عبرت نامۂ اندلس

سید نفیس ۱۳۸۲ھ

مقبول اکیڈمی لاہور

قصص الاوّلین عبرۃ للآخرین

عبرت نامۂ اندلس

ہر چہار جلد مکمل

مصنّفہ:

پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی

مترجمہ:

مولوی عنایت اللہ دہلوی ناظم دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

(فرزند خان بہادر شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ)

مرتّبہ و ایڈٹ کردہ

شیخ محمّد اسماعیل پانی پتی

مقبول اکیڈمی

۱۴ اے کوہِ نور چیمبر، شاہ عالم مارکیٹ لاہور

قصص الاولین عبرۃ للاخرین

عبرت نامۂ اندلس

ہر چہار جلد مکمل

مُصنّفہ،

پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی

مُترجمہ:

مولوی عنایت اللہ ناظم دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن

(فرزند خان بہادر شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ)

مُرتّبہ وایڈٹ کردہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

مقبول اکیڈمی

---

۴ اے کوہِ نور چیمبر، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

اہتمام ——— ملک مقبول احمد

طابع ——— نقوش پریس لاہور

قیمت ——— [redacted] 50/=

اکتوبر ۱۹۶۲ء

خطاطی :- خوش نویس ادارہ لاہور

فہرست مضامین

کتاب اول ۔ خانہ جنگی

کتاب ثانی

اسپین کے عیسائی اور اسپین کے عیسائی جو مسلمان ہو گئے۔

کتاب ثالث۔ خلافت

کتاب رابع۔ ملوک الطوائف۔

ضمیمہ جات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

مُقدّمہ

نوشتہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

مُسلمانانِ ہند کو جو تعلق اور محبت اندلس مرحوم سے ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلامی حکومت سپین کی متعدد تاریخیں اب تک عربی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ مثلاً اسکاٹ کی "ہسٹری آف دی مورش ایمپائر ان یورپ" اور لین پول کی کتاب "مورز ان سپین" وغیرہ انگریزی سے اور عبدالواحد مراکشی کی "کتاب المعجب" اور مقری کی کتاب "نفح الطیب" وغیرہ عربی سے اردو میں منتقل ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں ابن الاثیر اور ابن خلدون کی مبسوط تاریخوں میں جتنا حصہ تاریخ اندلس کا تھا اس کے بھی تراجم اردو میں ہو چکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ضرورت ابھی تک رفع نہیں ہوئی۔ تاریخ ایسی ہونی چاہیئے جسے پڑھتے ہوئے نہ طبیعت گھبرائے نہ اکتائے اور اس کے ساتھ ہی اس میں واقعات بھی نہایت صحت اور جامعیت کے ساتھ بیان کئے جائیں اور یہی چیز اب تک مفقود تھی۔ عربی تاریخوں کے تراجم بالعموم مُغلق، خشک، پیچیدہ اور بعض بعض جگہ سے غلط ہیں۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیں سوائے ناموں اور سنوں کی بھرمار کے بالعموم اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ رہ گئیں انگریزی تاریخیں ان میں عدم دلچسپی کے ساتھ غلط بیانیوں اور بہتان طرازیوں کی اتنی کثرت ہے کہ خدا کی پناہ۔ اسلامی سپین کے متعلق کوئی بھی یورپین تاریخ اس مصیبت سے بچی ہوئی نہیں۔ علاوہ غلط ہونے کے یہ تاریخیں مسلمانانِ اندلس کے متعلق ایسے شدید بغض، کینے، تعصب اور دشمنی سے بھری ہوئی ہیں کہ انھیں پڑھ کر ایک مسلمان کا خون جوش

کھانے لگتا ہے۔

بات یہ ہے کہ یورپین مورخین اور مستشرقین جب کبھی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق قلم اٹھاتے ہیں تو اپنے تعصب اور بغض کا اظہار ایسے بدترین طریقہ پر کرتے ہیں کہ اُن کے بیانات کو پڑھ کر نہایت درجہ رنج ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو نظرِ حقارت سے دیکھنا اور ہر برائی اور عیب بآسانی اُن کی طرف منسوب کر دینا یورپین مصنفین کی طبیعتِ ثانیہ بن چکا ہے۔ ایک یورپین مستشرق جب بدھ مت یا ہندو مذہب کے متعلق کچھ لکھے گا تو خواہ اُن کے خیالات سے متفق نہ ہو تاہم ایک منصفانہ اور سنجیدہ نگاہ اُن پر ضرور ڈالے گا۔ مگر سخت حیرت ہے کہ جب وہی مستشرق اسلام اور مسلمانوں کے متعلق کوئی تصنیف کرے گا تو اُس کی معقولیت اور سنجیدگی یک قلم رخصت ہو جائے گی اور اُس کی بجائے غصہ۔ نفرت اور بغض و عداوت کے جذبات فوراً بھڑک اٹھیں گے۔ یورپین مستشرقین کو اسلام اور مسلمانوں کے برخلاف نکتہ چینی کا اگر کوئی خفیف سا موقع بھی مل جائے تو تقلین مانئے ان کو حد درجہ رُوحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اسلام۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان بادشاہوں پر بدتر سے بدتر الزام نہایت بیباکی سے لگاتے ہیں مُنھیں کبھی مطلق باک نہیں ہوتا اور ہو بھی کس طرح؟ جب کہ نہ انھیں ہمارے جذبات و احساسات کا اندازہ ہے۔ نہ اسلام کی صحیح تعلیم انھوں نے سمجھی ہے۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بے عیب سیرت پر کبھی خالی الذہن ہو کر غور کیا ہے اور نہ مسلمان بادشاہوں کی تاریخ اپنے تعصب کو الگ رکھ کر کبھی پڑھی ہے اس صورت میں جو کچھ ان کے قلموں سے نہ ٹپکے تھوڑا ہے۔

اس موقع پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس تعصب کا باعث کیا ہے اور کیوں یورپین مصنفین اور مستشرقین کو مسلمانوں سے اس درجہ عناد اور بغض ہے؟ اس دشمنی کا سبب جہاں تک میں نے غور کیا ہے پادری ہیں جنھوں نے شروع سے لے کر ہر زمانہ میں اور بالخصوص صلیبی لڑائیوں کے دوران میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت و حقارت پھیلانے میں کوشش کا کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ اور صدیوں اس ناپاک پراپیگنڈہ مصروف رہے یہاں تک کہ ہر عیسائی بچے، جوان اور بوڑھے کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اسلام وحشیوں کا مذہب ہے اور مسلمان لٹیرے، قزاق، عیاش اور ملیش پسند ہوتے ہیں اور یہ بات اس قدر شدت کے ساتھ ان کے ذہن نشین

کی گئی کہ گویا ان کا ایک مذہبی اعتقاد بن گئی۔ ماؤں نے اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو یہی تعلیم دی جب وہ بڑے ہوئے تو انھیں کتابوں میں یہی پڑھایا گیا۔ اور جب پڑھ لکھ کر مورخ اور مصنف بنے تو پھر اسی بغض و عناد اور دشمنی و تعصب کو انھوں نے اپنی تصنیفات کے ذریعہ ملک میں پھیلانا شروع کیا جس کی تعلیم انھیں بچپن سے دی گئی تھی۔ اسلامی تاریخ و تمدن پر تمام یورپین اعتراضات کی جڑ یہی تعصّب ہے جو ان کی گھٹی میں ملا دیا گیا ہے۔

علاوہ اس بغض و عناد کے جو مسلمانوں کی طرف سے یورپین مصنفین اور مستشرقین کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔ قومی عصبیت اور مذہبی بیگانگت کی وجہ سے اندلس کے اسلامی دور کی تاریخ لکھتے ہوئے انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ ابتداءً سپین کے عیسائی باشندوں پر ان کے گناہوں کی پاداش میں خدائی عذاب مسلمانوں کی شکل میں نازل ہوا۔ اور جب عیسائیوں کو ان کے اعمال کی کافی سزا مل چکی تو ان کی نسل سے جو لوگ پیدا ہوئے وہ نہایت دیندار اور مخلص حامیٔ مذہب تھے انھوں نے دین کی محبت میں سرشار ہو کر تمام اسلامی سپین میں بڑی نیک نیتی کے ساتھ فتنہ و فساد پھیلانا شروع کیا تاکہ اسلامی سلطنت کے قُواء کمزور ہو جائیں۔ ان کے بعد جو نسل پیدا ہوئی اس نے اس "مقدس" کام کو نسبتاً زیادہ جوش اور استقلال کے ساتھ جاری رکھا یہاں تک کہ صدیوں کی مسلسل سعی و کوشش کے بعد آخر ۱۴۹۲ء میں مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کا سپین میں خاتمہ کر دیا۔"

گویا ان مورخین اور مستشرقین کے نزدیک اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت صرف اس لیے ظہور پذیر ہوئی تھی کہ:۔

(ا) ایک تو وہ کاہل اور گنہگار عیسائیوں کو خواب غفلت سے جگائے۔

(ب) دوسرے اس کے تباہ و برباد کرنے میں عیسائی دلاوروں اور بہادروں کی شجاعت اور وطن پرستی کے کارنامے منظر عام پر آجائیں۔

(ج) اسلامی سپین کی تاریخ لکھنے سے یورپین مصنفین کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس ذیل میں انھیں دل کھول کر مسلمانوں اور اسلامی بادشاہوں پر اعتراضات اور نکتہ چینی کا ایک عمدہ موقع ہاتھ آئے۔ کیونکہ اپنے اہل وطن اور اپنے مقدس پادریوں کو اسی صورت

میں خوشی کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ سوائے ایک دو مصنفین کے جنھوں نے ایک حد تک اسلامی سپین کی تاریخیں نسبتاً نرم الفاظ میں لکھی ہیں۔ اگرچہ اکثر مقامات پر منطقی پیرایہ میں دل شکن اعتراض کرنے سے وہ بھی نہیں چوکے۔ جو شورہ پشت خلافتِ اندلس کے غدار تھے ان مورخوں نے اُن کو محسنِ قوم" بتایا۔ جن عیسائی فتنہ انگیزوں کی ساری عمر اسپین میں فساد کی آگ بھڑکانے میں بسر ہوئی وہ ان کے نزدیک قوم اور وطن کے ولی خیر خواہ تھے وہ جو ڈاکو اور قزاق تھے انھوں نے اُن کو "قومی ہیرو" بنایا اور وہ بد باطن مسیحی جنھوں نے سپین میں اسلام اور بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کو گندی گالیاں دینا اپنا شیوہ بنا لیا تھا "شہید وطن" تسلیم کئے گئے۔ غرض کیا متعصب اور کیا اعتدال پسند، یورپ میں دونوں قسم کے مصنفین نے اسلامی سپین کی تاریخیں لکھتے وقت حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا۔ یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیئے کہ یورپین مصنفین نے جہاں کہیں مسلمانان سپین کی تعریف کی ہے وہاں مجبور ہو کر ادھورے دل سے کی ہے اور جہاں کہیں انھیں بُرا بھلا کہنے کا موقع ملا ہے وہاں پورے جوش کے ساتھ دل کا بخار نکالا ہے۔

(د) یورپین مورخین کی اسلامی سپین کے متعلق غلط بیانیوں اور سب و شتم کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اندلس کے قدیم پادری مصنفین نے مسلمانوں کے حالات لکھتے ہوئے عمداً نہایت دھوکہ، مکاری اور دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ بعد میں آنے والے مورخین نے انہی کتابوں سے اپنی تالیفات مرتب کیں۔ اور پہلی آلائشوں کے ساتھ اپنے تعصب کو بھی اُس میں شامل کر دیا۔ ایک تو کریلا ویسے ہی کڑوا تھا۔ نیم پر چڑھ کر اور بھی بدمزہ ہو گیا۔

ان غلط نویس اور دروغ گو مصنفین میں کونڈی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا لیکن تماشا یہ ہے کہ جس قدر اس کی کتاب غلط بیانات اور فرضی واقعات سے پُر تھی اُسی قدر وہ تمام یورپ میں مقبول، مشہور اور ہر دلعزیز ہوئی۔ یورپین دنیا کا ہر متنفس اسے وحی آسمانی کی مانند

ہر غلط و نقص سے پاک اور نہایت مستند اور معتبر یقین کرتا تھا۔ لیکن اس "معتبر" اور "مستند" مصنف کے متعلق خود اسی کے ہم مذہب مستشرق ڈوزی کی تحقیقات بھی سُن لیجیے لکھتا ہے" الف ب ت کے سوا عربی سے کونڈی کو برائے نام واقفیت تھی۔ اس نے واقعات کے قلیل ترین علم پر خیال آفرینی کی مدد سے جو واقعی درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی خوب جنگ آمیزی کی ہزارہا واقعات اور صدہا سنین اپنی طرف سے گھڑ کر لکھ دیئے اور ظاہر ہمیشہ یہی کیا کہ عربی کتابوں کا ترجمہ نہایت صحت اور درستی کے ساتھ کر رہا ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے جید مستشرق بھی دھوکے میں آگئے اور اس شعلۂ شیطانی کو چراغ ہدایت سمجھ کر اسکی طرف بڑھے"

ایک اور فرانسیسی فاضل ریبنان اس "بے مثل" اور "مستند" تاریخ کے متعلق ان الفاظ میں رائے زنی کرتا ہے" کونڈی کی تاریخ میں غلطیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ مہمل اور غلط عبارتیں بھری پڑی ہیں ایک ایک آدمی دو دو دفعہ مرا ہے اور کہیں پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا ہے عربی کے مصادر بڑے بڑے آباد شہروں کے نام ہو گئے ہیں اور ایسے لوگ جنھوں نے کبھی دنیا میں قدم نہ رکھا تھا بڑے بڑے فرضی کام کر گئے ہیں۔ ابن الابار کی تاریخ رجال سے کونڈی نے استفادہ کیا۔ اتفاق سے جلد ساز نے جلد بنانے میں چند اوراق غلط جگہ باندھ دیئے اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھی اور پانچویں صدی ہجری کے لوگوں میں خلط ملط ہو گیا۔ مگر کونڈی کا کمال دیکھیے کہ طرح طرح کے عجیب وغریب جھوٹے قصے اپنی طرف سے جوڑ کر سب باتوں کو ٹھیک بٹھاتا ہوا اس خلفشار سے باہر نکل آیا۔"

دیکھا آپ نے اسلامی سپین کے متعلق جو تاریخ سالہا سال تک یورپ میں وحی آسمانی سمجھی جاتی رہی۔ اس کی صحت کا یہ حال ہے۔ ہزار افسوس کہ اس رسوائے زمانہ کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور پبلشر صاحب محض چند ٹکے کمانے کی خاطر اس جھوٹ اور پُر فریب اعلان کے ساتھ کتاب کو فروخت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کونڈی کی نسبت یقین کرنا چاہیے کہ اسلام کا دلدادہ اور مسلمان تھا۔ اور اس نے اصل عربی اور ہسپانی تاریخوں سے اخذ کر کے یہ صحیح تاریخ لکھی تھی" اس اعلان پر غیرت اور حمیت اپنا سر نہ پیٹ لے تو اور کیا کرے؟

کونڈی کی اس تاریخ سے ایک بڑا نقصان یہ پہنچا کہ خوشنما الفاظ اور دلچسپ عبارت میں

ملفوف کر کے جو سرتاپا غلط اور بے بنیاد حالات کونڈی نے پیش کئے تھے وہ بعد میں آنے والے مصنفین نے ذوق وشوق کے ساتھ نہایت مستند اور معتبر واقعات کے طور پر اپنی اپنی تاریخوں میں درج کر دیے۔ اور اس طرح قریباً وہ تمام تصانیف جو کونڈی کے بعد اسلامی سپین پر لکھی گئیں غلط در غلط بیانات کا ایک نہایت لغو مجموعہ بن گئیں۔

کونڈی سے ہمیں ہی نہیں بلکہ خود یورپین مورخوں کو بھی شکایت ہے چنانچہ لین پول اپنی تاریخ "مورزان سپین" کے دیباچہ میں لکھتا ہے "کونڈی کی تاریخ" اسپین میں عربی حکومت بلحاظ ادب ضرور قابل قدر ہے۔ مگر تاریخی لحاظ سے اس کی کچھ حیثیت نہیں نیز وہ اس وجہ سے بھی لائق وقعت نہیں کہ بعد کی تصانیف میں جس قدر غلطیاں واقع ہوئیں انکا منبع یہی کتاب تھی۔

یورپ میں مظلوم اور بدنصیب مسلمانان اندلس کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا تھا اور کونڈی کی تاریخ وہاں صحیفۂ آسمانی سمجھ کر بک رہی تھی کہ ناگاہ غیب سے تاریخ کا ایک مجدد اعظم لائن ہارٹ ڈوزی کے نام سے ہالینڈ میں پیدا ہوا جس نے تحقیق و تدقیق کے گرزوں اور دلائل وشواہد کے آتشیں ہتھیاروں سے یورپ کا یہ شیش محل آناً فاناً زمین کے برابر کر دیا۔ اور جو شہرت، عزت، مقبولیت اور ہر دلعزیزی کونڈی کی تاریخ کو یورپ بھر میں حاصل تھی دم کے دم میں ملیامیٹ ہو گئی لوگوں نے دیکھا کہ وہ جسے جوہری بھی خالص سونا سمجھ رہے تھے نرا تانبا نکلا۔ اور تانبا بھی زنگ خوردہ اور بے کار

ڈوزی یورپ کا زبردست مستشرق، بڑا ادیب اور اعلیٰ پایہ کا مورخ تھا۔ فرانسیسی جرمن۔ انگریزی۔ عربی۔ عبرانی۔ کلدانی۔ سریانی۔ اسپینی۔ ڈینش۔ سویڈن اور آئس لینڈ کی زبانوں کا فاضل اور بے نظیر محقق تھا۔ اس نے پہلے تو کونڈی پر زبردست مقالے لکھے اور اس کی تمام غلط بیانیاں ایک ایک کر کے نہایت واضح طور پر پیش کیں۔ یہاں تک کہ تمام اہل علم کی نظر سے وہ کتاب گر گئی اور اس کی کوئی وقعت کسی کے دل میں باقی نہ رہی اور اس کے ساتھ ہی ان تمام تاریخوں کی شہرت بھی ختم ہو گئی جو کونڈی کے بعد لکھی گئی تھیں اور جنھوں نے اس سے واقعات نقل کر کے اپنی تاریخ کی وقعت بڑھائی تھی۔

جب یہ کام ہو چکا تو پھر ڈوزی نے اسلامی سپین کی ایک تحقیقی اور مستند تاریخ کی ضرورت محسوس کی۔ کیونکہ وہ اپنے سے پہلے کی اسلامی سپین کی تمام تاریخوں کو اس لیے بے وقعت اور ناکارہ "سمجھتا تھا کہ اُن کی بنیاد کونڈی کی تاریخ پر رکھی گئی تھی۔

یہ کام اگرچہ آسان نہ تھا مگر اولوالعزم ڈوزی کمر ہمت باندھ کر اس کی تکمیل کے لیے مستعد ہو گیا۔ بیس برس کے طویل عرصہ تک یورپ کے کتب خانوں میں پھرتا اور اسلامی سپین کے متعلق لٹریچر جمع کرتا رہا مطبوعات کے علاوہ جس قدر قلمی کتابیں مسلمانانِ اندلس کے متعلق یورپ کی کسی زبان میں وہ حاصل کر سکا اور ان کا مطالعہ کرتا اور ان سے اخذ و اقتباس کرتا رہا جب اس طرح عرصۂ دراز کی تلاش و تحقیق کے بعد کافی مواد جمع ہو گیا۔ تب فرانسیسی زبان میں تاریخ مسلمانانِ سپین از فتح اندلس تا زمانہ حکومت مرابطین" کے نام سے اُس نے ۱۸۶۱ء میں ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی۔ ۱۸۷۴ء میں اس کا جرمن میں ترجمہ ہوا۔ ۱۸۷۷ء میں اسپینی میں اور ۱۹۱۳ء میں مسٹر فرانسس گریفن اسٹوکس نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ یہی وہ محققانہ اور فاضلانہ کتاب ہے جس کا اردو ترجمہ آج شائقین تاریخ اندلس کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

یہ کتاب چھپتے ہی مولانا عنایت اللہ صاحب نے منگائی تھی۔ اور وہ ان کے پاس یکم دسمبر ۱۹۱۳ء کو پہنچ گئی تھی وہ اس وقت اپنی لاجواب تصنیف یعنی "اندلس اسکے تاریخی جغرافیہ" کے لیے مواد فراہم کر رہے تھے چنانچہ ابتداء میں انھوں نے چاہا کہ اسکے جستہ جستہ مقامات کا اردو میں ترجمہ کریں۔ لیکن کام شروع کرنے کے بعد مولانا کو محسوس ہوا کہ کتاب کی تلخیص مشکل ہے کیونکہ مضامین باہم ایسے مربوط اور مسلسل ہیں کہ اُن میں سے انتخاب کر کے اپنی مفید مطلب باتوں کا ترجمہ کرنا اور پھر اُنھیں علیحدہ نکالنا نہایت دقت طلب کام ہو گا۔ یہ دیکھ کر جناب موصوف نے کتاب کا ابتدا سے مکمل ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اور ۱۶ سال کے بعد ۱۹۲۹ء میں اُس سے فارغ ہو گئے۔

فاضل مترجم نے یہ ترجمہ کر کے یورپین تحقیقات کا ایک مکمل نمونہ اور مسلمانوں کے متعلق اہل یورپ کے جذبات کی ایک نمایاں تصویر اردو داں پبلک کے سامنے پیش کی ہے جس کی وجہ سے بہت سی نئی باتیں واضح طور پر اردو داں پبلک کے سامنے آگئی ہیں۔

اس ترجمہ میں بہت کافی محنت مولانا نے برداشت کی۔ جگہ جگہ دوسری تاریخوں سے امداد لینی پڑی۔ کتاب میں جہاں جہاں عیسوی سن اور تاریخیں آئی تھیں سب جگہ اُن کے ساتھ ساتھ ہجری سنہ اور عربی تاریخیں تحقیق کر کے لکھیں۔ جا بجا کتاب پر مناسب حاشیے اور مفید نوٹ تحریر کیے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔ غرض بہتر سے بہتر صورت میں اسے پبلک کے سامنے پیش کیا۔

ترجمہ کی خوبی، عمدگی اور روانی کے متعلق تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں بھلا جس کتاب کے مترجم مولانا عنایت اللہ ہوں اس کی عمدگی اور سلاست میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ مولانا موصوف کے والد شمس العلماء خان بہادر مولوی محمد ذکاء اللہ مرحوم اعلیٰ پایہ کے مصنف اور بہترین مؤلف ہونے کے علاوہ نہایت زبردست مترجم بھی تھے جو بلا مبالغہ کتابوں کی ایک بڑی لائبریری ترجمہ کر گئے ہیں۔ مگر مولانا عنایت اللہ کے ترجمے کے متعلق جو خط سرسید مرحوم نے ایک مرتبہ اُن کے والد کو لکھا تھا اس میں فرماتے ہیں:۔

اب کے تہذیب الاخلاق میں عزیزی عنایت اللہ کا ایک مضمون انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا ہوا چھپا ہے۔ آپ انصاف سے اُسے پڑھیے گا۔ آپ کی تمام عمر ترجمہ کرنے میں گذر گئی کیا آپ بھی ایسا عمدہ ترجمہ کر سکتے ہیں؟ اگر کسی ایسے مطول اور مشکل مضمون کا اردو میں ایسا ترجمہ کر دو تو جو کچھ کہو آپ کی نذر کروں ــــــ خاکسار سید احمد علیگڈھ ۲۹ جولائی ۱۸۹۵ء

سرسید مرحوم کے اس خط سے مولانا عنایت اللہ کی ترجمہ میں لیاقت اور قابلیت کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے اور جب اس بات کو دیکھا جائے کہ سرسید کے یہ الفاظ ۱۸۹۵ء کے ہیں جب کہ مولانا کی مشق ترجمہ ابھی ابتدائی حالت میں تھی۔ اور اس کے بعد سے وہ بیسیوں کتابوں اور ہزارہا نہایت دقیق اور مشکل صفحات کا بڑی خوبی کے ساتھ ترجمہ کر چکے ہیں تو فن ترجمہ کے لحاظ سے مولانا کی قدر دل میں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے حقیقت میں ڈوزی خوش نصیب تھا کہ اُس کو اردو کا ایسا مترجم ملا جو اس فن میں آج ہندوستان میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

ڈوزی کی یہ تاریخ یورپین دنیا میں بہترین سمجھی جاتی ہے۔ اور آج کل کے مستشرق اسے متفقہ طور پر نہایت مستند تسلیم کرتے ہیں اور فی الحقیقت وہ اس اعزاز کی صحیح طور پر مستحق

بھی ہے کیونکہ

(۱) اس سے پہلے جو کتابیں اسلامی سپین پر یورپین زبانوں میں لکھی گئیں وہ بیشتر گمراہ کن اور فرضی واقعات سے مملو تھیں۔ مگر ڈوزی نے حالات کی پوری تحقیق اور برسوں کی صبر آزما تلاش کے بعد سپردِ قلم کیا ہے۔ اور جو غلطیاں پہلے مصنفین نے کی تھیں اپنی کتاب کو اُن سے پاک رکھا ہے۔

(۲) اس کتاب کا بڑا کمال یہ ہے کہ تواریخی تحقیقات اور صحتِ واقعات کے ساتھ ساتھ ادبی لحاظ سے بھی وہ نہایت دلچسپ اور پُر لطف ہے۔ جہاں سے بھی پڑھو ناول کا مزا آتا ہے۔ اور انسان کا دل بے اختیار یہی چاہتا ہے کہ باب کو ختم کر کے ہی دم لے واقعات کو اس قدر دلچسپ طریقے سے بیان کرنے کی خاطر ڈوزی کو کتاب کی تالیف میں کافی محنت برداشت کرنی پڑی۔ ہفتوں کی تحقیق کو بعض مرتبہ صرف چند سطروں میں بیان کرنا پڑا۔ اور اکثر جگہ بہت سے واقعات جو نہایت محنت سے فراہم کئے تھے دلچسپی قائم رکھنے کی خاطر مجبوراً چھوڑنے پڑے۔

(۳) اس کتاب کے مُطالعہ کے دوران میں واقعات کو سمجھنے میں نہ کوئی الجھن پیدا ہوتی ہے اور نہ پڑھتے ہوئے طبیعت گھبراتی ہے۔ لکھتے لکھتے ڈوزی جہاں دیکھتا ہے کہ ناظر کی طبیعت تاریخی حالات پڑھتے پڑھتے کچھ گھبرانے لگے گی جھٹ انھیں چھوڑ کر دلچسپ فسانوی واقعات اور کیف انگیز نظموں کے تراجم نہایت سلیقہ کے ساتھ لکھنے لگتا ہے تاکہ بیان میں شگفتگی اور دلچسپی پیدا ہو جائے۔

(۴) وہ نہ بلا ضرورت عبارت کو طول دیتا ہے اور نہ اتنا مختصر لکھتا ہے کہ مطلب ہی خبط ہو جائے۔

(۵) ہر بات کی سند اور ہر واقعہ کا حوالہ ساتھ کے ساتھ ضرور پیش کر دیتا ہے جس کے ذریعہ اگر واقعات کو ان کے اصلی ماخذوں میں تلاش کیا جائے تو کوئی دقت نہ پیدا ہو (اصل فرانسیسی میں تمام حوالجات ڈوزی نے ہر واقعہ کے ساتھ وہیں دے دیئے تھے مگر کتاب کے انگریزی ترجمہ کے وقت مسٹر اسٹوکس نے ایک باب کے تمام حوالجات

بیجا کر کے ہر باب کے آخر میں لکھ دیئے اس لیے مجبوراً مولانا عنایت اللہ صاحب کو بھی اسی کی پیروی کرنی پڑی

(۶) اس نے اپنی کتاب میں حتی المقدور اسلامی سپین کی تاریخ کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

(۷) اس نے ایسے واقعات وحالات کو نمایاں طور پر قلمبند کیا ہے جن سے کسی تاریخی زمانہ کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہو۔

(۸) واقعات کی تحقیق اور حالات کے تجسس میں یکطرفہ کارروائی کا طریقہ اختیار نہیں کیا بلکہ عربی اور یورپین دونوں ماخذوں سے فاضلانہ اور ناقدانہ طریقہ پر کام لیا ہے۔

(۹) اس نے سپین کے عیسائی بادشاہوں کے اُن بیانات کا جو انھوں نے مسلمانوں کی تاریخ کے متعلق عربوں کے زمانہ میں قلمبند کرائے۔ عربی تاریخوں سے مقابلہ کیا اور اس کے بعد وہ جس نتیجہ پر پہنچا اسے اپنی تاریخ میں سپرد قلم کیا۔

(۱۰) اپنے عُمدہ اُسلوب ترتیب کے لحاظ سے یورپ نے اس کتاب کو بے مثل تسلیم کیا ہے

(۱۱) اس نے تاریخی الجھنوں اور پیچیدہ واقعات کو اس عُمدگی سے حل کیا ہے کہ وہ بخوبی ذہن نشین ہو کر سمجھ میں آجاتے ہیں۔

(۱۲) عام تاریخوں کی مانند ڈوزی نے اپنی اس تاریخ میں بادشاہوں کے حالات باقاعدہ طور پر مسلسل بیان نہیں کیے بلکہ جدا جدا مضامین کے دوران میں تمام ضمنی واقعات نہایت خوبی سے کھپاتا چلا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ تحقیق و تجسّس صحتِ واقعات۔ دلچسپی ولطافت۔ جامعیت اور عُمدہ اسلوب بیان کے لحاظ سے اسلامی سپین کی یہ تاریخ اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ یہی خوبیاں ہیں جن کے باعث یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ یورپ کی کسی زبان میں اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب موجود نہیں۔

مگر ٹھیریئے! کتاب کے محاسن پڑھنے کے بعد ناظرین کو کس قدر افسوس ہو گا کہ پھولوں کے ساتھ چند نہایت باریک اور نکیلے کانٹے بھی شامل ہیں اور مُصفّا شہد میں کچھ زہر بھی گھلا ہوا ہے یعنی چند ایسے عیب اور نقص بھی کتاب میں موجود ہیں جنکی وجہ سے اس کی خوبیوں پر بہت کچھ

پردہ پڑگیا ہے۔
ڈوزی کے ان معائب کی تفصیل حسب ذیل ہے

(۱) بہت ہی متعصب اور سخت دشمن اسلام ہے اور ساتھ ہی نہایت دریدہ دہن اور بد زبان بھی اس کی تمام تر کوشش یہی ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی تاریخ اور مسلمان بادشاہوں میں نقائص اور عیوب ڈھونڈے اور اگر اُسے ذرا سی بھی کوئی بات مل جاتی ہے تو فوراً اُسے لکھے بغیر نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اکثر رائی کو پہاڑ بنا دیتا ہے۔ اس کے تعصب سے بھی زیادہ اس کی طعن آمیز باتیں جگر خراش ہوتی ہیں

(۲) بعض اوقات اپنے نسلی اور قومی تعصب میں ایسا از خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ صاف صریح اور بدیہی بات کو بھی جھٹلانے پر آمادہ ہو جاتا ہے

(۳) واقعات بہ جد تحقیق کے بعد صحیح ماخذوں سے لکھتا ہے۔ مگر اپنے بُغض و تعصب کے باعث اُن سے نتیجہ غلط نکالنے میں دریغ نہیں کرتا۔ اور پھر اس غلط نتیجہ پر الزامات اور اعتراضات کی سر بفلک عمارت تیار کر لیتا ہے۔

(۴) وہ نکتہ چینی اور طعن و تشنیع ایسے دلآزار طریقے سے کرتا ہے کہ پڑھ کر طبیعت کو نہایت رنج ہوتا ہے۔ نکتہ چینی وہ اگرچہ دونوں گروہوں پر کرتا ہے۔ پادریوں اور سپین کے عیسائی بادشاہوں پر بھی اور علماء و خلفائے اندلس پر بھی۔ مگر جب پادریوں کو بُرا بھلا کہتا ہے تو ادب کے ساتھ۔ اور جب مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو جو کچھ جی میں آتا ہے کہتا چلا جاتا ہے۔

(۵) وہ مسلمان بادشاہوں کی خوبیوں اور محاسن کو جہاں تک ممکن ہو چھپانا چاہتا ہے یا ظاہر بھی کرتا ہے تو بادل ناخواستہ۔ البتہ ان کے عیوب اور برائیاں نہایت چمکا کر اور تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ بنی اُمیۂ اندلس میں صرف ایک شخص یعنی خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے سوا کوئی بادشاہ ایسا نہیں جس پر اس نے بیجا اعتراض نہ کئے ہوں۔

اس تعصب اور دشمنی کی وجہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایک تو وہ صدیوں کی عداوت ہے جو پادریوں نے مسلمانوں کے برخلاف اہل یورپ کے دلوں میں بٹھا رکھی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی بھی یورپین مصنف اور مستشرق الا ماشاء اللہ ایسا نہ ہوگا جو مسلمانوں سے شدید تعصب نہ رکھتا ہو۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جیسا کہ اس کا سوانح نویس لکھتا ہے "ڈوزی کی طبیعت میں ذاتی طور پر بھی جنگجوئی، خصومت، دریدہ دہنی اور بدلحاظی موجود تھی" اور اسی عادت کا ظہور سپین کی تاریخ لکھنے میں اس سے ہوا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ کتاب مسلمانوں کے متعلق اس قدر تعصب، دشمنی، عداوت، بغض، طعن و تشنیع اور اعتراضات سے بھری ہوئی ہے تو پھر ایسی کتاب کا ترجمہ کیوں کیا گیا؟ اور کیا ضرورت اسے اردو داں پبلک کے سامنے پیش کرنے کی محسوس ہوئی۔

میں نے یہی سوال مولانا عنایت اللہ صاحب سے کیا تو انھوں نے جو جواب دیا اسے میں اپنے الفاظ میں ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں:۔

(۱) سپین میں اسلامی حکومت کے حالات پڑھنے کے شوق اور ترجمہ کرنے کی عادت نے یہ ترجمہ کروایا۔

(۲) اس ترجمہ کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ اسے پڑھ کر ہندوستان میں کوئی ایسا فاضل پیدا ہو جو انہی ماخذوں کو سامنے رکھ کر جن سے ڈوزی نے کام لیا ہے بلکہ ان پر کچھ بڑھا کر اور ان سے صحیح اور درست نتائج اخذ کر کے اسی طرز پر یا اس سے بہتر اسلوب کے ساتھ اسلامی سپین کی ایک اعلیٰ پایہ کی تاریخ لکھنے کی کوشش کرے۔

(۳) ایک غرض اس ترجمہ کی یہ بھی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ان الزامات سے واقف ہو جائیں جو یورپین مصنفین اور مستشرقین عام طور پر اسلام اور مسلمانوں پر لگایا کرتے ہیں تاکہ وہ آسانی کے ساتھ ان میں سے ہر اعتراض کا تحقیقی جواب دے سکیں اور مسلمان ان کی طرز تحریر سے باخبر رہ کر دھوکے سے محفوظ رہ سکیں۔

(۴) تاریخ کے طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ موافق اور مخالف دونوں کے خیالات سے

واقفیت رکھتا ہو۔ ورنہ وہ دونوں بیانات میں ٹھیک موازنہ کبھی نہیں کر سکے گا اور نہ صحیح نتیجہ پر پہنچ سکے گا۔ یہ بات ترقی علم کے لیے بھی ضروری ہے اور مخالف کا جواب دینے کے لیے بھی۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ محامد اور تعریفوں کے سوا اپنے خلاف کوئی بات سننا ہی نہیں چاہتے اور اسی لیے انھیں پتہ ہی نہیں کہ مخالف ہمارے متعلق کیا خیالات رکھتا ہے اور کیسا زہر ہمارے خلاف پبلک میں پھیلایا جاتا ہے۔ حالانکہ بالکل ظاہر بات ہے کہ جب ہم مستشرقین یورپ کے اعتراضات سے واقف ہی نہیں ہوں گے تو ان کا جواب کیا دے سکتے ہیں؟ اور علمی طبقہ میں ان کے معاندانہ پراپیگنڈہ کا ازالہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ حق اور صداقت کو نہایت واضح کرنے کے لیے ضرورت ہے کہ اعتراضات موجود ہوں۔ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مغرب کے کفار کی طرف سے اگر اعتراضات نہ کیے جاتے تو قرآن کریم کا حجم بہت ہی تھوڑا سا ہوتا۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ اور ان کے تمدن پر الزامات نہ لگائے جاتے تو بیسیوں اعلیٰ پایہ کی تنقیدی اور تحقیقی کتابوں سے اردو زبان محروم رہتی۔ ہماری تبلیغ کبھی باأثر ہو ہی نہیں سکتی جب تک ہم اُن اعتراضات سے واقف نہ ہوں جو یورپین مستشرق اسلام اور مسلمانوں پر کر رہے ہیں۔ اور واقف ہو کر ان کے صحیح۔ مدلل اور تسلی بخش جواب جب تک ہم نہ دیں اس وقت تک مستشرقین یورپ اور مغربی اہلِ علم کے سامنے سر اُٹھا کر ہی نہیں سکتے۔ جو ہمیں ہمیشہ سے نیم وحشی۔ دشمن علم و تہذیب عیش پسند۔ عہد شکن۔ بے رحم۔ غرض جملہ بُرائیوں کا مخزن سمجھتے آئے ہیں اور سمجھ رہے ہیں۔

ممکن ہے اس بیان سے ناظرین اور بالخصوص علماء کرام کا اطمینان ہو گیا ہو اور انھوں نے سمجھ لیا ہو کہ اس کتاب کا ترجمہ کر کے مترجم کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب نہیں ہوئے اس موقع پر رفع غلط فہمی کے لیے ایک بات کہدینی نہایت ضروری ہے اور وہ یہ کہ ڈوزی نے اس تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں پر جو جو اعتراضات کئے ہیں، فاضل مترجم کو ہر گز ان سے اتفاق نہیں

اور وہ ان کو بالعموم غلط۔ لغو اور فضول سمجھتے ہیں۔ اسی لیے جہاں جہاں مناسب تھا حاشیوں میں ڈوزی کے اعتراضات کے جوابات دے دیے گئے ہیں اور جو زہر ان کے ذریعہ سے پھیلایا گیا تھا فوراً اس کا ازالہ کر دیا گیا ہے۔ البتہ کتاب کی وہ عبارتیں جو بہت ہی زیادہ دل شکن اور دلآزار سب و شتم سے لبریز تھیں اور جن میں دشنام کے سوا اور کچھ نہ تھا حذف کر دی گئی ہیں کیونکہ اعتراض کا محققانہ جواب دیا جا سکتا ہے اور دیا گیا ہے۔ مگر دشنام کا جواب نہ ہو سکتا ہے نہ دینے کی ضرورت ہے۔

سطور بالا میں جو کچھ ڈوزی اور اس کے ترجمے کے متعلق مجھے کہنا تھا کہہ چکا۔ اب اس فقرے پر اپنے بیان کو ختم کرتا ہوں کہ یہ توقع کہ یورپین مصنفین اور مستشرقین اسلامی سپین کی تاریخ کے متعلق عدل و انصاف سے کام لیں گے، بالکل بیکار ہے۔ اب تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس موضوع پر خود قلم اٹھائیں۔ اور واقعات کو اسی صبر اور تحقیق و تجسس سے جمع کریں جو یورپین مصنفین کا خاصہ ہے۔ اور پھر انھیں اسی شگفتگی و خوبی کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کریں جو یورپین مستشرقین کا طغرائے امتیاز ہے۔ اس کے بعد جو جو اعتراضات اہلِ یورپ اسلام اور مسلمانوں پر کرتے ہیں ان کے تحقیقی جواب دیں۔ یہاں تک کہ اسلامی سپین کی تاریخ پر اغیار کی مہربانی سے جس قدر سیاہ پردے پڑے ہوئے ہیں سب اٹھ جائیں۔ اور ہماری تاریخ کا روشن اور تابناک چہرہ مخالف و موافق دونوں بخوبی دیکھ سکیں۔

مورخہ ۱۸ رمضان ۱۳۵۴ھ
یکم نومبر ۱۹۳۵ء

خاکسار، محمد اسمٰعیل پانی پتی

یہ کتاب مسٹر اسٹوکس مترجم انگریزی کی اجازت سے حق ترجمہ نقد ادا کرنے کے بعد شائع کی گئی۔

دیباچہ

(نوشتہ مترجم انگریزی)

یہ انگریزی ترجمہ ایک نہایت ہی نادر فرانسیسی کتاب کا ہے جو پچاس برس سے عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے ایک بہت ہی دلچسپ حصے کے متعلق مستند مانی جاتی ہے۔ اور آج یہ پہلا موقع ہے کہ اُسے انگریزی میں ترجمہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

رائن ہارٹ ڈوزی کی "تاریخ مسلمانان اسپین" کی نسبت گو بعض معتبر تصانیف میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ دوبارہ شائع ہوئی تھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۱۸۶۱ء میں پہلی بار طبع ہو کر اسے پھر چھپنا نصیب نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے کتاب نادر الوجود اور کمیاب ہو گئی یہاں تک کہ اس کا علم بھی کہ ایسی بےمثل کتاب موجود ہے۔ صرف اُنھی لوگوں کو رہا جو فن تاریخ کے ماہر تھے۔ اس کا سبب کہ ایسی عمدہ اور مفید کتاب دوبارہ کیوں شائع نہیں ہوئی میں نے مصنف کے سوانح میں بیان کر دیا ہے۔ اصل کتاب کا دوسرا اڈیشن تو نہ نکلا لیکن ۱۸۷۴ء میں گراف فون بادیسین نے بہ نگرانی ڈاکٹر وُلف وائیلم اس کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ اس ترجمہ میں چند ایسی ترمیمات بھی شامل کی گئیں جو مصنف نے بعد میں اپنی تصنیف میں کی تھیں۔ میں نے ترجمہ کرتے وقت اس جرمن ترجمہ کو بار بار دیکھا اس کے بعد الیف دی کاسترو نے جو اشبیلیہ یونیورسٹی میں تاریخ اسپین کے پروفیسر تھے اصل کتاب کا اسپینی زبان میں ترجمہ کیا جو ۱۸۷۷ء میں شائع ہوا۔ یہ اسپینی ترجمہ اس انگریزی

ترجمہ میں حوالے لکھنے کی غرض سے بہت بکارآمد ثابت ہوا۔

۱۸۸۱ء میں (یعنی پروفیسر ڈوزی کی موت سے دو برس پہلے) ان کی کتاب "تحقیق" کا تیسرا اڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ شائع ہوا۔ اس کتاب سے جو اسپینی تاریخ کے طلبہ کے لیے نہایت ہی مفید ہے۔ بعض نوٹ منتخب کر کے اس ترجمہ میں بطور تعلیقات میں نے لکھے ہیں۔ اور بعض اصلاحوں اور اضافوں کو ترجمہ کے متن میں لے آیا ہوں۔

اصل کتاب کو ترجمہ میں کہیں گھٹایا نہیں۔ ترجمہ جہاں تک ہو سکا بالکل ٹھیک کیا۔ مگر اتنا لفظی بھی نہیں کیا کہ سمجھنا دشوار ہو جائے۔ اصل تصنیف کے ایسے فٹ نوٹ جو صرف عربی کے طلبہ کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے تھے۔ میں نے ترجمہ میں حذف کر دیے ہیں۔ اور ان کی جگہ دوسرے فٹ نوٹ ڈوزی کی تصنیفات یا بعد کی کتابوں کی مدد سے لکھے ہیں۔

جن کتابوں سے مصنف نے اپنی تصنیف میں مضامین لیے ہیں۔ انکے نام باستثنائے چند ابجائے ٹھیک موقع ہر فصل کے اخیر میں ایک ہی جگہ لکھتا گیا ہوں پورے پورے نام ان مطبوعہ یا قلمی کتابوں کے ترجمہ کے اخیر میں ایک ضمیمہ میں لکھ دیے ہیں۔

(یہاں انگریزی مترجم نے مشرقی اعلام کو انگریزی میں لکھنے کی دقتیں اور جو طریقہ اس بارے میں خود اس نے اختیار کیا ہے۔ بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربی حروف کو یورپین حروف میں لکھنے کے جو قواعد مرتب کر دیے گئے ہیں۔ اور عربی حروف کو تعبیر کرنے کے لیے یورپین حروف میں جو علامات بنائی جاتی ہیں۔ اُن کی پابندی مترجم نے نہیں کی۔ مثلاً ق یا ک سب کے لیے k لکھا ہے۔ پر کوئی علامت ایسی نہیں بنائی جس سے وہ ق پڑھا جائے اسی طرح س اور ص میں کوئی تمیز قائم نہیں کی۔ وغیرہ وغیرہ

اردو کے مترجم کا یہاں یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ اردو ترجمہ میں عربی اعلام خواہ آدمیوں کے ہوں یا مقامات کے۔ حتی الامکان صحیح عربی املا میں لکھے گئے ہیں)

اسپین کا نقشہ جو اس ترجمہ کے لیے خاص طور پر بنایا گیا ہے سپروز ملنیکی کی

تاریخی اٹلس کے نقشہ نمبر ۱۵ اور نمبر ۱۶ سے تیار کیا گیا ہے۔ اُس میں بعض مقامات جن کی اِس ترجمہ کے لیے ضرورت ہوئی۔ زائد لکھے گئے ہیں۔ اور بعض جن کا کچھ تعلق نہ تھا چھوڑ دیے گئے ہیں (بہت سے پرانے نام تاریخ میں ایسے بھی ہیں جن کا پتہ نہ چلنے کی وجہ سے وہ نقشے میں نہیں دکھائے جا سکتے)

سر ولیم میور کی کتاب "سوانح پیغمبر" (نیا اڈیشن مسٹر ٹی۔ ایچ۔ وائر ۱۹۱۲ء) اور موسیو کلیمنٹ ہارٹ کی "تاریخ ادب عربی" (۱۹۰۲ء) اور بالخصوص مسٹر آر۔ اے۔ نکلسن کی "عربی تاریخ اہل عرب" کا بے حد ممنون ہوں۔ یہ کتابیں ترجمہ کرنے کے زمانہ میں ہمیشہ میرے پاس رہیں (ایک جگہ تو میں ڈوزی کی کتاب کا ایک فقرہ جس طرح مسٹر نکلسن نے ترجمہ کیا تھا بالکل انھیں کے الفاظ میں لکھ گیا ہوں)

مصنف کے سوانح لکھنے میں میں نے جملہ واقعات مسٹر ایم۔ جے۔ ڈی گوجی کی کتاب سے لیے ہیں جو انھوں نے امسٹرڈم کی رائل اکاڈمی آف سائنس کے سامنے پیش کی تھی اور اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں ایم۔ وکٹر شاون نے ۱۸۹۳ء میں کیا تھا۔ موسیو گستاو ڈگٹ کی تاریخ مستشرقین یورپ (۱۸۷۰ء) سے بھی میں نے مدد لی ہے۔ موسیو ڈگٹ پروفیسر ڈفنری کے دوست تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ پروفیسر ڈوزی نے خود ان کو اپنے شروع زمانہ کے حالات سے آگاہ کیا ہوگا۔ مصنف کے نسب کے متعلق میں نے ایک نسب نامے سے حالات لکھے ہیں جو خود مصنف کے ایک ہم جدی عزیز نے اپنے خاندان کا لکھا تھا اور جو حال میں شائع ہوا ہے۔

ترجمہ میں اشاریہ اصل کتاب کے اشاریہ سے زیادہ تفصیل سے درج کیا گیا ہے۔

مجھے اس کی امید نہیں کہ اتنے بڑے ترجمے میں جس کا انجام دینا آسان کام نہ تھا۔ کوئی غلطی نہ رہی ہو۔ مگر اس کی امید ضرور ہے کہ غلطیاں زیادہ نہیں ہوئی ہوں گی۔ اگر کوئی صاحب کسی غلطی کی صحت کریں تو مجھے مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

لندن ۱۹۱۳ء — الف۔ جی۔ اسٹوکس

مُصنِّف کے سوانح

(از مترجم انگریزی)

سولھویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں شہر ولانسیئن[1] (فرانس) اور اس کے متصل اضلاع[2] اینو (بلجیم) میدانِ کارزار بنے ہوئے تھے۔ ولان سئین کی شہرپناہ بہت مستحکم اور اس کے گرد خندق بہت مضبوط اور گہری تھی۔ مگر اسپین کے سالارِ فوج فلپ[3] دی نوئیر کارم نے آخرکار ۱۵۶۷ء کے قریب اُسے فتح کر لیا۔ اور اپنی فوج کے لوگوں کو حکم دیا کہ شہر والوں سے خوب بدلہ نکالیں اس واقعہ کے پانچ برس بعد ولان سئین کے لوگوں نے دشمن کے قبضے سے اپنا شہر نکال لیا۔ یہ شہر گو دو مرتبہ دشمن کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا مگر قرب و جوار کے بسنے والے اسے ہمیشہ اپنے حق میں پناہ کی جگہ سمجھتے رہے ظالم اور جفاکار سپاہ کے قتل و غارت سے رعایا ایسی تباہ حال رہتی تھی کہ اکثر آدمیوں نے دیہات کا رہنا چھوڑ کر شہر میں سکونت اختیار کر لی۔ اور یہاں محنت و مشقت کر کے کچھ زمانہ کے بعد خوشحال ہو گئے۔ یہ نو آباد لوگ اپنا نام اکثر اُن مقامات کے ناموں پر رکھتے تھے جہاں وہ پہلے کبھی آباد رہ چکے تھے۔

گو پورا ثبوت موجود نہیں ہے لیکن ظنِ غالب یہ ہے کہ شہر کے انہی نو آباد خاندانوں سے ہمارے مصنف یعنی مؤرخ اندلس کے آباؤ اجداد تھے۔

اس سلسلۂ نسب میں ربط پیدا کرنے کے لیے ایک واقعہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ شہر ولان سئین سے تھوڑے فاصلے پر کامبرے[4] اور دوئے[5] (فرانس) کے

---

[1] Valenciennes

[2] Hainault

[3] Philip de Noircarmes

[4] Cambrai

[5] Douai

دو شہر تھے۔ ان شہروں کے وسط میں ایک چھوٹا سا گاؤں یا تعلقہ تھا جس کا نام اوازے[1] تھا
اٹھارویں صدی کے سرکاری کاغذات میں لکھا ہے کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں اب بھی
اٹھتر آدمی بستے ہیں اور اسی موضع کے نام سے ایک معزز خاندان کا نام چلا ہے جس کے
لوگ کامبرے کے شہر میں حاکم مقرر ہونے کا موروثی حق رکھتے تھے۔ ان واقعات سے
یہ نتیجہ نکالنا آسان ہے کہ لڑائیوں کے زمانہ میں جیسا کہ اوپر آچکا ہے موضع اُوازے کے اکثر
باشندے گاؤں چھوڑ کر شہر والان سیئن میں آباد ہو گئے تھے اور یہاں وہ اب تک اپنے تئیں
"اوازے والا" کہنے پر فخر کرتے تھے۔ اسی خیال کی تائید میں ایک بات یہ بھی ہے کہ ۱۶۶۲ء
میں والان سیئن میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام فرانسوا ڈوزی[2] ادی۔ اوازے یعنی
اُوازے والا) تھا۔ ڈاکٹر جی۔ جے[3]۔ ڈوزی نے ایک مفصل نسب نامہ میں جو حال میں
بڑی تحقیقات سے تالیف کیا ہے۔ فرانسوا ڈوزی کی اولاد کی مختلف شاخوں کے نام
درج کئے ہیں جو آجکل نیدرلینڈ[4] میں آباد ہیں۔

اب صرف اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ ۱۶۴۷ء میں فرانسوا دوزی کا خاندان والان سیئن
سے اُٹھ کر ولندستان[5] میں جا بسا۔ اور اب ولندستان کو دعوٰے ہو گیا کہ اس خاندان
کو ولندیزی قرار دے۔

۲۱ فروری ۱۸۲۰ء کو فرانسوا ژاک[6] ڈوزی طبیب لیڈن[7] کی بیوی سارہ ماریہ[8] کے
ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام رائن ہارٹ پیٹر آنے[9] رکھا گیا۔ اس لڑکے کی عُمر ابھی نو ہی
برس کی تھی کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ ابتدائی تعلیم اس کی واسینار[10] میں ہر فان فین[11]
کے سپرد ہوئی۔ اس کے بعد ہاتم[12] کے مدرسے میں داخل کر دیا گیا یہاں اُس نے بہت جلد

[1] Oisy
[2] Francois Dozy
[3] Dr G. J Dozy
[4] Netherlands
[5] Holland
[6] Francois Jaques Dozy
[7] Leyden.
[8] Sara Maria
[9] Reinhart Pieter Anne.
[10] Wassenaar
[11] Heer van Veen
[12] Hattem

ترقی کی کہ ڈاکٹر جے جے۔ دی گلدر[1] کی شاگردی کے لائق ہوگیا، تاکہ اُن کی تعلیم سے یونیورسٹی کی سند حاصل کرنے کی تیاری کرے۔ مدارسِ ابتدائی میں اس لڑکے نے اپنا وقت بہت اچھی طرح صرف کیا تھا، چنانچہ استاد نے اس امر کی تصدیق کی کہ فرانسیسی[2]۔ جرمن[3] اور انگریزی[4] زبانوں میں اُسے معقول دستگاہ ہوگئی ہے۔

مسیحی دینیات میں جو طلبہ یونیورسٹی کی سند حاصل کرنی چاہتے تھے ان کو ڈاکٹر دی گلدر عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ یہ دیکھ کر کہ ڈوزی میں غیر زبانیں سیکھنے کا مادہ بہت اچھا ہے۔ انھوں نے اِس شاگرد کو عربی پڑھنے کی ہدایت کی۔ ڈوزی استاد کی اس ہدایت سے بہت خوش ہوا۔ اور علاوہ اُن مضامین کے جن کا پڑھنا یونیورسٹی کی سند حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا۔ اُس نے ڈاکٹر موصوف سے عربی پڑھنی شروع کردی۔ علوم ریاضیہ کو چھوڑ کر جن سے ادبیات کے طلبہ کو ایک قابلِ غور نفرت ہوتی ہے۔ ڈوزی نے باقی تمام علوم حاصل کرنے کا ایسا ہَوکا ظاہر کیا کہ استاد پریشان ہوگئے۔ اور ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں اس ہمہ دانی کے شوق کا نتیجہ یہ نہ ہو کہ کسی ایک علم میں بھی تکمیل نہ ہو سکے۔

۱۸۳۶ء میں ڈوزی لیڈن کی یونیورسٹی[5] میں داخل ہوگیا۔ یہاں ڈاکٹر ویرز[6] ادبیات کے پروفیسر تھے۔ یہ ایک نوجوان شخص تھے اور لسانیات کے بڑے عالم تھے۔ اپنے شاگردوں کو بہت توجہ اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ اپنا کل وقت طلبہ پر وقف کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ پڑھانے میں کمال رکھنے کے سوا طبقۂ علماء میں کوئی ممتاز درجہ ایسا جس سے شہرت ہوتی، حاصل نہ کر سکے۔ ڈوزی جیسے طالب علم کو جسے یکبارگی بہت سے علوم تحصیل کرنے کا بیحد شوق تھا۔ صحیح راستے پر ڈالنے والا پروفیسر ویرز سے بہتر استاد نہ مل سکتا تھا۔ پروفیسر موصوف کی کیفیت یہ تھی کہ ہر علمی تحقیق میں غایت درجہ احتیاط اور دقتِ نظر سے کام

---

[1] Dr J. J de Gelder
[2] French
[3] German
[4] English
[5] Leyden University
[6] Weijers

دیتے تھے اور تحقیقات کے نتائج بیان کرنے میں بیحد سادگی اور صحت کو مدِ نظر رکھتے تھے اُن کے طرزِ بیان میں کہیں عالمانہ نخوت وغرور کا پتہ نہ تھا۔ اپنے شاگردوں کو بھی وہ انہی باتوں کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ اُستاد کی اس سادگی اور صحتِ بیان کا اثر ڈوزی میں عمر بھر رہا۔ پروفیسر ویرز سے ہمارے مصنف نے عربی۔ عبرانی۔ کلدانی اور سریانی زبانیں سیکھیں۔

اٹھارہ برس کی عمر تھی کہ اس محنتی اور شوقین طالب علم نے شعراء عرب کا کلام پڑھنے کا شوق ظاہر کیا۔ پروفیسر ویرز نے شاگرد کے اس شوق کو ایک نحوی اور عالم لسانیات کی نظر سے دیکھا اور اس قصد سے اُسے باز رکھا۔ شاعری کی بجائے عربی تاریخ کی طرف متوجہ کیا کہ اسی کو پڑھو اور اسی پر لکھو۔

ڈوزی نے اُستاد کی نصیحت پر عمل کیا۔ لیکن تاریخوں میں بیشمار لڑائیوں اور فرمانروا خاندانوں کے عزل ونصب اور اُن کی چندروزہ حکومتوں کے حالات اور ان کے ردوبدل کو پڑھتے پڑھتے طبیعت اس مضمون سے پھر گئی۔ لہذا تاریخ چھوڑ کر لُغت نگاری کی طرف متوجہ ہوا۔ فری تاگ کا عربی لاطینی لُغت[1] اُس زمانہ میں بہت قابل قدر مانا جاتا تھا۔ مگر یورپ کے طلبہ کی اغراض کے لیے اُس میں الفاظ کی کمی تھی۔ فری تاگ نے یہ کتاب عربی کتبِ لُغت سے تالیف کی تھی۔ صرف قدیم عربی کے الفاظ بالخصوص جو قرآن میں آئے ہیں۔ اُسمیں درج تھے۔ بہت سے الفاظ جو بعد کو مصنفینِ عرب کی کتابوں میں دیکھے جاتے تھے۔ وہ اس میں نہ تھے۔ اب ڈوزی نے عربی الفاظ کے متعلق اپنا علم بڑھانے کے لیے ایتین مارک کترمیری[2] کی تالیفات مطالعہ کرنی شروع کیں اور اس مطالعہ میں بیحد محنت کی اور اکثر حواشی بر زبان کر لیے۔

دسمبر ۱۸۴۱ء میں شاہی مجلس علماء[3] نے ایک انعامی مضمون اہل عرب کے لباس اور اُن کی پوشاکوں کی اقسام کے متعلق لکھوانا چاہا۔ ڈوزی سنتے ہی بیچین ہو گیا۔ اُسے

لے Lexicon Arabico-Latinum.

لے Etienne Marc Quatremere.

لے The Royal Institute

اس موضوع پر مضمون لکھنے کا بے حد شوق پیدا ہوا۔ لیکن صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے سخت محنت اور تلاش کی ضرورت تھی۔ متعدد قلمی نسخوں کا مطالعہ اور اُن میں ایک ایک چیز کو تلاش کیئے بغیر قلم اٹھانا ممکن نہ تھا۔ ڈوزی نے ان دشواریوں کی مطلق پروانہ کی مضمون پیش کرنے کے لیے اب ایک سال سے کچھ اوپر باقی رہ گیا تھا۔ بہرکیف لکھنا شروع کر دیا۔ اور یونیورسٹی کے کتب خانہ سے اس کثرت سے کتابیں منگوائیں کہ پروفیسر ویزز نے زیادہ کتابوں کی اجازت دینی بند کر دی۔ اور لکھا کہ جب تک کوئی معقول وجہ بیان نہیں کی جائے گی۔ زیادہ کتابیں نہیں بھیجی جائیں گی۔ اب ڈوزی کو سخت مشکل پیش آئی انعامی مضمون کے ممتحنوں میں پروفیسر ویزز بھی تھے۔ اور یہ قاعدہ سخت تھا کہ ممتحنوں پر مضمون لکھنے والوں کے نام ظاہر نہ ہوں۔ مگر ڈوزی نے ہمت کر کے ایک خط استاد کے نام لکھا اور اس میں صاف صاف لکھ دیا کہ میں انعامی مضمون لکھ رہا ہوں۔ اور اس وجہ سے مجھے زیادہ کتابوں کی ضرورت رہتی ہے۔ پروفیسر ویزز کو اس نوجوان طالب علم کی جسارت پر تعجب ہوا اور کتابیں جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ ڈوزی نے مہینوں اس مضمون کے لکھنے میں صرف کیے اور ایک دوست سے جس نے محرری کی خدمت ادا کی، مدد لے کر عربوں کے لباس پر ایک مضمون کیسا بلکہ ایک چھوٹا سا رسالہ لکھ ڈالا۔

۲۰ نومبر ۱۸۴۳ء کو جب کہ اس کی عمر صرف ۲۳ برس کی تھی۔ ڈوزی کو اس مضمون پر انعام مل گیا۔ جلدی میں لکھنے کی وجہ سے اس میں بہت سی خامیاں رہ گئی تھیں۔ اُن کو رفع کر کے دو برس بعد ڈوزی نے ایک کتاب شائع کی جس کا عنوان تھا "لُغت جس میں عربی پوشاک کے متعلق الفاظ جمع کیے گئے ہیں"۔ اس عجیب و غریب لُغت سے ظاہر تھا کہ مؤلف نے اس کے لکھنے میں بے انتہا تحقیق و تجسس سے کام لیا ہے۔ یہ تالیف ڈوزی کی علمی شہرت کا سنگِ بنیاد ہو گئی۔

پروفیسر ویزز نے اپنا بہت سا وقت اسپین کے عربوں کی تصنیفات پڑھنے میں صرف کیا تھا۔ چنانچہ اب انھوں نے اپنے شاگرد ڈوزی کو یوسی انتر بو کوندے کی تصنیف

ل DICIONNAIRE DETAILLE DESNOMS DES VETEMENTS CHEZ ARABES.

اسپین میں حکومتِ عرب کی تاریخ[1]" کی طرف توجہ دلائی - اس تصنیف کا مفصل حال ہم آگے بیان کریں گے - یہاں صرف اتنا لکھنا کافی ہوگا کہ ڈوزی کو بہت جلد اس بات کا پتہ چل گیا کہ کوندے کی کتاب میں غلطیاں کثرت سے ہیں - اور واقعات کے بیان میں صحت اور احتیاط بہت کم ملحوظ رکھی گئی ہے یہ کتاب اسپینی زبان میں تھی - اب ڈوزی کو اسپینی زبان پڑھنے کا شوق ہوا - چنانچہ اس نے اس زبان کی بہت سی کتابیں اپنے صرف سے مہیا کر کے اس زبان کو بخوبی حاصل کر لیا۔

اسپینی زبان سیکھنے کے بعد اسپین کے مشہور شاعر لوپ دی ویگا[2] پر ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا - لوپ دی ویگا عجیب قسم کا مصنف تھا - پندرہ سو ڈرامے اور بیس جلدوں میں ایک مثنوی[3] لکھنی اس کے نزدیک گویا کسی بڑے کام کے دوران میں بیچ کا ایک خفیف سا شغل تھا - ڈوزی کی مثل شیدائے علم کو ایسے مصنف کی طرف توجہ ہونی ایک قدرتی بات تھی - لیکن قسمت اچھی تھی کہ اس راہ کو چھوڑ کر دوسرے میدان میں ریاضت شروع کی - کچھ عرصہ سے ڈوزی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اسپین میں اسلامی حکومت کے کسی ایک دور کی تاریخ بہت صحت کے ساتھ لکھی جائے جس زمانہ میں وہ عربوں کے لباس پر انعامی مضمون لکھ رہا تھا اسی زمانہ میں اس نے بہت سا نادر مواد ایسے ماخذوں سے جمع کر کے جہاں اب تک تلاش و تحقیق کے قدم نہ پہنچے تھے ایک عنوان بہت ہی اچھا سوچ لیا تھا - اور وہ یہ تھا "خاندان بنو عباد کی عجیب و غریب تاریخ جس نے اشبیلیہ میں زوالِ سلطنت بنو امیہ کے بعد حکومت کی (۱۰۲۳ء تا ۱۰۹۱ء)"

۱۸۴۳ء میں ڈوزی نے لیڈن کی یونیورسٹی سے ڈاکٹر کی ڈگری حاصل کی اور اس کے بعد ہی اپنی شادی کی - اس بیوی نے عمر بھر شوہر کا ساتھ دیا اور آپس کے

---

[1] Jose Antonio Condes Historia de la dominacion de los Arabes en Espana.

[2] Lope de Vega [3] Epic

تعلقات ہمیشہ محبت اور سلوک کے رہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد اٹھارہ برس زندہ رہ کر ۱۹۰۱ء میں اس لائق بیوی نے انتقال کیا۔

شادی سے ڈوزی کے علمی اشغال میں کسی طرح کا فرق نہ آیا۔ شادی کرتے ہی کچھ زمانے تک میاں بیوی جرمنی میں رہے۔ یہاں شہر لیپزگ[۱] کے زمانہ قیام میں جرمنی کے مشہور و معروف مستشرق ہائنرک فلائشر[۲] سے ملاقات ہوئی اور اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً چالیس برس تک بہ استثنائے چند سال ان دونوں عالموں میں دوستی برقرار رہی ڈوزی جرمنی کے کتب خانوں میں بھی اُن عربی قلمی کتابوں کو جن سے بنو عباد اشبیلیہ کے حالات دریافت ہوں تلاش کرتا رہا۔

اس تلاش میں محنت کا اجر ڈوزی کو ایک غیر متوقع طریقہ پر ملا اور وہ اس طرح کہ گوتھا[۳] کے کتب خانہ میں عربی کا ایک قلمی نسخہ اس کی نظر سے گذرا۔ یہاں اس قلمی کتاب کو غلطی سے علامہ مقری کی تاریخ اندلس کا ایک حصہ سمجھ رکھا تھا حالانکہ وہ ایک حصہ ابن بسام کی کتاب الذخیرہ فی محاسن اہل الجزیرہ کا تھا اس کتاب پر ۱۱۰۹ء (۵۰۳ھ) درج ہے اس نسخہ میں ڈوزی کو ایک خط نقل کیا ہوا ملا۔ جو ایک شریف عرب نے روڈریگو لی کمپیا ڈور[۴] (لذارق طاغیہ القنبیطور[۵]) کے بارے میں لکھا تھا۔ اس شریف عرب کو روڈریگو نے جسے اہل سپین سِد[۶] کے لقب سے یاد کرتے ہیں بلنسیہ میں قید کر رکھا تھا۔ روڈریگو کی موت ۱۰۹۹ء میں ہو چکی تھی۔ ابن بسام کی تصنیف اس واقعہ سے صرف دس برس بعد کی ہے عیسائیوں کی کتابوں میں جس تصنیف میں روڈریگو کا سب سے پہلے ذکر ہوا ہے وہ ایک لاطینی مورخ کی لکھی ہوئی کتاب ہے جو جنوبی فرانس کا رہنے والا تھا یہ لاطینی کتاب ابن بسام کی کتاب الذخیرہ کے ۲۲ برس بعد کی لکھی ہوئی ہے۔ اس لیے ابن بسام کی کتاب کو

---

[۱] Leipsic

[۲] Heinrich

[۳] Gotha

[۴] Rodrigo le Campeador

[۵] عربی میں اس عیسائی کا نام اسی طرح آیا ہے compeador

[۶] Cid

تقدم و تقادم کی بنا پر حالات کو اور زیادہ صحیح طور پر درج کرنے کا موقع حاصل ہوا ہوگا۔ روڈریگو اسپینی عیسائیوں میں بڑا حامی نصرانیت اور مسلمانوں کا دشمن ہونے کی وجہ سے بڑا قابل عزت آدمی بلکہ اسپین کا سب سے بڑا عیسائی ہیرو مانا جاتا تھا۔ صدہا نظمیں اور گیت اس کے کاموں اور تعریفوں میں ملک میں رائج تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہوئے جو کہتے تھے کہ روڈریگو ایک فرضی ہیرو ہے۔ اس کا فی الحقیقت کبھی کوئی وجود نہ تھا۔

مسٹر۔ ایچ۔ ای۔ واٹس[1] لکھتے ہیں کہ ڈوزی کی اس تحقیقات نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر دیا کہ کمپیا ڈور (القنبیطور) واقعی ایک شخص گذرا ہے۔ ڈوزی نے خود بھی اس انکشاف کی اہمیت کو سمجھ لیا۔ اور اس کے متعلق اس نے اس قدر سرگرمی ظاہر کی کہ افسرانِ کتب خانہ نے اس قلمی نسخہ کو اسے گھر لے جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ اس کا اچھی طرح امتحان کرے۔ اس تاریخی انکشاف سے وہ زمانہ شروع ہو جاتا ہے جس میں ڈوزی کو مسلمانانِ اسپین کی تاریخ لکھنے کا شوق رہا۔

جرمنی سے لیڈن واپس آنے پر ڈوزی نے چند عربی قلمی کتابوں کو چندہ سے چھپوانے کا انتظام کیا۔ اس سلسلہ کی پہلی جلد ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کا نام رکھا گیا[2] ابن بدرون کی لکھی ہوئی شرح قصیدہ ابن عبدون پر۔ عربی متن کے ساتھ ایک مقدمہ۔ کچھ تعلیقات۔ مشکل الفاظ کی شرح اور ایک اشاریہ بھی چھاپا۔ تاریخی دلچسپی اس کتاب کو طبع کرنے میں یہ تھی کہ ابن بدرون بارھویں صدی عیسوی میں اشبیلیہ میں رہتے تھے۔ قصیدہ کا مضمون جس کی انھوں نے شرح لکھی خاندان بنی الافطس کا زوال تھا۔ جس کے پڑھنے سے زمانہ فتح کشی مرابطین کے حالات بھی بخوبی معلوم ہوتے تھے۔

اسی سال ڈوزی کو اجوتور انترپریتس لیگاتی وارنیریانی[3] مقرر کیا گیا۔ اور مشرقی قلمی

[1] Mr H-E Watts

[2] Commentair historique d' Ibn-Badroun sur le poeme d' Ibn Abdoun.

[3] Adjutor Interpretis legati Warneriani

کتابوں کی فہرست مرتب کرنے کا کام سپرد ہوا۔ اس کام کو اُس نے بڑی لیاقت سے انجام دیا ۱۸۴۷ء میں لندن کی ایک سوسائٹی نے جو مشرقی کتابوں کے چھاپنے اور شائع کرنے کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اپنے صرف سے انگریزی زبان میں ایک کتاب تاریخ الموحدین لعبدالواحد المراکشی شائع کی۔ اور کتاب کے شروع میں تاریخ اندلس کا خلاصہ عربوں کی فتح سے لے کر یوسف بن تاشفین کے زمانۂ حکومت تک درج کیا۔ جس میں کچھ حالات مرابطین کے بھی تھے جو موحدین سے پہلے گذرے تھے (اس کتاب کو عربی کا انگریزی ترجمہ سمجھنا چاہیئے) ڈوزی نے اصل عربی کتاب یعنی علامہ عبدالواحد المراکشی کی کتاب المعجب کتب خانہ لیڈن کے ایک نسخے کے مطابق چھپوائی۔ اسی سال ڈوزی نے عربی قلمی نسخوں کے متعلق خاص اطلاعوں۱ کے نام سے ایک کتاب کا پہلا حصہ چھپوایا۔ پوری کتاب ۱۸۵۱ء میں ختم ہوئی۔ ۱۸۴۸ء میں ابن العذاری کی کتاب البیان المغرب فی اخبار المغرب کی دونوں جلدیں چھپوائیں۔ ایک جلد افریقہ کے اور دوسری جلد اسپین کے حالات میں ہے۔ کتاب کے ساتھ ایک بڑا مقدمہ اور حواشی بھی اپنی طرف سے طبع کیے۔

ڈوزی عربی تاریخیں جس قدر زیادہ پڑھتا تھا اُسی قدر یقین ہوتا جاتا تھا کہ کوندے کی تاریخ اندلس میں جس کی تعریفیں تمام یورپ کر رہا ہے۔ بہت غلطیاں ہیں۔ آخر کار اس نے ارادہ کیا کہ کوندے کی غلطیوں کو ظاہر کرے۔ کیونکہ یہ ایک بڑی علمی خدمت ہوگی۔ کوندے کی ذات پر اب کوئی حملہ نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ۱۸۲۰ء میں اس کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس کے مرنے کے بعد اس کی تصنیف مکمل صورت میں شائع ہو کر تمام یورپ میں شہرت حاصل کر چکی تھی۔ ایسی کتاب میں غلطیاں نکالنی جسے یورپ مستند مان چکا ہو۔ آسان کام نہ تھا۔ منتقد کا فرض تھا کہ اس کام کے لیے پہلے سے پوری تیاری کرے۔ ڈوزی عربی تاریخوں کو پڑھنے کے بعد کئی مہینے تک عیسائی مورخوں کی تصانیف کے ایسے حصّے جن میں مسلمانوں کی فتوحات اسپین کا تذکرہ تھا۔ بنظر تحقیق پڑھتا رہا۔ جب دیکھا کہ حملے کے لیے ضروری سامان بہم پہنچ گیا ہے تو ایک کتاب "تمدن عیسوی کے شیوع سے قبل اسلامی ادبیات کے اسباب

۱. Notices sur quelques manuscrits arabes

الخطاط کے نام سے شائع کی۔ اِس کتاب نے کوندے کی تعریف کرنے والوں کے ہوش پرّان کر دیے۔ یوں تو ڈوزی کی عادت تھی۔ بالخصوص شروع زمانہ میں کہ فریق مقابل پر بڑی ہی سختی و دریدہ دہنی سے اعتراض کے تیر اس ظلم اور بیرحمی سے چلائے کہ کبھی پہلے ایسا نہ کیا تھا۔ کوندے کی نسبت لکھا کہ "الف۔ بے۔ تے۔ کے سوا عربی سے جس قدر واقفیت اس مصنف کو تھی وہ برائے نام تھی۔ اُس نے واقعات کے قلیل ترین علم پر خیال آفرینی کی مدد سے جو واقعی درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی خوب رنگ آمیزی کی۔ ہزارہا واقعات اور صدہا سنیں اپنی طرف سے گھڑ کر لکھ دیئے اور ظاہر ہمیشہ یہی کیا کہ عربی کتابوں کا ترجمہ نہایت صحت اور درستی کے ساتھ کر رہا ہے۔ حیرت کا مقام یہ ہے کہ یورپ کے بڑے بڑے جیّد مستشرقین بھی دھوکے میں آ گئے اور اس شعلۂ شیطانی کو چراغِ ہدایت سمجھ کر اس کی طرف بڑھے"۔

اسپینی مؤرخ کوندے پر ڈوزی کے اعتراضات اُن مبصروں نے تسلیم کر لیے جو اس مضمون پر رائے قائم کرنے کا حق رکھتے تھے۔ غرض جس بُت کی اب تک پرستش ہو رہی تھی اُسے خود پرستش کرنے والوں ہی نے گرا کر پامال کر ڈالا۔ فرانس کے مشہور عالم ارنسٹ رینان[۳] نے ایک مضمون میں جو جرنل دی دیباٹ[۴] میں چھپا تھا۔ ڈوزی کے اعتراضات کو تسلیم کر کے کوندے کی نسبت یہ سخت جملے لکھے ہیں "کوندے کی تاریخ میں غلطیوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ مہمل اور غلط عبارتیں بھری پڑی ہیں۔ ایک ایک آدمی سے دو دو بلکہ تین تین آدمی بنا ڈالے ہیں۔ کہیں ایک آدمی دو دفعہ مرا ہے اور کہیں پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گیا ہے۔ عربی کے مصادر بڑے بڑے آباد شہروں کے نام

---

[۱] Recherches sur l' histoire politique et litteraire de l'Espagne pendant le moyen age

[۲] اسپین کے پرانے پادری مورخوں نے مسلمانوں کے حالات لکھنے میں جس قدر دھوکہ مکاری تعصب اور دروغگوئی سے کام لیا ہے اسکو ڈوزی نے طشت ازبام کر دیا ہے انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا میں دیکھیے "ڈوزی" (مترجم اردو)

[۳] Ernest Renan [۴] Journal des Debats.

ہوگئے ہیں اور ایسے لوگ جنھوں نے کبھی دنیا میں قدم نہ رکھا تھا۔ بڑے بڑے فرضی کام
کر گئے ہیں۔ ابن الابار کی تاریخِ رجال سے کوندے نے استفادہ کیا۔ اتفاق سے جلد
ساز نے جلد بنانے میں چند اوراق غلط جگہ باندھ دیے۔ اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھی
اور پانچویں صدی ہجری کے لوگوں کے حالاتِ زندگی میں خلط ملط ہوگیا۔ مگر کوندے کا یہ کمال
دیکھیے کہ طرح طرح کے عجیب و غریب جھوٹے قصے اپنی طرف سے جوڑ کر سب باتوں کو
ٹھیک بٹھاتا ہوا اس غلفشار سے خوش خوش باہر نکل آیا۔"

لیکن عدالت کے سامنے کوندے کا وکیل چند واقعات اپنے بدقسمت موکل کی صفائی
میں ایسے پیش کر سکتا ہے جو معذرت میں قبول کیے جانے کے قابل ہیں۔ کوندے اسپین
کا باشندہ تھا۔ جب بادشاہ فرانس نے (جو اسپین کا دشمن تھا) کوندے کو اپنے دربار میں
ترجمان مقرر کیا۔ تو اسپین کے لوگوں نے اس ہم وطن کو دغاباز اور اپنا دشمن سمجھ لیا۔ بادشاہ
اسپین فردیننڈ[1] ہفتم کی گورنمنٹ نے اُسے جلاوطن کر دیا۔ اسپین کی اکادمی کی رکنیت سے
اُسے خارج کر کے نام فہرست سے چھیل دیا گیا۔ شاہ فرانس کی ترجمانی سے پیشتر کوندے
کتب خانہ اسکوریال[2] کا محافظ تھا۔ اس عہدے سے بھی وہ برطرف کیا گیا۔ کتب خانے
سے اُس کے نام عربی کتابوں کا اجرا بند کر دیا گیا۔ آخر کار ۱۸۱۳ء میں ترکِ وطن کر کے فرانس
میں آباد ہوا۔ لیکن جب اسپین میں واپس آیا تو ۱۸۱۶ء تک اس دارالحکومت یعنی شہر مجریط
میں داخل ہونے کی اجازت نہ ملی۔ اُس کے چار برس بعد ۱۸۲۰ء میں نہایت مفلسی کی حالت
میں انتقال کیا۔ تنگ دستی اس درجے کی تھی کہ اگر کچھ دوست اُس وقت موجود نہ ہوتے
تو میت کی تجہیز و تکفین شریفوں کی طرح نہ ہو سکتی۔ کوندے تاریخ اندلس کے صرف پہلے
حصے کو اپنی زندگی میں درست کرنے پایا تھا۔ مرنے کے بعد ڈون ژوان تینوتہ نے
اُس کے مسودے سے پوری کتاب طبع کرائی۔ لیکن ژوان تینو[3] مشکل سے ایسے کام

---

[1] Ferdinand VII

[2] Escorial.

[3] Don Juan Tineo.

کے لیے موزوں کہا جا سکتا تھا۔ ایک امریکانی مصنف نے جب ادبیات اسپین پر کتاب لکھی تو اس کے دیباچے میں کونڈے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "وہ ایک گوشہ نشین شریف اور شرمیلا عالم ہے جو جلاوطنی کی مصیبتیں اٹھاکر اب قابل عزت افلاس میں مبتلا ہے"

لیکن لیڈن کے عالم کے خیال میں (جو خوشحال اور خوش نصیب تھا) کونڈے کی یہ مصیبتیں خود آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈوزی کے نزدیک فن تاریخ میں عدم صحت ایک جرم اور غلط گو بس ایک مجرم کے برابر تھا۔

حال میں کچھ مدت سے کونڈے کی غلط بیانیوں کی نسبت کسی قدر رعایت ظاہر کی جانے لگی ہے۔ اور بہر کیف یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یورپ میں اندلس کی تاریخ پر سب سے پہلے جس نے تفصیل و بسط کے ساتھ قلم اٹھایا وہ کونڈے ہی تھا۔ اور گو اس دشوار کام کے لیے اس نے کافی سامان بہم نہ پہنچایا ہو۔ مگر باوجود اس کے تحقیق و تلاش میں اس نے پوری جاں فشانی کی مسٹر اسٹینلے لین پول نے جن الفاظ میں اس کی نسبت رائے ظاہر کی ہے۔ اس کی حد سے آگے اب کوئی نہیں بڑھ سکتا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "کونڈے کی تاریخ اسپین ادبی لحاظ سے بڑے پائے کی تصنیف ہے لیکن تاریخی وقعت کچھ نہیں رکھتی۔ بلکہ وہ اُن غلطیوں کا سرچشمہ بن گئی جو اس مضمون پر بعد کی تصانیف میں ظاہر ہوتی رہیں" خلاصہ یہ کہ کونڈے کی تصنیف کو اگر لوگ محض ایک خاکہ اندلس میں مسلمانوں کی حکومت کا سمجھتے اور معلوم کر لیتے کہ اس میں تصحیح کی بہت ضرورت ہے تو آئندہ دھوکے میں نہ پڑتے لیکن ایسے لوگوں نے جن میں کتاب کو اس کے اصلی ماخذوں سے مقابلہ کرنے کی لیاقت نہ تھی۔ اُسے ایک بڑی عالمانہ تصنیف تسلیم کر لیا۔ اور یہی غلط خیال اس امر کا باعث ہو گیا کہ اسپین کی تاریخ پر جو کتابیں آئندہ لکھی گئیں انھوں نے کونڈے کی تصنیف سے استفادہ کیا۔ اور اس طرح ان کی کتابوں میں بھی کثرت سے غلطیاں پیدا ہو گئیں۔

بہرحال صرف کونڈے ہی ایک ایسا مورخ نہ تھا جس پر ڈوزی نے اپنی کتاب "تحقیقات[1]" میں سختی سے اعتراض کیے ہوں۔ بلکہ ایک دوسرے مورخ پر بھی خوب ہاتھ

---

[1] Recherches

خلاف کیا ہے۔ دون پاسکل دی گیانگوس[1]۔ ڈوزی کا دوست تھا۔ اُس نے علامہ مقری کی کتاب نفح الطیب کے چند اجزا کا ترجمہ انگریزی میں ۱۸۴۳ء[2] میں لندن سے شائع کیا تھا۔ ڈوزی نے اس دوست کی بھی بری طرح خبر لی۔ لیکن یہاں ڈوزی کی سختی اور سخت کلامی قابلِ معافی تھی یہ درست ہے کہ پاسکل کا ترجمہ غلطیوں سے پاک نہیں۔ لیکن باوجود خامیوں کے اس کی کتاب تاریخ کے ایسے طلبہ کے لیے جو عربی زبان سے ناواقف ہوں۔ بڑی کارآمد تصنیف ہے اور جو حواشی اور تعلیقات اس نے اپنے ترجمہ میں بکثرت لکھے ہیں۔ وہ بقول مسٹر لین پول ایسے ہیں کہ اُن کے برابر مفید معلومات کسی اور کتاب سے حاصل نہیں ہو سکتیں۔ یہاں یہ بات کچھ بے موقع نہ ہوگی کہ اسپین کے عالموں نے ڈوزی کی اس حرکت کا کہ اس نے ایک اسپینی مؤرخ پر سخت اعتراضات کیے تھے۔ کچھ بُرا نہ مانا۔ اور ۱۸۵۱ء میں مجریط کی بزمِ تاریخ[3] کا اُسے ایک رکن مقرر کر دیا۔ ۱۸۵۳ء میں ڈوزی کو اسپین کی گورنمنٹ کی طرف سے "کمانڈر آف دی آرڈر آف چارلس سوم[4]" کا خطاب عطا ہوا۔

اس کے دس برس بعد کتاب "تحقیقات" کے دوسرے حصّے کے لیے مواد جمع ہو گیا چونکہ اس کتاب کے پہلے اڈیشن کے نسخے اب باقی نہ تھے۔ اس لیے دوسرے حصّے کیساتھ پہلے حصّے کو بھی شامل کر کے طبع کرایا۔ اس ترمیم شدہ اڈیشن کے مقدمہ کا مضمون جو پہلے تھا وہی اس مرتبہ بھی قائم رکھا۔ لیکن اسکے ایسے اجزا کو نکال دیا۔ جس کے اعادہ کا اب وقت نہ تھا۔ اس کے دو بڑے سبب تھے۔ ایک تو جیسا کہ ڈوزی نے لکھا ہے۔ یہ تھا کہ کونڈے پر جو اعتراضات کیے گئے تھے وہ سب تیر بہدف ہو کر اپنا کام کر چکے تھے۔ اور اب اُن کے تکرار کی ضرورت نہ تھی۔ دوسرے جو اعتراضات دون پاسکل پر پہلے مقدمہ میں کیے تھے۔ ان کی سختی پر دل گرفتہ ہوا اور اُن کو بھی اس نئے اڈیشن سے خارج کر دیا۔

۱۔ Don pascual de Gayangos.

۲۔ History of the Mohammedan Dynasties in Spain

۳۔ Academy of History, Madrid.

۴۔ Commander of the Order of Charles III.

۱۸۵۰ء میں پروفیسر پیرل کامپ[1] کے مستعفی ہونے پر یونیورسٹی میں پروفیسر تاریخ کی جگہ خالی ہوئی اور ڈوزی اس جگہ پر مقرر کر دیئے گئے لیکن جس دن مقرر ہوئے اُسی دن ایک سخت حادثہ پیش آیا یعنی ان کے ایک کم سن لڑکے نے جس سے ماں باپ کو بہت محبت تھی انتقال کیا۔

تاریخ کی پروفیسری نے ڈوزی کے علمی مشاغل کو ایک دوسری راہ پر ڈال کر نظر بہت وسیع کر دی۔ تاریخ اندلس جیسی بے مثل کتاب لکھنے کے لیے جس نے گیارہ برس کے بعد اپنی صورت دکھائی اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ شروع میں زیادہ تر وقت پروفیسری کی خدمات ادا کرنے میں صرف ہوا لوگوں کی زبان پر یہ بات رہا کرتی تھی کہ پروفیسر ایسے بھی ہوا کرتے ہیں جو لکچر دینے کو ایک آزار سمجھ کر سرسری طور پر اس خدمت کو انجام دینا کافی سمجھتے ہیں۔ لیکن ڈوزی اپنے فرائض منصبی کو جس قدر اہم سمجھتا تھا اس کا اندازہ اس کے ایک خط سے ہو سکتا ہے جو ایم۔ دی وریز[2] کو اپنے تقرر کے پہلے سال میں اس نے لکھا تھا۔ اس خط کا مضمون ایک جگہ یہ تھا کہ "بڑی تعطیل میں مجھے امید ہے کہ سویڈن[3] اور آئس لینڈ[4] کی زبانیں سیکھ لونگا۔ تاریخ کی کتابیں مطالعہ کرنے کے لیے ڈینش[5] زبان مجھے کافی طور پر آگئی ہے۔ کیونکہ سال آیندہ یورپ کی قوم نارمن[6] پر لکچر دینا چاہتا ہوں"۔

یہ واقعہ ہے کہ پروفیسر ڈوزی ہر سال اپنے لکچروں کے لیے ایک نیا مضمون تجویز کیا کرتے تھے اور ان کا مقصد ہمیشہ یہ رہتا تھا کہ اپنے شاگردوں میں تاریخ کا نہایت صحیح مذاق پیدا کر دیں۔ غیر معمولی حافظے اور کتب بینی کی کثرت نے ان کے ہر علمی مشغلے میں سہولت پیدا کر دی تھی۔

---

[1] Peerlkamp.

[2] M. de Vries.

[3] Sweden.

[4] Iceland.

[5] Danish.

[6] Narman

۱۸۵۲ء سے لے کر پانچ یا چھ برس تک پروفیسر ڈوزی اور ان کے ساتھ تین اور بڑے عالم یعنی - جی - ڈگٹ[1] - ایل - کریل[2] - اور کیمبرج والے - ڈبلیو رائٹ[3] - اس مفید کام میں مصروف ہوئے کہ علامہ مقری کی کتاب نفح الطیب کو عربی میں طبع کرا کے شائع کریں - یہ مشہور و معروف تصنیف جو سترھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی - اسپین اسلامیہ کی ادبی تاریخ میں بڑی مستند کتاب تھی - دراصل وہ غرناطہ کے مشہور وزیر لسان الدین ابن الخطیب کی سیرت پر لکھی گئی تھی - لیکن مقدمۂ کتاب میں مصنف نے ادبی و سیاسی معاملات کے متعلق بھی معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ جمع کر دیا تھا - کتاب کے اسی مقدمہ کو پروفیسر ڈوزی اور اس کے ساتھیوں نے پانچ حصوں میں شائع کیا اور کتاب کا نام منتخبات از تاریخ و ادبیات اعراب اندلس[4] رکھا (۱۸۵۵ء - ۱۸۶۱ء)

کو ندے پر ڈوزی کا حملہ فی الواقع تاریخ کے طلبہ کے حق میں ایک بڑا مفید کام تھا لیکن یہ کام صرف اس حد تک تھا کہ ایک بنی بنائی عمارت کو ڈھا دیا تھا - ڈوزی کے اعتراضوں نے ایک دھوکے میں ڈالنے والی تصویر کو مٹا ضرور دیا مگر وصلی کوری رہ گئی - اب اس مٹی ہوئی تصویر کی جگہ دوسری صحیح تصویر یا اور پائیدار عمارت بنانے کا کام ڈوزی نے اپنے ذمہ لیا - برسوں وہ اسی شغل میں بڑی کاوش اور محنت کے ساتھ مصروف رہے - وہ اس کام کو ایک بڑے قرضے کا ادا کرنا سمجھتے تھے - مگر اس سخت ریاضت کے زمانہ میں بھی علاوہ نفح الطیب کے اڈیشن کے چند مضامین جو دی گدز (ایمسٹرڈم)[5] کے رسالے میں چھپے - ڈوزی کے ان مضامین کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ آہنگر کی سندان سے چنگاریاں اڑی ہیں - ان میں ایک مضمون سترھویں صدی میں روس کی حالت پر - اور ایک چارلس سوم کے زمانۂ حکومت اسپین

---

۱ G. Dugat. ۲ L. Krehl.

۳ W. Wright

۴ Analectes sur l' Histoire et la litterature des Arabes d' Espagne.

۵ De Gids (Amsterdam)

پر تھا۔ کبھی کبھی کوئی مضمون سیاسیات وقت پر بھی شائع ہوتا رہا۔

آخر کار تاریخ اسپین کا مشکل کام ڈوزی نے ختم کر لیا۔ اور ۱۸۶۱ء میں ایک کتاب "تاریخ مسلمانان اسپین از فتح اندلس تا زمانہ حکومت مرابطین"[۱] کے نام سے چار جلدوں میں شائع کی یہ تصنیف فرانسیسی زبان میں تھی اور اس وقت جو کتاب پیش کی جاتی ہے۔ وہ اس کا انگریزی ترجمہ ہے۔

چاروں جلدوں میں تاریخ اسپین کی چار بڑی تقسیموں سے مطابقت بڑی ذہانت سے قائم کی ہے۔ گر یہ تقسیمیں ایسی ہیں کہ ایک حصے کے واقعات کی تکرار دوسرے حصے میں ضروری ہو جاتی ہے وقت کی ترتیب کا لحاظ کرنے میں ایک واقعہ کے اجزا پراگندہ ہو جاتے ہیں اور پورا واقعہ بخوبی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے ایک ایک واقعہ کو پورے طور پر ایک ہی جگہ بیان کیا ہے تاکہ پیچیدگی نہ پیدا ہو۔

جس تاریخی مواد سے مؤرخ کو بحث ہے وہ بہت پیچ در پیچ اور مختلف الانواع ہے واقعات جنھیں بیان کیا ہے وہ مختصر طور پر اس طرح سمجھ میں آ سکتے ہیں۔

اسپین شروع میں سلطنت روما کا ایک حصہ تھا۔ جس وقت روما کی شہنشاہی کا زوال شروع ہوا تو واندل[۲]۔ سوئیوی[۳]۔ الانی[۴]۔ اور سب کے اخیر میں فسیقوط[۵] نے اسپین پر یورشیں کیں جو جلد جلد یکے بعد دیگرے پیش آئیں۔ ہر یورش نے اسپین کے رہنے والوں میں اپنی کچھ نشانیاں چھوڑیں۔ لیکن فسیقوط کی حکومت دیرپا ثابت ہوئی یہ حکومت دو سو برس تک قائم رہی۔ اس مدت میں فسیقوط بھی شروع میں سیدھے سادے جفاکش فاتح تھے۔ اُنھی اسباب و علل کے باعث کمزور و ناکارہ ہو گئے۔ جنھوں نے ان سے پہلے رومانی فاتحوں کو معرض زوال میں ڈالا تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں اسپین پر ایک نیا حملہ ہوا۔ آبنائے جبرالٹر کے اس پار سے ایک گروہ عظیم۔ عرب۔ شام

---

۱ Histoire des Musulmans d'Espagne jusqu'a la Conquete de l'Andalousie par les Almoravides

۲ Vandals. ۴ Alans

۳ Suevi ۵ Visigoths

مصر و شمالی افریقہ سے سیاہ رنگ کے لڑنے والوں کا اُٹھا اور اسپین آسانی سے انکا شکار ہو گیا۔ مسلمان جو جوش مذہب اور شوق ملک گیری میں سرشار تمام جزیرہ نمائے اسپین پر سوائے ایسے حصّے کے جو بالکل شمال میں تھا پھیل گئے۔ بلکہ سلسلۂ جبال پائی رینیز[۱] البرانس) سے گذر کر انھوں نے تمام مغربی یورپ کو فتح کرنے کا قصد کیا تھا کہ فرانس میں مقام تور[۲] پر عیسائیوں کی عظیم الشان فتح نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔

مغربی یورپ میں تو ترقی مسدود ہوئی لیکن اسپین میں مسلمانوں کے قدم جم گئے اور انھوں نے اس ملک میں وہ تمدن پیدا کیا جو یورپ کے اُس وقت کے تمدنوں میں سب سے اعلیٰ و افضل تھا۔ یہ سچ ہے کہ چارلس مارٹل[۳] نے مسلمانوں کو فرانس نہ فتح کرنے دیا۔ لیکن مسلمانوں کو شکست دے کر اس بات کا موقع دیا کہ وہ اسپین میں اپنی حکومت بخوبی مستحکم کرلیں۔

مسلمانوں کی سلطنت اسپین کو خاک میں ملا دینا باہر کے دشمنوں کا کام نہ تھا۔ بلکہ یہ محض اندرونی خرابیاں تھیں جنھوں نے اتنی بڑی سلطنت کو غارت کردیا۔ مسلمان فاتح جب سے اسپین میں داخل ہوئے تھے اسی وقت سے زوال کی صورتیں ان میں مضمر تھیں صدہا برس پہلے عرب کے ریگستانوں میں قبیلوں میں نزاعات رہ چکے تھے۔ چونکہ ان نزاعات کی کسی کو کوئی وجہ معلوم نہ تھی۔ اس لیے وہ ختم ہونا بھی نہ جانتے تھے۔ یہ آپس کی سخت عداوتیں نجد کے خشک پہاڑوں اور یمن کی زمین سے وادی الکبیر اور وادیلئے ابرہ کو منتقل ہو گئیں۔ اور انہی آپس کی عداوتوں نے مغربی یورپ کو مسلمانوں کے قبضے سے بچا دیا۔

ان نزاعات کا جہاں سے وہ شروع ہوئے تھے سراغ لگا کر ان کے حسرتناک نتائج تک پہنچنا۔ مسلمانوں کے خلاف عیسائی راہبوں کے جوش مذہب کی کیفیت خود مسلمانوں میں خوارج کے تعصب اور فلسفی مزاج عربوں کی شک پرستی کا حال۔ بربر اور بدوی عربوں کی

---

۱ The pyrenees.

۲ Tours.

۳ Charles Martel (the Hammer)

آپس کی لڑائیاں۔ عیسائی ریاستوں کے باہمی نزاعات ایسی حالت میں بھی کہ سب کا یکساں دشمن سب کے سر پر کھڑا ہو۔ یہ کل باتیں بیان کرنی مصنف نے اپنے ذمہ لی ہیں تاکہ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ اسپین کے پیچیدہ حالات صاف طور پر ظاہر کر دیئے جائیں۔ اس زمانے کے الجھے ہوئے تاریخی واقعات کو سلجھا دینا ڈوزی کی محنت کا ثمرہ ہے۔ کتابِ اوّل میں اعراب قبل از اسلام کے خصائل کا مرقع بہت واضح طریقے سے تیار کیا ہے۔ یمانیہ اور معدیکی خونی نزاعوں کا تذکرہ کیا ہے۔ پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور اسلامی سلطنت کے جلد پھیلنے کے حالات درج کیے ہیں۔ عرب اور بربر کا اسپین پر قبضہ کرنا اور ان دونوں قوموں میں رقابتوں کے پیدا ہونے کی پوری کیفیت لکھی ہے۔ کتاب ثانی میں شروع کا حصہ مفتوحہ قوم (عیسائیوں) کے ذکر میں ہے۔ یہاں ہم قسیقوط کے دورِ حکومت میں پہنچتے ہیں۔ مصنف نے عربوں کی فتح کا حال ایک دوسرے پہلو سے بیان کیا ہے ملک میں اُن کے مستقل طور پر آباد ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ملک کے عیسائیوں کی کوششیں اور ایسے عیسائیوں کی کوششیں جو عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی حکومت مٹا کر آزاد ہو جائیں بیان کی ہیں۔ قرطبہ کے پادری شہیدوں کا حیرت انگیز حال لکھا ہے۔ اخیر خلیفہ عبدالرحمٰن ثالث کا ذکر ہے کہ وہ کس طرح اندلس میں سب سے بڑی قوت ہو گئے۔ کتاب ثالث میں اسپین کے تاریخی حالات خلافتِ بنی اُمیہ کے زمانے کے تحریر کیے ہیں۔ عالم و فاضل خلیفہ الحکم ثانی المستنصر باللہ کے بعد اُن کے فرزند ہشام (المؤید) کم سنی میں باپ کے جانشین ہوئے۔ مگر جملہ امورِ سلطنت اُن کے حاجب ابن ابی عامر المنصور کے قبضے میں آ گئے اور المنصور سلطنت میں مختارِ کُل ہو گئے۔ المنصور کی تدابیرِ سلطنت۔ شمالی اسپین کے عیسائیوں سے ان کی لڑائیاں اور فتوحات سات فصلوں میں نہایت واضح اور روشن طور پر بیان کی ہیں۔ باقی کتاب میں ایسے خلفائے اسپین کا تذکرہ ہے جن کی حکومت المنصور کے انتقال کے بعد چند روزہ رہی۔ ان بیانات میں ہم ۱۰۳۱ء تک پہنچ جاتے ہیں۔ کتاب رابع میں جو اس تصنیف کا آخری حصہ ہے چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور ملوک الطوائف کی پریشان اور پیچیدہ تاریخ کو جو خلافت بنی اُمیہ کے انقراض

کے بعد وقوع میں آئی۔ بڑی محنت سے صاف کیا ہے۔ مختلف قبائل میں رشک و حسد کا پیدا ہو جانا مسلمانوں کی قوت کا جلد اور لازمی زوال۔ مرابطین کو افریقہ سے اسپین میں بلانا افریقیوں کا حملوں اور اس کے ضروری نتیجے نہایت واضح طور پر بیان کیے ہیں۔ آخیر میں معتمد بادشاہِ اشبیلیہ کے عجیب وغریب سوانح ہیں۔ جن کی نسبت ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں کہ "معتمد کے حالات پڑھ کر جو عبرت ہوتی ہے اس پر الف لیلہ کا یہ فقرہ جو اس میں بار بار آتا ہے۔ یاد آجاتا ہے کہ عبرت حاصل کریں جو عبرت حاصل کرنی چاہیں ایسی کہ گویا دیکھا نہیں بلکہ کسی نے سوئیوں سے آنکھوں میں گود دیا ہے" (لَوْ كُتِبَ بِالْإِبَرِ عَلَى أَعْمَاقِ الْبَصَرِ لَكَانَ عِبْرَةً لِمَنِ اعْتَبَرَ)

ڈوزی کی یہ بلند پایہ تصنیف ایسی ہے کہ تاریخ ادب میں کوئی کتاب اس کے درجے کو نہیں پہنچتی۔ ایک بڑے عالم نے جو ایسی تصانیف کا بہترین مبصر کیا جاسکتا ہے لکھا ہے کہ یہ کتاب بڑی ذہانت اور گہری نظر سے ایسی لکھی گئی ہے جو انسان کے ادبی اور تاریخی احساس کو خوش اور محظوظ کرتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے مبصر و منتقد پہلے بھی گذرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جو تاریخی واقعیت اور ادبی رنگ آمیزی کو مربوط کر دینے کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ وہ اس طرز تحریر کو گوارا نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ "ہمارے سامنے صحیح صحیح واقعات بے کم و کاست پیش کر دو۔ الفاظ کی مینا کاری ہمیں درکار نہیں۔ مؤرخ کا فرض عین یہی ہے کہ تاریخ لکھتے وقت اپنی ہستی کو فراموش کر دے۔ مؤرخ کا کام یہ ہے کہ طالب علم کو کثرت سے اینٹیں دے دے اور معماری کا کام اسے خود کرنے دے۔" اس مسئلہ پر زیادہ بحث کرنے کا یہ موقع نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ پروفیسر ڈوزی اپنا فرض یہ نہ سمجھتے تھے۔

اس کے برعکس پروفیسر ڈوزی کو ادبی تعمیر میں بیحد خوشی ہوتی تھی اور اس کام میں ان کو ایک خاص لطف آتا تھا کہ جب ایک عمارت تیار ہو جائے تو جس قدر سامان عمارت کی پاڑ باندھنے میں کام میں لایا گیا ہے وہ سامنے سے ہٹا دیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عمارت کا حسن بہت خفیف طور پر اس محنت و مشقت کی طرف اشارہ کر سکتا ہے جس سے

اس کی تعمیر میں مال مصالحہ تلاش کر کے فراہم کیا گیا تھا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک ایسا طالب علم جسے غور کرنے اور سوچنے کی عادت نہ ہو۔ وہ مصنف کے طرز بیان میں سوانی و سلاست دیکھ کر مصنف کے کام کو ایک سطحی چیز سمجھے گا۔ یہ قصور حقیقت میں پڑھنے والے کا ہوگا لیکن یہ قصور ایک طور پر قابلِ معافی بھی ہوگا۔ کیونکہ جب ہموار زمین پر کسی بڑے دریا کی روانی کی تعریف کی جاتی ہے تو ذہن میں وہ پہاڑ اور چٹانیں اور صدہا رکاوٹیں نہیں ہوتیں جنھیں ٹکراتا ہوا اور رستہ نکالتا ہوا یہ دریا یہاں تک پہنچا ہے۔ اور اس سے بھی کم خیال اُن معاون نالوں اور ندیوں کا ہوتا ہے جنھوں نے شامل ہو کر دریا کی شان میں عظمت پیدا کی ہے پروفیسر ڈوزی اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ بعض وقت ہفتوں کی محنت کے ثمرے کو کتاب کے صرف ایک فقرے میں جگہ مل سکی ہے۔ بعض وقت اتنا بھی نہیں ہوا اور مدّت کی محنت اور عرق ریزی کے بعد معلوم ہوا کہ جو باتیں دریافت کر لی ہیں وہ درج نہیں کی جا سکتیں۔ کیونکہ جس ترکیب پر کتاب لکھنے کا قصد کیا ہے اُس میں اُن کا محل نہیں۔

یورپ کے لوگوں نے اِس کتاب پر یہ اعتراض کیا ہے کہ مصنف نے عربی کتابوں سے مضامین اخذ کیے ہیں۔ اِس اعتراض کا جواب ظاہر ہے۔ مصنف عربی کتابوں سے مدد لینے پر یوں مجبور ہوا کہ کسی اور ذریعۂ معلومات سے اس کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔ کوئی ماخذ ایسا نہ تھا جس میں ڈوزی نے پوری تلاش و تحقیق نہ کی ہو۔ اسپین کے عہد نویس عیسائی مورخوں کی کتابوں میں اسلامی حکومت کے متعلق واقعات بہت کم بیان ہوئے تھے۔ مگر ڈوزی نے جہاں تک ممکن تھا اُن سے بھی مدد لی۔ چنانچہ کتاب کے آخر میں ان کتابوں کی فہرست دی ہوئی ہے جنھیں مصنف نے پڑھا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ عیسائی مورخوں میں بھی کوئی ایسا نہ تھا جس کی تصنیفات کو مصنف نے دیکھا اور پڑھا نہ ہو۔ پادری مورخوں میں باجہ کے عایسیدور[1] اور ظلمنکہ کے سبستیان[2] سیلوس[3] اور البیلدا[4] البیضاء کے راہبوں کی تصنیفات

[1] Isidorus pacenesis

[2] Sebastain of Salamanca

[3] Silos

[4] Albelde

کے اجزا اور بیسیوں ایسے ہی اور مضمونوں کے حوالے اکثر اور مودب طریقے سے دیئے ہیں۔ پرانے عیسائی مورخین کی کتابیں معلومات کے اعتبار سے بالکل بنجر زمین ہیں ان کا مقابلہ عربوں کے بیانات سے نہیں ہو سکتا جو وافر و کثیر حسن و خوبی اور اصلیت سے مملو ہیں۔ اگر عربی تصنیفات سے مصنف نے خوشہ چینی کی تو اس کا الزام مصنف پر نہیں بلکہ اُن مسیحی راہبوں پر عائد ہوتا ہے جنھوں نے اپنے تاریک اور طوفانی زمانے میں علم کی دھیمی دھیمی جلتی ہوئی شمع کو روشن رکھنے میں حتی الامکان کوشش کی تھی۔

وہ مُورخ بھی جو تاریخ میں بالکل سائنٹفک طریقے کو پسند کرتے ہیں ان لطائف و ظرائف کو بہ نظرِ تحقیر نہیں دیکھ سکتے۔ جو عربی مورخوں اور عربی شاعروں کی عبارتوں سے لے کر ڈوزی نے اپنی کتاب میں بجنسہٖ لکھے ہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کے بیان میں تخیل اور تصور نے اپنی طرف سے کچھ رنگ بھلا ہو۔ مگر اس موقع پر وہ نصیحت جو مُورخ ساودی[1] نے اپنے بھائی کو کی تھی یاد رکھنی چاہیئے ساودی کے بھائی کا ارادہ صلیبی لڑائیوں پر ایک کتاب لکھنے کا تھا ساودی نے اُسے نصیحت کی کہ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں نہ چھوڑنا جن سے کسی سرگذشت کے بیان میں جان پڑ جاتی ہے۔ قدیم رسم و رواج۔ اہلِ سلف کے خیالات اور پرانا زمانہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے "

خیال ہو سکتا تھا کہ ایسے پایہ کی کتاب جو تحقیق اور قوتِ بیان میں اعلیٰ ترین درجہ رکھتی ہے بہت جلد مقبول ہو جائے گی اور بزم مورخین میں اُس کے مصنف کو بہت بڑا رتبہ مل جائے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ولندستان میں اُس کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ نہ وہ مقبول ہوئی اور نہ علمائے وقت نے اس کی کچھ تعریف کی۔ اس عجیب و غریب بے توجہی کا سبب بیان کرنا دشوار نہیں۔ ڈوزی کی تاریخ اسپین شائع ہونے کے دو برس بعد رسالہ دی گذریں پروفیسر ویتھ[2] نے اس پر ایک معقول تبصرہ لکھا اور ایک طول طویل انتقاد کے بعد کتاب کے نامقبول ہونے کی وجہ بیان کی۔ کتاب کی تعریف جہاں تک ممکن تھا کی۔ اور مصنف کی محنت و جانفشانی اور فنِ تاریخ میں

---

[1] Sonthey

[2] Professor Veth.

اُس کی اعلیٰ قابلیت کی داد دی - اور ناظرین کو بتایا کہ تاریخ اندلس پر اب تک جو کچھ لکھا گیا تھا اُس سب کو مٹا کر مصنف نے از سرِ نو تحقیقات کر کے یہ کتاب لکھی ہے - اس کے بعد اپنی رائے لکھی کہ اگر یہ کتاب ڈچ زبان میں لکھی جاتی تو قوم اس کو اپنی ادبیات کا اعلیٰ ترین نمونہ تسلیم کر کے فوراً اس کا خیر مقدم کرتی۔

غرض کتاب کے نامقبول ہونے کی وجہ بیان کر کے پروفیسر ونیتھ صاف صاف لکھ گیا ہے کہ ایک ڈچ یعنی ولندیزی کی ایسی اچھی کتاب کا کسی غیر ملک کی زبان میں لکھا جانا ایسی بات تھی جس کو تمام اہل وطن نے حُبِ وطن کے قواعد کے خلاف سمجھا - ایک قلیل التعداد مگر مغرور اور خوددار قوم کا ایسی شکایت کرنا بالکل قدرتی اور قابل معافی تھا ۔ مشہور ہے کہ گبن نے اپنی مشہور تصنیف "انحطاط و زوال سلطنتِ روما"ل فرانسیسی زبان میں لکھنی چاہی تھی اگر فرانسیسی میں گبن اپنی کتاب لکھتا تو بلاشبہ وہ انگلستان میں مقبول نہ ہوتی لیکن ڈوزی کو جو مشکل پیدا ہوئی تھی وہ بھی ظاہر ہے ۔ اگر ڈچ زبان میں وہ اپنی کتاب لکھتا تو ولندستان کے چھوٹے سے ملک میں اس کی تعریف و توصیف خواہ کتنی ہی ہوتی مگر باقی یورپ اُس سے ناآشنا رہتا - ڈوزی کو اِس کا علم تھا کہ تقریباً تمام تعلیم یافتہ ولندیزی فرانسیسی زبان میں ملکہ رکھتے ہیں اور اسی بنا پر اُس نے اپنی کتاب فرنچ میں لکھی ۔ مگر اس نے اس بات کا بہت کم اندازہ کیا کہ خود اُس کی اپنی قوم والے اس بات سے کتنا برا مانیں گے ۔ اگر سَو برس پہلے یہ کتاب لکھی جاتی تو اس کی زبان پڑھنے والوں کی آسانی کے لیے لاطینی ہوتی - لیکن اب لاطینی لکھنے کا زمانہ نہ تھا - ڈوزی نے اعتدال کو مدِ نظر رکھ کر ایسی زبان میں اپنی کتاب لکھی جو عالمگیر ہونے میں اپنی مثال نہ رکھتی تھی - لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروفیسر ڈوزی کی یہ کتاب ایک بار چھپ کر پھر نہ چھپی ۔

فرانسیسی زبان اختیار کرنے میں اپنی قومی زبان کی جو توہین ہو گئی تھی اس کی تلافی ڈوزی نے بہت جلد کر دی یعنی ۱۸۶۱ء میں ڈچ زبان میں ایک کتاب موسوم بہ

ل The Decline and Fall of the Roman Empire

"اسلام"[1] لکھ کر اپنی قوم کی علمی دولت میں اضافہ کیا۔ اس کتاب کا تعلق کتابوں کے ایک سلسلے سے تھا جو دنیا کے مشہور اور بڑے مذاہب پر لکھی گئی تھیں۔ ڈوزی کی اس تصنیف کو یورپ میں بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۸۸۰ء میں وہ دوبارہ شائع ہوئی اور ایم وکٹر شاون[2] نے اسے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

مذہب اسلام کی تاریخ لکھنے میں ڈوزی ایسے چند نتائج پر پہنچا جو بہت ہی حیرت انگیز سمجھے گئے۔ کتاب کے مقدمے میں اس نے وعدہ کیا کہ ان نتائج پر غور کر کے آیندہ بھی کچھ لکھا جائے گا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں ایک مضمون "مکہ میں بنی اسرائیل"[3] کے عنوان سے ڈچ میں لکھا ہوا شائع ہوا۔ ایم گسٹاو ڈگٹ[4] نے اس مضمون کی نسبت لکھا ہے کہ "بعض لوگوں نے ڈوزی کی جملہ تصنیفات میں اس کو سب سے بہتر اور بعض نے سب سے بدتر سمجھا۔" ڈوزی کی کتابوں میں اس مضمون سے زیادہ کسی کتاب نے شہرت حاصل نہیں کی۔ مگر اس کے ساتھ ہی جیسا سخت انتقاد اس مضمون پر کیا گیا ایسا کسی اور کتاب پر نہیں کیا گیا۔ جرمنی کے یہودیوں نے اس پر نہایت سخت اعتراض کیے۔ اس مضمون میں ڈوزی نے یہ بات ثابت کرنی چاہی تھی کہ پرانے خانہ کعبہ کی بنیاد ساؤل[5] کے عہد میں سبط سیمون[6] کے چند جلاوطن اسرائیلیوں نے رکھی تھی۔ اور مکہ کے بڑے تہوار حج کی ابتدا انہی اسرائیلیوں سے ہوئی۔ اور جس وقت بنی اسرائیل بابل میں قید تھے تو ان کا ایک قبیلہ مکہ میں جا کر آباد ہوا تھا۔ ڈوزی نے یہ بھی بدلائل ثابت کرنا چاہا کہ بنی اسرائیل اس زمانہ میں بعل کی پرستش کرتے تھے۔ یہوواہ کی پرستش ابھی تک ان میں رائج نہیں ہوئی تھی۔ اس مضمون کو مفصل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں۔

ڈوزی پروفیسری کی خدمات نہایت توجہ اور محنت سے انجام دیتا تھا لیکن ان خدمتوں نے مشکل تصنیفات لکھنے سے اسے باز نہ رکھا۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء میں اس نے ایک کتاب شائع کی

---

١ Het Islamisme ٢ M. Victor Chauvin.
٣ Israeliten te Mekka.
٤ M. Gustave Dugat
٥ Saul. ٦ Simeon

جس کا نام "بیانِ افریقہ و اسپین"[1] تھا۔ اس کتاب میں شریف ادریسی کی مشہور تصنیف نزہتہ المشتاق کے ایک حصے کا عربی متن مع اس کے ترجمے اور تعلیقات و فرہنگ کے شائع کیا ہے۔ اس مشہور و معروف مسلمان جغرافیہ نویس کی تصنیف کے چند اجزاء کی اشاعت کا کام پروفیسر ڈوزی نے ۱۸۶۴ء سے شروع کیا تھا۔ اور اس کام میں ایم۔ ڈی گوجے[2] بھی اس کے شریک تھے۔ ۱۸۶۵ء میں ڈوزی نے ایک کتاب "اوسٹرلنگن"[3] یعنی ڈچ الفاظ کی فہرست شائع کی۔ اس فہرست میں ڈچ زبان کے ایسے الفاظ تھے جن کی اصل عربی، عبرانی فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں سے تھی۔ ۱۸۶۹ء میں ڈبلیو۔ ایچ۔ انگل مان[4] کی کتاب کو جس میں اسپینی اور پرتگیزی الفاظ جن کی اصل عربی سے تھی درج کیے گئے تھے۔ صحیح کر کے اور اس میں اور الفاظ اضافہ کر کے شائع کیا۔ اس پر فرانس کی انجمن کتابہ و ادبیات[5] نے ۱۶ر جولائی ۱۹۶۹ء کو ڈوزی کو ایک انعام دیا جو ولنی پرائز[6] کہلاتا تھا۔

یونیورسٹی میں ریکٹر کے عہدے سے علیحدہ ہونے کے بعد ڈوزی نے آخری درس اس مضمون پر دیا کیا اسباب تھے جن سے اسلامی تمدن اور ادبیات میں عیسائی تمدن کے شیوع سے پہلے خرابیاں پیدا ہو گئیں[7]۔ یہ مفید اور اہم مضمون فوراً شائع کر دیا گیا جس وقت ڈی سلین نے مقدمہ تاریخ ابن خلدون کا ترجمہ شائع کیا تو ۱۸۶۹ء میں ڈوزی کے قلم سے ایک مضمون جرنل ایشیاٹک میں نکلا۔ اس مضمون میں ڈوزی نے فن انتقاد کو حقیقت میں درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اس مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈوزی اب تاریخ کے میدان کو چھوڑ کر تقویم اللسان کی طرف متوجہ ہونیوالا ہے

---

[1] Description de l'Afrique et de l'Espagne

[2] M. de Goeje   [3] Osterlingen

[4] W. H Engelmann

[5] Academie des Inscriptions et belles-lettres.

[6] Volney prize.

[7] De Causis cur Mohammedanorum cultura et humanitas prae ea quae Christianorum est, imminuta et Corrupta sit.

ڈوزی کی طبیعت میں ایک عالم ہونے کی حیثیت سے جنگجوئی اور خصومت اور منتقد ہونے کے اعتبار سے اعتراض میں دریدہ دہنی اور بدلحاظی اس درجے کی تھی کہ "مناقشاتِ مصنفین" میں اس پر ایک علیحدہ باب کی توقع کی جاسکتی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ علما کے باہمی مباحث نے اُن کی دوستیوں میں فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ صرف ایک مثال ایسی تھی اور اُس پر تعجب بھی ہوتا ہے جس میں ڈوزی اپنے پرانے اور نہایت عزیز دوست فلائشر سے رنجیدہ خاطر ہوگیا۔ چونکہ دو بڑے عالموں کے تعلقات کو ایک غلط فہمی نے منقطع کر دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ غلط فہمی ڈوزی کی بہت سی تصنیفات کا باعث ہوئی۔ اس لیے مناسب ہوگا کہ اُس کا کچھ حال ہم یہاں بیان کر دیں۔

لیپزک کے اس زبردست مستشرق فلائشر کا قاعدہ بندھا تھا کہ جس قدر نئی اور مشکل کتابیں شائع ہوتی جاتی تھیں اُن کے مطبوعہ اوراق کو وہ بغرضِ انتقاد پڑھتا تھا۔ اور اگر کہیں کوئی غلطی معلوم ہوتی یا تعلیق لکھنی ہوتی تو اُسے لکھ کر ایڈیٹروں کے پاس بھیج دیتا تھا۔ یہی طریقہ اُس نے "منتخباتِ مقری" کے متعلق بھی برتا۔ چنانچہ جب اس کتاب کا پانچواں حصہ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تو اضافوں اور اصلاحوں کی فہرست میں جو کتاب کے ساتھ شائع ہوئی بہت سی اصلاحیں اور اضافے پروفیسر فلائشر کے کیے ہوئے بھی موجود تھے۔ دیباچہ کتاب میں ایڈیٹروں نے پروفیسر فلائشر کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا کہ پروفیسر موصوف نے اپنے مخصوص مطالعوں کو چھوڑ کر اس کام کے لیے اپنا قیمتی وقت نکالا۔ امید کی جاتی ہے کہ جس قدر محنت انھوں نے کی ہے وہ رائگاں نہ جائے گی۔ ممکن ہے کہ ان جملوں کو پڑھ کر پروفیسر فلائشر کو خیال ہوا ہو کہ دیباچے میں کسی قدر اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ وہ اس میدان کے مرد نہ تھے ناحق زحمت اٹھائی۔ بہرکیف ۱۸۶۷ء میں پروفیسر فلائشر نے "منتخباتِ مقری پر اپنی اصلاحیں" رائل اکاڈمی آف سائنسز سکسنی[ل] کے رسالے میں علیحدہ شائع کرا دیں اور اُن کے دیباچے میں صاف صاف کہا کہ "منتخبات مقری کے ساتھ جو اصلاحیں ان کے

ل Royal Academy of Sciences Saxony

قلم کی ایڈیٹرانِ کتاب نے شائع کی تھیں اُن سے وہ خوش نہیں ہوئے۔ کیونکہ بعض اصلاحوں کے متعلق جو دلائل انھوں نے لکھے تھے ان کو اڈیٹروں نے حذف کر دیا۔ بعض اصلاحیں شائع کیں مگر ان میں ان کا نام نہیں بتایا۔ اور بعض بالکل ہی فروگذاشت کر دیں اپنے مجموعہ اصلاحات کو جُدا چھپوانے کی وجہ یہ ہوئی کہ پروفیسر موصوف اپنی اصلاحوں کی نسبت خیال کرتے تھے کہ وہ بہت ضروری ہیں اور اُن میں کوئی بھی حذف کرنے کے قابل نہیں۔ "منتخبات مقری" کو انھوں نے اِس زمانہ میں دوبارہ پڑھا بھی تھا۔ اور سابقہ اصلاحوں کے علاوہ چند اصلاحیں اور بھی ضروری معلوم ہوئی تھیں۔ پروفیسر فلائشر کی اصلاحات علیحدہ طبع ہونے میں کسی کو کوئی بُرا ماننے کی بات نہ تھی۔ لیکن وجہ یہ ہوئی تھی کہ دس برس پہلے ڈوزی پروفیسر فلائشر سے "منتخبات مقری" کی اصلاحوں کی بابت نج کے طور پر خط وکتابت کر چکے تھے۔ خاص کر کتاب کے اُس حصہ کی بابت جس کے چھپوانے کے وہ ذمہ دار تھے۔ پروفیسر فلائشر کی یہ زیادتی اور غلطی تھی کہ انھوں نے ڈوزی کے خطوط کی نسبت سمجھ لیا کہ وہ اطلاع عام کے چھاپے بھی گئے تھے اور اس سے بھی بدتر غلطی یہ کی کہ اُن خطوط میں جو رائے ڈوزی نے ظاہر کی تھی اس کو قطعی اور آخری رائے سمجھ لیا۔

پروفیسر فلائشر کی یہ غلطی ایسی تھی کہ جس شخص میں بے انصافی پر تحمل کرنے کی عادت بھی ہو تو بھی وہ بگڑ جائے۔ چہ جائیکہ پروفیسر ڈوزی جنھیں ذرا سی بات کی بھی تاب نہ تھی۔ غرض انھوں نے بہت بُرا مانا اپنے خطوں میں جن کا مضمون اب انھیں یاد بھی نہ رہا تھا۔ ڈوزی نے ایک ایک بات پر کتنی کتنی رائیں ظاہر کی تھیں۔ جن کو زیادہ مطالعہ اور غور کے بعد وہ ترک یا اُن میں ترمیم کر سکتے تھے۔ لیکن پروفیسر فلائشر نے ڈوزی کی اِن پرانی رائیوں کو اپنے مجموعۂ اصلاحات میں اس طرح بیان کیا کہ گویا وہ ڈوزی کی آخری اور قطعی رائیں تھیں اور یہ ظاہر کر کے ان کی تردید کی۔ ڈوزی نے جب اس مجموعے کو دیکھا تو جس کام میں وہ اس وقت مصروف تھے اُسے بالائے طاق رکھ چھری تیز کرنے بیٹھ گئے اور ۱۸۷۱ء میں ایک خط پروفیسر فلائشر کے نام چھپوایا اور اُس میں علامہ مقری کی کتاب پر فلائشر کے انتقاد سے بحث کی اس خط میں ڈوزی نے لٹھ چلانے کی جگہ تیز چھریوں سے کام لیا ہے۔ نہایت شائستہ اور نرم الفاظ میں لیپزک کے

بڈھے مستشرق کی بے انصافیاں بیان کیں اور ابی بارگیس[1] کا یہ جملہ اُسے یاد دلایا کہ " انسان کی زندگی کے دس برس ایک سوسائٹی کی زندگی کے سَو برس کے برابر ہوتے ہیں " اس کے بعد لکھا کہ " اگر میں بھی آپ کے اُن قیاسات کو جن کی میں نے تردید کی تھی اور میری تردید کے بعد آپ نے اُن کو بیان کرنے سے پرہیز کیا تھا چھپوا دیتا تو کیا آپ کو مجھ سے شکایت نہ ہوتی ؟ اس قسم کی شکایتوں سے کئی صفحے بھر کر ڈوزی اصل مضمون کی اصلاحی پیچیدگیوں میں مصروف ہو گیا۔ اور پروفیسر فلائشر نے جو کچھ لکھا تھا اس کی ایک ایک بات پر نہایت باریک بینی سے انتقاد کرنے لگا۔ ان دو بڑے مستشرقوں میں جو شکر رنجی اس وقت قائم ہوئی وہ عرصہ تک باقی رہی۔ لیکن یہ معلوم کرنے سے خوشی ہوتی ہے کہ آخر کار ان دونوں میں صلح ہو گئی چنانچہ پروفیسر فلائشر کا سوانح نگار لکھتا ہے کہ ان عالموں میں جو غلط فہمی ہو گئی تھی وہ ایسے طریقے سے رفع ہوئی جو دونوں کے لیے قابلِ تعریف ہے اور اب جیسا کہ آگے ظاہر ہو گا ڈوزی اور فلائشر میں دوستی ایسی مستحکم بنیاد پہ قائم ہوئی کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔

۱۸۶۷ء میں ڈوزی ایک کتاب کے لیے مواد جمع کرنے میں مصروف ہوئے اور یہ کتاب ایسی نکلی جس سے مستشرقین کی نظر میں شہرت اور ناموری کا استحقاق مصنف کو سب سے بڑھ کر حاصل ہوتا تھا۔ اس کتاب کا نام " ضمیمہ لغاتِ[2] عربی " ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں پورا مواد جمع کر لینے کے بعد لغات کی ترتیب شروع کی اور اس پر آٹھ برس تک مسلسل محنت کی آرام بہت کم کیا۔ ڈوزی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ صحتِ جسمانی اب جواب دینے کو ہے۔ دوستوں کو اس حال کی خبر نہ ہوئی۔ اس خیال نے کہ تندرستی اب رخصت ہونے کو ہے اور بھی آمادہ کیا کہ اگر مرضی اور قصد کے مطابق یہ کتاب تیار کرنی ہے تو جس قدر قوّت باقی ہے وہ اسی میں لگا دی جائے۔ ۱۸۸۱ء میں " ضمیمہ " ختم کر دیا گیا۔ اُس کے دیباچے میں ڈوزی لکھتے ہیں کہ

۱۔ Abbe Barges

۲۔ Supplement aux dictionnaires arabes.

اس کام کے ختم ہو جانے سے میں بہت خوش ہوں۔ اس پر بڑی مدت تک محنت کرنی پڑی ہے بعض عبارتیں اس میں ایسی ہیں جنھیں چالیس برس ہوئے کہ میں منتخب کر چکا تھا۔ اور اب پھر اصل سے مقابلہ کر کے ان کی صحت کی ہے۔ اگر مجھے پہلے سے یہ خیال ہوتا کہ مضامین کی ترتیب میں آٹھ برس لگ جائیں گے تو اس کام کو کبھی ہاتھ نہ لگاتا۔ میں تکلیف اور بیماری کی حالت میں اکثر ڈرتا رہا کہ کہیں یہ کام ناتمام نہ رہ جائے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ ڈر غلط نکلا۔ زندگی اور قوت اتنی ہوئی کہ کام ختم ہو گیا۔ جوانی سے اس کام کی آرزو تھی اور اب خوش ہوں کہ وہ خاتمہ کو پہنچا۔"

"ضمیمہ" کے ختم ہونے سے پہلے مصنف کو نئے نئے خطابات مل چکے تھے۔ کوپن ہیگن کی رائل اکاڈمی آف سائنس کی رکنیت تو پہلے حاصل ہو چکی تھی۔ ۱۸۷۸ء میں سینٹ پیٹرزبرگ کی اکاڈمی نے اپنا رکن بنایا۔ ۱۸۷۹ء میں وہ اعزازی رکن ڈیوتشے مورگن گریسل شاوٹ[1] کے مقرر کیے گئے۔ ۱۸۸۰ء میں روما کی اکاڈمی کے رکن نامہ نگار[2] اور علمی مجلس مجریط کے اعزازی پروفیسر[3] مقرر ہوئے۔ اور یہ اخیر عزت ایسی تھی جس سے اُن کا نام چارلس ڈارون اور جان ٹنڈل جیسے مشاہیر کے ساتھ شمار میں آنے لگا۔

لیکن ایم۔ دی گوجی لکھتا ہے کہ ڈوزی ان خطابات سے کہیں زیادہ قدر بڈھے پروفیسر فلائشر کی رائے کی کرتا تھا جو دوبارہ دوستی ہونے کے بعد اس پیرانہ سال پروفیسر نے "ضمیمہ لغاتِ عربی" کے متعلق ظاہر کی۔ رائے یہ تھی کہ "لین کی لغت کے بعد جو قدیم عربی سے تعلق رکھتی ہے اور ناتمام ہے۔ لغت نویسی میں ڈوزی نے یہ سب سے بڑا کام کیا ہے۔" پروفیسر موصوف نے ڈوزی کو مبارکباد دی ہے کہ۔ "آپ نے

---

[1] Honorary Member of the Deutsche Morgenlandische Gesellschaft.

[2] Foreign Correspondent of the Accademia dei Lincei of Rome.

[3] Honorary Professor of the Institucion Libre de Ensenanza of Madrid.

کثرتِ مطالعہ اور محنتِ شاقہ اور اس پر عربی زبان میں کامل قدرت رکھنے اور تیز نظری کی وجہ سے جس کا ثبوت اکثر مل چکا ہے۔ اس تالیف میں کیا باعتبار اس کے مواد کے اور کیا بلحاظ اس کے طرز بیان کے سب سے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

پروفیسر فلائشر کی عمر اب اسّی برس کی تھی مگر معلوم ہوتا تھا کہ جوان ہیں اور جوان بھی بھی سدا بہار۔ ان بزرگ کو اس کی خبر نہ تھی کہ پروفیسر ڈوزی نے جو ان سے عمر میں بیس برس چھوٹے تھے۔ دیباچۂ کتاب میں اپنی صحت کے متعلق جو شکایت کی ہے وہ ایک مرض مہلک کا مقدمہ ہے۔ جس وقت "ضمیمہ" ختم کیا تھا تو معلوم ہوا تھا کہ طاقت جسمانی سلب ہو چکی ہے۔ تمام عمر میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک کتاب ختم کرنے کے بعد سمجھ میں نہ آیا کہ دوسرا کیا کام شروع کیا جائے۔ یہ خستگی اور کمزوری تو کچھ کم ہو گئی مگر کوئی نیا کام شروع نہ ہو سکا۔ تاریخ موحدون کا دوسرا اڈیشن نکالنے کے لیے پہلے اڈیشن کی تصحیح کی اور بعض اصطلاحی امور پر پروفیسر فلائشر اور دی گوجی سے خط و کتابت کی آخری عمر میں سب سے بڑی خوشی اور تسکین اس بات سے ہوئی کہ کتاب "تحقیقات"[1] کا تیسرا اڈیشن چھپنے کی نوبت آئی۔ اس تیسرے اڈیشن میں متعدد اضافے کیے اور کہیں کہیں کسی قدر تصحیح بھی کی۔ اس کتاب کے تیسرے اڈیشن کی جلدیں ۱۸۸۱ء میں چھاپی گئیں۔ یہ کتاب ایسے طالب علموں کے لیے جن کے مطالعہ کا مضمون اسلامی اسپین، ہو نہایت مفید ہے اور جو طلبہ چاہتے ہیں کہ تاریخی واقعات کو جن کا ذکر ڈوزی کی "تاریخ مسلمانانِ اسپین" میں آیا ہے بنظرِ غائر تحقیق کریں ان کے لیے نہایت کارآمد ہے۔ گو اس کتاب میں ایسے مباحث اور مضامین ہیں جن میں باہمی تعلق نہیں لیکن وہ سب نہایت دلکش اور سلیس طرز میں بیان ہوئے ہیں۔ گوڈ فرائڈ بوامٹ[2] نے خوب کہا ہے۔ "اگر اس کتاب کے کسی مضمون میں کوئی خفیف سی بات بھی دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو بغیر پورا مضمون پڑھے دل نہیں مانتا۔"

---

[1] Recherches.

[2] Gottfried Buiat.

یہ ڈوزی کی آخری تصنیف تھی، ۲۹ اپریل ۱۸۸۳ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی زندگی ایسے بڑے واقعات سے خالی تھی جن کو یکجا کر کے اُن پر نکتہ چینی کی ضرورت ہو۔ زندگی کے تمام سوانح بالکل سادے تھے جن کا صرف بیان کر دینا کافی ہے۔ رائن ہارٹ ڈوزی صرف ایک عالم تھے۔ اور اُن کی زندگی کی آرزوئیں۔ ادبیات، لسانیات اور تاریخ پر ختم ہو جاتی تھیں، ادبیات کے وہ چالیس برس تک نہایت جفاکش خادم رہے۔ اور اپنی محنتوں سے دنیا کی علمی دولت میں اضافہ کر گئے۔

الیف، جی، ایس

al Reinhart Dozy

دیباچہ

(نوشتہ مُصنّف)

تاریخ اسپین سے اور بالخصوص اسلامی اسپین کی تاریخ سے مدت تک طبیعت کو خاص تعلق رہا۔ اور اُس کے مطالعہ میں بلا انقطاع بیس برس صرف کیے، اس کتاب کی تالیف کے پہلے بھی مُعلومات کے فراہم کرنے میں (جو یورپ کے تمام کتب خانوں میں منتشر تھیں) اور قلمی کتب کے امتحان اور مقابلہ کرنے میں عمر کا جو حصہ صرف ہوا، وہ بھی کم نہ تھا۔ اِن قلمی کتابوں میں سے بعض کو طبع کرا کے شائع بھی کیا۔

باوجود اس کے نہایت تذبذب کے ساتھ یہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کرتا ہوں، یہاں جس زمین پر مجھے چلنا پڑا ہے اُس پر پہلے کوئی نہ چلا تھا، وجہ یہ ہے کہ اسلامی اسپین کی تاریخ پر جو کتابیں اب تک لکھی گئی ہیں، وہ بالکل بے وقعت اور ناکارہ ہیں، یہ بحث میں ایک اور موقع پر پوری طرح لکھ چکا ہوں[1]، ان تمام کتابوں کی بنیاد کونڈی[2] کی تاریخ پر رکھی گئی ہے، اور یہ تاریخ ایک ایسے مصنف کی لکھی ہوئی ہے جو عربی زبان میں بہت کم استعداد رکھتا تھا، اور ایسی ناواقفیتِ زبان کی وجہ سے جس قدر عربی کتابیں اس نے بہم پہنچائیں اُنھیں سمجھ بھی نہ سکا علاوہ بریں جس چیز کو تاریخی احساس کہتے ہیں وہ بھی اس میں نہ تھا، پس جو کام مجھے کرنا پڑا، وہ یہی نہ تھا کہ میرے سابقین نے واقعات کے لکھنے میں جو غلطیاں کی ہیں اُنھیں رفع کروں، بلکہ میرے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ اگر تاریخ کے صفحوں پر مسلمانانِ اسپین کو پھر زندہ کر کے دکھانا اپنا مقصود ہے تو ہر واقعہ کو تلاش اور تحقیق کرتا ہوا اُس کی جڑ تک پہنچ جاؤں، اگر مضمون کی دلفریبیوں میں اس کی ندرت دلکش تھی تو اس ندرت کے ساتھ اس کی دشواریاں بھی بےشمار اور مختلف الانواع ثابت ہوتی

---

[1] کتاب تحقیقات Recherches sur l'histoire et la littérature de l'Espagne pendant le moyen age کے پہلے اڈیشن میں پروفیسر ڈوزی نے اس بحث کو پورے طور پر لکھا ہے۔

[2] Conde.

رہیں۔

مجھے یقین ہے کہ میرا یہ دعویٰ بالکل بجا ہو گا کہ مسلمانانِ اسپین کے متعلق جس قدر قلمی کتابیں یورپ میں موجود ہیں اُن سب کا مطالعہ میں کر چکا ہوں، اور اس تاریخ کے کسی پہلو کو میں نے دانستہ نظرانداز نہیں کیا ہے۔ لیکن چونکہ میری غرض یہ نہ تھی کہ میں کوئی بہت ہی خشک اور عالمانہ کتاب ایسی لکھوں جو صرف چند عالموں کے پڑھنے کے لائق ہو، اس لیے میں نے کتاب کے صفحوں کو پھیکی اور بے لطف تفصیل سے گراں بار نہیں کیا، جہاں تک میری قدرت میں تھا میں نے ادبی قوانین کی بھی پابندی کی ہے، جن کا منشا یہ ہوتا ہے کہ تاریخی انشاء میں خاص قسم کے واقعات کو ممتاز و ممیّز کر کے باقی کل واقعات کو ان کا تابع کر دیا جائے گویا وہ بادشاہ ہوں اور باقی سب اُن کے اہالی موالی اُن سے ادنیٰ درجہ پر ہوں، اسی وجہ سے میں اکثر اسی بات پر مجبور ہوا کہ ہفتوں کی محنت کا نچوڑ صرف چند سطروں میں لکھ جاؤں بلکہ بہت سے واقعات بھی تحقیق کرنے کے بعد اس وجہ سے چھوڑ دینے پڑے کہ جس وضع پر کتاب لکھنی چاہتا تھا اس میں وہ ٹھیک نہ بیٹھتے تھے۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ایسے واقعات کو بہت روشن طریقے پر لکھنا مدِنظر رکھا ہے۔ جو کسی تاریخی زمانے کی خصوصیات کو واضح کرتے ہوں اور بعض موقعوں پر مجھے مطلق تامل نہیں ہوا ہے کہ کسی سیاسی تاریخ کے ڈرامے میں گذرے ہوئے لوگوں کے شخصی و ذاتی حالات کا ذکر کر کے پھر ان میں جان ڈال دوں۔ کیونکہ میری رائے میں مؤرخ اکثر اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب تک پڑھنے والے کے لیے کچھ ساعتیں اور وقفے لطف و راحت کے ایسے نہ رکھے جائیں کہ چیزوں کا رنگ رُوپ اور خوشنمائی دیکھ کر وہ محفوظ ہوں اور زمانۂ زیرِ بحث کے آداب و اخلاق اُن کی نظر کے سامنے آجائیں۔ تو تاریخ ایک بیرنگ اور بے لطف مضمون رہ جاتا ہے، ایسے موَرخوں کے طریقے جو تصویر میں سامنے کی زمین پر تاریخی لوگوں کو چلتا پھرتا نہیں دکھاتے، بلکہ صرف اُن کے خیالات کو ظاہر کر کے محض استقرائی نتائج اور کلیات سے بحث رکھتے ہیں، میری تصنیف کے لیے موزوں نہ تھے۔

اس تاریخ میں صحت اور واقعیت پیدا رکھنے کے لیے میں نے کسی قسم کی محنت اور کاوش

سے جی نہیں چرایا ہے، مجھے اس کا یقین تھا کہ فضیلت اور علمیت کی شانیں دکھانے سے اس تاریخ میں شگفتگی اور سلاست پیدا نہ ہو گی، اس لیے میں نے تعلیقوں اور حوالوں کے لکھنے اور عبارتوں کو بکثرت نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ میری رائے ہے کہ اس قسم کی تالیف میں جیسی کہ یہ کتاب ہے، صرف نتائج کو اُس ساز و سامان سے جُدا کر کے دکھانا چاہیئے جن کو فراہم کرنے کے بعد وہ نتائج پیدا کیئے گئے تھے، اس لیے میں نے کتاب میں اُن ماخذوں کے نام اور اُنکے پتے بتا دیئے ہیں جن پر میرے بیانات مبنی ہیں۔

یہاں یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ تاریخی انتقاد پر چند مضامین شائع ہونے سے قبل اس کتاب کے بعض حصے لکھ لیے گئے تھے، مثلاً میرے عالم اور مہربان دوست موسیو ریناں[1] کا مضمون "پیغمبر اور اسلام کی ابتدا[2]" کے عنوان سے جب "ریویو دو موندے[3]" میں چھپا ہے تو میں اپنی اس تصنیف کی کتاب اوّل کی ابتدائی فصلیں لکھ چکا تھا ہم دونوں نے بعض نتیجے ایک ہی سے نکالے ہیں، لیکن ہر ایک بلا وساطتِ دیگر خود ہی ان نتیجوں پر پہنچا ہے۔

اب صرف یہ خوشگوار فرض باقی ہے کہ اپنے مہربان دوستوں کا اور بالخصوص مہل[4] رائٹ[5]، دیفرمری[6]، تورن برگ[7]، کالدرون[8]، دی سلین[9] اور ڈگٹ[10] کا شکریہ ادا کروں جنھوں نے اپنے کتب خانوں سے قلمی کتابیں مجھے دیں یا نہایت اخلاق اور مہربانی سے قلمی کتابوں سے اقتباسات اور ایک ہی کتاب کے دو مختلف نسخوں میں عبارت کے اختلافات نقل کرا کے میرے پاس بھیجے

لیڈن فروری ۱۸۶۱ء

---

[1] M-Renan [2] Mahammed and the origing of Islamism. [3] Bevue des deux Mondes.
[4] Mohl [5] Wright [6] Defremery [7] Tornberg
[8] Calderon [9] De Slane. [10] Dugat

کتابِ اوّل

خانہ جنگی

کتاب اوّل

خانہ جنگی

پہلی فصل

بدوئین

یورپ کا تو یہ حال ہے کہ ترقی کی راہ میں صدی بصدی آگے ہی بڑھتا رہا ہے۔ لیکن عرب کے بےشمار قبیلے جو اپنے خیمے اور گلّے لیے ملک کے وسیع ریگستانوں میں خانہ بدوش رہتے ہیں۔ اُن کی مستقل خصلت اور طبیعت یہ ہے کہ زندگی میں کسی قسم کی تبدیلی قبول نہ کریں کل جو حالت تھی وہی آج ہے اور یہی کل رہے گی۔ نہ وہ ترقی سے آشنا ہیں نہ تبدیلی سے

آج بھی ایک بدوی کی طبیعت میں وہی جوش بالکل خالص اور بے لوث شکل میں موجود ہے
جو اس کے بزرگوں سے پیغمبر خدا صلعم کے زمانے میں ظاہر ہوا تھا (دُور جانے کی ضرورت
نہیں) زمانہ بت پرستی کے عربوں کی تاریخ اور شاعری کے بہترین شارح وہ بیانات
ہیں جو آج کل کے (یورپین) سیاحوں نے عربوں کے طرزِ معاشرت۔ رسم و رواج
اور اندازِ خیال کے متعلق اُن میں مدت تک بود و باش رکھ کر اپنے سفرناموں میں درج
کیے ہیں۔[لہ]

لیکن پھر بھی عربوں میں ایسی سمجھ اور قوت کی کمی نہیں ہے جس کی ضرورت ملکی
سرحدوں کو آگے بڑھانے اور اپنی حالت کو بہتر کرنے میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک عرب
ترقی نہیں کرتا یا وہ ترقی کے خیال تک سے اجنبی ہے تو اِس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تمدن
نے جو مادی راحتیں اور آسائشیں پیدا کی ہیں اُن سے وہ قطعی بے نیاز ہے۔ اور نہ وہ
اپنی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بدوی کا پختہ عقیدہ اُسے یقین دلاتا
ہے کہ وہ خدا کی مخلوق کا کامل ترین نمونہ ہے۔ وہ دوسری قوموں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا
ہے محض اس بنا پر کہ دوسری قومیں اس کی قوم کی مانند نہیں۔ بدوی کو پورا یقین ہے
کہ وہ ایک متمدن انسان سے کہیں زیادہ خوش اور مطمئن رہنے والا آدمی ہے ظاہر
ہے کہ زندگی کی ہر حالت کے ساتھ کچھ نقصانات بھی وابستہ ہوتے ہیں اور کچھ فوائد بھی
بدویوں کو جو غرور اپنی زندگی پر ہے۔ اُس کی وجہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے وہ یہ
کہ مسائل حکمیہ سے ہدایت پاکر نہیں بلکہ ایک قسم کی عقل حیوانی کی رہبری میں انھوں نے (۴)
آزادی۔ مساوات اور اُخوت کو (جو "انقلاب فرانس" کے شعاری الفاظ ہیں) ایک ازیاد

لہ مجھے یقین ہے کہ آداب و طرزِ زندگی ہی میں نہیں بلکہ لباس اور بول چال میں بھی بنی اسمٰعیل آجکل بھی وہی ہیں جو انبیائے بنی اسرائیل کے زمانے میں تھے" ملاحظہ ہو ای۔ ایچ پامر کی کتاب صحرائے خروج THF DESERT OF THE EXODES مطبوعہ ۱۸۷۱ء صفحہ ۸۰، نیز دیکھو جی۔ آر۔ لیز کی کتاب شاہد صحرا THE WITNESS OF THE WILDERNESS مطبوعہ ۱۹۰۹ء صفحہ ۴۳ اور سی۔ آر۔ کونڈر کی کتاب فلسطین میں خیموں میں کاروبار" TENT WORK IN PALESTINE مطبوعہ ۱۸۸۵ء صفحہ ۳۳۷

رفتہ زمانے سے حیطۂ عمل میں لا رکھا ہے۔ روئے زمین پر کوئی انسان نہیں ہے جس کو آزادی سے اتنا حصہ ملا ہو جتنا کہ ایک بدوی کو حاصل ہوا ہے۔ بدوی فخریہ کہتا ہے کہ "میں کسی کو اپنا مالک، بجز خالق کائنات کے نہیں مانتا" جو آزادی اس کو حاصل ہے اُس میں قیود اتنی کم ہیں کہ میدان سیاسیات میں بڑے بڑے حریت پسند لوگوں کے اصول بھی اس آزادی کے سامنے ایک شخصی اور مطلق العنان حکومت کے دستور العمل معلوم ہوتے ہیں۔ متمدن سلطنتوں میں کسی قسم کے نظام حکومت کا موجود ہونا ایک شر ہے جس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن اس شر کے ساتھ یہ ضروری شرط لگی ہوئی ہے کہ خیر اور بھلائی اس سے پیدا ہوتی رہے۔ بدوی نے اس شرط ہی کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر قبیلے کا ایک شیخ ہوتا ہے جسے خود اہل قبیلہ منتخب کرتے ہیں۔ لیکن یہ شیخ حاکم نہیں ہوتا محض صلاح کار ہوتا ہے۔ اس کی عزت کی جاتی ہے۔ اس کی نصیحت کا خیال رکھا جاتا ہے بالخصوص اُس حالت میں جبکہ وہ بر محل عمدہ تقریر کرنی بھی جانتا ہو۔ لیکن حکم دینے کا حق اُس کو کسی حال میں حاصل نہیں ہوتا۔ شیخ کو اس کی خدمت کا کچھ معاوضہ نہیں دیا جاتا بلکہ یہ توقع کی جاتی ہے یہاں تک کہ رائے عامہ اس پر مصر ہوتی ہے کہ قبیلے کے مساکین کے گذارے کا وہ اپنے پاس سے بندوبست کریگا جس قدر انعام یا بخشش دوسروں سے اُسے حاصل ہو اس میں قبیلے کے لوگوں کو بھی شریک رکھے اور باہر والوں کی مہمان نوازی میں قبیلے کے اور لوگ جس قدر صرف کر سکیں اس سے زیادہ صرف کرے ہر موقع پر شیخ کے لیے لازمی ہے کہ جماعت شوریٰ سے جس میں قبیلے کے ہر خاندان کا ایک بڑا آدمی شریک ہوتا ہے صلاح و مشورہ کرے۔ اس جماعت کی بلا مرضی نہ کوئی لڑائی لڑی جا سکتی ہے اور نہ کوئی صلح ہو سکتی ہے۔ بلکہ بغیر اس کی رائے کے قبیلے کے لوگ کہیں اپنے خیمے تک نصب نہیں کر سکتے۔[1]

شیخ کا لقب جو ایک قبیلہ اپنے لوگوں میں سے کسی کو دیتا ہے تو اس میں لقب کے سوا

---

[1] ملاحظہ ہو برک ہارٹ کی کتاب "بدوؤں کے حالات" Notes on the Bedouins صفحہ ۶۶ - ۶۷

نیز سر آر۔ ایف برٹن کی کتاب "سفر المدینہ و مکہ" Pilgrimage to El Medinah and Meccah. حصہ سوم صفحہ ۸۵

اور کچھ نہیں ہوتا۔ یہ لقب گویا اس امر کی ایک عام شہادت ہوتی ہے کہ اہل قبیلہ اس شخص کی عزت کرتے ہیں جس کو یہ لقب انھوں نے دیا ہے یا یہ لقب گویا اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ جس شخص کو شیخ بنایا گیا ہے وہ اہل قبیلہ میں سب سے زیادہ لائق، سب سے زیادہ بہادر اور سب سے بڑھکر فیاض اور اپنے قبیلے کی خیر و سلامتی کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والا ہے۔ پرانے وقتوں کے ایک عرب نے کہا تھا۔

"یہ عزت ہم کسی شخص کو نہیں دیتے تاوقتیکہ وہ اپنا کل سرمایہ اور اس بات کی اجازت ہم کو نہ دیدے کہ جو کچھ اُسے عزیز ہے یا جس کی وہ عزت کرتا ہے اگر چاہیں تو ہم اُسے پامال کر ڈالیں۔ ہم یہ عزت کسی کو نہیں دیتے تاوقتیکہ کوئی شخص ہماری ایسی خدمتیں ادا نہیں کرتا جس کے متوقع ہم اپنے ایک غلام سے ہو سکتے ہیں ۱؎"

فی الواقع ایک شیخ قبیلہ کے اختیارات اکثر اس درجہ قلیل ہوتے ہیں کہ ناگوار ہونا تو کجا وہ کسی کو محسوس تک نہیں ہوتے۔ عرابہ سے جو رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ہم زمانہ تھا کسی نے پوچھا کہ وہ اپنے قبیلے کا سردار کیونکر ہوا؟ پہلے تو اس نے شیخ بننے ہی سے انکار کیا۔ لیکن جب زیادہ اصرار سے پوچھا گیا تو کہنے لگا کہ:

"اگر میرے قبیلے والوں پر مصیبتیں پڑیں تو میں نے ان کو اپنا مال دیا اگر ان میں سے کسی سے کوئی قصور ہوا تو اپنے پاس سے اُس کا تاوان بھگتا اور قبیلے میں جو سب سے زیادہ شفیق و مہربان تھا اُس کے بھروسے پر اپنے اختیارات قائم کیے میرے قبیلے والوں میں جو شخص اتنے سلوک نہیں کر سکتا اس کی عزت کم ہے اور جو میری مثل سلوک کر سکتا ہے وہ درجے میں میرے برابر ہے اور جو اس سے بھی زیادہ سلوک کر سکتا ہے اس کی اور زیادہ عزت ہے ۲؎"

جب کوئی سردارِ قبیلہ سرداری کے مراتب ادا نہیں کر سکتا تھا یا اُسی قبیلے میں کوئی دوسرا

۱؎ مُبَرّد صفحہ ۱

۲؎ مُبَرّد صفحہ ۱، مقابلہ کرو ابن نباتہ سے جسے راسموسن Rasmussen نے اپنی کتاب Addutamenta and Historiam Arabum میں نقل کیا ہے۔

آدمی اس سردار سے بھی زیادہ جری اور فیاض پیدا ہو جاتا تھا تو سابق شیخ کو معزول کر دیتے تھے اور اب تک یہی حال چلا آتا ہے[1]

آزادیٔ کامل جس کا نام ہے وہ تو بادیۂ عرب میں بھی عنقا تھی۔ لیکن آزادی میں درجۂ کمال کے قریب قریب پہنچ جانا جیسا عرب میں ممکن تھا دوسری جگہ ممکن نہ تھا۔ بدوی نہ تو معاشرت کے تعلقات میں کسی قسم کا فرق مانتے ہیں کیونکہ سب ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک ہی طرح کی غذا کھاتے ہیں اور ایک ہی طرح کا لباس پہنتے ہیں۔ اور نہ بدوی کے نزدیک دولت مندی ایسی چیز ہے جس کی قدر کی جائے کیونکہ اُن کی نظر میں دولت مستحق عزت نہیں[2]۔ دولت سے نفرت رکھنی اور باپ کے متروکے کو بے دھڑک مہمان نوازیوں میں اُڑانے کے بعد لوٹ کے مال سے جو بہر صورت اپنی دلیری اور جواںمردی کا ثمرہ ہوتا ہے بمشکل گذارہ کرنا ایک بہادر عرب کا اعلیٰ ترین معیارِ زندگی[3] ہے۔ مال و دولت کی بیقدری اس میں شبہ نہیں کہ انسان کی سیر چشمی اور حکیمانہ استغنا کی دلیل ہے۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ دولت جس طرح ایک دوسرے آدمی کے لیے بڑی چیز ہو سکتی ہے۔ بدوی کے لیے بڑی چیز نہیں ہے۔ کیونکہ بدوی کا اپنے مال پر قبضہ رکھنا کوئی مستقل بات نہیں ہوتی۔ اس کا مال حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اس کے قبضے سے نکل جاتا ہے ایک عرب شاعر کہتا ہے کہ "دولت صبح آتی ہے اور ابھی شام نہیں ہونے پاتی کر چلی جاتی ہے" عرب کے ریگستانوں میں اس خیال کا حرف حرف درست ثابت ہوتا ہے۔

بدوی زراعت کے پیشے سے بالکل نابلد ہوتا ہے۔ ایک چپہ بھر زمین بھی اس کی

[1] برک ہارٹ کی متذکرہ کتاب، بدوؤں کے حالات" صفحہ ۶۰ نیز کرسن ۲ ۔ صفحہ ۶۳
[2] برک ہارٹ صفحہ ۴۱
[3] کرسن ۲ صفحات ۵۵۵ و ۶۱۱

ملک نہیں ہوتی۔ اس کی دولت جو کچھ ہوتی ہے۔ وہ اُس کے اونٹ اور گھوڑے ہوتے ہیں اور یہ مال ایسا ہے جس کے قائم رہنے پر ایک گھنٹے کا بھی اُس کو بھروسا نہیں ہوتا۔ جب دشمن اُس کے قبیلے پر حملے کرتے ہیں اور یہ حملے رات دن کا مشغلہ ہوتے ہیں تو دشمن اس کا سب مال چھین کر لے جاتے ہیں اور کل جو مالدار تھا آج اس پر افلاس طاری ہوتا ہے۔ لیکن کل یہی مفلس اپنا بدلہ لے کر پھر مالدار ہو جائے گا۔[1]

مساواتِ کامل بہر کیف ایک حالت بے رنگ و بے لوث فطرت انسانی کی ہو سکتی ہے مگر یہ حالت محض ایک خیالی تجرید ہوتی ہے۔ بدوی بلاشبہ آپس میں بالکل ایک حالت اور سطح پر رہتے ہیں لیکن یہ قاعدہ کہ سب کو ایک ہی سطح پر سمجھا جائے۔ وہ کل بنی نوعِ انسان پر عائد نہیں کرتے اپنے تئیں سب سے بڑھ کر سمجھتے ہیں۔ نہ صرف اپنے غلاموں اور اپنے پیشہ وروں سے جو خیموں میں رہ کر اپنا اپنا کام کرتے ہیں بلکہ تمام دنیا کے لوگوں سے وہ اپنے آپ کو فائق جانتے ہیں۔ ان کو دعویٰ ہے کہ جس مٹی اور سانچے سے وہ بنائے گئے ہیں وہ اس مٹی اور سانچے سے مختلف ہے جس سے باقی نسل انسانی بنائی گئی ہے۔ قدرتی ناہمواریوں کا نتیجہ بہر کیف معاشرتی فرق اور امتیاز ہوتے ہیں۔ گو دولت بدوی کی عزت اور وقعت کا باعث نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ عزت و وقعت اس کو اپنی سخاوت۔ مہمان نوازی۔ ہمت۔ شاعرانہ مذاق اور فصاحت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے حاتم[2] نے کہا تھا کہ انسان کی تقسیم دو حصوں میں ہو سکتی ہے۔

۱۔ ایک وہ جو طامع و حریص ہیں اور جن کو دولت جمع کرنے میں لطف آتا ہے۔

۲۔ دوسرے وہ جو سخاوت کر کے عزت و ناموری تلاش کرتے ہیں۔

اکابر بادیہ یا امیر المومنین عمرؓ کے الفاظ میں "ملوک بادیہ" عربوں کے شعراء

---

[1] برک ہارٹ صفحہ ۲۰۰ نابغہ ایک شاعر لکھتا ہے "اے خدا مجھے اس بات سے محفوظ رکھ کہ گفتگو میں خاموش کر دیا جاؤں" "عرب جاہلیت کے آداب اور رسوم" مصنفہ سید احمد خاں مطبوعہ ۱۸۷۰ء صفحہ ۵)

[2] حاتم قبیلہ طے کا نہایت مشہور و معروف فیاض اور بہادر شخص تھا۔ اس کی قبر اب بھی "انوارض" نامی گاؤں میں موجود ہے۔ حاتم شاعر بھی تھا۔ اس کے دیوان کا ترجمہ ۱۸۹۷ء میں بالیف شلتس F. Schulthess نے کیا ہے۔

اور فصحا، اور ایسے لوگ ہیں جو بدوی اوصاف و محاسن پر عمل رکھتے ہیں۔ طبقۂ عوام میں وہ ذیل اور ادنیٰ لوگ شامل ہیں جو ان اوصاف محاسن پر عمل نہیں رکھتے۔ الکامل کے لقب کے سوا بدوی خاص مراعات یا عزت کے القاب سے ناآشنا تھے۔ یہ لقب زمانہ قدیم میں صرف اُس شخص کو دیا جاتا تھا جو شاعری میں ملکہ رکھنے کے علاوہ بہادر، سخی، کتابت سے واقف، شناوری اور تیر اندازی میں مشاق ہوتا ہم شرافت نسل جس کو اگر ٹھیک طور پر سمجھا جائے تو بہت سی ذمہ داریاں اپنے سر لے کر آئندہ نسلوں کو باہم وابستہ رکھتی ہے۔ بدویوں میں بھی موجود ہے اپنی قوم کے شریفوں اور بڑے آدمیوں کو یاد کر کے جن کی عظمت ایک خاص طریقے کی ان کے دل میں ہوتی ہے ہر خرد و کلاں میں تعظیم و تکریم کا ایک جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ جو لوگ قوم میں بزرگ مانے گئے تھے۔ ان کی اولاد سے خواہ اُس اولاد میں اپنے اسلاف کے سے اوصاف نہ ہوں بہت خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں، بدویوں کے دلوں میں نیک اور شریفانہ کاموں کی تعریف اور قدر ہمیشہ محفوظ رہتی ہے اسلام سے قبل کے زمانہ میں وہ شخص بہت ہی شریف سمجھا جاتا تھا جو قبیلہ کا سردار ہو اور ایسا سردار ہو کہ اُس کے باپ اور دادا اور پردادا یکے بعد دیگرے یہی مرتبہ حاصل کر چکے ہوں۔ ایسے شخص کو شریف سمجھنا ایک قدرتی امر تھا، کیونکہ جب سوائے اُس شخص کے جو بدوی خوبیوں کے اعتبار سے قوم میں سب سے ممتاز ہو شیخ کا منصب کسی کو نہیں دیا جاتا تھا تو پھر ظاہر ہے کہ بدوی اوصاف ایک ایسے خاندان میں موروثی ہو جاتے ہوں گے جو چار پشتوں سے اپنے قبیلے کے لیے سردار پیدا کرتا رہا ہو[1]۔

ایک ہی قبیلے کے تمام بدوی بھائی بھائی ہوتے ہیں۔ بھائی کا لفظ قبیلے کے ہم سن لوگ آپس میں ایک دوسرے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب کوئی بڑی عمر کا آدمی اپنے قبیلے کے کسی نوجوان سے بات کرتا ہے تو اس کو "ابن اَخی" کہتا ہے اگر ضرورت پیش آتی ہے اور کوئی محتاج بھائی امداد چاہتا ہے تو بدوی اپنی اس بھیڑ کو بھی

[1] جو عزت گھاس کی طرح اُگی ہو اُس کا مقابلہ قدیم عزت اور شرافت سے نہیں ہو سکتا (حماسہ ۶۶۹)
نکلسن کی تاریخ ادبیاتِ عرب (Literary History of the Arabs) مطبوعہ ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰۰

جو گلہ ختم ہونے کے بعد صرف ایک ہی رہ گئی ہے بھائی کے کھلانے کے لیے ذبح کر ڈالتا ہے اگر کسی دوسرے قبیلے کا آدمی بھائی کی توہین کرے تو اس کو اپنی ذاتی توہین سمجھتا ہے اور جب تک بدلہ نہ لیلے چین سے نہیں بیٹھتا۔

قبیلے والوں کو جو تعلق اپنے قبیلے سے ہوتا ہے اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ بیان کرنا مشکل ہے اس تعلق کو عرب کے لوگ "عَصَبِیَّتْ" کہتے ہیں۔ یہ عصبیت ایک بڑی گہری۔ بےحد و نہایت اور مضبوط و مستقل وفاداری کا نام ہے جو ایک بدوی اپنے قبیلے سے رکھتا ہے۔ اس عصبیت سے مراد اس قبیلے کی بہبود۔ خیر و سلامتی عزت و ناموری کے لیے ہمیشہ جان و دل سے کوشش میں مصروف رہنا ہے جس میں ایک بدوی پیدا ہوا ہے اور اسی میں مرے گا۔ یہ "عصبیت" ہمارے لفظ "پیٹریاٹزم (حُبِّ وطن)" سے جہاں تک ہم اُس کے معنی سمجھتے ہیں ہم معنی نہیں ہے۔ کیونکہ حُبِّ وطن ایک ایسی چیز ہے جس میں ایک آتش مزاج بدوی کے نزدیک گرمی بہت کم ہے اہل عرب کی عصبیت ایک جانسوز اور سب پر غالب آجانے والا جذبہ ہے اور اس کے ساتھ ہی فرائض انسانی میں سب سے ضروری اور مقدس فرض ہے خلاصہ یہ کہ عرب کے ریگستانوں اور صحراؤں کا اصلی مذہب یہی عصبیت ہے[1]

ایک عرب اپنے قبیلے پر اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہے اس کے لیے وہ ایسے خطرناک معرکوں میں جان دینے کو تیار ہو جاتا ہے جن میں ایمان اور جذبے کے مل جانے سے حیرت انگیز کرشمے ظاہر ہو سکتے ہیں۔ قبیلے کا ایک بدوی دشمن سے اس وقت تک لڑتا رہے گا جب تک اس کا جسم دشمن کے پاؤں کے نیچے کچل کر بالکل مسخ نہ ہو جائے۔ ایک شاعر کہتا ہے:۔

اپنے قبیلے سے الفت رکھو۔ کیونکہ جس چیز نے تم کو تمہارے قبیلے سے وابستہ کیا ہے
وہ اس گرہ سے زیادہ مضبوط ہے جس نے شوہر کو اس کی بیوی کے ساتھ باندھا ہے[2]

غرض یہ مفہوم ہے جو ایک بدوی آزادی، مساوات اور اخوت کا لیتا ہے۔ اور یہی ترکیبیں

---

[1] دیکھو مارگولیتھ کی کتاب "محمد" دوسرا اڈیشن صفحہ ۴ (مترجم انگریزی)
[2] مُبَرَّدُ صفحہ ۲۲۳

اُس کے لیے کافی ہیں وہ زیادہ کی خواہش نہیں رکھتا۔ بلکہ زیادہ کی خواہش اُس کے خواب و
خیال میں بھی نہیں آتی۔ اپنی اِس حالت سے وہ مطمئن ہے۔ مگر یورپ اپنی حالت سے
سوائے ایک بدلتے تمام وقفے کے کبھی مطمئن رہنا جانتا ہی نہیں۔ کیا ہماری آئے
دن کی یہ مضطربانہ حرکتیں اور سرگرمیاں، معاشرتی اور سیاسی ترقیوں کے لیے ہر
وقت کی ایک گلوسوز تشنگی اور اپنے حالات کی بہتری کے لیے مسلسل جستجو۔ روشن علامتیں
اور بدیہی اقرار اُس خستگی اور بےچینی کا نہیں ہیں جو مغربی دنیا میں معاشرت کی جڑوں کو اندر
ہی اندر کھائے جاتی ہیں، ترقی کا تخیل جس کی ثنا و صفت اساتذہ اپنی کرسیوں سے اور ارباب
سیاست اپنے اجلاسوں سے اس طرح کرتے ہیں کہ سن کر نفرت پیدا ہو جائے آج
کل کے معاشرتی نظاموں کا ایک اساسی مسئلہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ لوگ
بھی جن کو تندرست اور خوش رہنے کی برکتیں نصیب ہیں ترقی و تبدیلی کے لیے اسی
طرح شورِ قیامت برپا رکھتے ہیں؟ ہم خوشحالی پیدا کرنے کی مسلسل مگر لاحاصل جستجو میں
(یعنی کل جو بنایا تھا آج اُسے ڈھا رہے ہیں۔ ایک دھوکے سے نکل کر دوسرے (۳)
دھوکے میں اور ایک مایوسی سے پیچھا چھڑا کر دوسری مایوسی میں گرفتار ہو رہے ہیں) آخرکار
اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بنی نوعِ انسان کی قسمت کی طرف سے اب قطعی مایوس اور ناامید
ہو جانا چاہیئے۔ ہم افسردگی اور پژمردگی کی ساعتوں میں پکار اُٹھتے ہیں کہ انسان
کی قسمت جمہوری حکومتوں کی قسمت کے ساتھ نہیں بندھی ہے اور اُس کے بعد ہم ایک
دن دیکھے عالم میں انجانی نعمتوں کے حاصل کرنے کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ایک
بدوی کے دل میں ایسی کمزور اور بیمار آرزوئیں آئندہ خوشی سے زندگی بسر کرنے کی نہیں
پیدا ہوتیں۔ اُس کی سُبک سیر اور فضا میں تیرتی ہوئی رُوح جو کشادہ نظر۔ بےپروا۔ اور
کورے آسمان کی مانند صاف اور پاک ہے۔ ہمارے افکار و آلام اور غیر واضح امیدوں
میں سے کسی کی بھی شریک حال نہیں۔ لیکن ہم لوگوں کو (جن کے بعید از شمار حوصلے اور
اوّلوالعزمی قوتِ اختراع سے ترقی پا کر اُن کو اور بھی مضطرب اور بےچین رکھتے ہیں)
صحرائے عرب کی زندگی اپنی یکسانی و بیرنگی کی وجہ سے ناقابلِ برداشت معلوم ہو گی

اور ہم بہت جلد اپنے انھی افکار و مشکلات اور سیاسی پریشانیوں کو جن کے خوگر ہو چکے ہیں بلکہ اُن جانگداز تکلیفوں کو بھی جو ہمارے تمدن کے ساتھ دروزہ کی طرح لگی ہوئی ہوئی ہیں اُن فوائد پر ترجیح دیں گے جو عربوں کو اپنی ناقابل تبدیل زندگی میں حاصل ہیں۔

اہل یورپ اور اہل عرب کی طبیعتوں میں ایک بڑا اساسی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ ہماری "قوت اختراع"[1] کی سرسبزی و ثمر ریزی ہم کو دماغی آرام لینے کی مطلق اجازت نہیں دیتی۔ باوجود اس تکلیف کے ہماری ترقی جس قدر بھی ہے وہ اُسی قوت اختراع کا نتیجہ ہے۔ اور اسی بنا پر ہم اپنے کو دوسروں سے بہتر اور برتر جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جہاں یہ قوت اختراع یا آخذہ موجود نہیں ہوتی وہاں ترقی ناممکن ہوتی ہے۔ اپنی معاشری زندگی کو کامل بنانے اور ابنائے آدم کے مختلف گروہوں میں باہمی تعلقات پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ذہن میں ایک صورت اس معاشرت کی پیدا ہو جو موجودہ معاشرت سے زیادہ مکمل ہے۔ لیکن عربوں میں اگر بالعموم اُن کی نسبت ایسا خیال نہیں کیا جاتا تصور یا اختراع کی قوت بہت کم[2] ہے اُن کا خون ہمارے خون سے زیادہ تیز و گرم ہے۔ اُن کے جذبات شدید ہیں۔ لیکن ان کا شمار اُن قوموں میں ہے جو ایجاد و اختراع کی قوت میں سب سے کم درجے پر ہیں۔ اس خیال کو سمجھنے کے لیے ہم کو اُن کے

---

[1] انگریزی ترجمے میں امے۔ جی نیشن کا لفظ یہاں مستعمل ہوا ہے جس کے معنی تصور کی قوت کے ہیں۔ یہاں قوت اختراع یا قوت آخذہ کا لفظ مصنف کے اصل مطلب کو میرے خیال میں زیادہ واضح کرتا ہے۔ (مترجم اردو)

[2] عربوں پر یہ اتہام قطعاً بے بنیاد ہے اور اس کے غلط ہونے کی دلیل خود مصنف ہی کے اس جملے سے مل جاتی ہے کہ "جہاں قوت اختراع یا آخذہ نہیں ہوتی وہاں ترقی ناممکن ہوتی ہے" بھلا اگر عربوں میں قوت اختراع نہ ہوتی تو وہ اس قدر حیرت انگیز ترقی علوم و فنون میں کس طرح کر لیتے۔ جس کی تعریف میں آج تمام یورپین مورخین رطب اللسان ہیں اور جنھوں نے سینکڑوں کتابیں عربوں کے تمدن و تہذیب کے متعلق سالہا سال کی تلاش و تحقیق کے بعد لکھی ہیں۔ بلکہ صحیح یوں ہے کہ یورپ کی موجودہ تہذیب تمام تر عربوں ہی کی رہین منت ہے۔ باقی رہی اسلام سے پہلے عربوں کی ترقی۔ سو اس زمانہ کے عربوں کے متعلق بھی یہ الزام بالکل غلط ہے اور اس کا ناقابل تردید ثبوت مشہور مصری عیسائی فاضل جرجی زیدان نے ایک بیش بہا کتاب "العرب قبل الاسلام" لکھ کر دیا ہے جس میں اُس نے واقعات اور شواہد سے ثابت کیا ہے کہ تمام دنیا میں عرب ہی وہ پہلا مطلع ہے جہاں سب سے اول آفتاب تہذیب طلوع ہوا۔
(اسماعیل)

مذہب اور ادبیات پر ایک نظر ڈالنی چاہیے۔ اسلام لانے سے پہلے اس میں شبہ نہیں کہ عربوں کے بہت سے خدا اجرامِ فلکی کی تماثیل کے تھے لیکن ہندوؤں یا یونانیوں کی طرح ان خداؤں یا بتوں کے متعلق قصص کا کوئی علم اُن میں مُتعدن نہ تھا۔ ان کے اصنام کوئی داستانی تاریخ نہ رکھتے تھے اُن کے کسی شاعر تک کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ اُن خداؤں یا بتوں کی نسبت قصوں کا کوئی دفتر اپنی طرف سے مرتب کر دیتا۔[1] رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی جس مذہب کا وعظ کیا وہ ایک بہت سیدھی سادی وحدانیت تھی جس میں چند قواعد اور رسوم موسوی دین اور پُرانی اصنام پرستی سے لے کر اضافہ کر دیے گئے تھے۔[2] اس میں ہرگز کلام نہیں کہ ایجابی ر) مذاہب میں یہ مذہب سب سے زیادہ صاف اور سادہ اسرار سے پاک مذہب ہے اور اُن لوگوں کی نظروں میں جو ماورات فوق الفطرت کو حتی الامکان مذہب سے خارج رکھنا چاہتے ہیں اور عبادت الٰہی سے رسمیات اور سامانِ آرائش کو دُور رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ مذہب سب سے زیادہ طاہر اور

[1] ان کے شاعروں کو تو بتوں کے متعلق قصوں کا دفتر مرتب کرنے کا خیال اس وقت آتا جب وہ مزخرفات اور جھوٹے قصے گھڑنے میں رومیوں اور قدیم یونانی جیسے بزرگوں کی تقلید کرتے لیکن چونکہ عرب شاعروں کو بدقسمتی سے یہ فخر حاصل نہ ہو سکا اسلئے ان کی شاعری صرف واقعیت اور اصلیت پر مبنی ہو کر رہ گئی۔ اسماعیل

[2] اس مقام پر مصنف کا تعصب نہایت قابلِ افسوس ہے۔ آنحضرت نے جس خالص اور بےعیب اور جس بہترین اور اعلیٰ ترین وحدانیت کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ دنیا ہزاروں لاکھوں ٹکر کھانے کے بعد بھی اس کی نظیر نہیں لا سکتی مگر مصنف کو یہ خالص وحدانیت بھی موسویت اور بت پرستی سے ماخوذ نظر آئی۔ یقیناً دنیا کا ایک بھی مذہب ایسا نہیں جس نے اسلام کی مانند خدائے واحد و برتر کی اتنی زیادہ۔ اتنی کامل اور اتنی اعلیٰ صفات بتائی ہوں۔ خدا کی وہ صفات تو ہر مسلمان کے بچے سے سنی جا سکتی ہیں اور اہلِ علم نے دفتر کے دفتر اس بحث میں لکھ ڈالے ہیں لیکن کیا یہودیت اور عیسائیت ان کا پانچواں حصہ بھی پیش کر سکتی ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں اس صاف اور واضح اسکی برتری میں مصنف کا یہ کہنا کہ چند قواعد اور رسوم موسوی دین اور پرانی اصنام پرستی سے لے کر اضافہ کر دیئے گئے تھے کیسا ضعیف خیال ہے۔ مصنف نے کوئی مثال اپنے خیال کے ثبوت میں پیش نہیں کی۔ ہمارا پُر زور دعویٰ ہے کہ اسلام کے خدا کی ایک صفت بھی ایسی نہیں جس سے اعلیٰ اور عمدہ صفت موسوی دین یا دنیا کا [illegible] پیش [illegible] ظاہر ہے کہ [illegible] (باقی بر صفحہ آئندہ)

مطابق عقل ہے۔ مذہب ہی کی طرح ادبیات عرب کا حال ہے کہ اُس میں بھی اپنی طرف سے کوئی بات پیدا نہیں کی گئی۔ ایجاد و اختراع کا مادہ یہاں بھی مفقود ہے۔ یہاں بھی محض واقعیت اور بداہت کی طرف میلان ہے۔ دنیا کی اور قوموں نے اپنے بتوں اور سورماؤں کے کاموں پر بڑی بڑی نظمیں لکھ ڈالیں جن میں فوق الفطرت باتوں کو سب سے زیادہ جگہ دی گئی مگر عرب کی ادبیات میں ایسی نظموں کا پتہ تک نہیں۔ اس قسم کی نظمیں
(۹) تو درکنار کوئی قصہ یا افسانہ تک نظم نہیں ہے۔ عربوں کی نظم سرودی یا بیانیہ رہی ہے واقعیت کے شاعرانہ پہلو کے سوا اور کوئی بات بیان نہیں کی۔ عرب کے شعراء نے جس چیز کو مشاہدہ کیا یا محسوس کیا اُسے بیان کر دیا۔ کوئی بات ایسی پیدا نہیں کی جو خاص اُن کی طبعزاد کہلائی جا سکے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اگر کبھی تصور یا ایجاد کی کوئی جھلک دکھائی بھی تو خود اُن کی قوم کے نقاد بجائے تعریف کے ترش رو ہو کر اُن کو جھوٹا اور کاذب کہنے لگے۔ انتہا سے مافوق یا تخیل اعلیٰ کی طرف پرواز کرنے سے بدوی نا آشنا ہے اور نہایت قدیم زمانے سے اس کے نزدیک شاعری کا محض اصطلاحی پہلو یعنی صحت واقعہ اور حسن بیان شاعری کا سب سے بڑا جوہر رہا ہے۔ ایجاد فی الحقیقت عربی ادبیات میں اس قدر شاذ و نادر ہے کہ اگر کسی خیالی نظم یا قصے میں اس کے نشانات ملیں بھی تو فوراً یقین کر لینا چاہیئے کہ کوئی ترجمہ سامنے ہے عرب کی اصلی تصنیف نہیں ہے مثلاً الف لیلہ میں جس قدر قصے جادو اور سحر کے ہیں یا جیسا ایک

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کس طرح ہو سکتی ہے۔ البتہ یہ ہم مانتے ہیں کہ تمام انبیائے بنی اسرائیل خدا کے سچے رسول تھے اور ان سب نے متفقہ طور پر کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کی اور اسی کی تبلیغ آنحضرت نے فرمائی۔ کیونکہ ہدایت اور خدا تک پہنچنے کا راستہ ایک ہی ہے۔ اگر صرف اتنی سی بات سے اسلام کو موسویت سے ماخوذ مان لیا جائے تو پھر بنی اسرائیل کے ہر نبی کی تعلیم اپنے ماسبق نبی کی تعلیم سے اخذ شدہ ماننی پڑے گی۔ کیا عیسائی دنیا یہ ماننے کو تیار ہے کہ "پرانی اصنام پرستی" سے اسلام کی اعتقاد وحدانیت کا ماخوذ ہونا تو اس سے زیادہ قابلِ مضحکہ بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ بھلا دنیا کا وہ ہادی اعظم جس کی ساری عمر ایک اکیلے اور واحد خدا کے منوانے میں گذر گئی، وہ اس قوم کے اصولوں سے کیا اخذ کر سکتا تھا جو پتھر کے ایک ایک ٹکڑے ٹکڑے میں بھی تمام خدائی صفات موجود مانتی تھی۔ لہذا ہم کو تعصب اور بناوٹ نہ آتی تھی جس کی یورپ قدر کرتا ہے اس لئے جو کچھ لکھا حقیقت پر مبنی ہے مگر اس کو کیا کیا جائے کہ جو چیز عربوں کے نزدیک موجبِ ننگ و عار تھی وہی یورپ کے لیے طغرائے امتیاز ہے (اسمعیل)

ایک شاداب اور پُرنمو تصور کے حیرت انگیز کرشمے ہیں اور جو ایام طفلی میں ہم کو مسحور کر دیتے تھے اُن سب کی اصلیت ایرانی یا ہندی ہے۔ اس بڑے مجموعۂ قصص میں صرف وہی قصے فی الواقع اہل عرب کے ہیں جن میں آداب معاشرت کی تصویریں اور مرقعے لطائف و ظرائف۔ انسان کی واقعی زندگی کے مشاہدوں سے تیار کیئے گئے ہیں۔

اخیر میں جب اہل عرب نے بڑے بڑے ملکوں کو تلوار کی دھار سے فتح کر کے اپنی توجہ علوم و فنون کی طرف مبذول کی تو اُس وقت بھی یہی کمی ظاہر ہوئی کہ خود کوئی چیز جو خاص اُن کی مخترع کہلائی جائے پیدا نہ کر سکے[1] قدما کی تصانیف کے ترجمے کیے۔ اُن کی کی شرحیں لکھیں۔ نہایت صبر و تدقیق اور باریک مشاہدات سے علوم کی اکثر شاخوں کو ثمرور کیا لیکن کوئی بڑا اکتشاف اُن سے نہ ہو سکا اور کوئی ایک بھی بڑا اور

[1] پروفیسر ڈوزی کا یہ کہنا کہ عربوں میں تصور یا اختراع (یعنی امیجی نیشن) کی قابلیت کم تھی ایک ایسا اعتراض ہے جسکی صراحت اور توضیح ان کو کرنی ضروری تھی۔ تاریخ کا مطالعہ اس امر کو صاف طور پر واضح کرتا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے زمانہ کے اکثر علوم و فنون کو اس قدر ترقی دی تھی کہ سابقین سے ممکن نہ ہوئی تھی اور انھوں نے اپنی ضروریات اور اُس وقت کے حالات کے مطابق مختلف صنعتوں میں بھی کافی دستگاہ بہم پہنچائی تھی۔ نیز اکثر مفید ایجادوں میں بھی ان کا پایہ کسی سے کم نہیں رہا تھا چنانچہ فرانس کا نامور مورخ "سیدیو" تاریخ عرب" میں عربوں کی ایجادوں کا تذکرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ بعض یورپین اہل قلم عربوں سے چیزوں کے ایجاد کر لے کا شرف زبردستی چھیننا چاہتے ہیں۔ اُن کے بیان پر کوئی التفات و اعتبار نہ کرنا چاہیے (صفحہ ۴۷۵)

اسی تاریخ میں ایک جگہ سیدیو کہتا ہے "عربوں کے بیشمار نتائج افکار اور اُن کی نفیس نئی نئی ایجادیں اس بات کی شاہد عادل ہیں کہ وہ سب باتوں میں اہل یورپ کے اُستاد ہیں (صفحہ ۴۰۰) ایک مقام پر سیدیو نے ایک عجیب چوری کی حقیقت نہایت صفائی سے کھولی ہے۔ یعنے لکھتا ہے "عرب علما نے جو متعدد نئی نئی ایجادیں کیں اہل یورپ نے اُن میں سے اکثر اکتشافات کو اپنے ہاں کے اُن علماء کی طرف منسوب کیا ہے۔ جو پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں ہوئے ہیں (صفحہ ۴۱۵) اور یہ بات سیدیو نے بلا دلیل نہیں لکھی بلکہ ثبوت میں دس بڑی بڑی ایجادیں تفصیل کے ساتھ گنوائی ہیں۔ جن کی اختراع یورپین لوگ نہایت دیدہ دلیری سے اپنی قوم کی طرف منسوب کرتے ہیں (اسمٰعیل)

نتیجہ خیز تخیّل ایسا نہیں جس کے لیے ہم اُن کے شکر گذار ہوتے۔

غرض یہ قلب و جگر کی تہ میں بیٹھے ہوئے فرق ہیں جو عربوں میں اور ہم میں موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ عرب اپنے خصائص میں ہم سے زیادہ بلند پایہ ہوں۔ اور روح کی حقیقی عظمت اور انسان کے اصلی مرتبے کو وہی ہم سے زیادہ گہری نظر سے دیکھ سکے ہوں۔ یہ سب کچھ سہی۔ مگر اُن میں ترقی اور نمو کے وہ جراثیم موجود نہیں جو ہم میں موجود ہیں۔ شخصی آزادی حاصل کرنے کا بلاخیز شوق اور سیاسی عقل سے بالکل مُبرّا ہونا ایسے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوانین معاشرت کے تابع ہو کر زندہ رہنے کی قابلیت اُن میں مطلق نہ تھی۔ باوجود اس کے اُنھوں نے کوشش کی اور ایک پیغمبر نے اُن کو صحراؤں سے نکال کر دنیا فتح کرنے کے لیے روانہ کر دیا اور اس دنیا کو انھوں نے اپنے کارناموں کی شوکت سے معمور کر دیا۔ بیس ملکوں کا مال غنیمت حاصل کر کے عیش و عشرت کے مزے سیکھ لیے۔ اپنی ہی محکوم قوموں کے میل جول سے اکتساب علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور تہذیب و تمدن کی اُس بلندی پر پہنچے جہاں تک پہنچنا اُن سے ممکن تھا۔ رسول اللہ (صلعم) کے بعد بہت مدت گذر نے پہ اہل عرب اپنی پرانی قومی خصلتوں کو بھول سکے۔ اندلس میں جس وقت جہازوں سے اُترے ہیں تو وہ ڈال کے ٹوٹے اپنائے باوبہ تھے اور یہ امر اُن کے لیے قدرتی تھا کہ دریائے تاجر the Tagus اور وادی الکبیر the Guadalquivir کے ساحلوں پر بھی وہ انہی لڑائیوں میں مصروف رہنے کے خواب دیکھا کریں جو عرب، شام اور افریقہ میں اُن میں ہوتی رہی تھیں۔ اب انہی لڑائیوں اور جھگڑوں کی طرف جن کا سلسلہ ختم ہونا نہ جانتا تھا ہم کو سب سے پہلے توجہ کرنی ہے۔ مگر ان نزاعات کو سمجھنے کے لیے ہمیں فوراً پیغمبر عرب کے زمانے کی طرف واپس جانا چاہیے۔

کتاب اوّل

خانہ جنگی

دوسری فصل

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں عرب کی آبادی متعدد قبائل پر مشتمل تھی۔ ان میں بعض مستقل طور پر شہروں میں آباد تھے، مگر کثرت سے قبیلے ایسے تھے جو خانہ بدوش رہتے تھے۔ ان خانہ بدوش قبیلوں میں نہ کسی قسم کا اتحاد تھا اور نہ کوئی مرکزی حکومت تھی جس کے سب تابع ہوتے۔ وہ ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اگر شجاعت کسی قوم کو مغلوبیت سے بے نیاز کر سکتی ہے تو یقیناً عرب کے لوگ ایسی ہی حربی قوم تھے۔ دنیا کے کسی خطے پر ذوقِ جنگ آوری ایسا عالمگیر نہ تھا جیسا کہ یہاں تھا۔ بغیر لڑے لوٹ کا مال نہ مل سکتا تھا اور لوٹ کا مال بدویوں کی روزی تھی۔ اس کے علاوہ لچکدار نیزوں اور چمکتی ہوئی تلواروں کے چلانے۔ دشمنوں کا سر توڑنے اور قلم کرنے اور حریفِ مقابل کو اس طرح پیس ڈالنے میں جیسے چکی کے پاٹ اناج کو پیس ڈالتے ہیں اور مغلوبین کو کسی بُت کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ ویسے ہی قربانی کر ڈالنے میں اُن کو شراب کا سُرور حاصل ہوتا تھا۔

لڑائی میں جواں مردی کے جوہر دکھانے سے وہ شاعروں کی تعریف اور عورتوں کی

الفت کے مستحق ہو جاتے تھے۔ عرب کی عورتوں نے بھی اپنے بھائیوں اور شوہروں کی شجاعت و بسالت دیکھتے دیکھتے اپنی طبیعتوں میں لڑائی کا وہی شوق اور جذبہ پیدا کر لیا تھا جو اُن کے مردوں میں تھا۔ عورتیں لڑنے والے قبیلے کے پیچھے پیچھے چلتی تھیں۔ زخمیوں کی خدمت کرتی تھیں اور لڑنے والوں کی ہمت ایسے اشعار پڑھ کر بڑھاتی تھیں جن کا ایک ایک لفظ خونخواری اور درندگی میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا للکار للکار کر کہتی تھیں "ہمت! ہمت! اے عورتوں کے محافظو! ہمت سے کام لو! اپنی تلواروں کی دھار سے دشمن کو کاٹ ڈالو۔ ہم طارق (ستارۂ سحر) کی بیٹیاں ہیں۔ جن غالیچوں پر ہمارے پاؤں پڑتے ہیں وہ نرم ہیں۔ ہمارے گلوں میں موتیوں کے ہار ہیں۔ ہماری زلفیں عنبریں ہیں۔ جو بہادر دشمن سے لڑیں گے ہم اُنھیں گلے لگائیں گے۔ لیکن جو بزدل ہو کر لڑائی سے بھاگیں گے ہم انھیں ٹھکرا دیں گے اور ہماری باہیں ان کے گلوں میں نہ پڑیں گی۔" باوجود اس شجاعت و جانبازی کے اس قوم کی اصل کمزوری ایک عاقل کی سمجھ میں آسانی سے آسکتی تھی۔ کمزوری (۱۲
اس میں یہ تھی کہ قبیلوں میں کسی قسم کی یک جہتی اور اتفاق نام کو نہ تھا۔ آپس کی لڑائیاں آئے دن کا شغل تھا۔ اگر عرب کا ملک اتنا مفلس نہ ہوتا کہ اس کا فتح کرنا بے سود سمجھا جاتا تو اس عدم اتحاد و یک جہتی کی وجہ سے باہر کا کوئی بھی غنیم اس کو بہت آسانی سے فتح کر لیتا۔

جس وقت عرب کے ایک شہزادے نے بادشاہِ ایران سے کمک مانگی اور اس کے معاوضہ میں ملک کا ایک علاقہ دینا چاہا تو بادشاہ نے جواب دیا "تمہارے ملک میں دھرا کیا ہے؟ کچھ بھیڑیں ہیں اور کچھ اونٹ ہیں۔ ایسے ذلیل معاوضہ میں میں اپنا پر شکوہ اور زبردست ایرانی لشکر تمہارے ریگستانوں میں بھیجنا گوارا نہیں کر سکتا۔"

باوجود اس کے وہ دن آیا کہ عرب فتح کر لیا گیا۔ مگر کس نے فتح کیا؟ اسی کے ایک یتیم بچے نے۔ عجیب شخص تھے۔ محمد عربی!!! صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

. . . .

. . . .

. . . .

. . . . لہ

افراد کی مانند قوموں کا بھی یہی حال ہے کہ اُن میں بعض طبعاً مذہبی ہوتی ہیں اور بعض اس کے برعکس۔ بعض کے لیے مذہب اُن کی زندگی کا سنگ بنیاد ہوتا ہے۔ بغیر مذہب کے دنیا میں اُن کا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ جس دین میں وہ پیدا ہوئے
(۱۳) ہیں اگر اتفاقاً اس سے بیزار ہو جاتے ہیں تو فوراً دوسرا کوئی حکیمانہ طریقہ جو اُن کے پہلے دین سے بھی زیادہ خلاف عقل اور پُراز اسرار ہوتا ہے ایجاد کر کے اختیار کر لیتے ہیں غرض دنیا میں قومیں اسی طرح مذہب کے لیے اور مذہب کے سہارے سے زندہ رہی ہیں اور مذہب ہی میں اُن کو امید اور تسلی ملی ہے۔ لیکن عرب کے لوگ قدرتی طور پر مذہبی نہ تھے^۲ اور اس اعتبار سے اُن میں اور اور قوموں میں جنھوں نے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) شجرہ نسب یہ ہے۔　عبدالمطلب (بنی ہاشم)

(۶)	(۵)	(۴)	(۳)	(۲)	(۱)
حمزہ	العباس	عبداللہ سا آمنہ (بنی زہرہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)	ابولہب	ابو طالب	الحارث

لہ یہاں انگریزی کتاب کی اٹھ سطروں کا ترجمہ میں نے نہیں کیا ان میں مؤرخ نے عیسائی مصنفوں کے معمولی غلط اور فرسودہ اعتراضات آنحضرتؐ کی ذات پاک کی نسبت مثلاً جسمانی کمزوری۔ اعصابی ضعف غیر معتدل و معلول احساس۔ روحانی عادت نزول وحی کی کیفیت کو مرض کے دوروں سے تعبیر کرنا مکی اور مدینے کی زندگی کا فرق وغیرہ دہرائے ہیں۔ یہ محض مذہبی تعصب ہے جو عیسائیوں کے قلم سے لیے مہمل اعتراضات لکھوا تا رہا اور باوجود جواب پانے پر بھی انکے اعادہ سے باز نہیں آیا میں نے ان سطور کے ترجمہ سے پرہیز کیا ہے۔

ئے یہ کہنا کہ عرب کے لوگ قدرتی طور پر مذہبی نہ تھے خلاف واقعہ ہے مختلف مذاہب کا عرب میں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ مذاہب کے ماننے والے وہاں موجود تھے اور مذہب کیطرف اُن کی طبیعتیں مائل تھیں یہ فقرہ مصنف نے اجرا اسلام کے حالات بیان کرنے میں بالخصوص کسی مذہب کا ماننے والا معلوم نہیں ہوتا عربوں کی کسی قدر تعریف میں بعد اسلام سے شروع میں جو مخالفت عربوں نے کی اسکی تائید میں لکھا ہے گرچہ کچھ لکھا ہے وہ واقعہ نہیں ہے (مترجم)

اسلام قبول کیا بڑا فرق تھا۔ اس پر کچھ متعجب نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ مذہب کی اصلی حالت یہ ہے کہ جو قابو اور غلبہ اس کو انسان کے تخیل و تصور پر حاصل ہے وہ انسان کی عقل و دانائی پر نہیں ہے مثلاً آج کل کے بدوؤں کی مثال لیجیے۔ کہنے کو وہ مسلمان ہیں لیکن ارکان اسلام ادا کرنے کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنے کی بجائے جس کا حکم ان کو مذہب نے دے رکھا ہے وہ ایک وقت کی نماز نہیں پڑھتے عرب کے (عیسائی) سیاح برک ہارٹ نے جو بدوؤں سے خوب واقف تھا۔ اس بات کی شہادت دی ہے کہ غیر مذاہب سے رواداری رکھنے میں عرب کے لوگ ایشیا کی باقی تمام قوموں سے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ مذہبی رواداری اُن میں بہت پرانے وقتوں سے چلی آتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس قوم کو آزادی بحد عزیز ہو وہ مذہب کے استبداد کو بھی گوارا نہیں کر سکتی۔ مرثد جو چوتھی صدی عیسوی میں یمن کا بادشاہ تھا کہا کرتا تھا کہ "میں آدمیوں پر حکومت کرتا ہوں۔ اُن کی آراء پر حکومت نہیں کرتا میں اپنی رعایا سے اس بات کا متوقع رہتا ہوں کہ وہ میرے حکموں کے پابند رہیں گے لیکن اُن کے مذہبی معتقدات کو میں انہی کے پروردگار کے فیصلے پر چھوڑتا ہوں" اس مضمون پر شہنشاہ فریڈرک دوم بھی مرثد سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ لیکن اس قسم کی مذہبی رواداری بہرکیف مذہب کی طرف سے بے توجہی۔ تغافل و تشکیک کے لگ بھگ ہو جاتی ہے۔ اسی بادشاہ مرثد کے بیٹے نے پہلے موسوی دین اختیار کیا۔ پھر عیسوی دین۔ اور جب مرنے کو ہوا تو ان دونوں مذہبوں کے بیچ میں ڈانواں ڈول تھا۔ عرب میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں تین مذہب رائج تھے۔ ایک موسوی دوسرا نصرانی۔ تیسرا ایک قسم کا تعدد خدایان تھا۔ ان سب میں غالباً یہودی عرب

لہ خانہ بدوش اقوام کی دنیا کے سارے ممالک میں یہی حالت رہی ہے اور ہے پھر بچارے بدوؤں کی ہی کیا خصوصیت ہے؟ اور آجکل تو مہذب اور تعلیم یافتہ عیسائی دنیا کو مذہب سے کچھ واسطہ نہیں۔ (اسمٰعیل)

لہ سیاح پامر نے عربوں کو اس الزام سے بری کیا ہے کہ وہ لامذہب ہیں یا مذہب کی حرمت نہیں کرتے لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ کہنے کو وہ مسلمان ہیں لیکن اسلام کے نام کے سوا اس مذہب سے اور کچھ واقفیت نہیں رکھتے
مترجم انگریزی

ایسے تھے جو اپنے دین کو دل سے مانتے تھے۔ اور یہی لوگ ایسے تھے جو مذہبی رواداری کو جائز نہ سمجھتے تھے۔ مذہب کی بنا پر جبر و تعدی کی مثالیں عرب کی ابتدائی تاریخ میں شاذ و نادر پیش آئیں۔ اور اگر پیش آئیں بھی تو اُن کے مرتکب یہی یہودی عرب ہوئے نصرانی مذہب کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور اُن میں زیادہ تر عرب ایسے تھے جن کو اپنے اس مذہب کا علم بالکل سطحی تھا۔ امیرالمومنین علی نے ایک مرتبہ عرب کے قبیلۂ تغلب کی نسبت فرمایا کہ "تغلب نصرانی نہیں ہیں۔ نصرانیت سے جو کچھ انھوں نے سیکھا ہے وہ شراب خواری ہے۔[1]" حضرت علی کے اس قول میں کچھ مبالغہ نہ تھا نصرانیت میں معجزات اور اسرار کی اتنی کثرت تھی کہ یہ مذہب ایک مشکک اور دین کا استہزا کرنے والی قوم کے سامنے اپنے مقبول ہونے کی سفارش نہ کر سکا چنانچہ اس کا ثبوت بھی اُن چند اسقفوں کو ملا جو سنہ ۵۱۳ء کے قریب حیرہ[2] کے بادشاہ منذر ثالث کو عیسائی مذہب میں لانا چاہتے تھے۔ بادشاہ نے پادریوں کی تقریر بہت غور سے سن لی تو حاضرین دربار میں سے ایک شخص نے قریب آکر بادشاہ کے کان میں کچھ کہا منذر نے فوراً اپنا چہرہ ایسا بنا لیا جس سے بیحد رنج و الم ظاہر ہوتا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر پادریوں نے بہت ادب سے پوچھا کہ اس تغیر کا کیا باعث ہوا؟

منذر نے جواب دیا "افسوس! مجھے ابھی یہ جانکاہ خبر سنائی گئی ہے کہ ملائکہ کے سردار میکائیل کا انتقال ہو گیا۔

پادریوں نے کہا "اے بادشاہ نہیں۔ اس میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے فرشتے تو غیر فانی ہیں۔"

منذر نے بہت بیتاب ہو کر کہا۔ "غیر فانی! واہ۔ ابھی تو تم مجھے اس کا یقین دلا رہے تھے کہ خدا خود مر گیا۔

عربوں میں تعدد خدایان کے ماننے والے یعنی بت پرست بکثرت تھے اُنکے

[1] بیضاوی۔ تفسیر قرآن۔ سورہ ۵۔ آیت

[2] قدیم شہر بابل کی حدود میں ایک شہر تھا جسے غالباً سنہ ۲ء میں عربی قبائل نے بسایا تھا۔ (مترجم انگریزی)

ہر قبیلے بلکہ ہر خاندان کا خدا جدا تھا۔ لیکن ایک خدائے بزرترین جس کو اللہ کہتے تھے اُس کے بھی قائل تھے۔ باقی جس قدر خدا تھے وہ اللہ اور اس کے بندوں میں ایک واسطہ تھے۔ یہ بت پرست عرب اپنے کاہنوں اور بتوں کی عزت ایک خاص طریقے کی کرتے تھے اگر کسی کاہن کی پیشینگوئی پوری نہ اُترتی تو اس کو مار ڈالتے تھے۔ اگر منّت میں ایک ہرن مانا ہے اور مراد پوری نہ ہوئی تو ہرن کے بدلے ایک بھیڑ قربانی کر دیتے تھے۔ یا جس بت کے سامنے مُنّت مانی تھی اُس کو گالیاں دینے لگتے تھے۔

جس وقت امرء القیس اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے اٹھا ہے جسے بنی اسد نے مار ڈالا تھا تو راستے میں ایک مقام پر جہاں ذو الخلصہ نامی ایک بت رکھا تھا، اس غرض سے ٹھیر گیا کہ تیروں کے ذریعے سے اس عزم کے متعلق استخارہ کرے۔ چنانچہ تین تیر لیے ایک کو آگے بڑھنے۔ دوسرے کو عزم فسخ کرنے اور تیسرے کو عزم ملتوی کرنے سے تعبیر کیا اور پھر اِن تیروں کے ساتھ ملا کر قاعدہ کے مطابق ایک ایک تیر نکالنا شروع کیا پہلی مرتبہ جو تیر نکلا وہ اِس عبارت کا تھا کہ عزم فسخ کر دیا جائے۔ دوسری بار تیر نکالا تب بھی اسی مضمون کا تیر نکلا۔ جب تیسری بار بھی یہی فال نکلی تو امرء القیس نے تمام تیروں کو توڑ کر اُن کے ٹکڑے بُت کے منہ پر کھینچ مارے اور بت سے کہا "کم بخت! اگر تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو پھر بدلہ لینے سے تو مجھے ہرگز نہ روکتا"۔ ایک عرب مذہب خواہ کچھ ہی رکھتا ہو مگر وہ مذہب کو اپنی زندگی میں کوئی ممتاز جگہ نہ دیتا تھا۔ کیونکہ اس کو دنیا کے دھندوں لڑنے مرنے، جواء کھیلنے، شراب پینے اور عشقبازی سے کبھی مہلت ہی نہ ملتی تھی۔ شعراء عرب کا قول تھا، "آؤ آج چین کر لیں۔ کیونکہ موت ہم پر جلد قبضہ کرنے والی ہے" اور اسی مقولے پر اہل بادیہ کا اِس زندگی میں عمل تھا۔ وہ ہی لوگ جو شجاعت کے کسی کام یا اچھے شعر کو سنکر جھومنے لگتے تھے۔ جب مذہب کا ذکر آتا تھا تو بالکل سرد اور بے رُخ معلوم ہونے لگتے تھے۔ شاعر جو قومی خیالات کے بہترین شارح ہوتے ہیں مذہب کا تذکرہ اپنے اشعار میں بہت کم لاتے تھے۔ طرفہ ابن العبد کے اشعار ہیں:۔

صبح تمہارے آتے ہی شراب سے لبریز ایک ساغر نہیں دونگا۔ اگر پہلے سے پیئے ہوگے تو

اس کا خیال نہ کرنا میرے ساتھ ضرور بادہ نوشی کرنی ہوگی۔ میرے ہم مشرب شریف نوجوان ہیں جن کے چہرے ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ ہر شب ایک گانے والی دھاریوں دار لباس پہنے اور زعفرانی رنگ کی قبا زیب بدن کیے ہماری جلیس ہوتی ہے۔ گردن سے نیچے اس کا لباس کھلا ہوتا ہے عاشقوں کے ہاتھ جوبن لوٹتے ہیں مگر وہ خفا نہیں ہوتی۔ میری زندگی تو شراب اور نفس کی لذتوں پر وقف ہے۔ اپنا مال واسباب سب بیچ چکا ہوں۔ جو کچھ خود کمایا اور جو کچھ ماں باپ سے پایا وہ بھی اڑا چکا ہوں۔ لیکن اے ناصح مشفق اتم جو میرے شوق شراب اور خوئے جنگ جوئی کو برا کہتے ہو تو کیا آپ مجھے بقائے دوام بخش سکتے ہیں؟ اگر آپ اپنی عقل و فراست سے موت کے ناگوار وقت کو نہیں ٹال سکتے تو پھر اس سے پہلے کہ موت اپنا چنگل مجھ پر چلائے مجھے دنیا کی تمام لذتوں سے متمتع کیوں نہیں ہونے دیتے؟ وہ انسان جن کے جذبات میں فیاضی ہے جب تک جیتے ہیں خوب پیتے ہیں اے ناصح سخت گیر جب زندگی نہ ہوگا اور میں بھی نہ ہونگا تو پھر دیکھو نگا کہ شدتِ تشنگی کسے چونکے ڈالتی ہے؟"

تاہم بعض واقعات ایسے دریافت ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عربوں میں مذہبی جوش و خلوص خاص کر اُن عربوں میں جو شہروں میں آباد تھے موجود تھا۔ مثلاً نجران کے شہر میں بیس ہزار عرب عیسائیوں کو مجبور کیا گیا کہ یا تو مرنا قبول کریں یا یہودی ہو جائیں تو انھوں نے آگ میں جلنا منظور کر لیا۔ مگر اپنا مذہب نہ چھوڑا۔ لیکن اس قسم کا جوش عربوں میں ایک مستثنےٰ مثال ہے۔ مذہب کی طرف سے اگر اُن میں بالکل بے پرواہی نہ تھی تو سرد مہری تو ضرور تھی۔

پس ظاہر ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی نبوت کا اعلان کرنے پر ایک ایسا کام درپیش ہوا جس میں دو قسم کی مشکلیں تھیں۔ اُن کو صرف یہی نہیں کرنا تھا کہ جس دین کی دعوت دیتے تھے۔ اس کے حقائق سمجھائیں بلکہ اُن کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ ملک والوں پر جو علمی و دماغی غفلت چھائی ہوئی تھی اُس سے انھیں بیدار کریں۔ مذہب کا خیال اُن میں پیدا کریں اور ہدایت کریں کہ دین ایسی چیز نہیں جس سے بے پرواہی یا غفلت کی جائے خلاصہ یہ کہ

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک نفس پرور، متشکک اور استہزا پسند قوم کو ایک نئے قالب میں ڈھالنا اور اُن کی قلب ماہیت کرنی تھی۔ یہ کام ایسا سخت تھا کہ اگر ان کو اپنی رسالت کے برحق ہونے کا یقین اس درجے نہ ہوتا جس درجے کہ وہ رکھتے تھے تو پھر ایک انسان کی قدرت سے باہر تھا کہ اس سے سر براہ ہونے میں اپنے حواس سلامت رکھ سکتا۔ مکے والے جو اُن کے ہم وطن تھے یا تو اُن پر ترس کھاتے یا اُن کا مضحکہ اڑاتے۔ کوئی ان کو شاعر بتاتا جس کے سر پر جن آتا ہے۔ کوئی اُنہیں کاہن کہتا۔ کوئی جادوگر۔ کوئی مجنوں۔ جب لوگ انھیں سامنے سے آتا دیکھتے تو کہتے "دیکھو وہ عبداللہ کا بیٹا آسمان سے وحی (۱۶)
لیے چلا آتا ہے" کوئی بظاہر احسان رکھنے کو کہتا کہ "ہم اپنے صرف سے ان کے لیے طبیب بُلا دیں جو اِن کا علاج کرے"۔ کوئی ان پر غلاظت پھینکتا۔ گھر کی دہلیز سے باہر لوگ راہ میں کانٹے بچھا دیتے۔ نہایت سخت الفاظ کہہ کر لوگ اُن کو پُکارتے۔ مکہ سے نکل کر آپ باہر گئے تو بھی کوئی اچھی صورت پیدا نہ ہوئی۔ طائف میں وہاں کے رئیسوں کو جمع کر کے اسلام کی دعوت دی۔ مگر یہاں بھی لوگوں نے ستایا۔ ایک نے کہا "کیا خدا کو تم سے بہتر رسول نہیں ملا؟" دوسرے نے کہا "میں تم سے بحث کرنی نہیں چاہتا اگر تم نبی ہو تو پھر ایسے برگزیدہ ہو کہ مجھے تم سے بات کرنے کی مجال نہیں ہو سکتی اور اگر تم جھوٹے ہو تو اس لائق نہیں کہ میں تم سے بات کروں۔" محمدؐ مایوس ہو کر اس مجمع سے رخصت ہوئے۔ جب چلے تو لوگ توہین و استہزا کرتے ہوئے اور پتھر مارتے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

اِس حالت میں دس برس سے زیادہ گذر گئے مگر مسلمانوں کی تعداد تھوڑی ہی رہی تمام قرائن کہتے تھے کہ یہ نیا دین جلد مٹ جائیگا اور مٹے گا بھی ایسا کہ اس کا نام و نشان نہ رہے گا۔ مگر یہی زمانہ تھا کہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اوس اور خزرج کے قبیلوں سے ایسے معاون مل گئے جن کے ملنے کی توقع تک نہ ہو سکتی تھی۔ اوس اور خزرج کے

له یہ سطور ان اشخاص کو خاص طور سے پڑھنی چاہئیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اعتراضاً کہا کرتے ہیں کہ جاہل اور وحشیوں میں دین کا پھیلانا کیا مشکل بات تھی" (اسمٰعیل)

یہ دونوں قبیلے وہ تھے جنھوں نے پانچویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہجرت سے تقریباً سوا سو برس پہلے یہودیوں کے قبضے سے مدینہ کو نکال لیا تھا۔ مکہ اور مدینہ کے لوگ آپس میں عداوت رکھتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ دو مخالف اور متضاد نسلوں کے لوگ تھے عرب میں ایسی دو مخالف نسلیں موجود تھیں ایک یمانیہ اور دوسری معدیہ۔ مدینہ والے یمانیہ سے تھے اور مکہ والے اُن سے نفرت ہی نہیں بلکہ دشمنی رکھتے تھے ایک عرب کے نزدیک جو صرف گلّہ بانی اور تجارت کے پیشوں کو ایک آزاد انسان کے لیے جائز سمجھتا ہو زراعت کا پیشہ نہایت ذلیل کام تھا۔ مدینہ والے زراعت پیشہ تھے مکّہ والے تاجر تھے۔ اس کے علاوہ مدینہ میں ابھی تک بہت سے یہودی آباد تھے اوس اور خزرج کے متعدد خاندانوں نے بھی وہی مذہب قبول کر رکھا تھا جو شہر کے سابق مالکان میں اگر اب وہ محکوم حالت میں تھے اب تک محفوظ تھا۔ باقی لوگ جن کی تعداد سب سے زیادہ تھی مکے کی طرح بت پرست تھے مگر مکّے والے بالعموم تمام مدینے والوں کو یہودی سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے اُن سے نفرت کرتے تھے (محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے دل میں بھی یمانیہ اور زراعت پیشہ لوگوں کی نسبت وہی پرانے خیالات تھے جو ان (۱۵۱) کے ہم وطنوں کے تھے ۔لہ چنانچہ بیان ہوا ہے کہ جب آپؐ نے کسی کو یہ مصرع پڑھتے سنا کہ "میں حمیری ہوں۔ میرے بزرگ نہ ربیعہ سے پیدا ہوئے اور مضر سے" تو آپ نے فرمایا کہ یہی تیرے لیے بُرا ہوا۔ تیری اصل تجھ کو خدا اور خدا کے رسول سے منقطع کرتی ہے ۔ے ۲ یہ بھی بیان ہوا ہے کہ جب آپؐ نے

لہ: مصنف کا یہ کہنا کہ اپنے اہل وطن یعنی مکہ والوں کی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات بھی مدینہ والوں کی طرف سے بُرے تھے ایک دعویٰ بلا دلیل ہے۔ ایک یمنی کے مصرع پڑھنے پر جو آپ نے فرمایا تھا کہ یہی تیرے لیے بُرا ہوا" وغیرہ وغیرہ تو یہ الفاظ آپ نے ناجائز اور اشتعال انگیز مفاخرت کو رد کرنے کے لیے اور قبائل یمانیہ و عدنانیہ کو تنبیہ کے لیے فرمائے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ مصرع پڑھنے والے کا حمیری ہونا اسے خدا اور خدا کے رسول سے منقطع کرتا ہے بلکہ تفاخر نری وہ چیز ہے جس سے یہ نتیجہ بد ظہور پذیر ہوتا ہے (المعاوی)

ایک مدینے والے کے گھر میں ہل رکھا ہوا دیکھا تو اُس کے مالک سے فرمایا:۔ جب کسی کے گھر میں ایسی چیز آتی ہے تو ذلت اُس کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے[1]۔ بہر کیف تاجروں اور خانہ بدوشوں عربوں کی طرف سے مایوس ہو کر کہ جس دین کی طرف آپ اُن کو بلاتے ہیں اُسے وہ قبول نہ کریں گے اور اپنے چچا ابو طالب کے انتقال پر جو دشمنوں سے انہیں محفوظ رکھا کرتے تھے اور اس کا یقین کر کے کہ مکہ میں اب آپ کی جان کو خطرہ ہے آپ مجبور ہوئے کہ مدینہ والوں کی طرف سے اپنے بُرے خیالات[2] دور کر دیں۔ اور جہاں کہیں سے بھی مدد ملے اسے خوشی سے قبول کر لیں۔ اس لیے آپ نے مدینے کے عربوں کی درخواست منظور کر لی۔ مکہ والوں نے جس طرح کی تکلیفیں اور ایذائیں آپ کو پہنچائی تھیں وہ اور بھی مدینہ والوں کی مہمان نوازی کا آپ کو مستحق کرتی تھیں۔ عقبہ میں جو بیعت ہوئی اُس نے آپ کو اور مدینے والوں کو مستقل طور پر متفق و متحد کر دیا۔ عرب قبیلے کے تعلق اور واسطے کو تمام تعلقات سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قبیلی تعلق و واسطے کو چھوڑ کر اپنے قبیلے سے علیحدہ ہو گئے[3] اور مدینے میں

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ یہ ہیں مَا دَخَلَتِ السِّکَّۃُ دَارَ قَوْمٍ اِلَّا ذَلُّوْا یعنی جنکے گھروں میں ہل داخل ہوا وہ ذلیل ہو گئے۔ اسکا مطلب صرف اس قدر ہے کہ جو قوم زراعت کو بطور پیشے کے اختیار کر لیتی ہے وہ دنیا میں فاتح اور نامور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ پیشہ اس قسم کا ہے کہ اس میں مشغول ہو جانیوالے اشخاص دنیا میں معاشرتی، علمی، تجارتی اور سیاسی ترقی نہیں کر سکتے اور ویسے بھی دراصل اپنے ہاتھ سے کاشتکاری کرنا عام طور پر ایک ادنیٰ درجہ کا کام سمجھا گیا ہے۔ مالکانہ زمینداری ایک علیحدہ چیز ہے اور وہ ہمیشہ ہر قوم میں باعث اعزاز رہی ہے آنحضرت کا مطلب یہ ہرگز نہ تھا کہ پیشۂ زراعت فی نفسہ ذلیل ہے بلکہ کلیتاً اس پیشے کے اختیار کر لینے کا جو نتیجہ عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ آپ نے اسکی طرف اشارہ فرمایا تھا (اسمٰعیل)

[2] یہ محض بے سر و پا بات ہے "بُرے خیالات" کا ہرگز کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں (العمادی)

[3] ہاں بیشک آنحضرت اپنے قبیلے اور قوم والوں کے انتہائی مظالم سے تنگ آن کر اور اس وقت جبکہ جان پر آ بنی مجبوراً مکہ سے تشریف لے گئے مگر اس کے باوجود آپ نے قبیلی تعلق کو کبھی نہیں چھوڑا۔ اور جب کبھی آپ کو ذرا سا بھی موقع ملا تو آپ نے اپنے قبیلے والوں کے ساتھ احسان اور سلوک کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی کیا اس صورت میں کوئی بھی منصف مزاج انسان مُصنف کے قول سے اتفاق کر سکتا ہے (اسمٰعیل)

مع اپنے مکّی مسلمان ساتھیوں کے جا بسے ۔ مدینہ کے شاعروں کی زبان ہجو اپنے قبیلے والوں پر کھلوا دی[1] اور جہاد کا اعلان کر دیا[2]۔ مکہ کے مسلمان جو آپ کے ہمراہ مدینہ میں جا کر آباد ہوئے وہ اس وقت سے مہاجر کہلائے جانے لگے (جوش مذہب سے مشتعل[3] ہو کر اور موت کو اس بنا پر ہیچ سمجھ کر کہ بت پرستوں کے ہاتھوں مارا جانا سیدھا جنت میں پہنچا دے گا اوس اور خزرج نے انصارِ رسول اللہ بن کر شجاعت و بسالت کے بڑے بڑے کرشمے دکھلائے ۔ انصار اور مکّے کے بت پرستوں میں آٹھ برس تک لڑائیاں رہیں ۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کی تلوار کا خوف دور دور پھیل گیا اور اسی خوف سے لوگوں کو ترغیب ہوئی کہ نیا دین قبول کر لیں ۔ اس تبدیلِ مذہب میں خوشی اور دلی خلوص سے دیر یا ارادے کے ساتھ مسلمان ہونے کی مثالیں کم تھیں (کم نہیں بکثرت تھیں ۔ مترجم) آخر کار جب مکّہ فتح ہو گیا تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قوت کو استقلال اور استحکام ہو گیا اور وہ دن آگیا جس کے لیے مدینہ والوں نے یہ عہد کر رکھا تھا کہ مکّہ کے مغرور سوداگر بچوں کو ان کے غرور اور تکبّر کی اچھی طرح سزا دیں گے ۔ خزرج کے سردار نے کہا "آج ہے قتل کا دن آج کسی
کو زندہ نہ چھوڑا جائے گا"[4] لیکن اس مدنی سردار کی امید بر نہ آئی ۔ محمد (صلی اللہ علیہ (۸۱
وآلہٖ وسلم) نے سردارِ خزرج کو فوج کی سرداری سے محروم کر دیا[5] اور فوج کے سرداروں کو

---

[1] [2] یہ قطعاً خلاف واقعہ اور بے اصل بات ہے اور اس گہرے تعصب کو ظاہر کرتی ہے جو باوجود علم و فضل کے مصنف کو اسلام سے ہے ۔ ہرگز آپ نے مدینہ کے شاعروں کو اہل مکہ کی ہجو کا حکم نہیں دیا ۔ انفرادی طور پر اور وہ بھی جواباً اگر کبھی کسی نے کچھ کہا ہو تو اس سے یہ نتیجہ کہاں سے نکل آیا کہ آپ نے مدینہ کے شاعروں کی زبان اپنے قبیلے والوں پر کھلوا دی" اسی طرح یہ بھی غلط ہے کہ آپ نے جہاد کا اعلان کر دیا" تاریخ شاہد ہے کہ آپ نے ساری عمر کبھی پیش قدمی اور جارحانہ کارروائی نہیں کی اور ہمیشہ اس وقت تلوار اٹھائی جب دشمن فوج لیکر آپ کو شہید کرنے کے لیے اور آپ کے سلسلہ کو برباد کرنے کی غرض سے حملہ آور ہوئے (اسمٰعیل)

[3] نہیں بلکہ ظلم سے سخت مجبور ہو کر (اسمٰعیل)

[4] پورا قصہ یہ ہے کہ فتح مکہ کے دن ابو سفیان کو جو مسلمان ہو چکے تھے اسلامی فوج کی شان و شوکت دکھلانے کیلئے ایک ایسے مقام پر کھڑا کیا گیا تھا جہاں سے سارے اسلامی لشکر کو گذرنا تھا ۔ چنانچہ جب فوج کا وہ دستہ جس کے سردار حضرت سعد بن عبادہ تھے ادھر سے گذرے تو سعد نے ابو سفیان کو دیکھ کر کہا اَلْيَوْمَ يَوْمُ الْمَلْحَمَةِ اَلْيَوْمَ تُسْتَحَلُّ الْكَعْبَةُ ۔ یعنی

(باقی بر صفحہ آیندہ)

حکم دیا کہ مفتوحین کے ساتھ حد درجے کی نرمی برتی جائے۔ اب مکہ والے چپ چاپ دیکھتے رہے کہ خانہ کعبہ میں اُن کے بُت توڑے جا رہے ہیں۔ کعبہ اس وقت ایک اینٹ پتھر کا خانہ بنا ہوا تھا جس میں ۳۶۰ بتوں کو اتنے ہی قبیلے پوجتے تھے۔ مکہ والوں میں غصہ بھرا ہوا تھا انھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا کا بھیجا ہوا رسول تو مان لیا لیکن دل میں یہی قسمیں کھاتے رہے کہ مدینے کے اِن کسانوں اور یہودیوں سے جنھوں نے اِس وقت اُن پر فتح پائی ہے ایک دن سخت انتقام لیں گے۔

مکہ فتح ہونے کے بعد عرب کے بُت پرستوں کو معلوم ہو گیا کہ اب مقابلہ کرنا فضول ہے اور اِس اندیشے سے کہیں قبائل کو بالکل معدوم کر دینے والی لڑائی نہ شروع ہو جائے۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا جس کی دعوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرر کردہ سردار

ہی گھمسان کا دن ہے آج کعبہ میں لڑنا حلال کر دیا گیا ہے۔ ابوسفیان سنکر چپ رہے اور آخر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو ابوسفیان نے حضور میں عرض کیا کہ کیا حضور نے اپنی قوم کے قتل کا حکم دیا ہے؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا نہیں۔ اس پر ابوسفیان نے کہا کہ سعد بن عبادہ ابھی یہاں سے یہ کہتے ہوئے گذرے ہیں حضور نے فرمایا كَذَبَ سَعْدٌ وَلٰكِنْ هٰذَا يَوْمٌ يُعَظِّمُ اللّٰهُ فِيْهِ الْكَعْبَةَ یعنی سعد نے غلط کہا بلکہ آج کے دن تو اللہ تعالیٰ نے کعبہ کی عزت اور عظمت اور حرمت کو زیادہ بڑھائیگا اور اسمیں ہرگز خون ریزی نہیں ہوگی یہ ارشاد فرما کر حکم دیا کہ فوج کا علم سعد بن عبادہ سے لیکر انکے بیٹے قیس کو دیدیا جائے (مترجم) اللہ ظاہر ہے کہ کعبہ بحیثیت ایک مسجد کے خدائے واحد کی عبادت کیلئے حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل نے تعمیر کیا تھا۔ بعد میں بت پرستوں نے اس مسجد پر قبضہ کر کے اسے بتخانہ بنا دیا۔ اب جب اس گھر کا اصلی مالک اور وارث پیدا ہوا تو کیا ضرور نہ تھا کہ وہ ظالموں اور غاصبوں کو جنھوں نے زبردستی دوسرے کے گھر پر قبضہ کر رکھا تھا اس گھر سے نکالدے اور جو چیزیں ناجائز طور پر انھوں نے وہاں رکھی ہوئی تھیں انھیں باہر پھینکدے۔ پس حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ اپنا گھر خالی کرا لے کو کوئی بھی عقلمند ظلم یا زیادتی سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ ساتھ ہی اس سے بھی کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ آنحضورؐ حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی اور جسمانی و روحانی وارث نہیں تھے؟ ایک بات یہ بھی ہے کہ فتح مکہ پر آنحضرتؐ کے اعلیٰ درجہ کے حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر تمام اہل مکہ مسلمان ہو گئے۔ اس صورت میں بھی کعبے کے بت سوائے توڑ دینے اور پھینک دینے کے اور کس مصرف کے رہ گئے تھے

لہ دل میں قسمیں کھانے کی بھی ایک ہی کہی۔ مکہ والے ہرگز منافقانہ مسلمان نہیں ہوئے تھے بلکہ حضور کے حسنِ سلوک کو دیکھ کر سچے دل سے مسلمان ہوئے تھے۔ اگر بعض لوگ مؤلفۃ القلوب میں بھی تو اس سے تمام اہل مکہ پر کیسے حکم لگایا جا سکتا ہے؟ (مترجم)

معروف تھے لہ

تبدیل مذہب کی ایک عجیب مثال بنی ثقیف کی تھی۔ یہ قبیلہ طائف میں رہتا تھا اور اسی نے آپ کو اپنے شہر کی سرحد سے پتھر مارے تھے۔ اب اس کا ایک وفد آپؐ کے پاس آیا ... ...

... ...

... ...

مصنف کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ قریش مکہ نے قبیلوں کو معدوم کر دینے والی لڑائی کے اندیشے سے اسلام قبول کر لیا۔ اگر وہ ایسے ہی ہمدرد نوعِ انسان تھے تو آنحضرت صلعم اور آپ کے ساتھیوں کو تباہ و برباد کر دینے کیلئے کیوں انھوں نے اپنی بہترین طاقتیں خرچ کر دی تھیں؟ نیز کیا یہ صحیح نہیں کہ آنحضرتؐ سے پہلے یہی لوگ جو بقولِ مصنف قبیلوں کو معدوم کر دینے والی لڑائی شروع ہو جانے کے اندیشے سے مسلمان ہو گئے تھے، بہت ہی معمولی معمولی باتوں پر آپس میں پچاس پچاس برس تک لڑتے رہتے تھے اور قبیلے کے قبیلے برباد ہو جاتے تھے۔ ان قاتلوں کی وہ ہمدردی کی روح کہاں جاتی تھی؟ دراصل یہ محض آنحضرتؐ کا بیشتر اور لاثانی حسن سلوک تھا جسے دیکھ کر اور جس سے متاثر ہو کر مکہ کے باشندوں کو مجبور ہو کر مسلمان ہو جانا پڑا۔ اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں تھی۔ (اسمٰعیل) لہ یہاں ہم نے انگریزی ترجمہ کی ۱۴ سطروں کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے مصنف نے بنی ثقیف کے اسلام لانے کا واقعہ بہت ہی مغالطہ انگیز سرخے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ پہلے تو وفد بنی ثقیف کی پیش کردہ شرطیں یعنی نماز، شراب، جہاد ان کو معاف کیا جائے اور ایک سال تک وہ اپنے صنم اعظم لات کو اپنے ہاں قائم رہنے دیں اور جب یہ زمانہ پورا ہو جائے تو یہ بت ان کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑنا پڑے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمالیں لیکن جب باضابطہ معاہدہ لکھا جانے لگا اور کاتب نماز کی معافی لکھنے کو ہوا تو آپؐ کو تذبذب ہوا۔ بنی ثقیف نے اصرار کیا کہ شرط منظور ہو چکی اسی طرح لکھا جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی تک تامل میں تھے کہ حضرت عمرؓ وفد کو برا بھلا کہنے لگے۔ اب تو آنحضرت صلعم نے بنی ثقیف کی کسی شرط کو بھی سوائے اس کے کہ بت کو اپنے ہاتھ سے نہ توڑیں منظور نہیں فرمایا۔ مصنف نے جس طرح یہ روایت بیان کی ہے اس طرح وہ کہیں بیان نہیں ہوئی اور اس سے اس کی غرض محض توہین اور اخلاقی کمزوری دکھانے سے ہے جو غلط در غلط ہے کل واقعہ سیرۃ النبی مؤلفہ شمس العلماء علامہ شبلی مرحوم کے حصہ اول جلد دوم میں صفحات ۴۳ تا ۴۶ پر مفصل بیان ہوا ہے اور وہی بالکل صحیح ہے۔ مصنف کا بیان غلط ہے (مترجم)۔

غرض وفد کے لوگ اپنے قبیلے میں واپس آئے۔ چند مسلمان اُن کے ساتھ کر دیئے گئے انھوں نے ثقیف کی عورتوں کے رونے پیٹنے کا کچھ خیال نہ کیا اور لات کو توڑ ڈالا۔ اسلام لانے کی یہ مثال جو عجیب طریقے سے پیش آئی تھی ایسی تھی کہ اوروں سے زیادہ دیرپا ثابت ہوئی آئندہ زمانے میں جس وقت کل مُلک عرب اسلام سے مرتد ہوا تو بنی ثقیف[۱] مسلمان رہے اس بات سے تبدیل مذہب میں ان کی سچائی اور پختگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے قبل ہی قبائل عرب میں ارتداد شروع ہو گیا تھا۔ عرب کے بہت سے حصے ایسے تھے جہاں کے لوگ پیغمبر صلعم کی وفات کا بھی انتظار نہ کر سکے اور صرف اتنی خبر سنکر کہ آپ بیمار ہیں نجد۔ یمن اور یمامہ میں اسلام سے منحرف ہو گئے اور ان تینوں علاقوں میں ایک ایک آدمی مُدعی نبوت بن بیٹھا اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نقل اتار کر اُن کا حریف بن گیا جس وقت بیمار ہو کر آپ صاحب فراش ہوئے ہیں اُس وقت خبر سنی کہ یمن میں مرتدین کے سردار اسود عنسی (یعنی نقاب پوش) نے جو فتنہ انگیز فصاحت رکھنے کے ساتھ دولت مند بھی تھا اپنے علاقہ سے مسلمان عمال کو نکال دیا ہے اور نجران اور صنعا پر قبضہ کرنے کے بعد کل یمن کا مالک ہو گیا ہے (۱۱ ہجری میں) حبیب پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ہوا تو اسلام کا قصر متزلزل ہو کر گرنے کے قریب تھا۔ آپ کی وفات ایک زبردست اور عالمگیر بغاوت کے لیے اشارہ ہو گئی ہر جگہ مرتدین کو بالا دستی حاصل ہونے لگی اور روزانہ مسلمان عمال جن میں مہاجر اور انصار دونوں تھے مدینے میں واپس آنے لگے کیونکہ مرتدین ان کو ان کے علاقوں سے خارج کرنے لگے تھے۔ غرض نوبت یہاں تک پہنچی کہ مدینہ کے ارد گرد جو قبائل آباد تھے انھوں نے بھی سر اٹھایا اور مدینے کے محاصرہ کے لیے تیاریاں شروع کر دیں

لیکن ان تمام خطروں میں امیر المومنین ابوبکر کو جو حقیقت میں پیغمبر کی جانشینی کے

---

[۱] کیا بنی ثقیف کی نسبت بھی مصنف یہ کہہ سکے گا کہ وہ قدرتی طور پر مذہبی نہ تھے؟ (مترجم)

لائق اور اسلام کی تقدیر پر پورا بھروسا رکھتے تھے ایک لمحے کے لیے بھی کسی قسم کا تذبذب یا تردد نہ ہوا۔ لشکر اس وقت ان کے پاس نہ تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت کو نہایت وفاداری سے انجام دینے کے لیے وہ فوج کو شام کی فتح کیواسطے روانہ کر چکے تھے۔ اکثر مسلمان اس خیال سے کہ گھر میں خدشے درپیش ہیں کہتے ہی رہے کہ شام کی مہم کو ابھی ملتوی رکھا جائے مگر انھوں نے جواب دیا کہ "جو حکم پیغمبر دے چکے ہیں میں اُسے منسوخ نہیں کر سکتا۔ خواہ اس میں مدینہ بھیڑیوں کا شکار ہی کیوں نہ ہو جائے" اس لشکر کا کام وہی تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم بتا گئے تھے۔ اگر امیر المومنین ابوبکر مرتدین سے معاملہ کرنے پر راضی ہو جاتے تو تھوڑی بہت رعایتیں منظور کر کے مرتدوں کی مخالفت دور کر دیتے یا نجد کے اکثر قبائل کو اپنا خیر خواہ کر لیتے کیونکہ نجد سے وفود آئے ہوئے تھے اور وہ کہتے تھے کہ اگر عشر کی رقم اُن کو معاف کر دی جائے تو وہ نماز جاری رکھیں گے۔ بڑے بڑے مسلمانوں کی اس وقت یہ رائے تھی کہ ان وفود کو نفی میں جواب نہ دیا جائے۔ لیکن یہ امیر المومنین ابوبکرؓ ہی تھے جنھوں نے اس خیال کو برا اور اس مقدس دعوت کی شان کے خلاف سمجھا جس کو دشمنوں سے محفوظ مصئون رکھنا ان کا مقدس فرض تھا۔ انھوں نے کہا کہ "اسلام کی شریعت ایک ہے اس میں فرق نہیں ہو سکتا اور اس کی ہدایتوں میں کسی طرح کی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی" یہ سن کر عمرؓ بولے ابوبکرؓ کا ایمان ہم سب کے ایمانوں سے اگر وہ جمع کیئے جائیں زیادہ ہے" عمرؓ کا یہ خیال درست تھا۔ کیونکہ خلیفہ اوّل کی عظمت اور قوت کا راز حقیقت میں اُن کا یہی زبردست ایمان تھا۔ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شہادت ملتی ہے کہ جس قدر لوگوں نے اُن کی نبوت کو تسلیم کیا تھوڑی دیر کے لیے اُنھیں تامل ضرور ہوا تھا لیکن ابوبکرؓ کو مطلق نہیں ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ کو نہ کوئی خاص قدرت حاصل تھی۔ نہ وہ کوئی بہت بڑے آدمی تھے مگر اُن میں وہ چیز موجود تھی جس سے (۲۱)
ان کے دشمن محروم تھے اور یہ چیز وہ تھی جس نے خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فتح یاب و فیروز مند کیا تھا۔ یعنی ایمان کی مضبوطی۔

مرتدین کے حملوں میں یک جہتی یا اہتمام کچھ نہ تھا۔ آپس میں نااتفاقی رکھتے تھے اور ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ہر ایسے مسلمان کو جو ہتھیار اٹھا سکتا تھا مسلح کر کے اس کا موقع پایا کہ مدینے کے قرب و جوار میں جو لوگ مرتد ہو گئے تھے اُن کا قلع قمع کر دیں۔ اس کے بعد ہی جب حجاز کے وفادار قبیلوں نے اپنے پیدل اور سوار مہیا کر دیے اور لشکر کا بڑا حصہ شمال سے مال غنیمت لے کر واپس آگیا تو حضرت ابوبکرؓ نے اب بے تکلف محاربانہ پہلو اختیار کر کے کام شروع کیا۔ لشکر کے کئی حصے کر دیئے شروع میں ان حصوں میں بہت کم لوگ تھے لیکن جس قدر یہ حصے آگے بڑھتے گئے عربوں کی تعداد اُن میں بڑھتی گئی۔ یہ عرب یا تو اس خوف سے کہ کہیں اپنا مال نہ لٹ جائے یا اس شوق میں کہ دوسروں کا مال لوٹنے میں آئے گا۔ اسلام کے جھنڈوں کی طرف کھچے چلے آئے[1] نجد میں جری خالدؓ نے طلیحہ کے گروہوں پر حملہ کیا۔ طلیحہ جو کسی وقت ایک لشکر کے مقابلہ میں اکیلا ہزار آدمیوں کے برابر سمجھا جاتا تھا آج وہ تمام سپاہیانہ اوصاف کو بھول کر اپنی نبوت کے خیال میں محو ہے اور لڑائی کے میدان سے کچھ دور ایک چادر اوڑھے وحی کے انتظار میں خاموش کھڑا ہے۔ وحی اتری مگر اُس وقت جب کہ لڑائی میں اس کے ساتھیوں کے پاؤں اکھڑ چکے تھے۔ یہ حالت دیکھ کر طلیحہ فوراً گھوڑے پر سوار ہوا اور ساتھیوں سے یہ کہتا ہوا کہ "جس کسی کو آنا ہے میرے پیچھے چلا آئے" میدان سے بگٹٹ بھاگا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اس فتح میں مفتوحین کو قید نہیں کیا گیا کیوں کہ

[1] یہ خیال مصنف کے تعصب پر دلالت کرتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ تمام ملک باغیوں اور سرکشوں سے بھرا ہوا تھا اور مسلمانوں کی فوج، طاقت اور شوکت بہت کم تھی اور ہر دشمن مسلمانوں کو برباد کر دینے پر تلا ہوا بیٹھا تھا ایسے وقت میں کسی شخص کا اس نیت سے جہاد میں شرکت کرنا کہ دوسروں کا مال لوٹنے میں آئے گا کون صحیح الدماغ انسان کریگا؟ کیونکہ فتنہ و فساد کے وقت تو ہر انسان اور خصوصاً کمزور انسان یہی چاہتا ہے کہ گھر میں بیٹھا رہے اور اپنی جان بچائے اور ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمان نہایت کم و مختصر تھے۔ پس اس موقع پر مسلمانوں کا تلوار لے کر اٹھنا بلا شائبہ شک صرف فتنہ و فساد کو رفع کرنے اور اعلائے کلمۃ اللہ کی غرض سے تھا نہ کہ کسی اور نیت سے (اسمٰعیل)

حضرت ابوبکرؓ خالدؓ کو حکم دے چکے تھے کہ "مرتدین کو تلوار سے۔ آگ سے اور اذیت دے کر بے رحمی کے ساتھ ہلاک کیا جائے"۔

خالدؓ فتح و فیروزمندی میں شہرت حاصل کر کے یمامہ کے جھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے مقابلے کو بڑھے۔ مسیلمہ اسی زمانہ میں مسلمانوں کے دو لشکروں کو یکے بعد دیگرے شکست دے چکا تھا۔ اب خالدؓ سے جنگ شروع ہوئی۔ یہ لڑائی نہایت سخت تھی پہلے پہل مرتدین کو کامیابی ہوئی اور وہ بڑھتے ہوئے خالدؓ کے خیمے تک پہنچ گئے۔ خالد نے انھیں پسپا کر کے پھر اُس کھُلے میدان کی طرف پہنچا دیا جو دونوں لشکروں کے بیچ میں تھا۔ کئی گھنٹے کے سخت مقابلے کے بعد مرتدین نے ہر سمت میں شکست کھائی اور اب اُن میں غُل ہوا کہ "حدیقہ کی طرف چلو۔ حدیقہ میں داخل ہو جاؤ (حدیقۃ الرحمٰن شہر یمامہ کے قریب ایک باغ کا نام تھا) یہی شور مچاتے اور بھاگتے وہ ایک بڑے باغ میں داخل ہوئے جس کے گرد ایک بڑے آثار کی دیوار کھچی تھی اس باغ کے دروازے بہت بھاری اور مضبوط تھے۔ لڑائی کے جوش میں مسلمانوں نے مرتدین کا تعاقب کیا اور بے مثل ہمت و مردانگی کے ساتھ دو مسلمان دیوار پر چڑھ کر باغ (۲۲۱ کے اندر کود گئے۔ ان میں سے ایک شخص کو تو اتنے زخم پہنچے کہ وہ باغ کے اندر زمین پر پہنچتے پہنچتے ختم ہو گیا۔ دوسرا قسمت کا اچھا تھا زندہ رہا۔ اندر پہنچتے ہی وہ ان سے کنجی چھین کر باغ کے باہر (جہاں مسلمان موجود تھے) پھینک دی۔ اب کیا تھا دروازے کھول لیے گئے اور مسلمان سیلاب کی طرح باغ کے اندر داخل ہو گئے اور یہاں ایسا خونریز معرکہ ہوا جس سے علیحدہ ہو جانا ممکن نہ تھا۔ اس باغِ موت میں دس ہزار مرتدین میں سے ہر شخص جان سے مارا گیا۔

جس وقت خالدؓ وسطِ عرب میں خون کی ندیوں سے بغاوت کے شعلے بجھا رہے

لہ مصنف نے حسب عادت یہ واقعہ بھی بُرے اور غلط پیرایہ میں بیان کیا ہے حضرت ابوبکرؓ کا حکم یہ تھا "اور جس شخص نے اسلام لانے سے انکار کیا اس سے لڑائی کی جائے پس اگر اللہ عزوجل ایسے لوگوں پر غلبہ عنایت فرمائے تو وہ سب قتل کئے جائیں۔ ہر مقتول آلاتِ حرب اور آگ سے" اذیت دیکر بے رحمی سے ہلاک کرنا مصنف کا حاشیہ ہے
مترجم

تھے اسی زمانے میں لشکر اسلام کے دیگر امراء ملک کے جنوبی علاقوں میں ایسی ہی خدمتیں انجام دے رہے تھے۔ بحرین میں بکر بن وائل مرتد ہو گئے تھے۔ ایک رات یہ لوگ اپنے لشکر میں شراب پیکر بدمست ہوئے۔ مسلمانوں نے حملہ کر کے ان کو تہ تیغ کر دیا بکر بن وائل کے کچھ لوگ اتنا وقت پا سکے کہ سمندر کے کنارے پہنچ کر مسلمانوں سے پناہ لینے کو جزیرہ دارین میں چلے جائیں۔ مگر مسلمانوں نے یہاں بھی ان کا تعاقب کر کے سب کو قتل کر ڈالا۔ اسی قسم کا قتال یمن۔ عمان۔ مہرہ اور حضرموت میں ہوا۔ حضرموت میں اسود عنسی کے لشکر کے کچھ بقیۃ السیف لوگوں نے اسلامی سالار لشکر سے امان کی درخواست کی لیکن درخواست نامنظور ہوئی اور وہ بھی قتل کر دیئے گئے ایک قلعے کے حاکم نے اس طرح امن حاصل کیا کہ دس آدمیوں کی جان بخشی کا وعدہ لیکر باقی تمام قلعے والوں کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ اور یہ کل مرتد بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ایک علاقے میں قافلوں والی سڑک پر اتنی لاشیں تھیں کہ اُن کی عفونت سے مدت تک ہوا میں سمیّت رہی۔

اس خونریزی سے عربوں کو اسلام کا یقین ہوا ہو یا نہ ہوا ہو مگر وہ اتنا ضرور مان گئے کہ اس دین کے مقابلے میں اب کوئی نہیں ٹھیر سکتا اور اسلام ایک لا یغلب اور فوق العادت قوّت ہے۔ کشت وخون سے کمزور اور خوف وحیرت سے مرعوب ہو کر مرتدین نے آخر کار پھر اسلام لانے پر کم سے کم ظاہری طور پر سر تسلیم خم کر دیا۔ اور امیرالمومنین ابوبکرؓ نے اس خیال سے کہ یہ خوف اور رعب پھر کہیں ان کے دل سے نہ نکل جائے ان کو رومی اور ایرانی سلطنتوں کے مقابلے پر فوراً روانہ کر دیا۔ یہ دونوں سلطنتیں منتظر بیٹھی تھیں کہ کوئی آئے اور ہمیں فتح کر لے کیونکہ سالہا سال سے آپس کے جھگڑوں سے کمزور اور رسم غلامی کی وجہ سے کاہل وبزدل ہو چکی تھیں اور زوالِ حکومت سے قبل جتنی خرابیاں پیدا ہوا کرتی ہیں انھوں نے اندر ہی اندر ان دونوں سلطنتوں کو کھا کر تمام کر رکھا تھا۔ مرتد ہوتے اور پھر اسلام قبول کرنے میں جو کچھ نقصان مسلمانوں کو پہنچا تھا اس کی تلافی بے شمار دولت اور بڑے

(۲۲)

بڑے ملکوں پر قبضہ پانے سے ہوگئی۔ ارتداد کا نام ونشان مٹ گیا۔ کسی کو اب مرتد ہونے کا خیال تک نہ پیدا ہو سکتا تھا کیوں کہ اس جُرم کی سزا موت تھی۔[1] اور اسلام کے قانون کو اس بارے میں ذرا جنبش نہ تھی۔ لیکن اسلام کے ساتھ سچی عقیدت اور سچی حمیت دونوں چیزیں شاذ تھیں[2] نہایت شدید طریقوں سے بدویوں میں یہ ظاہری تبدیل مذہب عمل میں آیا تھا مگر اتنا بھی جو کچھ ہوا وہ بہت تھا کیونکہ اس سے زیادہ کی توقع ایسے لوگوں سے کیونکر ہو سکتی تھی جنھوں نے خالدؓ اور دیگر سرداران لشکر اسلام کے ہاتھوں اپنے عزیزوں کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا تھا (یہ فقرہ نہایت آزار دہ طریقہ سے اور بہت کچھ خلاف واقعہ مصنف کے قلم سے نکلا ہے ہم نے بعض الفاظ کے ترجمے سے پرہیز کیا ہے۔ مترجم)

بدوی مدت دراز تک ایک خاموش مقابلے کے ساتھ راسخ الایمان مسلمانوں کی کوششوں کو کہ نو مسلموں کو اسلام کی باتیں سکھائی جائیں بے اثر ثابت کرتے رہے۔ یہ نہ اسلام کی باتیں سیکھتے تھے اور نہ سیکھنے کی طرف رغبت ظاہر کرتے تھے امیرالمومنین عمر ابن الخطاب کے زمانۂ خلافت میں ایک بڈھے بدوی نے ایک جوان بدوی سے یہ معاہدہ کر لیا کہ ایک رات بیچ وہ اپنی بیوی کو اس کے پاس بھیج دیا کرے گا اور اُس کے معاوضہ میں جوان بدوی بڈھے کے گلے چرایا کرے گا۔ امیرالمومنین نے جب یہ عجیب معاہدہ سُنا تو دونوں بدوؤں کو طلب کیا اور کہا کہ کیا تم کو نہیں معلوم کہ اسلام میں شوہر اس قسم کا کوئی معاہدہ کسی کے ساتھ نہیں کر سکتا؟ اُن دونوں نے جواب دیا کہ "ہم کو کوئی ایسا قانون معلوم نہ تھا۔" ایک اور عرب شاعر جو

---

[1] محض ارتداد کی سزا تو اسلام میں قتل نہیں ہے مگر اس زمانے میں جو مرتد ہوتا تھا وہ ساتھ ہی باغی اور مسلمانوں کا دشمن بھی ہو جاتا تھا اور بغاوت کے جرم کی سزا سوائے قتل کے اور کیا ہو سکتی ہے (اسماعیل)

[2] اس زمانہ کے مسلمانوں کی اسلام کیساتھ سچی عقیدت اور سچی محبت کی ایک دو نہیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں مثالوں سے تاریخیں بھری پڑی ہیں اور اس لحاظ سے وہ زمانہ اسلام کا ایک زرین عہد کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر مصنف کو اپنے گہرے تعصب کی وجہ سے اس قسم کی کوئی مثال نظر نہ آئے تو اس کا کیا علاج (اسماعیل)

نے دو سگی بہنوں سے عقد کر لیا تھا۔ خلیفہ نے پوچھا

کیا تم کو علم نہ تھا کہ اسلام نے ایسے فعل کی اجازت نہیں دی ہے؟

عرب نے جواب دیا۔ مجھے یہ کچھ معلوم نہیں تھا اور جس فعل کو تم بُرا کہتے ہو مجھے اس میں کوئی بات قابل الزام نہیں معلوم ہوتی"

خلیفہ۔ بہر کیف شرع کا حکم اس امر میں صاف ہے۔ فوراً ایک بہن کو علیحدہ کر دو ورنہ تم قتل کیے جاؤ گے۔

عرب۔ کیا تم سچ کہتے ہو؟!

خلیفہ۔ ہاں بالکل سچ کہتا ہوں

عرب۔ تو پھر وہ مذہب اچھا نہیں جو ایسی باتوں سے منع کرے اور ایسا دین قبول کرنے سے مجھے کچھ نفع نہ ہوا۔

یہ بیوقوف بدوی اسلام سے اس مدتک ناواقف تھا کہ وہ اس قسم کی باتیں زبان پر لانے سے اتنا بھی نہ سمجھتا تھا کہ وہ توہین مذہب یا ارتداد کا مرتکب ہو جائے گا ایک صدی کے بعد مصر میں جو بدوی قبیلے آباد ہو گئے تھے اُن میں سے ایک قبیلے کو بھی علم نہ تھا کہ اسلام میں کس چیز کو حلال تبلایا گیا ہے اور کس کو حرام؟ یہ بدوی بہت جوش اور محبت سے پرانے وقتوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ زمانہ بُت پرستی کی لڑائیوں اور اسی زمانے کے بہادروں اور سورماؤں کے قصے ان کی زبان پر رہتے تھے مذہب کا نام بھی کوئی نہ لیتا تھا۔ اسی طرح اُسی زمانے میں شمالی افریقہ میں جو عربی قبیلے بسائے گئے تھے اُن کی بھی یہی حالت تھی۔ یہ گورے سپاہی شراب اس طرح بے تکلف پیتے تھے کہ گویا مذہب میں اس کا حرام ہونا بتایا ہی نہیں گیا ہے۔ جس وقت خلیفہ عمر ابن عبد العزیز نے اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے معلموں کو ان کے پاس بھیجا ہے تو اس وقت اُن لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ شراب حرام ہے۔ ایسے مسلمان بھی تھے جن کا علم قرآن کی نسبت سوائے بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ ممکن تھا گو ایسا ہونا یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ تبلیغ مذہب کے

جو ذرائع اختیار کیئے گئے اگر وہ اتنے ناگوار نہ ہوتے جس قدر کہ فی الواقع ناگوار تھے تو
اہل بادیہ میں اسلام کے ساتھ زیادہ جوشِ عقیدت ہوتا[1]۔ مذہبی معاملات کی طرف سے
جو بے پرواہی اور غفلت ایک بدوی میں ہوتی ہے اس کو دور کرنا ہمیشہ ایک دشوار
کام ثابت ہوا ہے۔ خود ہمارے زمانے میں (انیسویں صدی عیسوی) وہابی فرقے
نے بہت چاہا کہ بدوؤں کی یہ غفلت اور بے پرواہی کسی طرح دور ہو مگر کامیابی
نہ ہوئی۔ یہ فرقہ نہایت سخت گیر اور مذہب کو تمام آمیزشوں سے پاک رکھنے والا
گروہ ہے جو ہر قسم کی آرام طلبی اور باطل پرستی کو جس نے زمانے کی مدد سے اسلام
کو زنگ ڈالا ہے دور کرنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ "قرآن اور صرف قرآن" اُن
کا دین ہے۔ جیسے عیسائیوں میں لوتھر کے پیرو کہتے تھے کہ "انجیل اور صرف
انجیل" ان کا مذہب ہے۔ باوجود سعی و کوشش کے وہابیوں سے بھی یہ نہ ہو سکا
کہ بدوؤں کی مذہبی بے توجہی کو دور کر دیتے۔ وہابیوں نے جبر سے بہت کم کام
لیا۔ اور ایسے عرب جو شہروں اور بڑے قصبوں میں مستقل سکونت رکھتے تھے۔ وہ
مذہب کے نہایت مضبوط اور سچے پیرو ثابت ہوئے لیکن اہل بادیہ پر کچھ اثر نہ ہوا۔
انہوں نے اپنی پرانی عربی خصلت میں کسی اور چیز کی آمیزش نہ ہونے دی۔ گو بدوؤں
نے وہابیوں کے سیاسی خیالات سے ہمدردی ظاہر کی اور ایسے بدوی قبیلے
جو براہِ راست وہابیوں کے زیر حکومت تھے مجبور ہوئے کہ دین کے ارکان زیادہ
پابندی کے ساتھ ادا کریں۔ اور بعض بدوؤں نے دنیا کمانے کے لیے متقی مسلمانوں کا
بھیس اختیار کر لیا مگر باوجود اس کے بدوی سچے طور پر مذہبی لوگ نہ تھے جس وقت
محمد علی نے وہابیوں کا زور توڑ دیا تو بدوؤں نے بھی مذہب کا وہ لباس اتار پھینکا

[1] میں نے جس لفظ کا ترجمہ یہاں ناگوار کیا ہے اس کا ترجمہ قابل نفرت بھی ہو سکتا ہے (اشاعت اسلام کے طریقوں
کی مذمت عیسائیوں کی عادت میں داخل ہے۔ یہ کیا ضرور تھا کہ جس طرح عیسائی مذہب کی اشاعت ہوئی تھی (گو اس
میں بھی خونریزی کی مثالیں موجود ہیں) اُسی طرح اور مذہبوں کی تبلیغ بھی ہوتی۔ اب تو عیسائیوں کے اس قسم
کے اعتراضوں پر مسلمانوں کو ہنسی آتی ہے (مترجم)

جس کا بوجھ اُن کی جان پر دو بھر ہو گیا تھا۔ سر آر۔ ایف۔ برٹن لکھتا ہے کہ آج بادیہ عرب میں تھوڑا یا بہت نام کو بھی کوئی مذہب نہیں پایا جاتا احکام قرآن کی طرف کسی کو بھی توجہ نہیں [1]

عربوں نے گو اس انقلاب عظیم کو جو اُن کے ملک میں پیش آیا تسلیم کر لیا اور سمجھ لیا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو لیا۔ اب اس سے چارہ نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں نے یہ انقلاب پیدا کیا تھا ان کو انھوں نے کبھی معاف نہ کیا اور اس انقلاب سے جو مذہبی استبداد پیدا ہوا تھا اُس کے سامنے وہ کبھی سرنگوں نہ ہوئے۔ چنانچہ عربوں کی مخالفت نے آخر کار ایک نئی شکل اختیار کر لی۔ یعنی ایک مذہبی نزاع شخصی و ذاتی نزاع بن گیا [2]

ایک خاص معنی میں عرب کے شریف خاندانوں کو یعنی ان خاندانوں کو جن میں نسلاً بعد نسل قبیلوں کے سردار ہوتے چلے آئے تھے اس انقلاب سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ شرافتِ نسب کے متعلق آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے کبھی کچھ رہی کبھی کچھ [3] کبھی آپ نے "مساواتِ مطلق" کا حکم دیا۔ کبھی شرفا کی خاص

---

[1] مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کی کل عبارت سر آر۔ ایف۔ برٹن ہی کے اس مقولے کی تفسیر ہے۔ اگر بدوؤں کی اسلام سے جلد واقفیت نہ ہو سکی تو اس میں اسلام کا کونسا قصور ثابت ہوتا ہے؟ اگر کسی نو مسلم قوم کی اسلامی تعلیم جلد تکمیل نہ ہو سکی تو اس میں عیسائیوں کو کس بات سے تسکین ہو سکتی ہے (مترجم)[2] مصنف نے کہا یہاں اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بزرگانِ اسلام نے عربوں یعنی اہل بادیہ کو مسلمان کرنے میں ارتداد کے بعد بجبر سختیاں کی تھیں۔ بدو مسلمان تو ہو گئے مگر ان بزرگوں کی طرف سے اُن کے دل میں کپٹ رہی اور آئندہ جو خانہ جنگیاں ہوئیں وہ انہی اکابر اسلام یا انکی اولاد سے انتقام لینے کی غرض سے ہوئیں۔ یہ خیال مہمل اور خلافِ واقعہ ہے۔ عیسائیوں کے دل ایسی باتوں سے ٹھنڈے ہوتے ہوں مگر مسلمانوں کو تو ایسی باتوں پر ہنسی آتی ہے۔

[3] یہ قطعاً غلط ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمیشہ وہی رائے رہی جو وحی الٰہی نے تلقین فرمائی تھی۔ یعنی بہترین معیارِ شرافت تقویٰ ہے۔ بلاشبہ آپ نے شرفا کی خاص حیثیت بھی تسلیم کی مگر اُسی حد تک کہ اس معیار کے مطابق ہو (العمادی)

۱۲۵ حیثیت کو تسلیم کیا۔ کبھی کہا کہ "جاہلیت کا فخر اور آبائی تفاخر دور ہوا کیوں کہ سب لوگ اولادِ آدم ہیں اور آدم مٹی سے تھا۔ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا آدمی وہی ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہو" پھر کہا کہ "سب انسان برابر ہیں جیسے کنگھی کے دندانے ہوتے ہیں۔ صرف۔ قوتِ جسمانی بعض کو بعض پر فضیلت دے دیتی ہے" لیکن آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں سردار تھے اُن کو زمانۂ اسلام میں بھی سردار رہنے دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ "حکمت حق" کے تابع رہیں (یعنی مسلمان ہو جائیں) آپ نے فی الواقع کئی موقعوں پر چاہا کہ عرب کے قبیلوں میں جو سلسلہ شیوخ کا جاری ہے اُسے قائم نہ رکھا جائے۔ لیکن اِس قصد کو عمل میں لانے کی نوبت نہ آئی۔ بہرکیف قبائل میں سرداری کا سلسلہ بدستور جاری رہا شیوخ قبائل کو جو حقوق حاصل تھے وہ اُسی طرح قائم رہے اور وہ اپنے قبیلے کی سرداری کرتے رہے۔ کیونکہ آپؐ نے باوجود اس موہوم خیال کے کہ عربوں کو ملا جلا کر ایک قوم بنا دیا جائے۔ عربوں میں جو تقسیم قبیلوں کی چلی آتی تھی اُسے بحال رکھا اور اُس کو خدا کے حکم کے مطابق بتایا اور ہر قبیلہ جو ایک معاشری گروہ واحد تھا اپنے ہی لیے زندہ رہا اور اپنے ہی معاملات میں اس کو مصروفیت رہی اور ایسے معاملات سے جو اس کی ذات پر کسی قسم کا اثر نہ پہنچاتے تھے اُسے کچھ بحث نہ تھی لڑائی کے موقعے پر یہ قبائل جُدا جُدا قومی دستوں کی شکل رکھتے تھے۔ ہر ایک کا عَلَم علیحدہ ہوتا تھا اور خود شیخ قبیلہ یا کوئی اور شخص جسے شیخ نے حکم دیا ہو۔ قبیلے کا عَلَم بردار ہوتا تھا قاعدہ یہ تھا کہ شیوخ کا تقرر خلیفہ کرے۔ لیکن اس نظری قاعدے اور عملی طریقے میں فرق تھا۔ ایک قبیلے میں اُسی قبیلے کے کسی آدمی کو سرداری کی عزت بخشنا خلیفہ وقت ہی کا کام ہو سکتا تھا۔ کیونکہ عرب کسی غیر عرب کی اطاعت بہت مشکل سے قبول کرتے تھے بلکہ قبول کرتے ہی نہ تھے۔ چنانچہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور امیر المومنین ابوبکر نے بھی تقریباً ہمیشہ اسی طریقے پر اپنا عمل رکھا۔ اور ہمیشہ ایسے لوگوں کو صاحبِ اختیار قرار دیا جن کے ذاتی اثر کو عرب تسلیم کرتے تھے۔ لیکن امیر المومنین

عمر بن خطابؓ کے دورِ خلافت میں عربوں نے بطورِ استحقاق کے اس بات کا دعوے کیا کہ سوائے قبیلے کے آدمی کے کوئی دوسرا شخص قبیلے کا سردار مقرر نہ کیا جائے معمول یہ تھا کہ ہر قبیلہ اپنے ہی آدمیوں میں سے کسی کو اپنا شیخ منتخب کر لیتا تھا اور خلیفہ اس انتخاب کو منظور کر لیتے تھے۔ یہی طریقہ وہابیوں کے امیر نے انیسویں صدی عیسوی (تیرھویں صدی ہجری) میں اختیار کیا تھا۔ پس شیوخ کے قدیم گروہ نے جو امتیاز
(۲۶) اسے پہلے حاصل تھا وہی اب بھی قائم رکھا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپؐ کے خلفاء نے مناصبِ جلیلہ پر یعنی لشکروں کی امارت اور ملکوں کی حکومت پر پرانے آزمودہ کار مسلمانوں کو جن میں مہاجرین اور انصار ہوتے تھے مقرر کیا۔ کیوں کہ اس میں کسی طرح کا خطرہ نہ تھا۔ مہاجرین اور انصار وہ تھے جو سچے دل سے مسلمان ہوئے تھے اور جن پر اسلامی حکومت جو دینی اور دنیوی دونوں حیثیتیں رکھتی تھی پورا اعتماد رکھ سکتی تھی شیوخِ قبائل پر بہت زیادہ بھروسہ نہ تھا جو کبھی کبھی مذہب کے پورے پابند نہ ہوتے بلکہ اُن میں بعض وقت ملحد اور دہریے بھی ہوتے تھے جیسے عُیَینَہ سردار فزارہ کا حال تھا جس نے ایک موقعے پر کہا تھا کہ "اگر خدا ہوتا تو میں اُسی کے نام کی قسم کھا کر کہتا کہ مجھے اس کا یقین نہیں ہے۔"

مہاجرین اور انصار کو دوسروں پر ترجیح دینا ایک قدرتی امر تھا۔ وہ اس ترجیح کے مستحق تھے لیکن (بعض) شیوخِ قبائل جب دیکھتے تھے کہ شہروں کے رہنے والے زراعت پیشہ اور ایسے لوگ جو پہلے کچھ نہ تھے اب اُن کے سردار اور حاکم بنائے گئے ہیں تو وہ سمجھتے تھے کہ ہماری عزت میں بٹا لگا دیا۔ شیوخ کے علاوہ قبائل کے (بعض) لوگ بھی جو اپنے شیخ کی عزت کو اپنی عزت جانتے تھے اس بات پر دل سے ناراض ہوتے تھے اور بہت بے صبری کے ساتھ اس وقت کے منتظر ہوتے تھے جبکہ وہ اپنے شیوخ کے دعووں کو بزورِ شمشیر ثابت کریں اور اُن مہاجرین اور انصار کا کام ہی تمام کر دیں جنھوں نے (فتنۂ ارتداد کے وقت) اُن کے عزیزوں اور قبیلے کے لوگوں کو قتل کیا تھا ایسی ہی عداوت اور خصومت کے خیالات روسائے مکہ کے دلوں میں بھی بھرے

بھرے ہوئے تھے۔ رؤسائے مکہ کے سردار اس وقت بنی امیہ تھے۔ یہ لوگ جب اپنے زعم میں دیکھتے تھے کہ خلیفۂ وقت کی مجلسِ مشورت میں صرف وہ لوگ بلائے جاتے ہیں جو سابق الاسلام ہیں تو اُن کو گراں گزرتا تھا۔ یہ درست ہے کہ امیر المومنین ابوبکرؓ کا میلانِ خاطر مکہ کے رئیسوں کو مشوروں میں شامل کرنے کا تھا لیکن امیر المومنین عمرؓ ابن الخطاب نے اس بارے میں مخالفت کی اور جو کچھ صلاح اس کے متعلق انھوں نے دی اُس کو سب نے مان لیا۔ اب ہم دیکھیں گے کہ رؤسائے عرب نے پہلے بغیر کسی قسم کے جبر کے اپنا اقتدار قائم رکھنے کی کوشش کرنی چاہی۔ لیکن یہ بات اُس وقت آسانی سے دیکھی جا سکتی تھی کہ اگر اس کوشش میں وہ ناکام رہے تو پھر مہاجرین اور انصار کے مقابلے کے لیے بدوی قبیلوں کے شیوخ ان رؤسائے عرب کی مدد کو کھڑے ہو جائیں گے۔

اسناد

برک ہارٹ ص ۴۱ - ۱۶۰ - ۲۹۵

برٹن - سفرنامہ ج ۲ - ص ۸۶ - ۱۰۹

کوسن - ج ۱ - ص ۱۱۱ - ۱۱۴ - ج ۲ - ۷۸ - ۲۸۱ - ۳۹۱

ج ۳ - ۹۹ - ۲۳۱ - ۲۸۸ - ۵۰۷

ریحان - ریحان الالباب - لیدن - قلمی نسخہ ۱۵۴ صفحہ ۱۰۵

ابن خلدون - مقدمہ (۱۴) ص ۲۴۳ (۱۷) ص ۲۹۶

البلاذری - فتوح الشام - ص ۳۷ - ۳۹ - ۵۴ - ۷۷ - ۱۶۱ - ۱۶۲

۱۹۸ - ۲۰۰ - ۲۰۸ - ۲۰۹ - ۲۳۷

۳۳۹

ابن العذاری - ج ۱ - ۳۴

قرطاس - ص ۲۵

اصطخری ص ۲۶

احمد بن ابی یعقوب - ص ۵۲ - ۵۳ - ۶۴

ابن قتیبہ - ص ۱۲۱

طبری - ج ۱ - ۸۰ - ۱۱۰

ج ۲ - ۴ - ۱۱۰ - ۱۶۴ - ۲۰۶ - ۲۰۸ - ۲۱۰ - ۲۲۴

ابو المحاسن - ج ۱ - ص ۳۴۳

کتاب اوّل

خانہ جنگی

تیسری فصل

بنی اُمیّہ کا عُروج

امیر المومنین عمرؓ ایک عیسائی پیشہ ور کے خنجر سے کاری زخم کھا کر قریب بہ ہلاکت ہوئے تو انھوں نے اپنا جانشین نامزد کرنے کے لیے صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں سے چھ[1] شخص تجویز کیئے ان چھ میں علیؑ، عثمانؓ، زبیرؓ اور طلحہؓ بھی شامل تھے جس وقت حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا تو یہ چھ انتخاب کرنے والے دو دن تک مشورے کی غرض سے ایک مکان میں جمع رہے۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے، ہر شخص اپنے فضائل کو بڑھانے اور دوسرے کے دعوے کو گھٹانے میں مصروف رہا۔ تیسرے دن یہ فیصلہ ہوا کہ نصب خلافت کا کام انتخاب کنندوں میں سے اُس شخص کے سپرد کیا جائے جو اپنے دعوے سے دست بردار ہو چکا ہو۔ یہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ تھے۔ انھوں نے عثمانؓ اموی کو خلافت کے لیے نامزد کر دیا۔ مگر اس انتخاب سے علیؑ، زبیرؓ اور طلحہؓ کچھ خوش نہ ہوئے[2]

[1] باقی کے دو شخص عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص تھے (اسماعیل)

[2] یہ سارے واقعات و حالات نہایت مغالطہ آمیز پیرایے میں مصنف نے بیان کئے ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

بعض اعتبار سے اس انتخاب کو بہترین سمجھنا مشکل تھا[1]۔ یہ سچ ہے کہ حضرت عثمانؓ دولتمند اور سخی تھے اور پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور آپ کے ماننے والوں کے لیے اپنا مال بھی خرچ کر چکے تھے۔ صوم وصلوٰۃ میں بیحد شغف رکھتے تھے۔ اخلاق حمیدہ اور منکسر المزاجی کی مجسم تصویر تھے اور یہی اُن کی تمام خوبیاں تھیں۔ لیکن عقل اُن کی کبھی زیادہ قوی ثابت نہیں ہوئی تھی بلکہ بڑھاپے کی وجہ سے اُس میں کمی آگئی تھی اسوقت ستر برس کا ان کا سن تھا۔ طبیعت کے اس قدر نازک تھے کہ جب پہلی دفعہ منبر پر گئے تو ہمت اور تقریر دونوں میں قاصر رہے۔ اور غمزدہ آواز سے یہ کہتے ہوئے منبر سے نیچے اُتر آئے کہ پہلی کوشش بڑی مشکل چیز ہے۔ ان مرد پیرانہ سال کے حق میں یہ بات کہ اُن کو اپنے اہل خاندان کا بہت پاس تھا[2]۔ ایک بڑی خامی

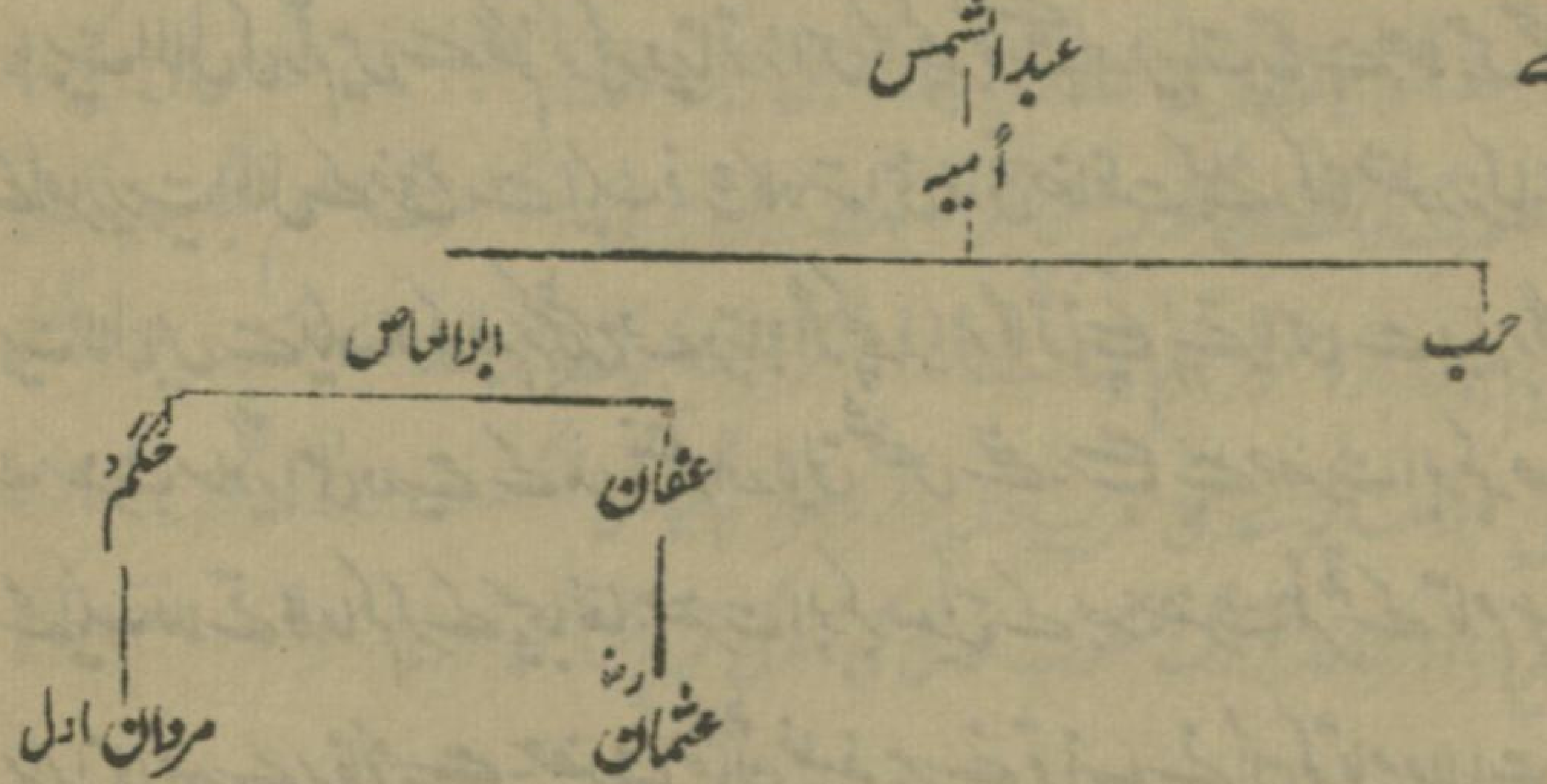
(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) (۵) اس مجلس شوریٰ میں جہاں چھ اصحاب کی مسور بن مخرمہ کے مکان میں ہوئی ہر شخص اپنے فضائل کو بڑھاتے اور دوسرے کے گھٹانے میں مصروف رہا۔ جو ھانا تو رہا درکنار۔ وہاں تو اپنے فضائل کسی نے بیان ہی نہیں کیے۔ نہ وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ جو شخص دعویٰ خلافت سے دست بردار ہو چکا ہو وہ خلیفہ منتخب کرے (اسد الغابہ بتذکرہ عثمانؓ بن عفان) نہ عثمانؓ کے انتخاب سے علیؓ طلحہؓ اور زبیرؓ ناراض ہوئے بلکہ سب نے اسی دن حضرت عثمانؓ کی بیعت کی۔ نہ اپنی رائے اور مرضی سے عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے حضرت عثمانؓ کو منتخب کیا۔ انھوں نے تو صرف یہ کیا تھا کہ جمہور صحابہ کی رائے حضرت عثمانؓ کے حق میں پاکر اس کا اعلان کر دیا (تاریخ الخلفاء سیوطی)

[1] یہ خیال بھی مصنف کا غلط ہے۔ انتخاب یقیناً بہترین تھا اور حضرت عثمان اپنے زمانہ حکومت میں فاروق اعظم سے بھی زیادہ محبوب سمجھے جاتے تھے (طبری ص ۳۰۲۶ اور سیوطی ص ۱۱۰) اور اگر بعض دشمنانِ اسلام اور مسلم نما یہودی فتنے برپا نہ کرتے تو حضرت عثمان کا زمانہ تاریخ اسلام کا ایک زریں عہد ہوتا (اسمٰعیل)

[2] اپنے خاندان والوں کیساتھ سلوک و مروت سے پیش آنا کوئی عیب کی بات نہیں۔ بلکہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کی قرآن شریف میں تاکید آئی ہے اور اسی حکم کی تعمیل حضرت عثمانؓ کرتے تھے۔ باقی ان کے عہد میں جو فتنے اٹھے ان کا باعث اس سلوک ومروت کو قرار دینا ہرگز ٹھیک نہیں۔ اُس کے اسباب دوسرے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں (اسمٰعیل)

ثابت ہوئی اور یہ خاندان بھی رؤسائے مکہ کا وہ تھا جس نے بیس برس تک رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین و مخالفت کی تھی اور اُن پر ظلم کیے تھے ۔خلیفہ ہو کر حضرت
عثمانؓ اپنے خاندان والوں کے بالکل قابو میں آ گئے ۔اُن کا چچا حَکَمؔ اور اس سے بھی زیادہ
حَکَم کا بیٹا مروان بہت جلد مالک و مختار بن گیا ۔حضرت عثمانؓ کے لیے جو کچھ ان لوگوں
نے چھوڑ رکھا تھا وہ فقط "امیر المومنین" کا لقب یا جن معاملات میں راضی نامے کرائے
جاتے تھے اُن کی ذمہ داری تھی ۔بلکہ اُن معاملات سے بھی جن کی یہ ذمہ داری تھی
اکثر اُن کو بے خبر رکھا جاتا تھا[۱] ۔حَکَم کا واقعی مسلمان ہونا شبہ سے خالی نہ تھا حَکَم
اس دن اسلام لایا تھا جس دن مکہ فتح ہوا تھا ۔اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ
وسلم نے چند راز کی باتیں اس سے کہی تھیں مگر اس نے افشائے راز کیا ۔آپ نے اُس کے
حق میں بددعا کی اور اُسے شہر بدر کر دیا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے یہ سزا
بحال رکھی مگر حضرت عثمانؓ نے حَکَم کو پھر بُلا لیا اور ایک لاکھ درہم اور بیت المال کی
کچھ زمینیں اس کو دے دیں ۔اس کے علاوہ اُنھوں نے حَکَم کے بیٹے مروان کو اپنا

لہ شجرۂ نسب یہ ہے



لہ حضرت عثمانؓ ہرگز اس قدر کمزور اور برائے نام خلیفہ نہیں تھے جیسا کہ مصنف نے ظاہر کیا ہے وہ بہت رحمدل اور چشم پوشی کرنے والے بزرگ تھے اور غلطی سے یہی اُن کی کمزوری سمجھ لی گئی ۔ان کا رعب بھی رعایا پر بہت تھا چنانچہ اس وقت کا ایک شاعر کہتا ہے "اے فاسقو! عثمانؓ کی حکومت میں لوگوں کا مال لوٹ کر نہ کھاؤ کیونکہ ابن عفان وہ ہے جس کا تجربہ تم لوگ کر چکے ہو ۔وہ لٹیروں کو قرآنی احکام کے موافق سزا دینے والا اور ہمیشہ احکام قرآنی کی حفاظت کرنیوالا ہے"
لہ حَکَم کو واپس بلانے کے متعلق حضرت عثمانؓ کا بیان ہے کہ انھوں نے آنحضرتؐ سے اس کی اجازت (باقی بر صفحہ آئندہ)

معتمد علیہ اور وزیر بنایا۔ اپنی لڑکی سے اُس کی شادی کر دی اور افریقہ کی غنیمت سے اُسے مالا مال کر دیا۔ اپنے خاندان کے ایک بزرگ کی خلافت سے منتفع ہونے کے لیے بنی اُمیہ کے لائق اور جاہ طلب نوجوانوں نے جو پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانی دشمنوں کی اولاد تھے۔ حکومت کے بڑے بڑے مناصب جن میں مالی نفع بکثرت تھا حاصل کر لیے۔ عام لوگ اِس سے خوش ہوئے کہ بزرگانِ سابق الاسلام کی جگہ جو بہت خشک مزاج اور سخت گیر تھے اب یہ عیش دوست اور ظرافت پسند امیر زادے اُن کے حاکم مقرر ہونے لگے۔ لیکن جو دیندار مسلمان تھے اُن کو اِن والیان ملک سے سخت نفرت پیدا ہوئی[1]۔ کونسا مسلمان تھا جو ابُوسفیان (کی قبل از اسلام کی حرکتوں) کو یاد کر کے (ان حرکتوں سے) نفرت نہ کرتا ہو۔ اسی ابوسفیان کے بیٹے معاویہ کو حضرت عثمانؓ نے شام کی تمام ولایات کا عامل مقرر کر دیا۔ (اسلام لانے سے پہلے) یہی ابوسفیان اُس فوج کا سردار تھا جس نے جنگِ اُحد میں پیغمبرؐ کو شکست[2] دی تھی اور جس نے مدینہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لے لی تھی اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک اولالعزم صحابی کے بیان کو غلط سمجھیں۔ (باقی رہا بیت المال کی رقم میں سے حَکَم کو کچھ دینا تو نہ اس کا کچھ ثبوت ہے اور نہ یہ بات سچ ہے بھلا جس شخص نے حضرت معاویہؓ کے اصرار پر بیت المال کے خرچ سے ایک فوج کا دستہ اپنی ذاتی حفاظت کیلئے رکھنا منظور نہ کیا۔ وہ دوسرے شخص کو بیت المال میں سے ایک لاکھ درہم کس طرح دے دیتا؟ اگر کچھ دیا ہو گا تو آپنے اپنے پاس سے دیا ہو گا (اسمٰعیل)

[1] حضرت معاویہؓ اعلیٰ درجے کے مدبر، منتظم اور لایق شخص تھے۔ سب سے پہلے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کو شام کے ایک علاقے کا حاکم کر کے بھیجا تھا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمرؓ کے تمام عہد حکومت میں بھی برابر اسی عہدے پر فائز رہے۔ حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو آپ نے اُن کو تمام ولایاتِ شام کا گورنر کر دیا اور دنیا نے دیکھ لیا کہ انھوں نے کس عمدگی اور لیاقت کے ساتھ تینوں صحابہ کے زمانے میں اپنے آپ کو اس عہدے کا اہل ثابت کیا نیز مصنف کا یہ قول کہ دیندار مسلمانوں کو حضرت عثمانؓ کے عاملوں سے نفرت پیدا ہوئی، اپنے ساتھ تاریخی تصدیق نہیں رکھتا (اسمٰعیل)

[2] یہ غلط ہے کہ آنحضرتؐ کو اُحد میں شکست ہوئی۔ شکست اس کا نام ہے کہ مخالف میدان چھوڑ کر بھاگ جائے یا اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دے اور اپنی ہار مان لے۔ حالانکہ اُحد میں اِن دونوں

میں آپ کا محاصرہ کیا تھا۔ ابوسفیان مکہ والوں کا سرگروہ تھا اور جب تک اس کے فریق کو ہزیمت نہ ہوگئی اور جب تک یہ نہ دیکھ لیا کہ دس ہزار مسلمان اس کو اور اس کے ساتھیوں کو مغلوب کرنے کے لیے شمشیر بکف ہیں اسلام قبول نہ کیا جس وقت آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ اُن کو خدا کا رسول مانے تو جواب دیا کہ "مجھے ابھی اس بات میں شک ہے" جب یہ جواب دیا تو اس سے کہا گیا کہ (۲۹)
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ کہو ورنہ سر قلم کر دیا جائے گا۔ تو اس حکم سے مجبور ہو کر ابوسفیان مسلمان ہو گئے۔ مگر حافظہ اس قدر کمزور تھا کہ تھوڑے دنوں کے بعد اتنا بھی یاد نہ رہا کہ کبھی اسلام قبول کیا تھا۔ پھر کونسا مسلمان تھا جس کو معاویہؓ کی ماں (اسلام سے قبل کی) ہند یاد نہ ہو۔ یہ وہ ظالم اور سفاک عورت تھی جس نے جنگ اُحد میں[1] مقتول مسلمانوں کے کٹے کانوں اور کٹی ناکوں کے ہار اور کنگن بنا کر پہنے تھے اور جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حمزہؓ ابن عبدالمطلب کی لاش کا پیٹ چاک کر کے اور کلیجہ نکال کر اپنے دانتوں سے چبایا تھا۔ جس کا باپ ایسا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔ البتہ بعض لوگوں کی ایک غلطی کی وجہ سے آنحضرتؐ کو نقصان ضرور پہنچا مگر شکست نہیں ہوئی۔ آنحضرتؐ صلعم جنگ کے بعد بھی یہ خبر پاکر ابوسفیان دوبارہ حملہ کرنا چاہتا ہے فوراً لشکر مرتب کر کے اس کے مقابلہ کو روانہ ہو گئے اور ابوسفیان اس کی بھنک پڑتے ہی سر پہ پاؤں رکھ کر فرار ہو گیا۔ کیا شکست خوردہ لوگوں کے حوصلے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں؟ اور کیا فاتح لوگ مغلوب فوج کی آمد کی خبر پاکر اسی طرح راہِ فرار اختیار کیا کرتے ہیں؟ (اسماعیل)

[1] سیرۃ النبی مولفہ علامہ شبلی میں ہند کے مسلمان ہونے کا واقعہ اس طرح مذکور ہے:۔
فتح مکہ کے موقع پر جو مستورات اسلام قبول کرنے کے لیے حاضر ہوئیں اُن میں ہند بھی آئی یہ وہی ہند ہے جو رئیس العرب عتبہ کی بیٹی اور امیر معاویہؓ کی ماں تھی حضرت حمزہؓ کو (جنگ اُحد میں) اسی نے شہید کرایا تھا اور انکا سینہ چاک کر کے کلیجہ چبا گئی تھی۔ وہ نقاب پہن کر آئی۔ شریف عورتیں زیادہ (بقیہ برصفحہ آئندہ)

ہو اور ماں "ہند جگر خوار" کے نام سے مشہور ہو گئی۔ ہو اس کے بیٹے معاویہ کا مسلمان ہونا کیونکر باور کیا جا سکتا تھا؟ معاویہ کے دشمن علانیہ کہتے تھے کہ معاویہ مسلمان نہیں ہیں [1]

عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح والیٔ مصر ہوئے یہ حضرت عثمان کے رضاعی بھائی تھے۔ ان کے حالات اور بھی عجیب ہیں۔ ان کی ہمت و مردانگی کے سب قائل ہیں۔ افریقہ میں ملک نومیدیہ کے رومی گورنر کو شکست دی اور رومی بیڑے پر فتح پائی۔ درآنحالیکہ مسلمانوں کے جہازوں کی تعداد بمقابلہ رومی جہازوں کے بہت کم تھی۔ لیکن یہی شخص شروع میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کاتب رہا تھا۔ ایک دفعہ آپؐ وحی لکھوانے لگے تو اس نے وحی کے الفاظ اور مفہوم کو بدل کر لکھ دیا۔ جب یہ جرم کھلا تو بھاگ کر کہیں چلا گیا اور وہاں مرتد ہو گیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عموماً نقاب پہنتی تھیں۔ لیکن اس وقت یہ غرض بھی تھی کہ کوئی اسے پہچانے نہیں بیعت کے وقت اس نے نہایت دلیری (بلکہ گستاخی) سے یہ باتیں کیں جو حسب ذیل ہیں۔ ہند۔ یا رسول اللہ آپ ہم سے کن باتوں کا اقرار لیتے ہیں؟ رسول اللہ صلعم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا ہند یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا لیکن بہر حال ہم کو منظور ہے۔ رسول اللہ صلعم۔ چوری نہ کرنا ہند۔ میں اپنے شوہر (ابو سفیان) کے مال میں سے دو چار آنے کبھی لے لیا کرتی ہوں۔ معلوم نہیں یہ بھی جائز ہے یا نہیں؟ رسول اللہ صلعم۔ اولاد کو قتل نہ کرنا۔ ہند۔ ہم نے تو اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا (جنگ بدر میں) آپ نے ان کو مار ڈالا اب آپ اور وہ باہم سمجھ لیں

(سیرۃ النبی جلد اول طبع دوم صفحہ ۷۶، ۷۷)

[1] یہ ہرگز صحیح نہیں۔ ہمارے نزدیک حضرت معاویہ ویسے ہی سچے مسلمان ہیں جیسے دوسرے صحابہ آنحضرت صلعم کی ان کے حق میں دعا ہے۔ اللّٰھم اجعلہ ھادیًا و مھدیًا (ترمذی بروایت عبد الرحمٰن بن ابو عمیرا) حضرت علی انکے متعلق فرماتے ہیں لا تکرھوا امرۃ معاویۃ فانکم لو فقد تموہ لرأیتم الرؤس تندرعن کواھلہا۔ یعنی معاویہ کو برا نہ سمجھو۔ جس وقت یہ تمہارے درمیان (باقی بر صفحہ آئندہ)

جس دن مکہ فتح ہوا تو ابن ابی سرح پردۂ کعبہ کی اوٹ میں چھپے کھڑے رہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اِن کے قتل کا حکم دے رکھا تھا لیکن انھوں نے حضرت عثمان کی پناہ ڈھونڈی۔ چنانچہ حضرت عثمان ان کو رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے لائے اور رحم کے خواستگار ہوئے۔ آپ دیر تک خاموش رہے اور آخر کار آہستہ سے فرمایا کہ "میں نے اِسے معاف کیا"۔ لیکن جب حضرت عثمان ابن ابی سرح کو سامنے سے ہٹا کر لے گئے تو آپ نے صحابہ کی طرف دیکھ کر کہا کہ "تم کو بات سمجھتے ہیں اس قدر توقف کیوں ہوتا ہے؛ میں خاموش اس لیے تھا کہ تم میں سے کوئی دوڑ کر اسے قتل کر دے گا"۔ غرض یہی ابن ابی سرح سلطنتِ اسلامیہ کے سب سے زیادہ شاداب و زرخیز ملکوں میں سے ایک ملک کے والی تھے۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سے اُٹھ جائیں گے تو تم دیکھو گے کہ بہت سے سرتن سے جدا کیے جائیں گے (تاریخ الخلفا سیوطی)

بھلا جو شخص آنحضرت صلعم کا کاتب وحی رہ چکا ہو۔ اور جسے صدیق جیسا کامل بالایمان، عمر جیسا حامی اِسلام، اور عثمان جیسا عاشق مذہب، ۴۰ سال تک مسلسل شام کا گورنر رکھیں اور اس سے خوش و مطمئن رہیں، اس کے اسلام میں کسی قسم کا شبہ کیا جا سکتا ہے؛ باقی رہیں غلطیاں۔ تو اُن سے کون شخص بچا ہوا ہے؛ مصنف کا یہ کہنا کہ جس کا باپ ایسا ہو اور ماں ایسی۔ وہ کس طرح مسلمان ہو سکتا ہے؛ بڑی ہی عجیب بات ہے ہندہ اور ابوسفیان تو پھر بھی مسلمان ہو گئے تھے۔ کیا اکثر جلیل القدر صحابی اشد ترین کافروں اور دشمنوں کے بیٹے نہیں تھے؛ مگر کیا ان کے اسلام میں کوئی شک کیا جاتا ہے؛ پھر بیچارے معاویہ نے کیا قصور کیا ہے کہ اس کے باپ یا ماں کے گذشتہ اعمال کی وجہ سے اُسے مسلمان نہ سمجھا جائے۔ ابوجہل سے زیادہ دشمن اسلام کون ہوگا! مگر کیا آج تمام دنیائے اسلام حضرت عکرمہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ نہیں کہتی۔ دشمنوں کا علانیہ معاویہ کو مسلمان نہ بتانا بھی اس امر کو درست ثابت نہیں کرتا۔ دشمن تو جو بات کہے گا۔ مخالف ہی کی کہے گا۔ (اسمٰعیل)

[1] ابن سرح کا یہ واقعہ صحیح ہے مگر ان کے زمانۂ کفر کے جرائم ہرگز قابلِ الزام نہیں حضرت عثمان نے رشتہ داری کے لحاظ سے نہیں بلکہ اسلیے کہ ان کے خیال میں وہ اس عہدے کے لیے موزوں تھے انھیں عامل مصر مقرر کیا تھا اور اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ جب ان سے رعایا کو کچھ شکایات پیدا ہوئیں تو آپ نے اُن کو فوراً معزول کر دیا۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی یہ گورنر مقرر ہوئے تھے۔ (سیرۃ ابن ہشام) (اسمٰعیل)

امیر المومنین عثمانؓ کا رضاعی بھائی ولید کوفہ کا والی تھا۔ اس نے آذربائیجان کی بغاوت اِس حالت میں فرو کی تھی جبکہ یہ علاقہ اسلامی حکومت سے قطعی آزاد ہونا چاہتا تھا ولید کے لشکر نے معاویہؓ کی فوجوں کے ساتھ مل کر جزیرہ قبرص کو فتح کیا تھا اور ولید کے زمانۂ حکومت کی تعریف ہر زبان پر تھی۔ مگر یہ جو کچھ بھی ہو ولید، عقبہ کا بیٹا تھا۔ اور عقبہ وہ شخص تھا جس نے پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (معاذ اللہ) تھوکا تھا اور ایک دفعہ آپؐ کا گلا ہی گھونٹ دیا ہوتا۔ اس کے بعد جب آپ نے اُسے قید کر دیا اور اُس کے قتل کا حکم دیا تو عقبہ چلا کر کہنے لگا کہ "جب میں مر جاؤں گا تو میرے بچوں کی خبر کون رکھے گا۔" پیغمبر نے جواب دیا "اگر وہ مسلمان نہ ہوئے تو[1] "نار جہنم" آپ کی اس پیشگوئی کو ولید بن عقبہ نے جو اس دن سے ابن الناز کے لقب سے مشہور ہو گیا صحیح ثابت کرنے میں اپنی طرف سے بھی حتی المقدور کمی نہیں کی۔ چنانچہ شراب کا ایک جلسہ جس میں خوبصورت گانے والیاں بھی موجود تھیں عیش و طرب کی مصروفیت میں آخر شب تک قائم رکھا یہاں تک کہ صبح ہوتے مینارِ مسجد سے جب موذن کی اذان سنی تو شراب کے بخارات ابھی تک دماغ میں بسے ہوئے تھے مگر اِسی حال میں فقط قمیص پہنے مسجد میں آکر نماز فجر پڑھانی شروع کر دی اور بجائے دو رکعتوں کے چار رکعتیں پڑھا دیں۔ اور چار رکعتیں پڑھانے کے بعد غالباً اِس خیال سے کہ لوگ اُسے مخمور نہ سمجھیں نمازیوں سے کہنے لگا "کہو تو اور پڑھاؤں" یہ سن کر ایک دیندار مسلمان نے جو پہلی صف میں تھا پکار کر کہا کہ "میں تجھ جیسے آدمی پر صبر نہیں کر سکتا۔ کبھی مجھے یقین نہیں آسکتا تھا کہ مدینہ سے ایسا آدمی ہمارے شہر کا حاکم مقرر ہو کر آئے گا۔ یہ کہہ کر اس نے صحن مسجد کو کرید کر سنگریزے اٹھائے اور دیگر نمازیوں نے بھی یہی کیا۔ ولید اس خوف سے کہ کہیں لوگ سنگسار نہ کر دیں مسجد سے بھاگا اور قصر امارت میں جھومتا جھامتا جاہلیت کے ایک شاعر کا

[1] اتنی بات کہ "اگر وہ مسلمان نہ ہوئے تو" مصنف نے چھوڑ دی ہے تاکہ اپنے مخالفانہ کلام میں کمزوری پیدا نہ ہو (مترجم)

یہ شعر پڑھتا ہوا داخل ہوا" جہاں شراب ہوگی اور گانا ہوگا وہیں تم مجھے پاؤ گے میرا دل پتھر کا نہیں ہے کہ عیش و نشاط کی حس نہ رکھتا ہو"۔ مشہور شاعر حطیئہ نے اس نماز کے واقعہ کو اپنے شاعرانہ جذبات کا محل قرار دیا اور چند ابیات اس مضمون کی کہیں "الحطیئہ اس امر کی تصدیق کرے گا کہ ولید ہرگز اُن اعتراضوں کا مستحق نہ تھا جو اُس پر کیے گئے۔ سب کچھ کہنے کے بعد اس کا قصور صرف اس قدر رہ جاتا ہے کہ نماز ختم کرنے پر اُس نے مقتدیوں سے کہا کیا اور پڑھوانی چاہتے ہو؟" اس وقت وہ شراب کے نشے میں مگن تھا اُسے خبر بھی نہ تھی کہ کیا کہہ رہا ہے۔ اے ولید! یہ ایک تقدیری امر تھا کہ تجھے کسی نے روک دیا ورنہ تو تو قیامت تک نماز ہی پڑھائے جاتا۔" بہرکیف حطیئہ گو شاعر اعلےٰ درجے کا تھا مگر یہ ماننا پڑے گا کہ وہ مرتد تھا۔ کبھی اسلام قبول کرتا تھا کبھی ارتداد اختیار کرتا تھا[۱] کوفہ میں بعض لوگ ایسے تھے (۲۱۱
جن کو بزرگان مدینہ سے روپے کی صورت میں امداد پہنچتی رہتی تھی[۲] یہ لوگ اس مرتد شاعر کے ہم خیال نہ تھے۔ چنانچہ اہل کوفہ میں سے دو شخص امیر المومنین کے پاس مدینے گئے اور اُن کے سامنے ولید پر شراب خواری کا الزام لگایا۔ پہلے تو حضرت عثمانؓ نے اِن لوگوں کا اظہار قلمبند کرنے سے انکار کیا۔ لیکن حضرت علیؓ دراندازہوئے۔ ولید پر جُرم ثابت ہوا اور وہ ولایت کوفہ سے معزول کیا گیا۔ کوفہ والوں کو اس کا افسوس ہوا[۳]

---

[۱] ولید کے متعلق نماز کا سارا واقعہ جعلی بلکہ فرضی معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر ولید نماز فجر کی دو رکعتیں پڑھا کر جب تیسری کے لیے کھڑا ہوا تو مقتدی یقیناً حسب قاعدہ زور سے سُبحان اللہ کہہ کر اُسے روک دیتے چونکہ بقول مصنف اُسے یہ خوف بھی تھا کہ نمازی مجھے مخمور نہ سمجھیں۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ ٹوکنے پر وہ فوراً رُک جاتا دوسرے کوفہ کے لوگوں نے جب دربار خلافت میں اس کی شکایت کی تو اگرچہ اس پر شراب خواری کا الزام لگایا مگر اس خاص واقعہ کا ذکر تک بھی نہیں کیا حالانکہ مصنف کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ محض اسی واقعہ سے مشتعل ہو کر ولید کی شکایت دربار خلافت میں کی گئی تھی۔ یہ فسانہ ولید کے دشمنوں نے گھڑا اور مرتد شاعر حطیئہ نے اُسے نظم کر ڈالا

[۲] یہ بالکل غلط ہے نہ اس امداد کا کوئی تاریخی ثبوت ہے اور نہ اس کی کوئی وجہ سمجھ میں آتی ہے (اسماعیل)

[۳] صحیح واقعہ ولید کی معزولی اور سزایابی کا یہ ہے کہ کوفہ کے دو شخص ابوزینب اور ابو مورع (باقی بر صفحہ آئندہ)

اب[1] مدینے کے بزرگوں نے حضرت عثمان کو والیانِ ملک کے بُرے انتخاب پر فضیحت کی اور یہ شکایتیں بھی کیں کہ بعض[2] صحابہ رسول اللہ صلعم کے ساتھ انھوں نے بُرا برتاؤ کیا اور جاہلیت[3] کے ایک طریقے کو جسے پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) موقوف کر چکے تھے پھر جاری کر دیا جس کی غرض یہ تھی کہ مکہ میں (جہاں ان کا مکان تھا) سکونت رکھ سکیں اور سب سے زیادہ یہ کیا کہ قرآن کا ایک نیا[4] نسخہ مرتب کرایا اور وہ بھی دین کے بڑے عالموں سے نہیں بلکہ اپنے ہوا خواہوں سے یہاں تک کہ رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جس شخص کو قرآن کا بہترین قاری کہا۔ اُس سے ترتیب قرآن میں مشورہ تک نہ لیا اور پھر یہ کیا کہ اِس نسخہ کو مستند قرار دے کر باقی تمام جلدیں جلوا دیں اب حضرت عثمانؓ

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) جن کو نالائق ہونے کی وجہ سے ولید نے اپنے عہدوں سے برطرف کر دیا تھا۔ ولید کے سخت مخالف تھے اور لوگوں کو اس کی مخالفت پر ابھارتے رہتے تھے یہ دونوں چند اور مفسدین کو اپنے ہمراہ لے کر دربارِ خلافت میں پہنچے اور ولید پر شراب خواری کا الزام لگایا۔ یہ لوگ اپنی پوشیدہ مصلحتوں کی وجہ سے یہ تو صاف طور پر نہ کہہ سکے کہ ہم نے ولید کو شراب پیتے ہوئے بچشم خود دیکھا ہے (حالانکہ جو شخص بقول مصنف ساری ساری رات محفلِ عیش جاری رکھے اور شراب پیتا رہے اس کے خلاف دو عینی گواہ شراب نوشی کے بہت آسانی سے مل سکتے تھے، مگر یہ کہا کہ ولید نے ہمارے سامنے شراب کی قے کی۔ حضرت عثمان نے یہ سنکر اُس پر حد جاری کر دی اور اس کے بعد اُسے معزول کر دیا۔ مگر محققین کے نزدیک ولید کی شراب نوشی آج تک بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی (تاریخ اُمم الاسلامیہ للخضری) اسمٰعیل

[1] یہ غلط ہے بزرگانِ مدینہ نے کبھی والیان ملک کے انتخاب پر اظہارِ ناراضگی نہیں کیا کیونکہ اول تو عامل حتی الامکان قابل اور لائق مقرر کئے جاتے تھے لیکن اگر کبھی عامل سے رعایا ناراض اور ناخوش ہوتی تھی تو حضرت عثمان فوراً اسے معزول کر دیتے تھے (خواہ وہ آپ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہوتا) (اسمٰعیل)

[2] صحابہ کے ساتھ بُرے برتاؤ کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں (اسمٰعیل)

[3] یہ محض بے اصل بات ہے آپ نے کوئی ایسی بات رائج نہیں کی جسے آنحضرت نے موقوف کر دیا تھا

[4] حضرت عثمان نے قرآن کا کوئی "نیا نسخہ" ہرگز مرتب نہیں کرایا۔ صرف یہ کیا کہ قرآن کریم کا وہ نسخہ جو بہترین حفاظِ قرآن کی مدد سے حضرت صدیق نے لکھوایا تھا اور جو ام المومنین (باقی بر صفحہ آئندہ)

کے رقیب سابق یعنی علیؓ - زبیرؓ اور طلحہؓ نے ارادہ کر لیا کہ جو حالت اس وقت ہے وہ برقرار نہیں رکھی جائے گی ؎ یہ تینوں صاحب اب اِس قدر مالدار ہو گئے تھے کہ جب اپنی دولت گننے بیٹھتے تھے تو لاکھوں پر نوبت پہنچتی تھی - انھوں نے ہر طرف روپیہ پہنچانا شروع کیا تاکہ جگہ جگہ حضرت عثمان کے خلاف بغاوتیں پیدا ہو جائیں ؎ مگر اس میں اُن کو کامیابی کم ہوئی - زیادہ تر حصہ مسلمانوں کا حضرت عثمان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت حفصہ کے پاس رکھا ہوا تھا اس کی نہایت احتیاط کے ساتھ بغیر کسی تغیر و تبدل کے لفظ بلفظ نقلیں کرا کر مختلف مقامات پر بھجوا دیں - اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا (صحیح بخاری بروایت انسؓ) اگرچہ اس کام میں کسی مشورہ اور صلاح کی ضرورت نہیں تھی مگر پھر بھی نقلیں کرانے سے پہلے احتیاطاً آپ نے تمام بڑے بڑے صحابہ سے مشورہ کر لیا تھا (ابوداؤد بروایت حضرت علیؓ) صرف حضرت ابن مسعود اس مشورہ میں شریک نہ ہو سکے کیونکہ وہ اس وقت مدینہ میں موجود نہیں تھے (مصنف نے قرآن کے بہترین قاری کا اشارہ غالباً انہی کی طرف کیا ہے) باقی رہا دوسری جلدوں کا جلوا دینا تو اس وقت جلدیں تو تھی ہی نہیں جو جلوائی جاتیں - البتہ لوگوں نے مختلف آیتیں لکڑی کی تختیوں - پتھر کے ٹکڑوں - جانوروں کی کھالوں اور درختوں کے پتوں وغیرہ پر لکھ رکھی تھیں - انھیں بیشک حضرت عثمان نے جلوا دیا تھا - ظاہر ہے کہ تمام آدمی یکساں قابلیت کے نہیں ہوتے - بعض آدمیوں نے بے احتیاطی یا کم لیاقتی کے باعث نقل میں غلطیاں بھی کی ہوں گی - وہ نقلیں باقی رہتیں تو یقیناً اختلافات اور جھگڑوں کا موجب ہوتیں - کیونکہ ہر آدمی اپنی نقل کو صحیح بتاتا - نہایت دور اندیشی کیساتھ ان خطرات کو محسوس کرتے ہوئے حضرت عثمان نے تمام متفرق تحریروں کو جمع کر کے نذر آتش کر دیا - حضرت عثمان ایسا نہ کرتے تو خدا کی یہ پاک کتاب اختلافات سے ہرگز نہ بچ سکتی اور آج قرآن کریم کے دو نسخے بھی ایک جیسے نہ پائے جاتے (اسمٰعیل)

؎ یہ تینوں حضرت عثمان کے رقیب نہیں تھے بلکہ سچے دوست خیرخواہ اور ہمدرد تھے نہ انھوں نے کبھی حضرت عثمان کے خلاف کسی سازش یا بغاوت میں شرکت کی اور نہ کبھی اُن کے مقابلہ میں خلافت کا دعویٰ کیا بلکہ ضرورت پڑنے پر ہمیشہ حضرت عثمان کی امداد و اعانت کی جیسا کہ آئندہ ثابت ہو گا (اسمٰعیل)

؎ حضرت زبیرؓ و طلحہؓ بیشک مالدار تھے مگر حضرت علیؓ کے متعلق یہ بات صحیح نہیں - نہ یہ بات درست ہے کہ خلیفہ وقت کے خلاف بغاوتیں برپا کرانے کے لیے ان بزرگوں نے روپیہ خرچ کیا (اسمٰعیل)

کا طرفدار رہا۔ آخر کار اِن تینوں صاحبوں نے مدینہ والوں کی مزاج شناسی کر کے کئی سو بدوی دراز قامت اور سیاہ رنگ مدینہ میں ایسے بلوائے جو بہ اُمیدِ زر قتل اور غارت کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے[1] اِن بدویوں نے ایک فرضی بے حُرمتی دین کا بدلہ حضرت عثمانؓ سے لینے کے لیے مسجد میں آپ پر دست درازی کی اور اُس کے بعد قصرِ خلافت کی طرف چلے گئے تاکہ حضرت عثمان کو آئندہ گھر سے نہ نکلنے دیں۔ قصر خلافت کی حفاظت پر اِس وقت صرف پانچسو آدمی مقرر تھے۔ اُن میں سے اکثر غلام تھے[2] اور اُن کا افسر مروان تھا۔ اُمید بہ کی جاتی تھی کہ حضرت عثمانؓ خود ہی خلافت سے دست بردار ہو جائیں گے مگر یہ اُمید پوری نہ ہوئی[3] حضرت عثمانؓ کو یا تو یہ یقین تھا کہ کوئی اُن کو جان سے نہ مارے گا یا امیر معاویہؓ پر بھروسہ تھا کہ وہ اُن کی مدد کو آجائیں گے[4] بھرحال

[1] اس قسم کی کسی سازش میں اِن تینوں بزرگوں کی شرکت ہرگز ثابت نہیں اور یہ الزام اِن پر ایک بہتان سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا (اسماعیل)

[2] یہ بھی صحیح نہیں۔ صرف تھوڑے سے آدمی بطور خود حضرت عثمان کے مکان کی حفاظت کر رہے تھے (اسماعیل)

[3] جس وقت باغیوں نے حضرت عثمان سے معزولی کے لیے کہا تو انھوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلعم نے مجھ سے فرمایا تھا کہ خدا تعالےٰ تجھے ایک کُرتہ پہنائیگا۔ لوگ اُسے اُتارنا چاہیں گے مگر تو اُتار یو مت۔ یہ کُرتہ خلافت ہے (طبری مطبوعہ لندن ص۲۹) اب اگر میں اس سے دست بردار ہو جاؤں تو یہ صریح عدول حکمی رسول ہوگی

[4] حضرت معاویہ نے تو پہلے ہی خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ سے حج کے موقع پر عرض کیا تھا کہ یا تو میرے ساتھ کچھ عرصہ کے لیے شام چلے چلیں یا ایک دستہ فوج اپنی حفاظت کے لیے متعین کر لیں مگر آپ نے دونوں باتیں نامنظور کر دیں۔ اگر امیر معاویہ سے امداد لینے کا خیال ہوتا تو اسی وقت ضروری تدابیر اختیار کرتے اگر حضرت عثمانؓ چاہتے تو بہت پہلے ایک جرّار لشکر مرتب کر کے اِن باغیوں اور فتنہ انگیزوں کا بالکل قلع قمع کر دیتے مگر انھوں نے آخر وقت تک اُن لوگوں پر جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے نہ خود تلوار چلائی نہ اس کی اجازت دی حتیٰ کہ جس وقت باغیوں نے آپ کے مکان پر حملہ کیا اور محافظ صحابہ سے لڑائی شروع ہو گئی تو اطلاع ملتے ہی آپ نے کہلا بھیجا کہ کوئی آدمی نہ لڑے اور جب لڑائی بند نہ ہوئی تو آپ ڈھال ہاتھ میں لیے ہوئے خود باہر نکل آئے اور سب صحابہ کو مکان کے اندر کر کے دروازہ بند کر لیا (اسمٰعیل)

امیر المومنین عثمانؓ نہایت ثابت قدم رہے۔ اس وجہ سے مخالفین کو اور بھی سخت تدبیریں کرنی پڑیں۔ کئی ہفتے تک قصر کا محاصرہ جاری رکھنے کے بعد ایک متصل مکان سے قصر کے اندر داخل ہوگئے اور ان واجب التعظیم اسّی برس کے بزرگ کو اس وقت شہید کیا جبکہ وہ تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔ اس کے بعد انھوں نے یہ حرکت کی کہ بیت المال کو لوٹنے چلے گئے۔ مروان اور بنی اُمیہ کے اور لوگوں کو اتنا وقت مل گیا کہ وہ مدینہ سے بھاگ جائیں (۳۶ھ / ۶۵۶ء) خاص مدینے والے یعنی انصار (یہ لقب اب صحابہ کی اولاد کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا) اِس واقعہ میں حضرت عثمان سے علیحدہ رہے[1]

---

[1] یہ صحیح نہیں کہ خاص مدینے والے اِس واقعہ میں حضرت عثمان سے علیحدہ رہے۔ تمام بڑے بڑے سردار حضرت عثمان کیساتھ اور ان کے طرفدار تھے حضرت علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ اور ابو ہریرہؓ برابر مفسدین کو سمجھانے اور شرارتوں سے منع کرنے کے لیے مصروفِ عمل تھے اور اول الذکر تینوں بزرگوں نے جنھیں ڈوزی نے حضرت عثمانؓ کے رقیب لکھا ہے، اپنے لڑکوں حسنؓ، حسینؓ، عبداللہ اور محمدؒ کو حضرت عثمان کی حفاظت کے لیے صحابہ کی ایک جماعت کیساتھ دروازہ پر بٹھا دیا تھا چنانچہ اُن کی وہاں موجودگی ہی مفسدین کو دروازہ کی راہ گھسنے سے مانع آئی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام مدینہ کے لوگ حضرت عثمانؓ کے طرفدار تھے۔ مگر چونکہ اس وقت مدینہ پر باغیوں کا قبضہ تھا اور اہل شہر دب چکے تھے (تاریخ خلافتِ راشدہ صـ۱۱۵) اس وجہ سے ہر شخص حمایتِ عثمان کے لیے شمشیر بکف ہو کر نہیں آسکتا تھا اور مجبوراً گھر میں بیٹھ گیا تھا۔ اسی سے مورخین کو یہ دھوکہ لگا کہ مدینے والے اِس معاملہ میں غیر جانبدار رہے۔ دوسرے چونکہ مفسدین اس فتنہ میں تلوار سے کام نہیں لیتے تھے اس لیے بھی اہل مدینہ اُن کے خلاف تلوار نہیں اٹھاتے تھے حضرت عثمانؓ کا نہایت سختی کے ساتھ حکم تھا کہ کوئی شخص ان لوگوں پر تلوار نہ اٹھائے اور اہل مدینہ کا فرض تھا کہ امیر المومنین کی تابعداری کریں ہاں اس بات کیلیے وہ تیار تھے کہ اگر مفسدین پہلے تلوار اٹھائیں تو وہ بھی اس کا جواب تلوار سے دیں اور حضرت عثمانؓ پر اپنی جانیں فدا کر دیں۔ اُدھر مفسدین بھی تلوار اٹھانے کی جرأت نہ کرتے تھے اور محض دباؤ سے کام نکالنا چاہتے تھے صرف ایک مرتبہ خفیف سی جھڑپ ہوئی تھی جس کو حضرت عثمانؓ نے فوراً روک دیا اور اصل اہل مدینہ کو اس بات کا وہم بھی نہ تھا کہ باغی حضرت عثمانؓ کو شہید کرنے کی جسارت کریں گے۔ اگر انھیں یہ خطرہ ہوتا تو یقین ہے کہ باوجود ہر قسم کے موانعات کے مدینہ کا ایک ایک بچہ حضرت عثمانؓ پر فدا ہو جاتا (اسماعیل)

مکان جس سے قاتل قصرِ خلافت میں پہنچے تھے بنی حزم کا تھا اور بنی حزم انصار کا ایک خاندان تھا جس نے بعد کو بنی امیہ سے عداوت رکھنے میں خاص شہرت حاصل کی۔ انصارِ مدینہ کی اس ناوقت علیحدگی پر جو سازشِ قتل میں شرکت رکھنے سے مشابہ تھی خود بنی حزم کے ایک شاعر حسان بن ثابت نے انصار کو بُرا کہا۔ حسان حضرت عثمان کے بڑے وفاداروں میں تھے اور وہ اِس خوف کی کافی وجہ رکھتے تھے کہ بنی امیہ اپنے رشتہ دار (حضرت عثمانؓ) کے قتل پر اُن کے قبیلے والوں (یعنی بنی حزم) سے ضرور انتقام لیں گے۔ اُنھوں نے اپنے اشعار میں کہا:-

جس وقت یہ بزرگ (یعنی حضرت عثمان) دیکھ رہے تھے کہ موت سامنے ہے تو انصار نے اُن کے بچانے کے لیے ہاتھ تک نہ ہلایا۔ اے انصار! افسوس اب بہت جلد تکبیر کی صدائیں۔ انتقام کشی اور خونِ عثمان کے نعرے تمہاری دیواروں سے ٹکرائیں گے۔"

اب حضرت علیؓ جن کو انصار نے خلافت کے درجے پر پہنچایا خلیفہ ہو گئے۔ آپ نے حضرت عثمانؓ کے مقرر کردہ والیانِ بلاد کو برطرف کر کے اُن کی جگہ سابقینِ اسلام کو جن میں اکثر انصار تھے مقرر کیا۔ صحابہ کو اب کامیابی ہوئی۔ انھوں نے ہر طرف اپنا اقتدار پیدا کرنا شروع کیا اور چاہا کہ قبائلِ عرب کے سرداروں اور بنی اُمیہ کو جو کل کے مسلمان تھے اور آج مسلمانوں کے ہادی اور پیشوا بن بیٹھے تھے مٹا دیں صحابہ اس میں کامیاب ہوئے مگر یہ کامیابی چند روزہ تھی۔ خود دارالندوہ میں اختلاف شروع ہو گیا۔ ہر صاحب نے قتلِ عثمانؓ پر سمجھا تھا کہ خلافت اب اُنھی کے پاس آنے والی ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ زبیرؓ اور طلحہؓ خلیفہ ہونے کی اُمید میں ناکام رہے اور اُن کو بخوفِ شمشیر حضرت علیؓ کی بیعت کرنی پڑی۔ پس طلحہ اور زبیر مدینہ سے چلے گئے

لہ ہمارے ہاتھ میں نہ تو قرآن اور نہ مستند تاریخی بیانات اس قسم کے ہیں جو مصنف کے اس قول کی تائید کرتے ہوں (اسمٰعیل)

تاکہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ ... ... ہو جائیں ... ... (۳۳)

... ... لہ

حضرت عائشہؓ حضرت علیؓ سے لڑنے چلیں۔ اس لڑائی کا نتیجہ کوئی پہلے سے معلوم نہ کر سکتا تھا۔ ان کے مساوئوں یعنی طلحہؓ اور زبیرؓ کے پاس جمعیت کم تھی اور حضرت علیؓ کے عَلَم کے نیچے بجز انصار اعداد قاتلینِ عثمانؓ کے اور کوئی نہ تھا۔ اس لیے اب یہ کام قوم کا تھا کہ خلافت کے اِن دعویداروں میں سے کس کے حق میں فیصلہ کرے۔ لیکن قوم ان میں سے کسی کی طرف بھی نہ تھی۔ نیک مرد اور پیرانہ سال عثمانؓ کے واقعۂ قتل سے سلطنتِ اسلام کے ہر گوشے تک غصے اور رنج کی صدائیں گونجتی چلی گئی تھیں۔ اور اگر قتلِ عثمانؓ میں زبیرؓ اور طلحہؓ کی سازش کا لوگوں کو گمان نہ ہوا ہوتا تو حضرت علیؓ کی مخالفت میں لوگ بالعموم زبیرؓ اور طلحہؓ کے ساتھ ہو جاتے۔ لیکن اُن کی سازش لوگوں پر ظاہر ہو چکی تھی۔ چنانچہ بصرہ کی مسجد میں عربوں نے طلحہؓ سے کہا "ہم وہ خط تمھیں دکھائیں جس کے ذریعہ سے تم نے ہم کو عثمانؓ کی مخالفت پر اُبھارا تھا"۔ اسی طرح زبیرؓ کو یاد دلایا گیا کہ زمانۂ خلافت حضرت عثمانؓ میں کوفے کے لوگوں کو انھوں نے سرکشی پر آمادہ کیا تھا۔[۲]

اس اثناء میں قوم نے بالعموم یہی مناسب سمجھا کہ جو انتظامِ مملکت حضرت عثمانؓ کے دَورِ خلافت میں تھا وہی جاری رکھا جائے اور جن لوگوں کو آپ نے والیانِ بلاد مقرر کیا تھا وہ بدستور اپنی جگہ پر قائم رہیں۔ پس جس وقت امیر المومنین علیؓ نے اپنی طرف سے

لہ یہاں واقعہ افک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مصنف نے حضرت علیؓ کی نسبت نہایت غلط اور اشتعال انگیز الفاظ لکھے ہیں۔ میں نے ان فقروں کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے (مترجم اردو)

ٹہ اس قسم کے تمام خطوط جو ان صحابیوں کی طرف سے مختلف لوگوں اور شہروں کو بھیجے گئے تھے بالکل جعلی تھے فرضی تھے جو عبداللہ بن سبا کے کارندوں نے ان بزرگوں کے ناموں سے نہایت ہوشیاری کے ساتھ خفیہ طور پر روانہ کیے تھے اور جن کا مقصد حضرت عثمانؓ کے خلاف عوام کو بھڑکانا تھا۔ چونکہ باغی خود قوم میں کوئی پوزیشن نہیں رکھتے تھے کہ ان کی بات کا اثر ہوتا لہٰذا انھوں نے ان بزرگوں کا نام لے کر فتنہ برپا کیا اور عوام ان کے دھوکے میں آگئے

کوفہ کا ایک والی مقرر کرکے روانہ کیا تو کوفے کے قریب پہنچ کر اس کو چند عرب ملے جنھوں نے صاف صاف کہدیا کہ ہم قاتلینِ عثمان رضی اللہ عنہ کو سزایاب کرانا اور جو والی اس وقت ہمارے شہر کا ہے اُسی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اور بتائے دیتے ہیں کہ اگر تم فوراً واپس نہ گئے تو ہم تمہارا سر پھاڑ ڈالیں گے۔" اسی طرح جن صحابی کو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ نے شام کا والی مقرر کرکے بھیجا اُن کو سرحدِ شام پر چند سواروں نے روک دیا۔ اور اِن سواروں کے سردار نے اُن سے دریافت کیا کہ "تم کس لیے آئے ہو؟"

صحابی۔ تمہارا امیر ہو کر آیا ہوں۔

سردار۔ اگر عثمان رضی اللہ عنہ کے سوا تم کو کسی اور نے بھیجا ہے تو بہتر ہوگا کہ واپس چلے جاؤ۔

صحابی۔ کیا تمھیں مدینہ کا واقعہ نہیں معلوم؟

سردار ہم کو سب کچھ معلوم ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ جدھر سے آئے ہو ادھر ہی چلے جاؤ۔

صحابی نے بنظرِ احتیاط اس نصیحت پر عمل کیا۔

آخر کار امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو کوفے میں ایسے لوگ مل گئے جو وقت پر کام آسکیں اور آپ نے اِن لوگوں کو اپنا طرفدار بنا لیا مگر بد قراری اور اُن سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ انہیں کے شہر (یعنی کوفہ) میں سکونت اختیار کروں گا۔ اور اس وجہ سے کوفہ کل سلطنت اسلام کا دار الحکومت ہو جائے گا۔

غرض کوفہ والوں کی مدد سے امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اس لڑائی میں جسے جنگ جمل کہتے ہیں کامیاب ہو گئے اور رقیبوں سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ طلحہ رضی اللہ عنہ کے کاری زخم لگا اللہ وہ زخم کے صدمے سے جاں بحق ہوئے زبیر رضی اللہ عنہ جب میدان جنگ سے چلے گئے تو ایک شخص نے اُنھیں شہید کر دیا۔ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آپ سے معافی مانگی جو آپ نے منظور کی[1] (۴)

---

[1] معافی مانگنے کا تو کوئی ذکر نہیں آیا البتہ اس موقع پر جو باہم گفتگو ہوئی اس کو سر ولیم میور نے اس طرح نقل کیا ہے لڑائی کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عائشہ کے خیمے میں آئے اور اطمینان ظاہر کیا کہ آپ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچا اور نرم آواز سے جس میں کسی قدر افسوس بھی شامل تھا کہا د اللہ تعالیٰ آپ کو (باقی بر صفحہ آئندہ)

اب حضرت علیؓ عرب۔ عراق اور مصر کے مالک ہو گئے۔ اس معنی میں کہ ان ملکوں میں کوئی شخص آزادی کے ساتھ اُن کے احکام کی مخالفت نہ کر سکتا تھا کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ آپ کی حکومت کو لوگ بادلِ نخواستہ یا علانیہ مخالفت کر کے تسلیم کرتے تھے عراق کے عرب جن کی مدد کی ضرورت حضرت علیؑ کو بہت رہتی تھی آپ کے کہنے پر نہ چلتے تھے اور جب کبھی آپ اُن کو لڑائی کا حکم دیتے تھے تو جاڑے میں جاڑہ اور گرمی میں گرمی کا بہانہ بنا کر انکار کر دیتا ان کے لیے معمولی بات تھی۔

ملکِ شام نے بہر نوع آپ کی خلافت کو تسلیم کرنے سے بڑے زور کے ساتھ قطعاً انکار کر دیا۔ حضرت معاویہؓ اگر امیر المومنین علیؑ کی خلافت کو تسلیم کرنا چاہتے بھی تو بغیر اپنی عزت میں فرق لائے ایسا نہ کر سکتے تھے۔ ہمارے ہی زمانے میں مصر کا ایک معمولی کاشتکار گو وہ کیسی ہی ذلت اور مظلومی کی حالت میں ہو اپنے عزیز کے خون کا بدلہ لینے کو تیار ہو جاتا ہے گو وہ یقین کرتا ہے کہ اس بدلہ لینے میں اُس کی جان چلی جائے گی۔ پس کیا معاویہؓ گوارا کر سکتے تھے کہ اپنے ایک عزیز یعنی حضرت عثمانؓ کے قتل پر قاتلوں کو بغیر سزا دِلوائے چھوڑ دیں؟ کیا وہ ایسے شخص کی اطاعت قبول کر سکتے تھے جس کے لشکر کے اُمرا اور سردار عثمانؓ کے قاتل تھے؟ اگر کوئی یہ کہے کہ معاویہؓ کو اپنے عزیز کے قتل پر جوشِ انتقام نہ تھا تو پھر حکومت کی طمع مجبور کرتی ہو گی کہ امیر المومنین علیؑ کو اپنا خلیفہ نہ مانیں۔ اگر معاویہ چاہتے تو غالباً عثمان کی کمک پا کر اُن کو قتل ہونے سے بچا لیتے۔ لیکن اگر فی الحقیقت حکومت کی حرص تھی تو، اس سے اُن کو کیا فائدہ پہنچتا۔ کیونکہ اگر حضرت عثمانؓ زندہ رہتے تو معاویہؓ شام کے والی جیسے تھے ویسے ہی رہتے۔ معاویہؓ خود اس بات کو تسلیم کیا کرتے تھے کہ جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا تھا کہ "اگر کبھی تمہیں حکومت ملی تو اُسے خوب سنبھالو گے" اُن کو خلیفہ بننے کے سوا دوسرا خیال نہ تھا۔

اور اب حالات کی شکل معاویہؓ کے حق میں مفید ہوتی چلی۔ معاویہؓ کو کامیابی کی اُمید

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) معاف کرے اُس سے جو کچھ ہوا ہے اور آپ پر رحم کرے۔ حضرت عائشہ نے فوراً جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ تم کو بھی معاف کرے اور تم پر بھی رحم کرے۔ اس سے مُوذی کے بیان کا فرق اور طرز ادا ظاہر ہے۔ (مترجم)

تھی اور اس امید کے بر لانے میں وہ سب کچھ صرف کر دینے کو تیار تھے۔ اور اب مُراد
پوری ہوتی نظر بھی آنے لگی تھی۔ ہر ایسی چیز کو جو جائز طریقے پر انھیں اس کام سے
روک سکتی اور ہر ایسا خیال جو از روئے انصاف اُن کو پس و پیش میں ڈال سکتا انھوں نے
بالائے طاق رکھ دیا۔ وہ اپنے معاملے کو حق بجانب سمجھتے تھے اور شام کے عربوں پر اُن
کو پورا بھروسہ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ جان و دل سے اُن کے ساتھ تھے۔ معاویہؓ جو شائستہ
مزاج۔ قابلِ محبت۔ فیاض۔ انسان کے دلی کوائف کے عالم اور حالاتِ وقت کے مناسب (۳۵۱)
کبھی نرم اور کبھی گرم ہو جانے والے شخص تھے انھوں نے اپنے ذاتی اوصاف سے یہ
معلوم کر لیا تھا کہ شام کے عربوں کی عزت و محبت کا مستحق انسان کس ترکیب سے ہو
سکتا ہے؛ معاویہ اور اعرابِ شام کے خیالات اور فوائد بھی یکساں تھے۔ اور یہ یکسانی
بھی اُن کی باہمی وابستگی کا مزید سبب ہو گئی۔ کیونکہ شام کے عرب مذہب کو ایک حرفِ غلط
سمجھتے تھے۔ مذہب ان کے نزدیک ایسی نامربوط اور اشتباہ کی چیز تھا جس کے صاف معنی
اُن کی سمجھ میں نہ آتے تھے۔ ارکان اور رسوم دین کا ادا کرنا اُن کے لیے تکلیف دہ تھا
اُن کو نئے حکام سے سخت نفرت تھی جن کو حکومت کرنے کا کوئی حق بجز اس کے نہ تھا کہ
وہ پیغمبر کے صحابہ تھے۔ علاوہ ازیں شام کے عربوں کو اس کا ملال تھا کہ شیوخِ عرب کا جو
سلسلہ ہمیشہ سے چلا آتا تھا وہ کیوں مفقود ہو گیا۔ غرض شام کے ان عربوں کی حالت یہ
تھی کہ اگر ان کو کوئی حکم دیتا تو حکم سنتے ہی وہ مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر یورش
کر دیتے اور اُن کو لوٹنے اور جلانے اور اُن میں رہنے والوں کو قتل کرنے کے لیے تیار ہو
جاتے۔ غرض امیر معاویہؓ اور اہل شام میں ہمدردی و یگانگی کے حقیقی اسباب یہی
ہو سکتے تھے جو اوپر بیان ہوئے اور ان کا ظہور بھی ایک موثر طریقے پر اس وقت ہوا
جبکہ ایک مدت دراز کی شاندار حکومت کے بعد امیر معاویہؓ کا انتقال ہو گیا۔ اور اہل شام
نے اُن کے ساتھ اپنی محبت کا آخری جوش و خروش ظاہر کیا۔ دمشق میں یزید کے پہنچنے
تک امیر معاویہؓ نے وقتِ نزع جس امیر کے سپرد حکومت کا انتظام کیا تھا۔ اُس امیر
نے حکم دے دیا تھا کہ جنازہ صرف امیر معاویہؓ کے قرابت مند اٹھائیں گے۔ لیکن دفن کے

روز جب جنازہ اٹھانے کو ہوئے تو اہلِ شام نے اُس امیر سے کہا "جب وقت خلیفہ زندہ تھے تو ہم اُن کے تمام معرکوں اور لڑائیوں میں اور اُن کی فتوح و آلام میں اُن کے شریک رہتے تھے۔ اس لیے اِس موقع پر بھی ہم کو شرکت کی اجازت ہو" اُن کی درخواست منظور کی گئی۔ اجازت ملتے ہی وہ سب جنازے کی طرف اِس ارادے سے بڑھے کہ اور کچھ نہیں تو آقا کی مٹی ہی کو ہاتھ سے چھو لیں۔ مگر اس وفورِ شوق میں ایسا ہجوم ہوا کہ کفن کی دھجیاں اُڑ گئیں۔

حضرت علیؓ کو پہلے ہی سے اس بات کا ثبوت مل گیا تھا کہ معاویہؓ کے معاملے کو اہلِ شام اپنا معاملہ سمجھ رہے ہیں۔ اُن سے کسی نے کہا تھا کہ روزانہ ایک ہزار آدمی جامع دمشق میں حضرت عثمانؓ کی قمیص کے سامنے رویا کرتے ہیں اور ان لوگوں نے قسم کھا رکھی ہے کہ خونِ عثمان کا بدلہ ضرور لیں گے۔ شہادتِ حضرت عثمانؓ کو چھ ماہ گذرے تھے کہ جنگِ جمل میں فتح پا کر امیر المومنین علیؓ نے پہلی مرتبہ معاویہؓ کو اطاعت قبول کرنے کے لیے نامہ لکھا۔ اس پر معاویہؓ نے اُن عربوں کو جو دمشق میں جمع تھے۔ حضرت عثمانؓ کا خون آلود کُرتہ دکھا کر اِس امر میں اُن سے مشورہ کیا۔ معاویہؓ کی تقریر سب نے نہایت ادب سے خاموش رہ کر سُنی۔ جس وقت وہ تقریر کر کے چُپ ہوئے تو شرفاءِ عرب میں سے ایک شخص نے سب کی طرف سے وکیل ہو کر کہا "اے امیر! ارادے اور حکم دینا آپ کا کام ہے۔ سُننا اور حکم پر عمل کرنا ہمارا۔ اس کے بعد فوراً حکم دیا گیا کہ جو شخص ہتھیار اُٹھانے کے قابل ہے وہ اپنے قبیلے کے عَلَم کے نیچے جمع ہو جائے اور تین دن کے بعد جو شخص اپنی جگہ سے غیر حاضر پایا جائے گا اس کو موت کی سزا دی جائے گی۔ وقتِ معین پر ایک شخص بھی غیر حاضر نہ تھا۔ اہلِ شام کا جوش جیسا سچا تھا ویسا ہی عام بھی تھا۔ اس وقت ایک قومی کام واقعی درپیش تھا جس کے لیے جان دینے کو وہ بالکل تیار تھے۔ صرف ولایت شام سے معاویہؓ کے پاس اتنے آدمی جمع ہو گئے تھے کہ باقی تمام ولایاتِ اسلام سے امیر المومنین علیؓ کے پاس اتنے جمع نہ ہو سکے تھے۔ حضرت علیؓ نے افسوس کیسا تھ شامیوں کی گرمجوشی کا مقابلہ عراق کے عربوں کی بے پروائی اور سرد مہری سے کیا اور فرمایا کہ میں خوشی سے

۳۶ھ

تم دس کے بدلے معاویہؓ کا ایک آدمی لینا پسند کرتا ہوں۔ خدا کی قسم! یہ کلیجہ چبانے والی عورت کا بیٹا کامیاب ہو جائے گا۔

خیالِ غالب یہ تھا کہ صفین کے میدانوں میں دریائے فرات کے داہنے کنارے کے قریب ایک جنگ اس امرِ عظیم کے تصفیہ کے لیے ہوگی۔ بہر کیف جب جانبین کے لشکر ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تو کئی ہفتے تک آپس میں گفت و شنید پھر چھوٹے چھوٹے خونریز معرکے بغیر کسی نتیجے کے ہوتے رہے۔ دونوں فریق لڑائی کو ٹالنا چاہتے تھے۔ بہر کیف جب مصالحت کی گفتگو کا کچھ انجام نہ ہوا تو لڑائی شروع ہو گئی۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعض پرانے صحابہ نے آج لڑائی میں وہی جوش و خروش دکھایا جو کسی زمانے میں عرب کے کفار سے لڑنے میں دکھاتے تھے اور دشمن سے کہتے تھے کہ "اسلام قبول کرو یا موت۔" اُن کی نظروں میں شام کے عرب قطعی کافر تھے عمار جو پہلے کوفہ کے والی تھے اور قاتلینِ عثمانؓ میں شمار کیے جاتے تھے[۱] جن کی عمر اس وقت ۹۰ برس سے متجاوز تھی پکار پکار کر کہتے تھے "قسم ہے! قسم ہے! خدا کی نظر میں کوئی شخص اتنا محبوب نہیں ہے جتنا کہ وہ شخص جو ان کافروں سے لڑے اگر میں ان کی برچھیوں سے مارا گیا تو میں دینِ برحق پہ گواہی دیتا ہوا مروں گا۔ اے یارانِ رسول اللہ! میرے ساتھ آؤ۔ آج جنت کے دروازے ہمارے لیے کھل گئے ہیں اور حوریں ہماری منتظر کھڑی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے عمارؓ وہاں پہنچے جہاں گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی اور شیر کی طرح لڑتے رہے یہاں تک کہ زخموں سے چور ہو کر دم نکل گیا عراق کے عرب بھی یہ دیکھ کر کہ آج عزت کے مٹ جانے کا خوف ہے اس قدر جوانمردی سے لڑے کہ اُن سے اتنی توقع نہ تھی۔ مگر امیر المومنین علیؓ کے سواروں نے اس زور کا

[۱] حضرت عمار بن یاسر کو حضرت عثمانؓ نے والیٔ مصر کے خلاف شکایات کی تحقیقات کے لیے مصر بھیجا تھا۔ وہاں پہنچے تو عبداللہ بن سبا کے فریب اور چکنی چپڑی باتوں میں آکر حضرت عمارؓ امیر المومنین عثمانؓ سے بدظن ہو گئے جس وقت حضرت عثمانؓ کی شہادت ہوئی ہے تو یہ مدینہ میں موجود تھے مگر انھوں نے باوجود بدظنی کے فساد و فتنہ اور قتلِ عثمانؓ میں ہرگز کوئی حصہ نہیں لیا۔ بلکہ اپنے گھر میں خاموش ہو کر بیٹھ گئے (اسماعیل)

دعاوا کیا کہ شامیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اِس خوف سے کہ شکست عنقریب ہوا چاہتی ہے،
میدان سے ہٹ جانے کی غرض سے معاویہؓ نے پاؤں رکاب میں رکھا ہی تھا کہ عمروؓ بن
العاص نے قریب آکر کہا "واہ امیر! تم ہمیشہ اپنی مشکلوں کو حل کر لینے پر ناز کیا کرتے
تھے۔ آج بھی کوئی تدبیر اس خطرے سے نجات کی نکالی؟" معاویہؓ بولے تمھیں یاد (۳۷)
ہوگا کہ فتح کی صورت میں میں نے تمھیں مصر کی ولایت پر مقرر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اب
تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ۔ عمروؓ بن العاص جو پہلے ہی لشکر علیؓ سے خفیہ طور پر بات چیت کرتے رہے
تھے معاویہؓ سے کہنے لگے کہ تمہارے لشکر میں جتنے لڑنے والے اس وقت ایسے ہیں جنکے
پاس قرآن ہیں اُن کو حکم دے دو کہ نیزوں کے پھلوں پر باندھ کر قرآن بلند کریں اور پھر کہو
کہ میں کتاب اللہ پر فیصلہ چاہتا ہوں، اِس مشورے کی پوری ذمہ داری میں اپنے سر
لیتا ہوں اور میں اِس رائے اور تدبیر کو سب سے بہتر جانتا ہوں۔

عمروؓ بن العاص اِس خیال سے کہ معاویہؓ کو کہیں شکست نہ ہو جائے پہلے ہی سے
لشکر علیؓ کے بعض سرداروں کو اِس ترکیب سے آگاہ کر کے اُن کو کسی بات پر آمادہ کر چکے
تھے۔ اِن سرداروں میں سب سے بڑا آدمی اشعث تھا اور یہ سب سے بڑھ کر ہوشیار
اور چالاک تھا۔ اشعث جس وقت زمانۂ کفر میں بنی کندہ کا شیخ تھا تو اس نے بادشاہی کا
دعویٰ کیا تھا۔ وہ اسلام یا اُس کے پیغمبرؐ سے خلوص رکھنے کی کوئی وجہ نہ رکھتا تھا۔ کیوں کہ
حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جس وقت اشعث مرتد ہوا تھا تو اُسے دیکھنا پڑا تھا کہ
قلعہ نجیر کے اندر جو اُس کا قلعہ تھا اُس کے ساتھی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوتے تھے
غرض معاویہؓ نے عمروؓ بن العاص کی رائے پر عمل کیا اور اپنی فوج کو حکم دیا کہ جو قرآن جن کے
پاس ہیں وہ نیزوں پر اُٹھا لیں۔ اسّی ہزار کے لشکر میں قرآن کی جلدیں زیادہ نہ نکلیں
صرف پانسو قرآن نکلے۔ لیکن اشعث اور اس کے ساتھیوں کے لیے اتنا ہی اشارہ کافی
تھا قرآنوں کے بلند ہوتے ہی اشعث اور اُس کے ساتھی امیرالمومنین علیؓ کے گرد جمع ہو گئے

لہ اُس زمانہ میں پریس تو تھا نہیں کہ مصحف کی طرح اس کثرت پر کوئی اظہارِ تعجب کرے (مترجم)

اور چیخ چیخ کر کہنے لگے "ہم کتاب اللہ سے فیصلہ چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جنگ ملتوی کی جائے۔"

امیر المومنین علیؑ غصہ سے کانپ اٹھے اور کہا کہ "یہ دھوکا ہے۔ یہ سخت فریب ہے۔ ان شامیوں کو نہیں معلوم کہ قرآن کسکو کہتے ہیں۔ ان کی تمام حرکتیں احکام قرآن کے خلاف ہیں۔ لیکن چونکہ ہم کتاب اللہ کے لیے لڑتے ہیں۔ اس لیے ہم اس کو حکم قرار دینے سے کیسے انکار کر سکتے ہیں؟ ہماری غرض ان لوگوں سے لڑنے کی یہ ہے کہ ہم انکو خدا کے حکم کی طرف لائیں۔ انھوں نے خدائے عزوجل کی نافرمانی کی ہے انھوں نے خدا کی کتاب سے انکار کیا ہے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ معاویہؓ یا عمروؓ بن العاص یا ابن السنار (ولید بن عقبہ) اور ایسے ہی لوگ مذہب یا قرآن کی کچھ پروا کرتے ہیں؟ میں بہ نسبت تمہارے ان لوگوں سے زیادہ واقف ہوں۔ میں نے ان کو بچہ دیکھا ہے اور جب وہ بڑے ہوئے اس وقت بھی ان کو دیکھا ہے۔ بچے یا بڑے ہمیشہ ظلم اور بے انصافی کے جاری کرنے والے رہے ہیں۔" امیر المومنین علیؑ کو اس کا یہ جواب ملا "بہر حال معاویہ اور معاویہ کے لوگ خدا کی کتاب سے فیصلہ چاہتے ہیں اور تم تلوار سے فیصلہ چاہتے ہو۔"

امیر المومنین نے فرمایا "افسوس! میں خوب دیکھ رہا ہوں کہ تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو اچھا جاؤ۔ اور اس جماعت کے پسماندگان سے مل جاؤ جو کبھی رسول اللہ صلعم کے برخلاف قائم ہوئی تھی۔ جاؤ اور ان لوگوں کے ساتھ ہو جاؤ جو خدا اور رسول کا نام لیتے ہیں مگر جھوٹے ہیں اور مفسد۔"

اب لوگوں نے اب کہنا شروع کیا کہ اشتر کو میدان سے بلا لو (اشتر اس وقت فوج سوارہ کے سردار تھے) ورنہ جو عثمانؓ کا حال ہوا ہے وہی تمہارا حال کیا جائے گا یہ دیکھ کر کہ جس بات کی یہ لوگ دھمکی دے رہے ہیں اگر ضروری سمجھا تو کر دکھائیں گے امیر المومنین علیؑ نے ان کا کہنا مان لیا اور اشتر کو واپسی کا حکم دے دیا۔ اشتر اس وقت معرکہ سر کر کے دشمن کے تعاقب میں مصروف تھا اس نے حکم ماننے سے انکار کیا۔ اب اشعث ابن قیس کے ساتھیوں نے اور زیادہ غل مچانا شروع کیا۔ امیر المومنین علیؑ نے

دوبارہ اشتر کی واپسی کا حکم دیا۔ اشتر نے حکم سن کر کہا "کیا امیر المومنین کو معلوم نہیں کہ فتح ہم کو ہونے والی ہے اور دشمن کو شکست ہونے میں اب کچھ دیر نہیں ہے" قاصدوں میں جو اشتر کے پاس جناب علیؓ کا حکم لے کر آئے تھے عراق کا ایک عرب تھا اُس نے کہا "اشتر! اگر علیؓ مارے گئے تو پھر تم کو اس فتح سے کیا مل جائے گا؟" یہ سنکر نہایت افسوس کے ساتھ اشتر نے اپنے سواروں کو واپسی کا حکم دیا۔ اور آج اشعث نے جو کبھی قبیلہ کندہ کا بادشاہ تھا اپنا بدلہ نکال لیا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے دیندار مسلمانوں (صحابہ اور انصار) کی تباہی شروع کی۔ اِن مسلمانوں نے اُس کو بادشاہی سے محروم اور قلعہ نجیر میں اُس کے قبیلے والوں کو قتل کیا تھا۔ امیر المومنین علیؓ نے اِسی اشعث کو معاویہؓ کے پاس دریافت کرنے بھیجا کہ "اس لڑائی کا فیصلہ تم قرآن سے کس طور پر چاہتے ہو؟" معاویہؓ نے کہلا بھیجا "علیؓ اور میں دونوں اپنی جانب سے ایک ایک حَکَم مقرر کریں گے۔ یہ حکمین قرآن کے مطابق اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ ہم دونوں میں سے کون خلافت کا مستحق ہے؟ میں اپنی طرف سے عمرو بن العاص کو حَکَم مقرر کرتا ہوں۔

جس وقت اشعث نے معاویہؓ کا یہ جواب امیر المومنین علیؓ کو پہنچایا تو آپ نے اپنے ابن عم عبداللہ ابن عباسؓ کو اپنی طرف سے حَکَم مقرر کرنا چاہا۔ لیکن یہ درست نہ تھا کیونکہ اس قدر قریب کا رشتہ دار طرف داری کرنے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے بہادر امیر لشکر اشتر کو تجویز کیا۔ اِس تجویز پر یہ کہا گیا کہ "دنیا میں جس نے آگ لگائی ہے وہ اشتر کے سوا کون ہے؟ اشعث نے کہا کہ "سوائے ابو موسےٰ کے ہم حضرت علیؓ کی طرف سے کسی کو حَکَم نہ مانیں گے۔" لیکن حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب سے ابو موسیٰ کو میں نے کوفہ کی ولایت سے ہٹایا ہے وہ مجھ سے رنجیدہ ہے میں اپنا معاملہ اُس کے سپرد کیسے کر سکتا ہوں؟" جواب ملا کہ "ہم کسی اور کو حَکَم نہ ہونے دیں گے۔" اس کے بعد امیر المومنین علیؓ کو طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں آخر کار آپ نے اس خیال سے کہ کسی طرح صلح ہو جائے ابو موسےٰ کا

حَکَم ہونا منظور کر لیا۔ جونہی آپ نے یہ منظوری دی۔ لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ یہ معاہدہ صلح جو حضرت علیؓ نے کیا ہے دین کے مطابق نہیں۔ اِس کو مسترد کیا جائے کیونکہ اِس نزاع کا فیصلہ سوائے خدا کے دوسرا نہیں کر سکتا۔ جب امیر المومنین علیؓ نے اِن لوگوں کی بات نہ سُنی تو آپ کے لشکر میں سے بارہ ہزار
سپاہ آپ سے فوراً علیحدہ ہو گئی۔ اس سپاہ میں کم سے کم ایک شخص ضرور ایسا ۳۹۱
تھا جو فریق مخالف سے مل گیا تھا۔ بیان کیا گیا ہے کہ وہ اشعث تھا۔ اس سپاہ میں قاریان قرآن بہت تھے۔ یہ بڑے دیندار لوگ تھے اور مذہب کا ان کو بے حد پاس تھا۔ لیکن جسے یہ قاریانِ قرآن دینداری سمجھتے تھے وہ امیر المومنین علیؓ اور شرفا مدینہ کے نزدیک دینداری نہ تھی۔ لشکر حضرت علیؓ سے جو لوگ علیحدہ ہو کر "خوارج" کہلائے وہ صحابہ سے بیزار تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ بزرگ (نعوذ باللہ) بداخلاق اور حیلہ ساز ہیں اور دین کو دنیا کا نفع حاصل کرنے کے لیئے کام میں لاتے ہیں۔ یہ خوارج قصد کر چکے تھے کہ مصدقہ جماعتِ مسلمین سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیں۔ یہ خوارج کیا مذہب اور کیا سیاست ہر اعتبار سے جمہوری اور عمومیت پسند لوگ تھے۔ اُن کی اخلاقی زندگی میں سخت پابندیاں تھیں۔ ہر گناہ کبیرہ کو کفر مطلق سمجھتے تھے اور ان میں بہت سی باتیں اُن حریت پسندوں سے مشابہ تھیں جو انگلستان میں سترھویں صدی عیسوی میں کرومؔ ول کے پیرو تھے۔

بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ امیر المومنین علیؓ کے حَکَم ابو موسیٰ کو معاویہؓ کے حَکَم عمرو بن العاصؓ نے زک دی۔ اور بعض نے لکھا ہے کہ نہیں حضرت علیؓ کے حَکَم نے معاویہ کے حَکَم کو دھوکہ دیا۔ بہر کیف لڑائی پھر شروع ہو گئی جس میں حضرت علیؓ کو بار بار شکست ہوئی۔ اور حریف فتح یاب نے پہلے مصر اور پھر عرب کو آپ کے قبضے

لہ خود حضرت علیؓ کو تو براہ راست کوئی شکست نہیں ہوئی۔ البتہ آپ کے بعض گورنروں کو حضرت معاویہؓ کے بعض حربوں کے مقابلہ میں ضرور شکستیں ہوئیں۔ چنانچہ مصر میں عمرو بن العاصؓ کے (باقی برصفحہ آئندہ)

سے نکال لیا۔ لشکرِ شام کا سپہ سالار جس وقت مدینہ پر متصرف ہوا تو قصرِ خلافت میں مسند کے قریب جا کر پوچھنے لگا " اے اوس اور خزرج کے لوگو! وہ واجب التعظیم مردِ کہن سال کیا ہوا جو اس مسند پر بیٹھا کرتا تھا؟ قسم ہے خدا کی اگر مجھ کو معاویہؓ کے عتاب کا خوف نہ ہوتا تو میں تم میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ ابھی وقت ہے کہ تم لوگ معاویہ کی بیعت کر لو۔ پھر تمہارا قصور معاف کر دیا جائے گا " زیادہ تر انصار اس وقت مدینہ میں نہ تھے حضرت علیؓ کے لشکر میں تھے۔ لیکن جس قدر مدینہ میں تھے اُن سے بجبر معاویہ کی بیعت لی گئی۔

اس کے چند روز بعد امیر المومنین علیؓ شہید ہو گئے۔ قبیلۂ تمیم کی ایک خارجی عورت قطام نامی نے (جس کے باپ اور بھائی جنگِ نہروان میں حضرت علیؓ سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے) ابن ملجم سے عقد کرنے کا اقرار اس شرط سے کیا کہ وہ خلیفہ کا سر اتار لائے۔ چنانچہ ابن ملجم نے حضرت علی کو اس وقت جبکہ آپ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں جا رہے تھے تلوار سے کاری زخم پہنچائے اور انہی زخموں کے صدمے سے آپ نے ۱۷ رمضان سنہ۴۰ھ مطابق ۲۷ جنوری سنہ۶۶۱ء کو انتقال فرمایا۔

حسنؓ بن علی کو خلافت وراثتہً[1] پہنچی۔ کسی گروہ کی سرگروہی اختیار کرنی آپکے موافق مزاج نہ تھی اور صرف سکون چاہتے تھے۔ جاہ و حشم۔ قوت و سطوت۔ بادشاہوں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مقابلے میں محمد بن ابی بکرؓ کو شکست ہوئی اور وہ مارے گئے بسر بن ارطاۃ نے عامل یمن و حجاز عبیداللہ بن عباس کو شکست دے کر صنعاء سے نکال دیا اور اہل یمن نے حضرت امیر معاویہ کی بیعت کی۔ نعمان بن بشیر، عامل عین التمر مالک بن کعب پر فتحیاب ہوا۔ سفیان بن عوف مدائن پر حملہ آور ہوا اور بہت سے مال غنیمت کے ساتھ دمشق کو لوٹا۔ غرض اسی طرح مختلف صوبے آہستہ آہستہ حضرت علیؓ کے ہاتھ سے نکلتے رہے اور آپ کی زندگی ہی میں حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت شام کے علاوہ یمن۔ حجاز۔ فلسطین اور مصر پر قائم ہو چکی تھی (اسمٰعیل)

[1] یہ صحیح نہیں بلکہ آپ کا انتخاب بھی لوگوں کے صلاح و مشورے اور اتفاق کے بعد ہوا تھا (اسمٰعیل)

کے افکار و تردوات کے مقابلے میں سہل گذاری اور خالی از ہمہ آفات آسائش کو
پسند کرتے تھے۔ اس وجہ سے شیعان علیؓ کے سرگروہ اب قیس بن سعد انصاری تھے
یہ بڑے قدآور اور مضبوط شخص تھے اور جسمانی زور اور طاقت کا عظیم الشان نمونہ تھے (۱۴۰)
بیس لڑائیوں میں دادِ شجاعت پا چکے تھے اُن کی دینداری بے خلل تھی دین کے ارکان
جان کے خطرے میں بھی ادا کر سکتے تھے۔ ایک روز نماز پڑھ رہے تھے۔ دیکھا کہ ٹھیک
اس جگہ جہاں سجدہ میں ماتھا ٹکتا ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ قیس
جس طرح نماز پڑھ رہے تھے پڑھتے رہے اور سجدے میں گئے تو سانپ کے بالکل
قریب پیشانی زمین پر رکھ دی۔ سانپ فوراً گردن میں لپٹ گیا مگر اس نے کاٹا
نہیں۔ قیس کو مطلق پرواہ نہ ہوئی جب نماز ختم کر چکے تو گردن سے سانپ چھڑا
کر دُور پھینک دیا۔ اِن راسخ الایمان بزرگ کو معاویہ سے نفرت تھی۔ نہ صرف اس
خیال سے کہ معاویہ اُن کے قبیلے کے عموماً اور اُن کے خاندان کے خصوصاً دشمن تھے
بلکہ نفرت کی خاص وجہ یہ تھی کہ وہ امیر معاویہ کو کافر سمجھتے تھے۔ قیس ہرگز تسلیم
نہ کرتے تھے کہ معاویہ مسلمان ہیں۔ ان دونوں میں باہمی نفرت اس قدر زیادہ
تھی کہ جس زمانہ میں امیر المومنین علیؓ کے حکم سے قیس مصر میں حاکم تھے تو معاویہ اور
قیس میں محض اس پُرلطف مشغلے کے لیے خط و کتابت شروع ہوئی کہ ایک دوسرے
کو دشنام دے۔ چنانچہ معاویہ اپنا خط قیس کے نام اس طرح شروع کیا "اے
یہودی کے بیٹے یہودی!" اور قیس نے اپنے خط میں معاویہ کو ان الفاظ سے
خطاب کیا "اے بت پرست کے بیٹے بُت پرست! تو نے اسلام بے دلی سے
اس وقت قبول کیا جب تو مجبور کیا گیا۔ لیکن اسلام جب تُو نے چھوڑا تو دل سے
اور خوش ہو کر چھوڑا۔ تیرا دین اگر کچھ ہے تو کل کی بات ہے لیکن تیری مکاری
ہمیشہ کی ہے۔

غرض حضرت حسنؓ اپنی اصلح جو طبیعت اور اس خواہش کو کہ کسی سے نہ لڑائیں
چھپا نہ سکے۔ قیس نے حضرت حسنؓ سے یہ کہکر بیعت کی کہ "اپنا ہاتھ بڑھایئے۔ میں

آپ سے اِس شرط پر بیعت کرتا ہوں کہ آپ خدائے عزوجل کی کتاب اور اُس کے
نبی کی سُنّت پر عمل کریں گے اور جو لوگ ہمارے دشمن ہیں اُن پر تلواریں کھینچیں گے
حضرت حسنؓ نے کہا: میں خدا کی کتاب اور نبی کی سُنّت پر عمل کروں گا۔ تم کو میری
اطاعت کرنی ہوگی اور صرف اُن سے لڑنا ہوگا جن سے لڑنے کا میں حکم دوں گا۔ اور
اُن لوگوں کے مقابلے میں تلوار نیام میں کرلینی ہوگی جن سے میں مصالحت چاہونگا
قیس نے بیعت تو کرلی لیکن امیر المومنین کے الفاظ نے قیس کے دل کو مطمئن
نہ کیا اور لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ: "جیسا شخص ہم چاہتے تھے یہ ویسے نہیں
ہیں یہ کبھی لڑنا پسند نہ کریں گے۔ اگر معاویہ کو فتح ہوگئی تو انصار کا پتہ بھی نہ
چلے گا کہ کہاں تھے؟" لوگوں کا یہ خوف جلد صحیح ثابت ہوگیا۔ کئی مہینے تک
حضرت حسنؓ مدائن میں بیکار مقیم رہے حالانکہ فوج کی اُن کے پاس کمی نہ تھی
غالباً اس زمانے میں انھوں نے معاویہ سے خط وکتابت شروع کردی تھی۔
بہرکیف انھوں نے اہل شام کے مقابلے کے لیے قیس بن سعد کو روانہ کردیا، لیکن (۴۱)
جو فوج اُن کے ساتھ کی وہ بہت کم تھی اور یہ بہادر انصاری شامی فوجِ مخالف کی
کثرت کی وجہ سے مغلوب ہوگئے اور اُن کی فوج والے بے ترتیب ہوکر میدان
سے بھاگے۔ اور جب یہ لوگ مدائن کے قریب سے گذرے تو حضرت حسنؓ کے
ساتھ انھوں نے بُرا برتاؤ کیا۔ اور اب حضرت حسنؓ کی نسبت اگر اُن کی نیت یہ نہ
بھی ہوتی تو بھی یہی سوءِ ظن ہوا کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ اپنی فوج کو دشمن کا لقمہ
بنادیا۔ اِس کے بعد حضرت حسنؓ نے اِس شرط پر کہ خلافت کے متعلق جملہ حقوق سے
وہ دست بردار ہوتے ہیں امیر معاویہ سے صلح کرلی۔ اور امیر معاویہ نے ان کو ایک
کثیر وظیفہ دے کر اُن کے ساتھیوں کی حفاظت کا ذمہ لیا۔

قیس بن سعد کے پاس اس وقت بھی پانچ ہزار فوج تھی۔ جنھوں نے امیر المومنین
علیؓ کے انتقال کے بعد سوگ میں اپنے سر منڈوا لیے تھے۔ اس تھوڑی سی فوج کو
لے کر قیس معاویہ سے پھر لڑنا چاہتے تھے، مگر اِن کو اس کا یقین نہ تھا کہ لڑنے کا جو

شوق اُن کے دل میں بھرا ہے وہی کیفیت فوج والوں کی بھی ہے اس لیے انھوں نے فوج کے لوگوں سے کہا کہ " اگر تم لڑنا چاہتے ہو تو ہم لڑائی جاری رکھیں گے اور سب مرجائیں گے مگر معاویہ کی بیعت نہ کریں گے۔ جو بات تمھیں پسند ہو وہ کہو" فوج والوں نے جواب دیا کہ " اب ہم لڑنا پسند نہیں کرتے "۔

قیس اپنے قبیلے کے سرداروں کے ساتھ امیر معاویہ کے پاس گئے اور اُن سے اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے صلح چاہی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ دہرائے جو آپ نے انصار کی سفارش میں لوگوں سے کہے تھے۔ " ان لوگوں کی عزت اور تعظیم کرو جنھوں نے تمہارے پیغمبر کو ہجرت کے وقت پناہ دی اور دین کی بنیادیں مضبوطی کے ساتھ قائم کر دیں "۔

خلاصہ یہ کہ قیس بن سعد نے امیر معاویہ سے کہا کہ انصار خوشی سے اپنی خدمات ان کے تابع فرمان کرتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ [1] امیر معاویہ نے جواب دیا " اے انصار! مجھے معلوم نہیں کہ میں تم پر کیوں مہربانی کروں؟ خدا کی قسم تم میرے جانی دشمن ہو۔ وہ تم ہی تھے جو جنگ صفین میں مجھے شکست دینے گئے تھے اور میرے آدمیوں کو تمہاری چمکتی ہوئی برچھیاں ہلاک کئے ڈالتی تھیں۔ تمہارے شاعروں کی ہجو گوئی نے میرے دل میں تیر چبھو رکھے ہیں۔ جب خدا نے وہ بات قائم کر دی جسے تم مٹانا چاہتے تھے تو اب تم مجھ سے یہ کہنے آئے ہو کہ میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کا خیال کروں۔ نہیں۔ ہم میں اتفاق کا ہونا ایسی بات ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا۔

قیس کو امیر معاویہ کی یہ باتیں سن کر غصہ آیا اور انھوں نے انداز گفتگو بدل کر کہا تمہاری مہربانی کے اس وجہ سے مستحق ہیں کہ ہم سچے مسلمان ہیں اور خدا کی

---

[1] مصنف نے یہاں قیس بن سعد کو ناحق طامع زر لکھا ہے قیس نے حضرت حسن کے فرمانے پر امیر معاویہ کی اطاعت قبول کی تھی مترجم

نظر میں یہ کافی ہے۔ یہ سچ ہے کہ جو لوگ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی پر متفق ہوئے ہیں اُن کے حقوق دوسرے قسم کے ہیں جن کا تم لحاظ کرتے ہو۔ ہم کو اِن لوگوں پر کسی طرح کا رشک نہیں۔ یہ سچ ہے کہ میدانِ جنگ میں ہم تمہارے دشمن رہے ہیں (۴۴)
لیکن اگر تم چاہتے تو یہ جنگ نہ ہونے دیتے۔ ہمارے شاعروں نے ہجو گوئی سے تمہیں غصہ دلایا ہوگا۔ لیکن جہاں تک انھوں نے جھوٹ کہا وہ بھلا دیا جائے گا۔ اور جہاں تک انھوں نے سچ کہا وہ ہمیشہ قائم رہے گا۔ معاویہ! تمہاری قوت کو استحکام ہو گیا ہے جسے ہم افسوس کیساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ جنگِ صفین میں جبکہ ہم تم کو شکست دینے ہی کو تھے ہم ایک ایسے شخص کے عَلَم کے نیچے کھڑے تھے جو جانتا تھا کہ وہ خدا کے کے حکم پر عمل کر رہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ایسا ہے کہ جو سچا مومن ہوگا وہ اس پر عمل کرے گا۔ لیکن اے معاویہ! جب تم کہتے ہو کہ ہم میں تم میں کبھی ملاپ نہ ہوگا۔ تو پھر یہ خدا ہی کی قدرت میں ہے کہ تم کو بُرائی سے باز رکھے" امیر معاویہ کو قیس بن سعد کی اس گفتگو پر اتنا غصہ آیا کہ انھوں نے قیس سے کہا کہ "تم میرے سامنے سے چلے جاؤ"

صحابہ اور انصار کی قوت ٹوٹ گئی اور قبیلوں کے رؤسا یعنی عرب کے پُرانے شرفا پھر قوی ہو گئے باوجود اس کے شام کے عربوں کے دل ٹھنڈے نہ ہوئے اُن کو اُمید تھی کہ صحابہ اور انصار سے بخوبی انتقام لیا جائے گا۔ مگر امیر معاویہ کے مزاج میں اعتدال تھا۔ پُورے انتقام کی انھوں نے اجازت نہ دی۔ لیکن اعرابِ شام خوب جانتے تھے کہ وہ دن دور نہیں ہے کہ جنگ کے شعلے پھر بھڑک اُٹھیں اور موت و زندگی کی ایک کشمکش پھر پیدا ہو جائے۔ انصار اور صحابہ غصے اور رنج سے اندر ہی اندر گھلے جاتے تھے۔ امیر معاویہ کی زندگی ہی میں بنی اُمیہ کی قوت کو بخوبی استحکام ہو گیا اور انصار اور صحابہ اُن کے مقابلے میں بیدست و پا رہ گئے۔ لیکن امیر معاویہ حیاتِ دوام لے کر نہیں آئے تھے۔ آخر ایک دن مرنا تھا۔ اس لیے مدینہ والے بجائے نا امید ہونے کے جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔

اس درمیان میں لڑنے والے تو مجبور ہو کر چپ بیٹھے مگر اُن کی جگہ شاعروں نے لڑنا اپنے ذمہ کر لیا۔ ہجویں اور مذمتیں جن میں خون کی بو آتی تھی آپس کی عداوتوں کو ظاہر کرنے کے لیے لکھی گئیں۔ ایک نے دوسرے پر حملہ جاری رکھا۔ آئے دن جھگڑے اور بدزبانیاں رہنے لگیں۔ شامیوں اور بنی اُمیہ کے سرداروں نے صحابہ اور انصار سے نفرت و عداوت ظاہر کرنے میں کسی موقع کو ہاتھ سے نہ دیا۔ یہی حال فریق مخالف کا تھا کہ وہ کلہ بکلہ جواب دینے میں کبھی نہ چوکا۔

اسناد

مسعودی قلمی نسخہ ۱۲۷۔ ص ۱۸۵۔ ۱۹۴۔ ۱۹۴ تا ۲۰۰۔ ۲۳۱۔ ۲۴۲۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸ (قلمی نسخہ ۵۲۷) ص ۱۴۱۔ ۱۵۹

طبری ج ۲۔ ص ۲۵۰۔ ۲۵۲

ابن بدرون ص ۱۴۸

زیری ص ۵۶۵

ریحان ص ۱۳۸ تا ۱۴۰۔ ۱۹۷۔ ۲۰۰

شہرستانی ص ۸۵۔ ۸۶

مُبرّد ص ۲۷۸۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵

ابوالمحاسن ج ۱ ص ۱۱۳

کتاب اول

خانہ جنگی

چوتھی فصل

یزید بن معاویہ

انتقال سے کچھ پہلے امیر معاویہؓ نے اپنے بیٹے یزید کو نصیحت کی کہ حسینؓ اور عبداللہؓ کو دیکھتے رہنا کیوں کہ ان کی طرف سے اندیشہ ہو سکتا ہے حسینؓ امیرالمومنین علیؓ کے دوسرے فرزند تھے اور عبداللہؓ حضرت زبیرؓ کے پسر تھے حضرت زبیرؓ مہاجرین میں سے تھے اور زمانۂ خلافت حضرت علیؓ میں دعویدارِ خلافت ہوئے تھے[1] غرض اس وقت حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ دونوں مدینہ میں رہتے تھے جس وقت حضرت حسینؓ نے عبداللہ بن زبیرؓ کو اطلاع دی کہ وہ اس امر کا یقین کر سکتے ہیں کہ امیر معاویہ

---

[1] حضرت علیؓ کی خلافت کے زمانہ میں حضرت زبیرؓ کا دعویٰ خلافت کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔ البتہ چونکہ حضرت زبیرؓ نے شروع میں حضرت علیؓ کے ہاتھ پر اس شرط کے ساتھ بیعت کی تھی کہ امیرالمومنین حضرت عثمانؓ کا قصاص لیا جائے۔ اس لیے بعد میں آپ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ کے ساتھ ہو کر حضرت علیؓ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مزید مطالبہ کیا تھا۔ مگر دعویٰ خلافت ہرگز نہیں کیا سلا ملیل (

کا انتقال ہوگیا ہے تو عبد اللہ بن زبیرؓ نے خلافت یزید کے بارے میں حضرت حسینؓ کا
ایماء لینا چاہا۔ آپ نے فرمایا کہ "میں کبھی یزید کو اپنا حاکم تسلیم نہ کروں گا۔ وہ صاحب
خمر ہے۔ زانی ہے۔ صید و شکار کا شوقین ہے" عبد اللہ بن زبیرؓ یہ سن کر کچھ نہ بولے
لیکن یزید کی نسبت اِن کا بھی وہی خیال تھا جو حضرت حسینؓ کا تھا۔

یزید بن معاویہ میں نہ تو باپ کی سی مُروّت تھی اور نہ اُن کا سا تحمل اور سلوک تھا
اور نہ وہ سہولت اور ترحمی کو پسند کرتا تھا۔ یزید اپنی ماں میسون کی پوری تصویر تھا۔
میسون ایک چاق و چوبند بدوی عورت تھی۔ جس کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ
صحرا میں ہوا کی آواز کو بڑے بڑے مغنیوں کی خوشنوائی سے اور خیمہ کے سایہ میں
نانِ جویں کا ایک ٹکڑا کھانے کو دمشق کے عالی شان محلوں کی پر تکلف ضیافتوں سے
بہتر جانتی تھی۔ اِسی ماں کے آغوش اور بنی کلب کے صحرا میں یزید نے پرورش پائی
تھی جب مسندِ خلافت پر بیٹھا تو عادتیں اور خصلتیں بادشاہوں یا پیشوایانِ مذہب کی سی
نہ تھیں بلکہ بادیہ عرب کے ایک شیخ قبیلہ کے سے اطوار رکھتا تھا۔ مزاج میں سخاوت
تھی۔ بلیغ تھا۔ شاعر بھی اچھا تھا۔ شکار کا دھتی، ناچ رنگ کا شیفتہ اور شراب کا خوگر
تھا۔ اس کے علاوہ ایک ایسے مذہب سے جو طرح طرح کی پابندیوں پر مجبور کرتا ہو
اور سوء اتفاق یہ کہ ایک ایسے ہی مذہب کا اُسے پیشوا بننا پڑا، اُسے کوئی دلی تعلق نہ تھا
پھر یہ مذہب بھی وہ تھا جس کی مخالفت اس کے دادا ابو سفیان نے تلوار سے کی تھی ایسے (۴۴)
دین سے اُسے کیا ہمدردی ہوتی؛ قدماء اسلام کی ... نیکی اور ... * اتقا
یزید کی طبیعت کے موافق نہ تھا۔ وہ کسی طرح اُس زمانہ کو جسے علماء نے جاہلیت کا زمانہ
کہا ہے موجودہ زمانۂ اسلام پر ترجیح نہ دے سکتا تھا۔ اور علی الاعلان ایسی لذتوں میں
مصروف رہتا جن کی قرآن میں ممانعت تھی۔ جس بات کی طرف اُس کی متلون اور قہرناک
طبیعت متوجہ ہو جاتی وہی کر بیٹھتا۔ کسی شخص کا کچھ پاس و لحاظ نہ کرتا۔ مدینہ میں لوگ

---

* یہاں سخت اشتعال انگیز اور تعصب آمیز الفاظ مصنف نے لکھے ہیں۔ میں نے اُن کا ترجمہ نہیں کیا۔ مترجم

اُس سے متنفر مگر شام میں سب اُس کے گرویدہ تھے۔

جیسا کہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے اسلام کی قدیم جماعت میں بھی افسروں کی زیادتی اور سپاہ کی کمی تھی۔ ولید بن عتبہ بن ابوسفیان مدینہ کا حاکم تھا۔ یہ ایک سیدھا سادہ عافیت پسند سا آدمی تھا جب حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس کی نظر بچا کر مدینہ سے نکل مکہ پہنچ گئے تو یہاں حضرت حسینؓ اہل کوفہ کے خطوط وصول کر کے دل میں بہت خوش ہوئے۔ یہ خطوط اس مضمون کے تھے کہ کوفہ کے عرب آپ کی سرداری قبول کرنا چاہتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کو خلیفہ مان کر عراق کی کل رعایا کو آپ کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ کر دیں گے۔ حضرت حسینؓ کے پاس اب کوفہ سے قاصد پر قاصد آنے لگے۔ بالآخر قاصد جو آیا وہ ایک بڑی لمبی عرضداشت لایا جس میں ۱۵۰ ورق پر لوگوں کے صرف دستخط تھے دور اندیش دوستوں نے آپ کو ہر طرح پر منت و سماجت، عجز و انکسار کے ساتھ سمجھایا کہ ایسی خطرناک منزل میں آپ قدم نہ رکھیں اور ایسے لوگوں کے وعدوں اور ظاہری جوش کا اعتبار نہ کریں جو آپ کے والد بزرگوار حضرت علیؓ کو دھوکہ اور فریب دے چکے ہیں مگر حضرت حسین نے کسی کی بات نہ سنی اور اُن بیشمار درخواستوں کو فخریہ دکھانے لگے جو اُن کے پاس کوفہ سے آئی تھیں۔ اور جن کی نسبت خوش ہو کر کہتے تھے کہ وہ دو اونٹ کا بوجھ ہیں۔ حضرت حسین نے اُن صداؤں کو مانا جو اُن کے دل سے اُٹھیں اور دوستوں کی نصیحت سے اِن دل کی صداؤں کو ماننا بہتر سمجھا اور تن بہ تقدیر کوفہ روانہ ہو گئے اُن کی روانگی سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو جو حضرت حسینؓ کے ظاہری دوست تھے، بڑی تسکین ہو گئی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ریاست کے معاملے میں پیغمبرؐ کے نواسے کی مخالفت کرنے کی اُن میں قوت نہیں ہے۔ مگر اب وہ کوفہ جا رہے ہیں، جہاں سے زندہ واپس آنے کی اُمید نہیں ہو سکتی۔ اس لیے وہ دل میں خوش ہو گئے۔

لہ میں نے یہاں تین سطروں کے الفاظ میں کچھ رد و بدل کیا ہے۔ مصنف نے جن الفاظ میں یہ مضمون ادا کیا ہے وہ بہت تکلیف دہ اور توہین آمیز ہیں۔ مترجم

حضرت حسینؓ کی خلافت کے لیے جو جوش و خروش عراق میں ظاہر کیا گیا۔ اُس میں مذہبی خیال کا لگاؤ مطلق نہ تھا۔ عراق کا ملک ایک مستثنیٰ صورت رکھتا تھا۔ معاویہ اگرچہ مکہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر جو صاحب حکومت خاندان اُن سے چلا وہ مکی نہ تھا بلکہ شامی خصوصیات رکھتا تھا۔ امیر معاویہ کے دور حکومت میں شام کا پلّہ تمام ملکوں سے بھاری ہوگیا تھا اور دمشق جو شام کا بڑا شہر تھا اب دار الخلافہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں عراق میں کوفہ کے شہر کو سب سے زیادہ بڑائی حاصل ہو چکی تھی۔ اب اعراب عراق کے غرور کو دمشق کی فضیلت صدمہ پہنچانے لگی۔

(۴۵) عراق کے لوگوں نے شروع ہی سے بغاوت اور فساد، بدنظمی و بدعملی کا طریقہ اختیار کر رکھا تھا یعنی وہ طریقہ جو بدوؤں کے لیے مخصوص اور اُن کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اس وجہ سے عراق کا ملک سیاسی مفسدہ پردازوں اور فتنہ انگیزوں کا معدن اور قاتلوں اور قزاقوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ اس خراب حالت کو دیکھ کر امیر معاویہ نے اپنے بھائی زیاد کو عراق کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا۔ زیاد نے عراق پہنچکر مفسدوں کا سدِّ باب ہی نہیں کیا بلکہ امن کو بالکل ہی غارت کر دیا۔ جلادوں اور سرہنگوں کو ساتھ لے کر گشت لگانا شروع کیا اور اگر کسی سے ذرا بھی سرکشی یا بغاوت کی علامت ظاہر ہوئی۔ اس کا نہایت سختی سے تدارک کر دیا۔ زیاد کی اس سخت گیر بلکہ خون ریز سیاست نے تمام ملک میں امن و امان پیدا کر دیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ عراق کے لوگوں نے حضرت حسینؓ کے آنے کو اپنے حق میں بہتر سمجھا۔

ملک عراق پر زیاد کا قبضہ اور تصرف ایسا سخت تھا جس کی خود رعایا کو بھی پوری کیفیت معلوم نہ تھی۔ بہر کیف زیاد کا پیمانۂ عمر لبریز ہوا اور وہ دنیا سے چل بسا۔ مگر اس کے ایک بیٹا چھوٹا جو حقیقت میں ایسے ہی باپ کے لائق تھا۔ اس کا نام عبید اللہ تھا۔ زیاد نے مرتے وقت بیٹے کو کوفہ کی بغاوت فرو کرنے کا کام سپرد کیا۔ اور یہ زمانہ وہ تھا جبکہ نعمان بن بشیر والیٔ کوفہ نے اہل کوفہ کے ساتھ ایسی نرمی کا برتاؤ شروع کیا تھا۔ جس سے خلیفہ کو نعمان کی طرف سے بدگمانی ہو چلی تھی۔ عبید اللہ بن زیاد بصرہ سے لشکر لیے ہوئے

کوفہ کے قصد سے نکلا۔ کوفہ کے قریب پہنچکر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ جب رات ہوئی تو منہ پر نقاب ڈال کر شہر میں داخل ہوا۔ اُس وقت فوج کے صرف دس سپاہی اس کے ساتھ تھے اِس سے پہلے شہر والوں کا حال معلوم کرنے کے لیے اُس نے اپنے چند آدمی خاص خاص موقعوں پر اس بات کے مشہور کرنے کے لیے بٹھا دیے تھے کہ گویا حضرت حسینؓ تشریف لا رہے ہیں۔ اتنی خبر اُڑتے ہی کوفہ کے بڑے بڑے رئیس استقبال کو دوڑے اور سب نے عرض کیا کہ ہمارے گھر چلیے۔ عبیداللہ بن زیاد نے جو منہ پر نقاب ڈالے اپنے کو حضرت حسینؓ ظاہر کر رہا تھا، کسی کی تواضع قبول نہ کی اب اُس کے چاروں طرف ہجوم ہو گیا، اور ہر شخص بآواز بلند کہتا تھا "حسین ابن رسول اللہ پر سلام ہو" اسی حالت میں عبیداللہ سیدھا قلعے کی طرف بڑھا جس میں والئ کوفہ نعمان سکونت رکھتا تھا۔ نعمان نے ہجوم کو دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیا۔ عبیداللہ نے آواز دی "دروازہ کھولو اور پیغمبر کے نواسے کو اندر آنے دو" نعمان نے اندر ہی سے جواب دیا "جہاں سے آئے ہو وہیں چلے جاؤ۔ میں تمہاری قسمت کو دیکھ رہا ہوں اور لوگوں کو اس بات کے کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتا کہ حسینؓ ابن علیؓ نعمان کے گھر میں مارے گئے۔" اس جواب پر عبیداللہ کو اطمینان ہوا اور اُس نے نقاب چہرے سے اٹھا دیا۔ جونہی لوگوں نے پہچانا کہ یہ تو عبیداللہ بن زیاد ہے تو سب ڈر کر وہاں سے غائب ہو گئے نعمان نے عبیداللہ کو سلام کیا اور کہا قلعے میں چلیے۔

دوسرے دن جب مسجد میں سب لوگ جمع ہوئے تو عبیداللہ نے کہا کہ "جو لوگ اچھے ہیں اُن کے حق میں میں مثل باپ کے رہوں گا۔ لیکن جو شریر ہیں اُن کے حق میں تلوار بن جاؤں گا۔" اس پر کچھ فساد ہوا، مگر وہ فرو کر دیا گیا۔ اس کے بعد کسی کی ہمت نہ تھی کہ بغاوت کا نام لے۔

ان افسوسناک واقعات کی اطلاع حضرت حسینؓ کو اُس وقت ملی جبکہ آپ راستے میں تھے اور کوفہ تھوڑی دُور رہ گیا تھا۔ آپ کے ہمراہ بمشکل ستّر نفوس تھے جن میں زیادہ تر آپ کے خاندان ہی کے لوگ تھے۔ مگر باوجود متوحش خبر ملنے کے آپ کوفہ کی

جانب بڑھے چلے گئے۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کسی سلطنت میں ایک بادشاہ کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو بادشاہی کا دعویٰ ہوتا ہے تو پھر اُس شخص پر ایک سحر کا سا اثر ہوجاتا ہے جو کامیابی کی اُمید پیدا کر کے کسی قسم کا پس وپیش اُسے سوچنے نہیں دیتا۔ حضرت حسینؓ کو اس کا یقین تھا کہ جس وقت کوفہ کے دروازے پر آپ پہنچیں گے تو اہل شہر فوراً مسلح ہو کر آپ کی نصرت پر مستعد ہو جائیں گے۔ چلتے چلتے آپ جب کربلا کے قریب پہنچے تو آپ کو وہ لشکر ملا جسے عبید اللہ بن زیاد نے اِس حکم کے ساتھ روانہ کیا تھا کہ "حسینؓ خواہ زندہ ملیں یا مردہ کوفہ میں لائے جائیں" لیکن اموی لشکر کا افسر، جسے یہ حکم دیا گیا تھا، اس پر عمل نہ کر سکا۔ اُسے تذبذب پیدا ہو گیا۔ یہ افسر فوج عمرو بن سعد قبیلہ قریش سے تھا۔ اس کے باپ سعد اُن لوگوں میں سے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر شروع زمانۂ تبلیغ میں اسلام لائے تھے۔ عمرو بن سعد اس خیال سے خوف زدہ ہوا کہ وہ کس طرح جناب فاطمہؓ بنت رسول اللہ کے ایک فرزند کا خون کرے۔ اس لیے اُس نے عبید اللہ ابن زیاد سے اِس بارے میں دوسرا حکم طلب کرنا چاہا۔ اور ملاقات کے وقت حضرت حسینؓ نے جو باتیں چاہی تھیں، وہ بھی عبید اللہ کو کہلا بھیجیں جب عبید اللہ نے ابن سعد کا پیغام سُنا تو اُسے بھی تامل ہوا کہ کیا کرے لیکن اس موقع پر کوفہ کے ایک رئیس نے جس کا نام شمر تھا اور جو اموی لشکر میں افسری کی خدمت پر پورا عربوں کا عرب تھا اس کے پوتے صمیل سے ہماری ملاقات اسپین میں ہوگی، عبید اللہ کی ہمت بڑھائی اور کہا "اے عبید اللہ! اگر قسمت سے دشمن تیرے قبضے میں آجائے تو کیا تو اسے چھوڑ دے گا؟ ایسا تو خیال میں نہیں آسکتا۔ دشمن کو ہر حال میں اطاعت قبول کرنی ہوگی۔" عبید اللہ نے شمر کے کہنے کے مطابق ابن سعد کو حکم بھیج دیا۔ حضرت حسینؓ نے اپنے آپ کو لشکر اموی کے حوالے کرنا منظور نہ کیا پھر بھی ابن سعد نے آپ پر کوئی حملہ نہیں کیا۔

جب عبید اللہ کو معلوم ہوا کہ ابن سعد نے ابھی تک آپ پر حملہ نہیں کیا ہے۔ تو اس نے مزید فوج شمر کی سرکردگی میں اس حکم کے ساتھ روانہ کی کہ "اگر یہ قریشی

(یعنی عمرو بن سعد اب بھی کچھ نہ کرے تو اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ شمر کام کرے)" لیکن جب شمر فوج لیے ہوئے موقع پر آیا تو ابن سعد نے اپنی فوج کو حضرت حسینؓ پر حملہ کرنے کا فوراً حکم دے دیا۔ آپ نے حملہ کرنے والوں کو بہت سمجھایا کہ اس حرکت سے باز آجائیں اور فرمایا کہ "اگر تم میرے نانا کے بتائے ہوئے دین کو مانتے ہو تو قیامت کے دن اس قتل کا کیا جواب دو گے؟" ہمراہیانِ حسینؓ نے نیزوں پر قرآن تک بلند کئے مگر دشمنوں پر کچھ اثر نہ ہوا۔ شمر نے حملے کا حکم دے دیا اور دشمن آپ پر تلواریں لے کر پل پڑے اور آپ کو شہید کر دیا۔ آپ کے جس قدر ہمراہی تھے تقریباً سب نے دشمنوں میں اچھی طرح قتال کر کے اپنی جانیں دیں (۱۰ محرم ۶۱ھ مطابق ۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء)[1]

یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ جب کوئی نیا مدعی سلطنت اپنے دعوے میں ناکام رہتا ہے تو آنے والی نسلوں کو اس سے ایک خاص ہمدردی اور شغف پیدا ہو جاتا ہے[2] علاوہ خلائق میں عدل و انصاف اور امن و امان کو قائم رکھنے کی ضرورت یا اس بات کا خیال اس وقت اُن کے دل میں نہیں ہوتا کہ خانہ جنگی اگر شروع ہی میں نہ روک دی جایا کرے تو پھر اس سے کن کن مصیبتوں اور آفتوں کا احتمال ہو سکتا ہے۔ آیندہ نسلوں نے

---

[1] ابن خلدون صفحہ ۱۶۸

[2] حضرت امام حسین علیہ السلام سے عام ہمدردی کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ بقول مصنف ہر ناکام مدعی سلطنت سے آنے والی نسلیں ہمدردی کیا ہی کرتی ہیں، بلکہ اس کا حقیقی باعث وہ روح فرسا حالات ہیں جن میں امام مظلوم نے شہادت پائی مثلاً آپ کے خاندان کا ایک ایک کر کے آپکے سامنے خاتمہ ہونا معصوم بچوں کا کام ظالموں کے تیروں سے تمام ہونا، عورتوں اور بچوں کا پیاس کی شدت سے آہ و زاری کرنا اور ایک قطرہ پانی کا اُن کو نہ ملنا۔ اور آخر میں اپنی عورتوں کو نہایت لاچاری اور بیکسی کی حالت میں چھوڑ کر خود بھوکا پیاسا شہید ہو جانا وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے حالات اگر کسی غیر مسلم کو پیش آتے تو وہ بھی ہمدردی کا مستحق تھا حضرت امام حسینؓ تو پھر بھی نواسۂ رسولؐ تھے اور اگر شہید نہ بھی ہوتے تب بھی اپنے ذاتی تقدس کی وجہ سے مسلمانوں کیلئے واجب التعظیم تھے (اسمٰعیل)

حسینؓ ابن علیؓ کی نسبت سمجھا کر یہ ارتکاب ایک ایسے سخت جرم کا ہوا ہے جو جرائم میں بدترین جرم تھا۔ ایرانیوں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس تصویر کو اور بھی مکمل کر دیا۔ ایرانیوں کے تعصب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لہ حضرت حسینؓ کے معاصر بہت ایسے تھے جو اس واقعہ کو دوسری ہی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ آپ نے اپنی قسم توڑی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاویہؓ کے زمانے میں ابن معاویہ کی ولیعہدی کی بیعت لے چکے تھے اور بدرجۂ آخر خلافت پر اپنا استحقاق ثابت نہ کر سکے۔

حضرت حسینؓ کی شہادت نے ایک دوسرے دعویدارِ خلافت پیدا کر دیے۔ یہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ تھے۔ ان کے مزاج میں حضرت حسینؓ سے زیادہ احتیاط تھی اور اپنے تئیں اُن سے زیادہ مستحقِ خلافت سمجھتے تھے۔ ایک زمانے میں یہ حضرت حسینؓ کے دوست بنے ہوئے تھے لیکن جو خیالات درحقیقت اِن کے تھے اُنھیں حضرت حسینؓ اور آپ کے دوست خوب سمجھتے تھے ٹہ۔ حضرت حسینؓ جس وقت کوفہ تشریف لے جا رہے تھے تو عبداللہ ابن عباسؓ آپ کے پاس آئے تھے اور آپ کو بہت کچھ سمجھانے کے بعد کہ آپ کوفہ نہ جائیں، مجبور ہو کر رخصت ہوئے تھے جب یہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے ملے تو کہنے لگے "عبداللہ! اب تو تمہارا دل ٹھنڈا ہوگا" اور اتنا کہہ کر سردار نجد کلیب وائل تغلبی کے اشعار اِس مضمون کے پڑھے "اے چکاوک! سبزہ زار کی رہنے والی میدان خالی ہے۔ انڈے بچے نکال، چہچہے کر۔ جب تک جی چاہے چہچہاتی چگتی پھر" خوش ہو کہ صیاد تجھ سے اس وقت بہت دور ہے لیکن ہوشیار

لہ مصنف کی عبارت کے بعض جملے ہم نے یہاں ترجمہ نہیں کیے۔ کیونکہ ان میں سخت توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ مترجم

ٹہ مصنف کا حضرت ابن زبیرؓ کی نسبت یہ خیال صحیح نہیں۔ تاریخی واقعات شہادت دیتے ہیں کہ وہ حضرت امام حسینؓ کے سچے دوست اور حقیقی خیرخواہ تھے اور اس خیرخواہی میں منافقت یا ظاہرداری کا شائبہ تک نہ تھا۔ اِس کی تصدیق اس تقریر سے بھی ہو سکتی ہے جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی آنے پر حضرت ابن زبیرؓ نے اہالیانِ مکہ کے سامنے کی اور جس کو ڈوزی نے بھی آگے چل کر نقل کیا ہے۔ اسمٰعیل

نہ کہ ایک نہ ایک دن اس کے دام میں گرفتار ہونا ہے" ... ... حسین تو عراق کو چلے اب تو حجاز کو نہ چھوڑ" حضرت حسین کے کوفہ جانے کے بعد ہی حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے خفیہ طور پر خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا تھا[1] لیکن جس وقت واقعہ کربلا کی خبر مکے میں آئی تو انھوں نے بہت رنج والم ظاہر کیا، اور ایک تقریر شہادت حضرت حسینؓ پر لوگوں کے سامنے کی حضرت عبداللہؓ ماں کے پیٹ سے خطیب پیدا ہوئے تھے۔ بلاغت کلام میں کوئی اُن کا ہمسر نہ تھا۔ خیالات کو حسب ضرورت مخفی رکھنے یا ان کو بدل کر بیان کرنے کے نازک فن میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ دولت خواہی اور قوت طلبی کو ادائے فرض منصبی، نیکی، مذہب، اور پارسائی کا لباس پہنا کر پوشیدہ رکھنا اور اس میں کامیاب ہونا ان سے بہتر کسی کو نہ آتا تھا، اور یہی راز خلائق میں ان کے باثر ہو جانے کا تھا ... ... چونکہ حضرت حسینؓ اب نہ رہے تھے اس لیے اپنی تقریر میں کہا کہ "حسین ابن علی خلیفہ برحق تھے" آپ کے اوصاف حمیدہ اور زہد و اتقا کی تعریف شروع کی، اور تقریر کو ان جملوں پر جن میں ایک طور سے یزید کی برائیوں کی طرف بھی اشارہ تھا، ختم کیا۔

"حسین ایسے شخص نہ تھے کہ قرآن کے بدلے غنا میں مصروف ہوں اور خوف خدا سے رونے کی جگہ حدی خوانی کریں۔ وہ ایسے نہ تھے کہ روزے چھوڑ کر حرام چیزیں پیا کریں۔ اور حلقہ ذکر و فکر سے نکل کر شکار کے لیے سوار ہو جائیں۔ بدکار لوگ جلد اپنے بُرے کاموں کا پھل پائیں گے"

---

[1] خفیہ خلیفہ کا لقب اختیار کر لینے کا کوئی ظاہرا ثبوت موجود نہیں۔ غالباً اس فقرہ سے مصنف کو یہ دکھانا منظور ہے کہ چونکہ ابن زبیر خود خلیفہ ہونا چاہتے تھے اور حضرت امام حسینؓ کو اپنی خلافت کی راہ میں ایک روک سمجھتے تھے اس لیے امام حسین کی شہادت پر ابن زبیر نے جس قدر اظہار رنج کیا اسے مصنوعی تھا حالانکہ یہ صحیح نہیں کیونکہ تاریخی قرائن اس کے خلاف ہیں اور ہمیں کوئی ثبوت اس امر کا نہیں ملتا کہ شہادت حسینؓ سے واقعتاً ابن زبیر کو خوشی ہوئی تھی (اسلیبل)

(۴۸)

اب حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے لیے پہلا کام یہ تھا کہ مہاجرین میں جو اشخاص
سربرآوردہ ہوں، اُن کو اپنے ساتھ کرلیں۔ لیکن اُن کو تردد یہ تھا کہ اپنے اصلی مقصد کو
جو مخالفت یزید اور حصولِ خلافت تھا، اور لوگوں سے تو پوشیدہ رکھنا آسان ہے مگر
مہاجرین سے اس کا اخفا آسان نہیں۔ وہ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ عبداللہ ابن عمرؓ کی
طرف سے اُن کی خلافت پر اعتراض ہوگا۔ کیونکہ ان بزرگ کو اگرچہ کسی سے کچھ واسطہ
نہ تھا اور عبادت کے سوا انہیں دوسرا کام نہ تھا، لیکن معاملاتِ دنیا کے سمجھنے میں وہ
بڑے عاقل اور ہوشمند تھے۔ بہر کیف حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ دل کے کمزور یا ہمت ہارنے
والے لوگوں میں سے نہ تھے۔ عبداللہ ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں۔ جس قدر وہ نیک اور
پارسا تھیں، اسی قدر جلد دوسرے کی بات کا یقین بھی کرلیتی تھیں۔ حضرت عبداللہ
ابن زبیرؓ نے سوچا کہ مضمون کی ابتدا انہی نیک اور بھولی بیوی سے اٹھانی چاہیئے چنانچہ
حضرت ابن زبیرؓ ان کے پاس گئے اور حسبِ عادت بڑی فصاحت و بلاغت سے خدا اور
رسول کی تعریف اور مہاجرین اور انصار کے ساتھ جوشِ ہمدردی ظاہر کرنے لگے اور
جب دیکھا کہ ان نیک بی بی کے دل پر اُن کی میٹھی میٹھی باتیں اثر کرنے لگی ہیں تو انھوں
نے کہا کہ "آپ اپنے شوہر کو سمجھائیں کہ وہ میری خلافت پر بیعت کرلیں" ان نیک
بی بی نے اس امر میں کوشش کا وعدہ کیا، اور جب اسی دن شام کو شوہر کے
سامنے کھانا رکھنے لگیں تو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کا بہت ہمدردی سے تذکرہ کرنے لگیں
اور اُن کی تعریف میں آخر جملہ یہ کہا "بس یہ سچ ہے کہ بجز خدا کی بزرگی کے ابن زبیرؓ
کسی چیز کا جویا نہیں ہے" اس پر عبداللہ ابن عمرؓ بہت ہی روکھے ہو کر بولے "تم کو
وہ جلوس بھی یاد ہے جو حج کے زمانہ میں معاویہ کے پیچھے پیچھے چلتا تھا خاص
کر وہ قطار خچروں کی جن پر حسین عورتیں زرق برق لباس پہنے ہیرے موتیوں میں لدی
پھندی بیٹھی ہوتی تھیں، بھلا ان چیزوں کو تم کب بھولی ہو گی؟ بس یہ سمجھ لو کہ عبداللہ
ابن زبیرؓ کو جس چیز کی آرزو اور تلاش ہے، وہ یہی خچر ہیں" اتنا کہہ کر حضرت
عبداللہ ابن عمرؓ کھانا کھانے لگے اور اپنی بیوی کی جو بہت ہی نیک اور

پارسا عورت تھیں، پھر کوئی بات نہ سُنی[1]

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو یزید سے قطعی مخالفت کیئے ہوئے اب ایک سال ہو لیا تھا۔ لیکن یزید کو اب تک اُن کی مخالفت کی کچھ پروا نہیں ہوئی تھی یہ بے توجہی ایک ایسے فرمانروا میں جو صبر اور نرمی کے اوصاف پر ناز نہ کر سکتا تھا، عجیب تھی وجہ اُس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اولاً یزید اُن کو کچھ بہت خطرناک آدمی نہ سمجھتا تھا۔ کیوں کہ وہ حضرت حسینؓ کی طرح مکہ چھوڑ کر کسی دوسری جگہ نہ گئے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ یزید جب تک شدید ضرورت نہ ہو ایسے مقام کو خون سے آلودہ نہیں کرنا چاہتا تھا جو ایام جاہلیت میں بھی کیا انسان اور کیا حیوان، سب کے لیئے جائے پناہ مانا جاتا تھا۔ یزید جانتا تھا کہ اگر حرم میں خون ریزی کی تو اُس کی یہ حرکت تمام مسلمانوں کی نظروں میں اس کے ظلم و ستم کا پیمانہ بالکل لبریز کر دے گی۔

لیکن آخر کار یزید کو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ پر صبر نہ رہا۔ ایک بار پھر ان کو بیعت لینے کے لیے طلب کیا، اور یہ آخری طلبی تھی۔ حضرت ابن زبیرؓ نے آنے سے انکار کیا یزید نے یہ خبر سنکر قسم کھائی کہ میں عبداللہ سے اُس وقت بیعت لوں گا، جب وہ میرے تخت کے سامنے زنجیروں میں جکڑا کھڑا ہو گا۔ لیکن جب یزید کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اپنی معمولی صلح پسند طبیعت کے اقتضار سے اِس قسم پر اُسے افسوس ہوا۔ لیکن قسم توڑتا کیونکر۔ اس لیے ایسی تدبیر کی کہ ابن زبیرؓ کی بے عزتی بھی نہ ہو اور قسم بھی پوری ہو جائے وہ تدبیر یہ تھی کہ ایک چاندی کی زنجیر اور ایک بہت پُر تکلف جُبہ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے پاس ایسا بھیجا کہ اس کو پہننے سے زنجیر چھپ جائے۔

اِس عجیب تحفے کو حضرت ابن زبیرؓ تک پہنچانے کے لیئے یزید نے دس آدمیوں کا ایک وفد مقرر کیا۔ اِس وفد کے سردار نعمان بن بشیر انصاری تھے۔ یہ ثقہ مسلمانوں اور بنی امیہ میں جب کوئی جھگڑا ہوتا تھا، تو اکثر اُس کے تصفیہ کے لیے بیچ میں آجاتے تھے

[1] آغانی ا۔ ۸ مقابلہ کرو ابن بدرون صفحہ ۱۹۹

نعمان کے ساتھ جو اور لوگ تھے، وہ شامی قبیلوں کے سردار تھے۔ جب یہ لوگ مکے پہنچے تو حضرت ابن زبیرؓ نے یزید کا تحفہ لینے سے حسبِ توقع انکار کیا۔ لیکن نعمان اس انکار سے گھبرائے نہیں اور اب انھوں نے ابن زبیرؓ کو سمجھانا شروع کیا۔ اس غرض کے لیے جو ملاقاتیں دونوں میں ہوتی تھیں، وہ تخلیے کی ہوتی تھیں۔ اور ان ملاقاتوں کا نتیجہ بھی کسی کو کچھ نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس وفد میں عبداللہ بن عضاہ بھی شریک تھا جو قبیلہ الاشعر کا سردار تھا۔ اور یہ قبیلہ شام میں علاقہ طبریہ کا ایک بڑا صاحبِ اقتدار قبیلہ تھا۔ ابن عضاہ کو ان مسلسل ملاقاتوں پر کچھ شبہ سا ہوا۔ اور دل میں کہنے لگا کہ یہ نعمان انصاری ہے اور بنی اُمیہ سے تعلق رکھتے ہیں جب یہ اپنے ہی گروہ اور قبیلہ کا نہ ہوا تو خلیفہ سے بدلتے ہوئے اسے کیا دیر لگے گی۔ اس شبہ کے پیدا ہونے کے بعد ایک دن ابن عضاہ کی ملاقات حضرت ابن زبیرؓ سے ہوئی۔

ابن عضاہ نے کہا " اے عبداللہ! میں بقسم کہتا ہوں کہ خلیفہ نے جو ہدایتیں سبھوں کو دی ہیں وہی نعمان کو دی ہیں اور ان سے کوئی خاص بات نہیں کہی نعمان کو جو خصوصیت حاصل ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ وہ اس وفد کا سردار ہے بخدا! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بیعت قبول کر لینے میں تمھیں کیا پس و پیش ہو رہا ہے انصار و مہاجر سب ایک ہی طرح کی چڑیاں ہیں اور اللہ ہی کو معلوم ہے کہ کہیں یہ لوگ کوئی سازش در پردہ تو نہیں کر رہے؟

عبداللہ ابن زبیر نے تُرش رو ہو کر کہا " پھر تم کو کیا؟ جب تک میں یہاں ہوں جو چاہوں گا سو کروں گا۔ یہاں میں ایسا ہی محفوظ ہوں جیسے کہ سامنے جو کبوتر بیٹھا ہے اس حرم میں محفوظ ہے۔ تم اس کبوتر کو نہیں مار سکتے، اور اگر بیت الحرام کی حرمت کو تلف کرو گے تو سخت گناہ میں مبتلا ہو گے"

ابن عضاہ بولا، کیا تم سمجھتے ہو کہ اس میں مجھے کچھ تردد ہو گا؟ اتنا کہہ کر اپنے

لہ کتاب البلدان - احمد ابن ابی یعقوب صفحہ ۶۲

اپنے غلام کی طرف اشارہ کیا جو ہتھیار لیے کھڑا تھا اور اُس سے تیر کمان مانگا۔ غلام نے فوراً کمان اور ترکش دیا۔ ابن عضاۃ نے ترکش میں سے ایک تیر نکالا، اور کمان میں لگا کر کبوتر کی شست باندھی اور کہا "اے کبوتر بتا! کیا یزید ابن معاویہ شراب خوار ہے؟ اگر تو نے ہاں کہا تو یہی تیر، جہاں تو بیٹھا ہے تجھے بیندھ دے گا۔ اے کبوتر! بتا کیا تو یزید کے خلع خلافت کی فکر میں بیٹھا ہے؟ کیا جماعت اسلام سے تو اُس کو علیحدہ کرنے کی فکر میں ہے؟ کیا تجھے اس پر بھروسا ہے کہ یہ حرم ہے؟ کہہ کہ یہی تیرے دل میں ہے، پھر یہ تیر تجھ پہ چلے گا"

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے کہا "تم جانتے ہو کہ یہ پرند بے زبان ہے تمہارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔" حضرت عبداللہؓ نے یہ بات دل میں کسی قدر بےچین ہو کر کہی تھی۔

ابن عضاۃ بولا "یہ سچ ہے کہ یہ پرند بے زبان ہے اور جواب نہیں دے سکتا مگر تم تو جواب دے سکتے ہو۔ ابن زبیر سنو! میں قسمیہ کہتا ہوں کہ تم کو یزید کی بیعت کرنی ہوگی خواہ خوشی سے خواہ کراہ سے۔ ورنہ تم دیکھو گے کہ اس وادی میں بنی الشعر کا رائت اڑتا ہوگا۔ جس خیال میں تم ہو اُس کا مجھے ذرا پاس و لحاظ نہ ہوگا۔" ان الفاظ پر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کا رنگ فق ہو گیا، کیونکہ اُن کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ حرم کی بے حرمتی کی جرأت کسی شخص کو ہو سکتی ہے، خواہ وہ شامی ہی کیوں نہ ہو انھوں نے ابن عضاۃ سے حیرت زدہ ہو کر پوچھا "کیا تم فی الحقیقت اس متبرک زمین پر خون ریزی کے مرتکب ہو سکتے ہو؟"

ابن عضاۃ نے جواب دیا "ہاں اور اس کا عذاب اُس پر ہوگا جس نے بیت الحرام کو امیرالمومنین کے خلاف بغاوت کرنے کے لیے منتخب کیا"[۱]

اگر ابن زبیر اُس وقت اس بات کو سمجھ لیتے اور اس کا پورا یقین کر لیتے کہ

---

[۱] آغانی ۱-۱۸

ابن عفناۃ جو کچھ کہہ رہا ہے، یہی خیال اس کے ہمعصر ساتھیوں کا بھی ہے، تو شاید بہت سی مصیبتیں اسلام پر سے اور خود حضرت ابن زبیرؓ پر سے ٹل جاتیں۔ لیکن ابن زبیرؓ کو بھی اسی طرح ہلاک ہونا تھا جس طرح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے داماد اور نواسے ہلاک ہوئے تھے، اور جس طرح آپ کے صحابہ اور انصار ہلاک ہونے والے تھے اور ان پر وہ آفات اور مصائب ٹوٹنے والے تھے جن کی مثال ملنی ممکن نہ تھی بہر حال ابن زبیر کی ساعت بھی آئی نہ تھی مشیت میں یہ تھا کہ مدینہ خود تباہ ہو کر، اور اپنے رہنے والوں کو جلاوطن اور قتل ہوتے دیکھ کر اس . . . . . . عزت کا معاوضہ دے جو پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ہاں پناہ دے کر حاصل کی تھی، اور اسلام کے سچے ہادیوں کو پیدا کیا تھا . . . . جنھوں نے اسلام کا نام لے کر کل عرب کو فتح کیا اور . . . . . . [1]

---

[1] یہاں مصنف نے اصحاب و انصار کے جھوٹی ہمدردی کے پردے میں تعصب کا زہر اگلا ہے دنیا میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ بڑے لوگ اپنے خیال سے کسی حالت میں بھی نہیں ٹلتے ہیں۔ رومن سلطنت میں اگر ایسے لوگ نہ ہوتے جو بتوں پر دھونی چڑھانے سے انکار کرتے تھے، تو آج مسیحی کلیسا کے شہیدان باوفا کی فہرستیں کوری نظر آتیں۔ خلاصہ مصنف کی عبارت کا یہ ہے کہ حضرت ابن زبیرؓ اگر یزید کی بیعت قبول کر لیتے تو مدینہ تباہ نہ ہوتا، اور صحابہ و انصار پر وہ مصیبتیں نہ ٹوٹتیں جو ان پر ٹوٹیں۔ مگر اس نتیجہ کو بھی مصنف نے بر نظر احتیاط شاید کے لفظ سے مشروط کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ اعتراض بیجا کے سوا اور کوئی غرض اس بلاغت کی نہ تھی (مترجم)

کتاب اوّل

خانہ جنگی

(۵۱)

پانچویں فصل

مدینہ کا محاصرہ ۔ واقعہ حرّہ

ہجرت نبوی کا باسٹھواں سال ہے ۔ شہر طبریہ کے مغرب میں پہاڑوں کے سلسلے کے پیچھے آفتاب غروب ہو چکا ہے ۔ طبریہ ایک پرانا شہر ہے ، اُس کی شوکتِ ماضی کا حال اس کے کھنڈروں سے ظاہر ہے ۔ لیکن جس نزہلنے کا ذکر ہم کرتے ہیں اُس وقت یہ شہر صوبہ اُردن[1] کا دار الحکومت تھا ۔ اور یزید بن معاویہ یہاں عارضی طور پر مقیم تھا ۔ مساجد کے مینار اور قلعے کے برج اور کنگورے چاند کی روپہلی روشنی سے منور ہو کر اپنا عکس بحرِ طبریہ میں ڈال رہے ہیں ، جس کے کنارے یہ شہر آباد تھا ۔ یہ بحیرہ عیسائیوں کی بہت

---

[1] دریائے اردن سے مغرب میں موجودہ فلسطین کا وسطی حصہ علاقہ اردن سے تقریباً مطابق ہوتا تھا شام کے پانچ جند یا اضلاع دمشق ، حمص ، قنسرین اور فلسطین تھے (دیکھو جی ۔ لی ۔ سٹرینج کی کتاب " بلادِ شام " مطبوعہ ۱۸۹۰ء صفحات ۲۴ اور اُن کے بعد)

مقدس روایات کو یاد دلاتا ہے۔ غرض یہ وقت اور حال تھا کہ ایک مختصر سا قافلہ شب کی خنکی میں سفر کے قصد سے شہر سے نکلا اور جنوب کی راہ اختیار کی۔ آگے آگے سواروں کا ایک دستہ تھا، اور اس کے پیچھے گھوڑوں پر سوار نو مسافر تھے۔ یہ لوگ بیشک صاحب وقار تھے، لیکن اُن کی صورتوں میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے معلوم ہوتا کہ دربارِ خلافت سے اُنہیں تعلق ہے، کیونکہ خلیفۂ وقت ایسے لوگوں سے جو مُسن ہوں اور جن کی صورتیں بھی خشک اور سخت ہوں، بہت کم اخلاص رکھتا تھا۔

کچھ دیر تک قافلہ والے چُپ چاپ چلتے رہے۔ ایک لفظ بھی کسی نے منہ سے نہ نکالا۔ آخر کار مسافروں میں سے ایک شخص نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا "بھائیو! بتاؤ، اب اِس شخص کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے، کم سے کم اتنا تو ضرور اقرار کرنا ہوگا کہ وہ ہمارے ساتھ سخاوت سے پیش آیا، اے عبداللہ ابنِ حنظلہ! کیا آپ کو اُس نے ایک لاکھ درہم نہیں دیے؟

ابن حنظلہؓ بولے: "ہاں دیا تو اِتنا ہی ہے، مگر وہ شراب پیتا ہے اور شرابخواری کو گناہ نہیں سمجھتا، بانسری بجاتا ہے، دن کو اُس کے ساتھی شکاری کتے اور رات کو اُس کے جلیس اوباش لوگ ہوتے ہیں۔ اُس کو . . . . . . سے پرہیز نہیں۔ اور وہ کبھی نماز نہیں پڑھتا، یہ بالکل ثابت ہے کہ اُسے مذہب سے مطلق بہرہ نہیں اب بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسے شخص کو ہم زیادہ دن تک گوارا کر سکتے ہیں، جس قدر تحمل ہم نے اس وقت تک کیا ہے وہ بھی نہ کرنا چاہیئے تھا، اگر ہم اسی حالت پر رہے تو اندیشہ ہے کہ آسمان سے پتھر نہ برسنے لگیں جن سے ہم سب غارت ہو جائیں۔ اے ابن سنان! فرمایئے، آپ کی کیا رائے ہے؟"

معقلؓ بن سنان اشجعی نے جواب دیا۔ "ہمیں مدینے پہنچ کر اس بات کا عہد کرنا چاہیے کہ اس فاسق . . . کی اطاعت ہم ہرگز نہ کریں گے۔ اِس عہد کے بعد مناسب ہوگا کہ کسی مہاجر کے فرزند کے ہاتھ پر ہم بیعت کر لیں۔"

معقلؓ یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ ایک شخص سامنے سے آتا ہوا قریب سے گذرا

جس سمت کو قافلہ جا رہا تھا اُسی سمت سے یہ شخص اس طرف کو آرہا تھا۔ قافلہ والے اپنی گفتگو میں جو رفتہ رفتہ تیز ہوتی جاتی تھی اگر بالکل منہمک نہ بھی ہوتے تو بھی اس شخص کی طرف نگاہ ڈال کر اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتے تھے۔ کیونکہ عبا کا اوپر کا حصّہ اُس کے سر پر اس طرح پڑا ہوا تھا کہ چہرہ کسی کو نظر نہ آسکتا تھا۔ جب قافلہ کے لوگ کچھ دور آگے بڑھ گئے تو یہ شخص چلتے چلتے ٹھہرا، اور پیچھے مڑ کر قافلہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی صورت ایسی تھی کہ ایک عرب کے نزدیک کسی راہ گیر کا اُسے راستے میں دیکھنا بڑا نحس تھا۔ یہ آدمی ایک آنکھ کا تھا، مگر اس آنکھ سے بھی جو تیز نگاہ تیر کی طرح اس نے قافلہ والوں پر ڈالی، اُس میں غضب کی خونخواری اور عداوت بھری تھی۔ اس نگاہِ قہر کے ساتھ اُس نے منہ سے بھی یہ الفاظ کہے "اگر پھر تو مجھے وہاں ملا جہاں میں تجھے قتل کر سکوں تو ہرگز تجھے زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اے ابن سنان! گو صحابہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں تیرا شمار ہے۔ لیکن آج جو بات میرے منہ سے نکلی اُسے اچھی طرح سمجھے رہنا۔"

ظاہر ہے کہ اس شخص نے قافلہ والوں کو پہچان لیا کہ وہ مدینے کے لوگ ہیں اور بات بھی یہی تھی کہ یہ سب اشرافِ مدینہ فرزندانِ مہاجرین یا فرزندانِ انصار تھے۔ اب ہمیں وہ حالات بیان کرنے چاہئیں جن کے سبب سے مدینے کے یہ لوگ یزید کے دربار میں گئے تھے۔

مدینے میں بغاوت کے آثار ظاہر ہو چلے تھے۔ کھیتی کی بعض زمینوں اور چند کھجور کے باغوں کی نسبت جو کسی زمانے میں امیر معاویہ نے مدینہ والوں سے خریدے تھے سخت نزاع پیدا ہو گئے تھے۔ مدینے والے کہتے تھے کہ یہ چیزیں اُن کو واپس دی جائیں کیونکہ وہ اُن سے جبراً خریدی گئی تھیں، اور اصلی داموں سے سَو درجہ کم اُن کی قیمت دی گئی تھی۔ عثمان بن محمد بن ابوسفیان اس وقت مدینہ کا امیر تھا اُس کو یہ خیال ہوا کہ یزید میرا ابنِ عم ہے ان مقدمات کے فیصلے کی کوئی سبیل نکال دے گا، اور یزید کو یہ موقع بھی مل جائے گا کہ عمدہ اخلاق اور احسان و کرم سے

وہ مدینے والوں کا دل بھی اپنے قابو میں کرلے۔ غرض یہ باتیں سوچ کر عثمان بن محمد نے اہل مدینہ کو رائے دی کہ وہ ایک وفد طبریہ کو لے جائیں جہاں یزید اس وقت مقیم تھا۔ مدینے والوں نے اس رائے کو پسند کرکے اس پر عمل کیا۔

امیر مدینہ عثمان کی نیک نیتی میں کسی کو کلام نہیں، مگر اُس نے اتنا نہ سوچا کہ اس تدبیر کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہ ہوسکتا تھا کہ شرفاء مدینہ یزید کے فسق و فجور کو دیکھ کر مدینے واپس آئیں، اور ان باتوں کو بطور چشم دید واقعات کے مدینے والوں کے سامنے انہیں سرکشی پر آمادہ کرنے کے لیے بیان کریں۔ امیر مدینہ کی فی الحقیقت یہ بڑی غلطی تھی۔ اُس کا فرض تو یہ تھا کہ اگر مدینے والے خود بھی یزید کے پاس جانے کا قصد کرتے تو انہیں منع کر دیتا۔

یہ معاملات وہ تھے جن کا اندازہ پہلے ہی آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ یزید نے اہل وفد کی جس قدر خاطر تواضع کی وہ دل سے تھی۔ اس میں اخلاق اور حسنِ سلوک شامل تھا، ان لوگوں کو اس نے خلعت اور جائزے دیئے، چنانچہ انصار میں عبداللہؓ کو جو حنظلہؓ کے فرزند تھے ایک لاکھ درہم، اور وفد کے باقی لوگوں میں سے ہر ایک کو حسب حیثیت دس دس یا بیس بیس ہزار درہم دیے، مگر یزید کو اپنی حرکتوں میں کسی کا لحاظ یا کسی کی شرم آتی نہیں، اور اُسکے دربار والے بھی پرہیزگاری اور پارسائی کا نمونہ نہ تھے جب اُس کا لہو ولعب اور اہل بادیہ سے جو اکثر موقعوں پر قزاقوں سے کچھ کم نہ ثابت ہوتے تھے اس کے تعلقات دیکھے تو مدینے کے اِن بزرگوں کو جو پارسائی اور پاکیزہ نفسی کی مثال تھے اور اہل بادیہ کے قدرتی دشمن تھے نہایت ناگوار ہوا۔

جب یہ بزرگ مدینے واپس آئے تو یزید کی برائیوں کو کم کرکے بیان کرنے کی جگہ جو کچھ حالات اس کے دیکھے یا سُنے تھے انہیں زیادہ کرکے بیان کیا۔ خوف خدا سے متاثر ہو کر غصے اور جوش میں یزید کو سخت مجرم اور گنہگار بنایا۔ اُن کے بیانات سے ایسے لوگوں کے دلوں پر جو یزید کی نسبت پہلے ہی سے ہر بُری سے بُری بات پر یقین لے آنے کے لیے آمادہ تھے، بہت اثر ہوا۔ چنانچہ مسجد میں عجب حالت پیش آئی

جس وقت لوگ مسجد میں جمع ہوئے تو اہل وفد میں سے ایک صاحب نے کہا "میں یزید کو اپنے سے ایسا ہی دُور کرتا ہوں جیسے اپنے سر سے اس عمامے کو" اور اتنا فرما کر سر سے عمامہ اُتار کر زمین پر پھینک دیا، اور یہ بھی کہا کہ "بیشک اُس نے مجھ کو انعام اور جائزہ دیا لیکن یزید شراب خوار ہے اور اللہ کا دشمن ہے"۔ ایک دوسرے صاحب کھڑے ہوئے اور کہا "میں یزید کو اپنے سے اس طرح دور کرتا ہوں جیسے پاؤں سے اس نعلین کو"۔ تیسرے صاحب بولے کہ "میں یزید کو اس طرح برطرف کرتا ہوں جیسے گلے سے اس قبا کو" چوتھے پکارے کہ "میں یزید کو اس طرح دفع کرتا ہوں جیسے اس جوتے کو"۔ دیگر حاضرین مسجد نے بھی یزید سے اسی طرح قطع تعلق کیا، اور تھوڑی دیر میں صحنِ مسجد میں جگہ جگہ عماموں، قباؤں اور نعلین کی ڈھیریاں لگ گئیں۔

(۶۳ھ) غرض اس طرح خلعِ خلافتِ یزید کے مسئلہ کا فیصلہ کر کے ان لوگوں نے مدینہ میں جس قدر بنی اُمیہ رہتے تھے اُن کو شہر بدر کرنے کا مصمم قصد کر لیا۔ چنانچہ بنی اُمیہ کو حکم دیا گیا کہ وہ بلا تاخیر شہر سے نکل جائیں۔ لیکن اس حکم کے دینے سے پہلے انہوں نے بنی امیہ سے اس بات کا عہد و میثاق لے لیا کہ "وہ کسی غنیم کی جو مدینے پر یورش کرے مدد نہ کریں گے، بلکہ اگر کوئی ایسا کرے تو اُسے پیچھے ہٹا دیں گے، اور اگر اپنے بس کی بات ہوئی تو لشکرِ شام کے ساتھ وہ ہرگز مدینے میں داخل نہ ہوں گے"۔

مدینے کے امیر عثمان بن محمد بن ابو سفیان نے (جو بنی امیہ میں سے تھا) مدینے والوں کو بہت سمجھایا کہ "دیکھو مجھے شہر سے نکال کر تم بڑے خطروں میں پڑ جاؤ گے، کیونکہ تھوڑی ہی مدت میں ایک لشکر جرار تم کو مغلوب کرنے یہاں آئیگا اس وقت تم کو یہ کہنا غنیمت ہو جائیگا کہ کم سے کم مدینے کے امیر کو تو تم نے شہر سے نہیں نکالا تھا۔ اگر تمہیں اپنی ہی بات پر اصرار ہے تو جب تک تم کو فتح نہ ہو جائے اُس وقت تک مجھ کو مدینے ہی میں رہنے دو، یہ نصیحت میں تم کو تمہارے ہی فائدے

کے لیے کرتا ہوں، اپنے فائدے کے لیے نہیں کرتا، میں خوشی سے اس بات پر آمادہ ہوں کہ تمہارا خون نہ بہنے دوں۔ لیکن مدینے والوں نے اس معقول بات کو ماننے کی بجائے عثمان بن ابوسفیان اور یزید کو سخت شب و شتم کیا۔ اور عثمان سے کہا کہ "ہم تجھی سے ابتدا کریں گے اور تجھے نکالنے کے بعد تیری قوم والوں کو نکالیں گے۔" بنی امیہ جو مدینے میں رہتے تھے یہ سُن کر سخت برہم ہوئے۔ مروان بولا کہ "یہ کیا نامعقول حرکت ہے"۔ ایک وقت وہ تھا کہ مروان حضرت عثمان کا ندیم اور مدینے کا امیر رہ چکا تھا۔ مگر اب وہ سخت پریشان تھا اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے بیوی بچوں کو کس کے سپرد کر کے شہر سے نکلے۔ بنی امیہ کی حالت اس وقت بہت خستہ تھی۔ مگر کیا کرتے جن باتوں کا عہد لیا گیا ان کا عہد کر کے شہر سے نکلے۔ نکلتے وقت شہر کے لوگ ایک شور برپا کرتے ہوئے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ بعض نے ان دیس نکالوں کو پتھر مارے اور ایک مولیٰ نے جس کا نام حریث تھا اور جو لنگڑے ہونے کی وجہ سے اچھل اچھل کر چلتا تھا۔ بنی امیہ کے اونٹوں کو جن پر وہ سوار تھے، مارنا اور پیٹنا شروع کیا۔ غرض اس صورت سے مدینہ والوں نے بنی امیہ کو جو اُس وقت تک حکومت اور اقتدار رکھتے تھے مجرموں کی طرح شہر بدر کر دیا۔ بنی امیہ کسی طرح ذوخشب تک پہنچے اور وہاں قیام کر کے منتظر ہوئے کہ دیکھئے مدینے سے ان کی نسبت اور کیا حکم آتا ہے۔

ذوخشب پہنچتے ہی پہلا کام بنی امیہ نے یہ کیا کہ ایک قاصد اس خبر اور درخواست کے ساتھ کہ اُن پر مدینے میں کیا کیا آفات گذری ہیں اور آئندہ آفات سے بچنے کے لیے اُن کی فوراً مدد کی جائے، یزید کی طرف روانہ کیا۔ اس قاصد کی روانگی کی خبر مدینے والوں کو ہو گئی، چنانچہ فوراً پچاس سوار مدینے سے یہ قصد کر کے نکلے کہ بنی امیہ کو ذوخشب سے بھی باہر نکال دیں۔ بدلہ نکالنے کے لیے حریث نے یہ موقع بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ (۵۵)
بنی حزم سے میں سے ایک شخص کی مدد سے (بنی حزم، انصار کا ایک خاندان تھا جس نے بلوائیوں کو اپنا مکان دیکر حضرت عثمانؓ کے وقوعۂ قتل میں مدد پہنچائی تھی) حریث نے مروان کے اونٹ کو جس پر وہ سوار تھا، مارنا شروع کیا۔ اُونٹ ایسا چمکا کہ مروان گرنے کو ہو گیا۔ کچھ

تو اونٹ پر ترس کھا کر اور کچھ اپنی جان کے خوف سے مروان اونٹ کی باگیں چھوڑ کر اس کی پیٹھ پر سے یہ کہتا ہوا کہ "عزیب اونٹ، تو تو اپنی جان کسی طرح بچالے" نیچے کود پڑا۔

بنی امیہ ذو خشب سے نکل کر سویدا[1] کے گاؤں میں پہنچے تو وہاں مروان کا ایک آزاد غلام رہتا تھا۔ اس نے مروان کو اپنے گھر بلا کر کھانا کھلانا چاہا۔ مروان نے کہا یہ "لنگڑا احریث مجھے تمہارے پاس کب ٹکنے دیگا، خدا نے چاہا تو اس خبیث پر ایک دن ہمارا قابو بھی چلے گا، پھر ہمارا قصور نہ ہوگا کہ اس کے ہاتھ پر بھی وہی گذرے جو اس کے پاؤں پر گذرا ہے۔" بنی امیہ جب وادی القری[2] میں پہنچے تو مدینے والوں نے وہاں قیام کرنے کی اُن کو اجازت دیدی۔

اسی اثناء میں خود مدینے والوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ جب تک بنی امیہ کو مدینے سے نکالنے، انہیں ذلیل کرنے، اور آزار پہنچانے کا سوال درپیش رہا مدینہ والوں میں بالکل اتحاد اور اتفاق رہا، لیکن جب کسی کو خلیفہ منتخب کرنے کا وقت آیا تو صورت دوسری پیدا ہو گئی۔ قریش کہنے لگے کہ ہم مہاجرین میں سے کسی کو خلیفہ مقرر نہ کریں گے، اور مہاجرین کہنے لگے کہ ہم قریش میں سے کسی کو خلیفہ منتخب نہ کریں گے، مگر اتفاق و یک جہتی اس وقت ضروری تھی، اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ انتخاب خلیفہ کے مسئلہ کو اس وقت ملتوی کر کے ہر قبیلہ کا ایک ایک شیخ مقرر کر دیا جائے۔ خلیفہ کا انتخاب، یزید کو حکومت سے علیحدہ کرنے کے بعد کیا جائے گا۔ قاصد جسے بنی امیہ نے یزید کے پاس بھیجا تھا، اب یزید کے پاس پہنچ گیا، اور کل حالات جو پیش آئے تھے وہ بیان کیے۔ جب یزید نے کل حالات سُن لیے تو اس کو مدینہ کے سرکشوں پر اتنا غصہ نہیں آیا جس قدر بنی امیہ پر

---

[1] یہ مقام مدینہ طیبہ سے تقریباً ۶۰ میل کے فاصلہ پر سمت شمال مغرب میں ہے۔

[2] یہ مقام سویدا سے ۱۰ میل شمال میں تھا۔

غصہ آیا اس نے قاصد سے پوچھا "کیا بنی امیہ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ایک ہزار آدمی مقابلے کے لیے اپنے موالی[1] میں سے جمع کر لیتے؟"

قاصد۔ یقیناً وہ ۳ ہزار آدمی بلا دقت جمع کر سکتے تھے۔

یزید۔ پھر اس قدر آدمیوں کے ہوتے ہوئے بنی امیہ سے یہ نہ ہو سکا کہ ایک ساعت بھی دشمن کا مقابلہ کرتے۔

قاصد۔ دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، مقابلہ بیکار ہوتا۔

اگر یزید کو اس بات پر غصہ آتا اور یہ غصہ اس کا بجا ہوتا کہ مدینے میں یہ ہنگامہ اُن لوگوں نے کیا ہے جو اس سے بڑے بڑے انعام اور جائزے بلا عذر لے چکے ہیں تو وہ ان کی پاداش کے لیے فوجیں فوراً روانہ کر دیتا، لیکن یزید کی اب تک یہی خواہش تھی کہ مدینے کے لوگوں سے کوئی جھگڑا نہ ہو۔ شاید اس کو رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ فرمانا یاد آتا ہو کہ "خدا اور ملائکہ اور انسان کی لعنت اُس پر ہوگی جو مدینے کے لوگوں پر تلوار اٹھائیگا"۔ بہر کیف یہ دوسرا موقع تھا کہ اس نے نرمی سے کام لیا، اور یہ نرمی اس وجہ سے اور بھی عجیب تھی کہ حلم یزید کی طبیعت کا خاصّہ نہ تھا۔ (۵۶)

غرض اس خیال سے کہ سختی نہ ہو اس نے نعمان بن بشیر کو جو انصاری تھے مدینے روانہ کیا (تاکہ وہ اپنی قوم والوں کے غیظ و غضب کو دھیما کریں اور پوچھیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں) نعمان بن بشیر مدینے گئے مگر ان کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں۔ یہ سچ ہے کہ انصار مدینہ نے اپنے ہم قوم نعمان کی نصیحت کو سُنا ضرور، اور یہ بھی کہا کہ ہم بیشک اس قدر کم اور کمزور ہیں کہ شام کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے، لیکن قریش لڑائی کے سوا کچھ اور چاہتے نہ تھے۔ چنانچہ سردار قریش عبداللہ بن مطیع نے نعمان انصاری سے کہا "اے نعمان تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کیوں ہماری جماعت قریش اور انصار میں تفرقہ پیدا

---

[1] جو غلام آزاد ہونے کے بعد بذریعہ ولا اپنے آقائے سابق کے قبیلہ کا آدمی سمجھا جاتا تھا اسے مولیٰ کہتے تھے۔ مولیٰ کی جمع موالی ہے۔

کرنے آئے ہو۔ خدا نے جو ہمارا کام اس وقت بنا دیا ہے اس میں کیوں خلل ڈالتے ہو؟" نعمان نے جواب دیا "اس وقت تو بڑے دلیر اور بہادر بنتے ہو، لیکن جب شامیوں کا لشکر مدینے کے دروازوں پہ پہنچے گا تو مجھے معلوم ہے کہ تم اس وقت کیا کرو گے، تیز سے تیز خچر جو ہاتھ لگے گا اس پر سوار ہو کر مکے بھاگ جاؤ گے اور ان بیچارے انصار کو اس مصیبت میں چھوڑ جاؤ گے کہ گلیوں میں، مسجدوں میں، اور گھروں کی دہلیزوں پر اُن کی لاشیں کٹی پڑی ہوں گی۔"

آخر کار جب نعمان بن بشیر نے دیکھا کہ مدینے والے کسی طرح نہیں مانتے تو وہ مجبور ہو کر یزید کے پاس واپس چلے گئے۔ اور مدینے میں جو کچھ پیش آیا تھا یزید کے سامنے بیان کر دیا۔

یزید نے سن کر کہا "اچھا۔ یہ ہے تو یونہی سہی، اب ضروری ہوا کہ شامی سواروں کے گھوڑوں کے سُموں سے انہیں روند ڈالوں۔"

بارہ ہزار فوج جس کا حجاز روانہ کرنا تجویز ہوا تھا اُسے مکہ اور مدینہ دونوں شہر فتح کرنے تھے۔ یزید نے جس شخص کو اِس فوج کا سردار مقرر کرنا چاہا تھا، وہ حال ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ اس لیے بہت سے لوگ اس شوق میں سرداری کے امیدوار بن گئے کہ مدینہ اور وہاں کے سرکش رئیسوں کو غارت کرنے کا موقع انہیں ملے گا۔ یزید نے ابھی تک اس فوج کی سرداری کے لیے کسی کو منتخب نہیں کیا تھا کہ ایک دن ایک شخص جو لڑائی کے فن میں بڑا ماہر تھا حاضر ہوا۔ یزید نے فوراً اُسے امیر لشکر مقرر کر دیا اور یہ شخص وہی یک چشم مسافر[ف] تھا جس سے طبریہ والی سڑک پر ہماری ملاقات ہوئی تھی۔

کوئی شخص جس کے سینے میں جاہلیت کی روایات اور زمانۂ بت پرستی کے اصول بدرجۂ غایت محفوظ ہوں مسلم بن عقبہ مری یا مزنی سے بڑھ کر نہ تھا۔ اسلام کی پرچھائیں تک اس پر نہ پڑی تھی، اور جن باتوں کو مسلمان مقدس اور متبرک سمجھتے تھے اس کی نگاہ میں ان کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ امیر معاویہ جب وہ زندہ تھے اس شخص کے

ف مسلم بن عقبہ

خیالات سے خوب آگاہ تھے، اور یزید سے کہہ گئے تھے کہ مدینے والوں نے اگر کبھی سر اٹھایا تو مسلم بن عقبہ سے بہتر آدمی ان کی سرکوبی کے لیے کہیں نہ ملے گا۔ مسلم کو رسالت سے انکار تھا، بت پرستوں کی بعض باتوں کا البتہ معتقد تھا، مثلاً خواب میں آئندہ کے حالات معلوم ہو جانے کا یقین رکھتا تھا۔ اور غرقد جو ایک قسم کی جھاڑی تھی جب اس میں سے کوئی بات سنائی دیتی تھی تو اسے بالکل سچ سمجھتا تھا۔ غرض مسلم بن عقبہ جب امیدوار بن کر یزید کے سامنے آیا تو اس نے اپنے عقیدے کے مطابق یزید سے کہا کہ "مدینہ کی فتح کے لیے اگر آپ نے کسی اور کو بھیجا تو وہ ناکام رہے گا، سوائے میرے دوسرا کوئی اس شہر کو فتح نہیں کر سکتا، کیونکہ میں نے خواب میں کانٹوں کی ایک جھاڑی دیکھی ہے جس میں سے آواز آتی تھی "مسلم کے ہاتھ سے" جب میں جھاڑی کے قریب گیا تو پھر آواز آئی کہ "جو شخص خونِ عثمانؓ کا بدلہ مدینے کے لوگوں اور عثمانؓ کے قاتلوں سے لے سکتا ہے وہ سوائے تیرے دوسرا نہیں ہے۔" یہ بیان سن کر یزید کو یقین ہو گیا کہ ابن عقبہ ہی وہ آدمی ہے جس کی اس وقت ضرورت ہے۔ چنانچہ جو فوج حجاز کے لیے تجویز ہوئی تھی اس کا سردار مسلم بن عقبہ کو مقرر کر دیا، اور اس کو ہدایت کر دی کہ "اہل مدینہ پر حملے سے پہلے تین دن کی مہلت ان کو دینا کہ اس میں اگر وہ چاہیں تو اطاعت قبول کر لیں۔ اگر اس مدت میں وہ ایسا نہ کریں اور تم کو فتح ہو جائے تو تین دن تک شہر کو لوٹنے دینا۔ اس لوٹ میں جس قدر روپیہ یا سامانِ خوراک یا ہتھیار لشکر والوں کے ہاتھ آئیں، وہ سب انہی کا مال سمجھا جائے۔ تین دن شہر کے لٹنے کے بعد مدینے والوں سے میری غلامی کی بیعت لینا، جو شخص بیعتِ غلامی سے انکار کرے، اس کو بلا تامل قتل کر دینا۔" اسی لشکرِ شام میں ابن عضاة بھی تھا، جس کی گفتگو ابنِ زبیرؓ کے ساتھ ہم ابھی نقل کر چکے ہیں۔ شام سے روانہ ہو کر لشکر بغیر کسی حادثے کے وادیُ القریٰ پہنچ گیا۔ جہاں بنی امیہ مدینہ سے نکلنے کے بعد ٹھہرے ہوئے تھے۔ مسلم بن عقبہ نے پہنچتے ہی بنی امیہ کو بلایا، اور ان میں سے ایک ایک سے مل کر صلاح پوچھی کہ شہر پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے بہترین تدبیر کیا ہوگی؟ عمرو پسر حضرت عثمانؓ سے مسلم نے جب یہ سوال کیا تو انہوں نے اپنے اس عہد

و میثاق کو جو مدینے والے ان سے لے چکے تھے، توڑنے سے انکار کر دیا۔ مسلم اس پر بہت بگڑا اور جھلا کر بولا "عمرو، اگر تم حضرت عثمان رضؓ کے فرزند نہ ہوتے تو ابھی تمہارا سر قلم کر دیتا۔ خیر تمہیں تو زندہ چھوڑے دیتا ہوں، لیکن اگر کسی اور قریشی نے مدد یا مشورہ دینے سے انکار کیا تو اُسے فوراً قتل کر دونگا۔"

اب نوبت اس کی آئی کہ مروان سے بھی مشورہ کیا جاتا۔ مروان کو اپنا عہد توڑنے میں تامل تھا، لیکن جان کا بھی خوف ہوا، کیونکہ مسلم جو کچھ زبان سے کہتا تھا وہی کرتا بھی (۵۸)
تھا۔ اس کے علاوہ مروان کو مدینے والوں سے اس قدر سخت پرخاش تھی کہ انتقام کے موقع کو ہاتھ سے دینا بھی ناگوار تھا۔ آخرکار ایک بات اُسے ایسی سوجھی جس سے خدا سے بھی معاملہ بخوبی طے ہو جائے اور عہد کے کسی لفظ کے خلاف بھی کوئی بات نہ ہو، یعنی قسم بھی پوری ہو جائے اور اپنا مطلب بھی نکل آئے، اس نے اپنے بیٹے عبدالملک کو بلایا۔ عبدالملک نے مدینے والوں سے کوئی عہد نہ کیا تھا۔ بس اس سے کہا کہ تم مسلم پر یہاں کے حالات ظاہر کر دو، اور مسلم کے پاس میرے جانے سے پہلے پہنچ جاؤ، ممکن ہے کہ جب تم ہی سے سب حالات اس کو معلوم ہو جائیں تو پھر مجھ سے ملاقات کے وقت کچھ نہ پوچھے۔

غرض عبدالملک مسلم کے پاس پہنچا، اور اس نے مسلم کو یہ صلاح دی کہ مدینے سے قریب تر جو جھنڈ کھجوروں کے ملیں، اُن میں رات کو فوج ٹھیرا دی جائے۔ دوسرے دن فوج حرّہ کی جانب کوچ کرے۔ یہ مقام مدینے سے مشرق میں واقع تھا۔ مدینے والے ضرور شہر سے نکل کر حملہ کریں گے۔ اس صورت میں جب وہ شہر سے باہر آئیں گے تو سورج اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ عبدالملک نے اشارۃً مسلم سے یہ بات بھی کہہ دی کہ اس کا باپ مروان مدینے کے خاص خاص لوگوں سے اس قسم کی بات چیت کر سکتا ہے کہ لڑائی شروع ہونے پر وہ لوگ باقی شہر والوں سے منحرف ہو جائیں۔ مسلم بن عقبہ یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوا، اور کہنے لگا "واہ تمہارا باپ بھی عجب آدمی ہے" مسلم نے مروان کو اب اس کی تکلیف نہ دی کہ وہ اپنی قسم کو توڑتا، اور عبدالملک نے جو

مشورہ دیا تھا اسی پر عمل کیا اور مدینے کے مشرق میں اس سڑک پر جو کوفے کو جاتی تھی، اپنا لشکر اتار دیا۔ اور مدینے والوں سے کہلا بھیجا کہ تین دن کی مہلت دی جاتی ہے اس میں جو کچھ غور کرنا ہو غور کر لیں۔ تین دن گذر گئے۔ مدینے والوں نے جواب کہلا بھجوایا کہ ہم اطاعت قبول نہ کریں گے۔ اب جیسا کہ مروان کا خیال تھا وہی ہوا یعنی مدینے والے بجائے اس کے کہ شہر پناہ کے اندر رہ کر جس کی پوری مضبوطی کر لی گئی تھی دشمن کے حملے کا انتظار کرتے، خود ہی شہر پناہ سے باہر نکل آئے (۲۶ اگست ۶۸۲ء مطابق ۲۷ ذی الحجہ ۶۳ھ) مدینے کی فوج چار دستوں میں تقسیم کی گئی تھی۔ اور ان چار دستوں میں تین قسم کے لوگ تھے۔

مہاجرین (یعنی قریش جنھوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینے کو ہجرت کی تھی) یہ سب معقل بن سنان کی سرکردگی میں تھے۔ معقل رض رسول اللہ صلعم کے صحابی تھے اور فتح مکہ میں اپنی قوم بنی اشجع کے ساتھ رسول اللہ صلعم کے مددگار رہے تھے۔ مدینے میں ان کی بے انتہا عزت کی جاتی تھی۔ چنانچہ مہاجرین (قریش) نے اُن کو اپنا سردار بنایا تھا حالانکہ وہ اُن کی قوم کے نہ تھے۔

قریش۔ جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت نہیں کی تھی، بلکہ فتح مکہ کے بعد مختلف اوقات میں مدینے میں آن بسے تھے۔ ان قریشیوں کے دو حصے تھے ایک حصے کی سرداری پر عبداللہ بن مطیع تھے، اور دوسرے پر ایک صحابی (عبدالرحمن بن زہیر زہری) تھے۔

انصار۔ یہ چوتھا دستۂ فوج تھا جس کی تعداد سب سے زیادہ تھی۔ اس کی سرداری عبداللہ بن حنظلہ رض کو ملی تھی۔

مدینہ کا لشکر چپ چاپ حرہ کی طرف بڑھا، جہاں شامی لشکر صف بستہ تھا۔ شامی لشکر کا سردار مسلم بن عقبہ اس وقت بہت بیمار تھا۔ باوجود اس کے وہ کرسی پر بیٹھا تھا اور کرسی صفوں کے آگے رکھ دی گئی تھی۔ مسلم نے اپنا علم ایک رومی غلام کے سپرد کیا

اور اپنے لشکر والوں سے پکار کر کہا "اب دکھا دو کہ اپنے سردار کی کس طرح حمایت کی جاتی ہے، بڑھو۔"

لڑائی شروع ہو گئی۔ شامیوں نے مدینے والوں پر ایسا شدید حملہ کیا کہ اُن کی فوج کے تین حصے یعنی مہاجرین و الاحصہ اور قریش کے دونوں حصے بے ترتیب ہو گئے لیکن فوج کے چوتھے حصے نے، یعنی جس میں انصار تھے، شامیوں پر دھاوا کر کے ان کو پیچھے ہٹا دیا، اور اب شامی مجبور ہوئے کہ اپنے سردار مسلم کے گرد جمع ہو جائیں۔

جانبین نے اب شدت کی لڑائی شروع کی، جانباز و جری فضل بن عباس نے جن کے تحت میں صرف ۲۰ سوار تھے اور جو خود عبداللہ بن حنظلہؓ کی ماتحتی میں تھے، اپنے سردار سے کہا کہ جس قدر سوار اور ہیں، وہ کل ان کی ماتحتی میں دیدیے جائیں "اب میں شامیوں کی صفوں کو چیرتا ہوا مسلم تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں، اگر اس تک پہنچ گیا تو آج وہ نہیں یا میں نہیں" عبداللہ بن حنظلہؓ نے فضل بن عباس کی درخواست منظور کی اور فضل بن عباس نے کل سواروں کو ساتھ لے کر شامیوں پر نہایت تیزی و سرعت سے دھاوا کیا، اور للکارے کہ "اے عزیز دوستو! ایک دفعہ اور جی توڑ کر دھاوا کرو۔ واللہ اگر مسلم مجھ کو مل گیا تو آج کا دن اس کے لیے اور میرے لیے دنیا میں آخری دن ہوگا۔ نہ بھولو کہ فتح بہادروں کا حصہ ہے۔" سواروں نے بڑی شجاعت اور مردانگی سے پھر یلغار کی اور شامی سواروں کی صفیں چیرتے پھاڑتے وہاں پہنچ گئے جہاں مسلم بن عقبہ شامیوں کا سپہ سالار بیٹھا تھا۔ پانچ سو پیادہ فوج کی ایک جماعت اس کے گرد زمین پر گھٹنے ٹیکے دشمن کی طرف برچھیاں تانے اپنے سردار کی حفاظت کر رہی تھی، لیکن فضل بن عباس دائیں بائیں تلوار چلاتے اور گھوڑے کو دوڑاتے ہوئے دشمن کے عَلَم کے قریب پہنچ گئے اور علمبردار پر ایک ہاتھ تلوار کا ایسا دیا کہ اس کا سر اور سر کا خود کٹ گیا۔ علمبردار کے گرتے ہی فضل بن عباس نے پکار کر کہا "برب کعبہ، میں نے اہل ضلالت کے سردار کو قتل کر ڈالا۔"[1] مسلم بن عقبہ

---

[1] فضل بن عباس رومی غلام کو جو علمبردار تھا۔ مسلم بن عقبہ سمجھے۔ مترجم

نے کہا "تو جھوٹا ہے" یہ کہہ کر مسلم نے گو بیمار تھا عَلَم خود اٹھا لیا۔ اور لشکرِ شام کو للکار کر فضل پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ حکم کا دینا تھا کہ شامیوں نے فضل کو چاروں طرف سے گھیر لیا، اور آخر کار وہ لڑتے لڑتے زخموں سے چُور ہو کر جاں بحق ہو گئے۔

جس وقت مدینے والوں نے دیکھا کہ لشکرِ شام کی وہ فوجیں جو ابن عضاة کی سرکردگی میں ہیں، اور دشمن کا باقی لشکر بھی اُن پر دھاوا کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے تو انہوں نے دفعتاً شہر پناہ کے اندر اَللّٰہُ اکبر۔ اَللّٰہُ اکبر کے نعرے گونجتے ہوئے سُنے۔ حقیقت یہ ہے کہ دشمن نے مدینے والوں کو اس وقت بڑا ہی دھوکا دیا۔ مروان نے مسلم سے جو کچھ کہا تھا وہ کر دکھایا۔ بنی حارثہ سے جو شہر میں رہتے تھے مروان نے عطیات کا وعدہ کیا۔

(۱۷۰) بنی حارثہ اس لالچ میں آ گئے، اور انہوں نے خفیہ طور پر شامی سپاہیوں کو شہر میں داخل کر لیا۔ اب مدینہ دشمن کے ہاتھ میں تھا اور مدینے والے سب کچھ کھو بیٹھے۔ اب وہ کھلی تھی اور دھمکے تھے۔ مدینے کی فوجوں کے لوگ بھاگ کر شہر میں آئے کہ کسی طرح اپنے بیوی بچوں کو بچا لیں۔ بعض اُن میں سے جیسے کہ عبداللہ بن مطیع تھے مکے کی طرف چلے گئے لیکن سردار انصار عبداللہ بن حنظلہؓ نے یہ قصد کر کے کہ آج کے بعد زندہ رہنا عبث ہے انصار سے کہا کہ "فتح دشمن کو ہو گئی ہے، گھڑی بھر میں سب کچھ ختم ہونے والا ہے، اے پرہیزگار مسلمانو، اور اے مدینے کے رہنے والو! جنہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہاں پناہ دی تھی، ایک روز سب کو مرنا ہے۔ اور سب سے بہتر موت شہادت کی ہے، آؤ، آج ہی سب ختم ہو جاؤ۔ آج اللہ نے موقع دیا ہے کہ ایک نیک کام کے لیے ہم اپنی جانیں فدا کر دیں۔"

شام کے لشکر نے مدینے والوں پر تیر برسانے شروع کیے، عبداللہ بن حنظلہؓ ایک بار اور للکارے کہ "جو شخص سیدھا جنت میں جانا چاہتا ہے وہ اس عَلَم کے نیچے آ جائے" یہ سن کر سب دوڑے اور یہ ارادہ کر کے کہ اپنی جانیں تھوڑی قیمت پر نہ بیچیں گے۔ بڑی جوانمردی سے لڑے۔ عبداللہ بن حنظلہؓ نے اپنے ایک ایک فرزند کو گھمسان لڑائی میں بھیجا اور سب کو شہید ہوتے دیکھا۔ جس وقت مسلم یہ کہہ رہا تھا کہ جو شخص عبداللہ بن حنظلہ

کا سر لائیگا اس کو انعام میں اشرفیاں دوں گا۔ عبداللہ بن حنظلہؓ دائیں بائیں دشمنوں کے سر کاٹ کاٹ کر گرا رہے تھے، اور اُن کو اس بات کا یقین تھا کہ ان مقتولین کے لیے عاقبت میں سخت عذاب موجود ہے۔ عربوں کے دستور کے مطابق رجز پڑھتے جاتے تھے، اور اُن کا حال اُن شیفتگانِ دین کا سا تھا جن کو اپنے دین سے وابستگی اور دشمن دین سے قلبی عداوت ہوتی ہے۔ رجز پڑھتے تھے اور جس کا سر اڑاتے تھے اس سے یہ بھی کہتے تھے کہ "تو تو مرتا ہے لیکن تیرے گناہ تیرے بعد زندہ رہیں گے۔ اللہ نے اپنے کلام میں فرمایا ہے کہ گمراہوں کے لیے دوزخ تیار ہے"۔ آخر کار حضرت ابن حنظلہ کو دشمنوں نے بہت زخمی کر دیا۔ اُن کے اخیافی بھائی سخت مجروح ہو کر اُن کے قریب ہی گرے۔ بھائی سے اس حالت میں کہنے لگے کہ "ان شامیوں کے ہاتھوں سے قتل ہو کر مجھ کو جنت میں جانے کا ایسا یقین ہے کہ اگر کفارِ دیلم مجھے قتل کرتے تو اتنا یقین نہ ہوتا"۔ یہی اُن کے اخیر الفاظ تھے۔

خونریزی نہایت خوفناک ہوئی۔ مقتولین میں سات سو حفاظ قرآن اور اسّی[۸۰] صحابہ تھے۔ اُن بزرگوں میں سے جو جنگ بدر میں شریک رہے تھے اور جس میں پیغمبر خدا صلعم کو پہلی مرتبہ مکے والوں پر فتح حاصل ہوئی تھی، آج ایک صاحب بھی زندہ نہ بچے۔ جب مسلم نے شہر کو تین دن تک لوٹنے کا حکم دیا تو لشکری فتح کے نشے میں مست شہر میں داخل ہوئے، چونکہ گھوڑوں پر سوار تھے اس لیے لوٹنے میں مشکل واقع ہوتی تھی، اس لیے یہ لوگ مسجد نبوی کی طرف گئے اور اپنے گھوڑے وہاں باندھ کر پیدل ہو گئے۔ اس وقت سعید بن مسیب جو اس زمانے کے بڑے فقیہ تھے، مسجد میں تنہا موجود تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ شام والے مسجد میں گھس پڑے ہیں اور انھوں نے اپنے گھوڑوں کو ممبر اور مزار مبارک کے بیچ میں باندھا ہے۔ یہ وہ مقام تھا جسے آنحضرت صلعم نے "رَوضَةٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّةِ" فرمایا تھا۔ اس بے ادبی کو دیکھ کر سعید سمجھے کہ اب کوئی سخت عذاب اترنے والا ہے، چنانچہ وہ بالکل بے حس و حرکت حواس گم کردہ کھڑے رہے۔ شامیوں نے انہیں دیکھ کر کہا "ذرا دیکھنا اس کم عقل آدمی کو"۔ مگر لوٹ کی دھن سوار تھی، اس کے شوق میں آگے بڑھے اور سعید کو

کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔

مسلم بن عقبہ نے کسی کو نہ چھوڑا، بچوں کو قید کر کے غلام بنایا یا اُن کو قتل کر دیا عورتوں کی بے عزتی کی۔ کچھ زمانے کے بعد ایک ہزار عورتیں اتنے ہی بچوں کی مائیں ایسی تھیں جن کی اولاد کو ذلیل کرنے کے لیے "اولادِ حرّہ[1]" کہتے تھے۔

اسیرانِ جنگ میں معقلؓ بن سنان صحابی بھی تھے۔ یہ پیاس کی تکلیف سے پریشان تھے، مسلم نے ان کو طلب کیا اور بہت رحمدل بن کر پوچھا کہ "ابن سنان کیا تم پیاسے ہو؟" معقل بولے "ہاں" مسلم نے فوراً اپنے ایک ملازم کو حکم دیا کہ "خلیفہ نے جو شراب ہمیں دی تھی وہ انہیں پینے کو دو"۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور جو کچھ پینے کو دیا گیا تھا، معقلؓ نے پی لیا[2]۔ پھر مسلم نے پوچھا کہ "پیاس بجھ گئی" انہوں نے کہا "ہاں"

---

[1] اس قسم کے رذیل اور عامیانہ جملے ایک فریق کا ادنیٰ طبقہ دوسرے فریق کی نسبت مشہور کیا کرتا ہے۔ اب بھی بڑی لڑائیوں کے بعد بعض عورتوں کے بچے وار چلڈرن یعنی اولادِ جنگ مشہور کر دیے گئے۔ مترجم

[2] اس کل واقعہ کو جس طرح طبری نے بیان کیا ہے، اُسے میں یہاں اردو ترجمہ طبری صفحہ ۲۲۳ سے نقل کرتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم ہوگا کہ مصنف نے کیسے بُرے دل سے سچی باتوں کو بگاڑ کر لکھنے میں تامل نہیں کیا۔ مصنف کا طرزِ بیان جا بجا ایسا ہے جیسے کوئی کسی سے پہلے سے عداوت رکھتا ہو، اور بات بات میں منہ سے زہر اگلنا اپنا فرض سمجھتا ہو، طبری کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:۔

"اس کے بعد معقل بن سنان کو مسلم کے سامنے لوگ لے کر آئے اور پہلے مسلم، معقلؓ کے دوستوں میں تھا مسلم نے کہا مرحبا یا ابی محمد (خوش آمدید اے ابو محمدؒ) معلوم ہوتا ہے تم اس وقت پیاسے ہو؟ معقلؓ نے کہا، ہاں پیاسا ہوں، مسلم نے کہا، دیکھو میرے ساتھ جو برف آئی ہے وہ شہد میں ڈال کر شربت بنا کر ان کے لیے لاؤ۔ شربت آیا، معقلؓ نے پی کر کہا سقاک اللّٰہ من شراب الجنۃ مسلم نے جواب دیا، سن واللہ اب تجھے حمیم جہنم کے سوا کبھی کچھ پینا نصیب نہ ہوگا۔ معقل نے کہا "خدا کا اور صلۂ رحم کا تجھے واسطہ دیتا ہوں، مسلم نے جواب دیا کہ مجھ سے تجھ سے مقام طبریہ میں جس شب تو یزید سے رخصت ہو کر نکلا ہے ملاقات ہو چکی ہے میں نے تجھے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ مہینہ بھر کا ہم نے سفر کیا اور یزید کے (باقی بر صفحۂ آئندہ)

اب مسلم نے تیور بدل کر کہا کہ "بس اب جتنی زندگی باقی ہے اس میں پھر کچھ پینا نصیب نہ ہوگا، موت کے لیے تیار ہو جاؤ۔" معقلؓ نے خدا اور صلۂ رحم کا واسطہ دیا۔ مسلم نے کہا "تم کس بات کا واسطہ دیتے ہو؟ کیا تم کو یاد نہیں کہ جب تم وفد کے ساتھ مدینے کو آئے تھے تو طبریہ کے قریب راستے میں مَیں تم کو ملا تھا؟ کیا وہ تم نہ تھے جو یزید پر لعنت کرتے تھے؟ کیا تم وہ نہیں ہو جن کو میں نے یہ کہتے سُنا تھا کہ جب ہم مدینے پہنچیں گے تو فوراً عہد کریں گے کہ اس فاجر کی اطاعت نہ کریں گے اور اس کے بعد یہ بہتر ہوگا کہ ہم کسی مہاجر کے فرزند کو خلیفہ بنائیں؟ اب سنو کہ میں نے اس وقت قسم کھائی تھی کہ اگر میں پھر کبھی تم سے ملا اور تم میرے قابو میں آ گئے تو تم کو قتل کروں گا۔ خدا کے سامنے میں اب اپنی قسم پوری کرتا ہوں۔" اس کے بعد مسلم نے معقلؓ کے قتل کا حکم دیا اور وہ قتل کر دیئے گئے۔

جب لوٹ ختم ہوئی تو مدینے میں جو لوگ رہ گئے تھے (اکثر شہر سے بھاگ چکے تھے) مسلم نے اُن کو طلب کیا اور ان سے بیعت لی۔ لیکن یہ بیعت معمولی نہ تھی جس میں خلیفہ کی اطاعت اور قرآن اور رسول خدا صلعم کے احکام کی پابندی کی قسم کھائی جاتی تھی۔ بلکہ اس بیعت میں مدینے والوں سے اس بات کی قسم لی گئی کہ وہ یزید کے غلام ہیں جن کو وہ آزاد کر سکتا اور بیچ سکتا ہے۔ ان لوگوں کو اس بات کے ماننے پر مجبور کیا گیا کہ اُن کا کل مال و متاع اب یزید کا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اُن کی بیویاں اور اُن کے بچے، اُن کی جانیں اور اُن کے مال سب کا مالک و مختار اب یزید ہے۔ جو شخص اس قسم کا عہد نہ کرے گا اس کو قتل کی سزا دی جائے گی۔ (۶۲)

بیعت لینے والوں میں دو قریشی ایسے تھے جنھوں نے کہا کہ ہم صرف معمولی طریقے پر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پاس سے خالی ہاتھ جاتے ہیں۔ اب ہم مدینے میں جا کر اس فاسق کو خلافت سے معزول کر دیں گے بھلا غطفان اور اشجع کو عزل و نصب خلافت میں کیا دخل؟ سُن میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب کسی جنگ میں تیرے قتل کرنے کا موقع پاؤں گا ضرور تجھے قتل کروں گا۔ یہ کہہ کر مسلم نے حکم دیا کہ معقل کو قتل کرو۔ اور وہ قتل کر دیئے گئے۔" مترجم

بیعت لے سکتے ہیں۔ مسلم نے ان کو فوراً قتل کرادیا۔ مروان بن حکم جو خود قریشی تھا اس نے اس قتل پر اعتراض کیا۔ اعتراض سن کر مسلم نے مروان کی پیٹھ پر چھری چبھو کر کہا "خدا کی قسم اگر تو بھی وہی الفاظ کہتا جو ان بدبختوں کی زبان سے نکلے تو میں تیرا سر بھی قلم کر دیتا" باوجود اس تنبیہ کے مروان نے پھر ایک شخص کی سفارش میں کچھ کہنا چاہا جس نے بیعت غلامی لینے سے انکار کیا تھا۔ یہ شخص مروان کے عزیزوں میں تھا۔ مسلم نے سفارش سننے سے انکار کیا۔ لیکن جب ایک خاص صورت پیش آئی یعنی ایک قریشی نے جس کی ماں قبیلہ کندہ کی تھی، بیعت غلامی لینے سے انکار کیا تو وہ مستثنیٰ کر دیا گیا۔ جس وقت اس قریشی نے بیعت سے انکار کیا تو لشکرِ شام کے ایک سردار نے جو بنی سکون سے تھا، اور بنی سکون اور بنی کندہ ایک ہی بطن سے تھے، مسلم سے کہا کہ ہماری بہن کا لڑکا بیعتِ غلامی نہیں لے سکتا۔ مسلم نے یہ سفارش سن کر اس قریشی کی بیعت معاف کر دی۔ شام کے عربوں نے اُن راسخ الایمان اکابرِ اسلام کی اولاد سے ایک پرانا نزاع طے کر لیا۔ جنھوں نے اسلام کی تبلیغ میں ان شامیوں کے بزرگوں کا خون عرب میں بہایا تھا[١]۔ عرب کی قدیم جماعتِ شرفاء نے اُن لوگوں کو ہلاک اور غارت کر دیا جن کو اسلام کی دولت نے سردار اور شریف بنایا تھا۔ مکے کی قدیم جماعتِ شرفاء کا نمائندہ اس وقت یزید

١؎ سوال یہ ہے کہ کیا اہل شام کا بھی یہی خیال تھا جو مصنف لکھا ہے، یا یہ محض مصنف کی بدگمانی کا مضمون ہے اور شامیوں کے ساتھ اس خصوص میں ہمدردی کرکے انہوں نے صحابہ اور اہل مدینہ کو قتل کیا۔ اسلام کی تبلیغ پر نفسِ اعتراض ہے اسے پڑھ کر ہر مسلمان کہہ سکتا ہے کہ یہ تحریر بجز اسلام سے فطری عداوت رکھنے کے اور کسی خیال کا نتیجہ نہیں ہے۔ ان لڑائیوں میں وجہ مخاصمت یہ نہ تھی کہ ایک فریق کے باپ دادا نے دوسرے فریق کے باپ دادا کو مسلمان کیوں کیا تھا۔ داعیانِ اسلام اگر استاد تھے تو اسلام ایک سبق تھا۔ شاگرد کو استاد سے جس نے تادیب کی ہو شاید دشمنی ہو جائے لیکن جس سبق کے پڑھنے میں وہ تادیب ہوئی اس سبق سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے، درحالیکہ سب اپنے تئیں مسلمان سمجھتے تھے اور مسلمان ہونے پر فخر کرتے تھے۔ اس قسم کے اعتراضات یورپ کے مستشرقین کی شگوفہ کاریاں اور بلاغت کے نمونے ہیں کہ کس طرح جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کر دکھاتے ہیں مگر کتنی گل افشانی کیجیے جھوٹ جھوٹ ہی رہتا ہے۔ مترجم

تھا۔ یزید نے اس وقت خلیفہ عثمان رضؓ کے خون کا بدلہ، اور لڑائیوں میں اُن شکستوں کا بدلہ نکال لیا جو مدینے والوں نے گو اس وقت وہ عَلَمِ نبوی کے سایے میں لڑتے تھے یزید کے دادا ابوسفیان کو دی تھیں۔ زمانۂ کفر کی قوتِ مقابلہ نے اسلام[1] کے برخلاف ایسا زور پکڑا کہ اس قوت کے قہر و عذاب کی کوئی انتہا نہ رہی (یہ صرف شاندار الفاظ ہیں۔ ان کے اجزا تحلیل کیجیئے گا تو کچھ بھی نہ رہے گا۔ مترجم) انصار اس صدمۂ عظیم کے بعد پھر نہ پنپے ان کی قوت ہمیشہ کے لیے زائل ہو گئی۔ مدینے کو یہ مدینے والے خالی کر کے صحرا کے جانوروں کے حوالے کر گئے، کیونکہ اکثر لوگ وطن چھوڑ کر دُور کے ملکوں میں گھر بسانے اور آرام پانے کی فکر میں اسلامی فوجوں میں بھرتی ہو کر افریقہ چلے گئے۔ جو لوگ مدینے میں رہے ان کی حالت واجب الرحم تھی۔ بنی امیہ نے اُن کی تحقیر و تذلیل میں جن سے اُن کو آزار پہنچیں اور وہ تباہ ہوں، کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔

واقعہ حرّہ کے دس برس بعد امیر مدینہ حجاج بن یوسف نے مدینے کے مُسن لوگوں کو جنہیں رسول اللہ صلعم کی صحبت کا شرف حاصل ہو چکا تھا، اس طرح ذلیل کیا (۶۳
کہ اُن کے ہاتھوں پر مہریں لگوائیں۔ حجاج کے نزدیک ہر ایک مدینے والا حضرت عثمان رضؓ کا قاتل تھا، اور یہ رائے قائم کر کے کہ خونِ عثمان رضؓ کا جس قدر الزام اہل مدینہ پر عائد کیا گیا ہے۔ اس سے زائد عائد ہونا چاہیئے تھا، حجاج نے حصارِ مدینہ طیبہ اور واقعہ حرّہ

---

[1] یورپ کے مصنف اسلام کا لفظ کئی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ کہیں اس کے معنی مذہب کے ہوتے ہیں۔ کہیں مسلمانوں کے اور کہیں مسلمانوں کی معاشرت کے۔ اس کثرتِ معنی کے پردے میں جہاں مسلمانوں کا قصور ہوتا ہے وہاں اُن کے مذہب کا قصور بنا دینا آسان ہوتا ہے۔ یہاں اسلام سے مراد مذہب نہیں ہو سکتا، کیونکہ جن لڑائیوں کا یہاں ذکر ہوا ہے اُن میں مذہب کے کسی اصول کو مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ نہ کسی فریق کو توحید سے انکار تھا نہ رسالت سے۔ وجہ خصومت کچھ ہی ہو مگر مذہب معرضِ بحث میں نہ تھا۔ ایک فریق کی قوتِ مقابلہ نے دوسرے فریق کے مقابلہ میں زور پکڑا لیکن اس موقع پر کفر اور اسلام کی قوت کا اندازہ کرنا بالکل خارج از بحث ہے لفظی خلط ملط کر کے مسلمانوں کے مذہب پر اعتراض لانا مستشرقین کا پرانا شیوہ ہے۔ مگر اب یہ جادو چلتا نہیں۔ مترجم

کو قتلِ عثمانؓ کی کافی پاداش نہ سمجھا۔ مدینے سے چلتے وقت حجاج نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو ایسے شہر سے جو بدترین شہر ہے، نکالا۔ یہ وہ شہر ہے جس نے خلیفہ کی مہربانیوں کا بدلہ دغا اور فریب سے کیا، خدا کی قسم ہے کہ اگر میرے امیر نے اپنے تمام خطوط میں ان لوگوں کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لیے مجھے نہ لکھا ہوتا تو میں ان کے شہر کو بالکل منہدم کر دیتا، اور یہ لوگ وہاں پڑے ہوئے کراہتے ہوتے جہاں رسولِ مقبولؐ تشریف رکھا کرتے تھے"۔ جب حجاج کے یہ الفاظ ایک مسن صحابی کے سامنے بیان کئے گئے، جن کی تذلیل حجاج کر چکا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ "عاقبت میں حجاج کے لیے عذابِ الیم ہے، الفاظ شایانِ فرعون ہیں"۔

افسوس ہے کہ ان افسردہ دل لوگوں کے لیے محض اس بات کا یقین تسلی کا موجب تھا کہ اُن کے عذاب دینے والے ایک دن دوزخ کے ہمیشہ جلتے رہنے والے شعلوں میں جلائے جائیں گے۔ صرف اسی امید سے وہ اپنا دل ٹھنڈا کر لیا کرتے تھے صحابہ کی پیشین گوئیاں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ اُن کی نسبت فرمایا تھا اُسے نہایت شوق اور سریع الاعتقادی سے سنتے اور یقین کرتے تھے۔ سعید بن مسیبؓ فقیہ جو مدینے پر حملے کے وقت مسجدِ نبوی میں موجود تھے۔ مدینے والے سے جو کوئی بھی سنے کہا کرتے تھے کہ "جب شامیوں کو میں نے دیکھا کہ اپنے گھوڑے باندھنے کے لیے مسجد کو اصطبل بنا رہے ہیں تو مزارِ اقدس کی سمت سے ایک آواز میرے کانوں میں آئی جس کے الفاظ ان مصیبتوں کی خبر دے رہے تھے"۔ قبیلہ مزینہ کا سردار اہل مدینہ کی نظر میں ایک دیو خبیث تھا، جس کی مثل روئے زمین پر پہلے نہ دیکھا گیا تھا۔ وہ سمجھتے اور یقین کرتے تھے کہ مسلم بن عقبہ کی مثل سوائے ایک شخص کے کوئی اور قیامت تک پیدا نہ ہوگا اور یہ شخص جو اس کی مثل ہوگا قبیلہ مزینہ ہی کا ہوگا۔ کیونکہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرما گئے تھے کہ قیامت کے دن جو لوگ سب سے آخر میں اٹھیں گے وہ مزینہ کے دو شخص ہوں گے۔ اور وہ اٹھ کر دیکھیں گے کہ دنیا اجڑی پڑی ہے۔ مدینے میں وہ آئیں گے، جہاں انہیں اہوانِ صحرا کے سوا کوئی جاندار نہ ملے گا۔ اس کے بعد آسمان

سے دو فرشتے اتریں گے" اور ان دونوں آدمیوں کو اونچا اٹھا کر زمین پر پٹک دیں گے اور پھر اُن کو گھسیٹتے ہوئے وہاں لے جائیں گے جہاں کل ابنائے آدم جمع ہوں گے ظلم اٹھاتے اٹھاتے اور مصیبتیں جھیلتے جھیلتے اب ان مدینے والوں کے لیے یہی ایک صورت مخلصی کی رہ گئی تھی کہ جس طرح اور ہموطن فوجوں میں بھرتی ہو کر افریقہ چلے گئے تھے، یہ بھی وطن سے نکل جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا بھی، پہلے افریقہ
(۶۴) گئے پھر وہاں سے اسپین چلے گئے۔ انصار کی تقریباً کل اولاد اس لشکر میں شامل تھی جسے ساتھ لے کر موسیٰ بن نصیر نے بحر زقاق (آبنائے جبرالٹر) کو عبور کیا تھا (سنہ ۹۴ھ مطابق ۷۱۲ء)۔ اسپین میں آکر یہ انصاری ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں میں آباد ہو گئے، اور کچھ عرصے میں اسپین میں اُن کی تعداد دیگر قبائل عرب سے جو وہاں آباد ہو گئے، زیادہ ہو گئی۔ مدینے میں اب کوئی اتنا بھی نہ جانتا تھا کہ انصار کیا ہوئے تیرھویں صدی عیسوی (ساتویں صدی ہجری) میں ایک سیاح نے مدینے میں آکر بہت شوق سے پوچھا کہ انصار کی اولاد میں سے اب بھی کوئی اس شہر میں ہے؟ تو اس سوال کے جواب میں ایک مرد اور ایک عورت جو بہت ہی بڈھے تھے بتائے گئے اور کہا گیا کہ بس یہی دو آدمی انصار کی اولاد میں سے اب اس شہر میں رہ گئے ہیں۔

اس بنا پر ہم کو شبہ ہو سکتا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی (بارھویں صدی ہجری) میں جو یہ قول نقل ہوا تھا کہ "مضافات مدینہ میں چند مفلس خاندان آباد ہیں جو انصار کی اولاد میں ہیں[۱]" صحیح نہ تھا۔

لیکن اسپین میں بھی انصار کو شامی عربوں کی عداوت سے نجات نہ ملی۔

---

[۱] سیاح برک ہارٹ جس زمانہ میں مدینہ طیبہ میں تھا (۱۸۱۴ء)، تو اس وقت بارہ خاندان انصار کے وہاں آباد ہونے بیان کیے گئے تھے۔ (دیکھو "سفرنامہ عرب" جلد ۲ صفحہ ۲۲۷) برٹن نے چار خاندان لکھے ہیں۔ برٹن کا زمانہ ۱۸۵۳ء ہے (دیکھو "سفر حج" جلد ۲ صفحہ ۲۵۴)

ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ شامیوں اور مدینے والوں میں وادی الکبیر کے کنارے از سر نو لڑائیاں شروع ہوئیں، اور یہ زمانہ وہ تھا کہ اسپین کا امیر ایک قریشی تھا جو واقعہ حرہ میں مدینے والوں کی طرف سے شامیوں سے لڑا تھا، اور شکست کے بعد مدینے سے بھاگ کر افریقہ کے لشکر میں شامل ہو گیا تھا۔

اسناد :-

ابن خلدون جلد ۲ ص ۱۶۹-۱۷۰

نورالدین سمہودی - تاریخ مدینہ ص ۳۰ تا ۲۲

ریحان ص ۲۰۰ - ۲۰۱

فقیہی ص ۴۰۰

ابن الاثیر جلد ۲ ص ۷۸ - ۷۹

نویری ص ۵۹۷

ابن قتیبہ ص ۱۵۲، ۲۰۱

مقری جلد ۱ ص ۱۸۷

اغانی جلد ۱ ص ۱۸ تا ۲۱

(٦٥)

کتاب اوّل

خانہ جنگی

چھٹی فصل

یمانیہ اور مَعدّیہ

ایسی عداوتوں سے قطع نظر کرکے جو اساسی اور لازمی اصول کے اختلاف کی بنا پر بنی نوع انسان میں ہمیشہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، کوئی عداوت اور خصومت یورپ یا ایشیا میں، یا مسلمانوں یا عیسائیوں میں اس عداوت کے برابر مستقل اور دوامی ثابت نہیں ہوئی ہے جو اختلافِ نسل کی بنا پر ہو۔ یہ وہ عداوت ہوتی ہے جس کا ظہور صدہا برس تک ہوتا رہتا ہے۔ سیاست، معاشرت، مذہب میں خواہ کتنے ہی انقلاب ہو جائیں مگر یہ باہمی عداوت کسی طرح نہیں مرتی۔ ہر حال میں زندہ رہتی ہے۔

اس کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ نسلِ عرب کی دو شاخیں تھیں جو بالکل جُدا جُدا تھیں اور اُن میں ہمیشہ سے عداوت چلی آتی تھی۔ اب ہم اس مضمون کی توضیح کر کے اُن وسیع الاثر نتائج کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو اس عداوت سے

پیدا ہوئے۔

مشرق میں یہ عام قاعدہ رہا ہے کہ جب کسی قوم کی اصل کا پتہ چلاتے ہیں تو تحقیق کرتے کرتے ایک شخص واحد کو اس کا مورثِ اعلیٰ قرار دیتے ہیں۔ نسل عرب کی ان دو شاخوں میں سے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے جو شاخ سب سے پرانی تھی اُس کو دعویٰ تھا کہ وہ آلِ قحطان سے ہے۔ ان قحطان کو اہلِ عرب نے جب کتب یہود سے واقف ہوئے تو یقطان سے مطابق کردیا جو عہد نامہ عتیق کی کتاب پیدائش[۱] میں حضرت سام پسر نوحؑ کی اولاد سے بیان ہوئے ہیں۔ عربوں کا یہ بیان بھی ہے کہ اولاد قحطان نے ولادت مسیح علیہ السلام سے کئی سو برس پہلے جنوبی عرب پر خروج کرکے وہاں کے اصلی باشندوں کو جن کی اصل کے متعلق کوئی امر تحقیق نہیں ہے، اپنا محکوم بنالیا تھا۔

قحطانیوں کو بالعموم یمانیہ کہتے تھے۔ قحطانیہ کا نام اُن کے مورثِ اعلیٰ قحطان کے نام پر، اور یمانیہ کا نام یمن کی رعایت سے مشہور ہوا، جو جنوبی عرب کا ایک زرخیز ملک ہے۔ اور اب اسی مقام اندوبود کے اعتبار سے ہم قحطانیوں کو یمانیہ لکھیں گے۔

نسل عرب کی دوسری شاخ کو دعوےٰ تھا کہ اس کے مورثِ اعلیٰ عدنان تھے جو حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں تھے، اور اس شاخ کے لوگ عرب کے زیادہ شمالی حصوں میں جن میں حجاز اور نجد کے ملک شامل تھے، آباد تھے۔ حجاز کی حدود فلسطین سے یمن تک ہیں، اور اسی میں مکے اور مدینے کے شہر ہیں۔ نجد کا ملک ایک وسیع اور مرتفع ہے جس پر کہیں کہیں پہاڑ ہیں اور جس سے مراد وسطِ عرب ہے۔ اس شاخ کے لوگ مختلف ناموں سے مثلاً معدی، نزاری، مضری، قیسی پکارے گئے ہیں۔ یہ نام کبھی تو نسل کی شاخوں کے لیے اور کہیں تمام نسل کے لیے مستعمل ہوئے ہیں کیونکہ قیس، مضر کی اولاد سے تھے اور مضر فرزند نزار کے اور نزار فرزند تھے معد کے۔ ہم اُن کو معدی یا معدیہ لکھیں گے۔

[۱] کتاب پیدائش باب ۱۰۔ درس ۲۵

یورپ کی تاریخ میں کوئی مثال باہمی نفرت و عداوت کی جو کبھی پوشیدہ اور اکثر علانیہ ہو یمانیہ اور معدیہ کی عداوت کی مثل نہیں ملتی۔ اسی عداوت کے باعث ذرا ذرا سی بات پر لوگ کشت و خون کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ نواحِ دمشق میں ان دونوں قبائل میں دو برس تک سخت خونریزی رہی۔ محض اتنی سی بات پر کہ ایک معدّی نے کسی یمانی کے کھیت سے ایک خربوزہ اٹھا لیا تھا؎۔ اسی طرح اسپین میں صوبہ مرسیہ میں سات برس تک خون کی ندیاں اس بات پر بہا گیں کہ کسی معدّی نے ایک یمنی کے باغ میں سے گذرتے ہوئے بے خیالی میں انگور کی بیل میں سے ایک پتا توڑ لیا تھا۔ شدید قومی عداوتیں وقتاً فوقتاً یورپ میں بھی ظاہر ہوئیں، لیکن محض ان قدرتی نتائج کے طور پر جو فاتح اور مفتوح، یا غالب اور مغلوب کے تعلقات سے پیدا ہوتی ہیں۔ برخلاف اس کے عرب میں کوئی قوم دوسری قوم پر فاتح یا غالب نہ ہوتی تھی۔ یہ درست ہے کہ قدیم زمانے میں نجد کے معدیہ نے بادشاہ یمن کو اپنا حاکم مان لیا تھا، اور اُس کو عُشر ادا کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ بات انہوں نے برضا و رغبت اس خیال سے اختیار کی تھی کہ کہیں وہ آپس کے جھگڑوں میں لڑ مر کر دنیا سے قطعی نیست و نابود نہ ہو جائیں۔ یہ معدّی قبائل جب اپنے ہی قبائل میں سے کسی قبیلے کے آدمی کو کل قبیلوں کا سردار مان لیتے تھے تو چند روزہ اتحاد کے بعد ہر قبیلہ اس بات پر آمادہ ہو جاتا تھا کہ اپنی آزادی جدا قائم کرے۔ جہاں اس بات کے درپے ہوئے، خانہ جنگی پھر شروع ہو جاتی تھی۔ اور اب دو صورتیں پیش نظر ہوتی تھیں، ایک یہ کہ آئے دن کی بدنظمی گوارا کی جائے۔ دوسری یہ کہ غیر کی حکومت قبول کریں۔ ان دو باتوں میں سے کوئی بات پسند کرنے پر شیوخ معدیہ مجبور ہوتے تھے۔ جب ایک مدت تک آپس میں کشت و خون ہوتا رہا تو باہم مشورہ کرکے کہنے لگے "اب سوائے اس کے چارہ نہیں ہے کہ بادشاہ یمن کو ایک بار پھر اپنا بادشاہ مان لیں، آؤ، اُس کو خراج میں بھیڑیں اور اونٹ دیں، اور اس کے عوض میں جو لوگ ہم میں زبردست

؎ ابوالفدا - جلد ۲ صفحہ ۶۴

ہیں اُن کو یہ بادشاہ زبردستوں سے محفوظ رکھے گا۔[1]" اس کے بعد جب حبش والوں نے یمن فتح کرلیا تو نجد کے معدیوں نے اپنے اوپر حکومت کرنے کا اختیار بطیب خاطر حیرہ کے بادشاہ کو دے دیا جو یمنی النسل تھا۔ مگر یہ اختیار ایسا ہی خفیف سا تھا جو سابق میں انہوں نے بادشاہ یمن کو دیا تھا۔ لیکن اس طرح اپنی مرضی اور خوشی سے کسی غیر کو اپنے اوپر حاکم بنانے اور ایک غیر قوم سے مغلوب ہو کر محکوم بننے میں بڑا فرق تھا۔

اب سے پہلے یورپ میں جب کبھی ایک قوم کو دوسری قوم سے مغلوب ہو کر مجبوراً ایک ہی ملک میں ساتھ ساتھ رہنا پڑا تو زبان اور رواج کے فرق نے ان میں بے انتہا تفرقے ڈالے رکھے۔ لیکن اسلامی سلطنت میں ایسا کوئی فرق نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے قبل یمنی یا حمیری زبانوں کی جگہ (جو درحقیقت عربی زبان اور اُن زبانوں کا مرکب تھی جن کے بولنے والوں کو عربوں نے فتح کیا تھا) خالص عربی زبان جس شکل میں کہ معدی اسے بولتے تھے سب میں رائج ہو چکی تھی اور معدیوں کو علمی حیثیت سے دوسرے لوگوں پر کسی قدر فوقیت بھی حاصل تھی۔ غرض چند خفیف اختلافات کے سوا دونوں قوموں کی زبان ایک ہی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فوجوں میں ایک معدی کو کسی یمنی کی بات سمجھنے میں کسی طرح کی مشکل پیش نہ آتی تھی[2]۔ علاوہ بریں دونوں قوموں کی طبیعت اور ان کے رسم و رواج بھی ایک ہی سے تھے۔ معاشرت کے اعتبار سے بھی دونوں قومیں خانہ بدوش تھیں۔ آخیر میں جب دونوں نے اسلام قبول کرلیا تو اُن کا مذہب بھی ایک ہو گیا۔ مختصر یہ کہ معدیوں اور یمانیوں میں ہرگز اتنا فرق نہ تھا جتنا کہ جرمن قوم کی اُن شاخوں میں تھا جنہوں نے مل کر سلطنت روما پر یورش

---

[1] کوسن جلد ۲ صفحہ ۲۸۵

[2] آجکل حمیری زبانوں کا علم صرف کتبوں سے ہوا۔ اور گذشتہ چالیس برس میں اُس میں بہت ترقی ہوئی ہے۔

[3] لیکن مہرا میں جو عرب کے بالکل جنوب مغرب میں ہے ایک قدیم زبان اب تک ایسی موجود ہے جسے کوئی اور عرب سمجھ نہیں سکتا۔

کی تھی۔ مغرب میں جو اسباب مختلف قوموں میں منافرت کا باعث ہوتے ہیں وہ مشرق میں موجود نہ تھے، باوجود اس کے باہمی نفرت و عداوت کو جو دوام و استحکام مشرق میں حاصل تھا اس کا پتہ مغرب میں مطلق نہیں چلتا۔ یورپ میں تین چار سو برس سے ایسی عداوت جو بزرگوں کے وقت سے چلی آتی ہو، مفقود ہو چکی ہے۔ لیکن بدویوں میں خون بہا کے نزاع ڈھائی ہزار برس سے اب تک جاری ہیں۔ جن کا سلسلہ تاریخ کے ابتدائی زمانہ سے چلا آتا ہے اور اب تک نہیں ٹوٹا۔ عرب کا ایک پرانا شاعر کہتا ہے کہ :-

"نسلی عداوت ہم کو ہمارے بزرگوں سے ورثے میں ملی ہے، اور جب تک ان بزرگوں کی اولاد دنیا میں قائم ہے، وہ عداوت بھی قائم رہے گی۔"

یورپ میں اس قسم کی عداوت نے کبھی وہ ظلم و ستم برپا نہیں کیے جو مشرق میں اس سے ظاہر ہوئے۔ اہل یورپ کے اسلاف میں اس دشمنی نے فطرت کے نرم اور پاک جذبات کو تلف نہیں کیا۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ یورپ میں کسی لڑکے نے اپنی ماں سے اس لیے نفرت کی ہو کہ وہ اس کے باپ کے قبیلے کی نہیں تھی۔ ایک یمنی سے جس وقت وہ مکہ میں کعبہ کا طواف کر رہا تھا، پوچھا گیا کہ جب تو اپنے باپ کے لیے دعا مانگتا ہے تو ماں کے لیے کیوں دعا نہیں مانگتا؟ تو اس لڑکے نے جواب دیا کہ "میں اپنی ماں کے لیے کیونکر دعا مانگ سکتا ہوں، وہ تو بنی معد کی بیٹیوں میں سے ہے۔"

یہ عداوت وہ تھی جو نسلاً بعد نسلٍ ایک سے دوسرے کو پہنچتی آئی تھی۔ اور باوجودیکہ دونوں قوموں کی زبان، قوانین، رسم و رواج، طبیعت و مزاج، دین و مذہب سب ایک تھا، بلکہ خود نسل کے اعتبار سے بھی چنداں فرق نہ تھا، کیونکہ دونوں قومیں سامی النسل تھیں مگر عداوت بند نہ ہوئی۔ ایسی دشمنی کی نسبت اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ در اصل وہ ان کے خون میں موجود تھی۔ غالباً پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی (۴۸)
عیسوی) کے عرب بھی اس عداوت کا آغاز بتانے میں قاصر رہے ہوں گے جیسے کہ آجکل کے یمنی قبیلے جو صوبہ اُورشلیم کے صحراؤں میں خانہ بدوش رہتے ہیں، قاصر ہیں۔ چنانچہ جب (یورپ کے) سیاحوں نے اُن سے پوچھا کہ تم صوبہ جبرون کے قیسیوں (معدیوں)

سے کیوں عداوت رکھتے ہو؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کا حال اُن کو بجز اس کے کچھ نہیں معلوم کہ یہ عداوت اُن میں اور معدیوں میں ایسے وقتوں سے چلی آتی ہے جو اب کسی کو یاد نہیں ہیں[1]

اسلام لانے پر بھی اس نسلی عداوت میں کمی نہیں ہوئی، بلکہ تعلقات بڑھنے سے دشمنی میں اور زیادہ تیزی اور قوت پیدا ہوگئی۔ باوجودیکہ ایک کو دیکھ کر دوسرے کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا، مگر جب مسلمان ہوئے تو یمنی اور معدی ایک ہی علم کے سائے میں آکر لڑنے کو نکلے، ایک ہی جگہ ان کو رہنا سہنا پڑا۔ فتوحات سے جو نفع ہوا اس کو سب نے مل کر بانٹا۔ مگر اس ساتھ کے رہنے اور رات دن کے میل جول نے ان میں اور بھی نئے نئے جھگڑے پیدا کر دیئے، اور اب اس نسلی عداوت نے وہ اہمیت اور دل بستگی پیدا کی جو اس زمانے میں بھی نہ تھی جب کہ یہ دونوں قومیں عرب میں سکونت رکھتی تھیں۔ اور اب جس زمانے کا حال ہم لکھنے والے ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ اسی عداوت اور دشمنی نے اسپین اور صقلیہ کی زمینوں اور جبل اور اکس کے جنگلوں اور گنگا کے کناروں کو خون سے تر کر دیا۔ اور آخر کار اس عداوت نے نہ صرف مفتوح قوموں کی قسمت کا فیصلہ کیا بلکہ لاطینی اور جرمن قوموں کے حق میں بھی بحیثیت مجموعی ایک قسم کا نتیجہ پیدا کیا۔ یہ معدیہ اور یمانیہ ہی کی باہمی عداوت تھی جس نے مسلمانوں کے قدم فتح و فیروزمندی کے راستے پر جب کہ وہ فرانس اور تمام مغربی یورپ کو الٹ دینے کی فکر میں تھے آگے بڑھنے سے روک دیئے۔

اگرچہ تمام سلطنتِ اسلام میں ہر جگہ یہ دونوں گروہ یعنی معدی اور یمانی آپس کی لڑائیوں میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن اسلامی قلمرو اتنی وسیع اور ان قبائل میں متفق

---

[1] ای۔ ر ابن من اپنی کتاب "انجیلی تحقیقات در فلسطین" میں لکھتا ہے کہ جس کسی سے پوچھا یہی جواب ملا کہ اس فرق کا حال سوائے اس کے نہیں معلوم کہ انسان کی یاد سے پہلے سے وہ چلا آتا ہے اس کو عقائد یا مذہب سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔ (جلد دوم۔ صفحہ ۱۷۔ ۱۸۔ مطبوعہ ۱۸۶۷ء)

ہو کر کام کرنے کی قابلیت اس قدر کم تھی کہ کوئی ایسی جنگ جو پوری سلطنت اسلام میں برپا ہو جاتی اور جس کے مقاصد پہلے سے معین کر لیے جاتے، ان دونوں قوموں میں برپا نہیں ہوئی۔ سلطنت کے تمام صوبے جدا جدا خانہ جنگی میں مبتلا رہتے تھے فریقین مقابل ان خانہ جنگیوں میں ایسے دو قبیلے ہوتے تھے جو وہاں بکثرت آباد ہوں۔ یہ قبیلے اکثر معدیہ اور یمانیہ ہوتے تھے، مگر اُن کے نام ہر صوبہ میں یہی نہ تھے۔ خراسان میں یمانیہ کو ازدی اور معدیہ کو تمیمی لکھا ہے۔ شام میں جس کے حالات سے آگے چل کر زیادہ بحث کرنی ہے فریقین جنگ کلبی اور قیسی تھے۔ کلبیوں کی اصل یمانیہ سے تھی اور شام میں عربی آبادی کا حصۂ غالب یہی لوگ تھے، کیونکہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں یمانیہ عرب سے اٹھ کر شام میں اور بنی معد عراق میں آباد ہو گئے تھے۔

(۲۹) امیر معاویہؓ کے ساتھ کلبی اور قیسی دونوں ایک سا تعلق رکھتے تھے۔ ان کی علاقائی تدبیر اور احتیاط نے دونوں فریقوں میں ایک قسم کا توازن قائم کر رکھا تھا۔ نہ اس کا پلہ جھکتا تھا نہ اس کا۔ دونوں قوموں کو اُن سے یکساں محبت تھی۔ لیکن باوجود اس تدبیر و احتیاط کے امیر معاویہ سے یہ نہ ہو سکا کہ ان دونوں قبیلوں کی عداوت کو، جو کبھی کبھی بھڑک اٹھتی تھی، بالکل مٹا دیتے۔ امیر معاویہ ہی کے عہد میں بنو کلب اور بنو فزارہ (قیسی) نے بنات قین[1] کے مقام پر ایک سخت لڑائی لڑی اس کے بعد جب امیر معاویہؓ نے یزید کو اپنا ولیعہد بنانا چاہا تو قیسیوں نے اس بنا پر کہ یزید کی ماں بنو کلب سے تھی اس میں مشکلیں پیدا کر دیں۔ یزید کی ماں مالک ابن بحدل سردار بنو کلب کی بیٹی تھی[2] اور قیسیوں کی نگاہ میں یزید جس کی پرورش اس کی ماں کے گھر دشت سماوہ میں ہوئی تھی، کلبی تھا۔ اس کا حال نہیں کھلتا کہ امیر معاویہؓ نے بنی قیس کو کیونکر رام کر لیا، بہر حال قیسیوں نے بھی آخرالامر یزید کو ولیعہد تسلیم کر لیا اور جب تک یزید زندہ رہا اس کے خیر خواہ رہے۔ لیکن یزید کا عہد صرف تین برس رہا۔ نومبر ۶۸۳ء (ربیع الاول

[1] وسٹن فلڈ کی کتاب "شجرۃ انساب" صفحہ ۲۶۵ [2] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۲۴

سنہ ۶۴ھ) میں واقعہ حرہ کے ڈھائی مہینے بعد ۳۸ برس کی عمر میں یزید مر گیا۔ اس کے مرنے پر مسلمانوں کی وسیع مملکت کا کوئی امیر نہ تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ یزید لاولد مرا تھا، اس نے کئی بیٹے چھوڑے تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ خلافت موروثی نہ تھی انتخابی تھی۔ اس انتخاب کے مہتم بالشان اصول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم نہیں کیا تھا، اصول انتخاب کے قائم کرنے والے حضرت عمرؓ تھے ...... [1] حضرت عمرؓ واضع قوانین ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں پر کامل اختیارات رکھتے تھے کسی کو اُن کے اختیارات پر اعتراض کی مجال نہ تھی۔ یہ حضرت عمرؓ ہی تھے جنہوں نے ایک روز خطبے میں کہا تھا کہ "اگر کسی شخص کو کل مسلمانوں کی رائے لیے بغیر امیر بنا دیا گیا ہو تو ایسا تقرر باطل و بیکار ہوگا" یہ واقعہ ہے کہ اس اصول انتخاب کو عمل میں لانے سے پرہیز کیا گیا لیکن یزید گو خلافت پر تمام مسلمانوں کی رائے لینے کے بعد منتخب نہیں ہوا، مگر امیر معاویہؓ نے اپنی زندگی میں کم از کم اتنی احتیاط ضرور کی تھی کہ یزید کو اپنا جانشین بنانے کے لیے لوگوں سے انہوں نے بیعت لے لی تھی، یزید نے اپنی زندگی میں اپنے کسی لڑکے کے واسطے ایسا نہیں کیا، جوانی میں اسے موت آگئی۔ یزید کا بڑا بیٹا جس کا نام دادا کے نام پر معاویہ تھا، کوئی حق خلافت نہ رکھتا تھا۔ باوجود اس کے احتمال یہ تھا کہ شام کے عرب جو اس زمانے میں خلیفہ ساز بنے ہوئے تھے، اگر متفق الکلمہ ہو گئے تو معاویہ بن یزید خلیفہ ہو جائیں گے۔ مگر
(۷۰) شام کے عرب اس پر متفق نہ ہوئے، اور یہ مشہور ہو گیا کہ معاویہ بن یزید کو خلافت حاصل کرنے کا شوق نہیں ہے۔ اس نوجوان اموی شہزادے کے خیالات پردہ خفا میں ہیں۔ اگر مسلمان مورخوں کی تحریر باور کی جائے تو سمجھنا چاہیے کہ معاویہ بن یزید اپنے باپ یزید سے کسی بات میں مشابہ نہ تھے۔ اُن کے نزدیک خلافت کا حق مدینے

---

[1] مصنف نے رسول اللہ صلعم کی ذاتِ پاک کے متعلق یہاں گستاخانہ الفاظ لکھے ہیں، میں نے اُن کا ترجمہ چھوڑ دیا ہے۔ (مترجم)

والوں کو حاصل تھا۔ جس وقت واقعہ حرّہ میں انہوں نے شامیوں کی فتح اور صحابہ کے قتل کا حال سنا تو رونے لگے، لیکن مسلمان مورخ بعض اوقات مذہبی لگاؤ کی وجہ سے تاریخی واقعات غلط لکھ جاتے ہیں،[1] اور یہاں اُن کے بیان کی تردید ایک اسپینی (عیسائی) مورخ (علیسو وود آف بیجا) کی تحریر سے جو قریب قریب اسی زمانے کا مصنف ہے، ہوتی ہے اس مورخ نے اپنی تاریخ کا یہ حصہ اُن شامیوں سے جو اس زمانے میں اسپین میں آباد تھے پوچھ پوچھ کر لکھا تھا۔ اسپینی مورخ لکھتا ہے کہ معاویہ بن یزید بالکل اپنے باپ کا نمونہ تھا۔ بہر کیف یہ جو کچھ بھی ہو، قیسی ہرگز ایسے شخص کو خلیفہ نہ کر سکتے تھے جس کی ماں اور دادی دونوں کلبی ہوں، اور نہ وہ حسان بن مالک بن بجدل کلبی حاکم فلسطین اور اردن کی حکومت کو تسلیم کر سکتے تھے، جس نے معاویہ بن یزید یعنی اپنی بہن کے پوتے کی طرف سے عنان حکومت اپنے قبضے میں کر لی تھی۔ قیسیوں نے ہر جگہ مخالفت پر کمر باندھ لی، اور بنو کلاب کے ایک سردار نے جس کا نام زُفر تھا (بنو کلاب بطنِ قیس سے تھے) اور جو قنسرین میں رہتا تھا، معاویہ بن یزید کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ قنسرین سے اس نے وہاں کے حاکم سعید بن بجدل کو جو کلبی تھا نکال باہر کیا۔ چونکہ معاویہ

---

[1] مسلمان مورخوں کی طرف سے تو یہ بے اعتباری ہے کہ مذہبی لگاؤ کی وجہ سے وہ واقعات غلط لکھ جاتے ہیں مگر مسلمانوں کی نسبت ایک عیسائی مورخ کا بیان بلا تامل قابل اعتبار اور لائق ترجیح سمجھ لیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں مصنف کے اس لگاؤ یا میلان خاطر کو مذہبی کہا جائے یا محض یورپین طبیعت کا بے جا خاصہ کہہ کر خاموش رہا جائے اس موقع پر یورپین طرفداری کہنا زیادہ مناسب ہوگا، کیونکہ مصنف عیسائی مذہب کا کچھ زیادہ قائل نہیں معلوم ہوتا۔ گو اسلام کی طرح نصرانیت کے ساتھ گستاخیاں نہیں کرتا اور نصرانیت کا پاس و ادب ملحوظ رکھتا ہے۔ تعجب ہے کہ مصنف نے اس پر کچھ طبع آزمائی نہیں کی کہ جن شامیوں سے پوچھ پوچھ کر اس عیسائی مورخ نے اپنی تاریخ لکھی تھی ان کا میلان خاطر کس طرف تھا؛ یورپ کے اکثر مصنف جب مسلمانوں کی تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان دنیا سے فنا ہو گئے۔ ما علیہ احالہٗ یاد کا اتنا بھی خیال نہیں ہے۔ جو تجویز جا ہیں سنائیں اور خود ہی سمجھ لیں کہ بڑا انصاف کیا ہے۔ (مترجم)

بن یزید کے مقابلہ پر کسی کو دعویدارِ خلافت بنا کر پیش کرنا ضروری تھا، زفر نے عبداللہ ابن زبیرؓ کی خلافت کا اعلان کیا۔ بنی قیس کو حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے ساتھ کوئی وابستگی نہ تھی مگر ایک عجیب معاون و مددگار حامیانِ ابن زبیرؓ کو مل گیا، چونکہ زفر چاہتا تھا کہ صحابہ کی اولاد میں سے کسی کو خلافت ملے، اس لیے مسجد میں آیا اور ایک دور کا خطبہ کہنے کو اس نے اپنا فرض سمجھا، وہ اگرچہ شاعر تھا اور خطیب بھی اچھا تھا۔ لیکن عرب جاہلیت کی مانند اس کو بھی مذہبی مصطلحات پر عبور نہ تھا۔ اور یہ نہ جانتا تھا کہ تعریف و توصیف کیونکر کی جاتی ہے۔ پہلا فقرہ آدھا کہہ کر خاموش ہو گیا، حاضرین یہ حالت دیکھ کر ہنسنے لگے۔

معاویہ بن یزید اپنے باپ کے مرنے کے بعد صرف چالیس دن زندہ رہے۔ بعض نے لکھا ہے کہ دو یا تین مہینے زندہ رہے۔ اس زمانے کی ٹھیک مدت معلوم نہیں اور نہ اس مدت کی صحت کی چنداں ضرورت ہے۔

معاویہ بن یزید کے مرتے ہی بدنظمی شروع ہو گئی، اکثر اسلامی ملکوں نے جو اس بات کو دیکھتے دیکھتے بیزار ہو گئے تھے کہ شام کے عرب کس طرح تمام اسلامی ملکوں کو اپنا مفتوحہ سمجھ رہے ہیں، حکومت وقت سے روگردانی کی۔ عراق میں لوگوں کا یہ حال تھا کہ ایک دن خلیفہ مقرر کرتے تھے اور دوسرے دن اُسے معزول کر دیتے تھے۔ حسان بن مالک بن بحدل کلبی اس کا فیصلہ نہ کر سکے کہ خود خلیفہ ہو جائیں کیونکہ ایسا کرنے میں وہ جانتے تھے کہ سوائے بنو کلب کے اور کوئی اس بات کا روادار نہ ہو گا۔ حسان یہ بھی فیصلہ نہ کر سکتے تھے کہ لوگ بنی امیہ میں سے جس کو چاہیں خلیفہ منتخب کر لیں۔ اور اس انتخاب کو مان لیں اور ایسے خلیفہ کی اطاعت قبول کر لیں۔ اس کے علاوہ کسی شخص کو یہ توقع نہ ہوتی تھی کہ خلیفہ ہو کر وہ کامیابی کے ساتھ حکومت کر سکے گا۔ اس وجہ سے کسی اموی کا امیدوارِ خلافت بن کر سامنے آنا آسان نہ تھا۔ ولید جو ابو سفیان کا پوتا تھا اور پہلے مکے کا امیر رہ چکا تھا خلیفہ ہونے پر رضامند ہو گیا تھا، لیکن جس وقت معاویہ بن یزید کے جنازے کی نماز پڑھانے لگا تو دفعتہً "وبائی مرض" میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا

اس صورت میں حسان بن مالک بن بحدل اس کے خواہشمند ہو سکتے تھے کہ خالد بن یزید خلیفہ بنا دیئے جائیں، لیکن خالد کی عمر اس وقت صرف سولہ برس کی تھی، اور عرب سوائے اچھی عمر کے آدمی کے کسی کو خلیفہ بنانا پسند نہ کرتے تھے اس لیے حسان، خالد پر زیادہ خیال نہ جما سکے۔ اب بنی امیہ میں سے عثمان بن محمد بن ابو سفیان کا خیال پیدا ہوا، اور عثمان سے ملاقات بھی کی۔ عثمان بن محمد مدینے کے امیر بھی رہ چکے تھے۔ لیکن انہوں نے اب یہ سمجھ کر کہ بنی امیہ کا ساتھ دینے والا اب کوئی نہیں ہے انکار کر دیا۔ اور امر خلافت میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے طرفدار ہو گئے۔ حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کا فریق اب زور پکڑتا جاتا تھا۔ شام میں جس قدر بنو قیس تھے سب نے ان سے بیعت کر لی تھی۔ قنسرین میں تو قیسیوں کا پہلے سے دَور دورہ تھا، اب فلسطین میں بھی اُن کا زور ہو گیا۔ حمص کے گورنر نعمان بن بشیرؓ جو صحابی تھے حضرت ابن زبیرؓ کی بیعت کر چکے تھے، اور شام کے پانچ بڑے علاقوں میں اب صرف اردن کا علاقہ جو سب میں چھوٹا تھا حسان بن مالک بن بحدل کے قبضے میں رہ گیا تھا۔ یہاں کے لوگوں نے البتہ حسان کی اطاعت کا وعدہ کر لیا تھا مگر اس شرط سے کہ یزید کے لڑکوں میں سے کسی کو خلیفہ نہ کیا جائے کیونکہ وہ سب کم سن تھے۔ دمشق کا علاقہ جو سب میں بڑا تھا وہاں کا حاکم اس وقت ضحاک بن قیس تھا، یہ قبیلہ فہر (قیسی) کا آدمی تھا[1]۔ ضحاک ابھی تک کسی کا طرفدار نہ تھا۔ اور اس وقت تک دراصل وہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ خلیفہ کسے کیا جائے۔ ضحاک پہلے صاحب الشرطہ کا منصب رکھتا تھا اور امیر معاویہ کا بڑا اچھا دوست تھا۔ مکّے کے کسی رہنے والے کا امرِ خلافت میں وہ مددگار و معاون نہ ہو سکتا تھا۔ اور معدی ہونے کی وجہ سے کسی کلبی سردار کی نسبت بھی رائے قائم کر کے اس کا طرفدار نہ بن سکتا تھا، ضحاک کی حالت اس وقت تذبذب کی تھی، حسان بن مالک بن بحدل نے اس نیت سے کہ ضحاک اور اہلِ دمشق کے خیالات کا اندازہ ہو جائے۔ ایک خط ضحاک

---

[1] بنی فہر، قریش ظواہر یعنی مضافات مکہ کے رہنے والے تھے، قریش بطاح میں سے نہ تھے جو مکہ کے شہر میں رہتے تھے۔

کے نام اس غرض سے بھیجا کہ وہ سب لوگوں کے سامنے جامع دمشق میں پڑھا جائے اس خط میں امویوں کی تعریف اور ابن زبیرؓ کی مذمت تھی۔ خط بھیجتے وقت حسان کو یہ خیال ہوا کہ ممکن ہے ضحاک اس کا خط مسجد میں پڑھ کر نہ سنائے اس لیے قاصد کو اس خط کی نقل بھی یہ کہہ کر دی کہ اگر ضحاک خط پڑھ کر نہ سنائے تو وہ اس کی نقل سب کو سنا دے۔ حسان نے جیسا خیال کیا تھا وہی ہوا۔ ضحاک جب ممبر پر خطبے کے لئے گیا تو اس نے حسان کے خط کا ذکر تک نہیں کیا۔ قاصد نے جب دیکھا تو خط کی نقل پڑھ کر تمام حاضرین کو سنا دی۔ خط کا پڑھنا ابھی پورا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ ہر طرف ایک شور برپا ہو گیا۔ کوئی کہتا تھا کہ حسان نے جو کچھ لکھا ہے سب سچ ہے، کوئی کہتا تھا (۷۲) کہ نہیں جو کچھ لکھا ہے سب جھوٹ ہے۔ غرض مسجد میں جو اسلامی ملکوں میں عبادت اور نیز سیاسی معاملات کے تصفیہ کا مقام ہوتا ہے، اب ایک ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ قیسیوں نے کلبیوں کو اور کلبیوں نے قیسیوں کو بہت برا بھلا کہنا شروع کیا۔ آخرکار ضحاک نے سب کو خاموش کیا، لیکن جو کچھ اس کی اپنی رائے تھی اس کی نسبت ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔

شام میں یہ واقعات اس وقت درپیش تھے جبکہ مسلم بن عقبہ والا لشکر مکے سے کوچ کر کے شام میں پہنچا ہے۔ مسلم جو شروع میں امیر لشکر ہو کر گیا تھا، اب زندہ نہ تھا۔ اس دوران میں جو واقعات گذرے تھے ان کا مختصر حال لکھ دینا یہاں ضروری ہے جس وقت واقعہ حرہ پیش آ رہا تھا، مسلم سخت بیمار تھا۔ مدینے پر قبضہ پانے کے بعد طبیبوں نے جن چیزوں کا پرہیز بتایا تھا وہ بھی مسلم نے چھوڑ دیا تھا، اور کہا تھا کہ "سرکشوں کو میں نے سزا دے لی، اب مروں گا بھی تو چین سے مروں گا، قاتلین عثمانؓ کو میں نے ہلاک کر دیا اب اللہ میرے گناہ معاف کر دے گا"۔ مسلم جب مدینے سے لشکر لیے ہوئے مکہ کی طرف آ رہا تھا تو ایک مقام پر جہاں سے مکہ صرف تین دن کی مسافت تھا، اسے معلوم ہوا کہ بس اب موت قریب ہے۔ چنانچہ اس نے حصین بن نمیر کو طلب کیا۔ حصین کی نسبت یزید نے حکم دے دیا تھا کہ اگر مسلم مر جائے تو حصین اس کی جگہ

میرِ لشکر ہو جائے۔ حصین ابن نمیر قبیلہ سکون کا تھا، اور سکون لعلون کندہ سے تھے، جو یمانیہ تھے۔ یعنی مسلم بن عقبہ کی طرح حصین ابن نمیر بھی کلبی تھا لیکن مسلم کو ابن نمیر سے نفرت تھی۔ کیونکہ اس کی قابلیت اور ثابت قدمی پر مسلم کو بھروسا نہ تھا۔ جب ابن نمیر آیا تو مسلم نے حسب عادت ترشرو ہو کر تیز لہجے میں کہا "اے ابن پالان خر، تو اب میرا جانشین ہوگا۔ مجھ کو تجھ پر مطلق بھروسا نہیں ہے لیکن امیر المومنین کا حکم ٹل نہیں سکتا۔ جو کچھ اس وقت نصیحت کرتا ہوں اُسے غور سے سن لے۔ نصیحت تیرے حق میں ضروری ہے، کیونکہ جیسا کچھ تو ہے میں خوب جانتا ہوں۔ سن کہ قریش کے مکر اور حیلوں سے ہوشیار رہنا، ان کی میٹھی باتوں میں نہ آجانا، اور خوب یاد رکھو کہ جب مکے کے سامنے پہنچو تو تین باتوں کا خیال رہے، مقابلہ بہت جوانمردی سے کرنا، شہر کے لوگوں کو قید کرنا اور شام کو واپس چلے جانا" یہ کہہ کر مسلم بن عقبہ مر گیا۔

مکے کے حصار میں ابن نمیر نے وہ وہ کام کیے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ اپنی نسبت مسلم کی بدگمانیوں کو وہ غلط ثابت کرنا چاہتا ہے۔ ہمت و مردانگی میں کمی یا پاس مذہب کے خیال سے کسی کام میں رک جانے کی جگہ مذہب کی توہین اور بے ادبی میں وہ مسلم کا بھی استاد نکلا۔ پہلے تو منجنیق لگا کر کعبے پر سنگباری کی جس سے خانہ کعبہ کے ستون ٹوٹ گئے، پھر ابن نمیر ہی کے حکم سے ایک شامی سردار نے رات کے وقت جلتی مشعل نیزے کی انی پر لگا کر ابن زبیرؓ کے خیمے میں پھینک دی جو مسجد کے صحن میں نصب تھا۔ خیمہ میں فوراً آگ لگ گئی اور پھیل کر خانہ کعبہ کے پردوں میں جا لگی اور عمارت میں جو کام لکڑی کا تھا وہ جل گیا، اور اس طرح کعبہ معظمہ کی جو مسلمانوں کا سب سے بڑھ کر محترم مقام تھا، سخت بے ادبی کی گئی۔

اب خوارج کا ایک گروہ مذہبی اختلاف کو فراموش کر کے اس خیال سے کہ

اس آگ لگنے کی اور روایات بھی ہیں، یہاں فاکہی کی "تاریخ مکہ" کا بیان درج ہوا ہے

مکے کی زمین کو دشمن کے حملے سے محفوظ رکھے، حضرت عبداللہ ابن زبیر کی مدد کو مکے چلا آیا۔ ان خوارج کی مدد سے اہل مکہ نے شامیوں کے حملے کا بڑی ہمت سے مقابلہ شروع کر دیا۔ لڑائیاں ہوتی رہیں حتیٰ کہ یزید کی خبرِ موت نے دفعتہً معاملات کی صورت کچھ اور ہی کر دی۔ حضرت ابن زبیرؓ مرگِ یزید کی خبر سنکر بے انتہا خوش ہوئے ابن نمیر کے لیے یہ خبر خبر نہ تھی بلکہ آسمان سے بجلی گری تھی ابن نمیر بڑا سنگدل حیلہ گر، اور خود غرض آدمی تھا، مسلم بن عقبہ کی طرح نہ تھا کہ آقا کی حکم برداری کے سوا اور کچھ نہ آتا ہو۔ ابن نمیر کو اس کا علم تھا کہ شام میں کیسے کیسے فریق موجود ہیں، اور اُن میں تعلقات کس قدر کشیدہ ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان فرقہ بندیوں کا نتیجہ ضرور خانہ جنگی ہوگا۔ اس کو یہ بھی علم تھا کہ بنی اُمیہ کمزور ہیں، غرض سوچنے لگا کہ اگر حضرت عبداللہ ابن زبیر سے جو مکے میں تو خلیفہ ہو ہی چکے ہیں، بیعت کر لی جائے تو بدنظمی رفع کرنے کی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہ ہوگی اور یہ تدبیر اس کے اور اس کے لشکر والوں کے حق میں بہتر ہوگی۔ اہل لشکر مصالحت کی طرف راغب تھے اور ابن نمیر اُن سے بھی زیادہ گذشتہ دعووں سے دست بردار ہو کر صلح پر آمادہ تھا۔ غرض اس خیال سے دوسرے دن رات کو ابن نمیر نے مقام ابطح میں حضرت ابن زبیرؓ کو ملاقات کے لیے بلوایا۔ ابن زبیر آئے اور حصین ابن نمیر نے اُن سے چپکے چپکے باتیں کرنی شروع کیں، تاکہ شام کے فوجی سرداروں تک آواز نہ جائے۔

حصین بن نمیر" میں تم کو خلیفہ ماننے پر اس شرط سے رضامند ہوں کہ تم سب کی جان و مال کو سلامتی دو، اور اس بات کا وعدہ کرو کہ واقعہ حرہ اور حصار مکہ میں جو لوگ قتل ہوئے ہیں اُن کے خون کا بدلہ نہ لوگے"

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ۔ نہیں، مجھ کو اُس وقت تک صبر نہ آئیگا جب تک میں اپنے ایک ایک آدمی کے بدلے دس دس دشمنوں کی جان نہ لے لوں

حصین بن نمیر" لعنت ہے اُس پر جو آج سے تم کو صاحب عقل سمجھے میں

نے تمہارا اعتبار کیا، چپکے چپکے تم سے بات کی اور تم نے غکار کر جواب دیا میں نے تم کو خلافت کی طرف بلایا، مگر تم نے مجھے موت کی دھمکی سنائی۔"

ابن نمیر اب یہ سمجھ کر کہ حضرت ابن زبیرؓ سے مصالحت ممکن نہیں، اپنا لشکر لے کر شام کی طرف روانہ ہو گیا۔ رستے ہی میں تھا کہ مروان سے ملاقات ہوئی واقعہ حرّہ کے بعد مروان پھر مدینے میں آباد ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے دمشق کے زمانہ سکونت میں اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ امویوں کی بات اب کچھ بنتی نظر نہیں آتی، چنانچہ انھوں نے ضحاک سے ملاقات کی اور اِس ملاقات میں یہ طے پایا کہ مروان حضرت ابن زبیرؓ کے پاس یہ خبر لے کر مکّے جائیں کہ اہل شام اُن کی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ مروان نے اس خبر کے لیے قاصد بننا اس خیال سے منظور کر لیا کہ ابن زبیر سے مخالفت مدت سے چلی آتی ہے، اس مخالفت کو رفع کرنے اور ابن زبیر سے مصالحت ہو جانے کی تدبیر اس سے بہتر نہیں ہو سکتی کہ اس وقت یہ ایلچی گری اختیار کی جائے۔ غرض اس پیغام کو لیے مروان دمشق سے چل کر مکہ کو آ رہے تھے کہ ابن نمیر لشکر لیے ہوئے مکہ سے شام کو واپس جاتا ہوا راستے میں ملا مروان سے باتیں ہونے لگیں۔ ابن نمیر نے مروان کو یقین دلایا کہ وہ حضرت ابن زبیرؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کر سکتا، ہاں اگر مروان میں اتنی ہمت ہو کہ وہ بنی امیّہ کا علم بلند کر سکے تو ابن نمیر اس کی مدد کو حاضر ہے۔ مروان نے اس تحریک کو پسند کیا، اور اب ابن نمیر اور مروان دونوں نے یہ قصد کیا کہ مقام جابیہ میں ایک مجلس شوریٰ قائم کریں تاکہ خلافت کے مسئلہ کو سب مل کر سوچیں اور اس کا کچھ فیصلہ کریں۔

اس مجلسِ شوریٰ میں حسان بن مالک بن بجدل اور اس کے کلبی ہوا خواہ شریک ہوئے۔ ضحاک نے بھی اس مجلس میں شریک ہونے کا وعدہ کیا، اور یہ بھی کہا کہ جابیہ میں اگر وہ حسّان کے خط کو مسجد میں پڑھ کر نہ سنانے کی وجہ بھی بیان کرے گا ضحاک فی الواقع اپنے ساتھیوں کو لیے جابیہ کی طرف روانہ بھی ہو گیا۔ لیکن راستے میں قیسیوں نے اس سے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ بنو کلب معاویہ بن یزید کے چھوٹے

بھائی خالد کو خلیفہ بنا دیں گے، کیونکہ خالد کا تعلق خاندانی کلبیوں سے بہت زیادہ ہے۔ ضحاک نے قیسیوں کے اس خیال کو تسلیم کر لیا، اور اب جابیہ کی طرف بڑھنے سے وہ رُک گیا اور رستے ہی میں سے پلٹ کر راہط کے میدان میں جو دمشق سے مشرق میں ہے، ڈیرے ڈال دیے۔ قیسی سمجھے بیٹھے تھے کہ کلبیوں سے جو جھگڑا اُن کا چلا آتا ہے اس کا فیصلہ عنقریب لڑائی سے ہونے والا ہے اور جوں جوں یہ وقت قریب آتا جاتا تھا وہ اِس مشکل سے آگاہ ہوتے جاتے تھے کہ ابن زبیرؓ کے فریق کا ساتھ دے کر کلبیوں سے لڑنا ہوگا۔ چونکہ ان قیسیوں کو ابن زبیرؓ کی بہ نسبت ضحاک سے زیادہ ہمدردی تھی جو امیر معاویہ کا دوست رہ چکا تھا۔ اس لیے انھوں نے ضحاک سے کہا کہ "تم خود کیوں خلیفہ نہیں ہو جاتے، تم ایسے ہی اچھے ہو جیسے حسان بن مالک بن بجدل یا عبداللہ ابن زبیرؓ اچھے ہیں" ضحاک ان جملوں کو سُن کر خوش ہوا کیونکہ وہ اپنی گومگو حالت سے جو اس وقت پیدا ہو گئی تھی، کسی طرح نکلنا چاہتا تھا۔ غرض ضحاک نے خلیفہ ہونے سے انکار نہیں کیا اور قیسیوں سے اپنی بیعت لے لی۔

جابیہ میں خلافت کے متعلق چالیس روز تک بحث ہوتی رہی قیسیوں کا خیال صحیح نکلا، حسان بن مالک بن بجدل اور اُس کے دوستوں نے خالد بن یزید کو خلیفہ کرنا چاہا اور حصین بن نمیر، مروان کے لیے بیعت نہ لے سکا۔ ابن نمیر نے بہت کہا کہ "اگر ہمارے دشمن ایک مردِ مسن کو خلافت کے لیے پیش کرتے ہیں تو کیا اس سے

گومگو حالت اس وجہ سے تھی کہ حضرت ابن زبیرؓ کا ساتھ تو اس وجہ سے دینا گوارا نہ تھا کہ امیر معاویہ کی دوستی یاد آتی تھی، جنھوں نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو کبھی اچھا نہ سمجھا تھا۔ اور خالد بن یزید یا حسان بن مالک بن بجدل یا یوں کہیے کہ کلبیوں کی طرفداری اس لیے شاق تھی کہ خود قیسیوں کا سردار تھا۔ اور قیسیوں اور کلبیوں میں پرانی عداوت چلی آتی تھی قیسیوں کے مشورے نے اس تذبذب کی حالت کو دور کر دیا (مترجم)

لازم آتا ہے کہ ہم ایک صغیر سن لڑکے کو خلافت کے لیے پیش کریں"۔ مگر ابن نمیر کی بات اُس وقت کسی نے نہ سنی، اور اُس سے یہ جواب دیا گیا کہ "مروان اگر خلیفہ ہو گیا تو پھر ہم کو اُس کا غلام ہو کر رہنا پڑے گا، اُس کے دس لڑکے ہیں، اور دس بھائی ہیں، اور دس بھتیجے ہیں"۔ علاوہ اس کے مروان کو شام کے لوگ ایک اجنبی آدمی سمجھتے تھے، کیونکہ خالد بن یزید تو بنی امیّہ کے اُس گروہ میں سے تھے جنھوں نے شام کو اپنا وطن بنا لیا تھا، اور مروان اور اُن کے خاندان والوں کی سکونت مدت تک مدینے میں رہی تھی۔ آخر کار بہت کچھ بحث کے بعد حسان بن مالک بن بجدل اور اُس کے دوست مروان پر رضامند ہو گئے، اور نہایت سخت اور خفیف کرنے والی شرائط کے ساتھ اُن کو خلیفہ بنانا منظور کر لیا۔ وہ شرطیں یہ تھیں (۵۱)
کہ تمام بڑے بڑے عہدے کلبیوں کو دیے جائیں، حکومت اُن کی صلاح و مشورے سے ہو اور ایک رقم کثیر کلبیوں کو سالانہ ادا کی جائے[1]

حسان بن مالک بن بجدل نے ایک شرط یہ بھی لگا دی کہ مروان کا جانشین خالد بن یزید ہوگا، اور جب تک یہ امر وقوع میں آئے، خالد حمص کا والی رہے جب یہ سب کچھ ہو لیا تو بنی سکون کے شیوخ میں سے ایک شیخ نے جس کا نام مالک ابن ہبیرہ الکلبی تھا اور خالد بن یزید کے بڑے خیر خواہوں میں سے تھا، بہت غرور اور بیباکی کے ساتھ مروان سے کہا "ہم تمہاری بیعت اُس طریقے سے نہیں کریں گے جو واقعی خلیفہ یعنی نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقرر کرنے کے وقت کی جاتی ہے، کیونکہ تمہارے عَلَم کے نیچے لڑنے میں ہم کو صرف دُنیا کا فائدہ ہے اگر تم ہمارے ساتھ اچھا برتاؤ کرو گے، جیسا کہ یزید اور معاویہ نے کیا تھا، تو ہم تمہاری مدد کریں گے ورنہ تم کو نقصان اٹھانا پڑے گا، اور ہم تمہاری عزت اور

[1] ڈنمارک میں بادشاہ کے انتخاب کے وقت جو شرائط کی جاتی تھیں ان کا مقابلہ ان شرطوں سے کرنا چاہیے دیکھو سی ایف ایلن کی "تاریخ ڈنمارک" مطبوعہ ۱۸۷۶ء جلد ۱ صفحہ ۱۸۵-۱۸۷

قرشیلوں سے زیادہ نہ کریں گے۔"

مجلسِ جابیہ ذیقعدہ ۶۴ھ (جون ۶۸۴ء) کے ختم ہونے پر برخاست ہو گئی یعنی اُس وقت یزید کی موت کو سات ماہ سے کچھ اوپر گذرے تھے۔ اب مروان قبائل بنو کلب سے غسان، سکاسک، سکون، اور دیگر یمنی قبیلوں کو ہمراہ لے کر ضحاک بن قیس کے مقابلے کو نکلے۔ ضحاک کے پاس اس وقت عثمان بن بشیر والیٔ حمص، اور زفر بن الحرث والی قنسرین اور ناتل بن قیس والیٔ فلسطین نے جو پہلے سے ضحاک کا ساتھ دے رہے تھے، اپنے اپنے لشکر کمک کے لیے بھیجے۔ زفر بن الحرث خود لشکر قنسرین کا رئیس بن کر ضحاک کے پاس گیا۔ مروان جس وقت ضحاک کے مقابلے کو روانہ ہونیوالے تھے تو ان کو خبر پہنچی تھی کہ بنو غسان کا ایک رئیس یزید بن انیس نامی جابیہ میں حاضر ہونے کی جگہ دارالحکومت (دمشق) میں چھپا بیٹھا رہا، جونہی اُسے معلوم ہوا کہ مروان خلیفہ ہو گئے، فوراً دمشق پر اُس نے قبضہ کر لیا، اور ضحاک جس شخص کو اپنا قائم مقام بنا کر وہاں چھوڑ گیا تھا، اُسے شہر سے نکال دیا۔ یہ قائم مقام ابن یسار حواس ہو کر شہر سے نکلا کہ خزانے کے مال کو بھی کہیں چھپا لے کے اوسان نہ رہے۔ غسانی سردار نے دمشق پر قبضہ پاکر مروان کو اپنی کارگذاری کی خبر دی اور بہت سے ہتھیار، روپیہ، اور سوار، مروان کی مدد کو دمشق سے روانہ کیے۔

فریقین کے لشکر، بلکہ یوں سمجھیے کہ جب دو بڑی قوموں کی فوجیں راہط کے میدان میں مقابلے پر آئیں تو بیس دن تک آپس میں خفیف لڑائیاں ہوتی رہیں اس کے بعد جنگ مغلوبہ شروع ہو گئی۔ ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ ایسی خونریز لڑائی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ قیسیوں کے اسّی رئیس، جن میں ضحاک بھی تھا، مارے گئے آخر کار یمانیہ نے قیسیہ کو کامل شکست دیدی [1]

[1] بعض مورخین نے لکھا ہے کہ مروان نے دھوکے سے صلح کا عہد توڑ کر یہ لڑائی جیتی تھی (باقی اگلے صفحے پر)

مرج راہط کی یہ لڑائی کبھی قیسیوں اور کلبیوں کے دل سے فراموش نہ ہوئی اور (۶۱)
اس لڑائی کے بہتر برس کے بعد گویا یہی لڑائی قیسیوں اور کلبیوں کی اسپین کے
ملک میں دوبارہ لڑی گئی۔ دونوں قوموں کے شاعروں کے لیے نظم کرنے کے
واسطے اس لڑائی سے بہتر دوسرا مضمون نہ تھا۔ ایک فریق فرطِ مسرت سے
نعرے لگا کر فتح و ظفر کا جوش دلوں میں پیدا کرتا تھا، دوسرا فریق اظہار رنج والم
کے بعد انتقام لینے کے لیے فریاد کرتا تھا۔

جس وقت بنی قیس میدان کارزار سے ہٹے تو زفر بن الحرث کے ساتھ بنو سلیم
(قیسی) کے دو رئیس تھے، کلبی قیسیوں کا تعاقب کر رہے تھے، ان تینوں ساتھیوں
میں سے صرف زفر کے گھوڑے میں اتنا دم تھا کہ کلبی اُسے نہ پا سکے۔ جس وقت
زفر کے ان دونوں ساتھی رئیسوں نے دیکھا کہ دشمن بالکل قریب آ گیا ہے تو وہ
چلائے زفر! زفر! ہم کو مرا سمجھ لے۔ زفر نے گھوڑے کو مہمیز کیا، خود بچ گیا مگر اس
کے دونوں ساتھی (بنو سلیم کے رئیس) کلبیوں کے ہاتھ سے قتل ہو گئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن شروع زمانے کے مورخ اس کے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ اگر مروان نے
اس قسم کی عہد شکنی کی ہوتی تو یہ مورخ ضرور معترض ہوتے۔ مقابلہ کرو ابو الفداء کی تاریخ مسلمانان
مترجمہ ریسکی، مطبوعہ ۱۷۸۹ء صفحہ ۱۱ اس تاریخ میں بیان ہوا ہے کہ مروان نے فتح پا کر اپنے آدمیوں کو
فراریوں کے تعاقب سے منع کر دیا تھا۔

اسناد

حماسہ صفحہ ۷۲ ، ۳۱۷ - ۳۱۹ ، ۶۵۸ - ۶۵۹

حماسہ (انگریزی) صفحہ ۳۴ - ۳۵

ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۱۷۰ - ۱۷۲

نقیبی صفحہ ۴۰۰

ابن الاثیر جلد ۳ صفحہ ۸۴

ابن بدرون صفحہ ۱۸۵

ابن عذاری جلد ۲ صفحہ ۸۴

اصطخری صفحہ ۱۳ - ۱۴ ، ۳۷

مبرّد صفحہ ۱۹۵

طبری جلد ۲ صفحہ ۲۵۴

ریحان صفحہ ۱۸۷ ، ۲۰۱ - ۲۰۲

عیسو دور صفحہ ۱۸

کتاب اول

خانہ جنگی

ساتویں فصل

خارجی اور شیعہ

مرج راہط میں فتح پا کر جب مروان ملک شام کا مالک ہو گیا، اور مصر پر قبضہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا تو زفر بن الحرث، بنی قیس کا سردار بن کر قرقیسیہ میں قلعہ نشین ہو گیا۔ یہ قلعہ جزیرے میں قنسرین سے مشرق میں دریائے خابور اور فرات کے اتصال پر واقع تھا قیسیوں میں اتنا دم تو تھا نہیں کہ کوئی بڑی لڑائی چھیڑ دیتے لیکن چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑتے اور شب خون مارتے رہے۔ بہر کیف قتل و غارت میں کسی طرح کی کمی نہ رہی۔ زفر کے ایک ماتحت سردار عمیر بن حباب کی سرکردگی میں قیسیوں نے دشت سماوہ میں بنی کلب کے خیمہ گاہ پر چھاپہ مارا، اور جو کلبی ملا اُسے زندہ نہ چھوڑا، یہاں تک کہ اُن کی عورتوں کو بھی قتل کیا۔ جب اس معرکے سے مال غنیمت لیے ہوئے بنی قیس اپنے مقام کو واپس آئے تو زفر خوش ہو کر کہنے لگا کہ کلبیہ! مصیبت اٹھانے کی اب تمہاری باری آئی ہے، انتقام لینا اب ہمارا کام ہے اور سزائیں بھگتنا تمہارا۔ اب سماوہ کے صحرا میں تم کو سلامتی

نصیب نہ ہوگی، یہاں سے بھاگو اور بنی بجدل کو بھی ساتھ لیتے جاؤ، اور اپنے لیے وہاں امن تلاش کرو جہاں کمینے غلام زیتون کے باغوں میں محنت و مشقت کرتے ہیں لہ"

باوجود اس کے قیسیوں کا اقتدار بنو کلب کے مقابلہ میں گھٹا ہوا تھا، یہ سچ ہے کہ قرقیسیہ والوں کی زیادتیوں سے لوگ خوفزدہ رہتے تھے، مگر پھر بھی یہ مقام قزاقوں کی ایک آماجگاہ سے زیادہ نہ تھا، جو مروان کے لیے کسی بڑے تردد کی وجہ نہ ہو سکتا تھا۔ مروان کو جس بات کا اس وقت سب سے زیادہ خیال تھا وہ عراق کا مغلوب کرنا تھا، کیونکہ یہاں جو دشمن پیدا ہوئے تھے وہ اور ہی قماش کے تھے۔

عراق اس وقت عجیب عجیب پیچیدہ مسائل اور طرفہ خیالات کا دنگل بنا ہوا تھا۔ طرح طرح کے مفرط اور حد سے گزرے ہوئے مذہبی عقائد رواج پانا چاہتے تھے۔ توریث و انتخاب، مطلق العنان بادشاہی اور قومی حریت، جمہور کی سیادت اور حق حکومت منجانب اللہ، شدید مذہبی تعصب اور دین سے بے پروائی، غرض ان میں کا ہر خیال باقی خیالات پر غالب آنے کی کوشش میں سرگرم تھا۔ فاتح عرب مفتوح ایرانی، غریب و امیر، وہمی و متشکک، سب ایک دوسرے سے آمادۂ پیکار تھے۔ اولاً اعتدال پسند گروہ تھا جسکو نہ بنی امیہ سے محبت تھی اور نہ ابن زبیر سے کچھ انس تھا۔ عراق میں شاید ہی کوئی متنفس ہو جس کے دل میں ابن زبیرؓ کی عزت ہو لیکن چونکہ تمام کوششیں اس امر کی کہ بصرہ میں اہل عراق کی کوئی قومی حکومت علیحدہ قائم ہو، بیکار ثابت ہو چکی تھیں۔ اس لیے اعتدال پسند گروہ نے ابن زبیرؓ کی خلافت کو اس لیے تسلیم کر لیا کہ وہی ایک ایسے شخص نظر آتے ہیں جو ملک میں کسی قسم کا انتظام قائم رکھ سکیں۔

لہ مقابلہ کرو۔ نوجرنل الشیاٹک جلد ۱۳ صفحہ ۳۰۹

اِس گروہِ معتدل کا ایک فریق تو ایسا تھا جس کا تعلق مذہب کے ساتھ اگر کچھ تھا تو وہ بہت ہی ضعیف تھا۔ اس فریق کا اصلی مقصد صرف اتنا تھا کہ آرام و آسائش سے زندگی بسر ہوتی رہے۔

دوسرا فریق اس گروہ کا ایسا تھا جو پہلے فریق سے بھی زیادہ مذہب اور عاقبت کی طرف سے بے پرواہ تھا۔ اس کے لوگ مذہب میں سرگرمی کی بجائے مذہبی شکوک میں مبتلا رہنے کو زیادہ پسند کرتے تھے، انکار کو امیدِ آخرت پر ترجیح دیتے تھے۔ جس خدا کو وہ پوجتے تھے اور جس کے حضور میں قربانیاں چڑھاتے تھے وہ صرف اس بات کا خدا تھا کہ عیش و اطمینان نصیب رہے اور نفس کی خواہشیں پوری ہوتی رہیں۔

عمر بن ابی ربیعہ کے خوش بیان اور ظریف قلم نے اس گروہِ اعتدال پسند کے خیالات تحریر کیے ہیں۔

بصرہ کے دو مقتدر اور ذی اثر شرفا یعنی احنف اور حارثہ اس گروہ کے دونوں فریقوں کا صحیح صحیح نمونہ تھے، انھیں سے باقی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

احنف کا تذکرہ اس زمانہ کی تاریخ میں اکثر آیا ہے، لیکن یہ تذکرہ محض ایک معلّم اخلاق اور ناصح ہونے کی حیثیت سے ہوا ہے۔ احنف کا کام ہمیشہ تقریر کرنا تھا، عمل سے بحث نہ تھی۔ اس حیثیت سے کہ وہ بنی تمیم کے سردار تھے، تمام تمیمی اُن کی بجد عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ امیر معاویہؓ کہا کرتے تھے کہ "اگر احنف کو کسی بات پر غصہ آگیا تو سو ہزار تمیموں کو فوراً غصہ آجائے گا، اور کوئی اتنا نہ پوچھے گا کہ آخر اس غصہ کا سبب کیا تھا۔" لیکن خوش قسمتی سے احنف کو غصہ آتا ہی نہ تھا۔ اُن کا تحمل ضرب المثل تھا، یہاں تک کہ جب وہ اپنی قوم یعنی بنو تمیم کو مسلح ہونے کا حکم دیتے تھے تو سمجھا جاتا تھا کہ اپنی حسین معشوقہ زبرہ کے خوش کرنے کے لیے انھوں نے یہ حکم دیا ہے۔ زبرہ اُن پر بڑے ظلم سے حکومت کیا کرتی تھی اُن کی قوم والے ایسا حکم سن کر کہا کرتے تھے کہ "آج زبرہ کا مزاج بگڑا ہوا معلوم

ہوتا ہے "چونکہ احنف کی ہر بات میں اعتدال تھا اس لیے اُن کے مذہب نے بھی انتہائے سرگرمی اور قطعاً بے تعلقی کے بین بین اپنا رستہ نکالا تھا وہ اپنے گناہوں کا کفارہ خود جسمانی اذیت اٹھا کر کیا کرتے تھے، لیکن یہ اذیت سخت نہ ہوتی تھی، ہر گناہ کی پاداش میں چراغ کی لَو میں سے اپنے ہاتھ کی ایک انگلی جلدی سے گذار دیتے تھے، اور درد سے ایک ہلکی سی آہ بھر کر کہتے تھے کہ پھر گناہ ہی کیوں کیا تھا؟" انھوں نے جوانی سے اپنا یہ قاعدہ رکھا تھا کہ ایک محتاط مگر مستقل انانیت اُن کی رہنما رہے، مگر نہ اتنی کہ نوبت کسی ریاکاری یا جرم تک پہنچ جائے۔ اگر کسی فریق کے نزاعی معاملات سے بحث ہو تو جہاں تک ممکن ہو "طرف داری" کا پہلو ہاتھ سے نہ جائے۔ حکومتِ وقت کو خواہ وہ ناجائز ہی کیوں نہ ہو، بغیر اعتراض یا خوشامد یا طلبِ منفعت کے ہمیشہ تسلیم کر لیا جائے۔ یہ کل قواعد جوانی میں انھوں نے اپنے لیے وضع کیے تھے اور پھر تمام عمر اُن میں سرِ مُو فرق نہ آنے دیا۔ اُن کی طبیعت میں نہ ہمدردی تھی، نہ پارسائی، نہ علو ہمتی پھر بھی یہ محدود خیال، موقعے کے دیکھنے اور اپنی خیر منانے والے بزرگ جو نہ کسی دوسرے میں گرمجوشی پیدا کر سکتے تھے، نہ خود کسی جوش و جذبہ سے متاثر ہوتے تھے، سب کے ممدوح تھے۔ سب لوگ ان کی نیک مزاجی، خوش اخلاقی (۷۹) اور صلح پسندی کی تعریف کرتے تھے۔

شرفائے جاہلیت کا ایک بڑا روشن اور فخر کی نمونہ حارثہ تھا۔ لوگوں میں وہ صاحبِ خمر مشہور تھے، لیکن اگر کوئی ان کو یہ بات جتاتا تھا تو برا نہ مانتے تھے۔ جب کبھی حاکم مقرر کیے جانے کے لیے کسی علاقہ یا ملک کا پسند کرنا ان کی رائے پر چھوڑا گیا تو وہ ہمیشہ ایسا مقام پسند کرتے تھے جہاں شراب عمدہ سے عمدہ میسّر

مصنف نے بے فائدہ ان بزرگوں کی نسبت سخت الفاظ استعمال کیے، ایک مورخ کی شان کے خلاف ہے کہ محض ضعیف شہادتوں کی بنا پر ایسے سخت فیصلے لکھے (مترجم)

آگے حارثہ کے مذہبی خیالات اُن کے دوستوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ ایک شاعر نے جو اُن کا عزیز بھی تھا، کہا تھا کہ " وہ موقع بھی عجیب ہوتا ہے جب حارثہ لوگوں کو نماز پڑھاتا ہے، یہ وہ شخص ہے جس کا مذہب ایک وہم باطل سے زیادہ نہیں " لیکن حارثہ کا حُسنِ اخلاق عدیم المثال تھا۔ اس کی تقریر قابلِ تعریف اور پسند آموز ہوتی تھی۔ علاوہ اس کے وہ اہلِ عراق میں دلیری و شہزوری میں مشہور تھا۔ گو یہ سچ ہے کہ عراق کے لوگ بالعموم ایسے تھے جن کی شجاعت کی تصدیق ناممکن تھی عبیداللہ بن زیاد کے زمانۂ حکومت میں دو ہزار عراقی چالیس خارجیوں کے مقابلہ میں بھیجے گئے، مگر ان دو ہزار کی ہمت نہ ہوئی کہ چالیس کا مقابلہ کرتے۔ عراقی ہزار یہ کہنے لگا کہ عبیداللہ کی زبان سے ملامت سننے کو میں اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ وہ میرے جنازہ کی نماز پڑھائے "

دوسرے دو بڑے گروہوں یعنی خارجیوں اور شیعوں میں بڑے سچے اور مضبوط اعتقاد کے لوگ موجود تھے۔ یہ دونوں گروہ ایک ہی مقام سے چلے تھے، لیکن جوں جوں آگے بڑھتے گئے اُن میں فرق بڑھتا گیا، یہاں تک کہ کچھ زمانہ کے بعد مذہب اور خلافت کو جن نگاہوں سے وہ دیکھنے لگے وہ ایک دوسرے سے بالکل جدا اور مختلف تھیں۔

خارجی نہایت شریف اور پُرجوش طبیعتیں رکھتے تھے اور انھوں نے ایسے زمانہ میں جبکہ خود غرضی اور جاہ طلبی کا طوفان برپا تھا، اپنے مذہب کی پاکیزگی اور نفاست کو قائم رکھا۔ اُن کے دل ابھی تک دنیا کی چیزوں پر جمے نہ تھے اور خدا کا خیال ان کی نظر میں ایسا بلند و بالا تھا کہ محض دکھاوے کی عبادت اور رسمی پارسائی میں کاہل وجود ہو کر وہ خواب آلودہ نہ ہوئے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیرو تھے۔ جیسے کہ آپ زمانۂ بعثت کی ابتدا میں تھے، جبکہ نیکی اور دین ہی آپ کی روح میں متمکن تھا، اور آنحالیکہ مدینے کے لوگ ایسے رسول کے معتقد

تھے جو تلوار کے زور سے دنیا کو مفتوح کرنا چاہتا تھا۔ اُس زمانہ میں جبکہ اسلام کی
وسیع سلطنت میں آپس کی خانہ جنگیاں ملکوں کو تہ و بالا کر رہی تھیں، اور ہر ایک
قبیلہ کو اپنی شرافتِ نسب کے زعم میں سلطنت کا دعویٰ ہوتا تھا، اس وقت خارجی
ہی تھے جو مضبوطی سے قرآن پاک کے اِن حسین الفاظ کے پابند تھے کہ "سب
مسلمان بھائی بھائی ہیں" وہ کہتے تھے کہ "ہم سے یہ نہ پوچھو کہ ہم قیس کی اولاد میں (۸۰)
ہیں یا تمیم کی، ہم ابنائے اسلام ہیں، ہم توحید پر ایمان رکھتے ہیں، اور خدا انہی بندوں
سے خوش ہوتا ہے جو اس کے منت گذار ہوتے ہیں۔"

خوارج اگر مساوات اور اخوت کے اصول پر زور دیتے تھے تو اس کی وجہ یہ
تھی کہ اُن میں اکثر لوگ اہلِ حضر تھے، رئیس اور امیر نہ تھے۔ اپنے معاصرین کو دیکھ
کر کہ اُن کے اخلاق کیسے خراب ہو گئے ہیں، اور کس طرح انھوں نے بغیر افسوس اور
شرم کے اپنے نفوس کو بدکاری و لذت پرستی پر اس یقین کے ساتھ وقف کر رہا
ہے کہ نماز عمرہ و حج ادا کرنے سے سب گناہ دُھل جاتے ہیں، خارجیوں نے اس بات
کا وعظ کہنا شروع کیا کہ ایمان بغیر اعمالِ نیک کے ایک بے جان جسم ہے اور یہ کہ
گنہگار اور منکر دونوں دوزخی ہیں۔ اس مسئلہ کی نسبت کہ مذہب گناہوں کو پاک
کر دینے کی کہاں تک طاقت رکھتا ہے؟ نہایت مبالغہ آمیز خیالات مروج ہو چلے
تھے مذہب اس زمانہ میں "ڈی ازم" سے زیادہ کچھ معنی نہ رکھتا تھا۔ جن لوگوں نے

یہاں مصنف نے رسولِ خدا صلعم کی نسبت نہایت سخت الفاظ لکھے ہیں، جو اس کے تعصب اور
تنگدلی کی دلیل ہیں۔ میں نے ان کا ترجمہ حذف کر دیا ہے۔ عیسائیوں کے نزدیک مذہب میں ترک دنیا اور رہبانیت
کا عنصر ایسا ضروری ہے کہ وہ کسی ہادی مذہب کو دنیا کے کاموں اور انتظام میں مصروف دیکھنا گوارا
نہیں کر سکتے اس غلط بنا پر عیسائی ہمیشہ پیغمبر اسلام کو بُرا کہہ کر خود بدنما ثابت ہوئے ہیں (مترجم)
ڈی ازم" عیسائیوں میں ایک اعتقاد تھا جس میں خدا کے وجود کا اقرار تھا، لیکن الہام یا اس بات
سے کہ اناجیل کے معنی عقلی طور پر بھی بیان کیے جاسکتے ہیں انکار تھا (مترجم)

اخلاق کی رسی کو ڈھیلا پکڑا تھا اگر اُن کو جنت میں جانے کا کبھی خیال گذرتا تھا تو اس میں داخل ہونا وہ بہت آسان سمجھتے تھے۔ خواجہ حسن بصری نے ایک روز مشہور شاعر فرزدق[1] سے جبکہ دونوں ایک میت کے ساتھ جا رہے تھے، پوچھا کہ "اے فرزدق! اس دن کے لیے تم نے کیا تیاری کی ہے؟ فرزدق نے جواب دیا کہ "صرف وہ شہادت جو ساٹھ برس سے خدا کے واحد ہونے پر دیتا آیا ہوں" خوارج کو ایسے جواب پر غصہ آتا تھا، اور وہ کہتے تھے کہ " اگر یہ صحیح ہے تو پھر شیطان بھی دوزخ سے بچ جائے گا، کیا اس کو خدا کے واحد ہونے کا یقین نہیں ہے۔

ایسی سوسائٹی میں جس کو ہم بت پرست، متلون، سبک اطوار، ملحد و شکک کہنا درست تھا۔ ایک ایسے مذہب کا نمودار ہونا جو اسلام کی مثل جوش و خروش اور قواعدِ اخلاق سخت رکھتا ہو، ایک قسم کی بدعت سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ شک و الحاد بعض وقت حکمت و فلسفہ کو درمیان لاکر زہد و پارسائی کو اسی طرح واجبُ القتل قرار دیتا ہے جس طرح کہ زہد و پارسائی بعض وقت خدا کا فرمان سنا کر حکمت و فلسفہ کو قابلِ دار ٹھیراتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ گورنمنٹ کو قدرتی طور پر ایک ایسے گروہ سے خوف پیدا ہوا جو عام خلائق میں ہر قسم کے فرق اور تمیز کو مٹا کر سب کو ایک ہی سطح پر لانا چاہتا تھا۔ خلفائے بنی امیہ شاید اِن خوارج کی طرف سے بے پرواہی برتتے بلکہ عجب نہ تھا کہ اُن کے مُربی و سرپرست بن جاتے، لیکن خوارج نے یہی نہیں کیا کہ حضرات طلحہؓ، زبیرؓ، علیؓ اور عائشہ صدیقہ کو جو معتدل گروہ کے بانی تھے ... ... دُنیا طلب اور منافق ہونے کا الزام دیتے، بلکہ وہ اس حد سے بھی گذر لیے اور بنی امیہ کو بھی انھوں نے مدینہ کے مسلمانوں کی طرح منکرِ دین مشہور کر دیا

[1] ہمام بن غالب الفرزدق عرب کا مشہور شاعر ہے ۳۵ھ/۶۵۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۱۰ھ/۷۲۸ء میں وفات پائی خواجہ حسن بصری کا انتقال بھی اسی سال ہوا (فرجرنل ایشیاٹک جلد ۱۳ صفحہ ۵۴۳)

اور اس مسئلہ پر کہ صرف قریشیوں کو استحقاقِ خلافت حاصل ہے اعتراض کر کے علانیہ کہہ دیا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں اس بات کا حکم نہیں دیا کہ دینی و دنیوی سرداری صرف قریشی کے ہاتھ میں رہنی چاہیے۔ خوارج کہتے تھے کہ ہر ایک مسلمان خواہ وہ شریف سے شریف قبیلہ کا ہو، خواہ ادنیٰ سے ادنیٰ طبقہ کا، خواہ قریشی ہو خواہ غلام سزاوارِ خلافت ہو سکتا ہے۔ یہ عقیدہ نہایت خطرناک اور تمام نظمِ حکومتِ اسلام کی بیخ کنی کرنے والا تھا۔ خوارج نے اسی پر بس نہیں کی، بلکہ وہ اب ایسے طرزِ حکومت کے تصور میں محو ہو گئے جو بہمہ وجوہ مکمل ہو، اور حریت کے جوش میں کہنے لگے کہ خلیفہ کی ضرورت محض بدکاروں کی اصلاح کے لیے ہوا کرتی ہے، چونکہ سچے مومنوں کے اعمال ہمیشہ نیک ہوتے ہیں اس لیے ان کو خلیفہ کی ضرورت ہی نہیں۔ بس عراق کی گورنمنٹ اور عراق کے رئیسوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس گروہِ خوارج کو اور اس کے معتقدات کو صفحۂ ہستی سے قطعاً نیست و نابود کر دینا چاہیے اور اب اُمراءِ عراق گورنمنٹ عراق کی مدد کے لیے خوارج کے غارت کرنے پر اس طرح کمر بستہ ہو گئے جیسے کہ اُمراءِ شام بنی اُمیہ کے مددگار بن کر صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غارت کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ چنانچہ عبید اللہ بن زیاد نے خوارج پر سخت ظلم و ستم شروع کیے، اس ملحد فلسفی (عبید اللہ) نے جو اس سے پہلے رسولِ خدا کے نواسے کے منصوبۂ قتل کو تکمیل تک پہنچا چکا تھا، خوارج کے خون کے دریا بہا دیے گو دل میں خوب سمجھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیرو یہی لوگ ہیں[1]، خوارج کی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ کوئی ان کو مغلوب نہ کر سکتا۔ حال ہی میں حضرت علیؓ سے دو لڑائیوں میں ان کو شکست ہو چکی تھی، اور اب علانیہ اپنے عقائد (۸۱)

---

[1] ڈوزی کا یہ خیال درست نہیں کیونکہ نہ ابن زیاد کے دل میں ایسا سمجھنے کا کوئی ثبوت موجود ہے اور نہ دراصل اپنے بعض خیالاتِ فاسدہ اور عقائدِ باطلہ کے باعث خوارج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے پیرو تھے (اسماعیل)

کی اشاعت بھی انھوں نے بند کر دی تھی، اور سب سے علیحدہ رہنے لگے تھے اپنے سردار کو بھی انھوں نے اس بنا پر معزول کر دیا تھا کہ وہ اپنے گروہ کی بیکاری اور غیروں سے اتحاد رکھنے کو ناپسند نہ کرتا تھا۔ باوجود اس حالت کے خوارج کے دشمنوں کو معلوم تھا کہ اس راکھ کے ڈھیر میں آگ کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اور جب موقع آئے گا وہ بھڑک اُٹھیں گی۔ اب خوارج نے خفیہ طور پر اپنے عقائد کو پھیلانا شروع کیا، اُن کی تقریریں غضب کی فصاحت و بلاغت ہوتی تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ جو وہ کہتے تھے دل سے کہتے تھے۔ عبیداللہ بن زیاد سے جب لوگوں نے کہا کہ یہ خوارج ایسے خطرناک نہیں ہیں کہ اُن کے تدارک میں سختی کی ضرورت ہو تو اس نے جواب دیا کہ "نہیں ان کے مذہب کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دینا ضروریات سے ہے۔ جس قدر تمھارا خیال ہے اُس سے کہیں زیادہ یہ لوگ خطرناک ہیں۔ ان کے ہلکے سے ہلکے لفظ پر بھی لوگوں کے دل جوش کھانے لگتے ہیں، اور وہ اس طرح مشتعل ہو جاتے ہیں جیسے پتنگا پھوس میں آگ بھڑکا دے۔"

خوارج نے نہایت ہولناک آزمائشوں کو ایسی ثابت قدمی اور تحمل سے برداشت کیا جو قابل تعریف تھا۔ اُن کو اپنی طبیعتوں پر قابو تھا اور رضاء الٰہی پر بھروسا، یہ لوگ قرآن کی آیتیں پڑھتے اور اللہ کے جاہ و جلال کو پکارتے ہوئے بڑے مضبوط قدموں سے مقتل کی طرف بڑھتے تھے، اور جلاد کی ضرب شمشیر کو پوری ہمت سے اپنی گردن پر لیتے تھے، جان تک بچانے کے لیے اپنے قول سے نہ پھرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک سرکاری عامل نے بازار میں ایک خارجی کو گرفتار کیا، خارجی نے کہا مجھے اتنی مہلت دو کہ میں گھر جا کر وضو کر کے نماز پڑھ لوں۔" عامل نے کہا "مگر تمھاری واپسی کا کون ذمہ دار ہے؟" خارجی نے جواب دیا "اللہ"۔ عامل نے اس کو اجازت دے دی اور وہ گھر سے نماز پڑھ کر حسب وعدہ عامل کے پاس چلا آیا۔ ایک اور خارجی جو قید خانہ میں تھا اس کی عبادت و خوش بیانی کو دیکھ کر داروغۂ محبس کو حیرت ہو گئی اور وہ بے اختیار کہہ اٹھا کہ "بے شک

تمہارے عقائد بہت اعلیٰ اور افضل ہیں، میں تمہارے ساتھ اتنا سلوک کر سکتا ہوں کہ رات کے وقت تم کو اپنے بال بچوں میں رہنے کی اجازت دیدوں، تم روزانہ شام کو اپنے گھر جا سکتے ہو بشرطیکہ صبح ہوتے ہی قید خانے میں واپس آجانے کا وعدہ کرو۔" قیدی نے وعدہ کیا، اور اب داروغہ روزانہ آفتاب غروب ہوتے ہی اُس کو اپنے گھر جانے کی اجازت دے دیتا، اور وہ صبح ہوتے ہی قید خانہ کو واپس آجاتا۔ ایک رات کو یہ قیدی اپنے گھر میں بیٹھا ہوا تھا کہ اُس کے چند ملنے والے آئے اور کہنے لگے کہ آج ہمارے گروہ میں سے کسی نے سرکاری جلاد کو قتل کر دیا ہے، عامل شہر اس خبر کو سن کر سخت برہم ہوا ہے، اور اُس نے حکم دیا ہے کہ جس قدر خارجی اس وقت قید خانہ میں ہیں اُن سب کو قتل کر دیا جائے۔ اتنا سنتے ہی قیدی کے بیوی اور بچے اور عزیز اُس سے کہنے لگے کہ اب تم حسب معمول صبح کو قید خانہ نہ جانا، اگر گئے تو جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا ہوگا۔ مگر قیدی نے کسی کی بات نہ مانی اور یہ کہہ کر کہ "اپنے قول سے پھر کر میں خدا کو کیا منہ دکھاؤنگا" وہ صبح ہی اُٹھ کر قید خانہ چلا گیا، جب اپنی کوٹھری کے قریب پہنچا تو داروغہ مجلس کو دیکھا کہ وہ بہت ہی بدحواس کھڑا ہے، قیدی نے فوراً اُس سے کہا کہ "آپ گھبرائیں نہیں، مجھ کو آپ کے آقا یعنی عامل شہر کا حکم معلوم ہوگیا تھا،" داروغہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا "کیا تم کو حکم معلوم ہوگیا تھا اور پھر بھی تم واپس چلے آئے؟" داروغہ یہ حال معلوم کر کے سکتہ کے عالم میں رہ گیا۔

عورتوں کی ہمت اور دلیری بھی مردوں کے برابر تھی، بلجہ ایک بڑی عابدہ اور زاہدہ خارجی عورت تھی۔ لوگوں نے اُس سے کہا کہ کل عبید اللہ ابن زیاد کی زبان پر اُس کا نام آیا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عنقریب قتل کر دی جائے گی عزیز و اقارب سمجھانے لگے کہ کہیں چھپ کر بیٹھ رہے، لیکن بلجہ نے روپوش ہونے سے قطعی انکار کیا اور کہنے لگی کہ اگر ابن زیاد نے مجھے گرفتار کیا تو یہ اس کے

حق میں بُرا ہوگا کیونکہ خدا اُس کو اِس جرم کی سخت سزا دے گا، میں یہ نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے کوئی بھائی مصیبت میں گرفتار ہو۔ غرض چپ چاپ خُدا کی مرضی پر راضی ہو کر وہ جلادوں کی منتظر ہو گئی جنھوں نے اُس کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اُس کی لاش کو بازار میں پھینک دیا۔

اِس حیرت انگیز ثابت قدمی، ہمت اور ایمان کی مضبوطی نے انصاف پسند لوگوں میں خوارج کی بہت عزت پیدا کر دی۔ بعض موقعوں پر جلادوں نے بھی قتل کرتے وقت اُن کو عزت کی نگاہ سے دیکھا، اور اُس ہاتھ پر بھی جو تلوار اٹھائے سر قلم کرنے کو ہوتا تھا۔ ایک خوف اِس بات کو دیکھ کر طاری ہوتا تھا کہ مظلوم کا دل جوشِ صدق سے کیسا لبریز ہے۔ صورت زرد ہے، کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے، مگر ایمان کا ایک نور ہے جو سر سے پاؤں تک برس رہا ہے۔ لیکن تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ خوارج کی استواری ایمان و اعتقاد کو دیکھ کر جو عزت اور خوف جلادوں کے دل میں پیدا ہوتا تھا، اُس کی جگہ اب صرف خوف اور وہ بھی اپنی جان کا باقی رہ گیا۔ اِن آفت رسیدہ خارجیوں نے درپردہ اپنی ایک جماعت قائم کی جس کا ہر شخص باہمی مشورہ کر لینے کے بعد کوئی کام کرتا تھا۔ چنانچہ جس روز سرکاری حکم سے کوئی خارجی قتل کیا جاتا تھا اُس کے دوسرے ہی دن کسی جلاد کا سر بھی اُتار لیا جاتا تھا۔ یہ گویا ابتدا تھی کہ آگے چل کر پوری قوت سے مقابلہ کیا جائے گا لیکن خوارج میں جو لوگ زیادہ پرجوش تھے وہ اِس ابتدائی کیفیت سے مطمین نہ تھے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ خارجیوں میں بلکہ عام طور پر تمام مسلمانوں میں کسی جُرم کی سزا کو خاموشی سے برداشت کر لینا کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک قسم کی کمزوری سمجھی جاتی تھی۔ مسلمانوں کا مذہب اور عیسائیوں میں رومن کیتھولک مذہب ایک خفیف سے اختلاف معنی کے ساتھ دونوں جنگی مذہب ہیں۔ خوارج میں وہ لوگ جن کو زیادہ غلو تھا، اپنے گروہ کے معتدل مزاج لوگوں کو ملامت کرتے تھے کہ وہ کیوں اغیار سے جو کافر و قزاق ہیں راہ و رسم رکھتے ہیں، یہ اُن کی نامردی اور حرصِ دنیا

ہے کہ وہ غیروں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ شعرا بھی اس قسم کے لوگوں کو برا کہتے تھے عہد یزید میں جس وقت یہ خبر گرم ہوئی کہ مسلم بن عقبہ عنقریب مدینہ اور مکہ پر حملہ کرنیوالا ہے تو شاعروں نے ان مقدس مقامات کی حفاظت پر لوگوں کو آمادہ کرنے کے لیے اشعار لکھ کر ہر طرف بھیجے۔ مدینہ اور مکہ کے معرکوں نے خوارج کے اس گروہ کی تقدیر کا فیصلہ کردیا جس کا بڑا رکن اس زمانہ میں نافع بن ازرق تھا۔ نافع نے اپنے دوستوں کو جمع کیا اور مکہ و مدینہ کی پاک زمین کو بچانے کے لیے ابن زبیر کی کمک پر پہنچ گیا ابن زبیر نے یہ کہہ رکھا تھا کہ شام کے عربوں سے لڑنے کے لیے وہ ہر شخص سے مدد لینے کو تیار ہوں گے اس میں چاہے اہل دیلم، ترک، کافر، اور حبشی لوگ ہی کیوں نہ ہوں چنانچہ جب نافع اپنے ساتھیوں کو لیے ہوئے مکہ پہنچا تو ابن زبیرؓ نہایت کشادہ دلی کے ساتھ اس سے ملے اور نافع کو یقین دلایا کہ وہ نئے عقائد کے خود بھی معتقد ہو گئے ہیں[1] جب تک مکہ کا محاصرہ جاری رہا، خوارج نے شجاعت کے بڑے بڑے جوہر دکھائے لیکن بعد میں ان کو یقین ہو گیا کہ ان میں اور ابن زبیرؓ میں اتفاق رہنا ممکن نہیں اسلیے نافع اور اس کے ہمراہی مکہ سے بصرہ کو واپس چلے آئے اور جب عام بدنظمی بڑھی تو بصرہ چھوڑ کر خوزستان کے علاقہ اہواز میں آکر آباد ہو گئے اور یہاں کے تمام سرکاری عہدہ داروں کو انھوں نے نکال باہر کیا۔

اب وہ وقت آیا کہ خوارج بالخصوص وہ خوارج جو اہواز میں آباد ہوئے تھے۔ اور نافع کے باپ ازرق کے نام سے ازارقہ مشہور ہوئے تھے، انھوں نے اس بات ہی کو کافی سمجھا کہ ایسے تمام عربی گروہوں سے جو ان کے ہم عقیدہ نہ تھے قطعی علیحدگی اختیار کی جائے۔ بلکہ انھوں نے اس امر کا اعلان کر دیا کہ غیروں میں بود و باش رکھنی ان کے ہاتھ کا ذبیحہ ان کے ساتھ شادی بیاہ کرنا سب حرام ہے۔ برسوں سے ظلم اٹھاتے اٹھاتے یہ لوگ انتقام کے پیاسے ہو گئے، اور طبیعتوں میں ظلم و وحشت کی

---

[1] ابن زبیر نے یقین نہیں دلایا بلکہ خود نافع کو شبہ ہوا کہ ابن زبیر اس کے ہم خیال ہو جائیں گے ۔ مترجم

زیادتی ہوگئی، قرآن کے معنی اس طرح کہنے لگے جیسے اٹھارویں صدی عیسوی میں انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے لوگوں نے انجیل کے معنی کہنے شروع کیے تھے جن کے بموجب نبیوں سے عداوت رکھنی ایک امر جائز تھا۔ تمام عرب جو گروہ خوارج سے باہر ہوں، وہ کافر تھے یا گنہگار، اور کافر اور گنہگار ایک ہی بات تھی۔ پس اگر یہ کافر یا فاسق خدا کے پسندیدہ لوگوں کو نہ مانیں تو اُن کو غارت کر دینا ضروری تھا کسی کی جان کو سلامتی نہ دی جائے، نہ مرد، نہ عورت، نہ بچّے کو، جو ماں کی چھاتی سے لگا ہو، کیونکہ قرآن میں حضرت نوحؑ کی زبانی آیا ہے[1]

ایک وقت وہ تھا کہ لوگ خوارج کو غارت کرنے کے درپے تھے، اب یہ وقت آیا کہ خوارج لوگوں کو غارت کرنے کی فکر میں ہوگئے۔ پہلے جو شہید ہوا کرتے تھے اب وہ خود جلاد بن گئے اور بہت جلد خون کے دریا بہاتے ہوئے بصرہ کی طرف بڑھے بصرہ والوں کا ڈر کے مارے بُرا حال ہوا یہاں کے لوگ اپنی بزدلی کا اقرار بڑے حکیمانہ طور پر کیا کرتے تھے دشمن کے مقابلہ کے لیے سوائے اپنی ہی دلیری اور اپنی ہی فوج کے اُن کے پاس دوسری چیز نہ تھی۔ کیونکہ یہ زمانہ وہ تھا کہ اپنی ہی فوج کے اُن کے پاس دوسری چیز نہ تھی۔ کیونکہ یہ زمانہ وہ تھا کہ بنی اُمیہ کی حکومت کو وہ بصرہ سے اُٹھا چکے تھے اور ابن زبیر سے ابھی تک بیعت کی نہ تھی۔ معاملات کو اور بھی زیادہ خراب کرنے کے لیے بصرہ والوں کو غلط مشورے دیے گئے، اور انھوں نے ایک قرشی کو جن کا نام ببہ[2] تھا اپنا امیر بنا لیا، یہ شخص اگرچہ بہت فربہ تھا مگر ذی وقعت انسان

[1] یعنی اے رب زمین پر کافروں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑ، کیونکہ اگر تو نے انہیں چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور صرف گنہگاروں اور کافروں کو دنیا میں پیدا کریں گے

[2] اس نام کی اصلیت معلوم کرنی ہو تو دیکھو ثعلبی کی کتاب لطائف المعارف (اڈیشن ڈی جونگ صفحہ ۲۷)

نہ تھا، چونکہ اس وقت جان و مال اور اہل و عیال سب معرضِ خطر میں تھے، اس لیے موقع ہی ایسا آیا کہ بصرہ والوں میں خواہی نخواہی کسی قدر ہمت آجائے۔ چنانچہ وہ دشمن کے مقابلہ کے لیے اپنے شہر سے ایسی جرأت و دلیری سے نکلے کہ اس سے پہلے کسی معرکہ میں یہ باتیں اُن سے کم ظاہر ہوئی تھیں۔ مقام دولاب کے قریب خوارج سے مقابلہ ہو گیا۔ ایک مہینے تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ سردارِ خوارج نافع بن ارزق اس معرکہ میں مارا گیا، اہل بصرہ کے تین فوجی سردار بھی یکے بعد دیگرے کام آئے، لیکن اب بصرہ والے اس طویل لڑائی سے گھبرا اُٹھے اور متعدد معرکوں کے بعد بھی کسی قطعی نتیجے کے نہ پیدا ہونے سے ہمت ہار چلے۔ چونکہ غیر معمولی کاوش اٹھانی پڑی تھی اس لیے جلد تھک کر یہ بات محسوس کرنے لگے کہ دراصل اپنی قوت کا صحیح اندازہ کرنے میں اُن سے غلطی ہو گئی تھی۔ غرض اس سوچ بچار کے بعد وہ اپنے گھروں کو واپس چلے آئے اس کے بعد عراق پر خوارج کا ضرور قبضہ ہو جاتا، لیکن حارثہ نے اپنی قوم والوں کے ساتھ جو بنی غدان کے نام سے مشہور تھے، دشمن کا راستہ روک دیا۔ حارثہ نے اپنے ہمراہیوں سے کہا " اگر بصرہ والوں کو خوارج کے پنجے میں چھوڑ دیا تو سمجھ لو کہ یہ رسوائی ایسی ہو گی جو کبھی دور نہ ہو سکے گی " حارثہ حکومت کی طرف سے امیر لشکر نہ تھا، یہ اس کا ذاتی جوشِ حمیت تھا کہ اس نے عراق کو غارت ہونے سے بچا لیا، اگر بہرکیف خوارج کی طرف سے خطرہ باقی رہا۔ بصرہ والے سوچتے تھے کہ خدا جانے حارثہ کو کس دن شکست ہو جائے، اگر ایسا ہوا تو پھر ان خوارج کو شہر میں داخل ہونے سے کوئی چیز نہ روک سکے گی۔ پس اُنھوں نے اپنی خیر اسی میں دیکھی کہ اپنی فوجی قوت کو ابن زبیر کے ساتھ شریک کر کے ابن زبیر کے ہاتھ پر بیعت کر لیں، چنانچہ ایسا ہی کیا بھی۔ اب ابن زبیر نے ایک شخص کو امیر مقرر کر کے بصرہ بھیجا اس نے اپنے بھائی عثمان کو امیر لشکر بنایا۔ جب عثمان اپنا لشکر لیے ہوئے میدان میں پہنچا تو دشمن کی فوج کو اپنے مقابلہ میں کم پایا، فوراً حارثہ سے جو اس وقت لشکر عراق کے ساتھ تھا کہنے لگا " حارثہ! کیا دشمن کی فوج بس اتنی ہی ہے؟ حارثہ نے

جواب دیا "اے امیر تم خوارج سے بخوبی واقف نہیں ہو اتنی ہی فوج سے وہ تم کو بہت تکلیف پہنچائیں گے۔"

عثمان نے کہا "واللہ! میں ان خوارج کی ہمت کا اندازہ بھی کیے لیتا ہوں اور جب تک یہ نہ ہوگا کھانا نہ کھاؤنگا۔"

حارثہ نے کہا "اے امیر! سمجھ لیجیے کہ جہاں ایک مرتبہ یہ لوگ میدان میں اُتر لیے، پھر نہ جانیں گے کہ ہٹنا کس کو کہتے ہیں۔"

عثمان بولا "میں اہل عراق سے واقف ہوں وہ نامرد ہیں۔ رہے تم، تو تمھیں لڑنے سے کیا واسطہ، تم کو تو اور ہی چیزوں کا شوق ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ عثمان کے چہرہ پر ایک حقارت آمیز طنز کا رنگ بھی گیا تھا۔ حارثہ کو اس دو گونہ توہین پر کہ اُس کو بزدل بھی سمجھا اور اس کی شراب خوری کی طرف بھی اشارہ کیا، بہت غصہ آیا اور اسی حال میں اُس نے اپنی فوج کو علیحدہ کر لیا، اور جب عثمان اور خوارج میں لڑائی شروع ہو گئی تو شریک نہ ہوا۔

عثمان کا مزہ سامنے آیا، اس کی فوج میدان سے بھاگی اور وہ خود بھی اس معرکہ میں مارا گیا۔ خوارج اب لوٹ مار میں کمی نہ کرتے، لیکن حارثہ نے عثمان کے گرتے ہوئے علم کو اٹھا لیا اور اپنی قوم والوں کو مقابلہ میں لا کر خوارج کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ ایک شاعر نے لکھا ہے کہ "اگر حارثہ وہاں موجود نہ ہوتا تو اس دن عراق کا ایک آدمی بھی زندہ نہ بچتا۔ جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ عراق کو کس نے بچایا؟ تو معدی اور یمنی دونوں ہمزبان ہو کر کہتے ہیں کہ حارثہ نے"

عبداللہ ابن زبیر نے جتنے آدمی امیر مقرر کر کے عراق روانہ کیے، اُن میں بدقسمتی سے ایک آدمی بھی اس بات کو نہ سمجھا کہ عراق میں جہاں بزدلی عام ہے، صرف حارثہ ہی ایسا بہادر ہے جو پوری ہمت اور دلیری سے کام کر سکتا ہے والیان عراق اُس کو شراب خور اور کافر سمجھتے رہے۔ لشکر کی امارت بھی جو کہ اُس کی خواہش تھا کبھی اس کے لیے منظور نہ کی۔ زمانۂ جنگ میں اُس کو کسی طرح کی کمک نہ بھیجی جاتی تھی

کا بھیجنا خوارج کے انسداد کے لیے نہایت ضروری تھا۔ حارثہ آخر کار تنگ آگیا، اور مجبور ہوا کہ خوارج کے ہاتھ سے کسی طرح اپنی قوم والوں کو بچالے، چنانچہ وہ لڑائی کے میدان سے اس طرح ہٹا کہ گویا اس کو شکست ہوگئی ہے، خوارج نے تعاقب کیا، یہاں تک کہ حارثہ مع اپنی فوج کے جسیر اصغر (دجلہ اصغر) کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں حارثہ اور اس کی فوج والے کشتیوں میں سوار ہوئے۔ جب کشتیاں منجدھار میں پہنچیں تو جس کنارے سے چلے وہاں ایک شور سنائی دیا اور دیکھا کہ ایک تمیمی جو پیچھے رہ گیا تھا دشمن کے خوف سے بھاگا ہوا دریا کی طرف آرہا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کنارے تک پہنچنے سے پہلے دشمن اس کو پکڑ لے گا۔ حارثہ نے اپنی کشتی واپس لے جانے کا حکم دیا۔ تاکہ تمیمی کو جب وہ کنارے پر پہنچے فوراً اپنی کشتی میں بٹھالے، مگر کنارہ سطح دریا سے بہت اونچا تھا اور تمیمی بھاری ہتھیار لگائے ہوئے تھا۔ اوپر ہی سے تمیمی کشتی میں کود ا، کشتی اس صدمہ سے فوراً الٹ گئی اور جس قدر لوگ اُس میں بیٹھے تھے مع حارثہ کے سب غرق ہوگئے اور ملک عراق اس طرح اپنے سب سے بڑے حامی اور محافظ سے محروم ہوگیا۔ خوارج نے عراق کی طرف بڑھنا بند نہیں کیا۔ دریائے فرات پر پل باندھنا اُنھوں نے پہلے ہی سے شروع کر دیا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر بصرہ سے بہت سے لوگ دوسرے مقامات کو چلے گئے اور جو باقی رہے وہ بھی شہر سے نکلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ بصرہ والوں پر خوارج کا خوف ایسا غالب تھا کہ والیٔ بصرہ کو ایک آدمی بھی ایسا نہ مل سکا جو لشکر عراق کی سرداری قبول کر لیتا۔ یہ حالت درپیش تھی کہ سب کے دل میں منجانب اللہ یہ خیال گذرا اور سب یک زبان ہو کر پکار اُٹھے کہ مہلب اور صرف مہلب ہی خوارج کی بلائے بے درماں سے ہم کو بچا سکتا ہے اور سچ یہ ہے کہ مہلب نے اُن کو بچا بھی دیا۔ یہ عرب ایک بے مثل شخص

بے فیض شخص تھا، صدیوں کے بعد تک اسپین کا ایک عیسائی سردار جس کا نام سد[1] مشہور تھا جس وقت اپنے محل واقع بلنسیہ میں بیٹھا شجاعانِ اسلام کی جانبازیوں کے تذکرے

---

[1] غالباً "سِد" "سید" کی تعریب ہے، پورا نام اس شخص کا "روڈ ریگو دِیز دی بیوار" (Rodrigo Diez de Bivar) اور لقب "ال کمپیادوز" (El Campeador) تھا، نفح الطیب میں یہ نام معرب شکل میں لذارق طاغیۃ القنبطور آیا ہے، اسپینی نام میں دیز (Diaz) کے معنی ہیں "بیٹا دیگو کا" (Son of Diego) غالباً یہی دیگو معرب ہو کر طاغیہ ہو گیا، کمپیادور کی عربی شکل قنبطور یا قمبیطور ہے۔ اسپینی زبان میں کمپیادور سب سے بہادر لڑنے والے کو کہتے تھے، جب دونوں فریق لڑائی کے لیے اپنی صفیں آراستہ کر لیتے تھے، تو ایک صف سے ایک منتخب آدمی لڑنے نکلتا تھا، دوسری صف سے بھی اس کے مقابلہ کے لیے آدمی آگے بڑھتا تھا، اگر پہلی صف والے منتخب لڑنے والے کو اس آدمی نے مار لیا تو اس کو کمپیادور کہتے تھے،

لذارق طاغیۃ القنبطور علاقہ قشتالیہ (Castella) کا رہنے والا تھا، قشتالیہ کے دار الحکومت برغش (Burgos) کے قریب ایک گاؤں بیوار (Bivar) نامی تھا، یہی اس کا وطن تھا پہلے عیسائی بادشاہ قشتالیہ شانجہ بسر فرذلند کی ملازمت میں علمبرداری کی خدمت پر رہا، پھر جب قشتالیہ پر شانجہ کے بھائی اذفونس کی حکومت ہو گئی تو کچھ دنوں اس بادشاہ کی ملازمت کرنے کے بعد قزاقی کا پیشہ اختیار کیا۔ ایک فوج جمع کر لی کبھی کسی عیسائی ریاست کی ملازمت کی آخر میں بنی ہود شاہان سرقسطہ (Zaragoza) میں پہلے مقتدر اور پھر منذر کی ملازمت میں رہا، منذر کی طرف سے بلنسیہ (Valencia) پر ماہ جون ۱۰۹۴ء میں قبضہ کیا کچھ دنوں آقا کے نام سے حکومت کی پھر خود مالک بن کر اپنی موت کے وقت تک جو جولائی ۱۰۹۹ء میں واقع ہوئی۔ بلنسیہ کا بادشاہ بنا بیٹھا رہا قزاقی بھی کرتا تھا، اس کے گروہ میں عیسائی مسلمان سب ہی شامل تھے اور سب نہایت ظالم اور لٹیرے اور بدمعاش تھے، بلنسیہ پر حکومت کرنے کے زمانے میں مسلمانوں پر شدت سے ظلم کیے انہیں قید کیا، لوٹا، جان سے مارا اور زندہ جلا دیا، عرب مورخوں نے اسے کلب الجلیقیہ لکھا ہے لیکن اسپین کے عیسائیوں نے اسے اپنا سب سے بڑا ہیرو، مذہب نصرانیت کا حامی اور

(باقی برصفحہ آئندہ)

پڑھا کرتا تھا تو مہلب کی تعریف و توصیف بڑے جوش سے اُس کی زبان پر آتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ مہلب اِس تعریف کا مستحق بھی تھا[1]

مہلب ابن ابی صفرہ کی نظر دوربین سے کوئی چیز پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی، اُس نے پہلے ہی سے دیکھ لیا تھا کہ خوارج سے جس قسم کی لڑائی ہو رہی ہے اُس میں محض حسبی لیاقت کا ہونا کافی نہیں ہے، یہ خوارج وہ متعصب لوگ تھے جن کا مقولہ تھا کہ "یا تو فتح کر دیا فتح کی کوشش میں جان دے دو" لڑائی میں اُن کی حالت یہ ہوتی تھی کہ سینے سے برچھیاں پار ہو گئی ہیں مگر اسی حال میں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کے نعرے لگاتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے ہیں پس علاوہ حربی قابلیت کے جس چیز کی ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ پہلے اُن کے مقابلے کے لیے اُن ہی کی مثل جانباز اور آزمودہ کار لڑنے والے ہوں، پھر اِن لڑنے والوں میں مذہب کا جوش و خروش بھی اُسی قسم کا ہو جیسا کہ خوارج میں تھا، اور اب مہلب نے فی الواقع ایک کرشمہ دکھا دیا، وہ یہ کہ عراق کے لوگ جو اب تک دین کے متعلق شکوک رکھتے تھے اُن کو شدت سے پابند مذہب بنا دیا اور اپنے ساتھیوں کے دلوں میں یہ بات بٹھا کر کہ خوارج خدا کے دشمن ہیں، اُن کے قتال میں جان دے کر تاج شہادت حاصل کرنے کا ایک ولولہ پیدا کر دیا، جب کبھی لڑتے لڑتے فوجیوں کی ہمت ٹوٹنے لگتی تھی تو مہلب فوراً چند جملے ایسے کہ گویا.. ..

(بقیہ صفحہ گذشتہ) مسلمانوں سے عیسائیوں کو نجات دلانے والا سمجھا، بیسیوں نظمیں اور گیت اس کے کارناموں (یعنی قتل و غارت) کے متعلق لکھے، جو اب تک مشہور ہیں۔ لیکن لذارق کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جس طرح مسلمانوں کو لوٹتا اور مسجدوں کو توڑتا تھا اسی طرح عیسائیوں کو مارتا اور گرجاؤں کو لوٹتا تھا، اس کے گروہ کے مسلمان جو عیسائیوں کی طرح رہزن اور بدمعاش تھے، اُسے سیّد (یعنی سردار) کہہ کر پکارتے تھے یہی لفظ سید بگڑ کر اسپینی زبان میں سِد (Cid) ہو گیا، سِد اکثر عربی لباس پہنتا تھا، اور روسائے عرب کی شان سے بلنسیہ میں رہا کرتا تھا (مترجم)

[1] کتاب "تحقیقات" مصنفہ ڈوزی مطبوعہ ۱۸۸۱ء حصہ دوم۔ صفحہ ۲۳

جن میں خدا کی طرف سے فتح و نصرت کا وعدہ ہوتا تھا لوگوں کو سُناتا تھا، کیونکہ مہلب میں یہ بات عجیب تھی کہ جس قدر وہ بہادر تھا اسی قدر ترکیبیں نکالنے میں بھی اُستاد تھا جس دن سے مہلب نے یہ طریقہ اختیار کیا پھر کبھی اُس کی فوج والوں نے کوئی علامت پست ہمتی کی ظاہر نہیں کی اور ہمیشہ وہ لڑائی میں کامیاب ہوتے رہے، کیونکہ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ فتح و ظفر خدا نے اُن کی قسمت میں پہلے ہی سے آمادہ رکھی ہے، یہ جنگ خوارج جو انیس برس تک جاری رہی، ایک مسلسل داستان مذہبی تعصب و خصومت کی تھی، یہ بتانا غیر ممکن ہے کہ آتش مزاجی، تمرد اور قساوت قلبی میں کون کس پر فائق رہا، مہلب کے ایک فوجی سردار کا قول تھا کہ "اگر ایک طرف کفار دیلم ہوں اور دوسری طرف خوارج، تو میں خارجیوں پر حملہ کرونگا، کیوں کہ ان کے ہاتھ سے جو مارا جاتا ہے وہ داخل جنت ہوتا ہے اور وہ ازواجِ پاک کی بزمِ محترم میں دس گنی شان و شوکت کا تاج اُس کے سر پر رکھا جاتا ہے"

غرض بصرہ کا حال تو یہ تھا کہ جس قدر لشکر اور سرمایہ پاس تھا اس کو خوارج کے مقابلہ میں صرف کرنا پڑا، اب ایک دوسرا گروہ شیعیانِ علیؓ کا تھا جس نے بنی امیہ اور ابن زبیرؓ دونوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا۔

اگر خوارج کے عقائد قدرتی طور پر ایک جمہوری حکومت کے پیدا کرنیوالے تھے تو شیعیانِ علیؓ کے اصول ایک شخصی حکومت اور وہ بھی سخت ترین شخصی حکومت پر منتج ہوتے تھے، اس امر کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر کے کہ رسول اللہ صلعم (معاذ اللہ) ایسے ناعاقبت اندیش تھے کہ انھوں نے اپنا جانشین مقرر کرنا عام لوگوں کی پسند پر چھوڑ دیا، اُنھوں نے رسول اللہ صلعم کے چند نہایت مبہم اقوال کی بنا پر اس عقیدہ کو قائم کر دیا کہ آپؐ حضرت علی کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے لیے فرما گئے تھے، اور یہ کہ اولادِ علیؓ جو بطنِ فاطمہؓ سے ہو خلافت کا موروثی حق رکھتی ہے۔ پس شیعیانِ علیؓ نے بنی اُمیہ ہی کو نہیں بلکہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، اور عثمانؓ کو بھی غاصب خلافت سمجھا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے خلیفہ کو خدا بنا دیا، اور کہدیا کہ امام سے کوئی

گناہ ہی نہیں ہو سکتا اور جو کمزوریاں یا نقائص انسان میں ہیں امام اُن سے بری ہے غرض امام یا خلیفہ میں الوہیت کو بدلائل تسلیم کر کے اُس زمانہ کے فریق غالب نے جس کا بانی کیسان[1] حضرت علیؓ کا آزاد کردہ غلام تھا از روئے منطق یہ افسوسناک نتیجہ نکالا کہ ایمان، مذہب، نیکی صرف اسی بات میں ہے کہ بلا عذر اطاعت اور بلا کلام حکم برداری ایک ایسے انسان کی کی جائے جو خدا بھی ہو۔ یہ عجیب خیال جو عرب کی طبیعت اور فطرت سے بالکل مغائر تھا معتقدین زردشت نے اپنے دماغ سے پیدا کر نکالا تھا، کیونکہ یہ پیروان زردشت اپنے بادشاہوں اور موبدوں کو خداؤں اور فرشتوں کی اولاد سمجھا کرتے تھے، اس عقیدہ کے لوگوں نے اس پرانے خیال کو نئے مذہب (یعنی اسلام) کے بادشاہوں کے ساتھ برتنا[2] چاہا، اور مسلمان بادشاہوں کی بھی وہی عظمت قائم کی جو وہ اپنے بادشاہوں کی حالت آتش پرستی میں کرتے تھے، کیونکہ گروہ شیعہ حقیقت میں ایک ایرانی گروہ یا فرقہ تھا، اور اس میں اکثر اہل عرب کے آزاد غلام تھے جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ عرب نہیں بلکہ ایرانی تھے اور یہی باعث ہوا کہ فرقۂ شیعہ نے نہایت غیظ و غضب کی ایک لڑائی کل سوسائٹی کے خلاف شروع کر دی، لیکن اس گروہ کے سردار اور رہنما عموماً عرب ہوتے تھے، جو لوگوں کی سریع الاعتقادی اور مذہبی تعصب سے اپنا نفع نکالتے تھے، جس زمانہ کا ہم تذکرہ کرتے ہیں اس وقت گروہ شیعہ کا سردار مختار بن زبید تھا، یہ نہایت سفاک، چالاک، ہوشیار اور بہادر مگر بے اُصول آدمی تھا، غصہ میں شیر اور مکاری میں روباہ سے کم نہ تھا، کبھی خارجی رہا کبھی زبیری، اور آخر میں شیعہ ہو گیا، آزاد سے آزاد جمہوریت کے حامیوں سے لے کر مطلق العنان بادشاہی کے پسند کرنے والوں تک کوئی فریق ایسا نہ تھا جس میں

[1] بعض عرب مورخوں نے کیسان کی جگہ مختار لکھا ہے، یہ غلطی ہے کیسان مختار کی فوج محافظ کا سردار تھا۔ [2] دیکھو ڈی ساسی کی کتاب "دروزیوں کے حالات مذہب" حصہ اول صفحہ ۲۷، اور دیکھو ڈوزی کا مضمون "تاریخ اسلام" (مترجمہ سادلن) صفحہ ۲۱۹

مختار کبھی نہ کبھی شریک نہ رہا ہو اپنے اس تلوّن کو جس سے لوگوں کو گمان ہوتا تھا کہ اس کے ایمان میں خلل ہے، انصاف پر مبنی بنانے کے لیے اُس نے اپنی ہی طبیعت اور مزاج کا ایک خدا بھی ایجاد کر لیا تھا، اس خدا کی تلوّن مزاجی کا یہ حال تھا کہ جس بات کا آج خیال یا قصد یا حکم کیا ہے کل وہ بدل سکتا تھا، ایسے خدا کے عجیب اور مہمل اعتقاد میں ایک بڑا نفع یہ تھا کہ جب مختار اپنی غیب دانی اور الہامی قابلیتوں پر ناز کرنے لگتا تھا تو کسی کو اعتراض کی مجال نہ ہوتی تھی، کیونکہ اگر کوئی واقعہ اس کی پیشین گوئی کے مطابق نہ اُترتا تو وہ آسانی سے جواب دیدیتا تھا کہ "خدا نے اپنے ارادے کو بدل دیا"

لیکن باوجود ان باتوں کے جن سے مختار کی طبیعت کا تلوّن ظاہر ہوتا تھا، کوئی شخص مختار سے زیادہ مستقل مزاج اور اپنے ارادے میں ثابت قدم نہ تھا، جو کچھ اس میں بدلتا تھا وہ محض ذرائع ہوتے تھے جو کسی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں لیکن مقصد اصلی اُس کے تمام کاموں کا کبھی نہ بدلا، اور وہ مقصد کیا تھا؟ محض طلب قوت و جاہ، جو نہ کسی کے دبائے دب سکے اور نہ کسی کے روکے رُک سکے جن چیزوں سے اور لوگ ڈرتے تھے یا جن چیزوں کو غایت درجہ ادب کی نگاہ سے دیکھتے تھے وہ سب مختار کی نظر میں حقیر اور ذلیل چیزیں تھیں، اُس کی مغرور طبیعت دنیا کے تمام سیاسی انتظاموں اور مذہبی طریقوں کو بڑی نفرت آمیز بے پروائی کے ساتھ دیکھتی تھی، وہ جانتا تھا کہ یہ تمام سیاسی تدبیریں اور مذہبی طریقے فقط دام پھیلائے گئے ہیں کہ خلق اللہ کو ان میں پھانسا جائے، یا وہ ایسے توہمات ہیں کہ اگر کوئی آدمی ہوشیار اور لائق ہو تو ان کی مدد سے اپنا کام خوب نکال سکتا ہے، مختار نے جتنے سوانگ بھرے بڑی عمدگی سے بھرے لیکن شیعوں کی سرداری کا سوانگ جب بھرا تو یہ اس کی طبیعت اور مزاج کے لیے بہت ہی موزوں اور مرغوب ثابت ہوا،

ایک غضب کا چھاپا مار کر کوفہ کو ابن زبیر کی حکومت سے نکال لیا، اس کے بعد جب خلیفہ عبدالملک نے شام کا لشکر اس کی سرکوبی کو بھیجا تو خود ہی آگے بڑھ کر مقابلہ پر آن ڈٹا مروان کے مرنے کے بعد عبدالملک خلیفہ ہو گئے تھے، کوفہ والوں نے مختار اور اُسکے

ایرانیوں کی حکومت کا جُوا بہت ہی غم اور غصہ کھا کر اپنے کندھوں پر رکھا تھا، ایرانیوں کو جو مختار کے ساتھ ہو گیے تھے اہل کوفہ اپنا غلام بناتے تھے، لیکن اس وقت یہی غلام مختار کے ہوا خواہ ہو کر اپنے آقاؤں پر حکومت کرنے لگے تھے غرض کوفے والے اسی فکر میں تھے کہ موقع پاتے ہی مختار کے خلاف بغاوت کر دیں، مختار نے جب یہ حالت دیکھی تو ادھر تو کوفہ والوں سے بہت سے وعدے وعید اور ان کو طرح طرح کی اُمیدیں دلانی شروع کیں، اُدھر خفیہ طور سے اپنے سپہ سالار ابراہیم بن اشتر کو جو اس وقت کوفہ سے باہر کہیں تھا بُلا بھیجا، اور معاملاتِ سیاست میں کوفہ والوں سے گفتگو کو اتنا طول دیا کہ ابراہیم کوفہ تک پہنچ جائے، اہل کوفہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مختار کو کوئی بڑی کمک پہنچنے والی ہے بہر کیف اسی اثنا میں ابراہیم بن اشتر مع شیعیان علیؑ کے کوفہ میں آ گیا اور آتے ہی کوفہ والوں کو تہ تیغ کرنا شروع کر دیا، جب اس طرح کوفہ کی بغاوت مختار نے فرو کر لی تو دو سو پچاس آدمیوں کو جن میں اکثر واقعۂ کربلا میں حضرت امام حسینؑ کے مقابلہ میں لڑے تھے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس قتل کی نسبت یہ کہنا کہ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کا بدلہ نکالا جاتا تھا، مختار کا محض ایک حیلہ تھا، اصلی غرض اُس کی یہ تھی کہ کوفہ والوں میں اتنا دم نہ رہے کہ پھر اس کے برخلاف سر اٹھا سکیں، اس مقصد میں مختار کو پوری کامیابی ہوئی اور اب اہل کوفہ نے دیکھا کہ بجز تلوار کے کسی چیز کی حکومت اُن پر نہیں ہے اس لیے اُن میں سے اکثر شہر چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

جب مختار نے دوبارہ اپنی فوج کو لشکرِ شام کے مقام پر جانے کا حکم دیا تو کوئی ذریعہ جس سے فوج والوں میں مذہبی جوش و خروش پیدا ہو باقی نہ چھوڑا۔ جب لشکر روانہ ہونے لگا تو اس کے سامنے ایک کرسی لا کر رکھی جو کسی بڑھئی[1] سے بہت واجبی قیمت یعنی دو چار روپوں میں خریدی تھی، مگر اُس کو ریشم سے منڈھ کر یہ بتایا کہ وہ جناب امیر علیہ السلام کی کرسی ہے، اور اُس کو پیش کر کے یہ تقریر کی کہ "اے لشکر کے لوگو! یہ کرسی تمہارے حق میں ایسی ہی مبارک ہو گی جیسے کہ تابوتِ سکینہ بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا، اسے

[1] تیلی سے

لڑائی میں اپنے ساتھ رکھو، اور جہاں سب سے زیادہ کشت وخون ہوتا ہو وہاں اس کو رکھدو، اور پھر اس کو دشمن سے بچاؤ، اگر فتح ہو جائے تو سمجھو کہ خدا نے تمہاری مدد کی اور اگر شکست ہو تو ہمت نہ ہارنا، کیونکہ مجھ کو الہام ہوا ہے کہ ایسی صورت میں خدا کی جانب سے تم پر ملائکہ کا نزول ہوگا اور وہ تمہاری مدد کریں گے، اور تم ملائکہ کو دیکھو گے کہ وہ سپید کبوتروں کی شکل میں اونچے اُڑتے ہوئے آئیں گے"

اصل میں مختار نے چند کبوتر جو کوفہ میں پالے گئے تھے، اپنے چند معتبر لوگوں کو جو لشکر کے ساتھ جا رہے تھے، یہ کہہ کر دے دیئے تھے کہ لڑائی میں اگر بات بگڑتی معلوم ہو تو ان کبوتروں کو چھوڑ دینا، مختار نے سوچ لیا تھا کہ جب یہ کبوتر چھوڑے جائیں گے تو ظاہر ہے کہ کوفہ کو واپس آئیں گے، اس میں دو باتیں حاصل ہوں گی، ایک یہ کہ کبوتروں کو آتے دیکھ کر وہ اپنی جان بچانے کی فکر کرے گا، دوسرے یہ کہ جس وقت فوج والے ان کو اپنے سروں پر اڑتا دیکھیں گے تو ان کو ملائکہ سمجھ کر شکست کو فتح کی صورت میں بدلنے کی کوشش کریں گے،

اگست ۶۸۶ء میں موصل کے قریب مقام خازر پر مختار کے شیعیان علیؓ اور شامی لشکر میں لڑائی ہوئی، پہلے شیعیوں کو شکست ہوگئی، کبوتر چھوڑے گئے، ان کو دیکھ کر لڑنے والوں کی ہمت بڑھی اور "ملائکہ" "ملائکہ" کا شور مچا کر شیعیانِ علی شامیوں پر ٹوٹ پڑے لڑائی خوب ہو رہی تھی کہ لشکرِ شام کے بائیں بازو میں ایک شور پیدا ہوا، اس طرف جو لڑنے والے تھے وہ سب بنی قیس تھے اور عمیر کی سرکردگی میں تھے جو زفر بن الحرث کا ایک ماتحت سردار رہ چکا تھا، جس صبح لڑائی ہوئی ہے اس کی رات میں عمیر کی ملاقات شیعیوں کے سردار سے ہو چکی تھی، جب لڑائی شروع ہوئی تو عمیر نے اپنا علم نیچا کر بنی قیس میں آوازے لگائے "انتقام، انتقام، مرج راہط کا انتقام لو" اتنا سنتے ہی بنی قیس لڑتے لڑتے رک گئے اور لڑائی کا نتیجہ دیکھنے کے منتظر ہو گئے، سورج ڈوبتے ہی شامی لشکر کو بالکل شکست ہوگئی، اور اس کا سپہ سالار عبید اللہ بن زیاد مارا گیا۔

مختار اس فتح پر خوش ہو رہا تھا کہ کوفہ کے وہ لوگ جو شہر سے نکل گئے تھے عبد اللہ بن زبیر کے بھائی مصعب کے پاس آگئے جو بصرہ کے حاکم تھے اور ان سے مختار کے مقابلہ پر

اُٹھنے کے لیے کہا، اور اِس بات کا یقین دلایا کہ کوفہ کے تمام لوگ جو ذرا بھی سمجھ رکھتے ہیں اُن کا ساتھ دیں گے۔ مصعب نے اِن لوگوں کی درخواست منظور کر لی، اور مہلب بن ابی صفرہ کو بصرہ میں بلا کر اور اپنے ساتھ لیکر شیعوں پر دو بڑی فتوحات حاصل کیں اور مختار کا محاصرہ کر لیا جو کوفہ میں قلعہ بند ہو گیا تھا مختار نے اس حالتِ حصار میں یہ دیکھ کر کہ اب اس کے ہمراہیوں کی موت کا وقت آن پہنچا ہے خود بھی زندہ رہنا پسند نہ کیا اور ان سب لوگوں سے بھی کہا کہ "آؤ ان محاصرہ کرنے والوں پر نکل کر دھاوا کریں، بہتر ہے کہ ہم سب بہادروں کی موت مریں، بجائے اس کے کہ فاقوں سے دم نکلے اور بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے جائیں، لیکن اب مختار کا اقبال اُس رخصت ہو چکا تھا، چھ یا سات ہزار ہمراہیوں میں سے صرف بیس آدمیوں نے قلعہ سے نکل کر دھاوا کرنے میں اس کا ساتھ دیا اور ان بیس آدمیوں نے اپنے دشمنوں کا خون اچھی طرح پیکر جان دی باقی جن ساتھیوں نے دھاوا کرنے سے انکار کیا تھا ان کو اس نامردی سے کچھ نفع نہ پہنچا ان کی نسبت اعلان کر دیا گیا کہ وہ رہزن اور قاتل ہیں، اور مصعب نے سنگ دلی سے اُن سب کو قتل کر دیا (۶۷ھ مطابق ۶۸۷ء) لیکن مصعب ابن زبیرؓ کو بھی اس کامیابی کا نفع بہت دن تک اٹھانا نصیب نہ ہوا، بلا قصد اور بے سمجھے بوجھے اُنھوں نے اِس لڑائی سے اپنے بھائی عبداللہ بن زبیرؓ کے بڑے دشمن کا بھلا کر دیا، یعنی خلیفہ عبدالملک کو اپنے دشمنوں سے نجات مل گئی اور شیعان علی کی طرف سے عبدالملک بالکل بےخوف ہو گئے، اب عراق میں آکر ابن زبیرؓ کے گروہ والوں سے عبدالملک نے لڑنے کا قصد کیا اس خیال سے کہ کہیں دشمن عقب سے حملہ نہ کرے۔ عبدالملک نے پہلے قرقیسیا کا محاصرہ کیا، یہاں زفر بن الحرث نے عجیب دو طرفہ مضمون کر رکھا تھا، کبھی وہ زبیریوں کی طرف سے لڑتا تھا اور کبھی شیعوں کو سامان رسد پہنچاتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ شیعوں کے ساتھ آگے بڑھ کر شامیوں کا مقابلہ کرے گا۔

جب عبدالملک نے قرقیسیا کا محاصرہ کیا تو زفر قلعہ نشین ہو کر بڑی بہادری سے اپنے قلعہ کو بچانے میں مصروف ہوا، بنو کلب کے مشورہ سے جو عبدالملک کے لشکر میں تھے

عبدالملک نے بنی قیس کو اپنے لشکر سے علیحدہ کر دیا، زفر کی سپاہ نے قلعہ سے نکل کر شامی فوج پر سخت حملہ کیا اور بڑھتے بڑھتے عبدالملک کے خیمہ تک پہنچ گئی عبدالملک چونکہ اس وقت دراصل مصعب سے لڑنے کو عراق جا رہے تھے اس لیے قرقیسا کا محاصرہ جلد اٹھانا چاہتے تھے، اسی خیال سے صلح کی بات چیت زفر سے شروع کی لیکن جب شامیوں نے قرقیسیا کے چار برج مسمار کر دیے اور شہر پر قبضہ پانا آسان معلوم ہونے لگا تو صلح کی گفتگو بند کر دی، اس کے بعد جب پھر فتح میں دشواریاں معلوم ہوئیں تو صلح کا پیغام دوبارہ شروع کیا گیا، زفر نے عبدالملک کے لشکر والوں کو خوب رشوتیں پہنچا دی تھیں اس لیے زفر نے صلح نامہ عمدہ شرائط کے ساتھ حاصل کر لیا، وہ شرطیں یہ تھیں کہ زفر کے تمام لوگوں کو امان دی جائے اور خود زفر کو قرقیسیا کا حاکم مانا جائے، زفر نے اپنی خودداری قائم رکھنے کے لیے یہ شرط بھی عبدالملک سے منظور کرا لی کہ جب تک عبداللہ ابن زبیرؓ زندہ ہیں، زفر کو کسی اموی خلیفہ کی بیعت پر مجبور نہ کیا جائے اس عہد نامہ کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے عبدالملک کے فرزند مسلمہ سے زفر کی بیٹی کی شادی کر دی گئی، عہد نامہ کی تکمیل کے بعد زفر، عبدالملک کی ملاقات کو آیا، خلیفہ نے اس کی بہت خاطر و مدارات کی اور تخت پر اُسے اپنے پہلو میں بٹھایا، یہ منظر بھی عجیب ہو گا کہ دو پرانے دشمن پاس پاس بیٹھے آئندہ رسم محبت قائم رکھنے کی باتیں کرتے ہوں گے لیکن جو محبت عبدالملک کے دل میں زفر کی طرف سے اس وقت پیدا ہوئی تھی اس کو پھر دشمنی کی صورت میں بدلنے کے لیے دو چار اشعار سے زیادہ کی ضرورت نہ پڑی ایک یمنی شریف جس کا نام ابن ذی الکلاع تھا، عبدالملک کے خیمہ میں آیا اور یہ دیکھ کر کہ خلیفہ اور زفر پاس پاس بیٹھے ہیں، رونے لگا، عبدالملک نے سبب پوچھا۔ ابن ذی الکلاع نے جواب دیا" اے امیر! میرے آنسو کیوں نہ نکلیں، اس وقت دیکھتا ہوں کہ وہ شخص آپ کے پہلو میں بیٹھا ہے جو ابھی (۹۱) ابھی آپ سے بغاوت میں مصروف تھا جس کی تلوار سے میرے عزیزوں کے خون کی بوندیں ابھی تک ٹپک رہی ہیں اور عزیز بھی وہ جنھوں نے میری وفاداری میں اپنی جانیں تک کھپا دیں، میرا گریہ اس لیے ہے کہ میں اپنے خاندان کے قاتل کو آپ کے پاس آپ کے

تخت پر بیٹھا دیکھتا ہوں، اور خود نیچے تخت کے پائے سے لگا کھڑا ہوں۔"

عبدالملک نے جواب دیا کہ "اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زفر کو میں تم سے زیادہ سمجھتا ہوں، چونکہ وہ میری زبان بولتا ہے اور اس کی تقریر مجھ کو بھلی معلوم ہوتی ہے اس لیے اس کو اپنے قریب بٹھالیا ہے۔"

شاعر الاخطل (غیاث ابن غوث عیسائی) دوسرے خیمہ میں بیٹھا شراب پی رہا تھا کسی نے اس سے جا کہا کہ عبدالملک زفر کی خاطر و مدارات کر رہا ہے، اخطل کو قرقیسیا کے اس سرکش زفر سے سخت عداوت تھی کیونکہ اس نے اخطل کے قبیلہ (بنی تغلب) کو ایک مرتبہ بالکل ہی ہلاک کر دیا ہوتا، اخطل نے اتنا سنتے ہی کہا "ابن ذی الکلاع سے کچھ بن نہ پڑا اب ذرا میرا وار بھی دیکھو" اتنا کہہ وہ اٹھ کر عبدالملک کے خیمہ میں آیا، تھوڑی دیر تک خلیفہ کا منہ چپکا کھڑا دیکھا کیا، پھر چند شعر پڑھے جن کا مطلب یہ تھا:

"جو شراب میرے ساغر میں ہے وہ ایک شکاری پرندکی تیز اور روشن آنکھوں کی طرح چمک رہی ہے، اگر کوئی تین جام اس شراب کے بے پانی ملائے پی لے، تو پھر اس کے دل میں دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور جب اس شراب کو پی کر وہ چلتا ہے تو قریش کی کسی نوجوان حسینہ کا سا خرام ناز اس میں پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے دامنوں کو ہوا سے اُڑنے دیتا ہے۔

عبدالملک نے پوچھا "کیا خیال دل میں آیا جو یہ شعر تم نے پڑھے؟"

اخطل نے کہا "اے امیر! بجا فرمایا، بہت سے خیال اس وقت دل میں گذر رہے ہیں، اور کیوں نہ گذریں؟ میں آج آپ کے پہلو میں اس شخص کو بیٹھا دیکھتا ہوں جس نے کل ہی یہ بات کہی تھی کہ "ہمارے بھائیوں کی ہڈیاں ڈھکنے کے لیے مٹی کھود کر جو ڈھیریاں چنی گئی تھیں اُن پر ایک دن پھر سبزہ اُگے گا، ہم اپنے بھائیوں کو کبھی نہ بھولیں گے، اور دشمن کی عداوت ہمارے دلوں سے کبھی زائل نہ ہوگی۔"

یہ الفاظ سنتے ہی عبدالملک ایسا اچھل پڑا جیسے کسی تتیے نے کاٹ کھایا ہو چہرہ

سرخ ہو گیا، غصہ سے کانپ اٹھا اور آنکھیں وحشیانہ عداوت کے جوش میں چمکنے لگیں۔ اور اسی حالت میں زفر کے ایک ایسی لات ماری کہ وہ تخت کے نیچے جا پڑا، اس واقعہ کے بعد زفر نے خود اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ میں کبھی موت سے اتنا قریب نہ ہوا تھا جیسا کہ اُس دن ہوا ہوں۔

سچی مصالحت کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا، تھوڑے ہی دنوں بعد بنی قیس نے بنی اُمیّہ کو تازہ ثبوت اپنی عداوت کا دیا، یہ ہم لکھ چکے ہیں کہ عبدالملک کا لشکر مصعب بن زبیر سے لڑنے عراق کو جا رہا تھا، قرقیسیا میں جب زفر سے صلح ہو گئی تو اس نے اپنے لڑکے ہذیل کی سرکردگی میں ایک دستہ فوج عبدالملک کے ساتھ کر دیا، لیکن جب عبدالملک کا پورا لشکر جس میں ہذیل کی فوج بھی تھی، مصعب کے لشکر سے مقابلہ پر آیا، تو جس قدر بنی قیس ہذیل کی فوج میں تھے وہ لڑائی کے ساز و سامان کے ساتھ مصعب سے جا ملے مگر ہذیل کی علیحدگی سے ایسا خراب نتیجہ پیدا نہیں ہوا جیسا کہ عمیر کی علیحدگی سے ہوا تھا اقبال عبدالملک کا ساتھ دے رہا تھا، مزاج کے متلوّن اور نامرد اہل عراق جو مصعب کی فوج میں تھے اس عرصہ میں اُن شکایات کو فراموش کر چکے تھے جو بنی اُمیّہ سے ان کو تھیں نہ لڑنے کا شوق اُن کو تھا، اور نہ یہ خواہش تھی کہ ایک ایسے دعویدار خلافت کے لیے اپنی جانیں دیدیں جس سے اُن کو واقعی نفرت تھی اودھر عبدالملک کے آوروں نے عراق والوں کو خوب روپیہ پہنچانا شروع کر دیا اور اُن سے طرح طرح کے وعدے کیے اہل عراق نے ان لوگوں کی باتوں کو کان دھر کر سنا، اس لیے مصعب کی فوج میں اب وہ سردار رہ گئے جو عبدالملک سے روپیہ کھا چکے تھے اور جن کا ایمان عبدالملک خرید چکا تھا، لڑائی شروع ہونے پر مصعب کو اپنے عراقی فوجیوں کا حال معلوم ہو گیا جس وقت اُن میں سے ایک سردار کو دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا اس نے کہا کہ میں اپنے قبیلہ کو ایسے کام کے لیے نہ لڑاؤں گا جس سے اس کو کسی قسم کا تعلق اور واسطہ نہیں ہے ایک دوسرے فوجی سردار کو جب دشمن پر دھاوا کرنے کا حکم دیا تو وہ کہنے لگا " کیا خوب! آپ مجھ سے دھاوا کرنے کو کہتے ہیں، اور میرے آدمی میرا ساتھ دینے کو مطلق تیار نہیں

ہیں، پھر میں اکیلا لڑ کر کیا کر لونگا؟"

پس مصعب جیسے بہادر اور خود دار شخص کے لیے صرف یہی کام باقی رہ گیا کہ اپنے لڑکے عیسیٰ کو بلائے اور اُس سے کہے " بیٹا، جا اور اپنے چچا عبد اللہ سے کہدے کہ عراق کے دغا بازوں نے مجھے دھوکا دیا، اور اے فرزند! اب اپنے باپ سے رخصت ہو، کیونکہ اب اس کی زندگی کے صرف چند نفوس باقی ہیں"

عیسیٰ بن مصعب نے جواب دیا " اے پدر بزرگوار، نہیں، قریش کبھی مجھ پر یہ الزام نہیں لگا سکیں گے کہ میں نے خطرہ کی حالت میں اپنے باپ کا ساتھ چھوڑ دیا" اتنا کہہ باپ اور بیٹے دونوں جنگ میں مصروف ہوئے اور کچھ دیر کے بعد اُن کے سر عبد الملک کے سامنے پیش کر دیے گئے (اکھ مطابق ۶۹۰ء)

عراق کے تمام لوگوں نے عبد الملک کی اطاعت قبول کر لی، مہلب بن ابی صفرہ نے جس کو ابھی تک مصعب کے مرنے کی خبر نہیں تھی، درآنحالیکہ خوارج کو اس کی موت کا علم ہو چکا تھا، روسائے خوارج کی ایک مجلس مشورت میں یہ بیان کیا تھا کہ مصعب اس کا سردار دین و دنیا ہے، اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ مروان ملعون کے لڑکے عبد الملک سے مقابلہ کرے، لیکن جب عبد الملک کے پاس سے اس مضمون کا فرمان آیا کہ مہلب کے تمام اموال و مراتب بحال کیے گئے، تو مہلب نے بھی وہی کیا جو اور اہل عراق نے کیا تھا عزت اور خیر خواہی کے یہی معنی تھے جو عراق والے لیتے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جو عراق میں بہترین شمار ہوتے تھے۔

خوارج کو ایسی باتوں پر غصہ آتا تھا اور وہ اہلِ عراق سے کہتے تھے " تم خود ہی فیصلہ کرو کہ ہم غلطی پر ہیں یا تم، کم سے کم اس بات کے تو قائل ہو جاؤ کہ تم دنیا کے بندے اور غلام ہو، اور روپیہ کے لیے تم کوئی بھی حاکم ہو اُس کی خدمت و خوشامد کو موجود ہو جاتے ہو، تم اخوان الشیاطین ہو"

اسناد

مُبرّد۔ کامل ص ۵۷۵۔۵۷۷۔۵۸۸، ۵۹۰-۶۲۳، ۶۴۷، ۶۴۷-۷۰۴
۷۳۶

شہرستانی کتاب ص ۸۷-۹۱، ۱۰۸-۱۱۰ وغیرہ وغیرہ

ابن خلدون ج ۲ ۔ ۱۷۱-۱۸۳

ریحان ص ۱۸۷

ابن خلکان (اڈیشن سلین کا) ج ۱ ۳۲۲
(اڈیشن وسٹن فلڈ) ۹-۸۴

ابن قتیبہ ص ۲۰۳

ابن بدرون ص ۱۸۹

مسعودی ص ۱۳۵

کتاب اول

خانہ جنگی

اٹھویں فصل

کلبی اور قیسی

عبدالملک کی سب آرزوئیں پوری ہونے والی تھیں، تمام دنیائے اسلام پر بلا استثنا حکومت کرنے کے لیے اب صرف مکہ پر قبضہ کرنا باقی رہ گیا تھا، یہ مقام ایک مدت سے عبدالملک کے حریفِ مقابل حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کا آخری آماجگاہ بنا ہوا تھا مکہ پر فوج کشی حقیقت میں سخت بے ادبی تھی، اگر عبدالملک کی طبیعت میں وہی زہد و تقوے موجود ہوتا جو جوانی میں اُسے حاصل تھا، تو اس خیال ہی سے اُس کا دل تھرا اٹھتا لیکن اب وہ پہلا سا جوش پارسائی کہ یزید مدینہ کو لشکر روانہ کرے اور عبدالملک علانیہ کہنے لگے کہ "یزید دشمن خدا ہے" باقی نہ تھا، زمانہ کی رفتار، دنیا کی مکروہات اور قدرت کے استعمال نے عالمِ جوانی کی پاکیزہ نفسی اور ایمان کی درستی کو خراب کر دیا تھا، کہا جاتا ہے کہ جس دن عبدالملک نے اپنے چچازاد بھائی عمرو بن سعیدالاشدق کو قتل کیا ہے یعنی جس دن قسم توڑنے اور قتل دونوں جرائم کا ارتکاب کر کے اپنے نام کو داغ لگایا ہے، عبدالملک نے تلاوتِ کلام مجید کرتے کرتے سرد اور افسردہ لہجے میں یہ

کہہ کر کتاب اللہ کو گردانا تھا کہ "آج سے مجھ میں اور تجھ میں کوئی بات ایک سی نہیں ہے" چونکہ عبدالملک کے مذہبی خیالات سب پر روشن تھے اس لیے جب مکہ کے محاصرہ کے لیے لشکر بھیجنے کی خبر گرم ہوئی، تو لوگوں کو چنداں تعجب نہ ہوا، لیکن جب یہ سنا کہ اس لشکر کی سرداری کس کو دی گئی ہے تو سب حیرت زدہ ہو گئے، عبدالملک نے اس جگہ پر حجاج بن یوسف کو جو ایک ادنیٰ خاندان کا آدمی تھا مقرر کیا تھا۔ یہ پہلے طائف میں معلم تھا، اور جس دن بچوں کو پڑھا کر آشنا ہو جاتا تھا کہ روٹی کا ایک ٹکڑا مول لے کر پیٹ بھر لے اس دن اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھتا تھا، اس کے بعد اس کو کسی قدر شہرت ہوئی کہ خلیفہ کی فوج محافظ میں مقرر ہو کر انتظام اچھا کیا، کچھ زمانے کے لیے عراق میں لشکر کے ایک حصہ کی افسری مل گئی، لیکن دشمن نے اس فوج میں ایسی پھوٹ ڈالی کہ لڑائی نہ ہو سکی اور حجاج کو اپنی جوانمردی یا بزدلی کسی چیز کے بھی دکھانے کا موقع نہ ملا، "مکہ والے لشکر کی امیری بھی اس وقت عجیب طور سے ملی تھی، جس وقت حجاج نے خلیفہ سے درخواست کی کہ ابن زبیر کے مقابلہ کو جو لشکر جانے والا ہے اس کی سرداری مجھے دی جائے تو خلیفہ نے اسے جھڑک کر خاموش کر دیا، لیکن اتفاق یہ کہ اُن متضاد کیفیتوں میں جنہیں انسان کا قلب قبول کرنے پر آمادہ رہتا ہے، ایک حالت یہ تھی کہ خواب اور تعبیر خواب کے اعتقاد نے عبدالملک کی طبیعت میں جو شک پرست واقع ہوئی تھی، ایک قسم کا اعتدال پیدا کر دیا تھا، حجاج کو کسی طرح اس بات کا علم ہو گیا تھا، چنانچہ اسی بنا پر اُس نے بڑی ہوشیاری سے اپنا مطلب حاصل کر لیا، ایک دن عبدالملک کے پاس حاضر ہو کر کہنے لگا کہ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں عبداللہ بن زبیرؓ کی کھال کھینچ رہا ہوں" خلیفہ نے یہ خواب سنتے ہی حجاج کو امیر لشکر مقرر کر دیا۔

عبداللہ بن زبیرؓ نے عراق کے ہاتھ سے نکل جانے اور اپنے بھائی مصعب کے مارے جانے کا حال بہت صبر و شکر سے سنا، دراصل اُن کو مصعب کی کارروائیوں کی طرف سے کہ آخر ان امور کیا صورت اختیار کریں، اطمینان نہ تھا، اُن کے خیال میں مصعب کا ارادہ عراق میں بادشاہ بن بیٹھنے کا تھا بہرکیف چونکہ فصاحت و بلاغت کی داد لینے کا

موقع اچھا تھا، اس لیے بھائی کی موت پر ایک خطبہ کہہ کر دل کو تسلّی دی، ہمارے نزدیک (یعنی مصنف متعصب کے نزدیک) اس خطبہ میں سرد مہری اور تصنّع پایا جاتا ہے، لیکن ابن زبیر کے نزدیک وہ نہایت اخلاق آفرین اور پند آموز تھا، انھوں نے بہت ہی سادگی سے کہا کہ مصعب کی موت سے اُن کو رنج بھی ہوا اور خوشی بھی، رنج اس لیے کہ ایک محب صادق اُن سے جدا ہو گیا، جس کی جدائی نے ان کے نازک دل پر ایسا زخم پہنچایا ہے جس کو صبر و شکر اور خدا کی مرضی پر راضی رہنا ہی مندمل کر سکتا ہے، خوشی اس لیے ہوئی کہ اللہ نے اُن کے بھائی کو شہادت کا رتبہ عطا فرمایا، جو اس بات کی تصدیق ہے کہ اللہ نے اُن پر اپنی رحمت کی۔"

لیکن جب خطبہ کہنے کی جگہ لڑنے کا دن آیا یعنی مکہ کا محاصرہ کر لیا گیا اور قحط کی مصیبتیں سامنے نظر آنے لگیں، تو پھر ابن زبیرؓ کی ہمت ٹوٹ گئی۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ان میں شجاعت نہ تھی ... ...

... ... بلکہ اُن میں اخلاقی قوت باقی نہ رہی تھی[۱]، چنانچہ لڑنے کے بارے میں انھوں نے اپنی والدہ حضرت اسماءؓ سے مشورہ کیا، یہ بی بی ایک رومانی عورت کی طرح شریف و دلیر طبیعت رکھتی تھیں، گو اس وقت اُن کی عمر تقریباً سو برس کی تھی۔

عبداللہؓ۔ اماں! مجھے سب نے چھوڑ دیا، دشمن صلح کی شرطیں اچھی پیش کرتا ہے آپ کے خیال میں اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

---

[۱] یہ دونوں باتیں ٹھیک نہیں، نہ مصائب کو دیکھ کر حضرت ابن زبیر کی ہمت ٹوٹی اور نہ ان کی اخلاقی قوت میں کسی قسم کی کمی واقع ہوئی، مصنف نے حضرت ابن زبیر کی اپنی والدہ سے گفتگو کا یہ غلط نتیجہ نکالا ہے حالانکہ وہ گفتگو محض مشورۃً اور صلاح کے طور پر تھی، نہ کہ اظہار عجز اور کمی ہمت اور جرأت کی وجہ سے، ماں کا ادب و احترام بھی اس امر کا متقاضی تھا کہ اس آخری وقت میں اُن سے رخصت کی اجازت لیجائی، جیسا کہ خود انھوں نے آخر میں اپنی والدہ سے کہا، ظاہر ہے کہ کسی امر میں صلاح و مشورہ کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ مشورہ کرنے والے کی ہمت ٹوٹ گئی ہے یا اُس میں اخلاقی قوت باقی نہیں رہی، ماں سے اجازت چاہنا بھی یقیناً کوئی اخلاقی کمزوری نہیں (اسمٰعیل)

اسمأؓ۔ تمہارا فرض ہے کہ جان دے دو،

عبداللہؓ۔ لیکن اگر میں اِن شامیوں کے ہاتھ سے مارا گیا تو ڈر ہے کہ وہ میری لاش سے بدلہ نکالیں گے،

اسمأؓ۔ پھر تم کو اس سے کیا، جب مردہ بھیڑ کی کھال کھینچی جاتی ہے تو کیا اُس کو کچھ تکلیف ہوا کرتی ہے،

عبداللہ یہ بات سن کر دل میں سخت شرمندہ ہوئے[1] اور فوراً اپنی والدہ کو یقین دلانے لگے کہ ان کا بھی یہی خیال ہے، صرف ماں کی اجازت حاصل کرنے کیلئے انھوں نے اس قسم کا استفسار کیا تھا غرض وہ چلے گئے اور جلد مسلح ہو کر پھر ماں کے پاس آئے اور اُن سے رخصت چاہی تو ماں نے اُن کو گلے لگایا، عبداللہ زرہ پہنے ہوئے تھے زرہ محسوس کرتے ہی اسما فرمانے لگیں "جو شخص موت کے لیے تیار ہوتا ہے اس کو زرہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ (۹۷)

عبداللہؓ۔ میں نے زرہ اس لیے پہن لی ہے کہ آپ کو میرے زندہ رہنے کی کچھ تو امید رہے[2]۔

یہ جواب عبداللہ نے ایسا گھبرا کر دیا کہ گویا کوئی اور بات سردست سوجھی نہ تھی۔

اسمأؓ۔ میں نے اُمید کو دل سے نکال دیا ہے، تم زرہ اُتار دو

عبداللہؓ ماں کا حکم بجا لائے، پھر چند گھنٹے تک خانۂ کعبہ میں عبادت کرتے رہے اور آخر میں دشمن پر حملہ کیا، اور زندگی سے زیادہ مرنے میں عزت پائی ان کا سر

---

[1] دل میں شرمندہ ہونے کی بھی ایک ہی کہی، اگر حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو صلح کر کے اپنی جان بچانی ہوتی تو پھر ماں کے پاس آنے اور صلاح و مشورہ کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی (اسمٰعیل)

[2] مصنف کے بیان کردہ الفاظ حضرت ابن زبیر نے ہرگز نہیں کہے، انھوں نے تو صرف یہ فرمایا تھا کہ "میں نے زرہ محض مضبوطی کے لیے پہنی ہے" اور ماں نے یہ کہہ کر کہ "اس سے کچھ مضبوطی نہیں ہوتی زرہ اتروادی تھی (دیکھو تاریخ ابن خلدون۔ ذکر شہادت ابن زبیرؓ) (اسمٰعیل)

کاٹ کر دمشق بھیجا گیا اور لاش صلیب پر لٹکا دی گئی (۳ے ھ / ۶۹۲ء)

چھ یا آٹھ مہینے تک مکہ کا محاصرہ برابر جاری رہا۔ حجاج نے بڑی دلیری مستعدی اور استقلال سے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ آثار مقدسہ کی طرف سے بالکل بے پروائی کے ساتھ کام کیا، خانہ کعبہ کے ساتھ اس کی بے ادبی کو فقہا نے کبھی معاف نہ کیا، گو اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ جس آقا کا وہ ملازم تھا، اس کی فرمانبرداری کو وہ کس درجہ اپنا فرض عین سمجھتا تھا کسی قسم کا مذہب اس کی طبیعت میں نہ تھا، نہ اس نے کعبہ کے قدیم تقدس کا لحاظ کیا، اور نہ ایسے مظاہر قدرت سے اسے کچھ تردد ہوا جن کے وقوع کو عوام الناس خدا کے غضب کی نشانیاں سمجھتے تھے، ایک روز شامی سپاہی منجنیق لگائے خانہ کعبہ پر سنگ باری کر رہے تھے کہ اتنے میں کڑک اور بجلی کا ایک طوفان اٹھا، اور بجلیاں بار بار اتنی گریں کہ بارہ سپاہی ہلاک ہو گئے، شامیوں پر ایسا خوف غالب ہوا کہ انھوں نے پتھر برسانے بند کر کے اس کام سے قطعی انکار کر دیا، حجاج نے یہ دیکھتے ہی قبا کے داموں کو کمر سے لپیٹ کر اور منجنیق میں خود پتھر رکھ کر زہ کو درست کر سپاہیوں سے کہا کہ "بہادرو، اس طوفان کے کچھ معنی نہیں ہیں میں اس ملک سے بخوبی واقف ہوں یہیں پیدا ہوا ہوں اس قسم کے طوفانوں کا یہاں آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔

بنی امیہ کے ساتھ حجاج کی یہ خیر خواہیاں بلاشبہ اس قابل تھیں کہ اس کو دل کھول کر انعام دیا جاتا، چنانچہ عبد الملک نے اسے امیر مکہ اور کچھ دنوں بعد پورے حجاز کا عامل بنا دیا۔ چونکہ حجاج بنی قیس سے تھا، اس لیے اس کی یہ ترقی بنی کلب کے لیے صرف ایسی حالت میں موجب خوف و تردد ہو سکتی تھی کہ حجاج بجائے ایک ادنے ترقی یافتہ شخص کے کسی مشہور و عالی نسب خاندان کا آدمی ہوتا۔

قیسیوں کے علاوہ کلبیوں کو اس بات پر فخر تھا کہ مکہ کے محاصرہ میں انھوں نے بھی بنی امیہ کی بڑی بڑی خدمتیں کی ہیں، مثلاً جس پتھر کے صدمے سے حضرت ابن زبیرؓ زمین پر گرے تھے اس کا پھینکنے والا حمید ابن بجدل کلبی تھا، لیکن کلبیوں کو خلیفہ کی طرف سے جو بات سب سے زیادہ مطمئن کیے ہوئے تھی، وہ یہ تھی کہ عبد الملک ان کی جوانمردی

اور وفاداری اور اُن کے سرداری کی تعریف کبھی نثر اور کبھی اشعار میں پڑھ کر ہمیشہ ان کو خوش (۹۷)
رکھا کرتا تھا، بڑے بڑے مناصب پر اُن کو مقرر یا اور قیسیوں کو محروم رکھتا، ان باتوں کے علاوہ بہت سے اموی شہزادوں مثلاً خالد بن یزید یا عبدالعزیز بن مروان کی وجہ سے بھی جو خلیفہ عبدالملک کے بھائی کلبی ماں سے تھے، بنی کلب کو بڑی تقویت رہتی تھی۔

عبدالملک کا دربار ایسے لوگوں سے بھی خالی نہ تھا جو بنی قیس کے دوست و سرپرست تھے، بالخصوص بشر بن مروان، عبدالملک کا بھائی جس کی ماں قیسی تھی قیسیوں کے حقوق کی حفاظت اور لڑائی جھگڑوں میں ان کی حمایت کیا کرتا تھا، اور ہمیشہ یہ کہہ کر کہ بنی قیس شجاعت و مردانگی میں بنی کلب پر فضیلت رکھتے ہیں" فخر کیا کرتا تھا، ایک دن بشر بن مروان کی اس تعریف پر خالد بن یزید کو ایسا غصہ آیا کہ اس نے چند کلبیوں سے کہا "کیا تم میں کوئی بھی آتنا نہیں کہ بیابان قیس میں جا کر اس قوم پر حملہ کرے، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ جن شہزادوں کی مائیں بنی قیس سے ہیں اُن کا غرور توڑا جائے، کیونکہ ہر وقت وہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے قبل اور اُن کے بعد جس قدر لڑائیاں ہوئی ہیں، اُن میں بنی قیس ہی کو بنی کلب پر فتح ہوئی ہے۔

خالد کی اس گفتگو کو سن کر ابن بجدل کلبی نے کہا کہ میں بنی قیس کے بیابان میں جا کر اُن پر حملہ کرنے کو خوشی سے رضامند ہوں بشرطیکہ خلیفہ مجھ کو اس کی سزا نہ دے۔

خالد۔ اس کا ذمہ دار میں ہوتا ہوں

ابن بجدل۔ وہ کس طرح ؟

خالد۔ ترکیب نہایت آسان ہے، یہ تم کو معلوم ہی ہوگا کہ جب سے ابن زبیرؓ فوت ہوئے ہیں، بنی قیس نے ایک حبہ عشر کا خلیفہ عبدالملک کو ادا نہیں کیا، اب میں تم کو ایک حکم اس مضمون کا لکھے دیتا ہوں کہ بنو قیس سے عشر کی رقم وصول کر و اور یہ حکم ایسا ہوگا کہ گویا عبدالملک نے خود لکھا ہے پھر تم کو موقع مل جائے گا کہ بنو قیس سے خاطر خواہ کسر نکالو۔

ابن بجدل روانہ ہو گیا، اس خیال سے کہ لوگوں کو شبہ نہ گذرے ہمراہیوں کی تعداد

کم رکھی، یہ وہ جانتا ہی تھا کہ راستہ میں جہاں کہیں اپنی قوم والوں میں ٹھہروں گا، بہت
لوگ ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں گے، چنانچہ حبیب بنی عبدِ وُدّا اور بنی عُلَیم میں پہنچا جو بنو
کلب کے دو قبیلے تھے اور دَوْمہ اور خبط کے جنوب والے میدان میں رہتے تھے تو اُن کو
خالد کا دیا ہوا حکم دکھایا، حکم کو دیکھتے ہی ان دونوں قبیلوں میں جو لوگ سب سے بہادر اور
جری تھے یہ کہہ کر کہ "صرف ساتھ چلنے کی اجازت دیدو اور ہم کچھ نہیں چاہتے" ابن بجدل
کے ہمراہ ہو گئے، ابن بجدل نے سب سے اِس بات کا حلف لیکر کہ کسی قیسی کو امان نہ دی
جائے گی صحرائے بنی قیس کا رخ کیا۔
سب سے پہلے بنی فزارہ کا ایک شخص اس غارت گر جماعت کا شکار ہوا، بنی فزارہ قیسوں
کا ایک قبیلہ تھا، یہ شخص بڑا دولتمند اور عالی نسب تھا، اس کا پردادا حذیفہ بن بدر جنگِ ۱۹۸
داحس[1] میں بنی ضبیان کا سردار رہ چکا تھا، لیکن چونکہ لونڈی کے بطن سے تھا، اس لیے
اس کی قوم والے اس کو ذلیل و حقیر سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اس کو اپنی بیٹی بھی عقد میں
نہ دی اور اس کو مجبور ہو کر قبیلہ بجانیہ کی ایک عورت سے نکاح کرنا پڑا، اس کے قبیلہ والے
اُس سے ملنے تک کے روادار نہ تھے اور اپنے خیمہ گاہ سے دور بالکل سرحد کے کنارے
اس کو رہنے کی اجازت دی تھی، ایک دن یہ غریب ذات برادری سے خارج صبح کی نماز
پڑھ رہا تھا جو بآوازِ بلند پڑھی جاتی ہے اور اب بلند آواز سے نماز پڑھنا ہی اس کی ہلاکت
کا باعث ہو گیا، ابن بجدل کا گروہ اس کی آواز سنتے ہی لپکا اور اس کو فوراً قتل کر ڈالا، اور
صرف یہی نہیں بلکہ اس کا مال بھی لوٹ لیا اور تقریباً سو اونٹ اُس کے ہانک لے گئے
اُس کے بعد حذیفہ بن بدر ہی کی اولاد سے پانچ خاندانوں پر حملہ کیا، لڑائی سخت ہوئی جو
غروب آفتاب سے پہلے ختم نہ ہو سکی، جب رات ہوئی تو کلبیوں کو قیسی میدان میں پڑے

[1] جنگ داحس پانچویں صدی عیسوی کے آخری زمانے میں مدت تک سختی سے جاری رہی، داحس
ایک گھوڑے کا نام تھا اور غبرا ایک گھوڑی تھی، ان دونوں میں دوڑ ہوئی، اس دوڑ میں چند سے
داحس کی نسبت سمجھا گیا کہ وہ جیت گیا ہے اور یہی وجہ لڑائی کی ہو گئی۔

نظر آئے، کلبی سمجھے کہ وہ سب مُردہ ہیں، لیکن حقیقت میں وہ زندہ تھے، اُن کے زخم گو متعدد تھے مگر مہلک نہ تھے۔ باد سموم نے اٹھ کر یہ احسان کیا کہ ان کے زخموں کو ریت سے بھر دیا، خون بہنا بند ہو گیا اور وہ سب مرنے سے بچ گئے۔

کلبی رات بھر چلتے رہے، صبح ہوتے ہی آل حذیفہ ہی سے ایک اور شخص جس کا نام عبداللہ تھا اُن کو ملا، یہ بدھا آدمی تھا اور مع اہل وعیال سفر کر رہا تھا، سوائے اس کے ایک نوجوان لڑکے جاد کے کوئی بھی اس کے ساتھ ایسا نہ تھا جو ہتھیار لگانے کی قابلیت رکھتا ہو، جاد کلبیوں کو قریب آتے دیکھ اپنی برچھی سنبھال گھوڑے پر سوار ہو، اُن سے بچ کر کچھ دُور جا کھڑا ہوا، ابن بجدل کی جماعت گھوڑوں پر سے اُتر پڑی، عبداللہ نے پوچھا کہ آپ کون لوگ ہیں؟ کلبیوں نے جواب دیا کہ ہم خلیفہ عبدالملک کے حکم سے محصول وصول کرنے آئے ہیں۔

عبداللہ نے دریافت کیا "کیا آپ ہم کو اس مضمون کا کوئی حکم دکھا سکتے ہیں؟"

ابن بجدل نے جواب دیا "بیشک دیکھ لو، یہ حکم موجود ہے۔

اتنا کہہ کر ابن بجدل نے عبداللہ کو وہ حکم دکھایا جس پر خلیفہ عبدالملک کی مہر تھی،

عبداللہ۔ اِس کا مضمون کیا ہے۔

مضمون پڑھ کر سنایا گیا اور وہ یہ تھا۔

عبدالملک بن مروان کی طرف سے حُمیدبن بجدل کو سلام، اس پروانہ کے ذریعہ نامبردہ حُمیدبن بجدل کو حکم دیا جاتا ہے کہ جس قدر بدوی اس کو ملیں اُن سے عشر وصول کرے، جو بدوی عشر ادا کر دے گا اس کا نام اس کتاب میں درج کیا جائے گا۔ اور وہ فرمانبردار اور خیرخواہ رعیت سمجھا جائے گا۔ لیکن جو انکار کریگا وہ خدا اور رسول اور امیر المومنین کا دشمن تصور کیا جائے گا۔

عبداللہ۔ یہ حکم درست ہے، میں حکم کی بجاآوری اور عشر دینے کو تیار ہوں۔

ابن بجدل۔ مگر صرف یہی نہیں ہے، کچھ اور بھی ہے وہ یہ کہ تم اپنی قوم کے سب لوگوں کو تلاش کرو، اور ان سب سے عشر وصول کر کے اپنے پاس جمع کرو

اور کوئی خاص جگہ بتاؤ جہاں ہم تم سے مل کر تمہارے ہاتھ سے رقم وصول کریں۔
عبداللہ۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے، بنی فزارہ اس بیابان میں دور دور تک پھیلے پڑے ہیں اب کوئی جوان آدمی نہیں، بڈھا اور کمزور ہوں، میں اتنی دور نہیں جا سکتا اور میرے لڑکوں میں سے صرف ایک لڑکا میرے ساتھ ہے، لیکن تم جو بہت دور سے آئے ہو اور لمبے سفر کی عادت رکھتے ہو میری قوم والوں سے بہ نسبت میرے زیادہ آسانی سے ملاقات کر سکتے ہو، اس سفر میں ان کے خیموں سے تمہارا روزانہ گذر ہوگا کیونکہ جہاں چراگاہ ہوتا ہے وہیں وہ قیام کرتے ہیں۔
کلبی سوار۔ یہ تو ہم سب خوب جانتے ہیں، وہ چراگاہوں کی تلاش میں اس بیابان میں متفرق نہیں ہوئے ہیں بلکہ عشر ادا کرنے سے بھاگتے پھرتے ہیں، وہ سب باغی ہیں۔
عبداللہ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ سب خلیفہ کی وفادار رعایا ہیں، وہ صرف اچھے مرغزاروں کی تلاش میں ...
کلبی سوار۔ بس بس، جو کچھ حکم دیں وہ کرو۔
عبداللہ۔ میں معذور ہوں، یہ عشر کی رقم ہے جس کا حقدار خلیفہ ہے اس کو قبول کیجیے۔
کلبی سوار۔ تمہاری اطاعت سچی نہیں ہے، تمہارا یہ لڑکا ہمارے سامنے گھوڑے پر سوار ہے، وہ مغرور ہے۔ اور ہم کو حقارت سے دیکھ رہا ہے۔
عبداللہ۔ میرے لڑکے سے آپ کچھ خوف نہ کیجیے، یہ عشر قبول کیجیے، اور یہاں سے رخصت ہو جیے۔
کلبی سوار۔ تمہاری ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے ہم سے یہ کہا تھا کہ تم اور تمہاری قوم والے ابن زبیر کی طرف سے لڑے تھے، اس نے فی الواقع سچی بات کہی تھی،
عبداللہ۔ نہیں، بنی فزارہ نہیں لڑے تھے، یہ سچ ہے کہ ہم نے ابن زبیر رضؓ کو

عشر ادا کیا تھا، سلطنت کے معاملات میں ہم دخل نہیں دیتے ملک کا جو مالک ہو اس کو عشر ادا کر دیتے ہیں،

کلبی سوار - اپنے ان الفاظ کی تصدیق اس طرح کرو کہ اپنے لڑکے کو گھوڑے سے نیچے اُتر آنے کا حکم دو۔

عبداللہ - اس لڑکے سے تمہیں کیا بحث ہے، تمہاری مسلح جماعت کو دیکھ کر وہ ڈرا ہوا الگ کھڑا ہے۔

کلبی سوار۔ گھوڑے سے اترنے کے لیے اس سے کہو، اسے ڈرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔

فزاری اپنے لڑکے کے پاس گیا اور اُس سے گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا لڑکے نے جواب دیا "بابا! مجھے ان لوگوں کی بیرحم نگاہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے، آپ کو جو کچھ دینا ہو انھیں دیدیں اور مجھے اجازت ہو کہ کسی طرح ان سے اپنی جان بچاؤں۔

عبداللہ پھر کلبیوں کے پاس آیا اور ان سے کہا "یہ عشر لیجیے اور ہماری جان چھوڑیے"

کلبی سوار۔ جب تک تمہارا لڑکا گھوڑے پر سوار ہے ہم تمہاری کوئی بات نہ سنیں گے۔

عبداللہ - لڑکا میری بات نہیں سُنتا - اگر وہ گھوڑے پر سوار بیٹھا ہوا ہے تو اس میں آپ کا کیا نقصان ہے۔

(۱۰) کلبی سوار - بس، بس، تم نے اپنے تئیں پُورا باغی ثابت کر دیا، کاغذ قلم دوات لاؤ، ہمارا کام ختم ہوا، اب امیر المومنین کی خدمت میں صرف اُتنا لکھ کر بھیجنا ہے کہ عبداللہ، عیینہ کا پوتا، ہمارے کام میں جو بنی فزارہ سے ہم کو ملا، مخل ہوا،

عبداللہ - ایسا ہرگز نہ لکھیے گا، میرا کچھ قصور نہیں ہے، میں آپ کو جتائے دیتا ہوں،

بڈھے فزاری نے بہتیری منت سماجت کی، لیکن کسی نے اُس کی نہ سنی، ابن بجدل نے خط لکھ کر ایک سوار کو دیا، جو خط لیتے ہی دمشق کو روانہ ہوگیا، عبداللہ حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا "کیوں اس قدر بے انصافی سے مجھے غلط الزام دیتے ہو؟ میں تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری نسبت خلیفہ کو یہ نہ لکھو کہ میں باغی ہوں، میں خلیفہ کا ہر ایک حکم ماننے کے لیے تیار ہوں۔

کلبی۔ اپنے لڑکے سے کہو کہ گھوڑے سے اتر آئے۔

عبداللہ۔ ہم لوگوں کو اس کا سبق مل چکا ہے کہ تم لوگوں کا اعتبار نہ کریں، تم اقرار کرو کہ میرے لڑکے کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچاؤ گے، عبداللہ نے اب اپنے لڑکے کو آواز دی اور کہا " لعنت ہو اللہ کی مجھ پر جو تو گھوڑے سے نہ اُتر آئے "

جاد باپ کا حکم بجالایا، برچھی ہاتھ سے پھینک کر گھوڑے سے اتر پڑا اور آہستہ آہستہ کلبیوں کی طرف چلا، اور باپ سے کہا کہ " بابا آج کا دن آپ کے لیے بہت تکلیف کا ثابت ہوگا "

اب جس طرح شیر اپنے چنگل میں شکار کو پکڑ کر اُس سے کھیلتا ہے، کلبیوں نے عبداللہ کے نوجوان لڑکے کو سخت و سست کہنا اور ایذائیں پہنچانی شروع کیں پھر ایک چٹان سے اس کو باندھ دیا تاکہ آسانی سے اُس کو قتل کرسکیں، اس غریب لڑکے نے موت کے کرب میں ایک نگاہ اپنے باپ کیطرف ڈالی جس میں تکلیف، صبر اور ملامت بھری تھی

کلبی درندوں نے عبداللہ کے سپید بالوں کا لحاظ کیا، مگر صرف اتنا کہ بیٹے کی طرح باپ کا خون نہ بہایا، لیکن بڈھے کو ڈنڈوں سے مارتے مارتے بیہوش کردیا، اور اسے مردہ سمجھ کر اسی طرح ریت پر چھوڑ کر چلتے بنے، کچھ دیر کے بعد عبداللہ کو ہوش آیا غم سے دل زخمی تھا، اور بار بار یہی کہتا تھا۔

" اگر میں اپنی سب مصیبتوں کو بھول بھی جاؤں، تب بھی اپنے لخت جگر کی وہ آخری نگاہ جبکہ میں نے اس کو اس کے قاتلوں کے سپرد کیا ہے، کبھی دل سے نہ مٹیں گی "

جاد کا گھوڑا اُس جگہ سے جہاں یہ نوجوان قتل کیا گیا تھا، نہ ہٹا، گردن ڈالے نیچے دیکھتا اور زمین اُس ٹکڑے کو جہاں اس کے مالک کا خون پڑا تھا، بار بار ٹاپیں مار کر کریدتا تھا، حتیٰ کہ اسی حال میں فاقوں سے جہاں کھڑا تھا وہیں گر کر مر گیا۔

کلبیوں نے علاوہ اِن کے اور مقامات پر بھی قتل کی وارداتیں کیں، ان کے مقتولوں میں بردہ ابن ہلہلہ بھی تھا، ہلہلہ بڑا نامی شیخ تھا، غرض یہ خون کے پیاسے کلبی، دمشق کو اس وقت واپس ہوئے ہیں جبکہ قیسیوں کو ان کی اصلی غرض معلوم ہوگئی اور اُن کے غضب سے بچنے کے لیے وہ اپنے بیابان کی انتہائی سرحدوں تک چلے گیے۔

اِن واقعات کی خبر پہنچتے ہی تمام کلبیوں میں شادیانے بجنے لگے، قبیلہ جہینہ جو بنو کلب کی نسل قضاعہ کی ایک شاخ تھا، اُس کے ایک شاعر نے جوشِ تعصب میں بڑے زور شور کے اشعار جن سے کلبیوں کے دلی خیالات ظاہر ہوتے ہیں لکھے۔

"اے میرے بھائیو! جو بنی کلب کے دوست ہو معلوم کر دو کہ حمید بن بجدل اپنی قوم کے لیے مسرت و شادمانی کے بڑے بڑے سامان لایا ہے، معلوم کرو اس نے بنی قیس کو ذلیل و خوار کر کے اُن کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ڈیرے خیمے چھوڑ کر چلے جائیں یہ شکست اُن کے حق میں ایسی ہی سخت ہوگی جو وہ اس طرح دوڑ بھاگے حمید کے مقتول ریگ بیابان پر بے گور و کفن پڑے ہیں۔ بنی قیس کے فاتحوں نے اُن کا ایسا تعاقب کیا کہ وہ اپنے مُردوں کو بھی دفن نہ کر سکے، میرے بھائیو! خوش ہو کہ بنو کلب کی فتوحات ہماری فتوحات ہیں، ہم اور وہ ایک ہی شخص کے گویا دو ہاتھ ہیں، جب لڑائی میں داہنا ہاتھ کٹ جاتا ہے تو بایاں ہاتھ تلوار چلانے لگتا ہے۔"

اموی شہزادوں میں بھی جن کی مائیں بنو کلب سے تھیں (مثلاً عبدالعزیز بن مروان جن کی ماں اور خالد بن یزید جس کی دادی کلبی تھی) بڑی خوشیاں منائی گئیں، جس وقت عبدالعزیز بن مروان کے کان تک اس واقعہ کی خبر پہنچی تو وہ اپنے بھائی بشر بن مروان سے جس کی ماں قیسی تھی خلیفہ عبدالملک کے سامنے کہنے لگا "بشر! تمہیں معلوم ہے کہ میرے ماموؤں نے تمہارے ماموؤں کیساتھ کیا کیا؟"

بشر۔ کیا کیا؟

عبدالعزیز۔ کلبی سواروں نے قیسیوں کے ایک خیمہ گاہ کو غارت کر دیا۔

بشر۔ یہ ناممکن ہے۔ تمہارے سب ماموں اتنے کاہل اور نامرد ہیں کہ وہ میرے ماموؤں کے ساتھ تیغ آزمائی نہیں کر سکتے،

دوسرے دن صبح بشر کو معلوم ہوا کہ اُس کے بھائی عبدالعزیز نے جو خبر سنائی تھی وہ صحیح تھی، اب یہ ہوا کہ ہلہلہ، سعید اور بنو فزارہ کا ایک سردار دمشق میں اس حال سے پہنچے کہ سر ننگے تھے۔ قبائیں ندارد تھیں۔ برہنہ پا تھے اور تن کو چیتھڑے لگے تھے اس صورت سے بشر کے سامنے آ کر گر پڑے اور اُس کی امداد اور سرپرستی کے خواستگار ہوئے، بشر نے اُن کی درخواست منظور کی اور اپنے بھائی خلیفہ عبدالملک کی خدمت میں حاضر ہو کر ایسی پُر درد تقریر اِن لوگوں کی حمایت میں کی کہ عبدالملک کے دل پر باوجودیکہ وہ بنی قیس سے خوش نہ تھا، بہت اثر ہوا، اور اُس نے وعدہ کیا کہ کلبیوں کی عطار سے ایک رقم وضع کر کے بطور تاوان بنو فزارہ کو دی جائے گی، یہ فیصلہ قانون کے مطابق تھا، لیکن بنو فزارہ کو اس سے تسکین نہ ہوئی، وہ روپے کے بھوکے نہ تھے بلکہ خون کے پیاسے تھے ہر غرض جب اُنھوں نے اس فیصلہ کو منظور نہ کیا تو خلیفہ نے کہا "اچھا، نصف رقم تمہارے نقصان کی اسی وقت بیت المال سے تم کو دی جاتی ہے، اور باقی نصف رقم اگر تم خیر خواہ رہے جس کی نسبت مجھ کو بہت شبہ ہے، بعد کو ادا کر دی جائے گی"

فزارہ نے خلیفہ کی اِس بدگمانی کو اپنی توہین سمجھا۔ اور چونکہ وہ اپنی اس حالتِ بدخواہی سے کہ وہ ایک واقعہ تھی، انکار بھی نہ کر سکتے تھے، اور جوشِ انتقام بھی دلوں میں بھرا تھا اس لیے قریب تھا کہ وہ پھر خلیفہ کی تجویز کو نامنظور کر دیں، لیکن زفر بن الحرث اتفاق سے وہاں موجود تھا، وہ بنی فزارہ کو علیحدہ لے گیا، اور اُن کو سمجھایا کہ جو رقم ملتی ہے اُسے لے لو اس سے تم گھوڑے اور ہتھیار خرید سکتے ہو، بنی فزارہ نے یہ بات مان لی، اور انھوں نے زرِ تاوان لینا منظور کر لیا، اور اُس سے سامانِ جنگ خریدنے کے بعد اپنے صحرا کو چلے گئے،

جب اپنے خیمہ گاہ میں پہنچے تو اپنی قوم کے لوگوں کو جمع کیا، اور اس جلسہ میں ہلہلہ نے

نہایت آتش بار تقریر میں بنی قیس کو اشتعال دیا کہ کلبیوں سے جس طرح ہو سخت انتقام لینا چاہیے ہلہلہ کے لڑکوں نے باپ کی تائید کی، لیکن اس مجمع میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنکی آنکھیں خصومت کے آشوب نے بالکل بند نہیں کی تھیں، اور وہ جانتے تھے کہ اس وقت اس قسم کی کوئی بات اپنے ہی نقصان کا موجب ہوگی، چنانچہ ایک شخص نے جس کو ہلہلہ سے اس امر میں اختلاف تھا کہا کہ "اے ہلہلہ! تمہارا خاندان اس وقت ایسا کمزور ہے کہ وہ اس مہم کو سر نہیں کر سکتا، بنو کلب نے جو ہمیشہ سے گرگ خصلت ہیں، تمہارے گھرانے کے اکثر لڑنے والوں کو ہلاک کر دیا ہے، اور تمہارا مال و اسباب بھی سب لوٹ کر لے گئے ہیں، اس حالت میں اگر حملہ کیا بھی گیا تو تم ہمارا کیونکر ساتھ دے سکتے ہو" ہلہلہ نے جواب دیا کہ اے برادرزادے! میں ضرور سب کے ساتھ چلوں گا، کیونکہ ایک آگ ہے جو میرے سینے کو پھونکے ڈالتی ہے، ان کلبیوں نے میرے لخت جگر بردہ کو میرے پیارے بردہ کو جس سے مجھے عشق تھا قتل کر دیا ہے" اور اتنا کہہ کر بیٹے کا ذکر کرکے ہلہلہ چیخیں مار مار کر رونے لگا اور کہتا جاتا تھا کہ "ارے اگر میرے بردہ کو کسی نے دیکھا ہو تو بتلائے وہ کہاں ہے اسے میرے پاس لے آؤ، وہ میرا جگر پارہ ہے، میرا فرزند ہے، اپنے خاندان کا فخر تھا، کیسی کچھ امیدیں اُس کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اس کے بعد ہلہلہ نے ان لوگوں کے نام لینے شروع کیے جو کلبیوں کی تلواروں سے مارے گئے تھے، ایک ایک کا نام لے کر پوچھتا وہ کہاں ہے؛ وہ کہاں ہے؛ انتقام، انتقام،

اب تمام مجمع، یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو کچھ دیر پہلے احتیاط سے کام لینا چاہتے تھے اور اس مہم کے خلاف تھے، ہلہلہ کی پُر درد تقریر سنکر بالکل وارفتہ ہو گئے اور اسی وقت سب نے مصمم ارادہ کر لیا کہ ایک مہم بنو کلب کو غارت کرنے کے لیے روانہ ہونی چاہیے چنانچہ جس قدر فزاری اس وقت موجود تھے انھوں نے بنات قائن کی طرف کوچ کر دیا، یہاں کلبیوں کی ایک بستی تھی، صبح ہوتے ہوتے بنی فزارہ بنی کلب پر جا ٹوٹے، کلبی دشمن سے غافل تھے، اور اب قیسیوں نے کلبیوں میں ایک تہلکہ ڈال دیا "بردہ کا بدلہ، جاد کا بدلہ، اور بدلہ اُن کا جو ہمارے مارے گئے ہیں" یہ جملے قیسیوں کی زبان پر تھے اور کلبیوں

کلبیوں میں کشت و خون کا ایک بازار گرم کر رکھا تھا، بنی کلب کے تمام لوگ صرف ایک آدمی کو چھوڑ کر جو اس ہنگامہ سے بھاگ گیا تھا۔ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، فزاریوں کی یہ کیفیت تھی کہ جس کلبی کو زمین پر پڑا دیکھتے، اس کے پاس جا کر غور کرتے کہ اس میں جان تو باقی نہیں ہے اگر ذرا سی رمق بھی معلوم ہوتی، تو فوراً تلوار سے اس کا خاتمہ کر دیتے۔ (۱۰۳)

جب اس قتل و غارت والی مہم کی اطلاع بشر بن مروان کو پہنچی تو اس نے بھی اپنا بدلہ نکالا، اور خلیفہ عبدالملک کے سامنے اپنے بھائی عبدالعزیز سے پوچھا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے ماموؤں نے آپ کے ماموؤں کے ساتھ کیا کیا؟" اس پر عبدالعزیز نے کہا "کیا یہ ممکن ہے کہ مصالحت ہونے کے بعد بھی جبکہ بنی قیس کو خلیفہ کی طرف سے ان کے نقصان کا معاوضہ ادا ہو چکا تھا۔ بنی قیس نے بنی کلب سے بدلہ لیا؟" عبدالملک یہ گفتگو سنکر سخت برہم ہوا، اور دونوں بھائیوں کو چپ کرا کے اصلی واقعات کا علم حاصل کرنے کے بعد اس معاملہ کو فیصلہ کرنے کا انتظار کرنے لگا، تھوڑی دیر گذری تھی کہ ایک کلبی، قبا اتری ہوئی، ننگے پاؤں، پھٹے حال، عبدالعزیز کے پاس آیا۔ عبدالعزیز اس کو جس حال میں وہ آیا تھا اسی حال میں خلیفہ کے سامنے لے گئے اور عرض کیا کہ "اے امیرالمومنین! کیا آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ جن لوگوں کو آپ اپنے سایہ عاطفت میں لے چکے ہیں، ان پر جور و تعدی کی جائے، آپ کے حکم کی نافرمانی ہو، آپ کا روپیہ اس غرض سے وصول کیا جائے کہ آپ ہی کے مقابلہ میں اسے صرف کر کے آپ ہی کی رعایا کو قتل کریں۔ کیا یہ حرکتیں حضور گوارا کر سکتے ہیں؟" اس کے بعد کلبی نے جو واقعات پیش آئے تھے بیان کیے عبدالملک غصہ سے بیتاب ہو گیا اور بنی قیس کے تدارک کا مصمم قصد کر لیا اپنے قہر و عتاب کا پورا اثر ڈالنے کے لیے فوراً حجاج کے نام جو اس وقت تمام عرب کا عامل تھا حکم لکھا کہ بنی فزارہ کے جس قدر مرد بالغ ہوں ان سب کو قتل کر دیا جائے۔

اگرچہ بنی فزارہ حجاج کے قبیلہ بنی ثقیف سے قریب کا واسطہ رکھتے تھے، لیکن حجاج کو اس حکم کے بجا لانے میں ذرا تامل نہ ہوا، گو اسے اپنی قوم سے بعید تعلق تھا لیکن قوم کی محبت سے کہیں زیادہ دنیا طلبی اس میں موجود تھی، اس معاملہ میں حجاج نے صاف سمجھ

لیا تھا کہ خود اس کے لیے اور اس کی قوم کے لیے صرف ایک ہی رستہ ہے جسکو اختیار کیا جا سکتا ہے اس کی عقل گواہی دیتی تھی کہ مخالفت بالکل بیکار ہوگی جس طرح ہو عبد الملک کو خوش رکھنا چاہیے اسلیے خلیفہ نے جو حکم دیا ہے اُس پر عمل کرنا لازمی ہے، چاہیے اس میں مقدس سے مقدس مقام کا مسمار کرنا، یا اپنے کسی عزیز کا قتل کرنا ہی کیوں نہ ہو، لیکن باوجود ان تمام خیالات کے حجاج فکرمند و دلگیر تھا، چنانچہ جب قتل کا ارادہ کر کے بنی فزارہ کی طرف چلا تو کہنے لگا بنی فزارہ کا خون کرتے ہی میری رسوائی و بے عزتی کا زمانہ آجائے گا، میرا نام لوگوں کی زبانوں پر حقارت سے آیا کریگا، اور وہ کہا کریں گے کہ قیسیوں میں حجاج سے بدتر کوئی قیسی دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔ علاوہ اس کے جو کام اسوقت ملا تھا وہ دشوار بھی بہت تھا، کیونکہ نہ صرف بنی غطفان نے جو فزارہ کے دوست تھے، بلکہ تمام بطون قیس نے اس بات کا حلف لے رکھا تھا کہ جب وقت پڑیگا بنی فزارہ کی مدد کرینگے، پس اگر بنی فزارہ پر ذرا بھی زیادتی ہوئی تو ملک میں وہ ایک عام خانہ جنگی کا باعث ہو جائے گی، حجاج اسی فکر و تردد میں تھا کہ ہلہلہ اور سعید اس کے سامنے آئے اور حجاج کی پریشانی رفع ہوگئی، یہ دونوں سردار اس بات سے تو بہت خوش اور مطمئن تھے کہ بنات فائن میں کلبیوں سے خوب خوب بدلے نکال لیے، لیکن ڈرے ہوئے اس بات سے تھے کہ کہیں اس واقعہ سے جنگ عام نہ ہو جائے اور اس سے اُن کی قوم کے لیے بُرے نتیجے پیدا ہوں، اس لیے انھوں نے قصد کر لیا کہ قوم کو ہلاکت میں ڈالنے کی جگہ وہ اپنی ہی جانیں اس پر سے قربان کر کے قوم کو سخت آفت سے بچالیں، جسطرح پہلے بنی کلب کی عداوت کا جوش و خروش اُن میں پیدا ہوا تھا اب قوم کی محبت کا جذبہ بھی اسی رنگ میں ظاہر ہوا، اور دونوں نے حجاج کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا کہ "اے حجاج! تو بنی فزارہ کی کل قوم سے کیوں ناراض ہے، قصور تو ہم صرف دو آدمیوں کا ہے" حجاج یہ سنکر دل میں بہت خوش ہوا، اور یہ سوچ کر کہ ایک بڑی مشکل مفت میں حل ہوئی جاتی ہے، اُس نے ہلہلہ اور سعید کو فوراً گرفتار کر لیا، اور خلیفہ عبد الملک کو لکھا کہ "تمام قبائل بنی قیس سے لڑنے کو اس نے مناسب نہ سمجھا اور صرف اُن کے دو بڑے سرداروں کو گرفتار کر لیا ہے، خلافت مآب اس معاملہ کو اسی حد تک رکھیں تو بہتر ہو" خلیفہ عبد الملک نے اس رائے کو بہت پسند

کیا، اور حجاج کو حکم بھیجا کہ دونوں قیدیوں کو لے کر دمشق میں حاضر ہو۔

جب یہ دونوں قیسی یعنی ہلہلہ اور سعید قصر خلافت میں جہاں چاروں طرف کلبی حاضر تھے، عبدالملک کے سامنے پیش کیے گئے تو نقیب نے آواز لگائی "سلام بجالاؤ" ہلہلہ نے بجائے سلام کے چند اشعار جن میں بعض اسی کے کہے ہوئے تھے اس مضمون کے پڑھے

سلام ہو عدی پر اور مازن پر اور شمیخ[1] پر سب سے بڑھ کر سلام ہو ابو وہب[2] پر، جو میرا سچا دوست ہے، اب میں موت کو خیر مقدم کہہ سکتا ہوں، کیونکہ بنی کلب کے خون سے اپنی پیاس بجھا چکا ہوں، مجھ کو بہت مسرت حاصل ہو چکی ہے جس قدر کلبی میری تلوار کے سامنے آئے ان کو میں نے قتل کیا چونکہ وہ مر چکے ہیں اس لیے میرے دل کو اب چین ہے

اس گستاخی کے جواب میں خلیفہ نے ہلہلہ کا نام جان کر غلط پکارا، گویا وہ ایک ایسے معمولی آدمی کا نام تھا جو اتنی عزت کا مستحق بھی نہ تھا کہ اس کا نام صحت کے ساتھ زبان پر لایا جائے، عبدالملک نے اس کا نام ہلہل کہہ کر لیا، لیکن ہلہلہ نے فوراً اس غلطی کو درست کرنے کے لیے کہا کہ "میرا نام ہلہلہ ہے" خلیفہ نے کہا "نہیں، یقینی تیرا نام ہلہل ہے" اس کا جواب ملا کہ "نہیں میرا نام ہلہلہ ہے، اور میرا باپ یہی نام لے کر مجھے پکارتا تھا اور وہ میرا نام بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ صحت کے ساتھ جان سکتا تھا" خلیفہ نے کہا اچھا اگر ہلہلہ ہے تو یہی سہی، سن! تو نے ان لوگوں پر عذاب کیا جن کو امیر المومنین نے پناہ دی تھی، تو نے ہمارے حکموں کی پروا نہ کی اور ہمارے روپیہ میں سرقہ کیا!

ہلہلہ۔ میں نے ان باتوں میں سے ایک بھی نہیں کی، ہاں اپنے عہد کو پورا کیا (۱۰۵
دشمن کی جس قدر تحقیر میرے دل میں تھی وہ ظاہر کی اور جس قدر انتقام لینا ممکن تھا، وہ لیا عبدالملک۔ اور اب خدا نے تجھے اس انتقام لینے والے ہاتھ کے سپرد کر دیا جو عدل و انصاف کا ہاتھ ہے۔

۱؎ عدی، مازن اور شمیخ تینوں فزارہ کی شاخیں تھیں ۲؎ ابو وہب، قبیلہ مازن سے تھا

ہلہلہ میں کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا ہوں اے ابن زرقار

یہ نام عبدالملک کے لیے سخت موجب توہین تھا، کیونکہ ایام جاہلیت میں ازرقار اس کی ایک وادی تھی جو سخت بدنام تھی، عبدالملک نے اتنا سنتے ہی ثویر کلبی کے سپرد اُس کو کر دیا، ثویر نے ہلہلہ پر اپنے باپ کے قتل کا الزام لگایا جو بنات قائن میں مارا گیا تھا۔

ثویر نے ہلہلہ سے پوچھا کہ "اے ہلہلہ! تو نے میرے باپ کو کب دیکھا تھا؟" ہلہلہ نے جواب دیا کہ بنات قائن میں اسے اخیر مرتبہ دیکھا تھا، اور اس وقت وہ بدبخت سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا" ثویر نے اتنا سن کر کہا" واللہ! میں تجھے قتل کروں گا" ہلہلہ نے کہا" تو اور قتل کرے گا! تو جھوٹا ہے، واللہ اس کام کے لیے تو کمینہ اور بزدل ہے یہ میں جانتا ہوں کہ میرے مرنے کا وقت قریب ہے کیونکہ یہ ابن زرقار کی خوشی ہے کہ میں مارا جاؤں" اتنا کہہ کر ہلہلہ مقتل میں بالکل ہوش و حواس کے ساتھ گیا اور بدوی اشعار نہایت گستاخانہ مزاج کے پڑھتا رہا، بشر نے ہلہلہ کے قتل کے وقت اس کے قریب رہنے کی اجازت لے لی تھی اور اس کو ہلہلہ کی ہمت و مردانگی پر ہمیشہ ناز رہا، جب ثویر نے گردن مارنے کے لیے تلوار اٹھائی تو ہلہلہ نے کہا" ایسا سچا ہاتھ لگانا جیسے میں نے تیرے باپ کی گردن پر لگایا تھا"

ہلہلہ کا ساتھی سعید، جس کو عبدالملک نے ایک دوسرے کلبی کے حوالے کیا تھا، اس نے بھی بڑی مردانگی اور جرأت قتل ہونے کے وقت دکھائی۔

اسناد:

سیوطی صفحہ ۲۱۶-۲۱۷

مجبرو صفحہ ۶۲۵-۶۳۶-۸۷۰

ابن قتیبہ صفحہ ۲۰۱-۲۰۲، ۲۷۲

ابن خلکان (اڈیشن دی سلین) ج ۱-ص ۱۸۲

فاکہی صفحہ ۱۰۴

حماسہ صفحہ ۲۶۰-۲۶۴ ، ۶۵۸

ریحان صفحہ ۲۰۴

آغانی ج ۱- صفحہ ۲۷

کتاب اوّل

خانہ جنگی

نویں فصل

کلبی اور قیسی

بسلسلہ فصل ہشتم

(۱۰۶)

ایک طرف تو شام کے عرب باہمی کشت وخون میں مصروف تھے دوسری طرف اہل عراق جن میں اکثر لوگ مفسد اور سرکش تھے، آپس میں لڑنے مرنے سے باز نہ آتے تھے اس آشوب زمانہ کو ایک مدت گذرنے کے بعد بھی کوفے اور بصرہ کے رئیس حسرت سے یاد کیا کرتے تھے یعنی وہ زمانہ جبکہ دس بیس غلاموں کو ساتھ لیتے، شہر کے گلی کوچوں میں تنتے اکڑتے غضبناک نگاہیں اِدھر اُدھر ڈالتے پھرا کرتے تھے، جہاں ذرا بھی کسی کی نظر ٹیڑھی دیکھی، فوراً تلواریں کھینچ لیں دو چار کی گردن اڑا دی تو پروا بھی نہ کی، کیونکہ جانتے تھے عامل شہر بہت نرم دل ہے کسی قصور کی سزا نہیں دیتا۔ عاملان عراق کا بالعموم یہ حال تھا کہ مجرموں کو سزا دینے ہی سے پرہیز نہ کرتے تھے بلکہ مہلب سے حسد رکھنے میں وہ رعایا کی حفاظت کا بھی بندوبست نہ کرتے تھے جو آئے دن خوارج کے حملوں اور غارت گری کا نشانہ بنی رہتی تھی، مہلب کیساتھ

والیان عراق کا یہ رشک و حسد کچھ بے سبب نہ تھا، عراق کے لوگ مہلب کو سب سے بڑا سپہ سالار اور عراق کا واقعی محافظ و مددگار سمجھتے تھے، کوئی نام مہلب کے نام کے برابر ان کو عزیز نہ تھا، چونکہ لشکرِ عراق کی سپہ سالاری اپنی ہی پیش کردہ شرطوں پر مہلب کو حاصل ہوئی تھی اس وجہ سے بے انتہا دولت پیدا کر لی تھی اور بڑی دریا دلی سے اُسے صرف کیا کرتا تھا[1]، پس مہلب کے شاندار طرزِ معاشرت، شاہانہ تموّل، بے انتہا سخاوت اور عالمگیر شہرت کے سامنے والیان عراق کسی گنتی میں نہ رہے تھے۔

خالد بن عبداللہ اموی جو عراق پر عبدالملک کے مسلط ہونے کے بعد بصرہ کا پہلا عامل مقرر ہوا تھا، ایک دن بہت افسردہ ہو کر کہنے لگا "اس شہر کے عربوں کو مہلب کے سوا کوئی دوسرا اچھا ہی نہیں" یہ رشک خالد کے دل میں ایسا بیٹھا کہ مہلب کو خوارج کے مقابلہ سے واپس بلا کر اپنی طرف سے اہواز کا عامل مقرر کر دیا، تاکہ مہلب شہرت و ناموری کے ذرائع سے محروم ہو کر ایک گونہ بیکاری و گمنامی کی حالت میں پڑا رہے، مہلب کی خالی جگہ پر خالد نے اپنے بھائی عبدالعزیز کو تیس ہزار کے لشکر پر سپہ سالار مقرر کیا، عبدالعزیز ایک نوعمر، بد دماغ اور ناتجربہ کار سا آدمی تھا، ایک روز دعوے سے کہنے لگا کہ بصرے (۱۰۶)
والے سمجھتے ہیں کہ خوارج کی جنگ کو مہلب کے سوا کوئی ختم نہیں کر سکتا، اچھا اب میں دکھاؤں گا کہ لڑائی ختم کرنا کس کو کہتے ہیں" اس بڑے بول کا انجام یہ ہوا کہ خوارج کے مقابلہ میں سخت کشت و خون کے بعد خالد نے قطعی شکست کھائی، عبدالعزیز کے افسر ماتحت نے خاص طور پر کہہ دیا تھا کہ خوارج کا ایک دستہ جو میدان سے بھاگا ہے اس کا تعاقب نہ کیا جائے، کیونکہ یہ بھاگنا ایک دھوکہ ہے، مگر عبدالعزیز نے کچھ نہ سنا، خارجیوں کا پیچھا کیا اسی حال میں کچھ آگے پہنچنے کے بعد کمین گاہ سے دشمن باہر نکل آیا، اور عبدالعزیز کے تمام افسران فوج اور بہت سی سپاہ حتیٰ کہ اس کی حسین بیوی (جو منذر بن جارود کی بیٹی تھی) اس کے

---

[1] بیان کیا گیا ہے کہ مہلب نے ایک مرتبہ ایک قصیدہ پڑھنے والے کو ایک لاکھ درہم، اور شاعر کو جس کا قصیدہ تھا اتنی ہی رقم دی تھی۔

سب خارجیوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے، بیس آدمی تلواریں کھینچے ہوئے عبدالعزیز کے پیچھے دوڑے مگر اُس نے بھاگ کر کسی طرح اپنی جان بچالی، جس پر سب کو حیرت ہو گئی۔

اس شکست پر مہلب کو کچھ تعجب نہ ہوا وہ پہلے ہی سے سمجھا بیٹھا تھا کہ عبدالعزیز ناکام رہے گا اور اسی لیے ایک آدمی لڑائی کی خبر دینے کے لیے اس نے مقرر کر رکھا تھا جب لڑائی ختم ہوئی تو یہ آدمی مہلب کے پاس آیا۔ مہلب نے اسے دیکھتے ہی چلّا کر پوچھا "کیا خبر لائے"؟

قاصد۔ ایسی خبر لایا ہوں جسے سنکر آپ خوش ہو جائیں گے، عبدالعزیز کو شکست ہو گئی اور اس کی فوج بھاگ گئی۔

مہلب۔ اے بدبخت! کیا تو سمجھتا ہے کہ میں ایسی خبر سے کہ ایک قرشی کو شکست ہو گئی اور مسلمانوں کا لشکر میدان سے بھاگ گیا، خوش ہو سکتا ہوں؟

قاصد آپ خوش ہوں یا ناخوش، خبر جو میں نے سنائی ہے وہ سچّی ہے۔

اب کُل عراق خالد پر آگ بگولہ ہو گیا، لوگ کہنے لگے "دیکھئے یہ نتیجہ ہوتا ہے، شریف وفادار مہلب کو جو لڑائی میں آزمودہ کار تھا، خطروں کو پہلے ہی سے دیکھ کر اُنکا علاج سوچ لیتا تھا، اُسکو تو دشمن کے مقابلے پر بھیجا نہیں، بھیجا تو کسے، ایک نوجوان آدمی کو جسکی ہمت و لیاقت کا پہلے سے مطلق اندازہ نہیں کیا گیا تھا" اس قسم کے فقرے خالد کو سنکر برداشت کرنے پڑتے تھے، ادھر بھائی کی ذلت و بدنامی کا بھی افسوس تھا، یہ سب کچھ تھا مگر عزت کا احساس بہت کم تھا، محض انتقام لینے کی آرزو میں نہ بصرے کی امیری چھوڑی اور نہ زندگی سے رخصت چاہی اور ایک پریشان حالت میں جو روز بروز بدتر ہوتی جاتی تھی، دمشق سے قاصد کے آنیکا انتظار کرنے لگا۔

کمزور طبیعتوں کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی مشکل پیش آتی ہے تو قوی طبیعتوں سے مشورہ کرکے اطمینان حاصل کرنا چاہتی ہیں، چنانچہ خالد نے مہلب کو بلوایا اور پوچھا کہ "تمھاری رائے میں خلیفہ اب کیا کریگا" مہلب نے بڑی بے اعتنائی سے جواب دیا کہ "آپ کو معزول کر دے گا"، مہلب خالد سے ایسا بیزار تھا کہ اسے خالد کی تسلی یا دلجوئی کرنی گوارا نہ ہوئی۔

خالد۔ لیکن کیا اس سے بھی بدتر کسی بات کا مجھے منتظر ہونا چاہیئے، کہ عبدالملک میرا رشتہ دار ہے"

مہلب: بیشک، کیونکہ اس خبر کیساتھ کہ آپ کے بھائی عبد العزیز نے ایران کے خارجیوں سے شکست کھائی ہے، خلیفہ یہ خبر بھی سنے گا کہ آپ کے دوسرے بھائی کو دشمن نے بحرین میں ہزیمت دے دی ہے۔

آخر کار جس قاصد کے آنے کا خوف تھا وہ آیا، اور خالد کو اس نے خلیفہ کا ایک خط دیا۔ اس خط میں عبد الملک نے خالد کو اس کی حماقت اور قصداً غلط کاری پر سخت نفرین کی اس کی معزولی سے اُسے آگاہ کیا اور اخیر میں یہ جملے لکھے کہ "اگر میں تم کو تمہاری خطاؤں کے مطابق سزا دوں تو میرے قہر و عتاب کا بار تم پر بہت زیادہ ہو جائے گا، مجھ کو قرابت مندی کا خیال ہے اس لئے اتنا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم کو بصرہ کی امارت سے برطرف کر دوں۔" (۱۰۸)

خالد کی جگہ عبد الملک نے اپنے بھائی بشر بن مروان کو جو کوفہ کا عامل تھا، امیر بصرہ مقرر کیا، اور حکم دیا کہ لشکر عراق کی سپہ سالاری مہلب کو دی جائے اور لشکر میں آٹھ ہزار سپاہ کا اضافہ کیا جائے، بصرہ کی ولایت پر بشر کا تقرر نہایت نامناسب تھا، اور اس سے بڑھکر کوئی غلطی نہ ہو سکتی تھی، کیونکہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ بشر، بنی قیس کا بیحد طرفدار تھا، قبائل یمانیہ سے اُس کو ہمیشہ کی عداوت تھی، اور ان قبائل کا عراق میں سب سے بڑا سرگروہ وہ مہلب ہی کو سمجھتا تھا، غرض عبد الملک کا حکم سُنکر بشر بن مروان کو بہت غصہ آیا، اور اس نے مہلب کو جان سے مار ڈالنے کی قسم کھالی، اتفاق سے بشر بن مروان کے ندیم موسیٰ بن نصیر[۱] (فاتح اندلس) وہاں موجود تھے، انھوں نے بشر کا غصہ فرو کیا، اور اس کے ساتھ ہی ایک خط مہلب کو اس مضمون کا لکھ بھیجا کہ بشر، بصرہ آتا ہے اس موقع پر جہاں تک ممکن ہو، احتیاط سے کام لینا، لوگوں کے ہجوم میں اگر بشر کا خیر مقدم کرنا لیکن جب وہ دربار کرے تو اس کے سامنے ہرگز نہ آنا، مہلب نے اس ہدایت پر عمل کیا۔

---

[۱] موسیٰ بن نصیر شروع میں حضرت ابن زبیرؓ کے ہواخواہوں میں تھے، مرج راہط والی لڑائی میں حضرت ابن زبیر کی طرف سے موجود تھے، مروان بن الحکم کو جب اس لڑائی میں فتح ہوگئی تو اس نے موسیٰ کی گرفتاری یا قتل کا حکم دیا، یہ سنتے ہی موسیٰ عبد العزیز بن مروان کے پاس چلے گئے، عبد العزیز نے ان کی حمایت اور سرپرستی کی، اس وقت سے موسیٰ خاندان بنی امیہ کے ہمیشہ خیر خواہ اور وفادار رہے۔

جب بشر بصرہ پہنچا تو روسا شہر کو جمع کر کے دربار کیا، مہلب کو غیر حاضر پاکر وجہ دریافت کی، جواب ملا کہ بازار میں جہاں مجمع عام تھا، مہلب موجود تھا اور اُس نے بشر کو سلام بھی کیا تھا لیکن وہ اِس قدر بیمار ہے کہ دربار میں حاضر نہیں ہو سکا جب یہ سنا کہ مہلب بیمار ہے تو اُس کو لشکر کی سپہ سالاری سے محروم رکھنے کے لیے بشر کو اچھا حیلہ ہاتھ آیا۔ بشر کے گرد و پیش جو خوشامدی موجود تھے، وہ بھی کہنے لگے کہ بحیثیت والئی ملک ہونے کے امیر کو خود اختیار ہے کہ جس کو چاہے سپہ سالار مقرر کرے، لیکن چونکہ عبدالملک کا حکم خاص مہلب کے لیے تھا۔ اسلیے بشر نے استفسار کرنا مناسب سمجھا، اور ایک وفد خلیفہ کی خدمت میں مع ایک معروضہ کے اس مضمون کا بھیجا کہ مہلب بیمار ہے، عراق میں اس کی مثل اور بہت سے جوانمرد و شجاع ایسے موجود ہیں جن کو لشکرِ عراق کی سپہ سالاری دی جا سکتی ہے۔

جب یہ وفد دمشق پہنچا تو عبدالملک نے ابن حکم سے جو وفد کا سردار تھا علیحدہ بلا کر پوچھا کہ "اے ابن حکم! تم بہت سچے اور عقلمند آدمی ہو، بالکل آزاد ہو کر بتاؤ کہ وہ کونسا فوجی افسر (۱۰۹)
ہے جس میں اتنی لیاقت ہو کہ وہ خوارج کی اس جنگ کو کسی طرح ختم کرا دے؟" ابن حکم گو قبائل یمانیہ سے نہ تھا، لیکن اُس نے بلا تامل مہلب کا نام لیا، عبدالملک نے کہا "لیکن مہلب تو بیمار ہے" ابن حکم نے ہنس کر کہا "یہ بیماری نہیں ہے جس کی وجہ سے اس کو مسندِ سپہ سالاری نہیں دی جاتی" اتنا سنتے ہی عبدالملک نے کہا "اچھا میں سمجھ گیا، بشر بھی خالد کے قدم بقدم چلنا چاہتا ہے۔"

عبدالملک نے فوراً بشر کو تاکیدی حکم بھیجا کہ سوائے مہلب کے کسی کو لشکر کی افسری نہ دی جائے بشر نے حکم کی تعمیل کی لیکن مجبوراً و بکراہت، مہلب نے اب ایک فہرست اُن اچھے لڑنے والوں کی جن کو وہ اپنے لشکر میں داخل کرنا چاہتا تھا بشر کو بھیجی، بشر نے ان میں سے جس قدر لوگ واقعی دلاور اور جری تھے اُن کے نام کاٹ دیے اور ابن مخنف کو بلا کر کہا (کوفہ سے جو لشکر امداد کے لیے آیا تھا، یہ اس کے افسر تھے) کہ "اے ابن مخنف! میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں اور تم پر مجھ کو پورا بھروسہ ہے اگر مجھ کو دوست رکھنا منظور ہے تو جو میں کہتا ہوں وہ کرو یعنی لڑائی میں مہلب کے کسی حکم پر عمل نہ کرنا، اور ایسی ترکیب کرنا مہلب کے جتنے منصوبے ہوں اُن میں سے کسی میں اس کو کامیابی نہ ہو۔"

ابن مخنف نے یہ باتیں سنکر سر نیچا کر لیا، بشر سمجھا کہ انھوں نے سب باتیں مان لیں، لیکن بشر، ابن مخنف سے بخوبی واقف نہ تھا، یہ اسی قوم اور قبیلے کے آدمی تھے جس قوم و قبیلہ کا مہلب تھا، اور ان کا ہرگز ارادہ نہ ہوا کہ وہ مہلب کے ساتھ وہ برتاؤ کریں جس کی بشر نے اُن کو ہدایت کی تھی، چنانچہ جب قصرِ امارت سے باہر آئے تو کہنے لگے "یہ لونڈا پاگل ہو گیا ہے سمجھتا ہے کہ میں اپنی قوم کے ایسے نامور سردار سے بے وفائی کر سکتا ہوں۔"

اب عراق کی فوجیں لڑائی کے میدان میں پہنچیں، گو بشر نے مہلب کے لشکر کو بہترین تجربہ کار افسروں اور لڑنے والوں سے محروم کر دیا تھا، لیکن اس پر بھی مہلب نے پہلے فرات کے کناروں سے پھر اہواز، اور پھر رام ہرمز؎ سے خوارج کو ہٹا دیا، مہلب ان فتوحات میں مصروف تھا کہ یکلخت بشر کے مرنے کی خبر آئی اور اب جو کام بشر اپنی زندگی میں نہ کر سکا تھا وہ اس کی موت سے از خود عمل میں آگیا، مرنے کی خبر آتے ہی لشکر میں ابتری پڑ گئی، اہل لشکر خود غرض اتنے تھے کہ ان میں اکثر لوگ اس لڑائی کو محض اہل بصرہ کے فائدہ کے لیے یقین کرتے تھے اسی بنا پر کوفے کی سپاہ نے جو ابن مخنف کے تحت میں تھی، نافرمانی کی اور اُس کے لوگ لشکر سے علیحدہ ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے، بصرہ کی فوج والوں نے بھی یہی کیا، حقیقت یہ ہے کہ خوارج سے اس وقت تک جتنی لڑائیاں ہوئی تھیں، اُن میں کبھی ایسی اندیشناک حالت پیدا نہیں ہوئی تھی جیسی کہ اس وقت ہوئی، عراق اب طرح طرح کی بغاوتوں اور سرکشیوں کا نشانہ بن گیا، نظم و نسق کسی قسم کا باقی نہ رہا، بشر تو مر ہی چکا تھا، اُس کے نائب نے کوفے سے اُن لوگوں کے نام جو لشکر سے علیحدہ ہو چکے تھے، حکم بھیجا کہ لڑائی پر واپس جائیں ورنہ سزائے موت دی جائیگی، مگر ان لوگوں نے یہی جواب دیا کہ اب تو ہم اپنے گھروں کو واپس جا رہے ہیں سزا دینے کا سوال خارج از بحث تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ خوارج نے بہت جلد اُن چند جانباز اور وفادار لوگوں کو جو مہلب کے عَلَم کے نیچے اب تک ثابت قدم رہے تھے شکستیں دینی شروع کیں اور تمام سرحدوں کو توڑ کر عراق میں سیلاب کی طرح اُمنڈ آئے اس سے پہلے خالد کے بھائی عبدالعزیز کی شکست کے وقت جو بدقسمت لوگ خوارج کے ہاتھ لگے تھے، اُن کو سخت ایذائیں اٹھانی پڑی تھیں کوئی

؎ رام ہرمز، شہر بصرہ سے تقریباً سو میل شمال مشرق میں ہے۔

زنجیروں میں جکڑا گیا، کوئی زندان میں محبوس ہوا، بعض بھوک پیاس سے مر گئے، جب اُن پر یہ آفات گذر چکی تھیں تو کس کو یقین ہو سکتا تھا کہ اب جو لوگ ان کے پنجۂ غضب میں گرفتار ہوں گے اُنکا بھی وہی درجہ نہ کیا جائیگا، غرض اس وقت سب باتوں کا دارومدار اس پر تھا کہ عراق کا نیا عامل کس قسم کا آدمی مقرر کیا جاتا ہے، اگر خلیفہ نے عمدہ انتخاب نہ کیا تو پھر عراق کے ہاتھ سے نکل جانے میں کچھ شبہ باقی نہ رہتا تھا۔

خلیفہ عبدالملک نے حجاج بن یوسف الثقفی کو جو اس وقت مدینے میں تھا، کوفہ کا گورنر مقرر کیا، حجاج حکم سنتے ہی فوراً کوفے روانہ ہوا، اُس وقت صرف بارہ آدمی اُس کے ساتھ تھے (دسمبر ۶۹۴ء) جب شہر میں داخل ہوا تو سیدھا مسجد جامع کی طرف گیا، جہاں بہت لوگ نئے عامل کے آنے کی خبر سنکر جمع ہو گئے تھے، کمر میں تلوار لگائے، کمان ہاتھ میں لیے عمامہ کے ایک سرے کو منہ پر نقاب کی طرح ڈالے مسجد میں داخل ہوا جب ممبر پر بیٹھا تو اپنی کمزور نظر کو (کیونکہ دور کی چیز کم دکھائی دیتی تھی) دیر تک مجمع میں چاروں طرف پھراتا رہا، مگر زبان بند رکھی جب یہ سکوت دیر تک رہا تو لوگ سمجھے کہ بزدل سا آدمی ہے، اب شہر والوں کو غصہ آنا شروع ہوا وہ اگرچہ بڑے کاموں میں ہیٹے تھے لیکن بدزبانی اور گستاخی میں بالخصوص جب اپنے کسی امیر کی توہین کا موقع آئے، پورے اُستاد تھے، جب دیکھا کہ حجاج کچھ بولتا ہی نہیں، تو آپس میں کہنے لگے کہ خدا بُرا کرے اِن بنی اُمیہ کا، ہمارے ملک کی حکومت ہمیشہ نالائقوں کے سپرد کرتے ہیں، اُن میں ایک صاحب ایسے منچلے تھے کہ انھوں نے اسکے سر پر ایک پتھر رسید کرنا چاہا، یہ باتیں شروع ہوئی تھیں کہ دفعتہً حجاج نے اس سکوت کو توڑا جسے قصداً اختیار کیا تھا، چونکہ نہ صرف فن سیاست میں بلکہ خطابت میں بھی بڑا دلیر موجد تھا اسلیے حسب دستور حمد و نعت بھی نہ کہی، اور خطبہ شروع کر دیا، عمامہ کا سرا ہٹایا جس سے چہرہ ابھی تک چھپا ہوا تھا اور ایک پرانے شاعر سہیم ابن وائل کے اس شعر سے اپنی تقریر شروع کی "میں طلوع ہوتا ہوا آفتاب ہوں، ہر مانع و مشکل پر غالب آتا ہوں اپنے تئیں شناخت کرانے کے لیے یہی کافی ہے کہ چہرہ سے نقاب ہٹا دوں"[1] اس کے بعد آہستہ اور متین لہجے میں کہنا شروع کیا "میں اُن سروں کو دیکھ رہا ہوں جو پک کر تیار ہو چکے

[1] میں نے اس شعر کو انگریزی سے ترجمہ کیا ہے، اصل عربی سے ترجمہ کیا جائیگا تو اس میں فرق ہو گا۔ مترجم

ہیں اور اُن کے کاٹننے کا وقت قریب آن پہنچا ہے، اُن کا کاٹنے والا کون ہے؟ میں ہوں،
میں عماموں اور ڈاڑھیوں کے بیچ میں، جو سینوں پر بکھری ہیں، خون دیکھ رہا ہوں۔ خون
(۱۱۱) اس کے بعد لہجے میں کسی قدر گرمی پیدا کر کے کہا "اے عراق کے لوگو! خدا کی قسم میں اُن
لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دھمکی کی نگاہیں دیکھ کر بھاگ جاتے ہیں، میں اُس اونٹ کی طرح
نہیں ہوں جو خالی مشک کو ڈھول کی طرح پیٹنے سے ڈر کر نوک دُم بھاگتا ہے جس طرح گھوڑے
کی عمر اور مضبوطی معلوم کرنے کے لیے اُس کے منہ کو اندر سے دیکھتے ہیں اسی طرح میرا امتحان بھی
کیا گیا ہے۔ اور میری عقل داڑھیں دیکھ لی گئی ہیں، امیر المومنین نے اپنے ترکش سے تیر نکال کر
پھیلائے اور ایک ایک کو نہایت غور اور احتیاط سے پرکھا، اور اُن میں جو سب سے زیادہ مضبوط اور سخت
تیر نکلا، وہ میں ہوں، اسی لیے تمہاری طرف بھیجا گیا، مدت سے فساد اور بغاوت تم نے اپنا شیوہ کر
رکھا ہے، لیکن اب سن لو کہ میں نے کس بات کی قسم کھائی ہے؟ میں تم کو اُس خاردار جھاڑی کی طرح
سمجھوں گا جس کو لوگ ایندھن بناتے ہیں اور پہلے اس سے کہ جلانے کے لیے اس ایندھن کی
ڈھیریاں لگاؤں، سب کو رسی سے ایک گٹھے میں باندھ لوں گا، میں تم کو اس طرح پیٹوں گا جیسے
کوئی اونٹوں کے ان اونٹوں کو پیٹتا ہے جو چراگاہ میں چرتے رہ جاتے ہیں، اور آگے نکل کے ان کے ساتھی سب
تھان پر بندھنے کے لیے چل پڑتے ہیں، اس کو اچھی طرح سمجھ لو کہ میں جو کہتا ہوں وہی کرتا ہوں
اور جس وقت جوتی کا تلا ناپ لیا پھر چمڑا اسی ناپ پر کاٹتا ہوں۔"

"امیر المومنین نے حکم دیا ہے کہ تمہاری عطا (تنخواہیں) ادا کر دوں، اور تم کو لڑائی کے
موقع پر پہنچا دوں، بس تیار ہونے کے لیے تین دن کی مہلت دیتا ہوں، اگر اس مدت کے
ختم ہونے پر کوئی شخص لڑائی کے مقام پر نہ پہنچا تو قسم ہے اُس ذات کی جو سب سے اعلیٰ اور برتر
ہے کہ اس شخص کا سر تن سے جدا کر دوں گا۔" اتنا کہہ کر حجاج نے ایک نوجوان آدمی سے کہا کہ خلیفہ
کا یہ خط اِن لوگوں کو سنا دو۔" جب اُس آدمی نے خط سے شروع ہی کے یہ الفاظ "اما بعد
السلام علیکم" پڑھے، جو خلیفہ نے تمام مسلمانانِ کوفہ سے خطاب کیے تھے، تو حسبِ دستور
سلام کا جواب دینے کی جگہ تمام مجمع گستاخانہ انداز سے خاموش رہا، گو اس بات کو دل میں
سب محسوس کرنے لگے تھے کہ یہ نیا امیر جس کا طرزِ بیان سخت اور اچانک ہے، معلوم نہیں کب کیا کہہ بیٹھے،

اور تقریر میں ایک رنگ اور زور بھی ہے۔ ان کے حق میں واقعی ایک جابر اور زبردست حاکم ثابت ہوتا نظر آتا ہے، لیکن انھوں نے کوئی ایسی علامت ظاہر نہ ہونے دی جس سے یہ بات کھل جاتی حجاج نے یہ کیفیت دیکھتے ہی خط پڑھنے والے کو بند کر کے لوگوں سے کہا "اے عراق والو! بھلا امیر المومنین تو تم پر سلامتی بھیجیں اور تم کو اتنی توفیق بھی نہ ہو کہ جواب تک دینا گوارا کرو، بخدا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے اخلاق کا سبق بھی تمھیں پڑھانا پڑے گا اے نوجوان! پھر خط کو شروع سے پڑھو۔"

حجاج نے اس سیدھی بات کو کہنے میں اپنے تیور کچھ ایسے بدلے، اور لہجہ و آواز میں وہ کیفیت پیدا کی کہ سامعین پر ایک خوف طاری ہو گیا، اور جب پڑھنے والے نے پھر پڑھا اما بعد، السلام علیکم" تو سب نے فوراً کہا، "وعلیٰ امیر المومنین السلام ورحمۃ اللہ (112

جو طریقہ کوفے میں اختیار کیا گیا تھا، بجنسہٖ وہی طریقہ اتنی ہی کامیابی کے ساتھ بصرہ میں بھی اختیار کیا گیا، یہاں بہت سے لوگ کوفہ کے واقعات سنتے ہی حجاج کے حکم کے منتظر بھی نہ ہوئے اور فوراً مہلب کے پاس خوارج سے لڑنے پہنچ گئے، ان لوگوں کے از خود چلے آنے پر مہلب نے خوشی اور تعجب سے کہا، "الحمد للہ! اب معلوم ہوتا ہے کہ وہاں ایک جواں مرد حاکم لوگوں پر مقرر ہو کر آیا ہے۔" اب کسی کی مجال نہ تھی کہ خوارج سے لڑنے کے لیے جانے میں ذرا بھی تامل کر سکتا، اگر کوئی نام کو بھی عذر کرتا تو فوراً قتل کر دیا جاتا، کیونکہ انسان کا خون کرنا حجاج کے نزدیک کوئی بات نہ تھی، چنانچہ دو تین آدمیوں نے انکار کا مزہ چکھا، یعنی فوراً ان کی گردن اڑا دی گئی

ان طریقوں سے گو حجاج کا خیال تھا کہ کام نکل گیا ہے لیکن در اصل یہ اس کی غلطی تھی جب لوگوں کا خوف کم ہوا، تو ان کو ندامت ہوئی کہ کس طرح مکتب کے لونڈوں کی طرح وہ ایک ظالم استاد سے ڈر گئے، اب پھر طبیعتوں میں ایک ابال آیا، جب حجاج کچھ فوج لے کر مہلب کے پاس جانے لگا تو لوگوں میں عطا پر کچھ جھگڑا ہوا، اور اس نے بڑھتے بڑھتے ایک عام بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ اب ہر طرف سے یہی شور برپا تھا کہ حجاج کو نکال دو، دھمکیاں دینی شروع کیں کہ اگر عبد الملک نے اس کو نہ نکالا تو ہم بہ اختیارِ خود اس کو معزول کر دیں گے، حجاج کا ساتھ

حما کرٹر دیل جلد ۱ صفحہ ۴۳۳

اس کے ساتھیوں نے چھوڑنا شروع کیا، یہاں تک کہ صرف چند قرابت مند یا سچے دوست اور وفادار خادم اس کے پاس رہ گئے، حجاج کو یہاں تک دیکھنا پڑا کہ لوگوں نے اسکے خیمے کو لوٹ لیا ہے اور اس کی بیویوں کو لے گئے ہیں، اگر ان باغیوں کو عبدالملک کا خوف نہ ہوتا تو اس موقع پر وہ حجاج کو قتل کر دیتے، مگر باوجود ان آفات کے حجاج نے ہمت نہ ہاری دوستوں نے سمجھایا بھی کہ باغیوں سے مصالحت کی گفتگو شروع کر دینی چاہیے، مگر اس نے نہایت برہم ہو کر اس رائے کو ناپسند کیا اور کہا کہ ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا جب تک یہ باغی اپنے سرغنوں کو میرے حوالے نہ کر دیں گے، میں کسی کی کوئی بات نہ سنوں گا، حجاج کو اس پر اتنا اصرار تھا کہ اپنی جان تک کی پروا نہ تھی، اور کچھ عجیب نہ تھا کہ مارا جاتا، لیکن بنی قیس اس موقع پر اس کی مدد کو کھڑے ہو گئے اور حقیقت میں انھوں نے حجاج کی جان بچا دی، بنی قیس نے اس بات کو سمجھ لیا تھا کہ ہماری امیدوں اور توقعات کو آیندہ پورا کرنے والا، اور حقیقت میں ہمارا کرتا دھرتا اب یہی حجاج ہے وہ یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ جو طریقے حجاج نے اختیار کئے ہیں، اگر ہم نے ان کی پابندی کی تو جو کچھ عزت اور دولت ہم سے جا چکی ہے، وہ پھر ہمارے پاس چلی آئے گی

غرض بنی قیس کے تین بڑے سردار جن میں قتیبہ بن مسلم سب سے ممتاز تھا، حجاج کی مدد کو دوڑ پڑے، بنو تمیم میں سے ایک سردار جو مہلب کے قبیلہ کا تھا اور جس کو باغیوں سے کچھ ہمدردی نہ تھی بنی قیس کے سرداروں کے ساتھ ہو گیا جب اس طرح چھ ہزار کی جمعیت حجاج کے پاس ہو گئی تو اس نے باغیوں سے لڑنا شروع کیا، اس لڑائی میں ایک موقع ایسا نازک آیا کہ حجاج کی شکست میں کوئی کلام نہ رہا تھا، لیکن اتفاق سے باغیوں کے سرگروہ کے ایک تیر لگا جس سے وہ ہلاک ہو گیا، اور حجاج کو فتح ہو گئی، اس فتح کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ حجاج نے باغیوں کا تعاقب نہیں کیا، بلکہ ان کو امان دے دی، صرف ۹ باغی سرداروں کے سر مہلب کے پاس بھیج دیے تا کہ اہل عراق کو جو مہلب کے ساتھ تھے عبرت ہو۔

پس اس طرح بنی قیس جو اب تک ہر ہنگامے اور سرکشی کے بانی ہوا کرتے تھے، پہلی مرتبہ حکومت کے معاون و مددگار ہو گئے اور اس شیوے کو اختیار کرنے کے بعد اس کو اس غرض سے جاری رکھا کہ خلیفہ کے دل میں عزت پیدا کر لیں۔

جب امن و امان ہو گیا تو حجاج اس کے درپے ہوا کہ مہلب کو زیادہ چستی و مستعدی پر آمادہ کرے، کیونکہ اس کی نسبت یہ خیال ہو چلا تھا کہ وہ لڑائی کو خواہ مخواہ طول دے رہا ہے اور اس میں خود اس کا نفع ہے۔ حجاج کی طبیعت میں غیظ و غضب اس بلا کا تھا کہ وہ صحیح اور غلط دونوں قسم کی تدبیریں بے دریغ کر بیٹھتا تھا، اب اس نے مہلب کو خط پر خط بھیجنے شروع کیے اور اس کو سہل انگار، کاہل، بلکہ نامرد کہہ کر اس پر ملامت کی بوچھاڑ کر دی اور اسکو سزائے قتل دینے کا ارادہ کیا، معزول کر دینے کا قصد تو بہر کیف اس پر صاف ظاہر کر دیا، علاوہ خطوط کے میدان جنگ میں قاصد بھیجنے شروع کیے، یہ قاصد بھی تھے اور ناصح بھی اور سب مہلب کی قوم کے لوگ تھے بعض مرتبہ یہ لوگ لشکر میں نا اتفاقی پیدا کر دیتے تھے، اور لڑائی کے دن ان کی صورت بھی نظر آتی تھی، باوجود ان باتوں کے جو اصلی مطلب تھا وہ آخر کار حاصل ہو گیا، حجاج کو عراق کا امیر ہوئے ابھی دو برس بھی نہ گذرے تھے کہ خوارج مغلوب ہوئے اور انھوں نے ہتھیار ڈال دیے (یہ واقعہ ۷۶ھ یا ۶۹۶ء کے ختم سال کے قریب یعنی وسط ۷۷ھ کا ہے)

اب حجاج تمام مشرقی ممالک اسلام کا گورنر مقرر ہو گیا، یہ امارت اس کی وفاداری اور قیمتی خدمات کا صلہ تھی، حجاج کو اور بھی بہت سی بغاوتیں دیکھنی پڑیں اور اس نے ان سب کو فرو کیا، ادھر اپنے بادشاہ کے سر پر تاج کو سنبھالے تھا، ادھر اپنی قوم یعنی بنی قیس پر جو ذلت و گمنامی میں مبتلا ہو گئی تھی، خلیفہ کو مہربان کرنے کی کوشش کرتا تھا، حجاج کو اس میں بغیر زیادہ مشکلات کے کامیابی ہو گئی، کیونکہ عبد الملک کو تو قیس و کلب میں سے کسی نہ کسی پر اعتماد کرنا ضروری تھا مطلق العنان بادشاہوں کو ایسے لوگوں کے ساتھ کچھ محبت نہیں رہتی جو شروع میں تو ان کو بادشاہ بنانے میں مددگار ہوتے ہیں اور پھر اسی بنا پر متوقع ہو جاتے ہیں کہ بادشاہ ان کے بار احسان سے کبھی سر نہ اٹھائے گا، بنو کلب نے مروان کو خلیفہ بنانے میں جو کچھ مدد کی تھی، اس کی وجہ سے ان (۴۸) غرور پیدا ہو گیا تھا، یہ غرور مروان کی اولاد کو ناگوار گذرتا تھا، بنی کلب خلیفہ عبد الملک کو ہمیشہ یاد دلایا کرتے تھے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو اس کے باپ مروان کو کبھی تخت نصیب نہ ہوتا، غرض بنی کلب عبد الملک کو اپنا خادم تصور کرتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ یہ ہمارا ہی ساختہ و پرداختہ بلکہ ہماری ہی چیز ہے، برخلاف اس کے بنی قیس اس کوشش میں تھے کہ جس طرح بن پڑے عبد الملک

کے دل سے یہ بات نکال دیں کہ وہ اُس کے باپ کے کبھی دشمن تھے اسی مقصد سے انھوں نے عبدالملک کے سامنے سرنگوں ہو کر اُس کا لطف و کرم حاصل کیا، اور اسکے ہر ایک حکم کو بلا عذر ماننے بلکہ اس کے اشاروں پر چلنے لگے اور اس طرح بنو کلب کی جگہ بنی قیس نے عبدالملک کے دل میں گھر کر لیا۔

کلبیوں نے یہ کیفیت دیکھتے ہی عبدالملک پر نکتہ چینیاں شروع کیں، خلیفہ کی قوت و حکومت کو اتنا استحکام ہو گیا تھا کہ بغاوت کی مجال تو کسی کو ہوئی نہیں مگر بنی کلب کے شاعر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے اپنے کلام میں عبدالملک پر احسان فراموشی کا الزام لگایا، جو اس بنی کلب کا ایک شاعر تھا، یہ اسی سعید کا باپ تھا جو بنی قیس کے ہاتھوں اسپین میں مارا گیا اور جس کا حال ہم آگے پڑھیں گے، غرض اس نے جو خلیفہ پر ذیل کے مضمون کے اشعار لکھے۔

عبدالملک! تو نے ہمارا صلہ ہم کو نہ دیا، گو ہم تیرے لیے بڑی جانبازی سے لڑے اور دنیا کا عیش و آرام تجھے نصیب کرا دیا، جولان میں جابیہ کے واقعات تجھ کو یاد ہیں۔ کہ وہاں کیا ہوا تھا؟ اگر اُس وقت ابن بجدل کلبی اس مجمع میں تیرا ساتھ نہ دیتا۔ تو آج گمنامی کی حالت میں تو زندہ ہوتا، اور تیرے خاندان میں کسی کو منبر پہ بیٹھ کر خطبہ دینا نصیب نہ ہوتا، اس پر بھی جب تو صاحبِ حکومت ہو گیا اور کسی تیرا حریف باقی نہ رہا تو تو نے ہم سے منہ موڑ لیا، بلکہ ہم کو اپنا دشمن سمجھنے لگا، کیا تجھ کو اس کا مطلق خیال نہ رہا کہ ایک دن ان باتوں کے انتقام لینے کا بھی آئے گا''

اسی شاعر نے ایک اور نظم میں لکھا۔

بنی اُمیہ نے ہماری برچھیوں کو اپنے دشمنوں کے خون میں رنگوایا، اور اب نہ اپنی دولت و حکومت سے ہم کو حصہ نہیں دیتے، اے اُمیہ کے خاندان والو! بیشمار سورماؤں کے لشکروں سے جن کا نعرۂ جنگ ہمارا نعرۂ جنگ نہ تھا، ہم اپنی تلواریں اور نیزے سنبھال سنبھال کر لڑے اور تم پر سے تمام خطروں کو جو تمھیں ڈرا رہے تھے، دور کر دیا، خدا ہم کو ہماری اس خدمت کا صلہ دے گا، کیونکہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے تمہارے تخت حکومت کو قائم کیا ہے، لیکن ہم کو یقین ہے کہ امیہ کا خاندان ہم کو ہمارا صلہ نہ دے گا، اے بنی اُمیہ

تم یہاں اجنبی ہو، تم حجاز سے آئے تھے اس زمین سے آئے تھے جسکو ایک صحرا ہمارے ملک (شام) سے جدا کرتا ہے، تم کو شام کا ملک بالکل نہ جانتا تھا[1]، ایک وقت وہ تھا کہ بنی قیس تم سے لڑنے آیا کرتے تھے، اُن کی آنکھوں میں عداوت بھری ہوتی تھی اور ان کے پھریرے ہوا میں اڑتے ہوتے تھے۔"

(۵) ایک اور کلبی شاعر نے جو مرج راہط کی فتح پر نظم لکھ چکا تھا، بنی امیہ کو خطاب کرکے یہ اشعار لکھے جس کا مطلب یہ ہے:

"یاد رکھو کہ تم کو بادشاہی ملی، ہم نے دمشق کے تخت سے اُن لوگوں کو اتار دیا جو اس پر بیٹھا رہنا چاہتے تھے، اور اُن کو اتار کر وہ تخت تم کو دے دیا، لڑائی کے اکثر میدانوں میں ہم نے اپنی وفاداری کا ثبوت دیا ہے اور مرج راہط کی جنگ میں محض ہماری جوانمردی کی بدولت تم کو فتح نصیب ہوئی تھی، ہماری عمدہ اور وفاداری کی خدمات کا صلہ احسان فراموشی سے نہ کرو، پہلے تم ہم کو دیکھ کر خوش اور متبسم ہوتے تھے، اب ہمارے حق میں ظالم نہ بنو، مروان کے زمانے سے پہلے جب ایک اموی امیر کے سامنے فکر و تشویش ایک موٹی نقاب کی طرح حائل تھی، اس وقت ہم ہی تھے جنھوں نے اس نقاب کو چیر کر اس کی بصارت کو روشن کیا تھا، جب وہ شکست کھانے کو ہوا، اور اس کا دانت سے دانت بجنے لگا تو ہم ہی نے اس کو بچایا، یہاں تک کہ فرط مسرت سے وہ چلا اٹھا کہ "سب بزرگی اللہ کو ہے" جب کوئی قیسی غرور کے کلمے زبان پر لائے تو اس کی وہ شجاعت و مردانگی اسے یاد دلاؤ جو جبرے[2] میں ضحاک کے لشکر میں اس سے ظاہر ہوئی تھی، وہاں کسی قیسی نے بھی اپنے تئیں مرد میدان ثابت نہیں کیا، سب گھوڑوں کی پیٹھ پر جا بیٹھے اور بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں۔"

لیکن ان اعتراضوں اور سخت کلامی سے بنی کلب کو کچھ نفع نہ ہوا، ان کا عروج ختم ہوا اور ایسا ختم ہوا کہ پھر کبھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہ سچ ہے کہ دربار کی پالیسی میں تبدیلی ممکن تھی اور تبدیلی

---

[1] بنی امیہ کی جس شاخ سے مروان کو تعلق تھا وہ مدینہ میں آباد ہو چکی تھی۔
[2] یعنی مرج راہط میں، جبرہ، غوطۂ دمشق کا ایک گاؤں ہے، دمشق سے مشرق ہی میں تھوڑے فاصلہ پر راہط کا میدان (مرج) ہے۔

ہوئی بھی اور کلبیوں کو ابھی بہت سے کارنامے افریقہ اور سپین میں دکھانے باقی بھی ہیں، لیکن وہ ثروت اور اقبال مندی جو ان کو مروان کے زمانہ میں حاصل تھی کہ گویا تمام بطون یمانیہ میں بنی کلب ہی سب کے سردار تھے پھر کبھی نصیب نہ ہوئی۔ یہ عزت و منزلت عبدالملک کے زمانہ میں قبائل یمانیہ سے بجائے بنی کلب کے بنی ازد کو حاصل رہی اور ابن بحدل کلبی کی عزت کا وارث مہلب کا خاندان ہو گیا، اس کے ساتھ ہی قبائل کی لڑائیاں جن کی شدت کبھی کم نہ ہوئی بجائے ایک چھوٹے رقبے کے بہت بڑے رقبہ پر پھیل گئیں اس وقت سے بنی قیس ہر جگہ قبائل یمانیہ سے دست و گریبان رہے۔

خلیفہ عبدالملک کی وفات پر اس کا بیٹا ولید تخت خلافت پر بیٹھا (۸۶ھ) اس کے دور حکومت میں قیسیوں کی ترقی کی کوئی انتہا نہ رہی، عبدالملک نے مرتے وقت ولید کو نصیحت کی تھی کہ حجاج کی ہمیشہ عزت کرنا اسی کی بدولت آج تم صاحب تخت و تاج نظر آتے ہو وہ تمہاری تلوار ہے، داہنا ہاتھ ہے تم اس کے اتنے محتاج رہو گے کہ وہ تمہارا اتنا محتاج نہیں رہے گا۔ ولید باپ کی نصیحت کو کبھی نہ بھولا، بلکہ یہ کہا کرتا تھا کہ میرا باپ تو حجاج کو اپنی پیشانی کی جلد کہا کرتا تھا میں اس کو اپنے کل چہرے کا پوست سمجھتا ہوں" یہ فقرہ ولید کی سلطنت کا خلاصہ ہے، فتوحات اور فوجی شان و شکوہ کے اعتبار سے کسی خلیفہ کا عہد ایسا بلند پایہ نہیں ہوا، بنی قیس سے قتیبہ بن مسلم نے اسلام کا علم سمرقند کی دیواروں پر نصب کیا، محمد بن قاسم نے جو حجاج کا ابن عم تھا، ہند کو کوہ ہمالیہ کے دامنوں تک فتح کر لیا۔ قلمرو اسلامیہ کی دوسری جانب قبائل یمانیہ نے افریقہ کے شمال میں فتوحات حاصل کر کے اور اسپین فتح کر کے یورپ کے اس وسیع ملک کو سلطنت اسلام میں جس کی بنا رسول اللہ صلعم نے ڈالی تھی شامل کیا، لیکن باوجود ان باتوں کے خلیفہ ولید کا عہد یمانیوں کے لیے بڑی مصیبت کا باعث ثابت ہوا بالخصوص انکے دو بڑے سرداروں کے حق میں یعنی یزید بن مہلب اور موسیٰ بن نصیر کے حق میں تو بد اقبالی کا خاتمہ ہو گیا مہلب کی وفات پر اس کے فرزند یزید بن مہلب نے جو باپ کی جگہ اب یمانیہ کا سردار تھا، بدقسمتی سے اس بات کا موقع دیا کہ حجاج اس کا دشمن ہو جائے، مہلب کے اور خاندان والوں کی طرح بنی امیہ کے دور میں یزید بن مہلب بھی دولت کے صرف بیجا میں وہی درجہ رکھتا تھا جو بنی عباس

کے دور میں آل برمک کو حاصل ہوا، یزید بن مہلب جہاں جاتا تھا روپیہ خوب لٹاتا تھا، خود خوش
رہتا تھا اور اوروں کو خوش رکھنا چاہتا تھا، لیکن یہ حالت کب تک قائم رہ سکتی تھی، جب
اپنی مکسوبہ دولت صرف ہو گئی تو سلطنت کے مال پر دست درازی شروع کی حجاج کو اس کا
پتہ چل گیا، حساب کرنے سے ساٹھ لاکھ درہم یزید بن مہلب کے ذمہ نکلے، حجاج نے اس
رقم کی واپسی کا تقاضا کیا اور جب پوری رقم ادا نہ ہو سکی تو یزید کو قید کر دیا، اور قید میں طرح
طرح کی اذیتیں اس کو پہنچائیں، چار برس اسی حال میں مبتلا رہ کر آخر کار دو بھائیوں کو
لے کر جو اس کے ساتھ ہی قید ہوئے تھے، یزید زندان سے نکل بھاگا، حجاج کو خیال ہوا
کہ یزید خراسان کی طرف گیا ہے اور وہاں پہنچکر بغاوت پھیلائیگا چنانچہ اسی وقت والیٔ
خراسان قتیبہ کو اس کی اطلاع کی گئی، لیکن یزید خراسان نہیں گیا، بلکہ ایک کلبی رہنما کی مدد
سے بیابان سماوہ کو طے کر کے سلیمان کے پاس چلا گیا، سلیمان خلیفہ ولید کے بھائی تھے
اور خلیفہ عبد الملک وصیت کر گئے تھے کہ ولید کے بعد وارثِ خلافت سلیمان ہوگا، سلیمان نے
قسم کھائی کہ جب تک میں زندہ ہوں مہلب کی اولاد کو کوئی شخص گزند نہیں پہنچا سکتا، علاوہ
اسکے انتیس لاکھ درہم طلائی جو ابھی تک ابن مہلب کے ذمہ نکلتے تھے، سلیمان نے اپنے پاس سے
بیت المال میں داخل کر دیے اور خلیفہ ولید سے بڑی مشکل اور تدبیر کے بعد معافی نامہ بھی حاصل (۱۱۷)
کر لیا ابن مہلب اب اپنے مربی اور سرپرست سلیمان کے قصر میں رہنے لگا، اور اس وقت کا منتظر
ہو گیا جبکہ یمانیہ کو پھر قوت حاصل ہو، ایک دفعہ کسی شخص نے اس سے پوچھا کہ تم کوئی مکان خرید
کر علیحدہ کیوں نہیں رہتے؟ اس نے جواب دیا کہ مکان کیوں خریدوں؟ جلد وہ وقت آنے
والا ہے کہ میں برسرِ حکومت ہو کر مستقل طور پر کسی قصر میں رہوں گا، اگر سلیمان خلیفہ ہو گئے
ورنہ قید خانہ میرا دائمی مسکن ہوگا۔

اب دوسرے یمانی کا حال سنیے، جو آگے چل کر فاتح اندلس ہونے والے ہیں، یہ یزید
بن مہلب کی طرح عالی نسب نہ تھے، بلکہ بنو لخم کے موالی تصور کیے جاتے تھے، بنو لخم یمانیہ کا
ایک قبیلہ تھا، موسیٰ اس وقت ایک ایسے فریق کے رکن تھے جسکو عزت حاصل نہ تھی انکے سرپرست
عبد العزیز بن مروان برادر خلیفہ عبد الملک تھے، جو اس وقت مصر کی امارت پر ممتاز تھے اور

یہ کلبیوں (یعنی یمانیوں) کے طرفدار اس وجہ سے تھے کہ اُن کی والدہ بنی کلب کی بیٹیوں میں سے تھیں، خلیفہ عبدالملک کے زمانے میں موسیٰ بن نصیر صدقات کے جمع کرنے کے لیے بصرے میں مقرر ہوئے تھے، وہاں سرکاری روپیہ میں بددیانتی کا الزام ان پر لگایا گیا خلیفہ عبدالملک کو جب معلوم ہوا تو حجاج کے نام ان کی گرفتاری کا حکم جاری کیا، موسیٰ کو معلوم ہو گیا۔ وہ فوراً بصرے سے روانہ ہو کر مصر میں اپنے مربی عبدالعزیز بن مروان والیٔ مصر کے پاس چلے آئے خلافت مآب کی طرف سے ایک لاکھ درہم سرخ بطور جرمانہ کے موسیٰ بن نصیر سے طلب کیے گئے تھے، عبدالعزیز بن مروان نے اس رقم کا نصف حصہ خزانۂ سرکار میں جمع کر دیا، اور موسیٰ کو افریقیہ کی گورنری پر روانہ کر دیا۔ افریقیہ پر امیر مقرر کرنے کا اختیار والیٔ مصر کو حاصل تھا اندلس فتح کرنے کے بعد بھی موسیٰ پر مثل سابق سرکاری روپیہ میں خیانت کا الزام لگایا گیا۔ موسیٰ اب بہت مالدار ہو گئے تھے، یہ زمانہ وہ تھا کہ سلطنت کے روپیہ میں گورنروں کی جانب سے خورد برد ہو جانی ایک معمولی بات تھی، موسیٰ کی نسبت گمان تھا کہ انھوں نے بہت زیادتی کی ہے بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ وہ اس فریق میں شامل نہ تھے۔ جس کو سلطنت میں اس وقت عروج تھا، خلیفہ ولید نے موسیٰ پر نظر رکھی اور کچھ مدت گذرنے پر موسیٰ کو اندلس سے واپس طلب کیا کہ دمشق میں آکر اپنا حساب کتاب پیش کریں، موسیٰ جب تک ممکن ہوا اس حکم کو ٹالتے رہے لیکن اس سے کیا ہوتا تھا، فتح اندلس میں موسیٰ کے بعض ہمراہی مدت سے اُن کے دشمن ہو گئے تھے اب ان کی دشمنی ظاہر ہو گئی۔ طارق اور مغیث نے اُن پر الزام لگائے، جن کو خلیفہ ولید نے آسانی سے یقین کر لیا، اور جب موسیٰ دمشق پہنچ کر دربار میں حاضر ہوئے تو دربار برخاست ہونے سے پہلے ان کو اٹھا دیا گیا، خلیفہ ولید نے موسیٰ کے قتل کا ارادہ کر لیا، لیکن بارسوخ اہل دربار نے جن کو موسیٰ بہت کچھ تحفے تحائف دے چکے تھے خلیفہ سے ان کی سفارش کی اور ان کی سفارش سے ایک رقم کثیر بطور جرمانہ ادا کر کے موسیٰ کی جاں بخشی ہوئی۔

اس واقعہ کے چند روز کے بعد خلیفہ ولید کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ اُن کے بھائی سلیمان خلیفہ ہوئے، اب قیسیوں کو جو ولید کے زمانہ میں عروج پر تھے زوال ہوا، حجاج مر چکا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ خدا ایسا کرے کہ میں ولید سے پہلے مر جاؤں اور ایسے خلیفہ کی اطاعت

نہ کرنی پڑے جو مجھ پر مطلق رحم نہ کرے[1]۔ حجاج کی یہ دعا قبول ہوئی، خود مر گیا، لیکن اس کے ساختہ پرداختہ لوگ اور اُس کے دوست اور اقربا، جو سلطنت کے جلیل القدر عہدوں پر ممتاز تھے، یک قلم موقوف کیے گئے اور اُن کی جگہ یمانیوں کو ملی، حجاج کا معتمد اور موالی اسکروی اور آزاد غلام (یزید ابن ابی مسلم جو عراق کا والی تھا اپنی جگہ سے معزول ہو کر قید کر دیا گیا، پانچ برس کے بعد جب سلیمان کے بعد یزید ثانی کا زمانہ آیا تو قید سے رہا ہو کر افریقیہ کا والی مقرر کیا گیا قسمت کی یہ نیرنگیاں کہ کبھی قید میں ہیں اور کبھی مسندِ حکومت پر اس زمانہ میں شاذ و نادر نہ تھیں۔

ابن ابی مسلم کی طرح قتیبہ فاتح سمرقند خوش قسمت ثابت نہ ہوئے وہ قتل کیے گئے اسی طرح ہند کے فاتح محمد بن قاسم حکومت سے معزول ہو کر جان سے مارے گئے، یزید بن مہلب جو خلیفہ ولید کے زمانے میں قریب تھا کہ قتل کر دیئے جائیں، اب سلیمان کے دور خلافت میں بڑے صاحب اختیار اور باقبال ہو گئے۔ یمانیوں میں صرف موسیٰ بن نصیر ایک ایسے شخص تھے جو یمانیہ کے عروج پر خود کوئی نفع حاصل نہ کر سکے، وجہ یہ تھی کہ خلیفہ ولید کو خوش کرنے میں اُن کے بھائی سلیمان کو انھوں نے ملول کر دیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب موسیٰ اندلس سے شام میں پہنچے تو خلیفہ ولید سخت بیمار تھے، ہر روز یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج ختم ہو جائیں گے، سلیمان کو اسکی آرزو تھی کہ موسیٰ اپنے ساتھ جو تحائف لائے ہیں وہ کسی طرح ان کو مل جائیں، چنانچہ انھوں نے موسیٰ کو کہلا بھیجا تھا کہ جب تک خلیفہ ولید کا انتقال نہ ہو جائے، وہ دمشق داخل نہ ہوں، موسیٰ نے اس کا کچھ خیال نہ کیا، ولید کی زندگی ہی میں دمشق پہنچ گئے اور خلیفہ کی خدمت میں تحائف پیش کر دیئے نتیجہ یہ ہوا کہ ولید کے مرنے پر یہ تحائف ولید کی اولاد کو مل گئے سلیمان کو یہ بات اس قدر ناگوار گذری کہ وہ موسیٰ سے اس دن سے بالکل ناراض ہو گئے اور خلیفہ ولید جو جرمانہ موسیٰ پر کر گئے تھے اسکو معاف نہیں کیا، موسیٰ نے یہ رقم اپنے دوستوں اور موالی کی مدد سے جو اسپین میں بکثرت موجود تھے، اور لخم کی امداد سے جس قبیلہ سے موسیٰ کی بیوی تھیں بآسانی ادا کر دیا، لیکن اس سے زیادہ کہ جرمانہ معاف نہیں کیا خلیفہ سلیمان نے اور کوئی انتقام موسیٰ سے نہیں لیا، موسیٰ کی نسبت طرح طرح کے جھوٹے قصے کہ خلیفہ سلیمان نے ان کو اذیتیں دیں مشہور ہو گئے، لیکن یہ سب قصے ان لوگوں نے گھڑے تھے جو آٹھویں صدی عیسوی کی فریق بندیوں اور

---

[1] ڈاکٹر ویل جلد ۱ ص ۵۵۳

سازشوں کو بھول چکے تھے، بات جو کچھ صحیح تھی۔ وہ صرف اتنی تھی (جیسا کہ ایک معتبر مورخ نے لکھا ہے[1]) کہ موسیٰ بن نصیر اپنے دوست یزید بن مہلب کی سرپرستی میں جس کو خلیفہ سلیمان کے دربار میں بڑا عروج تھا، امن و امان کیساتھ زندگی بسر کرنے لگے، موسیٰ کی مصیبتوں کے قصے ہرگز یقین کرنے کے قابل نہیں ہیں، اور اسپین کے ایک عیسائی مورخ نے جو حالات اس زمانہ کے لکھے ہیں[2] اُن سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان قصوں کی کوئی اصل نہیں ہے۔

خلیفہ سلیمان کے جانشین حضرت عمر بن عبدالعزیز خلفاء بنی امیہ کی تاریخ میں ایک مستثنیٰ مثال تھے وہ کسی فریق کے طرفدار نہ تھے، بلکہ ایک واجب التعظیم بزرگ اور فرشتہ خصلت انسان تھے ہر قسم کے فتنہ و فساد اور لوگوں کی باہمی عداوتوں کے شور و غوغا سے اُنھیں قلبی نفرت تھی، خدا کا شکر کیا کرتے تھے کہ وہ صدر اول میں پیدا نہیں ہوئے، جبکہ حضرت علیؑ، عائشہؓ اور معاویہ میں لڑائیاں ہوئی تھیں انھوں نے ان ناگوار واقعات کو زبان پر لانے تک کی ممانعت کر دی تھی، دین کی بہبود اور تبلیغ اسلام کی کوشش میں منہمک رہتے تھے، ان کے حالات پڑھ کر مقدس پاپائے روما گریگوری دہم کا تصور بندھتا ہے جس نے فلورنس کے عیسائیوں سے کہا تھا کہ تم کو میرے موافق فریق میں رہنے کی ضرورت ہے، اور نہ میرے مخالف فریق میں تم کو صرف اس کی ضرورت ہے کہ اپنے تئیں ایک ہی مذہب عیسوی کا پیرو اور ایک ہی ملک کا باشندہ سمجھو، لیکن نہ حضرت عمر بن عبدالعزیز اپنے پاکیزہ خیالات کو عملی صورت میں دیکھ سکے اور نہ پاپائے روما گریگوری

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد بنی اُمیہ میں یزید ثانی خلیفہ ہوئے انھوں نے حجاج کی بھتیجی سے اپنا عقد کیا اور قیسیوں کے بیحد طرفدار ہو گئے۔

یزید ثانی کے بعد ہشام خلیفہ ہوئے، شروع میں یہ یمانیہ پر مہربان رہے، اور یزید ثانی نے جن قیسیوں کو والیانِ ملک مقرر کیا تھا، ان کو برطرف کر کے یمانیہ کے لوگوں کو اُن کی جگہ مقرر کیا اور ان کو والیانِ معزول پر سختی کرنیکی اجازت دیدی، لیکن جب خاص واقعات پیش آئے جن کا

---

[1] مورخ بلاذری ص ۲۷

[2] عیسیدور آف بیجا (Isidore of Beja)

[3] مثلاً خراسان میں مسلم الکلابی قیسی کی جگہ اسد یمنی کو حاکم مقرر کیا۔

ذکر آئندہ کیا جائے گا، تو یمانیہ پہ اپنا لطف و کرم بند کر دیا، اب قیسوں نے یمانیوں سے بالخصوص افریقہ اور اسپین میں اپنا بدلہ نکالنا شروع کیا۔

اندلس اور افریقہ کے عرب اکثر قبائل یمانیہ سے تھے، اس لیے جب یمانیہ کے لوگ، ان ملکوں پر حکومت کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے تو بالعموم امن و امان رہتا تھا لیکن اگر بنی قیس میں سے کوئی حاکم ہو کر آتا تو سخت ہنگامے اور فساد برپا ہو جاتے، چنانچہ اس کی مثال یہ ہے کہ عامل افریقہ بشر بن صفوان کلبی کا جب انتقال ہونے کو ہوا تو اس نے اپنی قوم کے ایک شخص کو اپنی جگہ نامزد کر دیا۔ اس کلبی نے خیال کیا کہ خلیفہ ہشام بھی اس تقرر کی منظوری دے دیں گے لیکن ایسا نہ ہوا، خلیفہ ہشام نے عبیدہ بن عبد الرحمٰن سلمی قیسی کو افریقیہ کا حاکم مقرر کر کے روانہ کیا جب کلبی کو خبر لگی تو اس نے قصد کیا کہ عبیدہ کو جائزہ نہ دے اور بزور شمشیر اپنی جگہ پر قائم رہے لیکن ماہ جون یا جولائی ۷۲۸ء یعنی صفر یا ربیع الاول ۱۱۰ھ میں جامع مسجد قیروان میں جمعے کی نماز پڑھانے کے لیے تیاری کر رہا تھا کہ چند دوست دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ امیر عبیدہ آن پہنچا ہے اور شہر میں داخل ہونے کو ہے کلبی گورنر ایسا بدحواس ہوا کہ منہ سے بات نکلنی بند ہو گئی اور بمشکل اتنا کہہ سکا کہ "سبحان اللہ کو ہے قیامت بھی ایک دن یونہی یکایک آئے گی" زمین پر گرا اور جاں بحق ہوا۔

عبیدہ نے سوچا کہ شہر پہ رعب بٹھانے کیلئے بغیر اطلاع کیے اس پر قبضہ کرنا ضروری ہے قیروان کی شہر پناہ نہ تھی، عبیدہ اپنے قیسیوں کو ساتھ لیے آسانی سے شہر میں داخل ہو گیا، شہر والے ابھی اسی خیال میں تھے کہ عبیدہ ابھی شام یا مصر میں ہو گا، غرض جب اس قیسی امیر کا قیروان پر قبضہ ہو گیا تو اس نے کلبیوں پر سخت ظلم کیے، کسی کو قید کیا، کسی کی ناز بیب کی، اور خلیفہ کو خوش کرنے کیلیے ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیں،

افریقیہ پر تو بنی قیس کے عروج سے یہ کچھ گذرا، اب اسپین کی باری آئی، اس زمانہ میں اندلس (اسپین) کا عامل امیر افریقیہ کی طرف سے مقرر ہوا کرتا تھا، جس دن سے اندلس فتح ہوا تھا، قیسیہ عصبیت کا صرف ایک شخص (حر بن عبد الرحمٰن) وہاں کا گورنر مقرر ہوا تھا جب عبیدہ بن عبد الرحمٰن

لہ فتح اسپین کے حالات اس تصنیف کی کتاب ثانی میں بیان ہوئے ہیں۔

افریقہ کے امیر ہوئے تو انھوں نے شروع میں دو عامل یکے بعد دیگرے مقرر کر کے اندلس بھیجے، مگر ان کے تقرر میں عبیدہ کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی، اِن عاملوں کے بعد امیر عبیدہ نے اپریل (محرم) میں ہیثم بن عبید کلابی (قیسی) کو عامل اندلس مقرر کر کے روانہ کیا، اور اندلس کے عربوں کو تنبیہ کر دی کہ اگر انھوں نے اس نئے عامل کی نافرمانی کی تو سخت سزا دی جائے گی یمانیہ کو یہ تقرر سخت ناگوار گذرا، اور انھوں نے غالباً ہیثم کو قتل یا معزول کرنے کا ارادہ کیا یا ہیثم کو ان کی طرف سے ایسی بدگمانی ہوئی بہرکیف اس قیسی عامل نے عبیدہ امیر افریقہ کی خفیہ ہدایتوں کے مطابق بنی کلب کے سرداروں کو جو اندلس میں تھے قید کر دیا، اور ان کو سخت ایذائیں پہنچا کر اُن سے بغاوت کا اقبال کرایا، اور آخرکار اُن کو قتل کر دیا، ان مقتولوں میں سعد بن جواس ایک کلبی رئیس تھا، جو خاندانی شرافت، دولت مندی اور ذاتی لیاقت کی وجہ سے اندلس میں بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اِسی سعد کے باپ جواس نے اپنے اشعار میں خلیفہ عبدالملک کو اس بات پر ملامت کی تھی کہ وہ بنی کلب کے احسان نہیں مانتا جنھوں نے مرج راہط کی لڑائی لڑ کر اُس کے باپ مروان کو مالک تاج و تخت بنایا تھا، ہیثم نے جب سعد کو قتل کیا تو بنی کلب کا یہ حال تھا کہ غیظ و غضب سے کانپتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ ابرش نے جو خلیفہ ہشام بن عبدالملک کا کاتب تھا، امیرالمومنین کو کلبیوں کے اس غصے اور صدمے کی حالت سے مطلع کر دیا، اور خلیفہ ہشام کو آمادہ کر دیا کہ وہ دمشق سے ایک شخص محمد بن عبداللہ نامی کو اس غرض سے اندلس روانہ کریں کہ وہ ہیثم کو اس جرم کی سخت سزا دے اور ہیثم کی جگہ عبدالرحمٰن الغافقی کو جو یمانیہ سے تھے، امیر اندلس مقرر کرے، یہ عبدالرحمٰن الغافقی اندلس میں بڑے ہر دلعزیز تھے، محمد بن عبداللہ دمشق سے روانہ ہو کر قرطبہ میں آئے، عبدالرحمٰن الغافقی کو تلاش کیا مگر وہ نہ ملے، کیونکہ وہ ہیثم کے خوف سے کہیں روپوش ہو گئے تھے، محمد بن عبداللہ نے ہیثم کو گرفتار کیا، قرطبہ کے گلی کوچوں میں اس کی تشہیر کرائی اور اس سزا کے ختم ہونے پر اس کو افریقہ

---

(۱) عثمان بن ابی نسعہ الخثعمی (یمانی) (۲) حذیفہ بن الاحوص القیسی، پہلا عامل ماہ شعبان میں اور دوسرا اس کے کچھ دنوں کے بعد اندلس پہنچا، ان میں پہلا یمانی تھا اور دوسرا قیسی، دونوں کا زمانہ نہایت قلیل تھا، بالخصوص حذیفہ بن الاحوص القیسی کا زمانہ تو کسی شمار میں نہ تھا (مترجم)

روانہ کر دیا، تاکہ امیر افریقہ اس پر کوئی حکم سزا جاری کرے ، لیکن امیر افریقہ عبیدہ ایسے شخص کو کیونکر سزا دے سکتا تھا، جس نے اس کے حکموں پر عمل کیا ہو، خلیفہ ہشام ہشیم کو اس طرح سزا دینے کے بعد یہ سمجھے کہ اب کلبیوں کے دل ٹھنڈے ہو گئے ہوں گے، اگر بنی کلب یہ چاہتے تھے کہ خون سعد کے بدلے میں ہشیم قتل کیا جائے، خلیفہ ہشام نے ہشیم کے بارے میں جو احکام عبیدہ کو بھیجے ان میں اس قسم کا ابہام تھا کہ عبیدہ نے اُن کے معنی ہشیم کے مفید مطلب نکال لے، اس کی وجہ سے بنی کلب کو اور بھی غصہ آیا، اور اُن کے ایک بڑے رئیس نے جس کا نام ابو الخطار تھا اور جو سعد مقتول کا بڑا دوست رہ چکا تھا، اور جسے ایک مرتبہ عبیدہ نے قید بھی کر دیا تھا، اور اس وجہ سے وہ عبیدہ کا سخت دشمن ہو گیا تھا، ایک نظم خلیفہ ہشام بن عبدالملک کو سنانے کے لیے لکھی جس کا مضمون یہ تھا۔

اے مروان کے فرزند! تو قیسیوں سے ہمارا خون کرواتا ہے۔ اگر تو نے ہمارے ساتھ انصاف نہ کیا تو ہم خدا سے انصاف طلب کریں گے، معلوم ہوتا ہے کہ تو مرج راہط کے واقعہ کو بھول گیا، اور وہ لوگ اب تجھے یاد نہیں رہے جن کی بدولت تیرے باپ کو فتح ہوئی تھی تجھے معلوم رہنا چاہیے کہ وہ ہمارے سینے تھے جنھوں نے دشمن کی برچھیوں سے تیری جان بچائی بجز ہمارے نہ اس وقت تیرے پاس سوار تھے نہ پیادے، اب جب تجھ کو اپنی مراد حاصل ہو گئی اور ہمارے طفیل سے تو عیش و عشرت کرنے لگا تو ہم سے بے پروا ہو گیا، باوجود اس کے جب سے ہم نے تجھے جانا ہے ہم تیرے ساتھ ہیں، خبردار ہو جاؤ! اب پھر کبھی لڑائی ہوئی تو اپنی اس محفوظ حالت پر بھروسہ نہ کرنا، جس دن اس رسّی پر سے پاؤں پھسلا، تو پھر وہی رسّی کے بل جنھیں تم بہت مضبوط سمجھ رہے ہو، سب کھل جائیں گے۔ اکثر ایسا ہوا ہے۔

ابرش کاتب خلیفہ ہشام نے یہ نظم امیر المومنین کو سنائی، لڑائی کے احتمال نے جو ان اشعار سے پیدا ہوتا تھا، ہشام پر ایسا اثر کیا کہ اس نے امارت افریقہ سے عبیدہ کی معزولی کا حکم ۱۲۲
فوراً جاری کر دیا اور کہا "خدا غارت کرے اس نصرانی کے چھوکرے کو، میرا حکم نہیں سنتا۔"

اسناد:۔

مُبرّد ص ۴۶، ۲۲۰-۲۲۱، ۷۴۰-۷۶۶، ۷۸۵۰
ابن خلکان (اڈیشن ویسٹن فلڈ) حصہ ۹ ص ۵۱، حصہ ۱۰ ص ۱۰۵-۱۱۵
ابن قتیبہ ص ۲۰۱-۲۰۲
حماسہ ص ۶۵۶-۶۵۹
سیوطی ص ۲۲۱
ابن خلدون ص ۱۸۶، ۱۹۶
علیبدور ص ۳۸، ۴۰، ۵۷
ابن حبیب ص ۱۵۳
اخبار مجموعہ ص ۶۲
ابوالمحاسن جلد ۱ ص ۲۸۸
ابن الآبار ص ۴۷-۴۹
مقری کتاب ثانی۔ ص ۱۰
تعلیقات، عربی قلمی نسخوں پر مصنفہ ڈوزی۔ ص ۴۷-۴۹-۲۵۷
ابن العذاری، کتاب اول، ص ۲۴-۲۵، ۲۶، ۳۷

کتاب اوّل

خانہ جنگی

دسویں فصل

قبائل بربر

یمانیہ اور قیسیہ کے باہمی نزاعات نے محکوم قوموں پر بھی اثر کیا، کیونکہ ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے کے متعلق ان دونوں میں اختلاف آرا تھا۔ قیسیوں کا طرزِ عمل وہی تھا جو حجاج بن یوسف اختیار کر چکا تھا، اور ان لوگوں میں سے جو لوگ والیانِ ملک مقرر کیے جاتے وہ اسی طریقے کے پابند رہتے۔ شرع کا حکم تھا کہ عیسائی اور یہودی جو مسلمان ہو کر اسلامی سلطنت میں رہیں وہ جزیہ سے بری ہیں، اور جو اپنے قدیم مذہب پر قائم رہیں وہ جزیہ ادا کریں، جب اسلام کی اشاعت کثرت سے ہوئی تو بیت المال میں جزیہ کی آمدنی گھٹنی شروع ہوئی حضرت عثمان کے زمانہ میں جزیہ کی آمدنی مصر میں ایک کروڑ بیس لاکھ تھی چند سال کے بعد امیر معاویہ کے زمانہ میں وہ صرف پچاس لاکھ رہ گئی، کیونکہ قبطی عیسائی۔ اس مدت میں بکثرت مسلمان ہو گئے تھے، عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں اور بھی کمی ہوئی، مگر انھوں نے اس کی مطلق پرواہ کی بلکہ جب عامل مصر نے لکھا کہ وہ زمانہ قریب ہے، کہ مصر کے تمام ذمی مسلمان ہو جائیں اور جزیہ کی آمدنی بالکل بند ہو جائے تو خلیفہ عمر بن عبد العزیز نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہوا تو میں بہت خوش ہونگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو داعیٔ اسلام کر کے بھیجا تھا، نہ کہ محصول کا وصول کرنے والا۔ لیکن عراق میں جب حجاج بن یوسف ثقفی عامل مقرر ہوا تھا تو اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا تھا، تبلیغِ اسلام کی طرف

اسے توجہ نہ تھی، اور خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے سرکاری خزانہ کو خوب پُر رکھنا چاہتا تھا، اس نے عراق کے نومسلموں کو جزیہ سے مستثنیٰ نہیں رکھا۔ بنی قیس سے جو لوگ آیندہ ملکوں کے عامل مقرر ہوئے، انھوں نے حجاج کا طریقہ رکھا، بلکہ اس پر اتنا اضافہ اور کیا کہ محکوم قوموں کے ساتھ حقارت اور سختی کا برتاؤ بھی کیا، اب رہے یمانی عمال انھوں نے گو محکوم قوموں کے ساتھ انصاف اور نرمی نہ برتی ہو، لیکن جب وہ قیسیوں کی مخالفت پر کمربستہ ہوتے تھے، تو محکوم قوموں کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتے تھے اور بنی قیس کے سخت طریقوں کو برا کہتے تھے اس لیے محکوم قومیں اس وقت کی منتظر رہا کرتی تھیں جبکہ یمانیہ کے لوگ اُن پر حاکم ہوں، گو اس صورت میں بھی ان کو اکثر مایوسی ہوتی تھی، کیونکہ یمانیہ بھی آجکل کی لبرل پارٹی کی طرح تھے کہ جب اپنے ہاتھ میں گورنمنٹ نہ ہو تو محصولوں کے خلاف تقریریں کریں اور لوگوں کو یقین دلائیں کہ اگر گورنمنٹ ان کو مل گئی تو مالی انتظامات وہ بہت خوبی سے کریں گے، لیکن جب گورنمنٹ ان کو مل جائے تو پھر اپنے وعدوں کو ایفا نہ کر سکیں جس وقت خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے یزید بن مہلب کو عراق کی حکومت دی اور صیغۂ حکومت و امامت اور خراج پر بھی اُسی کو مامور کرنا چاہا، تو ابن مہلب نے اس خیال سے کہ اگر لوگوں پر سختی کرونگا تو حجاج کی طرح میری برائیاں بھی عالمگیر ہو جائیں گی اور اگر رعایت اور نرمی کرونگا تو خلیفہ سلیمان کو ناگوار گذریگا، صیغۂ مال کی خدمت سے معذرت چاہی اور اس عہدہ پر صالح بن عبدالرحمٰن کو جو بنی قیس سے تھا مقرر کرا دیا۔

لیکن یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یمانیوں میں ایسے لوگ موجود تھے جو اپنے اصول یا تو آسانی سے خود ہی بدل دیتے تھے یا اُن میں تبدیلی کی گنجائش رکھتے تھے، تاکہ اپنے حاکموں کی خواہ وہ قیسی ہوں یا یمانی پوری خیر خواہی اور حکم برداری کر سکیں، جب ایمان کی صفائی اور اپنے قبیلے سے محبت رکھنے کا خیال حرصِ دنیا اور طلبِ زر میں بدلنے لگا، تو ایسے آدمیوں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی گئی اس کی مثال سب سے بڑھ کر بشر بن صفوان کلبی کی ہے، کہ جب خلیفہ یزید بن عبدالملک نے جو قیسیوں کا طرفدار تھا، بشر کو افریقہ کا عامل مقرر کیا، تو بشر نے اپنی ہی قوم یعنی بنی کلب کے ایک شخص کو جس کا نام عنبسہ بن سحیم کلبی تھا عامل کرکے اسپین روانہ کیا، اور اس کو حکم دیا کہ عیسائیوں سے دو چند خراج وصول کرے، لیکن جب ہشام بن عبدالملک تختِ خلافت پر بیٹھے جو یمانیوں پر زیادہ

مہربان تھے، تو بشر بن صفوان نے ایک دوسرے شخص کو جس کا نام یحییٰ بن سلمہ کلبی تھا، اندلس کا عامل مقرر کرکے اس غرض سے روانہ کیا کہ عنبسہ نے جسقدر مال عیسائیوں سے زبردستی لیا ہے، وہ عیسائیوں کو دیا جائے، چنانچہ اسی زمانہ کے ایک عیسائی مورخ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ یحییٰ بن سلمہ نے مسلمانوں پر سخت تشدد کرکے اُن چیزوں کو برآمد کرایا جو مسلمانوں کی نہ تھیں،

محکوم قوموں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں، یمانیہ بہ نسبت قیسیہ کے بالعموم نرم طبیعت رکھتے تھے اس لیے رعایا کو یمانیہ سے زیادہ عداوت نہ تھی، شمالی براعظم افریقیہ کی وہ کثیر التعداد اور مختلف الاصل قومیں جن کو اہل عرب نے مصر سے لیکر بحر محیط کے ساحلوں تک ملک میں بکھرا پایا، اور جن کو عام طور بربر کہتے ہیں، یمانیہ کے ساتھ خاص انس رکھتی تھی، صدہا برس پہلے یورپ کے قدیم مورخ اسٹرابو نے لکھا تھا کہ بربر قومیں عرب کے باشندوں سے بہت مشابہ ہیں موسےٰ بن نصیر نے بھی لکھا تھا کہ یہ قومیں خاص خاص حدود کے اندر بنی اسمٰعیل کیطرح خانہ بدوش رہتی ہیں، اور ان کے لڑنے کے طریقے بھی وہی ہیں جو اہل بادیہ کے ہیں، موسیٰ بن نصیر وہ سپہ سالار تھے جنھوں نے بربر کو مغلوب و محکوم کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا، عربوں کی طرح بربر بھی ہمیشہ آزاد رہے تھے، کیونکہ افریقہ میں سلطنت روما کا تسلط افریقہ کے محض سواحل پر تھا، بربر کا سیاسی نظم و نسق بھی بدویوں کی مثل تھا، یعنی اُن میں ہر شخص آزاد تھا، صرف خاص خاص خاندان تھے جو ممتاز سمجھے جاتے تھے اور لوگ ان کی نصیحت مانتے تھے، عربوں کے لیے بربر کو فتح کرنا بہ نسبت روم اور ایران کے زیادہ مشکل ثابت ہوا، ہر فتح کے بدلے ایک شکست کھانی پڑتی تھی جسمیں کشت وخون بکثرت ہوتا تھا، جب فتحمند عرب تمام ملک میں سے گذرتے ہوئے بحر محیط کے ساحل تک پہنچ گئے تو واپسی کے وقت بربر کے ایک ٹڈی دل نے لشکر عرب کو گھیر لیا، اور اس کے تمام لوگوں کو قتل کر ڈالا، خلیفہ عبد الملک کو افریقہ کے ایک عامل نے لکھا کہ اس ملک کا فتح کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ بربر کی ایک قوم کو غارت کرتے ہی دوسری اس کی جگہ آن موجود ہوتی ہے، مگر باوجود ان تمام مشکلات کے جنھوں نے اس بات پر اور بھی آمادہ کیا کہ عزت اور نام اسی میں ہے کہ ہر مشکل کو حل کیا جائے، اہل عرب افریقہ کی فتح پر نہایت جوانمردی اور مضبوطی سے ثابت قدم رہے، ستر برس کی مسلسل جنگ و پیکار کے بعد افریقہ کی قومیں محکوم ہوئیں،

عقبہ فتح کرتے ہوئے سوس الادنیٰ (یعنی مراکش کی شمالی حد تک) پہنچ گئے تھے۔

مگر اس شرط سے کہ فاتح اپنے حقوقِ فتح کی بڑائیاں کر کے اُن کو ذلیل نہ کرے، بربر کی خودداری اور پندار کا پورا پورا لحاظ رہے اور وہ ایک مفتوح قوم نہ سمجھے جائیں بلکہ فاتح عرب ان کو اپنا بھائی سمجھیں ورنہ اس پر جو بربر کو ناراض کریگا آفت ٹوٹ پڑیگی، حجاج کا کاتب یزید بن ابی مسلم جو قیسی تھا جب افریقیہ کا حاکم مقرر ہو کر آیا تو اس نے بیوقوفی سے بربر کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ گویا بربر اسکے غلام ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بربر نے ابن ابی مسلم کو قتل کر دیا، مگر خلیفہ یزید بن عبدالملک نے گو وہ قیسیوں کے طرفدار تھے، اتنی ہوشیاری کی کہ بربر کو اس قتل کی کچھ سزا نہ دی، اور مقتول عامل کی جگہ محمد بن یزید کلبی کو امیر افریقہ مقرر کر کے بھیجا۔

خلیفہ ہشام نے یزید بن عبدالملک کی طرح ہوشیاری نہیں کی، انھوں نے عبیدہ بن عبدالرحمٰن سلمی (قیسی) کو عاملِ افریقہ مقرر کیا، اس تقرر کی وجہ سے ایک سخت بغاوت بربر میں ہوئی، جو افریقہ سے لیکر اسپین تک پھیل گئی شروع میں خلیفہ ہشام یمانیہ کے طرفدار تھے اسلیے رعایا اُن کو پسند کرتی تھی، لیکن کچھ زمانے کے بعد قیسیوں پر زیادہ التفات ہونے لگا کیونکہ ہشام کے ذوقِ زرکشی کو جیسا بنی قیس پورا کرتے تھے، یمانیہ سے نہ بن پڑتا تھا، اسیوجہ سے قیسیوں کو تمام ایسے صوبجات پر جن کو وہ اچھی طرح لوٹنا جانتے تھے، عامل مقرر کر دیا، قیسیوں نے سلطنت کا مالیہ اتنا بڑھایا کہ کسی تاجدار کے زمانہ میں وہ اتنا نہ بڑھا تھا، بربر کی بغاوت سے مجبور ہو کر خلیفہ ہشام نے عبیدہ کو افریقہ کی حکومت سے برطرف کر دیا (سنہ ۱۱۶ھ) اور عبیدہ کی جگہ عبیداللہ بن حجاب (مولیٰ بنی سلول) کو جو قیسی تھے، افریقہ کی امارت پر ممتاز کر دیا۔

عبیداللہ بن الحجاب گو ایک آزاد شدہ غلام کے پوتے تھے، لیکن وہ ایسے نہ تھے کہ لوگ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھ سکتے، فصاحت و خطابت میں فاضل و کامل اور ایام عرب اور انکے اشعار و وقائع کے حافظ تھے قیسیوں کے ساتھ ان کو بیحد تعلق تھا، اسی تعلق کی وجہ سے انھوں نے ایک بڑا شریفانہ اور فیاضانہ کام بھی کیا، یہ دیکھ کر کہ تمام ملک مصر میں بنی قیس کے دو ہی قبیلے آباد ہیں۔ انھوں نے قیسیوں کے تین سو مفلس خاندان مصر میں آباد کر دیے، اور اس نو آبادی کی ترقی اور فلاح میں بہت جانفشانی کی، عبیداللہ بن حجاب کو جو اُنس اور تعلق اپنے خاندان کے آقائے سابق یعنی حجاج اور حجاج کی اولاد کے ساتھ تھا اس کا حال پڑھ کر دل پر ایک اثر ہوتا ہے، گو ریاست

اور امارت کی وجہ سے ہر طرح کی شان و شوکت اُنھیں حاصل تھی، حکومت اور اختیارات کا پایہ بلند تھا لیکن اس بات پر کہ وہ ایک ادنیٰ خاندان کے آدمی ہیں خجل نہ ہوتے تھے، بلکہ حجاج کے احسانات کا بڑے جوش سے برملا اقرار کرتے تھے کہ اس محسن و مربی نے اُن کے دادا کو غلامی سے آزاد کیا تھا۔ زمانۂ امارت افریقہ میں حجاج کا فرزند عقبہ کے پاس آیا، عبید اللہ نے اپنے قریب مسند پر اُسے بٹھایا، اور اُس کی ایسی خاطر مدارات کی کہ عبید اللہ کے نوجوان مغرور لڑکے اس پر بُرا مان گئے اور جب علیحدہ ملے تو باپ سے جواب طلب کرنے کے طور پر پوچھنے لگے کہ آپ نے ایک بدوی کو شرفائے عرب اور قریش کی موجودگی میں اپنے قریب بٹھالیا، یقینی یہ لوگ اس بات پر ناراض ہو کر آپ کی طرف سے اپنے دل میں بغض رکھنے لگیں گے، آپ تو بڑی عمر کے ہو چکے ہیں آپ کا تو کوئی کچھ نہ کر سکیگا، کیونکہ موت جلد آپ کو ہر عداوت سے محفوظ کر دے گی، لیکن ہم جو آپ کی اولاد ہیں، اس بات کا خوف کر سکتے ہیں کہ آپ کے اس فعل سے جو عام شرمندگی ہوئی ہے اس کے بُرے نتیجے ہمیں اٹھانے پڑیں گے، علاوہ اس کے اگر امیر المومنین کو اس کی خبر ہوئی تو کیا ہوگا؟ کیا یہ سنکر انھیں غصہ نہ آئے گا کہ آپ نے اس عقبہ کی عزت قریشیوں سے بھی زیادہ کی؟ عبید اللہ نے جواب دیا "فرزندو! جو کچھ تم نے کہا درست کہا، میرے پاس کوئی عذر نہیں جو پیش کروں، مگر آئندہ موقع نہ دونگا کہ تمہارے منہ سے پھر ملامت سنوں" دوسرے دن عبید اللہ نے قصر امارت میں عقبہ بن حجاج اور تمام رؤسا اور شرفا کو بلایا تعظیم سب کی کی، لیکن ابن حجاج کو سب سے ممتاز جگہ پر بٹھا کر خود اس کے قدموں کے پاس ہو بیٹھے اس کے بعد انھوں نے اپنے لڑکوں کو طلب کیا، لڑکے داخل ہوتے ہی اس کیفیت کو دیکھ کر اور بھی حیرت زدہ ہوئے، اب عبید اللہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور خدا اور رسول کی حمد و ثنا کے بعد حاضرین کے سامنے تمام وہ باتیں بیان کیں جو ایک دن پہلے اُن کے بیٹوں نے ان سے کہی تھیں اور کہا کہ اب میں اللہ تعالیٰ کو اور تم لوگوں کو اگر اللہ تعالیٰ کافی ہے، گواہ کر کے کہتا ہوں کہ یہ عقبہ فرزند ہیں اُن حجاج کے جنھوں نے میرے دادا کو غلامی سے آزاد کیا تھا، میرے لڑکوں کو شیطان نے گمراہ کر کے ایک مجنونانہ تکبر اور غرور پیدا کر دیا ہے۔ لیکن میرا خدا شاہد ہے کہ کم سے کم میں احسان فراموشی کا مرتکب نہیں ہوں اور میں بخوبی علم رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے اور اس شخص کے مجھ پر کیا کیا احسان ہیں، یہ کل حالات میں نے سب کے سامنے اس خیال سے

کہتے ہیں کہ مبادا یہ لڑکے اس شخص کو اور اس کے باپ کو اپنا سرپرست ماننے سے انکار کردیں اور اس احسان فراموشی کی وجہ سے خدا کی برکتوں سے محروم ہو جائیں جسکا انجام یہ ہو کہ خدا اور بندگان خدا کی نظروں میں وہ ذلیل ہوں کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنی ہے مَلْعُوْنٌ مَنِ ادَّعٰی اِلٰی غَیْرِ نَسَبِہٖ، مَلْعُوْنٌ مَنْ اَنْکَرَ نِعْمَۃَ الْمُنْعِمِ عَلَیْہِ جو شخص اپنے نسب کو دوسرے کے نسب سے منسوب کرے یا اپنے محسن کے احسان سے انکار کرے وہ ملعون ہے" اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے "کُفْرٌ بِاللّٰہِ تَبَرٍّ مِنْ نَسَبٍ وَاِنْ دَقَّ وَکُفْرٌ بِاللّٰہِ اِدِّعَاءٌ اِلٰی نَسَبٍ مَجْھُوْلٍ" اپنے نسب سے بیزار ہونا اگرچہ درجہ میں کم ہو اور اپنے کو نسب مجہول کیطرف منسوب کرنا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا ہے" اے میرے فرزندو! چونکہ مجھ کو تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ اپنی ذات سے ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ تم خدا اور اس کے بندوں کی ملامت کا نشانہ بنو تم نے کہا کہ اگر امیر المومنین کو اس واقعہ کی خبر ہو گئی تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے، لیکن اس طرف سے اطمینان رکھو، اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے امیر المومنین اس سے بہت اعلیٰ اور افضل ہیں وہ خدا کی اطاعت اور اس کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا خوب جانتے ہیں اس لیے مجھے اس کا مطلق خوف نہیں ہے کہ اگر میں نے اپنے دوستوں کیساتھ بھلائی کی ہے تو وہ مجھ سے ناخوش ہو جائیں گے" اس تقریر کو سن کر ہر طرف سے صدائیں بلند ہوئیں "سچ ہے سچ ہے خدا ہمارے اس امیر کو زندہ رکھے" لیکن عبید اللہ کے فرزند اپنی اس خفت پر بیحد شرمندہ اور ملول ہو کر خاموش ہو گئے، اس کے بعد عبید اللہ نے عقبہ سے کہا "یہ میرا فرض ہے کہ جو حکم آپ دیں اُسے بجا لاؤں خلیفہ نے مجھے ایک وسیع ملک انتظام کے لیے دے رکھا ہے، اس میں جس صوبے کی حکومت آپ پسند کریں وہ حاضر ہے" عقبہ بن حجاج نے اسپین کی حکومت پسند کی اور کہا کہ "میری آرزو یہ ہے کہ جہاد کروں اور اسپین میں اس کا بہت موقع ہے"

لیکن باوجود اس عالی حوصلگی اور طبیعت میں اپنی قوم کی خوبیاں رکھنے کے عبید اللہ نے اپنی اس قومی خصلت کو کہ سوائے عرب کے اور سب قوموں کو حقیر و ذلیل سمجھے، بہت نمایاں طور پر ظاہر کیا اس کے نزدیک سوائے عرب کے اور سب قوموں کے لوگ جن کو وہ مشکل سے انسان سمجھتا تھا صرف اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ اپنی چوٹی کا پسینہ ایڑی تک اُس قوم کی دولتمندی کیلئے بہاتے

دیں جسکو رسول اللہ صلعم سب میں بڑا بتا گئے تھے، مصر میں جو وقت عبید اللہ افسر خراج ہوئے تھے تو انھوں نے خراج کی رقم میں جو قبطی ادا کیا کرتے تھے، پانچ فیصدی کا اضافہ کر دیا، قبطی بالعموم نہایت عافیت پسند تھے، مسلمانوں کا دور حکومت جب سے ہوا تھا انھوں نے کبھی کوئی بغاوت نہیں کی تھی، لیکن اس اضافۂ خراج پر وہ ایسے برہم ہوئے کہ سب نے ہتھیار اٹھا لیے، اب افریقہ میں عبید اللہ جب سے امیر ہو کر آئے اُس وقت سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ امراء دمشق کے عیش و عشرت کا سامان بربر کو نقصان پہنچا کر مہیا کیا کریں، چونکہ مرنیو بھیڑ کے بچوں کے اُون سے نہایت سفید پاکیزہ کپڑے تیار کئے جاتے تھے اس لیے دمشق میں اس کی بہت مانگ رہتی تھی، امیر عبید اللہ اسی غرض سے بربر کی بھیڑیں زبردستی پکڑوا لیا کرتے تھے اور جتنی بھیڑیں پکڑی جاتی تھیں وہ سب بلا تمیز ذبح کر دی جاتی تھیں، حالانکہ اگر سو بھیڑیں پکڑی جاتی تھیں تو ان میں مشکل سے کوئی ایک بھیڑ کا بچہ ایسا نکلتا ہو جس کا اون یا پوستین مطلب کا ہو، باقی سب ایسی ہوتی تھیں جن پر کچھ اُون ہوتا ہی نہ تھا، غرض بھیڑوں کے گلوں ہی پر بس نہ تھی، بربر کی بہو بیٹیوں کو بھی گرفتار کر کے امرائے شام کے پاس بھیج دیتے تھے، تاکہ اُن کی حرم سراؤں کی رونق بڑھے شام کے امیر ویسے بھی بربر کی عورتوں کے بڑے قدردان تھے، اور مشہور یہ تھا کہ اُن کا حسن عربی عورتوں کے حسن سے زیادہ ہوتا ہے

لہ مقریزی: قبطیوں کی تاریخ ز آولیشن وسٹن فلڈ ص ۵۵ (ٹ

علامہ ابن العذاری المراکشی اپنی کتاب اخبار المغرب میں لکھتے ہیں: بربریوں کی بغاوت اور ان کے سردار میسرہ کے استحکام کا سبب یہ تھا کہ ان کو عبید اللہ بن الحجاب کے عامل طنجہ کی سوء سیرت سے نفرت ہو گئی تھی اور اس وجہ سے بربر میں ناراضی پھیل گئی تھی، مشرق میں یہ حال تھا کہ خلیفہ بنی امیہ مغرب کی عجائبات کے دلدادہ اور عاشق تھے اور اپنے عمال افریقہ سے ان کو طلب کیا کرتے تھے، یہ عمال انکو وہ بربری عورتیں جو قیمتہً ہو کر آیا کرتی انھیں بھیجتے رہتے تھے، جب عبید اللہ بن الحجاب والی افریقہ ہوئے تو انھوں نے انکو اور زیادہ تعداد میں انکے پاس روانہ کرنا شروع کیا، یا تو اس بات میں عبید اللہ نے خود حد سے زیادہ اہتمام کیا، یا امرائے بنی امیہ نے عبید اللہ کو اس پر مجبور کیا۔ (اردو ترجمہ مولوی جمیل الرحمٰن تاریخ مغرب ص ۲۳) اخبار مجموعہ کا مصنف اس بات کو نہیں مانتا کہ عمال افریقہ کی زیادتیوں سے تنگ آکر بربر نے بغاوت کی تھی، وہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کو حکام پر طعن کرنے کی عادت ہے وہ اس قسم کی وجہ بنا لیا کرتے ہیں، یہ اعتراض انھی لوگوں کے ہیں جو امرائے اندلس سے بغض رکھتے تھے (مترجم)

پانچ برس سے زائد تک یہ سب زیادتیاں بربر چپ چاپ سہا کیے، کبھی کبھی شکایت کا کچھ ترشح بھی ہوتا رہا لیکن زیادہ تر دلوں میں بغض وعداوت بھرتے رہے، عرب کا ایک لشکرِ جرار اس وقت ملک میں موجود تھا، اس لیے دم بخود رہے، مگر یہ ظاہر ہو چلا تھا کہ بربر ایک دن بغاوت ضرور کریں گے، بربر اور عرب میں گو بہت سی باتیں مشابہ تھیں لیکن ایک بڑا فرق دونوں میں یہ تھا کہ بربر بجید مذہبی طبیعتیں رکھتے تھے بلکہ اوہام پرستی کیطرف مائل تھے معلمان دین کی بہت تعظیم اور کورانہ تقلید کرتے تھے، برعکس اس کے عرب بڑے متشکک اور مذہب پر طعن کرنے والے لوگ تھے، اور علمار کو موقع ہی نہ دیتے تھے کہ وہ اپنا کوئی اثر ان پر ڈال سکیں، افریقہ میں آجکل بھی اہل رباط ملکی معاملات میں بڑا دخل رکھتے ہیں، اگر بربر کے دو قبیلوں میں لڑائی ہو پڑتی ہے تو یہی اسکا فیصلہ کرتے ہیں جس وقت کسی قبیلے میں سردار کا انتخاب کیا جاتا ہے تو مرابطین ہی لائق ترین امیدوار سرداری پر نامزد کرتے ہیں جب کوئی مشکل پیش آتی ہے اور تمام قبائل کو جمع کرنیکی ضرورت ہوتی ہے، تو یہی اہل رباط ہر قبیلے کی رائے معلوم کرکے باہمی مشورہ کرتے ہیں اور اس طرح بحث ومباحثے کے بعد اپنی تجویز سناتے ہیں۔ جہاں یہ لوگ سکونت رکھتے ہیں (یعنی رباط) وہاں اُن کی آسائش اور ضروریات کا مہیا کرنا قوم کا فرض ہوتا ہے، بہت ہی تعجب کی بات یہ ہے کہ بربر اپنے معلمان دین کو خدا سے بھی بڑھ کر مانتے ہیں؎، ایک فرانسیسی مصنف جس نے ایمانداری سے اس قوم کے طریقوں کا مشاہدہ کیا ہے، لکھتا ہے کہ "اگر قزاقوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو کر لوٹ مار سے بچنے کے لیے کوئی غریب مسافر خدا کا واسطہ دیتا ہے تو اس کو پناہ نہیں ملتی لیکن اگر اس نے کسی بڑے بزرگ مرابط کا واسطہ دیا تو

اہلِ رباط سے مطلب ہے، مرابطین جمع ہے اس کا واحد مرابط یعنی اہل رباط ہے، یعنی وہ لوگ جو بغیر تنخواہ لیے عہد سے کے جہاد کے لیے تیار ہیں، یوسف بن تاشفین کی جماعت جس نے دولت مرابطین قائم کی اسی نام سے موسوم تھی، بعد کو جب جہاد کا جذبہ کم ہو گیا اور تصوف پھیلا تو رباط کے معنی خانقاہ کے ہو گئے اور مرابط خانقاہ نشین درویش یا عابد وزاہد کو کہنے لگے (مترجم)

؎ اس اعتراض کو ڈوزی نے کل بربر پر عائد کیا ہے، اور مثال میں فرانسیسی مصنف کا قول پیش کیا ہے جو بربر کے قزاقوں سے متعلق ہے، اگر مصنف کا خیال درست ہے تو اس سے یہ لطیفہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کل بربر قزاق تھے (مترجم)

لئے قزاقی چھوڑ دیتے ہیں، بربر سے کوئی بڑا کام اس وقت تک ظاہر نہیں ہوا جب تک کہ انکے دینی معلموں نے ان کو کسی بات پر نہ ابھارا ہو، یہ معلمان دین ہی تھے جنھوں نے دو وسیع سلطنتیں کھڑی کردیں، دولت مرابطین اور دولتِ موحدین کی بنیاد ڈالی، بالکل شروع زمانہ میں جس وقت عرب اور بربر میں لڑائیاں شروع ہوئی ہیں تو جو بربر پہاڑوں میں رہتے تھے وہ ایک کاہنہ کے معتقد تھے، اور اس کاہنہ میں خارقِ عادت اوصاف تسلیم کیے جاتے تھے، عربوں کے امیر لشکر عقبہ بن نافع الفہری نے جو بربر کے خصائل کو دوسرے عربی سردارانِ فوج کی بہ نسبت زیادہ سمجھتا تھا، فوراً معلوم کر لیا کہ اس دشمن کو مغلوب کرنے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ فوق الفطرت کرشمے اور کرامات دکھا کر ان کی سریع الاعتقادی پر اثر ڈالا جائے، اس لیے عقبہ بن نافع نے ایک کاہن اور مرابط کا رنگ اختیار کیا، کہیں دعا مانگ کر جنگل سے سانپوں کو بھگا دیا، اور کہیں ندائے غیب سننے کا دعوٰی کیا، یہ باتیں ہم کو لغو اور بچوں کی سی معلوم ہوتی ہیں لیکن عقبہ کے لیے وہ موجب کامیابی ہوئیں اور بربر کے دل پر عقبہ کی کرامتوں کا بے انتہا اثر ہوا! ۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ اس دشمن کا مقابلہ کرنا بیکار ہے چنانچہ انھوں نے اپنے ہتھیار ڈال دیے اور مسلمان ہو گئے۔

جس زمانہ کا حال ہم اس وقت لکھ رہے ہیں اُس زمانہ میں اسلام کی اشاعت افریقہ میں بخوبی ہو چکی تھی، خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے دورِ حکومت میں ایک بربر بھی ایسا نہ ملتا تھا جو مسلمان نہ ہو چکا ہو" اگر ہم ایور رمین علیسائی، یہ بات بھی یاد رکھیں کہ اسلام فوراً اور ہمیشہ دل سے قبول نہیں کیا جاتا تھا، اور ذاتی فوائد کا خیال اس دین کو قبول کرنے کیطرف لوگوں کو راغب کرتا تھا، تو پھر اس پرانے مورخ کے قول کو مبالغے پر محمول کرنے کی ضرورت نہیں رہتی، خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے خیال میں تبلیغ اسلام اُن کی زندگی کا اصلی مقصود معلوم ہوتا تھا، انھوں نے ہر طرح کے جائز ذرائع سے جن سے بربر میں اسلام کی اشاعت اور مسلمانوں کی تعداد بڑھنی ممکن تھی کام لیا نومسلم کے لیے لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ پڑھ لینا کافی تھا، کلمہ پڑھتے ہی وہ جزیے سے بری ہو جاتا تھا، اور اس کی ضرورت بھی نہ تھی کہ وہ شخص مذہب کے تمام قواعد کا سختی کیساتھ پابند رہے عاملِ خراساں نے ایک مرتبہ شکایۃً لکھ کر بھیجا کہ "بہت سے لوگ جو مسلمان ہوئے ہیں انھوں نے جزیے سے مستثنیٰ رہنے کے لیے ایسا کیا ہے اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ ختنہ تک نہیں کراتے

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس کا صرف اتنا جواب دیا کہ "اللہ نے اپنے رسول کو دین برحق کی طرف بلانے والا بنا کر بھیجا تھا، خاتن بنا کر نہیں بھیجا تھا" خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی چشم دوربین مستقبل پر لگی تھی، وہ جانتے تھے کہ اس بڑے ساگ پات اور کوڑے کرکٹ کے نیچے ایسی شاداب اور زرخیز زمین موجود ہے، جسمیں کلام الٰہی کا تخم جم کر کثرت سے بارآور ہونے والا ہے وہ نکتہ انھوں نے پہلے ہی سے سمجھ لیا تھا کہ گو نو مسلموں کی نسبت اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ اُن کا اسلام ضعیف ہے، لیکن ان ہی نو مسلموں کے بیٹے اور پوتے جس وقت اس دین میں شروع سے پرورش پاکر پروان چڑھیں گے تو مذہب کے ساتھ اُن کا خلوص اور جوش اُن لوگوں سے بڑھ کر ثابت ہو گا جنھوں نے زمانۂ سابق میں اپنے باپ دادا کی نسبت شبہ ظاہر کیا تھا کہ وہ سچے مسلمان تھے یا نہ تھے (یہ اشارہ عربوں کی طرف ہے)

واقعات نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی اس پیشین گوئی کو خاص کر افریقہ کے ملک میں بالکل صحیح ثابت کر دکھایا، شروع زمانہ میں اسلام اہل افریقہ کی نظر میں ایسا مذہب تھا جس سے ان کا جی اکتایا اور دل پھر جاتا تھا پھر وہ قابل برداشت ہو گیا، اسکے بعد یہی دین ان کا متاع زندگی اور مایۂ حیات بن گیا، لیکن اسلام کو جس شکل میں اُنھوں نے سمجھا تھا، وہ کوئی سرد و خشک محض ضابطہ کا دین نہ تھا، جسمیں اقرار وحدانیت بلا اعتقاد الہام اور شک پرستی میں ایک قسم کی مصالحت کر دی گئی ہو، جیسا کہ واعظین اپنے درس و تدریس میں اُسے ظاہر کیا کرتے تھے اور ایسی خدمتوں پر زور دیا کرتے تھے جو رعایا کو خلیفہ کی کرنی چاہئیں، مگر اُن خدمتوں کا ذکر تک نہ کرتے تھے جو خلیفہ کو رعایا کے حق میں ادا کرنی ضروری تھیں، بربر نے جس شکل میں اسلام کو مانا، وہ ایک سخت اور شدید جذبات سے لبریز مذہب تھا جس کا درس فرقہ خوارج کے واعظین نے اُن کو دیا تھا مشرقی ملکوں میں خوارج کی حالت یہ رہی تھی کہ جیسے شکار شیر کے ڈر سے بھاگتا پھرے اور اسکو کہیں پناہ کی جگہ نہ ملے گرفتار ہونے کے خوف سے طرح طرح کے بھیس بدلتے تھے بعض وقت اپنے نام تک فرضی رکھ لیتے تھے، لیکن آخرکار وہ وقت آیا کہ ہزارہا خدشوں اور خطروں کو جھیلنے کے بعد افریقہ کے جلتے اور جھلستے بیابانوں میں اُن کو پناہ مل جائے یہاں آکر بے مثل کامیابی کے ساتھ اُنھوں نے اپنے عقائد کو پھیلایا، اور ان پُرجوش سچے معلمانِ دین کی تعلیم جیسے افریقہ میں صدق

دل سے تسلیم کی گئی اور کہیں ایسا نہ ہوا یہ سمجھیے کہ جیسے مسیحی فرقہ کالون کو اپنے عقائد کی ترویج کے لیے اسکاٹ لینڈ کا ملک مل گیا تھا، اب خوارج کو اپنا مذہب پھیلانے کے لیے افریقہ کا ملک مل گیا عربوں نے خوارج کے معتقدات کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، اس وجہ سے نہیں کہ ان کے سیاسی خیالات سے عربوں کو کسی طرح کا تنفر تھا کیونکہ خوارج کی حُرّیت پسندی عرب کے مزاج کے بالکل موافق تھی نہ ماننے کا سبب محض یہ تھا کہ عرب نے مذہب کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونے کی رغبت کبھی ظاہر نہ کی تھی، اور نہ بزرگان دین کے سخت شعار کو جس میں مطلق رعایت نہ تھی، وہ تسلیم کر سکتے تھے، برعکس اس کے افریقہ میں ذلیل اور بے سروسامان جھونپڑیوں کے رہنے والوں نے خوارج کی تعلیم کو ایسے جوشِ عقیدت سے مانا جس کا بیان کرنا مشکل ہے یہ سیدھے سادھے جاہل لوگ تھے اور اُن باریک بینیوں اور موشگافیوں کو جو زیادہ تعلیم یافتہ لوگوں میں پیدا ہو گئی تھیں بالکل نہ سمجھتے تھے، اس لیے یہ دریافت کرنا بیکار ہو گا کہ خوارج کے مختلف فرقوں میں سے کس فرقہ میں ان کا شمار ہوتا تھا یعنی حروریہ، صفریہ، اباضیہ میں سے کونسی جماعت اُن کو زیادہ پسند تھی، مورخ بھی اس بارے میں خاموش ہیں، بہرکیف یہ جاہل بربر خوارج کے اصول و قواعد کو اس حد تک بخوبی سمجھتے تھے کہ اُن کو اپنے پرانے انقلابی اور جمہوری اصول سیاست میں شامل کر کے سب کو ایک جان کر دیں اور اُن خیالی اور ہوائی امیدوں کو پیش نظر کر لیں جو تمام بنی نوع انسان کو ایک سطح پر لانے کی ان معلموں کی تعلیم نے اُن میں پیدا کر دی تھیں اور اسکا بھی دل سے یقین کر لیں کہ جو لوگ اُن پر ظلم اور زیادتیاں کرتے ہیں اُن کی تقدیر میں دوزخ کی آگ اتری ہے۔

چونکہ ان کے خیال میں تمام خلفا حضرت عثمان سے لیکر نیچے تک سب بے دین اور غاصب تھے اس لیے کسی ایسے ظالم سے بغاوت اور سرکشی کرنی جو اُن کے مال لوٹ اور انکی عورتوں کو اُن سے چھین لیا کرتا ہو کوئی گناہ نہ تھا، بلکہ ایک جائز کام اور ضروری فرض تھا، چونکہ عربوں نے بربر کو صرف ایسے اختیارات دیے تھے جو ان کے قبیلوں کے انتظام کے متعلق تھے اور باقی ہر قسم کی قوت و قدرت حاصل کرنے سے اُن کو روکنا چاہا تھا، اس لیے بربر نے حقِ حکومت جمہور کے مسئلہ کو بہت جلد قبول کر لیا، یہ حقِ حکومت وہ تھا جو اُن کی خانہ بدوشانہ اور آزادانہ حالت میں مدتہائے دراز سے اُن میں رائج تھا، اب انھوں نے سمجھا کہ اُن کا یہ پرانا حق اصولِ اسلام اور اسکی سچی تعلیم کے مطابق ہے

اور ادنیٰ سے ادنیٰ بربر بھی، اگر کُل قوم اس کی نسبت رائے دیدے تو تختِ حکومت حاصل کر سکتا ہے لیکن باوجود جمہوریت کے اس پختہ خیال کے اس مظلوم اور ستم رسیدہ قوم نے ایسے لوگوں کے اشتعال سے جو نیم واعظ اور نیم مبارز تھے اور مذہب مستند کے ماننے والوں سے بہت سے بدلے بھی نکالنا چاہتے تھے، اس بات پر کمر باندھ لی کہ اللہ اور اس کے رسول اور کتاب مقدس کا نام لے کر جس کے ماننے والے دوسرے لوگ تھے، ایک خوفناک اور جابر مطلق العنان بادشاہی کی بنا ڈالیں، بیحد تعجب خیز و حیرت انگیز ہیں قوانین مذہب کے وہ استعمال جو ازل نے اُن کے مقدمہ میں لکھے ہیں، یہ قوانین کے مجموعے نہیں ہیں بلکہ مہلک ہتھیاروں کے گودام ہیں، جو ہر امر متنازع فیہ کے لیے فوراً ہتھیار مہیا کر دیتے ہیں کبھی اہل بدعت کے زندہ جلانے والوں کے حامی و شفیع اور کبھی اُن خطیبوں کے معاون و مددگار بنتے ہیں جو مطلق العنان بادشاہی قائم کرنیکے درپے ہوتے ہیں اور کبھی دلائل و براہین کا ایک پشتارہ "آزادی ایمان" کے معاونوں کو پیش کر دیتے ہیں جو ایک بادشاہ کو قتل کر کے جمہوری حکومت کی بنیاد ڈال دیتے ہیں (یہ سب تلمیحات یورپ کی مسیحی تاریخ سے لیکر مسلمانوں کے سر منڈھی گئی ہیں۔ مترجم)

ہر طرف لوگوں میں ایک ہیجان پیدا تھا۔ اور بربر منتظر تھے کہ اچھا موقع ملتے ہی غدر کر دیں یہ موقع بھی آگیا، وہ اس طرح کہ ۱۲۱ھ میں والی افریقیہ عبید اللہ بن الحجاب نے لشکرِ افریقہ کے ایک کثیر حصہ کو صقلیہ (سسلی) پر فوج کشی کے لیے بھیجدیا جس وقت یہ لشکر جہازوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا تو پھر ظاہر تھا کہ ذرا سا بہانہ ملنے پر بھی بربر ہتھیار سنبھال لیں گے، اس حالت میں علاقہ طنجہ کے عامل نے یہ بے احتیاطی کی کہ خاص اسی زمانہ میں جزیہ کے وصول کرنے میں قیسیوں کا طریقہ اختیار کیا، اور بربر پر جو اسکے علاقہ میں تھے عشر کی رقم دوچند کر دی، گویا کہ وہ مسلمان نہ تھے۔ اس پر بربر نے فوراً بغاوت کر دی، سروں کو منڈوا کر قرآن نیزوں پر باندھے، جیسے کہ خوارج کا دستور تھا، اور میسرہ مدغری کو جو اُن کا مذہبی پیشوا اور فوجی سردار تھا، اپنا حاکم بنا کر طنجہ کے شہر پر دھاوا کر دیا، اور اس کو فتح کر کے وہاں کے عامل عمر بن عبد اللہ المرادی کو، اور تمام عربوں کو جو شہر میں مل سکے، قتل کر ڈالا اور اپنے قواعد پر اس سختی اور بیرحمی سے عمل کیا کہ بچوں کو بھی زندہ نہ چھوڑا، طنجہ فتح کر کے میسرہ مدغری علاقہ سوس کی طرف چلا، یہاں عبید اللہ بن حجاج کا لڑکا اسمٰعیل

حاکم تھا، مگر سوس کی بربر قوموں نے میسرہ کے پہنچنے سے پہلے ہی ایک ہنگامہ برپا کر کے اس کو قتل کر دیا تھا، عربوں نے بہت کوشش کی کہ اس بغاوت کو کسی طرح فرو کریں، لیکن جب ہر طرف ناکامی نظر آئی تو ملک چھوڑنا شروع کر دیا، اور چند روز میں مغرب اقصٰی جسکو برسوں کی محنت اور جانفشانی سے حاصل کیا تھا، اُنکے ہاتھوں سے نکل گیا، جب ملک عربوں سے خالی ہوا تو بربر نے چاہا کہ کسی کو خلیفہ منتخب کریں، حُریت و مساوات کا جذبہ سیاسی انقلاب پیدا کرنے کے جوش میں اس قدر تیز تھا کہ کسی امیر یا رئیس کو نہیں بلکہ اُسی سردار کو جس کی سرکردگی میں خروج کیا تھا اپنا خلیفہ بنا لیا، اور یہ وہ شخص تھا جو کچھ دن پہلے قیروان کے بازار میں پانی بیچا کرتا تھا۔

عبیداللہ نے جس وقت عقبہ کو اسپین میں حکم بھیجا تھا، اسی وقت حبیب بن عبدہ بن عقبہ بن نافع کے پاس، جسے صقلیہ کی مہم پر روانہ کیا تھا، اس پیغام سے قاصد بھیجا کہ جہاں تک جلد ممکن ہو مع فوج کے افریقہ کو واپس چلے آو، صقلیہ کا انتظام اندلس کا بیڑہ کر لیگا، خطرہ بڑھتا جاتا تھا کیونکہ بغاوت ہر طرف پھیل گئی تھی، عبیداللہ نے صقلیہ کی فوج کا انتظار نہ کیا، اور جس قدر فوج دستیاب ہو سکی اُس پر خالد بن ابو حبیب الفہری کو افسر بنا کر بغاوت فرو کرنے کے لیے روانہ کیا اور خالد سے کہدیا کہ حبیب کا لشکر آتے ہی تمہاری کمک پر بھیج دیا جائے گا، خالد الفہری اب فوج لے کر آگے بڑھا، اور طنجہ کے قریب میسرہ مدغری سے مقابلہ ہو گیا، سخت لڑائی کے بعد جسمیں کچھ فیصلہ نہ ہو سکا، میسرہ پسپا ہو کر طنجہ کے شہر میں چلا آیا، یہاں خود اس کی فوج والوں نے اسے قتل کر دیا، اس قتل کی وجہ یا تو یہ ہوئی کہ بربر کی فوج کو اپنی فتحیابی کا پورا یقین تھا، اور جب فتح پوری حاصل نہ ہوئی تو اس غصہ اور شرمندگی میں اپنے ہی افسر کو مار دیا، یا یہ سبب ہوا کہ خلیفہ ہو کر میسرہ ازادی جمہوریت کے اُس اصول کا پابند نہ رہا جو اس کی فوج والے جانتے تھے، عربی مورخ یہ اخیر وجہ قتل کی بیان کرتے ہیں، اگر یہ درست ہے تو پھر بربر کا یہ فعل اُن کے حقوق اور فرائض منصب کے مطابق تھا کیونکہ اپنے قواعد کے موجب وہ کسی سردار یا خلیفہ کو جو اُن کے اصول پر کاربند نہ ہو اس کے منصب ہی سے علیحدہ نہ کر سکتے تھے بلکہ اس کو سزائے قتل بھی دے سکتے تھے۔

بربر نے اب اپنے لوگوں میں سے خالد بن حمید زناتی کو سردار مقرر کر کے عربی لشکر پر پھر حملہ شروع کیا اور اس مرتبہ ان کو زیادہ کامیابی ہوئی، جس وقت لڑائی پورے زور پر تھی تو زناتی کی

فوج کے ایک حصّہ نے عربی لشکر کے عقب پر حملہ کر دیا، عرب اب اس خوف سے کہ سب طرف سے گھر نہ جائیں میدان سے بے ترتیب ہو کر ہٹے، لیکن امیر لشکر خالد الفہری اور اُمرا جو اُس کے ہم رکاب تھے، اُن کی غیرت نے قبول نہ کیا کہ ایسی شکست کے بعد زندہ رہیں، چنانچہ وہ سب کے سب دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور بہت لوگوں کو قتل کر کے خود بھی قتل ہو گئے، اس لڑائی میں عرب کے شرفا۔ وعمائد اس قدر کام آئے تھے کہ اس کا نام غزوۃ الاشراف مشہور ہو گیا۔

اس اثنا میں حبیب بن عبید الفہری بھی صقلیہ سے واپس چلے آئے اور تاہرت کیطرف مع فوج کے روانہ ہوئے، لیکن خالد کی ہزیمت کی خبر سنکر بربر سے مقابلہ پر نہ آئے، اب افریقیہ کی حالت اُس جہاز کی سی تھی جو بغیر بادبان اور بغیر ناخدا کے موجوں پر چل رہا ہو، کیونکہ امیر افریقہ عبید اللہ بن الحجاب کو خود اہل عرب نے اس بنا پر معزول کر دیا تھا کہ یہ تمام آفات اسی کی زیادتیوں سے اُن کے سر پر ٹوٹی تھیں اور یہ الزام انکا بیجا نہ تھا، خلیفہ ہشام کو جب بربر کی بغاوت اور اور عرب کی ہزیمت کی خبر پہنچی تو غصہ سے تھرا اُٹھے اور کہا "خدا کی قسم ان بربر کو دکھا دونگا کہ ایک پرانے عرب کا قہر کس کو کہتے ہیں، ان پر ایسا لشکر بھیجونگا جو کبھی نہ دیکھا ہو، اس کا پچھلا سرا ابھی دمشق ہی میں ہوگا کہ اگلا سرا اُن پر پہنچ جائیگا" فوراً شام کے چار علاقوں میں حکم پہنچا کہ ہر علاقہ سے چھ چھ ہزار فوج مہیا ہو اور علاقہ قنسرین سے تین ہزار، اور یہ جملہ ستائیس ہزار فوج مصر کی تین ہزار سپاہ، اور افریقیہ کے لشکر سے جس قدر بھی وہ ہو مل جائے، اس مجموعی لشکر کی افسری اور نیز افریقیہ کی امیری پر کلثوم بن عیاض القشیری کو جو ایک آزمودہ کار قیسی سردار تھا اس حکم کے ساتھ مقرر کیا اگر کلثوم کام آجائے تو اس کا بھتیجا بلج بن بشر القشیری اسکی جگہ ہو جائے اور اگر بلج بھی مارا جائے تو ثعلبہ بن سلامۃ الجذامی یمانی جو قبیلہ عاملہ سے تھا، اور اس وقت علاقہ اردن کے رسالہ کا سردار تھا، بلج کی جگہ کام کرے۔ اس ارادے سے کہ بربر کو اس بغاوت کی نہایت سخت سزا دی جائے، خلیفہ نے حکم دیا کہ جو بربر ملے اُس کو قتل اور جو شہر فتح ہو اسکو لوٹ لیا جائے۔

ہارون اور مغیث بنی امیہ کے دو موالی تھے جو افریقیہ کے راستوں سے خوب واقف تھے ان دونوں کی رہبری میں کلثوم بن عیاض اپنے جرار لشکر کو لیے ہوئے ۱۲۳ھ میں داخل افریقیہ ہوئے افریقیہ میں جو عرب پہلے سے آباد چلے آتے تھے انھوں نے اس شامی لشکر کو اچھی نظر سے نہ دیکھا

کیونکہ یہ شامی نو وارد افریقہ کے عربوں کے ساتھ بہت متکبرانہ برتاؤ کرتے تھے، یہاں تک کہ افریقی عرب اُن کو بجائے دوست اور مددگار سمجھنے کے یہ باور کرنے لگے کہ گویا وہ ہم ہی پہ فوج کشی کرنے آئے ہیں، اب جہاں کلثوم کی فوج کسی شہر کے قریب پہنچی تو شہر والوں نے شہر کے دروازے بند کر لیے اور حبیب بلج نے جو ہراوّل کی فوج کا افسر تھا، تحکمانہ طریقہ پر دروازے کھولنے کو کہا، اور اس کیساتھ یہ دھمکی بھی دی کہ وہ خود اور اُس کی فوج والے مستقل طور پر افریقہ میں سکونت رکھیں گے تو شہر والوں نے حبیب بن عبدہ بن عقبہ کو جو صقلیہ سے واپس ہو کر ابھی تک تاہرت کے قریب مقیم تھے ان واقعات کی اطلاع کی حبیب نے کلثوم امیر لشکر کو اس مضمون کا خط لکھا کہ تمہارے مجنوں بھتیجے نے نہایت غرور کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ وہ اپنی سپاہ کے ساتھ اس ملک میں آباد ہو گا۔ اس کے علاوہ ہمارے شہروں کے باشندوں کو بات بات پر دھمکاتا ہے اسلیے میں تم کو ہوشیار کیے دیتا ہوں کہ اگر تمہاری فوج والے ہمارے لوگوں کو چین سے نہ رہنے دینگے تو ہم تمہارے مقابلہ پر ہتھیار اٹھالیں گے۔" کلثوم کے پاس حبیب کا یہ خط پہنچا تو اس نے معذرت کی اور لکھا کہ میں عنقریب مع لشکر کے تاہرت میں آپ سے ملاقات کرونگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، لیکن یہاں پہنچتے ہی شامیوں اور افریقیوں میں پھر کسی بات پر جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا بلج نے جو اپنے چچا کلثوم کی حمایت پر تھا، حبیب بن عبدہ کو دیکھتے ہی کہا کیا یہی شخص ہے جو کہتا تھا کہ ہمارے مقابلہ پر ہتھیار اٹھائیگا؟ حبیب بن عبدہ کے لڑکے عبدالرحمن نے کہا "بلج اسکا کچھ خیال نہ کرو، اگر میرے باپ سے تم کو کوئی شکایت پیدا ہوئی ہے تو وہ اسے جلد رفع کر دے گا" جانبین کے لشکر تیار تھے کہ اس جھگڑے میں شریک ہو جائیں، اب ایک طرف سے شامیوں نے اور دوسرے طرف سے افریقی اور مصری فوجوں نے شور مچانا شروع کیا کہ ہتھیار اٹھالو، بہر حال یہ نزاع نہایت مشکل سے فرو کیا گیا، فریقین میں مصالحت ہو گئی مگر وہ ظاہری تھی، اب یہ لشکر جس کی تعداد ستر ہزار تھی ایک مقام پر پہنچا جس کا نام نقدورہ یا لقدورہ تھا، یہاں بربری فوجوں نے آگے بڑھنے کا راستہ روک رکھا تھا، بربری فوجیں اس لشکر سے بھی کہیں زیادہ تعداد میں تھیں، اس کثرت کو دیکھ کر ہارون اور مغیث نے کلثوم کو صلاح دی کہ چاروں طرف خندق کھود کر یہیں قیام کر دینا چاہیے اور بجائے جنگ کرنے کے یہ مناسب ہو گا کہ قرب و جوار کے دیہات پر سواروں کے دستے تاخت و تاراج کیلئے بھیجے جائیں، کلثوم اس رائے پر

عمل کرنے کو آمادہ تھا، لیکن بلج بن بشر نے جو بہت ہی چھچھلے مزاج کا آدمی تھا، اس بات کو نہ مانا اور اپنے چچا سے کہا کہ "ہارون اور مغیث کی رائے پر بھروسا نہ کیجیے گا، بربر سے ہرگز ڈرنے کی ضرورت نہیں گو اُن کی تعداد زیادہ ہے لیکن نہ اُن کے پاس ہتھیار ہیں اور نہ کپڑے" بلج نے یہ بات غلط نہیں کہی تھی، بربر کے پاس ہتھیار کم تھے اور لباس کا بھی یہ حال تھا کہ سوائے سوتی شلوار کے بدن پر اور کوئی کپڑا نہ تھا، کلثوم کو چونکہ بلج سے مشورہ کرنے کی عادت تھی اسلیے بلج کی رائے اس نے مان لی اور لڑائی کا ارادہ کر کے بلج کو شامی سواروں کا سردار اور ہارون اور مغیث کو افریقی رسالوں کا افسر بنا کر اور شامی پیادہ فوج کو اپنی ماتحتی میں لے کر لڑائی شروع کر دی

لڑائی کی ابتدا بلج نے کی، وہ سمجھتا تھا کہ دشمن کی فوجیں جن کے پاس جنگی ساز و سامان کم ہے اُس کے سواروں کا مقابلہ نہ کر سکیں گی، لیکن دشمن نے سواروں کی زد سے بچنے کے لیے ایک عجیب ترکیب نکالی جو بہت ہی کارگر ثابت ہوئی، اور وہ یہ تھی کہ تھیلیوں میں کنکر پتھر بھر کر گھوڑوں کے منہ پر تاک تاک کر باری شروع کیں، یہ ترکیب چل گئی اور شامیوں کے گھوڑے چمک چمک کر ایسے بے قابو ہوئے کہ اکثر سوار زمین پر گر پڑے، اس کے بعد دشمن نے یہ کیا کہ نا کند گھوڑیوں پر پانی کی مشکیں لادیں اور بڑے بڑے تسمے اُن کی دموں میں باندھ کر دشمن کی طرف انھیں چھوڑ دیا، گھوڑیاں ڈر کر بالکل دیوانہ وار ہو کر بھاگیں اور فریق مخالف کی پیدل فوجوں میں سخت ابتری پڑ گئی، بلج سات ہزار سواروں کو لیکر دشمن پر حملہ آور ہوا، اس مرتبہ اس نے بربر کی بہنیں توڑ دیں، اور ایسا سخت دھاوا کیا کہ دشمن کی فوج کو چیرتا ہوا اُس کے عقب تک پہنچ گیا، مگر جب اس نے واپس ہونا چاہا تو بربر کی کچھ فوجوں نے اپنا رُخ اُس کی طرف کر کے اس کو روک دیا، اور کچھ فوجوں نے کلثوم کی پیادہ فوج پر ایسا سخت حملہ کیا کہ علیب، ہارون اور مغیث تینوں مارے گئے، افریقی عرب کچھ تو ان افسروں کے مارے جانے سے اور کچھ اس خیال سے کہ شامیوں سے پہلے ہی چشمک ہو گئی ہے میدان سے بھاگے، کلثوم اپنے شامی پیدلوں کیساتھ برابر دشمن کے مقابلے پر جمے رہے، ایک شخص کا چشم دید بیان تھا کہ جب کلثوم کے سر کا چمڑا ایک تلوار کی ضرب سے کٹ کر لٹک گیا تو انھوں نے نہایت اطمینان سے اُس چمڑے کو پھر اُس کی جگہ پر رکھ کر جما دیا، کلثوم دائیں

بائیں تلوار چلاتے اور ایسی آیاتِ قرآن پڑھتے جاتے تھے جن سے اُن کے ساتھیوں کی ہمت بڑھے، مثلاً "اللہ نے ایمان رکھنے والوں سے اُن کے مال اور اُن کی جان کو مول لے لیا ہے اور اُس کی قیمت میں اُنھیں جنت بخشی ہے"۔ "موت خدا کے حکم سے پہلے نہیں آسکتی، اُس کی زندگی کے دن پہلے سے لکھے ہوئے ہیں"۔ لیکن جب تمام شرفا و کبارِ عرب جو کلثوم کے ہمراہ لڑ رہے تھے، کام آگئے تو پھر کلثوم بھی زخموں سے چور ہو کر جاں بحق ہوئے، خلیفہ ہشام کے بھیجے ہوئے شامی لشکر کو بالکل شکست ہو گئی۔ بربر نے اس بیرحمی اور خونریزی کیساتھ تعاقب کیا کہ خود عربوں کا بیان ہے کہ ان کے لشکر کے ایک تہائی آدمی قتل اور ایک تہائی گرفتار ہو گئے

اس عرصہ میں بلج جو لشکر سے سات ہزار سوار علیحدہ لیے دشمن کے مقابلہ پر جما ہوا، شجاعت اور جوانمردی کے جوہر دکھلا رہا تھا، اُس نے بربر میں ایک قتل عام ڈال رکھا تھا، لیکن بربر کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اُن کو اس کی پروا ہی نہ تھی کہ اُن کے کتنے آدمی قتل ہوئے ہیں، اب دشمن کی وہ فوجیں بھی جو کلثوم کو شکست دے چکی تھیں بلج کی طرف جھکیں، قریب تھا کہ بلج اس بے شمار دشمن کے مقابلے میں بالکل نیست و نابود ہو جائے، اور اب صرف وہی صورتیں تھیں مر جانا یا بھاگنا؛ بلج نے اپنے ساتھیوں کے خیال سے اخیر صورت پسند کی، قیروان کی سمت میں فرار ممکن نہ تھا کیونکہ یہ راستہ جدھر سے کلثوم کے ہزیمت خوردہ لشکر کے افریقی و مصری عرب بھاگے تھے، بربر نے اب بند کر دیا تھا، لامحالہ اُس سے مخالف سمت میں یعنی طنجہ کیطرف بلج مع اپنے ساتھیوں کے چلا، بربر نے جو اب عربوں کے گھوڑے چھین کر پیدل سے سوار بن گئے تھے بلج کے تعاقب میں ذرا دم نہ لیا، آخر کار شامی رسالہ کسی طرح طنجہ پہنچ گیا، خستگی و ماندگی سے سب کی بُری کیفیت تھی، بلج نے بہت کوشش کی کہ طنجہ پر قبضہ کر کے اُس میں داخل ہو جائے، مگر جب یہ ممکن نہ ہوا تو سبتہ کی راہ لی، اور اس شہر پر قبضہ کر کے رسد جمع کرنی شروع کی، چونکہ علاقہ بہت زرخیز اور شاداب تھا۔ اس لیے غلہ جمع کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی مگر بربر بھی پیچھا کرتے کرتے سبتہ پہنچے، یہاں شہر کی صورت قلعہ کی سی تھی، فصیلیں اور مورچے رکھتا تھا، کسی قلعہ میں محصور دشمن کو فتح کرنا بربر کو آتا نہ تھا، بلج کے لوگ شہر کے دروازے بند کر کے اور زندگی سے مایوس ہو کر اپنی حفاظت میں کوشش کرنے لگے، الغرض بربر نے سمجھ لیا

کہ سبتہ حملہ کر کے تو فتح ہوگا نہیں۔ اس لیے محصور لوگوں کو بھوکا مارنا چاہیے، انھوں نے شہر میں غلہ کی آمد بالکل بند کر دی، اور سبتہ کے ہر طرف دو دو دن کی راہ تک کل علاقے کو ایسا برباد کیا کہ وہ جنگل معلوم ہونے لگا، اب شاہی سواروں کی یہ نوبت ہوئی کہ گھوڑے ذبح کر کے کھانے شروع کیے، جب یہ بھی ختم ہونے کو ہوئے تو اُن کو یقین ہو گیا کہ گر اسپین کے گورنر نے اس حالِ زار میں مدد نہ کی، جس کی درخواست انھوں نے بھیج رکھی تھی، تو پھر فاقوں سے مر جانے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔

اسناد:-

احمد ابن ابی یعقوب	ص ۶۹
ابن خلکان	اڈیشن وسٹن فلڈ) ص ۱۰ ص ۱۱۶
ابن خلدون	ص ۱۹۹، ۲۰۲ - تاریخ بربر، ج ۱ ص ۱۵۰-۱۵۱ (متن)
	تاریخ افریقہ (اڈیشن نوئل دی ورگس) ص ۱۰-۱۱ (متن)
ٹلیسیدرر	ص ۵۲ - ۶۳
ابن القوطیہ	ص ۶
اخبار مجموعہ	ص ۶۰ - ۶۴
ابن العذاری	پہلی جلد ۳۸ - ۴۴ دوسری جلد ص ۲۰

کتاب اوّل

خانہ جنگی

(۱۳۷) گیارھویں فصل

اسپین میں شامی اور مدنی عرب

اسپین میں جو عرب اس وقت تیس برس سے آباد تھے، وہ کسی حال میں گوارا نہ کر سکتے تھے کہ شامی عربوں کو جو اس وقت سبتہ میں محصور تھے جہاز بھیج کر اپنے ملک میں بلوالیں، شامی عربوں نے افریقہ میں افریقی عربوں کے ساتھ بہت بیہودہ برتاؤ کیا تھا اور اُن کو یہ بھی سنا دیا تھا کہ وہ مستقل طور پر افریقہ میں آباد ہونے والے ہیں، ان دونوں باتوں نے اسپینی عربوں کو ان خطروں سے ہوشیار کر دیا۔ جو ان شامیوں کو بحیرہ زقاق عبور کر کے اسپین میں داخلہ کی اجازت دینے سے پیدا ہو سکتے تھے، اسی بنا پر شامیوں کو اسپین سے مدد ملنے کی بہت کم امید رہ جاتی تھی لیکن جو بات اس امید کو قطعی منقطع کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ اس وقت اسپین میں مدینہ والے عربوں کا اثر اور اقتدار بہت بڑھا ہوا تھا۔

شامی عربوں کو مدنی عرب کافر سمجھتے تھے، ایک مدّت اُن سے مقابلہ رکھنے کے بعد مدینہ کے عربوں کو یہ دیکھنا پڑا کہ واقعہ حرّہ میں بزرگانِ اسلام یعنی انصار اور مہاجرین دونوں کی اولاد غارت

اور تباہ ہو جائے، مدینہ طیبہ کو لوٹا جائے، مسجد میں گھوڑے باندھے جائیں اور عورتوں کی بے حرمتی کی جائے، یہ وہ سانحہ تھا جس کے حالات پڑھ کر یورپ میں رومۃ الکبریٰ کی بربادی کا واقعہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، جبکہ بوربن حاکم میلان کے تندخو سپاہیوں اور چارج دُون فرینڈزبرگ امیر عساکر جرمانیہ کے خونخوار فوجیوں نے جو لوتھر کے نہایت متعصب پیرو تھے، اس مقدس اور متبرک شہر کو لوٹا تھا، لیکن واقعہ حرہ میں شامی عربوں نے ان ہی حرکتوں پر بس نہیں کی، بلکہ مدینہ والوں سے جبراً اس بات کی بیعت لی کہ وہ یزید کے غلام ہیں، اور غلام بھی ایسے کہ جب چاہے وہ اُن کو آزاد

لہ اس افسوسناک غارت گری میں رومہ کے مقدس مقامات کی بےحرمتی کی گئی، مرد و عورت، اسقف اور قسیس، پیرانہ سال راہبات، شریف بیبیاں اور شیر خوار بچے تک سپاہیوں کے جور و ظلم اور بے عزتیوں سے نہ بچ سکے، ان معصوموں کو وہ وہ تکلیفیں اور اذیتیں پہنچائی گئیں جن کو مورخ لکھتے ہیں کہ پہلے کسی نے سنا تک نہ تھا، مسیحی پر مسیحی کے جور و عذاب کی انتہا نہ رہی یہ حادثہ تھا جس کے بعد رومہ کو اپنی پہلی سی رونق اور اٹلی کو اپنی پہلی سی عزت پھر حاصل نہ ہوئی، غنیمت ہے کہ پروفیسر ڈوزی نے جن کی زبان درازیاں اور دل آزاریاں مسلمانوں کے حق میں حد سے گذری ہوئی ہیں، اس بات کو ضروری سمجھا کہ عیسائیوں کے ظلم و ستم اور وحشیانہ حرکتوں کی بھی ایک مثال پیش کر دیں، اس میں شک نہیں کہ ان دونوں واقعوں میں بہت سی باتیں مشابہ ہیں، واقعہ حرہ میں مسلمانوں نے مسلمانوں کے مقدس شہر کو اور وہاں کے واجب التعظیم باشندوں کو تباہ اور بے عزت کیا، اسی طرح واقعہ رومہ میں عیسائیوں نے جن میں بہت سے مقدس لوتھر کے پیرو تھے، عیسائیوں کے مقدس شہر کو لوٹا اور بڈھیا پارسا عورتوں تک کی بے عزتی کی، مگر ان دونوں واقعات میں ایک فرق بھی ہے، رومہ کی تباہی کا واقعہ ۱۵۲۷ء عیسوی کا ہے جبکہ یورپ کی موجودہ تہذیب سن بلوغ کو پہنچ چکی تھی، اسی تہذیب کے مجموعہ اخلاق کی کسوٹی پر یورپ کے مصنف ماضی و حال کے واقعات کا امتحان کر کے اپنی تجویزیں سنایا کرتے ہیں، واقعہ حرہ ۶۸۳ء عیسوی کا واقعہ ہے یعنی واقعہ رومہ سے قریباً آٹھ صدی پہلے کا جبکہ تہذیب بہت کم سن تھی، اس صورت میں جب سولھویں صدی میں یورپ کی تہذیب کے ایسے نمونے موجود ہوں تو پھر کس منہ سے اس قوم کا مضحکہ اڑایا جاتا ہے جس سے آٹھ سو برس پہلے اس قسم کی حرکتیں ظاہر ہوئی تھیں (مترجم)

کر دے اور جب چاہے فروخت کر ڈالے، پس انصار اور مہاجرین کی اولاد نے مدینہ کو ایسا خالی کیا کہ صحرا کے وحشی جانور وہاں پھرنے لگے، اس طرح وطن سے نکل کر افریقہ کی فوجوں میں بھرتی ہو گئے اور وہاں سے موسیٰ بن نصیر کے ساتھ اسپین میں آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی، ممکن ہے کہ اس نقل وطن میں مذہبی جذبات، جن میں غزور اور دنیوی فوائد حاصل کرنے کا خیال ہمیشہ شامل رہا، کچھ ٹھنڈے پڑ گئے ہوں، لیکن اُن کے دلوں میں اور اُن سے منتقل ہو کر اُن کی اولاد کے دلوں میں شامیوں کے ساتھ عداوت بدستور قائم رہی، اور اس بات کا کامل یقین رہا کہ صحابۂ رسول اللہ کی اولاد ہونے کا انھیں شرف حاصل ہے، اس لیے تمام سیاسی قوت اور اقتدار کے صرف وہی مستحق ہیں، چنانچہ ایک واقعہ اسی قسم کا اسپین میں پیش آیا، اکتوبر ۷۳۲ء عیسوی (شعبان ۱۱۴ھ) میں جب اسپین کے گورنر عبدالرحمان الغافقی فرانس کی مشہور لڑائی میں چارلس مارٹل کے مقابلہ میں شہید ہو گئے تو مدینہ والوں نے مشورہ کر کے عبدالملک بن قطن کو اُن کی جگہ اسپین کا امیر مقرر کر دیا، یہ عبدالملک مدنی فریق میں بہت سر برآوردہ مانے جاتے تھے، اور انچاس ۴۹ برس گذرے تھے کہ واقعہ حرہ میں شامیوں سے تیغ آزمائی کر چکے تھے، بہر حال کیا عیسائی اور کیا مسلمان سب یہی لکھتے ہیں کہ امیر ہونے کے بعد انھوں نے اسپین کے لوگوں کے ساتھ سخت بے انصافیاں کیں اور ملک پر بہت قہر اور جبر کے ساتھ حکومت کی جس وقت عامل افریقہ کو دوبارہ یہ اختیار ملا کہ حسب سابق اسپین کا گورنر وہی مقرر کیا کرتے[۱]، یعنی جس وقت عبیداللہ بن الحجاب افریقہ کے عامل مقرر ہوئے تو انھوں نے جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں عقبہ بن الحجاج السلولی کو اسپین کا امیر مقرر کیا، جس وقت یہ نیا گورنر اسپین میں پہنچا تو اس نے عبدالملک بن قطن کو قید میں ڈال دیا، اور مدنی فریق کے سرگروہوں کو جنھوں نے ملک کے امن میں اپنے فتنہ و فساد سے

لہ عبیداللہ بن الحجاب سے پہلے عبیدہ بن عبدالرحمن السلمی والی افریقہ تھے، انھوں کے آخر زمانہ میں اسپین کا عامل حسب قاعدہ اپنی طرف سے ہثیم کلابی کو مقرر کیا تھا، خلیفہ ہشام نے ہثیم کی شکایت سن کر اسے اسپین سے برطرف کر دیا پھر عبیدہ کو بھی افریقہ سے معزول کیا، اس زمانہ میں گویا افریقہ کے عامل کا یہ اختیار سلب ہو گیا تھا کہ وہ اسپین کا عامل مقرر کرے کیونکہ ہثیم کے بعد خود خلیفہ ہشام نے عبدالرحمن الغافقی کو عامل مقرر کرنے کا حکم دیا تھا (مترجم)

خلل ڈال رکھا تھا، گرفتار کر کے افریقہ روانہ کر دیا، لیکن اس سے مدینہ والوں کی ہمت میں کمی نہ ہوئی اور اس کے کچھ زمانہ بعد جب افریقہ میں بربر کی عظیم بغاوت نے عامل افریقہ کے اس اختیار کو کہ اسپین کا گورنر وہی مقرر کیا کرے، سلب کر لیا، تو اُس زمانہ میں اتفاق سے عقبہ بن الحجاج ایسا سخت بیمار پڑا کہ زیست کی توقع بالکل جاتی رہی، اب مدنی فریق نے یا تو اس کو سمجھا بجھا کر یا مجبور کر کے اُسی کی زبان سے عبد الملک بن قطن کو اس کا جانشین مقرر کرا دیا (صفر ۱۲۱ھ مطابق ربیع الاول ۱۲۳ھ) غرض یہی عبد الملک تھے جن کو بلج نے اس مضمون کی درخواست بھیجی تھی کہ اندلس سے جہاز بھیجے جائیں، تاکہ وہ اور اُسکے ساتھی جو سبتہ میں محصور ہیں اسپین میں چلے آئیں، لیکن اس قسم کی درخواست کو منظور کرنے کے لیے عبد الملک سے زیادہ غیر موزوں آدمی ملنا مشکل تھا، بلج نے اپنے خطوں میں بہت کوشش کی کہ کسی طرح عبد الملک کا دل نرم ہو جائے، یہاں تک لکھا کہ وہ اور اس کے متوسلین فاقوں سے مرے جاتے ہیں، اگر یہ بھی نہیں تو محض اسکا خیال کیا جائے کہ وہ اور عبد الملک دونوں عرب ہیں لیکن بڈھے عبد الملک کا ان لوگوں پر رحم کھانا تو شئے دیگر تھا وہ تو اس بات پر خدا کا شکر ادا کرنے لگا کہ نوے برس کی عمر میں اس نے یہ دن دکھایا کہ ایک پرانے دشمن سے بدلہ لینے کی مسرت حاصل ہو، کہنے لگا کہ یہ کم بخت اب اسی کے سبب فاقوں سے مر جائیں گے یہ اُن ملعونوں کی اولاد ہیں جنھوں نے حرّہ میں میرے دوستوں اور عزیزوں کو قتل کیا تھا، اور قریب تھا کہ مجھے بھی اپنی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں، کیا مدینہ طیبہ کو انھوں نے نہیں لوٹا؟ کیا روضہ اطہر کی بے حرمتی انھوں نے نہیں کی؟ ان باتوں پر بھی اُن خبیثوں کے لڑکے آج مجھ سے یہ خبط نامہ توقع رکھتے ہیں کہ انکی اس مصیبت کو دیکھ کر مجھ کو رحم آئے گا، اور ایک عرب کی منتقم طبیعت اُنکی اس حالت کو دیکھ کر ان کا قصور معاف کر دے گی اور ایک شامی کی تکلیفیں دیکھ کر ایک مدنی کو ترس آ جائیگا، غرض عبد الملک کی سب سے بڑی خواہش اور کوشش یہ تھی کہ کہیں ایسا نہ ہونے پائے کہ اسپین کا کوئی آدمی جسکو شامیوں سے کم عداوت ہو اُن کو کھانے پینے کا سامان پہنچا دے، اس بارے میں حد درجہ احتیاط مد نظر تھی، مگر باوجود اس کے بنی لخم کے ایک شریف آدمی نے عبد الملک کی نظر بچا کر دو جہاز غلے سے بھروا کر سبتہ پہنچوا دیے، عبد الملک کو جب معلوم ہوا تو اس فیاض لخمی کو گرفتار کر کے سات سو کوڑے اسکے لگوائے، اور پھر یہ الزام دے کر کہ لوگوں کو بغاوت پر اشتعال دیتا تھا اندھا (۱۳۹

کرا کے قتل کر ڈالا، لاش کو صلیب پر لٹکایا اور اُس کے ایک کتے کو مصلوب کیا، تاکہ ذلت میں کوئی کسر نہ رہ جائے

جب ہر طرف سے قطعی مایوس ہو کر شامی سمجھ رہے تھے کہ اب فاقوں سے مر جاتے ہیں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے، تو ایک عجیب واقعہ جسکا پہلے سے کسی کو گمان تک نہ ہو سکتا تھا ایسا پیش آیا کہ عبدالملک بن قطن کو شامیوں کے بارے میں اپنی ظالمانہ پالیسی بدلنی پڑی

بربر جو اسپین میں آباد ہو گئے تھے گو عربوں کی طرف سے بظاہر ان پر کوئی سختی نہ تھی لیکن اُن کے دلوں میں عربوں کی جانب سے وہی تعصّب اور حسد بھرا ہوا تھا جو افریقہ میں اُنکے بھائی بندوں کے دل میں تھا، اسپین کے فتح کرنے والے دراصل یہی بربر تھے یہ طارق اور اس کے بارہ ہزار بربر سپاہی تھے جنھوں نے قوطیوں کے لشکر پر فتح حاصل کی تھی، لیکن اس فتح کے جتنے پھل تھے اُن کو موسیٰ اور اس کے عربوں نے سمیٹ لیا تھا، خود عربوں نے جس دن سے اسپین میں قدم رکھا تھا، سوائے اس کے کچھ نہ کیا تھا کہ جن شہروں نے وشک جیتے ہی اطاعت قبول کر لی اُن پر تصرف کر لیا، اور پھر جب فتوحات کی نعمتوں کے تقسیم ہونے کا وقت آیا تو حصہ غالب موسیٰ اور اس کے عربوں کو ملا، مالِ غنیمت کا بھی بڑا حصہ اُنھی نے لیا، اور اسپین کے بہترین علاقے بھی حکومت کرنے کے لیے انھی کو ملے، چنانچہ اندلوسیہ[1] کا حسین، شاداب اور وسیع علاقہ انھوں نے اپنے پاس رکھا اور طارق کے لوگوں کو لامنشا[2]، استرمیدورا[3] کے علاقے بالیون، جلیقیہ، اور اشتوریاس کے سرد و بے آب و گیاہ پہاڑ رہنے کے لیے دیدیے، جہاں اُن عیسائیوں سے ہمیشہ دست و گریبان رہنا پڑتا تھا جو پورے طور پر مطیع نہ ہوئے تھے، عربوں کو گو خود دوسروں کے مالی حقوق کا لحاظ نہ تھا، لیکن اگر بربر سے اس بارے میں کوئی فروگذاشت ہوتی تھی تو اُن کو سخت سزا دیتے تھے، ایک مرتبہ جب ان بربروں نے چند عیسائیوں سے جنھوں نے چند شرائط کیساتھ اپنے تئیں

---

[1] اندلوسیہ سے مراد عربوں کے صوبجات اشبیلیہ، قرطبہ، قادس، جیان، غرناطہ اور المیریہ ہیں۔ پورے اندلس سے مراد نہیں ہے۔ مترجم

[2] عربوں کے علاقہ قلعہ رباح کا ایک حصہ سمجھنا چاہیے۔ مترجم

[3] عربوں کے علاقہ بطلیوس، قاصرش، اور اس کے قرب و جوار سے مراد ہے۔ مترجم

مسلمانوں کے حوالے کر دیا تھا، زرِ فدیہ طلب کیا، تو عربوں نے پہلے تو ان کے دوستوں کو کوڑے لگائے، پھر ان بربر کو پابہ زنجیر کر کے ایسے قید خانوں میں ڈال دیا جہاں کی آب و ہوا غلیظ اور مسموم تھی، اور ان قیدیوں کے بدن پر کپڑوں کی جگہ چیتھڑوں رہ گئے جن میں جوئیں بھری ہوئی تھیں۔

علاوہ بریں اسپین کے معاملات کو افریقہ سے اس قدر قریب کا تعلق تھا کہ بحر زقاق کے اس پار جو حادثہ پیش آتا تھا، اُس کی صدائے بازگشت اس پار بھی پہنچ جاتی تھی، بربر کے چار معزز سرداروں میں سے جو طارق کے ساتھ اسپین میں آئے تھے ایک سردار نے جس کا نام منوسا ابی نسعہ لکھا ہے سرطانیہ[1] میں علمِ بغاوت بلند کیا[2]، اور فرانس کے علاقہ اکوتانیہ کے حاکم یودس نے جس کی بیٹی سے اس بربر سردار نے اپنا عقد کر لیا تھا اسکو مدد پہنچائی، اس موقع پر جبکہ افریقہ میں بربر نے بڑے پیمانہ پر بغاوت کی تو اس کا اثر اسپین میں بے انتہا ہوا، اس ملک میں جس وقت افریقہ سے خوارج نہ صرف داعیانِ مذہب کی حیثیت سے بلکہ اس غرض سے آئے کہ عربوں کے نیست و نابود کرنے پر بربر کو مشتعل کریں تو اسپین کے بربر ہاتھ پھیلا کر اُن سے گلے ملے۔

اب اسپین میں عربوں کی حالت ایسی نازک اور خطرناک ہوگئی کہ عبدالملک کو اپنی طبیعت کے خلاف بالکل مجبور ہو کر اُن ہی شامیوں سے مدد مانگنے کی ضرورت ہوئی جنکو اُس نے نہایت بیدردی کیساتھ مصیبت میں چھوڑ رکھا تھا، لیکن اس حال میں بھی احتیاط کو ملحوظ رکھا، اور اس شرط سے اُن کے پاس جہاز بھیجنے کا وعدہ کیا کہ اسپین میں بربر کی بغاوت فرو کرنے کے بعد وہ اس ملک سے چلے جائیں گے، اور اس زمانۂ قیام کے لیے وہ اپنی جماعت سے دس فوجی سردار عبدالملک کے سپرد کریں گے جو ایک جزیرہ میں اس غرض سے نظر بند رکھے جائیں گے تاکہ عہدنامہ کی شرائط پوری کی جائیں، شامیوں نے یہ شرطیں منظور کیں اور اپنی طرف سے یہ شرائط پیش کیں

[1] شمالی اسپین میں البرانس کے پہاڑی سلسلے میں صوبہ لاردہ کے شمال میں یہ ایک کوہی علاقہ تھا، اس میں ایک درہ تھا جس سے اسپین سے فرانس میں جانے کا راستہ تھا (مترجم)

[2] عیسائی مورخ ایسی ودور نے اس بغاوت کو عبدالرحمن بن عبداللہ الغافقی امیر اندلس کے زمانہ کا واقعہ لکھا ہے اور عربی مورخ اسکو ہیثم بن عبید کلابی کے زمانہ کا لکھتے ہیں جو الغافقی سے پہلے امیر اندلس تھا۔

کہ جس وقت وہ اندلس سے واپس کیے جائیں تو اُن کی پوری جماعت ایک ہی وقت میں واپس
کی جائے، اس کے علیحدہ علیحدہ حصے نہ کیے جائیں اور افریقہ میں جہاں وہ جہاز سے اتارے
جائیں وہ ایسا مقام نہ ہو جہاں بربر کی حکومت ہو۔

غرض جانبین سے جب یہ شرائط منظور کر لی گئیں تو شامی سبتہ سے جہازوں پر سوار ہو کر
جزیرۃ الخضرا میں اترے، فاقوں نے سب کا بڑا درجہ کر رکھا تھا، بدن پر کپڑے پھٹ کر پرزے
پرزے ہو گئے تھے، اسپین کے عربوں نے یہ حالِ زار دیکھ کر قومی ہمدردی سے فوراً اُن کے کھانے
پینے اور کپڑوں کا انتظام کیا، ہر طرح سے اُن کی خاطر و تواضع میں مصروف ہوئے، او دولتمندوں نے (۱۴۱)
سَو سَو کے لیے اور ان سے کم حیثیت والوں نے دس دس، اور بعض نے صرف ایک ایک
شامی کیلئے کپڑے تیار کرائے، چونکہ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ بربر کا لشکر جو جزیرۃ الخضرا
کے قصد سے اس وقت مدینہ شذونہ تک پہنچ گیا تھا اس کو آگے بڑھنے سے روکا جائے اسلیے
بلج کی شامی سپاہ نے جس کیساتھ اسپین کے عربی سواروں کی بھی ایک جماعت ہو گئی تھی، بربر
کے اس لشکر پر حملہ کر دیا، اور اپنی پرانی شجاعت اور مردانگی کیساتھ لڑکر بربر کو پسپا کیا اور اُن کا تمام
مال و اسباب چھین لیا مالِ غنیمت خوب ہاتھ آیا، بربر کا دوسرا لشکر جو قرطبہ پر حملے کی غرض سے
آیا ہوا تھا، اُس نے شامیوں سے اپنے تیں بچانے میں بڑی کوشش کی اور عربوں کو بہت
نقصان پہنچایا، لیکن آخر کار ان کو بھی مجبور ہو کر پیچھے ہٹنا پڑا۔ اب رہا بربر کا تیسرا لشکر جس کی تعداد
سب سے زیادہ تھی اور جو طلیطلہ کا ستائیس یوم سے محاصرہ کیئے ہوئے تھا، یہ شامیوں کے مقابلہ
کو بڑھا اور وادی سلیط کے کنارے فریقین میں سخت لڑائی ہوئی اور اس میں بربر کو قطعی شکست
ہو گئی، اب عربوں اور شامیوں نے بربر کا اس طرح پیچھا کیا جیسے شکاری لوگ درندوں کا تعاقب
کرتے ہیں، غرض ان لڑائیوں سے بلج کے لوگ جو کل فقیر تھے آج انھوں نے مالِ غنیمت اتنا جمع
کر لیا اور ایسے متمول ہو گیے کہ اس سے پہلے یہ حالت اُنکے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی

غرض اس جری و جانباز لشکرِ شام کی بدولت بربر کی بغاوت جو ایک طوفان بلاخیز کی طرح
اُٹھی تھی، ایسی فرو ہوئی جیسے کوئی ساحر جادو کے عمل سے کسی بلا کو دور کر دے، اب عبدالملک بن
قطن نے یہ دیکھ کر کہ ایک دشمن یعنی بربر سے تو نجات ملی، کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیے کہ اس دوسرے

دشمن یعنی شامیوں سے بھی گلو خلاصی ہو جنھوں نے فی الواقع اس خطرناک موقع پر مدد کی تھی، مگر
جن کیساتھ دشمنی رکھنے کے علاوہ عبدالملک کو ان کی طرف سے خوف بھی ہوتا جاتا تھا چنانچہ
اب اس نے فوراً بلج کو عہدنامہ کی شرائط یاد دلائیں، اور اصرار کیا کہ وہ مع اپنے لشکر کے اسپین
سے چلا جائے، لیکن بلج اور بلج کے لوگ اب اس ملک کو واپس جانا نہیں چاہتے تھے جہاں
کی سختیاں اور مصیبتیں اُن کو اب تک یاد تھیں، اسپین ایک سرسبز اور شاداب ملک تھا جہاں
انھوں نے فتوحات حاصل کی تھیں، اور جہاں دولت بھی بکثرت اُن کو ملی تھی، اب اس ملک سے
ایک اُنس اُن کو پیدا ہو گیا تھا جب یہ صورت پیش ہو تو ظاہر ہے کہ وہ موروثی دشمنوں میں جبکہ
حالاتِ وقت نے ان کے مقاصد کو بھی ایک دوسرے کی ضد بنا دیا، نزاع کا برپا ہو جاتا
ایک قدرتی امر تھا۔

چونکہ عداوت اچھی مشیر و صلاح کار نہیں ہوتی عبدالملک نے معاملات کی صورت کو بھی اور بگاڑ
دیا، پرانے زخم پھر ہرے ہو گئے اور وہ اس طرح کہ شامیوں کی پوری جماعت کو ایک ساتھ
افریقہ پہنچانے سے اس بنا پر انکار کر دیا گیا کہ اب اُن کے پاس گھوڑے اور غلام بکثرت ہو گئے
ہیں، اور ان کا ساز و سامان بھی اتنا بڑھ گیا ہے کہ ان سب کی بار برداری کیلئے جہاز کافی نہیں
ہیں، لہٰذا عہدنامہ کی یہ شرط اب پوری نہیں کی جا سکتی، اس کے علاوہ جب شامیوں نے یہ خواہش
ظاہر کی کہ وہ صوبہ البیرہ (غرناطہ) یا صوبہ تدمیر (مرسیہ) کے ساحل سے جہازوں میں سوار ہونا چاہتے
ہیں، تو عبدالملک نے کہا کہ یہ کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ جہازوں کا بیڑا جزیرۃ الخضرا کے ساحل (۱۴۴)
پر رہتا ہے، اگر وہاں سے جہاز ہٹائے گئے تو اندیشہ ہے کہ بربر جزیرۃ الخضراء پر چڑھائی کر
دیں گے، غرض نوبت یہاں جا رسید کہ عبدالملک کے دل میں جو کینہ بھرا ہوا تھا، اب وہ اس
کو چھپا بھی نہ سکا، اور صاف کہہ دیا کہ شامیوں کو جہاز پر سوار ہو کر سبتہ ہی واپس جانا پڑے گا جو
اقرار نامہ کی شرائط کے بالکل خلاف تھا۔

اتنا سنتے ہی شامیوں میں سخت برہمی پیدا ہوئی اور بلج کہنے لگا کہ "بربر طنجہ کے حوالے
کرنے سے تو یہی بہتر ہو کہ ہم کو سمندر میں ڈبو دیا جائے۔ بلج نے اب امیر اندلس کو نہایت
سخت و سست کہنا شروع کیا، اور کہا کہ "عبدالملک کو سبتہ ہی میں فاقوں سے مرجانے کے لیے

چھوڑنے والا تھا، اور اس فیاض لخمی کو بھی جس نے ہم کو کھانے پینے کی چیزیں بھیجی تھیں، صلیب پر لٹکا چکا تھا" سخت کلامی کے بعد نوبت تلوار کی آگئی، عبدالملک اِس وقت قرطبہ میں تھا، حفاظت کے لیے شہر میں اِس وقت فوج بہت کم تھی، شامیوں کو موقع ملا اور انہوں نے عبدالملک کو قصرِ امارت سے باہر نکالکر بلج بن بشر القشیری کو امیرِ اندلس مقرر کر دیا (۲۰ ستمبر ۷۴۱ء)

چونکہ اب خون گرم ہو چکا تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ شامی اسی حد تک بس کرتے، اور لوگوں کا یہ خوف کہ شامی اِس سے بھی زیادہ بدلہ لینے والے ہیں صحیح ثابت ہوا، بلج نے امیر ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ حسبِ شرائط نامہ جو قومی سردار بطورِ یرغمال حراست میں لیے گئے تھے، اور جن کو جزیرۃ الخضراء کے سامنے ایک چھوٹے سے جزیرہ میں جس کا نام اُم حکیم تھا، نظر بند کیا گیا تھا، اُن کو قید سے رہا کر دیا، یہ سردار جب قرطبہ میں پہنچے تو اُنہوں نے شکایت کی کہ حاکم جزیرۃ الخضراء نے عبدالملک کے اشارے سے اُن کو کھانا اور پانی بہت کم دیا، اور اُن میں ایک سردار جو قبیلہ یمانیہ سے بنی غسان کا ایک رکن اور شرفائے دمشق سے تھا، شدتِ تشنگی سے مرگیا،

جب اُن لوگوں نے یہ حالات بیان کیے اور ایک معزز سردار کی موت کا واقعہ سُنایا تو پھر عبدالملک پر شامیوں کے غیظ و غضب کی کوئی انتہا نہ رہی، اور وہ کہنے لگے کہ "عبدالملک نے عہد شکنی کی ہے، اب ہم اُس کا خون مباح کرتے ہیں"

جن شامیوں نے عبدالملک کے قتل کرنے کی نیت ظاہر کی تھی، بلج کو اُن سے اتفاق نہ تھا، اُس نے لوگوں کا غصہ یہ کہہ کر فرو کرنا چاہا کہ "غسانی کی موت ایک اتفاقیہ غفلت کی وجہ سے پیش آئی تھی، عمداً یا کسی پیش بندی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا، لوگو! عبدالملک کی جان کا پاس و لحاظ کرو وہ قرشی ہے، اس کے علاوہ بہت ضعیف آدمی ہے" لیکن بلج کی فریاد کون سنتا تھا، قبیلہ یمانیہ کے لوگ اپنے عزیز غسانی کے خون کا بدلہ لینے کو تیار ہو گئے، اور اُن کو یہ بدگمانی ہوئی کہ بلج، عبدالملک کی جان اس لیے بچانی چاہتا ہے کہ دونوں آلِ معد سے ہیں، غرض بلج کے لوگوں نے عبدالملک کے قتل پر اصرار شروع کیا، بلج بھی دیگر اُمرائے ملک کی طرح اپنے منصب امارت پر اُسی وقت تک سلامت رہ سکتا تھا جب تک کہ وہ اپنے لشکر والوں کی خواہشوں اور مطالبوں کو پورا کرتا رہے، اس لیے بلج ان شامیوں کے شور و غوغا کو نہ روک سکا، اور مجبور ہوا کہ

اُس کے لشکر والے عبدالملک کو قرطبہ میں اُس کے مکان سے جہاں منصب امارت سے علیحدہ ہونے کے بعد اُس نے سکونت اختیار کی، گرفتار کریں،

(۱۴) غصہ میں مجنون تو ہو ہی رہے تھے، شامی عبدالملک کو جس کی عمر اس وقت ۹۰ برس کے قریب تھی اور جو سفید بالوں کی وجہ سے بقول مورخین حفتان (بچہ شتر مرغ) معلوم ہوتے تھے، گھسیٹتے ہوئے باہر لائے اور وہاں کہنا شروع کیا کہ "حرہ میں ہماری تلواروں سے تم بچ گئے تھے، وہاں تم کو شکست ہوئی تھی، اُس کا بدلہ تم نے اب اس طرح نکالا کہ ہم کو جانوروں کی کھالیں اور کتوں کا گوشت کھانا پڑا، تم نے تو ہم کو جو امیر المومنین ہشام کے لشکری تھے، دھوکا دیکر دشمن کے حوالے کر دیا ہوتا، یا ہم کو بربر کے ہاتھ بیچ ڈالا ہوتا" یہ کہہ کر وہ عبدالملک کو دریا کے پل کے قریب لائے اور تلواروں سے اُن کو ہلاک کر دیا اور اُن کی لاش کو صلیب پر چڑھا دیا، اور لاش کے دائیں طرف ایک کتے کو اور بائیں طرف ایک خنزیر کو لٹکایا،

ایسے ظالمانہ قتل اور ایسی تنفر انگیز سزا پر صدائے انتقام کا بلند ہونا لازمی تھا جنگ شروع ہو گئی اور اب تلوار ہی اس بات کا فیصلہ کرے گی کہ جو عرب فتح اول کے وقت اسپین میں آئے تھے یعنی مَدَنی، ملک کے مالک رہیں یا جو عرب اس وقت اسپین میں آئے ہیں یعنی شامی، وہ ملک پر حکومت کریں[۱]

اب عبدالملک کے دونوں بیٹے اُمیّہ اور قطن مدینہ والوں کے سرگروہ بنے، باپ کی معزولی پر ان میں سے ایک نے سرقسطہ میں اور دوسرے نے ماردہ میں پناہ لی تھی، بربر بھی جو پہلے عبدالملک کے دشمن تھے، اب عبدالملک کے لڑکوں کے ساتھ اس نیت سے ہو گئے کہ اندلس کے عربوں سے بعد کو سمجھ لیں گے پہلے ان شامیوں سے تو بدلہ نکال لیں، ان بربر کے علاوہ فرانس کے علاقہ اربونہ کا گورنر عبدالرحمن بن علقمہ لخمی اور لشکر افریقیہ کے امیر حبیب الفہری کا فرزند عبدالرحمان، دونوں مدینہ والوں کے مددگار ہو گئے، افریقیہ میں بربر کی بغاوت میں بربر سے سخت شکست کھانے کے بعد جس میں عبدالرحمن کا باپ الفہری مارا گیا تھا، عبدالرحمن شامیوں کے داخلہ سے کچھ پہلے اسپین میں چلا آیا تھا، بلج سے اس کا پہلے ہی جھگڑا ہو چکا تھا، اور اب وہ بلج کا جانی دشمن تھا

[۱] شامی عرب جو بلج کے ساتھ اندلس میں آئے تھے اُن کو اہل اندلس شامی کہتے تھے اور اُن سے پہلے آئے ہوئے عرب مدینین کہلاتے تھے،

اسپین میں آتے ہی عبدالملک سے تمام وہ سختیاں اور زیادتیاں جو بلج کے لشکر والوں نے افریقیہ کے عربوں پر کی تھیں، بیان کیں، اُن کو سن کر عبدالملک اور بھی شامیوں کا دشمن ہوگیا تھا، عبدالرحمٰن بن حبیب ہی نے عبدالملک کے اس ارادہ کو مصمم کیا تھا کہ شامیوں کو جہاز نہ بھیجے جائیں، اور سبتہ ہی میں اُن کو فاقوں سے مرنے دینا چاہئیے، جب عبدالملک قتل کردیئے گئے تو عبدالرحمٰن بن حبیب نے اس وقت یہ بھی سوچا کہ عبدالملک کو شامیوں نے قتل کیا ہے، اور عبدالملک اُسی کی قوم کے ایک بزرگ تھے، اس لیے اُن کے خون کا بدلہ لینا بھی ضروری ہے، عبدالرحمٰن کے دل میں کسی دن اندلس کی حکومت مل جانے کا بھی ارمان تھا، کیونکہ عربوں میں وہ ایک ممتاز خاندان کا آدمی تھا،

غرض عبدالملک کے لڑکوں کے ساتھ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ چالیس ہزار اور بعض کہتے ہیں کہ ایک لاکھ کی جمعیت ہوگئی، بلج بارہ ہزار سے زیادہ آدمی میدان میں نہ لاسکا، اور ان میں بہت سے لوگ لشکرِ شام کے وہ شامل تھے جو وطن جانے کی کوشش میں ناکام رہ کر بحرِ زقاق کو دوبارہ عبور کرکے پھر اندلس میں چلے آئے تھے، بلج نے لشکر کی تعداد بڑھانے کے لیے بہت سے عیسائی غلاموں کو (۱۴۴
بھی ساتھ لے لیا تھا، یہ غلام بربر اور عرب کی زمینوں کو کاشت کیا کرتے تھے، اب بلج اس پورے لشکر کو لے کر ایک گاؤں کے قریب جس کا نام اقوہ برطورہ تھا، دشمن کا منتظر ہوگیا،

اگست ۷۴۲ء مطابق شوال ۱۲۵ھ میں ایک لڑائی ہوئی، شامی اس ہمت اور دلیری سے لڑے کہ حریفِ مقابل کو پیچھے ہٹنا پڑا، حاکمِ اربونہ عبدالرحمٰن بن علقمہ لخمی نے جو اسپین کے مسلمانوں میں شجاعت و شہسواری میں سب سے زیادہ مشہور تھا، یہ سوچا کہ اس لڑائی کا فیصلہ جلد صرف اسی حالت میں ہوسکتا ہے کہ دشمن کے سردار کو قتل کردیا جائے، چنانچہ اُس نے اپنی فوج والوں سے کہا:
"بتاؤ بلج کہاں ہے؟ واللہ! یا تو میں آج اُسے قتل کروں گا یا خود قتل ہوجاؤں گا" لوگوں نے بتایا کہ وہ سامنے بلج سپید گھوڑے پر سوار ہاتھ میں عَلَم لیے کھڑا ہے، ابن علقمہ نے بلج کو دیکھتے ہی اپنے سرحدی سواروں کے ساتھ اس شدت کا حملہ کیا کہ شامی پیچھے ہٹ گئے، دوسرے حملے میں ابن علقمہ نے ایک تلوار بلج کے سر پر ماری، بلج زخمی ہوا، لیکن اتنے ہی میں قنسرین کی فوج والوں نے ابن علقمہ پر اس زور کا حملہ کیا کہ اس کو پسپا ہونا پڑا، اُس کے پسپا ہوتے ہی فوج میں بھاگڑ مچ گئی، اور سخت قتلِ عام برپا ہوا، پسرانِ عبدالملک کے لشکر کے دس ہزار، اور

شامیوں کی فوج کے ایک ہزار آدمی اس معرکہ میں کام آئے، شامی یہ فتح حاصل کر کے پھر قرطبہ میں داخل ہوئے،

بلج کا زخم مہلک ثابت ہوا اور وہ چند روز کے بعد مر گیا، اُس کے مرنے پر شامیوں نے ثعلبہ بن سلامہ الجذامی (عاملی) کو خلیفہ ہشام کے سابقہ حکم کے مطابق کہ اگر بلج لڑائی میں کام آجائے تو ثعلبہ اُس کا جانشین ہو، امیر اندلس مقرر کر دیا، اب مدینہ والوں کو اور بھی زیادہ خوف ہوا، کم سے کم بلج کوشش تو کرتا تھا گو کامیابی نہ ہوتی تھی کہ شامیوں کو کشت و خون سے روکے، لیکن اُس کے جانشین ثعلبہ نے یہ بھی نہ کیا، اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ شامی لشکر میں اپنا رسوخ بڑھانے کے لیے لشکر کو وہ بالکل آزاد رکھنا چاہتا تھا، یا رات کے وقت اُس کو کسی منحوس پرندے کی آواز "اسقونی اسقونی" چلاتی ہوئی سنائی دیتی تھی، جس کے معنی یہ تھے کہ مدینہ والوں سے ثعلبہ کو اپنے کسی قریب کے عزیز غالباً اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینا باقی ہے، بہر کیف یہ جو کچھ ہو مگر اس میں کلام نہیں کہ ثعلبہ کے اس قصد سے کہ مدینہ والوں پر کسی قسم کا رحم نہ کیا جائے، وہ سپاہِ شام میں بہت محبوب ہو گیا، اور لوگ بلج سے بھی زیادہ اُس کو عزیز رکھنے لگے،

لیکن ثعلبہ نے ایک معرکہ نحس ساعت میں شروع کیا، بربر اور اعرابِ اندلس کی ایک زبردست جماعت اس وقت ماردہ کے قریب جمع ہو گئی، ثعلبہ نے اس پر حملہ کیا مگر شکست کھائی اور پسپا (۱۲۵
ہو کر ماردہ کے شہر میں جو اس علاقہ کا صدر مقام تھا، پناہ لینی پڑی، دشمن نے فوراً شہر کا محاصرہ کر لیا، اور ثعلبہ کی حالت جلد خطرناک ہو گئی، قرطبہ میں اپنے نائب کو لکھا کہ جس قدر فوج فراہم ہو سکے سب کو ساتھ لے کر مدد کو آئے، قسمت یاور تھی، اتفاق سے جلد ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اس خطرہ سے فوراً نجات ہو گئی، دورانِ حصار میں عید کا دن آیا، بربر اور عرب جو شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اِدھر اُدھر متفرق ہو گئے، کسی کو اتنا خیال نہ آیا تھا کہ اگر کوئی بات اچانک پیش آجائے تو اُس کے روکنے کے لیے کوئی علاج موجود ہو، اُن کی اس بے احتیاطی اور غفلت سے ثعلبہ کو فائدہ پہنچ گیا، دفعتاً شہر سے نکلا اور حالتِ بے خبری میں عرب اور بربر پر حملہ کر کے قتلِ عام شروع کر دیا اور ایک ہزار مردوں کو قید کر کے باقی کو مجبور کیا کہ بھاگ کر اپنی جانیں بچائیں، ان قیدیوں اور فراریوں کے اہل و عیال جس قدر وہاں تھے، اُن کو بھی لونڈی غلام بنانے کے لیے گرفتار کر لیا،

اس قسم کے ظلم کی اب تک کوئی نظیر نہ تھی، شامیوں نے بھی اس زیادتی کو روا نہ رکھا تھا کہ عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنایا جائے، بلج کے زمانۂ امارت میں شامیوں نے اس قدیم دستور کا جو اہل بادیہ میں اب تک چلا آتا ہے پورا لحاظ کیا تھا کہ (خانہ جنگیوں میں) دشمن کی عورتوں اور بچوں کو ہمیشہ آزاد کر دیا جائے بلکہ اُن کی خاطر و مدارات کی جائے، لیکن ثعلبہ کو اس کی پروا نہ ہوئی، ثعلبہ اپنے دس ہزار قیدیوں کو ساتھ لیے قرطبہ کی طرف روانہ ہوا، اور جب شہر کے قریب مصارہ کے میدان میں پہنچا تو خیمے نصب کرائے، اور یہاں ایک دن جمعہ کو (مئی ۷۴۳ء مطابق رجب ۱۲۶ھ) حکم دیا کہ جس قدر قیدی ساتھ آئے ہیں اُن سب کو فروخت کر دیا جائے، مدینہ والوں کے غرور کو توڑنے کے لیے جن میں اکثر کا شمار اس وقت قیدیوں میں تھا، شامیوں نے ظالمانہ ظرافت کی نیت سے اس بات پر باہمی اتفاق کیا کہ کوئی قیدی ایسے خریدار کے ہاتھ نہ بیچا جائے جو سب سے زیادہ قیمت دے، بلکہ ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کیا جائے، جو سب سے کم قیمت پیش کرے، چنانچہ مدینہ کے ایک شخص کو جب بیچنے لگے تو جس خریدار نے قیمت میں دس دینار لگائے تھے اُس کے ہاتھ قیدی کو نہ بیچا، بلکہ جس نے قیمت میں ایک کتا پیش کیا تھا، اُس سے سودا کر لیا، اسی طرح ایک دوسرے مدنی کو ایک بکری کے عوض میں بیچ ڈالا، اور اسی قماش کی اور حرکتیں کرتے رہے، کبھی پہلے اس طرح کی توہین و تذلیل اکابر اسلام کی اولاد کی نہیں ہوئی تھی، مدینہ طیبہ کے محاصرہ میں بھی ایسے حالات پیش نہ آئے تھے، غرض ظلم و ستم کی یہ گرم بازاری ہو رہی تھی کہ ایک واقعہ ایسا ظہور میں آیا جس کو ثعلبہ اور اس کے ظالم جفا کار ساتھی پہلے سے نہ دیکھ سکے تھے،

جانبین میں ایسے لوگ موجود تھے جو طبیعتوں میں اعتدال رکھتے تھے، ہر چیز کا انجام سوچ سکتے تھے، خانہ جنگیوں سے جو آفات نازل ہوتی تھیں اُن کو چپ چاپ برداشت کر کے فریقین کی زیادتیوں اور ناروا حرکتوں پر دل ہی دل میں غصہ کھاتے تھے، اور ہر وقت یہ خوف دل میں رہتا تھا کہ مبادا مسلمانوں کے باہمی نزاع کو دیکھ کر شمال کے عیسائی اپنی سرحدوں کو بڑھاتے بڑھاتے کہیں مسلمانوں کے مقبوضہ ملک کو اپنے تصرف میں نہ لے آئیں، پس اس فکر و تشویش میں ان لوگوں نے امیر افریقیہ حنظلہ بن صفوان الکلبی سے خط و کتابت شروع کر کے درخواست کر رکھی تھی کہ کسی ایسے شخص کو

والئ اندلس مقرر کر کے بھیجا جائے جو ملک میں امن و امان پیدا کرنے کی لیاقت رکھتا ہو حنظلہ نے اس درخواست پر ابوالخطار حسام بن ضرار الکلبی کو امیرِ اندلس مقرر کر کے روانہ کیا، اور اب ابوالخطار اندلس میں داخل ہو کر قرطبہ کے قریب مصارہ کے میدان میں اُس وقت پہنچتا ہے جب کہ شامی اندلس کے عربوں کو کتوں اور بکریوں کے عوض میں بیچ رہے تھے۱؎ پہنچتے ہی اپنی امارت کا پروانہ جو امیرِ (۱۴۶ افریقیہ نے دیا تھا سب کو دکھایا، چونکہ یہ نوارد گورنر دمشق کے رؤسا میں سے تھا، اس لیے شامیوں کو مجال نہ ہوئی کہ اُس کی امارت سے انکار کرتے، اندلس کے عربوں نے ابوالخطار کا آنا اپنے حق میں مبارک سمجھا، کیونکہ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اُن دس ہزار قیدیوں کو جن کا نیلام ہو رہا تھا فوراً آزاد کر دیا، اور پھر بہت احتیاط اور حُسنِ تدبیر سے ملک میں امن و امان قائم کیا، پسرانِ عبدالملک یعنی اُمیّہ اور قطن اور اُن کے ہمراہیوں کو بجز عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری کے معافی دی، عبدالرحمٰن اس موقع پر کسی نہ کسی طرح ساحل پر پہنچ گیا اور وہاں سے جہاز پر سوار ہو کر افریقیہ چلا آیا، جہاں آئندہ زمانہ میں اُس کو بڑی شہرت اور ناموری حاصل ہوئی، امیرِ افریقیہ حنظلہ کے حکم سے اب بارہ سردار جو مفسد اور فتنہ پرداز سمجھے جاتے تھے اور جن میں ثعلبہ بھی شامل تھا اسپین سے نکال دیئے گئے، اس بنا پر کہ "وہ امنِ خلائق میں فتور پیدا کرتے ہیں، لیکن چونکہ وہ بہادر اور شجاع ہیں اس لیے بہترین بات اُن کے لیے یہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے جوہر دکھانے کے لیے افریقیہ میں جا کر بربر سے مقابلہ کریں۔" چونکہ اس وقت سب سے ضروری امر یہ تھا کہ دارالامارت یعنی شہر قرطبہ کو شامیوں سے خالی کرا لیا جائے اس امیرِ افریقیہ نے ان لوگوں کو سرکاری زمینیں بطور ہوائی جاگیروں کے عطا کیں، اور جو کاشت کار ان زمینوں پر کام کرتے تھے اُن کو حکم دیا کہ فصل کا ایک تہائی حصہ جو اب تک وہ سرکار میں داخل کرتے تھے آئندہ ان جاگیرداروں کو ادا کیا کریں، چنانچہ اس طرح اراضی تفویض کر کے

(۱) لشکرِ مصر کے لوگوں کو اخشنبہ، باجہ، اور تدمیر کے علاقوں میں

(۲) لشکرِ فلسطین کے لوگوں کو مدینہ شذونہ، اور جزیرۃ الخضراء کے علاقوں میں

(۳) لشکرِ اردن کے لوگوں کو علاقہ ریّہ (مالقہ) میں

۱؎ نخض ایک واقعہ کو قضیۂ کلیۂ بنالیا ہے، دیکھو "اخبار مجموعہ" (مترجم)

(۴) لشکرِ دمشق کے لوگوں کو علاقہ البیرہ (غرناطہ) میں
(۵) لشکرِ قنسرین کے لوگوں کو صوبہ جیان میں زمینیں دے کر آباد کر دیا

اور اب اندلس کی تاریخ میں اولادِ انصار کو جس قدر مہتم بالشان کام کرنے تھے جن کا انجام کبھی شاد کامی نہ ہوا، خاتمہ کو پہنچ گئے ہسپتنوں اور مالیسیوں کے مکتب میں درجۂ تکمیل کو پہنچ کر آخر کار اُن کو یقین ہو گیا کہ اُن کی اعلیٰ توقعات کبھی پوری نہ ہوں گی، پس معاملاتِ سیاست اور اُمورِ حکمرانی کو خیرباد کہہ کر وہ اس کوچے سے نکل آئے اور اپنے اپنے علاقوں میں معمولی رئیسوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگے، اب اگر کسی مدنی کو برسوں کے فصل کے بعد کبھی شہرت بھی ہوئی تو وہ کسی دوسرے فریق کے مددگار ہونے کی حیثیت سے ہوئی...... گو مدنی تعداد میں بہت تھے اور صاحبِ ثروت بھی تھے لیکن اپنے ملک کی تاریخ پر اب وہ کوئی اثر نہ ڈال سکے، عبد الملک بن قطن کی اولاد میں ایک شاخ بنی الجاد کے نام سے اشبیلیہ میں بڑی دولت مند اور صاحبِ املاک ہوئی، دوسری شاخ بنی قاسم کے نام سے مشہور ہوئی، یہ صوبہ بلنسیہ میں الیکنت کے قریب بڑے بڑے علاقوں کی مالک ہوئی، یہاں اُن کے نام پر ایک گاؤں بنی قاسم نامی اب تک موجود ہے لیکن ان دونوں شاخوں میں سے ایک بھی ایسی نہ تھی جو مدینہ والوں کی پہلی سی شان و عظمت کو دکھا کر گمنامی کی تاریکی سے باہر نکلتی، یہ سچ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) میں بنی قاسم ایک چھوٹی سی ریاست کے خود مختار بادشاہ ہو گئے، لیکن یہ خود مختاری ایک بہت ہی مختصر رقبہ پر محدود تھی، اور یہ زمانہ بھی وہ تھا کہ خلافتِ قرطبہ مٹ چکی تھی، اور ملک کے ہر بڑے زمیندار نے اپنی ایک چھوٹی سی حکومت علیحدہ قائم کر لی تھی، یہ بھی درست ہے کہ دو سو برس بعد بنی الاحمر جو حضرت سعد بن عبادہ رضؓ کی اولاد میں سے تھے، غرناطہ کے تختِ حکومت پر بیٹھے حضرت سعد رضی اصحابِ رسول اللہ میں ایسے جلیل القدر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے انتقال کے بعد قریب تھا کہ خلیفہ ہو جاتے، لیکن اب اندلس میں زمانہ وہ آ گیا تھا کہ پرانے دعوے اور پرانی رنجشیں سب محو ہو چکی تھیں، کسی کو اتنا بھی یاد نہ تھا کہ مدینہ والوں کا بھی کبھی کوئی فریق تھا، عربوں کی قومی خصوصیتیں اب اُن سے رخصت ہو چکی تھیں اور بربر کے اثرِ صحبت سے اُن کی طبیعتوں نے گہرا مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا، غرناطہ میں بنی الاحمر کی حکومت اتنے زمانہ تک رہی کہ اُن کو

(۱۴۷

اپنے مقبوضات ایک ایک کرکے عیسائی شاہانِ قشتالیہ کے قبضہ میں جاتے ہوئے دیکھنے پڑے، اور وہ دن بھی دیکھنا پڑا جس دن بقول عیسائی قصہ نویسوں کے "غرناطہ کے ایک دروازے سے انجیل داخل ہوئی اور دوسرے دروازے سے قرآن باہر آیا، اور جہاں اب تک اَللّٰہُ اَکْبَرُ کی آواز گونج رہی تھی، وہاں "ٹی ڈی ام"[1] کی صدائیں بلند ہونے لگیں"

حضرت سعد بن عبادہؓ کا یہ خاندان غرناطہ میں مدینہ والوں کی تقدیر کی زندہ نشانی تھا، اس خاندان کے نام کو ارضِ مشرق اور ارضِ مغرب دونوں میں بزرگ ترین تاریخی ناموں سے واسطہ رہا ہے مشرق میں ہادیٔ اعظم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبرؓ سے، اور مغرب میں شہنشاہ فرانس شارلمین اور ملکہ قشتالہ ازابلہ سے، یہ خاندانِ شاہی وہ تھا جس کی شان و شوکت، اور جس کا جاہ و حشم کبھی صفحۂ دل سے نہیں مٹ سکتا لیکن قسمت کی کوتاہی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا، یہ خاندان حضرت سعدؓ سے شروع ہوا، اور ابو عبداللہ سلطانِ غرناطہ پر ختم ہوا، ساڑھے آٹھ سو صدیاں ان دونوں ناموں کے درمیان حائل ہیں، اور جن کے یہ نام ہیں وہ دونوں وطن سے بے وطن ہو کر غیر ملکوں میں اپنی گزشتہ عظمت کو حسرت سے یاد کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے

حضرت سعدؓ "کامل" اسلام کے بڑے بہادر معاون و مددگار تھے، رسول اللہ صلعم کے تمام غزوات میں جو آپؐ نے کفار کے ساتھ کیے شریک رہے، اگر مہاجرین اپنے میں کسی کے لیے دعوئے خلافت نہ کرتے تو قریب تھا کہ انصارِ مدینہ آپ کو خلافت کے لیے منتخب کر لیتے، لیکن خود انصار ہی میں حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت بشیر بن سعدؓ کی تقریر اور قبیلہ اوس کی رائے نے جو مہاجرین کے ساتھ تھی، حضرت سعد بن عبادہؓ کو انتخابِ خلیفہ کے پُرشور مجمع میں کامیاب نہ ہونے دیا، حضرت فاروقِ اعظمؓ اور حضرت سعدؓ کے درمیان سختی کے ساتھ بات چیت ہوئی، ہجوم اس قدر تھا کہ حضرت سعدؓ کے کچل جانے کا اندیشہ تھا، کیونکہ وہ بیمار تھے اور چادر اوڑھے ہوئے ایک طرف بیٹھے تھے، حضرت صدیق اکبرؓ کا جب انتخاب ہو گیا تو سعدؓ نے قسم کھائی کہ وہ اس انتخاب کو کبھی تسلیم نہ کریں گے ..... اس لیے وہ عرب کو خیرباد کہہ کر شام چلے گئے[2]، شام میں اُن کی موت کا واقعہ اب تک ایک رازِ سربستہ

[1] "خدا کی تعریف ہو"

[2] ابن خلدون بروایت طبری ناقل ہے کہ حضرت سعد بن عبادہؓ نے اسی جلسہ میں، اور اسی دن (بقیہ حاشیہ بر صفحۂ آئندہ)

سمجھا گیا ہے مشہور ہے کہ دُور اور تنہا مقام پر کسی جن نے انہیں مار ڈالا، چند غلاموں نے اس حادثہ کی خبر اُن کے بیٹوں کو پہنچائی اور کہا کہ ہم نے ایک کنوئیں میں سے یہ آواز آتے سُنی ہے:[۵]

"ہم نے سردارِ خزرج سعد بن عبادہ کو ہلاک کر دیا، وہ تیر ہم نے اس کی طرف
چھوڑے جو اس کے دل تک پہنچ گئے۔"

ابو عبداللہ سلطانِ غرناطہ بھی جس وقت تاجِ حکومت سر سے کھو بیٹھے، تو اپنی زندگی کے باقی دن کاٹنے کے لئے افریقہ میں ایک دُور دراز غیر متواضع مقام میں چلے گئے، چلتے وقت ایک اُونچی پہاڑی سے جس کا نام اہلِ سپین کے عیسائیوں میں اب تک "مُور کی آہِ آخری" مشہور ہے، ایک نگاہِ حسرت غرناطہ کی طرف ڈالی، جو اُن کا محبوب شہر تھا اور جس کی نظیر دُنیا میں موجود نہ تھی۔

اسناد:- عیسیدر ص ۴۴؛ ۵۸ - ۶۷

مقری کتاب اول، ص ۱۴۵ کتاب دوم، ص ۱۱ - ۱۴،

سباستیانی کرونیکون، مرا اسپانا ساگرادا، ص ۱،

ابن العذاری، کتاب ثانی: ص ۲۷، ۳۰ - ۳۴

ابن الآبار ص ۵۱

اخبار مجموعہ ص ۶۵ - ۶۹

ابن القوطیہ ص ۷ - ۸

ابن الخطیب (قلمی نسخہ ۵) ص ۱۷۶

جبری جلد اول، ص ۲ - ۱۲، ۳۲ - ۴۲

نویری ص ۲۷۴

ابن قتیبہ ص ۱۳۲

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) بیعتِ عامہ سے تھوڑی دیر بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بیعت کر لی تھی، شام میں جانے کا واقعہ بعد کا ہے، جس طرح آنحضرتؐ کے بعد بہت سے صحابہ مدینہ سے نکل کر مختلف مقامات میں منتشر ہو گئے، اسی طرح حضرت سعدؓ بھی شام میں جا رہے، کوئی خاص عناد یا دشمنی اس نقلِ مکانی کا باعث نہیں ہوئی (اسمٰعیل)

[۵] ۱۴ھ/۶۳۶ء یا ۱۵ھ/۶۳۷ء میں ان کا انتقال ہوا ہے، یہ محض ایک اتفاقی واقعہ تھا جس کا یقینی سبب (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

کتابِ اوّل

خانہ جنگی ۱۱۴

بارھویں فصل

صمیل بن حاتم

شروع زمانۂ امارت میں ابوالخطار نے تمام فریقوں کے ساتھ ناطرفدارانہ برتاؤ رکھا، گو وہ کلبی تھا لیکن قیسیوں کو بھی جن کی تعداد اُن فوجوں میں جو بلج کے ساتھ اندلس آئی تھیں، بہت تھی، اِس سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، اس قسم کی ناطرفداری ایک عرب کی طبیعت میں مستثنیٰ شئے تھی، چنانچہ بہت جلد وہ قدرتی بغض و نفور جو مقتضائے فطرت تھا، ظاہر ہونا شروع ہو گیا، دو باتیں ایسی نکل آئیں جن کو قیسیوں سے سمجھنا ضروری ہوا، پہلی بات یہ کہ زمانۂ قیام افریقیہ میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) معلوم نہ ہو سکا، ابن خلدون لکھتا ہے کہ غسلخانے میں مرے ہوئے پائے گئے۔ اسدالغابہ میں ابن سیرین کی روایت ہے کہ کھڑے ہوئے پیشاب کر رہے تھے کہ یکایک گرے اور مر گئے" شاید حرکتِ قلب کا بند ہو جانا اُن کی وفات کا باعث ہوا، یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ ان غلاموں ہی کی کارستانی ہو گی، جنہوں نے کسی وجہ سے اُن کو شہید کر ڈالا، اور اُن کے بیٹوں سے جا کر ایک نہایت لغو بات کہہ دی کہ "سعد کو جنوں نے مار ڈالا، اور کوئیں سے آواز آرہی ہے" یہ بھی ممکن ہے کہ پیشاب کرتے یا نہاتے ہوئے اُن کو کسی سخت زہریلے جانور نے کاٹ لیا ہو، کیونکہ الکمال فی اسماء الرجال میں لکھا ہے کہ انتقال کے بعد اُن کا بدن سبز ہو گیا تھا (اسمٰعیل)

خود اُس کو ان قیسیوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ دوسرا واقعہ یہ تھا کہ اندلس میں ان قیسیوں نے اُس کے قبیلے کے ایک بڑے شخص یعنی سعد بن جواس کو قتل کر دیا تھا، سعد کی نسبت ابوالخطار کہا کرتا تھا کہ "کوئی میرے ہاتھ کاٹ لے مگر سعد کو زندہ کر دے" کم سے کم خونِ سعد کا بدلہ لینا اس وقت ممکن تھا اور یہ بدلہ وہ لے کر رہا، اس دوست کے قتل میں جس جس قیسی کی نسبت شرکت کا گمان ہوا اُن پر ایسا تشدد کیا کہ خود اپنے اشعار میں کہنا پڑا:۔

"اے کاش! سعد بن جواس کو معلوم ہوتا کہ میں نے اس کے معاملہ میں کیسی سختی سے کام لیا ہے، اُس کے خون کے عوض میں مَیں نے نوّے آدمیوں کو قتل کیا ہے، جن کی لاشیں زمین پر اس طرح پڑی ہیں جیسے پانی کی تیز رَو سے کھجور کے درخت جڑ سے اکھڑ کر زمین پر پڑے ہوتے ہیں۔"

اس قسم کے انتقامِ بلا امتیاز سے خانہ جنگی کی آگ پھر روشن ہو جانی ایک قدرتی امر تھا، بہرحال قیسیوں نے جن کی تعداد اندلس میں یمانیہ سے کم تھی، اس حالت سے جو ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی، بزورِ شمشیر نجات حاصل کرنے میں جلدی نہیں کی، اور اپنے جامِ غیظ و غضب کو اُس وقت تک نہ چھلکنے دیا جبتک اُن کے سردار کی عزت معرضِ خطر میں نہ آگئی، معدیہ سے قبیلہ کنانہ کے ایک شخص کا کچھ جھگڑا ایک کلبی سے ہو گیا، کنانی اپنی نالش امیر کے سامنے لے کر آیا، حق اُس کی جانب تھا لیکن ابوالخطار نے بیجا پاسداری سے مقدمہ اُس کے خلاف فیصلہ کر دیا، کنانی نے اِس بے انصافی کی شکایت سردار بنو قیس یعنی صمیل بن حاتم کلابی سے کی، صمیل شکایت سنتے ہی قصرِ امارت میں آیا اور ابوالخطار کو نصیحت کرنے لگا کہ اُس نے اپنے قبیلے کے آدمی کی بیجا طرفداری کی ہے، کنانی کے معاملہ پر پھر غور کر کے انصاف کیا جائے، امیر ابوالخطار نے صمیل کو سختی سے جواب دیا، صمیل نے بھی ویسا ہی ترشی سے جواب دیا، اس پر ابوالخطار نے صمیل کو ایک طمانچہ مار کر اپنے سامنے سے نکلوا دیا، سردار بنو قیس اس ذلت و توہین کو اس وقت بغیر حرفِ شکایت منہ پر لائے پی گیا، اُس کے عمامے کے پیچ بے ترتیب ہو گئے تھے، اسی حال میں قصر سے باہر آیا، ایک شخص دروازے پر کھڑا تھا اُس نے کہا "یا ابوالجوشن! تمہارے عمامے کو کیا ہوا؟ وہ ٹیڑھا ہو گیا ہے" صمیل نے جواب دیا کہ "اگر میری قوم ہے تو وہی اس کو سیدھا کرے گی" سردارِ بنی قیس صمیل کا

یہ حملہ اشتہارِ جنگ تھا، ابوالخطار نے آج سے اپنے حق میں ایک ایسا خطرناک دشمن پیدا کر لیا جو کسی کے ساتھ برائی یا بھلائی کرنے میں معمولی انسان نہ تھا، صمیل کی طبیعت قدرتاً فیاض تھی، مگر مغرور و منتقم بھی تھی، اُس کی روح میں دو قسم کی تاثیرات تھیں، جو قوت میں یکساں مگر سمتِ عمل میں مخالف واقع ہوئی تھیں، نہایت مضبوط دل کا آدمی تھا مگر خصائل میں توازن و اعتدال نہ تھا، علم سے نا آراستہ، مزاج میں تلون، عقلِ حیوانی کا بندہ، بخت و اتفاق کے ہاتھ کا ایک کھیل، اکثر متضاد قوتیں اُس کے دل و دماغ میں ایک کشمکش رکھا کرتی تھیں، جس وقت اُس کے جذبات کو تحریک ہوتی تو اُن کی پیروی میں جان تک لڑا دیتا، اور جب یہ طوفان تھم جاتا تو کاہلی، آرام طلبی اور بے توجہی طبیعت پر غالب ہو جاتیں اور یہی چیزیں سب سے بڑھ کر اُس کی فطرت کا اصلی رنگ معلوم ہونے لگتیں، اُس کی سخاوت کی انتہا نہ تھی، اور یہ خوبی وہ تھی جس کو اُس کے زمانہ کے لوگ سب سے زیادہ پسند کرتے تھے، جیسے سکاٹ لینڈ میں ہر رئیس کے ہاں ایک مطرب کا ہونا ضروری تھا اسی طرح ہر رئیسِ عرب کے متوسلین میں ایک شاعر کا ہونا بھی لازمی تھا، صمیل کا شاعر اس خوف سے کہ کہیں آقا بالکل ہی محتاج نہ ہو جائے، سال میں دو مرتبہ یعنی صرف عیدین کو صمیل کے پاس حاضر ہوتا تھا، کیونکہ صمیل نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب اُس کا شاعر اُس کے پاس آئے گا تو اُس وقت جو کچھ اُس کے پاس ہو گا وہ شاعر کی نذر کر دے گا، باوجودیکہ تعلیم برائے نام تھی مگر ذوقِ سخن رکھتا تھا، بالخصوص جب شعر اُس کی تعریف میں ہو، خود بھی کبھی کبھی شعر کہتا تھا مگر لکھنا پڑھنا بالکل نہ آتا تھا، اور اُس کے زمانہ کے لوگ اُس کو بلکہ وقتوں کا آدمی سمجھتے تھے، لیکن دوسرے پہلو سے دیکھئے تو اُس کی تربیت ایسی اعلیٰ درجہ کی تھی کہ دشمن بھی اُس کو آدمیت اور انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھ کر اُس کی تعریف کیا کرتے تھے، چال چلن کی خامیوں اور مذہب کی طرف سے بے پروائی میں وہ پرانے عربوں کی تقلید کرتا تھا، جو آزادہ رو لوگ برائے نام مسلمان تھے، شراب حرام کی گئی تھی مگر وہ ایک عرب جاہلیت کی طرح بے تکلف بادہ نوشی کرتا تھا، اور ایسا کم اتفاق ہوتا تھا کہ رات کے وقت ہوش و حواس میں اپنے بستر تک پہنچے، احکامِ قرآن سے ناواقف تھا، اور ایسی کتاب سے واقفیت پیدا کرنے کی خواہش بھی نہیں رکھتا تھا جس میں تفاخرِ قومی کے مٹانے والے اصول ایک عرب کے کبر و پندار کو مجروح کرتے ہوں، بیان ہوا ہے کہ ایک دن ایک معلم جو بچوں کو قرآن پڑھاتا

تھا، جب اس مضمون کو بیان کرنے لگا کہ "اللہ تعالیٰ لوگوں میں باری باری سے کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو کامیاب کرتا ہے" تو صمیل نے کہا "لوگوں کو نہیں بلکہ یوں کہو کہ عربوں میں کبھی کسی کو اور کبھی کسی کو کامیاب کرتا ہے۔"

مُعلم نے کہا "معاف فرمائیے مگر الفاظ یہی ہیں" کہ "لوگوں میں۔"

صُمَیل :- "کیا الفاظ اسی طرح ہیں؟"

مُعلم :- "یقیناً"

صَمیل :- "تو پھر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ فلاح اور بہبودی ہمارے ہی لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ رذیل بھی جیسے کسان، نوکر اور غلام ہیں اُس میں حصہ دار ہو سکتے ہیں۔"

صمیل اگر برا مسلمان تھا تو اس عیب کا الزام وہ اپنے اسلاف کو دے سکتا تھا، اُس کے دادا شمر کوفی کا حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں، یہ بنی امیہ کے لشکر کا سردار تھا، جس وقت نوبت یہ آئی کہ حضرت امام حسینؓ کو شہید کر دیا جائے تو شمر کو ایک لمحہ کے لیے بھی اُس میں تامل نہ ہوا درانحالیکہ اسی لشکر کے دوسرے سردار ایسے خلافِ دین فعل کے خوف سے کانپتے ہوئے پیچھے ہٹے جاتے تھے، یہی دادا جو سر حسینؓ کو لے کر یزید بن معاویہ کے پاس گیا تھا، صمیل کے اندلس میں آنے کا باعث ہوا، مختار ثقفی نے شمر کو قتل کر کے اُس کی لاش کو کتوں کے سامنے ڈلوا دیا، اور جب کوفہ پر قبضہ کر لیا تو قتلِ حسینؓ کا انتقام نہایت سختی سے لیا، شمر کے قتل کے بعد اُس کا بیٹا حاتم یعنی صمیل کا باپ فریق غالب کے قہر سے جان بچا کر بھاگا اور قنسرین کے علاقہ میں پناہ لی، اور یہاں وہ مع اہل و عیال آباد ہو گیا، جس وقت خلیفہ ہشام نے افریقیہ میں بربر کی بغاوت فرد کرنے کے لیے شام سے فوجیں فراہم کرنے کا حکم دیا تو صُمَیل بھی ان فوجوں میں بھرتی ہونے کے لیے منتخب کر لیا گیا، افریقیہ پہنچنے کے بعد بلج کے ساتھ اندلس میں آیا، اور یہاں بنی قیس اُس کو اپنا سردار ماننے لگے۔

صُمَیل قصرِ امارت سے اپنے گھر واپس آیا، اور یہاں اُسی رات کو اپنی قوم کے بڑے لوگوں کو جمع کیا، جب یہ لوگ آ گئے تو اُن سے کل حالات کہ کس کس طرح اُس کی ہتک اور توہین کی گئی، بیان کئے، اور دریافت کیا کہ اس معاملہ میں اب اُن کی کیا رائے ہے؟ ان لوگوں نے کہا،

"جو کچھ تدبیر تم نے سوچی ہے وہ بیان کرو، ہم پہلے ہی سے اُس کو پسند کیے لیتے ہیں، اور اُس پر عمل کرنے کو تیار ہیں" صمیل نے کہا "بخدا میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اُس اعرابی کو اُس کے اقتدار سے قطعی محروم کر دوں گا، لیکن اس وقت ہم بنی قیس اتنے کمزور ہیں کہ بلا امداد غیرے یمانیہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے، اور اس صورت میں اتنے بڑے کام میں پھنسا کر میں اپنی قوم کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا، بلاشبہ وہ لوگ جن کے بزرگ مرج راہط کی لڑائی میں شکست کھا چکے ہیں (یعنی بنی قیس) ہمارا ساتھ دیں گے، اور یہ بھی مناسب ہے کہ یمانیہ کے قبائل یعنی بنی لخم اور بنی جذام کو بھی ملا لیا جائے اور انہی میں سے کسی کو امیرِ اندلس بنانے کی منظوری دیدی جائے، یہ امارت بظاہر اُن کے پاس ہو گی لیکن حقیقت میں اُس کے مالک ہم ہی ہوں گے، پس میں قرطبہ سے ابھی روانہ ہو جاتا ہوں تاکہ اُن قبیلوں کے سرداروں سے ملاقات کر کے اُن کو ہتھیار اُٹھانے کی ترغیب دوں، آپ لوگ میری اس رائے سے متفق ہیں یا نہیں؟" جواب مِلا کہ "ہاں ہم تمہاری اس رائے کو پسند کرتے ہیں، لیکن ہمارے خیال میں اتنا ضرور ہے کہ یہ معاملہ ابو عطاء قیسی پر ظاہر نہ کیا جائے، کیونکہ یہ بات یقینی ہے کہ اس امر میں وہ ہمارا ساتھ نہ دے گا۔"

(۱۵۱) واقعہ یہ تھا کہ ابو عطاء جو استجہ میں رہتا تھا بنی غطفان کا سردار تھا، صمیل کا اثر اور اقتدار لوگوں پر ایسا حاوی تھا کہ ابو عطاء کے دل میں صمیل کی طرف سے حسد پیدا ہو گیا تھا، پس جو خیال بیان کیا گیا تھا اس پر تعجب کرنے کی ضرورت نہ تھی، غرض سب نے اتفاق کر لیا کہ بے شک ابو العطاء پر یہ معاملہ نہ کھلنا چاہیئے، لیکن ایک شخص ابن طفیل اس مجمع میں موجود تھا، اُس نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، چونکہ یہ ایک نوجوان شرمیلی طبیعت کا آدمی تھا، اس لیے اُس نے اپنے بڑوں کی بات کو کاٹنا نہ چاہا اور محض خاموش رہ کر اپنا اختلاف ظاہر کیا، لیکن صمیل کے اس کہنے سے کہ "ابنِ طفیل تم کیوں اپنی رائے دوسروں کی طرح صاف صاف بیان نہیں کرتے، ابنِ طفیل کو جرأت ہوئی اور اس نے کہا "مجھ کو صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر آپ نے ابو عطاء سے مدد نہ لی تو ہم کو ہرگز کامیابی نہ ہو گی، لیکن اگر آپ نے اُس سے امداد کے لیے کہا تو وہ اپنی دشمنی بالکل بھول جائے گا اور صرف اُس محبت کا پابند ہو جائے گا جو اُس کو اپنی قوم کے ساتھ ہے،

اس کا آپ یقین کریں کہ وہ نہایت دل سے ہماری نصرت پر آمادہ ہو گا۔" کچھ دیر سوچ کر صمیل نے کہا: "ابنِ طفیل تم ٹھیک کہتے ہو"۔

اِس کے بعد صبح ہونے سے پہلے ہی صمیل قرطبہ سے روانہ ہو کر سب سے پہلے استجہ میں ابو عطاء کے پاس آیا، ابن طفیل کا خیال بالکل صحیح نکلا اور ابو عطاء نے امداد کا وعدہ کر لیا، اور اپنے وعدہ پر ثابت قدم رہا، استجہ سے صمیل، مورور گیا، یہاں بنی جذام کا سردار ثوابہ رہتا تھا، یہ پہلے ہی سے ابو الخطار سے دل میں ناراض ہو چکا تھا، مختصر یہ کہ صمیل اور ثوابہ میں بخوبی عہد و پیمان ہو گیا اور اب ان اتحادیوں کا سردار ثوابہ قرار پایا، اور بنی قیس، بنی جذام اور بنی لخم نے مدینہ شذونہ کے علاقہ میں اپنے لڑنے والوں کو جمع کر دیا (اپریل ۷۴۵ء مطابق ماہ رجب ۱۲۷ھ)

ابو الخطار نے جس وقت یہ سنا کہ مخالفین لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں تو قرطبہ میں جس قدر فوج تھی اس کو ساتھ لے کر باغیوں کی طرف بڑھا، جب لڑائی (شذونہ کے قریب) وادی لکہ کے کنارے شروع ہوئی، تب یہ بات ثابت ہوئی کہ صمیل نے اپنے گھر پر بنی قیس کے مجمع میں جو صلاح دی تھی وہ کیسی باصواب تھی، وہ طاقتور یمنی قبیلوں کو بلا لینے اور ان میں سے ایک قبیلے کے آدمی کو سردار مان لینے میں صمیل نے وہ سیاسی چال چلی تھی جو مشرقی ملکوں میں ضرورت کے وقت اکثر اختیار کی جاتی تھی، اس قسم کی سازشوں میں دو باتیں حاصل ہوتی تھیں، ایک یہ کہ کمزور قبیلوں کو قوت پہنچ جاتی تھی، دوسرے یہ کہ لڑائی میں دشمن کا ہاتھ رکنے لگتا تھا، کیوں کہ عربوں کو اپنے ہی قبیلوں سے بالخصوص جبکہ اُن ہی میں کے ایک شخص کو حقِ سرداری مل چکا ہو لڑنے میں تذبذب ہوتا تھا[1]، یہی صورت جنگ وادی لکہ میں پیش آئی، ابو الخطار کے تحت میں جو یمانیہ تھے وہ بے دلی سے لڑے، اُن سے اور بنی جذام اور بنی لخم سے پہلے ہی پوشیدہ طور پر بات چیت ہوتی تھی، اور اب یہ لوگ لڑائی میں جہاں تک ممکن ہوتا تھا بنی لخم اور بنی جذام کو بچا جاتے تھے، آخر کار ابو الخطار کے یمانیہ یہ ظاہر کر کے کہ اُن کو شکست ہو گئی ہے میدان سے بھاگ گئے، اور اب ابو الخطار کے پاس میدان میں صرف بنی کلب رہ گئے، جب یہ

---

[1] خراسان اور عراق میں یمانیہ کی تعداد کم تھی، اُنھوں نے بنی معد کے قبیلہ ربیعہ سے سازش کر کے اُس کو اپنے ساتھ کر لیا، تاکہ بنی تمیم کا مقابلہ کر سکیں جو بطونِ معدیہ سے تھے۔

لوگ بھی لڑائی میں بہت سے کام آ گئے تو ابوالخطار کو بھی فرار ہونا پڑا، اس حالت میں وہ اور اُس کے خاندان کے تین آدمی دشمن کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے، لشکرِ فاتح میں بعض لوگ ایسے تھے جو ابوالخطار کو اُسی وقت قتل کر دیتے، لیکن اور لوگوں نے ایسا نہ چاہا اور اُن کی بات سب نے مان لی، ابوالخطار کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا، اور ثوابہ نے اس بنا پر کہ فتح حاصل ہے قرطبہ میں سکونت اختیار کی، لیکن بنو کلب نے ہرگز یہ نہ مانا کہ وہ کسی سے مغلوب ہو گئے ہیں، چنانچہ اُن میں کے ایک سردار نے جس کا نام عبدالرحمٰن بن نعیم تھا ابوالخطار کو قید سے چھڑانے کا بندوبست کیا، تیس ۳۰ چالیس ۴۰ سوار اور دو سو ۲۰۰ پیدل لے کر قرطبہ میں داخل ہوا، شب کی تاریکی میں اُن سپاہیوں پر حملہ کر کے جو ابوالخطار پر پہرہ دے رہے تھے اُن کو متفرق کر دیا، اور ابوالخطار کو قید خانے سے نکال کر بنو کلب میں جو اُس وقت (ترنگال میں) شہر باجہ کے قریب رہتے تھے پہنچا دیا۔

ابوالخطار نے قید سے رہائی پا کر یمانیہ کو اپنے عَلَم کے نیچے جمع کیا، اور باجہ سے قرطبہ کی طرف بقصدِ جنگ اس اُمید سے بڑھا کہ اس مرتبہ فوج اُس کی حمایت میں زیادہ ہمت اور جوش ظاہر کرے گی، ثوابہ اور صمیل نے بھی اُس کے مقابلہ کے لیے قرطبہ سے کوچ کیا، یہاں تک کہ ایک مقام پر فریقین کے لشکروں نے اپنے اپنے خیمے بالمقابل نصب کر دیئے، جب رات ہوئی تو ثوابہ کے لشکر سے ایک حدی نکل کر ابوالخطار کے لشکر کے قریب آیا اور بلند آواز سے کہنے لگا:-

"اے معشرِ یمانیہ! تم ہم سے کیوں لڑتے ہو؟ ابوالخطار کو تم نے قید سے کیوں چھڑا لیا؟ کیا تم کو یہ خوف تھا کہ ہم اُس کو مار ڈالیں گے؟ جس وقت وہ ہمارے قبضہ میں تھا تو ہم نے اُس کی جان بخشی کی تھی اور اُس کے سب قصور معاف کر دیئے تھے، ہم سے لڑنے کے لیے تمہارے پاس کافی وجہ اُس وقت ہو سکتی تھی کہ جب ہم اپنی ہی قوم سے کسی کو امیر مقرر کرتے، لیکن ہم نے تو تمہاری قوم کے ایک آدمی کو امیر بنایا ہے، اس لیے جس بات پر اس وقت تم آمادہ ہو اُس پر پھر غور کرو، قسم ہے کہ یہ باتیں میں تم سے کسی خوف کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ میری غرض صرف یہ ہے کہ خوں ریزی نہ ہو۔" اس تقریر نے جو ظاہر ہے کہ صمیل کے ابتدائی کا مشورہ کا محض اعادہ و انتشار تھا، ابوالخطار کے لشکر والوں پر بڑا اثر کیا، اور اسی رات کو انھوں نے اپنے خیمے اکھاڑ کر کوچ بول دیا، اور ابوالخطار کو جو اس پر راضی نہیں تھا، ساتھ لے، اپنے گھروں

کی طرف چل پڑے اور جب صبح کی روشنی اردگرد کی پہاڑیوں پر نمودار ہوئی تو یہ لوگ میدانِ
جنگ سے کئی فرسخ کے فاصلے پر پہنچ چکے تھے۔ ان خانہ جنگیوں میں قبیلوں کے لوگ (۱۵۴
کسی ایک شخص کے ذاتی فائدہ کے لیے نہیں لڑا کرتے تھے، بلکہ لڑنے میں اُن کی غرض
یہ ہوتی تھی کہ اُن کے قبیلے میں شرفِ سرداری آجائے[1]

ثوابہ کی موت پر جو اس جنگ کے ایک سال بعد ہوئی اسپین میں پھر بدنظمی شروع ہوئی
بنی جذام کے دو آدمیوں نے دعویٰ امارت کیا، ان میں عمرو بن ثوابہ تھا، جو سمجھتا تھا کہ باپ
کے بعد امیری کا مستحق وہی ہے اور دوسرے ابنِ حریث نے، یہ جلیقی کے پیٹ سے تھا اور
اس کا باپ ایسے خاندان کا آدمی تھا جو مدت دراز سے اسپین میں آباد تھا، اس ابن حُریث
کو شامیوں سے ایسی سخت عداوت تھی کہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "اگر ایک پیالہ میں تمام شامیوں
کا خون جمع کر دیا جائے تو میں پورا پیالہ پی جاؤں اور ایک بوند بھی نہ چھوڑوں" صمیل خود شامی
تھا اسلیے وہ ایسے دشمن کو حاکم بنانا کب گوارا کر سکتا تھا، لیکن وہ عمرو بن ثوابہ کا بھی ایسا ہی مخالف
تھا جیسا کہ ابن حریث کا تھا، صمیل خود اپنے لیے امارت نہیں چاہتا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بنی قیس
اتنے کمزور ہیں کہ اس کو سنبھال نہ سکیں گے، اس لیے صمیل کی کوشش یہ تھی کہ اپنے ہی
کسی آدمی کو امیرِ اندلس مقرر کرا دے تاکہ اُس پر ہمیشہ قابو رکھ کر حکومت اپنے ہاتھ میں رہے
ایسا آدمی جس سے یہ مطلب پورے ہوتے ہوں صمیل نے تلاش کر لیا تھا اور وہ یوسف الفہری تھا
یہ ایک عافیت پسند اور اوسط درجہ کی لیاقت کا آدمی تھا، لیکن وہ ایسا صاحبِ منزلت تھا
کہ عرب کے جس قدر مختلف فریق اسپین میں اس وقت موجود تھے وہ سب اس کی امارت کو
پسند کرتے تھے، سن بھی اس کا اتنا تھا کہ جو لوگ بڑی عمر کے آدمی کا امیر ہونا مصلحت سمجھتے
وہ بھی اس سے انکار نہ کر سکتے تھے، اس وقت اس کی عمر ۵۷ برس کی تھی، اس کے علاوہ وہ ایک
بڑے شریف اور معزز خاندان کا رکن تھا، عقبہ بن نافع مشہور سپہ سالارِ اسلام جس نے افریقہ کے

---

[1] مطلب یہ ہے کہ یمانیہ اس وجہ سے نہیں لڑتے تھے کہ ابوالخطار کی ذات کو کوئی نفع پہنچے، بلکہ غرض یہ
تھی کہ امیر یا سردار اُن کے قبیلہ کا آدمی بنایا جائے جب اُن کو معلوم ہوا کہ ثوابہ کو جو یمانیہ میں بنی جذام کا آدمی تھا
امیر کر دیا گیا تو ان کی غرض پوری ہو گئی، اور اب ان کو لڑنے کی ضرورت نہ رہی (مترجم)

ایک بڑے حصہ کو فتح کیا تھا یوسف کے باپ کا پردادا تھا، علاوہ اس کے وہ فہری تھا، اور قریش الاعالی کے بعد بنی فہر کا درجہ مانا جاتا تھا، عربوں کے لیے اس امر کا متوقع ہونا کہ بنی فہر حکومت کے اعلیٰ مناسب پر ممتاز ہوں ایک قدرتی امر تھا، بنی فہر کی نسبت ایک عام خیال یہ بھی تھا کہ وہ کسی فریق کی بیجا طرف داری سے بالکل پاک رہتے ہیں، غرض صمیل نے یوسف کے یہ تمام اوصاف مشہور کرنے کے بعد اُس کو امارتِ اندلس کے لیے نامزد کرادیا اور ابن حریث کی اشک شوئی اس طرح کی کہ علاقہ ریہ (مالقہ) کا اس کو حاکم بنوادیا، جنوری ۷۴۷ء مطابق ربیع الثانی ۱۲۹ھ میں آخر کار یوسف کا انتخاب اسپین کی امارت پر ہوگیا۔

یوسف الفہری کے امیر ہوتے ہی صمیل جس کے جذبۂ انتقام کو ثوابہ بن سلامہ روکے رکھتا تھا اب ملک کے سپید و سیاہ کا مالک ہوگیا، اور اس نے ارادہ کرلیا کہ یوسف کو جو اس کے ہاتھ میں موم سے زیادہ نرم تھا، اپنی انتقام کشی کا آلہ بنائے، اس بات کی طرف سے مطمئن ہو کر کہ یوسف پر پورا بھروسہ کیا جاسکتا ہے اب صمیل کو تمام قبائل یمانیہ کی متحدہ طاقت سے مقابلہ میں خطا تامل نہ ہوا اور اسی نیت سے پہلا کام یہ کیا کہ ابن حریث کو ریہ کی حکومت سے معزول کردادیا اور یہی امر بنائے جنگ ہوگیا، ابنِ حریث معزول ہوکر نہایت پیچ و تاب کھاتا ابوالخطار سے جاکر ملا، جو اس وقت اپنے بھائی بندوں یعنی یمانیہ کے پاس نہایت غم اور غصے میں زندگی بسر کررہا تھا ان دونوں سرداروں میں ملاقات ہوئی، اس معاملہ پر گفتگو بھی ہوئی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا، کیونکہ ابوالخطار نے کہا کہ امارتِ اندلس کا اگر کوئی پھر مستحق ہوسکتا ہے تو سوائے اُس کے دوسرا نہیں ہوسکتا ابن حریث کو دعویٰ امیری اس بنیاد پر تھا کہ اس کی قوم والے (یعنی وہ عرب جو اصحاب بلج سے پہلے اندلس میں آباد ہوچکے تھے) تعداد میں بہ نسبت بنو کلب کے زیادہ ہیں، بنو کلب نے یعنی ابوالخطار کے قبیلے والوں نے اس معاملہ کو دوسرے پہلو سے دیکھا، اُنھوں نے سوچا کہ اگر بنو قیس سے بدلہ لینا ہے تو اس میں اندلس کے تمام عربوں کو ملا لینے کی ضرورت ہوگی۔ اس لیے انھوں نے ابوالخطار پر زور ڈالا کہ ابن حریث کو امیر اندلس مان لیا جائے، ابوالخطار مجبور ہوا اور ابن حریث کو یمانیہ نے اپنی متفقہ رائے سے امیر اندلس مقرر کردیا، اور اب ملک میں جس قدر یمانیہ تھے وہ ابنِ حریث کے علَم کے نیچے جمع ہونے شروع ہوگئے، معدیوں کو یہ حال معلوم ہوا تو

وہ یوسف اور صمیل کے پاس لڑنے کی غرض سے جمع ہونے لگے اور اب تمام مختلف قبیلوں کے لوگ جو مدت سے لطف ہمسائیگی رکھتے تھے، اپنے اپنے گھروں سے نکل کر ایک متین اور جوانمرد قوم کی طرح ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر رخصت ہوئے لیکن میدانِ جنگ میں شوق تیغ آزمائی سب کے دلوں میں موجزن تھا۔ چونکہ جانبین کے لشکروں میں آدمی زیادہ نہ تھے اور لڑائی بھی محض جنوبی اسپین سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے یہ لڑائی لڑائی نہیں بلکہ محض ڈھول لڑنیوالوں کا ایک ہنگامہ معلوم ہوتی تھی، گو یہ درست ہے کہ جو لوگ اس میں شریک تھے وہ اپنی اپنی قوم کے بڑے بہادر اور شریف تھے۔

مقابلہ موضع شتقندہ کے قریب ہوا۔ یہ ایک پرانا رومانیوں کے زمانہ کا چھوٹا سا شہر تھا جس کے گرد فصیل تھی، اور وادی الکبیر کے پاس کنارے پر شہر قرطبہ کے بالکل سامنے واقع تھا بعد کو یہ قصبہ قرطبہ کے شہر میں ملا لیا گیا تھا، صبح کی نماز پڑھ کر سواروں نے ایک دوسرے پر اس طرح حملہ کیا گویا تفریحاً چوگان بازی کی مشق ہو رہی ہے مگر لڑنے میں کسر نہ رکھی، جب لڑتے لڑتے برچھے ٹوٹ گئے اور آفتاب بلند ہوا تو کسی طرف سے آواز آئی کہ اب لڑائی دست بدست ہونی چاہیے" اتنا سنتے ہی سوار گھوڑوں کی پیٹھ سے کود کود کر زمین پر آئے، اور ہر شخص نے اپنے حریف کو تلاش کر کے لڑنا شروع کیا یہاں تک کہ تلواریں بھی ٹوٹ گئیں، اب جو ہتھیار جس کے ہاتھ لگا اسی سے لڑنے لگا۔ کسی کے ہاتھ میں کمان تھی کسی کے ہاتھ میں محض ترکش تھا اور کسی کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ تھا مٹھیاں بھر بھر کر زمین سے خاک اٹھاتا اور دشمن کی آنکھوں میں ڈالتا، یا گھونسوں اور مکوں سے لڑ کر دشمن کے بال نوچتا، جب اسی طرح لڑتے لڑتے شام ہو گئی اور کچھ فیصلہ نہ ہوا تو صمیل نے یوسف سے دریافت کیا کہ "اگر کہو تو اس لشکر کو بلا لیا جائے جسے قرطبہ میں چھوڑ آئے ہیں" یوسف نے پوچھا "وہ کونسا لشکر ہے؟" صمیل نے جواب دیا "بازار والوں کا" ایک عرب کی نسبت بالخصوص ایسے عرب کی نسبت جیسے کہ صمیل تھا، یہ بات تعجب کی معلوم ہوتی ہے کہ شرفائے قوم کے اتنے بڑے معرکہ میں نان بائیوں، قصائیوں، پھیری والوں اور مزدوروں کو دست اندازی کی اجازت دے، لیکن چونکہ یہ انتظام پہلے سے کیا گیا تھا، اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ اس کو اس بات کو خوف ضرور تھا کہ کہیں موقع ایسا نہ آئے

کہ لشکر کے لوگ ہمت ہارنے لگیں، بہرکیف یہ جو کچھ بھی ہو، یوسف نے اپنے دوست کی رائے
سے اتفاق کرلیا اور فوراً دو قاصد قرطبہ بھیجے گئے کہ اس عجیب فوج کو میدان میں لے آئیں، نتیجہ
یہ ہوا کہ شہر کے چار سو آدمی جن میں ایک بھی باقاعدہ طور پر مسلح نہ تھا، میدان میں پہنچے، بعض
کے پاس البتہ تلواریں اور برچھیاں تھیں، قصابوں کے پاس ان کی چھریاں تھیں، اور باقی کے (۵۷ب)
پاس سوائے ڈنڈوں کے اور کچھ نہ تھا، ابن حریث کے لشکر والے لڑتے لڑتے اب تھک کر
نیم جان ہوگئے تھے، اس حال میں جب عوام الناس کی طرف سے یہ قومی کمک پہنچی تو لڑائی کا
فیصلہ ہوگیا، اور معدیوں نے بہت سے کلبیوں کو جن میں ابوالخطار بھی تھا، قید کرلیا، سردار
بنی کلب یعنی ابوالخطار کو معلوم ہوگیا کہ اب موت یقینی ہے، اس لیے قید سے نکل جانیکا قصد
بھی نہ کیا، مگر اس حالت یاس میں بھی یہ بات دل کو تسکین دیتی تھی کہ شامیوں کا جانی
دشمن یعنی ابن حریث بھی جس نے اس کو یمانیہ کی طرف سے امیر اندلس نہ ہونے دیا تھا اسی طرح موت
کے سپرد ہونے والا ہے، ابن حریث جان بچانے کے لیے ایک پن چکی کے پیچھے جا چھپا تھا۔
ابوالخطار نے معدیوں کو اس کا پتا بتادیا، جب گرفتار ہوکر اُسے سزائے موت کا حکم سننا پڑا تو ابوالخطار
نہ رہ سکا، اور ابن حریث کے اس فقرہ کو یاد کرکے کہ "اگر تمام شامیوں کا خون ایک پیالہ میں بھرا
ہو تو اُسے پورا چڑھا جاؤں" کہنے لگا "اے حبش کے لونڈے! اب بھی تیرے پیالہ میں کوئی
بوند باقی ہے؟" ابن حریث اور ابوالخطار دونوں سنہ ۱۳۰ھ میں قتل کردیئے گئے اب بنی معد
اسیران جنگ کو لیے قرطبہ کے بڑے گرجا[1] میں جو ونسنٹ کے نام سے مشہور تھا داخل ہوئے
اور یہاں ان مجرموں کا مستغیث و پیروکار، جج اور جلاد سب کچھ صمیل ہی صمیل تھا قہر انگیز انصاف
نہایت عجلت کیساتھ شروع کردیا گیا، جو حکم زبان سے نکلا اور اس پر عمل ہوا، وہ سزائے موت
سے کم نہ تھا، ستر آدمیوں کو قتل کرچکا تھا کہ اس کا ساتھی ابوعطا خون ریزی کے اس جاں گزا
منظر کو نہ دیکھ سکا اور اُسے بند کرنا چاہا، چنانچہ اس نے صمیل سے چلا کر کہا "اے ابوالجوشن!
اب تلوار نیام میں کرلے" صمیل جس پر اس وقت خون چڑھا ہوا تھا بولا "اسے ابوعطا!

[1] یہ سرقسطہ کا رہنے والا ایک عیسائی تھا جو سالتم کے مقام پر بت پرستوں کے ہاتھ سے قتل ہوکر مسیحی
شہید مانا گیا، اسی شہید کے نام سے گرجا کا نام ہوا۔

بیٹھ جا، آج کا دن تیرے لیے اور تیری قوم کے لیے بڑی عزت کا ہے" ابوعطار اتنا سنکر بیٹھ گیا اور صمیل پھر کشت و خون میں اُسی طرح مصروف ہو گیا، ابوعطار کو پھر تاب نہ رہی اپنے آدمیوں کو قتل ہوتے دیکھ کر اس پر ایک خوف اور الم طاری ہوا، کیونکہ یہ لوگ جو قتل کیئے جا رہے تھے گو یمنی تھے مگر ان کے شامی ہونے میں بھی کسی کو کلام نہ تھا، اور اب ابوعطار کو صمیل دوسرے ہی رنگ میں نظر آنے لگا، یعنی یہ کہ صمیل درحقیقت ابوعطا کے ہموطنوں کا دشمن اُن عراقیوں کی نسل کا آدمی ہے جو جنگِ صفین میں علیؓ کا ساتھ دے کر معاویہؓ کے شامیوں سے لڑے تھے، اتنا خیال آتے ہی ابوعطار پھر کھڑا ہوا اور صمیل سے کہنے لگا "اے اعرابی! اگر تجھ کو میرے ملکی بھائیوں کے خون میں ایسا لطف آ رہا ہے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تو اسوقت جنگِ صفین کو یاد کر رہا ہے بس اب اپنے خونی ہاتھ کو روک، ورنہ شمشیر زدن میں کل یمانیوں کو ان اسیروں کا حامی و مددگار بنا دوں گا" جب ابوعطار کے منہ سے یہ کلمے نکلے تو صمیل نے اپنی تلوار نیام میں کر لی اور اس طرح یہ خوں ریزی بند ہوئی۔

واقعہ شقندہ کے بعد یوسف کے اختیارات کو معرض بحث میں لانے کی کسی کو مجال نہ رہی تھی لیکن یوسف صرف نام کا امیر تھا، حکومت دراصل صمیل کرتا تھا یوسف صمیل کے ہاتھوں میں اپنی اس بیچارگی سے متنفر ہو گیا تھا، اور کسی طرح اپنے اس مشیر و وزیر سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے صمیل کو علاقہ سرقسطہ کا جو قرطبہ سے بہت دور تھا عامل مقرر کر کے اپنے پاس سے دفع کیا، صمیل نے اس منصب سے انکار نہیں کیا، بلکہ اس خیال سے بہت خوش ہو کر قبول کر لیا کہ سرقسطہ میں یمنی بکثرت آباد تھے اور وہاں کا حاکم ہونے کے بعد اُن پر سختیاں کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرتا رہے گا، لیکن حالات نے کچھ اور ہی صورت اختیار کی صمیل اپنے موالی غلاموں اور دوسرے قریشیوں کو ہمراہ لیے سرقسطہ میں وارد ہوا (۱۳۲ھ/۷۵۰ء) مگر اسی سال اسپین میں بڑی خشک سالی شروع ہو گئی تھی جو پانچ برس تک جاری رہی، قحط ایسا سخت و شدید تھا کہ نامہ و پیام کے ذرائع بھی تمام ہرکاروں کے مر جانے سے بند ہو گئے اور اسپین کے شمالی علاقوں میں جو بربر آباد تھے وہ بھی سب کے سب یک لخت ملک چھوڑ کر اپنے وطن افریقہ کو چلے گئے اس عالمگیر مصیبت کو دیکھ کر عاملِ سرقسطہ صمیل کے دل پر بڑا اثر ہوا، اس کی طبیعت میں رحمدلی اور جفاکاری دونوں اپنے اپنے وقت پر

شدت کے ساتھ ظاہر ہونے کے لیے موجود تھیں قحط کی مصیبت دیکھ کر انسانی ہمدردی کے جذبہ نے اپنا رنگ دکھایا، عداوت، کینہ اور بغض سب یک لخت فراموش ہوا، دشمن اور دوست معدی اور یمنی میں کچھ فرق نہ کیا، کسی کو روپیہ دیا، کسی کو غلام دیے اور روٹی سب کو دی اس رحم دلی اور سخاوت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی قصائی ہے جس کی تلوار سے اتنے سر کٹ کٹ کر قرطبہ میں گرجا کے فرش پر گرے تھے۔

دو تین برس اسی حال میں گذرے، اگر قلیبہ و یمانیہ میں ملاپ ہوتا ممکن ہوتا اور اگر اس وقت کی ہمدردی و سلوک کا نتیجہ یہ ہوتا کہ صمیل اور اس کے دشمنوں میں صلح ہو جاتی تو اسپین کو سالہاسال کے کشت و خون کے بعد کچھ دن امن و سلامتی کے میسر ہو جاتے، لیکن جس بیرحمی سے صمیل نے یمانیوں کو قتل کیا تھا وہ ایسا قصور تھا کہ خواہ کیسے ہی سلوک اس کی طرف سے ہوتے، معاف نہ ہو سکتا تھا، اس کی نسبت خیال تھا کہ موقع ملتے ہی وہ پھر ویسی ہی خونریزی شروع کر دے گا۔ جانبین کے سر برآوردہ لوگوں کے دلوں میں باہمی عداوت ایسی جاگزیں ہو گئی تھی کہ اگر مصالحت ہوتی بھی تو وہ امن کی محض ایک چندروزہ صورت ہوتی، یمانیہ دل سے یقین رکھتے تھے کہ اسپین کا مالک سوائے ان کے دوسرا نہیں ہو سکتا، اس لیے قیسیوں کی حکومت کو مان لینے کے کیا معنی، اُن کا مصمم قصد تھا کہ جو ملک اُن کے ہاتھ سے نکلا ہے، موقع ملتے ہی وہ اس کو پھر حاصل کر لیں، قریش کے بعض بڑے لوگوں کو بھی شکایت پیدا ہو چلی، چونکہ یہ قبیلہ وہ تھا جو رسولِ خدا صلعم کے وقت سے سب میں اعلیٰ اور افضل مانا جاتا تھا اس لیے یہ قریشی جو قریشی الاعالی تھے اس بات کو نہ دیکھ سکتے تھے کہ بنی فہر جن کا شمار قریش البطاح میں تھا اسپین میں حکومت کریں، قریش الاُعالی قریش البطاح کو کم درجے کا سمجھتے تھے۔

یہ خیال پہلے سے ہو سکتا تھا کہ اِن قریش الاعالی اور یمانیہ میں باہم سازش ہو جائیگی، (۱۵۸) چنانچہ اس میں کچھ زیادہ دیر بھی نہ لگی، صورت یہ ہوئی کہ اسی خاندانِ قریش کا ایک بڑا شخص عامر[1]

---

[1] عامر بنی عبدالدار کے ایک نوجوان شخص تھے، اندلس میں یہ بہت نامور اور ممتاز ہو گئے تھے، یہ ابو عدی کی اولاد میں تھے، اور ابو عدی بھائی تھے مصعب ابن ہاشم کے، جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب تولے تھے، علمبرداری کی خدمت جنگِ احد اور بدر میں انہی کے سپرد رہی تھی (مترجم)

زمانہ میں قرطبہ میں موجود تھا، یہ پہلے شمالی اندلس والے لشکر کا سپہ سالار تھا، جہاں عیسائیوں سے مسلمانوں کا اکثر مقابلہ رہتا تھا، یوسف الفہری، عامر سے کشیدہ خاطر تھا، اس لیے عامر کو اس نے معزول کر دیا، اب عامر نے یہ چاہا کہ یمانیہ کو یوسف کیساتھ جو عداوت ہے اُس سے اپنا کوئی نفع نکالے، چنانچہ یہ ظاہر کر کے کہ عباسی خلیفہ (ابو جعفر منصور) نے اُس کو اسپین کا امیر مقرر کر دیا ہے۔ عامر یمانیہ کا سردار بن گیا، اور شہر قرطبہ کے مغرب میں جہاں کچھ زمین اُس کی ملکیت سے تھی وہاں اپنے رہنے کے لیے ایک قلعہ بنوانا شروع کیا، اس قلعہ کے تعمیر ہونے کے بعد اس کا ارادہ تھا کہ کسی دن یوسف پر حملہ کرے، اس میں کامیابی کی بھی اُمید اس کو تھی، کیونکہ قرطبہ میں امیر اندلس یوسف کی حفاظت کے لیے صرف پچاس سواروں کا ایک رسالہ رہا کرتا تھا، عامر نے سوچا تھا کہ اگر اس حملہ میں کامیابی نہ ہوئی تو بھی کچھ اندیشہ کی بات نہ ہوگی، کیونکہ اس صورت میں وہ فوراً اپنے قلعہ میں پناہ لے کر یمانیہ سے کمک پہنچنے کا منتظر ہو سکیگا جن سے پہلے ہی اس نے سازش کر لی تھی۔

یوسف کو عامر کے ان ارادوں کا حال معلوم ہو گیا، اُس نے عامر کو گرفتار کرنا چاہا لیکن یوسف کو پتہ چل گیا کہ عامر ہشیار ہو چکا ہے، اس لیے بغیر صمیل کے مشورے کے اُس نے اس معاملہ میں مزید کارروائی ملتوی کر دی اور صمیل سے جو قرطبہ سے کوسوں دور رہتا تھا عامر کے متعلق تمام امور میں رائے طلب کی، عامل سرقسطہ نے جواب دیا کہ عامر کو فوراً قتل کر دیا جائے لیکن عامر خوش قسمت تھا، قصر امارت کے ایک جاسوس نے اس کو اس خطرہ سے آگاہ کر دیا اور عامر فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر سرقسطہ کی طرف چل پڑا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ شام کے رہنے والے یمانیہ تو شقندہ کی لڑائی میں اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ ان سے زیادہ توقع رکھنی درست نہیں البتہ شمال مشرقی اضلاعِ اسپین کے یمانیہ اس کی بخوبی مدد کر سکیں گے، لیکن جب تک عامر سرقسطہ کے علاقہ میں پہنچے، ایک دوسرا قریشی جسکا نام حباب بن رواحہ الزہری تھا سرقسطہ میں علم بغاوت بلند کر چکا تھا، اب عامر نے اس امر کی تحریک کی کہ صمیل کی مخالفت میں خود عامر کو اور حباب کو مل کر کام کرنا چاہیے چنانچہ ان دونوں سرداروں نے باہمی ملاقات کی اور اس بات پر رضامند ہو گئے کہ یمانیہ اور بربر کو یوسف اور اس کے ماتحت سردار صمیل کے

مقابلہ میں اس بنا پر آمادہ جنگ کر دیں کہ عباسی خلیفہ نے عامر کو امیر اندلس مقرر کیا ہے، عامر اور حباب کی متحدہ جمعیت نے صمیل کی فوج کو جو اس نے ان باغیوں کے مقابلہ کے لیے بھیجی تھی شکست دے دی اور اس شکست کے بعد یمانیہ اور بربر نے سرقسطہ کا محاصرہ کر لیا۔ (۱۳۶ھ، ۱۳۷ھ — ۷۵۳ء، ۷۵۴ء)

سرقسطہ کا جس وقت اس دشمن نے محاصرہ کر لیا تو صمیل نے یوسف کو کمک کے لیے لکھا لیکن یوسف نے کمک نہ بھیجی، کیونکہ یوسف کی حالت اس وقت ایسی مجبوری کی تھی کہ وہ صمیل کے لیے فوج فراہم نہ کر سکا، صمیل کو جب کمک نہ پہنچی تو یوسف کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے بنی قیس سے مدد کی درخواست کی بنی قیس اس وقت قنسرین اور دمشق والے لشکروں میں جو صوبہ جیان اور صوبہ البیرہ میں رہتے تھے بکثرت موجود تھے، صمیل نے ان کو لکھا کہ "میں اس وقت نہایت خطرناک حالت میں ہوں، لیکن اگر تھوڑی سی بھی مدد مل جائے تو اس خطرے سے مجھے نجات مل سکتی ہے" مگر حالت یہ تھی کہ یہ تھوڑی سی مدد ملنی بھی اس وقت مشکل نظر آ رہی تھی عبید کلابی نے جو صمیل کا بڑا دوست اور بنی قیس میں صمیل کے بعد سب سے بڑا سردار مانا جاتا تھا جیان اور البیرہ کے اضلاع میں قنسرین اور دمشق والوں کے لشکروں میں دورہ کرنا شروع کیا جو لوگ بھر وسے کے معلوم ہوئے ان کو آمادہ کیا کہ مسلح ہو کر سرقسطہ کی طرف کوچ کریں کلاب محارب[1]، سلیم، نصر اور ہوازن کے قبیلوں نے خود ہی اس مہم میں شریک ہونے کا قصد ظاہر کیا، لیکن بنی غطفان کا اس وقت کوئی سردار نہ تھا، ابو عطار کا انتقال ہو چکا تھا، اور ابھی تک کوئی دوسرا سردار منتخب نہ ہوا تھا، اس لیے یہ قبیلہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا، اور ٹھیک ٹھیک جواب دینے میں لیت و لعل کرتا رہا، قبیلہ کعب ابن عامر صمیل سے جلتا تھا اور چاہتا تھا کہ صمیل کو مدد نہ پہنچے اور وہ ہلاک ہو جائے، لیکن جب عبید کے اصرار پر بنی غطفان نے مدد دینے

---

[1] قبیلہ محارب جس میں اس کی تین شاخیں یعنی قشیر، عصیل اور حریش کے قبیلے شامل تھے، شکایت سے خالی نہ تھا، وجہ یہ تھی کہ جس زمانہ میں بلج بن بشیر القشیری۔ اندلس میں شامیوں کا سردار تھا تو سرداری کا منصب محارب میں محفوظ تھا، اب یہ منصب بنی کلاب کی طرف منتقل ہو گیا تھا، اور بنی کلاب ہی سے صمیل اور عبید تھے۔

کا وعدہ کرلیا تو قبیلہ کعب ابن عامر نے بھی تمام باتوں پر غور کرکے یہی مناسب سمجھا کہ وہ بھی اور ان کے ساتھ ہو جائیں۔ کیونکہ اگر الگ رہے تو سب کی دشمنی مول لینی ہوگی اور ان کی اصلی غرض بھی پوری نہ ہوگی، کیونکہ صمیل کو ہر حالت میں مدد پہنچ کر رہائی مل جائے گی، اور پھر وہ ان کی مدد کا محتاج بھی نہ رہے گا

آخر کار بنی قیس کے کل قبیلوں نے تھوڑی تھوڑی جماعتیں صمیل کی کمک کے لیے روانہ کردیں، پیدلوں کی تعداد معلوم نہیں، لیکن سواروں کی تعداد ۲۶۰ سے زیادہ نہ تھی، بنی قیس یہ دیکھ کر کہ ان کی مجموعی قوت بھی دشمن کے مقابلہ کے لیے کافی نہیں ہے ہمت ہارنے لگے، لیکن ان ہی میں سے ایک شخص کھڑا ہوا، اور ان کے اس تذبذب کو یہ کہہ کر دفع کردیا قیسیو! ہم صمیل جیسے لائق سردار کو جو خطرے کی حالت میں ہے یونہی نہیں چھوڑ سکتے، ہمارا فرض ہے کہ اس کی جان بچانے میں اپنی جان گنوا دیں۔" اس مختصر تقریر سے ہاری ہوئی ہمت پھر جاگ اٹھی اور سب قیسیوں نے مل کر سرقسطہ کے قصد سے طلیطلہ والی سڑک اختیار کی، قبیلہ کعب ابن عامر کے سردار ابن شہاب کو اس مہم کا سردار بنایا گیا تھا، یہ تقرر عبید کلابی کے مشورے سے ہوا تھا، حالانکہ اس سرداری کا مستحق خود عبید تھا لیکن وہ نیک نیت اور فیاض آدمی تھا، اس نے ایسے قبیلے کے سردار کو اس مہم کا سپہ سالار قرار دیا جو پہلے اس مہم کا سخت مخالف تھا، اس امید میں کہ اس قدر افزائی سے وہ صمیل کے معاملہ میں جان و دل سے مصروف ہو جائے گا، یہ مہم ۱۳۸ھ ۷۵۵ء کی ابتدا میں روانہ ہوئی۔

جب بنی قیس کا یہ لشکر وادی آنہ کے کنارے پہنچا تو وہاں قبیلہ بکر بن عائل اور قبیلہ بنی (۱۴۰) علی سے ملاقات ہوئی، یہ دونوں قبیلے گو قیسی نہ تھے لیکن بطون معد سے تھے اور ان کو اس مہم کیساتھ ہمدردی تھی، چنانچہ انھوں نے اپنے قبیلوں کے چار سو سواروں سے زائد اس لشکر کے ہمراہ کردیے، اس طرح مزید قوت کیساتھ لشکر طلیطلہ پہنچا، یہاں معلوم ہوا کہ سرقسطہ کے محاصرے میں دشمن نے ایسی سختی اختیار کی ہے کہ عنقریب صمیل اپنے تئیں دشمن کے حوالے کرنے والا ہے، اس خیال سے کہ اب وقت پر پہنچنا دشوار ہے لیکن صمیل کو اتنا تو معلوم ہو جائے کہ کمک آرہی ہے انھوں نے اپنے ہی لوگوں میں سے ایک شخص کو سرقسطہ روانہ کیا اور اسکو

حکم دیا کہ محاصرین کی جماعت میں سے نکل کر جس طرح بن پڑے فصیل شہر کے پاس پہنچ جائے اور اس کاغذ کو جو دیا جاتا ہے ایک پتھر میں اچھی طرح باندھ کر فصیل پر سے شہر کے اندر پھینک دے۔ اس کاغذ پر دو شعر اس مضمون کے لکھے تھے۔

اے محصورو! خوش ہو جاؤ کہ کمک تمہارے پاس پہنچنے کو ہے اور بہت جلد وہ تم پر سے اس محاصرے کو اٹھا دے گی، آل نزار کے بڑے بڑے شہسوار عوج کی عمدہ نسل والی گھوڑیوں پر سوار تمہاری رہائی کے لیے آ رہے ہیں[1]

قاصد نے جس طرح اس کو حکم دیا گیا تھا اس کی بجا آوری کی، شہر والوں نے پتھر پر لپٹا ہوا کاغذ اٹھا لیا اور اسے صمیل کے پاس لے گئے، صمیل نے اسے پڑھوا کر سنا اور فوراً محصوروں کی ہمت بڑھانے کے لیے اس مژدے سے ان کو آگاہ کیا، اب تلوار کا ایک ہاتھ بھی نہ چلنے پایا تھا کہ یہ معرکہ ختم ہو گیا، اس خبر کے مشہور ہوتے ہی کہ بنی معد ان پہنچے ہیں، عامر اور حباب نے اس خوف سے کہ کہیں دشمن چاروں طرف سے ان کو نہ گھیر لے محاصرہ اٹھا لیا، بنی قیس اور ان کے ہمراہی شہر سرقسطہ میں داخل ہوئے، صمیل نے نہایت کشادہ دلی سے بنی قیس کو ان کی خدمات کے صلہ میں بڑے بڑے انعام دیے۔

اس لشکر میں جو صمیل کی مدد کو آیا تھا تیس موالی بنی امیہ کے بھی تھے، یہ لوگ لشکرِ دمشق کے تھے جو صوبہ البیرہ میں آباد ہو چکے تھے، یہ بنی امیہ ایک مدت سے معدیوں کے ہوا خواہ چلے آتے تھے، اور جنگِ شقندہ میں وہ یوسف اور صمیل کی سرکردگی میں بڑی ہمت اور جوانمردی سے لڑے تھے، اسلیے یوسف اور صمیل دونوں ان لوگوں کی بڑی عزت کرتے تھے، اس وقت یہ تیس سوار بنی قیس کے لشکر کے ساتھ محض اس غرض سے نہیں آئے تھے کہ

---

[1] اصل عربی اشعار یہ ہیں۔

تَبَشَّرْ بِالسَّلَامَةِ يَا جِدَارُ ۔۔۔ أَتَاكَ الْغَوْثُ اِنْقَطَعَ الْحِصَارُ

أَتَتْكَ بَنَاتُ أَعْوَجَ مُلْجَمَاتٍ ۔۔۔ عَلَيْهَا الْأَكْرَمُوْنَ وَهُمْ نِزَارُ

[2] عرب کے دستور کے مطابق بنی امیہ کے موالی بھی بنی امیہ ہی سمجھے اور کہے جاتے تھے۔

اپنے دوست صمیل کو محاصرے سے نجات دیں، بلکہ اُن کا اصلی مقصود یہ تھا کہ ایک نہایت اہم معاملہ میں جو اس وقت درپیش ہو گیا تھا۔ صمیل سے رائے طلب کریں، اس معاملہ کی پوری کیفیت بیان کرنے کے لیے ہم کو اُن حالات کی طرف رجوع کرنا ہو گا جو اب سے پانچ برس پہلے وقوع میں آئے تھے۔

اسناد:-

اخبار مجموعہ۔ ص ۶۲ - ۷۸، ۸۱
مقری کتابِ ششم
ابن العذاری - ج ۲ ص ۳۵ - ۳۸، ۴۳ - ۴۵
ابن الابار - ص ۴۶ - ۵۰، ۵۲، ۵۴
یبیدور ص ۶۸، ۷۰، ۷۵
ابن الخطیب (قلمی نسخہ ۴) مضمون "صمیل"
ابن القوطیہ - ص ۱۶ - ۱۷
ابن خلدون - کتابِ ثانی - ص ۱۷۷

کتاب اول

خانہ جنگی

(۱۶)

تیرھویں فصل

عبدالرحمٰن بن معاویہ کی پریشان گردی

۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲ھ مطابق ۵ اگست ۷۵۰ء کو خلفائے بنی اُمیہ کا آخری تاجدار مروان بن محمد بن مروان بن الحکم مصر میں قتل کر دیا گیا، جہاں اُس نے اپنے دشمنوں سے پناہ لی تھی اس کے بعد اموی خاندان شاہی کے لوگوں پر جور و عقوبت کا دروازہ کھل گیا، بنی عباس جو اب سلطنت کے مالک ہو گئے تھے، چاہتے تھے کہ بنی اُمیہ کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے، خلیفہ ہشام کے پوتے ابان بن معاویہ کو گرفتار کر لیا، ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹ کر گدھے پر سوار کرایا، اور اسی حال میں گاؤں گاؤں اُس کی تشہیر کی۔ پیچھے پیچھے ایک آدمی پکارتا چلا "دیکھو ابان بن معاویہ کو، خاندان مروانیہ کا یہ سب سے بڑا شہسوار ہے۔" اس درجے کو پہنچانے کے بعد ابان کو قتل کر دیا، خلیفہ ہشام کی لڑکی شہزادی عبدہ سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنا زر و جواہر کہاں دفن کیا ہے؟ جب اُس نے نہ بتایا تو اُس کی بھی گردن اُڑا دی، غرض بنی اُمیہ پر ظلم کرنے میں اتنی زیادتی کی کہ اس زیادتی ہی سے اصل

مطلب فوت ہوگیا، اور اُن کے بہت سے لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بیابان میں نکل گئے اور وہاں بدویوں کے گھروں میں چھپ بیٹھے، اب عباسیوں نے یہ دیکھ کر کہ شکار ہاتھ سے نکلا جاتا ہے بغیر حیلے کے اُسکو پھر دامِ ہلاکت میں پھنسانا ممکن نہیں، خلیفہ ابوالعباس کے نام سے ایک اشتہار جاری کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ "بنی اُمیہ واقعی بہت قتل ہو چکے ہیں، لیکن اب جو باقی رہ گئے ہیں اُن کو امان دی جاتی ہے" ستر سے زیادہ اُموی اس دھوکے میں آ گئے اور وہ سب کے سب ایک دعوت کے موقع پر مار مار کر ہلاک کر دیئے گئے۔

شروع میں جب اموی شہزادوں کا قتلِ عام عمل میں آیا تو خلیفہ ہشام کے دو پوتے یحییٰ اور عبدالرحمان اس ہنگامہ سے بھاگ کر کہیں جا چھپے تھے، جس وقت اشتہارِ امن جاری ہوا، تو یحییٰ اپنے بھائی عبدالرحمٰن سے کہنے لگا "ابھی ہم کو ظاہر ہونے میں جلدی نہ کرنی چاہیئے دیکھ لینا چاہیئے کہ انجام کیا ہوتا ہے؟ اگر خیریت رہی تو جب کبھی عباسیوں کا لشکر قریب آئیگا اس میں بھرتی ہو کر باہر چلے جائیں گے، اشتہار میں جس امان کا وعدہ کیا گیا ہے اس پر ابھی تک مجھکو اطمینان نہیں ہے، اس لیے ایک آدمی کو لشکر کیطرف بھیجتا ہوں تاکہ اُن عزیزوں کا حال دریافت کرے جو اشتہار پڑھ کر ظاہر ہو گئے ہیں"۔

اس قاصد نے جب ستر امویوں کو ہلاک ہوتے دیکھ لیا تو دوڑا ہوا یحییٰ کے پاس آیا، اور کل کیفیت بیان کی، اس قاصد کے پیچھے پیچھے عباسیوں کے سپاہی لگے ہوئے تھے، جن کو
۱۳۲ھ حکم تھا کہ یحییٰ اور عبدالرحمٰن کا سر اتار لیں، یحییٰ ان سپاہیوں کو دیکھ کر ایسا بدحواس ہوا کہ بھاگنے کا کوئی رستہ نظر نہ آیا، اور سپاہیوں نے اُسے گرفتار کر کے وہیں قتل کر دیا، عبدالرحمٰن کی جان اس طرح بچ گئی کہ وہ وہاں موجود نہ تھا، شکار کھیلنے گیا ہوا تھا، رازداروں نے رستہ ہی میں بھائی کے قتل کی خبر سنائی، عبدالرحمٰن اندھیری رات میں چھپتا چھپاتا گھر آیا، اور یہاں آکر اپنی بہنوں سے کہا کہ "میں تو اب بھاگتا ہوں، فرات کے قریب ایک گاؤں میں جا کر پناہ لیتا ہوں وہاں اپنا ایک مکان بھی ہے تم بھی میرے لڑکے اور چھوٹے بھائی کو لے کر جس قدر جلد ممکن ہو وہاں چلی آؤ۔

شہزادہ عبدالرحمٰن اُس گاؤں میں خیریت سے پہنچ گیا، اور بہت جلد اُس کی بہن، لڑکا

اور بھائی بھی وہاں آ گئے، یہاں عبدالرحمٰن کا ارادہ زیادہ رہنے کا نہ تھا، بلکہ بہت جلد افریقہ چلے جانے کا تھا، لیکن اس خیال سے کہ یہ جگہ بہت پوشیدہ اور محفوظ ہے، دشمن کو آسانی سے پتہ نہ چلے گا، وہ کچھ دن اس امید میں اور وہاں ٹھہرا رہا کہ جب خطرہ کم ہو جائے گا تو افریقہ کا دور دراز کا سفر اختیار کرے گا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ عبدالرحمٰن آشوبِ چشم کی وجہ سے ایک تاریک کمرہ میں لیٹا ہوا تھا کہ یکایک اس کا چار برس کا لڑکا سلیمان جو گھر کی دہلیز سے باہر کھیل رہا تھا، بہت ڈرا ہوا اور روتا ہوا دوڑ کر کمرے میں آیا اور باپ کے سینہ سے لپٹ گیا، عبدالرحمٰن نے کہا "دیکھو بیٹا میری طبیعت اچھی نہیں ہے، یہ تم کو ہوا کیا؟ کس چیز سے ڈر گئے ہو؟ بچے نے پھر اپنا منہ باپ کی گود میں چھپا لیا، کچھ کہتا بھی جاتا تھا اور سسکیاں بھر کر روتا بھی جاتا تھا۔ عبدالرحمٰن نے یہ کہہ کر کہ "آخر یہ ماجرا کیا ہے؟" اٹھا کمرے کا دروازہ کھولا جب باہر آکر ادھر اُدھر دیکھا تو دور سیاہ پھریرے نظر آئے، بچے نے بھی یہی کالے کالے جھنڈے دیکھے تھے اور اس کو خوب یاد تھا کہ ایک دفعہ اور بھی جہاں پہلے رہا کرتے تھے یہی سیاہ پھریرے نظر آئے تھے اور اس کا چچا مار ڈالا گیا تھا، عبدالرحمٰن یہ دیکھتے ہی گھر کے اندر آیا، کچھ اشرفیاں جیب میں ڈالیں اور اپنی دونوں بہنوں سے اتنا کہہ کر کہ اب مجھے یہاں سے بھاگنا چاہیے، رخصت ہوا اور یہ بھی کہتا گیا کہ میرے آزاد غلام بدر سے کہہ دینا کہ میں فلاں جگہ جا رہا ہوں وہیں آجائے اور اتنا ضروری سامان بھی ساتھ لیتا آئے کہ خدا کو منظور ہو تو جان سلامت رہے۔"

اب ان کالے پرچم والے سواروں نے گاؤں کو سب طرف سے گھیر لیا اور پھر اُس مکان پر آئے جہاں اس اموی خاندان نے پناہ لی تھی، یہاں سوائے دو عورتوں اور ایک بچے کے کوئی نظر نہ آیا، اُن کو سواروں نے کچھ گزند نہ پہنچایا، اسی اثنا میں عبدالرحمٰن اور اس کا چھوٹا بھائی جس کی عمر تیرہ برس کی تھی گاؤں سے کچھ دور ایک جگہ چھپ کر بیٹھ رہے تھے چھپنا کچھ مشکل بھی نہ تھا، کیونکہ اس نواح میں جھاڑیاں اور درخت کثرت سے تھے، جب بدر بھی آگیا تو یہ دونوں بھائی چلتے چلتے فرات کے کنارے پہنچے، یہاں عبدالرحمٰن کو اس کا ایک ملاقاتی ملا اس شخص کا اعتبار کر کے عبدالرحمٰن نے اُس کو کچھ روپیہ دیا کہ گھوڑے اور کھانے پینے کی چیزیں

خرید کر لاوے، بدقسمتی سے ایک غلام نے عبدالرحمٰن اور اس شخص کی باتیں سن لیں، سنتے ہی (۱۲۳)
انعام کے لالچ میں یہ بے ایمان غلام بھاگا اور عباسی سواروں کو بتا دیا کہ فراری کہاں چھپے ہوئے ہیں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ عبدالرحمٰن اور اس کے بھائی نے دفعتہً گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنی، اُنھوں نے فوراً نکل کر ایک باغ میں چھپنا چاہا، مگر سواروں نے دیکھ لیا، اور انھوں نے باغ کو چاروں طرف سے گھیرنے کی کوشش کی، معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اب چشم زدن میں یہ دونوں بھائی قتل کر دیے جائیں گے، جان بچانے کی اب صرف ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ فرات میں کود پڑیں اور تیر کر پار چلے جائیں، دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا، اس کوشش میں طرح طرح کے خطرے بھی تھے لیکن جان سے مایوس تو ہو ہی چکے تھے۔ بلا تامل دریا میں کود پڑے، سواروں نے یہ دیکھ کر ان کو آوازیں دینی شروع کیں "پلٹ آؤ، پلٹ آؤ، تم کو کچھ گزند نہ پہنچائیں گے" عبدالرحمٰن ان وعدوں کو خوب سمجھتا تھا، اُس نے اور تیزی کے ساتھ تیرنا شروع کیا جب منجدھار میں پہنچا تو کچھ دیر دم لیا، چھوٹا بھائی جو تیرنے میں پیچھے رہ گیا تھا۔ اُس کو آواز دی کہ "تیزی سے تیرو" لیکن اب اس غریب نوعمر لڑکے کو جو عبدالرحمٰن کی طرح بڑا بیباک بھی نہ تھا اپنی جان کا خوف پیدا ہو چلا تھا، سواروں کے کہنے میں آگیا اور پلٹ کر جس کنارے سے آیا تھا اُدھر ہی کو تیرنے لگا، عبدالرحمٰن یہ دیکھتے ہی چلایا "بھائی! بھائی! یہ کیا کرتا ہے؟ میرے پیچھے چلا آ، ان سواروں کے کہنے میں نہ آ" لیکن عبدالرحمٰن کے چیخنے پکارنے سے کچھ نہ ہوا، سوار کنارے پر آپس میں کہنے لگے ایک تو مل جائے گا مگر دوسرا نکل گیا اس پر ایک سوار نے کپڑے اُتار کر چاہا کہ تیر کر عبدالرحمٰن کا راستہ روکے، لیکن دریا کا پاٹ اتنا تھا کہ کچھ نہ ہو سکا اور عبدالرحمٰن کا پیچھا کسی نے نہ کیا، لیکن افسوس جب عبدالرحمٰن پار اُتر لیا تو اُس نے دیکھا کہ دوسرے کنارے پر سواروں نے اس کے چھوٹے بھائی کو قتل کر ڈالا۔

عبدالرحمٰن فرات کے کنارے سے بھاگ کر فلسطین میں بخیریت پہنچ گیا، یہاں اس کا وفادار مولیٰ بدر اور اُس کی بہن کا آزاد غلام سالم بھی کچھ روپیہ اور جواہرات لے کر آ ملے، اور یہ تینوں فلسطین سے بعزم افریقہ روانہ ہو گئے، افریقہ میں عباسیوں کی حکومت ابھی تک تسلیم نہیں کی گئی تھی اور یہاں بہت سے مروانی شہزادے جان بچا کر چلے آئے تھے، فلسطین سے

افریقہ کا سفر بھی بخیریت تمام ختم ہوا۔ افریقہ کا ملک ایسا تھا کہ عبدالرحمٰن اگر چاہتا تو وہاں خیر و سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کر لیتا، لیکن طبیعت ایسی نہ رکھتا تھا کہ ایک معمولی آدمی کی طرح گمنامی میں زندگی کے دن کاٹ دیتا، اس بیس برس کے نوجوان شہزادے کے دل و دماغ میں بڑے بڑے عزم اور حوصلے بھرے ہوئے تھے، بلند قامت، طاقتور، بہادر، اعلیٰ درجہ کا تعلیم و تربیت یافتہ طبیعت میں جوش اور امنگ، ایسے شخص کا نصب العین سوائے اس کے کیا ہو سکتا تھا کہ جاہ و منزلت کے اونچے زینے پر پہنچے، بچپن کی بعض باتیں ایسی یاد آیا کرتی تھیں کہ اس وقت کی تنگ دستی اور آوارہ گردی میں حوادث و خطرات کے جھیلنے پر اور بھی طبیعت کو آمادہ رکھتی (۱۶۴
تھیں عربوں میں یہ اعتقاد عام تھا کہ ہر شخص کا مقدر اس کے چہرے پر لکھا ہوتا ہے، عبدالرحمٰن میں یہ اعتقاد سب سے بڑھا ہوا تھا، کیونکہ اس کے دادا مسلمہ بن عبدالملک نے جو علوم سری اور غیبی میں بڑی شہرت رکھتا تھا، عبدالرحمٰن کے بشرہ کو دیکھ کر ایک پیشین گوئی کی تھی جو عبدالرحمٰن کی دلی تمناؤں سے بھی مطابق ہوتی تھی، عبدالرحمٰن اس وقت دس برس کا تھا، اسکے باپ معاویہ بن ہشام کا انتقال ہو چکا تھا، ایک دن وہ اور اس کے سب بھائی ملازموں کے ساتھ رصافہ کو جاتے تھے، رصافہ قنسرین کے علاقہ میں ایک بڑا عالیشان قصر تھا جہاں امیر المومنین خلیفہ ہشام اکثر سکونت رکھا کرتے تھے، یہ بچے جب قصر کے دروازے کے پاس پہنچے تو ادھر سے مسلمہ برادر خلیفہ ہشام گھوڑے پر سوار آ رہے تھے، بچوں کو دیکھ کر گھوڑوں کو روکا اور پوچھا کہ یہ کس کے بچے ہیں؟ جب معلوم ہوا کہ معاویہ مرحوم کے بچے ہیں تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور یہ کہہ کر کہ "معاویہ کے یتیم ہیں" ملازم کو حکم دیا کہ "وہ دو بچوں کو اٹھا کر قریب سے دکھائے" سب بچوں میں عبدالرحمٰن سب سے بھلا اور پیارا معلوم ہوا اُسے اپنے سامنے کاٹھی پر بٹھا کر بہت پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے، اس وقت اتفاق سے خلیفہ ہشام محل سے نکلے، مسلمہ کو دیکھ کر پوچھنے لگے "یہ کس کا بچہ ہے؟" مسلمہ نے کہا "معاویہ مرحوم کا" اتنا کہہ کر مسلمہ ہشام کی طرف جھکے اور اُن کے کان میں کہنے لگے کہ "وہ امر اب عنقریب پیش آنے والا ہے اور یہی بچہ وہ مرد نکلے گا جس کی نسبت آپ کو خاص خاص باتیں معلوم ہو چکی ہیں" خلیفہ ہشام نے پوچھا "کیا واقعی تم کو اس کا یقین ہے؟" مسلمہ بولے "میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ

اس بچے کے چہرے اور گردن پر صاف صاف علامتیں اس بات کی موجود ہیں"۔ یہ باتیں اگرچہ مسلمہ نے ہشام کے کان ہی میں کہی تھیں مگر اتنی آواز سے کہی تھیں کہ عبدالرحمٰن ان کو بخوبی سن سکا تھا۔

عبدالرحمٰن کو یہ بھی یاد تھا کہ اُس دن سے اس کے دادا خلیفہ ہشام کی ایک خاص نظر التفات اس پر رہنے لگی تھی، بچوں کو جو چیزیں بھیجی جاتی تھیں ان میں ہمیشہ کوئی چیز ایسی بھی ہوتی تھی، جو خاص عبدالرحمٰن کیلئے ہوتی دوسرے بھائیوں کی اس میں شرکت نہ ہوتی تھی اور مہینے میں ایک بار اس کو محل میں آنے کا بھی حکم دے دیا تھا۔

عبدالرحمٰن میں اتنی سمجھ نہ تھی کہ مسلمہ کی گفتگو کا مفہوم سمجھ لیتا، لیکن لوگوں میں اس وقت بہت سی باتیں آئندہ کی نسبت مشہور ہو چلی تھیں بنی امیہ کی حکومت کو چند سخت صدمے پہنچ چکے تھے، لوگوں کی طبیعتوں پر ایک فکر رہنے لگا تھا۔ اس حالت میں شاہی خاندان کے لوگ اکثر منجموں، رمالوں اور ایسے ہی اور لوگوں سے جن کو زمانہ مستقبل پر سے نقاب اٹھا دینے کا دعویٰ ہوتا تھا۔ آئندہ کے حالات دریافت کرتے رہتے تھے، ان پیشہ ور غیب دانوں کا حال یہ تھا کہ اپنے سرپرستوں اور مربیوں سے بڑے بڑے انعام اور عطایا پایا کرتے تھے اس لئے نہ تو کوئی بری خبر سنا کر ان کو مایوس کرنا چاہتے تھے اور نہ کوئی اچھی خبر کہکر جو آئندہ غلط نکلے ان میں بڑی بڑی توقعات پیدا کرنی چاہتے تھے۔ اس لیے ہر پیشین گوئی میں اپنا مسلک بین بین رکھتے تھے۔ یہ خبر انہوں نے سنا دی تھی کہ بنی امیہ کی سلطنت جاتی رہے
(۱۹۵) گی۔ لیکن اسی خاندان کا ایک شخص اسی سلطنت کو کسی دوسرے مقام پر قائم کرے گا۔ مسلمہ کو بھی اور لوگوں کی طرح اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا۔

پس عبدالرحمٰن کو اپنی نسبت اس کا کامل یقین تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ صاحب تاج و تخت ہو جائے گا، گو یہ نہیں معلوم تھا کہ کس ملک میں یہ دولت اور عزت ملے گی، مشرق تو ہاتھ سے نکل ہی چکا تھا۔ ادھر کسی قسم کی امید نہ ہو سکتی تھی، افریقہ اور اسپین البتہ باقی تھے مگر ان دونوں پر ایک فہری خاندان مستقل طور پر صاحب حکومت بننا چاہتا تھا

آج کل افریقہ پر یا یہ کہیئے کہ افریقہ کے اس حصہ پر جو دولت عرب کے قبضہ

ہیں رہ گیا تھا[1]، وہ شخص حکومت کر رہا تھا جس سے ہم اسپین میں ملاقات کر چکے ہیں اور جس نے امیر اندلس بننے کی کوشش بھی کی تھی مگر کامیابی نہیں ہوتی تھی یہ شخص عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری، امیر اندلس یوسف الفہری کا رشتہ دار تھا ابن حبیب نے ابھی تک خلافت عباسیہ کی اطاعت قبول نہیں کی تھی، اسی خیال سے وہ اکثر منجموں اور رمالوں سے اپنی اولاد کے مستقبل کی نسبت سوالات کیا کرتا تھا، عبدالرحمٰن بن معاویہ کے آنے سے پہلے کا ذکر ہے کہ ابن حبیب کے دربار میں ایک یہودی آیا، جو علوم سری میں مسلمہ بن عبدالملک کا شاگرد اور اسی کے پاس سے یہاں آیا تھا۔ اس یہودی نے یہ پیشین گوئی کی کہ شاہی خاندان بنی امیہ کا ایک شخص جس کا نام عبدالرحمٰن ہوگا۔ اور جس کی پیشانی کے دونوں طرف گیسو دراز ہوں گے ایک ایسے خاندان کا بانی ہوگا۔ جو افریقہ پر[2] سلطنت کرے گا۔ ابن حبیب نے یہودی کے منہ سے یہ بات سن کر کہا۔ "چونکہ میرا نام عبدالرحمٰن ہے، اور میں افریقہ کا اس وقت مالک بھی ہوں اس لیے تمہاری پیشین گوئی کو اپنے حق میں صحیح کرنے کے لیے اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ پیشانی کے دونوں طرف ایک ایک گیسو رکھ لوں۔ اس پر یہودی نے کہا "نہیں! آپ سے مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ آپ شاہی خاندان سے نہیں ہیں"

اس کے بعد جب عبدالرحمٰن بن معاویہ افریقہ میں آیا اور ابن حبیب نے دیکھا کہ وہ دو گیسو رکھتا ہے تو اس نے فوراً یہودی کو طلب کر کے اس سے کہا کہ "غالباً یہی شخص ہے جس کی قسمت میں افریقہ کی حکومت اتری ہے کیونکہ اس میں وہ سب باتیں موجود ہیں جو تم نے اپنی پیشین گوئی میں بیان کی تھیں۔ لیکن اس سے ہونا کیا ہے۔ وہ مجھ کو حکومت سے

---

[1] افریقہ کے مغربی علاقوں نے عرب کی حکومت سے آزادی حاصل کر لی تھی

[2] تاریخ کے قلمی نسخہ میں یہاں اندلس لکھا ہے۔ مگر یہ کتابت کی غلطی ہے۔ یہودی نے غالباً افریقہ کہا تھا۔ چوں کہ اس کی پیشین گوئی غلط ثابت ہوئی اور عبدالرحمٰن فی الواقع اندلس میں صاحب حکومت ہوا، اس لیے آگے چل کر لکھنے والوں نے افریقہ کی جگہ اندلس لکھ دیا۔

محروم نہیں کر سکتا۔ میں اس کو بہت جلد قتل کر ڈالوں گا۔

یہودی جس کو بنی امیہ سے جو اس کے آقا رہ چکے تھے بڑا تعلق تھا۔ ابن حبیب کی یہ گفتگو سن کر بہت گھبرایا، اور سوچنے لگا کہ اس کی غیب دانی تو اس نوجوان مروانی کے حق میں سم قاتل ہونا چاہتی ہے، پس اس نے اپنے ہوش و حواس بجا رکھ کر عرض کیا۔ "حضور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس نوجوان شہزادے میں وہ سب باتیں موجود ہیں جو میں نے کہی تھیں، اگر میری پیشین گوئی کا آپ کو پورا یقین ہے تو اس سے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں یا تو یہ کہ یہ نوجوان عبدالرحمٰن وہ شخص نہیں ہے اس صورت میں اگر آپ نے اسے قتل کیا تو آپ ایک خون ناحق کے مرتکب ہوں گے، یا یہ کہ یہی وہ شخص ہے جو از روئے پیشین گوئی افریقہ کا بادشاہ ہونے والا ہے اس صورت میں آپ جو چاہیں سو کریں۔ اس کی جان آپ نہیں لے سکتے، کیونکہ کسی کے مقدر کو بدلنا ممکن نہیں ۱۶۶ء

یہودی کی اس دلیل کو معقول و مضبوط پاکر ابن حبیب نے شہزادہ عبدالرحمٰن کو قتل کرنے کا قصد ملتوی کر دیا، لیکن وہ نہ صرف عبدالرحمٰن بن معاویہ سے بلکہ اور جس قدر مروانی شہزادے عباسیوں کے خوف سے بھاگ کر افریقہ میں پناہ گزین تھے۔ ان کی طرف سے بھی سخت بدگمان ہو گیا تھا، اور ڈرتا تھا کہ کہیں کبھی یہ لوگ حکومت افریقہ کا دعویٰ نہ کرنے لگیں اس لیے وہ ان سے بہت خبردار رہتا تھا، ان شہزادوں میں خلیفہ ولید ثانی کے دو لڑکے بھی تھے، یہ دونوں اپنے باپ کا نمونہ تھے، جیسے وہ عیش پسند اور بدکار تھا جس نے ایک مرتبہ محل کی ایک عورت کو اپنی جگہ نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا اور جس نے (نعوذ باللہ) قرآن مجید پر تیر مارے تھے، وہی کیفیت ان لڑکوں کی تھی، ایک رات دونوں بیٹھے شراب[1] پی رہے تھے کہ ان میں سے ایک بولا "اس حماقت کو تو دیکھو ابن حبیب سمجھتا ہے کہ اس ملک کا وہی مالک ہو جائے گا، اور ہم جو خلفاء کی اولاد ہیں، یونہی ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے اور اس کو حکومت کرتے دیکھا کریں گے۔"

---

[1] ابن العذاری یہاں شراب کے نبیذ کا لفظ لکھتا ہے، جس کی حلت کا فتویٰ علماء نے دیدیا تھا (اسمٰعیل)

ابن حبیب دروازے کے قریب لگا کھڑا تھا، اس نے یہ سب باتیں سن لیں اور اب مصمم ارادہ کر لیا کہ ان خطرناک مہمانوں سے جلد اپنی گلو خلاصی کرے گا اور ان کو اسطرح قتل کرے گا کہ ان کی موت اتفاقی یا آپس کے کسی نزاع کا نتیجہ معلوم ہو، چنانچہ ان شہزادوں کے ساتھ اس نے اپنے برتاؤ میں کسی قسم کا فرق ظاہر نہ ہونے دیا اور جب وہ دونوں ملاقات کے لیے آئے تو حسب دستور ان سے بہت خاطر و مدارات سے ملا، لیکن جو اس کے معتمد اور مشیر تھے ان سے ذکر کر دیا کہ ان شہزادوں کی زبان سے اس اس طرح کی باتیں سنی ہیں اور اب وہ اس کی نظر میں ہیں انہی معتمدوں میں سے کسی شخص نے جو بنی امیہ کا ہمدرد تھا، شہزادوں کو صلاح دی کہ ابن حبیب کے انتقام سے اگر جان بچانی ہے تو فوراً افریقیہ سے بھاگ جائیں شہزادوں نے اس صلاح پر عمل کیا۔ ابن حبیب کو جب دفعۃً شہزادوں کے غائب ہو جانے کی اطلاع ملی اور کوئی وجہ بھی اس بات کی معلوم نہ ہوئی تو وہ سمجھا کہ یہ شہزادے ضرور کسی عرب یا بربر قبیلے کو بغاوت پر آمادہ کرنے گئے ہیں، فوراً ان کے تعاقب میں سوار دوڑا دیے ان سواروں نے شہزادوں کو جا پکڑا، اور گرفتار کر کے ابن حبیب کے پاس لے آئے! امیر نے ان کے اس بھاگنے کو اور ان الفاظ کو جو ان کی زبان سے سُنے تھے۔ کافی ثبوت ان کی نیت مجرمانہ کا سمجھ کر دونوں کو فوراً قتل کرا دیا۔ اس کے بعد ابن حبیب کا قصد ہوا کہ اور جس قدر اموی افریقیہ میں مقیم ہیں ان کا بھی کام تمام کر دیا جائے۔ لیکن ان لوگوں کو ان کے دوستوں نے خبردار کر دیا، اور وہ سب بھاگ کر بربر کے ان قبیلوں میں جو خود مختار ہو گئے تھے۔ پناہ گزین ہو گئے۔

عبدالرحمٰن بن معاویہ اس پریشان حالی اور آوارہ گردی میں کبھی ایک قبیلہ میں پناہ لیتا تھا، کبھی دوسرے میں کبھی اس شہر میں کچھ دن قیام کرتا، کبھی دوسرے شہر میں اسی حالت میں شمالی افریقہ کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک طے کر ڈالا۔ کچھ
مدت برقہ میں قیام کیا، وہاں سے نکل کر ملوک تاہرت یعنی بنی رستم کے ہاں پناہ لی اس (۶۷)
کے بعد بربر مکنسہ کے پاس رہنے کی درخواست کی، غرض پانچ برس اسی حال میں گذر گئے تاریخ سے اس بات کی شہادت مطلق نہیں ملتی کہ اس زمانہ میں عبدالرحمٰن بن معاویہ

کو کبھی اسپین میں اپنی تقدیر آزمائی کا خیال پیدا ہوا ہو، افریقہ البتہ وہ ملک تھا جس کی فکر میں یہ اولوالعزم شہزادہ ہمیشہ رہا کرتا تھا، اگرچہ نہ کوئی یار و مددگار تھا اور نہ پیسہ پاس تھا، لوگوں سے ملنے ملانے اور دوست و طرفدار پیدا کرنے کی دھن ہر وقت رہا کرتی تھی جب مکنسہ کے قبیلے نے اس کو اپنے ہاں سے نکال دیا تو وہ نواحِ سبتہ میں چلا آیا، یہاں بربر کا قبیلہ نفزہ رہتا تھا، عبدالرحمن کی ماں اسی قبیلہ کی تھی۔

آخر کار جب یقین ہو گیا کہ افریقہ میں قسمت بیدار نہ ہوگی تو اس نے سمندر پار اسپین کی طرف خیال دوڑایا، اسپین کے کچھ حالات اسے سالم سے معلوم ہوتے تھے، یہ اور بدر دونوں آزاد غلام اس کل زمانہ آوارہ گردی میں عبدالرحمن کے ساتھ رہے تھے، سالم کو موسیٰ بن نصیر کے ساتھ یا اس کے بعد اندلس دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور اس وقت وہ عبدالرحمن کو بہت کچھ مدد دے سکتا تھا، لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں وہ خفا ہو کر شام چلا گیا واقعہ یوں ہوا کہ ملکوں ملکوں پھرتے پھرتے تنگ آکر سالم چاہتا تھا کہ کوئی بہانہ ملے تو اس ساتھ سے پیچھا چھڑائے۔ اتفاق سے ایک دن بے وقت سو رہا تھا، عبدالرحمن نے آواز دی اس نے سنی نہیں عبدالرحمن کو غصہ آیا، ایک برتن میں پانی بھرا ہوا تھا۔ اسنے اٹھا کر پانی سالم پر پھینک دیا، سالم کو یہ بہت ناگوار ہوا، اور اتنا کہکر چلتا ہوا کہ "آپ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے ہیں کہ گویا میں کوئی معمولی غلام ہوں، اب میں آپ سے ہمیشہ کو رخصت چاہتا ہوں، مجھ پر آپ کا کوئی احسان نہیں ہے آپ کی بہن البتہ میری آقا اور سرپرست ہیں اور اب میں انہی کے پاس واپس جاتا ہوں"

دوسرا آزاد غلام یعنی بدر برابر اپنے آقا کے ساتھ رہا، اسی کو عبدالرحمن نے اسپین روانہ کیا تاکہ موالی بنی امیہ جو اس ملک میں موجود تھے ان سے اس کے بارے میں مشورہ طلب کرے یہ موالی تعداد میں چار سو یا پانچ سو کے قریب تھے ان کا تعلق لشکر دمشق یا قنسرین سے تھا، اور یہ دونوں لشکر صوبہ البیرہ اور جیان میں آباد تھے، روانگی کے وقت عبدالرحمن نے ایک خط بدر کو دیا تھا، اس میں لکھا تھا کہ "ابن حبیب کے قہر سے جو امویوں کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے۔ میں پانچ برس سے افریقہ میں پریشان پھر رہا ہوں لے

موالی خاندانِ امیہ! میری خواہش ہے کہ تم ہیں آ کر رہوں، کیونکہ مجھے اس کا یقین ہے کہ تم میرے دوست اور وفادار ہو گے، لیکن افسوس ہے کہ میں اسپین میں قدم نہیں رکھ سکتا، کیونکہ وہاں کا امیر بھی افریقہ کے امیر کی طرح فہری ہے، اگر وہاں آؤں گا تو وہ بھی مجھ کو دشمن سمجھ کر میری جان کے درپے ہو جائے گا۔ میں امیر المومنین ہشام کا پوتا ہوں کیا اس تعلق کی بنا، مجھ کو اسپین کی امیری کا حق حاصل نہیں ہے؟ معمولی حیثیت کا آدمی (۱۹۸)
ہو کر میں اندلس میں نہیں آسکتا، لیکن سلطنت کا مدعی بن کر تو وہاں داخل ہو سکتا ہوں، میں تمہارے ساحل پر اس وقت تک قدم نہیں رکھوں گا جب تک تم مجھ کو اس کا یقین نہ دلا دو گے کہ وہاں مجھ کو کامیابی کا کچھ بھی موقع مل سکتا ہے اور یہ کہ جہاں تک تمہاری طاقت میں ہو گا۔ تم میری مدد کرو گے اور میرے معاملہ کو اپنا معاملہ سمجھو گے" اخیر میں اس بات کا وعدہ کیا کہ جو لوگ اس کی مدد کریں گے ان کو بڑے بڑے انعام اور اعلیٰ مناصب دیے جائیں گے۔

اسپین پہنچ کر بدر نے اپنے آقا کا خط عبید اللہ بن عثمان اور عبد اللہ بن خالد کے پاس بھجوا دیا۔ یہ دونوں لشکر دمشق کے بڑے سر برآوردہ لوگ تھے۔ انہوں نے خط پڑھ کر دیگر موالی بنی امیہ سے اس معاملہ میں گفتگو کرنے کے لیے ایک دن مقرر کیا، اور یوسف بن بخت کو بھی جو لشکر قنسرین میں بنی امیہ کا سردار تھا، اس مشورہ میں شریک کیا، غرض مقررہ دن سب نے مل کر اس امر کا فیصلہ کیا کہ اس معاملہ میں طریقہ عمل کیا اختیار کیا جائے، کام نہایت مشکل تھا۔ لیکن اس پر سب نے اتفاق کیا کہ اس میں کوشش کرنی لازمی ہے۔ اس فیصلہ میں موالی بنی امیہ نے کوئی احسان نہیں بلکہ اپنا ایک ضروری فرض ادا کیا تھا کیونکہ ایک عرب کے نزدیک ولا کا تعلق ایک ایسا تعلق تھا۔ جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔ اور سب اس کو نہایت وثوق کے ساتھ تسلیم کرتے تھے، یہ تعلق اگرچہ صلبی نہ تھا لیکن آقا اور اس کے مولیٰ میں ایک اضافی قرابت مندی قائم کر دیتا تھا، اور ایک مولیٰ کی اولاد کا فرض تھا۔ کہ ہر حالت میں اس شخص کی اولاد کی مدد کرے جس نے اس مولیٰ کے مورث اور بانیٔ خاندان کو آزاد کیا تھا، لیکن اہل مشورہ نے یہ فیصلہ اپنے نفع کے خیال

سے بھی کیا تھا، کیونکہ عربی حکومتوں میں ریاست کے عہدے بالخصوص بڑے عہدے بادشاہ کے عزیزوں یا بادشاہ کے موالی میں تقسیم ہو جایا کرتے تھے اس بنا پر عبدالرحمٰن کے لیے حصول سلطنت میں کوشش کے یہ معنی تھے کہ اس کے موالی بھی اپنے لیے حصول اختیارات کی کوشش کر رہے ہیں، بہرکیف جس طریقہ کار کو اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس میں ایک مشکل ایسی پیدا ہوئی کہ صمیل بن حاتم سے مشورہ لینا ضروری ہوا، اور اس سے پیشتر کوئی کارروائی مناسب نہ سمجھی، یہ سب کو معلوم تھا کہ آج کل صمیل امیر یوسف سے کشیدہ خاطر ہے، کیونکہ زمانہ حصار سرقسطہ میں یوسف نے اس کو کمک نہیں پہنچائی تھی، اس کے علاوہ یہ خیال بھی تھا کہ صمیل کے دل میں خاندانِ امیہ کی محبت ابھی تک کچھ قائم ہے، کیونکہ زمانہ سابق میں یہ خاندان صمیل کے بزرگوں کا سرپرست رہا تھا۔ بہرکیف اس کا سب کو یقین تھا کہ اس معاملہ میں صمیل کا پورا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ ایسا عالی ظرف ہے کہ اگر کوئی بات اس سے بطور راز کے کہی جائے گی تو کسی پر افشا نہ کرے گا، غرض اس مشورے کی خاطر تیس کے قریب موالی امیہ بدر کو ساتھ لے کر بنی قیس کی اس فوج میں شامل ہو گئے جو صمیل کی مدد کو سرقسطہ جا رہی تھی۔

یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ بنی قیس کو اس مہم میں کامل فتح ہوئی، اب ہم اپنا قصہ جہاں سے چھوڑا تھا، شروع کرتے ہیں، یعنی اس مقام سے کہ موالی بنی امیہ صمیل سے تخلیہ میں ملاقات کی درخواست کرتے ہیں۔

صمیل نے ان کی درخواست منظور کی اور اب ان موالی نے سب سے پہلی بات اس (۱۶۹)
نے یہ کہی کہ "جو خبر ہم آپ کے پاس لے کر آئے ہیں اس کو آپ اپنے ہی تک رکھیں کسی اور سے نہ کہیں"، صمیل نے اسے منظور کیا، اب عبید اللہ نے بدر کے آنے کا حال اور عبدالرحمٰن بن معاویہ کا خط پڑھ کر صمیل کو سنایا اور بہت ادب سے عرض کیا کہ "اب آپ فرمائیں کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے؟ جس بات کو آپ کہیں گے اس پر ہم عمل کریں گے، اور جس بات کو ناپسند فرمائیں گے اس سے پرہیز کریں گے"۔ صمیل نے تھوڑی دیر سوچ کر جواب دیا کہ "یہ بڑا اہم معاملہ ہے اس میں آپ مجھ سے فوراً جواب طلب نہ کریں جو کچھ

آپ نے کہا ہے اس پر میں غور کروں گا، اور اس کے بعد جو کچھ رائے قائم ہو گی۔ وہ آپ سے بیان کروں گا۔"

اتنی گفتگو کے بعد صمیل سے بدر کی تقریب کی گئی، بدر سے بھی صمیل نے کسی قسم کا وعدہ نہیں کیا، مگر بہت سے تحائف جیسے اپنے اور مددگاروں کو دیے تھے اس کو بھی دیے

اب صمیل سرقسطہ سے قرطبہ کا قصد کر کے چل پڑا۔ جب قرطبہ میں پہنچا تو دیکھا کہ علاقہ سرقسطہ کے باغیوں کو سزا دینے کے لیے امیر یوسف فوج جمع کر رہا ہے۔

مئی ۷۵۵ء میں جب امیر یوسف قرطبہ سے سرقسطہ جانے کو ہوا، تو اس نے موالی بنی امیہ کے دونوں سرداروں یعنی عبیداللہ اور ابن خالد کو طلب کیا۔ یوسف ان سرداروں کو اب اپنے ہی موالی میں شمار کرتا تھا۔ کیونکہ ان کے اصلی سرپرست یعنی بنی امیہ مشرق میں تخت سلطنت سے معزول ہو چکے تھے، جب یہ سردار حاضر ہوئے تو اس نے کہا کہ "تم اپنے لوگوں کو حکم دو کہ وہ ہماری مہم میں شریک ہو کر سرقسطہ چلیں" عبیداللہ نے عرض کیا "اے امیر! ان کا ساتھ جانا تو اس وقت خارج از بحث ہے، یہ غریب تو برسوں کی فاقہ کشی کے بعد اس قابل نہیں رہے کہ لڑائی کے میدان میں جا سکیں، جن میں کچھ دم تھا وہ ابھی صمیل کی مدد کو سرقسطہ گئے تھے، اور اس جاڑے کے سفر سے اب وہ بہت ہی خستہ حال ہو رہے ہیں"، یوسف نے کہا "اگر یہی بات ہے تو یہ دس ہزار دینار سرخ ان کو دیدو اس سے وہ غلہ خرید لیں گے اور پھر ان میں جلد طاقت آ جائیگی" عبیداللہ نے جواب دیا کہ "پانچ سو آدمیوں کی جماعت کے لیے دس ہزار دینار تو کچھ بھی نہیں ہیں خاص کر اس خشک سالی کے زمانہ میں" یوسف نے کہا "اس سے زیادہ میں نہیں دے سکتا" عبیداللہ بولا "تو پھر اس روپیہ کو رہنے دیجئے، ہم آپ کے ہمراہ نہیں چل سکتے"

لیکن جب عبیداللہ اور ابن خالد، امیر یوسف سے رخصت ہو کر باہر آئے تو دونوں کی رائے بدل گئی، آپس میں کہنے لگے "بہتر تو یہی ہے کہ اس رقم کو قبول کر لیا جائے اس سے ہمارے بہت سے کام نکل سکیں گے، یہ تو ظاہر ہے کہ بنی امیہ یوسف کی فوج میں شریک نہ ہوں گے اپنے اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں گے تاکہ یہاں کوئی بات پیش آ جائے تو

اس کے لیے طیار رہیں، فوج سے غیر حاضر ہو جانا کوئی ایسی بات نہیں ہے، کوئی بہانہ کر دیا جائے گا، رقم کو بہر حال قبول کر لینا چاہیئے، اس میں سے کچھ بنی اُمیہ میں تقسیم کر دی جائیگی تاکہ وہ غلہ خرید لیں، باقی جو کچھ بچے گا، وہ ہم دوسرے مقاصد کی پیروی میں خرچ کر سکیں گے یہ سوچ سمجھ کر وہ پھر امیر یوسف کے پاس آئے اور کہا کہ "جو رقم آپ نے فرمائی تھی وہ ہمیں قبول ہے" یوسف نے فوراً دس ہزار دینار اُن کو دے دیے، اس روپے کے وصول ہوتے ہی یہ دونوں سردار علاقہ البیرہ میں بنی اُمیہ کے پاس آئے، اور اُن میں سے ہر ایک کو دس دس درہم یہ کہہ کر دیے کہ "یہ قلیل رقم امیر یوسف نے اُن کو غلہ خریدنے کے لیے دی ہے۔ اس کا کچھ ذکر نہیں کیا کہ رقم اس سے کہیں زیادہ دی ہے اور نہ یہ کہا کہ امیر یوسف چاہتا تھا کہ وہ سب اس کی فوج میں شریک ہو کر سرقسطہ چلیں اور دس ہزار دینار جو دیے ہیں وہ اُن کی تنخواہ کی بابت ہیں[1] ۱۰

اس اثنا میں امیر یوسف قرطبہ سے مع لشکر کے روانہ ہو گیا، سرقسطہ پہنچنے کے لیے طلیطلہ کا راستہ اختیار کیا، چلتے چلتے علاقہ جیان میں شہر منجیبار سے شمال میں لشکر نے قیام کیا، یہ مقام اُس زمانہ میں مرسیٰ الفتح کے نام سے مشہور تھا، یہاں سے وادی الکبیر کو عبور کر کے جبل مورنیہ کے دروں کو راستہ جاتا تھا۔ دریا اترنے کے لیے اب تک یہاں ایک گھاٹ موجود ہے جس کو ۱۸۰۸ء میں جنگ بیلن کی وجہ سے تمام یورپ میں شہرت ہو گئی تھی، یہاں امیر یوسف کے قیام کا باعث یہ ہوا تھا کہ ملک کے مختلف علاقوں سے جو فوجیں سرقسطہ کی مہم کے لیے طلب کی گئی ہیں وہ سب یہاں جمع ہو لیں تو آگے کوچ کیا جائے، امیر یوسف اس وقت فوج والوں کو تنخواہ تقسیم کر رہا تھا کہ بنی امیہ کے دونوں سردار عبیداللہ اور ابن خالد حاضر ہوئے، اس کا ان دونوں کو خیال تھا کہ باغیان سرقسطہ کے تدارک کے لیے یوسف جلد روانہ ہونے والا ہے اور اس مقام یعنی مرسیٰ الفتح میں

---

[1] ایک دینار طلائی چاندی کے بیس درہم کے برابر ہوتا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سرداروں نے دس ہزار کی تین چوتھائی رقم دیگر مصارف کے لیے اپنے پاس رکھ لی

اس کا زیادہ قیام نہ ہوگا، امیر یوسف نے اُن کو دیکھتے ہی پُوچھا کہ "ہمارے موالی کیوں نہیں ساتھ آئے؟" اس کا جواب عبیداللہ نے یہ دیا کہ "اے امیر! آپ اطمینان رکھیں آپ کے موالی اُن لوگوں کی طرح نہیں ہیں جن کا حال آپ پر اور ہم سب پر خوب روشن ہے اُن کی کبھی یہ خواہش نہیں ہو سکتی کہ آپ دشمن کے مقابلہ کو جائیں اور آپ کے ہمرکاب نہ ہوں، اور یہی بات وہ کہتے بھی تھے، لیکن اس کے ساتھ ان کا ایک معروضہ یہ بھی ہے کہ اُن کو تھوڑی سی مہلت دی جائے، آپ کو معلوم ہے کہ ربیع کی فصل اس مرتبہ اچھی ہوئی ہے، اس مہم میں شرکت سے پہلے وہ یہ چاہتے ہیں کہ فصل کاٹ لیں پھر فوراً حاضر ہو جائیں۔"

امیر یوسف کوئی وجہ نہ رکھتا تھا کہ عبیداللہ کو ایک دھوکا دینے والا آدمی سمجھتا، اس نے ان دونوں سرداروں کی بات کا یقین کر لیا، اور اُن سے کہا کہ "اپنے قبیلے والوں کے پاس واپس جا کر اُن کو تاکید کر دو کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ ہمارے لشکر کے ساتھ ہو جائیں۔"

اس کے ایک یا دو دن کے بعد یوسف لشکر کے ساتھ آگے بڑھا، عبیداللہ اور ابن خالد نے کچھ دور تک امیر یوسف کی معیت کی، اور آخر میں یہ وعدہ کر کے کہ "موالی کو جلد روانہ کیا جائے گا۔" وہ امیر یوسف سے رخصت ہو کر مرج الفتح کی طرف واپس چلے۔

رستہ ہی میں تھے کہ صمیل اور اُس کے سواروں سے ملاقات ہوئی، شب گذشتہ حسب معمول مے نوشی کا جلسہ رہا، جب صبح ہی یوسف کے لشکر نے کوچ کیا تو صمیل ابھی خواب نوشیں میں تھا، جب دن خوب نکل لیا تو اُٹھا، اور لشکر سے جا ملنے کے لیے روانہ
(۱۷۱) ہوا، عبیداللہ اور ابن خالد کو سامنے سے آتا دیکھ کر اُس نے بہت تعجب سے پوچھا "کیا کوئی خبر سنانے آئے ہو؟" دونوں نے جواب دیا "نہیں، امیر یوسف نے ہم کو رخصت کر دیا ہے، اور ہم نے وعدہ کیا ہے کہ اپنے ہمراہیوں کو لے کر طلیطلہ میں اُس کے لشکر سے مل جائیں گے، اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو کچھ دور ہم حضور کے ساتھ چلیں۔" صمیل نے جواب دیا "آپ کی صحبت میرے لیے باعث مسرت ہو گی" کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد عبیداللہ نے صمیل کے قریب آ کر کان میں کہا کہ

مجھ کو کچھ تخلیہ میں عرض کرنا تھا " صمیل نے سواروں کی طرف اشارہ کیا ، وہ سب گھوڑوں کی راہیں کھینچ پیچھے رہ گئے ، جب عبیداللہ اور صمیل کچھ آگے نکل آئے تو عبیداللہ نے کہا کہ " ابن معاویہ کے بارے میں پہلے عرض کر چکا ہوں ، اُسی کے بارے میں دریافت کرنا تھا معلوم نہیں آپ نے کیا رائے قائم کی ؟ ابن معاویہ کا قاصد ابھی تک واپس نہیں گیا ہے " ؛ صمیل نے جواب دیا " ہاں میں اس بات کو بھولا نہیں ہوں میں نے اس پر بہت غور کیا ہے اور جیسا میں نے تم سے وعدہ کیا تھا اپنے کسی مخلص دوست سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا ، میرا جواب یہ ہے کہ شخص معلوم تاج شاہی اور میری امداد کا مستحق ہے ، آپ اُسکو لکھ دیں کہ انشاء اللہ ہم اس کی مدد کریں گے ، لہٰذہ کوری چندیا والا بڈھا (صمیل نے امیر یوسف کا یہی نام رکھ چھوڑا تھا) تو وہ میری بات میں نہیں بول سکتا ، میں جو چاہونگا وہ کروں گا - اُس سے صاف کہدوں گا کہ وہ اپنی لڑکی اُم موسیٰ[1] کا ابن معاویہ سے نکاح کر دے ، اور پھر امارت اندلس سے دست بردار ہو ، اگر اُس نے میرا کہنا مان لیا تب تو خیر ، ورنہ پھر اُس کے گنجے سر کو ہم اپنی تلواروں سے پارہ پارہ کر دیں گے اور اسی سزا کے وہ لائق ہو گا ۔"

عبیداللہ اور ابن خالد یہ جواب سن کر بے انتہا خوش ہوئے ، دونوں نے صمیل کے ہاتھ کو بوسہ دیا ، اور ان کے سرپرست کے حق میں وعدہ امداد کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ، اس کے بعد یہ دونوں سردار رخصت ہو کر مرسی الفتح کو واپس آئے -

ظاہر ہے کہ مے خواری شب کا خمار ابھی تک صمیل کے دماغ سے نہ نکلا تھا اور آج صبح کو جب سے بیدار ہوا تھا یوسف سے کچھ بہت ہی خفا تھا ، اس وقت جو کچھ اُس نے عبیداللہ اور ابن خالد سے کہا تھا ، وہ ہرگز کسی فکر اور غور کا نتیجہ نہ تھا ، بلکہ وقت پر جو کچھ زبان پر آیا وہ کہہ دیا تھا ، بے پروائی اور کاہلی طبیعت کا خمیر تھی ، عبدالرحمٰن کے معاملہ میں حقیقت میں مطلق غور نہیں کیا تھا ، لیکن جب عبیداللہ اور خالد کے دل میں اُمید پیدا

---

[1] یہ عبدالملک الفہری سابق امیر اندلس کے لڑکے قطن کی بیوہ تھی ۔

کرادی تو اب نفع نقصان کے مسئلہ کو سوچنا شروع گیا، اور دفعتاً ایک خیال ایسا آیا کہ
اور سب خیالات اُس کے سامنے ہیچ ہو گئے، وہ یہ تھا کہ "اگر بنی امیہ کا کوئی شہزادہ اسپین ۱۷۴
میں بادشاہ ہو گیا تو پھر قبائلِ عرب جو یہاں رہتے ہیں اُن کی آزادی کدھر جائے گی ؟ جبکہ وقت
ایک بادشاہ کے تخت میں پوری سلطنت آگئی تو پھر ہم اُمرا و روساء عرب کے اختیارات
کیا باقی رہ جائیں گے ؟ یوسف سے خواہ مجھ کو کتنی ہی شکائتیں ہوں، مگر جو حالت
اس وقت ہے اُس کو بدلنا بالکل مصلحت کے خلاف ہے، اِس حالت کو بدستور
قائم رکھنا ضروریات سے ہے"۔ جب اِس نتیجہ پر پہنچ گیا تو ایک غلام کو فوراً بلایا، اور
اُس کو حکم دیا کہ "فوراً دوڑتا ہوا جا، بنی امیہ کے جو دو سردار ابھی ملاقات کر کے گئے
ہیں اُن سے کہدے کہ آگے نہ بڑھیں، میرا انتظار کریں۔

عبیداللہ اور ابن خالد آپس میں صمیل کے وعدوں پر اطمینان ظاہر کرتے ہوئے اور
یہ کہتے ہوئے کہ "اب عبدالرحمٰن کی کامیابی میں ذرا بھی شبہ نہ کرنا چاہیئے" کوئی ایک فرسخ
کے قریب گئے ہوں گے کہ عبیداللہ نے کسی کو اس کا نام پکارتے ہوئے سنا، دونوں
چلتے چلتے ٹھہر گئے کہ اتنے میں ایک سوار قریب پہنچا، یہ وہی غلام تھا جسے صمیل نے بھیجا تھا
سوار نے کہا "آپ توقف فرمائیں اور میرے آقا کے آنے کا انتظار کریں" عبیداللہ اور
ابن خالد یہ پیغام سن کر کہ صمیل کے پاس نہ جائیں بلکہ جہاں ہیں وہیں انتظار کریں، بہت
گھبرائے اور ڈرے کہ کہیں گرفتار ہو کر امیر یوسف کے حوالے نہ کر دیے جائیں، بہرکیف یہ
دونوں وہیں ٹھہرے رہے، تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ دیکھا صمیل اپنے سپید خچر کو کب "یہ
سوار اُس کو سرپٹ دوڑائے آ رہا ہے، یہ دیکھ کر کہ وہ تنہا ہے، سوار وغیرہ ساتھ نہیں ہیں
ان کے دم میں دم آیا، صمیل نے قریب پہنچکر خچر کو روکا اور کہنے لگا "جب سے تم نے
ابن معاویہ کا وہ خط لا کر مجھے دیا تھا، اُس وقت سے میں اس معاملہ میں برابر غور کرتا رہا ہوں
(یہ بات صمیل نے صحیح نہیں کہی تھی یا اُس کے حافظے کی غلطی تھی، اُس کا اقرار کرنا کہ
واقعی وہ اس معاملہ پر غور کرنا بھول گیا تھا اُس کی شان کے خلاف تھا)

صمیل نے سلسلۂ کلام جاری رکھا اور بولا "میں نے تمہاری تدبیر کو جیسا کہ ابھی میں

نے کہا تھا بہت پسند کیا تھا، لیکن جب تم میرے پاس سے چلے گئے تو دوبارہ غور کرنے کے بعد یہ خیال آیا کہ یہ عبدالرحمٰن ایک ایسے زبردست خاندان کا آدمی ہے کہ اگر یہاں وہ جم گیا تو وہ پھر ہم سب کا پتہ بھی نہ چلے گا کہ کہاں تھے اور کدھر گئے، رہا دوسرا شخص (یعنی امیر یوسف) وہ دل کا اچھا ہے، کبھی اتفاق سے ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہمارا کہنا رد کر دیتا ہے، ورنہ اکثر جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی کرتا ہے اس کے علاوہ امیر یوسف کے ہم پر بہت سے احسانات ہیں، اور یہ ہمارے لیے زیبا نہیں کہ اس کو مشکلات میں مبتلا کر دیں، پس آپ لوگ جو کچھ کریں اُس میں احتیاط شرط ہے، اگر آپ نے اپنے اپنے گھر پہنچ کر اس تدبیر پر اصرار کیا جو پہلے سوچی گئی تھی تو اس میں شک نہیں کہ آپ مجھے اپنے قریب آتے دیکھیں گے لیکن اس وقت میں آپ کا دوست نہ ہونگا، میری بات اچھی طرح سن رکھو، قسم کھاتا ہوں کہ پہلی تلوار جو اپنے نیام سے تمہارے دعویدارِ سلطنت کے مقابلہ میں باہر آئے گی وہ میری تلوار ہوگی، اچھا فی امان اللہ، خدا تم کو اور تمہارے آقا ابن معاویہ کو عقل اور سمجھ دے"

(۱۷۳ عبیداللہ اور ابن خالد اس گفتگو کو سن کر دنگ رہ گئے، اُن کی تمام اُمنگیں یکایک خاک میں مل گئیں، اور اس خیال سے کہ معلوم نہیں اس آتش مزاج اور مغلوب الغضب آدمی سے بگاڑ لینے میں کیا سے کیا ہو جائے، اُنھوں نے بہت انکسار کے ساتھ عرض کیا "اللہ آپ کو برکت دے، ہماری رائے آپ کی رائے سے اختلاف نہیں کر سکتی" صمیل ان جملوں کو سنکر کسی قدر نرم ہوا اور کہنے لگا "یہ سب درست ہے، میں بحیثیت ایک دوست کے آپ کو صلاح دیتا ہوں کہ اس ملک کے معاملاتِ سیاست میں کسی قسم کی تبدیلی کی کوشش ہرگز مناسب نہیں، جو کچھ مناسب ہے وہ یہ ہے کہ اپنے آقا ابن معاویہ کو اس ملک میں کسی بڑے عہدے پر مقرر کرا دو، اگر تم اس بات کا وعدہ کرو کہ وہ امارتِ اندلس کی خواہش نہ کریگا تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں کہ امیر یوسف اُس کی بہت خاطر و مدارات کرے گا، اور اپنی لڑکی سے اُس کا نکاح کر دے گا، اور جہیز بھی اچھا اور قیمتی دیگا، اچھا، اب رخصت، خدا آپ کا یہ سفر مبارک کرے" اتنا کہہ صمیل نے "کوکب" کی باگ موڑی

اور وہ چراغ پا ہو کر پچھلے پاؤں پر کچھ دیر رقص کر کے آخر کار ٹھیک سمت میں مڑ گیا، صمیل نے ایڑ لگائی، اور خچر جدھر سے آیا تھا اسی رخ ہوا ہو گیا۔

اب صمیل بن حاتم یا یوں کہیے کہ بنی معد کی طرف سے جو عموماً اپنے سردار کے کہنے میں تھے موالی بنی امیہ کو قطعی مایوسی ہو گئی، اب اس کے سوا انھیں کوئی چارہ نہ تھا کہ یمانیہ سے مل کر ان کو بنی معد سے لڑنے اور انتقام لینے پر ابھاریں، بنی امیہ نے یہ ارادہ مصمم کر لیا تھا کہ انجام جو کچھ ہو عبدالرحمٰن بن معاویہ کو ایک مرتبہ اندلس میں بلانا ضرور ہے، اب عبید اللہ اور ابن خالد جب اپنے گھروں کو واپس آنے لگے تو تمام ایسے سرداران یمانیہ سے ملاقات کرتے ہوئے چلے جو ان کے نزدیک بھروسے کے لوگ تھے اور ان سے درخواست کی کہ عبدالرحمٰن بن معاویہ کی مدد کے لیے مسلح ہو جائیں۔

اس معاملہ میں توقع سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی، یمانیہ واقعہ شقندہ میں شکست کھانے کے بعد بنی معد کی طرف سے غم و غصہ کی حالت میں رہ کر ان پر دانت پیسا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اب بنی معد کا جوا ان کے کندھے سے کبھی نہ اترے گا، غرض یمانیہ بالکل رضامند ہو گئے کہ پہلے ہی اشارہ پر وہ سب کے سب بنی معد کے مقابلہ پر ہتھیار اٹھا لیں گے اور جو کوئی بھی سلطنت کا مدعی بن کر کھڑا ہو گا، اس کے علم کے نیچے بنی معد سے لڑنے کو تیار ہو جائیں گے اور اس میں ان کو اپنے موروثی دشمنوں کو قتل و غارت کرنے کا خوب موقع ملے گا۔

یمانیہ کی امداد کی طرف سے مطمئن ہو کر، اور یہ معلوم کر کے کہ امیر یوسف اور صمیل اس وقت شمالی علاقوں میں مصروف کار ہیں، موالی بنی امیہ نے اپنے آقا عبدالرحمٰن بن معاویہ کو اندلس میں مدعو کرنے کا یہ موقع سب سے بہتر سمجھا، چنانچہ انھوں نے ایک جہاز خریدا اور ابو غالب تمام بن علقمہ کو جن کے ساتھ گیارہ آدمی اور تھے پانچ سو دینار اس غرض سے دیئے کہ ان میں سے کچھ دینار تو شہزادہ عبدالرحمٰن کو دیئے جائیں اور باقی بربر میں تقسیم کیے جائیں، کیونکہ ان لوگوں کی نسبت پہلے ہی سے یہ خیال تھا کہ وہ بغیر روپیہ لیے عبدالرحمٰن کو اپنے ملک سے رخصت نہ ہونے دیں گے، یہ روپیہ وہی تھا جو امیر یوسف نے بنی امیہ کے

موالی میں تقسیم ہونے کے لیے دیا تھا، تاکہ باغیان سرقسطہ کے مقابلے کے لیے جو مہم جا رہی تھی اس میں وہ شریک ہو جائیں۔

یوسف کو اس وقت یہ خیال کیونکہ گذر سکتا تھا کہ یہی روپیہ اسپین میں ایک ایسے شخص کو بلانے میں خرچ کیا جائے گا جو بالآخر اندلس کی امارت سے اُسے محروم کر دے گا

اسناد:

اخبار مجموعہ ص ۶۹-۷۲، ۷۷-۸۰
مقری کتاب ششم
ابن العذاری، جلد ا ص ۴۹-۵۰
ابن القوطیہ ص ۹

کتاب اول

خانہ جنگی

چودھویں فصل

اسپین میں عبدالرحمٰن بن معاویہ کا وارد ہونا

عبدالرحمٰن قبیلۂ نفزہ سے علیحدہ ہو کر بربر مغیلہ میں جو بحرِ متوسط کے ساحل پر آباد تھے رہنے لگا، کئی مہینے سے نہایت فکرمند اور پریشان تھا، حالت روز بروز سخت انتظار اور اضطراب کی ہوتی جاتی تھی، ہر وقت یہی خیال تھا کہ دیکھئے بدر اندلس سے کیا خبر لاتا ہے جب سے گیا ہے اسکا کچھ حال معلوم نہیں ہوا حقیقت میں عبدالرحمٰن کی حالت اس وقت بہت نازک تھی، جو منصوبہ بڑے حوصلے اور ہمت سے سوچا تھا، اگر وہ نہ چلا تو پھر حکومت اور سلطنت کے جس قدر خوشگوار خواب نظر آرہے تھے وہ یک لخت معدوم ہو جائیں گے اور پھر دنیا میں اس طرح رہنا ہوگا جیسے کوئی آدمی برادری سے خارج ہو کر آوارہ حال ہو جائے، شاید افریقہ کے کسی دور و دراز گوشے میں ساری عمر تنہائی اور روپوشی میں گذارنی ہو، لیکن اگر تدبیر چل گئی تو پھر اندلس نہ صرف ایک پناہ کی جگہ ہوگی، بلکہ دولت

واقتدار اور اس کے ساتھ جو راحتیں وابستہ ہیں وہ سب میسر ہو جائیں گی۔

غرض ایک طرف امید اور دوسری طرف بیم ان ہی دونوں کی کشاکش میں دن رات کٹ رہے تھے کہ ایک روز سمندر کے کنارے نماز عصر ادا کرنے کے بعد ایک جہاز ساحل کی طرف آتا نظر آیا، ابھی جہاز کنارے تک پہنچا نہ تھا کہ ایک آدمی اس میں سے کودا اور تیر کر خشکی کی طرف آنے لگا۔ عبدالرحمٰن نے اس تیراک کو پہچان لیا، بدر کے سوا دوسرا کون ہو سکتا تھا اس وفادار مولیٰ کو اپنے آقا کی خدمت میں حاضر ہونے کی اس قدر جلدی تھی۔ کہ جہاز کے ساحل تک پہنچنے کا بھی انتظار نہ کیا اور آقا کو دیکھتے ہی اس کے پاس فوراً پہنچنا چاہا۔ دور ہی سے پکار کر کہا کہ " اچھی خبر لایا ہوں "۔ جب قریب آیا تو کل حالات جو پیش آتے تھے بیان کئے اور ان سرداروں کے نام بتائے جو دل سے شہزادہ کی نصرت پر آمادہ تھے اور جو لوگ اس وقت جہاز میں ساتھ آئے تھے ان کے نام بھی عرض کیے، اور کہا کہ " یہ جہاز آپ کو اسپین لے جانے کے لیئے حاضر کیا گیا ہے۔ روپے کی طرف سے بھی آپ مطمئن رہیں۔ کیونکہ ہم پانچ سو دینار سرخ اپنے ساتھ لائے ہیں " عبدالرحمٰن یہ سب باتیں سن کر بے انتہا خوش ہوا، اور جو لوگ جہاز سے اترے تھے ان کا خیر مقدم کرنے لگا ان میں پہلا شخص جس کی شہزادے سے تقریب کی گئی وہ ابو غالب تمام بن علقمہ تھا عبدالرحمٰن نے جب اس کا نام سنا تو باغ باغ ہو گیا، کیونکہ ایک ایسے شخص کے لیے جو شگون نیک و بد کا قائل ہو، اس سے بہتر نام عمدہ توقعات کا پیدا کرنے والا ممکن نہ تھا۔ تمام سے مطلب تھا کہ مقصد پورا ہو گا، اور غالب کے معنی کامیاب کے تھے۔ پس عبدالرحمٰن نہایت خوش ہو کر کہنے لگا " سبحان اللہ! اب مراد حاصل اور فتح نصیب ہو گئی "[1]۔

---

[1] نفح الطیب میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے " بدر نے (اپنے آقا کے پاس) پہنچکر معاملے کے مستحکم واستوار ہونے کی بشارت دی اور تمام بن علقمہ نے بڑھ کر اس کی تائید کی عبدالرحمٰن نے پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے "؟ کہا تمام عبدالرحمٰن نے پھر پوچھا " اور کنیت " کہا " ابو غالب " عبدالرحمٰن نے کہا " اللہ اکبر! اب ہمارا تمام کام پورا ہو گیا، اور ہم اللہ کے حول اور قوت سے غالب آئیے "۔ (مترجم)

جب ان سب لوگوں سے جو جہاز پر آئے تھے ملاقات اور گفتگو ہو لی، تو فوراً اندلس کو روانہ ہو جانا مناسب سمجھا، سامانِ سفر درست کر کے جس وقت عبدالرحمٰن جہاز پر سوار ہونے لگا تو بربر کا ایک گروہ آیا اور کہنے لگا کہ جب تک ہم کو انعام نہ ملے گا ہم کسی کو جانے نہ دیں گے اس مشکل کا حل پہلے ہی سے سوچ لیا گیا تھا، چنانچہ ابو غالب نے تمام نے ہر ایک بربر کو اس کے حسبِ حیثیت روپیہ دیا، لیکن جب جہاز لنگر اٹھانے کو ہوا تو ایک بربر نے جس کو کچھ نہیں ملا تھا۔ پانی میں کود کر اس کی رسی پکڑ لی اور روپیہ مانگنے لگا، اہلِ جہاز میں سے ایک شخص کو اس حرکت پر غصہ آیا، اور فوراً تلوار نکال ایک وار ایسا کیا کہ بربر کا ہاتھ کٹ گیا، اور وہ سمندر میں گر پڑا۔

جب ان افریقیوں کی پہنچ سے جہاز کچھ آگے نکل آیا تو شہزادے کی تشریف آوری کی خوشی میں جہاز پر رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگائی گئیں چند روزہ سفر کے بعد جہاز ساحل اندلس پر المنکب کی بندرگاہ میں بخیریت سے پہنچ گیا (۱۴ ستمبر ۷۵۵ء مطابق غرہ ربیع الاول ۱۳۸ھ) اندلس کے ساحل پر قدم رکھ کر شہزادے کو اور شہزادے سے مل کر عبید اللہ اور ابن خالد کو جو آقا کے استقبال کے لیے المنکب میں حاضر تھے جس قدر مسرت ہوئی ہو گی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، باغ الفنتین[1] میں جو عبداللہ بن خالد کا نزہت گاہ ارجذونہ اور البیرہ کے درمیان شہر لوشہ سے قریب واقع تھا، شہزادے نے کچھ روز قیام کیا اس کے بعد قلعہ طرش میں جو عبید اللہ کی جاگیر سے تھا کچھ دن سکونت رہی قلعہ طرش باغ الفنتین سے کسی قدر مغرب میں حصن انشر اور لوشہ کے درمیان واقع تھا۔

اس اثنا میں یوسف الفہری طلیطلہ پہنچ گیا، اور موالی بنی امیہ کے انتظار میں جن کا ابھی تک کچھ پتہ نہ تھا، سخت پریشان رہنے لگا، اس امید میں کہ وہ آتے ہوں گے لشکر کا کوچ روز ملتوی کرنا پڑتا تھا، صمیل کو خیال ہو چلا تھا کہ موالی کی اس تاخیر کا اصلی سبب کیا ہے

---

[1] باغ الفنتین نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں ابن خالد کی اولاد کے قبضہ میں تھا ابن حیان نے اس کا موقع بھی بیان کیا ہے (ص ۷۶-۸۳)

لیکن اخفائے راز کے دعدے پر بدستور قائم رہا اور جس خفیہ سازش میں موالی اس وقت مصروف تھے اس کا ایک حرف تک کسی کے سامنے زبان پر نہ لایا۔ طلیطلہ میں دیر تک قیام کرنا اس کو بھی بہت شاق تھا، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ باغیان سرقسطہ کا جس قدر جلد قلع قمع ہو اتنا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ ایک دن امیر یوسف نے موالی کے دیر لگانے کی شکایت کی تو صمیل ترش رو ہو کر بولا۔ وہ شان آپ ہی کی ہے کہ ہر عامی اور رازل کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اب اس کی امید نہ رکھیے گا کہ سرقسطہ پہنچکر باغیوں کی تعداد آپ کو کم نظر آئے گی اگر یہاں کچھ دن اور اسی انتظار میں کاٹے تو پھر کامیابی کی جتنی صورتیں ہیں وہ سب ہاتھ سے نکل جائیں گی۔ یوسف جیسے غیر مستقل ارادے کے لئے یہ جملے حکم حاکم مرگ مفاجات ہو گئے اور دوسرے ہی دن سرقسطہ کی سمت کوچ کرتا نظر آیا، لیکن جب دشمن کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ لڑنا ضروری نہیں ہے۔ باغیوں نے فوج مقابل کی کثرت دیکھتے ہی شرائط صلح پیش کر دیں یوسف نے اس شرط سے صلح کا وعدہ کیا کہ تینوں قریشی سرداروں کو یعنی عامر العبدری (۱۷) اور اس کے بیٹے وہب اور حباب بن رولجہ الزہری کو جو بغاوت کے اصلی بانی تھے اس کے سپرد کر دیا جائے، باغیوں کو اس شرط کے منظور کرنے میں ذرا پس و پیش نہ ہوا کیونکہ انمیں کثرت سے یمانیہ کے لوگ تھے جن کو قریشیوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی، لیکن اس بات کا یقین ان کو ضرور تھا کہ قریشی معدی ہیں اور یوسف بھی معدی ہے اس لیے ان کو یوسف کے ہاتھ سے کوئی گزند نہ پہنچے گا، غرض باغیوں نے تینوں قریشی سرداروں کو یوسف کے حوالے کر دیا، یوسف نے ان کو حراست میں لے کر روساء لشکر کو ان کے بارے میں رائے دینے کے لیے جمع کیا۔

صمیل ان قریشیوں کی جان کا دشمن ہو چکا تھا اور اب ان کے حق میں موت سے کم کوئی چیز اس کے دل کو تسکین نہیں دے سکتی تھی اس مجمع میں اس نے بہت جوش سے ان کے قتل کی رائے دی لیکن حاضرین میں سے قیسیوں نے اس رائے کو نہ مانا، اور کہنے لگے کہ "کسی قریشی کی جان لینے کا حق ہم کو حاصل نہیں ہے" ان قیسیوں کو اس کا ڈر بھی تھا کہ ملک میں قریش اور ان کے ہوا خواہ بڑے صاحب قوت ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم

قتل کی رائے دیں اور یہ لوگ دشمن ہو کر ہمارے خون کے پیاسے ہو جائیں خاندانِ کعب بن عامر سے ابن شہاب عقیلی اور حصین ابن الدجن عقیلی بھی اس مجمع میں موجود تھے انہوں نے قیسیوں سے بھی زیادہ زور کے ساتھ صمیل کی رائے سے اختلاف کیا الغرض جب سب کی یہی رائے ہوئی کہ قریشیوں کو قتل نہ کیا جائے تو صمیل نے بھی دل میں بہت ہی کچھ پیچ و تاب کھا کر اور یہ ارادہ کر کے کہ اس ابن شہاب اور حصین ابن الدجن سے آج کا بدلہ نہ لیا ہو تو بات نہیں سب کی رائے سے اتفاق کر لیا۔ یوسف نے قریشیوں کے قتل سے پرہیز کیا مگر ان کو بدستور حراست میں رکھا۔

صمیل کو جلد اس بات کا موقع مل گیا کہ ابن شہاب اور حصین ابن الدجن سے انتقام لے جنہوں نے اس وقت اس کی رائے سے اختلاف کیا تھا اور چند روز ہوئے تھے کہ محاصرہ سرقسطہ کے موقع پر صمیل کی مدد پر آنے سے بھی انکار کیا تھا، صورت یہ پیش آئی کہ علاقہ بنبلونہ کی قوم بشکنس[1] نے جلیقیہ کے عیسائیوں کی طرح حکومت عرب سے روگردانی کی صمیل نے یوسف کو صلاح دی کہ باغیانِ بشکنس کی سرکوبی کے لیے ایک مہم ابن شہاب اور حصین ابن الدجن کی سرکردگی میں بنبلونہ کی طرف روانہ کی جائے یہ تحریک اس لیے کی تھی کہ ان دونوں مخالفوں کو جو قریشیوں کے قتل میں مانع ہوئے تھے یہاں سے کہیں دور بھیج دیا جائے۔ اس کے ساتھ یہ توقع بھی تھی کہ جس ملک کو یہ مہم روانہ کی جاتی ہے وہ ایسا سخت اور دشوار کوہستان ہے کہ وہاں سے ان دونوں کا زندہ بچ کر آنا نہایت مشکل ہوگا

امیر یوسف کی طبیعت پر صمیل اتنا قابو پائے ہوئے تھا کہ صمیل کی رائے اس نے حسبِ عادت منظور کر لی اور ابن شہاب اور حصین ابن الدجن کو کچھ فوج دیکر بنبلونہ کی طرف روانہ کر دیا، اور اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو اس شمال مشرقی سرحدی علاقہ کا حاکم مقرر کر کے خود قرطبہ کے قصد سے چل پڑا راستہ میں دریائے شربہ[2] کے کنارے لشکر مقیم تھا کہ دفعۃً ایک ہرکارہ خبر لایا کہ قوم بشکنس کے مقابلہ میں جس قدر فوج بھیجی گئی تھی۔ اس کو

[1] وسکونس شمالی اندلس میں ایک علاقہ کا نام تھا جو موجودہ علاقہ نبرہ کے متصل تھا یا اس پر منطبق ہوتا تھا اسی وسکونس سے بشکنس ہو گیا۔ (مترجم) [2] اخبار مجموعہ میں وادی شربہ لکھا ہے۔ ابن الابار نے یہ نام وادی الرمل لکھا ہے یعنی ریت والا دریا۔ اس کا موجودہ نام گوادارمہ (Guadarrama) ہے

ہزیمت ہوگئی - ابن شہاب لڑائی میں کام آیا، اور حصین ابن الدجن بقیتہ السیف کو لے کر سرقسطہ میں چلا آیا ہے۔ صمیل اس خبر سے بڑا خوش ہوا اور دوسرے دن صبح ہوتے ہی امیر یوسف کے پاس پہنچا اور کہنے لگا، "اس سے زیادہ کیا خوش نصیبی ہوسکتی ہے کہ اس ابن شہاب سے کسی طرح نجات ملی اب ان تینوں قریشیوں کا بھی جو حراست میں ہیں خاتمہ کیجیے ان کو یہاں بلوائیے اور فوراً قتل کر دیجیے" یوسف کو اس میں تذبذب تھا لیکن صمیل نے بار بار اپنی رائے پر اس قدر زور دیا کہ آخر کار یوسف کو اس کی رائے صحیح معلوم ہونے لگی اور اسی کے مطابق عمل ہوا۔

عامر اور اس کا بیٹا وہب اور حباب بن رداجہ الزہری قتل کر دیے گئے[1] دن کے دس بجے حسب معمول جب صبح کے کھانے کے لیے دسترخوان بچھایا گیا اور صمیل اور یوسف کھانا کھانے بیٹھے تو یوسف نہایت افسردہ اور ملول معلوم ہوتا تھا تین آدمیوں کا خون جو ابھی کیا تھا دل پر سخت گراں گذر رہا تھا، اور اس بات پر بھی اپنے تئیں لعنت ملامت کرتا تھا کہ ابن شہاب اور اس کے بہادر ہمراہیوں کو بیٹھے بٹھائے کیوں موت کی طرف ہانک دیا یوسف کو اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مقتولوں کا خونِ انتقام کے لیے چیخ رہا ہے اور کانوں میں خودبخود یہ صدا آرہی ہے کہ اب اس کی حکومت کے دن پورے ہوئے یوسف اس وقت ایسا فکر مند تھا کہ کھانا بالکل نہ کھا سکا، اس کے برعکس صمیل بہت خوش اور چونچال تھا کھانے میں بڑی رغبت

سے مصروف رہا اور امیر یوسف کی تسلی و تشفی کرتا رہا کہ اس میں فکر کی کیا بات ہے درآنحالیکہ یہ کل جرائم اس نے اپنے دوست اور حاکم یوسف کے ہاتھ سے اپنی ذاتی عداوت کی پیروی میں کرائے تھے۔

صمیل کہنے لگا کہ "ان پریشان خیالات کو اپنے دل سے دور کیجیے آپ نے کونسا گناہ کیا ہے؟ اگر ابن شہاب مارا گیا تو اس میں آپ کا کیا قصور ہے؟ وہ لڑائی میں کام آیا ہے اور لڑائی میں ہر لڑنے والے کی یہ نوبت آسکتی ہے اگر قریشیوں کے قتل پر افسوس ہے تو یہ سمجھ لیجیے کہ وہ اپنے کیے کو پہنچے وہ سخت خطرناک باغی تھے اور جو سزا ان کو دی گئی ہے

[1] مقابلہ کرو برک ہارٹ کے بیان سے "بدوئین" صفحہ ۳۶

وہ دوسروں کے لیے جوان کے قدم بقدم چلنا چاہیں گے عبرت ہوگی اب اس ملک اسپین کو آپ اپنی ملک سمجھیئے آج سے آپ ایک ایسے دودمانِ شاہی کے بانی ہوئے ہیں جس کا نام تا قیامت چلیگا اور اب ایسا کور بخت وکوتاہ اندیس کون ہوگا جو آپ کی حکومت پر اعتراض لا سکے ؟

لیکن صمیل کی یہ سب کوششیں کہ یوسف کا فکر دور ہو بیکار تھیں ، یوسف کے دل پر افسوس اور شرمندگی کی جو تاریک گھٹا چھائی ہوئی تھی وہ ان باتوں سے دور نہ ہوئی یہاں تک کہ کھانا ختم ہوا ، یوسف اٹھ کر اپنے دو بیٹوں کے خیمے میں آیا اور چاہا کہ حسب عادت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر استراحت کرے ۔

یہاں تنہائی میں یوسف سونے کی غرض سے نہیں بلکہ عادت کی وجہ سے ایک پلنگ پر لیٹ رہا اس فکر و پریشانی میں آنکھوں میں نیند کا کیا ذکر تھا ۔ اسی حال میں تھا کہ یکایک سپاہیوں میں یہ غل سنا کہ قرطبہ سے کوئی قاصد آیا ہے ، یوسف یہ غل سنتے ہی اٹھ بیٹھا اور خیمے کے دروازے کے پاس جا کر پہرے والوں سے پوچھا "لوگ کیا کہہ رہے ہیں" ؟ سپاہیوں نے عرض کیا کہ "ام عثمان کے خچر پر سوار ایک غلام آیا ہے" یوسف نے کہا اس کو فوراً یہاں بلا لاؤ " اب وہ اس خلجان میں پڑا کہ آخر وہ کیا پیغام ہے جو اس کی بیوی نے اس عجلت کے ساتھ بھیجا ہے ؟ ظاہر ہے کہ کوئی ایسی ہی سخت اور مشکل بات ہوگی کہ اس طرح آدمی روانہ کیا گیا ۔

قاصد خیمے کے اندر آیا اور امیر کو ایک خط دیا ۔ جس کا مضمون تھا کہ "خلیفہ ہشام کا ایک پوتا اسپین میں آیا ہے قریہ طرش میں روی السیرت ابو عثمان عبید اللہ کے قصر میں مقیم ہے ۔ بنی امیہ کے موال اس کے ساتھ ہو گئے ہیں ، آپ کے حاکم البیرہ نے جس قدر فوج مل سکی ۔ ساتھ لے کر اس مدعی سلطنت کا مقابلہ کیا ، لیکن پسپا ہونا پڑا ، اس کے آدمیوں کو دشمن نے مارا پیٹا لیکن کوئی جان ضائع نہیں ہوئی جو تدارک مناسب و ضروری ہو اسے جلد اختیار کیا جائے "

یہ خط پڑھتے ہی یوسف نے صمیل کو بلوایا صمیل جب کھانا کھا کر اپنے خیمہ کو جا رہا تھا ۔

تو قاصد کو آتے دیکھا تھا۔ مگر حسب عادت بے پروائی سے اس کی طرف توجہ نہ کی تھی جب یوسف نے اسے بلوایا تو خیال ہوا عجیب نہیں کہ جس قاصد کو آتے دیکھا تھا وہ کوئی سنگین اور وحشتناک خبر لایا ہو۔

یوسف کے خیمے میں قدم رکھتے ہی پوچھا " اے امیر! کیا بات پیش آئی ہے کہ مجھے اس وقت سوتے ہوئے کو آپ نے اٹھوا بلوایا۔ کوئی بری خبر تو نہیں ہے؟" یوسف نے کہا " واللہ! بہت بری خبر ہے اور مجھے خوف ہے کہ جو خون ہم نے آج کئے ہیں ان کی سزا میں خدا کا عذاب اب ہم پر شروع ہو گیا ہے" صمیل نے ہنس کر کہا آپ تو ایسی باتیں کرتے ہیں جو دانائی سے بعید ہیں۔ پھر سن لیجئے جن لوگوں کو ہم نے قتل کیا ہے وہ ایسے خبیث تھے کہ خدا بھی ان کی فریاد نہ سنے گا۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ ہوا کیا ہے؟ یوسف نے جواب دیا کہ " یہ خط ام عثمان کے پاس سے آیا ہے، خالد! ذرا اس خط کو پڑھ کر سنا تو دو۔"

خالد امیر یوسف کا آزاد غلام اور کاتب تھا، اس نے خط یوسف کے ہاتھ سے لیا اور پڑھ کر سنایا، مضمون سنکر صمیل کو یوسف کا سا تعجب نہ ہوا، کیونکہ اس معاملہ کا کسی قدر پتہ اس کو پہلے ہی مل چکا تھا، غرض یہ خبر کہ عبدالرحمٰن اندلس میں آگیا ہے اس نے بلا استعجاب سنی اور سن کر کہنے لگا۔ واقعی معاملہ اہم ہے۔ اس وقت جس قدر فوج موجود ہے۔ اس کو لے کر فوراً اس مدعی کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو جانا چاہیئے اور موقع پر پہنچتے ہی حملہ کر دینا ضروری ہے، ممکن ہے کہ اس طرح ہم اسے قتل کر ڈالیں اس کے پاس ابھی تک فوج اس قدر کم ہوگی کہ ہم اس کو آسانی سے بھگا دیں گے اور جہاں ایک مرتبہ اس کو ہزیمت ہو گئی پھر اس کا دل ٹوٹ جائیگا" یوسف نے کہا " مجھ کو تمہاری رائے سے بالکل اتفاق ہے روانگی کا فوراً بندوبست کرنا چاہیے"

تمام لشکر میں یہ خبر دوڑ گئی کہ خلیفہ ہشام کا پوتا اسپین میں آن پہنچا ہے اور اب ہم کو اس سے لڑنے کے لیے چلنا ہوگا۔ اس خبر نے ہر طرف ایک ہلچل ڈال دی لشکر والوں کی حالت اس وقت ایسی تھی کہ اول تو ان کو یوسف پر اس بات کا غصہ تھا کہ ان کے سردار

ابن شہاب کے خلاف سازش کر کے اس کو اور اس کے ساتھ ہمارے بہادر بھائیوں کو پہاڑوں میں لڑوا کر جان سے مروا دیا، دوسرے اس بات پر سخت برہم تھے کہ سردار ان بنی قیس کی رائے کے قطعاً برخلاف قریشیوں کو قتل کرا دیا گیا، غرض اس غصہ اور برہمی کی حالت میں وہ ہرگز آمادہ نہ تھے کہ ایک ایسی مہم میں شریک ہوں جس کیلئے ابھی تک ا روپیہ بھی ان کو نہیں ملا ہے۔ لشکر کے لوگ آپسمیں کہنے لگے "مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو لڑائیوں کو ایک ہی لڑائی سمجھا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا، ہم کو جانا منظور نہیں" رات ہوتے ہی سپاہیوں نے لشکر چھوڑنا شروع کر دیا، قبائل نے آپسمیں مشورہ کر کے مختلف گروہ قائم کیے اور ان سب نے لشکر سے نکل اپنے اپنے گھروں کی راہ پکڑی، یمانیہ میں مشکل سے دس آدمی یوسف کے لشکر میں رہ گئے ان میں علم بردار بھی شامل تھے، جو علم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے، کیونکہ اس سے ان کی عزت میں فرق آتا تھا، مگر ان لوگوں نے نہ تو لشکر سے جانے والوں کو بُرا کہا، اور نہ ان کو روکنے میں کوشش کی: بنی قیس میں سے کچھ لوگ جن کو صمیل سے زیادہ تعلق تھا اور ان کے علاوہ معدی قبیلوں میں سے ایک دستہ فوج یوسف کے پاس رہ گیا باقی پورا لشکر غائب ہو گیا؛ جو فوج رہ گئی تھی اس کے لوگوں پر بھی کچھ بھروسا نہ ہو سکتا تھا کیونکہ ابھی سرقسطہ والی مہم میں منزلیں طے کرتے کرتے وہ تھک کر چور ہو چکے تھے، اور اپنے اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے یوسف اور صمیل سے درخواست کی کہ اب قرطبہ کو واپس چلیے، ہشام کے پوتے سے جنگ کے لیئے جانے کے بارے میں انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ ریہ کا علاقہ (جہاں وہ مقیم ہے) پہاڑی ملک ہے اور یہ موسم جاڑے کا ہے، اس وقت وہاں جا کر لڑنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک کم خطرے سے بچنے کے لیے ایک بڑے خطرے میں مبتلا ہونا پسند کیا جاتا ہے" اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "اس موقع پر جس قدر بغاوت ہو گی وہ صرف ساحل کے علاقوں تک محدود رہے گی۔ اس لیے اگر عبدالرحمن سے لڑنا ہے تو خشک موسم کے آنے تک اسے ملتوی کر دیا جائے"

لیکن صمیل کا ارادہ جب ایک دفعہ بولیا پھر وہ اٹل تھا۔ لشکر والوں نے جو کچھ کہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں بہت سی باتیں معقول تھیں لیکن صمیل نے لڑائی کا جو منصو

سوچا تھا اُس پر منضبوط رہا، پس وادی شربنہ سے یہ مختصر جماعت پیدلوں اور سواروں کی کوہستانِ ریّہ کے عزم سے چل پڑی، لیکن اب یوسف نے یہ خیال کر کے کہ فوج والوں کی بھی مرضی نہیں ہے، دوسرے اور طرح طرح کی مشکلات پیش آنے کا احتمال ہے صمیل کے منصوبہ جنگ کو ناقابل عمل سمجھا، جاڑہ شروع ہو گیا تھا، بارش کثرت سے ہونے لگی تھی جا بجا ندیوں کی طغیانی نے رستوں سے صحیح سلامت گذرنا مشکل کر دیا تھا، غرض صمیل کہتا ہی رہا مگر یوسف نے لشکر والوں سے کہدیا کہ یہ کوچ صرف قرطبہ پہنچنے کے لیے کیا جا رہا ہے یوسف کے اس ارادہ میں پختگی پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے سنا تھا کہ عبدالرحمٰن بن معاویہ اندلس میں حصول امارت کے قصد سے نہیں آیا ہے، بلکہ محض پناہ ڈھونڈنے اور کوئی ایسا منصب حاصل کرنے آیا ہے جو اُس کی شان و منزلت کے لائق ہو، اس کے علاوہ کسی نے یوسف سے یہ بھی کہدیا تھا کہ اگر آپ اس شہزادے سے اپنی کسی لڑکی کا عقد کر دیں گے، اور اُس کو کچھ روپیہ بھی دے دیں گے، تو پھر وہ آپ سے کسی چیز کا طلبگار نہ ہوگا

یوسف نے قرطبہ پہنچتے ہی نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کر دیا، اور اپنے تین معتمدوں کو یعنی عبید قیسی، خالد، اور عیسٰی کو طرش روانہ کیا، عبید بنی قیس کا سردار تھا، اور درجہ میں (۱۸۱)
صرف صمیل سے کم تھا، اور صمیل کا دوست بھی تھا، خالد امیر یوسف کا کاتب تھا، عیسٰی بنی امیہ کا مولیٰ اور فوج میں بخشی کا منصب رکھتا تھا، ایک خلعت فاخرہ، دو گھوڑے، دو خچر، دو غلام، اور ایک ہزار دینار سُرخ ان لوگوں کو دیے گئے کہ طرش پہنچکر امیر یوسف کی طرف سے شہزادہ کو پیش کر دیں۔

جب یہ لوگ یہ کل سامان لیے ہوئے علاقہ ریّہ کی سرحد پر قریہ ارش میں پہنچے تو عیسٰی نے گو وہ بنی امیہ کا مولیٰ تھا مگر اپنے آقا یوسف کا دل سے خیر خواہ تھا اپنے ساتھیوں سے کہا تعجب ہوتا ہے کہ امیر یوسف اور صمیل اور آپ جیسے لوگ بھی کوئی کام بغیر سوچے سمجھے کر سکتے ہیں، کیا آپ صاحبوں کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ اگر عبدالرحمٰن نے یوسف کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا تو یہ تحائف جو ہمارے ساتھ ہیں، ان کو قرطبہ واپس لیجانے کی نوبت آسکے گی؟ ہرگز نہیں" عیسٰے کی یہ بات سب کو بہت معقول معلوم ہوئی اور

اُنھوں نے عیسیٰ کو مع تحائف قریہ ارش میں چھوڑ کر ارادہ کر لیا کہ اگر عبدالرحمٰن یوسف کی شرطیں قبول کر لیں تو یہ تحائف پیش کر دیے جائیں گے ورنہ اِن کو قرطبہ واپس لیجائیں گے جب عبید اور خالد قریہ طرش میں پہنچے تو دیکھا کہ تمام قریہ اور قلعہ فوجیوں سے پٹا پڑا ہے، بنی اُمیہ کے تمام موالی اور لشکرِ دمشق واردن وقنسرین کے یمانیہ جو اندلس میں آباد تھے سب جمع ہیں، یوسف کے سفیروں کو سامنے آنے کی اجازت دی گئی، عبدالرحمٰن نہایت اخلاق سے اُن سے مِلا، اُس وقت شہزادہ ایک مختصر سا دربار کر رہا تھا جس میں ابوعثمان عبید اللہ تمام درباریوں میں ممتاز تھا، عبید اور خالد نے اپنے حاضر ہونے کا مقصد بیان کیا، اور کہا کہ "امیر یوسف اُن عنایات سابقہ کے دل سے ممنون ہیں جو خلفائے مروانیہ نے اُن کے پردادا عقبہ بن نافع پر مبذول فرمائی تھیں، پس اُن کی دلی آرزو ہے کہ وہ آپ کے ساتھ آشتی وسلوک کے تعلقات رکھیں، بشرطیکہ آپ کو امیر اندلس بننے کا دعویٰ نہ ہو، بلکہ اُنہی شاہی جاگیرات کو طلب کریں جو اسپین میں آپکے دادا خلیفہ ہشام کو اس سے قبل ذاتی طور پر حاصل تھیں" اس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ "امیر یوسف اپنی لڑکی کا عقد آپ سے کرنا چاہتے ہیں اور جہیز بھی بکثرت دینے کو فرماتے ہیں، اس وقت بھی اُنھوں نے بہت سے تحائف آپ کے لیے بھیجے ہیں جو قریہ ارش سے یہاں جلد پہنچنے والے ہیں، اگر حضور قرطبہ کا قصد فرمائیں گے تو امیر یوسف بہت خوش ہو کر آپ کی مدارات کریں گے"۔

یہ شرائط موالی بنی اُمیہ کو ناپسند نہیں ہوئیں، وہ پہلا سا جوش و خروش اب اُن میں باقی نہ تھا، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یمانیہ گو اپنے حریفانِ مقابل مضریہ سے لڑنے کو تیار تھے، لیکن اُن کو عبدالرحمٰن کے دعویٰ سلطنت کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، اِن سب باتوں پر نظر کر کے اِن موالی نے یہی بہتر سمجھا کہ یوسف کے ساتھ یہ معاملہ مصالحت طے ہو جائے چنانچہ اُنھوں نے یوسف کے ایلچیوں کو یہ جواب دیا کہ "آپ کی شرائط کو ہم پسند کرتے ہیں یوسف کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہمارا آقا اور سرپرست اندلس میں حصولِ امارت کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ صرف اُن زمینوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے جن پر وہ موروثی حق (۱۴۲)
رکھتا ہے"۔

لیکن بلا شبہ شہزادے کی غرض محض اتنی ہی نہ تھی، ایک دولتمند جاگیردار یا زمیندار بن کر اُس کی دلی آرزوئیں پوری نہ ہو سکتی تھیں، مگر ابھی تک چونکہ قدم جمے نہ تھے اس لیے اُس نے اپنے سارے اُمور دوستوں کی رائے پر چھوڑ دیے تھے، اور اُن کے ساتھ بہت ہی حجاب و انکسار کا برتاؤ رکھتا تھا، اُن کی کسی تجویز یا تحریک پر بحث نہ کرتا تھا، غرض اس موقع پر وہ مصلحتہً خاموش رہا، بادی النظر میں اُس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کی عقل پختہ نہیں ہوئی ہے، یا یہ کہ ابھی تک اس نے اپنے معمر استاد ابو عثمان عبید اللہ کی شاگردی سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

خالد نے کہا کہ "اب میں حضور کی خدمت میں وہ خط پیش کرتا ہوں جو امیر یوسف نے دیا ہے، اور جس میں وہ تمام امور بیان ہوئے ہیں جو ابھی ہم نے عرض کیے" شہزادے نے خالد کے ہاتھ سے خط لے کر ابو عثمان کو دیا کہ وہ اُسے بہ آواز بلند پڑھ دیں"

اس خط کی عبارت خالد ہی کی لکھی ہوئی تھی، کیونکہ وہ امیر یوسف کا کاتب تھا اور اس کی عربی تحریر بہت ہی نفیس صنائع و بدائع سے مرصع ہوتی تھی، جب عبید اللہ اُس کو آخر تک پڑھ گئے تو شہزادے نے حسب عادت ہوشیاری سے کل ذمہ داری عبید اللہ پر ٹال کر کہا "مناسب ہے کہ اس خط کا جواب آپ ہی تحریر کر دیں، اس معاملہ میں میرے خیالات سے آپ واقف ہیں"

خط کا جواب جو کچھ دیا جاتا وہ ظاہر تھا، عبید اللہ امیر یوسف کی جملہ شرائط کو منظور کر لیتے۔ عبدالرحمٰن پہلے ہی سے سلطنت و حکومت کی آرزو کو افسردہ دلی کیساتھ عبید اللہ کی مرضی پر چھوڑ چکے تھے، مگر اتفاق ایسا ہوا کہ خالد کی ایک بے موقع ظرافت نے اس کل کارروائی کی صورت دگرگوں کر دی، اور عبدالرحمٰن کی مردہ اُمیدیں پھر زندہ ہوگئیں۔

خالد عرب نہ تھا، ایک مفتوح رعیت اور نسل کا اسپینی تھا، اُس کے ماں باپ عیسائی غلام تھے، خالد کے باپ نے اپنے زمانہ کے دیگر عیسائی غلاموں کی مانند اپنا مذہب ترک کر دیا تھا، مسلمان ہونے کے بعد اُس کا نام زید ہو گیا، اور اسلام قبول کرنے کے صلہ میں اُس کے آقا امیر یوسف نے اس کو آزاد کر دیا۔ اُس کے لڑکے کو امیر یوسف کے محل میں

رہنے کی اجازت ہوگئی، یہ لڑکا بہت ذہین اور قابل نکلا، علمی مشاغل میں محنت شاقہ اٹھاتا تھا، نہایت شوق سے تعلیم پوری کر کے عربی ادب میں بڑی دستگاہ پیدا کرلی، عبارت بہت شستہ و پاکیزہ لکھنے لگا، یہ قابلیت دیکھ کر امیر یوسف نے اس کو اپنا کاتب مقرر کرلیا کاتب کا عہدہ بڑا معزز تھا۔ اندلس کے امیر اس عہدے پر ہمیشہ ایسے لوگوں کو مقرر کر کے خوش ہوتے تھے جو بڑے ادیب اور قدیم شعراء عرب کے کلام پر عبور رکھتے ہوں، کاتب کا درجہ حاصل کر کے خالد نے امیر یوسف کی کمزور طبیعت پر جو ہمیشہ دوسرے کے صلاح اور مشورے کی محتاج رہتی تھی، بڑا قابو پالیا، جس وقت صمیل موجود نہ ہوتا تھا تو خالد ہی کے فیصلے امیر یوسف کے فیصلے ہوا کرتے تھے، خالد کے اس علم اور اقتدار پر عربوں کو حسد ہوتا تھا، اور اس خیال سے کہ وہ ایک غلام اور غلام زادہ ہے اس سے نفرت کرتے تھے، جس قدر یہ انگھڑ اور تلوار کے دھنی عرب خالد کو کم مایہ اور ذلیل سمجھتے تھے اسی قدر خالد ان کو حقیر اور ذلیل جانتا تھا، غرض جس وقت خالد نے دیکھا کہ بڈھا عبیداللہ جو قلم کی بہ نسبت تلوار سے زیادہ آشنا تھا، بہت کچھ زور لگا کر بے ڈھنگے طریقے سے خالد کی مرصع و مزین عبارت کا جواب لکھنے میں مصروف ہے اُس غرور کی وجہ سے جو اہل علم کا خاصہ ہے، اُسے اس بات پر غصہ آیا کہ شہزادہ نے اتنا بڑا کام ایک ایسے جاہل کے سپرد کردیا جو زبان کی خوبیوں اور باریکیوں سے قطعی ناواقف ہے، چنانچہ رہا نہ گیا اور اس طرح مسکرا کر جیسے کوئی کسی کو ذلیل سمجھے عبیداللہ سے کہنے لگا "یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں، اس خط کا جواب لکھنے میں تو آپ کی بغلوں سے پسینا بہہ نکلے گا" عبیداللہ جو مزاج کا ویسے بھی تیز تھا اتنا سنتے ہی کہ یہ نو دولت عیسائی کا لونڈا، غلام بچہ ہماری ہنسی اُڑاتا ہے آگ ہو گیا، اور کہنے لگا کہ کذاب کیا بکتا ہے، دیکھ! ابو عثمان کی بغلوں سے پسینا نہیں بہے گا۔ اور اس خط کا جواب کبھی نہ جائے گا۔" اتنا کہہ خط اُٹھا خالد کے منہ پر کھینچ مارا، اور ایک گھونسہ بھی زور سے اس کے سر پر رسید کیا، سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس خبیث کو فوراً حراست میں لیکر بیڑیاں ڈال دو۔" سپاہی فوراً حکم بجالائے۔

اس کے بعد ابو عثمان نے شہزادے سے کہا "دیکھیے، ہماری فتح و فیروزمندی کے

زینہ کی یہ پہلی سیڑھی ہے، یہ آدمی یوسف کے حق میں چشمۂ دانش اور منبع فراست تھا، اِسکے بغیر یوسف بالکل بے دست و پا ہو جائے گا۔"

دوسرے سفیر یعنی عبید سردار بنی قیس نے انتظار کیا کہ عبید اللہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو کچھ کہے، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کہا "اے ابو عثمان! اس بات کو یاد رکھو کہ خالد امیر اندلس کا سفیر اور ایلچی ہے، اُس کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچنا چاہیے" ابو عثمان نے جواب دیا "نہیں، اے عالی مرتبت سردار بنی قیس! ایلچی اور سفیر دراصل آپ ہیں اور آپ ہر طرح کے امن و عزت کے ساتھ واپس جا سکتے ہیں، رہا یہ خالد تو اس کے خطاوار ہونے میں کلام نہیں، اور جو سزا اس کو دی گئی ہے وہ اس کا سزاوار تھا، یہ علج ہے، ایک کمینے اور ذلیل عیسائی کا لونڈا۔"

خالد کی بے موقع بدتمیزی اور عزور اور ابو عثمان کی آتش مزاجی نے نامہ و پیام کے اس سلسلے کو قطعی درہم و برہم کر دیا، اور عبدالرحمن یہ دیکھ کر کہ بخت و اتفاق اس کے بعض منصوبوں میں جنھیں وہ زبان پر نہ لا سکتا تھا۔ خود بخود کس طرح ساعی ہو گئے ہیں، اس واقعہ سے ہرگز ناخوش نہ ہوا،

جس وقت عبید جس کی عزت ابو عثمان کے دل میں اس وجہ سے تھی کہ وہ ایک بڑے طاقتور قبیلۂ عرب کا سردار تھا، رخصت ہوا، اور خالد قید خانہ میں پہنچ گیا تو موالی بنی امیہ کو یاد آیا کہ تحائف کا بھی کچھ ذکر آیا تھا کہ قریہ ارش میں اُن کو دیر لگی ہے، اِس خیال کے آتے ہی اُن تحفوں پر قبضہ کرنا چاہا، چونکہ عملاً یوسف کے مقابلہ میں اعلان جنگ ہو گیا تھا اس لیے یہ تحائف اگر مل گئے تو جائز طور پر مال غنیمت تصور کیے جا سکتے تھے، تقریباً بیس سواروں نے قریہ ارش کی طرف اپنے گھوڑے سرپٹ ڈال دیے، لیکن عیسیٰ کو جو ان تحفوں کے ساتھ ارش میں رہ گیا تھا، طرش کے واقعات سے کسی طرح پہلے ہی آگاہی ہو گئی تھی، پس وہ مع کل سامان کے جو شہزادہ عبدالرحمن کو نذر دینے کے لیے ساتھ لایا تھا، ارش سے چل دیا، اور بنی امیہ کے سوار خالی ہاتھ طرش کو واپس آئے، اس نقصان کی نسبت عبدالرحمن نے عیسیٰ کو معاف نہ کیا، عیسیٰ درحقیقت بنی امیہ کا موالی تھا۔ اور اس

نے عبدالرحمٰن کو یہ باور بھی کرانا چاہا کہ اُس وقت وہ امیر یوسف کا نمک حلال ملازم تھا، اور بجز اس کے کہ اپنے آقا کے نفع کا خیال کرے اور کوئی چارہ اُسے نہ تھا، مگر عبدالرحمٰن کے دل میں بات رہی۔

جس وقت عبید سردار بنی قیس نے قرطبہ میں آکر یوسف اور صمیل سے وہ کل واقعات کہے جو طرش میں پیش آئے تھے تو صمیل نے کہا "میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ سفارت ناکام واپس آئے گی، اے امیر! میں نے آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ اس مدعی سلطنت عبدالرحمٰن پر جاڑے ہی کے موسم میں جس وقت اُس نے اِس ملک میں قدم رکھا تھا حملہ کر دیجیے، مگر آپ نے نہ سُنا۔"

صمیل کی یہ رائے گو درست تھی، لیکن اس پر عمل کرنا ممکن نہ تھا، مگر اُس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس مشکل سے نکلنے کی سوائے اس کے دوسری تدبیر نہ تھی۔

سند

اخبار مجموعہ صفحات ۸۰ - ۸۳

(۱۴۵)

کتاب اوّل

خانہ جنگی

پندرھویں فصل

عبدالرحمٰن الداخل

۱۳۰ھ کا جاڑا اندلس میں غیر معمولی سختی کا تھا، جانبین کو انتظار کرنا پڑا کہ وہ ختم ہو لے تو لڑائی شروع کریں، عبدالرحمٰن نے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ابو عثمان عبید اللہ نے جو اس کشتی کی ناخدائی کر رہے تھے۔ اس مجبورانہ بیکاری کے زمانہ میں (جو کئی ماہ کا تھا) پورا کام نکالا اور کافی وقت مل گیا کہ سردارانِ عرب و بربر سے یوسف کے مقابلہ میں لڑنے کے لیے بخوبی گفت و شنید ہو جائے، یمانیہ نے بہ اتفاق کلی کہدیا کہ ہم اشارہ پاتے ہی شہزادہ عبدالرحمٰن کے طرف دار بن کر لڑنے کو تیار ہو جائیں گے، بربر اس امر پر متفق الرائے نہ ہوئے، کچھ یوسف کے طرفدار ہو گئے اور کچھ عبدالرحمٰن کے، سرداران بنی قیس میں سے صرف چھ آدمیوں نے شہزادے کو مدد دینے کا وعدہ کیا، ان میں سے تین شخص یعنی جابر حصین اور ابو بکر ایسے تھے جن کو صمیل سے ذاتی رنجش تھی، جابر علا ابن شہاب کا بیٹا تھا

وہ دوسروں کے لیے جوان کے قدم بقدم چلنا چاہیں گے عبرت ہوگی اب اس ملک اسپین کو آپ اپنی ملک سمجھیئے آج سے آپ ایک ایسے دودمانِ شاہی کے بانی ہوئے ہیں جس کا نام تا قیامت چلیگا اور اب ایسا کون بخت دکوتاہ اندلس کون ہوگا جو آپ کی حکومت پر اعتراض لاسکتے؟

لیکن صمیل کی یہ سب کوششیں کہ یوسف کا فکر دور ہو بیکار تھیں، یوسف کے دل پر افسوس اور شرمندگی کی جو تاریک گھٹا چھائی ہوئی تھی وہ ان باتوں سے دور نہ ہوئی یہاں تک کہ کھانا ختم ہوا، یوسف اٹھ کر اپنے دو بیٹوں کے خیمے میں آیا اور چاہا کہ حسب عادت کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر استراحت کرے۔

یہاں تنہائی میں یوسف سونے کی غرض سے نہیں بلکہ عادت کی وجہ سے ایک پلنگ پر لیٹ رہا اس فکر و پریشانی میں آنکھوں میں نیند کا کیا ذکر تھا۔ اسی حال میں تھا کہ یکایک سپاہیوں میں یہ غل سنا کہ قرطبہ سے کوئی قاصد آیا ہے، یوسف یہ غل سنتے ہی اٹھ بیٹھا اور خیمے کے دروازے کے پاس جاکر پہرے والوں سے پوچھا "لوگ کیا کہہ رہے ہیں"؟ سپاہیوں نے عرض کیا کہ "ام عثمان کے خچر پر سوار ایک غلام آیا ہے" یوسف نے کہا اس کو فوراً یہاں بلالاؤ" اب وہ اس خلجان میں پڑا کہ آخر وہ کیا پیغام ہے جو اس کی بیوی نے اس عجلت کے ساتھ بھیجا ہے؟ ظاہر ہے کہ کوئی ایسی ہی سخت اور مشکل بات ہوگی کہ اس طرح آدمی روانہ کیا گیا۔

قاصد خیمے کے اندر آیا اور امیر کو ایک خط دیا جس کا مضمون تھا کہ "خلیفہ ہشام کا ایک پوتا اسپین میں آیا ہے قریہ طرش میں رومی السیرت ابو عثمان عبید اللہ کے قصر میں مقیم ہے۔ بنی امیہ کے موال اس کے ساتھ ہو گئے ہیں، آپ کے حاکم البیرہ نے جس قدر فوج مل سکی۔ ساتھ لے کر اس مدعی سلطنت کا مقابلہ کیا، لیکن پسپا ہونا پڑا، اس کے آدمیوں کو دشمن نے مارا پیٹا لیکن کوئی جان ضائع نہیں ہوئی جو تدارک مناسب و ضروری ہو اسے جلد اختیار کیا جائے"۔

یہ خط پڑھتے ہی یوسف نے صمیل کو بلوایا صمیل جب کھانا کھا کر اپنے خیمہ کو جا تا تھا۔

تو قاصد کو آتے دیکھا تھا۔ مگر حسب عادت بے پروائی سے اس کی طرف توجہ نہ کی تھی جب یوسف نے اسے بلوایا تو خیال ہوا عجیب نہیں کہ جس قاصد کو آتے دیکھا تھا وہ کوئی سنگین اور وحشتناک خبر لایا ہو۔

یوسف کے خیمے میں قدم رکھتے ہی پوچھا "اے امیر! کیا بات پیش آئی ہے کہ مجھے اس وقت سوتے ہوئے کو آپ نے اٹھوا بلوایا۔ کوئی بُری خبر تو نہیں ہے؟" یوسف نے کہا "واللہ! بہت بری خبر ہے اور مجھے خوف ہے کہ جو خون ہم نے آج کئے ہیں ان کی سزا میں خدا کا عذاب اب ہم پر شروع ہو گیا ہے" صمیل نے ہنس کر کہا آپ تو ایسی باتیں کرتے ہیں جو دانائی سے بعید ہیں۔ پھر سن لیجئے جن لوگوں کو ہم نے قتل کیا ہے وہ ایسے خبیث تھے کہ خدا بھی ان کی فریاد نہ سنے گا۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ ہوا کیا ہے؟ یوسف نے جواب دیا کہ "یہ خط اُم عثمان کے پاس سے آیا ہے، خالد! ذرا اس خط کو پڑھ کر سُنا تو دو۔"

خالد امیر یوسف کا آزاد غلام اور کاتب تھا، اس نے خط یوسف کے ہاتھ سے لیا اور پڑھ کر سنایا، مضمون سنکر صمیل کو یوسف کا سا تعجب نہ ہوا، کیونکہ اس معاملہ کا کسی قدر پتہ اس کو پہلے ہی مل چکا تھا، غرض یہ خبر کہ عبدالرحمٰن اندلس میں آ گیا ہے اس نے بلا استعجاب سنی اور سن کر کہنے لگا۔ "واقعی معاملہ اہم ہے۔ اس وقت جس قدر فوج موجود ہے۔ اس کو لے کر فوراً اس مدعی کے مقابلہ کے لیے روانہ ہو جانا چاہیئے اور موقع پر پہنچتے ہی حملہ کر دینا ضروری ہے، ممکن ہے کہ اس طرح ہم اسے قتل کر ڈالیں اس کے پاس ابھی تک فوج اس قدر کم ہو گی کہ ہم اس کو آسانی سے بھگا دیں گے اور جہاں ایک مرتبہ اس کو ہزیمت ہو گئی پھر اس کا دل ٹوٹ جائیگا" یوسف نے کہا "مجھ کو تمہاری رائے سے بالکل اتفاق ہے روانگی کا فوراً بندوبست کرنا چاہیے۔"

تمام لشکر میں یہ خبر دوڑ گئی کہ خلیفہ ہشام کا پوتا اسپین میں آن پہنچا ہے اور اب ہم کو اس سے لڑنے کے لیے چلنا ہو گا۔ اس خبر نے ہر طرف ایک ہلچل ڈال دی لشکر والوں کی حالت اس وقت ایسی تھی کہ اول تو ان کو یوسف پر اس بات کا غصہ تھا کہ ان کے سردار

ابن شہاب کے خلاف سازش کر کے اس کو اور اس کے ساتھ ہمارے بہادر بھائیوں کو پہاڑوں میں لڑوا کر جان سے مروا دیا، دوسرے اس بات پر سخت برہم تھے کہ سرداران بنی قیس کی رائے کے قطعاً برخلاف قریشیوں کو قتل کروا دیا گیا، غرض اس غصہ اور برہمی کی حالت میں وہ ہرگز آمادہ نہ تھے کہ ایک ایسی مہم میں شریک ہوں جس کیلئے ابھی تک روپیہ بھی ان کو نہیں ملا ہے۔ لشکر کے لوگ آپس میں کہنے لگے "مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو لڑائیوں کو ایک ہی لڑائی سمجھا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا، ہم کو جانا منظور نہیں" رات ہوتے ہی سپاہیوں نے لشکر چھوڑنا شروع کر دیا، قبائل نے آپس میں مشورہ کر کے مختلف گروہ قائم کیے اور ان سب نے لشکر سے نکل اپنے اپنے گھروں کی راہ پکڑی، یہاں تک میں مشکل سے دس آدمی یوسف کے لشکر میں رہ گئے ان میں علم بردار بھی شامل تھے، جو علم کو چھوڑ کر نہیں جا سکتے تھے، کیونکہ اس سے ان کی عزت میں فرق آتا تھا، مگر ان لوگوں نے نہ تو لشکر سے جانے والوں کو برا کہا، اور نہ ان کو روکنے میں کوشش کی، بنی قیس میں سے کچھ لوگ جن کو صمیل سے زیادہ تعلق تھا اور ان کے علاوہ معدی قبیلوں میں سے ایک دستہ فوج یوسف کے پاس رہ گیا باقی پورا لشکر غائب ہو گیا، جو فوج رہ گئی تھی اس کے لوگوں پر بھی کچھ بھروسہ نہ ہو سکتا تھا کیونکہ ابھی سرقسطہ والی مہم میں منزلیں طے کرتے کرتے وہ تھک کر چور ہو چکے تھے، اور اپنے اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے یوسف اور صمیل سے درخواست کی کہ اب قرطبہ کو واپس چلیے، ہشام کے پوتے سے جنگ کے لیے جانے کے بارے میں انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ "ریہ کا علاقہ (جہاں وہ مقیم ہے) پہاڑی ملک ہے اور یہ موسم جاڑے کا ہے، اس وقت وہاں جا کر لڑنے کے معنی یہ ہوں گے کہ ایک کم خطرے سے بچنے کے لیے ایک بڑے خطرے میں مبتلا ہونا پسند کیا جاتا ہے" اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "اس موقع پر جس قدر بغاوت ہو گی وہ صرف ساحل کے علاقوں تک محدود رہے گی۔ اس لیے اگر عبد الرحمن سے لڑنا ہے تو خشک موسم کے آنے تک اسے ملتوی کر دیا جائے" لیکن صمیل کا ارادہ جب ایک دفعہ ہو لیا پھر وہ اٹل تھا۔ لشکر والوں نے جو کچھ کہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں بہت سی باتیں معقول تھیں لیکن صمیل نے لڑائی کا جو منصوبہ

سوچا تھا اُس پر مضبوط رہا، پس وادی شربنہ سے یہ مختصر جماعت پیدلوں اور سواروں کی کوہستان ریّہ کے عزم سے چل پڑی، لیکن اب یوسف نے یہ خیال کر کے کہ فوج والوں کی بھی مرضی نہیں ہے، دوسرے اور طرح طرح کی مشکلات پیش آنے کا احتمال ہے صمیل کے منصوبہ جنگ کو ناقابل عمل سمجھا، جاڑہ شروع ہو گیا تھا، بارش کثرت سے ہونے لگی تھی جابجا ندیوں کی طغیانی نے رستوں سے صحیح سلامت گذرنا مشکل کر دیا تھا، غرض صمیل کہتا ہی رہا مگر یوسف نے لشکر والوں سے کہدیا کہ یہ کوچ صرف قرطبہ پہنچنے کے لیے کیا جارہا ہے یوسف کے اس ارادہ میں پختگی پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے سنا تھا کہ عبدالرحمٰن بن معاویہ اندلس میں حصول امارت کے قصد سے نہیں آیا ہے، بلکہ محض پناہ ڈھونڈنے اور کوئی ایسا منصب حاصل کرنے آیا ہے جو اُس کی شان و منزلت کے لائق ہو، اس کے علاوہ کسی نے یوسف سے یہ بھی کہدیا تھا کہ اگر آپ اس شہزادے سے اپنی کسی لڑکی کا عقد کر دیں گے، اور اُس کو کچھ روپیہ بھی دے دیں گے، تو پھر وہ آپ سے کسی چیز کا طلبگار نہ ہو گا

یوسف نے قرطبہ پہنچتے ہی نامہ و پیام کا سلسلہ شروع کر دیا، اور اپنے تین معتمدوں کو
یعنی عبید قیسی، خالد، اور عیسیٰ کو طرش روانہ کیا، عبید بنی قیس کا سردار تھا، اور درجہ میں (۱۸۱)
صرف صمیل سے کم تھا، اور صمیل کا دوست بھی تھا، خالد امیر یوسف کا کاتب تھا، عیسیٰ بنی امیہ کا مولیٰ اور فوج میں بخشی کا منصب رکھتا تھا، ایک خلعت فاخرہ، دو گھوڑے، دو خچر، دو غلام، اور ایک ہزار دینار سُرخ ان لوگوں کو دیے گئے کہ طرش پہنچکر امیر یوسف کی طرف سے شہزادہ کو پیش کر دیں۔

جب یہ لوگ یہ کل سامان لیے ہوئے علاقہ ریّہ کی سرحد پر قریہ ارش میں پہنچے تو عیسیٰ نے گو وہ بنی امیہ کا مولیٰ تھا مگر اپنے آقا یوسف کا دل سے خیر خواہ تھا اپنے ساتھیوں سے کہا، تعجب ہوتا ہے کہ امیر یوسف اور صمیل اور آپ جیسے لوگ بھی کوئی کام بغیر سوچے سمجھے کر سکتے ہیں، کیا آپ صاحبوں کی سمجھ میں اتنا بھی نہیں آتا کہ اگر عبدالرحمٰن نے یوسف کی شرائط ماننے سے انکار کر دیا تو یہ تحائف جو ہمارے ساتھ ہیں، ان کو قرطبہ واپس لیجانے کی نوبت آسکے گی؟ ہر گز نہیں" عیسےٰ کی یہ بات سب کو بہت معقول معلوم ہوئی اور

اُنھوں نے عیسیٰ کو مع تحائف قریہ ارش میں چھوڑ کر ارادہ کر لیا کہ اگر عبدالرحمٰن یوسف کی شرطیں قبول کر لیں تو یہ تحائف پیش کر دیے جائیں گے ورنہ اِن کو قرطبہ واپس لیجائیں گے جب عبید اور خالد قریہ طرش میں پہنچے تو دیکھا کہ تمام قریہ اور قلعہ فوجیوں سے پٹا پڑا ہے، بنی اُمیہ کے تمام موالی اور لشکرِ دمشق واردن وقنسرین کے یمانیہ جو اندلس میں آباد تھے سب جمع ہیں، یوسف کے سفیروں کو سامنے آنے کی اجازت دی گئی، عبدالرحمٰن نہایت اخلاق سے اُن سے مِلا، اُس وقت شہزادہ ایک مختصر سا دربار کر رہا تھا جس میں ابوعثمان عبیداللہ تمام درباریوں میں ممتاز تھا، عبید اور خالد نے اپنے حاضر ہونے کا مقصد بیان کیا، اور کہا کہ " امیر یوسف اُن عنایات سابقہ کے دل سے ممنون ہیں جو خلفائے مروانیہ نے اُن کے پردادا عقبہ بن نافع پر مبذول فرمائی تھیں، پس اُن کی دلی آرزو ہے کہ وہ آپ کے ساتھ آشتی وسلوک کے تعلقات رکھیں، بشرطیکہ آپ کو امیر اندلس بننے کا دعویٰ نہ ہو، بلکہ اُنہی شاہی جاگیرات کو طلب کریں جو اسپین میں آپکے دادا خلیفہ ہشام کو اس سے قبل ذاتی طور پر حاصل تھیں" اس کے بعد اُنھوں نے کہا کہ " امیر یوسف اپنی لڑکی کا عقد آپ سے کرنا چاہتے ہیں اور جہیز بھی بکثرت دینے کو فرماتے ہیں، اس وقت بھی اُنھوں نے بہت سے تحائف آپ کے لیے بھیجے ہیں جو قریہ ارش سے یہاں جلد پہنچنے والے ہیں، اگر حضور قرطبہ کا قصد فرمائیں گے تو امیر یوسف بہت خوش ہو کر آپ کی مدارات کریں گے "۔

یہ شرائط موالی بنی اُمیہ کو ناپسند نہیں ہوئیں، وہ پہلا سا جوش وخروش اب اُن میں باقی نہ تھا، کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ یمانیہ گو اپنے حریفانِ مقابل مضریہ سے لڑنے کو تیار تھے، لیکن اُن کو عبدالرحمٰن کے دعوئ سلطنت کے ساتھ کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، اِن سب باتوں پر نظر کر کے اِن موالی نے یہی بہتر سمجھا کہ یوسف کے ساتھ یہ معاملہ بمصالحت طے ہو جائے چنانچہ اُنھوں نے یوسف کے ایلچیوں کو یہ جواب دیا کہ " آپ کی شرائط کو ہم پسند کرتے ہیں یوسف کو یقین کر لینا چاہیے کہ ہمارا آقا اور سرپرست اندلس میں حصولِ امارت کے لیے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ صرف اُن زمینوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے جن پر وہ موروثی حق رکھتا ہے "۔ (۱۳۲)

لیکن بلاشبہ شہزادے کی غرض محض اتنی ہی نہ تھی، ایک دولتمند جاگیردار یا زمیندار بن کر اُس کی دلی آرزوئیں پوری نہ ہو سکتی تھیں، مگر ابھی تک چونکہ قدم جمے نہ تھے اس لیے اُس نے اپنے سارے اُمور دوستوں کی رائے پر چھوڑ دیے تھے، اور اُن کے ساتھ بہت ہی حجاب و انکسار کا برتاؤ رکھتا تھا، اُن کی کسی تجویز یا تحریک پر بحث نہ کرتا تھا، غرض اس موقع پر وہ مصلحتہً خاموش رہا، بادی النظر میں اُس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کی عقل پختہ نہیں ہوئی ہے، یا یہ کہ ابھی تک اس نے اپنے معمر استاد ابوعثمان عبیداللہ کی شاگردی سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

خالد نے کہا کہ "اب میں حضور کی خدمت میں وہ خط پیش کرتا ہوں جو امیر یوسف نے دیا ہے، اور جس میں وہ تمام امور بیان ہوئے ہیں جو ابھی ہم نے عرض کیے" شہزادے نے خالد کے ہاتھ سے خط لے کر ابوعثمان کو دیا کہ وہ اُسے بہ آواز بلند پڑھ دیں۔"

اس خط کی عبارت خالد ہی کی لکھی ہوئی تھی، کیونکہ وہ امیر یوسف کا کاتب تھا اور اس کی عربی تحریر بہت ہی نفیس صنائع و بدائع سے مرصع ہوتی تھی، جب عبیداللہ اُس کو آخر تک پڑھ گئے تو شہزادے نے حسب عادت ہوشیاری سے کل ذمہ داری عبیداللہ پر ٹال کر کہا "مناسب ہے کہ اس خط کا جواب آپ ہی تحریر کر دیں، اس معاملہ میں میرے خیالات سے آپ واقف ہیں۔"

خط کا جواب جو کچھ دیا جاتا وہ ظاہر تھا، عبیداللہ۔ امیر یوسف کی جملہ شرائط کو منظور کر لیتے۔ عبدالرحمٰن پہلے ہی سے سلطنت و حکومت کی آرزو کو افسردہ دلی کیساتھ عبیداللہ کی مرضی پر چھوڑ چکے تھے، مگر اتفاق ایسا ہوا کہ خالد کی ایک بے موقع ظرافت نے اس کل کارروائی کی صورت دِگرگوں کر دی، اور عبدالرحمٰن کی مردہ اُمیدیں پھر زندہ ہو گئیں۔

خالد عرب نہ تھا، ایک مفتوح رعیت اور نسل کا اسپینی تھا، اُس کے ماں باپ عیسائی غلام تھے، خالد کے باپ نے اپنے زمانہ کے دیگر عیسائی غلاموں کی مانند اپنا مذہب ترک کر دیا تھا، مسلمان ہونے کے بعد اُس کا نام زید ہو گیا، اور اسلام قبول کرنے کے صلہ میں اُس کے آقا امیر یوسف نے اس کو آزاد کر دیا۔ اُس کے لڑکے کو امیر یوسف کے محل میں

رہنے کی اجازت ہوگئی، یہ لڑکا بہت ذہین اور قابل نکلا، علمی مشاغل میں محنت شاقہ اٹھاتا تھا، نہایت شوق سے تعلیم پوری کرکے عربی ادب میں جری دستگاہ پیدا کرلی، عبارت بہت شستہ و پاکیزہ لکھنے لگا، یہ قابلیت دیکھ کر امیر یوسف نے اس کو اپنا کاتب مقرر کرلیا کاتب کا عہدہ بڑا معزز تھا۔ اندلس کے امیر اس عہدے پر ہمیشہ ایسے لوگوں کو مقرر کرکے خوش ہوتے تھے جو بڑے ادیب اور قدیم شعراء عرب کے کلام پر عبور رکھتے ہوں، کاتب کا درجہ حاصل کرکے خالد نے امیر یوسف کی کمزور طبیعت پر جو ہمیشہ دوسرے کے صلاح اور مشورے کی محتاج رہتی تھی، بڑا قابو پالیا، جس وقت صمیل موجود نہ ہوتا تھا تو خالد ہی کے فیصلے امیر یوسف کے فیصلے ہوا کرتے تھے، خالد کے اس علم اور اقتدار پر عربوں کو حسد ہوتا تھا، اور اس خیال سے کہ وہ ایک غلام اور غلام زادہ ہے اس سے نفرت کرتے تھے، جس قدر یہ انگھڑ اور تلوار کے دھنی عرب خالد کو کم مایہ اور ذلیل سمجھتے تھے اسی قدر خالد ان کو حقیر اور ذلیل جانتا تھا، غرض جس وقت خالد نے دیکھا کہ بڈھا عبید اللہ جو قلم کی بہ نسبت تلوار سے زیادہ آشنا تھا، بہت کچھ زور لگا کر بے ڈھنگے طریقے سے خالد کی مرصع و مزین عبارت کا جواب لکھنے میں مصروف ہے اس غرور کی وجہ سے جو اہل علم کا خاصہ ہے، اسے اس بات پر غصہ آیا کہ شہزادہ نے اتنا بڑا کام ایک ایسے جاہل کے سپرد کردیا جو زبان کی خوبیوں اور باریکیوں سے قطعی ناواقف ہے، چنانچہ رہا نہ گیا اور اس طرح مسکرا کر جیسے کوئی کسی کو ذلیل سمجھے عبید اللہ سے کہنے لگا "یہ آپ کیا لکھ رہے ہیں، اس خط کا جواب لکھنے میں تو آپ کی بغلوں سے پسینا بہہ نکلے گا" عبید اللہ جو مزاج کا ویسے بھی تیز تھا اتنا سنتے ہی کہ یہ نو دولت عیسائی کا لونڈا، غلام بچہ ہماری ہنسی اڑاتا ہے آگ ہوگیا، اور کہنے لگا کہ کذاب کیا بکتا ہے، دیکھ! ابو عثمان کی بغلوں سے پسینا نہیں بہے گا۔ اور اس خط کا جواب کبھی نہ جائے گا۔" اتنا کہہ خط اٹھا خالد کے منہ پر کھینچ مارا، اور ایک گھونسہ بھی زور سے اس کے سر پر رسید کیا، سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس خبیث کو فوراً حراست میں لیکر بیڑیاں ڈالدو۔" سپاہی فوراً حکم بجالائے۔

اس کے بعد ابو عثمان نے شہزادے سے کہا "دیکھیے، ہماری فتح و فیروز مندی کے

زینہ کی یہ پہلی سیڑھی ہے، یہ آدمی یوسف کے حق میں چشمۂ دانش اور منبع فراست تھا، اِسکے بغیر یوسف بالکل بے دست و پا ہو جائے گا“

دوسرے سفیر یعنی عبید سردار بنی قیس نے انتظار کیا کہ عبید اللہ کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو کچھ کہے، چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے کہا ”اے ابو عثمان! اس بات کو یاد رکھو کہ خالد امیر اندلس کا سفیر اور ایلچی ہے، اُس کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچنا چاہیے“ ابو عثمان نے جواب دیا ”نہیں، اے عالی مرتبت سردار بنی قیس! ایلچی اور سفیر دراصل آپ ہیں اور آپ ہر طرح کے امن و عزت کے ساتھ واپس جا سکتے ہیں، رہا یہ خالد تو اس کے خطاوار ہونے میں کلام نہیں، اور جو سزا اس کو دی گئی ہے وہ اس کا سزاوار تھا، یہ علج ہے، ایک کمینے اور ذلیل عیسائی کا لونڈا“

خالد کی بے موقع بدتمیزی اور غرور، اور ابو عثمان کی آتش مزاجی نے نامہ و پیام کے اس سلسلے کو قطعی درہم و برہم کر دیا، اور عبدالرحمٰن یہ دیکھ کر کہ بخت و اتفاق اس کے بعض منصوبوں میں جنھیں وہ زبان پر نہ لا سکتا تھا۔ خود بخود کس طرح ساعی ہو گئے ہیں، اس واقعہ سے ہرگز ناخوش نہ ہوا،

جس وقت عبید جس کی عزت ابو عثمان کے دل میں اس وجہ سے تھی کہ وہ ایک بڑے طاقتور قبیلۂ عرب کا سردار تھا، رخصت ہوا، اور خالد قید خانہ میں پہنچ گیا تو موالی بنی امیہ (۱۴۸ء)
کو یاد آیا کہ تحائف کا بھی کچھ ذکر آیا تھا کہ قریہ ارش میں اُن کو دیر لگی ہے، اِس خیال کے آتے ہی اُن تحفوں پر قبضہ کرنا چاہا، چونکہ عملاً یوسف کے مقابلہ میں اعلان جنگ ہو گیا تھا اس لیے یہ تحائف اگر مل گئے تو جائز طور پر مال غنیمت تصور کیے جا سکتے تھے، تقریباً بیس سواروں نے قریہ ارش کی طرف اپنے گھوڑے سرپٹ ڈال دیے، لیکن عیسیٰ کو جو ان تحفوں کے ساتھ ارش میں رہ گیا تھا، طرش کے واقعات سے کسی طرح پہلے ہی آگاہی ہو گئی تھی، پس وہ مع کل سامان کے جو شہزادہ عبدالرحمٰن کو نذر دینے کے لیے ساتھ لایا تھا۔ ارش سے چل دیا، اور بنی امیہ کے سوار خالی ہاتھ طرش کو واپس آئے، اس نقصان کی نسبت عبدالرحمٰن نے عیسیٰ کو معاف نہ کیا، عیسیٰ درحقیقت بنی امیہ کا موالی تھا۔ اور اس

نے عبدالرحمٰن کو یہ باور بھی کرانا چاہا کہ اُس وقت وہ امیر یوسف کا نمک حلال ملازم تھا، اور بجز اِس کے کہ اپنے آقا کے نفع کا خیال کرے اور کوئی چارہ اُسے نہ تھا، مگر عبدالرحمٰن کے دل میں بات رہی۔

جس وقت عبید سردار بنی قیس نے قرطبہ میں آکر یوسف اور صمیل سے وہ کل واقعات کہے جو طرش میں پیش آئے تھے تو صمیل نے کہا "میں پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ سفارت ناکام واپس آئے گی، اے امیر! میں نے آپ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ اِس مدعی سلطنت عبدالرحمٰن پر جاڑے ہی کے موسم میں جس وقت اُس نے اِس ملک میں قدم رکھا تھا حملہ کر دیجیے، مگر آپ نے نہ سُنا۔"

صمیل کی یہ رائے گو درست تھی، لیکن اس پر عمل کرنا ممکن نہ تھا، مگر اُس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اس مشکل سے نکلنے کی سوائے اس کے دوسری تدبیر نہ تھی۔

سند

اخبار مجموعہ صفحات ۸۰ - ۸۳

کتاب اوّل

(۱۴۵)

خانہ جنگی

پندرھویں فصل

عبدالرحمٰن الداخل

۱۳۰ھ کا جاڑا اندلس میں غیر معمولی سختی کا تھا، جانبین کو انتظار کرنا پڑا کہ وہ ختم ہو لے تو لڑائی شروع کریں، عبدالرحمٰن نے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ابو عثمان عبیداللہ نے جو کس کشتی کی ناخدائی کر رہے تھے۔ اس مجبورانہ بیکاری کے زمانہ میں (جو کئی ماہ کا تھا) پورا کام نکالا اور کافی وقت مل گیا کہ سرداران عرب زبر سے یوسف کے مقابلہ میں لڑنے کے لیے بخوبی گفت و شنید ہو جائے، یمانیہ نے بہ اتفاق کلی کہدیا کہ ہم اشارہ پاتے ہی شہزادہ عبدالرحمٰن کے طرف دار بن کر لڑنے کو تیار ہو جائیں گے، بربر اس امر پر متفق الرائے نہ ہوئے، کچھ یوسف کے طرفدار ہو گئے اور کچھ عبدالرحمٰن کے، سرداران بنی قیس میں سے صرف چھ آدمیوں نے شہزادے کو مدد دینے کا وعدہ کیا، ان میں سے تین شخص یعنی جابر حصین اور ابو بکر ایسے تھے جن کو صمیل سے ذاتی رنجش تھی، جابر علاء بن شہاب کا بیٹا تھا

جس کو صمیل نے دیدہ و دانستہ موت کا لقمہ بنانے کے لیے قوم شکنس کے مقابلہ میں روانہ کیا تھا حصین ابن الدجن العقیلی اس معرکہ میں ابن شہاب کے ساتھ تھا مگر زندہ بچ کر چلا آیا تھا - ابوبکر بن ہلال العبدی کو صمیل سے اُس دن سے عداوت ہو گئی تھی جب سے اس کے باپ کو ایک مرتبہ صمیل نے مارا تھا، باقی تین قیسی قبیلہ ثقیف کے تھے، اور بنی ثقیف مشہور و معروف حجاج بن یوسف الثقفی کے زمانہ سے بنی امیہ کے بڑے خیرخواہ چلے آتے تھے،

اب فریقین قبائل بربر سے مدد پا کر آمادہ ہو گئے کہ جنگ شقندہ جسے اب دس برس ہونے کو آتے تھے، ایک بڑے پیمانہ پر پھر لڑی جائے، فریقین طاقت کے اعتبار سے اتنے بے جوڑ نہ تھے جیسے کہ معلوم ہوتے تھے عبدالرحمٰن کے فریق والے تعداد میں زیادہ تھے، لیکن اُن میں جس قدر یمانیہ تھے اُن پر پورا پورا بھروسہ نہ تھا، کیونکہ عبدالرحمٰن کے امر حکومت میں وہ کوئی خاص شغف نہ رکھتے تھے اور اس لڑائی کو بنی معد سے انتقام لینے کا محض ایک آلہ سمجھ رہے تھے، لیکن یوسف کے فریق والے ایک متحدہ جماعت کی شکل رکھتے تھے، مگر اُن کا اتحاد ایسا ہی اتحاد تھا جیسے کہ عربی قبائل میں آپس کے کینہ و رشک کو دل میں رکھتے ہوئے پیدا ہو سکتا تھا، لیکن اس وقت یہ خیال سب کے دل میں تھا کہ موجودہ سلطنت جس طریقہ پر چل رہی ہے اُسی طریقہ پر اس کو قائم رکھا جائے۔

یوسف ایک سیدھی اور سہولت پسند طبیعت کا سن رسیدہ آدمی تھا، عربوں کے ذوقِ خود سری اور آزادہ روی کو مطلق نہ روکتا تھا، بلکہ نظمِ حکومت کو درہم برہم کرنے کی کارروائیاں بھی جب وہ کرتے تھے تو اُن میں بھی بہت کم دست اندازی کرتا تھا، اس لیے یوسف ایک ایسا حاکم اور امیر تھا جو بنی معد کی طبیعت اور مزاج کے بالکل مطابق تھا، جب کبھی اس کی عقل کام نہ دیتی اور اکثر ایسا ہوتا تھا، تو صمیل صلاح و مشورہ دینے کے لیے ہر وقت پہلو میں موجود ہوتا۔ اور صمیل کو اپنی قوم والوں یعنی بنی قیس کے زیادہ تر لوگوں میں بہت اقتدار حاصل تھا، گو یہ قوم بھی اس کے دشمنوں سے خالی نہ تھی۔

جاڑا ختم ہوا کر بہار کا موسم آتے ہی طرش میں خبر آئی کہ یوسف میدان جنگ میں اترنے کو ہے: یہ خبر سنتے ہی عبدالرحمٰن کے فریق نے فیصلہ کر لیا کہ طرش سے جو علاقے مغرب میں واقع ہیں

ان کی طرف چلنا چاہیئے، یہ علاقے تمام تر یمانیہ کے تھے اس لیئے یہ خیال بھی ہوا کہ انہیں جہاں جہاں گذر ہوگا یمانیہ کے گروہ ساتھ ہوتے جائیں گے، اور نیز کسی ایسے مقام پر قبضہ بھی کرلیا جائے گا۔ جہاں سے یوسف پر حملہ کرنا بخوبی کارگر ہو۔

غرض اس کوچ میں سب سے پہلے علاقہ ریّہ میں سے گذرنا ضروری تھا یہاں لشکر اردن کے عرب آباد تھے، مستقر حکومت اس علاقہ کا اس زمانہ میں ارجذونہ کا شہر تھا، اور وہاں کا حاکم ایک قیسی تھا جس کا نام جدار یا جدارن بن عمرو المذحجی تھا، عبید اللہ نے اس کے پاس آدمی بھیجکر دریافت کرایا کہ آیا وہ اپنے علاقہ میں سے شہزادہ عبدالرحمٰن کو گذرنے کی اجازت دے دیگا؟ جدار کو یا تو صمیل سے کچھ پرخاش تھی، یا یہ سمجھ کر کہ اس کے علاقہ کے کل باشندے یمانیہ ہیں اور ان کی مرضی پر چلنا ضروری ہے، عبید اللہ کو جواب کہلا بھیجوایا کہ یوم الفطر کو ارجذونہ کے مصلّے میں آپ شہزادہ کو لے آئیں، پھر اس وقت دیکھوں گا کہ میں کیا کرسکتا ہوں،، غرض مقررہ دن یعنی یکم شوال ۱۳۸ھ ہجری کو یہ دن عیسوی حساب سے ۸ مارچ ۷۵۶ء کو پڑتا ہے، عبدالرحمٰن اور اس کے موالی مصلّے ارجذونہ میں وارد ہوتے، یہ مصلّے شہر ارجذونہ کے سامنے ایک وسیع میدان تھا۔ شہر اور گردونواح کے لوگ عید کی نماز پڑھنے کے لیئے اس وقت یہاں موجود تھے، نماز کے بعد خطبہ میں جب امام امیر یوسف کے لیے دعا کرنے کو ہوا، تو جدار نے کھڑے ہوکر امام سے کہا "یوسف کی جگہ عبدالرحمٰن بن معاویہ بن ہشام کے لیئے دعا کی جائے کیونکہ عبدالرحمٰن ہی ہمارا امیر بن امیر ہے" اس کے بعد اس نے لوگوں سے کہا یا معشر ریّہ! یہ جو میں نے کہا اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ سب نے یک زبان ہوکر کہا وہ جو کچھ آپ نے کہا وہ درست کہا" اس پر امام نے خطبہ میں امیر عبدالرحمٰن کے حق میں دعا مانگی، اور خطبہ ختم ہوتے ہی ارجذونہ کے لوگوں نے عبدالرحمٰن کے ہاتھ پر اس کی اطاعت کرنے اور خیرخواہ رہنے کی بیعت کی،

عبدالرحمٰن کو اپنا امیر ماننے میں اہل ریّہ بڑی خوشی سے آمادہ ہوئے تھے، لیکن ان کے سرداروں کی تعداد جو اپنی اپنی فوجیں لے کر عبدالرحمٰن کی مدد کو آئے زیادہ نہ تھی، لیکن یہ کمی اس طرح پوری ہوگئی کہ بنی الخلی کے بربر قبیلے نے جس کا شمار مروانی خلیفہ یزید ثانی کے

موالی میں تھا اور جو رندہ کے علاقے میں (جس کا نام اس وقت تاکرنہ (Ta Corona) تھا[1])
آباد تھا، جب سنا کہ ارجذونہ کے لوگوں نے بیعت کر لی ہے تو انہوں نے اپنے چار سو سوار فوراً
شہزادے کی مدد کے لیے بھیج دیئے۔
علاقہ ریہ سے مراجعت کر کے عبدالرحمن نے قصبہ شذونہ کا قصد کیا، یہاں لشکر فلسطین کے
عرب آباد تھے اریہ سے شذونہ آنے میں شہزادے کو کوہستان رندہ میں ان راستوں سے
گذرنا پڑا ہوگا۔ جو اونچے اونچے پہاڑوں کے گرد چکر کھاتے ہوئے گئے ہیں یہاں وہ ایک شہر
میں پہنچا جہاں بطون معد میں سے قبیلہ کنانہ کے لوگ آباد تھے اس شہر کا نام آج کل کمینیہ[2] Ximena
ہے جس میں لفظ کنانہ کی جھلک اب تک موجود ہے شہر میں سوائے عورتوں اور بچوں کے کوئی
نہ تھا، مرد جس قدر تھے وہ امیر یوسف کی فوج میں بھرتی ہونے چلے گئے اس اعتبار سے یہ شہر
دشمن کا تھا، مگر عبدالرحمن کی فوج والے عورتوں اور بچوں سے مزاحم نہ ہوئے۔
صوبہ شذونہ کے یمانیہ تمام اطراف سے آ کر عبدالرحمن کی فوج میں بکثرت بھرتی ہوئے اور
اپنی کل جمعیت کو ساتھ لیے شہزادے نے شذونہ سے اشبیلیہ کی طرف کوچ کیا، اشبیلیہ میں

---

[1] کرونہ (Corona) لاطینی لفظ ہے اور تا (Ta) بربر زبان کا لفظ ہے پہاڑ کی چوٹی پر جو قلعہ ہوتا تھا
اس کیلئے یہ نام استعمال ہوتا تھا، کوہستان ریہ میں ایسے قلعے بکثرت ہیں چنانچہ بنی الخل کا ایک قلعہ اور شہر
اب تک اسپینی زبان میں بلینا والید (Benadalid) کے نام سے مشہور ہے، یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جس میں ایک خوبصورت
قصر ہے، رندہ (Ronda) کے جنوب میں دریائے شنیل (Genil) پر واقع ہے دیکھو مارمل Marmol
کی کتاب (Rebelion de los Moriscos) صفحہ ۲۲ اور روچ فورٹ سکوٹ Rochfort Scott
کی کتاب رندہ اور غرناطہ کی سیر (Excursions in Ronda and Granada) جلد ۱ صفحہ ۸۹
[2] یہ ایک چھوٹا سا شہر ہے جس میں رومیوں کے وقت کا ایک قلعہ بھی ہے، دیکھو روچ فورٹ اسکاٹ
Scott کی، جلد ۲ صفحہ ۸۲ کنانہ کا نام ایک دوسرے شہر کینیہ میں بھی ہے جو جیان (Jaen) اور شوذر
ہ کے درمیان واقع ہے، شہر مرتش (Martos) کے شمال میں جس شہر کا نام تورکس کیمینو
(Torrex imeno) ہے اس میں بھی لفظ کنانہ موجود ہے۔

لشکرِ حمص کے عرب آباد تھے، یہاں پہنچتے ہی صوبے کے دو بڑے زبردست یمنی سردار یعنی قبیلہ عاقب کا ابو الصبّاح اور قبیلہ حضرموت کا حیوٰۃ بن ملامس اس کے استقبال کو آئے غالباً شوال کے دوسرے ہفتہ (وسط مارچ) میں عبدالرحمن شہر اشبیلیہ میں داخل ہوا یہاں سب نے اسکی اطاعت قبول کی اس کے چند روز بعد ہی خبر آئی کہ یوسف لڑنے کے ارادے سے قرطبہ سے چل پڑا ہے اور وادی الکبیر کے داہنے کنارے کنارے چل کر آخر کار اشبیلیہ پر حملہ کرنے کا قصد رکھتا ہے شہزادہ یہ خبر سنتے ہی شہر اشبیلیہ سے باہر نکل آیا اور وادی الکبیر کے بائیں کنارے کنارے چل کر قرطبہ پہنچنے کے قصد سے کوچ بول دیا، یہ راستہ اس امید میں اختیار کیا تھا کہ قرطبہ میں بغیر کسی کو خبر ہوئے پہنچ جائے گا، اس وقت وہاں فوج زیادہ موجود نہ ہوگی، اور جو یمانیہ اور بنی امیہ کے موالی وہاں رہتے ہیں وہ بھی آملیں گے۔

علاقہ طشانہ[۱] (Tocina) میں جب عبدالرحمن مع لشکر کے پہنچا تو خیال آیا کہ لشکر میں اردن فلسطین اور حمص کے عربوں کے پاس اپنے اپنے لوا موجود ہیں لیکن شہزادہ کے پاس کوئی لوا موجود نہیں ہے، اس خیال کے آتے ہی لشکر کے سرداروں نے کہا "اللہ ہم پر رحم کرے بغیر علم کے تو ہمارے لشکر میں بالکل ابتری ہو جائیگی" سردارِ اشبیلیہ ابو الصباح نے فوراً ایک لمبے سے برچھے کی نوک پر ایک عمامہ کو باندھ دیا، اور اس شکل میں وہ برچھا شہزادے کو دیا اور یہی آئندہ بنی امیہ کا لِوا ہو گیا۔

اب کیفیت یہ ہوئی کہ وادی الکبیر کے اس پار دریا کے کنارے کنارے تو عبدالرحمن مع لشکر کے قرطبہ کی طرف کوچ کر رہا تھا، اور اسی دریا کے دوسری جانب کنارے کنارے امیر یوسف اشبیلیہ کے قصد سے آرہا تھا، کچھ دنوں کے بعد یہ دونوں لشکر بالکل قریب آگئے[۲] (۱۸۸) صرف دریا بیچ میں حائل رہا مگر وہ اس قدر طغیانی پر تھا کہ عبور کرنا محال تھا، دونوں

---

[۱] بعض مورخوں نے علاقہ طشانہ (Tocina) کی جگہ قلمیرہ (Colombera) لکھا ہے ابن القوطیہ (ص ۱۱) نے قریہ بنی بہر لکھا ہے اور بیان کیا ہے کہ بہر قبیلہ لخم کی ایک شاخ تھے، موجودہ نام بریلیس (Brenes) عربی لفظ بہرین Bahrain کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتا ہے۔

[۲] مئی (یعنی ذی الحجہ) کا مہینہ تھا۔

لشکروں کی نظریں ایک دوسرے کی نقل و حرکت پر لگی ہوئی تھیں یوسف نے تو قرطبہ سے اشبیلیہ پہنچنے میں اس لیے جلدی کی تھی کہ عبدالرحمٰن کو زیادہ کمک نہ پہنچنے پائے لیکن اب دریا کی طغیانی کو دیکھ کر بہت گھبرایا اور انتظار کرنے لگا کہ کب دریا اترے اور وہ پار جاکر عبدالرحمٰن کے لشکر کا مقابلہ کرے، ادھر عبدالرحمٰن اس فکر میں تھا کہ یوسف کو خبر نہ ہونے پائے اور وہ قرطبہ پہنچ جائے، چنانچہ اس سفر میں ایک دن سورج ڈوبتے ہی لشکر والوں کو حکم دیا کہ جابجا آگ روشن کر دیں تاکہ یوسف کو یہ معلوم ہو کہ دشمن پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے جب لشکر والوں نے اس حکم پر عمل کیا تو عبدالرحمٰن مع لشکر کے اندھیرے میں قرطبہ کی طرف چل پڑا، لیکن مشکل یہ ہوئی کہ اس مقام سے قرطبہ کا فاصلہ ۵۴ عربی میل تھا۔ بہرکیف کوئی ایک میل آگے بڑھا ہوگا کہ یوسف کو اس خفیہ روانگی کی کسی نے خبر کردی، یہ خبر سنتے ہی یوسف بھی اپنا رخ بدل قرطبہ کی طرف ہو لیا تاکہ دارالامارت کو دشمن کے حملے سے بچائے اور اب دونوں لشکروں میں ایک دریا کے اس طرف اور دوسرا دریا کے اس پار دوڑ شروع ہوئی، عبدالرحمٰن نے یہ دیکھ کر کہ اس دوڑ میں یوسف بازی لے جائیگا اپنے لشکر کو قیام کا حکم دے دیا یوسف نے بھی جو دریا پار سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، اپنے لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا کچھ قیام کے بعد عبدالرحمٰن پھر قرطبہ کی طرف چلا یوسف بھی چلا حتیٰ کہ عبدالرحمٰن قرطبہ سے چند میل اس طرف مصارہ کے مقام پر ٹھہر گیا، یوسف نے بھی اسی مقام پر مگر دریا کے دوسری جانب پڑاؤ ڈال دیا، عبدالرحمٰن نے جو تدبیر سوچی تھی وہ نہ چل سکی لشکر والے بھی اس پر کبیدہ خاطر ہوئے کیوں کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا راستے میں کھیتوں میں سے ایک قسم کی پھلیاں توڑ توڑ کر کھاتے رہے تھے ان کو امید تھی کہ اگر قرطبہ پہنچ گئے تو فاقہ ٹوٹے گا اور اسوقت کی تکلیفوں کے بعد راحت نصیب ہوگی۔

۱۳ رمئی ۷۵۶ء (۹ ر ذی الحجہ ۱۳۸ھ) کو عرفہ تھا، اسی دن سے وادی الکبیر اترنا شروع ہوگیا اب عبدالرحمٰن نے جس کے لشکر میں قرطبہ سے بھی کچھ لوگ آکر شامل ہوگئے تھے سرداران فوج کو جمع کرکے کہا، "اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم کوئی بات قطعی طور پر فیصلہ کرلیں یوسف کی شرائط آپ کو معلوم ہیں۔ اگر آپ ان کو بہتر سمجھتے ہیں کہ میں انہیں منظور کرلوں تو میں اس کیلئے آمادہ ہوں، لیکن اگر آپ کا فیصلہ یہ ہے کہ لڑائی ہو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں جو کچھ آپکی رائے ہو

وہ صاف صاف بیان کر دیجئے اور جو کچھ آپ کی رائے ہو گی وہی میری رائے ہو گی" یمانیہ کے سرداروں نے بہ اتفاق رائے لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا، موالی بنی امیہ نے بھی ان سے اتفاق کیا لیکن مصالحت ہو جانے کا خیال ان کے دلوں سے ابھی تک بالکل دور نہ ہوا تھا غرض جب قطعی طے ہو گیا کہ لڑائی کی جائیگی، تو عبدالرحمٰن نے اپنے امرائے لشکر کو دوبارہ خطاب کر کے کہا "اچھا اگر آپ لڑائی پر آمادہ ہیں تو بہتر ہے کہ آج ہی دریا عبور کر کے کل لڑائی شروع
۱۸۹ھ کر دیں، کل کا دن میرے خاندان کیلئے بڑا مبارک دن ہے، جمعہ ہے اور یوم عید اضحیٰ، یہی دن تھا کہ میرے دادا کے دادا مروان نے مرج راہط میں ایک فہری پر فتح پا کر ہمارے گھرانے میں خلافت قائم کی تھی اس وقت بھی ایک فہری کا ہم کو مقابلہ کرنا ہے اور اس کا وزیر بھی قیسی ہے اس دن بھی قیسوں اور یمانیوں کا مقابلہ تھا اور آج بھی دونوں حریف مقابل ہیں پس اے مصاحبان صادق، ہم کو امید رکھنی چاہیئے کہ کل کا دن یمانیوں اور اُمویوں کے لیے ایسی ہی شان و شوکت کا ہو گا جیسا کہ مرج راہط کا دن ہوا تھا۔" اس کے بعد شہزادے نے لشکر کے سرداروں میں احکام جاری کیے مگر اس کے ساتھ ہی دھوکہ دینے کیلئے اس نے یوسف سے سلام پیغام شروع کرائے مطلب یہ تھا کہ کسی طرح بغیر لڑے بھڑے اس کا لشکر دریا کے پار پہنچ جائے اور لشکر والوں کو جو بھوکے تھے کچھ کھانے پینے کا سامان بھی مل جائے چنانچہ اس نے امیر یوسف کو کہلا بھجوایا کہ "جو شرائط اس نے طرش میں اپنے ایلچیوں کی معرفت کہلا کر بھجوائی تھیں وہ محض خالد بن یزید کی گستاخی و بے ادبی کی وجہ سے نامنظور کر دی گئی تھیں اب وہ مجھ کو منظور ہیں اور امید ہے کہ جب میرا لشکر دریا عبور کرنے لگیگا تو امیر مزاحم نہ ہو گا دونوں لشکر جب دریا کے ایک ہی کنارے پر ہوں گے تو معاملات پر گفتگو بھی آسانی سے ہو سکیگی چونکہ اب صورت باہمی مصالحت پیدا ہونے کی قریب ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ لشکر کے لیے کچھ کھانے پینے کی چیزیں بھی بھیجی جائیں" مخالف کی بات کا یقین کر کے اور اس لیے کہ معاملہ بغیر کشت و خون کے طے ہو جائے گا یوسف دھوکے میں آگیا اور عبدالرحمٰن کا لشکر جب دریا عبور کرنے لگا تو اس نے مزاحمت مطلق نہ کی بلکہ کچھ مواشی اور بھیڑیں اس کے لشکر والوں کے لیے بھیجیں اس بڈھے یوسف کی تقدیر کچھ ایسی الٹی تھی کہ جو کام کرتا تھا وہ خود بخود اس نوجوان دشمن کے حق میں سود مند ہو جاتا تھا بنی اُمیہ

کے موالی کو جو روپیہ اس غرض سے دیا تھا کہ وہ ہتھیار وغیرہ خرید کر اس کے ساتھ لڑنے چلیں وہ اس کام میں آیا کہ عبدالرحمٰن اندلس میں وارد ہو جائے اور اب موالشی جو بھیجے تو ان کو کھا پکا کر ایک بھوکا دشمن مقابلہ کیلئے خوب چست و چاق ہو گیا۔

یوسف کو اس دھوکے کا حال دوسرے دن یعنی عید الضحیٰ کے دن (جمعہ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۸ھ مطابق ۱۵ مئی ۷۵۶ء) کھلا اب کیا دیکھتا ہے کہ عبدالرحمٰن کا لشکر جس میں اب جیان، اور البیرہ کے یمانیہ بھی شامل ہو چکے ہیں، صفیں باندھے لڑائی کیلئے سامنے تلا کھڑا ہے لڑنے پر مجبور ہو کر یوسف نے اپنی فوجوں کی ترتیب شروع کر دی، اگر اس کے لڑکے ابو زید کے پاس سے جو سرقسطہ میں تھا ابھی تک کمک نہیں پہنچی تھی، ابن قیس جو یوسف کی فوج میں تھے وہ بھی عبدالرحمٰن کی طرح اس جمعہ کو مرج راہط والا جمعہ سمجھ رہے تھے اور اس وہم میں ہمت ہارے دیتے تھے۔

لڑائی شروع ہو گئی شہزادے کے چاروں طرف اس کے موالی حلقہ کئے ہوئے تھے، اور ابو عثمان عبیداللہ علم برداری کی خدمت پر تھے، عبدالرحمٰن خود ایک عمدہ اندلسی گھوڑے پر
سوار تھا، کبھی اس کو کداتا اور کبھی چراغ پا کر دیتا تھا، سواروں میں حتیٰ کہ سرداران لشکر میں بھی (۹۱)
بہت کم لوگ ایسے تھے جن کے پاس گھوڑے ہوں، کیونکہ اس زمانہ سے بہت بعد تک بھی اندلس میں گھوڑے اس قدر کم تھے کہ رسالوں میں سواری کیلئے بالعموم خچروں سے کام لیا جاتا تھا بہر کیف شہزادے کے اس تیز و طرار گھوڑے کو دیکھ کر یمانیہ دل میں خائف و بدگمان ہونے لگے اور آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ "ہمارا یہ امیر ابھی بالکل نوجوان ہے اس کی جوانمردی اور شجاعت کا ابھی تک امتحان نہیں ہوا ہے کیا خبر ہے کہ لڑائی سے ڈر جائے اور گھوڑے کو بہانہ بنا کر میدان سے نکل بھاگے اور اس فرار میں اپنے موالی کو بھی مشکل میں پھنسا دے، اور لشکر میں بھی ابتری پڑ جائے"

یہ سرگوشیاں رفتہ رفتہ اتنی آواز سے ہونے لگیں کہ عبدالرحمٰن نے بھی سن لیا، ابو الصباح کو جسے اس خیال نے سب سے زیادہ بے چین کر رکھا تھا عبدالرحمٰن نے فوراً طلب کیا، اشبیلیہ کا یہ سردار جو ایک بڈھے خچر پر سوار تھا قریب آیا شہزادے نے کہا "ابو الصباح! امیرا یہ گھوڑا

بہت ہی تیز اور شریر ہے اس طرح کودتا اچھلتا ہے کہ تیر چلاتے وقت ٹھیک نشانہ نہ لگا سکوں گا اس کی بجائے تو خچر بہتر ہوگا، اور اس تمام لشکر میں تمہارے خچر سے بہتر کوئی جانور خاص کر میرے لیے نظر نہیں آتا، وہ غریب معلوم ہوتا ہے اور عمر میں بھی اتنی ہے کہ سپید ہو رہا ہے میری سواری کے لیے تو یہی بہتر ہے اس کی وجہ سے لڑائی میں لشکر کے لوگ مجھے پہچانتے بھی رہیں گے اگر خدانخواستہ معاملہ بگڑا تو اسی خچر کے پیچھے پیچھے وہ چلیں آئیں گے اور میں ان کو عوث کا راستہ بتاؤں گا بس اس گھوڑے سے تم اپنا خچر بدل لو۔" ابو الصباح نے شرمندہ ہو کر کہا ،، یہ کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہمارا امیر گھوڑے پر سوار رہے، یمانیہ نے جب دیکھا کہ عبدالرحمٰن ایک بڈھے اور سست خچر پر سوار ہے تو ان کا خوف دور ہو گیا۔

لڑائی کا نتیجہ زیادہ دیر تک مشتبہ نہ رہا، عبدالرحمٰن کا رسالہ دشمن کے میمنہ اور قلب کو چیرتا ہوا اندر پہنچا، یوسف اور صمیل دونوں میدان سے بھاگے مگر اس وقت جب کہ دونوں کا ایک ایک لڑکا لڑائی میں کام آگیا، یوسف کے میسرہ میں عبید قیسی کی سرداری میں بنی قیس تھے یہ سب بہت دن چڑھے تک اپنی جگہ قائم رہے اور جب تک ان کے تمام سوار یہاں تک کہ عبید بھی کام نہ آگئے میدان سے نہ ہٹے۔

اب فتحیاب یمانیوں کو سوائے لوٹ کے اور کسی بات کا خیال نہ رہا ان میں سے بعض دشمن کے لشکر گاہ میں پہنچے جو اس وقت خالی پڑا تھا۔ یہاں یوسف کی فوج والوں کیلئے جو کھانے تیار تھے خوب کھاتے اور لشکر میں جس قدر مال ملا سب لوٹ لیا بہت سے لوگ شہر میں پہنچے کہ امیر یوسف کا محل لوٹیں، ان میں کے دو آدمی جو قبائل یمانیہ میں سے بنی کلے کے لوگ تھے وادی الکبیر کا پل اتر کر شقندہ میں صمیل کا محل لوٹنے پہنچے یہاں ان کو جو کچھ مال و متاع ملا اسکے علاوہ (۱۹۱)
ایک صندوق تھا جس میں دس ہزار دینار سرخ مقفل تھے صمیل نے جبکہ وہ دشمن سے بھاگ رہا تھا۔ جیان کی سڑک کے کنارے ایک اونچی پہاڑی سے ان دونوں آدمیوں کو دیکھا اور پہچان لیا کہ اس کے دیناروں والا صندوق لیے جاتے ہیں

صمیل اگرچہ شکست کھا چکا تھا۔ اور ایک لڑکا بھی اس کا اس معرکہ میں قتل ہوا تھا۔ مگر اس کا دم خم ابھی تک وہی تھا۔ اس حرکت پر اس کو بہت غصہ آیا اور انتقام

لینے کا ارادہ پیدا ہوا، چنانچہ اپنے اشعار میں کہا۔

"یاد رہے کہ قبیلۂ طے کے پاس یہ روپیہ میری امانت ہے کیونکہ وہ دن آرہا ہے کہ میں اسے ان سے واپس لوں، اگر تم کو میری تلوار اور نیزے کی قوت معلوم کرنی ہے تو یمانیہ سے جاکر پوچھو، اگر وہ شرمندہ ہوکر جواب نہ دیں تو پھر بہت سے میدان جنگ ایسے موجود ہیں جو ان کی طرف سے جواب دیں گے کہ ہاں ہم نے ان کو پے در پے شکستیں کھاتے دیکھا ہے یہی میدان ضمیل کی جوانمردی اور شجاعت پر گواہی دیں گے"

قرطبہ میں داخل ہوکر جس وقت عبدالرحمٰن امیر یوسف کے قصر میں آیا تو لوٹنے والوں کو بمشکل وہاں سے نکال سکا۔ جب تک ان کو بہت سے کپڑے نہ دیے جن کے نہ ہونے کی انہیں شکایت تھی اس وقت تک محل سے باہر نہ آئے محل میں یوسف کی مستورات جس قدر تھیں ان کی حالت بھی خطرناک تھی، یمانیہ کو ان کا کچھ بھی لحاظ نہ تھا، یوسف کی بیوی ام عثمان اور اس کی دو لڑکیوں نے عبدالرحمٰن سے امان چاہی، ام عثمان نے کہا "یا بنی عم! ہمارے ساتھ ایسا ہی اچھا سلوک کرو جیسا خدا نے تمہارے ساتھ کیا ہے" ان عورتوں کی بیکسی اور بے بسی پر عبدالرحمٰن کا دل بھر آیا، یہ وہ جانتا ہی تھا کہ وہ اس کی قرابت مند ہیں۔

عبدالرحمٰن نے ام عثمان کو جواب دیا "یقیناً آپ کی حفاظت کرنی میرا فرض ہے" چنانچہ اس نے فوراً صاحب الصلوٰۃ کو بلایا، یہ یوسف کے موالی میں سے تھے، جب وہ آئے تو شہزادے نے کہا کہ "ان مستورات کو آپ اپنے مکان میں مہمان رکھیے اس صورت میں وہ اہل لشکر کی زیادتیوں سے محفوظ رہیں گی" ان بیگمات کی بعض قیمتی چیزیں جو سپاہیوں نے لوٹ لی تھیں، عبدالرحمٰن نے ان کو واپس دلائیں اس کے شکریہ میں یوسف کی ایک لڑکی نے ایک کنیز جس کا نام ہلال تھا۔ عبدالرحمٰن کو نذر میں دی۔ یہی ہلال امیر اندلس ہشام بن عبدالرحمٰن کی ماں ہوتی۔

عبدالرحمٰن کی یہ فیاضیاں یمانیہ کو بری معلوم ہوئیں اور لوٹنے سے ان کو منع کرنا اور آنحالیکہ بکثرت مال غنیمت دینے کا وعدہ ہو چکا تھا، ان کو سخت ناگوار ہوا دشمن کی عورتوں کو امان دینے پر بھی ان کے دل بگڑے اور وہ سمجھے کہ اس میں فاتحین کی حق تلفی کی گئی ہے وہ کہنے لگے کہ

"عبدالرحمٰن اپنے خاندان والوں کی رعایت کرتا ہے لڑائی ہم نے اس کیلئے فتح کی ہے جو کچھ مہربانی اور رعایت ہو وہ ہمارے ساتھ ہونی چاہیئے نہ کہ دوسروں کے ساتھ" ان شکایتوں کو اکابر یمانیہ نے بھی کچھ بہت ناپسند نہیں کیا۔ ان کا اس قدر تسلیم کرنا کہ شہزادے نے جو کچھ کیا وہ ۱۲ درست کیا محض اپنے ایمان کو صاف رکھنے کیلئے تھا۔ دل میں وہ شکایت رکھنے والوں کے ہم خیال تھے، یمانیہ جانتے تھے کہ عبدالرحمٰن کی مدد ہم نے بنی معد سے بدلہ نکالنے کے لیئے کی تھی اور بدلہ اب نکل چکا چنانچہ ان میں سے کم از کم ایک شخص نے تو صاف صاف کہدیا کہ "بنی معد سے تو ہم نے اپنے پرانے نزاعات کا بدلہ لے لیا، یہ عبدالرحمٰن اور اس کے موالی بھی بنی معد ہی کے لوگ ہیں، اب ہم کو اپنی تلواروں کا رخ بدل کر اس کا کام بھی تمام کرنا چاہیئے اس طرح ایک ہی دن میں دو معرکے سر ہو جائیں گے"۔

اس سخت بدنما اور رسوائی کے مضمون پر اس طرح بے رحمی کے ساتھ بحث ہونے لگی کہ گویا وہ بہت ہی ضروری اور کھلی ہوئی بات ہے، کسی نے اس خیال کو پسند کیا کسی نے ناپسند جنہوں نے ناپسند کیا تھا ان میں بنی خزاعہ تھے اور بنی کلب بنی خزاعہ ہی کی ایک شاخ تھے ابھی کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ ایک شخص ثعلبہ جذامی نے جس کا تعلق صوبہ شذونہ کے لشکر سے تھا، یہ کل حال کہ کس طرح قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، عبدالرحمٰن سے جا کہا۔ اس میں ثعلبہ کی ایک ذاتی غرض بھی شامل تھی اور وہ یہ تھی کہ فوج کیلئے اس کے قبیلہ سے سردار منتخب کیے جا رہے تھے۔ تو باوجود شرافتِ نسب کے اس کا خیال نہ کیا گیا اور قبیلہ کے دوسرے لوگوں کو سردار مقرر کر دیا گیا، اب چونکہ ان سرداروں نے رائے دی تھی کہ عبدالرحمٰن کو قتل کر دیا جائے۔ تو اس کو ان سرداروں سے بدلہ نکالنے کا اچھا موقع ملا، چنانچہ اس نے پوری کیفیت عبدالرحمٰن کو جا سنائی اور یہ بھی کہدیا کہ یمانیہ میں صرف بنی خزاعہ کا اعتبار کیا جائے اور کسی کا نہیں اور اس سازش کا سب سے بڑا محرک ابو الصباح ہے"۔ شہزادہ نے ثعلبہ کا بہت شکریہ ادا کیا اور انعام دینے کا وعدہ کیا (چنانچہ آئندہ اس وعدہ کو ایفا کیا) اور ضروری تدارک میں مطلق دیر نہ کی ایک کلبی کو جس کا نام عبدالرحمٰن بن نعیم تھا قرطبہ میں صاحب الشرطہ (کوتوال) مقرر کیا۔ اور اپنے چند موال کو حکم دیا کہ حفاظت کیلئے اس کے قریب رہا کریں یمانیوں کو جس وقت

معلوم ہوا کہ سازش کا حال کھل گیا ہے انہوں نے اس کا ترک کرنا ہی مناسب سمجھا، اور جمعہ کے روز قصر امارت سے جس وقت عبدالرحمٰن مسجد کو گیا تو کوئی مزاحم نہ ہوا عبدالرحمٰن نے اب امام ہونیکی حیثیت سے جمعہ کی نماز پڑھائی اور خطبہ میں کہا کہ میں ایک اچھے امیر کیطرح ان پر حکومت کرونگا
عبدالرحمٰن اگرچہ اسپین کے دارالحکومت کا مالک ہو گیا تھا، لیکن تمام ملک پر ابھی تک مستولی نہ ہوا تھا، اس نے یوسف اور صمیل کو شکست دیدی تھی مگر یہ دونوں ابھی اپنی تقدیر سے مایوس نہ ہوئے تھے، شکست کھا کر بھاگنے کے بعد دونوں نے ملاقات کی اور اس ملاقات میں جو کچھ طے پایا اس کے مطابق یوسف نے طلیطلہ جاکر وہاں کے لوگوں سے مدد طلب کی ۱۹
اور صمیل جیان چلا گیا جہاں بنی قیس کا لشکر رہتا تھا، یہاں پہنچ کر اس نے بنو معد کو آمادہ جنگ کیا، یوسف کو طلیطلہ جاتے ہوئے رستہ میں وہ فوج مل گئی تھی جو اس کی کمک کیلئے سرقسطہ، سے آرہی تھی اس کو اور کچھ فوج جو طلیطلہ میں فراہم ہو سکی اس کو ساتھ لیتے یوسف اصمیل سے جا ملا اب ان دونوں نے صوبہ جیان کے عامل کو شہر سے باہر نکال دیا، اور اس نے حصن منتیشہ میں جاکر پناہ لی اسی طرح البیرہ کا حاکم البیرہ سے نکل کر پہاڑوں میں جا چھپا اسی زمانہ میں یوسف کو خبر لگی کہ عبدالرحمٰن قرطبہ سے اس پر حملہ کرنے آرہا ہے، یہ سنکر یوسف نے اپنے فرزند ابوزید کو حکم دیا کہ وہ فوج لیکر اس راستے کو چھوڑتا ہوا جس سے عبدالرحمٰن حملہ کرنے کو آرہا ہے قرطبہ جائے قرطبہ پر قبضہ کرنا دشوار نہ ہوگا. کیونکہ عبدالرحمن کے ادھر آنے سے شہر میں فوج کم رہ گئی ہوگی اور شہر پر قبضہ اگر ہو گیا تو عبدالرحمٰن جو ہماری طرف آرہا ہے اتنا سنتے ہی کہ قرطبہ ہاتھ سے نکل گیا فوراً قرطبہ کی طرف پلٹ جائے گا، اور اس سے ہم کو اتنی مہلت مل جائیگی کہ اپنی فوجوں کی تعداد بڑھا کر ان کو [illegible]ب درست کرلیں، یوسف کی یہ ترکیب چل گئی، جونہی عبدالرحمٰن قرطبہ سے نکل کر یوسف کی طرف [illegible] چلا، ابوزید نے قرطبہ پر حملہ کرکے اس پر قبضہ کرلیا. ابوعثمان عبیداللہ جو اس وقت قرطبہ میں تھے، مجبور ہوکر چند سپاہیوں کے ساتھ جامع مسجد کے ایک حصہ میں پناہ گزین ہوگئے مگر ابوزید [illegible] نے آخر کار ان کو گرفتار کرلیا. اس کے بعد ہی جب یہ سنا کہ عبدالرحمٰن رستہ سے پلٹ کر اس پر [illegible] حملہ کرنے کے لیتے قرطبہ آرہا ہے تو ابوزید، ابوعثمان عبیداللہ کو ساتھ لیے ہوئے اور قصر امارت سے [illegible] عبدالرحمٰن کی دو کنیزوں کو نکال کر شہر سے چلتا ہوا اس حرکت پر لعنت[illegible] فوج نے

جو ساتھ تھے، ابوزید کو ملامت کی اور کہا کہ "ابوزید! تم مروت اور اخلاق میں عبدالرحمٰن سے نہایت کمتر ہو جس وقت تمہاری بہنیں اور باپ کی بیویاں اس کے قبضہ میں تھیں اس نے ان کا احترام کیا اور حسن سلوک سے پیش آیا، اور ان کو امان بخشی تمہارا یہ حال ہے کہ اس کی کنیزوں کو لیے جاتے ہو" ابوزید یہ کلام سن کر سخت نادم ہوا، قرطبہ سے شمال میں ابھی کوئی ایک میل گیا ہوگا کہ قیام کر دیا اور حکم دیا کہ دونوں کنیزوں کے لیے ایک خیمہ نصب کیا جائے، جب خیمہ نصب ہو گیا تو اس میں ان دونوں کنیزوں کو مع ان کے مال و اسباب کے چھوڑ کر خود اپنے باپ سے ملنے البیرہ کی طرف بڑھا، ابو عثمان عبیداللہ بدستور اس کی حراست میں رہے۔

عبدالرحمٰن کو جس وقت معلوم ہوا کہ ابوزید قرطبہ سے نکل گیا ہے۔ تو ادھر سے مطمئن ہو کر وہ پھر یوسف پر حملہ کرنے کی غرض سے بسرعت روانہ ہوا، لیکن اب واقعات نے ایسی شکل اختیار کی جس کا پہلے کسی کو گمان تک نہ تھا یعنی صمیل اور یوسف نے یہ دیکھ کر کہ عبدالرحمٰن سے مقابلہ کرنے کی انہیں اتنی طاقت نہیں ہے کہ سربراہ ہو سکیں، فوراً صلح کی شرطیں پیش کیں اور کہا کہ ہم شہزادہ کو اسپین کا امیر اور بادشاہ تسلیم کرنے کے لیے اس شرط سے تیار ہیں کہ جس قدر ہمارا ذاتی مال و متاع اور جائیداد ہے وہ بدستور ہمارے قبضہ اور تصرف میں رہے اور سب کے حق میں امان کا اعلان کیا جائے شہزادہ نے ان شرائط کو اپنی طرف سے ایک شرط بڑھا کر قبول کر لیا اور وہ شرط یہ تھی کہ یوسف اپنے دونوں بیٹوں یعنی ابوزید اور ابوالاسود کو بطور یرغمال عبدالرحمٰن کے سپرد کر دے جس وقت امن ہو جائیگا تو اس کے لڑکے اس کے پاس واپس بھیج دیے جائیں گے۔

یوسف نے اس شرط کو منظور کر لیا، اور عبدالرحمٰن نے فرزندان یوسف کو بہت خاطر و مدارات سے قصر الامارت میں رکھا صرف اتنی قید لگا دی کہ قصر سے باہر جانے کی ان کو اجازت نہ ہوگی، اس نے اس بات کا بھی وعدہ کیا کہ جس وقت ملک میں امن و امان ہو گیا تو ان کو ان کے باپ کے پاس واپس بھیجدیا جائیگا اس صلح کے وقت ابو عثمان عبیداللہ ابوزید کی حراست میں تھے اور خالد بن یزید اندلسی یوسف کا ایلچی، عبدالرحمٰن کی قید میں تھا جب صلح ہو گئی تو ایک دوسرے کے بدلے قید سے رہا ہوئے اور یہ تقدیر کا ایک عجیب کرشمہ تھا کہ ایک اموی مولیٰ کو ایسے شخص کے بدلے میں قید سے رہائی ملے جس کو خود اس نے قید میں رکھنے کا حکم دیا ہو۔

عبدالرحمن کو اب سب نے اندلس کا امیر اور بادشاہ تسلیم کر لیا اور وہ البیرہ سے چل کر قرطبہ میں اس شکل سے داخل ہوا کہ بیچ میں خود سوار تھا اور دائیں طرف یوسف اور بائیں طرف صمیل اپنے اپنے خچروں پر سوار ساتھ ساتھ تھے، صمیل عبدالرحمن کی نظروں میں ایسا شائستہ اور شریف ثابت ہوا کہ بعد کو یہ الفاظ اس کی زبان پر اکثر آئے کہ "البیرہ سے قرطبہ تک، صمیل میرے ہمرکاب آیا لیکن کیا مجال تھی کہ اس کا گھٹنا میرے گھٹنے سے مل گیا ہو یا اس کے خچر کا ایک قدم میری سواری سے آگے بڑھا ہو، کبھی کوئی نامعقول سوال اس نے مجھ سے نہیں کیا اور جب تک میں نے بات نہیں کی خود کوئی بات شروع نہیں کی"۔ مورخ لکھتے ہیں کہ یوسف میں عبدالرحمن کو کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی کہ ایسے ہی الفاظ میں اس کی بھی تعریف کرتا۔

کچھ مدت تک ہر طرح خیریت رہی، یوسف کے دشمنوں کی سازشیں جو کسی طرح اسے جرم میں ماخوذ کرانا چاہتے تھے کہ جو زمینیں اس کی نہ تھیں ان پر بھی اس نے تصرف کرنا چاہا ناکام رہیں عبدالرحمن نے یوسف اور صمیل دونوں کے ساتھ بہت عزت اور خصوصیت کا برتاؤ رکھا، اور جب کبھی ضرورت پیش آتی ان سے صلاح و مشورہ بھی کرتا۔

صمیل اپنی موجودہ حالت پر بالکل قانع اور مطمئن تھا، یوسف میں گو خود کسی بات کو فیصلہ کرنے کی عقل نہ تھی مگر وہ بھی اپنی حالت پر قناعت کر لیتا۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ بہت سے بداندیش لوگ جو اس انقلاب حکومت سے دل میں ناراض تھے اس کے گرد و پیش رہنے لگے ان میں قریش بنی فہر اور بنی ہاشم کے وہ بڑے بڑے سردار اور رئیس تھے جو یوسف کے دورِ حکومت میں بڑی بڑی ذمہ داریوں کے عہدوں پر ممتاز تھے، ان لوگوں کو گوارا نہ تھا کہ جو حالت گمنامی اور کس مپرسی کی اس وقت ان کے لیے پیدا ہو گئی ہے وہ اسی طرح قائم رہے اس لیے وہ امیر معزول کو عبدالرحمن کے خلاف ابھارتے رہے معمولی سی معمولی بات بھی جو شہزادے کی زبان سے نکلتی تھی اس کو عجیب عجیب غلط معنی پہنا دیے جاتے تھے غرض انجام یہ ہوا کہ ان لوگوں کی سازشیں چل گئیں، یوسف نے پھر بغاوت پر کمر باندھی اور صمیل سے مدد چاہی۔ مگر صمیل نے اور صمیل کی قوم والوں (یعنی قیس) نے قطعی انکار کر دیا اب یوسف نے بلادیوں[1] سے بالخصوص ان سے

[1] بلادیوں سے مراد وہ عرب ہیں جو اندلس میں شامی عربوں سے پہلے آباد ہوئے تھے یعنی (باقی بر صفحہ آئندہ)

جو لقنت[1]، ماردہ، اور طلیطلہ میں رہتے تھے مدد مانگی، یہ عرب یوسف کی مدد پر تیار ہو گئے غرض ایک دن عبدالرحمٰن کو خبر لگی کہ یوسف ماردہ کی طرف روانہ ہو گیا ہے، فوراً سوار پیچھے دوڑاتے گئے لیکن یوسف دور نکل گیا تھا، اب عبدالرحمٰن نے صمیل کو بلوایا اور کہا، "تم کو ضرور معلوم ہو گا۔ کہ یوسف بھاگنے والا ہے مگر پھر بھی تم نے مجھے کچھ نہ بتایا" یہ کہکر عبدالرحمٰن نے صمیل کو بہت سخت وسست کہا، صمیل نے جواب دیا کہ "اے امیر! میں بالکل بے قصور ہوں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ نہیں بھاگا، اگر میں اس سازش میں شریک ہوتا، تو یہاں نہ ہوتا اس کے ساتھ ہوتا"[2] عبدالرحمٰن نے کہا۔ "یہ ممکن نہیں کہ بغیر تم سے مشورہ کیے یوسف قرطبہ سے باہر قدم نکال سکتا، تمہارا فرض تھا کہ تم مجھ کو اس کی اطلاع کرتے" اس کے بعد عبدالرحمٰن نے صمیل اور یوسف کے دونوں بیٹوں یعنی ابوزید، اور ابوالاسود کو جواب تک بطور یرغمال قصرِ امارت میں رہتے تھے، قید خانہ بھجوا دیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ان شامی عربوں سے پہلے جو بلج کے ساتھ ملک میں داخل ہوئے تھے

[1] لقنت (Lacant) سے مراد غالباً وہ مقام ہے جو اشبیلیہ (Sevillle) کے شمال مغرب میں "فوئنتی دی کانتوس" (Fuente de Cantos) کے قریب واقع ہے۔

[2] بہت مشکل ہے یقین آسکتا ہے کہ صمیل نے عبدالرحمٰن سے سچ بولا کم از کم یوسف کے باغیانہ منصوبوں اور فساد انگیز ارادوں کی تو یقیناً اسے اطلاع تھی (جیسا کہ ڈوزی اوپر ذکر کر چکا ہے) پس کیا صمیل کا فرض نہ تھا کہ وہ عبدالرحمٰن کو شروع ہی میں اس ہونہار بغاوت سے مطلع کر دیتا: تاکہ اتنا بھاری کشت و خون نہ ہوتا جواب ہوا صمیل نے اس سازش میں شریک نہ ہونے کی جو دلیل عبدالرحمٰن کے سامنے پیش کی وہ بھی کچھ معقول اور مضبوط نہیں واقعات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے پورا یقین اس بات کا ہو جاتا ہے کہ صمیل اس سازش میں یوسف کا شریک تھا عبدالرحمٰن کے برسرِ اقتدار آجانے سے صمیل کی مطلق العنانی کو سخت صدمہ پہنچا تھا کیونکہ یوسف اپنے وقت میں صرف برائے نام امیر تھا، حکومت دراصل صمیل ہی کرتا تھا، ضرور صمیل کو خیال آتا ہوگا کہ اس کھوئے ہوئے اقتدار کو پھر حاصل کرے پس کیا تعجب ہے کہ اس نے یوسف سے کہدیا ہو کہ "تم جاکر فوج فراہم کرکے عبدالرحمٰن کا مقابلہ کرو اور میں دارالخلافہ میں رہ کر شہزادہ کی نقل و حرکت اور اس کے ارادوں سے تمہیں مطلع کرتا رہونگا۔" (اسماعیل)

ماردہ پہنچ کر یوسف نے عرب اور بربر کو جو اس کا ساتھ دینے کو تیار ہو گئے تھے، ماردہ میں جمع کیا اور ان سب کو لے کر لقنت کی طرف چلا، لقنت پہنچنے پر یہاں کے لوگ بھی اسکے ساتھ ہو گئے، اب یہاں سے یوسف اپنی پوری جمعیت کو لیے ہوئے حملہ کی غرض سے اشبیلیہ کی طرف بڑھا صوبہ اشبیلیہ کے تمام بلادی اور شامی عرب اس کے علم کے نیچے جمع ہو گئے اور اب یوسف تیس ہزار سپاہ کے ساتھ اس قابل ہو گیا کہ اشبیلیہ کا محاصرہ کر لے۔

اشبیلیہ کا حاکم اس وقت عبدالرحمٰن کا ایک عزیز تھا جس کا نام عبدالملک تھا، یہ اس واقعہ سے ایک برس پہلے مع اپنے دو بیٹوں کے اندلس میں وارد ہوا تھا، یوسف کا خیال تھا۔ کہ عبدالملک کے پاس شہر میں شامیوں کی تھوڑی سی فوج ہو گی اور اس میں اتنا دم نہ ہو گا کہ شہر سے باہر نکلکر یوسف کے مقابلہ میں کوئی جارحانہ کارروائی کر سکے اس خیال سے اب یوسف نے یہ عزم کیا کہ پوری تیس ہزار فوج کے ساتھ براہ راست قرطبہ پر حملہ کر دے اور قبل اس کے کہ شامی عرب اہل قرطبہ کی مدد کو آئیں دارالامارت پر خود قابض ہو جائے مگر یوسف کا یہ منصوبہ نہ چلا کیونکہ اس نے ابھی قرطبہ کا رخ ہی کیا تھا کہ وہاں شامی عرب پہنچ گئے اور عبدالرحمٰن ان کو لے کر یوسف کے مقابلہ کے لیئے قرطبہ سے نکل کھڑا ہوا۔ عامل اشبیلیہ عبدالملک کو بھی کمک پہنچنے کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا اس کا لڑکا عبداللہ یہ سمجھ کر کہ باپ اشبیلیہ میں محصور ہو گیا ہے، مورور کے علاقہ سے جہاں کا وہ عامل تھا، فوج لے کر اشبیلیہ پہنچ گیا اور اب باپ اور بیٹے دونوں نے مل کر یوسف پر جس حالت میں کہ اس کی فوج قرطبہ کی طرف جارہی تھی، حملہ کرنے کا قصد کر لیا، یوسف کو دشمن کی اس نقل و حرکت کی جس وقت اطلاع ملی تو اس خوف سے کہ کہیں سب طرف سے گھر نہ جائے اس نے قرطبہ سے رخ پھیر کر پہلے اشبیلیہ اور مورور کی فوجوں کو غارت کرنیکا ارادہ کیا، یوسف جس وقت عبدالملک کے مقابلہ میں آیا تو عبدالملک نے پیچھے ہٹنا شروع کیا اس سے غرض یہ تھی کہ عبدالرحمٰن کو جو قرطبہ سے چل پڑا تھا اتنا وقت مل جائے کہ وہ مع فوج عبدالملک سے آملے، مگر یوسف نے اس کا موقع کافی نہ دیا، اور عبدالملک کو مجبور کیا کہ وہ لڑائی شروع کر دے۔

اب لڑائی شروع ہوئی مگر وہی پرانے طریقے کی یعنی پہلے ایک ایک آدمی ہر دو جانب سے میدان میں اتر کر لڑا، یوسف کی فوج سے ایک بربر جو ایک فہری خاندان کا غلام تھا، نکلا، اور

فریق مقابل سے کہنے لگا کہ "ہے تم میں کوئی ایسا بہادر جو مجھ سے تیغ آزمائی کرے" چونکہ یہ
بڑا ہی طاقتور اور دیو ہیکل آدمی تھا، اس لیے عبدالملک کے لوگوں میں سے کسی کو اس سے لڑنے کی
جرأت نہیں ہوئی، یہ دیکھکر عبدالملک نے کہا کہ "اگر فراق کا یہی آغاز ہے تو وہ سب کی ہمت (۱۹۶)
پست کر دیگا" یہ کہکر اس نے اپنے فرزند عبداللہ کی طرف دیکھا اور کہا "اے فرزند
تو اس آدمی سے لڑنے جا، اللہ تیری مدد کریگا" عبداللہ باپ کا حکم سنتے ہی میدان کی طرف
چلا، مگر اتنے میں ایک حبشی نے جو اس کے خاندان کا آزاد غلام تھا عبداللہ سے پوچھا کہ "آپ
کہاں جاتے ہیں؟" عبداللہ نے کہا کہ "اس بربر سے لڑنے جاتا ہوں" حبشی نے کہا، آقا
اس کام کی اجازت مجھ کو دیجئے "اور یہ کہتا ہوا وہ بربر سے لڑنے دوڑ پڑا۔

دونوں لشکر اس لڑائی کا انجام بچشم انتظار دیکھنے لگے، دونوں لڑنے والے قد و قامت
جثے، طاقت، اور ہمت کے لحاظ سے برابر کی جوڑ تھے، کچھ دیر تک اس طرح لڑتے رہے
کہ نہ یہ کچھ کم رہا نہ وہ، مینہ برسنے کی وجہ سے زمین پر کیچڑ ہو گئی تھی ایکایک بربر کا پاؤں پھسلا
اور وہ گرا، گرتے ہی حبشی نے جھپٹ کر اس کے دونوں پاؤں کاٹ دیے اتنا دیکھتے ہی
عبدالملک کے لوگوں کی ہمت بڑھی اور یکدم اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر پوری فوج یوسف کے لشکر پر
ٹوٹ پڑی، اور ایسا شدید حملہ کیا کہ یوسف کی سپاہ کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان سے فرار
ہوئی۔ لیکن عبدالملک کے پاس اتنی فوج نہ تھی کہ اس فتح کے پورے نتائج حاصل کر لیتا،
یوسف کی فوج والوں میں کوئی ادھر بھاگا کوئی ادھر یوسف بھی فرار ہوا ایک اپنا غلام اور ایک
غلام بنی تمیم کا جس کا نام سابق تھا اس کے ساتھ تھے، یہ سب لوگ قلعہ رباح والے میدان سے
گذر کر اس سڑک پر پہنچے جو طلیطلہ کو جاتی تھی یوسف گھوڑے پر سوار بڑی تیزی سے ایک گاؤں
کے قریب سے گذر رہا تھا۔ جہاں سے طلیطلہ صرف دس میل رہ گیا تھا کہ گاؤں والوں نے
اسے پہچان لیا، اور ایک مدنی عرب عبداللہ بن عمر والانصاری نے اپنے دوستوں سے کہا کہ "جلد
گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ اور اس بھاگتے ہوئے آدمی کو قتل کر دو، اس کے مرنے سے اس کو بھی
راحت ہو جائیگی اور دنیا کو بھی چین مل جائے گا۔ جب تک یہ زندہ رہے گا ہر طرف آگ لگاتا رہے
گا" عبداللہ انصاری کا اتنا کہنا تھا کہ اس کے دوست فوراً گھوڑوں پر سوار ہو گئے چونکہ ان کے جانور

تازہ دم تھے، اور بھاگنے والوں کے گھوڑے تھکے ہوئے تھے اس لیے طلیطلہ سے چار میل ادھر ہی ان لوگوں نے یوسف کو جا پکڑا، اور فوراً یوسف اور سابق کو قتل کر دیا، یوسف کا ایک غلام بچ گیا اور اسی نے سابق امیر اندلس کی موت کی خبر طلیطلہ میں پہنچائی۔

جس وقت عبداللہ بن عمرو انصاری نے عبدالرحمٰن کے سامنے اس کے بدقسمت دشمن یوسف کا سر پیش کیا تو عبدالرحمٰن نے جو اپنے سب دشمنوں کی ہلاکت چاہتا تھا، حکم دیا کہ یوسف کے دو بیٹوں میں سے ابوزید کو قتل کر دیا جائے اور دوسرے بیٹے یعنی ابوالاسود کو جو کم سن ہے قتل نہ کیا جائے بلکہ بدستور قید میں رکھا جائے[1]۔

اب صرف صمیل دشمنوں میں اور باقی تھا، ایک دن یہ خبر مشہور ہوئی کہ صمیل شراب پی رہا تھا کہ دم نکل گیا، سرداران بنی معد دیکھنے کے لیے گئے کہ کہیں کسی نے اسے مار تو نہیں ڈالا جب کمرے میں آئے تو دیکھا کہ لاش کے قریب شراب، کچھ میوے اور شیرینی رکھی ہے، ان لوگوں کو گمان ہوا کہ صمیل کسی مرض سے نہیں مرا بلکہ اس کو زہر دیا گیا ہے، لیکن واقعہ یہ تھا کہ عبدالرحمٰن کے حکم سے اس کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔

اسناد:-

اخبار مجموعہ ص ۸۳-۹۱

ابن القوطیہ ص ۱۰-۱۳

ابن الابار ص ۴۲-۵۰، ۵۴-۵۵

مقری ج ۲ ص ۲۴

---

[1] غریب ابوزید کا قاتل دراصل اس کا باپ یوسف تھا۔ اگر وہ بلا سبب بغاوت نہ کرتا تو نہ خود مارا جاتا، اور نہ ابوزید قتل ہوتا۔ عبدالرحمٰن کا تو مقصد اور مدعا یوسف کے دونوں بیٹوں کو یرغمال کے طور پر اپنے پاس قلعہ میں رکھنے کا یہی تھا کہ یوسف اسی وجہ سے بغاوت نہ کرنے پائے اور اگر بغاوت کرے تو اس کے دونوں بیٹے قتل کر دیے جائیں اب اگرچہ بقول امریکانی مورخ ایس۔ پی سکاٹ کے "اس کے دونوں بیٹے مستوجب سزائے موت ہو چکے تھے" مگر پھر بھی عبدالرحمٰن نے اس کے چھوٹے بیٹے پر بوجہ اس کی کم سنی کے رحم کیا اور صرف اس لڑکے کو قتل کیا جو جوان اور لڑ سکنے کے قابل تھا عبدالرحمٰن کا یہی فعل اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ وہ خونخوار اور ظالم نہیں تھا کیونکہ اگر وہ ایسا ہوتا تو ابوالاسود کو بھی ساتھ ہی قتل کرا دیتا کون تھا جو اسے منع کر سکتا (اسماعیل)

(۱۹۸)

کتاب اول

خانہ جنگی

سولھویں فصل

عبدالرحمٰن الداخل (بسلسلہ فصل سابق)

شہزادہ اپنے مقصد کو پہنچ گیا، اور ایسا شخص جس کا خون وطن میں مباح ہو چکا تھا اور جس نے پانچ برس افریقہ کے صحراؤں میں اس سرے سے لے کر اس سرے تک قبیلے قبیلے پریشان حال رہ کر آوارہ گردی کی تمام صعوبتیں اٹھائی تھیں آخر کار ایک وسیع ملک کا بادشاہ ہو گیا اور وہ لوگ جنہوں نے اس کی دشمنی کا بیڑا اٹھایا تھا سب فنا ہو گئے۔

تاہم جو چیز دھوکے اور قتل سے حاصل کی تھی اسے چین سے برتنا نصیب نہ ہوا ملک میں اس کی قوت کو استحکام کلی نصیب نہ ہوا، صرف یمانیہ کا فریق ایسا تھا جس پر اعتماد ہو سکتا تھا لیکن اس امر کو کہ ان کی امداد خالی از خطر نہیں ہے عبدالرحمٰن نے کبھی نظر انداز نہ کیا شقندہ کے میدان میں جو شکست فاش یمانیہ کو ہو چکی تھی اس کے انتقام کے وہ شدت سے پیاسے ہو رہے تھے اور اس بات کیلئے بھی بیقرار تھے کہ کسی طرح ان کا قبیلہ جو ایک مدت سے سرداری

کی عزت سے محروم کر دیا گیا ہے پھر مسندِ امارت حاصل کر لے، پس اس صورت میں عبدالرحمٰن کے معاملہ کو یمانیہ نے کبھی اس سے زیادہ نہ سمجھا کہ وہ ایک پردہ ہے جس کے پیچھے ان کی اصلی اور ذاتی اغراض پوشیدہ ہیں، اگر ان کا آپس کا رشک وحسد مخل نہ ہوتا تو کسی یمنی کا امیر اندلس ہونا وہ سب سے بہتر سمجھتے، غرض یہ شروع ہی سے نظر آسکتا تھا کہ جس وقت یمانیہ اور شہزادے دونوں کا دشمن مغلوب ہو جائیگا تو پھر یمانیہ کی تلواریں شہزادے پر جھک پڑیں گی۔ اور یہی ہوا بھی، بتیس برس کے زمانۂ حکومت میں از اوّل تا آخر عبدالرحمٰن کو یہی دیکھنا پڑا کہ، اس کو حکومت سے محروم کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، کبھی یمانیہ، کبھی بربر، اور کبھی بنو فہر عَلَم بغاوت بلند کرتے ہیں' اور گو اُن کو پے در پے شکستیں دی جاتی ہیں مگر انھوں نے وہی مثل کر رکھی ہے کہ ایک دیو کو مارو اور نئو اور پیدا ہو جائیں، یہ عبدالرحمٰن کی خوش قسمتی تھی کہ عربی سرداروں میں متحد ہونے کی قابلیت کا پتہ نہ تھا، اتنا ضرور کچھ کچھ ان کی سمجھ میں آتا تھا کہ عبدالرحمٰن کی حکومت کو غارت کرنے کے لیے تمام سردرانِ عرب و بربر میں اتحاد کا ہونا سب سے پہلی ضرورت ہے، لیکن مل کر کوئی کام کرنا ایسا مضمون تھا جو خارج از بحث تھا، پس دشمنوں میں نا اتفاقی، اپنی طرف سے ملک گیری میں مسلسل سرگرمی اور ایسی حکمت اور تدبیر کی پیروی جس میں بدعہدی و فریب یا سختی اور ظلم تو کبھی کبھی، مگر ہوشیاری اور موقع پر مناسب عمل ہمیشہ شامل رہا، وہ اسباب تھے جن کی بدولت عبدالرحمٰن اپنے منصب امارت کو قائم رکھ سکا، گو اسے چند خیر خواہ امراء و رؤسا اور اپنے خاص موالی اور بربر کی فوجوں پر بھی جو افریقہ سے بھرتی کی تھیں، پورا بھروسہ رہا۔

یمانیہ کی متعدد خوفناک بغاوتوں میں سب سے زیادہ سخت بغاوت علاء بن مغیث یحصبی ۱۹۹
الیمنی کی سمجھنی چاہیئے جو ۱۴۶ھ (۷۶۳ء) میں پیش آئی، اس سے دو برس پہلے ہشام نے طلیطلہ میں بغاوت کی تھی، ہشام یہاں کا ایک مقتدر رئیس، اور سابق امیر عذرہ بن عبداللہ فہری کا بیٹا تھا اور اس وقت بنی فہر کی سرداری اُسے حاصل تھی، عبدالرحمٰن اس ہنگامہ کو فرو نہ کرنے پایا تھا کہ علاء بن مغیث یحصبی نے جسے خلیفہ منصور عباسی نے اندلس کی سندِ حکومت عطا کر دی تھی، اندلس

له ہشام کا باپ عذرہ بن عبداللہ فہری ۱۲۰ھ (۷۳۸ء) میں چند ماہ اندلس کا گورنر رہا تھا (اسماعیل)

میں داخل ہوا، اور علاقہ باجہ میں پہنچکر عباسیوں کا سیاہ عَلم وہاں نصب کر دیا، متعدد نفاق زدہ فریقوں کو متحد کرنے والا اِس عَلم کے سوا دوسرا نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ یہ کسی چھوٹے موٹے فریق کا عَلم نہ تھا، بلکہ کل جماعتِ اسلام کا لِوا تھا، علاقہ باجہ کے فہری یمانیہ کے ساتھ ہو گئے اور ان سب نے موقع پاکر عبدالرحمٰن کو قرمونہ میں محصور کر لیا، دو مہینے جب اسی حال میں گذر گئے تو حالت نازک ہو چلی اور عبدالرحمٰن نے ارادہ کر لیا کہ حکومت چاہے رہے چاہے جائے، کسی طرح اس حصار سے باہر نکلنا چاہیے، چنانچہ جس وقت اسے معلوم ہوا کہ دشمن کے بہت سے لوگ محاصرہ کی طوالت سے گھبرا کر کسی نہ کسی بہانہ سے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے ہیں، تو عبدالرحمٰن نے اپنے ہمراہیوں میں سے سات سو آدمیوں کو جو حقیقت میں دلیری و شجاعت کے جوہر آبدار تھے منتخب کیا اور شہر کے باب اشبیلیہ کے قریب آگ روشن کرا کر ان لوگوں سے کہا ”دوستو اب وقت ایسا ہے کہ یا تو دشمن پر فتح حاصل ہونی چاہیے یا مر جانا چاہیئے آؤ! ہم سب اپنی تلواروں کے نیام اس آگ میں ڈال کر قسم کھائیں کہ اگر فتح نصیب نہ ہوئی تو سب کے سب مردانِ پکار کی طرح اپنی جانیں دیدیں گے“ اتنا سنتے ہی کوئی نیام نہ تھا جو آگ میں نہ جھونک دیا گیا ہو، اس کے بعد شہر سے نکل کر ان لوگوں نے اس غضب کا دھواں دھار حملہ کیا کہ دشمن بدحواس ہو کر بھاگا۔

بیان کیا گیا ہے کہ علاء بن مغیث اور دیگر سرداران لشکر کے علاوہ جو اس معرکہ میں قتل ہوئے اُن کی تعداد سات ہزار تھی، عبدالرحمٰن نے طیش میں آکر علاء بن مغیث اور اُس کے مشیران خاص کی لاشوں سے اُن کے سر اتروا لیے اور اس خیال سے کہ عباسی خلیفہ کو پھر اندلس سے اُس کی حکومت اُٹھوانے کی جرأت نہ ہو، ان سروں کو اندر سے خالی کرا کر ان میں نمک اور کافور بھر دیا، اور ہر سر کے کان میں ایک ایک پرچہ آویزاں کر دیا جس پر اُس شخص کا حسب و نسب لکھا تھا جس کا وہ سر تھا، پھر ان سروں کو ایک تھیلے میں بھروا کر اُسی تھیلے میں عباسیوں کا سیاہ پھریرا، اور وہ سند جو خلیفہ منصور نے اندلس پر حکومت کرنے کی علاء بن مغیث کو دی تھی مع ایک مختصر کیفیت کے کہ ان باغیوں کو کس طرح شکست دی گئی لکھ کر رکھ دی، اس زمانہ میں قرطبہ کا ایک سوداگر تجارت کی غرض سے قیروان جانے والا تھا، چنانچہ اُسے بہت سا انعام دیکر اس ہدایت کے ساتھ یہ تھیلا اُس کے سپرد کیا گیا کہ جب وہ قیروان پہنچے تو رات کے وقت وہاں کے بڑے بازار میں

اس کو رکھ دے، سوداگر نے یہی کیا، شدہ شدہ اس کی اطلاع جس وقت خلیفہ منصور کو ہوئی تو اس نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ مجھ میں اور اس دشمن صعب میں ایک سمندر حائل ہے"

دولت عباسیہ کے ہوا خواہوں پر اس طرح فتح پانے کے بعد ہی عبدالرحمن نے بہت جلد (۲۰۰ طلیطلہ کی بغاوت فرو کی (۱۴۷ھ) جو اس واقعہ سے دو برس پہلے شروع ہو گئی تھی امیر کے حکم سے بدر اور تمام بن علقمہ نے طلیطلہ کا محاصرہ کر لیا تھا، اہل طلیطلہ نے اس محاصرہ سے تنگ آ کر صلح کی درخواست کی اور اپنے تین سرداروں کو جو بغاوت کے سرغنے تھے بدر اور تمام کے سپرد کر کے امان حاصل کر لی اور یہ بغاوت فرو ہوئی، تمام بن علقمہ ان تینوں باغی سرداروں کو گرفتار کر کے قرطبہ لے جا رہا تھا کہ راستے میں امیر کا ایک فرستادہ عاصم بن مسلم ملا، اس نے تمام کو امیر کا حکم سنایا کہ تم طلیطلہ کے والی مقرر کیے گئے ہو اس لیے طلیطلہ واپس جاؤ اور ان قیدیوں کو میرے سپرد کرو۔ عاصم جس وقت ان قیدیوں کو لے کر قرطبہ چلا تو راستے میں امیر کا بھیجا ہوا ایک دوسرا شخص طفیل ملا، اس کے ساتھ ایک نائی ایک درزی، اور ایک ٹوکریاں بنانے والا تھا، نائی نے ان باغیوں کی داڑھیاں اور سر مونڈے، درزی نے ان کے جُبّے سیئے، اور ٹوکری والے نے بڑے بڑے کھانچے تیار کیے، پھر ان باغیوں کو کھانچوں میں بند کر کے کھانچوں کو گدھوں پر لادا اور اس حال سے قرطبہ میں لا کر مصلب میں لے گئے اور سب کو مصلوب کر دیا۔

بدخواہان دولت کو اس قسم کی وحشیانہ سزائیں دینا ہی کافی ثبوت امیر کے اس مصمم قصد کا تھا کہ جب ضرورت ہو تو رعایا پر اپنی ہیبت طاری کر کے حکومت کرے، لیکن ان باغی سرداران طلیطلہ کے قتل کے دو برس بعد سعید یحصبی معروف بہ مطری نے جو بغاوت کی اس سے ظاہر ہوا عربوں کو رام کرنا کوئی آسان بات نہ تھی،

مطری علاقہ لبلہ کا ایک یمنی سردار تھا، ایک رات شراب پینے کے بعد اثنائے گفتگو میں ان یمانیوں کے قتل کا ذکر آیا جو علا بن مغیث کے ساتھ ہو کر عبدالرحمن سے لڑے تھے، اپنی قوم والوں کے قتل کا حال سن کر مطری کو جوش آ گیا، اٹھ کر ایک برچھے کی نوک پر کپڑا باندھا، اور اس پر قسم

۱ے تینوں کے نام یہ ہیں (۱) ہشام بن عذرہ فہری (۲) حیوٰۃ بن ولید یحصبی (۳) عثمان بن حمزہ (مترجم)

کھائی کہ اپنی قوم والوں کے خون کا بدلہ ضرور لے کر رہونگا، دوسرے دن جب صبح بیدار ہوا تو رات کا واقعہ مطلق یاد نہ تھا، برچھے کو دیکھ کر کہ اُس کی صورت ایک عَلَم کی سی ہو گئی ہے سخت حیرت میں گیا، اب لوگوں نے اُسے رات کا واقعہ یاد دلایا، مطری نے گھبرا کر حکم دیا کہ "برچھے پر سے کپڑا کھول ڈالو، کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ حماقت سارے یمن میں مشہور ہو جائے"، لیکن ابھی کپڑا علیحدہ نہیں کیا گیا تھا کہ اس نے پھر غور کیا اور کہا "نہیں بس اس عَلَم کو ہاتھ نہ لگاؤ، میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو زبان سے کوئی بات نکالنے کے بعد، چاہے وہ کچھ ہو، اُس کے انجام سے ڈریں" یہ کہکر اس نے اپنی قوم کے لوگوں یعنی یمانیہ کو ہتھیار اُٹھانے کا حکم دیا، اور کچھ مدت تک سرکاری فوجوں سے لڑتا رہا، یہاں تک کہ ایک معرکہ میں قتل ہو گیا، اس کے ساتھی اس قدر ثابت قدمی سے لڑتے رہے کہ آخر کار امیر نے اُن سے صلح کر لی۔

اب ابوالصباح کی باری آئی، اس زبردست یمنی سردار سے بدگمان رہنے کی عبدالرحمٰن معقول وجہ رکھتا تھا، جنگِ مصارہ کے بعد ہی اُس نے عبدالرحمٰن کو قتل کر دینے کا مشورہ کیا تھا، لیکن عبدالرحمٰن (۳۰۹) نے اس وقت اس بات بگاڑنی نہیں چاہی اور اس کو اشبیلیہ کا والی مقرر کر دیا، لیکن ۱۴۹ھ/۷۶۶ء میں جب کوئی باغی بھی ایسا نہ تھا جس سے لڑتا، اور یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ اب اتنی قوت حاصل ہو گئی ہے کہ اس یمنی دشمن کو اُس کی دشمنی کا مزہ چکھا سکتا ہے، تو عبدالرحمٰن نے ابوالصباح کو اشبیلیہ کی حکومت سے معزول کر دیا، اس پر ابوالصباح کو ایسا غصہ آیا کہ اس نے اپنی قوم والوں کو ہتھیار اُٹھا لینے کا حکم دیا اور بغاوت کر دی، اور اب عبدالرحمٰن کو معلوم ہوا کہ اس یمنی سردار کو جتنا وہ سمجھے ہوئے تھا، اس سے کہیں زیادہ وہ با اقتدار اور صاحبِ قوت ہے، پس عبدالرحمٰن نے ایک دھوکے سے کام لیا، وہ یہ کہ ابوالصباح سے قرطبہ میں ملاقات کرنی چاہی اور عبداللہ بن خالد کو ایک امان نامہ ابوالصباح کے حق میں لکھ کر دیا، اور کہا کہ اس کو دکھا کر ابوالصباح کو قرطبہ میں لے آؤ، ابوالصباح اس امان نامہ کو پاتے ہی قرطبہ میں چلا آیا، اور چار سو سوار جو اس کے ہمراہ تھے ان کو قصرِ امارت کے دروازے پر چھوڑ کر امیر کے پاس آیا، دونوں کی تنہائی میں ملاقات ہونے لگی، بیان کیا جاتا ہے کہ ابوالصباح نے بدزبانی اور سخت کلامی کر کے امیر کو برہم کر دیا؛ اور اُس نے غصہ میں آ کر ابوالصباح کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنا چاہا، مگر ابوالصباح طاقت میں کم نہ تھا

امیر نے آدمیوں کو آواز دی، اور اُنھوں نے آتے ہی ابوالصباح کو قتل کر دیا، معلوم ہوتا ہے کہ اس قتل کے لیے بہت سی پیش بندیاں کر لی گئی تھیں، جن کو بنی اُمیہ کے ہواخواہ مورخوں نے اپنے آقا کے حالات لکھتے وقت ظاہر نہیں کیا۔

جب ابوالصباح قتل ہو گیا تو عبدالرحمٰن نے حکم دیا کہ لاش پر چادر ڈال دی جائے اور خون کے نشانات جہاں جہاں ہوں مٹا دیے جائیں، اس کے بعد امیر نے اپنے وزراء کو مندیلا کر ان سے کہا کہ "ابوالصباح اس وقت اس قصر میں قید ہے، پس تم سے دریافت کیا جاتا ہے کہ اس کو زندہ رہنے دیا جائے یا ہلاک کر دیا جائے" تمام ندیموں نے جواب دیا "نہیں اسے امان ملنی چاہیے اُس کے ہلاک کرنے میں خطرہ ہے، کیونکہ اُس کے ساتھ جو مسلح سوار آئے ہیں، وہ قصر کے دروازے پر کھڑے ہیں، اور امیر کے سپاہی وہاں سے بہت فاصلے پر ہیں" صرف ایک ندیم نے جو امیر کا رشتہ دار تھا، اس رائے سے اتفاق نہیں کیا، اور اشعار میں عرض کیا و

"اے ابن خلفاء! جو رائے میں دیتا ہوں وہ صائب ہے، ایسے آدمی کو جو تیرا دشمن ہو
اور تجھ سے بدلہ لینے کی فکر میں ہو زندہ نہ چھوڑ، اگر وہ زندہ رہا تو ہم پر بڑی بڑی آفتیں
ڈھائے گا، اُس کا خاتمہ کر کے تو ایک بلا سے نجات پا جائیگا، دمشقی تلوار اُس کے سینے
میں اُتار دے، اس کو ہلاک کرنا تیری فضیلت کا باعث ہو گا۔"

عبدالرحمٰن نے کہا "ایسا ہے تو تم سب کو معلوم ہو کہ میں نے ابوالصباح کو قتل کر دیا، اور اتنا کہہ کر اس کا بھی خیال نہ کیا کہ اس کے ندیموں پر کیسا خوف طاری ہو گا، لاش پر سے چادر ہٹا دی جن وزیروں نے قتل کا مشورہ اس خوف سے نہیں دیا تھا کہ ابوالصباح کے مسلح ہمراہی
۱۲۰۲ قصر کے دروازے پر موجود تھے، اُن کو معلوم ہوا کہ اُن کا خوف بالکل بیجا تھا، کیونکہ جب قصر کے ایک دربان نے اُن لوگوں سے کہا کہ "تمہارا سردار تو مارا گیا، تم کیوں فضول دروازے پر کھڑے ہو؟" تو یہ سب لوگ چپ چاپ وہاں سے چلے گئے، اس عجیب واقعے سے یہ گمان ہوتا ہے کہ عبدالرحمٰن نے احتیاط اور پیش بینی کر کے ان لوگوں کو پہلے ہی سے کچھ روپیہ پہنچا دیا تھا۔

موالی بنی امیہ میں صرف ایک شخص ایسا عالی ظرف تھا جس نے اس دھوکے اور فریب کو نفرت کی نظر سے دیکھا، یہ عبداللہ بن خالد تھا جس کو بغیر اُس کے علم کے اس قتل کا ایک ذریعہ بنایا گیا

تھا، کیونکہ جس امان نامہ کا اعتبار کر کے ابو الصباح قرطبہ میں آیا تھا وہ اسی عبداللہ بن خالد کے ہاتھ امیر نے ابوالصباح کو بھیجا تھا، اس واقعہ کے بعد عبداللہ بن خالد دربار سے رخصت ہو کر اپنے تعلقہ کو چلا گیا، اور پھر کوئی خدمت امیر کی قبول نہیں کی۔

ابوالصباح کے قتل کے چند روز بعد بربر نے جو اب تک چین سے بیٹھے تھے ایک بڑی بغاوت کھڑی کر دی، اس کی ابتدا ایک مدرسہ کے معلم سے ہوئی جو مشرقی اسپین کا رہنے والا تھا، اور اصلی نام اس کا شقیا تھا، یہ کسی قدر مجنون اور کسی قدر بنا ہوا آدمی تھا، دین کی کتابیں اور عرب کی روایات بکثرت مطالعہ کرنے سے، یا محض اس شوق میں کہ کسی بڑے گروہ کا سردار بن جائے اُسے اس بات کا یقین ہو گیا، یا اُس نے محض ظاہر کیا کہ ایسا یقین رکھتا ہے کہ وہ حضرت علی اور حضرت فاطمہؓ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد سے ہے، بربر ہمیشہ کے ضعیف الاعتقاد تھے، اُن کو اس کے فاطمی ہونے کا یقین ہو گیا، ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ اسکی ماں کا نام فاطمہ تھا، شقیا نے اب اپنا نام عبداللہ بن محمد مشہور کر کے وادی آنہ اور دریائے تاجہ کے بیچ میں جو وسیع علاقہ تھا اس میں خروج کیا، اس علاقہ میں آبادی کے لحاظ سے بربر کی تعداد سب سے زیادہ تھی اور اپنے کسی مرابط یا خانقاہ نشین ہی سے اشارہ پاتے ہی شمشیر بکف ہو جانے کے لیے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے اب شقیا کے ظاہر ہوتے ہی وہ اُسکے پاس بکثرت جمع ہو گئے، اور بہت جلد شنت بریہ، ماردہ، قوریہ اور مدلین پر اُنھوں نے قبضہ کر لیا۔

حاکم طلیطلہ نے شقیا کی سرکوبی کے لیے فوج روانہ کی، شقیا نے اُسے شکست دے دی شاہی سالارِ فوج ابو عثمان عبیداللہ کی فوج میں جس قدر بربر تھے اُن کو اپنی طرف بلا کر باقی فوج شاہی پر حملہ کر کے اُسے بھگا دیا، لشکر گاہ پر قبضہ کر لیا، اور پھر پہاڑوں میں چھپ کر عبدالرحمٰن کی تمام کوششوں کو کہ کسی طرح شقیا کھلے میدان میں مقابلہ پر آئے، بیکار ثابت کرتا رہا آخر کار دو برس کی غیر مسلسل

ء دریائے تاجہ (The Tagus) کی شاخ وادی ایلہ (The Guadiela) کے کنارے اب ایک مقام کا نام کاسترودی سانتور Castro de Santover ہے، یہ ایک وقت میں (Santebria) کہلاتا تھا، جسے عربوں نے شنت بریہ کر لیا

اور بے ترتیب لڑائیوں کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے قوم بربر کے ایک سردار کو جس کا نام ہلال
مدیونی تھا اور جو مشرقی اسپین میں بڑا زبردست آدمی تھا اپنی طرف بلالیا، یہ سردار شقیا سے جس نے (۲۰۳)
اپنے آپ کو فاطمی مشہور کر رکھا تھا جلتا تھا، اور اس کی کامیابی اور مرجعِ خلائق بن جانے کو
حسد کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔

اب بربر میں پھوٹ پڑ گئی اور شقیا مجبور ہوا کہ شنت بریہ سے نکل کر شمالی علاقوں میں چلا جائے
امیر عبدالرحمٰن فوج لیے اس کے تعاقب میں مصروف تھا کہ یکایک مغربی اسپین میں یمانیہ کی بغاوت
کی خبر سنی، جب سے ابوالصباح قتل ہوا تھا یمانیہ اس فکر میں تھے کہ اُس کے خون کا بدلہ لیا جائے
چونکہ اس وقت عبدالرحمٰن شقیا کے پیچھے فوجیں لیے ہوئے شمالی اسپین میں تھا، اس لیے
یمانیہ کو اچھا موقع ملا، سیدھے اُٹھے اور دارالامارت قرطبہ پر حملہ کر کے قبضہ کرنا چاہا، اس
بغاوت کے سرغنے[1] ابوالصباح کے قرابت مند اور والیان لبلہ و باجہ تھے اور مغربی صوبوں
کے بربر نے اُن کو کمک پہنچائی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ ان بربر کو شقیا کے بھیجے ہوئے لوگوں نے
آمادہ کیا تھا کہ یمانیہ کو اس بغاوت میں مدد دیں،

عبدالرحمٰن اس بغاوت کی خبر سنتے ہی شقیا کو بحالہ چھوڑ کر قرطبہ واپس آیا[2] قصر میں پہنچ کر
ایک رات بھی آرام نہ کیا، اور فوراً دشمن کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا، دریائے بتبذر کے کنارے
پہنچا تو دیکھا کہ باغیوں نے خندقیں کھود کر پڑاؤ ڈال رکھا ہے، چند روز تک چھوٹی چھوٹی لڑائیاں
لڑنے کے بعد عبدالرحمٰن نے اپنے بربر موالی کے توسط سے، جن میں بنی الخلی بھی شامل تھے دشمن کے
لشکر سے اُن بربر کو توڑ لیا جو اس وقت یمانیہ کا ساتھ دے رہے تھے، یہ بربر موالی رات کے وقت
چپکے سے باغیوں کے لشکر میں پہنچے اور اپنی قوم والوں کو انھوں نے یہ بات آسانی سے سمجھادی کہ

---

[1] سرغنوں کے نام یہ ہیں (۱) حیاۃ بن ملابس (یا ملامس) الحضرمی رئیس اشبیلیہ
(۲) عبدالغفار بن حمید الیحصبی حاکم لبلہ
(۳) عمر بن طالوت حاکم باجہ

[2] اسے وادیٔ قیس یعنی دریائے قیس بھی کہتے تھے۔

عربوں کے کینہ اور عداوت سے صرف عبدالرحمٰن ہی ایک ایسا شخص ہے جو اُن کو محفوظ رکھ سکتا ہے اگر اس کو انھوں نے معزول کر دیا، تو پھر اس ملک میں جتنے بربر ہیں سب کو دیس نکالا مل جائے گا اگر تم ایسے معاملہ سے جس میں خود تم کو نقصان پہنچنے والا ہے دست بردار ہو کر امیر کے خیر خواہ بن جاؤ گے تو وہ تمہارا شکر گذار ہو گا۔

یہ نصیحت کارگر ثابت ہوئی، اور بربر نے وعدہ کر لیا کہ "کل جس وقت یمانیہ مقابلہ کو اٹھیں گے تو ہم اُن کی فوج سے علیحدہ ہو جائیں گے" یہ وعدہ انھوں نے ایفا بھی کیا، چنانچہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے اُنھوں نے یمانیہ سے کہا کہ "ہم صرف اس حالت میں لڑ سکتے ہیں جبکہ گھوڑوں پر سوار ہوں، چونکہ تم پیادہ لڑنے میں بخوبی مہارت رکھتے ہو اس لیے جس قدر گھوڑے تمہارے پاس ہیں وہ ہم کو سواری کے لیے دیدو" یمانیہ کو اِن لوگوں سے بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی انھوں نے فوراً اپنے سب گھوڑے اِن کو دے دیے، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ان کو معلوم ہوا کہ اُن سے بڑی حماقت ہوئی ہے، لڑائی ابھی پورے طور پر شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ جن بربروں کو گھوڑے مل گئے تھے وہ اُن پر سوار ہو کر امیر عبدالرحمٰن کے رسالوں میں شامل ہو گئے اور اپنے بھائیوں سے جن کو گھوڑے نہ مل سکے تھے کہتے گئے کہ "جس وقت لڑائی شروع ہو تو بھاگ جانا۔ اب بربر سواروں اور امیر عبدالرحمٰن کے رسالوں نے یمانیہ پر دھاوا کیا یمانیہ چاروں طرف سے گھر گئے، سخت کشت و خون ہوا، عبدالرحمٰن نے اپنی فوج کو حکم دیدیا تھا کہ دشمن کی فوج سے جو بربر بھاگتے نظر آئیں اُن کو نہ مارا جائے" لیکن سپاہیوں نے آنکھیں بند کر کے جو سامنے آیا اُس کو قتل کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ تیس ہزار لاشیں میدان میں پڑی نظر آئیں ان سب لاشوں کو ایک خندق کھود کر دفن کر دیا گیا، دسویں صدی عیسوی (چوتھی صدی ہجری) تک یہ مقام لوگوں کو بتایا جاتا تھا،

وسط اسپین میں بربر کی بغاوت دس برس تک برابر جاری رہی اور جب تک کہ شقیا کو اس کے دو ساتھیوں نے مار نہ ڈالا، فرو نہ ہو سکی

ابھی یہ بغاوت چل ہی رہی تھی کہ عبدالرحمٰن کے برخلاف ایک سازش ایسی سخت ہوئی جس میں سازش کرنے والوں نے باہر کے ایک زبردست دشمن اور فاتح کو گھر میں لا کھڑا کیا

اس سازش کے رکن یہ لوگ تھے۔

(۱) سلیمان بن یقظان الاعرابی الکلبی۔ یہ صوبہ برشلونہ کا حاکم تھا۔

(۲) عبدالرحمٰن بن حبیب الفہری یہ معزول امیر اندلس یوسف الفہری کا داماد تھا، اور صقلبی کے لقب سے اس لیے مشہور ہو گیا تھا کہ اونچا قد، چھریرا بدن بھورے بال، کرنجی آنکھیں رکھتا تھا، اور اس وجہ سے صقالیہ سے بہت مشابہ تھا جو غلاموں کی حیثیت سے اسپین میں بکثرت موجود تھے۔

(۳) ابوالاسود محمد۔ یہ امیر معزول یوسف الفہری کا بیٹا تھا جسکو عبدالرحمٰن نے حبس دوام کی سزا دے رکھی تھی، اس قید میں اُس نے اپنے آپ کو اندھا ظاہر کر کے محافظوں کو اپنی طرف سے غافل کر رکھا تھا۔

(ابوالاسود کا قصہ یہ ہے کہ جب وہ اندھا بنا تو شروع میں کسی کو یقین نہ آیا طرح طرح سے اُس کی آزمائشیں کی گئیں، مگر آزادی حاصل کرنے کے شوق نے کچھ ایسی قوت اس میں پیدا کر دی کہ اپنی کسی حرکت سے اُس نے اس فریب کو کھلنے نہ دیا آخر میں سب کو یقین ہو گیا کہ فی الحقیقت وہ اندھا ہے، چنانچہ اس کو الاعمٰی کے نام سے لوگ پکارنے بھی لگے، اس طرح محافظانِ جیل کو اپنی طرف سے بے پروا کر کے اُس نے اپنے ایک خادم سے جو کبھی کبھی اجازت حاصل کر کے اُسکے پاس آیا کرتا تھا اپنی رہائی کے متعلق مشورہ کیا، قاعدہ یہ تھا کہ روز صبح کے وقت ایک زمین دوز راستے سے محافظوں کی نگرانی میں تمام قیدی قید خانہ سے نکل کر دریا کے کنارے ضروریات سے فارغ ہونے کے لیے جایا کرتے تھے، ایک دن جب ابوالاسود دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ اُس کا وہی خادم جو کبھی کبھی اُس کے پاس آیا کرتا تھا چند دوستوں کے ساتھ گھوڑے لیے ہوئے دریا کے اُس پار موجود ہے، اتنا دیکھتے ہی لوگوں کی آنکھ بچا کر ابوالاسود دریا میں کود گیا، اور تیزی سے تیر کر دوسرے کنارے پر پہنچا، اور وہاں فوراً سوار ہو گھوڑے کو طلیطلہ کی سمت میں سرپٹ ڈال دیا اور اس شہر میں آخرکار صحیح سلامت پہنچ گیا۔)

ان تینوں سرداروں کو عبدالرحمٰن سے ایسی سخت عداوت تھی کہ انھوں نے شارلمین بادشاہ فرانس (فرلہ ملک افرنجہ) سے امیر عبدالرحمٰن کے برخلاف مدد مانگنے کا قصد کرلیا، درآنحالیکہ یہ بادشاہ جس کی فتوحات کی دھوم تمام یورپ میں مچی ہوئی تھی اسلام کا جانی دشمن تھا، بہرکیف یہ سازشی ۱۶۱ھ ۷۷۷ء میں شارلمین کے پایہ تخت پدربرن (PADERBORN) میں پہنچے، بہار کا موسم تھا بادشاہ دربار کر رہا تھا جو ہر سال موسم گرما یا بہار میں اس غرض سے کیا جاتا تھا کہ جدید فرامین اپنی قلمرو میں جاری کرے اور جہاں جہاں فوجی مہمات بھیجی ہوں ان پر غور کرے، اہل سازش دربار میں آئے، اور بادشاہ سے کہا کہ "ہم امیر اندلس عبدالرحمٰن کے خلاف آپ سے مراسم آشتی پیدا کرنے چاہتے ہیں" شارلمین نے بلا تامل یہ بات منظور کرلی، یہ زمانہ ایسا تھا کہ وہ کسی لڑائی میں مصروف (۲۰۵
نہ تھا، اور اسے نئی نئی فتوحات کے سوچنے کے لیے بخوبی مہلت حاصل تھی، اس نے سیکسن قوم کی نسبت جس سے اس کو حال میں لڑنا پڑا تھا، یہ سمجھ لیا تھا کہ اب اس میں کچھ دم باقی نہیں ہے محکوم ہونے اور عیسوی مذہب قبول کرنے پر اب وہ مجبور ہوگئی ہے، اس قوم کے ہزارہا آدمی بھی اس وقت اصطباغ لینے کے لیے دارالحکومت میں آئے ہوئے تھے، اور ان کا زبردست سردار وٹی کنڈ (WITTEKIND) اسی زمانہ میں اپنے ملک سکسنی سے جلاوطن کردیا گیا تھا، اور جان بچانے کے لیے ڈنمارک کے کسی شہزادے کے ہاں اس نے پناہ لی تھی،

غرض گفتگو کے بعد یہ طے پایا کہ (۱) شارلمین بادشاہ افرنجہ ایک لشکر جرار کے ساتھ جبل البرانس کے سلسلہ میں سے گذر کر اسپین میں داخل ہو (۲) سلیمان بن یقظان الاعرابی حاکم برشلونہ اور دریائے ابرو کے شمالی علاقوں کے ایسے حاکم جو سلیمان کے دوست ہیں اپنی اپنی فوجیں لیے تیار ہیں، اور جس وقت بادشاہ افرنجہ کا لشکر اسپین میں داخل ہو تو اس کے ساتھ شریک ہوجائیں (۳) ابن حبیب الصقلبی افریقیہ میں بربر کی فوج بھرتی کرے، اور اس فوج کو اسپین کے صوبہ تدمیر (مرسیہ) میں لے آئے، اور یہاں پہنچکر وہ شمال کے اہل سازش (یعنی بادشاہ افرنجہ، سلیمان اور دریائے ابرو کے شمال والے حکام) کے مقاصد کی تائید میں اس طرح کارگذار ہو کہ عباسی خلیفہ اور شارلمین بادشاہ فرانس میں دوستی کا ہونا ظاہر کرکے عباسیوں کا علم بلند کردے۔

یہ زبردست اور خوفناک سازش جس میں حملہ کی تدبیر بہت ہی غور دا احتیاط کے ساتھ طے پائی تھی، تمام سابقہ بغاوتوں سے عبدالرحمٰن کے حق میں کہیں زیادہ خطرناک تھی لیکن عبدالرحمٰن کی یہ خوش قسمتی تھی کہ جس احتیاط سے یہ تدبیر سوچی گئی تھی اُسی احتیاط سے اس پر عمل نہ ہو سکا، ابن حبیب نے افریقہ میں فوجیں بھرتی کیں، اور ان کو جہازوں میں بٹھا کر اسپین کے علاقہ تدمیر میں لے آیا لیکن یہ کام قبل از وقت کیا شارلمین نے ابھی جبل البرانس کا سلسلہ جو اسپین اور فرانس میں حائل تھا عبور نہیں کیا تھا، ابن حبیب نے عباسیوں کا علم بلند کرنے کے لیے سلیمان بن یقظان سے مدد مانگی، سلیمان نے جواب دیا کہ بادشاہ افرنجہ کے دارالسلطنت پیدربرن میں لڑائی کا جو نقشہ طے پایا تھا اُس کے مطابق اس کا فرض یہ ہے کہ شارلمین کی امداد کے لیے شمال کے علاقوں میں فوجیں لیے ہوئے موجود رہے، اس وقت وہ ابن حبیب کو مدد نہیں دے سکتا۔

سلیمان، یمنی تھا اور ابن حبیب، فہری، یمانیہ اور بنی فہر میں جو نزاع چلا آتا تھا، اس کا خیال اتنا کمزور نہ تھا کہ ابن حبیب کو سلیمان کی طرف سے دھوکے اور دغا کا گمان نہ ہوتا، یہ سمجھ کر کہ سلیمان اس کو فریب دے کر جال میں پھنسانا چاہتا ہے، ابن حبیب نے تدمیر سے شمال کی طرف بڑھ کر سلیمان پر حملہ کر دیا، سلیمان نے اُسے شکست دے دی، ابن حبیب شکست کھا کر تدمیر میں واپس آیا، یہاں اُس قوم کے ایک بربر نے اُسے مار ڈالا، ابن حبیب نے غلطی سے اس بربر کو اپنا رازدار بنا لیا تھا اور اس کا اُسے گمان تک نہ تھا کہ وہ درپردہ امیر عبدالرحمٰن کا آدمی ہے

جب شارلمین کا لشکر البرانس کے پہاڑوں کے قریب پہنچا (۱۶۱ھ) تو تین عرب سرداروں میں سے جن پر اُس نے بھروسا کیا تھا ایک مر چکا تھا، یعنی ابن حبیب زندہ نہ تھا، باقی دو میں سے ابوالاسود محمد نے بادشاہ افرنجہ کو اگر کچھ مدد دی تو وہ اس قدر کم تھی کہ عربی یا فرانسیسی مورخوں نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، اب صرف ایک عربی سردار یعنی سلیمان بن یقظان الاعرابی حاکم برشلونہ اور اُس کے معاون اور دوست جو شمالی علاقوں کے حاکم تھے، یعنی صوبہ وشقہ (HUESCA) کا حاکم ابو ثور، اور سرقسطانیہ (CRCDUNA) کا عیسائی حاکم قومس گلندو (GALINDO)، بادشاہ فرانس کے مددگار رہ گئے۔

سلیمان الاعرابی بہرحال اس زمانہ میں خالی ہاتھ نہ بیٹھا تھا، خود برشلونہ میں حاکم تھا

حسین بن یحییٰ انصاری جو حضرت سعدؓ بن عبادہ کی اولاد میں تھا سرقسطہ میں موجود تھا سلیمان نے حسین سے ساز باز کر کے سرقسطہ پر قبضہ کر لیا اور یہ دونوں یہاں حکومت کرنے لگے لیکن جب وقت شارلیمن کی فوجیں البرانس کے پہاڑوں سے اتر کر سرقسطہ کے دروازوں پر پہنچیں تو سلیمان (۲۰۶) نے دیکھا کہ شہر کے مسلمانوں کی حالت نہایت نفرت اور عتاب کی ہے، اور وہ اس بات کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے کہ فرانس کا عیسائی بادشاہ اُن کے شہر میں داخل ہو، بالخصوص حسین بن یحییٰ جو اپنی خاندانی روایات کو متبرک خیال کرتا تھا باوجود سلیمان کی کوششوں کے کسی طرح روادار نہ ہوا کہ اس قسم کی کوئی حرکت کی جائے، سلیمان مجبور ہوا، اور اس اندیشہ سے کہ بادشاہ افرنجہ اس کو بدعہد اور دغاباز نہ سمجھے، خود ہی اس کے پاس چلا گیا۔

شارلیمن نے سرقسطہ کو محصور کرنے کی تیاریاں کی ہی تھیں کہ ایک ایسی خبر اس کے پاس آئی جس سے اس کے تمام منصوبے الٹ پلٹ ہو گئے، قوم سیکسن کا سردار وٹی کند (WITTEKI-ND) پھر اپنے ملک سیکسنی میں داخل ہو گیا تھا، اور اس کے حکم سے سیکسن کی قوم نے شارلیمن سے دوبارہ بغاوت کر دی تھی، افرنجی فوجیں ملک سے باہر تھیں، اس لیے وٹی کند کو اور بھی موقع مل رہا تھا کہ شارلیمن کے ملک کو آگ اور تلوار سے غارت کرے، وٹی کند اسی طرح ملک کو تباہ اور برباد کرتا ہوا دریائے رائن (RHINE) تک پہنچ گیا، اور شہر کلون (COLOGNE) کے سامنے والے شہر دوِلِج پہ قابض ہو گیا۔

اب جب اپنے گھر پہ بلا نازل ہوئی تو شارلیمن مجبور ہوا کہ وادی ابرہ[1] کا کنارہ چھوڑ کر دریائے رائن کے کنارے پہنچ کر اپنا ملک سنبھالے، چنانچہ مع تمام لاؤ لشکر کے واپس ہوا، اس سفر میں البرانس کے پہاڑوں میں رُنست شاوز سے گذرنا پڑا جو ایک خطرناک درہ تھا، اس درے کے شمالی سرے پر جنگلوں اور چٹانوں میں جو بلندی پر واقع تھے بشکنس کے لوگ جن کو افرنجیوں سے سخت عداوت تھی اُن کو لوٹنے اور غارت کرنے کی تاک میں پہلے سے چھُپ بیٹھے تھے، یہاں گھاٹی بہت تنگ تھی، اسلیے کم عریض رودیف میں ایک طولانی قطار بنا کر افرنجی لشکر

[1] سرقسطہ کا شہر دریائے ابرہ کے کنارے واقع ہے۔

اُس میں گذرنے لگا، لشکر کے آگے کا حصہ صحیح سلامت نکل گیا، لیکن اخیر کا حصہ جس کے پاس تمام مال واسباب تھا، جب گھاٹی سے نکل کر بلندی پر آنے لگا تو بشکنسیوں نے اس پر حملہ کیا، افرنجی سپاہی بھاری ہتھیار رکھتے تھے، بشکنسی ہلکے ہتھیار لگائے ہوئے تھے اور تازہ دم تھے اور جس مقام پر حملہ کرنے کو جمع ہوئے تھے وہ بھی اچھا تھا، غرض انھوں نے فرانسیسیوں کو بلندیوں سے دھکے دے کر نیچے وادی میں گرانا شروع کیا، فرانسیسیوں نے اس حملہ کا بہت کچھ جواب کرنا چاہا مگر بشکنسیوں نے ان میں قتل وغارت کا ایسا بازار گرم کیا کہ سوائے ایک افسر کے جس کا نام رولنڈ (ROLAOD) تھا اور جو بریٹن (BRATON) کی سرحد کا فوجدار تھا کسی کو زندہ نہ چھوڑا، تمام لشکر کا مال واسباب لوٹ لیا، اور جب رات ہوئی تو اندھیرے میں سب کے سب غائب ہوگئے۔

بادشاہ افرنجہ کی یہ مہم بہت ہی امید افزا حالات میں شروع ہوئی تھی مگر اس کا انجام نہایت مصیبت ناک ہوا، جس قدر لوگوں کو اس سازش سے کسی نہ کسی طور پر تعلق تھا اُن سب نے سوائے عبدالرحمٰن کے جس کے غارت کرنے کو وہ کھڑی کی گئی تھی، اُسے ناکام رکھنے میں اپنا اپنا حق ادا کیا، اولاد سرقسطہ کی باغی رعایا، عیسائی بشکنسیوں اور ملک سگسنی کے ایک رئیس ربعنی وڈیکنڈ نے جس کا نام تک امیر اندلس کو معلوم نہ ہوگا، جو فائدہ کی صورتیں پیدا کر دی تھیں، اُن سے نفع اُٹھاتے ہیں عبدالرحمٰن نے ... فوج لیکر سرقسطہ کی طرف چلا کہ اس شہر کو اپنا مطیع بنائے، سلیمان بن یقظان الاعرابی جو شارلمین کی پسپائی میں اُس کے ساتھ تھا اس اثنا میں سرقسطہ (۳۰۷
واپس آگیا تھا، لیکن عبدالرحمٰن جب یہاں پہنچا تو وہ زندہ نہ تھا، حسین بن یحییٰ انصاری نے اس کو ملحد و مرتد سمجھ کر سرقسطہ کی مسجد میں قتل کرا دیا تھا، عبدالرحمٰن نے آتے ہی شہر کا محاصرہ کر لیا، حسین نے امان مانگی، امیر عبدالرحمٰن نے اس کی درخواست منظور کی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد حسین نے پھر سر مخالفت بلند کیا، شاہی فوجوں نے پھر شہر کا محاصرہ کر لیا، اہل شہر نے تنگ آکر حسین کو امیر کے حوالے کر دیا، اور وہ امیر کے حکم سے ہلاک کر دیا گیا، سرقسطہ پر قبضہ کرنے کے بعد امیر نے بشکنسیوں پر حملہ کیا اور سرطانیہ کے قومس نگندو کو اپنا باجگزار بنایا، سب سے اخیر میں ابوالاسود محمد نامی سردار ... جس کے بیٹے شاہی فوجوں سے مقابلہ ہوا، ابوالاسود کے میمنہ پر جو سردار فوج تھا اُس نے دھوکا دیا، ابوالاسود کو شکست ہوئی اور چار ہزار آدمی اس

لڑائی میں گرگ و کرگس کا طعمہ بن گئے

اس طرح عبدالرحمٰن الداخل تمام لڑائیوں میں جو فی الحقیقت مجبور ہو کر اس کو اپنی رعایا کے مقابلہ میں لڑنی پڑی تھیں کامیاب ہو گیا، اُس کی یہ فتوحات ایسی تھیں کہ دشمنوں نے بھی اس کی تعریف کی، مثلاً بیان ہوا ہے کہ ایک روز عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے اپنے ندیموں سے پوچھا بتاؤ بادشاہوں میں صقرِ قریش ہے؟" ندیموں نے اس خیال سے کہ شاید خلیفہ خود اس لقب کو اپنے لیے پسند کرتے ہوں گے بلاتامل عرض کیا کہ "خود امیر المومنین بادشاہوں میں صقرِ قریش ہیں حضور نے شاہوں کو سرنگوں، بغاوتوں کو فرو، دشمن کو پامال اور فتنوں کو دور کیا" خلیفہ منصور نے فرمایا "نہیں یہ کچھ نہیں" ندیموں نے عرض کیا "تو پھر معاویہ بن ابی سفیانؓ یا عبدالملک بن مروان کو صقرِ قریش سمجھا جائے" منصور نے کہا "نہیں، یہ بھی نہیں، امیر معاویہ کے لیے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ راستہ صاف کر گئے تھے، اور عبدالملک کی حمایت پر ایک زبردست گروہ کمربستہ ہو گیا تھا، صقرِ قریش درحقیقت عبدالرحمٰن بن معاویہ ہے، یہ وہ شخص ہے جس نے یکہ و تنہا ایشیا اور افریقہ کے جنگلوں میں برسوں سرگرداں رہ کر محض اپنی ہمت سے بغیر اس کے کہ کوئی فوج یا لشکر ساتھ ہو سمندر پار ایک ایسے ملک میں بادشاہی حاصل کی جس سے کسی قسم کی واقفیت پہلے سے نہ رکھتا تھا، بجز اپنی عقل اور پامردی کے کسی کا سہارا اُس کو نہ تھا، باوجود اس کے اُس نے اپنے مغرور دشمنوں کو نیچا دکھایا، باغیوں کو غارت کیا، اور عیسائیوں کے مقابلہ میں اپنی سرحدوں کو مستحکم کیا اور ایک بڑی سلطنت کی بنیاد ڈال دی، اور ایسے ملک کو جو چھوٹے چھوٹے خودسر رئیسوں کے قبضہ میں آکر تقسیم ہو گیا تھا پھر متحد کر کے ایک ہی تخت و تاج کا مطیع بنا دیا، یہ باتیں کسی دوسرے سے بن نہ پڑی تھیں"۔ عبدالرحمٰن نے بھی اپنے ان حالات کو سچے غرور اور فخر کے ساتھ کسی موقع پر اشعار میں ظاہر کیا تھا۔

۲۰۸۱ پھر بھی اس غدار، ظالم، کینہ ورؔ، اور مطلق العنان بادشاہ کو اپنی تمام فتوحات بڑی قیمت

ؔ ذوزی کے ہاتھ میں قلم ہے اگر اس سے بھی سخت الفاظ عبدالرحمٰن کے لیے لکھتا تو کون ہاتھ پکڑنے والا تھا لیکن ایک وسیع النظر مورخ اور ایک منصف مزاج ناظرِ تاریخ کا فیصلہ یہی ہو گا کہ عبدالرحمٰن نے جس قدر قتل و خونریزی کی اور جتنی لڑائیاں اُس نے لڑیں، یہ سب کچھ اُس نے اس وقت کیا جبکہ اس کے سوا اور (باقی آئندہ صفحہ پر)

دے کر مول لینی پڑیں، یہ مانا کہ کسی عرب یا بربر سردار کو اتنی مجال نہ تھی کہ علانیہ امیر کے مقابلہ پر آتا مگر دل میں سب کڑھتے تھے، کوئی شخص جس کو اپنی عزت کا پاس ہوتا اُس کی ملازمت قبول نہ کرتا، ایک موقع پر جب اپنے ندیموں سے مشورہ کرنے لگا کہ قرطبہ کا قاضی کس کو مقرر کیا جائے تو اسکے دونوں لڑکوں سلیمان اور ہشام نے متفق الرائے ہو کر (یہ اتفاق رائے عمر بھر میں اسی موقع پر رہا تھا) مصعب کا نام تجویز کیا جو ایک سن رسیدہ اور نیک بخت بزرگ تھے، عبدالرحمن نے فوراً ان کو طلب کیا لیکن مصعب نے اس بات کا یقین کر کے کہ ایک ایسے بادشاہ تخت میں جو اپنی قوت کو قانون سے بالاتر سمجھے قضا کی خدمت قبول کرنے میں بجائے عدل گستری کے ظلم گستری کرنی ہوگی، اس خدمت سے انکار کر دیا، عبدالرحمن گوارا نہ کر سکتا تھا کہ کوئی شخص اس کی بات کو رد کرے، فوراً اپنی مونچھیں مروڑنے لگا، یہ علامت تھی کہ غیظ و غضب کا طوفان اب اٹھنے والا ہے، حاضرین دربار منتظر ہو گئے کہ اب کوئی دم میں امیر کی زبان سے مصعب کے قتل کا حکم نکلنے والا ہے اس موقع پر ایک عربی مورخ لکھتا ہے "مگر خدا نے امیر کے بُرے خیال کو پھیر دیا اور مصعب کی ضعیفی و بزرگی نے امیر کے دل میں خود بخود اس کی عزت پیدا کر دی اور امیر نے اپنے غصہ کو پی کر یا جہاں تک ہو سکا اُسے چھپا کر صرف اتنا جواب دیا "آپ جائیں، اور لعنت ہو ان پر جو آپ کو یہاں تک لائے"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کوئی چارہ کار ہی نہ تھا، اس نے جب بھی کسی کے خلاف تلوار اٹھائی مجبور ہو کر اٹھائی، اُسکے خلاف سازشیں کی گئیں اُس کے خلاف بغاوتیں کھڑی کی گئیں اُس پر فوج کشیاں کی گئیں، اُس کو معزول کرنے کیلئے ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا گیا اور اس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اپنوں اور غیروں نے کوشش اور سعی کا کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا، اب اہل انصاف بتلائیں کہ جب ان حالات سے مجبور ہو کر اس نے اپنے دشمنوں کے استیصال پر کمر باندھ لی، اور سر باغی و سرکش کو ہلاک کر دیا، تو کیا بُرا کیا، بغاوتوں اور سازشوں کو مٹانے کیلیے دنیا کا عادل سے عادل اور رحمدل بادشاہ جو کچھ کرنے پر مجبور ہوتا، وہی عبدالرحمن نے کیا، اور دنیا کا کونسا بادشاہ ہے جس نے بغاوتوں اور سرکشیوں کو فرو کرنے کے لیے قتل و خون ریزی سے کام نہ لیا ہو، پھر بیچارہ عبدالرحمن کیوں مورد الزام ہے؟ چند سطر اوپر ڈوزی کا یہ فقرہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ "اس طرح عبدالرحمن الداخل تمام لڑائیوں میں جو فی الحقیقت مجبور ہو کر اس کو اپنی رعایا کے مقابلہ میں لڑنی پڑی تھیں کامیاب ہو گیا۔" اس فقرہ میں ڈوزی خود تسلیم کرتا ہے کہ عبدالرحمن کی تمام جنگیں محض مجبوری کا نتیجہ تھیں، پس کیا مجبور ہو کر تلوار چلانے والا انسان "غدار، ظالم، اور کینہ ور" جیسے الفاظ کا مستحق ہو سکتا ہے؟ اگر کینہ ور ہوتا تو ابوالاسود کو ضرور قتل کروا ڈالتا۔ اسمٰعیل

عبدالرحمٰن کو دیکھنا پڑا کہ جن لوگوں نے تمام ضرورتوں کے وقت اس کو مدد دی تھی وہ ایک ایک کر کے اُس سے جُدا ہو گئے، اس کے اکثر موالی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اُن میں سے بعض نے جیسے عبداللہ بن خالد تھے ...... اُس راستے پر جو عبدالرحمٰن نے اپنے لیے نکالا تھا ساتھ چلنے سے انکار کر دیا، بعض کو اسکی طرف سے شبہ رہنے لگا، بیان ہوا ہے کہ جب ابوعثمان علیہ عبیداللہ کو اندیشہ ہوا کہ عبدالرحمٰن ان کو علیحدہ کر دے گا تو امیر کو اپنا ضرورتمند رکھنے کے لیے انھوں نے یہ ترکیب کی کہ جب خود اُن کے بھانجے وجیہ نے ایک فاطمی مدعی سلطنت کے فریق میں شامل ہو کر عبدالرحمٰن سے سرتابی کی تو اپنے اس عزیز کے معاون اور مددگار ہو گئے (اس امید میں کہ اس معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لیے امیر ان سے صلاح و مشورے کا محتاج رہے گا) لیکن جب وجیہ پر امیہ کا قابو چل گیا تو اس نے اس پر بہت سختی کی، اور باوجود ابوعثمان کی منت وسماجت کے اُسے قتل کر دیا، اس کے کچھ عرصے کے بعد ابوعثمان پر جھوٹ یا سچ یہ الزام لگایا گیا کہ امیر کے دو عزیزوں نے جو سازش اس کے انتزاع دولت کے لیے کی تھی اسمیں ابوعثمان بھی شریک تھے، لیکن امیر کو اس قدر ثبوت اُن کی شرکت کا نہ مل سکا کہ پورا یقین ہو جاتا، اس لیے ایک بڈھے آدمی کو جس کی بدولت تخت ملا تھا، محض شبہ پر قتل کرنے میں تامل ہوا مگر یہ کہا کہ "میں ابوعثمان کو ایسی سزا دونگا جو قتل سے بھی بدتر ہوگی" چنانچہ اُس دن سے پھر کبھی ابوعثمان سے بات نہ کی۔

۱۲۰۹. بدر جیسا وفادار خادم بھی آخر کار نظروں سے گر گیا، امیر نے اس کی جائیداد ضبط کر لی اور اسکو اسی کے گھر میں قید کر دیا، اس کے بعد جلاوطن کر کے شمالی سرحد کے کسی شہر میں بھجوا دیا، لیکن انصاف یہ ہے کہ بدر نے اپنے آقا کی وہ عزت کرنی جو ایک ملازم کا فرض ہے چھوڑ دی تھی، اور بلاوجہ شکایتوں اور گستاخانہ عرضیوں سے عبدالرحمٰن کو ستا ڈالا تھا۔

بڑے بڑے موالی سے ناراض ہونے کے بعد اب عبدالرحمٰن کو یہ دیکھنا پڑا کہ خود اسکے خاندان والے اسکے برخلاف سازش میں مصروف ہیں، امیر جس وقت اسپین کا مالک ہوا تھا تو بنی امیہ کو جو ایشیا اور افریقہ کے مختلف مقامات میں جا بسے تھے اپنے پاس بلوا کر ان کو دولت و درجات سے مالا مال کر دیا تھا، لوگوں نے عبدالرحمٰن کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ "سلطنت عطا کرنے کے بعد جو سب سے بڑی نعمت خدا نے مجھ کو بخشی

لہ ان میں ایک عبدالرحمٰن کا حقیقی بھتیجا عبیداللہ بن ابان بن معاویہ بن ہشام تھا، یہ زیدی کے نام سے معروف تھا اور دوسرا اُس کا چچازاد بھائی عبدالسلام بن یزید بن ہشام تھا (مترجم)

وہ یہ تھی کہ اپنے عزیز و اقارب کو رہنے کے لیے ایک پناہ کی جگہ دینے کے قابل ہو جاوں اور انکو ہر طرح
کا فائدہ بھی پہنچا سکوں، اور یہ دیکھ کر خوش ہوتا رہوں کہ ان کے دلوں میں میری عظمت ہے، جس کیلیے میں
صرف اپنے خدا کا احسانمند ہوں"۔ باوجود اس حسنِ سلوک کے یہ مروانی شہزادے حرصِ جاہ و منزلت
سے متاثر ہو کر اپنے افسرِ خاندان کی مطلق العنانی اور استبداد کو گوارا نہ کر سکتے تھے اور آپس میں اُس کے
انقطاعِ سلطنت کی سازشیں کرتے رہتے تھے، اسی قسم کی وہ سازش تھی جو دو مروانی شہزادوں اور
تین عربی سرداروں نے آپسمیں ملکر کی، مخبر نے اسکی اطلاع کر دی اور سب کے سب گرفتار ہو کر قتل کر دیے
گیے، اس کے چند سال بعد دوسری سازش مغیرہ بن ولید بن اُمیہ بن ہشام یعنی امیر کے حقیقی بھتیجے اور صمیل
کے لڑکے ہذیل نے ملکر کی، ہذیل اپنے باپ صمیل کے خون کا بدلہ، جسے گلا گھونٹ کر ہلاک کیا گیا تھا، لیے بغیر
کیونکر رہ سکتا تھا، یہ سازش بھی کھل گئی، اہلِ سازش سب گرفتار ہوئے اور قتل کر دیے گیے ان کے قتل کے
بعد امیر کا ایک ملازم خاص اُس کے پاس گیا تو کیا دیکھا کہ امیر سر نیچا کیے نہایت رنج و الم کی حالت میں
بیٹھے ہیں ملازم سمجھ گیا کہ آقا اس وقت کن خیالات میں غرق ہیں، یہ دوسرا چرکا تھا جو ان کو سرِ خاندان ہوتے
ہوئے اپنے ہی خاندان والوں سے پہنچا تھا، اور جسمیں عزیزوں کی محبت اور تعلقات کا خون کرنا پڑا تھا
ملازم بالکل خاموش اور نہایت ادب سے سامنے آکر کھڑا ہوا عبدالرحمٰن نے سر اونچا کیا اور کہا "ایسے عزیز بھی
کسی کے نہ ہوں گے جیسے میرے ہیں، میں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالکر جس وقت تخت حاصل کرنا چاہا
ہے تو اسوقت جتنا مجھکو اپنا خیال تھا اُتنا ہی ان لوگوں کا تھا، جب مجھکو اپنا مطلوب حاصل ہو گیا تو
میں نے اُنکو اس ملک میں بلایا اور اپنی دولت میں ان کو شریک کیا، اور اب جو کچھ خدا نے مجھکو دیا ہے یہ
مجھ سے چھیننا چاہتے ہیں، مگر خدا نے ان کو اس کفرانِ نعمت کی سزا دی کہ ان کی سازشیں مجھ پر کھولدیں، اگر
میں نے ان کی جان لی ہے تو اسی لیے کہ اپنی جان بچاؤں، لیکن پھر بھی میں کیسا بدقسمت ہوں، میں
اُن سے بدگمان ہوں اور انکو مجھ سے یہ سوءِ ظن ہے کہ میں اُن کو غارت کرنا چاہتا ہوں، اعتماد، بھروسہ، دل
کا سچا سچا حال ایک دوسرے پر ظاہر کرنا، یہ سب چیزیں ختم ہوئیں، کیا اب مجھ میں اور میرے بھائی ولید میں جو اس (۲۱۰
نالائق مغیرہ کا باپ تھا کوئی تعلق باقی رہے گا؟ جو صلۂ رحم مجھ میں اور اسمیں تھا وہ اس لڑکے کے قتل سے منقطع
ہو گیا، اب ایسے بھائی کے قریب رہنے سے مجھے کیونکر چین نصیب ہو سکتا ہے؟ میری آنکھیں اُس کی
آنکھوں سے کیونکر مل سکتی ہیں؟" اس کے بعد ملازم سے کہا "تم اسی وقت میرے بھائی ولید کے

پاس جاؤ امیری طرف سے عذر خواہی کرو، اور یہ پانچ ہزار دینار دیکر اس سے کہنا کہ اس ملک سے نکل کر جہاں چاہے (افریقیہ میں) جاکر آباد ہو جائے"۔ ملازم حکم بجالایا، ولید کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ فکر سے بالکل مُردوں کی سی صورت ہوگئی ہے، ملازم نے اسکی تسلی و تشفی کی، اور امیر نے جو دینار بھیجے تھے وہ دیکر جو کچھ امیر نے کہا تھا اُسے دہرایا، ولید نے ایک آہ سرد بھر کر کہا افسوس! دوسرے کے جُرم کی سزا مجھے دی جاتی ہے، اس باغی فرزند نے جو قتل ہوا، اور قتل کا سزاوار تھا مجھے بھی اپنے ساتھ تباہ کیا، لیکن میں نے سوائے اس کے کبھی نہ چاہا کہ بھائی کے خیمہ کے ایک گوشہ میں پڑا رہوں، اب جو حکم اُس نے دیا ہے وہ بجالاتا ہوں ہمارا فرض ہے کہ خدا کی مرضی کے سامنے گردن جھکا دیں"، اس کے بعد ملازم امیر عبدالرحمٰن کے پاس آیا اور کہا کہ ولید اسپین سے جانے کی تیاری کر رہے ہیں، جو باتیں ولید نے کی تھیں وہ بھی اس ملازم نے امیر کے سامنے بیان کیں، امیر نے حالتِ رنج میں مسکرا کر کہا "اس بھائی نے جو کچھ کہا وہ سب سچ کہا، مگر اسکی امید نہ رکھنی چاہیئے کہ اسکی ان باتوں سے میں دھوکے میں آجاؤں گا، یا اُسکے اصلی خیالات مجھ سے پوشیدہ رہیں گے، میں اُسے خوب جانتا ہوں، اس کا بس چلے تو میرے خون سے اپنی پیاس بجھانے میں ذرا تامل نہ کرے"

رؤساء عرب و بربر کی نظر میں مطعون، امراء سے بیزار، اور اہلِ خاندان سے دھوکا کھا کر اب عبدالرحمٰن کی تنہائی روز بروز زیادہ ہوتی گئی، حکومت کے شروع زمانہ میں جبکہ کم از کم قرطبہ کے باشندوں میں وہ ہر دلعزیز تھا، تو بے تکلف دارالامارت کے گلی کوچوں میں اکثر اکیلا پھرا کرتا تھا اور ہر کس و ناکس سے ملتا جلتا تھا لیکن اب وہ سب سے بدگمان تھا، ہر وقت اسکی طبیعت پر غصہ رہتا تھا اور اس حالت میں قصر سے بہت کم نکلتا تھا، اور باہر آتا بھی تھا تو بہت سے لوگ محافظ کے طور پر اُس کے ساتھ ہوتے تھے، جب جانبِ اور مغربی اندلس کے بربر نے بغاوت کی تھی، اُس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ تنخواہ دار فوجیں بھرتی کرکے رعایا پر اپنا رعب قائم رکھے، چنانچہ ملک کے بڑے بڑے رئیسوں سے غلام خرید کر اُن کو سپاہ میں شریک کیا، افریقیہ سے بربر کو بکثرت بھرتی کرکے چالیس ہزار کا ایک لشکر تیار کر لیا جس کے لوگوں کو امیر کی ذات سے وابستگی تھی مگر ملک کی خیر طلبی سے کوئی واسطہ نہ تھا۔

عبدالرحمٰن ہر وقت اِس فکر میں رہتا تھا کہ کوئی بہتر سے بہتر طریقہ ایسا نکالے کہ عرب اور بربر کو کسی نظم میں لے آئے، امن و عافیت سے رہنے، اور قانون کی پابندی کا اُن کو خوگر بنائے، اس

(۲۱۱) مقصد کے حصول میں اُس نے وہی تدبیریں کیں جو بعد کو یورپ کے بادشاہوں نے پندرھویں صدی

عیسوی میں فیوڈل ازم (FEUDALISM) یعنی سلحداری حکومت کو مٹا کر شاہی مطلق کے قائم کرنے میں کی تھیں، اب اسپین نے ناگزیر واقعات کے باعث جس بُرے حال میں اپنے تئیں پایا وہ افسوسناک تھا اور افسوسناک تھے وہ کام جو عبدالرحمٰن کے بعد اُس کے جانشینوں کو کرنے پڑے، بانی خاندان نے جس ریاستہ کی داغ بیل ڈالی تھی وہ اُس مطلق العنانی پر ختم ہوئی، جو تلوار کے زور سے قائم رہتی ہے یہ بالکل سچ ہے کہ کوئی بادشاہ عرب اور بربر کو سوائے اس طریقے کے اور کسی طریقہ سے مطیع نہ رکھ سکتا تھا اگر ظلم اور مطلق العنانی ایک جانب تھی تو بدنظمی اور بدعملی دوسری طرف، یہ ممکن تھا کہ عرب اور بربر کے متعدد قبائل علیحدہ علیحدہ جمہوری ریاستوں کی شکل میں قائم کر دیئے جاتے، اور یہ تمام ریاستیں جب شمال کے عیسائیوں سے مقابلہ کی ضرورت ہوتی تو متحد ہو جایا کرتیں، اگر ایسا ہوتا تو یہ طریقہ وہ تھا جو عرب اور بربر کی قدیم روایات کے مطابق ہوتا، لیکن مطلق العنان بادشاہی اِن دونوں قوموں کی طبیعت اور مزاج کے بالکل ناموافق تھی۔

اسناد

اخبار مجموعہ	ص ۹۱- ۹۸	نویری	ص ۱۱۴
ابن القوطیہ	ص ۱۳-۱۴ و ۱۸	ابن الخطیب (قلمی نسخہ P.)	ص ۲۱۴
ابن عذاری	جلد۲- ص ۵۲ ۶۴	خوشانی	ص ۲۰۴-۲۰۵
ابن الابار	ص ۵۴-۵۶	مقری	جلد۲- ص ۲۵-۳۴

[1] فیوڈل ازم (FEUDALISM) اس طرز حکومت کو کہتے تھے جس میں بادشاہ ملک کی تمام زمینیں ملک کے بڑے بڑے رئیسوں میں تقسیم کر دیتا تھا، اور اس کے معاوضہ میں ہر رئیس کیلئے لازمی ہوتا تھا کہ کچھ فوج اپنے خرچ پر اپنے پاس رکھے اور جس وقت بادشاہ کو اس کی ضرورت ہو تو فوراً اسے لے کر حاضر ہو، جب یورپ کے بادشاہوں نے دیکھا کہ اس طریقہ سے ملک کے روساء بادشاہ سے بھی زیادہ صاحب قوت ہوتے جاتے ہیں تو انھوں نے اس طرز حکومت کو مٹا تا چاہا رئیسوں کی قوت توڑ کر مختار اور مطلق العنان بادشاہ بن گئے (مترجم)

کتاب اوّل تمام ہوئی

کتاب ثانی

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

فصل اوّل

قوم قسیقوطِ (VISIGOTHS) کے دورِ حکومت میں اسپین کی حالت

یہاں تک ہماری توجہ فاتحوں کے حالات کی طرف مبذول رہی، اب کچھ حال مفتوحوں کی قسمت کا بھی لکھنا ضروری ہے۔ پس آئندہ ہم کو مفصلۂ ذیل امور سے بحث ہوگی:۔

(۱) ایسے حالات جنھوں نے مسلمانوں کے لیے اسپین کا فتح کرنا آسان کر دیا۔

(۲) اسلامی فتوحات کی ترقی کی مختصر کیفیت

(۳) فاتحوں نے ملک فتح کرکے وہاں کے عیسائی باشندوں کی کیا حالت پیدا کی؟

(۴) اسلامی حکومت کا اثر اُن متعدد مصیبت زدہ عیسائیوں پر کیا ہوا جو عیسوی حکومت میں غلام یا سرف کہلائے جاتے تھے

(۵) آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز (یعنی پہلی صدی ہجری کے آخر) کی کمزور عیسائی نسل

کے بعد جب ملک میں ایک طاقتور نسل پیدا ہوئی تو اُس نے فاتحوں کے مقابلے اور مخالفت میں مدت دراز تک جو کوششیں جاری رکھیں اُن کے مفصل حالات اِن مقابلہ کرنے والوں میں شہروں اور پہاڑوں کے لوگ دولت مند مالکان اراضی (مسلمان اور عیسائی دونوں) اور آزاد شدہ غلام شامل تھے، اور اِن مخالفانہ کوششوں میں عیسائی راہبوں کے مذہبی جوش اور پارسا عیسائی عورتوں کے صبر و استقلال نے کس طرح مدد پہنچائی۔

جس زمانے میں جزیرہ نمائے اسپین پر ملک گیری کی غرض سے مسلمانوں کی نظر پہلی بار پڑی تو اِس ملک کی کمزوری پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ اس کا فتح کرنا غنیم کے لیے بہت آسان ہے ملک میں سوسائٹی کا قصر بالکل بوسیدہ ہو کر گرنے کو ہو رہا تھا۔

یہ خرابیاں مدت سے چلی آتی تھیں، اسپین رومانی سلطنت کا ایک صوبہ تھا، لیکن آخری قیصران روما کے دور میں سلطنت روما کے اور حصوں کی طرح اس کی حالت بھی افسوسناک تھی، چنانچہ پانچویں صدی عیسوی کا ایک مؤرخ لکھتا ہے کہ "اسپین میں روما کو جو کچھ حاصل تھا وہ معدوم ہو چکا ہے صرف نام باقی ہے" حالت یہ تھی کہ ایک طرف تو وسیع علاقوں اور جائیدادوں کے مالک تھے جن کو لٹی فندی کہتے تھے، اور دوسری طرف ایک بے شمار انبوہ شہروں کے مفلس باشندوں، سرفوں اور غلاموں کا تھا، تمام دولت مند اور ایسے لوگ جن کو حکومت کی طرف سے مراعات حاصل تھیں، عامل اور مجسٹریٹ، بڑے بڑے عہدے دار، اور ایسے رئیس جن کو قیصر کی جانب سے اعزازی خطابات ملے ہوئے تھے ہر قسم کے محصول سے مستثنیٰ تھے اس وجہ سے محصولوں کا کل بار ملک کی متوسط الحال رعایا پر تھا، اور وہ اس کے بوجھ میں دبی مرتی تھی، یہ دولت مند لوگ، اور سرکاری حکام اور وسیع علاقوں کے مالک اور خطاب یافتہ رئیس بڑے پر تکلف اور عالیشان محلوں میں عیش کرتے تھے، اُن کے محل و قصر کسی خوشنما و پر فضا
۲۱۶ دریا کے کنارے ہوتے تھے، دریا کی سطح پر ان محلوں کے سرسبز باغوں اور تاکستانوں اور مرتفع زمین والے زیتون کے جنگلوں کا عکس پڑتا تھا، ان عشرت کدوں میں اِن امیروں کے دن قمار بازی، شناوری، شہسواری اور ضیافتوں میں بسر ہوتے تھے، محلوں کے عظیم الشان

کمروں میں جہاں ایران و آشور کے کارچوبی پردے پڑے ہوتے، غلاموں کے گروہ میزوں کو لذیذ کھانوں اور پرانی شرابوں سے آراستہ کرتے، حاضرین مسندوں پر تکئے لگائے برجستہ شعرگوئی میں مصروف ہوتے، سامنے مطربوں کے طائفے اور خوبصورت عورتیں ناچ گا نے سے ان کا دل خوش کیا کرتیں [1]

ملک کے خاص اور چیدہ لوگوں میں دولت کی یہ کثرت و نمائش، عام رعایا کی تنگدستی کو اور بھی نمایاں کرتی تھی، شہروں کے بدچلن اور شریر لوگ ایسے نہ تھے جن پر کسی کو رحم آتا، ملک کے اُمرا اُن سے ڈرتے اور اُن کی خوشامدیں کرتے اور غریب رعایا کا پیٹ کاٹ کر اُن کو غلّہ اور رسد مفت دیا کرتے، تماشا گاہوں میں خونریزی کے تماشے دکھا کر اُن کو مست رکھتے، لیکن جو رعایا متوسط الحال تھی جیسے اہل کوریا (ارکان مجلسِ انتظامی) یا برگس (تجارت پیشہ لوگ) شامل تھے اور شہروں کا انتظام اُن کے سپرد تھا، وہ سب رومانی سلطنت نے اس خیال سے کہ رعایا پر سختی نہ ہو، شہروں میں بلدیے (میونسپلٹیاں) قائم کر دیے تھے، لیکن یہ بلدیے خود زیادتیاں کرتے کرتے ظالم یا ظلم سہتے سہتے مظلوم ہو گئے تھے، قیصر قسطنطین کا زمانہ جب آیا تو اِس قیصر نے شہروں کی ایسی زمینیں اور جائیدادیں جن سے آمدنی تھی ضبط کر لیں، اور یہ ضبطی بھی اُس وقت عمل میں آئی جب وقت کہ ہر شہر کے مصارف اہل شہر کے مفلس ہو جانے سے بڑھ گئے تھے، پھر یہ قاعدہ جاری ہوا کہ کوریا (مجلس انتظامی) کا ہر ایک رکن جو صاحب مراعات نہ ہو، اور پچیس ایکڑ سے زیادہ اراضی رکھتا ہو، اُس کا فرض ہو گا کہ کوریا کی آمدنی میں محصول ادا کرنے والوں کے افلاس کی وجہ سے جس قدر کمی ہو جاتی ہو اُسے اپنی جیب سے بھرا کرے

پس اہل کوریا جو پچیس پچیس ایکڑ سے زیادہ زمینیں رکھتے تھے اور صاحب مراعات نہ

---

[1] اس زمانہ کے متمول اسپینیوں کی طرز معاشرت کے حالات کی کوئی شہادت براہِ راست نہیں ملتی، لیکن اس امر کے فرض کرنے کے لیے کافی وجہ موجود ہیں جو طرز معاشرت جنوبی اسپین کے دولت مندوں کی تھی، وہی اسپینیوں کی بھی تھی، دیکھو 13 x 1

ہوتے تھے، وہ اِس قاعدہ کی سخت ذمہ داریوں سے کسی طرح اپنی گلوخلاصی نہ کرا سکتے تھے، کیونکہ کوریا کی رکنیت موروثی اور قدیم ہو چکی تھی، اور اُس کے ارکان اپنی اپنی زمینوں اور جائیدادوں سے بالکل وابستہ تھے اس وجہ سے کہ بغیر قیصر کی منظوری کے وہ اپنی کسی جائیداد کو بیع یا رہن نہ کر سکتے تھے، قیصر اپنے آپ کو سلطنت کی کل زمینوں کا مالک تصور کرتا تھا، اور رعایا کی نسبت سمجھتا تھا کہ زمین کے متعلق وہ کسی قسم کے مالکانہ حقوق نہیں رکھتی، جو کچھ حق ہے وہ صرف زمین سے نفع اٹھانے کا ہے، ارکان بلدیہ بعض وقت ایسے تنگ آجاتے تھے کہ بلدیہ چھوڑ کر بھاگ جاتے یا فوج میں بھرتی ہو جاتے، یا کوئی ادنیٰ اسی ملازمت کر لیتے، لیکن حکومت کا فولادی پنجہ ایسا سخت اور حکومت کی نظر اتنی تیز تھی کہ فوراً ایسے فراریوں کا سراغ لگا لیا جاتا، اور اُن کو پکڑ کر پھر کوریا میں شامل کیا جاتا، اگر سراغ نہ ملتا تو ان کی جگہ مبتذل اور غیر صحیح النسب لوگ، بدعتی عیسائی، یہودی اور سزا یافتہ بدمعاش بلدیے کے رکن بنا دیے جاتے، غرض کوریا کی رکنیت جو کسی زمانے میں بڑے اختیار اور عزت کا منصب تھا اب ایک ایسا آلۂ تعذیب بن گیا جس سے لوگوں کو ذلیل کیا جاتا اور سزا دی جاتی تھی۔

کوریا والوں کے بعد باقی رعایا میں یا تو سرف تھے یا غلام، زراعت کے پیشے سے غلامی ابھی تک جدا نہیں ہوئی تھی، مگر یہ ضرور ہے کہ جب سے رومانی سلطنت قیصروں کے ہاتھ میں آئی تھی، سرف کی جماعت کو رفتہ رفتہ ترقی ہوئی تھی، جس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ زراعت پیشہ رعایا جو آزاد تھی تباہ ہو چکی تھی، اور کچھ وجہ وہ آسانیاں تھیں جو سرف لوگوں کے متعلق قواعد میں پیدا کر دی گئی تھیں، سرف آزادی اور غلامی کے بیچ میں ایک درجہ رکھتے تھے، اُن کی کاشتکاری کے قواعد پہلے تو رواج یا معاہدے پر مبنی ہوتے تھے، لیکن قیصر دیوکلیشین کے زمانہ میں امن و حفظِ سلطنت کے خیال سے سرف کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہو گیا تھا، اور حکومت کو ہمہ وقت اُس کی طرف متوجہ رہنا پڑتا تھا، تاکہ یہ کاشتکار اگر کھیت چھوڑ کر بھاگ جائیں تو ایسے لوگ موجود ہوں جو اُنکی جگہ کاشتکاری کر سکیں، یا اگر فوجوں میں بھرتی کی ضرورت ہو تو اُن کو بھرتی کیا جائے، اس لیے سرف کاشتکاروں کا انتظام ہی بالکل جدا کر دیا گیا تھا، اُن کا قانون بھی علیحدہ تھا اور پولیس بھی، بعض صورتوں میں سرفوں کی حالت جو زمین کے مالکوں کو اُس کی پیداوار کا ایک حصّہ ادا کیا کرتے تھے غلاموں سے

کسی قدر بہتر تھی، غلام قانونی طور پر شادی نہ کر سکتے تھے مگر سرف لوگ جائز طور پر از روے قانون شادی کر سکتے تھے، غلام زمین کے مالک نہ ہو سکتے تھے مگر سرف کاشتکار مالک ہو سکتے تھے ان کے آقا اُن کی جائیداد ضبط نہ کر سکتے تھے، لیکن بغیر آقا کی مرضی کے اُن کو اپنی جائیداد منتقل کرنیکا اختیار نہ تھا، قانون کی نظر میں اُن کی حیثیت غلاموں کی نہ تھی، وہ حکومت کو محصول براہِ راست ادا کرتے تھے، لڑائی کے زمانہ میں فوج میں بھرتی کیے جاتے تھے، لیکن جسمانی سزائیں چاہے غلام ہوں چاہے سرف دونوں کو دی جاتی تھیں اور کسی طرح کے سیاسی حقوق یا ایسے حقوق جو ایک آزاد شخص کو کسی حکومت میں حاصل ہوتے ہیں اُن کو نہ مل سکتے تھے، سرف لوگ در حقیقت کسی شخص کے نہیں بلکہ اُس زمین کے غلام ہوتے تھے جسے وہ کاشت کرتے تھے، ایسی زمین کے ساتھ اُن کے تعلقات موروثی اور اس درجہ لاینفک ہوتے کہ کسی طرح وہ اُس سے علیحدہ نہ ہو سکتے تھے، مالک اراضی زمین کو بغیر سرفوں کے اور نہ سرفوں کو بغیر زمین کے فروخت نہ کر سکتا تھا۔

سرفوں سے زیادہ خراب و خستہ حال غلاموں کے گروہ تھے، یہ مواشی یا خانہ داری کے اسباب کی طرح بلا تکلف فروخت کیے جا سکتے تھے، اُن کی تعداد اُن کے آقاؤں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی، حکیم سینیکا لکھتا ہے کہ " ایک زمانہ میں مجلس سینات میں اس بات کی تحریک ہوئی کہ جس قدر غلام ہیں وہ ایک ہی قسم کا لباس پہنیں تاکہ اُن میں اور دوسروں میں تمیز نہ ہو سکے، لیکن یہ تحریک منظور نہ ہوئی، اس بنا پر کہ اگر ایسا کیا تو کہیں غلام آقاؤں کی قلتِ تعداد کا اندازہ نہ کرنے لگیں۔" قیصر اگستوس کے زمانہ میں ایک آزاد شخص کے پاس اگرچہ مسلسل خانہ جنگیوں کی وجہ سے وہ تنگدست ہو گیا تھا چار ہزار سے زیادہ غلام تھے، رومانی سلطنت کے آخری زمانہ میں بھی اسپین میں غلاموں کی تعداد کم نہ ہوئی، ملکِ گال میں ایک عیسائی کے پاس پانچ ہزار اور ایک دوسرے عیسائی کے پاس آٹھ ہزار غلام تھے، غلاموں پر سختیاں بڑی ۲۱۸۱
بیرحمی سے کیجاتی تھیں، بعض وقت ایک آقا اپنے غلام کو تین سو کوڑے اس قصور پر لگاتا تھا کہ گرم پانی کے لیے اُسے انتظار کرنا پڑا، آقاؤں کے ہاتھ سے جو ظلم ہوتے تھے وہ تو ہوتے ہی تھے، لیکن غلاموں کے کاموں پر اُن کے افسر اور نگران کار جو بیرحمیاں کرتے تھے وہ بیان سے باہر ہیں، یہ افسر اور نگراں کار خود بھی غلام ہوتے تھے۔

غرض سوداگر ہوں یا تاجر، سرف ہوں یا غلام، حکومت کے جبر، آقاؤں کے تشدد، اور مالکانِ اراضی کے ظلم سے بچنے کے لیے آخری علاج یہی کرتے کہ گھر بار چھوڑ کر جنگل کو نکل جائیں اور وہاں رہزنی کا پیشہ اختیار کریں۔ جنگلوں میں پہنچکر یہ لوگ ابتدائی انسان کی طرح زندگی بسر کرتے اور جب موقع ملتا اپنے آقاؤں سے خوب جی کھول کر بدلہ نکالتے اور اُن کے عیش و آرام کے گھروں اور محلوں کو لوٹ لیتے، اور اگر کوئی دولت مند ان کے پنجہ میں گرفتار ہو جاتا، تو اُسے زندہ نہ چھوڑتے۔ یہ رہزن جن کو اسپینی زبان میں باگود کہتے تھے بعض اوقات گروہ بندی کر لیتے، اور پھر بہت سے گروہ مل کر ایک بھاری جمعیت قائم کر کے لوٹ مار کا ایک پورا لشکر بن جاتے، ایک مرتبہ فرانس میں قیصر ویرک لیتن کے زمانہ میں ان رہزنوں نے ایسی مہیب شکل اختیار کی کہ اُن کی سرکوبی کے لیے ایک بڑا لشکر بھیجنا پڑا۔

جس سوسائٹی کو افلاس اور مصیبت نے ایسا چھلنی کر دیا ہو، ضرور تھا کہ وہ غنیم کے پہلے ہی حملہ پر سرنگوں ہو جائے، عام رعایا کی کیفیت یہ تھی کہ ان کو اِس سے مطلق بحث نہ رہی تھی کہ فتح پا کر رومائیوں نے اُن پر ظلم کیے یا کسی اور قوم نے، صرف ایسے اُمراء جن کو خاص اختیارات و مراعات حاصل تھے، یا ایسے لوگ جو کثرت سے دولت رکھتے تھے، موجودہ رومانی سلطنت کے برقرار رہنے کی آرزو رکھ سکتے تھے، ان امیروں اور رئیسوں میں اکثر بدکاری و عیش پرستی سے ایسے بیکار ہو گئے تھے کہ اُن میں دشمن سے مقابلہ کی قوت اور ہمت باقی نہ رہی تھی۔

بہرکیف جب شمال کی وحشی قومیں رومانی سلطنت پر لوٹ پڑیں تو اسپین میں بعضے ہمت والے ایسے بھی نکلے جو ملک کی خیر خواہی یا کم از کم اپنی حفاظت کیلیے ہتھیار سنبھال کر کھڑے ہو گئے، چنانچہ شہر طرکونہ کے شرفاء نے فیسقوط کے سیلاب کو روکنے میں بہت کوشش کی اور ملک کو اِس دُشمنِ صعب سے بچانا چاہا، مگر تمام کوششیں بےسود ثابت ہوئیں، قیصر ہنوریان کے زمانے میں جب وحشی قوموں نے جن کے نام الان، وندل، اور سوئی وی تھے دریائے رائن عبور کر کے فرانس میں آگ اور تلوار کا طوفان برپا کیا اور اسپین کو بھی دھمکی دی تو یہاں کے اکثر لوگ بے پروائی اور کاہلی کے ساتھ اپنی قسمت کا لکھا دیکھنے کے منتظر ہو گئے مگر اس خطرے کو

ے انہی شمالی وحشی قوموں میں سے فیسقوط کی قوم بھی تھی

دور کرنے کی کوشش نہ کی، اسی زمانہ میں دو بھائیوں نے جو بڑے دولتمند اور شریف تھے، اور جن میں ایک کا نام ویدیموس اور دوسرے کا وریانوس تھا اپنے صرف کاشتکاروں کو ہتھیار دے کر جبل البرانس کی گھاٹیوں میں فیسیقوط کی لوٹ مار کو روکنا چاہا، ان پہاڑوں میں دشمن کا راستہ روک کر ملک کو بچانا مشکل نہ تھا، لیکن جب قیصر قسطنطین کے حکم سے یہ دونوں بھائی جو قیصر کو قیصر نہیں مانتے تھے گرفتار ہو کر قتل کر دیے گئے اور اسی قیصر نے ایک وحشی قوم ہنوری کی فوج تیار کی تاکہ دوسری حملہ آور وحشی قوموں کا سدِ باب ہو، اور اس فوج نے بجائے حفاظت کے خود ہی ملک کو لوٹنا شروع کیا، اور اس جرم کی سزا سے بچنے کے لیے اُن وحشی قوموں کے لیے اسپین کے دروازے کھول دیے جو اس وقت فرانس کو لوٹ رہی تھیں، تو ان تمام حالات میں ایک آدمی بھی اسپین میں ایسا نہ تھا جسے اپنے ملک کی حفاظت کا خیال پیدا ہوا ہو جب وحشی قوموں کا داخلہ ملک میں شروع ہو گیا اور اُس کا پیش آنا ناگزیر تھا تو اُمراءِ اسپین نے خطروں کو دل سے بھلانے کی یہ تدبیر کی کہ شرابیں پی پی کر بدمست ہو گئے تاکہ کسی بات کا ہوش نہ رہے، اِدھر دشمن شہر کے دروازوں سے داخل ہو رہا تھا، اور اُدھر یہ امیر رئیس شراب میں مخمور ناچ گانے میں مصروف تھے اور خوبصورت کنیزوں کے برہنہ شانوں کے بوسے اپنے لرزتے ہوئے لبوں سے لیتے تھے، عام رعایا کا یہ حال تھا کہ گویا کشت و خون سے طبیعت کو مانوس کرنے اور خون کی بُو دماغ میں بسا کر خون کا نشہ پیدا کرنے کے لیے تماشہ گاہوں میں بیٹھے شمشیر بازوں کا تماشہ دیکھتے تھے کہ انسان انسان کو کیونکر ذبح کرتا ہے، اسپین کے تمام شہروں میں سے ایک شہر بھی ایسا نہ تھا جس کے لوگ قلعہ بند ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے، جس شہر پر یہ وحشی چڑھ کر گیے اُس کے دروازے گویا آپ سے آپ کھل گئے اور وحشیوں کے گروہ شہروں میں بے روک ٹوک بغیر ہتھیار چلائے داخل ہوئے، خوب لوٹا، جلایا، مگر قتل سوائے ایسے موقعوں کے جہاں خونریزی کی پیاس بجھانے کی ضرورت ہوئی، کہیں نہیں کیا،

یہ زمانہ نہایت خوف اور خدشوں کا تھا، گو اِس دور کی نسلوں سے ہم کو کتنی ہی نفرت معلوم ہوتی ہو اس بنا پر کہ اُن میں نسائیت، بزدلی، اور زوال پذیری موجود تھی، لیکن پھر بھی ان کے حال پر رحم آتا ہے، رومانیوں کی مطلق العنانی گو ناقابلِ برداشت تھی، لیکن ان وحشیوں

کے جور وستم کے مقابلہ میں وہ کہیں بہتر تھی، قیصروں کے ظلم گو ظلم تھے مگر باقاعدہ اور ایک اندازے
اور اُصول کے مطابق تھے، لیکن یہ ٹیوٹن کی وحشی قومیں کسی چیز میں تمیز نہ کرتی تھیں، جو کچھ سامنے ۲۲
آتا اُسے غارت کر دیتی تھیں، تمام ملک پر تباہی و مصیبت کی ایک گھٹا چھائی ہوئی تھی، اور ان
مصیبتوں پر سب سے بڑھ کر آفات وبا اور قحط کی اور نازل ہوئیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ
فاقہ زدہ ماؤں نے اپنے بچوں کو مار مار کر اُن کا گوشت کھایا۔

جزائر بلارک، قرطاجنہ، اشبیلیہ کو قوم وندل نے خوب لوٹا، یہ اسپین کی خوش قسمتی تھی کہ ۴۲۹ء
میں وندل کی قوم اسپین سے نکل کر افریقہ چلی گئی، ان کے ساتھ الان قوم کے کچھ لوگ تھے جو
فیسقوط کی تلوار سے بچ گئے تھے، لیکن سوئی وی کی ظالم اور سفاک قوم جس کے لیے قتل و غارتگری
ایسی ہی ضروری تھی جیسے تن زندہ کے لیے سانس کا چلنا، اسپین میں آکر اُسکے شمال مغربی حصہ
میں جسے جلیقیہ کہتے تھے جم گئی، اور کچھ زمانہ کے لیے ملک کے جنوبی علاقہ بے ٹیکا اور قرطاجنہ کی بھی
مالک ہو گئی، اسپین کا کوئی قطعہ ایسا نہ تھا جو باری باری قوم سوئی وی کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق نہ
رہا ہو، لوسی تانیہ، طرکونہ، بے ٹیکا، غسقونیہ ان تمام اضلاع نے اس خونخوار قوم کے ہاتھوں طرح
طرح کے ظلم سہے، طرکونہ اور غسقونیہ کے علاقوں کی حالت نہایت ہی زبون تھی، رہزنوں کیساتھ
ہزارہا کاشتکار اور تباہ شدہ زمیندار شامل ہو گئے، اور ان علاقوں کو ہر طرف سے لوٹنا اور
غارت کرنا شروع کیا، یہ لوگ رومانیوں کی جان کے دشمن تھے، کبھی وحشی فوجکشوں کے دشمنوں
سے اور کبھی اُن کے دوستوں سے مل جاتے تھے، طرکونہ میں یہ رہزن ایک سردار کے تحت جس کا
نام باسل تھا پہنچے، اور وہاں وحشیوں کی ایک بڑی جماعت کو جس نے رومانیوں کی ملازمت اختیار
کر لی تھی اور اس وقت طرسونہ کے گرجا میں جمع تھی قتل کر ڈالا، کسی شخص کو یہاں تک کہ اسقف کو
بھی زندہ نہ چھوڑا، اس کے بعد باسل نے مع اپنی خونی فوج کے سوئی وی سے سازباز کر لیا، اور
اس کے ساتھ ہو کر سرقسطہ کے مضافات کو لوٹنا شروع کیا، اور شہر لاروہ پر دفعتہً حملہ کر کے تمام شہر
والوں کو گرفتار کر لیا۔

اس واقعہ کے پانچ برس بعد سوئی وی رومانیوں سے مل گئے، تاکہ رہزنوں کی اس فوج
کو کسی طرح نیست و نابود کر دیں جو باسل کی سرکردگی میں ملک کو غارت کیے ڈالتی تھی

جلیقیہ کے علاقہ کو بمقابلہ دیگر اضلاع اسپین کے سوئی وی قوم نے سب سے زیادہ تباہ و غارت
کیا تھا، یہی علاقہ ان کی حکومت کا مرکز، اور ان کے معرکوں اور کشت و خون کا دنگل تھا، ساٹھ
برس تک قتل و غارت کا بازار اِس قوم نے یہاں گرم رکھا، آخر کار اہل جلیقیہ کا صبر ختم ہوگیا، اور
اب انھوں نے وہ طریقہ اختیار کیا جو شروع سے اُنھیں اختیار کرنا چاہیے تھا، یعنی اُنھوں نے اپنے
تئیں مسلح کرلیا اور بڑے بڑے مضبوط قلعوں میں حفاظت کی غرض سے جا بیٹھے، کبھی کبھی سوئی وی
کے لوگوں کو پکڑ لیتے تھے، پھر اس قوم کے لوگوں سے گفتگو شروع ہوتی تھی اور یہ اپنے قیدیوں کے
عوض میں اُن کے قیدیوں کو رہا کردیتے تھے، یا حریفین ایک دوسرے سے ضمانت میں اُن
کے آدمی طلب کرتے تھے، کچھ دنوں کو امن ہوجاتا، لیکن پھر سوئی وی کوئی فساد اٹھا کر لوٹ
مار پر پل پڑتے، جلیقیہ کے لوگوں نے کوشش کی کہ فرانس کے رومانی گورنر، یا اسپین میں جس
قدر ملک رومانیوں کے تحت میں رہ گیا تھا اُس کے گورنر سے مدد مل جائے، لیکن اس میں
خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی آخر کار اب اِن وحشی قوموں میں آپس میں چل پڑی اور فسیقوط
نے سوئی وی پر حملہ کیا، اور سنہ ۴۵۶ء میں دریائے اوروبگو کے کنارے سوئی وی کو سخت ہزیمت
ہوئی، لیکن اس واقعہ سے جلیقیہ والوں کو بجائے سلامتی نصیب ہونے کے دوسرے خطروں (۲۲۱)
کا سامنا ہوا، فسیقوط نے براغہ کے شہر کو لوٹا مگر کسی کو قتل نہیں کیا اکثر شہر والوں کو غلام بنا کر ساتھ
لیا، گرجاؤں کو اصطبل بنایا اور پادریوں کے پاس جس قدر مال و متاع تھا یہاں تک کہ ان کے
کپڑے بھی سمیٹ کر چلتے ہوئے، جس طرح طرکونہ کے لوگ قزاق اور رہزن ہوگئے تھے، اسی
طرح اب براغہ کے لوگوں نے شہر چھوڑ کر لوٹ کا پیشہ اختیار کیا اور گروہ بندی کرلی، استورقہ
کے شہر میں فسیقوط نے اور بھی غضب ڈھایا، جب وہ اس شہر کے سامنے پہنچے تو ایک
ایسے فریق کو اس پر قابض پایا جو رومانیوں کی طرف سے دشمن سے لڑنے کو تیار تھا، فسیقوط
دوست بن کر شہر میں داخل ہوئے، اور جب وہاں پہنچ لیے تو یک لخت قتل عام شروع
کردیا، صدہا عورتوں، بچوں، اور پادریوں کو جن میں دو پادری اسقف کا درجہ رکھتے تھے
غلام بنا لیا، گرجاؤں کی قربانگاہیں توڑ دیں، گھروں میں آگ لگا دی اور گرد و نواح کے
ملک کو خوب لوٹا اور تباہ کیا یہی حال بلنتیہ کے شہر کا ہوا، پھر ان فسیقوط نے استورقہ کے

قریب ایک قلعہ کا محاصرہ کیا، لیکن اب جلیقیہ کے لوگوں میں مایوسی اور ناامیدی نے ایک قوت پیدا کر دی، اور انھوں نے قلعہ نشین ہو کر مدت تک کامیابی کے فسیقوط کا مقابلہ کیا

جب فسیقوط فرانس کو واپس گئے تو سوئی دی نے لوٹ مار شروع کر دی، الک کے شہر میں ان کا ایک گروہ مجلس بلدیہ کے بڑے کمرہ میں گھس پڑا یہاں بلدیہ کے ارکان بے خوف و خطر اجلاس کر رہے تھے، جان کا خوف اس لیے نہ تھا کہ یہ ہفتہ "آلام مسیح" کا تھا جس میں کشت و خون سے پرہیز کیا جاتا تھا، لیکن سوئی دی کو اس کا کچھ لحاظ نہ ہوا، اور سب کو قتل کر ڈالا، قلمریہ کے شہر میں سوئی دی کے ایک دوسرے گروہ نے عہد نامے کے خلاف وہاں کے کل باشندوں کو گرفتار کر کے غلام بنا لیا، اس تمام فتنہ و فساد کے بعد انجام یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کل اسپین پر فسیقوط کا قبضہ ہو گیا، ملک والے ملک کی دو تہائی زمین سے محروم ہو گئے لیکن ان نئے آقاؤں یعنی فسیقوط کی حکومت کو سوئی دی کے ظلم اٹھانے کے بعد بہت غنیمت سمجھا،

ان بیشمار مصائب اور زوال معاشرت کے زمانہ میں صرف ایک گروہ انسانی ایسا تھا جس نے کبھی ہمت نہ ہاری جس نے پرانی دنیا کے غارت ہونے کو کچھ زیادہ نظر افسوس سے نہ دیکھا جس نے اپنے ہم قوم رومانیوں کے مقابلہ میں وحشی قوموں کی طرف داری ظاہر کی، یہ انسانی گروہ کون تھا؟ یہ گروہ فرقہ سنت اوگستائن کے چیدہ و منتخب رومن کیتھولک پادریوں کا تھا وحشی قوموں کے حملے جس زمانہ سے شروع ہوئے تھے اسی زمانہ سے اس جماعت کی کوشش تھی کہ فاتحوں کے ظلم و تشدد کو کم کر کے دنیا کے سامنے بیان کرے، یہ لوگ آفات و آلام کے اس بحر ناپیدا کنار کو ایک قسم کی وحشیانہ تسکین اور خوشدلی سے ملاحظہ فرماتے رہے، اسقف ہیو کا ایک شاگرد تھا جو اسپین میں قسیس کا درجہ رکھتا تھا، اس کا نام پولوس اوروسیوس تھا، اور تاریخ میں اپنی ایک کتاب استاد ہیو کے نام سے معنون کر چکا تھا، اور وحشی اقوام الان، سوئیوی اور وندل کے حملوں اور لشکر کشی کا شاہد بھی رہ چکا تھا، اس کتاب میں اس نے ایک موقع پر اپنا (۲
یقین ظاہر کیا ہے کہ وحشی قومیں جس وقت جزیرہ نمائے اسپین میں آباد ہو گئیں، اور ملک کو باہم تقسیم کر لیا، تو پھر انھوں نے اس ملک کے ساتھ دوستوں اور خیر خواہوں کا سا برتاؤ کیا

ؔ وہ ہفتہ جس میں عیسائیوں کے عقائد کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام مصلوب ہوئے تھے (مترجم)

جس زمانہ میں تسیس نے یہ خیال لکھا تھا یعنی تقریباً ۴۱۷ء میں، اُس زمانہ کی نسبت بیان کرتا ہے کہ اسپین میں خاص اِس ملک کے لوگ ایسے موجود تھے جو وحشیوں کی حکومت میں افلاس اور آزادی سے رہنے کو رومانیوں کی حکومت میں رہنے سے بہتر سمجھتے تھے جہاں محصول نہایت سختی سے وصول کیے جاتے تھے"۔ ایک اور پادری مارسیلز کے رہنے والے نے جس کا نام سلویانوس تھا، بیس[20] تیس[30] برس کے بعد جو کچھ لکھا وہ اِس سے بھی زیادہ تھا، اُس نے وحشیوں کی تعریف کی ہے، پرلورس اوروسیوس نے تو کچھ ہی لوگوں کا یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ وہ وحشیوں کی حکومت کو رومانیوں کی حکومت سے بہتر سمجھتے ہیں، مگر سلویانوس نے اس کو تمام اہل اسپین کا خیال ظاہر کیا، اِس خیال کو تمام اہل ملک سے منسوب کرنے کے برابر کوئی چیز خلافِ قدرت وخلاف قیاس نہیں ہو سکتی، اور اسی طرح سلویانوس کے بیان کے برابر بھی کوئی دوسرا جھوٹ نہیں ہو سکتا، حقیقت اُس کے بیان کے برعکس تھی، اور ہمیں بنی نوع انسان کی عزت کا پاس کر کے یہ لکھنا ضروری ہے کہ روما کی رعایا میں قومی عزت کا خیال ہرگز اس درجہ پست و کمزور نہ ہوا تھا کہ وحشیوں کی حکومت کو رومائیوں کی حکومت پر ترجیح دیتے، اس کے علاوہ یہ رعایا بخوبی تجربہ رکھتی تھی کہ جو تکلیفیں ان وحشیوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی ہیں وہ روما کی مطلق العنان سلطنت میں کبھی نہیں اٹھانی پڑی تھیں، گو یہ رعایا اس قدر کمزور اور پست ہمت تھی کہ وحشیوں کی حکومت کا جوا اپنے کندھے سے نہ گرا سکی مگر اس میں اتنی غیرت موجود تھی کہ وہ ان وحشی فرجکشوں سے دلی نفرت وکراہت رکھے، سیڈونیس اپولیناریس نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ "آپ تو ان وحشیوں کے صرف شریر لوگوں سے بچنا چاہتے ہیں اور میں ان کے اچھے لوگوں سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں" حقیقت میں اہل اسپین کے قومی خیال کو جس قدر یہ قول سچائی سے ظاہر کرتا ہے وہ پادریوں کے اقوال نہیں کرتے جو وحشیوں کے حملے کو خدا کی برکت سمجھ کر بیان کرتے تھے، لیکن باوجود اس کے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے بیانوں کے لیے پادری اپنے نزدیک معقول عُذر رکھتے تھے، اوّلاً تو اُن کے دل میں انسانی ہمدردی یا مروت کا کوئی خیال ایسا نہ تھا جو اُن کو ایسی باتوں سے روکتا، دوسرے اُن کے لیے قوم کی محبت ایک بے معنی چیز تھی، دُنیا میں ملک کی محبت اُن پر کوئی اثر نہ رکھتی تھی کیونکہ اُن کا آبائی ملک آسمان تھا، رحم اُن کے دلوں سے زائل ہو چکا تھا، لُوٹ بلکہ قتل عام تک

اُن کے قلب پر اگر کچھ اثر کرتا تھا تو وہ بہت خفیف ہوتا تھا، پادری اور ڈیوس بادلِ ناخواستہ
اس امر کا اعتراف کرکے کہ قوم سوئی وی اور اس کے اتحادیوں سے کہیں کہیں قتل عمل میں آیا تھا
پوچھتا ہے کہ " ایک عیسائی کی بڑی تمنا حیاتِ جاوید حاصل کرنے کی ہوتی ہے اُس کو اس سے
کیا مطلب کہ کب اور کس طرح اِس دنیا سے رخصت ہونا پڑے گا"
پادریوں کے لیے سوائے کلیسہ کے نفع نقصان کے اور کوئی چیز قابل توجہ نہ تھی، ہر ایک
سیاسی واقعہ کو محض اس نظر سے دیکھتے تھے کہ آیا اِس سے کلیسہ کو کوئی فائدہ پہنچے گا یا ضرر
حامیان دین مسیحی کی حیثیت سے بُت پرستوں ہی کی تردید اُن کا بڑا فرض نہ تھا، بلکہ بہت سے
ایسے عیسائیوں کو ہدایت کرنا بھی ضروری تھا جو ابھی تک حلقۂ نصرانیت میں کافی طور پر شامل نہ (۲۲
ہوسکے تھے، اور کہتے تھے کہ روما کی سلطنت پر جس قدر مصائب آئے ہیں وہ قدیم بت پرستی سے غفلت
کرنیکی وجہ سے آئے ہیں، اُن کو یہ بھی دعویٰ تھا کہ عیسائیت نے روما کی قوت و اقتدار کو نقصان پہنچایا
ہے اگر عیسائیت شائع نہ ہوتی تو روما کے پرانے دیوتا اس کی حفاظت و صیانت کرتے، اِن بدعقیدہ
لوگوں کو پادری یہ جواب دیتے تھے کہ روما اب سے نہیں ہمیشہ سے بدقسمت رہا ہے، اور موجودہ
خرابیاں ایسی سخت نہیں ہیں جیسی کہ وہ بیان کی جاتی ہیں، علاوہ اس کے یہ پادری اس حقیقت کو
خوب سمجھ گئے تھے کہ ایسے نئے خیالات کو جیسے کہ دین مسیحی کے اصول تھے ذہن نشین کرنے کے
لیے ایسی زمین کی ضرورت ہے جسمیں پہلے کوئی بیج نہ پڑ چکا ہو۔
بہرکیف رومانی شرفاء پر پادریوں کا قابو نہ چل سکا، یہ شرفاء عیسائی ہوگئے تھے مگر محض
اس خیال سے کہ عیسائی مذہب سلطنتِ روما کا سرکاری مذہب ہوچکا تھا، بدکاری اُن میں اِس
قدر بڑھی ہوئی تھی کہ وہ عیسائی مذہب کے سخت قواعدِ اخلاق کے متحمل نہ ہوسکتے تھے، اور ان کی
طبیعتیں اس قدر شکی واقع ہوئی تھیں کہ اصول نصرانیت کا معتقد ہونا اُن کے لیے ممکن نہ تھا، یہ
رومانی شرفاء محض ضیافتوں، تماشوں اور لہو و لعب کے لیے دنیا میں پیدا ہوئے تھے، اور بقاءِ
روح تک سے اُنھیں انکار تھا، پادری سلویانوس دینی غیرت سے متاثر اور خشمگین ہوکر کہتا ہے کہ
یہ بیدین " گھوڑ دوڑ کے میدان کو خدا کے کلیسہ سے بہتر جانتے ہیں، گرجاؤں سے نفرت اور تماشا
گاہوں سے الفت رکھتے ہیں، ہر مخلوق کی قدر و قیمت اُن کے دل میں ہے مگر نہیں ہے تو خالق

کی جسے وہ ذلیل و حقیر جانتے ہیں، مذہب کی باتوں کی ہنسی اڑاتے ہیں۔" لیکن وحشیوں کے اخلاق اور چال چلن پر نظر کیجیے تو وہ رومانی شرفا و امرا سے بہتر نہ تھے، پادری معترف ہیں کہ وہ بھی رومانیوں کی مثل انصاف کا خون کرنے والے، طامع، فریبی اور غاصب تھے، کیونکہ کسی کا یہ قول بالکل درست و بجا ہے کہ جب کوئی قوم زوال پذیر ہونے کو ہوتی ہے تو اس کے عیوب بھی وحشیوں ہی کے سے عیوب ہو جاتے ہیں۔" لیکن یہ وحشی قومیں گو نیکی نہ رکھتی تھیں مگر پادری جو کچھ اُن کو بتاتے اور سکھاتے تھے اُس کا یقین تو کر لیتی تھیں، یا یہ سمجھیے کہ ان وحشی قوموں کی طبیعتیں قدرتی طور پر مذہب پرست تھیں، جب کوئی خطرہ پیش آتا تھا تو اُن کے لوگ سوائے خدا کے کسی دوسرے سے دُعا نہ مانگتے تھے، جنگ شروع ہونے سے پہلے اُن کے بادشاہ ٹاٹ کا جبہ پہن کر خدا کے سامنے جھکتے تھے، یہ کام ایسا تھا کہ رومانی فوج کا کوئی سپاہی دیکھتا تو بے اختیار ہنسی آنے لگتا، جب لڑائی میں فتح ہوتی تو وہ سمجھتے کہ خدا کی مدد شامل حال تھی، اس کے علاوہ پادریوں کی دل سے عزت کرتے تھے، نہ صرف اپنے ایریوسی فرقے کے پادریوں کی بلکہ رومن کیتھولک پادریوں کی بھی عزت اُن کے دل میں تھی، درآنحالیکہ رومانی اِن کیتھولک پادریوں سے نفرت کرتے اور کیتھولک کے نام پر ان کا مضحکہ اُڑاتے تھے، اس صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان وحشیوں نے پادریوں کو اپنا ہمدرد بنالیا، یہ وحشی قومیں ایریوسی عقائد کی عیسائی تھیں، پادری اس بات کو جانتے تھے مگر یہی سمجھتے تھے کہ یہ خامی ناقص معلمان مذہب کے ملنے سے پیدا ہوئی ہے، ان کو کیتھولک عیسائی بنانے کی طرف سے مایوس نہ ہونا چاہیئے، اور جب ان کو کیتھولک عیسائی بنالیا تو پھر کلیسہ کے حق میں کیسا عروج و اقبال کا زمانہ آجائے گا۔

رومانی سلطنت کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں ان دور اندیش کیتھولک پادریوں کی آرزوئیں (۱۴۲۲)
پوری نہ ہوئی ہوں، بالخصوص اسپین میں یہ آرزو سب سے زیادہ اس وقت پوری ہوئی جبکہ ۵۸۶ء میں ریکارڈ (رمذریق) اور اُس کے ہمراہی فسیقوط نے ایریوسی نصرانیت ترک کر کے رومن کیتھولک مذہب قبول کیا۔[1] اُس دن سے ان خدامِ کلیسہ نے فسیقوط کی وحشت دُور کرنے

[1] طلیطلہ کی تیسری مسیحی مجلس ۵۸۹ء میں منعقد ہوئی تھی، اس مجلس نے ایریوسی نصرانیت کو ترک کرنیکا قطعی حکم دیدیا

اور اُن کو تہذیب و شائستگی سکھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا، یہ قوم اسپین میں قدم رکھنے سے پہلے ہی رومانی صوبجات میں پچاس برس تک قیام رکھنے کے باعث آدھی رومانی ہو گئی تھی، اور تہذیب و تمدن کے فوائد سے متاثر ہونے کی قابلیت اُس میں پیدا ہو چکی تھی، وہ منظر بھی عجیب ہوگا کہ وحشی قومیں جو کبھی جرمانیہ کے جنگلوں میں درندوں کی طرح پھرتی تھیں، اب اُن کی اولاد پادریوں کی شاگرد بن کر تحصیلِ علوم میں سرگرم ہے، فیسقوط بادشاہ ریکسوونتھ کا ایک عجیب خط اسقف سرقسطہ براُلن کے نام کا اب تک موجود ہے، اس خط میں بادشاہ نے اسقف کا شکریہ ادا کیا ہے کہ بادشاہ نے اپنی تالیف کا جو مسودہ بھیجا تھا اُس میں اسقف نے مہربانی سے اصلاح دے دی اور مسودہ میں جو غلطیاں یا فروگذاشتیں تھیں وہ کاتبوں کی غفلت کی وجہ سے ہوئی تھیں، مگر ان اسقفوں نے بادشاہوں کے دل و دماغ کی تربیت اور اصلاح ہی پر بس نہیں کی، بلکہ وضع قوانین اور ملک کے انتظام کے اختیارات بھی اپنے قبضہ میں کر لیے اور کلیسائی کاغذات میں اپنی نسبت یہ تحریر فرما دیا کہ ہم خداوند یسوع مسیح کے حکم سے قوم کے محافظ مقرر ہوئے ہیں۔

جس وقت طلیطلہ میں یہ پادری کونسل میں اجلاس کرتے ہوتے، تو بادشاہ مع اپنے درباریوں کے ان کے سامنے حاضر ہو کر زمین پر گھٹنے ٹیک کر کھڑا ہوتا، اور بہت سی آہوں اور اشکوں کے ساتھ درخواست کرتا کہ یہ بزرگانِ دین خدا کی جناب میں اس کی سفارش کریں، اور ملک کی بہتری کے لیے عمدہ قوانین وضع کریں، جس وقت پادری ان بادشاہوں کو ہدایت کرتے تھے کہ پرہیزگاری اور عبادت اُن کے لیے سب سے بڑی نیکی ہے تو بادشاہ اس بات کو خوب سمجھتے تھے کہ ساری پرہیزگاری اور عبادت اسی میں ہے کہ پادریوں کی اطاعت ہمیشہ جاری رہے، اور عیاش سے عیاش بادشاہ بھی سر جھکا کر اس بات کو برداشت کرنے کہ ملکی معاملات میں کلیسہ کی ہدایت پر ہمیشہ عمل کرتا رہے۔

اس طرح ملک میں ایک نئی جماعت (یعنی پادریوں کی جماعت) صاحبِ قوت پیدا ہو گئی اور اُس نے اور تمام قوتوں کو اپنی ذات میں مجتمع کر لیا، معلوم ہوتا تھا کہ یہ جماعت تمام اخلاقی اور آئینی انتظامات کو از سرِ نو زندگی بخشے گی، سب لوگ قدرتی طور پر اس کی طرف اس خیال سے

مائل ہوئے کہ اُن کی تکلیف کو وہ کم کرے گی، جس وقت تک ایریوسی نصرانیت کو فروغ رہا، رومن
کیتھولک پادری غریبوں پر اس طرح مہربان رہے جیسے والدین اولاد پر ہوتے ہیں، اُن کے لیے
شفاخانے کھولے، چنانچہ سہر مارِدہ کے اسقف ماسونیوس نے اپنے کلیسہ کے سرفوں کو اس قدر (۲۲۵)
روپیہ دیا کہ عید فسح کے جلوس میں یہ لوگ ریشمیں کپڑے پہن کر نکلتے ہوتے وقت یہ اسقف اپنے ایسے
غلاموں کو جو ہمیشہ وفادار رہے تھے آزاد کر گیا، اور ان کی گذر اوقات کے لیے بہت سا مال بھی وقف
کر گیا، اس بات کا بہت بھروسہ کے ساتھ یقین کیا جا سکتا تھا کہ یہ پادری غلامی کے رواج کو یک لخت
مسدود کر دیں گے، کیونکہ یہ رواج لفظاً نہیں تو معناً ضرور منشا اناجیل کے خلاف ہے اس مسئلہ
پر کہ غلامی ناجائز ہے اُس زمانہ میں جبکہ پادریوں کو قوت حاصل نہ تھی وہ بڑے زور شور سے وعظ
کرتے رہے تھے، اس لیے خیال کیا جاتا تھا کہ جب اُن کو قوّت حاصل ہو جائے گی تو وہ اپنے
قول پر عمل کر کے غلامی کا سدِ باب کر دیں گے۔

لیکن ایسا خیال کرنا فاش غلطی تھی، جس زمانہ میں پادریوں کو قوت حاصل نہ تھی، اور لوگ
اُن سے نفرت کرتے اور اُن پر ظلم کرتے تھے، اُس وقت البتہ غلامی کے رواج کو بند کرنے کے لیے
وہ بڑے بڑے اصول بیان کرتے رہے لیکن جب اُن کو اختیارات حاصل ہو گئے تو انھوں نے
ان اصولوں سے انکار کر دیا، جب وہ بڑے بڑے علاقوں کے مالک ہوئے جن میں ہزارہا سرف
کاشتکار آباد تھے، اور عالیشان قصر رہنے کو ملے، جہاں کثرت سے غلام خدمت کے لیے حاضر
رہتے تھے تو یہ پادری کہنے لگے کہ آزادیٔ غلامی کے اصول ہم نے قبل از وقت رائج کرنے چاہے
تھے حقیقت میں ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ سرف آزاد کیے جائیں، اور شاید ابھی صدیوں تک ایسا
وقت نہ آئے، پلوسیوم (فرما) کے اسقف السیدور نے صحرا میں بیٹھے ہوئے حیرت ظاہر کی
تھی کہ عیسائی ہو کر کوئی شخص کیسے کسی کو غلام بنا کر اپنے پاس رکھ سکتا ہے، لیکن اسی نام کا ایک
اور پادری تھا جو اشبیلیہ کا اسقف تھا، اور طلیطلہ کی مسیحی مجلسوں کی روح رواں سمجھا جاتا تھا، اور
اٹھارہ دینی مجلسوں میں آبائے مسیحی نے "جلال کلیسائے جاثلیق" کے لقب سے اُسے یاد کیا تھا مگر یہ
پادری مسئلہ غلامی پر جب لکھنے بیٹھا تو اپنے ہمنام اسقف پلوسیوم کا قول نقل نہیں کیا بلکہ حکمائے
سلف میں سے ارسطاطالیس اور قصرو کے اقوال نقل کرنے لگا، ارسطاطالیس کا قول تھا کہ

فطرت نے انسان میں بعض کو حکم دینے کے لیے اور بعض کو حکم بجا لانے کے لیے پیدا کیا ہے" ارقصرو
کا قول تھا کہ "ایسے لوگوں کو دوسروں کا محکوم رہنا چاہیے جو خود اپنے اوپر حکومت کرنے کے لیے
وضع نہیں ہوئے" اسقفِ اشبیلیہ بھی یہی لکھنے لگا، مگر اس میں خود اس نے اپنی تردید کی
کیونکہ ایک جگہ اُس نے یہ بھی لکھا تھا کہ "سب انسان خدا کی نظر میں ایک سے ہیں، اور آدم
کا گناہ جس نے غلامی پیدا کی مسیح کے کفارے سے مٹ چکا ہے" ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ
پادریوں پر ہم کوئی الزام لگائیں کہ انھوں نے غلامی کو آزاد نہیں ہونے دیا، یا ایسے لوگوں سے کوئی
محاکمہ کریں جن کی رائے تھی کہ غلام ابھی آزادی کے لائق نہیں ہیں، ہم اس بحث کو محض اس بیان
واقعہ تک جس سے بہت سے اہم نتائج پیدا ہوتے ہیں محدود رکھتے ہیں کہ پادری اپنے قول پر
ثابت قدم نہ رہے، اور غلاموں کے دل میں جو امید انھوں نے پیدا کر دی تھی اس کے ایفا کی
کوئی صورت نہ نکال سکے ان لوگوں کے صاحب اقتدار ہونے پر سرف لوگوں کی حالت پہلے سے
بھی زیادہ خراب ہو گئی فسیقوط مثل دیگر وحشی قوموں کے جو رومانی قلمرو کے حصوں میں آباد تھیں (۲۲۶)
کاشتکاروں سے سرکاری بیگار کے طریقہ پر خدمت لیتے تھے، ایک عجیب دستور جس کے بانی
لاعلم تھے یہ ہو گیا تھا کہ غلاموں کے خاندانوں میں سے ہر خاندان کے ذمے آقا کے خاندان کی
ایک خاص خدمت پشتہا پشت سے مخصوص ہو گئی تھی، مثلاً غلاموں کے ایک خاندان کے
ذمے تھا کہ ہل چلانے والے آقا کے خاندان کو ہمیشہ مہیا کرتا رہے، اسی طرح کسی غلام خاندان کو
ماہی گیر، کسی چرواہے، کسی کو لوہار، کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ آقا کے خاندان کو پیش کرتے ہوتے
تھے، کوئی غلام یا سرف بغیر اپنے آقا کی اجازت کے شادی نہ کر سکتا تھا، اور اگر ایسا کرتا بھی تو شادی
کالعدم تصور کی جاتی تھی، اور شوہر بیوی سے زبردستی جدا کر دیا جاتا تھا، جب کسی سرف یا غلام
کی شادی کسی دوسرے مالک کی سرف عورت یا لونڈی سے ہوتی تو جس قدر اولاد اُن سے پیدا
ہوتی، وہ دونوں مالکوں میں تقسیم کر لی جاتی، اس معاملہ خاص میں فسیقوط کا قانون رومانی سلطنت کے
قانون سے کچھ کم بے رحمی کا نہ تھا، کیونکہ قیصر قسطنطین نے حکم دے رکھا تھا کہ شوہر سے بیوی، باپ سے
بیٹا، اور بہن سے بھائی جدا نہ کی جائے، جب ہم فسیقوط کے ان متعدد اور سخت قوانین پر غور
کرتے ہیں جو انھوں نے سرف یا غلام کے بھاگ جانے کے متعلق نافذ کر رکھے تھے، تو مقیاس

چاہتا ہے کہ فیسقوط کے دور حکومت میں رعایا کی حالت بہت مصیبت کی ہوگی آٹھویں صدی عیسوی میں اکثر اس کے تمام غلاموں اور سرفوں نے جن کی مصیبتیں اب یہاں وہی تھیں جو پہلے اسپین میں پیش آچکی تھیں اپنے فیسقوط آقاؤں کے برخلاف بغاوت کردی

پادری نہ تو سرف لوگوں کی حالت کو بہتر کرسکے، اور نہ اُس رعایا کی حالت کو جو متوسط الحال تھی، برگر یعنی اوسط درجے کے لوگ بدستور زمین سے وابستہ ہے، علاوہ بریں شہر کا کوئی آدمی اپنی جائیداد فروخت کرنے کا حق نہ رکھتا تھا ملک کا مالی انتظام فیسقوط کے زمانہ میں وہی رہا جو رومانیوں کے عہدِ حکومت میں تھا ملک کے مالیہ کے متعلق جو طور و طریقہ قیصرانِ روما نے اختیار کیا تھا وہی قوطی بادشاہوں کی طرف مع دیگر رومانی روایات کے منتقل ہوگیا، اور معلوم ہوتا تھا کہ شاگرد استاد سے بڑھ جائیں گے، متوسط الحال رعایا کی تباہ حالت میں کچھ کمی نہ ہوئی، گو مذہبی مجالس اس کی مقر تھیں کہ رعایا کی حالت خراب ہے۔

رومانیوں کے زمانہ کی تمام خرابیاں یعنی ایک خاص جماعت میں کل دولت کا جمع ہوجانا غلامی کا رواج ایسی کاشتکاری کا عام ہونا جس میں کاشتکار کا ناتا زمین سے کسی طرح نہ ٹوٹ سکتا تھا جائداد کا ناقابل انتقال ہونا، غرض یہ کل خرابیاں اب تک موجود تھیں اُدھر ان پادریوں سے جو مسیح کی طرف سے اپنے تئیں رعایا کا پاسبان سمجھتے تھے، اتنا بھی نہ ہوسکا کہ جو حالت انھوں نے آنکھ کھولتے ہی دیکھی تھی اُسی کو رہنے دیتے، نہیں، ان میں تعصب کی ایسی زیادتی ہوئی کہ یہودیوں پر جو اس زمانہ میں یہاں بکثرت آباد تھے سخت ظلم شروع کردیئے اور یہی ان پادریوں سے
توقع بھی کی جاسکتی تھی، مجلٹ نے بہت صحیح لکھا ہے کہ "عہد وسطیٰ میں جب لوگوں نے پوچھنا ۲۲۷۱
شروع کیا کہ کلیسا کی ربانی حکومت میں جس جنت کا وعدہ ہوا تھا وہ اس دنیا میں دوزخ کی صورت میں کیوں نمودار ہوئی ہے؛ تو اہل کلیسہ گو اس اعتراض کے اصلی معنی خوب سمجھتے تھے، لیکن لوگوں کی زبان بند کرنے کو جواب دیتے تھے کہ 'یہ ایک قہر خدا ہے جو یہودیوں کے گناہوں کی وجہ سے نازل ہوا ہے، خداوند مسیح کے قاتل ابھی تک اپنی سزا کو نہیں پہنچے ہیں" یہی یہودیوں پر ظلم شروع ہونے کی وجہ ہوگئی، قوطی بادشاہ سیسی بوت (سیسبوط) کے عہد یعنی سنہ ۶۱۶ء میں ان ظلموں کی ابتدا ہوئی، فرمان جاری ہوا کہ جس قدر یہودی اس ملک میں رہتے ہیں، وہ سال ختم

ہونے سے پہلے عیسائی کرلیے جائیں، اس تاریخ کے بعد جو یہودی اپنے مذہب پر قائم رہنے پر اصرار
کریں ان کو تسلو تسلو کوڑے لگا کر جلا وطن کر دیا جائے اور ان کی جائیداد ضبط کرلی جائے، کہا جاتا ہے کہ
اس خوف سے نوّے ہزار سے زیادہ یہودیوں نے حاضر ہو کر اصطباغ لیا اور یہ تعداد بھی ایک قلیل
جماعت کی تھی جو عیسائی ہوئی، اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس قسم کا تبدیل مذہب کبھی
دل سے نہیں ہوا کرتا، عیسائی ہو کر یہ یہودی خفیہ طور پر اپنے بچوں کا ختنہ کرتے رہے اور شریعت
موسوی کے دیگر احکام کی بھی پابندی کرتے رہے، ظاہر ہے کہ ایسی کثیر التعداد قوم کو یک لخت اور
جبراً عیسائی کرنا ایک فعل عبث تھا، طلیطلہ کی چوتھی مسیحی مجلس نے اس غلطی کا اقرار کر کے حکم دیا کہ
یہودی اپنے قدیم مذہب پر قائم رہیں، لیکن اُن کے بچے اُن سے لے لیے جائیں، تاکہ ان کو
عیسائی دین میں اُٹھایا جائے" اس حکم کے بعد پادریوں کو یہ پشیمانی ہوئی کہ یہ نرمی و رعایت ضرورت
سے زیادہ ہو گئی ہے، اس لیے فیصلہ کیا کہ اب انتہا درجہ کا تشدد کرنا چاہیے، چنانچہ جب چھٹی مجلس
نے طلیطلہ میں اجلاس کیا تو حکم دیا کہ "دار الحکومت طلیطلہ میں کسی بادشاہ کو تخت پر بیٹھنے کی اجازت
نہ ہوگی تا وقتیکہ وہ اس بات کا حلف نہ کرے کہ سلطنت کی جانب سے جس قدر شدید
قوانین اب تک یہودیوں کے بارے میں جاری ہو چکے ہیں اُن سب پر پورا عمل درآمد کرے گا"
لیکن باوجود سخت قوانین کے اور طرح طرح کے ظلم و تعدی کے یہودی کسی نہ کسی طرح اسپین
میں آباد ہی رہے اور تعجب یہ ہے کہ وہ اِس ملک میں زمینیں بھی کثرت سے رکھتے تھے، اس سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس سختی اور بے رحمی کے ساتھ قانون وضع ہوتے تھے، اسی سختی کے ساتھ
اُن پر عمل نہ ہوتا تھا، مخالفین کی قوتِ عمل ان کے ارادوں کے ہم پلہ نہ تھی

اسّی برس تک یہودیوں نے صبر کیا تھا جس قدر ظلم عیسائیوں نے کیے ان کو سہا، لیکن
اخیر میں صبر نہ رہا اور انہوں نے اپنے ظالموں سے انتقام لینا چاہا، مسلمانوں کی فتح اسپین سے
۱۷ برس پہلے یعنی ۶۹۴ء میں اسپین کے یہودیوں نے بحر زقاق سے دوسری طرف افریقیہ میں جس
قدر یہودی آباد تھے۔ اُن سے سازش کر کے اسپین میں ایک عام بغاوت پیدا کرنی چاہی کہا جاتا
ہے کہ افریقیہ میں بربر کے بہت سے قبیلے ایسے تھے جو یہودی مذہب رکھتے تھے، اور

۱؎ آٹھویں مجلس طلیطلہ کے احکام دفعہ ۱۰ (اسپینا سگرادا جلد ۶ صفحہ ۱۹۲)

اسپین کے بہت سے یہودی بھاگ کر اُن میں شامل ہوتے رہے تھے، اس بغاوت کی نسبت یہ طے پایا تھا کہ جس وقت افریقہ کے یہودی اسپین میں داخل ہوں تو ایک ہی وقت میں کئی مختلف مقامات پر غدر کر دیا جائے، لیکن ہوا یہ کہ بغاوت ہونے سے پہلے ہی کسی طرح حکومتِ اسپین کے کان تک یہ خبر پہنچ گئی، قوطی بادشاہ اجیکا نے فوراً اس بغاوت کے انسداد کی تدبیر سوچی اور طلیطلہ میں پادریوں کی مجلس منعقد کر کے فوراً ان آسمانی اور دنیاوی مشیرانِ دولت کے اجلاس پر یہودیوں کی اس مجرمانہ تحریک کا حال بیان کیا، اور درخواست کی کہ اس نافرمان قوم کو اس کی اس حرکت پر نہایت سخت سزا دی جائے چنانچہ مجلس نے بنی اسرائیل میں سے بعض لوگوں کی شہادت لی، جس سے ثابت ہوا کہ اسپین کے یہودی بغاوت کر کے چاہتے ہیں کہ ملک میں یہودیوں کی حکومت ہو جائے، اس شہادت کو سن کر پادری غصہ سے تھرا اُٹھے، اور اُنھوں نے تمام یہودیوں کی گرفتاری اور اُن کی جائیداد ضبط کرنے کا حکم جاری کیا، بادشاہ اجیکا نے تمام یہودیوں کو قید کر کے عیسائیوں کی غلامی میں ان کو دیدیا، یہودیوں کے پاس جو عیسائی غلام تھے وہ آزاد کیے گئے اور یہودیوں کو انہی کے غلاموں کا غلام بنایا گیا، آقاؤں کو حکم ہوا کہ اپنے غلاموں کو اُن کے قدیم مذہب موسوی پر نہ چلنے دیں اور جب اِن غلاموں کے بچے سات برس کی عمر کو پہنچیں تو اُن کے ماں باپ سے انھیں چھین لیا جائے، اور اُن کو عیسائی اٹھایا جائے، یہودی کو یہودی کے ساتھ شادی نہ کرنے دیں، اور یہودی غلام سوا ئے عیسائی عورت کے، اور یہودی لونڈی سوائے عیسائی مرد کے کسی سے شادی نہ کرنے پائے [1]

اس میں شبہ کی کوئی وجہ نہیں کہ کل احکام سختی کیساتھ عمل میں لائے گئے اس وقت سوال غیر مذہب والوں کو سزا دینے کا نہ تھا، بلکہ خطرناک باغیوں کی سرزنش کا تھا، افریقہ کے شمال مغربی حصہ کو مسلمان جس زمانہ میں فتح کر چکے تھے، اُس زمانہ میں فسیقوط کے عیسائی بادشاہوں کے ہاتھوں یہودیوں پر اسپین میں یہ جور و ظلم ہو رہے تھے؛ یہودیوں کی یہ دعا کبھی ختم نہ ہوئی کہ ظالم عیسائیوں کے پنجہ سے اُن کی نجات ہو، پس جن فاتحوں نے اُن کو عیسائیوں کے ظلم سے بچایا اور جزیہ کی خفیف رقم لے کر اُن کو اپنے مذہب پر قائم رہنے دیا، یہودیوں کی نظر میں وہ ایسے لوگ

---

[1] دیکھو ساتویں مجلسِ طلیطلہ کے احکام (اسپینا سگرادا۔ جلد ۶ صفحہ ۲۳۴)

تھے جو اُن کو نجات دینے کے لیے آسمان سے اُترے تھے۔
یہودی، سرف، مفلس برگر، سوداگر، سب جانی دشمن تھے اور انہی دشمنوں کو ایک
متزلزل اور پادر رکاب معاشرت اپنی آغوش میں پال رہی تھی، ماسوا اس کے ملک کی صاحب مراعات
جماعتیں اسلامی فوجکشوں کے مقابلہ کے لیے سوائے ایسی فوجوں کے جن میں عیسائی اور یہودی
سرف بھرتی تھے، اور کوئی فوج نہ رکھتی تھیں، رومانی سلطنت کے دورِ آخر میں سرف کاشتکار فوجوں
میں کام دینے لگے تھے، قوطیوں نے بھی اپنے زمانہ میں یہی طریقہ جاری رکھا، جب تک قوطیوں
میں سپاہیانہ خصائل قائم رہے، اس وقت تک اس کی ضرورت نہیں ہوئی کہ ہر ایک مالک الاراضی
سے کسی مخصوص تعداد میں لڑائی کے وقت سرف طلب کیے جانے کا کوئی قاعدہ وضع کیا جائے
لیکن بعد کو جب غلاموں کی محنت سے دولت پیدا کرنے کا شوق ہوا تو فوجوں میں ضرورت کے
(۲۲، وقت بھرتی کے قاعدے بھی قانونی طور پر منضبط ہوئے، قوطی بادشاہ ومبانے اس ضرورت کو
محسوس کیا، چنانچہ اس بادشاہ نے اپنے ایک فرمان میں شکایت کی کہ مالکانِ الاراضی زراعت
میں ایسے مصروف ہو جاتے ہیں کہ لڑائی کے وقت اپنے سرفوں کا دسواں حصہ بھی سرکار میں
نہیں بھیج سکتے، اس لیے حکم جاری کیا گیا کہ ہر ایک مالک اراضی خواہ قوطی ہو یا رومانی، لڑائی
کے وقت اپنے سرفوں کی تعداد کا دسواں حصہ سرکار میں بھیجا کرے، آگے چل کر یہ دسواں حصہ
نصف حصہ ہو گیا، اس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ فوج میں سرفوں کی تعداد آزاد سپاہیوں سے
کہیں زیادہ ہو گئی ہو گی، جس کے یہ معنی ہوئے کہ ملک کی حفاظت زیادہ تر ایسے سپاہیوں کے
ہاتھوں میں چلی گئی جو دشمن سے سازش کر لینے کو اپنے ظالم آقاؤں کی خدمت بجا لانے سے
بہتر سمجھتے تھے۔

اسناد

سلویانوس Salvianus De Gub. Dei

W. 58.60 74 V 86 95

Vi 115.028 V. 130-150

سیدون (Sidon Apol Epist VII 14) نیز وہ عبارتیں جو

Fauriel نے اپنی کتاب "تاریخِ گال" میں نقل کی ہیں۔ جلد ۱ ص ۳۸۷

اوروسیوس Orosius ڈیتیکشن اور جلد ۷ ص ۴۰-۴۳

ایڈاتیوس Idatius کرونیکون

فورم جوڈیکم Forum Judicum جلد ۲ ص ۱۱، جلد ۵ ص ۲، ۱۹، ۷-۹ جلد ۱ ص ۱

اسپانیا سگرادا Espana Sagrada جلد ۳ ص ۲۵۹-۲۶۰، ۳۸۲۱

جلد ۲۰ ص ۲۴۴-۲۷۷

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مسلم

دوسری فصل

اسلامی فتح

مندکرہ بالا حالات سے ظاہر ہوا کہ قیقوط کے دور حکومت میں اسپین پر رومانیوں کے زمانہ سے بھی بدتر طریقہ پر حکومت کی جاتی تھی، قوائے سلطنت میں مدت سے وہ امراض پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے کمزوری شدت سے پیدا کر دی، حتیٰ کہ صرف بارہ ہزار آدمیوں کے ایک لشکر نے جسے خود اسپین کے لوگوں سے مدد پہنچائی، ایک ہی ضرب میں اس ملک کے قصرِ حکومت کو زمین دوش کر دیا۔

والیٔ افریقہ موسیٰ بن نصیر نے سلطنتِ عرب کی حدود کو بحرِ محیط تک وسیع کر دیا تھا، صرف سبتہ کا ایک شہر ایسا تھا جو مسلمانوں کا مقابلہ کرتا رہا، یہ شہر سلطنت بیزنطیہ (قسطنطنیہ) کے مقبوضات میں سے تھا، اور سلطنتِ بیزنطیہ میں ایک زمانہ میں افریقہ کے شمالی ساحل کے تمام ملک شامل تھے، چونکہ قیصر قسطنطنیہ کی حکومت اس قدر فاصلۂ دراز پر تھی کہ سبتہ کو ضرورت کے وقت قیصر کوئی مدد نہ پہنچا سکتا تھا، اس وجہ سے عیسائی حاکم سبتہ نے اسپین کے بادشاہوں

سے دوستانہ مراسم پیدا کرلیے تھے۔ اس زمانہ میں یلیان عیسائی سبتہ کا حاکم تھا، اس نے اپنی بیٹی کو دربار طلیطلہ میں بھیج رکھا تھا کہ وہاں شاہی محلوں میں رہ کر اپنے مرتبے کے مطابق تعلیم و زینت حاصل کرے، لیکن یہاں بادشاہ رزریق کی نظر اس پر پڑی پادشاہ نے اس کے دامن عصمت کو آلودہ کیا، یلیان نے جب سنا تو غصہ سے اپنے آپے میں نہ رہا اور چاہا کہ عربوں کے داخلے کے لیے اپنے شہر سبتہ کے دروازے کھول، لیکن اس سے پہلے اس نے عربوں سے ایک عہدنامہ کرلیا جو اس کے حق میں مفید تھا، اور اب اسپین کی دولت اور شادابی کی تعریف کرکے موسیٰ کو ترغیب دی کہ وہ اسپین پر فوج کشی کرے، اور اس صورت میں فوج کی روانگی کے لیے یلیان نے جہازوں کے انتظام کا وعدہ کیا کہ ضرورت کے وقت فوراً مہیا کر دیے جائیں گے موسیٰ بن نصیر نے امیرالمومنین ولید سے استصواب کیا خلیفہ نے اس مہم کو خطرناک سمجھا اور لکھا کہ "پہلے اسپین کے حالات معلوم کرنے کے لیے تھوڑی سی فوج بھیجو، فوراً کثیر فوج ایسے ملک کو روانہ نہ کی جائے جو سمندر پار ہے" اس حکم کے آتے ہی موسےٰ نے طریف بن مالک نخعی کو جو موسیٰ کے موالی میں سے تھا، چار سو پیدل اور ایک سو سواروں کی جمعیت کیساتھ اسپین روانہ کر دیا، اس فوج نے چار جہازوں میں جنھیں یلیان حاکم سبتہ نے مہیا کیا تھا، بحر زقاق کو عبور کیا، اور جزیرۃ الخضراء کے گرد و نواح کو تاخت و تاراج کرکے یہ فوج جولائی ۷۱۰ء (۹۲ھ) میں افریقہ کو واپس آگئی۔

دوسرے سال جب موسیٰ کو معلوم ہوا کہ رزریق بادشاہ اسپین قوم بشکنس کی بغاوت کو فرو کرنے کے لیے دارالسلطنت سے غیر حاضر ہے، تو اپنے موالی میں سے ایک دوسرے شخص یعنی طارق بن زیاد لیثی کو جو مسلمانوں کے لشکر قراول کا سردار تھا، سات ہزار مسلمانوں کے ساتھ اسپین کو روانہ کیا، یہ جمعیت بھی بلیان حاکم سبتہ کے انھی چار جہازوں میں جنھوں نے طریف کی فوج کو پہلے اسپین پہنچایا تھا، تھوڑی تھوڑی کرکے ساحل اسپین پر اتار دی گئی مسلمانوں کے پاس سوائے ان چار مستعار جہازوں کے کوئی جہاز نہ تھا، طارق نے اپنی

ؒ اس لڑکی کا نام "فلورنڈا" تھا اس کی ماں سابق قوطی بادشاہ اسپین غیطشہ (Witiza) کی بیٹی تھی۔

فوج کو اس پہاڑ پر جمع کیا جو اب تک اس کے نام سے جبل طارق (جبرالٹر) مشہور ہے، اس پہاڑ کے پیچھے سمندر کے کنارے کارتیجنیہ[1] کا قدیم شہر آباد تھا، طارق نے اس شہر کو فتح کرنے کے لیے عربی سالاروں میں سے جو بہت کم ساتھ تھے، ایک سالار کو جس کا نام عبدالملک معافری[2] تھا فوج کا ایک دستہ دیکر روانہ کیا، مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کرلیا، طارق نے مع فوج کے جبل طارق سے اتر کر مغرب میں ایک جھیل تک (جسے لاگونا دی لاجنڈا کہتے ہیں اور عربوں نے جسے بعد کو البحیرہ کہا) پہنچا تو معلوم ہوا کہ بادشاہ اسپین، رزریق ایک بڑا لشکر لے کر اس کے مقابلے کے لیے آرہا ہے چونکہ جہاز جن میں طارق کا لشکر ساحل اسپین پر اترا تھا صرف چار تھے اس لیے اگر طارق چاہتا بھی تو اس لشکر کو واپس افریقہ لے جانے میں بڑی دشواریاں پیدا ہوتیں، لیکن طارق نے واپسی کا خیال نہیں کیا، حوصلہ مندی، شوق ملک گیری اور جوشِ مذہب نے مجبور کیا کہ بڑھا چلے، فوراً موسیٰ بن نصیر سے کمک طلب کی، موسیٰ نے چار بربر جہازوں پر سوار کر کے روانہ کیے، یہ جہاز طارق کی روانگی کے بعد موسیٰ نے تیار کروائے تھے، اور اب طارق کے پاس بارہ ہزار کا لشکر ہوگیا، بادشاہ اسپین رزریق کے لشکر کے مقابلہ میں مسلمانوں کی فوج نہایت قلیل تھی، لیکن عیسائیوں کی دغابازی مسلمانوں کی کامیابی میں مددگار ہوگئی

رزریق غاصب سلطنت تھا، سابق بادشاہ اسپین غیطشہ کو بہت سے امرا ملک کی مدد سے تخت سے اتار کر خود سلطنت کا مالک ہوگیا تھا، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے غیطشہ کو قتل کرادیا تھا، اس وجہ سے ملک میں ایک بڑا فریق رزریق کا جانی دشمن تھا، اس فریق میں غیطشہ کے بھائی اور بیٹے شریک تھے، اب اس فریق کے سرداروں سے مصالحت

---

[1] عربوں نے اسے بھی قرطاجنہ Cartagena لکھا ہے، وہ کارتیہ اور کارتاجینہ میں فرق نہ کرتے تھے قدیم شہر کارتیجنیہ کے ویرانے پر ایک قلعہ سترھویں صدی عیسوی میں موجود تھا، جسے کارتاجینا کہتے تھے، اب اس کا نام توری ول رو کادیلو Torre del Rocadille

[2] انہی عبدالملک معافری سے آٹھویں پشت میں محمد بن ابی عامر المنصور گذرے ہیں۔

کرنے کے لیے بادشاہ رزریق نے ان کو لکھا کہ طارق کے مقابلے کے لیے وہ بھی آئیں، یہ سردار جن میں غیطشہ کے بیٹے سب سے ممتاز تھے قانوناً مجبور تھے کہ بادشاہ کا حکم بجا لائیں چنانچہ وہ آئے لیکن دل میں نفرت اور غصہ بھرا تھا، بادشاہ نے چاہا کہ اُن کا غصہ کسی طرح فرو کرے اور وہ اس کا اعتبار کرنے لگیں، لیکن، اس میں کامیابی نہ ہوئی اور انھوں نے بادشاہ کا ساتھ اس وقت چھوڑا جبکہ مسلمانوں سے مقابلہ ہو رہا تھا، مگر اُن کا یہ فعل اس نیت سے نہ تھا کہ وہ ملک پر بربر کا قبضہ کرا دیں کیونکہ وہ خود سلطنت کے دعویدار تھے، ایسا ارادہ کرنا خود کشی کے برابر ہوتا، لیکن غیطشہ کے بیٹے یہ نہیں سمجھتے تھے، اور اگر ایسا سمجھتے تو ایسا سمجھنا اُن کا کچھ خلافِ عقل بھی نہ ہوتا کہ بربر ملک میں سلطنت قائم کرنے کے ارادے سے نہیں بلکہ صرف لوٹ مار کی غرض سے داخل ہوئے ہیں، انھوں نے اس مسئلہ کو اپنے دل میں اس طرح سوچا کہ "ان غیر ملک والوں کو جو چیز درکار ہے وہ مالِ غنیمت ہے، اور جب یہ مال ۲۳۲
اُن کے پاس کافی جمع ہو جائے گا تو پھر وہ اپنے ملک یعنی افریقہ کو واپس چلے جائیں گے" ان کو اس کا بھی پورا یقین تھا کہ جب رزریق کو شکست ہو جائے گی تو اُس کا اقبال رخصت ہو گا اور پھر کوئی اس کو بہادر اور خوش قسمت بادشاہ نہ سمجھے گا، اس صورت میں اُن کو اپنے حقوق بادشاہی کے مطالبہ کا موقع ملے گا اور اس میں وہ کامیابی حاصل ہوگی جواب تک نہیں ہوئی تھی، اور اگر رزریق جان سے مارا گیا تو اُن کے بادشاہ ہونے کی صورت اور زیادہ بہتر ہو جائے گی، پس فی الواقع وہ اپنی کوتاہ اندیشی اور خود غرضی سے مغلوب ہو گئے اور اگر واقعی اُن کی حرکت سے ملک ایک غیر مذہب والی قوم کے قبضے میں چلا گیا تو یہ فعل اُن کا عمداً نہ تھا اور نہ اُن کی یہ مرضی تھی۔

لڑائی ۹ر جولائی ۷۱۱ء کو وادیٔ[1] بکہ کے کنارے ہوئی، اسپینی لشکر کے میمنہ اور میسرہ کے سردار غیطشہ کے دونوں بیٹے تھے، اور زیادہ تر انہی کے علاقوں کے سرف[2] کاشتکار

[1] وادی بکہ ایک دریا ہے جو خلیج طرف الاغر کے قریب شہر دبجر اور کونیل کے درمیان سمندر میں گرتا ہے، دیکھو ریسرچز Recherches مولفہ ڈوزی ۱۸۸۱ء فصل اول، ص ۳۰۵ — ۳۰۷

[2] جیسا کہ پہلے مفصل بیان ہو چکا ہے سرف ایک قسم ادنیٰ کاشتکاروں کی ہے۔

لشکر کے ان حصوں میں تھے، اِن سرفوں نے نہایت مستعدی سے اپنے آقاؤں کے اس حکم کی تعمیل کی کہ دشمن کی طرف سے پیٹھ کرلیں۔

قلب لشکر خود بادشاہ رزریق کی سرکردگی میں تھا، اور وہ دشمن کے مقابلہ میں کچھ دیر تک جما رہا، لیکن آخر کار شکست کھا گیا، اور اب مسلمانوں نے عیسائیوں کو قتل کرنا شروع کیا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس لڑائی میں رزریق مارا گیا، بہرکیف اس کو پھر کسی نے نہ دیکھا، اور ملک ایسے وقت میں بغیر بادشاہ کے رہ گیا جبکہ اُس کو بادشاہ کی سخت ضرورت تھی، طارق اس کیفیت کو سمجھ گیا، موسیٰ بن نصیر کا حکم تھا کہ افریقہ واپس چلا آئے، مگر طارق نے اِس حکم کو نہ مانا، اور آگے بڑھا، اور حقیقت میں اس وقت اِسی بات کی ضرورت بھی تھی تاکہ سلطنت اسپین کا بوسیدہ قصر بالکل منہدم ہوجائے، رعایا جو پہلے سے ناراض تھی اور حاکموں کے ظلم اٹھا رہی تھی اس نے فاتحوں کی فتح کے لیے ہر جگہ آسانیاں پیدا کردیں، صرف کاشتکاروں نے انگلی تک نہ اُٹھائی، صرف اس خیال سے کہ اپنے تئیں بچانے میں اُن کے آقا بھی بچ جائیں گے، یہودیوں نے علانیہ بغاوت اختیار کی، اور اپنی خدمات مسلمانوں کو پیش کیں۔

وادی بکہ کی فتح کے بعد دوسری فتح طارق کو شہر استجہ کے قریب حاصل ہوئی، یہاں سے اُس نے اپنی فوج کے حصے قرطبہ، ارجذونہ اور البیرہ کی طرف روانہ کئے اور خود لشکر کا بڑا حصہ لیکر طلیطلہ کی طرف بڑھا، ارجذونہ کے باشندے شہر چھوڑ پہاڑوں میں پناہ گزین ہوئے اور یہ شہر بغیر لڑائی کے مسلمانوں کے قبضے میں آگیا، البیرہ کو حملہ کرکے فتح کیا اور شہر میں یہودیوں اور مسلمانوں کی فوج مقیم کردی، قرطبہ کو ایک چرواہے نے مسلمانوں کے حوالے کرا دیا، اور یہ اس طرح کہ شہر پناہ جہاں سے ٹوٹی ہوئی تھی اُس کا پتہ بتا دیا، اور مسلمان وہاں سے شہر کے اندر داخل ہوگئے، طلیطلہ میں یہودیوں نے عیسائیوں کو دغا دی، ہر طرف ناقابل بیان بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، اکابر ملک اور اساقفہ بدحواس تھے، چنانچہ ایک عرب مورخ نے لکھا ہے کہ "خدا نے کفار کے دل میں مسلمانوں کا رعب بٹھا دیا" حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا خوف عیسائیوں میں اب عالمگیر ہوگیا، قرطبہ کے شرفا طلیطلہ کو بھاگے: اور طلیطلہ کے اُمرا نے بھاگ کر جلیقیہ کے علاقے میں پناہ لی، طلیطلہ کا مطران (کلیسہ کا افسر اعلیٰ) ملک ہی چھوڑ کر بھاگا

اور محفوظ رہنے کے لیے رو ما پہنچا، جو لوگ پناہ لینے کے لیے بھاگ گئے نہیں، انھوں نے بجائے (۲۳۳)
اس کے کہ مقابلہ کر کے اپنی حفاظت کریں اسی میں خیر دیکھی کہ مسلمانوں سے چند شرائط پر صلح کر لیں
انھی لوگوں میں بادشاہ غیطشہ کے بیٹے بھی تھے، انھوں نے اس بنا پر کہ رذریق سے دغا کر چکے
ہیں، اس لیے مسلمانوں کی شکر گذاری کے مستحق ہیں مسلمانوں سے وہ شاہی زمینیں انعام میں مانگیں
جن کی پیداوار وصول کرنے کا بادشاہ سابق کو حق حاصل تھا، ان زمینوں پر تین ہزار خرمنگاہ تھے
مسلمانوں نے ان کی درخواست منظور کی، اور بادشاہ غیطشہ کے بھائیوں میں سے ایک
کو جس کا نام اوپاس تھا طلیطلہ کا حاکم مقرر کر دیا۔

غرض قسمت کی اس اتفاقیہ کامیابی نے لوٹ مار کے ایک دھاوے کو مستقل فتح بنا دیا
لیکن موسیٰ بن نصیر اس واقعہ سے خوش نہ ہوئے، اسپین کا فتح کیا جانا وہ ضرور چاہتے تھے لیکن
اپنے ہاتھوں سے، طارق کی ناموری اور فتح سے جو نفع طارق نے اٹھایا اُس پر موسیٰ کو رشک
پیدا ہوا، لیکن خوش قسمتی سے ابھی ملک میں موسیٰ کی فتوحات کے لیے گنجائش تھی، طارق
نے نہ ابھی تک ملک کے تمام شہر فتح کیے تھے اور نہ ملک کی کل دولت اپنے قبضے میں کی
تھی پس موسیٰ طارق کے متعاقب چلے، اور اٹھارہ ہزار عربوں کو اپنے ساتھ لے کر جون ۷۱۲ء
(رمضان ۹۳ھ) میں بحر زقاق (آبنائے جبرالٹر) کو عبور کر کے اسپین میں وارد ہوئے، آتے
ہی مدینہ شذونہ کو فتح کیا، اور یہاں سے جو اسپینی عیسائی اُن کے ساتھ ہو گئے انھوں نے شہر
قرمونہ پر قبضہ کروا دیا، اور یہ اس ترکیب سے کہ شہر کے دروازے کے سامنے مسلح ہو کر آئے اور ظاہر
کیا کہ دشمن کے خوف سے پناہ لینے آئے ہیں، جب اُن کو شہر میں آنے کی اجازت ہو گئی تو اندر
پہنچ کر رات کے وقت شہر کا دروازہ کھول عربوں کو اندر بلا لیا، اشبیلیہ کی فتح میں زیادہ مشکل
پیدا ہوئی، یہ ملک میں سب سے بڑا شہر تھا، یہاں کے لوگوں نے قلعہ بند ہو کر کئی ماہ تک مقابلہ
کرنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے، ماردہ کے شہر نے بھی مسلمانوں کا خوب مقابلہ کیا، آخر کار
یکم جون ۷۱۳ء کو مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کر لیا، اب موسیٰ بن نصیر نے طلیطلہ کا قصد
کیا، طارق اپنے افسر کے استقبال کے لیے آیا، اور موسیٰ کو دیکھتے ہی گھوڑے سے اُتر
پڑا، لیکن موسیٰ کی حالت غیظ و غضب کی تھی، طارق کو چابک مار کر کہا " بغیر میری

اجازت کے تم کیوں اس قدر بڑھے چلے آئے؟ میں نے تمھیں صرف اتنا حکم دیا تھا کہ محض ایک حملے کے بعد افریقہ واپس چلے آنا"

اسپین کا باقی حصہ سوائے چند شمالی صوبوں کے بغیر کسی مشکل کے فتح ہو گیا، عیسائیوں کے لیے مقابلہ بلسود تھا، کیونکہ کوئی اُن میں اتنا نہ تھا کہ انتظام درست کرکے باقاعدہ مقابلہ پر انھیں آمادہ کرتا، اس کے علاوہ اُن کی خود غرضی نے بھی اُن کو جلد مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لینے پر مجبور کیا، جلد اطاعت قبول کر لینے سے مفید مطلب شرائط پر تصفیہ ہو جاتا تھا لیکن مقابلہ کے بعد اطاعت کرنے میں جائیداد ضبط کر لی جاتی تھی

بحیثیت مجموعی مسلمانوں کی یہ فتح عیسائیوں کے حق میں کوئی بڑی مصیبت نہ تھی، یہ سچ ہے کہ ابتدا میں کچھ زمانہ بدعملی کا رہا، جیسا کہ ٹیوٹن قوموں کی فوجکشی کا ابتدائی زمانہ تھا، مسلمان سپاہ نے بھی ادھر اُدھر لوٹ شروع کی، چند شہروں کو جلا دیا، اور ایسے اُمرا سلطنت کو جو بھاگ نہ سکے تھے قتل کر دیا، یہاں تک کہ بعض جگہ بچوں کو بھی قتل کیا، لیکن عربی حکومت نے بہت جلد اس قسم کی بدعملیوں اور ظلموں کا انسداد کر دیا، اور جب امن قائم ہو گیا تو اس زمانہ کی رعایا نے جس میں جان باقی نہیں رہی تھی اپنی قسمت پر صبر و شکر کیا، بہت کم شکایتیں لب بان پر آئیں، عربوں کی سلطنت درحقیقت اُن کے لیے ایسی ہی قابل برداشت تھی، جیسے کم از کم نسیقوطی کی سلطنت رہی تھی، فاتحوں نے مفتوحوں کو انھی کے قانون اور قانونی حکام کا پابند رکھا اور اُن پر اُنھی کے قوم کے کومٹ یا والی مقرر کیے، ان قومسوں کو عیسائیوں سے سرکاری محصول وصول کرنے اور اُن کے مقدمات فیصل کرنے کا اختیار دیا، ملک کے وہ حصے جو مسلمانوں نے بزور شمشیر لیے تھے اور ایسے علاقے جو کلیسا کی ملک تھے یا ایسے امرا کی جائیدادیں جو علاقہ وغیر کو بھاگ گئے تھے فاتحوں نے باہمی تقسیم کر لیں، لیکن ان تمام علاقوں اور جائیدادوں سے جو صرف کاشتکار متعلق تھے اُن کو مسلمانوں نے مطلق نہیں چھیڑا، اور اسی حکمت عملی پر سلطان ہمیشہ کاربند رہے، ملک کے اصلی باشندے زراعت کا کام خوب جانتے تھے فاتح ایسے ذلیل پیشے کو اختیار کرنا اپنی شان کیخلاف سمجھتے تھے، "صرف کاشتکاروں" کو حکم ہوا کہ جس طرح وہ زراعت کرتے آئے ہیں اُسی طرح اپنا کام جاری رکھیں، اور جو فصل پیدا کریں اُسکے پانچ

(۲۳۴)

حصے کرکے چار حِصّے مسلمانوں کو دیں اور ایک حِصّہ اپنے صرف میں لائیں۔ شاہی زمینوں پر جو سرف آباد تھے، اور یہ نہایت کثرت سے تھے، کیونکہ شاہی زمینیں ضبط شدہ جائیداد کا پانچواں حِصّہ تھیں، اُن کو حکم تھا کہ پیداوار کا صرف ایک تہائی حصہ ادا کریں، پہلے یہ حِصّہ بیت المال میں جمع ہوتا تھا، لیکن بعد کو یہ قاعدہ بدل دیا گیا، کیونکہ بعض شاہی زمینیں بطور جاگیر اُن عربوں میں تقسیم کردی گئیں تھیں جو بعد کو اسپین میں آکر آباد ہوئے، مثلاً یہ عرب وہ تھے جو امیر اندلس سمح بن مالک الخولانی کے ساتھ اسپین میں آکر بسے تھے، یا ایسے شامی عرب تھے جو بلج بن بشر کے ساتھ ساحل اسپین پر اُتر کر ملک میں آباد ہوئے تھے[1]۔ عیسائی کاشتکار بھی کسی سے کم نہ رہے پہلے وہ ایک تہائی حِصّہ پیداوار کا بیت المال میں داخل کرتے تھے، اب جس کی جاگیر میں زمین چلی گئی اُس کو تہائی حِصّہ ادا کرنے لگے۔ باقی عیسائیوں کی حالت کا اچھا بُرا ہونا اُن شرائط پر منحصر تھا جو وہ اپنے مسلمان حاکموں کے ساتھ کرسکے اور یہ شرائط بعض صورتوں میں ایسی تھیں جن کو ہرگز غیر مفید نہیں کہہ سکتے، مثلاً شہر ماردہ کے وہ لوگ جو شہر فتح ہونے کے وقت شہر کے اندر ہی رہے تھے اُن کا کسی قسم کا مال ضبط نہیں کیا گیا، صرف گرجاؤں کے مال اور جائداد کو ضبط کیا، اسپین کے جس صوبے میں قوطی عیسائی سردار تھیوڈومیر (تدمیر) حاکم تھا اور جس کے علاقے میں علاوہ اور شہروں کے اورقہ، مولہ، اریولہ، اور لقنت کے شہر آباد تھے اُن میں عیسائیوں کا مطلق کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا، ان عیسائیوں نے صرف خراج دینا منظور کیا، اور وہ بھی کچھ روپیہ کی شکل میں اور کچھ پیداوار کی شکل میں، غرض ایک عام نظر ڈالنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ عیسائی اپنے مال و جائیداد کے بڑے حِصّے پر مالک رہے، اس کے علاوہ اُن کو اپنے مال کے منتقل کرنے کا بھی اختیار رہا، اور یہ اختیار ایسا تھا جو اُن کو ویسیقوط کے عہدِ حکومت میں حاصل نہ تھا، لیکن ان کو جزیہ دینا پڑتا تھا، جس کی شرح امیروں کے لیے ۴۸ درہم، متوسط الحال لوگوں کے لیے ۲۴ درہم، مزدوروں اور پیشہ وروں کے لیے ۱۲ درہم سالانہ تھی، ہر قمری مہینے کے ختم ہونے پر گویا بارہ قسطوں میں یہ رقم ادا کی جاتی تھی، لیکن عورتیں، بچے، عیسائی راہب، اپاہج اور اندھے اُس سے مستثنیٰ تھے، جزیہ کے علاوہ مالکان

[1] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۱۴۰

اراضی کو خراج ادا کرنا ہوتا تھا، یہ محصول فصلوں پر تھا، اور ہر علاقہ میں اس کی زمین کی حیثیت کے مطابق لگایا گیا تھا، جو عیسائی مسلمان ہو جاتے اُن پر جزیہ معاف ہو جاتا، لیکن تبدیل مذہب سے خراج پر کوئی اثر نہ ہوتا، وہ بدستور ادا کرنا پڑتا، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں عیسائیوں کی حالت کا جس وقت پہلے زمانہ کی حالت سے مقابلہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سختی کی نہ تھی، غیر مذہب کیساتھ عربوں کی بیحد رواداری کا بھی یہاں خیال کر لینا چاہئے۔ مذہبی معاملات میں کسی پر سختی نہ کرتے تھے، اگر کہیں حکومت ہی غیر معمولی طور پر پابندِ مذہب ہوئی جو شاذ و نادر دیکھنے میں آتا تھا تو بات دوسری تھی، ورنہ عربوں کو کوئی خاص توجہ اس طرف نہ تھی کہ عیسائی مسلمان کیے جائیں، اس میں بیت المال کا بہت نقصان تھا، عیسائی بھی احسان فراموش نہ تھے اور اپنے فاتحوں کی مذہبی رواداری اور انصاف کے جو اُن کیساتھ کیا گیا تھا ممنون تھے، وہ مسلمانوں کی حکومت کو افرنجیوں کی حکومت سے بہتر سمجھتے تھے، آٹھویں صدی کے دوران میں اسی وجہ سے بغاوتیں بہت کم ہوئیں، کم کیا بلکہ صرف ایک بغاوت کا حال پڑھنے میں آتا ہے، اور وہ شہر باجہ کے عیسائیوں کی بغاوت تھی، مگر یہ ہنگامہ بھی ایک عربی سردار کے اغوا سے پیش آیا تھا، شروع زمانہ میں پادری تک غیر مطمئن نہ تھے، درآنحالیکہ اُن کے لیے بے اطمینانی کی سب سے بڑھ کر وجوہ ہو سکتی تھیں، اس کا اندازہ کسی قدر ایک لاطینی تالیف سے ہو سکتا ہے جو ۷۵۴ء میں قرطبہ میں لکھی گئی تھی، اس تالیف کو ایک شخص عیسیدور سے منسوب کیا جاتا ہے ۲۲
جو شہر باجہ کا اسقف تھا[1]، مگر یہ غلطی ہے، بہرکیف مولف کوئی ہو، مگر وہ پادری ضرور تھا، اور پادری ہو کر بھی مسلمانوں کی نسبت اچھا خیال رکھتا تھا، ایسا اچھا خیال رکھنا تھا کہ چودھویں صدی عیسوی سے پہلے کے کسی اسپینی عیسائی مولف کا ایسا خیال نہیں رہا تھا، اپنی قوم کی محبت بھی اس کے دل میں کچھ کم نہ تھی اور اسپین کی قسمت پر وہ بہت کچھ رویا بھی ہے اور عربی حکومت

---

[1] یہ تالیف جس میں بہت سی غلطیاں ہیں غالباً کسی قرطبی عیسائی کی لکھی ہوئی ہے، عبدالرحمٰن الداخل کے اسپین میں آنے سے پہلے اندلس کے مسلمانوں میں جو خانہ جنگیاں ہوئی ہیں اور فتح اندلس کے حالات اس تالیف میں بہت اچھی طرح بیان ہوئے ہیں، دیکھو ڈوزی کی کتاب تحقیقات (۱۸۸۱ء) حصہ اول، ص ۲-۱۲

اُس کی نظروں میں وحشیوں کی حکومت تھی، لیکن مسلمان فاتحوں سے اگر اُس نے نفرت ظاہر کی ہے تو یہ نفرت اختلافِ قوم کی بنا پر ہے، اختلافِ مذہب کی بنا پر نہیں، ایسے واقعات جن پر کسی اور زمانے کے پادری خون کے گھونٹ پینے لگتے، علیسیدور کے قلم سے بغیر کسی شکایت کے نکلے ہیں، مثلاً اس نے بیان کیا ہے کہ بادشاہ رزریق کی بیوہ نے عبدالعزیز بن موسیٰ امیر اندلس سے اپنی شادی کر لی، اس قسم کے واقعہ کو بیان کرنے میں نہ اُسے شرم آئی اور نہ کچھ حجاب ہوا بلکہ وہ اُسے ایک معمولی بات سمجھا۔

بعض اعتبار سے عربی فتح ملک کے حق میں ایک نفع ثابت ہوئی، کیونکہ اس فتح سے ملک کی معاشرت میں ایک اہم انقلاب پیدا ہوا، اور اس انقلاب نے بہت سی خرابیاں جن کی وجہ سے یہ ملک صدہا سال سے تکلیف کی حالت میں تھا، دُور کر دیں، جو جماعتیں عیسائیوں کی صاحب مراعات تھیں ان کے اختیارات اور پادریوں کا زور اور اُمرا کی قوت معدوم ہو گئی اور چونکہ ضبط شدہ زمینیں کثرت سے لوگوں میں تقسیم ہو گئی تھیں، اس لیے کاشتکاروں کو زمین کے متعلق مالکانہ حقوق پیدا ہو گئے، اس سے ملک کو بہت نفع ہوا، مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں جو اعلیٰ درجہ کی ترقی زراعت کو ہوئی اس کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہی زمین میں مالکانہ حقوق کا پیدا ہو جانا تھا۔

اس کے علاوہ اسلامی فتح نے غلاموں کی حالت میں بہتری پیدا کی، غلامی کی آزادی کے مسئلہ کو جس نظرِ التفات سے اسلام دیکھتا تھا عیسائی مذہب نہ دیکھتا تھا بالخصوص وہ عیسائی مذہب جس کے شارع اور مفسر قوطیوں کے عہدِ حکومت میں پادری لوگ تھے، رسول اللہ صلعم نے بذریعہ وحی فرمایا تھا کہ غلاموں کو اجازت ہے کہ اپنا فدیہ خود دے کر آزاد ہو جائیں، مسلمانوں کے مذہب میں غلام کو آزاد کرنا بڑا نیک کام تھا، اور اس سے گناہ معاف ہو جاتے تھے پس عربوں میں غلاموں کی حالت نہ تو سخت تھی اور نہ ایسی تھی کہ غلامی ہمیشہ قائم رہے، کچھ دنوں خدمت کرنے کے بعد غلام کو اکثر آزاد کر دیا تھا، بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ وہ مسلمان ہو جاتا تھا، ایسے عیسائی سرف کاشتکاروں کی حالت بھی ترقی کر گئی جو مسلمانوں کی زمین کاشت کرتے تھے، بجائے سرف رہنے کے اب وہ ایک حد تک ایسے کاشتکار ہو گئے

جن کو بہت سی باتوں میں آزادی حاصل تھی، اُن کے مسلمان آقا خود زراعت کرنے میں اپنی
کسرِ شان سمجھتے تھے، اس لیے یہ عیسائی کاشتکار آزاد تھے کہ اپنے ہی پرانے طریقوں کے
مطابق زراعت کریں، عیسائیوں کے غلاموں اور سرف کاشتکاروں کو عرب کی فتح نے آزادی
کا ایک آسان راستہ بتا دیا تھا، اُن کو فقط اس بات کی ضرورت ہوتی تھی کہ عیسائی کے علاقے کو (۲۴۷
چھوڑ کر کسی مسلمان کے علاقے میں چلے جائیں اور وہاں کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ
پڑھ کر" اللہ کے آزاد کردہ غلام بن جائیں، کثرت سے عیسائی سرف کاشتکاروں نے اسی طرح
آزادی حاصل کی جس آسانی سے وہ عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہونے پر آمادہ ہو جاتے تھے
اُس پر تعجب کرنے کی ضرورت نہیں، قسیقوط کے دورِ حکومت میں باوجودیکہ پادریوں کے اختیارات
کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی، پھر بھی عیسائی مذہب کی جڑیں اس مُلک میں زیادہ گہری نہ گئی
تھیں، چوتھی صدی عیسوی میں جس وقت قیصر قسطنطین نے مسیحیت کو دینِ ملوکی قرار دیا تو
اس وقت سے اسپین اپنے پرانے ادیان بت پرستی کا اس درجہ خادم اور وفادار رہا کہ جس وقت
عربوں نے اِس ملک کو فتح کیا ہے تو نصرانیت اور بت پرستی دونوں اس کشمکش میں تھے کہ
ان دونوں میں سے کونسا مذہب ملک پر واقعی مسلط ہوتا ہے، اُسافقہ مجبور تھے کہ دھمکیاں
اور بد دعائیں دیا کریں، اور اُن لوگوں کا سخت تدارک کریں جو جھوٹے خداؤں کو مانتے تھے جو
لوگ واقعی عیسائی مذہب کے پابند تھے، اُن کی پابندی بھی زبان کی تھی دل کی نہ تھی، اور جو
لوگ ملک میں رومانیوں کی اولاد تھے اُن میں مذہب کی طرف سے اپنے باپ دادا کی سی شکوک
موجود تھے، جو لوگ قوطیوں کی نسل سے تھے اُن کو مذہبی معاملات کی پرواہ اتنی کم تھی کہ جس
وقت اُن کے بادشاہ ریکارڈ نے ایریوسی دین عیسوی چھوڑ کر رومن کیتھولک مذہب اختیار کیا
تو وہ بھی بے تکلف رومن کیتھولک ہو گئے، قوطیوں کی سلطنت میں دولتمند پادریوں کی پریشانی
و سرگردانی کے لیے اور بہت سے کام تھے جو اُن کے سپرد تھے، کہیں بدعتی عیسائیوں کی تردید
تھی، کہیں اصول و اسرارِ دین پر مباحثے تھے، کہیں ملک کے سیاسی انتظام میں انہماک تھا
غرض اُن کو سینٹ اگسٹائن کی ہدایت کے مطابق اس کام میں وقت ضائع کرنے کی
مہلت کہاں تھی کہ" وہ غریبوں اور مسکینوں میں جا کر انہی کی طرح اپنے تئیں غریب اور

مسکین بنائیں، اور حق بات کے سب سے پہلے بول اُن کے کانوں میں اس طرح خوش ہو کر کہیں جیسے باپ اپنے بچوں سے باتیں کر کے خوش ہوتا ہے" لوگوں کو جبراً عیسائی مذہب میں توڑے آتے تھے مگر یہ نہ ہو سکتا تھا کہ عیسائی مذہب کی محبت بھی ان کے دل میں پیدا کریں، اس لیے مطلق تعجب کرنے کا مقام نہیں ہے کہ جب عرب فاتحوں نے مسلمان ہونیکی سرط پر اُن کو آزادی دینے کا وعدہ کیا تو وہ اپنی طبیعتوں کو نہ روک سکے، ان لوگوں میں بعض بدقسمت اب تک بت پرست تھے، باقی جس قدر تھے وہ عیسائی مذہب سے اس قدر کم واقف تھے اور عیسائی مذہب میں جو تعلیم اُن کو ملی تھی وہ اس قدر ابتدائی اور بیکار تھی کہ کیتھولک مذہب اور اسلام دونوں کے اسرار اُن کی سمجھ میں نہ آ سکتے تھے، جو کچھ وہ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے تھے وہ یہ تھا کہ پادریوں نے بڑی بیرحمی کے ساتھ غلامی سے آزاد ہونے کی آرزوؤں کو جو خود ان پادریوں نے کسی زمانہ میں ان میں پیدا کی تھیں خاک میں ملا دیا، لیکن یہ غلام عیسائی یا سرف کاشتکار (۲۳۸ ز
ہی ایسے لوگ نہ تھے جنھوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا، بلکہ بہت سے عیسائی امیروں اور شریفوں نے بھی، یا تو جزیہ سے بچنے کے لیے، یا جب عربوں نے پرانے عہد نامے توڑنے شروع کیے تو اپنی جائیدادوں کو محفوظ رکھنے کے لیے، یا اس وجہ سے کہ وہ حقیقت میں اسلام کو خدا کا بتایا ہوا مذہب یقین کرتے تھے، عیسائی مذہب ترک کر دیا۔

اب تک ہم نے اُن فوائد کا ذکر کیا ہے جو عربوں نے اسپین فتح کر کے اس ملک کی رعایا کی سوشل حالت میں پیدا کیے، لیکن یہ کہنا بھی قرین انصاف ہے کہ بعض تعلقات میں مسلمانوں کی فتح نے برے اثرات بھی پیدا کیے، مثلاً عیسائی رعایا اپنے مذہب کے متعلق آزاد رکھی گئی لیکن چرچ (کلیسا، یعنی صیغۂ امور مذہب مسیحی) آزاد نہ رہا، بلکہ برخلاف عہدِ فسیقوطہ کے اُس کی حالت شرمناک اور آزار دہ غلامی کی ہو گئی، مسیحی مجالس کا انعقاد، یا اُساقفہ کا تقرر جو پہلے شاہانِ قوط کے اختیار میں تھا اب سوی النسل سلاطین کی طرف اسی طرح منتقل ہو گیا جیسے کہ اسپین کے شمالی علاقہ اشتوراس میں شاہانِ اشتوراس کی طرف منتقل ہو گیا تھا، مذہبی مجلسوں اور اسقفوں کے مقرر کرنے کا حق ایسے لوگوں کو حاصل ہو جاتا جو مسیحی دین کے دشمن تھے حقیقت میں کلیسا کی بے عزتی کا موجب اور اُس میں خرابیاں پیدا ہو جانے کا باعث ہوا مسیحی

مجلسوں سے جو اُسقف غیر حاضر ہو جاتے تھے اُن کی جگہ پُر کرنے کو یہودی اور مسلمان مجلس میں بٹھا دیے جاتے تھے، جب کسی اسقف کی جگہ مستقل طور پر خالی ہوتی، تو اس خالی جگہ پر جو عیسائی سب سے زیادہ روپیہ پیش کرتا وہ اُسقف مقرر کر دیا جاتا، جو لوگ اس طرح جگہ حاصل کرتے تھے وہ بدعتی یا عیاشں واوباش عیسائی ہوتے تھے، اور انہی کے سامنے عیسائیوں کو اپنی نہایت عزیز اور مقدس اغراض پیش کرنی ہوتی تھیں، اِن عیاشوں اور اوباشوں کا یہ حال تھا کہ کلیسہ کی مقدس رسوم کے وقت بھی وہ درباری سردارانِ عرب کی مدح وستائش میں مصروف ہوتے تھے، بعض وقت وہ اُسقف جو اس طرح مقرر کیے جاتے، اس درجہ ملحد ہوتے تھے کہ عاقبت پر بھی ایمان نہ رکھتے تھے، بعض وقت ایسے بدمعاش بھرتی ہو جاتے تھے جو اپنا ایمان بیچ کر اُن عیسائیوں کا ایمان بھی بیچ ڈالتے تھے جو اُن کی نگرانی میں ہوتے تھے، یعنی جب خود رشوت دے کر مقرر ہوئے تو جن کی مذہبی نگرانی اُن کے ذمہ ہوتی تھی اُن سے رشوت وصول کر کے اپنے نقصان کی تلافی کرتے تھے۔

ایک موقع پر افسرانِ مال نے شکایت کی کہ مالقہ کے عیسائی جزیہ نہ دینے کی غرض سے تحصیلِ جزیہ کے وقت چھپ جایا کرتے ہیں، اس شکایت کو سن کر مالقہ کے اسقف ہوسٹیگیس نے وعدہ کیا کہ اس کے علاقہ میں جس قدر عیسائیوں پر جزیہ واجب الادا ہوتا ہے اُن کی پوری فہرست تیار کر کے پیش کرے گا۔ اسقف کو اپنے وعدہ کا خیال رہا، اور جب سالانہ دورے کو اٹھا تو اپنے علاقے کے تمام عیسائیوں سے درخواست کی کہ وہ اپنے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام لکھ کر اس کو دیں تاکہ اُن کی فہرست تیار کر کے دعا کے وقت ہر ایک کو نام بنام یاد رکھا جائے، عیسائی جن کو اپنے اسقف پر پورا بھروسہ تھا اس دھوکے میں آ گئے، اور آئندہ ایک عیسائی بھی جزیہ دینے کے وقت روپوش نہ ہو سکا، کیونکہ افسرانِ مال کے پاس اسقف کی تیار کردہ فہرست موجود تھی جس میں تمام عیسائیوں کے نام اور پتے درج تھے [1]

[1] یہاں مسلمانوں کے نیک و بد ہونے سے کچھ بحث نہیں ہے، سوال صرف اتنا ہے کہ اسقف بے ایمان تھا یا عیسائی، یا دونوں؟ مترجم

اس کے علاوہ جب عربوں کی قوت کو ملک میں زیادہ استحکام ہو گیا، تو وہ پرانے عہدناموں کی شرائط کے ایسے مستقل طور پر پابند نہ رہے جیسے کہ شروع زمانہ میں تھے، جبکہ وہ رفتہ رفتہ اپنی قوت کو بڑھا رہے تھے، اس تبدیلی سے قرطبہ کے عیسائیوں کو سب سے پہلے نقصان اُٹھانا پڑا، فتح کے وقت اس شہر کے تمام گرجا سوائے شنت بخنت (سینٹ ونسنٹ) کے گرجا کے مسمار کر دیے گئے تھے، اس گرجا پر عیسائیوں کا قبضہ ایک عہدنامہ کے ذریعے سے تھا، کئی برس تک عہدنامے کی پابندی ہوتی رہی، مگر جب شامی عربوں کے آنے سے قرطبہ کی آبادی بہت بڑھ گئی تو شہر کی مسجدوں میں نمازیوں کے لیے جگہ نہ رہی، شامی مسلمانوں نے اس معاملہ میں اب وہی طریقہ اختیار کرنا چاہا، جو دمشق، حمص، اور دیگر شہروں کے بارے میں اختیار کیا تھا، یعنی ہر شہر کے بڑے گرجا کا آدھا حصّہ عیسائیوں سے لے کر اس میں نماز پڑھنے لگے تھے، حکومت نے بھی شامیوں کے اس طریقہ کو پسند کیا، اور عیسائیوں کو شنت بخنت (سینٹ ونسنٹ) کا آدھا گرجا دینے پر مجبور کیا، مسلمانوں کا یہ کام فی الواقع خلافِ عہد تھا، غرض اس طرح نصف گرجا پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، کچھ زمانے کے بعد جب عبدالرحمٰن الداخل اندلس کے امیر ہو گئے تو انھوں نے عیسائیوں سے کہا کہ جو حصّہ اُن کے قبضے میں رہ گیا ہے وہ امیر کے ہاتھ فروخت کر دیں، عیسائیوں نے پہلے تو اس بنا پر قطعی انکار کیا کہ اگر یہ ٹکڑا بھی ہمارے پاس نہ رہا تو پھر عبادت کے لیے کوئی جگہ ان کے لیے نہ رہے گی، مگر امیر عبدالرحمٰن نے اصرار کیا، آخر کار عیسائیوں نے جو حصّہ انکے قبضے میں تھا اسے ایک لاکھ دینار، نرخ پر (جو آجکل کے حساب سے ۴ لاکھ ۴ ہزار پونڈ یا ۶۰ لاکھ روپے ہوتے ہیں) امیر اندلس کے ہاتھ فروخت کر دیا، اور اس بات کی بھی اجازت حاصل کر لی کہ قرطبہ میں جس قدر گرجا گرا دیے گئے تھے اُن کو از سر نو تعمیر کر لیں، امیر عبدالرحمٰن نے گو اس وقت انصاف کیا، لیکن ہمیشہ اُن کا یہ حال نہ رہا، انھوں نے اس عہدنامے کو جو طارق نے رزریق سے پہلے بادشاہ غیطشہ کے لڑکوں سے کیا تھا توڑ دیا، اور اُن میں ایک شہزادے کی جائداد جس کا نام اردالبت تھا، یہ کہہ کر ضبط کر لی کہ ایک عیسائی کے لیے اتنا بڑا علاقہ غیر ضروری ہے، اس کے علاوہ اور عہدنامے تھے جن میں تبدیلیاں پیدا کی گئیں، یا اُن کو بالکل ہی مسترد کر دیا گیا، حتیٰ کہ نویں صدی عیسوی میں تقریباً سوا سو برس کے بعد کوئی پرانا عہدنامہ

باقی نہ رہا۔

علاوہ اس کے فقہانے حکومت کو یہ پڑھانا شروع کیا کہ وہ اپنا مذہبی جوش اس طرح ظاہر کرے کہ عیسائیوں سے جو محصول لیے جاتے ہیں اُن میں بیش قرار اضافہ کردے، چنانچہ اس کی وجہ سے قرطبہ اور دیگر شہروں کی عیسائی رعایا تباہ تنگ وست ہوگئی ا ایک موقع پر ایک لاکھ دینار خاص طور محصول کی مد میں عیسائیوں سے لیا گیا) بہ الفاظِ دیگر یہ سمجھنا چاہیئے کہ اسپین میں بھی اہلِ عرب کی حکومت میں وہی ہوا جو اُن کے دیگر مفتوحہ ملکوں میں ہوتا رہا تھا یعنی یہ کہ عرب ابتدا میں نرمی اور رحمدلی سے حکومت کرتے تھے، لیکن پھر اُن کی حکومت مطلق العنان ہوکر ناقابلِ برداشت ہوجاتی تھی، نویں صدی عیسوی سے آگے چل کر اسپین (۲۷
کے فاتحوں نے امیر المومنین عمرؓ کی اس برجستہ ہدایت کی لفظاً لفظاً پابندی کی کہ" ہم عیسائیوں کو نگلیں اور ہماری اولاد عیسائیوں کی اولاد کو جب تک اسلام قائم ہے نگلتی رہے ؎" بہرکیف فتح اسپین کے ایک صدی بعد دولتِ عرب سے جن لوگوں کو سخت شکایت پیدا ہوئی وہ عیسائی نہ تھے بلکہ مولدین میں سے ایسے عیسائی تھے جو اپنا مذہب بدل کر مسلمان ہوگئے تھے، یہ نو مسلم سب کے سب ایک ہی خیال کے نہ تھے، ان میں بعض ایسے تھے کہ گو مسلمان ہوگئے تھے مگر در پردہ عیسائی تھے اور ترکِ مذہب پر نادم تھے، ان بظاہر مسلمان مگر درپردہ عیسائیوں کی حالت حقیقت میں نہایت خراب تھی، کیونکہ مسلمان ہوجانے کے بعد وہ اپنے دین پر نہ لوٹ سکتے تھے اس معاملہ میں اسلام نہایت سخت تھا، اگر عیسائی ایک مرتبہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوگیا تو پھر اس کو ہمیشہ مسلمان ہی رہنا پڑتا تھا، خواہ اس کا دل اسلام سے کتنا ہی منحرف ہوجائے، اور خواہ ایسے تبدیل مذہب پر وہ اپنے تئیں کتنی ہی نفریں کرتا ہو، اس سے کچھ غرض نہ تھی کہ کلمہ اُس نے غصہ کی حالت میں پڑھا تھا یا کمزوری کی حالت میں، یا تنگدستی سے مجبور ہوکر، یا ایسی حالت میں وہ مسلمان ہوا تھا کہ جزیہ ادا کرنے کو پاس پیشہ نہ تھا، یا کسی جرم کا مرتکب ہوا تھا جس کی سزا اس کے عیسائی حاکم سخت دیتے لیکن مسلمان ہونے سے وہ ایسی سزا سے بچ گیا، بہرصورت مسلمان ہونیکے بعد ترک

حضرت عمرؓ نے اس قسم کی کوئی ہدایت کبھی کسی کو نہیں دی (مترجم)

اسلام ایسا قصور تھا جس کی سزا موت تھی[1]، ایسے نومسلموں کی اولاد جو عیسائی مذہب قبول

[1] اسلام ارتداد کی سزا ہرگز قتل تجویز نہیں کرتا، اور قرآن مجید میں قطعاً ایسی کوئی آیت موجود نہیں جس کا مضمون یہ ہو کہ مرتد کو قتل کر دیا جائے۔ مسلمان ہونے یا کفر اختیار کرنے کو اسلام نے انسان کی اپنی مرضی اور خوشی پر پر موقوف رکھا ہے، اور اس معاملہ میں ہرگز کسی جبر اور سختی کی اجازت نہیں دی۔ قرآن مجید میں جابجا اس مطلب کی آیتیں ہم پڑھتے ہیں، مثلاً لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ (یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں) یا فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (یعنی جو شخص چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کردے) اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (یعنی ہم نے انسان کو سیدھا راستہ بتلا دیا ہے، اب چاہے وہ مسلمان ہو کر شکر گذار بنے اور چاہے کافر ہو کر ناشکرا) ایک جگہ خاص ارتداد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ (یعنی جو کوئی تم (مسلمانوں) میں سے اپنے دین سے پھر جائے اور اسی حالتِ کفر میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا اور آخرت میں بیکار گئے اور وہ دوزخی ہوں گے) بجائے اس کے کہ مرتد کی سزا قتل ثابت ہو فَيَمُتْ کے لفظ سے یہاں قتل کی صریح نفی نکلتی ہے یہاں یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے کہ مرتد کو ارتداد کی نہ صرف کوئی سزا نہیں دیجائیگی، بلکہ آخرت کی سزا (یعنی دوزخ) بھی صرف اسی صورت میں ملے گی جبکہ وہ اسی حالتِ ارتداد میں مرجائے، ورنہ نہیں، اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو خداتعالیٰ یہاں یہ فرماتا کہ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَاقْتُلُوْهُ۔ ایک دوسری جگہ آتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ (یعنی جو لوگ ایمان لائے پیچھے کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے پھر کافر ہو گئے، پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو اللہ ان کو نہیں بخشے گا) اس سے کیا ثابت ہوا؟ یہی، کہ نہ صرف ایک مرتبہ ارتداد کی سزا قتل نہیں، بلکہ جو شخص بار بار مرتد ہوا اور اسلام قبول کر کر کے انکار کرتا ہے اور اس طرح دوسرے کمزور مسلمانوں کے لیے فتنے اور ابتلا کا موجب بنے ایسے شخص کے لیے بھی اس دنیا میں کوئی سزا تجویز نہیں کی گئی۔ علاوہ ازیں ایک اور محکم آیت بھی ہمارے دعوے کو یقینی طور پر ثابت کرتی ہے جو یہ ہے وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِىْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

کرنا چاہتی تھی اُس کی حالت اور بھی خراب تھی، خود اس کا کوئی قصور نہ تھا، اپنے باپ دادا کے قصور کی سزا پا رہی تھی، شرع کے مطابق یہ لوگ مسلمان تھے کیونکہ مسلمان کی اولاد تھے ترکِ اسلام سے یہ بھی مستوجب قتل ہو جاتے، اسلام کا قبضہ اِن پر جہد سے لے کر لحد تک نہ اُٹھ سکتا تھا، اس لیے تعجب کا مقام نہ تھا کہ جو عیسائی مسلمان ہو کر تبدیل مذہب پر نادم و پشیمان تھے اُن کے دلوں میں مسلمانوں کی طرف سے ایک خصومت رہنے لگی، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم تھی، زیادہ تر حصّہ نومسلم عیسائیوں کا ایسا تھا جو دل سے اسلام کا پابند تھا، لیکن اُس کو بھی عربوں کی سلطنت سے شکایت تھی، اِن لوگوں کو سلطنت سے شکایت رہنی بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اکثر نومسلم وہ تھے جو پہلے عیسائی غلام تھے اور مسلمان ہو کر آزاد ہوئے تھے، یہ وہ لوگ تھے جنکی حالت اسلامی فتح کی وجہ سے بہت بہتر ہو گئی تھی، پھر کیا وجہ ہوئی کہ یہ لوگ بھی عربوں سے ناراض رہنے لگے؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یعنی اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ صبح کو قرآن پر ایمان لے آؤ اور شام کو منکر ہو جاؤ تاکہ وہ (یعنی مسلمان بھی اسلام کو جھوٹا سمجھ کر اپنے پہلے دین پر لوٹ جائیں) یہ آیت مدینہ میں اس وقت نازل ہوئی جبکہ وہاں مسلمانوں کی حکومت تھی، اگر واقعی اسلام میں مرتد کی سزا قتل تھی تو کیا یہودیوں کا ایک بچہ بھی ایسی شرارت کی جرأت کر سکتا تھا! اس قسم کی فتنہ انگیزی کا ظہور یہودیوں سے اسی وقت ہوا جبکہ اُن کو پورا یقین تھا کہ شخص اسلام سے انکار کر دینے سے حکومت کسی قسم کی کوئی سزا نہیں دے گی؛ صلحنامہ حدیبیہ میں ایک شرط بھی تھی کہ جو مسلمان (مرتد ہو کر) اہل مکہ میں جا ملے گا اُسے واپس نہیں کریں گے، اگر خدا تعالیٰ کا حکم قتلِ مرتد کا ہوتا تو پھر آنحضرت صلعم اس شرط کو ہرگز منظور نہ فرماتے، پس آنحضرت صلعم کے عمل اور خدا تعالیٰ کے ارشاد کے صریحی خلاف اگر قتل مرتد کے متعلق کوئی حدیث یا قول پیش کیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ بالکل جعلی اور وضعی ہوگا،

اس صورت میں ڈوزی کا یہ قول کہ اسلام اس معاملہ میں نہایت سخت تھا" نہ قابل قبول ہے اور نہ صحیح سالقبہ اگر ایام جنگ میں کوئی شخص مسلمانوں کی فوج میں سے بھاگ کر لشکر کفار میں جا ملے، یا مرتد ہو کر مسلمانوں کے قتل و خون کا مرتکب ہو تو بیشک اس کا قتل اسلام جائز قرار دیتا ہے، مگر اس صورت میں یہ سزا ارتداد کی نہیں ہوگی بلکہ غداری اور قتل و غارت کی ہوگی، اور آج بھی تمام مہذب سلطنتیں اس قسم کے لوگوں کو یہی سزا دیتی ہیں، (اسمٰعیل)

نہیں ہے، ایک مصنف نے لکھا ہے "تاریخ میں ایسی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کسی سلطنت میں آشوب و انقلاب محض اس وجہ سے نہیں ہوا کرتا کہ رعایا کی حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے بلکہ ایسی بغاوتیں اکثر اس وقت بھی پیدا ہوئی ہیں جبکہ کسی ملک کی رعایا سخت اور ناقابل برداشت قوانین کی پابندی میں صبر کے ساتھ مصیبتیں جھیلتی رہی ہو، اور پھر یک لخت ایسے قوانین کا بوجھ اس کے سر سے ٹل گیا ہو" یہ لکھنا بھی ضروری ہے کہ معاشرت کے اعتبار سے نو مسلموں کا درجہ کم تھا، عرب اُن کو ایسے سرکاری عہدوں سے جن کی تنخواہیں بڑی ہوتی تھیں معمولاً محروم رکھتے تھے اور اُن کی طرف سے بدگمان رہتے تھے کہ وہ دل سے مسلمان نہیں ہوئے ہیں اس لیے حقارت کی نظر سے اُن کو دیکھتے تھے، چونکہ ان نومسلموں میں بہت سے لوگ ایسے تھے جن پر عیسائی حکومت کے زمانہ میں غلامی کی مہر لگائی گئی تھی، اور اب تک وہ ان کی پیشانیوں پر موجود تھی، اس لیے عرب ان کو غلام یا ابن غلام کہا کرتے تھے، اور پھر ان دونوں لفظوں کے استعمال میں تمیز کرنی بھی چھوڑ دی تھی اور ایسے نومسلموں کو بھی جو پہلے معزز اور شریف گھرانوں کے عیسائی تھے ان ہی بُرے الفاظ سے پکارنے لگتے تھے، نومسلموں نے صبر کے ساتھ اس توہین کو برداشت نہیں کیا، کیونکہ اُن کو اپنا مرتبہ معلوم تھا، وہ جانتے تھے کہ ہم میں ایک قوت ہے جو وقت پر ہم کو سہارا دے گی، آبادی کا بڑا حصہ یہی نومسلم تھے، وہ نہ سمجھ سکتے تھے کہ ایک چھوٹی سی جماعت (یعنی اہل عرب) جو سب سے علیحدہ رہتی ہے، کل اختیارات کی مستحق ہو سکتی ہے پس نومسلموں کو گوارا نہ ہوا کہ وہ ذلت کی حالت میں زیادہ رہ سکیں اور ایسے لوگوں کی حکومت اور گستاخیوں کو برداشت کر لیں جن کی حقیقت اس سے زیادہ نہ تھی کہ غیر ملک کے چند لڑنے والے تھے جو مختلف مقامات پر سپاہیوں کی حیثیت سے چھاونیوں میں رہتے تھے نومسلموں یعنی مولدوں کی بغاوتوں نے جن میں عیسائی بھی شامل ہوئے بہت سی شکلیں اختیار کیں، ہر ایک صوبے اور بڑے شہر نے مختلف وقتوں میں عربوں سے بغاوت اختیار کی، اور اُن وجوہ سے جو آگے ظاہر ہوں گے رعایا کی کوششیں کہ کسی طرح عربوں کی حکومت سے آزاد ہو جائیں اور بھی سخت اور متواتر ہو گئیں۔

اَسناد:

ابن القوطیہ	ص ۴، ۵
ابن عذاری	جلد ۲ ص ۱۱، ۱۴، ۲۴-۲۴۵-۲۴۴، ۱۴-۲۴۲
مقری	جلد ۱ ص ۳۵۹، ۳۶۸
	جلد ۲ ص ۱۱، ۱۴
اسپناسگرادا	Espana Sagrada xi 325-516
	حصّہ ص ۲-۵، ۸
الوار Alvar	خط ۱۳ ص ۲
ابن بطوطہ	جلد ۱ ص ۱۹۸
اخبار مجموعہ	ص ۴۷
اصطخری	ص ۴۳
البصری	ص ۱۲۴

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

تیسری فصل

یوم الخندق

دارالحکومت قرطبہ میں مولدین یعنی نومسلم اسپینی اور اُن کی اولاد جو خصوصیت کیساتھ مولدین کہلائی جاتی تھی بکثرت آباد تھی، ان میں اکثر آزاد شدہ غلام تھے جو اب اپنی خریدی ہوئی زمینوں پر زراعت یا عربوں کے علاقوں اور جاگیروں میں یومیہ مزدوروں کی طرح کام کرتے تھے، یہ سب بڑے مضبوط، محنتی، اور خاصے خوشحال لوگ تھے، کیونکہ شہر کے جنوبی حصہ اشقندہ میں وہ سکونت رکھتے تھے، لیکن اب اُن میں سیاسی انقلاب پیدا کرنے کے جذبات پیدا ہو گئے اور امیر حکم بن ہشام کے دورِ حکومت میں فقہا کی پشت گرمی سے اُنھوں کے ایک ایسی سخت بغاوت کی جس کا انجام اُن کے حق میں نہایت مصیبت ناک ہوا۔

امیر عبدالرحمٰن الداخل کو اپنی قوت اور اقتدار کا اس درجہ پاس تھا کہ اُنھوں نے فقیہوں کے اختیارات کو اتنا نہ بڑھنے دیا کہ وہ امیر کی مطلق العنان تدابیر میں مخل ہو سکتے، لیکن امیر ہشام کے زمانہ میں جو عبدالرحمٰن کے فرزند تھے اور باپ کے بعد تخت نشین ہوئے، فقہا کے اثر اور اختیار میں اضافہ ہوا، ہشام زمانۂ شہزادگی میں نہایت مذہبی شخص تھے اور نیکی اور اخلاق کی

مجسم تصویر تھے، جب تخت نشین ہوئے تو رعایا اس تذبذب میں تھی کہ برائی اور بھلائی اگر دونوں پیش نہ رہیں تو نہیں امیر کا میلان کس طرف ہو۔ کیونکہ اُن کی باتوں سے ظاہر ہو چکا تھا کہ جہاں رحم دلی اور فیاضی طبیعت میں موجود ہے، وہاں انتقام لینے اور ظلم کرنے کا مادہ بھی غیر حاضر نہیں، لیکن رعایا کا یہ تذبذب جلد رفع ہو گیا، ایک نجومی نے یہ پیشین گوئی کی کہ امیر کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ ہشام نے جب یہ سنا تو دنیا کی تمام لذتوں سے ہاتھ کھینچا اور نیک کاموں سے اپنی آخرت کی بہتری میں مصروف ہوئے، نہایت سیدھا سادہ لباس پہن کر قرطبہ کے گلی کوچوں میں پھرا کرتے، غریبوں سے ملتے، بیماروں کے پاس جاتے، مفلسوں کے گھر پہنچتے اور نہایت دردمندی سے اُن کی تکلیفوں اور ضرورتوں کو معلوم کر کے ان کو رفع کرتے اکثر زیادہ رات گئے زور کی بارش میں قصرِ امارت سے چپکے سے نکل جاتے، کسی غریب بیمار کے لیے کھانا ساتھ لیتے، اور اُس کے گھر میں جا کر بیمار کے پاس تنہا بیٹھے اس کی تیمارداری کرتے، اوقاتِ نماز کے نہایت پابند تھے، لوگوں کو بھی یہی ہدایت کرتے تھے اور جب اندھیری راتوں میں بارش کا طوفان ہوتا اور دیکھتے کہ نمازی باوجود موسم کی خرابی کے نماز کے لیے مسجد میں وقت پر حاضر ہوئے ہیں تو اُن کو انعام دیتے۔

یہی زمانہ تھا کہ مشرق میں ایک نئی جماعت فقہا کی پیدا ہوئی، مالک بن انس مدنی کو یہ جماعت اپنا امام مانتی تھی، امام مالک مذہب سنت والجماعت کے چار اماموں میں سے ایک ایک امام تسلیم کیے گئے ہیں، اس جماعتِ فقہا سے امیر ہشام کو نہایت عقیدت ہو گئی امام مالک عباسیوں سے جن کی حکومت میں وہ رہتے تھے سخت ناراض ہو گئے تھے، وجہ یہ ہوئی تھی کہ عباسیوں نے اُن پر یہ الزام عائد کر کے کہ ایک علوی کو جو مدعی خلافت تھا انھوں نے مدد دی ہے، اُن کو سزائے تازیانہ دی اور اُن کا ایک ہاتھ تڑوا دیا، چونکہ امیر اندلس امام صاحب کے ان ایذا رسانوں (یعنی عباسیوں) کا مخالف تھا، اس لیے امام صاحب کا خیال اُس کی طرف گیا، لیکن یہ امر کہ امیر اندلس اُنکا عقیدت مند بھی ہے امام صاحب کو بعد کو معلوم ہوا، جب امام صاحب کے تلامذہ نے ہشام کے زہد و ورع کی تعریفیں شروع کیں تو اُن کو ایک گونہ توجہ اُس کی طرف ہوئی اور وہ ہشام کو اسلامی بادشاہوں کا ایک اچھا نمونہ

سمجھنے لگے، اور فرمایا کہ ہشام ہی ایک ایسا شخص ہے جو مسندِ حکومت پر بیٹھنے کے لائق ہے جب یہ اندلسی طلبہ مدینہ سے اسپین کو واپس آئے تو امیر ہشام کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ امام صاحب حضور کے نہایت مداح ہیں، ہشام اس بات کو سن کر ایسا خوش ہوا کہ مالکی عقائد کی جہاں تک ممکن ہوا اسپین میں اشاعت شروع کرادی، دینیات کے طلبہ کو وظیفے دیئے تاکہ وہ مدینہ جاکر مالکی مذہب کی تعلیم و تربیت حاصل کریں، اسپین کے محکمہ قضا میں بھی جہاں تک ہوسکا مالکی مذہب کے علماء کو بڑے بڑے مناصب پر مقرر کیا۔

۱۸۰ھ (۷۹۶ء) میں جب ہشام کا انتقال ہوا تو تمام ملک میں مالکی مذہب کی نہایت عزت کیجاتی تھی بہت سے لائق نوجوان دل میں اُمنگ رکھنے والے مالکی عقائد کے پابند تھے، انہی لوگوں میں بربر کے قبیلے مصمودہ کے ایک نوجوان یحییٰ ابن یحییٰ[1] تھے، اُنھوں نے مدینہ میں امام صاحب سے پڑھا تھا، اور امام صاحب اپنے تلامذہ میں ان کو بہترین سمجھتے تھے، چنانچہ ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک روز امام صاحب شاگردوں کو درس دے رہے تھے کہ راستے سے ایک ہاتھی گذرا جس قدر شاگرد تھے سبق چھوڑ کر ہاتھی کو دیکھنے باہر نکل آئے، صرف یحییٰ بیٹھے رہ گئے، امام صاحب کو تعجب ہوا اور پوچھنے لگے "یحییٰ! تم کیوں ہاتھی دیکھنے باہر نہیں گئے؟ اندلس میں تو یہ جانور نہیں ہوتا۔ یحییٰ نے عرض کیا حضور میں اپنے وطن سے حضور کی تعلیم سے مستفید ہونے حاضر ہوا ہوں، ہاتھی دیکھنے نہیں آیا"۔ امام صاحب شاگرد کے جواب سے ایسے خوش ہوئے کہ یحییٰ کو "عقیل الاندلس" کا خطاب دیا، قرطبہ میں یحییٰ کو بہت شہرت حاصل ہوئی، اور وہ اسپین میں مالکی مذہب کے سب سے بڑے عالم اور فقیہہ مانے جاتے تھے، لیکن جس قدر علم و فضل میں زیادتی رکھتے تھے اسی قدر مغرور بھی تھے، اس میں شک نہیں کہ یحییٰ ایک غیر معمولی شخص تھے، اور ان میں آج کل کے ایک معلم کی حیثیت اور عہدِ وسطیٰ کے ایک پاپائے روما کا سا شوقِ حکومت مجتمع تھا۔

---

[1] یحییٰ، بربر کے قبیلہ مصمودہ سے تھے اور عربی قبیلہ بنی اللیث کے موالی تھے، طارق بن زیاد کیساتھ ان کے دادا اندلس میں آکر آباد ہوئے تھے۔

ہشام کے بعد حکم امیر اندلس ہوئے، ان کی طبیعت یحییٰ بن یحییٰ، جو عقیل اندلس مشہور تھے، یا (۲۴۴
دیگر مالکی فقہا کی طبیعت کے برعکس تھی، لیکن حکم لامذہب آدمی نہ تھے، اُن کے دادا عبدالرحمٰن الداخل کے ایک نہایت متقی اور پرہیزگار موالی نے جو حج بیت اللہ سے مشرف ہو چکے تھے بچپن میں انھیں تعلیم و تربیت دی تھی، اس لیے حکم نے مذہب اور پیشوایانِ مذہب کی دل سے عزت کرنی سیکھ لی تھی، علماء سے گفتگو کرنے کے بہت شائق تھے، قضاۃ کی بہت عزت کرتے تھے، ایسی حالتوں میں بھی جبکہ یہ محکمہ قضا کے افسر حکم کے عزیزوں اور دوستوں کے خلاف سخت حکم سناتے تھے یا خود امیر حکمؔ کے خلاف کوئی حکم صادر کرتے تھے، لیکن طبیعت رنگین پائی تھی، خوش صحبت تھے، زندگی کے لطف اُٹھانے سے محروم نہ رہنا چاہتے تھے، فقہا پھیکی اور بے مزہ زندگی کو بہترین طریقہ سمجھتے تھے، حکم اُسے ناپسند کرتے تھے، فقہا نے اُنھیں بار بار شکار سے منع کیا، مگر اُن کے اس شوق میں کمی نہ ہوئی، شکار کا شوق فقہا کے مذاق کے بالکل خلاف تھا، علاوہ اسکے جو سب سے بڑی بات اُن میں تھی وہ یہ تھی کہ حرمت شراب کے حکم کو کالعدم سمجھتے تھے، یہ تمام عیوب تو کسی نہ کسی طرح معاف ہو بھی جاتے، لیکن جس چیز کو معاف کرنا ممکن نہ تھا، وہ یہ تھی کہ حکمؔ اپنے اختیارات خود اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے تھے، اور اسی بنا پر وہ فقیہوں کو ملکی معاملات میں ایسے اختیارات جو وہ حاصل کرنا چاہتے تھے نہ دے سکے، حکمؔ کو یا تو اس کا علم نہ ہوا، یا معلوم کرنے کی پروا نہ ہوئی کہ فقہاء مالکی عقائد کی نئی بندش سے یکجا و یکجہت ہو کر سلطنت میں بہت بڑی قوت ہو گئے ہیں، جس کے مقابلہ پر ایک نہ ایک دن بادشاہ کو آنا ضروری ہوگا۔

جب فقہا کی اُمیدیں بر نہ آئیں تو انھیں ایک غرور پیدا ہوا، جو کسر نفسی کے لباس میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے اور بھی سخت و درشت تھا، اور اب یہ معلمانِ دین کی حیثیت کو بدل کر سیاسی معاملات میں شہرت کے خواہاں ہو گئے، ہجو و ملامت کے لیے جس قدر فصاحت کی ضرورت تھی وہ ختم کر کے بادشاہ کا ذکر بھی بغیر نفرین کے نہ کرتے تھے، اسی سلسلہ میں ایک دن انھوں نے حکم دیا کہ بادشاہ کی نیک ہدایت کے لیے دعائیں مانگی جائیں، اِن دُعاؤں کی عبارت بھی عجیب تھی مثلاً "اے خُدا! اس فاسق و فاجر کو جسے اپنے گناہوں پر اصرار اور احکامِ خدا کی پابندی سے گریز ہے، لہو و لعب سے محفوظ کر، اور اس حالتِ گمراہی سے اُسے راہِ راست پر لا۔" قرطبہ کے

نو مسلم بھی جو پہلے ہی سے ناراض بیٹھے تھے فقہار کا ساتھ دیکر ایسے سخت گنہگار کے حق میں دعا کرنے لگے، نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک دن امیر حَکَم قرطبہ کے بازار میں سے گذر رہے تھے کہ (۲۴۵ کچھ لوگوں نے ہجوم کر کے اُن کو پتھر مارے، بادشاہ اور دستہ فوجِ محافظ نے جو ساتھ تھا، کسی طرح تلواریں برہنہ کر کے اس انبوہ میں سے رستہ نکالا (۱۸۹ھ - ۸۰۵ء)

اب یحییٰ ابن یحییٰ فقیہہ اور عیسیٰ ابن دینار نے امراء قرطبہ سے سازش کر کے ابن شماس کو جو امیر حَکَم کا عمزاد تھا، مسندِ امارت پر بٹھانا چاہا، ابن شماس نے قبل اس کے کہ ان فقہا، اور امراء کی تحریک کو منظور کرے اُن لوگوں کے نام دریافت کیے جن پر اس معاملہ میں پورا پورا بھروسا کیا جائے، اہل سازش نے وعدہ کیا کہ ایک فہرست ایسے تمام لوگوں کی جو اس تحریک میں معاون و مددگار ہیں مرتب کر کے ابن شماس کو دی جائے گی، انھوں نے ایک تاریخ بھی مقرر کی کہ اس تاریخ کو رات کے وقت سب لوگ آکر وہ فہرست ملاحظہ کرینگے، اتنا سنکر ابن شماس خفیہ طور پر حکم کے محل میں آیا اور کل واقعہ سے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔

امیر حکم نے اس واقعہ کو کچھ یقین کے ساتھ نہ سنا، اور بگڑ کر کہا "اے ابن شماس کیا تو ایسے بزرگوں کے خلاف جو شہر میں سب سے زیادہ عزت والے ہیں، مجھے غصہ دلانے آیا ہے؛ قسم ہے خدا کی، تجھے اپنے قول کی تصدیق کرنی ہوگی ورنہ تیرا سر قلم کر دوں گا"۔

ابن شماس نے جواب دیا "بہتر ہے، ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے، مگر اس بات کا وعدہ فرمایئے کہ جو تاریخ میں نے بیان کی ہے اُس کی رات کو آپ کوئی معتبر شخص میرے پاس بھیجدیں گے" امیر حَکَم نے کہا "اچھا"۔

جب وہ رات آئی تو حکم نے اپنے معتمد خاص ابن الخدع اور عیسائی غلام یا نطو کو ابن شماس کے پاس بھیجدیا، ابن شماس نے ان دونوں کو پردے کے پیچھے چھپا کر بٹھا دیا، اہل سازش کو طلب کرنے پر جب وہ لوگ آئے تو ابن شماس نے کہا کہ "فرمایئے وہ کون کون لوگ ہیں جن پر ہم بھروسا کر سکتے ہیں؛ سازشیوں میں ایک نے فہرست میں سے نام پڑھنے شروع کیے، ابن الخدع نے جو پردے کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، نام سن سن کر لکھنے شروع کیے، لیکن فہرست میں ایسے لوگوں کے نام بھی تھے جو ظاہر میں امیر حَکَم کے بڑے

دوست اور خیر خواہ تھے، ابن الخندع کو یہ خوف ہوا کہ کہیں میرا نام بھی نہ لیا جائے، اس گھبراہٹ میں اُس نے مناسب سمجھا کہ پردے کے پیچھے اپنا بیٹھا ہونا ظاہر کر دے، چنانچہ اس نے کاغذ پر قلم اس طرح چلایا کہ اس کی چرچراہٹ کی آواز سازشیوں کے کانوں تک پہنچ گئی اور وہ ہوشیار ہو کر یہ کہتے ہوئے بدحواس ہو کر بھاگے "اے ابن شماس! خدا کے دشمن، تو نے ہمارا بھید کھول دیا"

ان میں سے اکثر نے قرطبہ چھوڑ کر اپنی جان بچائی۔ بھاگنے والوں میں سے عیسیٰ ابن دینار، اور یحییٰ ابن یحییٰ بھی تھے، یہ قرطبہ سے نکل کر طلیطلہ چلے گئے، جہاں کے لوگ حکم سے باغی ہو کر پہلے ہی سے خودسر ہو گئے تھے، باقی سازشی اتنے خوش نصیب نہ تھے، چنانچہ ان میں کے ۷۲ آدمی جن میں کے چھ آدمی قرطبہ کے نامی رئیس تھے گرفتار ہو کر صلیب پر چڑھا دیے گئے۔

۲۴ سنہ ۱۹۰ھ / ۸۰۶ء میں جس زمانہ میں امیر حکم ماردہ میں ایک بغاوت فرو کرنے کے لیے آ گئے ہوئے تھے، تو قرطبہ کے لوگوں نے پھر ان سے سرکشی اختیار کرنی چاہی، معاملہ کی صورت بہت بگڑ جاتی مگر امیر حکم یہ خبر سنتے ہی فوراً قرطبہ واپس آئے اور متمردوں کو مغلوب کر کے جو لوگ ان میں سرغنہ تھے اُن کو قتل یا مصلوب کرا دیا۔

اگر قتل و صلیب کی یہ سخت سزائیں اہل قرطبہ کو ٹھنڈا نہ کر سکیں تو طلیطلہ والوں پر جو کچھ گذری اُس نے قرطبہ والوں پر ثابت کر دیا کہ امیر حکم جن کے مزاج کی نرمی رعایا کی سرتابی سے روز بروز کم ہو کر سختی میں بدلتی جاتی تھی، ایسے شخص ہیں جو باغیوں کو مطیع کرنے میں کسی یا قتل کو عمل میں لانے سے مطلق پرہیز نہ کریں گے۔

طلیطلہ جو شاہان گوط کا دارالسلطنت رہا تھا، محکوم عیسائیوں کی نظروں میں اپنی قدیم شہرت، اور پادریوں کے علم و فضل، اور افسران کلیسہ یعنی مطرانوں کے وسیع اثر کے باعث اب تک "مدینۃ الملوک" سمجھا جاتا تھا، عیسائی رعایا اس شہر کو ملکی اور مذہبی دونوں اعتبار سے اسپین کا بزرگ ترین شہر خیال کرتی تھی، طلیطلہ کی شہر پناہ کے اندر عرب اور بربر بہت کم رہتے تھے یہ لوگ فاتح تھے، شہر سے باہر مضافات کے اُن علاقوں میں رہتے تھے، جو پہلے عیسائی شرفا کے تھے، لیکن مسلمانوں کے حملے کے وقت بھاگ جانے سے اُن کے یہ علاقے ضبطی میں آ کر مسلمانوں میں باہم تقسیم ہو گئے تھے۔

شہر کے لوگ بڑے پرجوش اور بہادر تھے[1] اور آزادی کا جوش اُن میں بہت تھا[2] عرب مورخ اُن کی نسبت لکھتے تھے کہ "کسی بادشاہ کی رعایا ایسی سرکش اور نافرمان نہیں ہے جیسے کہ طلیطلہ کے لوگ ہیں" شاعر بیب جو ایک ایسے خاندان کا آدمی تھا جو عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان ہوا تھا یہاں کے لوگوں میں بہت شہرت رکھتا تھا، جب تک یہ شاعر زندہ رہا، امیر حَکَمؒ کی ہمت نہ ہوئی کہ طلیطلہ کے لوگوں کی مزاج پرسی کرتا، لیکن جب وہ مرگیا، تو امیر نے ایک شخص کو جو وشقہ کا رہنے والا عیسائی سے مسلمان ہوا تھا اور عمروس بن یوسف اس کا نام تھا طلب کیا، اور اہل طلیطلہ کے تدارک کی بابت اپنا پوشیدہ ارادہ اس پہ ظاہر کیا اور کہا کہ "صرف تم ہی ان باغیوں کو سزا دینے میں میری مدد کرسکتے ہو کیونکہ اگر کسی عرب کو طلیطلہ والوں پر حاکم بنا کر بھیجا جائے گا تو وہ اس کو حاکم نہ مانیں گے، البتہ تم کو ضرور حاکم تسلیم کریں گے، کیونکہ تم انہی کی قوم کے آدمی ہو" اس کے بعد امیر حَکَمؒ نے اپنا پوشیدہ منصوبہ جو نہایت ظلم اور سفاکی کا تھا عمروس پر ظاہر کیا، عمروس نے اسے اوّل تا آخر سنکر اس پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اس جاہ پرست عمروس کو نہ تو مذہب[3] کا پاس تھا اور نہ اخلاق کا اس وقت اس کی یہی خواہش تھی کہ امیر کی مدد پر کمربستہ ہو کر اپنے ہی ملک والوں کو قتل کرے اسکے بعد جب عمروس کو ارشلونہ کے افرانسیسی بادشاہ کی ماتحتی میں خود اپنی ایک حکومت قائم کرنے کا خیال ہوا تو اسے امیر حَکَمؒ کا بھی خیال نہ رہا، اور شارلمین بادشاہ افرنجہ کے بیٹے سے امیر حَکَمؒ کے خلاف سازش کرلی۔

۱۹۱ھ میں امیر حَکَمؒ نے عمروس کو طلیطلہ کا گورنر مقرر کردیا، اور ایک خط اہل طلیطلہ کے نام اس مضمون کا لکھا کہ "ہم نے اپنے الطاف خسروانہ سے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (۳۴۷)
تمہاری بہتری کا ہمیں خیال ہے اپنے موالی میں سے کسی شخص کو تم پر حاکم بنا کر نہیں بھیجا بلکہ

[1] مسلمانوں کے حملے کے وقت تو طلیطلہ کے عیسائیوں نے کوئی بہادری نہیں دکھائی تھی (مترجم)

[2] آزادی کے جوش سے یہ مطلب سمجھنا چاہیے کہ فتنہ و فساد کا مادہ اُن میں بہت تھا (مترجم)

[3] عمروس مسلمان تھے، کس مذہب کا پاس اس کو ہوتا؟ عیسائی مذہب کا یا اس مذہب کا جسکے عیسائی دشمن تھے مترجم

ایسے شخص کو گورنر مقرر کیا جو تمہاری ہی قوم کے روسا میں سے ہے"۔ عمروس جب طلیطلہ پہنچا تو اس نے وہاں کے لوگوں کی خاطر و مدارات اور ان کے دلوں کو مسخر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اور ان پر یہ ظاہر کیا کہ عیسائیوں کے قومی مقاصد سے اس کو بیحد دلچسپی ہے، ہر موقع پر ظاہر کیا کہ وہ امیر حکم کا دشمن ہے، نہ صرف امیر حکم بلکہ تمام بنی امیہ اور قوم عرب سے اُسے عداوت ہے عمروس نے جب اس بات کا خوب اطمینان کر لیا کہ طلیطلہ کے لوگوں کو اس پر پورا بھروسا ہو گیا ہے، تو ایک روز ان کے رئیسوں سے کہنے لگا "مجھے خوب معلوم ہے کہ اس شہر کے لوگوں اور حاکمِ شہر میں کیوں ہمیشہ نزاع رہتا ہے، میں جانتا ہوں کہ امیر کی فوجیں شہر میں سکونت رکھ کر تمہارے گھروں کے امن و امان میں خلل ڈالتی ہیں، اور ہمیشہ فوج والوں اور شہر والوں میں ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں، یہ سب مشکلیں رفع ہو سکتی ہیں اگر تم اتنی اجازت دے دو کہ شہر کے سرے پر ایک عمارت بنوا دوں جس میں کل فوج جو شہر میں رہتی ہے وہاں ایک ہی جگہ جا رہے اس طرح تم فوجیوں کی زیادتیوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔

اہل طلیطلہ اپنے ہم قوم گورنر عمروس کا پورا اعتبار کرنے لگے تھے، انھوں نے اس کی تجویز کو پسند کیا، اور کہا کہ عمارت بجائے شہر کے سرے کے اگر وسط شہر میں بنائی جائے تو اور بھی مناسب ہو۔

غرض جب یہ عمارت تیار ہو گئی، تو عمروس نے فوج والوں کو اس میں آباد کر دیا، اور امیر حکم کو اس واقعہ کی اطلاع دی، حکم نے شمالی سرحد کے ایک سپہ سالار کو حکم بھیجا کہ اس حیلہ سے کہ سرحد پر دشمن نے چڑھائی کی ہے قرطبہ سے فوج کمک طلب کرو، یہ حکم پہنچتے ہی سرحد کے سپہ سالار نے اس کی تعمیل کی، قرطبہ اور قرطبہ کے علاوہ اور شہروں سے فوراً فوجیں تین وزیروں اور شہزادہ عبدالرحمٰن بن حکم کی سرکردگی میں سرحد کی طرف روانہ کر دی گئیں شہزادہ عبدالرحمٰن کی عمر اس وقت ۱۴ برس کی بھی پوری نہ تھی، یہ کمک کی فوجیں جس وقت روانہ ہوئیں تو ان کے سپہ سالار کو ایک خط دیا گیا اور زبانی کہدیا گیا کہ جب عمروس کے پاس مجمع عام میں وزراء موجود ہوں تو یہ خط اس وقت ان کو پیش کر دیا جائے۔

جب یہ امدادی فوجیں سرحد کے قصد سے روانہ ہو کر طلیطلہ کے قریب پہنچیں تو خبر آئی کہ

دشمن جو سرحد پر چڑھائی کرنے والا تھا، پیچھے ہٹ گیا ہے، یہ خبر طلیطلہ میں بھی معلوم ہوئی عمرو بن نے سنا تو شہر کے رئیسوں سے کہا، شہزادہ عبدالرحمٰن شہر سے باہر لشکر میں ہیں، ادب اس بات کا مقتضی ہے کہ آپ سب لوگ میرے ساتھ چل کر شہزادے کی خدمت میں کورنش بجالائیں۔ روسا طلیطلہ اس بات پر راضی ہوگئے اور لشکر میں حاضر ہوئے، شہزادہ جس وقت ان رئیسوں سے باتیں کر رہا تھا، اور چاہتا تھا کہ اپنے اخلاق سے اُن کے دلوں پر اچھا اثر پیدا کرے، تو اُس وقت عمروس نے وزیروں سے جو لشکر کے ساتھ تھے ملاقات کی فوج ملک کے سپہ سالار نے اس موقع پر امیر حکمؒ کا خط وزیروں کے سامنے پیش کیا، اس خط میں مفصل احکام درج تھے، جن کا مضمون آگے کے حالات سے ظاہر ہوگا۔

امیر حکمؒ نے جو احکام اپنے خط میں لکھے تھے اُن کی پوری پوری تعمیل ہوئی۔

غرض عمروس وزیروں سے ملاقات کرکے پھر روسا طلیطلہ کے پاس چلا آیا، جو اُس وقت شہزادہ عبدالرحمٰن کے اخلاق سے نہایت خوش تھے، اور کہہ رہے تھے کہ "یہ بالکل سچ ہے کہ (۲۴۸)
اگر شہزادہ چند روز ہمارے شہر میں قیام فرمائے تو ہماری بڑی عزت افزائی ہو اسکے تشریف لانے سے جو رشتہ اتحاد اس وقت قائم ہوا ہے وہ اور بھی مضبوط اور مستحکم ہو جائے گا۔ اس تحریک کو کہ شہزادہ شہر میں آئے سب نے پسند کیا، کسی کو کسی بات کا بظاہر مطلق خوف نہ تھا کیونکہ امیر نے ایک ایسے شخص کو جو خاص اسپین کا رہنے والا تھا اُن پر حاکم مقرر کرکے بھیجا تھا آزادی جس کے وہ دل سے خواستگار تھے اُن کو مل ہی چکی تھی، اور شہزادے کے طور و طریقے سے اُمید ہوتی تھی کہ جب وہ بادشاہ ہوگا تو اپنے باپ کے قدم بقدم چلے گا، چنانچہ طلیطلہ کے روسا و شرفا نے جو حاضر تھے، شہزادہ عبدالرحمٰن سے درخواست کی کہ شہر میں رونق افروز ہوکر اُن کی عزت افزائی فرمائیے، شہزادے نے پہلے کچھ تذبذب ظاہر کیا، کیونکہ حکمؒ نے اس کو سمجھا دیا تھا کہ کسی بات کی طرف زیادہ شوق ظاہر نہ کرنا، پھر یہ ظاہر کرکے اہل طلیطلہ پر مہربانی مقصود ہے اُن کی درخوست منظور کرلی۔

اب شہزادہ شہر میں داخل ہوکر اُس نو تعمیر عمارت میں جسے عمروس نے تیار کرایا تھا، مقیم ہوا، اور فوراً حکمؒ دیا کہ کل ایک بہت بڑی ضیافت کا بندوبست کیا جائے، ضیافت میں شرکت

کے رقصے جملہ روساء و عمائدینِ شہر اور دولت مند لوگوں کو شہر کے اندر اور باہر بھیجے گئے۔

دوسرے دن صبح مہمان عمارت میں آنے شروع ہوئے، ایک دفعہ ہی سب کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوئی ایک ایک شخص گھوڑے سے اُتر کر عمارت میں داخل ہوا اور گھوڑا دوسرے دروازے پر بھیجدیا گیا کہ وہاں مالک کی واپسی کا انتظار کرے۔

اب اس عمارت کی کیفیت سنیئے کہ اس کے صحن میں ایک بڑی خندق جسکی مٹی عمارت کی تعمیر میں صرف ہوئی تھی کھدی تھی، اِس خندق یا گڑھے کے کنارے جلاّد تلواریں لیے کھڑے تھے جب کوئی مہمان داخل ہوتا، جلاّد ایک ہی ضرب میں اُس کا کام تمام کر دیتا۔

کئی گھنٹے تک قتل کا بازار اسی طرح گرم رہا، اس بات کا معلوم کرنا غیر ممکن ہے کہ اُس دن کتنے آدمی قتل ہوئے، اُسی روز سے یہ دن یوم الخندق کے نام سے مشہور ہوا بعض مورخ لکھتے ہیں کہ سات سو آدمی، اور بعض کا خیال ہے کہ پانچ ہزار سے زیادہ آدمی اس دن قتل ہوئے۔

جب دن زیادہ چڑھا تو ایک طبیب کو خیال ہوا کہ اتنے آدمی محل میں داخل ہوئے، مگر کوئی واپس نکلتا نظر نہ آیا، اُسے کچھ شبہ سا ہوا، اور وہ پوچھنے لگا کہ جو مہمان بہت پہلے سے آئے ہوئے ہیں وہ کہاں ہیں"؟ ایک شخص نے جو قریب کھڑا تھا، کہا کہ وہ دوسرے دروازے سے نکل کر چلے گئے ہوں گے،، طبیب نے کہا "میں تو اس پشت والے دروازے پر بھی بڑی دیر تک کھڑا رہا، مگر کسی کو نکلتے نہ دیکھا" یہ کہتے ہی اس کی نظر عمارت کی چار دیواری کے کنگروں (۲۴۹
کی طرف گئی، تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک دھواں سا اُٹھ رہا ہے، طبیب اتنا دیکھتے ہی چلاّ اٹھا کہ "یہ دھواں ضیافت کے لذیذ کھانوں سے نہیں اٹھا ہے، بلکہ یہ مقتول بھائیوں کے خون کی بھاپ ہے"

طلیطلہ پر ایک حیرت کا عالم طاری ہو گیا، ایک ہی وار میں اُس کے بڑے بڑے رئیس اور بڑے بڑے دولتمند غارت ہو گئے، اور یوم الخندق کا انتقام لینے والا طلیطلہ کی چار دیواری میں کوئی نظر نہ آیا۔

اسناد

اخبار مجموعہ ص ۹۹ - ۱۰۲

ابن القوطیہ ص ۱۵ - ۲۱

مقری جلد۱ ص ۴۹۱، ۸۹۹

جلد۲ ص ۱۵۴

نویری ص ۴۵۰ - ۴۵۲

ابن الخطیب (قلمی نسخہ ۶) ص ۲۱۳ - ۲۱۴

عبدالواحد ص ۱۲ - ۱۳

ابن خلکان جلد۱ ص ۲۱۵، ۶۵۵ (اڈیشن سلین)

جلد۱ ص ۱۹ - ۲۱ (اڈیشن وسٹن فلڈ)

علیسیدور ص ۴۹، ۶۱، ۶۹، ۷۷

ابن خلدون ص ۶ - ۷

قرطاس ص ۲۳

ابن عذاری جلد۲ ص ۶۸ - ۸۰

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مُسلم

چوتھی فصل

امیر حکم بن ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل

یوم الخندق کے خونریز واقعہ نے قرطبہ کے نو مسلم عیسائیوں اور ان کی اولاد (مولدین) پر ایسا (۲۵۰
گہرا اثر کیا کہ وہ سات برس تک نچلے بیٹھے رہے، لیکن اس زمانہ کے بعد جو سبق اس واقعہ سے
مِل چکا تھا اُسے وہ بھول گئے۔ بالخصوص طلیطلہ کے مولدین جنھوں نے اس زمانہ کے بعد پھر
حکومت کا جوا اپنی گردن سے اُتارنا چاہا، قرطبہ میں مولدین اور فقیہوں کا اتحاد روز بروز بڑھتا
گیا، ایک دوسرے کی ہمت بڑھاتا رہا کہ آقا کے چابک کے نیچے بدگمانی بند نہ ہو، امیر حَکَم ان لوگوں
کو یقین دلانا چاہتے تھے کہ اگر اُنھوں نے بغاوت بھی کی تو وہ بے اثر ہو گی، کیونکہ شہر قرطبہ کے
گرد اس زمانہ میں بہت سے قلعے ایسے بنا دیے گئے تھے جن کی زد میں پورا شہر آ جاتا تھا، ان
سواروں کے دستے جو خاص امیر کی جان کی حفاظت کے لیے تھے، ان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا
ان سواروں کو لوگ عجم کہتے تھے، کیونکہ یہ سب حبشی یا باہر کے ملکوں کے غلام ہوتے تھے اور عربی
کا ایک حرف بھی نہ سمجھتے تھے، لیکن اس قسم کے تدارک مانع بغاوت نہ تھے، بلکہ بغاوت پر اور زیادہ

اشتعال دینے والے تھے، جو لوگ حکومت سے ناراض تھے، وہ اور زیادہ زبان اور عمل سے اپنی دشمنی کا اظہار کرنے لگے، شہر کے جنوبی حصہ میں جسے ربض شقندہ کہتے تھے چار ہزار فقیہ اور طلبہ اور نو مسلم عیسائی، آباد تھے، اور جب کوئی سوار یا سپاہی اس ربض کے تنگ و پیچیدہ گلی کوچوں میں آ نکلتا تھا خواہ اکیلا ہو یا دو چار ساتھ ہوں، تو پھر یہاں کے لوگ اس کی بُری گت بناتے تھے، گالیاں دیتے تھے، مارتے تھے، اور بعض وقت بیرحمی کے ساتھ مار بھی ڈالتے تھے فقیہوں اور طلبہ نے امیر حکمؒ کی بھی توہین کی، وہ اس طرح کہ امیر کے ذمہ ایک خدمت یہ بھی تھی کہ مسجد میں آکر نماز پڑھائیں، پس جہاں موذن نے مسجد میں اذان کہی اور لوگ جو نماز کے لیے جمع ہوتے پکار پکار کر کہنا شروع کرتے" او شرابی! نماز کے لیے آ، نماز کے لیے آ"

یہ صدائیں روز بروز تیز ہوتی گئیں، منتظمین شہر ایسے گستاخوں کو گرفتار کرنا چاہتے تھے مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آتے تھے، ایک بار مسجد میں ایک نہایت ادنیٰ طبقہ کے آدمی نے امیر حکمؒ کے سامنے آکر انہیں گالیاں دیں اور دھمکایا، لوگوں کا جو انبوہ قریب کھڑا تھا، اس نے اس آدمی کی تعریف میں نعرے لگائے، امیر حکمؒ کو اس گستاخی اور بے ادبی پر تعجب بھی ہوا اور غصہ بھی آیا اور اس نے اس گروہ میں سے دس آدمیوں کو جو سرغنہ تھے، گرفتار کرا کے مصلوب کرا دیا، اور جس مال پر اس کے والد امیر ہشام نے عشر کا محصول معاف کیا تھا وہ پھر جاری کر دیا، اس پر بھی قرطبہ والوں کی نخوت و سرکشی میں کوئی فرق نہ آیا، ایسے بزرگ موجود تھے جو لوگوں کے غصہ کو بھڑکاتے تھے، یحییٰ بن یحییٰ فقیہ اس اثنا میں طلیطلہ سے قرطبہ چلے آئے تھے، وہ وعظ اور خطبوں اور زیادہ تر اپنی شہرت و ناموری کے اثر سے سرکشی کی تحریک کو قوت دینے لگے، بلکہ اس کے سرغنہ اور رہنما بن گئے اور اب سخت خطرہ کا وقت قریب پہنچ گیا، یہاں تک کہ ایک معمولی واقعہ نے علانیہ بغاوت پیدا کر دی

(۱۹۸ھ/۸۱۴ء)[1] ماہ رمضان کا زمانہ تھا، روزے میں یونہی غصہ جلد آجاتا ہے، واعظوں نے

---

[1] اس تاریخ کی نسبت عربی مورخوں میں بڑا اختلاف ہے، بعض نے بغاوت کا ہونا ۱۹۱ھ میں لکھا ہے، اور بعض نے ۲۰۱ھ میں، جنھوں نے ۲۰۲ھ میں لکھا ہے وہ درست نہیں معلوم ہوتے ابن الابار (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

لوگوں کو امیر کے خلاف اشتعال دینا شروع کیا، اتفاق سے ایک دن امیر کی فوج محافظ کا ایک سوار ایک اسلحہ ساز کی دوکان پر آیا، یہ دوکان ربضِ شقندہ میں تھی، آتے ہی دوکاندار سے کہا کہ ہماری تلوار پر صیقل کر دے" دوکاندار نے کہا" ذرا توقف کیجیے، میں اور کام کر رہا ہوں سوار نے کہا" ہم زیادہ نہیں ٹھہر سکتے، ہماری تلوار پر ابھی صیقل ہونا چاہیے" اسلحہ ساز نے کسی قدر ترش ہو کر کہا" آپ تو بہت ہی تیز معلوم ہوتے ہیں، مجھے جب فرصت ہوگی اس وقت آپ کا کام کرونگا" اس پر سوار نے کہا" اچھا" اور اتنا کہتے ہی تلوار کے ایک ہی ہاتھ میں دوکاندار کا کام تمام کر دیا۔

راہ گیر جو تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے، دوکاندار کے قتل ہونے پر شدت سے برہم ہو کر چلّائے کہ" بس! اب وقت آگیا ہے کہ ان ظالم سپاہیوں اور شرابی امیر کو جس نے انہیں نوکر رکھا ہے ختم کر دیا جائے"

ربضِ شقندہ کے علاوہ اب شہر کے اور محلوں میں بھی بلوہ پھیل گیا، ایک بڑے ہجوم نے اِدھر اُدھر سے جو ہتھیار ہاتھ لگا اٹھالیا، اور امیر حَکَم کے سواروں اور غلاموں کے پیچھے پیچھے سخت و سُست کہتا ہوا چلا، سواروں اور غلاموں نے یہ دیکھ کر کہ بلوائیوں سے جان بچنی مشکل ہے آگے آگے بھاگ کر قصرِ امارت میں پناہ لی۔

امیر حَکَم نے جب قصر کی دیواروں پر سے نیچے دیکھا کہ آدمیوں کا ایک بڑا انبوہ طوفانی سمندر کی مثل موجیں مار رہا ہے، اور ایک قیامت کا سا شور اس نے برپا کر رکھا ہے، تو خیال آیا کہ ایک دستہ سواروں کا بھیجکر اس ہجوم کو پراگندہ کر دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا، لیکن بلوائیوں نے سواروں کے اس حملے کو برداشت کر لیا، اور سواروں ہی کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

خطرہ نہایت سخت پیدا ہو گیا تھا، قصر کی عمارت گو ہر طرح محفوظ تھی، لیکن جو لوگ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور ابن عذاری لکھتے ہیں کہ بہت سے باغیوں نے" جو حَکَم سے اس وقت بغاوت کیے ہوئے تھے" طلیطلہ میں پناہ لی، اگر ۲۰۲ھ کو صحیح مانا جائے تو اس تحریر سے مطابقت نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس وقت طلیطلہ میں باغی موجود نہ تھے، ۱۹۸ھ کی صحت کی تائید نوری، ابن قوطیہ، اور مقریزی کے بیانوں سے ہوتی ہے

اندر تھے اُن کو اطمینان نہ تھا کہ بلوائیوں کے حملہ سے قصر محفوظ رہ سکے گا، گو محل کی حفاظت کرنے والے سب بڑے جری اور بہادر تھے، لیکن اس خیال سے اُن پر مایوسی طاری ہو چلی تھی کہ اگر یہ لوگ قصر کے اندر آ گئے تو پھر جان بچنی محال ہو گی امیر حکم کو بھی اُمید نہیں رہی کہ بلوائیوں سے (۲۵۲) اب جان بچ سکیگی، مگر اس کے چہرہ پر آثار پریشانی مطلق نہ تھے اور وہ بالکل مطمئن معلوم ہوتا تھا، اُس نے اپنے عیسائی غلام یاز نطو کو قریب بلا کر کہا کہ حرم سرا میں فلاں بیگم سے عطر کی شیشی جلد لے آئے، یہ حکم (اس وقت) ایسا عجیب تھا کہ غلام اسے مطلق نہ سمجھا اور تذبذب کی حالت میں خاموش کھڑا رہا، امیر نے غصہ سے وہی حکم پھر دیا اور کہا "جاتا کیوں نہیں، اے نامختون باپ کے چھوکرے" یاز نطو اتنا سنتے ہی بھاگا اور عطر کی شیشی لا کر امیر کو دی، امیر نے شیشی ہاتھ سے لے کر سر کے بالوں اور داڑھی پر عطر کچھ ایسی شان اور اطمینان سے ملنا شروع کیا کہ گویا کسی مہ پارہ عروس سے ملاقات کی تیاری ہو رہی ہے، یاز نطو سے یہ دیکھ کر ضبط نہ ہو سکا، اور امیر کی اس حالت پر تعجب ظاہر کر کے کہنے لگا "یا امیر! تقصیر معاف ہو تو کچھ عرض کروں، عطریات کے استعمال کا یہ وقت حضور نے کچھ عجیب نکالا ہے، کیا حضور اس خدشے اور خطرے کو ملاحظہ نہیں فرماتے جو درپیش ہے؟" حکم نے کہا "احمق چپ رہ" جب عطر مل کر بالوں کو درست کر لیا تو کہا "بغیر اس عطر کی خوشبو کے کٹے ہوئے سروں میں سے میرے سر کو باغی کیوں کر پہچان سکیں گے؟ اب جا، اور حدیر سے کہہ کہ میرے پاس فوراً حاضر ہو۔"

روطندہ کے جیل پر جو فوج حفاظت کے لیے متعین تھی حدیر اس کا افسر تھا، اس وقت اس قید خانہ میں بہت سے فقیہ تھے جو سابق کے ہنگاموں میں ماخوذ ہو کر سزا بھگت رہے تھے، اب تک اِن لوگوں کی جان سلامت رکھی گئی تھی، لیکن اس وقت یہ دیکھ کر یہ فقیہ اور کل رعایا امیر کی جان اور تخت دونوں کے درپے ہے، حکم نے ارادہ کیا کہ ان فقیہوں کو میرے بعد زندہ نہ رہنا چاہیے، جونہی حدیر سامنے آیا امیر نے حکم دیا کہ "رات ہوتے ہی جتنے فقیہ روطندہ کے قید خانہ میں ہیں اُن کو باہر لا کر قتل کر دیا جائے اور اُن کی لاشیں صلیب پر چڑھا دی جائیں۔" حدیر کو یقین تھا کہ اگر بلوائی قصر میں گھس آئے تو میں جان سے مارا جاؤں گا، اور مرتے ہی خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینا ہو گا، اس وجہ سے حدیر نقہا کے قتل کا حکم

سنکر ڈر گیا اور کہنے لگا "اے امیر! میں ڈرتا ہوں، ممکن ہے کل میں اور آپ دونوں دوزخ میں پڑے ہوں اور کوئی ہماری آہ وزاری کا سننے والا نہ ہو، اور نہ میں آپ کی مدد کر سکوں اور نہ آپ میری"۔ اتنا سنکر حکم برہم ہوا اور پھر غصہ سے وہی حکم دیا، مگر جب دیکھا کہ حدیر پر خوف غالب ہے تو اس سے کہا "اچھا جاؤ اور ابن نادر کو ہمارے پاس بھیجو"۔ ابن نادر بھی حدیر کی طرح اسی فوج کا افسر تھا جو ربطندہ کے قید خانہ پر مامور تھی، ابن نادر نے امیر کے حکم کی تعمیل کا وعدہ کر لیا، اس کے بعد حکم نے پورے ہتھیار لگائے اور قصر کی فصیل سے نیچے اترا اور جس قدر فوج اس وقت قصر میں گویا محصور ہو گئی تھی اس کا معائنہ کیا، اور ایک نہایت فصیح و بلیغ تقریر کر کے انکی ہمت بڑھائی، پھر اپنے عمزاد عبیداللہ کو طلب کیا، جو اس زمانہ کا نہایت بہادر لڑنے والا تھا، جب عبیداللہ سامنے آیا تو کہا کہ "چند چیدہ شہسواروں کو لے کر ان بلوائیوں کے ہجوم میں سے راستہ نکال کر جنوب شہر کی طرف جاؤ اور ربض شقندہ کے گھروں میں آگ لگا دو"۔

اس میں حکم نے یہ سوچا کہ جو لوگ بلوائیوں میں جنوب شہر کے رہنے والے ہیں، جس وقت وہ اپنے گھروں کو جلتا دیکھیں گے تو مال و اسباب اور بیوی بچوں کو بچانے کے لیے ادھر متوجہ ہو جائیں گے، سامنے کے رخ سے تو عبیداللہ حملہ کرتا ہوا بڑھے گا اور عقب سے حکم اپنی فوج سے ان کی خبر لے گا۔

یہ تدبیر اسی قسم کی تھی جو مسلم نے یوم حرّہ میں اختیار کی تھی اور جس کی وجہ سے مدینہ والوں میں قتل و تباہی شدت سے نمایاں ہوئی تھی، چنانچہ عربی مورخوں نے یوم حرّہ کے واقعہ کو اس موقع پر یاد دلایا ہے۔

غرض قصر امارت کے دروازے سے عبیداللہ مع اپنے سواروں کے دفعتاً نکلا اور باغیوں کو مجبور کیا کہ وہ پل کی طرف ہٹتے چلے جائیں، بیچ کی بڑی سڑک اور ربل والے میدان میں بلوائیوں پر سخت دھاوا کیا، وادی الکبیر کو ایک موقع پر جہاں دریا پایاب سا تھا عبور کیا، یہاں کمانیہ کا لشکر جو حکم کے اشاروں کو دیکھ رہا تھا شریک ہو گیا، اور اب جنوب شہر کی طرف شقندہ میں پہنچ کر اس فوج نے گھروں میں آگ لگا دی، حکم کے خیال کے عین مطابق جونہی بلوائیوں میں سے ان لوگوں نے جو شقندہ میں رہتے تھے جب اپنے گھروں سے دھواں اور شعلے اٹھتے دیکھے تو وہ فوراً

مال واسباب اور اہل وعیال کو بچانے کے لیے قصر کے سامنے سے ہٹ کر اپنے اپنے گھروں کی طرف دوڑے، اور جب سامنے سے اور عقب سے سواروں نے دھاوا کیا تو بلوائیوں میں بھاگڑ پڑی، اور اب سواروں نے انھیں کاٹنا شروع کیا، بہتوں نے پناہ مانگی مگر ان قرطبیوں کو پناہ کون دیتا تھا، حبشی سوار جن کو اعجم یعنی گونگا کہا جاتا تھا، عربی کا ایک لفظ بھی نہ سمجھتے تھے، جدھر پہنچتے تھے قتل کا بازار گرم کر دیتے تھے، صرف تین سو بلوائی بچے، جن کو زندہ گرفتار کرکے امیر کے سامنے پیش کیا گیا، فوراً حکم ہوا کہ دریا کے کنارے انہیں صلیب کی سزا دی جائے۔

امیر حَکَم نے اب اپنے وزراء سے مشورہ کیا اور پوچھا کہ آیا بقیۃ السیف کو معاف کیا جائے یا اُنکو بھی قتل کر کے قصہ ختم کیا جائے، وزراء میں اختلاف رائے ہوا، حَکَم نے اُس فریق کی رائے کو پسند کیا جس نے نرمی ظاہر کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ رعایا کے ساتھ انتقام لینے میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیے بہرکیف یہ طے پایا کہ جنوبی حصۂ شہر یعنی ربض شقندہ کو بالکل منہدم کر دیا جائے اور اس کے رہنے والوں کو حکم ہو کہ تین دن کے اندر ملک سے نکل جائیں، ورنہ چوتھے دن ان کو سولی پر چڑھا دیا جائیگا۔

غرض یہ باغی جو کچھ بچا کھچا اسباب تھا، اسے مع اہل وعیال کے لیکر ان گھروں سے باہر نکلے جن میں پیدا ہوئے تھے، اور پھر یہ گھر اُن کو دیکھنے نصیب نہ ہوئے، سب لوگوں کو ایک ساتھ ایک ہی گروہ کی شکل میں ملک سے باہر نکلنے کا حکم نہ تھا، تھوڑے تھوڑے اکٹھے ہو کر نکلنے شروع ہوئے راستے میں سپاہیوں اور لٹیروں نے جو ندی نالوں اور پہاڑیوں کے پیچھے تاک میں بیٹھے تھے، جو کچھ مال وسامان ان غریبوں کے پاس تھا وہ بھی لوٹ لیا، یہ لوگ جب وقت بحرِ متوسط کے ساحل پر پہنچے تو کچھ لوگ جہازوں پر سوار ہو کر افریقیہ کی طرف اور کچھ مصر کی طرف روانہ ہو گئے، انہیں عورتوں اور بچوں کی گنتی چھوڑ کر پندرہ ہزار کے قریب اسکندریہ کے پاس ایک مقام پر اُتر پڑے مصر کی حکومت اُن کے وہاں اُترنے پر مزاحم نہ ہو سکی، کیونکہ اس وقت مصر کے لوگوں نے عباسی خلفاء سے سرکشی اختیار کر رکھی تھی، اور حالت سخت بدنظمی اور بدنمی کی ہو رہی تھی، ان نووارِدوں کو اس وقت سوائے اسکے کچھ نہ بن پڑا کہ جہاں اترے تھے وہاں کے ایک زبردست عربی قبیلہ کو اپنا سرپرست بنالیں، لیکن کچھ مدت کے بعد جب کچھ جان آ گئی تو اسی عرب قبیلے سے یہ نووارد دمگر بیٹھے اور اس سے لڑکر اس پر کامل فتح حاصل کرلی، اور اس طرح اسکندریہ کے شہر پر اپنا قبضہ کرلیا،

(۲۵۴)

حکومتِ مصر کی طرف سے اِن پر حملے ہوتے رہے، مگر باوجود اس کے وہ ۲۱۱ھ / ۸۲۶ء تک اسکندریہ پر متصرف رہے، آخر کار عباسی خلیفہ مامون الرشید کے ایک سپہ سالار نے انھیں شکست دی، اِس کے بعد اندلس کے یہ جلاوطن اسکندریہ چھوڑ کر جزیرہ اقریطش چلے گئے، اس جزیرہ کا ایک حصہ اب تک قسطنطنیہ کے عیسائی قیصروں کے پاس تھا، اندلسیوں نے اس جزیرہ کو فتح کرلیا، ان کا سردار ابو حفص عمر البلوطی تھا (یعنی فحص البلوط کا رہنے والا جسے آج کل کمپو دی کلات راوا (Campo de Calatrava) کہتے ہیں) اسی ابو حفص کی اولاد سے ایک خاندان ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء تک جزیرہ اقریطش پر سلطنت کرتا رہا (یعنی سوا سو برس سے زیادہ اُس نے یہاں حکومت کی) اس کے بعد بنی حفص کو زوال ہوا، اور جزیرہ اقریطش پھر یونانی عیسائیوں کے قبضے میں چلا گیا،

جلاوطن قرطبیوں کے دوسرے گروہ کو جس میں آٹھ ہزار خاندان تھے، آباد ہونے کے لیے نئی جگہ ملنے میں دشواری نہیں ہوئی جس زمانہ میں یہ لوگ ملک بدر کیے گئے تھے اُسی زمانہ میں ادریس بن عبداللہ مغرب اقصیٰ میں ایک نیا شہر تعمیر کر رہا تھا، جو بعد میں فاس کے نام سے مشہور ہوا، ادریس بن عبداللہ کی رعایا اکثر خانہ بدوش تھی اور شہر میں آباد ہونے کو بہت ناپسند کرتی تھی، اِس غیر مالک والوں کو نئے شہر میں بسانے کی کوشش کی گئی، اور جلاوطن اندلسیوں کو اس شہر میں آباد ہونے کی اجازت آسانی سے مل گئی، مگر ان لوگوں میں اور ان کے علاوہ جو لوگ شہر میں آباد ہوئے ان میں ہمیشہ نزاع برپا رہا، عربوں کی ایک بڑی جماعت قیروان سے بلا کر اس شہر میں آباد کی گئی تھی، ان قیروانی عربوں اور اندلسیوں میں جن میں اکثر کلٹو رومن نسل کے لوگ تھے، باہم قلبی عداوت تھی، گو دونوں ایک ہی زمین پر آباد تھے مگر ایک گروہ دوسرے گروہ سے ایسا بے تعلق رہا کہ چودھویں صدی عیسوی تک ان دونوں قوموں کے چہروں کا نقشہ بالکل جدا جدا نظر آتا تھا، اُن کے مذاق، اُن کے کاروبار، اور اُنکے رسم و عادات ایک دوسرے سے مختلف تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اپنے قومی امتیاز کو ہمیشہ قائم رکھیں گے، عرب اہلِ حرفہ یا تاجر تھے، اندلسی زراعت پیشہ تھے صرف قوتِ لایموت پیدا کر کے گذر کرتے تھے، عرب دولت کماکر اس میں سے کچھ بچا بھی لیتے تھے اور خوش باش، خوش پوشاک اور نفاست پسند تھے، اور اندلسیوں کو بھونڈا، بھدا، ذلیل اور بخیل سمجھتے تھے، اندلسی یا تو

زراعت کے پیشہ پر بالکل قانع ہوکر، باعربوں کی دولتمندی پر جو رشک انھیں ہوتا تھا، اُس کو اپنی خودداری کی وجہ سے بغیر ظاہر کیئے عربوں کو ایک مغرور و مسرف اور لہو و لعب میں دولت کو صرف کرنے والی قوم سمجھتے تھے، ادریس بن عبداللہ نے یہ سمجھ کر کہ ان دونوں گروہوں میں ہمیشہ جھگڑا ہوتا رہے گا۔ اُن کو علیحدہ علیحدہ آباد کیا تھا۔ ہر ایک کا ربض یا محلہ جدا تھا، ہر ربض کے گرد چار دیواری اور اس میں بازار مسجد، اور ٹکسال ہر ایک کی جدا تھی، لیکن باوجود اس احتیاط کے عرب اور اندلسی کئی سو برس تک کبھی پوشیدہ اور کبھی علانیہ عداوت کیساتھ شہر فاس میں آباد رہے اور اکثر دریا کے قریب کی زمین پر جو دونوں ربضوں میں حائل ہوتی سخت نزاع رہا کرتے۔

قرطبہ کی رعایا میں جو لوگ باغی ہوئے تھے، وہ تو اپنے بالوں، بیویوں، اور بچوں کو قتل ہوتے دیکھنے کے بعد بغاوت کی سزا میں جلاوطنی کی مصیبتیں بھگت رہے تھے، لیکن قرطبہ کے فقہا، جو درحقیقت بغاوت کے محرک اور مرتکب ہوئے تھے اُن کا قصور معاف ہوگیا ابھی بلوا پورا فرو نہ ہونے پایا تھا کہ امیر کی طرف سے ان پر خلوص اور مہربانی کی علامات ظاہر ہونے لگیں، چنانچہ جس زمانہ میں یہ حکم جاری تھا کہ جن لوگوں پر بغاوت کا شبہ ہو اُن کو گرفتار کرکے قتل کردیا جائے، اُسی زمانہ میں پولیس کو معلوم ہوا کہ ایک فقیہ کسی قاضی صاحب کی محلسرا میں روپوش ہے قاضی صاحب ان فقیہ کے رشتہ دار تھے، پولیس نے مکان میں داخل ہونا چاہا کہ فقیہ کو گرفتار کرکے قتل کردے لیکن گھر کی عورتوں نے ایسا شور مچایا کہ قاضی صاحب اپنے عزیز کو بچانے دوڑے، اور پولیس سے کہا کہ یہ گرفتاری بالکل خلاف قانون ہوگی، پولیس والوں نے کہا کہ "ہم کو تاکیدی حکم ملا ہے کہ ایسے لوگوں کو گرفتار کرکے قتل کردیں اور ہم اس حکم پر عمل کرنا چاہتے ہیں" قاضی صاحب اتنا سنتے ہی قصر امارت میں پہنچے، جب حاضر ہونے کی اجازت ہوئی تو سامنے آکر کہنے لگے "یا امیر! خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کا، جو آپ سے لڑے تھے قصور معاف کرکے اُن پر کرم فرمایا تھا، اب آپ بھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت مند ہیں، اخلاق محمدی کا اتباع کریں" اتنا کہہ کر قاضی صاحب نے کل واقعہ بیان کیا، امیر حکم کو قاضی صاحب کے معروضہ پر ایسا رحم آیا کہ نہ صرف قاضی صاحب کے

عزیز فقیہ کو معاف کیا، بلکہ اور تمام فقہا کی نسبت بھی جو قرطبہ سے بھاگ کر طلیطلہ چلے گئے تھے معافی کا فرمان جاری کر دیا جس قدر جائیداد ان لوگوں کی ضبط ہوئی تھی وہ ان کو واپس کی گئی اور حکم ہوا کہ قرطبہ اور حوالی قرطبہ کو چھوڑ کر جہاں چاہیں وہ اندلس میں آباد ہو جائیں، یحییٰ ابن یحییٰ اللیثی جو اس پر آشوب زمانہ میں بربر کے ایک قبیلے میں روپوش ہوئے تھے، ان کو بھی معافی مل گئی اور دربار میں حاضری کا حکم بھی ہو گیا، چنانچہ وہ دربار میں حاضر ہونے لگے اور پھر بارسوخ ہو گئے، لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو معافی سے مستثنیٰ رکھے گئے تھے، ان میں بنی معافر کے ایک فقیہ طالوت نامی تھے، یہ مالکی مذہب رکھتے تھے اور اپنے خطبوں میں لوگوں کو بغاوت پر اشتعال دینے میں مشہور تھے، طالوت اس وقت ایک یہودی کے مکان میں چھپے ہوئے تھے، یہودی نے جہاں تک اس کے امکان میں تھا اپنے گھر میں ان کی آسائش و آرام کا سامان کر دیا تھا، لیکن ایک سال کے بعد اس حالتِ روپوشی سے طالوت بیزار ہو گئے، اور انھوں نے یہودی سے کہا کہ "میں کل تمہارے مکان سے چلا جاؤنگا، گو اس گھر میں جو مہمان نوازی میری ہوئی ہے اُسے کبھی نہ بھولوں گا، اب میں اپنے پرانے شاگرد ابوالبسّام کے پاس جانا چاہتا ہوں، جو اس وقت امیر حَکَم کا وزیر ہے اور دربار میں بہت کچھ اثر رکھتا ہے اس پر میرے احسانات بھی ہیں۔ اور ممکن ہے کہ امیر سے وہ میری سفارش کر دے"۔ یہودی نے کہا "یا شیخ کبھی کسی درباری کا اعتبار نہ فرمایئے گا، ممکن ہے کہ وہ آپ کو فوراً گرفتار کرا دے، لیکن اگر آپ کو یہ خیال گذرا ہے کہ آپ مجھ پر کوئی بار ہیں اور اس لیے زیادہ قیام پسند نہیں فرماتے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر آپ یہاں تا زیست رہنا پسند کریں گے تو بھی مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی"۔ باوجود یہودی کے اصرار کے طالوت نے جانا چاہا، اور دوسرے دن شام ہوتے ہی گھر سے نکل وزیر ابوالبسّام کے مکان پر بغیر کسی کے پہچانے پہنچ گئے۔

ابوالبسّام نے اُنھیں دیکھا تو گھبرایا وہ سمجھتا تھا کہ فقیہ صاحب اس وقت قرطبہ سے کوسوں کے فاصلے پر ہوں گے، مگر دیکھتے ہی اُستاد کی تعظیم کو اُٹھا اپنے قریب بٹھایا اور حال پوچھا کہ کب تشریف لائے اور اس قدر عرصہ سے کہاں تشریف رکھتے تھے، طالوت نے

یہودی کا ذکر کیا کہ اس نے بڑی خدمت کی اور اپنے گھر میں بہت آسائش سے مہمان رکھا
اس کے بعد کہا کہ "اب میں تمہارے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ امیر حکمؔ سے میری سفارش
کردو" ابوالبسّام نے کہا "آپ بالکل مطمئن رہیں جہاں تک میرے امکان میں ہوگا، آپ کے لیے
معافی حاصل کروں گا، یہ کوئی دشوار بات نہیں ہے، کیونکہ امیر کو اب خود اپنی سختی پر ندامت ہے
آج شب کو آپ یہاں آرام فرمائیں اور کل میں امیر کی خدمت حاضر ہو کر عرض کرونگا"
فقیہ طالوت وزیر کی ان باتوں کو سنکر اس رات خوب گہری نیند سوئے، اُن کو اس
کا گمان تک نہ تھا کہ جس میزبان نے اس قدر خاطر مدارات سے مہمانی کی ہے اور سفارش
کا وعدہ کرکے اُن کے دل سے ایک بھاری بوجھ دور کر دیا ہے۔وہ درحقیقت ان کے گرفتار
اور قتل کرا دینے کی فکر میں ہے، ابوالبسّام کے دل میں فی الواقع یہی دغا بھری ہوئی تھی، دوسرے
دن امیر کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور پہلے سے بندوبست کرتا گیا کہ طالوت مکان سے نکل کر
کہیں جانے نہ پائیں اور اب دربار میں حاضر ہو کر ایک مخاصمانہ تبسم کے ساتھ ابوالبسّام نے
امیر سے سوال کیا "حضور کا خیال اس موٹے دُنبے کی نسبت کیا ہوگا۔جو سال بھر تک بھیڑی کھانے
میں بند پڑا رہا ہو" حکمؔ کو اس سوال میں کوئی خاص بات نہ معلوم ہوئی، معمولی سوال سمجھ کر (۲۵۷)
جواب دیا کہ "ایسے دنبے کا گوشت نہایت بدمزہ ہوگا، مجھے تو ایسے جانور کا گوشت
پسند ہے جو جنگل میں آزادرہ کر کھاتا پیتا ہو کیونکہ ایسا گوشت زود ہضم اور مقوی ہوتا ہے"
ابوالبسّام نے عرض کیا "حضور میرا مطلب یہ نہیں ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فقیہ طالوت
آج میرے گھر میں آن پھنسے ہیں"۔ حکمؔ نے کہا "سچ کہو تمہارے قبضہ میں وہ کیسے آگیا؟"
وزیر نے کہا "خیر مقدم کے چند پاکیزہ جملوں سے"
امیر نے طالوت کے فوراً حاضر کیے جانے کا حکم دیا۔ طالوت دربار میں حاضر ہوتے ہی
خوف سے لرزنے لگے، امیر نے غصہ مطلق ظاہر نہیں کیا بلکہ نرم آواز میں ان سے کہا "طالوت!
سچ کہنا کہ اگر اس تخت پر تمہارا باپ یا فرزند بھی ہوتا تو کیا جو عزت و احترام میں نے تمہارا کیا
تھا اس سے زیادہ کرسکتا؟ کوئی موقع بھی ایسا بتا سکتے ہو کہ تم نے اپنے لیے یا غیر کے لیے
کوئی بات چاہی ہو، اور میں نے اسے منظور نہ کیا ہو؟ کئی مرتبہ جب تم بیمار ہوئے تو تمہاری

عیادت کو تمہارے گھر گیا، جب تمہاری بیوی کا انتقال ہوا تو کیا تمہارے گھر کے دروازے پر میں تم سے نہیں ملا تھا؟ کیا پیادہ پا تمہاری بیوی کے جنازے کے ساتھ میں نہیں گیا تھا، اور اس کو دفن کر کے تمہارے ہمراہ واپس نہیں آیا تھا؟ مگر ان سب باتوں کا انعام تم نے مجھے یہ دینا چاہا کہ میری عزت کو خاک میں ملا دیا جائے میرے مرتبہ امارت کو تم نے نامبارک بنانا چاہا، یہاں تک کہ میرا خون بہانے کے درپے ہو گئے"۔

امیر حُکَمؒ کی اس تقریر نے فقیہ طالوت کو یقین دلا دیا کہ اب ان کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اس طرف سے اطمینان ہوتے ہی انھوں نے پھر وہی اپنا پرانا انداز بیباکی اور بے ادبی کا جس کے وہ خوگر ہو چکے تھے اختیار کیا، حُکَمؒ سمجھا تھا کہ اس کی تقریر سے طالوت کے دل پر اثر ہوا ہوگا۔ مگر فقیہ کے دل پر کوئی اثر نہ ہوا تھا، چنانچہ سرکشانہ سختی کے ساتھ امیر کو جواب دیا "سمجھ لو کہ سوائے حق کے اور کوئی بات میرے منہ سے نہیں نکل سکتی تھی تم سے دشمنی کرنے میں میں نے خدا کے حکم کی پابندی کی اور جب یہ حالت تھی تو تمہارے احسانات کوئی چیز نہ تھے"۔

یہ تقریر سنکر جس کا مطلب تھا کہ جو کچھ جی میں آئے کرو، حُکَمؒ کو دفعتہً غصہ آیا لیکن فوراً غصہ پی کر نرمی سے بولا "جب میں نے تم کو یہاں طلب کرنے کا حکم دیا تھا تو سوچتا تھا کہ مجرموں کو جو اذیتیں دی جاتی ہیں ان میں سے کون سی اذیت تمہارے لیے تجویز کروں کہ تمہاری جان نکل جائے، لیکن اب میں تم سے کہتا ہوں کہ جس خدا نے تم کو مجھ سے دشمنی کا حکم دیا تھا اسی نے مجھے یہ حکم دے دیا کہ تمھیں معاف کردوں جاؤ، اور خدا تم کو اپنی پناہ میں رکھے جب تک زندہ ہوں باللہ العظیم! تمہاری ویسی ہی عزت کرونگا جیسی کہ پہلے کرتا تھا، خدا ایسا کرتا کہ جو کچھ گذرا ہے نہ گذرتا"۔

اس عالم دین کو نرمی کے ساتھ اس بات کو بتانے کے لیے کہ خدا کسی کو کسی سے دشمنی کرنیکا حکم نہیں دیتا کیا اس سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ ممکن تھا؟

طالوت نے بہرکیف یہ ظاہر کیا کہ وہ امیر کا اصلی مطلب نہیں سمجھے غالباً ان کے دل میں (۲۵۸) غرور ایمان اس قدر اثر کر چکا تھا کہ وہ امیر کی نصیحت کا مطلب نہ سمجھ سکے، کوئی لفظ منت گذاری کا

ان کی زبان سے نہ نکلا، بلکہ حَکَمُ کے اخیر جملے کو اُنھوں نے اپنی زبان سے اس طرح دہرایا کہ:۔ "جو کچھ گذرا ہے اگر وہ نہ گذرتا تو امیر کے حق میں مفید ہوتا۔" اس کے معنی یہ تھے کہ امیر کو ڈراتے تھے کہ عاقبت میں اُس کو اپنے کیے کی سزا نہایت سخت ملے گی۔ حَکَمُ جس کو دل سے یقین تھا کہ حق اس کی جانب ہے نہ کہ فقیہ کی طرف غصّہ کو پی گیا اور یہ ظاہر کر کے کہ یہ فقرہ گویا سنا ہی نہیں دریافت کرنے لگا کہ وزیر ابوالبسّام نے طالوت کو کہاں گرفتار کیا تھا؟ طالوت نے جواب دیا کہ "ابوالبسام نے مجھے گرفتار نہیں کیا بلکہ میں خود اُس کے پاس چلا آیا، میں اس کی دوستی پر جو پہلے سے چلی آتی تھی، بھروسا کر کے اس کے پاس آیا تھا،" حکم نے پوچھا اس سے پہلے ایک سال تک کہاں رہے؟ طالوت بولے کہ "اسی شہر میں ایک یہودی کے گھر میں رہا" یہ سنکر حَکَمُ نے ابوالبسّام کی طرف دیکھا، ابوالبسّام اس تقریر کو بالکل خاموش کھڑا سن رہا تھا، حَکَمُ نے غصّہ سے کہا "اچھا تو یہ ایک یہودی تھا جس نے ایک غیر مذہب کے عالم کی بھی اُس کے علم و فضل کی وجہ سے عوث کی ہم کو چھپانے میں اس یہودی کو اس کا خوف نہ ہوا کہ وہ خود اپنے تئیں اور اپنے بیوی بچّوں اور مال و متاع کو ہمارا مورد عتاب بنا رہا ہے لیکن ابوالبسام! تم نے یہ چاہا کہ میں پھر اُس زیادتی اور تشدد کا مرتکب ہو جاؤں جس پر اب میں نادم و شرمندہ ہوں، بس ابوالبسّام! ہمارے سامنے سے دور ہو، اور پھر ہماری نظر کو اپنی صورت دکھا کر ناپاک نہ کر۔"

ابوالبسّام کو دغا دینے کا ثمرہ ذلت و خواری سے ملا، برعکس اس کے فقیہ طالوت پر اُن کے مرتے دم تک سلطانی مکارم جاری رہے، یہاں تک کہ جب انتقال ہوا تو حَکَمُ اُن کے جنازہ کے ساتھ گیا۔

اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ ربض شقندہ کے پیشہ وروں اور باشندگان طلیطلہ کے حق میں حَکَمُ ظالم ثابت ہوا، لیکن علمائے دین و فقہاء کے ساتھ اُس نے ہر قسم کی بُردباری سے کام لیا، یہ فقیہ اور علما یا تو عرب تھے یا بربر، حَکَمُ بھی ایک سچے عرب کی طرح خریدنے اور بیچنے کے اوزان جُدا جدا رکھتا تھا، مفتوحہ باشندگانِ ملک سے اُسے نفرت تھی اور جہاں کوئی

ﻟﻪ دوزی نے اس فقرے میں عربوں اور حَکَمُ دونوں کو بے ایمان ٹھیرایا ہے۔ عرب چونکہ اپنی قوم کے (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

قصور ان سے ہوا انتہا درجے کی سختی کو جائز نہ رکھتا تھا، لیکن جب اپنی قوم کے لوگ باغی ہو جاتے تھے تو نہایت خوشی سے اُنھیں معاف کر دیتا تھا، عربی مورخوں نے فقہا پر حکم کی مہربانی کرنے کی وجہ اور لکھی ہے وہ لکھتے ہیں کہ جو سختی حکم نے اس موقع پر کی تھی اس پر اس کا دل پکڑا گیا اور اپنی حرکت پر اُسے سخت ندامت ہوئی، اس سے انکار کرنے کی ضرورت نہیں کہ حکم بعض وقت سخت ظالم ہو جاتا تھا، لیکن پھر غصہ اترتے ہی اس کی طبیعت نرم ہو جاتی تھی، ممکن ہے کہ اپنے بعض کاموں کو جو غصہ کی حالت میں اس سے ہو جاتے تھے گناہ سمجھ کر افسوس کرتا ہو، مثلاً اس کا یہ حکم کہ رو طلندہ کی جیل میں جس قدر فقیہ قید تھے وہ قتل کر دیے جائیں، اس پر اس کو بعد میں (۲۵۹) افسوس ہوا ہوگا، لیکن ہم کو ذرا شبہ نہیں کہ موالی بنی اُمیہ نے حکم کی اس ندامت کے ذکر میں مبالغہ کیا ہے تاکہ اپنے خاندان کے ایک ایسے بادشاہ کو جسے علماء دین جہنم کے سب سے گہرے طبقہ میں جگہ دے چکے تھے، دنیا کی نظر میں اچھا ثابت کریں اگر ہم خود حکم کے بیان پر غور کرتے ہیں جو اس نے ایک نظم میں کیا ہے جسے مرنے سے کچھ پہلے اس نے اپنے فرزند کے لیے لکھا تھا تو ثابت ہوتا ہے کہ اس کو جو کچھ اس نے کیا تھا اس میں اپنے حق بجانب ہونے کا یقین تھا۔ اس نظم کے ترجمہ کے بعد ہم امیر حکم کے حالات بھی ختم کر دیتے ہیں:۔

جیسے کہ خیاط سوئی چلا کر کپڑے کو جوڑتا ہے۔ اسی طرح تلوار چلا کر میں نے اپنی مملکت کے جُدا جُدا ٹکڑوں کو جوڑ کر سالم کر دیا۔ کیونکہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا، ایک شکستہ اور پارہ پارہ سلطنت کے برابر کوئی چیز مجھ کو قابل نفرت نہیں معلوم ہوتی تھی۔ میری سرحدوں سے دریافت کرو کہ کوئی مقام بھی ایسا ہے، جو دشمن کے قبضہ میں ہو؟ اس کا جواب ہوگا کہ کوئی نہیں، اگر وہ نہیں کہ ہاں ایسا مقام ہے، تو میں ابھی تلوار

(بقیہ حاشیہ گذشتہ) تھے حکم ان کا قصور معاف کر دیتا تھا، لیکن اسپین کے لوگوں پر تشدد کرنے میں عار نہ تھا مصنف کو اسپینیوں سے یہاں ہمدردی اس وجہ سے ہوئی ہے کہ وہ یورپ کے رہنے والے تھے اور گو اس وقت مسلمان تھے مگر پہلے تو عیسائی رہ چکے تھے، لیکن انہی نومسلموں پر جہاں عیسائی مذہب ترک کرنے پر نفرت ظاہر کی جاتی ہے وہاں اُن کو بے ایمان اور دغاباز ثابت کیا جاتا ہے (مترجم)

لے کر اس طرف چلا جاؤنگا، میری باغی رعایا کی کھوپریوں سے سوال کرو، جو ٹوٹے ہوئے کدو کی طرح میدان میں پڑی ہوئی دھوپ میں چمک رہی ہیں۔ وہ یہی جواب دیں گی کہ ہمیں مارا ہے اور پھر بدلا ہے۔ خوف سے بدحواس ہوکر جان بچانے کو باغی بھاگے لیکن میں اپنی جگہ قائم رہا اور موت کو کچھ نہ سمجھا۔ اگر میں نے ان باغیوں کے بیوی بچوں کی سلامتی نہ دی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ میری بیوی بچوں کی جان کے درپے تھے جو شخص اپنے خاندان کی توہین کا انتقام نہ لے وہ عزت سے محروم ہے اور بنی نوع انسان میں ایسا ہے جس سے نفرت کرنی چاہیے۔ تلوار چلنے کے بعد اگر میں نے ان کو زہر پینے کو دیا تو اس میں میں نے وہ قرضہ ادا کیا ہے۔ جو زبردستی ان کی وجہ سے لینا پڑا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کو موت نصیب ہوئی تو یہ ان کی تقدیر کا لکھا تھا۔ جو پورا ہوا۔ پس اے فرزند! جو ممالک میں تیرے سپرد کر رہا ہوں ان میں امن ہے وہ ایک نرم سیج ہیں جن پر تو آرام کر سکتا ہے۔ میں نے اس کی احتیاط بخوبی کر لی ہے کہ کوئی بغاوت تیرے آرام میں خلل نہ ڈالے۔"

اسناد:۔

اخبار مجموعہ	ص ۱۰۳-۱۰۴
ابن عذاری	جلد ۲ ص ۷۳-۷۴-۷۸-۷۹-۸۱-۸۲
نویری	ص ۴۵۳-۴۵۴-۴۵۶
ابن خلدون	ص ۷ جلد ۳ ص ۴۴ جلد ۴ ص ۶
ابن الابار	ص ۴۰-۴۱
ابن القوطیہ	ص ۲۲-۲۴
قرطاس	ص ۲۱-۲۳-۲۵، ۷۰، ۷۱
خوشانی	ص ۲۵۰
عبدالواحد	ص ۱۴

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مسلم

پانچویں فصل

امیر عبدالرحمٰن الاوسط

سلاطین اسپین کے دربار کو جیسی رونق عبدالرحمٰن بن حکم کے زمانے میں ہوئی، ایسی کبھی پہلے نہ ہوئی تھی، شان و شوکت میں خلفائے بغداد کی ہمسری کے خیال سے اس نئے امیر نے بڑا خدم حشم اپنے گرد جمع کر لیا اور دار السلطنت قرطبہ کو بڑی زیب و زینت بخشی، کثیر دولت صرف کر کے پل مسجدیں اور محل تعمیر کرائے۔ عالیشان اور پر فضا باغ لگائے، جن میں پہاڑوں کا پانی نہروں کے ذریعے ہمیشہ جاری رہتا، شاعری سے عشق تھا، گو اشعار جو امیر سے منسوب کیے جاتے تھے اکثر دوسروں کے ہوتے تھے، لیکن دربار کے شاعروں کو انعام و اکرام سے ہمیشہ مالا مال کرتا رہتا تھا، طبیعت کا نرم خلیق اور دل کا ضرورت سے زیادہ اچھا تھا، نوکر چاکر آنکھوں کے سامنے اسے لوٹتے تھے، مگر کسی کو سزا نہ دی جاتی تھی تمام زمانہ حکومت میں چار شخص امیر عبدالرحمٰن کی طبیعت پر حاوی رہے ان میں ایک فقیہہ تھے، دوسرا ایک مغنی تھا، تیسری ایک عورت، اور چوتھا ایک خواجہ سرا، فقیہہ دہی یحییٰ

بن یحییٰ قبیلہ مصمودہ کے بربر تھے، جن کا تذکرہ ہم ابھی کر چکے ہیں کہ ربض شقندہ میں امیر حکم کے خلاف بغاوت پر اشتعال درحقیقت انہی کا کارنامہ تھا، اس بغاوت کی ناکامی نے ثابت کر دیا تھا کہ ان فقیہ نے جو حکمت عملی اختیار کی تھی وہ غلط تھی، صحیح راہ یہ تھی کہ اگر علماء کو سلطنت میں اختیارات حاصل کرنے مقصود تھے تو وہ امیر کی دشمنی سے نہیں بلکہ دوستی سے حاصل ہو سکتے تھے، مگر اس خیال کو اگر درست سمجھ بھی لیتے تو فقیہ یحییٰ ایسے نہ تھے کہ ان کی خودداری اور تحکمانہ مزاج دوسرے کے سامنے آسانی سے جھک جاتا۔ بہرکیف دربار شاہی میں اُن کی صاف گوئی، بیباکی اور غیر مودب طریقوں نے انھیں کچھ نقصان نہ پہنچایا، کیونکہ یہ دریا دل بادشاہ گو فلسفہ کا شائق تھا، مگر طبیعت کا رجحان فی الحقیقت مذہب کی طرف تھا، اور یحییٰ جیسے خوددار عالم کے غیظ و غضب کو محض نیکی اور راستی کے جلوے سمجھا کرتا تھا، ان بزرگ کی بدمزاجیاں بے تکلف اٹھاتا، اُن کی درشت تقریریں چپ رہ کر سنتا، اور گناہوں سے توبہ کرنے میں جیسے جیسے سخت کفارے وہ تجویز فرماتے اُن کو بطیب خاطر ادا کرتا، جملہ امور مذہبی اور دار القضاء کا پورا انتظام انھیں کے سپرد کر دیا گیا تھا، بادشاہ کی قدر افزائی، اور علماء کی اعانت اور متوسط الحال باشندوں کے جوش عقیدت سے جہان سے خائف بھی رہتے تھے، اور ان باتوں کے علاوہ عامۂ خلائق کی امداد سے جو جنگ ربض کے زمانے سے انھیں اپنا ہم خیال تصور کرنے لگی تھی، اور جس کی امداد ایسی نہ تھی کہ بنظر تحقیر دیکھی جاتی یحییٰ ابن یحییٰ فقیہ آخر کار اسپین میں ایک بڑی قوت ہو گئے، کوئی باضابطہ منصب دربار میں انھیں حاصل نہ تھا، اگر وہ سب پر حکومت کرتے تھے تو یہ محض ان کی شہرت اور اثر کا نتیجہ تھا کسی منصب یا عہدے کا نہ تھا، مطلق العنان حکومت کو دل سے پسند فرماتے تھے، گو تھوڑا ہی زمانہ ہوا کہ اسی مطلق العنان حکومت کا مقابلہ کر چکے تھے، جب کبھی ضرورت پیش آتی تو اپنے اختیارات کو جس طرح چاہتے بے تکلف کام میں لاتے، قاضیوں کو اگر اپنے عہدوں پر سلامت رہنا ہوتا تو اُن کا فرض تھا کہ یحییٰ ابن یحییٰ فقیہ کا حکم مانیں، امیر عبدالرحمٰن چاہتے بھی تھے کہ کسی طرح ان کے قابو سے گلو خلاصی حاصل کریں، مگر بن نہ پڑتا تھا، امیر نے ایک مرتبہ قضاۃ سے وعدہ بھی کیا کہ ان کی مدد کریں گے، لیکن یہ وعدہ ایفا ہو سکا، جس قاضی نے فقیہ یحییٰ کے حکم سے روگردانی کی پھر امیر عبدالرحمٰن کو اسے برطرف ہی کرنا پڑا، فقیہ یحییٰ کا ذرا سا

اشارہ کسی قاضی کے خلاف کافی تھا کہ قاضی اپنی جگہ سے علیحدہ کر دیا جائے

ابوالحسن علی بن نافع معروف بہ زریاب بھی امیر عبدالرحمٰن کی طبیعت میں کچھ کم دخل نہ رکھتا تھا مگر اس کا میدان دوسرا تھا۔ زریاب بغداد سے آیا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی النسل تھا۔ خلفائے عباسیہ کے متوسلین میں سے مشہور و معروف مغنی اسحاق الموصلی کا شاگرد تھا۔ ایک دن خلیفہ ہارون الرشید نے اسحاق سے فرمایا "کیا کوئی نیا مطرب نہیں ہے جو دربار میں حاضر ہو؟" اسحاق نے عرض کیا "حضور میرا ایک شاگرد ہے جس کا گانا برا نہیں ہے، اس پر میں نے بڑی محنت کی ہے اور یقین ہے کہ اس سے میرا نام چلے" خلیفہ نے فرمایا "اچھا اسے دربار میں حاضر کرو" غرض ایک دن زریاب دربار میں حاضر ہوا، امیرالمومنین اس کی تمیز و تہذیب اور حسن تقریر پر فریفتہ ہو گئے، گانے کی نسبت جب خلیفہ نے زریاب سے کچھ سوال کیا تو اس نے عرض کیا کہ "گانا تو جس طرح اور لوگ گاتے ہیں۔ میں بھی گاتا ہوں، لیکن مزامیر میں ایک خاص فن ایسا ہے جس پر سوائے میرے دوسرے کو قدرت نہیں وہ فن میرا ایجاد کردہ ہے، اور اس کے مبصر حضور جیسے جوہر شناس ہی ہو سکتے ہیں اگر حکم ہو تو ایسا گانا سناؤں جو کسی نے نہ سنایا ہو" امیرالمومنین نے اجازت دی خادموں نے جلدی سے زریاب کے استاد اسحاق کا عود سامنے لاکر رکھا، زریاب نے استاد کے عود کو بجانے سے انکار کیا اور اپنا بنایا ہوا عود طلب کیا۔ امیرالمومنین نے پوچھا کہ اپنے استاد کا عود کیوں نہیں بجاتے؟ زریاب نے جواب دیا "اگر حضور کی یہ مرضی ہے کہ استاد کی مثل گاؤں تو ان کے عود کے ساتھ شروع کر سکتا ہوں، لیکن جو طرز میں نے ایجاد کیا ہے اگر اس کے مطابق سننا منظور ہے تو پھر مناسب ہے کہ میں اپنے ہی بنائے ہوئے عود پر گاؤں اس کے بعد زریاب نے ہارون الرشید کے سامنے وہ اصول بیان کیے جن کے مطابق اس نے یہ نیا آلۂ موسیقی تیار کیا تھا، پھر ایک قصیدہ ہارون کی تعریف میں اپنا ہی لکھا ہوا گانا شروع کیا، ہارون اس کا گانا سنکر بحد محظوظ ہوئے اور اسحاق پر ناراض ہوئے کہ ایسے عجیب مغنی کو اب تک ہمارے حضور میں پیش نہیں کیا، اسحاق نے عرض کیا کہ "مجھ کو خود اس سے پہلے زریاب کے اس کمال کا حال معلوم نہ تھا، زریاب نے کبھی اپنا یہ کمال مجھ پر ظاہر نہیں کیا تھا"

اسحاق نے یہ بات بالکل سچ کہی تھی، چنانچہ جب وہ زریاب سے تنہا ملا تو شاگرد کو سخت ملامت کی کہ "تو نے اپنے حال سے مجھے لاعلم رکھ کر آج دربار میں مجھے شرمندہ کیا، اب صاف صاف سن! کہ مجھکو تیری حالت پر وہی رشک ہے جو ایک ہم پیشہ کو دوسرے ہم پیشہ کی حالت پر ہوتا ہے، امیر المومنین آج تجھ سے خوش ہوئے ہیں اور تھوڑے دن میں ان کے دل میں تیری جگہ وہی ہو جائیگی جو اس وقت مجھے حاصل ہے، یہ بات ایسی ہے کہ اگر تیری جگہ میرا فرزند بھی ہوتا تو میں اس کو گوارا نہ کر سکتا، اگر آج مجھے تیرے ساتھ وہ محبت نہ ہوتی جو اُستاد کو شاگرد کے ساتھ ہوتی ہے تو میں یہیں تیرا کام تمام کر دیتا، پھر چاہے جو کچھ ہوتا، بس اب ان دو باتوں میں سے ایک بات کو سوچ کر فیصلہ کر یا تو یہاں سے چلا جا، اور کہیں دور جا کر آباد ہو اور اس بات کی قسم کھا کہ کبھی تیرا حال مجھ کو معلوم نہ ہوگا، اس صورت میں تیری ہر قسم کی ضروریات کے لیے میں اپنے پاس سے روپیہ دینے کو تیار ہوں، لیکن اگر یہ منظور نہیں ہے تو تجھے اختیار ہے یہاں رہ مگر یہ سمجھ لے کہ تجھے غارت کرنے میں میں اپنا سارا مال، یہاں تک کہ جان تک صرف کر دونگا۔" زریاب نے بلا تامل پہلی بات مان لی اور استاد سے روپیہ لے کر بغداد سے نکل گیا

تھوڑے دن کے بعد ایک روز خلیفہ ہارون الرشید نے اسحاق کو حکم دیا کہ زریاب کو حاضر کرے، اسحاق نے عرض کیا کہ "معذور ہوں زریاب پر کسی آسیب کا اثر ہے اور کہتا ہے کہ کوئی جن آکر اُس کو گانا سکھاتا ہے، اس وجہ سے وہ اس درجہ مغرور ہو گیا ہے کہ اپنے سامنے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا، چونکہ حضور سے اُسے نہ کچھ انعام ملا تھا، اور نہ دربار میں پھر حاضری کا حکم ہوا تھا، اس لیے یہ سمجھ کر کہ اُس کی خاطر خواہ قدر نہیں ہوئی، وہ غصہ میں کہیں نکل گیا، مجھ کو علم نہیں کہ وہ اس وقت کہاں ہے اور شکر کرتا ہوں کہ حضور سے الگ وہ دور ہوا، کیونکہ اُس پر ایک حالت ایسی طاری ہونے لگی تھی کہ اس کی صورت مہیب ہو جاتی تھی" امیر المومنین نے یہ سن کر زریاب کے چلے جانے پر افسوس کیا اور اسحاق نے جو کچھ کہا تھا اس کا یقین کر لیا۔

اسحاق کا بیان جھوٹ نہ تھا، زریاب کو حقیقت میں اس کا یقین تھا کہ حالتِ خواب

میں وہ جنات کا گانا سنتا ہے چنانچہ سوتے سوتے اکثر چونک پڑتا تھا، اور فوراً اپنی دونوں کنیزوں (۲۶
کو آواز دیتا تھا، ان میں سے ایک کا نام غزلان اور دوسری کا کندہ تھا، یہ دونوں نوجوان عورتیں تھیں، آقا کی آواز سنتے ہی وہ اپنی اپنی بانسریاں لے کر آتیں اور زریاب انکو فوراً وہ راگ سکھا دیتا جو جنات سے اُس نے ابھی سنے تھے، ان راگوں کے لیے موزوں اشعار وہ خود تصنیف کرتا جاتا تھا لیکن اسحاق سے بہتر کوئی اس بات کو نہیں جان سکتا تھا کہ زریاب کی اس حالت میں کوئی بات دیوانگی یا جنون کی نہ تھی، کونسا صاحب فن ایسا ہے۔ خواہ جنات کا اسے یقین ہو یا نہ ہو، جسکی زندگی میں ایسے لمحے نہ آتے ہوں، جن میں ایسے اثرات جن کا بیان کرنا دشوار ہو اور جو امور فوق الفطرت سے مشابہ ہوں، اُس پر عمل نہ کرتے ہوں۔

زریاب بغداد سے روانہ ہو کر افریقہ پہنچا اور یہاں سے اُس نے ایک عریضہ امیر حکم کو بھیجا کہ دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ہو، امیر حکم خط پڑھ کر زریاب کے حسن تحریر پر ایسا فریفتہ ہوا کہ فوراً لکھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو قرطبہ چلے آؤ، اور ایک معقول تنخواہ دینے کا بھی وعدہ کیا، زریاب مع اہل و عیال کے بحر زقاق کو عبور کر کے جزیرۃ الخضرا کے شہر میں پہنچا ہی تھا کہ امیر حاکم کے انتقال کی خبر سنی اس خبر سے اس درجہ پریشان ہوا کہ فوراً افریقہ کو واپس جانے کا قصد کیا، لیکن ایک یہودی مغنی جس کا نام منصور تھا اور جس کو امیر حکم نے زریاب کے استقبال کے لیے جزیرۃ الخضرا روانہ کیا تھا مصر ہوا کہ واپس نہ جانا چاہیے، کیونکہ امیر حکم کا فرزند عبدالرحمٰن بھی موسیقی کا ایسا ہی عاشق ہے جیسا کہ حکم تھا اور باپ ہی کی مثل اہل غنا کے حق میں فیاض بھی ہے، غرض منصور نے زریاب کو واپس نہ جانے دیا عبدالرحمٰن کو جس وقت معلوم ہوا کہ زریاب اندلس میں آگیا ہے تو فوراً قرطبہ میں حاضر ہونے کے لیے اسے خط لکھا اور جس قدر شہر اور قصبات جزیرۃ الخضرا سے قرطبہ تک راستہ میں آتے تھے اُن کے حاکموں کو پروانہ بھیجا کہ جہاں تک ممکن ہو ہر شہر و قصبے میں زریاب کی خاطر و مدارات کیجائے، اس کے علاوہ ایک خواجہ سرا کی معرفت بہت سے تحائف اور اسباب کے لیے بار برداری کے خچر روانہ کیے، زریاب جب قرطبہ میں پہنچا تو ایک عالیشان محل میں اتارا گیا، تین روز تک تکان سفر دور کرنے کی اجازت ہوئی چوتھے دن دربار میں مدعو کیا گیا، امیر عبدالرحمٰن نے گفتگو شروع کی اور وہ تنخواہ بیان کی جس پر زریاب کو قرطبہ میں ملازم رکھنا منظور تھا، یہ تنخواہ بہت بڑی تھی، علاوہ دو سو دینار سُرخ کے

جو باہوار مقرر ہوئے، عیدین اور موسم بہار اور نوروز پر ایک ایک ہزار اشرفیوں کے انعام کا بھی وعدہ کیا، دو سو پیمانے جو اور دو پیمانے گندم کے مقرر ہوئے، مختلف مقامات میں کئی عالیشان مکان مع باغات اور کھیتوں کے جو اُن سے متعلق اور ۴۰ ہزار دینار سُرخ کی قیمت کے تھے، رہنے کیواسطے عطا ہوئے، غرض اس تمام انعام و اکرام کے بعد امیر عبدالرحمٰن نے گانے کی فرمائش کی، جب زریاب نے گانا سنایا تو امیر ایسا خوش ہوا کہ پھر کسی دوسرے مطرب کا گانا نہ سُنا، اِسی دن سے زریاب پر بیحد مہربان ہوگیا، اور اکثر مختلف علوم و فنون، تاریخ اور شاعری وغیرہ پر اس سے گفتگو کیا کرتا تھا، اس حیرت انگیز مغنی کو عجیب عجیب علوم پر عبور تھا اور وہ بڑی وسیع معلومات کا آدمی تھا علاوہ عمدہ شاعر اور دس ہزار سے زیادہ راگ اور راگنیوں کا علم رکھنے کے اس نے علم ہیئت اور جغرافیہ میں بھی بڑی دستگاہ پیدا کی تھی اور دنیا کے مختلف ملکوں اور وہاں کے باشندوں اور اُن کے اخلاق اور طرزِ معاشرت کے متعلق اس کی تقریریں نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہوتی تھیں، لیکن اس علم و فضل سے بھی بڑھ کر جس چیز کا اثر عبدالرحمٰن کے دل پر ہوتا تھا وہ اس کا مذاق سلیم و حسنِ تقریر اور حرکات و سکنات میں خوش ادائی تھی شیریں سخنی و نفاستِ گفتار میں کوئی اس کو نہ پاتا تھا حسن شناسی میں کوئی اس کا ہم پلہ اور مذاق کی نفاست و پاکیزگی میں کوئی اس کا نظیر نہ تھا، شاہی جلسوں اور ضیافتوں میں آرائش کا انتظام اِس خوبی سے کرتا تھا کہ دوسرے کو یہ طاقت نہ تھی عام لوگ اس کو انسان سے بڑھ کر سمجھتے تھے اور ہر نئی طرز کا موجد اسی کو جانتے تھے اور ان چیزوں میں اس کی زبان کا ایک ایک لفظ اسپین کے عربوں میں قانون کا حکم رکھتا تھا، جو نئی باتیں اس نے پیدا کیں وہ بیشمار تھیں، لوگوں کے طرزِ معاشرت میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، پہلے سر کے بالوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ لمبے لمبے ہوتے تھے اور مانگ بیچ میں نکالی جاتی تھی۔ میزوں پر ظروف سونے چاندی کے اور میز پوش کپڑے کے ہوتے تھے، اب سامنے کے بال پیشانی پر جمائے جاتے تھے، میزوں پر شیشے اور بلور کے ظروف ہوتے تھے اور میز پوش بجائے کپڑے کے چمڑے کے ہونے لگے، ہر موسم کے لیے جُدا جُدا لباس تجویز کیا، ترکاریوں میں ہلیون (Asparagus) کی نسبت بتایا کہ یہ ایک عمدہ غذا ہے اس سے نفرت نہ کرنی چاہیے۔ بہت سے کھانے ایجاد کیے جو اسی کے نام سے زریاب مشہور ہو گئے غرض وضعدار زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی بات میں بھی زریاب ایک اعلیٰ نمونہ قرار پایا، خوش نصیبی کی

ایسی مثالیں بھی دنیا میں شاذ نکلیں گی کہ ایک گوّیے کی یہ توقیر ہو کر جب تک اسپین میں اسلامی حکومت قائم رہے وہاں کے مسلمان زریاب کو علماء و شعرا، اہل سیف و وزرا، اور ابنائے ملوک کے طبقے میں شمار کرکے اُس کی عزت کریں۔

باوجودیکہ زریاب کو عبدالرحمٰن کے مزاج میں بہت دخل ہو گیا تھا، اور لوگ بھی عرضیاں لے کر آنے لگے تھے کہ بادشاہ کو ان کے اصلی حالات سے آگاہ کرے، مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ زریاب سیاسی اور ملکی معاملات میں دخل دینے سے ہمیشہ پرہیز کرتا تھا، وہ دنیا سے خوب واقف تھا، اور اس بات کو اچھی طرح سمجھے ہوئے تھا کہ جب ہر طرف رشک و حسد کا بازار گرم ہو تو سلطنت کے معاملات سے بحث رکھنی یا سازشوں میں شریک ہونا مذاق سلیم کے منافی ہے اس قسم کی باتوں کو اس نے سلطانہ طروب اور خواجہ سرا نصر پر چھوڑ رکھا تھا، سلطانہ طروب نہایت بے مہر اور خود غرض عورت تھی، فریق بنانے کا شوق اور طمع زر اس کی طبیعت کا خمیر تھا، سچے عشق سے ایسی عورت کب واقف ہو سکتی ہے، وہ دولت کے مقابلہ میں کسی چیز کا پاس نہ کرتی تھی جب تک خاوند اشرفیوں کے توڑے دروازہ پر نہ رکھ دیتا دروازہ نہ کھولتی۔ ظالم، لالچی سازشوں کی شوقین تھی اور خواجہ سرا نصر سے ہمیشہ ملی رہتی، یہ خواجہ سرا بھی ظلم و دغا میں سلطانہ طروب کا ہمسر تھا، نصر ایک اسپینی عیسائی کا لڑکا تھا، یہ آختہ تھا، عربی زبان بولنی نہ جانتا تھا اور عیسائیوں کے ساتھ اس کو ایسی ہی سخت عداوت تھی جو ایک نو مسلم عیسائی کو ہو سکتی تھی۔

غرض اس وقت دربار قرطبہ کی تو یہ کیفیت تھی جو اوپر بیان ہوئی اور ملک کی حالت یہ تھی کہ اس میں امن و امان نہ تھا، صوبہ مرسیہ میں سات برس سے معدیہ اور یمانیہ میں لڑائیاں ہو رہی تھیں ماردہ میں مدت سے غدر پڑا ہوا تھا اور وہاں کے عیسائی لوئی لی ڈیبونیر۔ (Louis le Deb onnaire) سے نامہ و پیام کرتے اور اس سے سازش کرکے حکومتِ اسلام کی دشمنی کے درپے تھے طلیطلہ میں بغاوت موجود تھی اور قرب و جوار کے اضلاع میں بھی آئے دن بدنظمی اور فساد رہتا تھا۔

یوم الخندق کے چند سال بعد ہی اہل طلیطلہ نے پھر خودسری اختیار کر لی تھی اور عمروس بن یوسف نے جو محل بنوایا تھا اسے مسمار کر دیا تھا، امیر حکم نے طلیطلہ کو سر کرنے کے لیے ایک بار پھر حیلے سے کام لیا، قرطبہ سے یہ قصد ظاہر کرکے کہ قیطلونیہ پر فوج کشی کرنے کو نکلا ہے صوبہ مرسیہ میں لشکر

آنار دیا، یہاں سے جاسوس دوڑا کر معلوم کیا کہ طلیطلہ کے لوگ اس قدر مطمئن بیٹھے ہیں کہ رات کو شہر کے دروازے تک بند نہیں کرتے، امیر حکم فوراً لشکر لے کر طلیطلہ کی فصیلوں کے سامنے پہنچ گیا اور ایک دروازہ کھلا پاکر بغیر تلوار چلائے شہر پر قابض ہو گیا، شہر کے شمالی حصے کے مکانات جلوا دیئے انہی میں ایک مکان ہاشم کا تھا جو عیسائی مذہب ترک کر کے مسلمان ہوا تھا، اب ہاشم بالکل مفلس اور تنگ دست ہو کر طلیطلہ سے قرطبہ میں آیا اور گذارے کے لیے لوہار کا پیشہ اختیار کیا کچھ دنوں کے بعد اس بدسلوکی کا بدلہ نکالنے کے لیے جو طلیطلہ میں اس کے ساتھ ہوئی اور ان زیادتیوں کے انتقام کے لیے جو سلطنت کی طرف سے اُس کے ہموطنوں پر کی گئی تھیں۔ ہاشم نے طلیطلہ کے شرپسندوں سے سازش کی، اور قرطبہ چھوڑ کر وہ طلیطلہ چلا آیا۔ یہاں آکر وہ رعایا کا سردار بنا اور عبدالرحمٰن بن حکم کے سپاہیوں اور خدام کو طلیطلہ سے باہر نکال دیا (۲۱۴ھ / ۸۲۹ء) اس کے بعد ہاشم نے قرب وجوار میں لوٹ مار شروع کی اور ایسے قریوں کو جن میں عرب آباد تھے لوٹ لیا، ہاشم کی جماعت اور بڑھی اور اُس میں اہل حرفہ اور کاشتکار، غلام، اور ہر قسم کے بدمعاش اور اوباش شامل ہو گئے یہاں تک کہ اس غول کی صورت نہایت مہیب ہو گئی۔ عبدالرحمٰن بن حکم نے حاکم سرحد محمد بن وسیم کو حکم دیا کہ ایک فوج ان باغیوں کی گوشمالی کو بھیجی جائے، وسیم نے فوج روانہ کی لیکن ہاشم کے غول نے اُسے پسپا کر دیا اور ایک سال تک باغیوں کے اس گروہ نے طلیطلہ کے علاقے میں لوٹ مار جاری رکھی آخر کار امیر عبدالرحمٰن نے وسیم کو سخت ملامت کر کے کہ اس نے سُستی اور غفلت کی ہے اُس کے پاس ایک فوجِ کمک اور روانہ کی، اس فوج کے پہنچتے ہی وسیم نے ہاشم پر حملہ کیا، ہاشم قتل ہوا اور اس کے ساتھی میدان سے بھاگ گئے۔

مگر طلیطلہ کے لوگ ابھی تک باغی تھے اور شہر انہی کے قبضہ میں تھا، ۲۱۹ھ / ۸۳۴ء میں امیر عبدالرحمٰن نے اپنے لڑکے امیہ کو شہر کے محاصرہ کے لیے روانہ کیا، لیکن شہر والوں نے امیہ کے حملوں کا ایسا جواب دیا کہ امیہ صرف قرب وجوار کے علاقوں کو تاخت وتاراج کر کے قرطبہ کو واپس چلا، طلیطلہ والوں نے یہ دیکھ کر کہ شاہی فوج واپس جا رہی ہے۔ چاہا کہ اس حالت میں شاہی فوج کو غارت کر دیں، لیکن امیہ پہلے ہی سے ایک فوج قلعہ رباح میں بسر کر دگی میسرہ جو ایک نومسلم عیسائی تھا چھوڑتا آیا تھا، میسرہ کو اہل طلیطلہ کے اس قصد کی کہ شاہی فوج کو حالتِ واپسی میں

وہ غارت کرنا چاہتے ہیں خبر لگ گئی، اُس نے فوراً طلیطلہ والوں کو غارت کرنے کے لیے ایک فوج کمین گاہ میں بٹھا دی طلیطلہ والے قریب آئے تو اس فوج نے ایسا سخت حملہ کیا کہ اہل طلیطلہ کو سخت ہزیمت ہوئی، ہبیسرہ کے فوجی سرداروں نے مقتول دشمنوں کے سر کاٹ کر اس زمانہ کے دستور کے مطابق اپنے افسر ہبیرہ کے سامنے پیش کیے۔ لیکن ہبیسرہ اگرچہ عیسائی سے مسلمان ہو چکا تھا تھا مگر اس کے دل سے اپنے ملک کی محبت بالکل نہ مٹی تھی کٹے ہوئے سروں کو دیکھ کر اس کی سابقہ حمیت ملکی جوش میں آئی اور اس قوت سے یہ ملکی حمیت دوبارہ زندہ ہوئی کہ وہ اپنے تئیں ملامت کرنے لگا کہ افسوس کن لوگوں کی خدمت میں نے اختیار کی، یہ لوگ وہ ہیں جو اس کے ملک پر تشدد اور ظلم کرتے ہیں، ہبیسرہ اسی شرمندگی اور رنج میں چند روز بعد مر گیا۔

امیر عبدالرحمٰن گو وقتاً فوقتاً طلیطلہ کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجتا رہا، لیکن وہاں کے لوگوں میں جب تک اتفاق رہا عبدالرحمٰن کچھ نہ کر سکا، اہل طلیطلہ کی بدقسمتی سے یہ اتفاق اُن میں نہ رہا ہمیں یہ نہیں معلوم کہ شہر کے اندر اُس وقت کیا واقعات پیش آئے، لیکن ابعد کے حالات سے دریافت ہوتا ہے کہ عیسائیوں اور مولدوں (نو مسلم عیسائیوں) میں نزاع پیدا ہو گیا۔

طلیطلہ کا ایک رئیس ابن مہاجر نام جو پہلے عیسائی تھا اور اب مسلمان ہو گیا تھا۔ طلیطلہ سے مع اپنے ہمراہیوں کے نکل گیا اور قلعہ رباح میں جو شاہی فوج موجود تھی اس کے سپہ سالار کے پاس جا کر اپنی خدمات پیش کیں، (۲۲۱ھ) سپہ سالار نے فوراً اُسے ملازم رکھ لیا، اب ابن مہاجر اور اُس کے ہمراہیوں کے صلاح و مشورہ سے قصد کیا گیا کہ شہر طلیطلہ میں رسد پہنچنے کا سدباب کر دیا جائے اور جب اہل شہر قحط سے تنگ آ جائیں تو شہر فتح کر لیا جائے۔

غرض طلیطلہ کا محاصرہ اسی نیت سے کیا گیا، اور شہزادہ ولید جو امیر عبدالرحمٰن کا بھائی تھا اس محاصرہ کا سردار مقرر ہوا، محاصرہ ایک برس تک جاری رہا، شہر کے لوگ رسد کے بند ہو جانے سے قحط کی مصیبت میں مبتلا ہو گئے، عربی سردار فوج نے ایک قاصد پیغام صلح کے ساتھ شہر کے لوگوں کے پاس روانہ کیا، اس قاصد نے ان کو سمجھایا کہ ہتھیار ڈال دیں، کیونکہ شہر ایک نہ ایک دن اُن کو حوالے کرنا ہی پڑیگا، اس لیے بہتر ہے کہ اس وقت صلح کر لی جائے تاکہ شرائط صلح اُن کے حق میں مفید قرار پا سکیں، اہل طلیطلہ نے قطعی انکار کیا، یہ اُن کی بدقسمتی تھی کہ شاہی قاصد نے

شہر میں آکران کی ہمت و مردانگی ہی کو مشاہدہ نہیں کیا تھا، بلکہ قحط نے جو بُری گت انکی بنائی تھی وہ بھی اُس نے دیکھ لی تھی، چنانچہ واپسی پر اُس نے عربی سردار فوج سے کہا کہ شہر پہ اب حملہ کر کے قبضہ کر لینا چاہیے، عربی سردار یعنی شہزادہ ولید نے اِس مشورہ کو پسند کیا، اور ۲۰ جون ۸۳۷ء (۲۸ جمادی الآخر ۲۲۲ھ) کو ایک سخت حملے کے بعد شاہی فوج نے طلیطلہ پر قبضہ کر لیا اِس سے پہلے آٹھ برس تک یہ شہر اپنی حکومت میں بالکل آزاد رہا تھا، مورخوں نے یہ کچھ نہیں لکھا کہ امیر عبدالرحمٰن نے اہل طلیطلہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا، صرف اتنا لکھا ہے کہ امیر نے طلیطلہ کے کچھ لوگوں کو ضمانت میں مانگا، اور عمروس بن یوسف والا محل جسے طلیطلہ کے لوگوں نے منہدم کر دیا تھا پھر تعمیر کیا گیا۔

امیر عبدالرحمٰن کے آخری زمانۂ حکومت میں قرطبہ کے عیسائیوں نے ایک نئی قسم کی سرکشی اختیار کی، جو بالکل مستثنیٰ صورت رکھتی تھی، اب ہم اس سرکشی کے حالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

نویں صدی عیسوی کے زمانۂ وسطیٰ کے عیسائی مؤرخ جنھوں نے اپنی تصانیف لاطینی زبان میں لکھی ہیں، نہ صرف قرطبہ کے عیسائیوں کی اس عجیب سرکشی کے متعلق بکثرت معلومات پیش کرتے ہیں، بلکہ ان قرطبی عیسائیوں کی طرزِ معاشرت، خیالات اور عقائد کی نسبت بھی بہت کچھ واقفیت پیدا کراتے ہیں، اب ہم کوشش کرتے ہیں کہ ان عیسائی مورخوں نے اس موضوع پر جو دلچسپ حالات بہت تفصیل سے لکھے ہیں، اور جو اُن کی کتابوں سے اخذ کیے جا سکتے ہیں اُن کو بجنسہٖ یہاں لکھ دیں۔

اسناد

ابن عذاری۔ جلد ۲۔ ص ۷۶، ۸۲، ۸۵، ۸۷۔ ۹۳ - ۹۵

مقری۔ جلد ۱ ص ۲۲۳-۲۲۵ جلد ۲ ص ۸۳

یولوجیس (Eulogius) کی کتاب جلد ۲ ص ۱

خوشانی۔ ص ۲۰۷، ۲۵۷، ۲۶۵-۲۶۶-۲۶۷

ابن خلکان۔ جلد ۱ (ایڈیشن وسٹن فلڈ) ص ۲۰

نویری ص ۴۵۸ - ۴۵۹

ابن خلدون ص ۷ - ۸

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

چھٹی فصل

یولوجیوس اور فلورا

قرطبہ کے عیسائیوں میں بالخصوص اُن کے تعلیم یافتہ لوگ بکثرت ایسے تھے جنکو اپنی (۲۶)
قسمت سے کچھ شکایت نہ تھی، اُن پر کسی قسم کا ظلم نہ تھا، اپنے مذہب کی پابندی کی اُن کو قطعی اجازت ملی ہوئی تھی، اور وہ ہر طرح سے خوش تھے، ان میں بہت سے عیسائی ایسے تھے جو اسلامی فوجوں میں بھرتی تھے، بہت سے ایسے تھے جو دربار شاہی میں یا عربی امراء کی سرکاروں میں بڑی بڑی تنخواہوں کے عہدوں پر مقرر تھے، یہ لوگ بھی اپنے آقاؤں کی طرح حرمیں رکھتے تھے اور بعض میں اور بیہودہ باتیں بھی تھیں

جو عیسائی علمی مذاق رکھتے تھے وہ عربی علم ادب کی آب و تاب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ لاطینی تصنیفات سے نفرت کرنے لگے، جب کبھی کچھ تصنیف کرتے تو اپنے آقاؤں کی زبان کام میں لاتے، اسی زمانہ کا ایک متعصب عیسائی الوارو نہایت غصے اور افسوس سے لکھتا ہے:-

میرے ہم مذہب عیسائی عربوں کی شاعری اور افسانوں سے حظ اُٹھاتے ہیں، وہ مسلمان فقیہوں
اور فلسفیوں کی کتابیں مطالعہ کرتے ہیں اس غرض سے نہیں کہ اُن کی تردید کریں، بلکہ اس لیے
کہ صحیح اور نفیس عربی لکھنی آجائے، پادریوں کو چھوڑ کر آج کونسا عیسائی ہے جو کتب مقدسہ کی
تفسیریں لاطینی زبان میں مطالعہ کرتا ہو، کونسا عیسائی ہے جو انجیل یا انبیا اور حواریوں کے
حالات پڑھتا ہو، افسوس! ایسے نوجوان عیسائی جو ذہانت اور لیاقت میں اونچا درجہ رکھتے
ہیں، اُن کو سوائے عربی کے اور کسی زبان سے واقفیت نہیں، وہ بڑے ذوق و شوق سے
عربوں کی تصانیف پڑھتے ہیں، عربی کتابیں بصرف کثیر اتنی جمع کرتے ہیں کہ کتب خانے بنا لیتے
ہیں عربی ادب کی تعریف میں اُن کی زبان خشک ہوتی ہے، لیکن جو کتابیں دین مسیحی سے
مخصوص ہیں اُن کو دیکھ کر بڑی نخوت سے کہتے ہیں کہ وہ ہماری توجہ کے لائق نہیں، زیادہ
افسوس اس کا ہے کہ عیسائی اپنی زبان تک بھول گئے ہیں اور ہزاروں عیسائیوں میں سے شاید
ایک عیسائی ایسا نکلے جو اپنے کسی دوست کو چار سطر کا خط سلیس لاطینی زبان میں لکھ سکے لیکن
عربی کا یہ زور ہے کہ اس زبان کو روانی سے لکھنے والے عیسائی بکثرت موجود ہیں، عربی میں شعر
کہتے ہیں جو صحت عروض کے لحاظ سے عربوں کے کلام سے بھی بڑھا ہوا ہوتا ہے[ا]" اگر غور
کیا جائے تو عربی ادب کا یہ شوق اور لاطینی ادب کی طرف سے غفلت کوئی عجیب بات نہ تھی
یونان اور رومائے قدیم کے شاعروں کا کلام قرطبہ کے عیسائیوں میں ابھی تک مروج نہ ہوا
تھا لاطینی زبان کی مذہبی کتابیں دنیادار عیسائیوں کے لیے کوئی لطف نہ رکھتی تھیں، لاطینی (۲۶۹)
تصانیف کی جو عام حالت اُس زمانہ میں تھی وہ زوال کی تھی، شاعری اس زبان میں نثر رہ گئی تھی
تھی لیکن عروض کے قواعد بھول چکے تھے، اشعار میں صرف قافیہ بندی ہوتی تھی، اس شاعری
کا طرز بھی بھدا اور بے قاعدہ تھا

قرطبہ کے عیسائیوں نے جن میں مشرقیت بہت پیدا ہو گئی تھی، اپنی طبیعتوں کو حکومت غیر

[ا] مترجم انگریزی یہاں یہ نوٹ لکھتا ہے: "اس کا بدلہ نصرانیت نے اس وقت نکالا جبکہ پادری کیمنز ہیمینیز نے ہزار
عربی کتب غرناطہ میں سربازار جلوائیں اور عربی زبان بولنے اور لکھنے کی ممانعت اس حکم سے کی کہ یہ ایک وحشی
زبان بےدین اور قابل نفرت قوم کی ہے" (مترجم)

خوش رہنے کے قابل جلد بنا لیا، لیکن سب عیسائی ایسے نہ تھے، کچھ لوگ مستثنیٰ بھی تھے، قومی غرور اور خودداری سب کے دل سے نہ مٹی تھی، بعض نازک طبیعتیں ایسی بھی تھیں جو بڑے لوگوں کو اپنے اوپر مہربان بنانے سے نفرت رکھتی تھیں، وہ امیروں کے درباروں میں خوشامد اور چاپلوسی سے داخل ہونا نہیں چاہتی تھیں، یہ وہ لوگ تھے جو قرطبہ کے پرانے لاطینی نام پر تزیکیان (دارالامراء) پر اب تک فخر کرتے تھے، یہ شہر اُن کا مولد تھا، اور اب انہیں اس کا رنج تھا کہ وہ ایک سلطان کا دارالسلطنت ہے، اسپین کے شمال میں جو چھوٹی چھوٹی عیسائی حکومتیں قائم ہوئی تھیں اُن کی حالت پر رشک کرتے تھے، گو اِن حکومتوں میں آپس کی لڑائیاں کسی طرح ختم نہ ہوتی تھیں مگر عربوں کی حکومت سے تو وہ آزاد تھیں اور کم سے کم عیسائی اُنکے مالک اور حاکم تھے بعض وقت اُنکے اس حبِّ قومی کو واقعی شکایتیں بھی تیز کر دیتی تھیں، واقعی شکایتیں اس طرح پیدا ہوتی تھیں کہ مسلمان امیر کبھی کبھی ایسے فرمان جاری کرتے تھے جن سے عیسائیوں کو دلی تکلیف پہنچتی تھی اور ایسے حکموں کو وہ اپنی ذلت اور توہین کا باعث جانتے تھے، مثلاً ایک موقع پر فرمان جاری ہوا کہ مسلمان اور عیسائی دونوں اپنے بچوں کا ختنہ کرایا کریں، اس پر عیسائیوں کو بہت طیش آیا، اِن لوگوں میں جو سب سے زیادہ رنج اور غصے کی حالت میں رہا کرتے تھے وہ پادری اور قسیس تھے، یہ مسلمانوں کے جانی دشمن تھے اور ان کا دشمن ہونا مقتضائے فطرت تھا، اُنکی دشمنی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کے پیغمبر اور پیغمبر کی تعلیم کے متعلق ان پادریوں نے اپنے دماغ میں نہایت بیہودہ اور غلط خیالات بھر لیے تھے، پیغمبر اسلام اور اُن کی تعلیم کی اصلی کیفیت سے آگاہ ہونا اُنکے لیے کچھ مشکل نہ تھا، لیکن جہالت اتنی تھی کہ خود مسلمانوں سے جو اُن کے ہمسایہ تھے اِن باتوں کو تحقیق کرنے کی انھوں نے مطلق پروا نہ کی حقیقت سے اجتناب کر کے اس بات کو بہتر سمجھا کہ پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت نہایت مہمل اور نامعقول قصوں کا یقین کر لیں، یولوجیس جو اس زمانہ کے پادریوں میں بڑا صاحب علم و فضل مانا جاتا تھا، سیرت پیغمبر سے آگاہ ہونے کے لیے عربوں کی تصانیف کی طرف متوجہ نہ ہوا، اگرچہ وہ عربی میں کتب تواریخ کے پڑھنے کی پوری استعداد رکھتا تھا، بلکہ لاطینی زبان کی ایک قلمی کتاب کو اس بارے میں اُس نے مستند سمجھ لیا، یہ قلمی (۲۷۰)
نسخہ اس کو بنبلونہ کی مسیحی خانقاہ میں اتفاق سے مل گیا تھا، اس کتاب میں جہاں اور باتیں

لکھی تھیں ایک جھوٹا اور نامعقول قصہ یہ بھی درج تھا" ... ...

... ...

... ... ۔[1] اس جھوٹے اور بیہودہ قصہ کی نسبت پادری یولوجیس بڑے جوش و خروش سے اپنی کتاب میں کہتا ہے کہ ایسے ہوتے تھے مسلمانوں کے پیغمبر کے معجزات !"

پادریوں نے جس طرح پیغمبر کی سیرت کو غلط سمجھا تھا اسی طرح اسلام کے اصول بھی غلط طریقے پر سمجھ رکھے تھے، پادریوں کی یہ جہالت ایک قدرتی بات تھی، کیونکہ رہبانیت میں انھوں نے پرورش پائی تھی، عورت سے عشق کرنا ایسا فعل تھا جس سے اُنکی طبیعت کو مطلق لگاؤ نہ تھا، ایسے لوگوں کو کثرتِ ازدواج کا طریقہ جو مسلمانوں میں جائز تھا، نہایت ہی رزیل فعل معلوم ہوتا تھا، اور اس سے بھی بڑھ کر جس خیال سے پادریوں کو اذیت پہنچتی تھی وہ یہ تھا کہ مسلمانوں نے اپنی جنت میں حوریں آباد کر رکھی تھیں، بہرکیف یہ اور عجیب بات تھی کہ انھوں نے پیغمبر اسلام کی تعلیم کو جناب مسیح کی تعلیم کے بالکل برعکس سمجھ رکھا تھا، (اسلام کا دشمن اور متعصب عیسائی) الوارو لکھتا ہے "مسیح کے اس دشمن نے ہفتہ کا چھٹا دن مسیح کے "یوم آلالام" کے جواب میں کھانے اور رندمشربی کے لیے مقرر کر رکھا تھا (یوم الآلام عیسائیوں میں غم کرنے اور روزہ رکھنے کا دن ہوتا ہے) مسیح نے اپنے شاگردوں کو عفت اور عصمت کا سبق دیا، پیغمبر نے جسم کی لذتوں اور ناپاک مسرتوں کا وعظ کہا حتیٰ کہ محرموں کو حلال کر دیا، مسیح نے نکاح کرنے کا حکم دیا، پیغمبر نے طلاق کا، مسیح نے شراب سے پرہیز اور روزے رکھنے کی ہدایت کی، پیغمبر نے شراب خواری اور بسیارخوری کی ہدایت کی۔" اسی مصنف الوارو نے مسیح کے چند الفاظ نقل کیے ہیں، لیکن انجیل میں اس کا پتہ چلانا کہ وہ واقعی مسیح کے الفاظ ہیں بہت دشوار کام ہے، وہ الفاظ یہ ہیں

---

[1] اِس قصے میں بیان ہوا ہے کہ مسلمانوں میں ہر سال ایک خاص زمانہ میں کتے مارنے کا دستور تھا، اس دستور کی وجہ بیان کرنے میں سخت کذب و افترا کیساتھ حضرت پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ قدسی صفات کی شان میں بیہودہ الفاظ اور بالکل جھوٹی باتیں لکھی ہیں، میں نے اس قصہ کو اشتعال انگیز سمجھ کر ترجمہ نہیں کیا اگرچہ ڈوزی نے پادریوں کی جہالت اور حماقت ثابت کرنے کے لیے یہ باتیں لکھی ہیں، مگر ان کا اعادہ بھی نامعقول حرکت معلوم ہوا (مترجم)

مسیح نے حکم دیا کہ روزے کی حالت میں مرد کو اپنی عورت سے علیحدہ رہنا چاہیے مگر پیغمبر نے روزے کے دنوں کو خصوصیت کیساتھ شہوانی لذتوں کے لیے مخصوص کیا۔" الوارو کی اس تحریر پر تعجب آتا ہے، گو امیر اندلس کے دربار تک اُس کی رسائی نہ ہو، لیکن اس کا علم تو اسے ضرور ہوا ہوگا کہ ایک مرتبہ امیر عبدالرحمٰن بن حکم نے جب رمضان کے روزے قضا کیے تھے تو یحییٰ فقیہ نے کیسا سخت کفارہ امیر کے لیے تجویز کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اِن پادریوں نے نہایت غلط خیالات مسلمانوں کے مذہب کی طرف سے اپنے (۲۷۱)
دل میں جما رکھے تھے، جو عیسائی ۲؎ بہتر معلومات رکھتے تھے وہ اِن پادریوں کو بہتیرا سمجھاتے تھے کہ پیغمبر اسلام نے خالص اخلاق حمیدہ کی تعلیم دی ہے مگر اُنکی سمجھ میں مطلق یہ بات نہ آتی تھی، ان پادریوں کو اس بات پر اصرار تھا کہ اسلام اور رومانیوں کی بت پرستی کو ایک ہی چیز سمجھ کر مسلمانوں کے مذہب کو شیطان کی پیدا کردہ بت پرستی سمجھیں۔

لیکن پادریوں کی عداوت کا اصلی سبب مسلمانوں کا مذہب نہ تھا بلکہ عربوں کے خصائص تھے عربوں نے ایک لطیف نفس پرستی میں خوش اخلاقی اور بشاشت کو آمیز کر رکھا تھا، پادریوں کو انکی یہ ادا زہر معلوم ہوتی تھی، کیونکہ یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ترک دنیا، نفس کشی، اور جسم کو ایذائیں پہنچا کر گناہوں کے کفارے کی طرف اپنے دلوں کو رجوع کیا تھا، اتنی بات ضرور تھی کہ ان پادریوں کو اکثر ستایا بھی جاتا تھا، طبقۂ اعلیٰ کے مسلمان اس قدر روشن خیال اور تربیت یافتہ تھے کہ وہ کسی عیسائی کی اُس کے مذہب کی بنا پر توہین نہ کرتے تھے، لیکن عوام الناس جیسا کہ ہر جگہ حال ہے اس بارے میں ناگوار حرکتیں کرتے تھے، جہاں کوئی پادری رستہ میں آتا دکھائی دیا فوراً آوازے کسنے لگے کہ "دیکھو وہ احمق جا رہا ہے" یا کوئی مذاقیہ گیت جس کے اخیر میں طنز آمیز تعریف صلیب کی ہوتی گانے لگتے ۱؎ بعض اوقات بازاروں کے شریر لڑکے اُن کو پتھر مارتے، جب کسی عیسائی کا جنازہ گذرتا تھا تو راہگیروں کی زبان سے پادریوں کو یہ فقرہ سننا پڑتا "خدا ان پادریوں

۱؎ یہاں مترجم انگریزی کا یہ نوٹ ہے "کوئی مسلمان اس بات کا یقین نہیں رکھتا کہ حضرت عیسیٰ مصلوب ہوئے تھے اور ایک عجیب خیال مسلمانوں کا یہ ہے کہ یہودا کی شکل حضرت عیسیٰ کی سی ہوگئی تھی اور اس طرح یہودا نے اس جرم کی سزا برداشت کی جو حضرت عیسیٰ پر یہودیوں نے عائد کیا تھا۔ برٹن الف لیلہ ۱۸۸۵ء حصہ ۲ ص ۲۲۰ تعلیقہ (مترجم)

پر رحم نہ کرے"۔ کبھی کبھی جنازے کے ساتھ جو لوگ ہوتے تھے اُن پر مٹی اور کیچڑ پھینکی جاتی تھی، جب اوقاتِ مقررہ پر گرجا کا گھنٹہ بجایا جاتا، تو مسلمان سر ہلا کر کہتے، "یہ عیسائی کیسے بیوقوف ہیں، پادریوں سے دھوکا کھا رہے ہیں، پادریوں کی جھوٹی باتوں کو یقین کرنے میں عیسائی کیسی سخت حماقت کرتے ہیں، ان بیوقوفوں کو دھوکا دینے والوں پر خدا کی لعنت ہو"

بعض مسلمانوں کی نظروں میں عیسائی بالعموم اور پادری بالخصوص نہایت نفرت کے قابل لوگ تھے، یہ مسلمان اُن سے دور سے بات کرتے تھے، تاکہ قریب جانے میں انکے کپڑے اُنکے کپڑوں سے چھو نہ جائیں، لیکن یہ بدقسمت پادری جن کو ناپاک سمجھ کر اُن سے اتنی نفرت کیجاتی تھی کہ اُن کو چھونا ایک جذامی کو چھونے کے برابر تھا مسیح کے اس قول کو یاد کرتے تھے کہ "میرے نام کیوجہ سے سب لوگ تم سے نفرت کریں گے"۔ اور سمجھتے تھے کہ آج اس قول کی تصدیق ہو رہی ہے، پادری اُس زمانے کو حسرت سے یاد کرتے تھے جبکہ مسیحی دین ملک پر حکمران تھا، ہر طرف عالیشان گرجا کھڑے تھے، اور پادریوں کا حکم سلطنت میں سب سے زیادہ باأثر تھا (۲۷۲

جب پادریوں کی خودداری مجروح ہوئی اور توہین نے دل پر چرکے لگائے تو سمجھے کہ اب کچھ کرنا چاہیے، اس حالت میں چند پادری اور چند راہب اور کچھ معمولی عیسائی کمربستہ ہوئے کہ چپ بیٹھ کر اب تکلیفیں نہ اٹھائیں گے، دعائیں اور منتیں ماننی اب فضول ہیں، قہر درویش برجان درویش کا مصداق اب نہیں بنا جاتا۔

اگر یہ پادری ایسے شہروں میں جو اسلامی مرکزِ حکومت سے دور تھے آباد ہوتے، جہاں مسلمانوں سے لڑنے میں کامیابی کی امید ہو سکتی تھی، تو وہ ضرور سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیتے، اگر پہاڑوں میں آباد ہوتے تو رہزن اور قزاق ہو جاتے، بہرکیف چاہے طلیطلہ میں سپاہی بنتے، چاہے مالقہ کے پہاڑوں میں رہزنی کا پیشہ اختیار کرتے، مگر جو کچھ بھی ہوتا مسلمانوں سے لڑنا اب انکے نزدیک ضروری تھا، لیکن قرطبہ دارالامارت تھا، وہاں ہتھیار اُٹھانے کی انھیں مجال نہ تھی، اس سبب بجائے سپاہی اور قزاق بننے کے قرطبہ میں انھوں نے مسیحی شہید بننے کا ارادہ مصمم کر لیا

عوام کی توہین اور تذلیل سے بچنے کے لیے یہ پادری گھر سے اسی وقت نکلتے تھے جب کوئی شدید ضرورت پیدا ہوتی تھی، ہر مہینے جب جزیہ وصول کرنیوالے آتے تو یہ بیماری کا بہانہ کر کے

گھر میں بستر پر پڑے رہتے، اس طرح مدت تک حالتِ تنہائی میں رہ کر، اور عبادت و ریاضت میں دن کاٹ کر عداوت اور رنج کی باتوں کو خوش ہو کر ایک بیش بہا خزانہ کی طرح دل کے سفینے میں جمع کرتے جاتے، جس قدر تکلیفیں بڑھتیں اور نئی شکایتیں پیدا ہوتیں ایک ایک کو لوحِ دل پر نقش کرتے جاتے، جب آفتاب غروب ہوتا تو اُٹھتے اور رات کی پُر اسرار ظلمت میں کسی ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی ہلکی روشنی میں انجیل کے خاص خاص مقامات نکال کر بالخصوص متی کی کتاب کا دسواں باب یا آبائے مسیحی کے کاموں اور شہیدوں کی سوانح کا ضرور مطالعہ کرتے متی کی کتاب میں مسیح کے اس ارشاد کو پڑھتے "تم جاؤ اور سب قوموں کو تعلیم۱؎ دو، جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اسکو تم اُجالے میں کہو، جو کچھ تم سے کان میں کہتا ہوں تم اُس کی بالاخانوں پر سے منادی کرو، میں تم کو بھیجتا ہوں اس طرح جیسے بھیڑوں کو کوئی بھیڑیوں میں بھیجے، تم میرے سبب حاکموں اور بادشاہوں کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے تاکہ میری نسبت اُن کے سامنے گواہ بنو، جو بدن کو قتل کر سکتے ہیں اور روح کو قتل نہیں کر سکتے اُن سے نہ ڈرو، بلکہ اُس سے ڈرو جو بدن اور روح دونوں کو جہنم میں ہلاک کر سکتا ہے" آبائے مسیحی کی سوانح میں بالخصوص اس کلام کو بغور پڑھتے کہ "مسیح کے چیدہ لوگوں میں وہی شمار کیے جائیں گے جو عمداً شہادت حاصل کرنے کے لیے اپنے تئیں پیش کریں گے، درآنحالیکہ اس وقت چھپ بیٹھنا اُن کے لیے قابلِ الزام نہ ہو گا" جو چیز ان پادریوں ۲)
کے معلول تصور کو سب سے زیادہ مشتعل کرتی تھی وہ اُن مقدس لوگوں کی مثالیں تھیں جنھوں نے رومانی بت پرستوں کے ہاتھوں (اب سے صدہا برس پہلے) اذیتیں اٹھائی تھیں، یہ وہ مقدس نفوس تھے جو شہادت (قتل) سے بچنے کی جگہ بصد شوق اس کے منتظر رہتے تھے کہ شہادت کی

۱؎ یہ ڈوزی کی صریح تحریف ہے جو بُری دیدہ دلیری سے کی گئی ہے، اس مقام پر انجیل میں ہرگز نہیں لکھا کہ جاؤ اور سب قوموں کو تعلیم دو، بلکہ اس کے برخلاف وہاں صاف طور پر یہ الفاظ درج ہیں "غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا، بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا" (دیکھو متی باب ۱۰ آیت ۵-۶) اس کی تصدیق حضرت مسیح کے اُس قول سے بھی ہوتی ہے جہاں آپ نے فرمایا ہے کہ "میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا" (متی باب ۱۵ آیت ۲۴) ان دونوں بیانوں سے کیا ثابت ہوا ہے کہ حضرت مسیح ساری دنیا کیلئے آئے تھے اور انھوں نے اپنے پیروؤں کو دنیا کی ساری قوموں کی طرف تبلیغ کے لیے بھیجا (اسمٰعیل)

شاندار موت اُن کو جلد نصیب ہو، پادریوں کی روحیں مضطرب تھیں کہ اُنہی پرانے مقدس لوگوں کی نقل جنھوں نے دین پر گواہی دینے میں اپنی جانیں تلف کی تھیں کسی طرح وہ بھی اُتاریں، پادری کبھی اُن قدیم مسیحی شہیدوں کے نام کی تعظیم و تکریم میں غافل نہیں رہے، ان پادریوں کو اپنی اس کم نصیبی پر افسوس تھا کہ مسلمان اُن پر ظلم نہیں کرتے۔ اپنی نمازوں میں ہمیشہ خدا سے ایسے موقعے نصیب ہونے کی دعائیں مانگتے رہتے تھے، جن میں وہ دین کے لیے کوئی بڑا کام ایسا ہی کریں جیسے کہ عیسائیت کے ابتدائی زمانہ میں خدا کے سچے اور وفادار بندوں کو کرنے پڑے تھے۔

یہ مجنون اور متعصب فرقہ دو عجیب و غریب شخصوں کے اثر میں تھا، ایک اُن میں پادری تھا جس کا نام یولوجیس تھا، اور دوسرا ایک متعصب عیسائی تھا جس کا نام الوارو تھا، یولوجیس ایک بہت پرانے قرطبی خاندان کا آدمی تھا، یہ خاندان جس قدر عیسائی مذہب سے شغف رکھتا تھا اسی قدر اسلام سے عداوت رکھنے میں مشہور تھا، یولوجیس کا دادا، جس کا نام بھی یولوجیس ہی تھا جس وقت مسجد کے مینار سے موذن کی آواز سنتا تھا تو اپنے جسم پر پریشان صلیب بناتا تھا اور داؤد نبی کا یہ زبور گانے لگتا تھا "اے خدا! چپ نہ ہو، اے خدا! چین نہ لے، کیونکہ دیکھ تیرے دشمن ادودھم مچاتے ہیں، اور ان لوگوں نے جو تجھ سے کینہ رکھتے ہیں سر اُٹھایا ہے" اگرچہ یولوجیس کا خاندان مسلمانوں کا بڑا دشمن تھا، مگر اس کے تین بھائیوں میں سے سب سے چھوٹا بھائی جوزف اسلامی حکومت کا ملازم تھا۔ دو بھائی تجارت کرتے تھے، ایک بہن تھی جس کا نام انولو تھا، یہ کسی دیر راہبات میں راہبہ ہو گئی تھی، یولوجیس کی تعلیم شروع ہی سے اس غرض سے ہوئی تھی کہ پادری بنے، خانقاہ سنت[1] زولس کے پادریوں کی شاگردی میں اس نے رات دن اس قدر محنت کی کہ اپنے ہم مکتبوں ہی سے نہیں بلکہ اُستادوں سے بھی بڑھ گیا، اب یہ شوق ہوا کہ اس خانقاہ کے پادری جہاں تک پڑھا سکتے تھے اُس سے بھی آگے تعلیم حاصل کرے، لیکن

---

[1] زولس (Zoulus) قرطبہ میں قیصر دیکلیتین Diocletain کے زمانہ میں شہید ہوا تھا، وہ گرجا جو اس مسیحی شہید کے نام سے موسوم تھا اسے اسقف اگاپیوس (Agapus) نے تعمیر کرایا تھا، اور اسی گرجا میں زولس کی لاش دفن تھی، اس شہید کے نام سے ایک دعا تھی جو مستعربین کی قدیم زبان میں نماز کی کتاب میں درج تھی، یولوجیس کی لاش بھی اسی گرجا میں دفن کی گئی تھی۔

اس خوف سے کہ یہ اُستاد ناراض نہ ہو جائیں، اپنا یہ خیال اُن پر ظاہر نہیں کیا، اور پوشیدہ طور پر قرطبہ کے مشہور و معروف علمائے مسیحی بالخصوص رئیس راہبان اِسپرا کے درس میں شریک ہونے لگا۔ اس رئیس راہبان نے اسلام کے رد میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، اور دو مسیحی شہیدوں کی سوانح بھی لکھ چکا تھا جو امیر عبدالرحمٰن ثانی کے دورِ حکومت میں قتل ہو کر شہیدوں کے زمرے میں داخل ہوئے تھے۔

۸۲۰ اسپرا نے نوجوان یولوجیوس پر اپنا بہت اثر پہنچایا، اور اسی رئیس راہبان نے اس کے دل میں اسلام کی طرف سے وہ عداوت پیدا کی جو بعد کو یولوجیوس کی طبیعت کا خاصہ ہو گئی۔

اسپرا کی درسگاہ میں یولوجیوس کی ملاقات الوارو سے ہوئی، الوارو ایک نوجوان عیسائی شریف خاندان کا آدمی اور بہت دولتمند تھا، یہ قرطبہ کا رہنے والا تھا، گو پادری بننا اس کی قسمت میں نہ تھا، لیکن وہ اسپرا کے درس میں ہمیشہ شریک رہتا تھا، اور جو خیالات اُستاد کے تھے وہی اُس کے ہو گئے تھے، یولوجیوس اور الوارو دونوں آپس میں محبت اور ہمدردی رکھنے کے لیے قدرتی طور پر موزوں تھے، اس لیے بہت جلد اُن میں گہری دوستی ہو گئی، الوارو نے بوڑھے ہو کر جب اپنے دوست یولوجیوس کی سوانح عمری لکھی تو اُس زمانہ کا حال بہت خوش ہو کر لکھا جبکہ یہ دونوں ایک ہی درسگاہ میں پڑھتے تھے، اور دونوں نے ہمیشہ دوست رہنے کی قسم کھائی تھی، اور دونوں ایک ایسے استادِ کامل کا درس سننے کے مشتاق رہتے تھے جس پر صوبۂ بٹیکا کو ناز کرنا بجا تھا، الوارو نے اپنی اس کتاب میں اُس وقت کو بھی یاد کیا ہے جبکہ خطوط اور اشعار کے پشتارے کے پشتارے ایک نے دوسرے کو لکھے تھے، مگر پھر اُن کو اس خیال سے تلف کر دیا تھا کہ کہیں آیندہ زمانے کے لوگ اس جوشِ جوانی کے ناکارہ ثمرات کو اُن کی لذت کا اندازہ کرنے کی نیت سے نہ پڑھنے لگیں۔

یولوجیوس شروع میں سنت زولس کے گرجا میں شماس کے عہدے پر مقرر ہوا، پھر وہاں کا پادری ہو گیا، اب جسقدر عیسائیوں سے اُس کو واسطہ پڑا، وہ اُس کی نیکیوں کی تعریف کرنے لگے، راہبات کی خانقاہوں کو جا کر معائنہ کرنے میں اُس کو خاص لطف حاصل ہوتا تھا، اِن راہبات پر بہت جلد اُس نے اپنا اثر پیدا کیا، کثرتِ عبادت سے بزرگی حاصل کر کے جسم کو

شب بیداری اور روزوں سے حقیر کر لیا۔ خدا سے دُعا مانگا کرتا کہ خاص توجہ فرما کر زندگانی کے اس بار سخت سے اُس کو سبکدوشی عطا فرمائے اور خاصان خدا میں جگہ دے

باوجود اس سخت اور افسردہ زندگی کے عشق مجازی کی ایک نازک شعاع نے اُس کے دل کو روشن کر دیا، مگر یولوجیس کا یہ عشق نہایت سادگی کا ایک پاک اور بیلاغ جذبہ تھا یولوجیس نے قصداً کبھی اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن ایک موقع پر بالکل اتفاق سے اس عشق کا اظہار بہت خوش ہو کر کر گیا۔

یہی زمانہ تھا جبکہ قرطبہ میں ایک نوجوان اور حسین دوشیزہ فلورا نامی رہتی تھی، یولوجیس اور فلورا میں رفتہ رفتہ ایک عجیب قسم کی روحانی قرابت پیدا ہو گئی، اس لڑکی کا باپ مسلمان اور ماں عیسائی تھی، اور یہ لڑکی مسلمان سمجھی جاتی تھی، باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا ماں نے اسے خفیہ طور پر عیسائی مذہب میں اٹھایا، اب لڑکی کے دل میں ایسی چیزوں کا شوق پیدا ہوا جن میں عیسوی مذہب مقدس اور متبرک سمجھتا تھا، لیکن اُس کا بھائی جو پکا مسلمان تھا اُس کے حال سے باخبر رہتا تھا، چنانچہ عشاء مسیحی کی رسم میں شرکت کیلئے وہ اس بھائی کی وجہ سے گرجا میں بہت کم حاضر ہو سکتی تھی، فلورا کے دل پر ایک بوجھ سا رہتا تھا جو اُسے ناگوار تھا، اس کو خیال ہوا کہ اب تک میں نے لوگوں کو یہ سمجھنے دیا ہے کہ میں مسلمان ہوں، کہیں (۲۷ھ)
اس میں میں کسی گناہ کی تو مرتکب نہیں ہو رہی، کیونکہ کتاب مقدس میں جو اُس کو بہت پیاری ہے لکھا ہے کہ "جو کوئی لوگوں کے سامنے میرا اقرار کرے گا میں اپنے باپ کے پاس جو آسمان پر ہے اس کا اقرار کرونگا، اور جو کوئی لوگوں کے سامنے میرا انکار کرے گا میں اپنے باپ کے سامنے جو آسمان پر ہے اُس سے انکار کروں گا۔

یہ لڑکی بڑی دلیر، حوصلہ مند اور نڈر تھی۔ اور برداشت اذیت کی قابلیت غیر معمولی طور پر اُس میں موجود تھی، قوت، جسارت، اور غایت درجہ دشوار کام کرنے کا مادہ اُس کی طبیعت میں تھا، پس اُس نے جلد اپنا ارادہ مصمم کر لیا اور بغیر اپنے بھائی کے علم کے گھر سے نکل کھڑی ہوئی اُس کی بہن بالدی گوتھا۔ اُس کے ساتھ ہوئی، جس کو بہن فلورا سے پوری ہمدردی تھی، یہ دونوں لڑکیاں مسلمانوں سے پوشیدہ عیسائیوں میں رہنے لگیں بھائی نے دونوں بہنوں کو

عیسائیوں کی خانقاہوں میں تلاش کرنا شروع کیا، مگر کہیں پتہ نہ چلا، لیکن جب اُس نے چند پادریوں کو شبہ میں ماخوذ کرا کے سزائیں دلوانی چاہیں، تو فلورا کو یہ گوارا نہ ہوا کہ اسکی وجہ سے عیسائی بھائیوں کو قید خانے جانا پڑے، اس لیے وہ خود ہی اپنے گھر واپس چلی آئی اور بھائی کے سامنے آکر کہا "تو نے ایسے لوگوں پر جو خدا والے ہیں میری وجہ سے تشدد کرنا چاہا، اس لیے میں یہاں چلی آئی، اس وقت میں موجود ہوں اور تیرے منہ پر اور وہ بھی بہت فخر سے کہتی ہوں کہ میں عیسائی ہوں، تیرا جتنا بس اور بس چلے مسیح سے مجھے چھین لے لیکن میں تیرے سب زور و ظلم سہونگی مگر مسیح سے بیگانہ نہ ہوں گی"۔ بھائی نے کہا "بدنصیب بہن! کیا تو نہیں جانتی کہ شرع میں مرتد کی سزا قتل ہے[1]؟" فلورا نے کہا "مجھے خوب معلوم ہے میں مقتل میں بھی جا کر مضبوطی سے کہوں گی کہ 'یسوع میرے خداوند میرے خدا! تیری محبت میں سرشار ہو کر موت میرے لیے ایک مسرت ہے'" بھائی نے اس گفتگو پر برہم ہو کر بہن کو بہت بید ردی سے مارا، مگر فلورا کے قوا بدنی اُن مستثنیٰ اور کامل ترین تعاہمامے عضوی میں سے تھے جن پر جسمانی تکلیف کا کچھ اثر نہیں ہوتا، بھائی نے یہ دیکھ کر کہ بہن کو مارنا پیٹنا بیکار ثابت ہوا، اب پیار اور محبت سے اُسے سمجھانا چاہا، جب اس کا بھی کچھ اثر نہ ہوا، تو آخر کار وہ فلورا کو گھسیٹتا ہوا قاضی کے پاس لے گیا اور کہا کہ "یہ میری بہن ہے، ہمیشہ اسلام کی عزت کرتی تھی اور میرے ساتھ نماز روزہ کرتی تھی، مگر عیسائیوں نے اسے گمراہ کر دیا، ہمارے رسول مقبول کی طرف سے اُس کے دل میں نفرت پیدا کی، اور اس بات کا یقین کرا دیا کہ عیسیٰ خدا ہے" قاضی نے فلورا سے پوچھا "تمہارا بھائی جو کچھ کہتا ہے کیا یہ سچ ہے؟" فلورا نے جواب دیا، "قاضی! کیا تو اس بیدین کو میرا بھائی کہتا ہے! یہ میرا بھائی نہیں ہے، میں اسکو اب بھائی نہیں سمجھتی، جو کچھ وہ کہتا ہے سب جھوٹ ہے میں کبھی مسلمان نہ تھی، میں نے بچپن سے ہمیشہ مسیح پر ایمان رکھا اور مسیح ہی میرا خدا ہے اور وہی میرا نوشہ ہوگا"۔ (۲۷

---

[1] شرع میں ارتداد کی سزا قتل ہرگز نہیں، جیسا کہ ہم پہلے ایک نوٹ میں بدلائل ثابت کر چکے ہیں، ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ ۳۶۲ یہ علیحدہ بات ہے کہ کسی خاص بادشاہ یا کسی اسلامی سلطنت نے بطور خود قانون بنا لیا ہو، اس صورت میں یہ اُس کا ذاتی فعل ہو گا، اسلام اس کا ذمہ دار کسی طرح نہیں ہو سکتا (اسمٰعیل)

قاضی فلورا کی نسبت فوراً قتل کا حکم جاری کر دیتا، لیکن غالباً اس کی کم سنی اور خوبصورتی کا خیال کر کے، اور بلا شبہ اس یقین کیساتھ کہ جسمانی سزا اس کو سلام کیطرف پھر مائل کر دیگی اس نے دو خادموں کو حکم دیا کہ لڑکی کے دونوں ہاتھ پھیلا کر پکڑے رہیں اور اُس کی گردن پر کوڑے لگائے جائیں، اس سزا کے بعد زندہ تو کیا تقریباً مردہ حالت میں لڑکی کو اسکے بھائی کے حوالے کر دیا، اور کہا کہ "اس کو دین برحق کی تعلیم دو، اگر پھر بھی وہ اس حالت کو نہ بدلے تو میرے پاس واپس لاؤ"

گھر آکر بھائی نے بہن کو گھر کی عورتوں کے سپرد کر دیا، اور اس خیال سے کہ وہ بھاگ نہ جائے، حکم دیا کہ گھر کے دروازے ہر وقت بند رکھے جائیں، چونکہ مکان کے گرد بہت اونچی دیوار تھی، اس لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت نہ سمجھی، لیکن فلورا جیسی دلیر اور من چلی عورت کو یہ چیزیں کب روک سکتی تھیں، چند روز کے بعد جبکہ زخم ابھی پورے طور پر بھرے بھی نہ تھے، فلورا کو پھر بھاگنے کی قوت محسوس ہوئی چار دیواری کے اندر ہی ایک کمرے کی چھت پر چڑھ گئی اور وہاں سے دیوار پر چڑھ کر دوسری طرف گلی میں جا کودی، چوٹ مطلق نہیں آئی اندھیرے میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی اتفاق سے ایک عیسائی کا گھر مل گیا جو اُس کا شناسا تھا، یہاں وہ مدت تک چھپی رہی، اور یہیں پادری یولوجیوس نے اُس کو پہلی مرتبہ دیکھا، فلورا کی خوبصورتی، انداز تقریر، اور حرکات، اور اُس کی زندگی کی عجیب سرگذشت، تکلیفوں پر صبر، ایمان کی پختگی معرفت اسرار مسیحی میں اُس کی سرافرازی، ان سب باتوں نے نوجوان پادری کے خیال و تصوّر میں ایک شعلہ روشن کر دیا، درآنحالیکہ پادری طبیعت پر قابو رکھنے اور نفس کی ترغیبوں سے ہمیشہ ہوشیار رہنے کا خوگر ہو چکا تھا، فلورا کے لیے اُس کے دل میں ایک اعلیٰ قسم کی محبت پیدا ہوئی، ایک عشق پیدا ہوا جو روحانی تھا، اور ایسا کچھ تھا جو فرشتوں کے مسکن میں بے جسم روحوں کو مقدس خواہشات سے متاثر کرتا ہو۔

یولوجیوس نے اس پہلی ملاقات کے چھ برس کے بعد اس ملاقات کی سب باتوں کو یاد کیا ہے، یہ مدت اتنی تھی کہ جو صورت دیکھی تھی اُس کا نقش ہلکا پڑ جاتا، مگر نہیں، زمانے کے گذرنے نے اس تصور کو اور بھی اُجاگر کر دیا، یہ کیفیت یولوجیوس کے ایک خط سے جو اُس نے

فلورا کو لکھا تھا، اور اُن پرجوش الفاظ سے جو اس خط میں تھے بخوبی ثابت ہو جاتی ہے خط کا
مضمون تھا "مقدس بہن! ایک زمانہ تھا کہ تم نے اپنی مجروح گردن جس پر تازیانے کے نشان
تھے مجھے دکھانے کی عزت بخشی تھی، افسوس اُس وقت وہ خوبصورت لمبے لمبے بال جنہیں گردن
چھپتی رہتی تھی موجود نہ تھے، مجھے تم نے یہ عزت اس لیے بخشی تھی کہ اس وقت تم مجھ کو اپنا روحانی باپ
سمجھتی تھیں، اور مجھ کو اپنی ہی مثل پاک اور عفیف جانتی تھیں، نرمی سے میں نے اپنا ہاتھ (۲۷۷)
چھپی رہتی تھی، اور مجھ کو اپنی ہی مثل پاک اور عفیف جانتی تھیں، نرمی سے میں نے اپنا ہاتھ
تمہارے زخموں پر رکھا، اے کاش مجھ کو یہ مسرت نصیب ہوئی ہوتی کہ ایک بوسے سے اُن
زخموں کو اچھا کر دیتا، مگر میری ہمت نہ ہوئی . . . . جس وقت تم سے رخصت ہوا تو زمین پر میرے
قدم اس طرح پڑتے تھے جیسے کوئی خواب میں چلتا ہو، اور میری آنکھوں کا یہ حال تھا کہ بند ہونا
نہ جانتی تھیں۔"

فلورا اس خوف سے کہ قرطبہ میں لوگوں کو اس کا پتہ چل جائیگا اپنی بہن بلدی گوتھا کے
ساتھ کسی اور شہر میں جا چھپی۔

یولوجیوس اور فلورا کی دوبارہ ملاقات کا حال ہم آیندہ بیان کریں گے۔

اسناد

یولوجیوس کی کتاب Mem Sanct; Arol Mart; Ep ad will

Indic lumin; vita Enleg

الوار Arol., ii c. 2 to 6.

سیمس

ابن خلکان، ج ۱۰، ایڈیشن وسٹن فلڈ ص ۲۰

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

ساتویں فصل

قرطبہ کے مسیحی شہید

جس زمانہ میں قرطبہ کے عیسائی "متعصبین" (جنہیں عربی مورخوں نے "مجانین" لکھا ہے۔ مترجم) حالت تنہائی اور بیکاری میں فاسد خیالات اور معلول منصوبوں میں محو رہتے تھے، ایک واقعہ ایسا پیش آیا جس سے بالکل ممکن تھا کہ عیسائیوں کی عداوت اور نفرت مسلمانوں کیساتھ دوچند ہو جاتی۔

سنت ایکس کلوس کے گرجا کا ایک پادری جس کا نام پرفکتوس تھا، ایک دن بازار میں کچھ خریدنے نکلا، وہاں چند مسلمانوں سے کچھ گفتگو ہونے لگی، یہ پادری عربی بہت روانی سے بول سکتا تھا، معمولی بات چیت کے بعد مذہب کا ذکر چھیڑا، مسلمانوں نے پادری سے کہا "تم ہمارے رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہو؟" پادری نے کہا "مسیح میرا خدا ہے، تم اپنے پیغمبر کی نسبت نہ پوچھو کہ ہم عیسائی اُس کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں، کیونکہ اگر میں نے اپنا خیال ظاہر کیا تو تم بُرا مان جاؤ گے اور مجھ کو قاضی کے سپرد کردو گے جو میرے قتل کا حکم سنا دے گا، لیکن اگر اس بات کا یقین دلا دو کہ

میرے لیے کوئی ڈر کی بات نہ ہوگی تو میں تم کو اپنا رازدار بناکر بتا سکتا ہوں کہ ہماری انجیل میں تمہارے پیغمبر کی نسبت کیا لکھا ہے! پھر تم کو معلوم ہو جائیگا کہ ہم عیسائی اس کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں۔"

مسلمانوں نے کہا کہ "تم ہمارا یقین کرو اور کسی بات سے نہ ڈرو، لیکن یہ بتا دو کہ تمہارے مذہب والے ہمارے رسول پاک کی نسبت کیا خیال رکھتے ہیں؟ اور ہم قسم کھاتے ہیں کہ تمہاری بات کسی سے نہ کہیں گے۔"

اس پر پرفکتوس بولا "تو پھر سنو! ہماری انجیل میں لکھا ہے "جھوٹے مسیح اور جھوٹے نبی اُٹھ کھڑے ہوں گے اور وہ نشان اور عجیب کام کھائیں گے تاکہ اگر ممکن ہو تو برگزیدوں کو بھی گمراہ کریں" (مرقس باب ۱۳- آیت ۱۲) اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد پادری نے کہا کہ اُن جھوٹے نبیوں میں (نعوذ باللہ) تمہارا نبی سب سے بڑھکر ہے۔"

اتنا کہہ کر پادری کچھ ایسا جوش میں آیا کہ جتنا ارادہ رکھتا تھا اُس سے بڑھ کر مسلمانوں کے پیغمبر کو کثرت سے دشنام دینے لگا، اور کہا کہ (معاذ اللہ) وہ بندۂ شیطان تھا۔ مسلمان اس وقت تو سن کر چپ ہو گئے اور پادری کو (حسب وعدہ) صحیح سلامت جانے دیا، لیکن دل میں رنج اور غصہ بھرا رہا، کچھ دنوں کے بعد جب انہی مسلمانوں نے پادری مذکور کو سڑک پر جاتے دیکھا تو یہ سمجھ کر کہ اب وہ اپنی قسم کے پابند نہیں رہے، قریب کے لوگوں سے کہنا شروع کیا "دیکھو! یہ وہی بے ادب اور گستاخ پادری ہے جس نے ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسے ایسے سخت الفاظ کہے تھے کہ ہم میں سے متحمل سے متحمل آدمی بھی انہیں سن کر دیوانہ ہو جاتا" اتنا زبان سے نکلنا تھا کہ (بقول یولوجیوس) یہ معلوم ہوا کہ کسی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا، پرفکتوس کو لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور (۲۷
اُسے پکڑ کر اس طرح اٹھائے ہوئے قاضی کے پاس لے گئے کہ اُس کے پاؤں تک زمین پر نہ ٹکنے پائے، اور قاضی کے سامنے آکر فریاد کی کہ "اس پادری نے ہمارے رسول مقبول کی شان میں نہایت بے ادبی کے الفاظ کہے ہیں، آپ ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ ایسے آدمی کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔"

گواہوں کی شہادت لینے کے بعد قاضی نے پرفکتوس سے کہا کہ "تمہارا کیا جواب ہے؟" پادری جس کا شمار ہرگز اُن عیسائیوں میں نہ تھا جو شہادت کا درجہ پانے کے مشتاق رہتے تھے ڈر کے مارے سر سے پاؤں تک کانپنے لگا اور اپنا بچاؤ اسی میں نظر آیا کہ جو الفاظ اُس کی زبان سے نکلنے بیان میں کیے گئے تھے اُن سے قطعی انکار کر دے، غرض وہ انکاری ہو گیا مگر اس انکار سے کچھ نفع نہ ہوا، اس کا لاعن ہونا بالکل ثابت تھا، اور قاضی نے شرع کے مطابق اس کے قتل کا حکم سنا دیا، اور بہت کڑی بیڑیاں ڈال کر پرفکتوس قید خانے بھیجدیا گیا تاکہ حاجب نصر اس کے قتل کا جو دن مقرر کرے اُس دن وہ قتل کر دیا جائے۔

اب اس بدقسمت پادری کو جو مسلمانوں کے دھوکے اور اُنکی قسم[1] پر بھروسہ کرنے کا شکار ہو گیا تھا زیست کی کوئی امید نہ رہی، جب اُسے یقین ہو گیا کہ موت سے بچنا ممکن نہیں، تو اُس میں وہ ہمت پیدا ہوئی جو قاضی کے سامنے نہ ہوئی تھی، مسلمانوں کے قسم توڑنے پر جس سے اب اس کی جان جانے کو تھی غصہ کھا کر اور یہ سمجھ کر کہ نہ اب جان بچیگی اور نہ جرم میں کوئی تخفیف

[1] اوپر بیان ہوا ہے کہ پرفکتوس نے اپنے ارادے سے بھی بڑھ کر مسلمانوں کے پیغمبر کو کثرت سے گالیاں دیں مسلمانوں نے جس وقت قسم کھائی تھی تو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ وہ اپنے پیغمبر کی شان میں ایسی سخت کلامی سنیں گے، اگر اُن کو ذرا بھی اس کا گمان ہوتا تو ہرگز وہ اِس بات کی قسم نہ کھاتے کہ ایسی سخت کلامی اور دشنام دہی کے بعد بھی وہ پادری سے بازپرس نہ کریں گے، ایسی قسم خود اُن کے حق میں ایک جرم ہو جاتی، انجیل کی عبادت نقل کرنے تک پادری کی بات اُنھوں نے سن لی، مگر اسکے بعد جو گالیاں پادری نے دیں وہ اُس کی زیادتی، خباثت اور کمینہ پن پر دلالت کرتی ہیں یہ بالکل قدرتی امر تھا کہ اُس پادری کو آیندہ دیکھتے ہی ان مسلمانوں کو غصہ آتا، انصاف اس کا مقتضی نہیں ہے کہ پادری کی گالیوں کو مسلمانوں کی قسم کے تحت میں لا کر پادری کی حفاظت کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھا جائے اور پادری بھی وہ جو قاضی کے سامنے جھوٹ بولا تھا، مسلمانوں کا سوال معقول تھا، اُن کے نزدیک حضرت مسیح اور پیغمبر خدا دونوں مقدس ہستیاں تھیں، مگر پادری نے جواب میں تعصب، جہل، اور کمینہ پن دکھایا، اُس کی شروع ہی سے یہ نیت معلوم ہوتی تھی کہ مسلمانوں کو دھوکا دیکر ان سے قسم لے اور پھر پیغمبر خدا صلعم کو برملا گالیاں دے، پس دھوکا پادری نے دیا نہ کہ مسلمانوں نے (مترجم)

سمجھی جائے گی، پادری نے اب صاف صاف اقرار کیا کہ مسلمانوں کے پیغمبر کو اُس نے گالیاں دی
تھیں، اور اس پر اُس کو فخر ہے اتنا کہنے کے بعد پھر اُس نے ویسی ہی گالیاں بکنی شروع کیں
اور مسیحی شہید بننے کے لیے تیار ہو گیا، قید خانے میں عبادت میں مصروف رہتا، روزے رکھتا
اور کبھی پلک سے پلک نہ جھپکتی، اسی حال میں مہینوں پر مہینے گزرنے لگے، حاجب نصر کے
اجلاس سے کوئی حکم نہ آیا، معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ اس پادری کے مقدمہ کو بالکل ہی بھول گیا
ہے یا دانستہ اُس کی تکلیف اور اذیت کو بڑھانے کے لیے قتل کا دن مقرر نہیں کرتا، مگر واقعہ
یہ تھا کہ ظلم میں ایک شان پیدا کرنے کے لیے نصر نے قصد کر لیا تھا کہ عید الفطر تک پادری کا
قتل ملتوی رکھا جائے، اس سال عید الفطر موسم بہار میں آئی تھی، تاریخ ۱۸ اپریل ۸۵۰ء یعنی
یکم شوال ۲۳۵ھ) تھی، صبح کو بہت سویرے ہی سے قرطبہ میں جہاں ماہِ رمضان کی وجہ سے
ایک مہینے سے صبح کے وقت سناٹا رہتا تھا، چہل پہل شروع ہو گئی، لوگ مسجدوں کا رُخ
کیے بازاروں اور گلیوں میں اس کثرت سے جا رہے تھے کہ چلنے کو رستہ نہ ملتا تھا، دولتمند
پر تکلف لباس سے آراستہ تھے، غلام بھی آج بڑی سج دھج سے تھے، آقاؤں نے جو عید کے
جوڑے بنوا دیے تھے وہ پہنے ہوئے تھے، بچے اپنے بڑوں کا دامن پکڑے دوڑے جاتے تھے
(۲۸۰) کوئی چوپایہ جس پر سواری ہو سکتی ہو ایسا باقی نہ رہا تھا جس سے کام نہ لیا گیا ہو، اور جتنے آدمی وہ
اپنی پیٹھ پر لاد سکتا تھا اُتنے ہی اس پر سوار نہ ہوئے ہوں، ہر ایک چہرہ مسرت و نشاط کی
تصویر تھا، دوست ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے اور گلے ملتے تھے۔

نماز ختم ہونے پر ملاقاتیں شروع ہوئیں، ہر جگہ لذیذ سے لذیذ کھانے اور عمدہ سے عمدہ
شرابیں[1] مہمانوں کے انتظار میں چنی گئیں، امیروں کے دروازوں پر غریبوں کا ہجوم تھا، جو بھوکے
کوّوں کی طرح اتر کر بچے کھچے کھانے صاف کر جاتے تھے، عورتیں بھی جو سوائے اس دن کے
سال بھر تک اپنے گھروں میں بند پڑی رہتی تھیں، آج آزاد اور خوش تھیں، اُن کے باپ

---

[1] یہاں عیسائی مصنف جس نے عید کا منظر بیان کیا ہے اس بات کو بھول گیا ہے کہ شراب مسلمانوں
کے ہاں حرام ہے شراب کی جگہ اگر شربت لکھتا تو مضائقہ نہ تھا (مترجم)

اور خداوند تو شراب نوشی میں مصروف ہیں، اور وہ خود کھجوروں کے پتے ہاتھ میں لیے قبرستانوں کو جا رہی ہیں، جہاں مردوں پر ماتم کرنے کے بہانے سیر و تفریح کا موقع بھی ملتا ہے۔

تیسرے پہر جبکہ وادی الکبیر کی سطح کشتیوں سے جن میں کم و بیش مخمور لوگ بھرے تھے پٹ گئی اور دریا پار والے میدان ہزاروں قرطبی بظاہر خطبہ سننے مگر درحقیقت سیر و تماشے کے لیے موجود ہو گئے تو پادری پرفکتوس کو اطلاع دی گئی کہ صاحب نصر نے آج کا دن اس کے قتل کے لیے مقرر کیا ہے، پرفکتوس کو معلوم تھا کہ دریا پار والے میدان میں مجرم قتل کیے جاتے ہیں، جہاں آج ہزاروں آدمی جمع ہو کر خوشیاں منا رہے ہوں گے، پادری قید خانے سے مقتل میں جانے کے لیے تیار ہوا، اور اس خیال سے سخت طیش میں آیا کہ آج عام خوشی کے دن اس کو قتل کی سزا اس لیے دی جاتی ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ان کے خوش کرنے کے لیے وہ ایک تماشا بنایا جائے، پس اس نے ایسے غصہ میں جو سچا غصہ تھا پکار کر کہا، "میں پیشین گوئی کرتا ہوں کہ یہ نصر جو مغرور ہے، جس کے سامنے شریفوں اور پرانے خاندانوں کے سر خم ہوتے ہیں، اور جو اس وقت اسپین میں بادشاہی کر رہا ہے، اس کو آج کی عید کے بعد جس میں اس کے جور و ستم نے میرے قتل کا حکم دیا ہے، دوسری عید الفطر دیکھنی نصیب نہ ہوگی۔"

پرفکتوس نے اس قتل کے وقت کسی قسم کی کمزوری کی کوئی علامت ظاہر نہیں کی مقتل میں جب اس کو لے جا رہے تھے تو وہ چلا چلا کر کہتا تھا کہ "ہاں میں نے تمہارے پیغمبر پر لعن کیا تھا اور اب پھر لعن کرتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ ... ... مسلمانو! تمہارا مذہب شیطان کا مذہب ہے، نارِ جہنم تمہاری منتظر ہے۔" بار بار اسی طرح گالیاں دیتا ہوا وہ مضبوطی کے ساتھ مقتل میں آیا، متعصب مسلمانوں کا ہجوم اس کے گرد تھا، یہ سب شوق سے منتظر تھے کہ (۲۸۱ آج اس عیسائی کی گردن کٹتے دیکھیں جس نے ان کے رسول مقبول کو گالیاں دی ہیں۔

عیسائیوں کی نظروں میں پرفکتوس کو درجۂ شہادت حاصل ہوا، قرطبہ کے عیسائیوں نے جن کے آگے آگے قرطبہ کا اسقف تھا پرفکتوس کے تابوت کو بڑے تزک و احتشام سے اس قبر میں اتارا جس میں شہید اکس کلوسؔ[1] کی لاش دفن تھی، اور سب عیسائیوں نے پکار پکار کر کہا کہ

---

[1] قیصر دیوکلیتین کے عہد میں یہ عیسائی مارا گیا تھا، کلیسہ نے اس کو مسیحی شہید کا درجہ دیا۔

"خدا اپنے اس خدمت گذار پرفکتوس کی موت کا انتقام ظالموں سے لے گا"
پادری کے قتل کے بعد شام کے وقت وادی الکبیر میں ایک کشتی الٹ گئی اور آٹھ مسلمان جو اس میں سوار تھے ان میں سے دو ڈوب گئے، اس واقعہ پر پادری یولوجیوس نے خوش ہو کر کہا "خدا نے اپنے سپاہی کی جان کا بدلہ لے لیا، ہم پر ظلم کرنے والوں نے پرفکتوس کو آسمان پر پہنچا دیا اور ان میں سے دو آدمیوں کو دریا کی موجوں نے لپیٹ لیا کہ دوزخ کے جبڑوں میں انہیں پسنے کو ڈال دیں۔"

عیسائیوں کے اطمینان اور جمع خاطر کے لیے ایک اور بات بھی پیش آئی، پرفکتوس شہید کی پیشین گوئی پوری ہوئی، ایک سال پورا گذرنے نہ پایا تھا کہ نصر کی ناگہانی اور سخت موت کا واقعہ پیش آیا، یہ صاحبِ اقتدار خواجہ سرا اپنی ہی دغابازی کا خود شکار ہو گیا، چاہ کن را چاہ در پیش کا مضمون ہوا، واقعہ یہ ہوا کہ سلطانہ طروب اس کوشش میں تھی کہ اس کا بیٹا عبداللہ ولیعہد مقرر کر دیا جائے، اور محمد جو امیر عبدالرحمٰن کے ۴۵ بیٹوں میں سب سے بڑا تھا، باپ کا جانشین نہ ہو، محمد بن عبدالرحمٰن کی ماں کا نام بہیر تھا، گو سلطانہ طروب کو اپنے شوہر عبدالرحمٰن پر بہت قابو تھا مگر اس معاملہ میں وہ شوہر کو راضی نہ کر سکی، پس وہ نصر کی طرف رجوع ہوئی کیونکہ جانتی تھی کہ اس کو محمد بن عبدالرحمٰن سے خاص عداوت ہے، نصر سے طروب نے درخواست کی کہ عبدالرحمٰن اور اس کے بیٹے محمد دونوں کا خاتمہ کر دے، نصر نے اس کا وعدہ کر لیا، اور یہ سوچ کر کہ پہلے باپ کا کام تمام کرنا چاہیئے نصر نے ایک طبیب سے جو حرانی مشہور تھا ملاقات کی یہ طبیب مشرق سے قرطبہ میں آیا تھا، یہاں آتے ہی جلد شہرت حاصل کر لی، اور ایک دوا ضعف معدے کی ایسی تیار کی کہ بہت جلد دولت مند ہو گیا، اس دوا کی ایک شیشی پچاس اشرفی میں فروخت کرتا تھا، نصر نے حرانی سے کہا کہ ایک کام ہے اگر آپ کر دیں تو بہت ہی احسان مانوں طبیب نے کہا آپ کے ارشاد کو بجالانے سے بہتر میرے لیے کیا کام ہو سکتا ہے انہوں نے اسی وقت ایک ہزار اشرفیاں بطور نذر کے طبیب کو پیش کیں اور کہا کہ "ایک زہر جس کو تبسون الملوک[1] کہتے ہیں تیار کر دیجیے"

[1] معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کیا لفظ ہے جس طرح کتاب میں آیا ہے اسی طرح میں نے لکھ دیا ہے (مترجم)

حرانی نصر کی نیت کو تاڑ گیا، اور اب اس کو دو طرح کے خوف پیدا ہوئے، ایک تو یہ کہ بادشاہ کو اس کے ذریعہ سے زہر دینے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ نصر خود خوف کرنے کے قابل آدمی ہے، کیونکہ بادشاہ نے اس کو بہت اختیارات دے رکھے ہیں، طبیب نے بہر کیف زہر تیار کر کے نصر کے پاس بھیجدیا، لیکن اس کے ساتھ ہی محلسرا کی ایک کنیز کی معرفت بادشاہ کو خبردار کر دیا کہ اگر نصر کوئی دوا پینے کے لیے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے تو بادشاہ اس کو نہ پئیں (۲۸۲)

جب نصر حسب دستور بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوا، تو بادشاہ نے ناسازی مزاج کی شکایت کی، نصر نے عرض کیا کہ "جو شکایت حضور کو ہے اس کی ایک مجرب دوا میرے پاس ہے جو مجھ کو ایک حکیم سے حاصل ہوئی ہے، کل علی الصباح حاضر کروں گا، کیونکہ وہ خلور معدہ کی حالت میں پی جاتی ہے"

دوسرے دن نصر دوا لے کر آیا، بادشاہ دوا کی شیشی اس کے ہاتھ سے لیکر بغور دیکھنے لگا اور پھر کہا کہ "نصر یہ دوا تو شاید مضر ثابت ہو، پہلے تم اسے پی کر دیکھو" یہ سن کر نصر کے ہوش اڑ گئے، مگر انکار کی مجال نہ تھی کہ کہیں انکار کرنے میں کل بھید نہ کھل جائے، یہ خیال کر کے کہ شاید حرانی اس کا کچھ بدرقہ کرے نصر نے زہر پی لیا، اور جلد سے جلد ایسا موقع پاتے ہی کہ کسی طرح کا شبہ نہ گذرے بادشاہ سے رخصت ہوا، گھر آتے ہی حرانی کو بلایا اور کل واقعہ کہکر علاج چاہا، حرانی نے بکری کا دودھ تجویز کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، معدے اور امعا میں سخت سوزش پیدا ہوئی، اور نصر اسی تکلیف میں مر گیا۔

پادریوں کو خبر بھی نہ ہوئی کہ قصر امارت میں کیا ہو گذرا، ان کو صرف اتنا علم ہوا کہ نصر کی موت دفعتہً وقوع میں آئی کچھ کچھ سرگوشیاں بھی ہوئیں کہ وہ زہر دے کر مارا گیا ہے، اس کے سوا ان پادریوں کو اور کچھ معلوم نہ ہوا۔

بظاہر اہل دربار نے بادشاہ کو زہر دینے کی اس ناکام سازش کو دبانا چاہا کیونکہ اس میں بڑے بڑے جاہ و منصب شریک تھے، یہ کل واقعہ پردہ خفا میں رہ جاتا، مگر اتفاق سے بنی امیہ کے موالی میں ایک شخص کی تحریر نے اسے افشا کر دیا، اس مصنف کی تحریر سے نہ صرف یہ واقعہ بلکہ دسہاد کے

اور حالات بھی اس وقت طشت از بام ہوئے جبکہ اہل سازش میں سے کوئی شخص زندہ نہ تھا اور اِن حالات کا ذکر آزادی سے کیا جا سکتا تھا، پادریوں کو اس معاملہ کا حال جہانتک کہ اُن کے مقاصد سے اسے تعلق تھا دریافت ہو گیا تھا یعنی یہ کہ پرفکتوس کی پیشین گوئی جسے قید خانہ میں عیسائی اور مسلمان قیدی دونوں سُن چکے تھے حرف بحرف پوری ہوئی اور پرفکتوس کے قتل کے بعد نصر ایک ہی سال کے اندر مر گیا۔

ان واقعات کے تھوڑے دنوں بعد بعض مسلمانوں نے جو سختی کا برتاؤ ایک عیسائی سوداگر کے ساتھ کیا اُس نے گروہ "متعصبین" میں اور بھی ہیجان پیدا کر دیا۔

اس عیسائی سوداگر کا نام یوحنا تھا، یہ بالکل ایک بے ضرر سا آدمی تھا، اور کبھی اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ خیال نہ گذرا تھا کہ کسی وقت میں مسیح کے لیے جان دینی اُس کی قسمت میں آئی ہے، اپنے کام میں ہر وقت کی سرگرمی نے اس کی حالت کو بہتر کر دی، یہ سمجھ کر کہ کسی عیسائی کا نام مسلمان خریداروں کی نظروں میں بڑی وقعت نہیں رکھ سکتا مال بیچتے وقت وہ صدا لگایا کرتا تھا قسم ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی میرے مال سے بہتر کہیں مال نہ ملے گا چاہے کتنا ہی ڈھونڈ لوگے (۲۸۴
اس قسم کی صدا لگانی اسکی عادت میں شامل ہو گئی تھی، جب اُسکے ہم پیشہ مسلمان سوداگروں نے جن کی بکری کم ہوتی تھی دیکھا کہ یوحنا روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے تو وہ اس تاک میں ہوئے کہ اس کو کسی طرح نقصان پہنچانا چاہیے چنانچہ ایک دن اُس کی معمولی صدا سن کر ان سوداگروں نے اس سے کہا "یوحنا، تو ہمارے پیغمبر خدا کا نام ہر وقت اس لیے لیتا رہتا ہے کہ جو لوگ تجھ سے ناواقف ہیں وہ تجھے مسلمان سمجھیں، ہم کو ہرگز اس بات کی برداشت نہیں کہ جھوٹی باتوں پر تم ہمارے رسولِ مقبول کا نام لے کر اُن کی قسمیں کھاؤ"

یوحنا نے معذرت کی کہ اِس نام کے لینے میں اُس کی نیت یہ نہ تھی کہ مسلمانوں کے دل کو کسی طرح کی تکلیف پہنچائے، غرض جب یہ جھگڑا زیادہ بڑھا تو یوحنا جھلا کر بولا "اچھا، اب میں تمہارے پیغمبر کا نام کبھی نہ لونگا اور لعنت ہے اُس پر جو نام لے" یہ الفاظ مشکل سے اسکی زبان سے نکلے تھے کہ لوگوں نے اُسے پکڑ لیا اور یہ پکارتے ہوئے کہ یہ لاعن ہے مجدف ہے اُسے قاضی کے پاس لے گئے جب قاضی نے یوحنا سے پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ کسی کی

توہین کرنی میری نیت میں نہ تھی اور جو الزام مجھ پر لگایا جاتا ہے اسکی وجہ محض تجارتی رقابت ہے"

قاضی کا فرض تھا کہ یا تو ملزم کو بے قصور سمجھ کر رہا کر دیتا، یا اگر اسکو قصور وار سمجھتا تھا تو سزائے موت کا حکم صادر کرتا، مگر اُس نے اِن دونوں باتوں کے بین بین یہ طریقہ پسند کیا کہ یوحنا کو چار سکو دُرّے لگائے جانے کا حکم دیا، اس سزا کے بعد یوحنا کو گدھے پر دُم کی طرف منہ کر کے سوار کرایا گیا اسامں صدا کے ساتھ اُس کی تشہیر کی گئی کہ "دیکھو یہ سزا ہے اُس کی جو ہمارے پیغمبر کی جناب میں بے ادبی کرتا ہے" اس کے بعد یوحنا کو بیڑیاں پہنا کر قید خانہ میں ڈال دیا گیا جس وقت پادری یولوجیس اِس قید خانہ میں آیا تو یوحنا کے جسم پر تازیانے کے زخم ہرے تھے، اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد "متعصبین" کا گروہ جو اپنی بیکاری اور تساہل پر افسوس کر رہا تھا، میدان میں اُتر آیا، اور اب اُس کا نصب العین یہ ہوا کہ کافروں کے ہاتھ سے کسی طرح موت نصیب ہونی چاہیے، اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے پیغمبر کو دشنام دیں، چنانچہ یہی حرکت اب اِن "متعصبین" نے شروع کی، اس مثال کا قائم کرنے والا سب سے پہلا آدمی ایک راہب تھا جس کا نام اسحاق تھا، یہ قرطبہ کا رہنے والا شریف اور متمول عیسائی ماں باپ کا لڑکا تھا، اور اُس کی تعلیم و تربیت بھی اچھی ہوئی تھی، عربی زبان خوب جانتا تھا، ابھی نو عمر ہی تھا کہ امیر عبدالرحمٰن کے دربار میں اسکو کاتب کی جگہ مل گئی لیکن جب ۲۴ برس کا سن ہوا تو کچھ دل پکڑ گیا، فوراً دربار کی ملازمت اور اس کی عمدہ توقعات سے کنارہ کر کے طبانوس کی مسیحی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گیا، یہ خانقاہ اس کے چچا جرمیاس نے اپنے صرف سے تعمیر کرائی تھی، اس کے چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ اور گھنے جنگل تھے اور جو لوگ اس خانقاہ میں رہتے تھے اُن کے لیے قواعد بھی اور خانقاہوں سے زیادہ سخت تھے اور مذہبی تعصب و عناد کے نشو و نما کے لیے یہ بہت ہی زرخیز زمین سمجھی جاتی تھی، اس کنج عزلت میں اسحاق کا چچا جرمیاس اور اُس کی چچی الزبتھ اور چند عزیز بھی رہتے تھے، اور سب نے رہبانیت کی تنگ و تاریک زندگی اختیار کر رکھی تھی، مثال کی قوت، وحشت خیز ماحول، سخت روزے، شب بیداری، عبادت، جسم کو اذیتیں پہنچانی، اور مسیحی شہداء کے سوانح کا ہر وقت مطالعہ (۲۸۴)
ان تمام باتوں نے مل جل کر اس نوجوان اسحاق کے دل میں مذہبی تعصب کا وہ جوش و خروش

پیدا کیا جو جنون کی حد کو پہنچ گیا، اور اُسے بالکل یقین کیسا تھ یہ معلوم ہوا کہ خداوند مسیح اس کو حکم دے رہا ہے کہ اپنی جان دیکر بزرگی حاصل کرے، پس ایک دن وہ خانقاہ سے نکل کر قرطبہ پہنچا اور قاضی کے سامنے آکر کہا "میں آپکا دین قبول کرنا چاہتا ہوں، مہربانی کرکے آپ مجھے اس کی ہدایت کریں" قاضی خوش ہوا کہ ایک عیسائی کو مشرف بہ اسلام کرنے کا موقع ملتا ہے فوراً جواب دیا کہ "نہایت خوشی سے" اور اسی وقت ارکان اسلام اُسے بتانے لگا، لیکن اسی اثنا میں اسحاق نے کہا کہ "اس نے .... تمہیں دھوکا دیا............ اور بہت سے ذلیلوں کو اپنے ساتھ گھسیٹ کر......[1] تم عقل رکھتے ہو پھر کیوں ان ناپاک عقائد کو ترک نہیں کرتے؟ اس کی جھوٹی باتوں پر تم کو کیونکر یقین آیا؟ بس فوراً عیسائی مذہب قبول کرو، کیونکہ نجات صرف اسی دین میں ہے۔"

قاضی اس تقریر کو سن کر اپنے آپے میں نہ رہا، منہ کھلا تھا مگر زبان پر کوئی لفظ نہ تھا غصہ سے آنکھوں میں آنسو آگئے، اور ایک دفعہ ہی نہایت زور سے اسحاق کے منہ پر تماچہ مارا۔

راہب نے تماچہ کھا کر کہا "ہائیں! کیا تو خدا کی شبیہ کو تماچہ مارتا ہے؟ اسکا تجھے ایک دن حساب دینا ہوگا۔"

دار القضا میں اور جس قدر لوگ اس وقت تھے وہ قاضی سے کہنے لگے "غصہ کو دور فرمایئے اپنے مرتبہ کا خیال رکھیے، اور فراموش نہ کیجیے کہ شرع میں ایسے شخص کی توہین ممنوع ہے جسے قتل کا حکم مل چکا ہو۔"

قاضی نے آخر کار راہب سے مخاطب ہو کر کہا اے بدنصیب! شاید تو شراب پیے ہے، یا تو عقل سے بے بہرہ ہے اور تجھے نہیں معلوم کہ تیرے منہ سے کیا نکل رہا ہے؟ کیا تو نہیں جانتا کہ جس ذات اقدس کی تو توہین کرتا ہے اس کا حکم ہے کہ جو شخص اس طرح کے الفاظ زبان پر لائے جیسے کہ تو لایا ہے اُس کی سزا موت ہے۔ (۸۵ر

راہب نے آہستہ سے کہا "قاضی میں ہوش میں ہوں، شراب میں جانتا بھی نہیں کیسی ہوتی ہے، جذبۂ حق میں سوختہ ہو کر میں نے یہ باتیں تیرے اور دوسرے حاضرین کے سامنے کہی ہیں

[1] ان فقروں میں بعض نہایت بے ادبی کے الفاظ پیغمبر خدا صلعم کی نسبت آئے ہیں جنکے ترجمے میں نے پرہیز کیا ہے (مترجم)

اب تو میری موت کا حکم دے، میں موت کا حکم سننے سے ڈرتا نہیں بلکہ اُس کا مشتاق ہوں کیا ہمارے خداوند مسیح کا قول نہیں ہے کہ "برکت والے ہیں وہ جو حق کی خاطر ظلم برداشت کرتے ہیں، آسمانی بادشاہی اُنہی کی ہے"۔

قاضی کو اب اس راہب کے حال پر افسوس ہوا اور اسے قید خانے بھیجنے کے بعد امیر عبدالرحمٰن سے اجازت چاہی کہ جس صورت میں ملزم یقیناً مجنون ہے تو سزا میں کچھ تخفیف کر دی جائے، لیکن امیر یہ دیکھ چکا تھا کہ پرفکتوس کے قتل کے بعد عیسائیوں نے بہت دھوم دھام سے اُسکی عزت کی تھی، اس لیے حکم دیا کہ "حد شرع بے کم و کاست جاری کی جائے اور عیسائیوں کو اجازت نہیں ہے کہ مجرم کی لاش کو تزک و احتشام کے ساتھ دفن کریں، بلکہ حکم دیا جاتا ہے کہ اُس کی لاش کو کئی دن تک پھانسی پر اس طرح کہ سر نیچے ہو اور پاؤں اُوپر ہوں لٹکا رہنے دیا جائے، اس کے بعد لاش جلا کر اُس کی راکھ دریا میں بہا دی جائے"۔ ان حکموں کی تعمیل ہوئی (۳ جون ۸۵۱ء مطابق ذی الحجہ ۲۳۶ھ)

امیر کے اس حکم نے گو اسحاق کی لاش کو مسیحی تبرکات میں داخل ہونے سے محروم کر دیا، مگر راہبوں نے اس کمی کو اسطرح پورا کیا کہ اسحاق کا نام شہیدوں کی فہرست میں درج کر کے اُسکی کرامات کا ذکر کیا، جو صرف بچپن ہی میں نہیں بلکہ پیدائش سے بھی پہلے اُس سے ظاہر ہوتی رہی تھیں،

اب اور عیسائی شہید ہونے کے لیے میدان میں آئے، اسحاق کے قتل کے دو دن بعد ایک افرنجی عیسائی نے جس کا نام سانکو تھا، اور جو امیر عبدالرحمٰن کی فوج محافظ کا ایک سپاہی اور پادری یولوجیس کا شاگرد تھا، پیغمبر کو گالیاں دیں اور قتل کی سزا پائی، اس کے بعد جو دن اتوار کا آیا، (۷ جون) تو اس دن چھ راہب جن میں ایک اسحاق کا چچا جرمیاس، اور دوسرا ایک راہب جانبتوس تھا جو اپنے حجرے میں ہمیشہ تنہا پڑا رہتا تھا، قاضی کے سامنے آئے اور کہا کہ ہم اپنے مقدس بھائیوں اسحاق اور سانکو کے الفاظ کا اعادہ کرتے ہیں" اتنا کہکر پیغمبر کو دشنام دینے لگے، اور کہا کہ "اب اپنے جھوٹے نبی کا بدلہ ہم سے نکالو" یہ چھ کے چھ بھی قتل کر دیے گئے، ان کے بعد سنت اکیس کلوس کے گرجا کے ایک پادری نے جس کا نام سیسی نند تھا اور جو راہبان اسحاق اور سانکو کا بڑا دوست تھا خواب میں دیکھا کہ یہ دونوں دوست اُس کے پاس آئے ہیں اور ہدایت کرتے ہیں

کہ شہیدوں کی موت مرد، یہ سیسی نند بھی قتل کیا گیا، جس وقت قتل ہونے لگا تو اُس نے اپنے گرجا کے شماس پولس نامی سے کہا کہ وہ بھی اُس کی مثال کی پیروی کرے، اپولوس بھی اس واقعہ کے چار دن بعد ۲۰ جولائی قتل کردیا گیا، شہر قرمونہ کے ایک جوان راہب تھیودومیر نے بھی اسی طرح کامیابی کے ساتھ شہادت کا درجہ حاصل کیا،

(۲۸۶) غرض دو ماہ سے کم کی مدت میں گیارہ وقوعے شہادت کے ایسے پیش آئے کہ "متعصبین" فی الحقیقت اپنی فتح و فیروزمندی پر ناز کرنے لگے، لیکن اس گروہ کے علاوہ اور جس قدر عیسائی ایسے تھے جو امن و عافیت کیساتھ زندگی بسر کرنے کے سوا اور کسی بات سے سروکار نہ رکھتے تھے اس عجیب و غریب حالت کو دیکھ کر سخت پریشان ہوئے اور ڈرے کہ کہیں مسلمان تمام عیسائیوں سے بدگمان ہو کر اُن پر ظلم کرنے شروع نہ کردیں، یہ لوگ "متعصبین" سے کہتے تھے کہ سلطان نے ہم کو اپنے مذہب پر چلنے کا پورا اختیار دے رکھا ہے، وہ ہم پر کسی طرح کا ظلم نہیں کرتا، پھر کیا چیز ہے جس کے لیے تعصب کا یہ جنون تم میں اُچھلا ہے؟ جن لوگوں کو تم شہید ہونے کی عزت بخشتے ہو وہ شہید نہ تھے، بلکہ ایسے لوگ تھے جنھوں نے غرور اور تکبر میں آکر جو ام المعاصی ہے خودکشی کی ہے، اگر وہ کتاب مقدس کی طرف رجوع کرتے تو اُس میں یہ حکم پڑھتے کہ "دشمنوں سے بھی محبت کرو، اور اُن سے بھی بھلائی کرو جو تم سے دشمنی رکھتے ہیں" مسلمانوں کے پیغمبر کو دشنام دیتے وقت حواریٔ مسیح کا یہ قول بھی تو یاد رکھا ہوتا کہ "افترا پردازی اور بہتان باندھنے والے آسمانی بادشاہی میں داخل نہیں ہو سکتے" مسلمان ہم سے کہتے ہیں "اگر خدا کو منظور ہوتا کہ ہمارے نبی کو جھوٹا ثابت کرتا، اور جو ارادہ ان متعصب لوگوں کا ہے اگر وہ خدا نے ان کے دل میں ڈالا ہوتا تو پھر تمہارا دین اختیار کرنے کے لیے خدا ہم پر اپنی نشانیاں ظاہر کرتا، مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ اس کے برعکس خدا کو منظور ہوا کہ ان نام نہاد شہیدوں کی لاشیں جلا کر اُن کی راکھ دریا میں بہادی جائے، تمہارے دین والوں کو ان شہادتوں سے کوئی نفع نہیں پہنچا، اور نہ ہم کو کوئی نقصان ہوا، آخر خودکشی کا یہ جنون کیا ہے؟" مسلمان جب اس طرح اعتراض کرتے ہیں اور ان کے اعتراض درست ہیں تو تم ہی بتاؤ کہ ہم اُن کو کیا جواب دے سکتے ہیں؟

اسی قسم کے دلائل نہ صرف معمولی عیسائی بلکہ بہت سے پادری بھی پیش کرتے تھے، پادری

یولوجیوس نے ان دلیلوں کا جواب دینا اپنے ذمہ کر لیا، اور ایک کتاب "یادگار شہداء" کے نام سے لکھنی شروع کی، اس تصنیف کی کتاب اوّل میں ایسے لوگوں کو نہایت سخت و سست کہا ہے جو بقولِ مصنف "اپنی ناپاک زبان سے مسیحی شہیدوں کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں اور اُن پر لعنت بھیجتے ہیں" جو عیسائی مسلمانوں کی مذہبی رواداری کے قائل تھے اُن کی تردید میں یولوجیوس نے نہایت تاریک رنگوں میں اُن مصائب و آلام کی تصویر کھینچی ہے جو عیسائیوں کو اور اُن میں سے بالخصوص پادریوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں برداشت کرنے پڑتے ہیں، ایک جگہ لکھتا ہے "افسوس! اگر اسپین میں کلیسہ کانٹوں میں پھول بن کر کھلا، یا ایک خودسر اور ناپاک قوم میں مشعل بن کر چمکا تو ان نعمتوں کو اُن بے دینوں سے منسوب نہ کرو جن کے سامنے گناہوں کی سزا میں ہم ذلیل کیے جاتے ہیں، بلکہ یہ نعمتیں خداوند کی طرف سے ہیں جس نے اپنے شاگردوں سے کہا تھا "دیکھو! میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہوں حتیٰ کہ دنیا کے خاتمہ تک تمہارے ساتھ رہوں گا" اس کے بعد یولوجیوس اپنی کتاب میں اناجیل اور قصص شہداء سے وہ تمام عبارتیں نقل کرتا ہے، جن سے ثابت ہو کہ نہ صرف یک لخت شہادت حاصل کرنے کی اجازت دی گئی ہے بلکہ شہید ہونا ایک کارِ ثواب ہے جسے خدا پسند کرتا ہے، یولوجیوس اپنے مخالفوں سے کہتا ہے "اے گنہگارو! جو شہیدوں کی شان و بزرگی کو حقیر سمجھتے ہو، جان لو کہ یوم آخر میں خدا کے سامنے اِن شہیدوں سے تمہارا مقابلہ ہوگا، اور جس جس طرح سے تم نے اُنکی بے ادبی ہے، اُن سب کا جواب دینا پڑے گا۔

عربی حکومت عیسائیوں کی اس عجیب و غریب بغاوت سے پریشان ہوئی خاص وجہ یہ تھی کہ ان بے خون تو ان "متعصبوں" کی طبیعت کا صرف ایک پہلو تھا، دوسرا پہلو شوقِ جنگ اور اُس کیساتھ یہ خواہش تھی کہ ان بزعم خود سیاسی بدسلوکیوں کا انتقام بھی مسلمانوں سے لیا جائے بہرکیف اس وقت سب سے زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ اِن "مجانین" کو خودکشی سے کیونکر روکا جائے

لہ یولوجیوس اور الوارو نے اکثر مسیحی شہیدوں کی نسبت لکھا ہے کہ "وہ خدا کے سپاہی تھے جو ناپاک دشمن سے لڑے تھے"

پیغمبر کیساتھ بے ادبی کے جرم میں سزائے موت کا ملنا تو بہرحال لازمی تھا، اس میں مسلمانوں کے قانون کو مطلق جنبش نہ تھی، صرف ایک تدبیر ایسی تھی جس سے خیال ہوتا تھا کہ اس مرض کا دفعیہ ہوجائے اور وہ یہ تھا کہ ایک کلیسائی کونسل بٹھائی جائے، اور اُس کو سمجھا دیا جائے کہ وہ ایک حکم جاری کر کے عیسائیوں کو اس قسم کی شہادتیں حاصل کرنے کی قطعی ممانعت کردے، امیر عبدالرحمٰن نے یہی تدبیر کی، تمام اساقفہ کو ایک مجلس میں جمع کیا، اور چونکہ بذاتِ خود اس مجلس میں شریک نہ ہو سکتا تھا، اِس لیے اپنی طرف سے ایک سرکاری عہدہ دار کو جو عیسائی تھا اِس مجلس میں شرکت کے لیے مقرر کر دیا۔

یولوجیوس اور الوارو نے اس عیسائی عہدہ دار کا نہایت ہی سخت و درشت الفاظ میں ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ "یہ کاتب یا کافر، مفسد، مغرور اور ظالم شخص تھا، عیسائی صرف نام کا تھا شروع ہی سے وہ مسیحی شہیدوں کا دشمن اور بدخواہ تھا" غرض اس شخص سے یولوجیوس اور الوارو کو اس درجہ نفرت تھی کہ اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ کہیں اس کا نام نہ لیا جائے۔ لیکن عربی مورخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا نام قومس بن انطونیاں بن یلیاں تھا۔

قومس نہایت مستعد اور ہر بات کی تہ کو پہنچنے والا آدمی تھا، عیسائیوں اور مسلمانوں نے باتفاق رائے لکھا ہے کہ عربی میں اُس کی تحریر و تقریر نہایت صحیح و شستہ ہوتی تھی، اس کا افسرِ خاص عبداللہ بن اُمیہ اور خود امیر عبدالرحمٰن اُس سے بہت خوش تھے، اور جس زمانہ کا ہم ذکر کرتے ہیں اس وقت دربارِ امارت میں اُسے بہت رسوخ حاصل تھا، مذہبی باتوں کیطرف سے وہ بالکل بے پرواہ تھا، اور جو لوگ مذہبی تعصب رکھتے تھے اُن کو بہت ہی حقیر اور ذلیل سمجھتا تھا، قومس اُن احمق عیسائیوں پر جو اپنے سر کٹوانے پر بلاوجہ مصر تھے شاید لعن طعن کرنے پر اکتفا کرتا، لیکن ڈر یہ تھا کہ ۲۸
ان کم عقلوں کی حماقت سے خود اُس کے حق میں بُرے نتائج نہ پیدا ہونے لگیں، کیونکہ اس کو ابھی سے نظر آرہا تھا کہ مسلمانوں کے تیور بدل چلے ہیں، اور تمام عیسائیوں کیطرف سے ایک قسم کی بدگمانی اُنکے دل میں پیدا ہونے لگی ہے، اس حالت کو دیکھ کر ایک پریشان خیال اُس کے ذہن میں آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان بدگمان تو ہوتے ہی جاتے ہیں، متعصب اور غیر متعصب عیسائیوں میں تمیز کرنی چھوڑ دیں، جس کا نتیجہ یہ ہو کہ خود قومس اور اس کیساتھ اور عیسائی عہدہ داروں کو بڑی بڑی

تنخواہیں پا رہے ہیں اپنے عہدوں سے علیحدہ ہونا پڑے، اور شاید اپنی اندوختہ دولت سے بھی وہ محروم ہو جائیں

غرض جب عیسائیوں کی مذہبی کونسل بیٹھی تو قومس صرف امیر اندلس ہی کے خیالات کا ترجمان نہ بنا بلکہ خود اپنے نفع نقصان کا بھی اُسے خیال ہوا، اور اُس نے کامیابی کیساتھ اس سیلاب کو روکا جو زور پکڑ کر ایک دن خود اُس کو بھی بہالے جاتا۔

اسناد:-

یولوجیوس Mem Sanct; PP 237-49, 269; ii. c. 1-6, 15; iii. c. 2;

الوار Indic lum PP. 225-44

حالی (ابن ابی اصیبعہ پر مضمون)

ابن القوطیہ ص ۳۱-۳۴

خوشانی ص ۲۹۱-۲۹۲

ابن الابار ص ۹۴

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مسلم

آٹھویں فصل

امیر محمد بن عبدالرحمن بن حکم کی تخت نشینی

مسیحی کونسل کا اجلاس ریکافرید مطرانِ اشبیلہ کی صدارت میں شروع ہوا، تومس نے جو ۲۸۹
امیر کی طرف سے آیا تھا، مجلس کے سامنے کل واقعات بیان کرکے اُن مہلک نتیجوں کا نقشہ کھینچا جو
اُن دشنام دہندگانِ پیغمبر کی حرکتوں سے پیدا ہو سکتے ہیں! یہ لاعن و مجدف اس لائق نہیں ہیں کہ
قتل ہونے کے بعد اُن کو شہیدوں کی فہرست میں درج کرکے اُنکی عزت افزائی کی جائے، بلکہ
اس لائق ہیں کہ کلیسہ اُن کو اپنے زمرے سے خارج کر دے، کیونکہ ان کی حرکتوں سے اندیشہ ہے
کہ کہیں تمام عیسائیوں پر ظلم و تعدی شروع نہ ہو جائے"۔

یہ خیالات ظاہر کرکے تومس نے کونسل سے درخواست کی کہ اپنی طرف سے وہ ایک ایسا حکم جاری کرے جس میں ان خود ساختہ شہیدوں کے طریقے کو از حد نازیبا مذموم قرار دیکر ان کے اتباع سے عیسائیوں کو قطعی ممانعت کر دے، مگر اس کے ساتھ ہی تومس کو خیال ہوا کہ ایسا حکم بھی غالباً پورے طور پر کارگر نہ ہوگا، کیونکہ متعصبوں میں جو سرگروہ ہیں اور جن میں یولوجیس سب سے زیادہ نمایاں ہے کونسل کے حکم پر معترض ہو جائیں گے، اور ایسے حکم کے جاری ہونے پر بھی بیوقوف اور

سریع الاعتقاد عیسائیوں کو بہکاتے رہیں گے کہ وہ قاضی کے سامنے جاکر پھر وہی حرکتیں کریں جو اب تک ظاہر ہوئی تھیں، بہرکیف جو کچھ بھی ہو یہ دشنام دہی کسی نہ کسی طرح بند کرنی ضرور ہے، اس بنا پر تومس نے اساقفہ سے یہ بھی کہا کہ جو متعصب پادری خطرناک سمجھے جائیں بہتر ہے کہ وہ قید کر دیے جائیں۔

ساول اسقف قرطبہ نے کونسل نے اجلاس میں شہیدوں کی حمایت میں تقریر شروع کی یہ اسقف "متعصبین" کا دل سے ہمدرد نہ تھا، بلکہ پادریوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس نے ایسا کیا تھا، وجہ یہ تھی کہ اس ساول کے حالاتِ سابقہ ناگفتہ بہ تھے، واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ قرطبہ کے پادریوں نے اسقفی کے لیے اس کو منتخب کر لیا تھا، مگر امیر کے ہاں سے اس کے تقرر کی منظوری نہیں آئی، اس منظوری کو حاصل کرنے کے خیال سے ساول نے محل کے خواجہ سراؤں سے کہا کہ اگر تقرر منظور کرا دو گے تو سو اشرفیاں بطور نذرانے کے دوں گا خواجہ سراؤں نے ضمانت مانگی، ساول نے ایک دستاویز اس مضمون کی لکھدی کہ اسقفی کی جائیداد کی آمدنی سے ایک سو اشرفیوں کی رقم وہ ادا کر دے گا، اس دستاویز سے پادریوں کو نقصان پہنچتا تھا، کیونکہ گرجا کی آمدنی کا مستحق سوائے ان کے دوسرا نہ تھا، بہرکیف خواجہ سراؤں نے کہہ سنکر ساول کا تقرر قرطبہ کی اسقفی پر امیر سے منظور کرا دیا،

دیندار عیسائی ساول کو اس کی خیانت پر ہمیشہ شرمندہ کرتے رہتے تھے، اس شرمندگی کو مٹانے، اور پادریوں میں پھر عزت پیدا کرنے کے خیال سے ساول گروہ "متعصبین" کا ہمدرد بن گیا جس وقت پر فکتوس کا جنازہ پادریوں نے دھوم سے نکالا تھا جس سے حکومت کو سخت برہمی ہوئی تھی تو ساول مع اپنے پادریوں کے اس جلوس میں سب سے آگے تھا،

غرض اس وقت کونسل میں آکر "کتاب مقدس" اور "سوانح شہدا" سے اس نے ایسی عبارتیں سنانی شروع کیں جن سے "متعصبین" کے کام قابل تحسین ثابت ہوں، لیکن کونسل کے اراکین یعنی اساقفہ پر ساول کی دلیلوں کا کچھ اثر نہ ہوا، اور اُن کا میلانِ خاطر اسی طرف رہا کہ تومس نے جو تحریک کی ہے اسی کے مطابق حکم جاری کیا جائے، مگر باوجود اس میلان خاطر کے ان کو ایک سخت مشکل یہ درپیش تھی کہ کلیسہ ہمیشہ سے ایسے مذہبی خودکشوں کو بہ نظر التفات دیکھ کر شہیدوں

میں شامل کر رہا تھا جب سابق سے یہی طریقہ چلا آتا تھا تو آج کل کے شہیدوں کو برا کہنے کے معنی یہی ہوں گے کہ اشاعت مسیحیت کے آغاز میں جن عیسائیوں نے دین کے لیے اپنی جانیں دی تھیں وہ بھی برے تھے، پس کونسل نے کسی اصول کی بنا پر ان اسباب کو جن کی وجہ سے عیسائی خودکشی کرتے تھے برا نہیں بتایا، اور نہ ان لوگوں کو برا کہا جنھوں نے زمانہ حال میں شہادت حاصل کی تھی، بلکہ صرف ایک امتناعی حکم اس مضمون کا جاری کر دیا کہ اپنی مقدس و متبرک موت سے عیسائی آیندہ پرہیز کریں۔

قومس اساقفہ کی مشکلات کو بخوبی سمجھتا تھا، اس لیے اس نے اس حکم کو کافی سمجھا، بالخصوص اس وجہ سے کہ ریکافرید صدر کونسل نے اس بات کا وعدہ کر لیا تھا کہ بہرکیف اس گروہ "متعصبین" کا اچھی طرح سے تدارک کر دیا جائیگا۔

کونسل کا حکم جاری ہوتے ہی یولوجیس اور اس کے دوستوں نے حکم دینے والوں کی مخالفت میں انہی کے حکم سے کام لیا، اور کہنے لگے کہ "یہ حکم اس سال کے شہدا کو مطعون نہیں کرتا بلکہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ شہیدوں کی تعداد میں اور زیادتی ہونے والی ہے، اس صورت میں شہادت کی ممانعت چہ معنی دارد؟ اس ممانعت اور حکم کے باقی مضمون میں ایسا تناقض ہے جس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ حکم محض خوف سے جاری کیا گیا ہے، اس حکم میں جس قدر شہید ہونے کو پسند کیا گیا ہے اسی قدر اس کو علانیہ اچھا سمجھنے سے خوف ظاہر کیا گیا ہے"

غرض مفسدہ مجنون طبیعتوں نے اساقفہ کے اس حکم سے سرتابی کی، لیکن متعصب عیسائیوں میں یا تو اتنی عقل نہ تھی کہ ان کی زیادتیوں سے جو نتیجہ پیدا ہونے والا تھا اسے سمجھ جاتے، یا اگر اسکی سمجھ تھی تو یقینی انھوں نے اپنی ہمت کا اندازہ اصلیت سے زیادہ کیا، کیونکہ جس وقت ریکافرید مطران اشبیلہ نے اپنے قول کے مطابق حکومت کی اعانت سے گروہ "متعصبین" کے سرغنوں کو قیدخانے بھیجدیا تو سب کے ہوش پران ہوئے، کوئی چھپا، کوئی بھاگا، کوئی اپنی جگہ ہمیشہ بدلتا رہا یولوجیس نے ان حرکتوں کے بہتیرے عذر کیے کہ "اگر میں یا میرے دوست روپوش ہو گئے، یا ہمیشہ نقل مکان کرتے رہے، یا بھیس بدل کر ادھر ادھر بھاگے، تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ ہم ابھی اپنے آپ کو شہادت حاصل کرنے کے لائق نہ سمجھتے تھے"

مگر یولوجیوس کے یہ عذر سب لغو سمجھے گئے اصل واقعہ یہ تھا کہ اب شہادت حاصل کرنے سے جان سلامت رکھنی زیادہ عزیز ہو گئی تھی، اگرچہ زبان سے اس کا اقرار نہ کرتے تھے "متعصبوں" میں جو سرگروہ تھے اُن کی بزدلی بھی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ خود یولوجیوس کا بیان ہے " اگر پتّا بھی کھڑکتا ہے تو ہم خوف سے لرز جاتے ہیں" جو بڑے دیندار عیسائی اور پادری کچھ دنوں پہلے شہیدوں کی تعریف میں قصیدے پڑھا کرتے تھے، اُنھوں نے حیرت خیز عجلت کے ساتھ اپنے طور و طریقے بدل دیے اور ان لوگوں میں بہت سے ایسے نکلے جنھوں نے عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا، "متعصبین" باوجودیکہ بھاگتے اور چھپتے پھرتے تھے اور اپنی حفاظت میں حد درجہ (۲۹۱)
کی احتیاط کرتے تھے، مگر ساؤل اُسقفِ قرطبہ اور اُس کے فریق کے بہت سے پادریوں کا سراغ مل گیا اور وہ سب گرفتار ہو گئے یہی حال پادری یولوجیوس کا ہوا یہ اپنے گھر میں چھپا ہوا "یادگارِ شہدا" لکھنے میں مصروف تھا کہ سرکاری افسر گھر میں گھس آئے، گھر کے لوگ بہتیرا چیخے چلائے مگر اُنھوں نے یولوجیوس کو گرفتار کر کے قید خانے پہنچا دیا، قید خانے میں یولوجیوس اور فلورا میں ایک مرتبہ ملاقات ہوئی۔

اب ہم وہ حالات بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے فلورا قید خانے پہنچی تھی

شہر قرطبہ کے قریب ایک مسیحی خانقاہ تھی، اس میں ایک نوجوان راہبہ جس کا نام مریم تھا رہا کرتی تھی، یہ اُن چھ راہبوں میں سے ایک راہب کی بہن تھی جو قاضی کے سامنے دشنام دہی کے جرم میں قتل ہوئے تھے مریم کو اپنے بھائی سے بہت محبت تھی، جب وہ قتل ہو گیا تو مریم اس کے غم میں رات دن رویا کرتی تھی ایک دن ایسا ہوا کہ ایک راہبہ جو اسی خانقاہ میں رہتی تھی مریم کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ آج خواب میں تیرا بھائی مجھ پر ظاہر ہوا تھا اور وہ کہہ گیا ہے کہ "میری بہن مریم سے کہہ دینا کہ میرے مرنے پر اب وہ رونا چھوڑ دے کیونکہ وہ جلد میرے پاس آسمان پر آنے والی ہے۔" اس دن سے مریم نے رونا بند کر دیا اور اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ جیسی موت بھائی مرا ہے ایسی ہی موت وہ بھی مرے گی خانقاہ سے اُٹھ قرطبہ کے ارادے سے چلی تو پہلے ثلث ایکس کلوس کے گرجا میں آئی اور ایک جوان کنواری لڑکی کے قریب جو اس وقت اولیائے مسیح سے نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ دعا مانگنے میں مصروف تھی خود بھی

کھڑے ہو کر دعا مانگنے لگی۔ یہ جوان کنواری لڑکی فلورا تھی، مدت تک ایک عیسائی کے گھر میں چھپی رہی تھی۔ لیکن ایک دن ایسا جوش اُٹھا کہ وہاں سے نکل کھڑی ہوئی شہادت کی تیاری مریم کی طرح کرنے لگی۔ مریم نے بہت خوش ہو کر اپنا ارادہ فلورا پر ظاہر کیا دونوں گلے ملیں اور قسمیں کھائیں کہ اب کبھی جُدا نہ ہونگی اور دونوں ساتھ ہی مریں گی۔ مریم بولی کہ "میں اپنے بھائی سے ملنے جاؤنگی" فلورا نے کہا "میں مسیح سے اپنی شادی رچا کر خوش رہوں گی" دونوں جوش مذہب میں سرشار دارالقضا میں قاضی کے سامنے آئیں۔ فلورا نے قاضی سے کہا بہت زمانہ ہوا کہ مجھ بت پرست (مسلمان) باپ کی بیٹی کے ساتھ تو نے نہایت ظلم کا برتاؤ کیا تھا۔ اور تیرا ظلم اس بنا پر تھا، منکر مسیح ہونے سے میں نے انکار کیا تھا۔ اسکے بعد میں اپنی کمزوری کی وجہ سے روپوش ہو گئی۔ لیکن آج مسیح کے خدا ہونے پر پورا یقین رکھکر تیرے سامنے آنے میں مجھے مطلق خوف نہیں ہے۔ اب پھر میں اسی مضبوطی کے ساتھ جو پہلے رکھتی تھی تیرے سامنے کہتی ہوں کہ مسیح خدا ہے اور میں تیرے .. .." (یہاں فلورا نے نہایت سخت بے ادبی کے الفاظ حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پاک میں استعمال کیے۔ جن کا اعادہ ناممکن ہے) اب مریم کی باری آئی۔ وہ کہنے لگی قاضی میں ان چھ شہیدوں میں سے ایک شہید کی بہن ہوں جنہوں نے تیرے پیغمبر کو دشنام دے کر جام شہادت پیا تھا۔ میں بھی اقرار کرتی ہوں کہ مسیح خدا ہے اور قاضی تیرا مذہب شیطان کا ایجاد کیا ہوا ہے۔"

یہ دونوں عورتیں سزائے موت کی مستوجب تھیں لیکن قاضی کو غالباً ان کی جوانی پر ترس آیا بہت کوشش کی کہ جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے ہیں۔ ان سے وہ توبہ کریں لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں پھر بھی قاضی نے دونوں کو قید خانہ بھیج دینا کافی سمجھا۔

شروع میں وہ اپنی بات پر نہایت مضبوطی سے قائم رہی ہر وقت عبادت کرتیں روزے رکھتیں کلیسا کی تعریف میں گیت گا گا کر ترک دنیا کے خیالات میں غرق رہتیں لیکن ایک مدت دراز تک قید میں ایک ہی طرح رہتے رہتے اور ان لوگوں کی منت و سماجت سے جو ان کی جان بچانی چاہتے تھے اور خاص کر قاضی کی اس دھمکی سے کہ اگر وہ اپنے کہنے سے باز نہ آئیں تو ان سے کسب کرایا جائے گا۔ آخر کار ان کی پختگی اور صبر و شکیبائی میں فرق آنے لگا قاضی نے

یہ دھمکی اس لیے دی تھی کہ وہ جانتا تھا کہ یہ عورتیں موت کے خوف سے کہیں زیادہ اپنی عفت شکنی سے ڈرتی ہیں، قریب تھا کہ وہ اپنی اس حالت کو بدل دیتیں لیکن اسی زمانہ میں یولوجیوس قید بھگتنے کے لیے اسی قید خانے میں وارد ہوا۔ اور اس نے ان عورتوں کی ہمت کو سنبھال لیا

یولوجیوس کو اس موقع پر جن تکلیفوں کا سامنا ہوا وہ حقیقت میں بہت شدید تھیں،

اس جوان اور حسین لڑکی سے جس کے عشق بے زبان میں اس کا دل ڈوبا ہوا تھا، یہ کہنا کہ وہ جان دینے پر آمادہ ہو، ایسا کام تھا کہ سخت سے سخت متعصب بھی اس سے منہ موڑ لیتا۔ لیکن یولوجیوس نے فلورا کو بجائے مرنے سے باز رکھنے اور اس کے جوش مذہب کو ٹھنڈا کرنے کے نہایت فصیح و بلیغ تقریروں سے اس کی ہارتی ہوئی ہمت میں پھر مضبوطی پیدا کر دی، ہم یولوجیوس کے اس اندھے تعصب پر خواہ اسے کتنا ہی الزام دیں اور خواہ اس کی حالت پر کتنے ہی آنسو بہائیں مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بالکل ہی سرد اور بے حس طبیعت رکھتا تھا، باوجود ظاہری سکون کے جس کے پردے میں وہ اپنی شدید تکلیفیں چھپائے ہوئے تھا۔ اس کا دل در حقیقت درد میں تڑپتا تھا، ایک قوی اور جلد اثر قبول کرنے والی روح میں غلبۂ شوق و جذبات نے پھر زور کیا، یا یہ کہیئے کہ عشق نے اپنا رنگ دکھانا چاہا۔ بشرطیکہ یولوجیوس اور فلورا کے روحانی تعلق کو عشق کہنا درست ہے بہر کیف یولوجیوس کے سینے میں عشق اور ایمان کی ایک کشمکش تھی جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے باوجودیکہ طبیعت ایسی پائی تھی کہ جدھر رجوع ہو سب کچھ اسی پر قربان کر دے۔ یولوجیوس نے اپنے دل کی شورش کو روکا اور یہ سوچ کر کہ اپنا عشق جو ایک کمزوری ہے کسی کو ظاہر نہ ہو سخت محنت شاقہ میں مصروف ہو کر اس رنج کو دل سے بھلانے کی کوشش کی رات دن لکھنے پڑھنے میں مصروف ہوا ایک رسالہ لکھا جس میں فلورا اور مریم کو سمجھایا ہے کہ شہادت سے زیادہ کوئی کار ثواب نہیں "یادگار شہدا" جو پہلے سے لکھ رہا تھا اسے قید خانے میں ختم کر کے نظر ثانی کے لیے الوارو کے پاس بھیجا۔ اپنے دوست دلپسند اسقف بنبلونہ کو ایک بہت بڑا خط لکھا اور زمانۂ اسیری میں مذہبی

له یہ بیان متعصب پادریوں کا ہے کوئی مسلمان قاضی اس قسم کی سزا تجویز نہیں کر سکتا، اور نہ مسلمان رہ کر وہ ایسی دھمکی دے سکتا ہے۔ مترجم

خیالات سے بھی طبیعت کو اتنی مہلت ملی کہ "عروض" پر ایک کتاب لکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اپنے شہر والوں میں قومی محبت کا جو مادہ دراصل موجود ہے۔ مگر اس وقت نظر نہیں آتا اسے زندہ کر کے پرانی لاطینی ادبیات کا شوق اس شہر کے لوگوں میں پیدا کرے۔ جس میں سینیکا اور لیوکان جیسے ادیب پیدا ہوئے تھے۔ اور جس کے باشندوں کا فرض تھا کہ لاطینی ادبیات کو وہ اپنا قومی ورثہ سمجھتے قسطنطین کے زمانہ حکومت میں پادریوں کا خیال تھا کہ ایسے پھول نہ چنے جائیں جن پر آب اصطباغ کی شبنم نہ پڑی ہو۔ یولوجیوس کو یقین تھا کہ قرطبہ کے عیسائیوں کے سامنے جو عربی ادبیات پر جان دینے لگے ہیں۔ اگر رومانی ادبیات پیش کی جائیں گی تو عربی دانی کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اس سے پہلے یولوجیوس نے رومانی شعراء ورجل، مورس اور جووینال کی تصانیف کے قلمی نسخے اپنے ہموطنوں کو پڑھنے کے لیے نبرہ کے علاقے سے دستیاب کر لیے تھے۔ اب یہ دیکھ کر کہ اہل مذاق شاعری میں قافیہ بندی سے قطعی بیزار ہو گئے ہیں اس نے لاطینی عروض کے قواعد لوگوں کے دلوں میں ذہن نشین کرنے چاہے تاکہ لوگ اوگستی عہد کی شاعری کی تقلید کرنے لگیں۔

بہر کیف اسی زمانہ میں یولوجیوس کی سحر بیانی اپنا رنگ لائی اور اس کے اثر سے فلورا اور مریم میں دل کی مضبوطی اور ثبات قلب ایسا پیدا کیا کہ یولوجیوس کو بھی باوجودیکہ وہ باطنی اثرات سے متاثر ہونے کا خوگر ہو چکا تھا۔ سخت حیرت ہوئی۔ یولوجیوس کا دل آمادہ تھا کہ جس کی تعریف اس کے دل میں ہے اُسے خدا بنا کر پوجے اور اب فلورا اس کی نظر میں ایسی مقدس اور پاک ہستی تھی جس کے گرد نور کا ایک حلقہ تھا۔ فلورا کے بھائی نے جب دارالقضا میں درخواست کی تو قاضی نے فلورا کو طلب کر کے اب آخری بار کوشش کی کہ وہ کفر چھوڑ کر اپنی جان بچالے، مگر فلورا نے نہ مانا، اور وہ پھر قید خانے بھیج دی گئی، اس مرتبہ پھر یولوجیوس اس سے قید خانے میں ملا، اس ملاقات کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ فلورا مجھے ایک فرشتہ معلوم ہوئی ایک آسمانی نور تھا جو اس کے گرد چمک رہا تھا، اس کا چہرہ خوشی سے سُرخ تھا، معلوم ہوتا تھا کہ آسمانی نشاط اُسے ابھی سے محسوس ہونے لگی ہے۔ قاضی کے سوالات اور اپنے جوابات فلورا نے ایسے تبسم کے ساتھ سنائے جس میں فتح و فیروزی پائی جاتی تھی جس وقت اس کی یہ باتیں جو امرت سے زیادہ میٹھی تھیں میں نے سنیں تو اس کے ارادہ میں اشتعال پیدا کرنے کے لیے میں نے تاج شہادت

کی طرف اشارہ کیا جو اس کے لیے تیار ہو چکا تھا، جوشِ پرستش میں میں نے اس فرشتہ کو سجدہ کیا، اور عرض کیا کہ اپنی دعاؤں میں مجھے بھی یاد رکھیے۔ فلورا کی گفتگو سے دوبارہ زندگی پاکر، اور دل ہلکا کر کے میں اپنی تاریک کوٹھڑی میں واپس چلا آیا۔"

جس دن ۲۵/ جمادی الاول ۲۳۷ھ مطابق ۲۴/ نومبر ۸۵۱ء بروز سہ شنبہ فلورا اور اس کی سہیلی مریم قتل کی گئی ہیں یولوجیوس کے لیے وہ بڑی کامیابی اور فتح کا دن تھا، چنانچہ الوارو کو اس نے لکھا برادرم! خداوند نے ہم پر بے انتہا کرم فرمایا ہے اور بڑی مسرت ہم کو نصیب ہوئی ہے، دونوں کنواریوں نے جنہیں آنسو بہا بہا کر ہم نے کلمۂ حیات کی تعلیم دی تھی شہادت کا تاج حاصل کر لیا، ظلمت کے بادشاہ (شیطان) کو مغلوب کر کے اور دنیا کی تمام الفتوں اور محبتوں کو پامال کر کے وہ خوشی خوشی اس نوشہ سے ملنے چلی گئیں جو آسمان پر حکومت کرتا ہے۔ اور مسیح کے بیاہ کی ضیافت میں مدعو ہو کر اس مقام پر جو پاکوں کا مسکن ہے یہ نیا گیت گاتی ہوئی پہنچ گئیں۔

"اے خداوند ہمارے خدا! سب عزت اور جلال تیرے لیے ہے کہ تو نے ہم کو جہنم کے قبضے سے چھڑا کر شہیدوں کی مسرت آفریں صحبت کے لائق بنا دیا۔ اور اپنی ابدی بادشاہت میں ہم کو بلا لیا۔"

ان کی فتح پر تمام کلیسا خوش ہے لیکن میں سب سے زیادہ اس فتح پر خوش ہونے کا حق رکھتا ہوں کیونکہ ان کے ارادے اور قصد کو میں نے اس وقت مضبوط کیا تھا جبکہ ان کی ہمت پست ہونے لگی تھی۔"

فلورا کے قتل کے پانچ دن بعد یولوجیوس ساول اور چند اور پادری قید سے رہا کیے گئے یولوجیوس نے اپنی رہائی کی وجہ بلا تامل یہ بیان کی ہے کہ جس وقت فلورا اور مریم شہید ہونے کے لیے مقتل کو جاتی تھیں تو انھوں نے کہا تھا کہ جب ہم مسیح کے حضور میں حاضر ہوں گے تو اس سے قیدیوں کی رہائی کے لیے عرض کریں گے۔"

ساول قید سے چھوٹنے پر ایک فرمان سلطان اشبیلیہ کے حکموں کا پابند ہو گیا، مگر یولوجیوس نے شہیدوں کی تعداد بڑھانے میں اپنی کوششیں دو چند کر دیں۔ اور اس کے اشتعال پر

پادریوں اور راہبوں اور عورتوں نے جو خفیہ طور پر عیسائی تھیں دشنام دہی اختیار کی اور سب کو قتل کی سزا ملی۔

ان متعصب عیسائیوں کی حماقت اور بے باکی اس حد تک پہنچ گئی کہ ایک دن ایک بوڑھا راہب اور ایک نوجوان عیسائی دونوں جامع مسجد قرطبہ میں گئے اور چلّا چلّا کر کہنے لگے "عیسائیوں کے لیے آسمان کی بادشاہی قریب آن پہنچی ہے۔ لیکن تم کافروں کے لیے دوزخ نے اپنا منہ کھول دیا ہے اور تھوڑے دن میں وہ تم سب کو نگل جائے گی۔"

مسجد میں جس قدر مسلمان جمع تھے ان کو اس قدر غصہ آیا کہ اگر قاضی ان کو منع نہ کرتا تو ان دونوں کے وہیں ٹکڑے اڑا دیتے۔ مگر قاضی نے ان عیسائیوں کو قید خانے بھیج دیا۔ جہاں ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر سر قلم کر دیئے گئے (۲۱ شوال ۲۳۵ھ بمطابق ۱۶ ستمبر ۸۵۲ء بروز جمعہ)

اس واقعہ کے چھ دن بعد امیر عبدالرحمان الاوسط کا دفعتہً انتقال ہو گیا پادری یولوجیس لکھتا ہے کہ یہ بڈھا بادشاہ قصر امارت کے بالاخانہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ جونہی اس کی نظر ان پھانسیوں کی طرف گئی جن میں آخر کے دو شہیدوں کی دست و پا بریدہ لاشیں اب تک لٹک رہی تھیں تو حکم دیا کہ ان لاشوں کو اتار کر جلا دیا جائے۔ یہ حکم زبان سے نکلا ہی تھا کہ اس پر فالج گرا اور اسی رات کو وہ ختم ہو گیا۔"

امیر عبدالرحمٰن نے دو بیٹے چھوڑے تھے ایک کا نام محمد تھا اور دوسرے کا نام عبداللہ چونکہ عبدالرحمٰن نے اس کا فیصلہ نہیں کیا تھا کہ کونسا بیٹا اس کا جانشین ہو گا، اور لڑکوں کو بھی ابھی تک باپ کے مرنے کا علم نہیں ہوا تھا، اس لیے جانشین کا انتخاب کرنا قصر کے خواجہ سراؤں پر منحصر ہو گیا، جو خادم رات کے وقت خدمت میں تھے اُنھوں نے امیر کی آنکھیں بند ہوتے ہی قصر کے کل دروازے اندر سے بند کر لیے تاکہ موت کی خبر مشہور نہ ہونے پائے۔

اب ان خادموں نے فوراً اپنے ساتھیوں کو جمع کیا، خواجہ سراؤں میں سے جو شخص سب میں زیادہ صاحب اقتدار تھا اُس نے حاضرین سے کہا تھا "ایک ایسا سانحہ جو ہم سب کے حق میں نہایت اہم ہے ابھی پیش آیا ہے۔ ہمارا آقا اب زندہ نہیں ہے" اتنا سنتے ہی تمام خواجہ سرا رونے پیٹنے لگے، اس پر اسی خواجہ سرا نے کہا "رونے پیٹنے کے لیے وقت

بالکل نہیں ہے، اس کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ اس وقت کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ پہلے اپنے اور جمیع مسلمانوں کے حقوق کا خیال کرنا چاہیئے، سوال یہ ہے کہ تخت، کس کو دیا جائے۔"

اس وقت ظاہر ہوتا تھا کہ سلطانہ طروب کی سازشوں کا کوئی نتیجہ نکلنے والا ہے رشوتیں دے کر اور طرح طرح کے وعدے وعید کر کے ملکہ نے قصر کے تمام خواجہ سراؤں کو ملا رکھا تھا۔ اور مطمئن تھی کہ اس کا لڑکا عبداللہ باپ کے بعد تخت نشین ہو گا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ جس کو یہ خواجہ سرا پسند کریں گے اس کو قوم بھی پسند کرے گی یا نہیں؟ اس میں شبہ تھا کہ قوم ایسا کرے گی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عبداللہ اخلاقی کمزوریوں میں بہت بڑھا ہوا تھا۔ پابند شرع ہونے میں بھی اس کی نسبت بدگمانی تھی اور لوگ بھی بالعموم اسے ناپسند کرتے تھے، خواجہ سرا ابوالمفرح کو جو بڑا دیندار شخص تھا اور بیت اللہ کا حج بھی کر آیا تھا۔ عبداللہ کے تمام عیوب معلوم تھے وہ حاضرین سے کہنے لگا ابھی جس کی نسبت آپ نے رائے دی کیا وہ آپ سب لوگوں کی رائے ہے۔ حاضرین نے جواب دیا! "ہاں سب کی رائے ہے" تب ابوالمفرح نے کہا "اگر ایسا ہے۔ تو میری بھی یہی رائے ہے۔ کیونکہ آپ کی طرح سلطانہ طروب کا شکر گزار رہنا میرا بھی فرض ہے۔ بلکہ ان کے احسانات مجھ پر آپ لوگوں سے بھی زائد ہیں۔ لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ جس پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اگر عبداللہ امیر ہو گیا تو ہمارے اختیارات اسپین سے یک لخت اٹھ جائیں گے۔ اور جس وقت یہاں کے گلی کوچوں میں ہم نکلیں گے۔ تو لوگ یہ کہہ کر گالیاں دیں گے کہ ان خواجہ سراؤں پر خدا کی لعنت ہو، انتخاب جانشینی کے لیے بہتر سے بہتر شہزادے کے ہوتے ہوئے انھوں نے بدتر سے بدتر آدمی کا انتخاب کیا۔ اس قسم کی ملامتیں ہونگی جو ہم کو سننی پڑیں گی آپ عبداللہ کو بھی جانتے ہیں اور اس کے ملنے والوں سے بھی واقف ہیں اگر اُسے تخت مل گیا تو وہ کونسی مضر باتیں ہیں جن کا اندیشہ مسلمانوں کو نہیں ہو سکتا۔ دین کو الگ خطرہ درپیش ہو گا یاد رکھو کہ اس انتخاب پر لوگوں ہی کے سامنے نہیں، بلکہ خدا کے سامنے بھی تم سب کو جواب دینا ہو گا۔"

ابوالمفرح نے یہ کل باتیں سچ کہیں تھیں اور خواجہ سراؤں پر اُنکا بے حد اثر ہوا اور اُنھوں نے

ابوالمفرج سے کہا "تو پھر آپ کہیں کہ آپ کس کو تخت پر بٹھانا پسند کرتے ہیں؟" جواب ملا کہ "محمد بن عبدالرحمٰن جو پرہیزگار ہے اور اس کے حسنِ اخلاق میں کسی کو کلام نہیں۔" اس پر خواجہ سرا بولے "یہ سب کچھ درست ہے مگر وہ سخت مزاج اور بخیل ہے۔" ابوالمفرج نے جواب دیا "تم اس کو بخیل کہتے ہو جب کسی کے پاس کچھ ہو ہی نہیں تو فیاضی اور سخاوت کہاں سے دکھائے گا۔ البتہ اگر بادشاہ ہو گیا اور شاہی خزانہ اس کے قبضے میں ہوا۔ تو ہمارے احسان بڑی داد و دہش سے اتارے گا۔ اس ذرا شبہ نہ کرو۔"

ابوالمفرج کی صلاح سب نے مان لی اور قرآن پر قسم کھائی کہ محمد بن عبدالرحمٰن کو بادشاہ تسلیم کریں گے۔ ان میں دو بڑے خواجہ سرا سعدون اور قاسم تھے۔ یہ دونوں ملکہ طروب کو خوش رکھنے کے لیے عبداللہ کے بڑے حامیوں میں تھے۔ اب ان کو یہ فکر ہوئی کہ کسی طرح محمد بن ۲۹۶
عبدالرحمٰن کو ابھی سے اپنے اوپر مہربان بنائیں۔ قاسم نے کہا کہ "آپ لوگ محمد بن عبدالرحمٰن سے میری سفارش کریں" اس کا سب نے اقرار کیا۔ اور سعدون کو اس کام پر مقرر کیا کہ وہ خود محمد بن عبدالرحمٰن کو امیر مرحوم کی جگہ تخت نشینی کا مژدہ سنائے

ابھی رات باقی تھی شہر قرطبہ کے دروازے بند اور مقفل تھے۔ محمد بن عبدالرحمٰن کا محل وادیٔ الکبیر کے اس پار تھا۔ اس لیے سعدون نے باب القنطرہ اور پل والے دروازۂ شہر کی کنجیاں ساتھ لیں لیکن قصر امارت سے باب القنطرہ تک پہنچنے میں عبداللہ کا محل بیچ میں آتا تھا۔ جس میں سے گذرنا ضروری تھا۔ یہاں رت جگا ہو رہا تھا، سب لوگ رنگ رلیوں میں مصروف تھے سعدون جب اس محل میں آیا تو کسی کو شبہ نہ گذرا اور وہ محل سے نکلتا ہوا باب القنطرہ پر آیا، دروازہ کھول کر پل اترا اور محمد بن عبدالرحمٰن کے محل میں پہنچ گیا۔ محمد بن عبدالرحمٰن خواب سے بیدار ہو کر حمام میں تھا۔ وہیں اطلاع ہوئی کہ سعدون حاضر ہوا ہے۔ اور کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔ محمد بن عبدالرحمٰن حمام سے فارغ ہو کر کپڑے پہن کر باہر آیا۔ اور سعدون کو حاضر ہونے کی اجازت دی جب سعدون سامنے آیا تو اس سے پوچھا کہ آج اس قدر سویرے کیسے آنا ہوا۔ سعدون نے جواب دیا کہ "میں اطلاع دینے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جنت نصیب کرے اور محل کے خواجہ سراؤں نے آپ کو تخت نشینی کے لیے

منتخب کیا ہے، اور یہ آپ کے والد مرحوم کی خاتم ہے"

محمد بن عبدالرحمٰن کو سعدون کی بات کا یقین نہ آیا، وہ سمجھا کہ اس کا بھائی عبداللہ تخت پر بیٹھ گیا ہے اور اُس نے اب سعدون کو میرے قتل کے لیے بھیجا ہے، اس پر اسے فوراً اپنی جان بچانے کا خیال آیا، اور وہ سعدون سے کہنے لگا" اگر تمہارے دل میں خوفِ خدا ہے تو میری جان سے درگذر کرو، میں جانتا ہوں کہ تم میرے پرانے دشمن ہو، کیا اِس وقت میرا خون بہانے آئے ہو؟ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میرا یہاں نہ رہنا ضروری ہو تو میں اسپین سے نکل جاؤں گا ملکِ خدا تنگ نیست، اور اس طرح زندگی بسر کرونگا کہ بھائی کو میری طرف سے کسی قسم کی بدگمانی نہ ہو سکے گی۔"

سعدون نے بڑی مشکل سے شہزادے کو یقین دلایا کہ جو خبر اس نے سنائی ہے، وہ بالکل سچ ہے، جب سعدون نے بہت سی قسمیں کھائیں تو محمد بن عبدالرحمٰن کو اس کی بات کا یقین آگیا، اب سعدون نے عرض کیا کہ "حضور کو تعجب ہوا ہوگا کہ اس مژدہ کو سنانے کے لیے لوگوں نے مجھے کیوں تجویز کیا، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ میں نے خود اپنے دوستوں سے درخواست کی کہ اس خوشخبری کا قاصد مجھے بنایا جائے تاکہ حضور میرے پچھلے قصوروں کو معاف فرما دیں"

محمد بن عبدالرحمٰن نے سن کر کہا "میں نے معاف کیا، اور اسی طرح خدا بھی تمہیں معاف کرے" پھر یہ کہا کہ "میں اپنے معتمد خاص محمد بن موسیٰ کو بلاتا ہوں، تاکہ ہم دونوں مل کر کچھ مشورہ کریں"

حالتِ موجودہ میں محمد بن عبدالرحمٰن کے لیے سب سے بڑی بات یہ تھی کہ باپ کے قصر پر کسی طرح قبضہ کرلے، کیونکہ اگر قصرِ امارت پر قبضہ ہو گیا تو پھر عبداللہ کی اتنی ہمت نہیں ہو سکتی کہ تخت کے بارے میں وہ کوئی نزاع پیدا کرے، پھر سب لوگ محمد بن عبدالرحمٰن کو امیر اندلس تسلیم کرلیں گے، لیکن دشواری یہ تھی کہ قصرِ امارت تک پہنچنے میں عبداللہ کا محل بیچ میں پڑتا تھا اس کے محل سے اس طرح گذرنا کہ کسی کو شبہ نہ ہو کیونکر ممکن تھا؟ اگر دربانوں کو معلوم ہو گیا کہ کون جارہا ہے تو اصلی بات کو تاڑ جائیں گے اور قصرِ امارت تک اسے پہنچنے نہ دیں گے ۲۹۴

غرض یہ باتیں تھیں جن کے متعلق محمد بن عبدالرحمٰن نے اپنے معتمد ابن موسیٰ سے مشورہ کیا۔ ابن موسیٰ نے صلاح دی کہ اس معاملہ میں قاضی یوسف ابن باصل سے مدد لینی چاہیے کیونکہ اُسکے

تحت ہیں اس وقت تین سو آدمی ہیں۔

محمد بن عبد الرحمٰن نے یہ صلاح مان لی، لیکن جب یوسف کو اصلی غرض معلوم ہوئی تو اس نے اس معاملہ میں کسی کا طرف دار بننا گوارا نہ کیا اور اپنے ماتحت لوگوں کو محمد بن عبد الرحمٰن کی مدد پر نہیں بھیجا، اور یہ کہلا بھیجا کہ میں تخت نشینی کی بحث سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا ہم سب حضور کے موالی ہیں اطاعت اسی کی کریں گے جو قصر شاہی کا مالک ہوگا،

ابن موسیٰ نے یوسف کے پاس سے واپس آکر محمد بن عبد الرحمٰن کو اس کا جواب سنایا، اور کہا کہ "حضور! جب سب کچھ جیتنا ہے تو کچھ ہارنا بھی چاہیے، میری صلاح تو یہ ہے اور لیے سنیے حضور کو معلوم ہے کہ امیر جنت آشیان اپنی پوتی یعنی آپ کی صاحبزادی کو اکثر قصر میں بلایا کرتے تھے اور میں شہزادی کے ہمراہ ہوتا تھا، اگر اس وقت حضور عورتوں کا لباس پہن لیں تو آپ کو آپ کی صاحبزادی سمجھ کر عبداللہ کے محل سے گذرنے دیں گے، اور اس طرح اگر خدا کی مدد شامل حال رہی تو ہم قصر امارت تک پہنچ جائیں گے۔

غرض یہی تدبیر اختیار کی گئی، تینوں شخص گھوڑوں پر سوار ہوئے سعدون سب سے آگے ہوا، بیچ میں محمد بن عبد الرحمٰن اور سب سے پیچھے ابن موسیٰ، محمد بن عبد الرحمٰن عورتوں کا لباس پہنے ہوئے تھے اور منہ پر ایک بھاری نقاب ڈال رکھی تھی، جس وقت عبداللہ کے محل کے قریب پہنچے تو اندر سے گانے بجانے کی آوازیں سنائی دیں، محمد بن عبد الرحمٰن نے اس وقت ایک شعر کسی پرانے شاعر کا پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"خدا کرے کہ ہم اپنی کوشش میں ایسے ہی کامیاب ہوں جیسے تم اپنے دل کی امنگوں میں اس وقت خوش ہو"

محل کے دروازے پر بالا خانے میں دربان بیٹھے شرابیں پی رہے تھے، جب سواروں کو دروازے کی طرف آتے دیکھا تو ان میں سے ایک دروازہ کھولنے نیچے اترا، اور سعدون کی طرف للکار کر بولا "کون ہے؟" سعدون نے کہا "احمق دیکھتا نہیں، چپ رہ، خاتون کا ادب کر" دربان کو کچھ شبہ نہ رہا اور اس نے فوراً دروازہ کھول دیا، اور اب یہ تینوں سوار عبداللہ کے محل میں داخل ہوئے، دربان دروازہ بند کر کے پھر بالا خانے پر چلا گیا اور وہاں جا کر کہنے لگا کہ "شہزادہ محمد کی لڑکی کی سواری گئی ہے، سعدون اور شہزادی کے

باپ کا وزیر ابن موسیٰ سواری کیساتھ ہے

یہ سمجھ کر کہ سب سے مشکل مرحلہ طے ہوگیا محمد بن عبدالرحمٰن نے ابن موسیٰ سے کہا "تم یہیں رہو، میں جلد تمہارے لیے مدد بھیجتا ہوں، اور پھر اس بات کی احتیاط رکھنا کہ قصر سے باہر کوئی نہ نکلنے پائے"۔

اب محمد بن عبدالرحمٰن صرف سعدون کو ساتھ لیے ہوئے آگے بڑھا، سعدون نے قصر کے دروازے پر دستک دی، یہی قصر ہے جس کے اندر امیر عبدالرحمٰن اس وقت مرے پڑے ہیں دربان نے دروازہ کھولا اور کہا "کیا یہ سواری شہزادہ محمد کی صاحبزادی کی ہے؟ سعدون نے کہا "بیشک" دربان نے کہا تعجب ہے میں نے شہزادی کو اس دروازے سے اکثر آتے جاتے دیکھا ہے، لیکن جو قد و قامت اس وقت دیکھ رہا ہوں اس سے ہمیشہ کم دیکھا ہے، سعدون! تم مجھے دھوکا دیتے ہو، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کوئی شخص جس کو میں نہ جانتا ہوں اس دروازہ سے قصر میں داخل نہیں ہو سکتا! شہزادی صاحبہ یا تو چہرہ سے نقاب اٹھائیں یا گھوڑے سے نیچے اتریں" سعدون نے کہا "تو شہزادی کی توہین کرتا ہے" دربان ز۹۸ نے جواب دیا "میں نہیں جانتا وہ کون ہیں تاوقتیکہ وہ اپنی صورت نہ دکھائیں گی، میں اندر نہ جانے دوں گا"۔

محمد بن عبدالرحمٰن نے جب دیکھا کہ دربان کسی طرح نہیں مانتا، تو اپنے چہرہ سے نقاب اٹھا کر کہا "دیکھ میں ہوں محمد بن عبدالرحمٰن، اور اس لیے آیا ہوں کہ میرے باپ کا انتقال ہو گیا ہے" یہ سن کر دربان نے کہا "تو جو کچھ میرا خیال تھا معاملہ اس سے بڑھ کر اہم ہے لیکن حضور قصر میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مجھے تحقیق نہ ہو جائے کہ امیر زندہ ہیں یا گذر گئے" اتنا سنکر سعدون نے دربان سے کہا کہ "اچھا آؤ، میرے ساتھ چلو تاکہ تم کو ہماری بات کا یقین آئے۔

دربان نے سعدون کو اندر بلا کر دروازہ بند کر دیا، محمد بن عبدالرحمٰن باہر کھڑا رہا، قصر میں سعدون دربان کو اس کمرہ میں لے گیا، جہاں امیر مردہ پڑے تھے، دربان بادشاہ کی لاش دیکھ کر رونے لگا، اور سعدون سے کہا کہ "آپ نے جو کچھ کہا تھا سچ تھا، اب جو حکم

ہو بجا لائیں۔"

دربان نے جلد آکر دروازہ کھولا اور محمد بن عبدالرحمن کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا "شہزادہ والاجاہ! اندر تشریف لائیے خدا حضور کا اقبال بڑھائے اور آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو فلاح ہو۔"

اسناد:

یولوجیوس — Mem Sanct Doc Mart., Epp

الفارو — Epp Vit Eulog

ابن القیوطیہ ص ۳۲-۳۳

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مسلم

نویں فصل

امیر محمد بن عبدالرحمٰن کا دورِ حکومت

امیر محمد تنگ خیال، سرد مہر، اور خود غرض آدمی تھا، باپ کے مرنے کا اسے رنج نہ ہوا، (۲۹۹)
بلکہ خوش ہوا، اور اس خوشی کو پوشیدہ رکھنے کی بھی زحمت نہ اٹھائی، ایک دن باغ رصافہ سے
جو قرطبہ کے قریب بڑی تفریح کا مقام تھا[1] دن بھر تفریح کرنے کے بعد وزیر ہاشم کے ساتھ
گھوڑے پر سوار قصرِ امارت کو آرہا تھا، شراب کا کچھ کچھ سرور باقی تھا، بادشاہ اور وزیر میں اِدھر
اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں ہاشم کی طبیعت کچھ افسردہ سی ہوئی اور وہ کہنے لگا
"اے ابن الخلفاء! دنیا کیسی اچھی جگہ ہوتی اگر موت اس میں نہ ہوتی" امیر نے کہا
"واہ کیسی نامعقول بات کہی ہے، اگر موت نہ ہوتی تو آج میں صاحب تخت کیونکر ہوتا؟
موت تو بڑی اچھی چیز ہے، میرا بزرگ مرگیا اور آج میں اس کے تخت پر ہوں"
محمد بن عبدالرحمٰن کے انتخاب کے وقت خواجہ سراؤں نے جو یہ اعتراض کیا تھا کہ وہ

---

[1] اسی نام کا ایک باغ "دمشق" کے قریب بھی تھا۔

بخیل ہے تو یہ اعتراض غلط نہ تھا، مسندِ امارت پر بیٹھتے ہی عہدہ داروں اور اہل فوج کی تنخواہیں کم کرنی شروع کیں، پھر اپنے باپ کے وقت کے وزیروں کو برطرف کر کے اُن کی جگہ نوجوان اور ناتجربہ کار لوگوں کو اس شرط سے جگہ دی کہ جس قدر آمدنی اوپر کی ہو اُس میں ایک حصہ امیر کا بھی ہوگا، جو صرفِ خاص کی آمدنی میں جمع ہوتا رہے گا، تمام مالی معاملات میں خود بڑی سختی اور موشگافی سے دخل دیتا تھا، حساب کی جانچ میں سخت گیر اتنا تھا کہ ایک لاکھ اشرفیوں کا بھی حساب ہو تو ایک ایک درہم پر خزانے کے محرروں سے حجت کرتا تھا، اُس کے بخل سے سب لوگ ناراض و بیزار تھے، فقہاء البتہ اُس کا ساتھ دیتے تھے، کیونکہ وہ عیسائی شہیدوں کی اس حرکت پر کہ مسجد میں جاکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انھوں نے بے ادبی کی تھی، نہایت برہم تھے، امیر محمد کو وہ پکا مسلمان اور عیسائیوں کا دشمن جانتے تھے اور جو توقعات اُن کو امیر سے تھیں اُن کو امیر نے جلد پورا بھی کر دیا، یعنی جس دن تخت پر بیٹھا اسی دن تمام عیسائی عہدہ داروں اور فوج کے عیسائی جوانوں کو برطرف کر دیا، صرف قومس کو موقوف نہیں کیا، کیونکہ اُس کی نسبت معلوم تھا کہ عیسائی مذہب کی اُسے مطلق پروا نہیں ہے اور اس کی عقل و دانائی بھی قابلِ قدر چیزیں ہیں، امیر محمد کے بزرگوں نے جو مذہبی رواداری رکھتے تھے اِس بات کا خیال نہیں کیا تھا کہ عیسائیوں نے اپنے پرانے گرجاؤں میں کس طرح وسعت پیدا کر لی ہے اور باوجود ممانعت کے کس طرح نئے گرجا بناتے چلے گئے ہیں، لیکن امیر محمد نے جو شرائط ابتداءً ہوئی تھیں انکی پابندی کرنی چاہی اور حکم دیا کہ زمانہ فتح سے لے کر اب تک جس قدر نئے گرجا عیسائیوں نے بنا لیے ہیں وہ ڈھا دیے جائیں. وزراء نے بادشاہ کو خوش کرنے اور دربار میں اپنا رسوخ بڑھانے کے لیے اس حکم کی حکم سے بھی بڑھ کر تعمیل کی اور انہی گرجاؤں کو نہیں ڈھایا جو تین سو برس سے قائم تھے بلکہ عیسائیوں کی ذات پر بھی سخت ظلم شروع کر دیے، نتیجہ اُس کا یہ ہوا (بشرطیکہ ہم یولوجیوس اور الوارو کی تحریر کو باور کریں) کہ بہت سے عیسائیوں نے بلکہ جس قدر عیسائی آباد تھے اُن میں سے اکثر نے عیسائی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا، قومس نے اس کی مثال سب سے پہلے پیش کی عبداللہ بن اُمیہ کی بیماری کے زمانہ میں ایک مدت سے قومس قاضی القضاۃ کی جگہ پر قائم مقامی کر رہا تھا

حبیب عبداللہ بن امیہ کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ کہا کرتا تھا کہ اگر قومس آج کو مسلمان ہوتا تو میں اس کو قاضی القضاۃ کے عہدے پر مستقل کر دیتا، امیر کا یہ کہنا قومس نے بھی سن لیا اور وہ مسلمان ہو کر قاضی القضاۃ ہوگیا[1]، جس زمانہ میں وہ عیسائی تھا کبھی گرجا میں جا کر نماز نہ پڑھتا تھا لیکن جس دن سے مسلمان ہوا اُس وقت سے مذہب کے تمام فریضوں کو اس درجہ پابندی اوقات سے ادا کرنے لگا کہ لوگ اس کو بڑا عابد و پرہیزگار مسلمان سمجھنے لگے، اور اس کو حمامۃ المسجد (مسجد کا کبوتر) کا خطاب دیا۔

امیر محمد کی مذہبی نارواداری کے نتائج طلیطلہ میں کچھ اور ہی شکل میں نظر آئے تین چار برس پہلے حبیب یولوجیوس نبرہ کے سفر سے واپس ہونے لگا تھا تو کچھ دنوں طلیطلہ میں مقیم رہا تھا یہاں سطران طلیطلہ وسترمیر نے اُس کی بڑی خاطر و مدارات کی، اس امر کو باور کرنے کے لیے بخوبی شہادت موجود ہے کہ اس زمانۂ قیام میں یولوجیوس نے طلیطلہ کے عیسائیوں کو عربی حکومت کیخلاف خوب بھڑکایا، اور مبالغہ کے ساتھ قرطبہ کے عیسائیوں کی مصیبتوں کو اُن کے سامنے بیان کیا طلیطلہ کے عیسائی یولوجیوس کی بڑی عزت کرنے لگے، اور قرطبہ میں جن عیسائیوں نے شہادت حاصل کی تھی اُن کے واقعات کو یولوجیوس کی زبان سے بڑے شوق سے سُنتے، غرض جب طلیطلہ کے عیسائیوں کو معلوم ہوا کہ امیر محمد نے قرطبہ کے عیسائیوں پر تشدد کیا ہے تو انھوں نے طلیطلہ میں بغاوت کردی اور اپنا سردار ایک عیسائی کو جس کا نام سندولہ تھا مقرر کیا، ان عیسائی باغیوں نے اس خوف سے کہ طلیطلہ کے جن عیسائیوں کو ہم نے ضمانت میں دے رکھا ہے اور وہ سب اس وقت قرطبہ میں نظربند ہیں، کہیں وہ ہلاک نہ کر دیے جائیں طلیطلہ کے عرب حاکم کو گرفتار کر لیا اور امیر محمد کو کہلا بھیجا کہ اگر اپنے عرب حاکم کی خیر چاہتے ہو تو جن عیسائیوں کو ہم ضمانت میں دے چکے ہیں اُن کو ہمارے پاس واپس کر دو، امیر نے ان لوگوں کو واپس کر دیا اور طلیطلہ کے باغیوں نے عرب حاکم رہا کر دیا

---

[1] گومیز ڈمس نے مسلمان ہونے پر بھی اپنا عیسائی نام برقرار رکھا، لیکن اس کے لڑکے کا نام عمرو تھا، یہ بھی دارالوزارت میں ملازم تھا ۲۹۱ھ/۹۰۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔

اساس کے بعد اِن باغیوں نے اعلانِ جنگ کر دیا (۳۰

ان باغیوں کا خوف کچھ ایسا پیدا ہوا کہ قلعہ رباح میں جو شاہی فوج رہا کرتی تھی اس نے قلعہ چھوڑ دیا، کیونکہ اب وہ ایک غیر محفوظ مقام سمجھا جانے لگا تھا، طلیطلہ کے باغیوں نے حملہ کر کے قلعہ رباح کی دیواروں کو گرا دیا، لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد امیر محمد نے فوج روانہ کی جس نے دیواروں کو پھر تعمیر کر دیا (۲۳۹ھ/۸۵۳ء)

اب امیر محمد نے دو بڑے سرداروں کے تحت میں فوج طلیطلہ کی جانب روانہ کی، لیکن باغیوں نے یہ کیا کہ جبل مورینہ کی گھاٹیوں اور دروں میں سے گذر کر راستہ ہی میں شاہی فوج کا مقابلہ کیا، اور شہر اندوشر کے قریب اس فوج کو پسپا کر کے شاہی لشکر گاہ لوٹ لیا

اب طلیطلہ کے باغیوں کی ہمت بڑھی اور وہ خاص اندوشر کے شہر کی طرف بڑھے، بلکہ یہاں تک ارادہ کیا کہ قرطبہ پر چڑھائی کریں، امیر محمد نے خطرے کو سخت سمجھ کر بذات خود طلیطلہ پر چڑھائی کی (جون ۸۵۴ء مطابق محرم ۲۴۰ھ) باغیوں کے سردار سندولہ نے یہ خیال کر کے کہ اپنی فوج کم ہے مدد چاہی اردون نے فوراً ایک لشکر بنی ارزو کے رئیس گاتون کی سرکردگی میں سندولہ کی کمک پر بھیجا[1]

غرض طلیطلہ میں عیسائی فوجیں اس کثرت سے جمع ہوگئیں کہ امیر محمد کو شہر فتح کرنے کی اُمید نہ رہی، لیکن بالآخر وہ باغیوں کو سخت نقصان پہنچانے میں کامیاب ہوگیا، دریائے سلیط (وادیٔ سلیط) جن پہاڑوں میں سے ہو کر نکلا ہے، اُن کی پشت پر امیر نے اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ چھپا کر بٹھا دیا، اور خود تھوڑی سی فوج لے کر طلیطلہ کے شہر پر چڑھائی کی، اور فصیل شہر کے سامنے توپخانہ لگا دیا،

طلیطلہ کے باغیوں نے جب دیکھا کہ امیر کی فوج بہت قلیل ہے اور باوجود اس کے

---

[1] ابن عذاری نے لکھا ہے کہ اردون نے اپنے بھائی کی سرکردگی میں لشکر بھیجا، ابن خلدون نے بیان کیا ہے کہ بادشاہ نبرہ نے بھی کچھ فوج بھیجی تھی

اس نے شہر پر حملہ کی جرأت کی ہے تو انھیں بہت تعجب ہوا اور انھوں نے اپنے سپہ سالار گاتون کو صلاح دی کہ فصیل سے باہر نکل کر امیر کی فوج پر حملہ کر دے

گاتون کو ناموری کی ہوس تھی پس اس نے موقع کو غنیمت جان کر طلیطلہ والوں کو ساتھ لے اپنی پوری فوجی طاقت سے امیر کی فوج پر حملہ کیا، حملہ کرتے ہی امیر کی فوج پیچھے ہٹی، اس پر طلیطلہ والے یہ سمجھ کر کہ بھاگ گئے دشمن کی خوب خبر لیں گے، آگے بڑھے، اور اتنے آگے بڑھے کہ اس مقام پر پہنچ گئے جہاں امیر محمد نے پہاڑوں میں اپنی فوج کا ایک حصّہ چھپا کر بٹھا دیا تھا طلیطلہ اور لیون کی عیسائی فوجیں شاہی فوج کا زور شور سے تعاقب کر رہی تھیں کہ یکایک کیا دیکھتی ہیں کہ شاہی فوج نے اُن کو چاروں طرف سے گھیر لیا ہے،

اب امیر کی فوج نے طلیطلہ اور لیون کی فوجوں میں موت کا بازار گرم کیا اور ایسا قتل عام کیا کہ عیسائی فوجوں کا ایک متنفس بھی زندہ نہ چھوڑا، قرطبہ کے ایک شاعر نے اس واقعہ کو اس طرح اشعار میں بیان کیا ہے کہ:۔

ابن ہیوس نے موسیٰ سے کہا، میں موت کو دیکھ رہا ہوں کہ ہر طرف ہے، آگے ہے اور پیچھے ہے اور نیچے ہے ۔ ۔ ۔ وادی سلیط کی چیلیں ان غلاموں اور نامختونوں کے گردہوں پر روتی ہیں اور ان کے رونے کی آوازیں پہاڑوں میں بار بار گونجتی ہیں۔"

وحشی فاتحوں نے آٹھ ہزار باغیوں کی لاشوں سے اُن کے سر قلم کر کے ان کی ڈھیریاں چنیں اور ان ڈھیریوں پر سے اِدھر سے اُدھر کود کود کر خوشی سے اتنے نعرے لگائے کہ چاروں طرف شور پیدا ہو گیا،

اس کے بعد امیر محمد نے اِن سروں کو قرطبہ اور شہروں کو روانہ کیا تاکہ وہ شہر کی دیواروں پر نصب کر دیے جائیں، اور بہت سے سر افریقہ کے شہزادوں کے پاس بطور تحفہ کے روانہ کیے (۳۰۲)

اس فتح سے مطمئن ہو کر اور یہ خیال کر کے کہ طلیطلہ والے (جو اپنے ۲۰ ہزار آدمیوں کا اس معرکہ میں قتل ہونا بیان کرتے تھے) اب زیادہ نہ ستائیں گے، امیر محمد دار الحکومت کو واپس آیا مگر اس کا بندوبست کرتا گیا کہ اگر طلیطلہ کے لوگ پھر سر اُٹھائیں تو حاکم قلعہ رباح اور حاکم طلبیرہ اور خود امیر کا فرزند منذر باری باری سے اُن کی گوشمالی کرتے رہیں۔

قرطبہ پہنچ کر امیر محمد نے وہاں کے عیسائیوں پر تشدد کیا، تبانوس کی عیسائی خانقاہ کو منہدم کرا دیا اس کام میں امیر محمد نے کچھ بے انصافی نہیں کی، کیونکہ یہ خانقاہ عیسائیوں کے تعصب کا مولد ومسکن بنی ہوئی تھی، عیسائیوں سے جو محصول لیے جاتے تھے ان کی تحصیل کا ٹھیکہ غیروں کو دیا ان لوگوں نے محصول کی رقم عیسائیوں پر بڑھا دی۔

باوجود ان سزاؤں کے متعصب عیسائیوں کا جوش وخروش کم نہ ہوا، ادھر مسیحی شہید دیدہ ودانستہ جلاد کے سامنے اپنی گردنیں پیش کرتے رہے، اُدھر الوارد اور یولوجیوس ان شہیدوں کی حمایت اور اُنکے کاموں کی ستائش پر کمربستہ رہے، دونوں نے ایک ایک کتاب عیسائی شہیدوں کی تعریف وتوصیف میں لکھی، اس قسم کی اشتعال انگیز تصانیف کی قرطبہ میں ضرورت بھی تھی کیونکہ یہاں کے عیسائی عافیت پسند اور اپنی حالت پر قانع تھے، اور جو کچھ تکلیفیں ان پر گزرتی تھیں اُن کو "متعصبین" کی حرکتوں کا باعث سمجھتے تھے، امیر اندلس کی کسی مذہبی ناروا داری کا سبب نہیں سمجھتے تھے، البتہ طلیطلہ اور اس کے قرب وجوار کے شہروں میں جو عیسائی رہتے تھے اُن کو "متعصبین" اور بالخصوص یولوجیوس سے اس قدر ہمدردی تھی کہ جب وسترمیر مطران طلیطلہ کا انتقال ہو گیا تو صوبے کے اساقفہ نے یولوجیوس کو بہ اتفاق رائے مطران کی خالی جگہ پر منتخب کر لیا، لیکن امیر محمد نے یولوجیوس کو طلیطلہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی، گو اساقفہ اپنے انتخاب پر اصرار کرتے رہے اور یہ سمجھ کر کہ امیر کا حکم کبھی نہ کبھی منسوخ ہو جائے گا، انھوں نے ممانعت کر دی کہ جب تک یولوجیوس زندہ ہے اس وقت تک دوسرا مطران منتخب نہ کیا جائے۔

قرطبہ کے عیسائی جس وقت "متعصبین" کی رائے پر اعتراض کرتے تھے، تو جواب میں یہ لوگ اُن تعریفوں کا حوالہ دیتے تھے جو طلیطلہ کے عیسائیوں کی جانب سے انکی ہوا کرتی تھیں تھوڑے دنوں کے بعد اُنھوں نے دو فرانسیسی راہبوں کو بھی سند میں پیش کیا جنھوں نے "متعصبین" کے کاموں کو اچھا بتایا تھا اور صاف صاف بیان کیا تھا کہ قرطبہ میں جو عیسائی مسلمانوں کے ہاتھوں شہید ہوئے ہیں وہ درجہ میں اُن پرانے شہیدوں کے برابر ہیں جو عیسائیت کے ابتدائی دور میں روما کے بت پرستوں کے شہید ہوئے ہیں۔

یہ دونوں فرانسیسی راہب جن کا نام اُسوارو اور اودل اردتھا پیرس کے قریب
سان ژرمان کے دیر سے متعلق تھے، قرطبہ میں وہ ۲۴۴ھ ۸۵۸ء میں پہنچے تھے، اُن کے رئیس
دیر ہلدوان نے اُنہیں بلنسیہ اس غرض سے روانہ کیا تھا کہ دنسنٹ (ونجنٹ) شہید کی ہڈیاں
اسپین سے لے کر فرانس میں آئیں، لیکن رستہ ہی میں معلوم ہوا کہ ونسنٹ شہید کی ہڈیاں اٹلی
کے شہر بلنی دنتو کو روانہ ہو چکی ہیں، سفر تو شروع کر ہی چکے تھے اب اِن راہبوں کو یہ ڈر ہوا (۳۰۳)
کہ کہیں خالی ہاتھ وطن کو واپس نہ جانا پڑے، اسی حال میں خبر سنی کہ تھوڑا عرصہ ہوا قرطبہ میں بہت سے
عیسائی شہید ہوئے ہیں، اب شوق ہوا کہ سینٹ ونسنٹ کی ہڈیاں نہ سہی دوسرے ہی
شہیدوں کی ہڈیاں مل جائیں تو غنیمت ہے، لوگوں نے بھی کہا کہ گو قرطبہ تک سفر کرنا بہت
مشکل ہے، لیکن اگر یہ مرحلہ طے کر لیا تو پھر تبرکات کا ملنا یقینی امر ہے۔

اس زمانہ میں اسپین میں سفر کرنا درحقیقت دشوار اور خطرناک کام تھا، بلکہ بعض صورتوں
میں قطعی ناممکن تھا، کیونکہ قزاق برابر رستہ لوٹتے رہتے تھے، سفر کا طریقہ یہ تھا کہ جب بہت سے
لوگ جمع ہو جاتے تو کارواں بنا کر کوچ کیا کرتے، لیکن وقت پر کسی مسافر کو ایسے کاروان کا مل
جانا بالکل اتفاقیہ امر ہوتا تھا۔

بہرکیف یہ دونوں راہب اس بات پر آمادہ ہو کر کہ جس طرح بھی ہو شہیدوں کے تبرکات
حاصل کیے جائیں سفر کے تمام خطرے جھیلنے کو تیار ہو گئے، جب سرقسطہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ
اخیر کارواں جو یہاں سے قرطبہ گیا تھا اس کو اب آٹھواں برس ہے مگر قسمت کے اچھے تھے اتفاق
سے اُن کو اتنا انتظار نہ کرنا پڑا، اور جلد ایک کارواں مل گیا جو قرطبہ جا رہا تھا، دونوں راہب
اس کارواں کے ساتھ ہو لیے، سرقسطہ کے عیسائیوں کو یقین تھا کہ پہاڑوں میں یہ کل قافلہ
قتل ہو جائے گا، اس لیے وہ رخصت ہوتے وقت مل کر اس طرح روئے جیسے کوئی کسی کے

لہ شہیدوں کی لاشیں، ان کی ہڈیوں کا چھچھ یا ہڈیاں، بال، ناخن، کھوپڑی، یا کوئی شے
جو شہید سے زندگی میں متعلق رہی ہو سب تبرکات میں شمار ہوتی تھیں اور عیسائی سمجھتے تھے کہ ان
سے برابر کرامات ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ (مترجم)

مرتے پڑتا ہو، مگر ان کا یہ خوف فضول نکلا، راہبوں کو سفر کی صعوبتوں کے بعد یہ راحت نصیب ہوئی کہ وہ منزلِ مقصود یعنی مسلمانوں کے دار الحکومت قرطبہ تک بخیر و عافیت پہنچ گئے، یہاں سان کپرین کے گرجا کے شماس نے اُن کو مہمان کر کے بڑی خاطر و مدارات کی

اب راہبوں کو تبرکات کی تلاش ہوئی، مگر ایک مدت تک کچھ کامیابی نہ ہوئی، آخر کار ایک بڑے عیسائی رئیس نے جس کا نام لیوی جلد، او رعرف ایدلیسو لیمیس (عبد السلام) تھا اور جو ان راہبوں کے کام سے بہت دلچسپی رکھتا تھا، اس بات کی کوشش کی کہ پینالا ریا رجبال العسل[1] کی مسیحی خانقاہ سے اُن کو شہید اوروئیوس، اور جرُرج کی لاشیں جو اُسی خانقاہ میں دفن تھیں دستیاب ہو جائیں، لیکن جو راہب اس خانقاہ میں رہتے تھے انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی، حالانکہ اسقف قرطبہ سادل نے اجازت دیدی تھی کہ لاشیں دیدی جائیں، آخر کار سادل خود آیا اور وہ لاشیں فرانسیسی راہبوں کو دے دی گئیں، گو خانقاہ والے یہی کہتے رہے کہ اسقف کو ایسے قیمتی تبرکات سے اُن کو محروم کر دینے کا کوئی حق نہ تھا۔

قرطبہ میں تقریباً دو مہینے تک قیام کرنے کے بعد جب یہ فرانسیسی راہب اُسوارد اور اودول آردا اپنے وطن کو جانے لگے، تو اُن کے ساتھ ایک بڑا بھاری گٹھڑ بھی تھا اس گٹھڑ پر اُسقفِ قرطبہ کی مہر لگی تھی، اور بادشاہِ فرانس چارلس بالد کا پتہ اس پر لکھا ہوا تھا، یہ اس غرض سے تھا کہ مسلمان سمجھیں کہ اس گٹھڑ میں بادشاہ فرانس کے لیے تحائف جا رہے ہوں گے حالانکہ اس میں اوروئیوس اور جرُرج شہیدوں کی لاشیں تھیں[2]

واپسی میں ان راہبوں کا سفر زیادہ دشوار ثابت نہ ہوا، کیونکہ اسی زمانہ میں امیر محمد طلیطلہ (۳۰۴) پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہونے کو تھا، قرطبہ کی فوج کے علاوہ تمام افواج کو حکم ملا تھا کہ اس مہم

---

[1] جس پہاڑ پر یہ خانقاہ تھی اس پر مکھیوں کے بہت سے چھتے تھے، اسی وجہ سے اس کا یہ نام پڑ گیا تھا ان شہیدوں کو خانقاہ میں دفن ہوئے چھ برس ہوئے تھے

[2] اوروئیوس کے سر کا پتہ نہ چلا تھا، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اس کی بیوی کی قبر سے سر نکال کر اور وئیوس کی ہڈیوں میں رکھدیا گیا۔

پر روانہ ہوئی اس لیے یہ راہب بہت آسانی سے اسی مہم کی ایک فوج کیساتھ ہو لیے لشکر میں لیوی جبلہ بھی موجود تھا، طلیطلہ پہنچ کر لیوی جلمان فرانسیسی راہبوں کو شہر میں لے گیا، طلیطلہ سے قلعۃ النہر تک راستہ بے خطر تھا، کیونکہ راستہ میں جتنے قلعے اور قریے آتے تھے اُن کے مالک جرہ رہزن و قزاق بھی تھے اور مسافروں کو خوب لوٹا کرتے تھے، سب جان کے خوف سے اپنے اپنے مقام چھوڑ کر طلیطلہ کے شہر میں چلے گئے تھے، کیونکہ اُس کے گرد بہت مضبوط فصیل تھی، اس اثنا میں فرانس میں ویرسان ژرمان کو نارمن لوگوں نے جلا دیا تھا، اور وہاں کے راہب اسی دیر سے متعلق ایک گاؤں میں جس کا نام اسمنت تھا چلے گئے تھے، جب یہ دونوں راہب فرانس پہنچے تو اسمنت کے گاؤں میں انھوں نے شہیدوں کی لاشیں گٹھڑ سے نکالیں، راستے بھر عجیب وغریب کرامات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ان لاشوں سے ظہور میں آتا رہا تھا، کچھ دنوں کے بعد موضع اسمنت سے لاشیں دیرسان ژرمان کو منتقل کر دی گئیں، جو پیرس کے قریب تھا، اب پیرس کے باخدا عیسائیوں کی زیارت کے لیے یہ لاشیں بطور تبرکات کے دکھائی گئیں اور بادشاہ فرانس چارلس کو انکے متعلق اس درجہ دلچسپی پیدا ہوئی کہ اس نے ایک شخص کو جس کا نام مانیکو تھا، خاص اس غرض سے قرطبہ بھیجا کہ شہید اور وکیوس اور شہید جرج کے حالات جسقدر صحیح صحیح دریافت ہو سکیں اُنھیں معلوم کر کے فوراً اطلاع دے۔

طلیطلہ کیخلاف جو مہم روانہ کی گئی تھی، اور جس کی بدولت فرانسیسی راہبوں کو اپنے وطن واپس جانے کا موقع مل گیا تھا، اس کا نتیجہ امیر محمد کی مرضی کے مطابق نکلا، امیر نے ایک مرتبہ پھر طلیطلہ کے دشمنوں کو ایک حربی حیلے سے مغلوب کیا، دریائے تاجہ کے پل پر پہلے اپنی فوج کو کھڑا کیا اور کچھ لوگوں کو حکم دیا کہ نیچے جا کر پل کے پائے کاٹ دیں، طلیطلہ والے اس حال سے بے خبر رہے، جب پل کے پائے قریب قریب کٹ لیے، تو شاہی فوج کو جو پل پر کھڑی تھی، حکم ہوا کہ وہاں سے ہٹ جائے۔

فوج کے ہٹتے ہی طلیطلہ کے باغی سمجھے کہ شاہی فوج بھاگی ہے، فوراً اُس کے تعاقب میں پل پر چلے آئے، جونہی پل پر پہنچے وہ ایک دم سے گرا، اور طلیطلہ کے سپاہی دریائے تاجہ میں کثرت سے ڈوب کر مر گئے،

طلیطلہ کے لوگوں میں اس واقعہ سے جس قدر رنج والم ہوا، اسی قدر امیر کے دربار میں اس پر خوشیاں منائی گئیں، یہاں امیر کی ذرا سی بھی کامیابی بہت مبالغہ سے بیان کیجاتی تھی، دربار کے ایک شاعر نے اس مضمون کے اشعار پڑھے[1]؎

خدا کو منظور نہ ہوا کہ جس پل پر کفار کی فوج کھڑی ہے وہ سلامت رہے، طلیطلہ اپنے
باشندوں سے محروم ہوجانے پر غمگین ہے اور ایسا اجاڑ معلوم ہوتا ہے جیسے گورستان"

اس مہم کے سر ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد امیر محمد کو اپنے پرانے دشمن یولوجیوس کو قتل کرنے کا موقع مل گیا، اور یہ اس طرح پیش آیا

اسی زمانہ میں قرطبہ میں ایک نوجوان لڑکی جس کا نام لکریتیا تھا، رہا کرتی تھی، اس کے ماں باپ مسلمان تھے، لیکن ایک رشتہ دار عورت نے جو راہبہ تھی اس لڑکی کو خفیہ طور پر عیسائی کرلیا، چنانچہ ایک دن لڑکی نے اپنے ماں باپ سے صاف صاف کہدیا کہ اس کو اصطباغ مل چکا ہے، ماں باپ یہ خبر سن کر بحد ناراض ہوئے اور چاہا کہ لڑکی کو پھر مسلمان کرلیں، جب وہ نہ مانی تو انھوں نے اُسے مارنا شروع کیا، اس پر بھی اثر نہ ہوا، جب رات دن مار پڑنے لگی تو کچھ تو مار کے خوف سے، اور کچھ خیال سے کہ کہیں قاضی تک نوبت پہنچے، اور اس کے سامنے مرتد ثابت کی جائے، اس لڑکی نے یولوجیوس اور اس کی بہن انولا سے اپنا حال کہہ کر پناہ چاہی، یولوجیوس کو شاید اس وقت فلورا یاد آگئی ہوگی، کیونکہ لکریتیا کی بہت سی باتیں اس سے ملتی تھیں۔

غرض یولوجیوس نے اس لڑکی کو بہت کچھ اطمینان دلایا، اور کہا کہ ہم تمہارے پوشیدہ رہنے کا انتظام اُسی دن کردیں گے جس دن تم اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل بھاگوگی،

چنانچہ ایک دن بڑی ترکیب سے لکریتیا گھر سے بھاگی، وہ ترکیب یہ تھی کہ ماں باپ کے سامنے ظاہر کیا کہ عیسائی مذہب اور ترک دنیا کا خیال اب اس نے چھوڑ دیا ہے، جب والدین کے دل کو یہ سنکر تسلی ہوگئی، تو ایک دن اُس نے خوب اچھے اچھے کپڑے پہنے اور یہ کہتی ہوئی کہ ایک عزیزہ کی شادی میں جاتی ہوں، گھر سے نکلی اور سیدھی یولوجیوس اور

[1] اس شاعر کا نام "عباس ابن مرناس" تھا (مقری کتاب اول ص ۱۰۱)

انولا کے پاس پہنچی۔ انھوں نے لکریتیا کو اپنے اُن دوستوں کا مکان بتا دیا، جہاں اس لڑکی کے رہنے کا انھوں نے پہلے سے بندوبست کر رکھا ہے۔

ماں باپ نے سرکاری سپاہیوں کو ساتھ لیکر ہر جگہ لڑکی کو ڈھونڈا مگر کہیں پتہ نہ چلا اس کے بعد ایک عجیب موقع پیش آیا لکریتیا کو یولوجیوس کی بہن انولا سے بہت محبت ہوگئی تھی ایک دفعہ اس نے پورا دن اسی راہبہ کیساتھ گذارا، جس نوکر کیساتھ آئی تھی اُس سے کہدیا کہ رات ہوتے ہی پھر آجائے تاکہ اسکے ہمراہ واپس چلی جائے، مگر وہ نوکر نہ آیا، جب رات بہت ہوگئی تو لکریتیا نے کہا کہ اب رات اور کل سارا دن رہ کر شام کو چلی جاؤنگی، اکیلی اس لیے نہ گئی کہ راستہ میں لوگ پہچان لیں گے، لیکن یہ تاخیر اس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی صبح ہوتے ہی کسی جاسوس یا دغاباز علیسائی نے قاضی کو خبر کردی کہ جس لڑکی کی تلاش ہے وہ اس وقت یولوجیوس کی بہن کے پاس ہے، قاضی نے فوراً اس کی گرفتاری کا حکم دیا، چنانچہ لڑکی جس مکان میں ٹھیری ہوئی تھی اُسے گھیر لیا، اور لکریتیا کیساتھ یولوجیوس بھی جو اس وقت مکان میں موجود تھا گرفتار ہوگیا۔

جب قاضی نے یولوجیوس سے پوچھا کہ تم نے لڑکی کو اپنے گھر میں کیوں چھپا یا تھا؟ تو اس نے جواب دیا "ہم کو حکم ہے کہ جو لوگ ہمارے پاس ہدایت کے لیے آئیں ان کے سامنے اپنے مذہب کا وعظ کہیں، اور اپنے دین کی انھیں تعلیم دیں، اس لڑکی نے چاہا کہ میں اُسے مسیحی دین کی تعلیم دوں، میں نے اس کی درخواست کے مطابق جہاں تک ہو سکا مسیحی دین کی تعلیم دی اور یہ تعلیم اسی طرح دی کہ اگر آپ بھی ہدایت حاصل کرنے کی مجھ سے درخواست کریں تو میں آپ کو بھی اسی طرح مذہب کی تعلیم دوں"۔

اس طرح یولوجیوس نے ایک مسلمان کو علیسائی بنانے کا جرم تسلیم کرلیا، مگر اس جرم کی سزا موت نہ تھی، اس لیے قاضی نے تازیانے کی سزا تجویز کی،

یولوجیوس نے قاضی کا حکم سنتے ہی اپنے دل کا ارادہ مضبوط کر لیا، اس ارادے کی وجہ ہمت اتنی نہ تھی جتنا غرور تھا، یولوجیوس نے فیصلہ کر لیا کہ تازیانے کی بے عزت کرنے والی سزا برداشت کرنے سے ہزار درجہ بہتر ہوگا کہ جن اُصول کا عمر بھر سے پابند چلا آتا ہے۔ اُن کی

تصدیق اپنی جان سے کرے، چنانچہ اُس نے فوراً قاضی سے پکار کر کہا " قاضی، اپنی تلوار تیز کر، میری روح کو اس کے خالق کے پاس روانہ کر، اور اس خیال میں نہ رہ کہ میں کوڑوں سے (۳۰۶)
اپنی پیٹھ کی کھال اُڑواؤنگا۔"

اتنا کہہ کر اب اس پادری نے مسلمانوں کے پیغمبر کی نسبت نہایت سخت بے ادبی کے الفاظ کی بوچھاڑ کر دی، وہ سمجھتا تھا کہ اِس دشنام دہی کے بعد وہ فوراً قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن قاضی نے اس خیال سے اس کا لحاظ کیا کہ وہ تمام مُلک اسپین کے عیسائیوں کا مطران منتخب ہو چکا ہے، ایسی صورت میں اُسے سزائے قتل دینے کی ذمہ داری قاضی نے اپنے اوپر نہ لینی چاہی اور یولوجیوس کو قصرِ امارت میں بھیجدیا کہ وزرائے سلطنت اس کے بارے میں جو کچھ حکم سنانا ہو سنائیں۔

جس وقت یولوجیوس ایوان وزارت میں آیا تو ایک معزز عہدہ دار جو یولوجیوس کو خوب جانتا تھا، اور اس وقت اُس کی جان بچانی چاہتا تھا، قریب آیا اور کہنے لگا:

"یولوجیوس! مجھے تعجب ہے تو اِس بات کا ہے کہ دیوانے اور فاترالعقل تو بے شک بے سمجھے بُوجھے جلاد کے سامنے اپنی گردن رکھ دیتے ہیں، لیکن یہ کیا بھید ہے کہ تم جیسا عالم وفاضل جس کی عزت سب کی نظروں میں ہے وہ بھی انہی دیوانوں اور فاترالعقل لوگوں کی نقل اتارے؟ آخر یہ کیا جنون تم پر سوار ہوا ہے؟ کیوں اپنی جان کے خود درپے ہوتے ہو؟ میں بہت عاجزی اور منت سے کہتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر غور کرو، ضرورت کے سامنے سر خم کر دو، اور قاضی کے پاس جا کر صرف اتنا کہدو کہ میں اپنے کہے سے توبہ کرتا ہوں، پھر میں اور میرے ساتھی جو کچھ ہو گا وہ دیکھ لیں گے، تم کو پھر کسی بات کا خوف نہ رہیگا۔"

اس عہدہ دار کی تقریر نے مہذب اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کے خیالات کی ہو بہو ترجمانی کی تھی، ان مسلمانوں کو متعصب عیسائیوں سے اتنی نفرت نہ تھی جس قدر کہ اُن پر رحم آتا تھا، انہیں افسوس تھا کہ قانون مجبور کرتا ہے ورنہ وہ ایسے لوگوں کو جنھیں وہ "مجنون" سمجھتے تھے قتل نہ کرتے۔

یولوجیوس کے دل میں شاید اس وقت وہ شوقِ شہادت موجود نہ تھا جو اُس نے اپنے

متحد و شاگردوں کے دل میں پیدا کیا تھا اور جنہوں نے اسی شوق میں اپنی جانیں دی تھی کیونکہ دراصل یولوجیوس ایسے عیسائیوں کا سرگروہ تھا جو مسلمانوں کے مقابلہ میں قوت اور اختیارات حاصل کرنا چاہتے تھے، محض مذہبی تعصب رکھنے والوں کا وہ سرغنہ نہ تھا شاید حالتِ موجودہ میں اس کے دل میں خیال گذرا ہو کہ مسلمان فی الواقع ایسے وحشی اور ظالم نہیں ہیں۔ جیسا کہ ان کی نسبت اس نے فرض کر رکھا تھا لیکن اسکے ساتھ ہی وہ سمجھتا تھا کہ اگر اپنے کیے سے وہ پھرا، اور توبہ کر لی تو اس کے ساتھی اس کو واقعی نہایت ہی ذلیل اور کمینہ سمجھیں گے، پس اس نے وزیروں کے سوالوں کا جواب وہی دیا جو دوسرے عیسائیوں نے ایسے موقعوں پر دیا تھا، وزیروں نے بہت تامل اور تذبذب کے بعد اسکی نسبت سزائے موت کا حکم سنایا اور اسے فوراً مقتل کی جانب روانہ کر دیا۔

مقتل میں پہنچکر یولوجیوس نے بہت ہی صبر و استقلال ظاہر کیا، ایک خواجہ سرا نے اسی حالت میں اس کے ایک گلے پر تماچہ مارا یولوجیوس نے انجیل کے حکم کے مطابق یہ کہکر کہ "اس گلے پر بھی تماچہ مارو" دوسرا گلہ سامنے کر دیا، خواجہ سرا نے دوسرا تماچہ مارا، اس کے بعد نہایت ہمت اور مضبوطی کے ساتھ یولوجیوس چبوترے پر چڑھا، دونوں گھٹنے زمین پہ ٹیک کر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے اور نشانِ صلیب بنایا، پھر ایک مختصر دعا پڑھ کر جلاد کے سامنے گردن جھکا دی (۱۱؍ مارچ سنہ ۸۵۹ء مطابق ۲؍ ذی الحجہ سنہ ۲۴۴ھ) اس قتل (۳۰۷) کے چار دن بعد لگہ بینا پر ارتداد کا جرم ثابت ہوگیا اور وہ بھی قتل کر دی گئی۔

یولوجیوس کے قتل نے جو ملک کے تمام عیسائیوں کا مطران منتخب ہو چکا تھا، ہر طرف ایک کہرام مچوا دیا۔ یہ کہرام نہ صرف قرطبہ میں برپا ہوا جہاں اس شہید کی کرامات اس کے مرتے ہی بکثرت ظاہر ہونی شروع ہوگئی تھیں، بلکہ تمام ملک کے عیسائی رنج والم میں ڈوب گئے۔ شمالی اضلاع ملک کی تاریخی کتابوں میں درآنحالیکہ قرطبہ کی شہادتوں کا ان میں مطلق ذکر نہیں ہے۔ مگر یولوجیوس کی شہادت بقیدِ تاریخ ضرور بیان کی گئی ہے۔ اس واقعہ کے چوبیس برس بعد جس وقت لیون کے عیسائی بادشاہ الفونسو اور امیر محمد کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تو اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ یولوجیوس شہید اور

لکہ بتیا شہیدہ کی ہڈیاں بادشاہ یسون کو دیدی جائے گی۔

،،متعصبین،، قرطبہ کا سردار گو اب زندہ نہ تھا۔ مگر پھر بھی متعصب عیسائی قتل ہونے کی غرض سے مسلمانوں کے پیغمبرؐ کو دشنام دیتے رہے لیکن زمانے کے مٹانے اور محو کرنے والے اثرات نے اپنا کام لیا، اور عیسائیوں کا یہ عجیب و غریب تعصب جو قرطبہ میں برسوں، جاری رہا تھا۔ اس قانونِ مطلق دکل کے سامنے سرنگوں ہوگیا جو تمام عالم پر حاوی ہے اور کچھ زمانہ گذرنے کے بعد شہادت کا یہ جنون ایک قصہ پارینہ ہوگیا۔

اب ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے، اجبالِ ریّہ کے اسپینی نومسلم اور عیسائی ایک بغاوت شروع کرتے ہیں۔ یہ بغاوت ایسی تھی کہ اس کے ساتھ سے تمام جزیرہ نمائے اسپین میں سرکشی عام ہوگئی،، اور قرطبہ کے عیسائیوں کو موقع ملا کہ پہلے مسلمانوں کے پیغمبرؐ کو گالیاں دیتے تھے اب محمد امیر قرطبہ کو گالیاں دیں۔

اسناد :-

ابنِ عذاری، جلد ۲ ص ۹۶ - ۹۹، ۱۰۹، ۱۱۴ - ۱۱۵
یولوجیوس Mem Sanct ii.16: iii-1-3, 5, 10-11-&c i Epist P330
ابن القوطیہ، ص ۷۹
الوار Vit Eulog c. 10-16
سمس Sams ii.c. 9
خوشانی، ص ۲۹۳
عریب، جلد ۲ ص ۱۵۳
نویری، ص ۶۳ ۴
ابن خلدون، ص ۹

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مسلم

دسویں فصل

رنّیہ کے پہاڑی باشندے

۱۰ آجکل کا سیاح جو قرطبہ سے مالقہ کا سفر اختیار کرتا ہے، اس شوق میں کہ ایک نہایت خوبصورت گو خطرناک ملک دیکھنے میں آتے گا، اس کا کچھ خیال نہیں کرتا کہ دشوار و ناہموار رستوں میں گاڑی کے جھٹکے اور ہچکولے، گھوڑوں کی سست رفتاری اور سفر کی خستہ حالی کیا درجہ کرے گی، جب قرطبہ سے چلتا ہے تو وادی شنیل تک اس کو ایسی زمین ملتی ہے جو اونچی نیچی تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن ہر طرف لہلہاتی کھیتیاں اور ہرے بھرے کھیت نظر آتے ہیں، جب دریائے شنیل سے اتر لیتا ہے تو شہر کمپیلوس رقبل تک سطح زمین ملتی ہے اس ہموار قطعہ سے نکل کر وہ رندہ اور مالقہ کے پہاڑوں میں داخل ہوتا ہے، اور یہ سب سے زیادہ خوشنما حصہ اس ملک کا ہے، یہاں جگہ جگہ پہاڑیاں اور پہاڑ بلند اور خوبصورت خدا کی قدرت کا عجیب نمونہ نظر آتے ہیں، شاہ بلوط اور کاک کے سرسبز جنگلوں نے پہاڑوں کے دامن ڈھک رکھے ہیں ندیاں نالے گہرے اور تاریک جا بجا ملتے ہیں اور ان کا پانی اپنی گذر گاہوں میں اونچے،

اونچے چٹانوں سے نشیب میں اس زور شور سے گرتا ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی جا بجا پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر ویران قلعے اور شکستہ برج نظر آتے ہیں کہیں کہیں پہاڑوں کی ڈھلانوں پر چھوٹے چھوٹے گاؤں آباد ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں بالکل بے برگ وبار ہیں۔ جا بجا پہاڑوں کے بعض حصے بالکل سیاہ یا خاکستری رنگ کے ہیں جن کو دیکھکر خیال ہوتا ہے کہ ہزارہا برس تک بجلیوں نے گر گر ان کو جلا دیا ہے، باقی حصوں کو دیکھتے تو معلوم ہوتا ہے کہ پھولوں میں پڑے ہنس رہے ہیں، جگہ جگہ تاکستان اور باغات ہیں، جو بادام، انجیر، زرشک اور انار کے درختوں سے پٹے پڑے ہیں، چپے چپے پر نہریں سیب اور ناشپاتی کے باغوں میں سے ہوتی ہوئی چاروں طرف کی زمین کو شاداب رکھتی ہیں کھیت ہر جانب دکھائی دیتے ہیں، جن میں سن اور جوٹ کے علاوہ ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا ہے اور یہ غلہ ایسا ہوتا ہے۔ جس کے آٹے کی روٹی ایسی اجلی اور نفیس تیار ہوتی ہے کہ وہ تمام دنیا میں مشہور ہے۔

اس کوہستان کے باشندے، خندہ جبیں، بشاش، خوش بیں، اور زندہ دل لوگ ہیں، گانے اور ہنسنے پر جان دیتے ہیں، مجرے کی آواز پر ناچ ناچ کر دل خوش کیا کرتے ہیں مگر باوجود اس کے مغرور اور بات بات پر لڑنے والے ہیں۔ خود سَر ہیں مگر اس کے ساتھ بہادر بھی ہیں، مزاج کے ایسے تند و تیز ہیں کہ جہاں کسی کی ٹیڑھی نظر دیکھی فوراً خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا، کوئی میلا ایسا نہیں ہوتا جس میں دو چار کا خون نہ ہوتا ہو، عورتیں انکی نہایت حسین ہوتی ہیں مگر طبیعت میں مردانہ پن رکھتی ہیں، ورزش، قامت، مضبوط اور تندرست ہوتی ہیں کیسی ہی محنت و مشقت کا کام ہو۔ ہمت نہیں ہارتیں، بھاری بھاری بوجھ آسانی سے اٹھا لیتی ہیں اور آپس میں کشتیاں بھی خوب لڑتی ہیں۔

امن کے زمانہ میں ان پہاڑی لوگوں کا اکثر یہ شغل رہتا ہے کہ تجارت کا انگریزی مال بغیر چنگی کا محصول ادا کئے چور طارق سے ملک کے اندرونی حصوں میں پہنچا دیں چنگی کے افسر اور اہل کار بہتیری نگرانی کرتے ہیں مگر ان سب کی آنکھوں میں خاک ڈالنی انہیں خوب آگئی ہے بعض وقت اپنا ایک بڑا گروہ بنا کر اور اس کا ایک سردار مقرر کر کے پہاڑوں سے اتر کر دیس میں اپنا مال بیچنے آتے ہیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اگر حکومت نے کوئی فوج بھیجی ہے تو اس کا

خوب مقابلہ کیا ہے، یہ حال تو امن کے زمانہ میں رہتا ہے۔ بدامنی یا خانہ جنگی کے زمانہ میں انمیں سے اکثر رہزنی اختیار کرتے ہیں۔ رہزنوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک لدرون اور دوسرے راتیبر وں میں زیادہ تر چرواہے، دیہات کے بیکار لوگ سست اہل حرفہ فصل کے کاٹنے والے پریشان گرد مزدور یا سرائے والے جن کی سرائیں مسافروں سے خالی ہوتی ہیں یا چھوٹے چھوٹے زمیندار شامل ہوتے ہیں، یہ لوگ رہزنی پیشہ کے طور پر نہیں کرتے۔ البتہ اگر کوئی مسافر بغیر محافظ کے مل جاتا ہے تو جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے سب رکھوا لیتے ہیں، اگر محافظ ساتھ ہوئے تو اپنی فرابیں کہیں جھاڑی میں چھپا کر پھاوڑا کدال ہاتھ میں لے لیتے ہیں۔ تاکہ کھیت میں کام کرنے والے معلوم ہوں، یہ راتیبر د ہر جگہ نظر آتے ہیں، یہ کم درجے کے رہزن ہیں اور جدھر اپنا فائدہ دیکھتے ہیں ادھر ہی ہو جاتے ہیں، کبھی قزاقوں کی مدد کرتے ہیں کبھی پولیس کی، تاکہ قزاق گرفتار ہوں، غرض بڑی ہوشیاری سے جس کی جیت دیکھتے ہیں اسی کا ساتھ دیتے ہیں۔

لدرون لوگ جو پورے قزاق ہیں، فوجی قواعد کی پابندی کے ساتھ گھوڑوں پر سوار کمپنیاں بنا کر نکلتے ہیں اور راتیبر وں سے وجاہت اور شان میں بہت بڑھے ہوتے ہیں راتیبرد جسے لوٹتے ہیں۔ الزام سے بچنے کے لیے اُسے مار بھی ڈالتے ہیں، لیکن لدرون، اس وقت تک کسی کو جان سے نہیں مارتے جب تک وہ ان سے لڑتے نہیں، یہ درجہ اعلیٰ کے قزاق شائستہ اور خلیق ہوتے ہیں اور بہت ہی خلق کے ساتھ مسافروں کے کپڑے اتروا لیتے ہیں، عام لوگوں کو ان سے نفرت نہیں ہے بلکہ ایک طرح پر ان کی عزت کرتے ہیں۔

لدرون قانون کو ہیچ سمجھ کر اس کے مقابلہ پر آتے ہیں۔ سوسائٹی کو آزار پہنچانا ان کا کام ہے جن اضلاع سے کچھ وصول کرنا چاہتے ہیں وہاں کے لوگوں پر اپنا ڈر بٹھا کر جو چاہتے ہیں ان سے لے لیتے ہیں، لیکن باوجود اس کے وہ لوگوں میں ایک طرح کی وقعت رکھتے ہیں ان کی آوارہ گرد زندگی، شجاعت و انسانیت کا اثر عورتوں کے دل پر خواہ ان قزاقوں کا خوف ان پر کیسا ہی غالب ہو، بہت ہوتا ہے جب یہ لوگ عدالت کی گرفت میں آ کر پھانسی پر چڑھائے جاتے ہیں تو ان سے لوگوں کو ہمدردی ہوتی ہے، اور ان کی حالت پر رحم آتا ہے زمانہ حال میں جوسی ماریا نامی ایک شخص نے ان قزاقوں کی سرگروہی میں بڑی شہرت حاصل کی تھی، اس

مشہور قزاق کا نام اندلوسیہ کے باشندوں میں مدت تک زندہ رہیگا یہ محض اتفاق تھا کہ اس کو قزاقی کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک مرتبہ اس نے غصہ میں آکر ایک آدمی کو قتل کر دیا اور قتل کے بعد گرفتاری سے بچنے کیلئے پہاڑوں میں بھاگ گیا یہاں سوائے اپنی قزاقوں کے اور کوئی ذریعہ معاش اس کے پاس نہ تھا اس لیئے بہت سے ساتھی جمع کیئے اور ان کیلئے کسی طرح گھوڑے بھی بہم پہنچائے اور اب اس گروہ کو ساتھ لیئے باقاعدہ طور پر راستوں کو لوٹنے لگا بہادر، چالاک اور ذہین تھا، اور ملک کے چپے چپے سے واقف تھا اسلیئے رہزنی میں ہمیشہ کامیاب رہا حکومت کی طرف سے اس کی گرفتاری کی جتنی کوششیں ہوئیں سب کو بیکار ثابت کر دیا۔ تمام ملک میں اس کے خفیہ دوست موجود تھے جنہوں نے اس کا ہمیشہ ساتھ دینے پر قسم کھا رکھی تھی، جب اس کے گروہ کا کوئی آدمی کم ہو جاتا تھا تو چالیس چالیس امیدوار موجود ہو جاتے تھے۔ جن میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ میں اس خالی جگہ کے لیئے منتخب کر لیا جاؤں اسکی ماتحتی میں قزاقی کرنے کو لوگ عزت کا پیشہ سمجھتے تھے یہ مجسٹریٹوں سے بھی سازباز رکھتا تھا چنانچہ جب کیپٹن جنرل نے اس کی گرفتاری کا اشتہار جاری کیا تو اشتہار میں یہ بھی بیان کیا کہ چار ضلعے ایسے ہیں جہاں کے مجسٹریٹ اس کے مددگار ہیں۔

جوسی ماریا کے اختیارات اس قدر بڑھے ہوئے تھے کہ جنوبی اسپین کی تمام بڑی بڑی سڑکوں پر درحقیقت اسی کی حکومت تھی، محکمہ برید کا افسر اعلیٰ ڈاک کے صحیح سلامت گذرنے کیلئے فی گاڑی اسّی فرلانگ سالانہ اس قزاق کو ادا کیا کرتا تھا، یہ اپنے ماتحت قزاقوں پر اس درجہ مطلق العنانی سے حکومت کرتا تھا کہ کبھی بادشاہ کو بھی رعایا پر اس طرح حکومت کرنی نصیب نہ ہوئی ہوگی مقدمات میں اس کے فیصلے بالکل انصاف پر مبنی ہوتے تھے۔

یہ قزاق، اور بلا محصول دیئے مال کے اٹھانے والے جنگی زندگی نہایت سخت اور دشوار حالات میں گذرتی تھی، لڑائی کے زمانہ میں ایک دشمن صعب کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے یہ سچ ہے کہ جہاں زیادہ اتحاد و یک جہتی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہوتی تھی وہاں یہ قزاق سرخ رو نہ ہوتے تھے اور یہ بھی درست ہے کہ کھلے میدان میں وہ باقاعدہ فوج کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ لیکن پہاڑوں کے ناہموار و تنگ راستوں میں زمین سے واقفیت اور نقل و حرکت میں

پھرتی ان کو ہر معرکہ میں کامیاب رکھتی تھی۔ پہاڑوں میں ان کی خوں ریزیوں کا تجربہ فرانسیسیوں کو اسوقت ہوا جبکہ نپولین نے اسپین کے تخت پر اپنی طرف سے ایک بادشاہ بٹھا کر یہ چاہا کہ یہ بادشاہ ان پہاڑیوں پر حکومت کرے اور اس کی مطیع ہوکر رہیں جب کھلے میدانوں میں یہ پہاڑی لوگ فرانسیسی سواروں کو مل گئے تو انہوں نے سینکڑوں کو قتل کر ڈالا۔ لیکن جب بلند پہاڑوں کے کنارے کنارے پیچیدہ ڈھنگ راستوں میں جہاں فرانسیسیوں کے گھوڑے اور بھی خدشے کی صورت پیدا کرتے تھے۔ ان لوگوں سے مقابلہ ہوا تو پھر قدم قدم پر یہ فرانسیسی سوار ان کا شکار ہو گئے، پہاڑیوں نے چٹانوں کی آڑ سے بندوقیں فیر کرکے ان میں تہلکہ ڈالدیا ایسے مقامات سے جہاں خیال تک نہ ہوتا تھا کہ دشمن چھپا ہوگا دفعتاً باہر آکر بندوقوں سے سب کچھ دھواں دھار کر دیتے تھے اور فیر کرتے ہی پہاڑوں پر چڑھ کر غائب ہو جاتے تھے

اس طرح فرانسیسی فوج کے دستے پہاڑوں میں ان لوگوں کے ہاتھوں غارت ہوگئے۔ مگر طبیعتیں ایسی بامذاق پائی تھیں کہ اس چاروں طرف کے خون اور خرابے میں بھی ظرافت سے باز نہ آتے تھے، فرانسیسی سوار اولیبرا کے گاؤں میں جب پہنچے تو گاؤں والوں سے شکار کا گوشت کھانے کو مانگا، گاؤں والوں نے جھٹ ایک گدھا کاٹ اور اس کا گوشت بھون بھلس ان کے سامنے رکھدیا، فوجیوں نے گوشت کھایا تو مگر بہت ہی بدمزہ معلوم ہوا جب پھر لڑائی شروع ہوئی تو یہ گاؤں والے سواروں پر فیر بھی کرتے جاتے تھے اور پوچھتے بھی جاتے تھے کہ "کہو" اولیبرا میں گدھے کا گوشت کس نے کھایا تھا؟ کسی عیسائی سے یہ کہنا کہ تو نے گدھے کا گوشت کھایا ہے ان پہاڑیوں میں اس کی سخت توہین سمجھی جاتی تھی۔

اسپین کے جس حصہ کا ذکر ہم نے اوپر لکھا ہے اس کو لوگ صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) (۳۱۱) میں عرب "ریہ" کہتے تھے اصل نام ریجیو[1] تھا، ارجذونہ اس وقت اس علاقہ کا صدر مقام تھا

---

[1] پیر ونرؔ نے یہ نام ریجیو ملاگیتانہ لکھا ہے۔ ابن خلدون اور بعض دیگر عربی مصنفین نے ریّہ کو ایک شہر سمجھا ہے اور مالقہ سے اسے خلط ملط کر دیا ہے، مالقہ صوبہ ریّہ کا دار الحکومت فیبقوط کے دور حکومت میں تھا اس کے بعد خلیفہ عبدالرحمن الناصر کے زمانہ میں مالقہ علاقہ ریّہ کا صدر مقام ہوا۔ ریّہ کی نسبت خیال ہے کہ اس نام کا ایک شہر بھی تھا۔ دیکھو جغرافیہ اندلس در ریّہ۔

لوگ جو اس علاقہ میں اس وقت آباد تھے تقریباً کل اسپین کے اصلی باشندے تھے اور ان کی عادتیں، خصلتیں، خوبیاں اور برائیاں بھی بعینہٖ وہی تھیں جو زمانہ حال کے باشندوں کی ہیں (جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا)۔

ربہ کے باشندوں میں اس وقت تھوڑے عیسائی تھے، باقی کل مسلمان تھے، مگر قوم کے وہ خالص اسپینی تھے، جنہوں نے اس خیال میں نشوونما پایا تھا کہ اپنے ملک والوں پر جو کوئی ظلم کرے اس سے جانی دشمنی رکھنی چاہیئے، چونکہ یہ لوگ آزادی کے عاشق زار تھے اس لیے دل میں ٹھان لیا تھا کہ غیر ملک والے جو ہم پر مسلط ہو کر مطلق العنانی سے حکومت کر رہے ہیں، اب ان کو خود نقصان میں رہ کر ملک کی دولت سے متمتع نہ ہونے دیں گے۔
چنانچہ وہ عربوں کی سلطنت اپنے ملک سے اٹھانے کیلئے موقع کے منتظر ہو گئے اور یہ بھی سمجھنے لگے کہ یہ موقع اب دور نہیں ہے، کیونکہ ربہ کے علاوہ اور علاقوں میں ملک والوں کو جو جو کامیابیاں عربی حکومت کے برخلاف روزانہ ہوتی رہتی تھیں، ان کو دیکھ دیکھ کر ان پر ثابت ہوتا جاتا تھا کہ اگر ہمت اور ثابت قدمی سے کام لیا تو ان کا مقصد بھی ایک دن پورا ہو جائے گا۔

طلیطلہ نے اس زمانے میں خود مختاری حاصل کر ہی لی تھی۔ امیر نے بیس۲۰ برس تک اس شہر کو مطیع کرنے کی کوشش کی مگر کچھ نہ ہوا، عیسائیوں کی اس شہر میں کثرت تھی اور انہوں نے اپنی حفاظت لیون کے عیسائی بادشاہ کے سپرد کر دی تھی۔ گو طلیطلہ کے نومسلموں نے طلیطلہ کے عیسائیوں کا ساتھ چھوڑ کر ان کو نقصان پہنچایا تھا لیکن ۲۶۰ھ ۸۷۳ء میں یہ نوبت آئی کہ امیر کو مجبور ہو کر ایک عہد نامہ اس مضمون کا لکھنا پڑا کہ جمہوری طرز سلطنت جو طلیطلہ والوں نے اختیار کر لیا ہے وہ برقرار رکھا جائے گا۔

غرض طلیطلہ کے عیسائیوں کو تقریباً ایک آزادانہ سیاسی زندگی حاصل ہو گئی مگر سالانہ خراج ان کو ادا کرنا پڑتا تھا۔

ایک دوسری خود مختار ریاست علاقہ اراگون [illegible] میں [illegible] اسحاق [illegible]
[illegible] قائم ہوئی (یہ ریاست اسلامی تھی، اسکے بانی بنو القسی تھے

بنی قسی فسیقوط کا ایک پرانا خاندان تھا جو کبھی پہلے عیسائی اور اب مدت سے مسلمان تھا نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) کے وسط میں یہ نومسلم خاندان اپنے ایک رکن موسیٰ ثانی[1] کی لیاقت سے ایسا صاحبِ اختیار ہو گیا کہ حکمراں خاندانوں کی برابری کرنے لگا۔ امیر محمد کے زمانے میں موسیٰ ثانی سرقسطہ، تطیلہ، وشقہ اور تمام علاقہ ارغون کا مالک ہو گیا طلیطلہ کے عیسائی موسیٰ سے دوستی رکھنے لگے اور لب بن موسیٰ طلیطلہ کے لشکر کا امیر ہو گیا تھا موسیٰ ثانی نے جو بڑا جواں مرد تھا۔ اور لڑائی سے تھکنا نہ جانتا تھا، کبھی برشلونہ کے عیسائی حاکم سے اور کبھی البہ کے عیسائی گورنر سے اور کبھی کونٹ قشتالیہ اور افرنجیوں سے لڑائیاں شروع کیں، جب موسیٰ کی قوت اوجِ کمال کو پہنچی اور قرب و جوار کی ریاستیں اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں حتیٰ کہ بادشاہِ فرانس چارلس بالڈ نے اس کو بیش بہا تحائف بھیجے تو موسیٰ نے ایسا شاہی دبدبہ پیدا کیا کہ کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہ کر سکتا تھا، اور اس قصد سے کہ جیسا اقتدار رکھتا ہے ویسا ہی اس کا خطاب بھی ہو۔ وہ اپنے کو اسپین کا تیسرا بادشاہ کہنے لگا ۲۴۸ھ/۸۶۲ء میں اس عجیب و غریب شخص کا انتقال ہو گیا[2] (۳۱۲)

یہ سچ ہے کہ موسیٰ کے مرنے پر امیر محمد نے سرقسطہ اور طلیطلہ پر اپنی حکومت قائم کر لی لیکن اس حکومت کو استقلال نہ ہوا، دس برس کے بعد موسیٰ کے لڑکے اٹھ کھڑے ہوئے ملک کے لوگوں نے ان کی مدد کی، کیونکہ بنی قسی کے سوا وہ کسی اور خاندان کی اطاعت کرنے کی عادت نہ رکھتے تھے، غرض ان سب نے مل کر امیر محمد کی فوج کو اپنے علاقے سے ہٹا دیا امیر محمد نے ان کو مطیع کرنے کی کوشش کی، لیکن انہوں نے لیون کے بادشاہ الفونسو سوم کی مدد سے امیر کے حملوں کا جواب دیا، الفونسو سوم اور بنو قسی سے مراسم اتحاد اتنے بڑھے کہ اس نے اپنے لڑکے اردون کو بنو قسی کے پاس تعلیم و تربیت پانے کے لیے بھیجا، یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بنی قسی

---

[1] یعنی موسیٰ بن موسیٰ بن فرتون۔

[2] موسیٰ کو اسی کے داماد ازراق نے جوشِ حسد میں مار ڈالا، ازراق وادی الحجارہ کا حاکم تھا (ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" مطبوعہ ۱۸۸۱ء جلد ۱ ص ۲۱۵)

مسلمان تھے اور چالیس برس تک ان کے خاندان سے لوگ امیر اندلس کی جانب سے ثغر الاعلیٰ کے حاکم مقرر ہوتے رہے۔ مترجم اردو)

پس اسپین کا شمالی حصہ امیر محمد کی حکومت سے آزاد اور اس کا دشمن تھا اسی زمانہ میں ماردہ کے ایک اسپینی نومسلم ابن مردان[1] نے اسپین کے مغرب میں ایک خودمختار ریاست قائم کی جس وقت اس شہر میں امیر محمد کے خلاف بغاوت ہوئی تو ابن مردان باغیوں کا سردار تھا امیر کی فوج نے جب اس بغاوت کو فرد کیا تو ابن مردان گرفتار ہوگیا۔ امیر نے اس کا قصور معاف کیا اور فوجِ محافظ میں اس کو سرداری کی جگہ دی، لیکن وزیر السلطنت ہاشم کو ابن مردان سے مخاصمت تھی چنانچہ ایک دن تمام وزیروں کے سامنے ابن مردان کو یہ کہکر کہ "مجھ سے تو کتا بھی بہتر ہے" اس کے منہ پر ایک تماچہ مارا (۲۶۲ھ / ۸۷۵ء)

ابن مردان نے اس توہین پر قسم کھائی کہ چاہے جان جاتی رہے مگر یہ ذلت پھر گوارا نہ کریگا۔ فوراً اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو جمع کیا اور قرطبہ سے بھاگ کر ماردہ کے جنوب میں قلعہ الحنش پر قبضہ کرلیا۔ شاہی فوج نے الحنش کا محاصرہ کیا ابن مردان اور اس کے ساتھیوں نے قلعہ کے دروازے اندر سے بند کرلئے تھوڑے دنوں کے بعد قلعے میں جسقدر کھانے کا سامان تھا وہ ختم ہوگیا، اور اب محصوروں کی یہ نوبت ہوئی کہ گھوڑوں کو مار مار کر کھانا شروع کیا۔ مگر جب تک پانی ختم نہ ہوا ابن مردان نے شاہی فوج سے صلح نہ کی یہ خیال کرکے کہ محصوروں کی حالت کس قدر ردی ہوگئی تھی، جس وقت اس صلح کی شرائط کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ابن مردان کے حق میں وہ مضر نہ تھیں، کیونکہ ان شرائط کی رو سے اسے اجازت ملی تھی کہ قلعہ الحنش کو چھوڑ کر بطلیوس کے شہر میں جا رہے۔ جس کے گرد شہر پناہ نہ تھی۔

غرض امیر کے پنجہ سے نکل کر ابن مردان پھر امیر کا ایک خطرناک دشمن ہوگیا جو گروہ باغیوں کا اس کے ساتھ تھا، اس کے علاوہ ایک دوسرا گروہ نومسلم باغیوں کا جن کا سردار سعدون تھا اس نے اپنے ساتھ لیا اور ماردہ اور دیگر مقامات کے نومسلموں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور ایک نئے مذہب کا

---

[1] یعنی عبدالرحمٰن ابن مردان ابن یونس

وعظ کہنا شروع کیا جس میں عیسائی مذہب اور اسلام کو غلط ملط کرنا چاہا۔

عیسائی بادشاہ لیون الفونسو سوم سے سازش کر کے جو اسلامی سلطنت کے باغیوں کا قدرتی دوست اور محسن تھا ابن مروان نے ہر طرف لوٹ مار شروع کی عرب اور بربر سے وہ
۳۱۳ خصوصیت کے ساتھ بدلہ نکالنا چاہتا تھا۔ اور یہ بدلہ ان بدسلوکیوں کا سمجھتا تھا جو عرب اور بربر نے خاص اسکی ذات اور اس کے ہمقوم اسپینی نومسلموں کے ساتھ کی تھیں۔

اس باغی کی قزاقیوں کا حال معلوم کر کے امیر محمد نے ایک فوج اپنے فرزند منذر اور وزیر السلطنت ہاشم کی سرکردگی میں اس کے مقابلے کیلئے روانہ کی ابن مروان اس فوج سے مقابلہ کیلئے آگے بڑھا، اور سعدون کو بادشاہ لیون سے کمک طلب کرنے کو بھیجا اور خود حصن کو کوئی Caracu... کے قریب اپنی فوج اتار دی اس قلعہ کے وسیع مگر شکستہ آثار اب تک بہت بڑے رقبہ میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، یہاں سے ہاشم کے ایک ماتحت سردار نے منت شلوط کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، تھوڑے عرصہ کے بعد شاہی فوج کے ایک سردار نے ہاشم کو خبر دی کہ سعدون بادشاہ لیون سے امدادی فوج لیکر منت سلوط کے قریب آن پہنچا ہے لیکن یہ فوج تعداد میں اتنی کم ہے کہ آسانی سے مغلوب ہو سکتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سردار کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ سعدون کے ساتھ بڑی فوج تھی اور ہاشم کو دھوکا دینے کے لیے اس نے مشہور کر دیا تھا کہ اس کی فوج قلیل ہے یہ دھوکا چل گیا ہاشم تھوڑی سی فوج لے کر سعدون کے مقابلہ کو چل پڑا جب سعدون کو جاسوسوں نے خبر دی تو وہ فوراً فوجِ کمک کو ایک پہاڑ کے پیچھے لے گیا اور وہاں اسے چھپا کر بٹھا دیا جونہی ہاشم کی فوج ادھر سے گذری سعدون کی فوج کمینگاہ سے نکل کر ہاشم کی فوج پر ٹوٹ پڑی اور اسکو بہت نقصان پہنچایا، ہاشم اگرچہ زخموں سے چور ہو گیا لیکن جب تک شاہی فوج کے پچاس افسر اس کے گرد لڑتے لڑتے مر نہیں لیے دشمن اس کو گرفتار نہ کر سکا، گرفتار کرتے ہی اسکو ابن مروان

ل یہ قلعہ موجودہ شہر سوردا دربال ر ، اور المدد ردیل کیمپور کے درمیان واقع تھا۔

کے پاس لاتے، ہاشم ابن مردان کی سخت توہین کر چکا تھا اب وقت یہ تھا کہ ہاشم کی جان اس کے ہاتھ میں تھی مگر اس نے ہاشم سے کچھ نہ کہا۔ اس کی عزت اور مرتبہ کا خیال رکھا لیکن لیون کے عیسائی بادشاہ کے پاس اسے روانہ کر دیا۔

امیر محمد نے جب ہاشم کی گرفتاری کا حال سُنا تو سخت برہم ہوا اور افسوس کرنے لگا وزیروں میں جس وزیر کو سب سے زیادہ پسند کرتا تھا وہی عیسائی رئیس لیون کے ہاتھ میں قید ہو گیا اور سب سے زیادہ فکر یہ دامن گیر ہوا کہ بغیر زرِ فدیہ ادا کیے قیدی کی رہائی ممکن نہیں فدیے میں لیون کے بادشاہ نے ایک لاکھ اشرفیاں طلب کیں۔

امیر محمد کی طبیعت میں بخل بہت تھا اور یہ موقع اس کے لیئے سخت آزمائش کا ہو گیا اتنی بڑی رقم کو ادا نہ کرنے کے بہانے طرح طرح کے سوجھنے لگے " اگر ہاشم قید ہو گیا ہے تو یہ اسی کا قصور ہے کیوں ایسی حماقت کی؟ جو شخص بغیر پس و پیش سوچے کام کرے دوسرے کی نیک صلاح کو نہ مانے اس کا یہی درجہ ہونا چاہیئے "۔ آخر کار جب ہاشم کو قید میں پڑے دو برس ہو لیے تو امیر فدیہ کی رقم کا نصف حصہ ادا کرنے پر راضی ہو گیا باقی رقم کی بابت ۳۱۴
ہاشم نے خود اسے ادا کرنے کا وعدہ بادشاہ لیون سے کیا اور اس وعدہ کی ضمانت میں اپنے بھائیوں، بیٹوں اور بھتیجوں کو بطور یرغمال کے لیون میں چھوڑ کر خود اس نیت سے قرطبہ چلا آیا کہ ابن مردان سے انتقام لے۔

اس دو برس کے عرصہ میں ابن مردان نے اشبیلیہ اور لبلہ کے علاقوں کو خوب لوٹا تھا امیر محمد کو جب اس نومسلم باغی کا کوئی علاج نہ سوجھا، تو خود ہی اس سے دریافت کیا کہ آخر وہ کیا شرطیں ہیں جن کی منظوری کے بعد وہ اپنی قزاقیوں سے جو ملک کو ویران کیئے ڈالتی ہیں باز آ سکتا ہے۔ ابن مردان کے جواب میں غرور اور دھمکی دونوں باتیں موجود تھیں جواب دیا کہ " اگر بطلیوس کا شہر اسے دیدیا جائے اور اس کے گرد شہر پناہ بنانے کی اجازت ہو، خراج معاف کیا جائے اور کسی قسم کی اطاعت پر مجبور نہ کیا جائے تو وہ لوٹ مار سے پرہیز کرے گا۔ اور امیر محمد کے نام کا خطبہ مسجدوں میں پڑھوائے گا "۔ ان شرائط کے منظور کرنے میں اگرچہ امیر کی سبکی تھی۔ لیکن اس نے انہیں منظور کر لیا۔

ہاشم جب قید سے رہا ہو کر قرطبہ میں آیا تو اس نے امیر کو صلاح دی کہ ابن مروان کو اب مغلوب کر لینا ناممکن نہیں ہے، پہلے اس کا کوئی مستقل مقام نہ تھا، جب کبھی ہم اس کا تعاقب کرتے تھے تو وہ اپنے سواروں سمیت کہیں چھپ جایا کرتا تھا، لیکن اب وہ ایک شہر میں مستقل سکونت رکھتا ہے اس لیئے ہم اُس پر قابو پا سکتے ہیں اور اس کے شہر کا محاصرہ کر کے اُسے گرفتار کر سکتے ہیں، امیر نے ہاشم کی یہ اصلاح مان لی اور حکم دیا کہ ہاشم فوج لیکر ابن مروان پر حملہ کرے ہاشم فوراً فوج لے کر لبلہ پہنچا، ابن مروان نے یہ خبر سنتے ہی امیر محمد کو کہلا بھجوایا کہ ہاشم قرطبہ سے مغرب کی سمت میں فوج لیکر چڑھا ہے میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس کا قصد بطلیوس میں میرا محاصرہ کر کے مجھ سے انتقام لینے کا ہے لیکن قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر لبلہ سے ایک قدم بھی ہاشم نے آگے بڑھایا تو بطلیوس کے شہر کو مسمار کر کے پھر پہلا سا قتل و غارت شروع کر دونگا امیر محمد یہ پیغام سن کر ایسا گھبرایا کہ ہاشم کو مع اس کی فوج کے قرطبہ واپس بلا لیا۔ اور ابن مروان کو مغلوب کرنے کا خیال پھر نہ کیا۔

ادھر باغی شجاعت اور تدبیر میں اپنا کمال دکھا رہے تھے ادھر امیر محمد کی حکومت ضعف و بزدلی کا ثبوت دے رہی تھی، باغیوں کے ساتھ جس قدر رعایت کی جاتی تھی اور عہد نامے لکھ کر ان سے صلح کی جاتی تھی اسی قدر سلطنت کے رعب و داب میں فرق آتا تھا اور یہ چیز سلطنت کے حق میں نہایت مضر تھی کیونکہ محض رعب ہی وہ ذریعہ ہے جس سے ایک ایسی رعایا کے دل میں سلطنت کی عزت قائم رہ سکتی ہے جس میں فاتح کم اور مفتوح زیادہ ہوں اور مفتوح یا تو پورے طور پر مغلوب نہ ہوئے ہوں یا جو مغلوب ہوئے ہوں وہ دل میں حکومت سے ناراض رہتے ہوں۔

ریہ کے پہاڑی لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ ملک کے شمالی اور مغربی حصوں میں سلطنت کے برخلاف عیسائیوں اور نومسلموں کو خوب کامیابیاں ہوئی ہیں تو ان کی ہمت بڑھی سنہ ۲۶۶ھ میں بہت سی بغاوتیں اور فتنے ملک کے مختلف حصوں میں برپا ہونے شروع ہوئے (۸۷۹ء) سلطنت ان خطروں سے غافل نہ تھی، لیکن جب اصل کیفیت معلوم ہوئی (۳۱۵) تو حالت بہت تشویش کی ہوگئی اور جلدی میں سخت تدبیریں اختیار کی گئیں باغیوں کے ایک بڑے

گروہ کا سردار گرفتار ہو کر قرطبہ میں لایا گیا۔ ایسی بلندیوں پر جن کی حفاظت نہایت ضروری تھی قلعے تعمیر کیے گئے مگر باوجود ان تدبیروں کے ربّیہ کے پہاڑی عیسائیوں اور نومسلموں کی جنمیں نومسلموں کی تعداد بہت زیادہ تھی ہمت پست نہ ہوئی بلکہ پہلے سے بھی زیادہ آمادہ فساد ہو گئے مگر باوجود اس ہمت اور آمادگی کے ان میں متحد و متفق ہو کر کسی کام کو سرانجام دینے کی قابلیت کم تھی اور جس چیز کی کمی ان میں تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا لائق سردار نہ رکھتے تھے جو حصولِ آزادی کے لیے اس حریت پسند قوم کی مجموعی قوتوں کو ایک ہی طرف لگا دے اگر کوئی ایسا سردار پیدا ہونے والا تھا۔ تو اس کے محض ایک اشارہ کی ضرورت تھی کہ یہ لوگ ہتھیار اٹھا کر اس کے ساتھ ہو جاتیں۔

اسناد

سیباستیان (Sebastiani) ص ۲۶

نویری (رسّتہ ۲۵۹ ہجری)

ابن عذاری ج ۲ ص ۱۰۲ - ۱۰۶

ابن خلدون ص ۱۰

ابن القوطیہ ص ۳۷

ابن حیان ص ۱۱

کرونیکول البیلڈنسی Chronicon Albeldense c 62

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مسلم

گیارھویں فصل

عمر بن حفصون

(۳۱۶) جس زمانہ میں صوبہ ریہ کے پہاڑی لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کی تحریک پیدا ہوئی اُسی زمانہ میں مالقہ سے شمال مشرق میں حصن اوطی کے قریب ایک گاؤں میں ایک، زمیندار رہا کرتا تھا جس کا نام حفص تھا، یہ فسیقوط کی نسل سے ایک اچھے خاندان کا آدمی تھا اور اسی خاندان کے ایک شخص الفونسو نامی سے پانچویں پشت میں تھا[1]الفونسو کو کاؤنٹ کا خطاب حاصل تھا، لیکن جب ملک میں سیاسی اور مذہبی رد و بدل کا زمانہ آیا تو حفص کے دادا

---

[1] ابن خلدون کی تاریخ میں عمر کا نسب نامہ اسطرح بیان ہوا ہے۔ عمر بن حفصون بن عمر بن جعفر بن دبیان بن فرغلوش بن اذفونش القس (ابن خلدون، جلد رابع ص ۱۳۴) اسطرح اذفونش القس یعنی الفونسو سے عمر پانچویں پشت میں ہوا جعفر کے نام کے ساتھ "الاسلامی" کا لفظ ڈوزی نے لکھا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان میں پہلا شخص جو مسلمان ہوا وہ جعفر تھا۔ (مترجم اردو)

جعفر الاسلامی نے عیسائی مذہب سے بے پروائی یا غفلت کے باعث اسلام قبول کر لیا اور امیر حکم بن عبدالرحمن کا زمانہ تھا کہ وہ رندہ کی سکونت چھوڑ کر حصن اوطی کے قریب آن بسا جعفر کی اولاد اپنا تو بکی مسلمان معلوم ہوتی تھی لیکن دل میں وہ اپنے بزرگوں کے دین کی عزت کرتی تھی حفص نے محنت و کفایت شعاری سے بہت دولت جمع کر لی تھی اور اس کے کم مالدار ہمسایہ لوگ عزت کے خیال سے اُسے بجائے حفص کے حفصون کہنے لگے تھے اور ان دو حرفوں کے اضافے سے گویا اس کا نام شرافت کا ایک خطاب بن گیا تھا حفص کی امن و امان کی زندگی میں شاید کبھی کوئی چیز مخل نہ ہوتی۔ لیکن اس کا بیٹا عمر اُس کے قابو سے بالکل باہر ہو گیا تھا اور اس کو ہمیشہ پریشان رکھتا تھا۔ یہ لڑکا بیہودہ مغرور اور مفسد تھا، اور اندلسی طبیعت کا بُرے سے بُرا رخ اس کی باتوں سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ کسی کی ذرا سی بات سن کر یا ٹیڑھی نظر اور بدلے تیور دیکھتے ہی لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ لڑکو سڑک پر زخمی پڑا ہے۔ لوگوں نے دیکھا، اور اٹھا کر اس کے گھر پہنچا یا۔ اس کی شعلہ مزاجی سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یا تو ایک دن کسی کو جان سے ماریگا، یا خود مارا جائے گا۔ اور ہوا بھی یہی ایک روز ایک آدمی سے کسی معمولی سی بات پر الجھ کر لڑ پڑا اور اسے جان سے مار ڈالا، باپ یہ سمجھ کر کہ بیٹے کو کسی طرح پھانسی سے بچا لے گھر اور گاؤں چھوڑ کر جہاں پچھتر برس سے وہ اور اس کے بزرگ آباد رہے تھے رندہ کے پہاڑوں میں کوہِ بلبشتر کے نیچے ایک مکان میں رہنے لگا یہاں سوائے پہاڑوں اور جنگلوں کے کچھ تھا نہیں ابن حفصون اب گھر سے نکل کر گھاٹیوں اور جنگلوں میں غائب رہنے لگا اور رہزنوں کی صحبت میں رہ کر رہزن ہو گیا، یعنی جسے آج کل کی اصطلاح میں رائیسر دکھنا زیبا ہو گا ایک مرتبہ کسی جرم میں گرفتار ہو کر حاکم ضلع کے حکم سے تازیانے کی سزا پائی اس سزا کے بعد جب گھر آیا تو بڈھے باپ نے یہ خیال کر کے کہ اب یہ پکا بدمعاش اور قزاق ہو گیا ہے اُسے گھر سے نکال دیا جب اسپین میں اس کے گذر کی کوئی صورت نہ رہی تو ساحل کی طرف چلا گیا۔ ساحل سے ایک جہاز میں بیٹھ کر افریقہ پہنچا، یہاں حالتِ آوارہ گردی میں کچھ دنوں بعد تاہرت کے شہر میں آیا اور ایک واقفکار سے جو ریہ کا رہنے والا تھا۔ ملاقات ہوئی یہ درزی کی دوکان کرتا تھا۔ ابن حفصون بھی اس کی (۳۱۷)
دوکان میں کام کرنے لگا۔ ایک دن دوکان میں بیٹھا کپڑے سی رہا تھا کہ ایک بڈھا آدمی آیا

اور اس نے درزی کو کچھ کپڑا سینے کو دیا، درزی نے بڈھے کو بیٹھنے کو کہا، بڈھا بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا، ابن حفصون بھی باتوں میں شریک ہو گیا، بڈھے نے درزی سے پوچھا کہ "یہ نوجوان آدمی کہاں کا ہے"؟ درزی نے کہا "ریہ میں یہ میرا پڑوسی تھا، یہاں کام سیکھنے چلا آیا ہے"۔ اب بڈھے نے ابن حفصون سے پوچھا کہ "تم ریہ سے کب آئے؟" ابن حفصون نے جواب دیا "کوئی چالیس دن ہوئے ہوں گے"۔ بڈھے نے پوچھا "تم نے مبستر کا پہاڑ دیکھا ہے؟" ابن حفصون بولا کہ "اس کے پیچھے ہی تو میرا گھر ہے، کیا کوئی غدر تو وہاں نہیں پڑا؟" بڈھے نے کہا "نہیں لیکن تھوڑے دن ہوئے" اتنا کہہ کر بڈھے نے پوچھا "تم ایک شخص سے جو مبستر سے قریب ہی رہا کرتا تھا اور ابن حفصون اس کا نام تھا واقف ہو؟" ابن حفصون اپنا نام سنتے ہی زرد پڑ گیا، آنکھیں نیچی کر کے پھر کچھ نہ بولا، بڈھے نے ابن حفصون کی صورت غور سے دیکھی تو معلوم ہوا کہ ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے، یہ بڈھا ایک اسپینی تھا اور اس کو کامل یقین تھا کہ اس کی قوم پھر بیدار ہوگی، گو ابن حفصون کے جرائم اور جرائم کر کے بھاگنے کے حالات وہ سن چکا تھا، لیکن باپ کے اس نافرمان بیٹے اور مفسد پہاڑی رہزن میں اس کو ایک ایسی صورت نظر آ رہی تھی جو کسی وقت میں اپنی قوم کا ہادی و رہنما بننے والی ہے، ابن حفصون کے چپ ہو جانے سے اور رنگت کے زرد پڑ جانے اور صورت پر پریشانی ظاہر ہونے، اور ٹوٹے ہوئے دانت سے جس کا حال معلوم تھا کہ لڑائی میں ٹوٹا تھا، اس بڈھے کو مطلق شبہ نہ رہا کہ جس سے وہ بات کر رہا ہے در اصل وہی عمر بن حفصون ہے، بڈھے نے اس خیال سے کہ اس نوجوان کے دل میں جو امنگ اور دلولہ بھرا ہوا ہے اس کو ایک اچھے رستہ پر ڈال دے اور ایک نیک مقصود اس کی طبیعت میں پیدا کر دے، ابن حفصون سے کہا کہ "بس اب اپنے وطن کو واپس چلو سوئی چلانے سے تمہاری تنگ دستی دور نہ ہوگی، اپنے ملک میں پہنچ کر تم بنی امیہ کے حق میں ایک قہر ثابت ہو گے، اور ایک بڑی قوم پر حکومت کرنے لگو گے"۔

ایک زمانہ کے بعد اس بڈھے کی پیشین گوئی نے ابن حفصون کے شوقِ حکومت کو بہت کچھ قوت بخشی، لیکن اس تقریر کے وقت ابن حفصون کی کچھ اور ہی کیفیت ہوئی، خوف اس پر غالب ہوا، اور ڈرا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہاں جو لوگ میرے طرفدار نہیں ہیں ان میں سے کوئی مجھے پہچان

اور حاکم تاہرت میرا حال معلوم کر کے مجھے گرفتار کرے، عامیر قرطبہ سے حاکم تاہرت کے مراسم ہیں ایسی صورت میں کہیں یہ حاکم مجھے گرفتار کر کے حکومت اسپین کے حوالے نہ کر دے، غرض ان باتوں سے ڈر کر وہ تاہرت سے بھاگا، سامان سفر جو کچھ تھا وہ فقط دو روٹیاں تھیں جو قبا کی آستین میں رکھ لی تھیں، اس حال سے وطن واپس آیا، باپ کے گھر جانے کی ہمت نہ ہوئی اپنے ایک چچا کے گھر چلا گیا اور وہاں جتنی باتیں بڈھے سے سنی تھیں وہ سب چچا سے بیان کیں، یہ شخص اعتقاد کا ضعیف مگر ہمت کا مضبوط تھا، بڈھے کی پیشین گوئی کا اسے یقین ہو گیا، اور بھتیجے کو صلاح دی کہ "بغاوت کرنے اور غدر ڈالنے کا بندوبست کرنا چاہیے" اور اس میں جہاں تک میرے امکان میں ہو گا تمہاری مدد کرونگا"۔ ابن حفصون بہت آسانی سے اس بات پر رضامند ہو گیا، اور چچا نے تقریباً چالیس کاشتکار اسی غرض سے جمع کیے اور اُن سے کہا کہ تم ایک فوج کی مثل اپنے کو سمجھو اور ابن حفصون تمہارا سردار ہے"۔

ابن حفصون نے ان لوگوں کو جو ہر بات کے لیے تیار تھے خاص طور پر ترتیب دیکر ببشتر کے پہاڑ پر ڈیرے ڈال دیے (۲۶۸ھ) اس پہاڑ پر رومانیوں کے وقت کا ایک قلعہ تھا جسے آجکل الکستیلون (Castillon) کہتے ہیں[1]، یہ قلعہ شکستہ حالت میں تھا مگر اس کی درستی اور مرمت میں زیادہ دقت پیش نہ آئی، قزاقوں اور بلوائیوں کے لیے اس سے بہتر کوئی جگہ ملنی مشکل تھی، قلعہ پہاڑ کی ایک بلند چٹان پر واقع تھا، مشرق اور جنوب کی سمتوں میں اس چٹان کے پہلو زمین سے اس طرح سیدھے اٹھے ہوئے تھے کہ دشمن ان سمتوں سے کسی طرح اوپر نہ پہنچ سکتا تھا، قلعہ کا موقع اس وجہ سے اور بھی اچھا تھا کہ ہموار مزروعہ زمینیں اس کے قریب تھیں یہ زمینیں جو قبل سے قرطبہ تک پھیلی ہوئی تھیں، ایسی تھیں کہ ان میں ابن حفصون کا گروہ اپنے مویشی آسانی سے چرا سکتا تھا، اور ایسے زمینداروں سے جن کے گھر دور پڑتے تھے روپیہ وصول کرنے کی وارداتیں آسانی سے عمل میں لا سکتا تھا، شروع میں ابن حفصون نے اسی قسم کی لوٹ مار، اور

[1] موسیو سیمونٹ (M. Simonet) نے اس قلعہ کو لاس میساس دی ویلاوردی Las Mesas de Villaverde سے مطابق کیا ہے، دیکھو ڈوزی کی کتاب تحقیقات Recherches مطبوعہ ۱۸۸۱ء صفحہ ۲۲۲-۲۲۱

رہزنی پر اکتفا کیا، لیکن کچھ دنوں بعد پیشۂ قزاقی کو اپنی شان کیخلاف سمجھا، کیونکہ اب اسکے گروہ کی تعداد میں بہت ترقی ہوتی جاتی تھی، بہت سے لوگ، جو اچھی صحبت سے نکل کر بری صحبت میں رہنا چاہتے تھے، یا کسی وجہ سے شہروں سے بھاگ کر پہاڑوں میں چھپا رہنا اپنے حق میں بہتر سمجھتے تھے اس گروہ میں شامل ہو گئے۔

جب اس طرح قوت بڑھی تو ابن حفصون نے اضلاع میں جو شاہی فوج حفاظت کیلیے رہتی تھی پرواز کرنے شروع کیے اور جب ہمت اور بڑھی تو شہروں کے دروازوں پر یہ گروہ قتل و غارت کے لیے پہنچنے لگا۔ حاکم ریہ کو فکر ہوئی اور جس قدر فوج رکھتا تھا اسے لے کر اس گروہ پر حملہ آور ہوا، لیکن شکست کھا گیا اور اپنے خیمہ گاہ کو چھوڑ کر بھاگا، ابن حفصون کے آدمیوں نے خیمہ گاہ لوٹ لیا، امیر محمد کو جب یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے حاکم ریہ کی نالائقی کو اس شکست کا باعث سمجھا اور اسے معزول کر کے دوسرا حاکم مقرر کیا، لیکن اس حاکم کو بھی مقابلہ میں کامیابی نہ ہوئی جب دیکھا کہ قلعہ ببشتر کو فتح کرنا واقعی نہایت دشوار کام ہے تو اس نے ابن حفصون سے صلح کر لی، لیکن یہ مصالحت چند روزہ تھی شاہی فوج ابن حفصون پر بار بار حملہ کرتی رہی اور ابن حفصون دو تین برس تک اپنے قلعے سے دشمن کا جواب
۳۱۹ دیتا رہا لیکن آخر کار مجبور ہو گیا، اور وزیر السلطنت ہاشم کے سامنے ابن حفصون نے ہتھیار ڈال دیے، اور وزیر ہاشم ابن حفصون کو مع اس کے گروہ کے قرطبہ لے آیا۔ ابن حفصون اور اس کے گروہ کو دیکھ کر کہ شاہی فوج میں اچھے افسر اور سپاہی بن سکتے ہیں، امیر محمد ابن حفصون سے اچھی طرح ملا، اور فوج میں بھرتی ہونے کے لیے اس سے کہا، ابن حفصون نے اس خیال سے کہ اس وقت اور کچھ نہیں تو یہی غنیمت ہے امیر کا حکم مان لیا۔

اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد یعنی سنہ ۲ھ ۸۸۲ء میں جب وزیر السلطنت ہاشم بنو قسی کے سردار محمد ابن لب اور لیون کے بادشاہ الفونسو سے لڑنے گیا تو ابن حفصون نے جو ہاشم کے ساتھ تھا اس معرکہ میں شجاعت کے بڑے بڑے جوہر دکھلائے، خاص کر پانکارور کی لڑائی میں وہ بڑی جوانمردی سے لڑا، ویسے بہت خاموش اور سرد، مگر لڑائی میں نہایت تیز اور آگ کا شعلہ بن جاتا تھا ان باتوں کی وجہ سے سپہ سالار اس کی بہت قدر کرنے لگا، لیکن ابن حفصون

جب لڑائی سے قرطبہ واپس آیا تو اس کو والیٔ قرطبہ محمد بن ولید بن غانم سے بہت جلد شکایت پیدا ہوگئی ابن غانم اور ہاشم میں چشمک تھی ہاشم کو جو لوگ عزیز تھے ابن غانم ان کو ستاتا تھا ابن حفصون بھی ہاشم کے آوردوں میں سے تھا، اس لیے اسے بھی دق کرنا شروع کیا اور یہ اس طرح کہ اس کے ہمراہیوں کو بار بار نقل مکان پر مجبور کیا کھانے کے لیے جو غلہ بھیجا وہ بھی بہت بُرا تھا، ابن حفصون جیسے یونہی کسی بات کی تاب نہ تھی غصّہ کو دبا نہ سکا، اور ایک دن ابن غانم کو کالی روٹی کا ایک سوکھا ہوا ٹکڑا دکھا کر کہنے لگا "اللہ کی رحمت کے اگر امیدوار ہو تو بتاؤ یہ روٹی کوئی آدمی کھا سکتا ہے؟" ابن غانم نے جواب دیا "نامعقول. تو کون ہے جو ہم سے اس طرح گستاخی سے بات کرتا ہے"، ابن حفصون طیش میں آگر چپکا اپنی چھاؤنی میں چلا آیا، اور ایک دن ہاشم کے محل میں ہاشم سے ملاقات کرکے کل حال سنایا، ہاشم نے کہا "ابن حفصون، افسوس ہے کہ لوگ تمہاری قدر نہیں کرتے، لیکن یہ تمہارے اختیار میں ہے کہ لوگ تمہاری قدر کریں"

ابن حفصون اب سرکاری ملازمت سے قطعی بیزار ہوگیا، اور ایک دن اس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا "بس اب یہاں سے چلو، اور پھر وہی پہلی سی زندگی اختیار کرو جس کے ہم خوگر ہو چکے ہیں" ہمراہی اس سے بہتر کیا بات سمجھتے تھے، چنانچہ ایک دن شام ہوتے ہی یہ سب قرطبہ سے نکل ببشتر کی طرف روانہ ہوگئے (۲۷۱ھ ۸۸۴ء)

قرطبہ سے نکلتے ہی ابن حفصون اس کوشش میں ہوا کہ کسی طرح قلعہ ببشتر پر قبضہ ہو جائے لیکن یہ کام مشکل تھا، کیونکہ وزیر السلطنت ہاشم نے جو اس قلعہ کے موقع اور مضبوطی کو خوب سمجھتا تھا اس میں بہت سی فوج مقیم کر دی تھی، کئی برج اور پشتے اضافہ کرکے اسے پہلے سے بھی زیادہ مستحکم کر دیا تھا، اور اب اس کو فتح کرنا غیر ممکن معلوم ہوتا تھا، لیکن ابن حفصون کو اپنی اچھی قسمت پر اتنا بھروسا تھا کہ وہ ہمت نہ ہارا، اپنے چچا کی مدد سے اس نے اپنے گروہ میں پھر بہت سے دلیر اور بہادر آدمیوں کو بھرتی کیا، اور ببشتر پر دفعتہً حملہ کر دیا، شاہی فوج نے گھبرا کر قلعہ چھوڑ دیا، اور قلعہ دار ایسا بدحواس ہو کر بھاگا کہ اپنی معشوقہ کو بھی ساتھ نہ لیا، ابن حفصون کو یہ عورت اس قدر پسند آئی کہ اس سے نکاح کر لیا یا بطور حرم کے اُسے اپنے پاس رکھا۔

غرض اس زمانہ سے نویں صدی عیسوی کا یہ جوسی ماریا قزاق جس نے انیسویں صدی عیسوی کے

اصلی جوسی ماریا سے تقدیر اچھی پائی تھی، جنوبی اندلس کے اسپینیوں کا سردار اور رہنما ہوگیا، اور اپنے ملک والوں سے خواہ مسلمان تھے یا عیسائی، یہ کہنا شروع کیا کہ "تم اس امیر محمد کا زمانہ بہت برداشت کر چکے، اس امیر نے تمہیں لوٹا ہے اور محصولوں کی چکی میں دل ڈالا ہے، عرب جو تم کو غلام سمجھتے ہیں، کیا تم چاہتے ہو کہ وہ تمھیں اپنے پاؤں میں روند ڈالیں، یہ نہ سمجھو کہ میں کسی ذاتی غرض یا طمع کے خیال سے تم سے یہ باتیں کہتا ہوں، میری تمنا صرف اس قدر ہے کہ جو بد سلوکیاں تمہارے ساتھ ہوئی ہیں ان کا انتقام لوں اور تم کو غلامی سے آزاد کراؤں"۔

ایک عربی مؤرخ لکھتا ہے کہ جب کبھی ابن حفصون اس قسم کی تقریر لوگوں کے سامنے کرتا تھا تو سننے والے اس کا شکریہ ادا کرتے تھے اور اُن کی فرمانبرداری کا وعدہ کرتے تھے۔

اس بات کا ثبوت کہ ابن حفصون کی طبیعت میں جو عیوب پہلے تھے اب وہ جاتے رہے تھے خود اس کے دشمنوں کی شہادت سے ملتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ انہی دشمنوں سے اس کے حالاتِ زندگی بھی دریافت ہوئے ہیں، بجائے نخوت ظاہر کرنے اور آمادہ فساد رہنے کے اب وہ اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ سپاہی سے بھی بہت نرمی اور اخلاق سے پیش آتا تھا، اس کے ہمراہیوں کا یہ حال تھا کہ اپنی جان تک اس پر فدا کرنے کو تیار تھے، اس کے حکموں کی پابندی ایسی سرگرمی سے کرتے تھے کہ گویا وہ مذہبی احکام ہیں، خطرہ کیسا ہی سخت ہو، خواہ جلتی آگ ہی کیوں نہ ہو، مگر اشارہ پاتے ہی اُس میں گھس پڑتے تھے، خود ابن حفصون کا یہ حال تھا کہ لڑائی کے وقت صفِ اوّل میں جہاں خوب گھمسان ہو ایک معمولی سپاہی کی طرح لڑتا، اور دشمن میں جس کو سب سے زیادہ قوی ہیکل دیکھتا اُسی سے تیغ آزمائی کرتا، اور جب تک لڑائی جیت نہ لیتا، ہٹنا نہ جانتا تھا، نہ کوئی آدمی اُس کی طرح خوش ہو کر اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا تھا، اور نہ کوئی اس کی مثل دوسروں کے لیے اچھی مثالیں پیش کرتا تھا، جو لوگ خدمت میں تھے ان کی ہر خدمت کا صلہ دینے میں بڑی فیاضی دکھاتا، لوٹ کا مال اُن لوگوں کو سب سے زیادہ دیتا جنھوں نے سب سے زیادہ جانبازی دکھائی تھی، ہمت و مردانگی کی داد دینے میں چاہے وہ دشمن ہی سے کیوں نہ ظہور میں آئی ہو کبھی بخل نہ کرتا، ایسے دشمن کو جو سخت مقابلہ کے بعد مغلوب اور گرفتار ہوتا، رہا کر دیتا، لیکن مجرموں اور خاطیوں کو سخت سزا دینے میں کمی نہ کرتا، اس کے سخت اور فوری فیصلے کسی گواہی یا شہادت پر

بنی نہ ہوتے تھے، سزا دینے کے لیے محض اُس کے دل کو جرم کا یقین ہو جانا کافی تھا، گو قزاقی رہزنی اور لوٹ مار ان سب لوگوں کے خون میں موجود تھی، لیکن ابن حفصون کی بلا تاخیر عدل گستری نے ان پہاڑی علاقوں میں رعایا کی حالت امن و حفاظت کی کر دی، عربی مورخ یقین دلاتے ہیں کہ ابن حفصون کے زمانہ میں ایک تنہا عورت کو بھی اتنی حفاظت میسر تھی کہ وہ روپیہ لیے ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک بخوف چلی جاتی تھی، ۳۲۱

امیر محمد نے تقریباً دو برس تک اس حریف مقابل کو جو ایک دیرینہ مظلوم قوم کا حامی اور سرپرست بن کر ظاہر ہوا تھا مغلوب و مطیع کرنے کی کوئی تدبیر نہ کی، جمادی الاول ۲۵۲ھ مطابق جون ۸۶۶ء میں العقبہ والی الحمہ نے جب سرکشی کی تو اس کی گوشمالی کے لیے اپنے فرزند منذر کو جو ولی عہد بھی تھا روانہ کیا، الحمہ کا یہ باغی حاکم بھی ابن حفصون کی طرح ایک نو مسلم خاندان کا آدمی تھا اور ابن حفصون سے اتحاد رکھتا تھا، جب ابن حفصون نے سنا کہ دوست پر حملہ ہوا ہے تو فوراً مدد کو آیا، شاہی فوج نے الحمہ کا محاصرہ کر لیا، دو مہینے تک محاصرہ جاری رہنے کے بعد جب رسد ختم ہوگئی تو محصوروں نے چاہا کہ قلعہ سے نکل کر دشمن میں سے رستہ کاٹتے ہوئے نکل جائیں قلعہ سے باہر آئے مگر مقصد حاصل نہ ہو سکا اور پھر قلعہ میں واپس جانا پڑا، اس معرکہ میں ابن حفصون کے کئی جگہ زخم آئے ایک ہاتھ کٹ گیا، اور جب اُس کے بہت سے آدمی مارے گئے تو بھاگ کر پھر قلعے میں چلا آیا یہ باغیوں کی خوش قسمتی تھی کہ اسی زمانہ میں منذر کو ایک خبر قرطبہ سے ملی، جس کو سنتے ہی وہ محاصرہ اٹھا کر قرطبہ واپس چلا آیا، یہ خبر اُس کے باپ امیر محمد کے انتقال کی تھی ۱۴ اگست ۸۸۶ء مطابق ۲۸ صفر ۲۷۳ھ،

ابن حفصون کو اب موقع ملا کہ اپنی حکومت کو اور وسعت دے، بہت سے قلعوں کے مالکوں کو بلا کر سمجھایا کہ میرے ساتھ شریک ہو جاؤ، اور اب ان سب قلعہ داروں نے ابن حفصون کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا، اس وقت سے سمجھنا چاہیے کہ ابن حفصون واقعی جنوبی اسپین کا بادشاہ ہو گیا۔

منذر جب تخت پر بیٹھا تو ابن حفصون نے اب اس کو اپنا مدِ مقابل سمجھا، منذر جفاکش اور بہادر تھا اور مزاج میں احتیاط رکھتا تھا، موالی بنی امیہ اس زمانہ میں یقین کے ساتھ کہا کرتے تھے

کہ منذر کی عمر اگر ایک سال اور وفا کرتی تو جنوبی اسپین کے جس قدر باغی و بلوائی تھے سب اسکے مطیع ہو جاتے۔

بہر کیف منذر نے باغیوں کی اچھی طرح خبر لی، قبرہ، البیرہ اور جیان کے علاقے میدان کارزار بن گئے، کبھی کوئی فریق جیتا کبھی کوئی، ۸۸۶ء (شوال ۲۷۲ھ) کے موسم بہار میں منذر نے بذات خود باغیوں سے لڑنا شروع کیا، بہت سے قلعے جو راستے میں آئے فتح کرتا ہوا آگے بڑھا ببشتر کے قریب باغیوں میں قتل و غارت کا بازار گرم کیا، شہر ارجذونہ کا محاصرہ کیا یہاں عیشون جو فوجِ مقیم کا سردار تھا اور ایک نومسلم خاندان کا آدمی تھا، تعلی و خود ستائی میں جواب تک اہل سپین کی خصوصیات سے سمجھی جاتی ہیں کسی سے کم نہ تھا، منذر نے جب شہر کا محاصرہ کیا تو بار بار یہ فقرہ زبان پر لاتا تھا کہ "اگر منذر مجھے گرفتار کرلے تو پھر اُس کا فرض ہوگا کہ ایک طرف خنزیر اور دوسری طرف ایک کتے کو لٹکا کر دونوں کے بیچ میں مجھے صلیب پر چڑھائے" مگر وہ اس بات کو بھول گیا تھا کہ فوجی قوت سے بھی زیادہ موثر ذریعے منذر کے پاس عیشون کو گرفتار کرنے کے موجود ہیں، ارجذونہ کے بعض باشندے ایسے بھی تھے جن کو رشوت لینے میں عار نہ تھا چنانچہ ایک دن جب عیشون انہی لوگوں میں سے ایک کے مکان میں بغیر ہتھیار لگائے پہنچا تو اس نے عیشون کو گرفتار کرادیا، اور پابہ زنجیر کرکے فوراً امیر منذر کے پاس روانہ کردیا، اور اب منذر نے عیشون کو اسی طریقہ سے سزائے صلیب دی جس طریقہ کو وہ طنزاً بیان کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد ارجذونہ بہت جلد فتح ہوگیا۔ اب امیر منذر نے بنی مطروح کے تین رئیسوں کو جو باغہ (Priego) ۳۲۲
کے پہاڑی علاقے میں خود سر ہو کر قلعوں پر قابض ہو گئے تھے، اور ان کے ساتھ انہیں اور بانیوں کو سزائے صلیب دی، اس کام سے فارغ ہو کر قلعہ ببشتر کو فتح کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ ابن حفصون کو اس کا یقین تھا کہ یہ قلعہ فتح نہیں ہو سکتا، منذر نے جب قلعہ کا محاصرہ کیا تو ابن حفصون قلعہ بند ہو کر بہت اطمینان سے سوچنے لگا کہ منذر کے ساتھ کوئی چال چلنی چاہیے، دھوکا دینا اور وہ بھی ایک لطف کیساتھ، اُس کا ایک خاص فن تھا، چنانچہ پیغام صلح کے ساتھ یہ کہلا بھیجا کہ میں حضور کے ساتھ قرطبہ جاکر وہیں سکونت اختیار کرونگا اور میرے لڑکے حضور کے موالی میں شمار کیے جائیں امیر منذر اس دھوکہ میں آگیا، قضاۃ اور علما کو جمع کرکے حکم دیا کہ جس طرح ابن حفصون کہتا ہے

اسی عبارت میں ایک صلح نامہ تیار کیا جائے۔

صلح نامہ تحریر ہونے کے بعد ابن حفصون منذر کی خدمت میں حاضر ہوا، منذر اس وقت قلعہ ببشتر کے نزدیک ہی ایک قلعہ میں مقیم تھا، ابن حفصون نے امیر سے عرض کیا کہ میرے حال پر اتنی اور عنایت فرمائیں کہ ایک سو خچر ببشتر کو روانہ کرنے کا حکم ہو تاکہ میں اپنا مال و اسباب قلعہ سے نکال کر قلعہ خالی کر دوں، منذر نے یہ درخواست منظور کی، اور خود جس قلعہ میں قیام تھا وہاں سے فوراً مع فوج کے مراجعت کی، خچر حسب درخواست دس فوجی افسروں اور ڈیڑھ سو سواروں کی حفاظت میں ببشتر روانہ کیے گئے، ابن حفصون اگرچہ اُس وقت نظر بند تھا مگر اس کو قابل اعتبار سمجھ کر کسی نے زیادہ خیال نہ کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ابن حفصون رات کے وقت حراست سے بھاگ کر ببشتر کے قلعہ میں آیا، اور قلعہ سے کچھ سپاہیوں کو ساتھ لے کر نیچے اترا اور خچر اور سوار جو امیر کے بھیجے ہوئے ببشتر کو آ رہے تھے اُن پر یکایک حملہ کیا، اور سواروں کو پراگندہ کر کے خچر پکڑ کر قلعے میں داخل کیے۔

ابن حفصون کی اس دغابازی پر منذر کو بہت غصہ آیا، اور ببشتر پر پھر حملہ کرنے کی قسم کھا کر کہا کہ اب کے محاصرہ اس وقت تک نہ اُٹھاؤں گا، جب تک یہ ابن حفصون جھوٹا حلف لینے والا دغاباز مولّد مغلوب نہ ہو جائے گا، لیکن موت نے منذر کی اس قسم کو پورا نہ ہونے دیا منذر کا سوتیلا بھائی عبداللہ جو اس کا ہم سن بھی تھا مدت سے تخت امارت کی فکر میں تھا، لیکن اُس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر منذر نے کوئی لڑکا ایسا چھوڑا جو تخت پر بیٹھنے کی عمر کا ہوا تو پھر تخت کبھی نصیب نہ ہو گا، اس لیے عبداللہ نے چاہا کہ منذر کا کسی طرح قبل از وقت کام تمام کر دے، چنانچہ جو شخص منذر کی فصد کھولا کرتا تھا اس کو عبداللہ نے رشوت دی، فصاد نے فصد لیتے وقت زہر آلود نشتر سے کام لیا، اور منذر زہر کے اثر سے جاں بحق ہوا، ۱۵ر صفر ۲۷۵ھ مطابق ۲۹ر جون ۸۸۸ء منذر نے صرف دو برس سلطنت کی۔

عبداللہ اس وقت قرطبہ میں تھا، اور منذر کا انتقال ببشتر کی مہم سے مراجعت کے بعد ہی کسی نزدیک مقام پر لشکر میں ہوا تھا، خواجہ سراؤں نے عبداللہ کو ہوشیار کیا، اور اس سے کہا کہ جہاں منذر کا انتقال ہوا ہے وہاں سے لشکر کو فوراً روانہ ہو جانا چاہیے۔

عبداللہ نے پہلے تو وزراءِ سلطنت کو بھائی کے انتقال کی خبر دی اور پھر پہلے تو وزیروں سے پھر قریشیوں اور موالی بنی امیہ سے، اور اُس کے بعد عہدہ دارانِ سلطنت اور امراءِ لشکر سے یکے بعد دیگرے اپنی امارت پر بیعت لی۔ منذر کی فوج کے لوگ منذر کے اس ارادے سے کہ ۳۲۲ ببشتر فتح کیا جائے، پہلے ہی سے ناخوش تھے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ قلعہ فتح نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بات پہلے ہی سے آسانی سے سمجھ میں آرہی تھی کہ منذر کے مرنے کی خبر سنتے ہی سب فوجی لوگ لشکر سے چلے جائیں گے۔

اہلِ لشکر کی اِس حالت سے ایک سردار نے عبداللہ کو آگاہ کیا، اور کہا کہ منذر کی موت فوج والوں پر ظاہر نہ کی جائے اور جنازہ قریب ہی کہیں دفن کر دیا جائے، لیکن عبداللہ نے یہ صلاح نہیں مانی اور بہت ہی غصہ سے جو دراصل تصنع تھا کہا "کیا میں اپنے بھائی کی لاش کو اُن لوگوں پر چھوڑ دوں جو گھنٹے بجاتے اور صلیب کی پرستش کرتے ہیں؛ میں ہرگز ایسا نہ کرونگا، بھائی کا جنازہ ضرور ضرور قرطبہ لے جاونگا، اس میں چاہے میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

غرض امیر منذر کی موت کی اطلاع اہلِ لشکر کو دی گئی، اُن کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشخبری ہو سکتی تھی، بغیر عبداللہ سے کہے یا اجازت لیے اُنھوں نے رفتہ رفتہ اپنے گھروں کی راہ لی، جس وقت عبداللہ جنازے کے ساتھ چلا، تو قرطبہ پہنچتے پہنچتے فوج کا بہت سا حصہ غائب ہو چکا تھا۔

ابن حفصون کو منذر کی موت کی خبر اس وقت پہنچی جبکہ عبداللہ اس کا جنازہ قرطبہ کو لے جا رہا تھا، ابن حفصون یہ دیکھ کر کہ شاہی فوج میں کمی اور ابتری ہو گئی ہے، لوٹ کی فکر میں ہوا، بہت سے لوگوں کو جن کی جمعیت کم تھی گرفتار کر کے اُن کا کل مال واسباب لُوٹ لیا۔

اس غداری سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ عبداللہ نے اپنے غلام فرتون کو ابن حفصون کے پاس یہ کہکر بھیجا کہ "ایسا مجمع جو جنازہ لے جاتا ہو اس پر حملہ کرنا کب درست ہے؛ میں تمہارے ساتھ دوستی اور مصالحت کا طریقہ رکھنا چاہتا ہوں"۔ ابن حفصون نے یہ سنکر

معلوم نہیں اپنی طبیعت کی فیاضی سے، یا مصلحتِ وقت سمجھ کر جنازے کے تعاقب سے پرہیز کیا،

جب عبداللہ قرطبہ میں پہنچا ہے تو صرف چالیس سوار اس کے ساتھ تھے، باقی فوج کے تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلتے ہوئے تھے ؛

اسناد

ابن خلدون ص ۱۰۹، ۱۰۰، ۹۱ تاریخ بربر (اڈیشن سلین) جلد ۱ - ص ۳۷

ابن عذاری، دیباچہ ۴۴ تا ۴۶، جلد ۲ ص ۸۴ نوٹ، ۱۰۶ تا ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۱۷ تا ۱۲۱، ۱۲۳

ابن الخطیب، قلمی نسخہ ۶ (عمر بن حفصون پر ایک مضمون)

ابن القوطیہ ص ۳۰ تا ۳۹

نویری ص ۴۶۴ تا ۴۶۵

ابن حیان ص ۲ تا ۴

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مُسلم

یارھویں فصل

سوار القیسی

عبداللہ بن محمد بری ساعت میں تخت نشین ہوا، قومی اختلافات اور عداوتوں نے قصر امارت کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں اور اب وہ گرنے کو تھا، ابن حفصون اور اس کے پہاڑی قزاق بذاتِ خود سلطنت کے لیے ایسی روک نہ تھے جس کا انسداد ممکن نہ ہوتا، لیکن سب سے بڑی مشکل یہ پیدا ہوئی کہ روساء عرب نے جو اسپین میں رہتے تھے سلطنت کی عام بدنظمی سے فائدہ اٹھانا چاہا اور بغاوتیں برپا کر کے خود مختار ہونے کی کوشش کی، مروانی سلطنت کے حق میں عربوں کی یہ باغیانہ تحریک جس قدر مضر تھی اس قدر اسپینیوں کی اخواہ مسلمان مولد ہوں یا عیسائی البغاوت خطرناک نہ تھی، کم سے کم امیر عبداللہ تو یہی سمجھتا تھا۔

امیر کی حالت ایسی تو تھی نہیں کہ وہ عربی رئیسوں یا اسپینیوں سے بے نیاز ہو کر رہتا اس لیے دونوں میں سے ایک کیساتھ اس نے مصالحت کا قصد کر لیا، چنانچہ اسپینیوں کی طرف اسے خاص توجہ ہوئی، ان میں سے بعض پر اس نے پہلے بھی کسی قدر مہربانی ظاہر کی تھی اسپینیوں میں ابن مروان جلیقی سے دوستی اور ملاقات اس وقت کی تھی جبکہ یہ دونوں امیر محمد

کے زمانہ میں شاہی فوج محافظ میں سرداری پر ممتاز تھے، پس لطلیوس میں ابن مروان کو بدستور قائم رہنے دیا، اتنی بات البتہ اور کی کہ ریّہ کی سندِ حکومت ابن حفصون کو عطا کی، مگر اس شرط سے کہ وہ امیر کو اپنا بادشاہ تسلیم کرے، ابتدا میں یہ تدبیر اچھی ثابت ہوئی، کیونکہ اس میں کامیابی ہوئی تھی، ابن حفصون نے اطاعت قبول کی، اور اپنے لڑکے اور اپنی فوج کے چند سرداروں کو امیر کے دربار میں بطور ضمانت بھیجدیا، امیر عبداللہ نے ان مہمانوں کی خاطر و مدارات کی اور انھیں بہت انعام و اکرام دیا، لیکن کچھ مہینے اطاعت کرنے کے بعد ابن حفصون کو امیر عبداللہ کی پرواہ نہیں رہی، اور اس نے اپنے سپاہیوں کو لوٹ مار سے نہ روکا، یہ سپاہی قریوں اور قصبوں کو لوٹتے ہوئے اشونہ اور استجہ بلکہ قرطبہ کے دروازوں تک پہنچ جاتے تھے، جب شاہی فوج ان قزاقوں کے مقابلے کے لیے بھیجی گئی تو اس کو شکست ہو گئی اور اس شکست کے بعد ابن حفصون نے امیر عبداللہ سے علانیہ بغاوت اختیار کر لی اور قلعہ ببشتر میں امیر کی طرف سے جو وکیل رہتے تھے اُن کو نکال دیا

غرض سپینیوں (مولدوں) اور عیسائی دونوں کو اپنا خیر خواہ اور مطیع بنانے میں امیر عبداللہ کو کامیابی نہ ہوئی، بلکہ اس کوشش میں اپنی ہی قوم یعنی عربوں سے لڑائی ٹھن گئی، ملک کے ایسے حصّوں میں جہاں شاہی حکومت کا احساس برائے نام رہ گیا تھا وہاں عربوں کا ایک ایسے بادشاہ کا مطیع و منقاد ہو کر رہنا جو اُن کے دشمنوں (اہل اسپین) سے ۳۲۵
میل جول رکھتا ہو، ممکن نہ تھا، اور اس کی آرزو ایک اُمید لاحاصل تھی۔

اسی مضمون سے متعلق صوبہ البیرہ میں جو واقعات پیش آئے۔ اب اُن کی طرف ہم کو توجہ کرنی چاہیے، اگر مذہبی حالاتِ ماضی کو یاد کرنے سے انسان کے دل پر کوئی اثر ہو سکتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ اسپین کے صوبوں میں جیسا صوبہ البیرہ کو عیسائی مذہب سے تعلق اور شغف تھا، ایسا کسی دوسرے علاقے کو نہ تھا، یہ حصۂ ملک وہ تھا جہاں اسپین میں دین عیسوی کی اشاعت سب سے پہلے ہوئی تھی، اسی علاقے میں اُن سات بڑے مسیحی واعظوں نے وعظ کیا تھا جن کی نسبت روایت چلی آتی تھی کہ روما والے حواریین مسیح کے وہ شاگرد تھے، صوبہ البیرہ میں عیسائی مذہب کو یہ شان و بزرگی اس وقت حاصل تھی جبکہ

تمام جزیرہ نمائے اسپین میں بت پرستی کی ظلمت پھیلی ہوئی تھی، اس کے بعد سنہ ۳۰ عیسوی میں البیرہ کے دارالحکومت[1] (یعنی مدینہ البیرہ) میں ایک مشہور مذہبی کونسل پادریوں کی بھی ہوئی تھی، جب مسلمانوں کا دور دورہ ہوا تو اس علاقے کے اسپینی باشندے مدت دراز تک اپنے بزرگوں کے دین (نصرانیت) پر قائم رہے، فتح اندلس کے تھوڑے ہی دن بعد حضرت خنش صنعانی نے جو تابعی تھے اور موسیٰ بن نصیر کیساتھ اس ملک میں آئے تھے، مدینۃ البیرہ میں سب سے پہلی مسجد تعمیر کی تھی، لیکن اس شہر میں مسلمانوں کی اتنی قلت تھی کہ ڈیڑھ سو برس تک مسجد کی حالت وہی رہی جو حضرت خنش الصنعانی چھوڑ گئے تھے، برعکس اس کے گرجا اس شہر میں متعدد تھے اور بہت مال و متاع رکھتے تھے، یہاں تک کہ غرناطہ میں بھی جو مدینہ البیرہ سے بہت قریب تھا چار بڑے گرجا تھے، جن میں سے ایک گرجا جو باب البیرہ کے سامنے تھا سب سے بڑا تھا، اسکو ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں قوطیوں کے ایک بڑے رئیس گدیلا نامی نے بنوایا تھا، یہ گرجا شان و شوکت میں اتنا عظیم الشان تھا کہ کوئی دوسرا گرجا اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا،

لیکن امیر عبدالرحمٰن الاوسط اور امیر محمد کے دورِ حکومت میں عیسائیوں میں ترک مذہب کے واقعات شروع ہو کر عالمگیر ہو گئے، اور شہروں کی مثل مدینہ البیرہ میں بھی ایسے عیسائی موجود تھے جن کے کان طمع دنیا کی صدائیں سننے کے لیے بہرے نہ تھے، علاوہ ازیں اُن کے اسقف شموئیل کی شراب خواری اور بیہودہ حرکتوں نے عیسائیوں کے دلوں میں ایسے مذہب سے نفرت پیدا کرادی جس کے پیشوا ایسے نالائق ہوں، اس نفرت کے بعد جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ جبر و تعدی نے ختم کرادیا جن کا مرتکب خود شموئیل ہوا تھا، عیسائیوں نے تنگ آ کر اس کو اسقف کے عہدے سے معزول کر دیا،

(۳۲۶) شموئیل معزول ہوتے ہی قرطبہ پہنچا، اور وہاں جاتے ہی مسلمان ہو گیا، اب اس نے ان عیسائیوں کو جو اس کے مذہبی تحت میں پہلے سے تھے اور جن پر اب اسلامی سلطنت نے اُسے قطعی اختیار دے دیا تھا، ستانا شروع کیا، اس کی سختیوں کی برداشت عیسائیوں کو

[1] یہ دارالحکومت شہر غرناطہ سے شمال مغرب میں موجودہ مقام پینوس لوانتی کے قریب تھا

نہ ہو سکی، نتیجہ یہ ہوا کہ جان اور مال کے بچانے کے لیے عیسائی کثرت سے مسلمان ہونے لگے اور آخر زمانہ میں مدینۃ البیرہ میں نو مسلموں کی وہ کثرت ہوئی کہ سلطنت کیطرف سے ایک بہت بڑی مسجد ان کے لیے تعمیر کرائی گئی، مسجد کی تعمیر ۲۵۰ھ؁ ۸۶۴ء؁ میں بزمانہ امیر محمد بن عبد الرحمن ختم ہوئی۔

صوبہ البیرہ کے عرب اکثر شامی عربوں کی اولاد تھے، یہ لوگ مدینہ البیرہ نے تنگ گلی کوچوں کو ناپسند کر کے علاقے کے کھلے میدانوں میں آباد ہوئے تھے، اسپینیوں کے مقابلے میں وہ دیہاتی سمجھے جاتے تھے، شہر کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ شہر بہت تنگ و تاریک تھا، اسکے چاروں طرف کالی کالی پہاڑیاں تھیں، جن پر درخت یا سبزے کا نام نہ تھا، یہ بالکل خشک اور ویران تھیں، نہ موسم بہار میں اُن پر پھول کھلتے تھے اور نہ زمستاں میں برف کا کوئی گالا اُن پر گرتا تھا، عربوں کے لیے ایسا شہر مطلق دلچسپی نہ رکھتا تھا، لیکن جمعہ کے روز عرب کے یہ امیر اور رئیس کچھ تو نماز پڑھنے کے لیے اور کچھ اپنے اصیل گھوڑے اور اُن کا قیمتی سامان دکھانے کی غرض سے شہر کی مسجد میں آیا کرتے تھے، یہ اسپینیوں کو نہایت حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے۔

جب دو قوموں کا تعلق محض خوش اخلاقی سے ملنے جلنے پر ہو، تو پھر یک قوم کی طرف سے غرور اور نخوت کا اظہار دوسری قوم کو بیحد ناراض کر دیتا ہے، عربوں کی نظروں میں اسپینی خواہ مسلمان ہوں، خواہ عیسائی، ایک "ذلیل گروہ" تھا، اور یہی توہین کا جملہ وہ اُن کیواسطے بولا بھی کرتے تھے۔

غرض ان باتوں سے عربوں نے اسپینیوں کو اپنا جانی دشمن بنا رکھا تھا، دونوں میں دنگے فساد کے وقوعے اکثر پیش آتے رہتے تھے، چنانچہ جس زمانہ کا ہم آگے ذکر کرنے والے ہیں اس سے ۳۰ برس پہلے اسپینیوں (مولدوں) نے عربوں کو الحمراء کے قلعہ میں جہاں اُنھوں نے پناہ لی تھی، محصور کر لیا تھا[1]

امیر عبداللہ کے ابتدائی زمانۂ حکومت میں اسپینیوں اور روساء عرب میں سخت نزاع برپا ہوا، ان عربی سرداروں نے امیر عبداللہ سے بالکل سرکشی اختیار کر کے بنو قیس میں سے ایک

---

[1] اس لڑائی کا حال سوائے شاعر عبلی کے اشعار کے اور کہیں نہیں پایا جاتا

شخص یحییٰ بن سخالہ کو جو بڑا بہادر اور شجاع عرب تھا اپنا سردار مقرر کر لیا تھا، جس وقت اسپینیوں نے ان عربوں کو اُن کے قریوں اور قصبوں سے نکال دیا تو انھوں نے ایک پرانے قلعہ میں جا کر پناہ لی، یہ قلعہ غرناطہ سے شمال مشرق میں وادی الفرتونہ کے قریب واقع تھا، اس کا رومانی نام منت سکرو تھا، عربوں نے اسے اپنے تلفظ میں منت شقر کر لیا تھا، اب اسپینیوں نے جن میں مسلمان اور عیسائی دونوں شامل تھے، یہ دیکھ کر کہ عرب قلعہ نشین ہو گئے ہیں ایک
شخص نابل نامی کو اپنا سردار مقرر کیا، اور قلعہ منت شقر کا محاصرہ کر لیا، اور آخر کار بہت سے ۳۲۷
عربوں کو قتل کر کے قلعہ اُن سے چھین لیا، عربوں کے سردار یحییٰ نے بھاگ کر اپنی جان بچائی اس لڑائی کے بعد اُس کی فوج اتنی کم رہ گئی کہ اس نے ہتھیار ڈال کر عربوں سے مصالحت کر لی اور مدینہ البیرہ میں اکثر آمد و رفت رکھنے لگا، اسی زمانہ میں غالباً اس نے کوئی سازش کی، جو اسپینیوں کو ناگوار ہوئی، اور ۲۷۶ھ / ۸۸۹ء میں اسپینیوں نے غفلت کی حالت میں اس پر حملہ کر کے اس کو اور اس کے ساتھیوں کو مار ڈالا اور ان کی لاشوں کو ایک کوئیں میں ڈال کر جہاں کہیں عرب ملے اُن کو مارنا شروع کیا،

اسپینی اس وقت بہت خوش تھے، چنانچہ اُن کا شاعر عبلی[1] کہتا ہے۔

"ہمارے دشمنوں کی برچھیاں ٹوٹ گئیں، ہم نے اُن کے غرور کو نیچا دکھا دیا، جسے وہ "ذلیل گروہ" کہا کرتے تھے، آج اسی گروہ نے اُن کی جڑ کاٹ دی، اب ایک زمانے تک اُن کے مُردے جن کو ہم نے کوئیں میں پھینک دیا ہے اس کے منتظر رہیں گے کہ کوئی ان کا انتقام لینے والا پیدا ہو۔"

عربوں کی حالت اس وجہ سے اور بھی ابتر ہو گئی کہ اُن میں خود پھوٹ پڑی ہوئی تھی، جو بدنظمی اس وقت تھی اس نے معدیہ اور یمانیہ کی پرانی عداوتوں کو پھر چمکا دیا، بہت سے اضلاع میں جن میں ایک علاقہ شذونہ کا بھی تھا، ان دونوں قبیلوں کے لوگوں میں سخت لڑائی

[1] اس شاعر کا پورا نام "عبد الرحمٰن ابن احمد" تھا، یہ موضع عبلیہ کا رہنے والا تھا جو وادی اش کے قریب واقع ہے۔

شروع ہوگئی، صوبہ البیرہ میں جہاں یحییٰ بن سخالہ کے مرجانے سے اُس کے جانشین مقرر کرنیکی ضرورت پیدا ہوگئی تھی، یمانیہ بکثرت آباد تھے، یہ لوگ بنی سعد سے اس بات پر لڑنے لگے کہ یحییٰ کا جانشین یمانیہ ہی سے کوئی شخص ہونا چاہیے، وقت نہایت نازک تھا، اور ایسے وقت میں آپس میں لڑنے کے معنی یہ تھے کہ دونوں تباہ ہوجائیں، یمانیہ اس خطرہ کو سمجھ گئے اور جب بنو معد نے اپنے لوگوں میں سے ایک شخص سوار کو سردار مقرر کرنا چاہا تو یمانیہ نے خاموش ہوکر اس کی اطاعت قبول کرلی، سوار بڑا بے جگر آدمی تھا اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنی قوم کو ہلاکت سے بچالیا، بعد کو لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ تعالےٰ عربوں میں سوار کو پیدا نہ کرتا تو ان کا نام ونشان تک مٹ جاتا۔

یحییٰ بن سخالہ کی طرح سوار بھی بنی قیس سے تھا، اور یحییٰ کے قاتلوں سے اس کے خون کا بدلہ لینا اس کا فرض تھا، سوار اسپینیوں کی جان کا دشمن اس وجہ سے بھی ہورہا تھا کہ منت شقر کے معرکہ میں اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو اسپینیوں کے ہاتھوں اپنی آنکھوں سے قتل ہوتے دیکھا تھا، جس دن سے یہ واقعہ پیش آیا تھا وہ اسپینیوں کے خون کا پیاسا ہوگیا تھا، خود اس کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عمر اس وقت زیادہ تھی، چنانچہ اپنے اشعار میں کہتا ہے "عورت میری محبت کی اب قدر نہیں کرتی کیونکہ میرا سر سفید ہوگیا ہے" مگر واقعہ یہ ہے کہ ایک خونی معرکے میں اس نے وہ سختی اور بے رحمی دکھائی جو جوان آدمی سے بھی ظاہر نہ ہوسکتی تھی، سوائے ایک خیال کے کہ انسانی ہمدردی اور رحمدلی کو دل سے قطعی دور کر دیا جائے دوسرا خیال سوار کے ذہن میں اس وقت نہ تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ ملک الموت کی خدمت گذاری پر مامور ہوا ہے، اور طبیعت کی نرمی، اگر یہ نرمی کبھی کسی وقت موجود تھی تو (۱۴۲ھ) اس یقین کی وجہ سے دور ہوگئی کہ خدا کا حکم بجا لا رہا ہے۔

سوار القیسی جس قدر عرب اپنے علم کے نیچے جمع کرسکا اُن کو جمع کیا، اور پہلا کام یہ

۱؎ قیسیوں کے سردار سندہ سے سوار چوتھی پشت میں تھا، یہ شخص غرناطہ سے شمال میں علاقہ البلوط کے رستانہ میں آباد ہوا تھا، اس کی اولاد اب تک وہاں موجود ہے۔

سوچا کہ قلعہ منت شقر جو ہاتھ سے نکل چکا تھا اس کو پھر فتح کرے، اس میں اس کے دو مقصد تھے ایک یہ کہ اس قلعہ پر قبضہ کرنے سے اپنے لوگوں کے لیے ایک ایسا مستحکم مقام مل جائے گا جہاں سے پورا بندوبست کر کے دشمن پر حملہ کیا جا سکے گا، دوسرا مقصد اپنے فرزند کے خون کا انتقام اس کے قاتلوں سے لینا تھا، اسپینیوں نے منت شقر میں بہت سی فوج مقیم کر رکھی تھی، لیکن عربوں نے یلغار کر کے اور قلعے کی دیواروں پر چڑھ کر قلعہ فتح کر لیا، اب سوار القیسی کا انتقام شروع ہوا، جس قدر فوج اسپینیوں کی قلعہ میں تھی اور جس کی تعداد چھ ہزار تھی سب قتل کر دی گئی۔

منت شقر کے بعد سوار القیسی نے قریب و جوار کے اور قلعوں کو فتح کیا اور ہر فتح کے بعد سخت خونریزی اور قتل عام ہوا، اور کہیں کسی اسپینی کی جان کو سلامتی نہیں دی گئی ان کے خاندان کے خاندان قتل کر دیے گئے، یہاں تک کہ بے شمار جائیدادیں ایسی رہ گئیں جن کا کوئی وارث نہ تھا۔

اس سخت مصیبت میں اسپینیوں نے البیرہ کے حاکم سے جس کا نام جاد تھا، مدد چاہی اور اس سے کہا کہ اب ہم تمہارے مطیع رہیں گے، جاد نے ان کی درخواست منظور کی، اور اپنی فوج اور اسپینیوں کو لے کر سوار پر حملہ کیا۔

سوار دشمن کے حملہ کا بلا خوف منتظر تھا، لڑائی سخت ہوئی جس میں عربوں کو فتح ہوئی اور وہ دشمن کا تعاقب کرتے مدینۃ البیرہ کے دروازے تک پہنچ گئے، دشمن کے سات ہزار آدمیوں کو قتل کیا، جاد حاکم البیرہ عربوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔

اس لڑائی نے جو جنگِ جاد کے نام سے مشہور ہوئی عربوں کے دل خوش کر دیے اب تک وہ آس پاس کے قلعوں کو معمولی معرکوں میں فتح کیا کرتے تھے، مگر یہ لڑائی انہوں نے کھلے میدان میں لڑ کر جیتی تھی اور یحییٰ کے قتل کا بدلہ ہزاروں کو قتل کر کے لیا تھا، چنانچہ سعید ابن جودی جو عربوں کا بڑا بہادر لڑنے والا اور اعلیٰ درجہ کا شاعر تھا، اہل عرب کے جذبات کو اس طرح بیان کرتا ہے۔

اے مرتدوں اور کافر لوگو! جو مرنے کی ساعت تک دین حق کو باطل بتاتے ہو، یحییٰ کے خون کا

بدلہ لینے کو ہم نے تمہیں قتل کیا، اس لیے کہ خدا کی مرضی یہی تھی، اے غلام زادو! تم نے
بے احتیاطی سے اُن بہادروں کے غصہ کو تیز کر دیا جو کبھی اپنے مقتول دوستوں کا انتقام لینے
سے غافل نہیں رہتے، اب اُن کا غصہ اٹھانے کو تیار ہو جاؤ، اور ان کی چمکتی ہوئی تلواریں
اپنے جسم پر چلتی ہوئی دیکھو، لڑنے والوں کے آگے آگے جو کسی توہین کو برداشت نہیں
کر سکتے اور ایسے جری ہیں جیسے جنگل کے شیر، ایک عالی نسب سردار تمہارے مقابلہ
کو آرہا ہے، یہ وہ عالی نسب ہے جو ناموری میں سب سے بڑھا ہوا ہے، اس کو اپنے افضل
بزرگوں سے شرافت ورثہ میں ملی ہے وہ شیر ہے ہزار کے شریف خون سے ہے ٣١
وہ اپنی قوم کا ایسا ستون ہے کہ دوسرا ہو نہیں سکتا، وہ اپنی قوم والوں کا جو اس کے
وعدوں کا اعتبار کرتے تھے تم سے بدلہ لینے آتا ہے، اُن کے خون کا بدلہ اس نے لے لیا
اس نے زرد صورت والوں کے بیٹوں[۱] کو قتل کیا ہے، اور جو زندہ رہ گئے وہ زنجیروں
میں جکڑے درد سے کراہتے ہیں، ہم نے تمہارے ہزارہا آدمیوں کو قتل کیا ہے، لیکن غلام
لاکھ بھی مارے جائیں تو ایک شریف کی موت کا بدلہ نہیں ہو سکتے۔

افسوس دیوانگی میں انھوں نے ہمارے یحییٰ کو قتل کر دیا، اور اسی حالت میں جبکہ
وہ اُن کا مہمان تھا ان کمینے خبیث غلاموں نے اُس کو ذبح کر ڈالا، ذلیل ہیں اُن کے
کام، لیکن یہ حرکت جنون کی تھی، ان کی بدنصیبی نے اب ان کو یقین دلا دیا کہ ہاں یہ
انھوں نے غلطی کی تھی، دغا بازو! کمینو!! تم نے یحییٰ کو باوجود عہد و پیمان کے قتل کر دیا۔"

اس بڑی فتح کے بعد سوار القیسی نے ریہ، جیان اور اس سے بھی آگے بڑھ کر قلعہ رباح
کے عربوں سے دوستانہ عہد نامے کر لیے اور اب وہ پھر قتل و غارت پر آمادہ ہو گیا، اسپینیوں
کے دل اب بالکل ٹوٹ چکے تھے اور اس وقت سوائے اس کے سلامتی کی کوئی صورت نہ تھی
کہ امیر عبداللہ کی پناہ ڈھونڈیں جس سے وہ باغی اور منحرف ہو چکے تھے، پس انھوں نے امیر سے
اپنی حفاظت کی درخواست کی، امیر کے اختیار میں کچھ ہوتا تو وہ شوق سے اُن کی درخواست

---

[۱] بنی الاصفر یعنی اسپینی (جن کا زرد یا گورا رنگ تھا)

منظور کر لیا، بہر کیف جس قدر اختیار تھا اُس کے بھروسے پر اسپینیوں سے وعدہ کیا کہ میں دوستانہ
طریقے پر اس معاملے میں دخل دونگا، امیر عبداللہ نے سوار القیسی کو کہلا بھجوایا کہ اگر میرے مطیع ہو کر
رہو گے اور اسپینیوں کو امن سے رہنے دو گے تو حکومت میں تم کو بڑا درجہ دیا جائے گا، سوار
نے امیر عبداللہ کا کہنا مان لیا اور اب عربوں اور اسپینیوں نے حلف لیے کہ آیندہ ہمیشہ دوستی
سے مل جل کر رہیں گے، غرض اس طرح ملک میں امن وامان قائم ہو گیا، لیکن یہ حالت عارضی
تھی، فریقین کے دلوں میں غصہ اور رنج اب تک بھرا ہوا تھا

سوار کو جب کوئی دشمن لڑنے کے لیے قریب نہیں ملا، تو اُس نے ابن حفصون کے
دوستوں اور لاحقین پر حملہ کر دیا، سوار کے ظالمانہ معرکوں اور اسپینیوں کی فریاد نے البیرہ کے لوگوں
میں پھر جوش قومی پیدا کر دیا، اور اب پھر سب مل کر سوار کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور اور لوگ
بھی اُن کے ساتھ ہوئے، البیرہ کے ہر خاندان سے لڑائی کی صدا بلند ہوئی اور اسپینیوں نے
عربوں پر ہر جگہ یورش کر کے اور اُن کو شکست دیکر آخر کار مجبور کیا کہ عرب الحمرا کے قلعہ[۱] میں جا کر پناہ لیں

قلعہ الحمرا کی حالت یہ تھی کہ کبھی اسپینی اُس پر قبضہ کرتے تھے اور کبھی عرب، ان بار بار کے
حملوں سے یہ قلعہ ایک غیر محفوظ عالیشان ویرانہ نظر آنے لگا تھا، بہر کیف عربوں کے لیے یہی ایک
پناہ کی جگہ رہ گئی تھی، اگر یہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر ایک عرب کا بھی زندہ بچنا مشکل تھا، اسلیے
عربوں نے قصد کر لیا کہ جہاں تک امکان میں ہوگا قلعہ الحمرا کو دشمن سے بچائیں گے جب تک
آفتاب آسمان پر رہتا، عرب اسپینیوں کے متواتر حملوں کا جواب کلہ بکلہ دیتے رہتے، اسپینی بھی جان ۳۳۰
توڑ کر حملہ کرتے تھے کہ کسی طرح ان قاتل وجفاکار عربوں کا دنیا سے خاتمہ کر دیں، جب رات ہو جاتی
تو عرب مشعلیں جلا جلا کر قلعہ کی دیواروں اور بُرجوں کی مرمت کرتے، تکان وخستگی، ہر وقت کی
خبرداری، اور اس خیال سے کہ اگر ذرا بھی غفلت ہوئی تو سوائے موت کے اور کچھ نہیں ہے
عربوں کی حالت اس درجہ اضطراب کی ہو گئی کہ وہ ذرا ذرا سی بات سے شگون نکالتے اگر کوئی اور موقع
ہوتا تو وہ ان باتوں پر ہنستے، مگر جان کے خطرہ نے ان کا اعتقاد ضعیف کر دیا، ایک رات

---

[۱] یہ قلعہ الحمرا، وہی مقام ہے جہاں بعد کو بنو نصر کے زمانہ میں بیت الحمرا کی مشہور عمارات تیار ہوئیں، مترجم

ایسا ہوا کہ فصیل پر سے ایک کنکری ان کے سامنے آکر پڑی، ایک عرب نے اسے اٹھا کر دیکھا تو ایک کاغذ اس پر لپٹا ہوا تھا، کاغذ کو کھولا تو اس میں تین بیتیں لکھی تھیں، جب یہ عرب ان کو پکار کر پڑھنے لگا تو سب نے خاموش ہو کر سنا، مضمون اُن بیتوں کا یہ تھا۔

"ان کے گاؤں برباد ہیں اور اُن کے کھیت اجڑے پڑے ہیں آسمان پر گِدّے اُڑ کر ریت پھیلاتے ہیں، الحمرا میں بند پڑے پڑے وہ نئے نئے جرائم سوچ رہے ہیں مگر وہاں بھی اُن کو متواتر شکستیں اٹھانی پڑیں گی، جیسے کہ ان کے باپ دادا کو اٹھانی پڑی تھیں جو ہماری تلواروں اور برچھوں کے سامنے آئے تھے۔

جب یہ اشعار مشعلوں کی روشنی میں جن کے شعلے کبھی تیز اور کبھی ہلکے ہو جاتے تھے پڑھے گئے تو عرب جو پہلے ہی سے ناامید ہو رہے تھے، ان بیتوں کو سن کر اور بھی بددل اور مایوس ہو گئے، آخر کار ایک عرب نے کہا کہ "یہ کنکری نہیں گری ہے بلکہ خدا کی طرف سے ہمیں تنبیہ ہوئی ہے کہ ہوشیار رہیں، جس وقت ہم ان بیتوں کو سنتے تھے تو ایک خوف ہم پر غالب تھا اور وہ خوف ایسا تھا کہ اگر تمام عالم کی قوتیں بھی جمع ہو کر ہم پر حملہ کرتیں تو اس قدر خوف نہ ہوتا" بعض عرب جن پر ان اشعار کا زیادہ اثر نہ تھا، کہتے تھے کہ "یہ کنکری آسمان سے نہیں گری ہے بلکہ کسی دشمن نے باہر سے پھینکدی ہے اور یہ بیتیں اُس شخص کی کہی ہوئی ہیں جو اسپینیوں کا بڑا شاعر ہے" اس خیال سے رفتہ رفتہ سب لوگوں کو اتفاق ہو گیا، اور انھوں نے اپنے شاعر اسدی سے کہا کہ دشمن کے جواب میں اسی بحر اور قافیے میں شعر کہے، یہ کام اسدی کے لیے نیا نہ تھا، شاعری کے معرکے اسدی اور حبلی میں بہت ہو چکے تھے، لیکن اسدی کی طبیعت کسی قدر کمزور تھی، اور ذرا سی پریشانی بھی فکر شعر میں اس کے لیے مخل ہو جاتی تھی، اس وقت وہ کچھ ایسا سراسیمہ تھا کہ بہت کوشش کے بعد بھی صرف دو بیتیں لکھ سکا، جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ طبیعت حاضر نہیں ہے، ان دو بیتوں کا مضمون یہ تھا۔

"ہمارے گاؤں برباد نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہمارے کھیت اُجڑے ہیں، ہمارا قلعہ ہم کو تمام حملوں سے محفوظ رکھتا ہے، یہاں ہم کو شان و شوکت نصیب ہے یہاں ہم اپنے لیے فتح و فیروزمندی اور تمہارے لیے شکست و ہزیمت کی تدبیریں سوچ سکتے ہیں"

جواب پورا ہونے کے لیے تیسری بیت کی ضرورت تھی، اسدی کی حالت ایسی غیر ۳۳۱
ہو رہی تھی کہ تیسری بیت نہ کہہ سکا، شرمندگی سے آنکھیں نیچی کیے دوستوں کے سامنے خاموش اور پریشان کھڑا رہا، اور صورت سے یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے کبھی شعر کہا ہی نہ تھا۔

یہ ناگہانی مشکل ایسی پیش آئی کہ عربوں کی گئی ہوئی ہمت کا پھر آنا دشوار ہو گیا۔ پہلے تو کسی قدر اطمینان ہو جانے سے اُن کو یقین ہو چلا تھا کہ ان بیتوں میں کوئی امر خارقِ عادت نہیں ہے، لیکن جب اپنے شاعر اسدی کو دیکھا کہ تیسری بیت کہنے سے وہ قاصر ہے تو ان کا وہم پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا، اسدی شرمندہ و خجل ہو کر اپنے گھر چلا گیا، گھر پہنچ کر جب سونے کو لیٹا تو دفعتہً ایک آواز کانوں میں آئی جو کہتی تھی

"اور سچ ہے کہ جب ہم حملہ کرنے نکلیں گے تو تم کو ایسی بری شکست ہو گی کہ ایک آنِ واحد میں تمہاری بیویوں اور بچوں کے بال سفید ہو جائیں گے"

یہ گویا تیسری بیت تھی جو پہلے باوجود کوشش کے وہ نہ کہہ سکا تھا، اسدی کو یقین ہو گیا کہ کسی جن نے یہ بیت کہی ہے، اسی حالتِ خوف میں وہ دوڑا ہوا قبیلے کے سردار اضحی نامی کے پاس گیا اور بیت سنائی اضحی نے کہا "اس پر تم کو خوش ہونا چاہیے، اس بات میں مجھے تم سے اتفاق ہے کہ یہ بیت کسی جن کی کہی ہوئی ہے، جو پیشین گوئی اس میں کی گئی ہے وہ ایک دن ضرور پوری ہو گی، بے شک ایسا ہی ہو گا اور اسپینیوں کی یہ قومِ ناپاک ایک دن ضرور تباہ ہو گی"

عربوں نے یہ سمجھ کر کہ اب خدا کی نگاہِ مہر پھر ان کی طرف ہے، اسدی کی تینوں بیتوں کو کاغذ پر لکھ کر، اس میں ایک لکڑی لپیٹ کر دشمن کی طرف پھینک دی

ایک ہفتہ کے بعد عربوں نے دیکھا کہ اسپینیوں کا ایک لشکر بارہ ہزار آدمیوں کا مشرقی سمت سے اُن پر حملے کی تیاریاں کرتا ہے اور قریب کی ایک پہاڑی کے اوپر آلاتِ حرب نصب کرتا ہے، سوار نے اس بات کو مناسب نہ سمجھا کہ ایک بوسیدہ قلعے میں بند رہ کر اپنے بہادروں کو دشمن کے ہاتھوں سے قتل کرائے، اس لیے قلعے سے باہر نکل کر لڑنے کو تیار ہوا، لڑائی شروع ہوتے ہی سوار چند بہادر لڑنے والوں کی ایک جماعت کو لے کر چپکے سے میدان سے

علیحدہ ہوگیا، اور سب کی نگاہ بچاتا ہوا دشمن کی اُس فوج پر یکلخت جا پڑا جو پہاڑی پر جمع ہوئی تھی اور اس زور کا حملہ کیا کہ اُس فوج کے پاؤں اکھڑ گئے، پہاڑی کے نیچے اسپینیوں کی جو فوجیں کھڑی تھیں، وہ اپنی اس فوج کا حال دیکھ کر سخت خوف زدہ ہوئیں اور سمجھیں کہ عربوں کو کہیں سے کمک پہنچ گئی ہے، اتنا سمجھتے ہی اسپینی فوج میں بھاگڑ پڑی اور عربوں نے اُن کا تعاقب کیا حتی کہ مدینہ البیرہ کے دروازوں تک پہنچ گئے، اس تعاقب میں عربوں نے بارہ ہزار کو اور بعض کہتے ہیں کہ سترہ ہزار اسپینیوں کو قتل کر ڈالا

(۳۳) سعید بن جودی نے اس دوسری لڑائی کا حال جسے حرب مدینۃ البیرہ کہتے ہیں، اس طرح اپنی نظم میں لکھا ہے۔

ان زرد صورت والوں کے بیٹوں نے یہ دعوٰی کیا تھا کہ جب، ہمارا لشکر تمہارا مقابلہ کریگا تو وہ تمہارے سروں پر ایک طوفان کی طرح ٹوٹ پڑے گا، تم اِس حملے کو نہ سنبھال سکو گے، تم خوف سے کانپنے لگو گے، اور پھر مضبوط سے مضبوط قلعہ بھی تم کو پناہ نہ دے سکے گا، لیکن دیکھو جب وہ لشکر ہمارے سامنے آیا تو ہم نے اُسے پیچھے ہٹا دیا اور اس طرح ہٹایا جیسے کوئی کھانے پر سے مکھیاں اڑا دیتا ہے، اُن کو اس طرح سے ہانک دیا جیسے کوئی شترخانہ کھول کر اونٹوں کو باہر ہنکا دیتا ہے، یہ سچ ہے کہ طوفان سخت تھا، مینہ بڑی بڑی بوندوں کی صورت میں اترا، بادل گرجے اور بجلیوں نے بادلوں کو شق کر دیا، بیشک طوفان ایسا آیا لیکن وہ ہمارے سروں پر نہیں ٹوٹا تمہاری صفین کی صفیں ہماری تیز تلواروں سے کٹ کر اس طرح گریں جیسے اناج کاٹنے والے کی درانتی سے اناج کٹ کر گرتا ہے

جب انھوں نے ہمارے حملے کو دیکھا تو ہماری تلواروں نے ان میں ایسا خوف پیدا کیا کہ وہ اپنی پیٹھ دکھا کر بھاگے، پھر ہم اُن پر ٹوٹ پڑے اور اپنے برچھوں سے ان کو چھید لیا، بعض کو ہم نے قید کر کے اُن کو زنجیریں پہنا دیں، بعض موت کے سے کرب و اضطراب میں میدان سے بھاگے اور دنیا اُن پر تنگ ہوگئی، تم نے دیکھ لیا کہ ہم وہ منتخب روزگار ہیں جو اپنے دشمنوں کے سروں پر اس وقت بھی داغ لگا سکتے ہیں جس وقت

بقول تمہارے مینہ بڑی بڑی بوندوں میں برستا ہے، ہم ہیں آل عدنان سے جو لڑنے میں سب سے آگے رہتے ہیں، اور ہم ہیں آل قحطان سے جو عقاب کی مثل اپنے شکار پر گرتے ہیں، ہمارا سردار بڑا بہادر لڑنے والا ہے حقیقت میں وہ شیر ہے، ہر جگہ اس کی شہرت ہے اور وہ قیس کی اولاد سے ہے، برسوں سے شریف سے شریف اور بہادر سے بہادر لوگوں نے اس کی شجاعت اور مروت کی تعریف کی ہے، وہ عزت والا ہے، وہ اُن شجاعوں کی اولاد سے ہے جن کی نسل کبھی کسی غیر قوم کے خون سے آلودہ نہیں ہوئی وہ اپنے دشمن پر اس طرح آتا ہے جیسے ایک عرب یا قیسی کو آنا چاہیئے، کفار کے مقابلہ میں وہ ایمان کی سپر ہے

یہ سچ ہے کہ سوا اس دن اپنی اصیل تلوار کو چلا کر اس طرح دشمن کا سر کاٹ رہا تھا جیسے فولاد کی تیز دھار کاٹ سکتی ہے، یہ اُسی کا بازو تھا جس سے اللہ نے اُن کافروں کو قتل کرایا، جنھوں نے ہماری دشمنی پر کمر باندھی تھی، جب اِن زرد صورت والوں کے لیے موت کی گھڑی آئی تو ہمارا سردار اپنے بہادر جوانوں کو لیے اس طرح قائم ہوگیا، جیسے زمین پر پہاڑ قائم ہو، اور ان بہادر جوانوں کی تعداد اتنی تھی کہ اس تنگ معلوم ہونے لگی اور سب بہادروں نے یک لخت اپنے ہنہناتے گھوڑوں کو مہمیز کر کے دشمن پر دھاوا کر دیا۔

تم ہم سے لڑائی چاہتے تھے لڑائی ہوئی اور وہ تمھارے حق میں مہلک ثابت ہوئی اور خدا نے دفعتہً تم پر تباہی بھیجد ''

اسپینیوں[1] کی حالت اس لڑائی کے بعد ایسی نازک ہو گئی کہ اپنی قوم کے سب سے بڑے آدمی یعنی عمر بن حفصون کو اپنا سردار تسلیم کرنے کے سوا اب کوئی چارہ نہ رہا، اُنھوں نے ابن حفصون کو اپنا حاکم مان کر اس کی اطاعت قبول کی، ابن حفصون جو نزدیک ہی رہتا تھا، مدینۃ البیرہ میں

[1] یہاں اسپینیوں کا جہاں کہیں ذکر آیا ہے وہاں عیسائی اور مسلمان دونوں شامل سمجھنے چاہئیں صرف عیسائیوں سے مراد نہیں ہے، مترجم

مع اپنی فوج کے داخل ہوا، شہر کی فوج کو درست کیا اور قرب و جوار کے قلعوں میں جو فوجیں [illegible] تھیں ان کو اپنے علم کے نیچے جمع کر کے سوار کے مقابلے کو نکلا سوار کو اس اثنا میں جیان اور ریہ کے عربوں سے مدد پہنچ گئی تھی، اب اس کا لشکر اتنا زیادہ ہو گیا کہ ابن حفصون کے مقابلے میں کامیابی کی امید ہو گئی اور یہ امید غلط نہ تھی، سوار کے مقابلے میں ابن حفصون کی بڑی بڑی بہادر فوجیں غارت ہو گئیں، ابن حفصون خود زخمی ہوا اور میدانِ جنگ سے بھاگا، چوں کہ لڑائیوں میں اکثر جیتا کرتا تھا اس لیے اس موقع پر فاش شکست کھا کر بہت ہی غصہ آیا اور شکست کا سارا ۲ الزام باشندگانِ البیرہ پر تھوپ دیا، اور اُن کو سخت ملامت کی کہ لڑائی کے وقت اس کے کہنے پر عمل نہیں کیا، اس غصہ میں اُس نے مدینہ البیرہ کے لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کیں اور اس جنگ میں جو صرف البیرہ کے لوگوں کے لیے لڑی گئی تھی جس قدر مصارف ہوئے تھے شہر والوں سے وصول کیے اور اپنے ایک فوجی سردار حفص بن المورہ[1] کو مدینہ البیرہ کی حفاظت پر چھوڑ کر خود بقیۃ السیف کو ساتھ لیے قلعہ ببشتر کو واپس چلا آیا۔

جن عربوں کو قید کر کے اپنے ساتھ لایا، اُن میں مشہور شاعر سعید بن جودی بھی تھا، اسی زمانۂ اسیری میں اس نے یہ شعر کہے تھے،

"میرے دوستو! ہمت اور امید کو ہاتھ سے نہ جانے دو، یقین کر لو کہ مصیبت کے بعد راحت نصیب ہو گی، اور تکلیف کو خوشی کے ساتھ بدل کر تم یہاں سے جاؤ گے اور لوگ بھی جنھوں نے برسوں اس زندانِ تاریک میں گذارے ہیں، آج روشنی میں خوش خوش پھر رہے ہیں، افسوس! اگر آج ہم قیدی ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیے تھے، بلکہ ہم نے خود دشمن کو اپنے اوپر اچانک آنے دیا، اگر کوئی چیز مجھ کو پہلے سے آگاہ کر دیتی تو میری برچھی کی نوک میری حفاظت کرتی کیونکہ خطرہ کے وقت میری ہمت و جوانمردی کا حال سواروں کو معلوم تھا۔

اور اے مسافر! اب جا، اور میرے شریف باپ اور میری پیاری ماں کو میرا

[1] نام سے نومسلم اسپینی معلوم ہوتا ہے،

سلام پہنچا، یہ دونوں اس بات کو بہت خوشی سے سنیں گے کہ تو مجھے دیکھکر انکے پاس آیا ہے، اور میری پیاری بیوی سے بھی سلام کہنا، اور یہ پیام اسے پہنچا دینا کہ میں قیامت تک تمہارے ہی تصور میں رہونگا اور اپنے دل پر تمہارا نقش لیئے پروردگار کے سامنے جاؤنگا۔ سچ یہ ہے کہ جو تکلیف اور رنج تم کو اس وقت ہے اس کی تکلیف مجھ کو قید کی تکلیف بلکہ قبر کی تکلیف سے بھی بڑھ کر ہے۔

شاید میں یہاں قتل کردیا جاؤں اور یہیں مجھکو دفن بھی کردیا جائے گا لیکن ایک بہادر آدمی ہو کر میں ایسی موت کو پسند نہیں کرسکتا۔ بلکہ چاہتا ہوں کہ میدان جنگ میں لڑتا ہوا مردوں، اور میری لاش کو کرگس کھائیں"

ابن حفصون کے جانے کے بعد سوار ایک ایسی جگہ پھنس گیا جہاں مدینۃ البیرہ کے لوگ اسکو ہلاک کرنے کے لیئے چھپے بیٹھے تھے ان لوگوں نے سوار کو مار ڈالا جب شہر میں اس کا جنازہ نکلا تو لوگ خوشی سے نعرے لگانے لگے، عورتوں نے جنہیں خون کا نشہ چڑھا ہوا تھا لاش کو اس طرح دیکھا جیسے کوئی درندہ گوشت کو دیکھتا ہے، یہ اس شخص کی لاش تھی جس نے ان کے بھائیوں خاوندوں اور بچوں کو مارا تھا۔ وہ دیکھتے ہی ایسی بیتاب ہوئیں کہ چیخیں مارتی ہوئی لاش پر جا پڑیں اور لاش کی بوٹیاں نوچ نوچ کر کھا گئیں[1]

ابن حفصون نے سعید بن جودی کو کچھ دن قید رکھنے کے بعد رہا کر دیا تھا جب سوار القیسی مارا گیا تو عربوں نے سعید کو اس کا جانشین مقرر کیا، اگرچہ سعید سوار کا دوست تھا، اور اس کی شجاعت اور شرافت کی تعریف بھی اپنے اشعار میں لکھ چکا تھا۔ مگر خود سوار سے کسی بات میں ملتا نہ تھا۔ سعید عالی نسب تھا امیر حکم کے زمانہ میں اس کا دادا پہلے مدینۃ البیرہ میں عہدہ قضا پر پھر حاکم شہر قرطبہ کے ممتاز منصب پر مامور رہا تھا، عربوں میں سعید بے مثل لڑنے والا تھا۔ اس کے ہم عصر

[1] پروفیسر ڈوزی کا مترجم مسٹر سٹوکس یہاں ایک نوٹ اس مضمون کا لکھتا ہے غالباً انہی کی نسل سے وہ عورتیں تھیں جنہوں نے نپولین کے زمانہ میں فرانس کے زخمی سپاہیوں کو دیکھتے ہی غل مچا مچا کر ان کی آنکھوں میں چاقو اور قینچیاں بھونکی تھیں (مترجم)

لوگوں نے دس اوصاف اس میں بتائے تھے جو ایک کامل شریف آدمی میں اس وقت ضروری
سمجھے جاتے تھے، یعنی سخاوت، شجاعت، شہسواری، حسن صورت ملکہ شاعری، فصاحت
۳۳۴ھ جسمانی طاقت، نیزہ بازی، تلوار چلانا، اور تیراندازی یہی ایک عرب تھا جس کے سامنے میدان
جنگ میں آتے ہوئے ابن حفصون کانپتا تھا، ایک معرکۂ جنگ میں لڑائی شروع ہونے سے پہلے
بوقت سعید نے ابن حفصون کو للکارا کہ آؤ ہم تم باہم لڑ کر فیصلہ کر لیں، تو ابن حفصون
کی ہمت نہ ہوئی کہ سعید سے لڑے اور ایک دوسرے موقع پر جب کہ ہنگامہ کارزار گرم تھا۔ اور ابن
حفصون اتفاق سے سعید کے سامنے آگیا تو اس نے فوراً سعید سے چھپنا چاہا مگر سعید نے دوڑ کر
کمر میں ہاتھ ڈال ابن حفصون کو زمین پر پٹک دیا سعید اسی وقت اس کا کام تمام کر دیتا لیکن ابن
حفصون کے سپاہی بیچ میں آگئے اور بڑی مشکل سے اس کو سعید کی گرفت سے چھڑایا۔

عرب کا یہ شجاع، جو شجاعوں میں سب سے بڑھ کر تھا۔ جیسا دلیری اور جوانمردی میں سخت تھا۔ ویسا ہی عشق و محبت کی باتوں میں نرم تھا۔ کسی کی سریلی آواز یا خوبصورت بال کسی پھول سے دست نازک کا حسن جیسا اس کو مفتون کرتا تھا، دوسرے کو نہ کرتا تھا۔

امیر محمد کے زمانہ حکومت میں شہزادہ عبداللہ کے محل کے قریب سے سعید ایک رات گزر رہا تھا کہ ایک عورت کے گانے کی دلکش صدا کانوں میں آئی یہ گانا محل کے نیچے کی منزل میں ہو رہا تھا اور اس کی کھڑکی گلی کی طرف کھلی ہوئی تھی گانے والی جہینہ تھی جس کا حسن مشہور تھا پر اس وقت اپنے آقا یعنی شہزادہ عبداللہ کے پاس بیٹھی کبھی جام شراب بھر کر شہزادے کو دیتی تھی اور کبھی گانا سناتی تھی، سعید کا دل بے قابو ہو گیا گلی کے اندر ایک گوشہ میں اسطرح کھڑا ہو گیا کہ کوئی راہ گیر اسے دیکھ نہ سکے۔ نظر کھڑکی کی طرف جمائی اور ایک عالم محویت میں گانا سنتا رہا مگر تمنّا یہی تھی کہ کسی طرح گانے والی کی صورت نظر آجائے بڑی دیر تک اسی حال میں کھڑے رہنے کے بعد ایک گورا گورا نازک ہاتھ شہزادے کو جام شراب دیتا نظر آیا۔ بس اتنی جھلک کے بعد پھر کچھ اور نظر نہ آیا۔ مگر اسی جھلک میں ہاتھ کی خوبصورتی اور آواز کے حسن نے دل و دماغ میں ایک آگ لگا دی۔ عشق پیدا ہو گیا۔ مگر عاشق و معشوق میں ایک پردہ ایسا حائل تھا جو کبھی نہ اٹھ سکتا تھا جب بالکل مایوس ہوا تو اس جذبۂ عشق کو کسی دوسری راہ پر ڈالنا چاہا زر کثیر صرف کر کے

ایک نہایت خوبصورت کنیز مشکل سے تلاش کر کے خریدی اور اس کا نام جہینہ رکھا، گو اس جہینہ نے اپنے آقا کو خوش اور محفوظ رکھنے کی کوشش کی لیکن پہلی جہلینہ کا نقش اس کے دل سے نہ مٹا سکی جیسے سعید نے ان اشعار میں یاد کیا تھا۔

نغمہ جانفزا جو سنا تھا اس نے دل میں نشاط پیدا کیا پھر اس نشاط کے بدلے اس نے غم کو مسلط کر دیا جو مجھے اب گھلائے دیتا ہے، جہلینہ کو میں قیامت تک بھولونگا کبھی اس سے یہ آنکھیں دوچار نہیں ہوئی ہیں مگر دل اسی کے حوالے کر چکا ہوں جہلینہ میری زندگی کی آرزو ! یہ دل جو ایک طائر کی طرح پھڑکتا ہوا تیرے پاس آیا ہے اس کو پناہ دے رو رو کر تیرا نام اس طرح لیتا ہوں جیسے ایک صنم پرست صنم کے سامنے جوش پرستش میں سر بسجود ہو کر اس کا نام پکارتا ہے ،،

باوجود اس گرمی کلام کے سعید کو جہلینہ بہت دن تک یاد نہ رہی جو طبیعت ایک ایک آن میں ہوا کی طرح اپنا رخ بدلتی ہو، جو دل ہمہ وقت ایک لذت سے دوسری لذت کی جستجو میں ہو اس کے عشق کو دوام کب نصیب ہو سکتا ہے ؟ سعید کے ایسے اشعار جن سے یہ کیفیت ظاہر ہوتی ہے یہاں درج کئے جاتے ہیں، مگر یہ وہ اشعار ہیں جن کو کوئی عرب بغیر اس جملے کے کہ ،، اللہ اس کو معاف کرے ،، نہ پڑھتا تھا۔ (۳۳۵)

،، شیریں سے شیریں ساعت زندگی کی وہ ہے جب کہ شراب کا دور چل رہا ہو جب کہ لڑائی کے بعد معشوق سے پھر مصالحت ہو گئی ہو اور اس سے بھی بڑھ کر لذت کی وہ ساعت ہے جب کہ دونوں ہم کنار ہوں اور دونوں کے دل آسودہ ہو جائیں حلقہ نشاط میں اس طرح دوڑ رہا ہوں جیسے منہ زور گھوڑا دہانہ دانتوں میں دبا کر دوڑتا ہو کسی ارمان کو بغیر نکالے نہیں چھوڑتا۔

لڑائی میں موت کا فرشتہ میرے سر پر منڈلاتا ہے تو میں اپنی جگہ سے ہرگز نہیں ہلتا، لیکن دو خوبصورت آنکھیں جہاں چاہتی ہیں مجھے لے جاتی ہیں ،،

جب ایک نئی حسینہ قرطبہ سے سعید کے پاس پہنچی تو وہ جہلینہ کو بھول گیا جونہی یہ نازنین سعید کے سامنے آئی، شرم و حیا نے مجبور کیا کہ آنکھیں نیچی کر لے اس پر سعید نے یہ اشعار پڑھے

"اے حسین صورت! تو نے اپنی نظریں میری طرف سے ہٹا کر فرش کی طرف کیوں جھکا دیں؟ کیا میری صورت نے تجھے ناخوش کیا؟ خدا کی قسم میری صورت نے ایسا خیال کسی کے دل میں اب تک پیدا نہیں کیا تھا۔ میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ میں اس فرش سے کہیں زیادہ تیری توجہ کے لائق ہوں"۔

اس میں شبہ نہیں کہ شرفاء عرب کی تمام خوبیاں سعید میں موجود تھیں لیکن سوار القیس کے سے کھرے اوصاف اس میں نہ تھے اس لیے سوار کی موت سے جو نقصان اہل عرب کو پہنچا تھا اس کی تلافی سعید نہ کر سکا۔

سوار نے اپنی زندگی میں پرانے رومانی قلعوں کی جو ٹوٹ پھوٹ چلے تھے مرمت کرا دی تھی۔ مثلاً منتیشہ اور لبط کے قدیم قلعوں کو پھر مستحکم کر دیا تھا۔ اس لیے سعید کے زمانہ میں عربوں کی بات بہت کچھ بنی رہی۔ مسلمان مورخ سعید کے جنگی معرکوں کے حالات میں بہت اختصار سے کام لیتے ہیں۔ جو کافی ثبوت اس بات کا ہے کہ ان معرکوں میں سعید کو کامیابی نہیں ہوئی لیکن ان کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ کم سے کم ایک مرتبہ تو مدینہ البیرہ پر سعید کا قبضہ ضرور ہو گیا تھا۔ سعید جب شہر میں داخل ہوا۔ تو اسپینیوں کا شاعر عبلی قصیدہ لیکر حاضر ہوا۔ سعید نے اسے بہت انعام دیا۔ جب شاعر انعام لے کر رخصت ہوا تو ایک عرب نے سعید سے کہا "اے امیر! تو نے اس شخص کو روپیہ دیا ہے۔ کیا تجھے علم نہیں کہ تھوڑے ہی دن ہوئے کہ یہی شاعر سب سے بڑا مفسد تھا۔ کیا یہ وہ نہیں ہے جس نے کہا تھا کہ:

"وہ مردے جن کو ہم نے (اسپینیوں نے) کوئیں میں پھینکا ہے۔ بہت دن تک منتظر رہیں گے کہ ان کے خون کا بدلہ لینے والا کوئی پیدا ہو"۔

سعید کو اتنا سنتے ہی یہ معلوم ہوا کہ زخم جو پورا مندمل نہ ہوا تھا، پھر پھوٹ نکلا غصہ سے آنکھیں لال ہو گئیں اور فوراً یحیٰ بن سخالہ کے ایک عزیز سے کہا کہ "اس آدمی کے پیچھے جاؤ اور اس کو قتل کر کے اس کی لاش کو بھی کوئیں میں پھینک دو"۔

اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔

اسناد

ابن حیان ص ۶۲ تا ۶۳، ۳۷ تا ۹۴، ۹۲ تا ۹۴

ابن القوطیہ ص ۳۷

سیمس جلد ۲ ص ۴

ابن الابار ص ۸۰ تا ۸۷

ابن الخطیب۔ قلمی نسخہ (ی) ص ۵ سوار پہ ایک مضمون قلمی نسخہ ۴ اور ایک مضمون سعید ابن جودی پہ

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

تیرھویں فصل

اشبیلیہ کے اسپینی مسلمان (مولدون)

جس زمانہ میں البیرہ کے اسپینیوں اور عربوں میں فتنہ و فساد کا بازار گرم تھا اسی زمانہ میں (۳۳۷)
اشبیلیہ میں اس سے بھی زیادہ اہم واقعات پیش آرہے تھے۔

قومی فریق (یعنی مروانی سلطنت کے خلاف مسلمان اور عیسائی اسپینیوں کے فریق)، کو جو طاقت اور زور اشبیلیہ میں حاصل تھا وہ دوسری جگہ نہ تھا، قوم فیسقوط کے زمانہ حکومت سے اشبیلیہ رومانی تہذیب و تمدن اور علم و اخلاق کا مرکز اور شریف خاندانوں کا وطن تھا فتوح عرب سے ان کی طرز معاشرت میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا تھا، عرب جو بالعموم دیہات میں رہنا پسند کرتے تھے، شہر میں بہت کم آباد تھے اس لیے شہر کے باشندوں میں زیادہ تر لوگ رومانی اور قوطی نسل کے تھے (قطع نظر اس کے کہ وہ مسلمان تھے یا عیسائی۔ مترجم) زراعت و تجارت نے انہیں دولت مند کر دیا تھا۔ شہر اشبیلیہ جو دلوی الکبیر کے کنارے واقع تھا ایک بڑا بندرگاہ بھی رکھتا تھا، جہاں دور دور کے سمندروں سے جہاز آیا کرتے تھے، تاکہ روئی،

زیتون، اور انجیر بھر کر باہر کے ملکوں میں لے جاتیں، یہ چیزیں اشبیلیہ کے علاقے میں بکثرت پیدا ہوتی تھیں، اشبیلیہ کے باشندوں نے شروع ہی میں عیسائی مذہب ترک کر کے اسلام قبول کر لیا تھا۔ کیونکہ امیر عبد الرحمٰن الاوسط ہی کے زمانہ میں ایک بہت بڑی مسجد نو مسلموں کے لیئے شہر میں تعمیر کرنی پڑی تھی، البکن باوجود اس ترکِ مذہب کے ان لوگوں کے طور طریقے مشاغل اور خاندانی نام وہی رہے جو سابق سے چلے آتے تھے۔ یہ نام مثلاً بنی انجلینو بنی سبار لیقو ایسے تھے جن سے ان کا اسپینی ہونا قطعی ثابت ہوتا تھا[1]۔

یہ اسپینی مسلمان امن وعافیت کی زندگی پسند کرتے تھے اور بادشاہ وقت سے عداوت رکھنے کی بجائے اس کو رعایا کی جان ومال کا محافظ اور نگہبان سمجھتے تھے لیکن عربوں سے وہ ڈرتے تھے، بالخصوص ان سے جو دیہات میں رہتے تھے، شہر میں جو عرب آباد تھے انمیں تہذیب وشائستگی کا اثر بہت ہو گیا تھا۔ اور محض اختلافِ قوم ونسل کی بنا پر باہمی نفرت وعداوت کا خیال ان میں باقی نہ رہا تھا، لیکن دیہات کے عربوں میں وحشیانہ خصائل، قومی تعصب دوسروں کو حقارت سے دیکھنے اور لڑ بیٹھنے کی عادتیں بدستور موجود تھیں اور جن قدیم عربی خاندانوں کی وہ عزت کرتے تھے جن میں سے ان کے سردار منتخب ہوا کرتے تھے اور جن کے حکم کو وہ مانتے تھے ان کی عزت ووقعت اپنے دل میں وہی قائم رکھی جو ہمیشہ سے تھی مالدار (۲۲۸ اسپینیوں کی دولت کو دیکھ کر ان عربوں کو رشک ہوتا تھا اور موقع پاتے تھے تو ان کو لوٹتے ہی نہ تھے بلکہ ان میں قتل عام بھی کرتے تھے۔ اشبیلیہ سے مغرب میں جو شاداب اور زرخیز علاقہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جسے اقلیم الشرف یا شرف اشبیلیہ[2] کہتے تھے وہاں کے عرب جنہیں قوت بھی زیادہ حاصل تھی ان باتوں میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اسپینیوں میں ایک پیشین گوئی چلی آتی تھی کہ اشبیلیہ کا شہر ایک دن آگ سے غارت ہوگا اور یہ آگ شرف اشبیلیہ سے اٹھے گی غرض یہ حالات دیکھ کر ان ابنائے صحرا کی دست درازیوں سے پناہ میں رہنے کیلئے شہر کے

---

[1] شمالی اسپین کے پرانے عہد ناموں میں یہ نام ملتے ہیں دیکھو اسپینا سگرادا جلد ۳ ص ۴۶۹

[2] یہ قطعہ اشبیلیہ اور لبلہ کے درمیان واقع تھا۔

لوگ اپنا انتظام کرتے رہتے تھے ان عربوں کے بارہ گروہ تھے، ہر گروہ کا سردار علم، اور سلح خانہ جدا تھا۔ اور ان سب نے علاقہ اشبیلیہ کے مغدی عربوں اور مورور کے بتر بربر سے اتحاد کر رکھا تھا۔

صوبہ اشبیلیہ کے ذی اقتدار عربی خاندانوں میں دو خاندان بہت ممتاز تھے ان میں ایک خاندان بنی حجاج کا تھا، اور دوسرا بنی خلدون کا بنی حجاج گو اپنے خیالات میں بالکل عرب تھے لیکن ننھیال کی طرف سے وہ قوطیوں کے بادشاہ غیطشہ کی اولاد میں تھے غیطشہ اسپین کا وہ بادشاہ تھا۔ جس کے بعد ہی رزریق بادشاہ ہوا تھا جس سے مسلمانوں نے اسپین فتح کیا تھا۔ بادشاہ غیطشہ کی پوتی سارہ جب بیوہ ہوئی تھی تو اس کا نکاح عرب کے ایک رئیس عمیر لخمی سے ہوا تھا جو یمانیہ سے تھا اس شوہر سے سارہ کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے جن سے چار بڑے خاندانوں کا سلسلہ چلا، ان خاندانوں میں سب سے دولت مند خاندان بنی حجاج کا تھا سارہ ہی کی بدولت بنی حجاج علاقہ سفید کی وسیع جائداد کے مالک ہوتے تھے (یہ علاقہ صوبہ اشبیلیہ اور صوبہ لبلہ کے بیچ میں واقع تھا) کیونکہ ایک عربی مورخ نے جو خود اولاد سارہ سے غیطشہ کے اخلاف میں تھا۔ لکھا ہے کہ سارہ کے علاوہ عمیر کی بیویوں سے بھی لڑکے تھے لیکن دولت و ثروت میں وہ سارہ کے لڑکوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

دوسرا بڑا معزز خاندان بنی خلدون کا تھا، یہ لوگ بھی یمانیہ تھے اور قبیلہ حضر موت سے متعلق تھے، ان کی جائیداد شرف اشبیلیہ میں تھی۔

ان دو بڑے خاندانوں یعنی بنی حجاج اور بنی خلدون کے لوگ زمیندار اور مردان پیکار ہونے کے علاوہ بڑے تاجر اور جہازوں کے مالک بھی تھے اکثر دیہات میں عالیشان حویلیوں میں رہتے تھے جن کو برج کہتے تھے، شہر اشبیلیہ میں بھی ان کے مکانات تھے، جنہیں دیکھنے کو وہ شہر میں کبھی کبھی آیا کرتے تھے۔

جس وقت امیر عبداللہ کا عہد حکومت شروع ہوا تو بنی خلدون کا رئیس اعظم کریب تھا۔ یہ شخص بڑا عیار اور ہوشیار تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ایسے کل اوصاف اس میں موجود تھے جو کسی فریق کی سرداری کے لیے ضروری ہوتے ہیں اپنی قومی روایات پر ثابت قدم تھا اسلئے

مطلق العنان بادشاہی سے اس کو نفرت تھی اور چاہتا تھا کہ جس قبیلہ کا وہ خود ہے یعنی یمانیہ سے کوئی شخص اسپین کا امیر ہو اور بنو امیہ جنھوں نے یمانیہ کی مدد سے اسپین کی حکومت حاصل کی تھی مسندِ امارت سے علیحدہ کر دیے جائیں، اسی غرض سے پہلی کوشش اس کی یہ تھی کہ اشبیلیہ کے شہر میں بغاوت پھیلائے، چنانچہ شہر کے عربوں کو سرکشی پر آمادہ کرنا چاہا، اور اس بات کی کوشش کی کہ اُن میں آزادی کا جوش پیدا ہو، لیکن کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ یہ عرب اکثر ۹۱
قریشی یا حکمراں خاندان بنی امیہ کے موالی اور تخت کے خیر خواہ تھے، یا یہ سمجھیے کہ ایسے فریق سے تعلق رکھتے تھے جو ملک میں ہمیشہ قانون کی پابندی اور امن و امان قائم رکھنا چاہتا ہے، ان لوگوں کی خواہش یہ تھی کہ یہ خیر و سلامتی سے آباد رہیں، نہ اُن کے کاروبار میں فرق آئے اور نہ آرام و آسائش میں خلل واقع ہو، اس لیے کریب کے منصوبوں کو وہ پسند نہ کر سکے، بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ کریب کی طبیعت میں دنیا طلبی و جاہ پسندی ہے، اور آدمی بھی وہ ایسا ہے کہ جو چاہے سو کر گزرے تو پھر اُن کو ایک قسم کا خوف اور تنفر اس سے پیدا ہوا، کریب جب کبھی حصول آزادی کی گفتگو کرتا تو وہ کہتے کہ ”ہم بد نظمی کے دشمن ہیں اور کسی شخص واحد کی طمع پوری کرنے کے لیے خود کوئی ذریعہ بننا نہیں چاہتے، اور اس کے بُرے مشوروں سے اپنا دامن پاک رکھنا چاہتے ہیں“

کریب یہ سوچ کر کہ شہر میں تو کوئی اس کی بات سنتا نہیں یہاں وقت مفت میں ضائع کرتا ہے شرف اشبیلیہ کو واپس چلا آیا، جہاں اُس کی جائیداد تھی، یہاں اپنی قوم یعنی یمانیہ میں اُس نے بہت جلد ایک جنبش پیدا کر دی، اور ان سب نے وعدہ کر لیا کہ کریب کا اشارہ پاتے ہی وہ ایک دم ہتھیار اُٹھا لیں گے، اس کے بعد کریب نے ایک گروہ قائم کیا جس میں بنی حجاج اور لبلہ اور شذونہ کے دو بڑے سردار اور قرمونہ کے رہنے والے بربر شریک ہوئے، مقصد اس گروہ کے قائم کرنے کا یہ تھا کہ اشبیلیہ کو امیر عبد اللہ کی حکومت سے نکال کر اسپینیوں کو خوب لوٹا جائے، اشبیلیہ کے اسپینی رئیس اس سازش سے آگاہ نہ تھے، کچھ کچھ خبریں اُن کے کانوں تک پہنچی تھیں، مگر معاملات کا صحیح علم اُن کو نہ تھا۔ اور نہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ کوئی سخت ہنگامہ ہونے والا ہے۔

اس نیت سے کہ جن لوگوں نے اُس کے مشورے کو نہیں مانا تھا اُن سے انتقام لیا جائے اور لوگوں پر یہ ثابت ہو جائے کہ امیر عبداللہ اپنی رعایا کی حفاظت سے قاصر ہے، کریب بن خلدون نے خفیہ طور پر مارده اور مدلین کے قبائل بربر کو اطلاع دی کہ اشبیلیہ سرکاری فوجوں سے آجکل خالی ہو گیا ہے، اگر مالِ غنیمت کثرت سے حاصل کرنے کا شوق ہے تو یہ بالکل اُن کے اختیار میں ہے، مارده اور مدلین کے نیم وحشی بربر جو لوٹ کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ فوراً اشبیلیہ پر حملہ کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، اور طلیاطہ کی بستی پر جو اشبیلیہ سے تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر وادیٔ آرہ کے پُل سے جنوب میں تھی قبضہ کر کے وہاں کے لوگوں کو لُوٹنے لگے، مردوں کو مار ڈالا، عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا، یہ ہنگامہ سنتے ہی حاکم اشبیلیہ شہر کے ایسے لوگوں کو جو ہتھیار باندھ سکتے تھے لیکر بربر کے مقابلہ کو نکلا، یہ سن کر کہ طلیاطہ پر بربر کا قبضہ ہو چکا ہے حاکمِ اشبیلیہ نے اپنا لشکر ایک پہاڑی پر جسے جبل زیتون کہتے تھے اُتار دیا، جبل زیتون کا فاصلہ طلیاطہ سے جہاں دشمن تھا تین میل کا تھا، اب فریقین جنگ کی تیاریاں کرنے لگے، اشبیلیہ کے اور رئیسوں نے جہاں اپنی طرف سے کچھ سپاہ حاکم شہر کی مدد کو بھیجی تھی وہاں کریب بن خلدون نے بھی ایک دستہ اپنی فوج کا اس کے پاس بھیجدیا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی رات کے وقت بربر کو اطلاع کر دی تھی کہ
(٣٢ تمہاری فتح کو آسان کرنے کے لیے ہم اپنی فوج عین لڑائی کے وقت حاکمِ اشبیلیہ کے لشکر سے علیحدہ کر لیں گے، کریب نے یہی کیا بھی۔

دوسرے دن جب کریب اپنی فوج کو لے کر بھاگا تو حاکم اشبیلیہ کی باقی فوج بھی بھاگی اب اس بھاگتی ہوئی فوج کا بربر نے تعاقب کیا، حاکمِ اشبیلیہ نے بھاگ کر پانچ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں میں جس کا نام ہیبر تھا دم لیا، اور یہاں گاؤں کے گرد خندق کھود کر قلعہ نشین ہو گیا، بربر نے یہ کوشش نہیں کی کہ اُسے اپنی جگہ سے ہٹائیں، اسلیے کچھ تعاقب کے بعد وہ طلیاطہ کو واپس چلے آئے، اور یہاں تین دن تک لشکر ڈالے آس پاس کے مقامات کو لوٹتے اور غارت کرتے رہے، اور اس کے بعد یہ لوگ کثرت سے مالِ غنیمت ساتھ لیے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔

بربر کی اس غارت گری نے صوبہ اشبیلیہ کے بہت سے زمینداروں کو تباہ کر دیا، یہ تباہی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ اشبیلیہ کے لوگ ایک دوسری مصیبت میں گرفتار ہوئے اس مرتبہ کریب کو اپنی کسی حرکت پر اپنے کو ملامت کرنے کی ضرورت نہ ہوئی، اس کے مقاصد اسی کے دشمنوں کے ایک سردار یعنی ابن مروان جلیقی نے پورے کیے، ابن مروان اس وقت بطلیوس کا مالک ہو رہا تھا، یہ دیکھ کر کہ قریب کے شہر مارده کے لوگ بہت کچھ مال غنیمت حاصل کر کے لائے ہیں، ابن مروان نے ارادہ کیا کہ ایک لڑائی چھیڑ کر خود بھی بہت سا مال حاصل کرے، چنانچہ فوج لیکر اشبیلیہ کی طرف بڑھا، اور اشبیلیہ سے دس میل ادھر ہی وہاں کے دیہات اور قصبات کئی دن تک لوٹتا رہا، اور جب بطلیوس کو واپس ہوا تو مال غنیمت کے لحاظ سے اب کوئی وجہ مارده کے بربر پر رشک کرنے کی نہ رہی

حاکم اشبیلیہ کی اس کاہل وجودی سے کہ ملک لٹ رہا ہے اور اسے جنبش نہیں اشبیلیہ کے لوگ سخت ناراض ہو گئے اور امیر عبداللہ پر بھی انھیں غصہ آیا کہ کیسا حاکم اُن کے شہر کے لیے مقرر کر کے بھیجا ہے، جب انھوں نے امیر سے شکایت کی تو یہ سچ ہے کہ امیر نے اس نالائق حاکم کو معزول کر دیا. مگر جو آدمی اس کی جگہ بھیجا گو وہ بہت دیانتدار تھا مگر انتظام اُس سے بھی نہ ہوا، اور لوٹ مار کرنے والے جو روز بروز ترقی پر تھے اُن کا کچھ انسداد نہ کر سکا،

ان لٹیروں میں سب سے بڑھ کر ایک بربری رئیس بربر تماشکہ نامی قرمونہ کا رہنے والا تھا یہ اشبیلیہ سے قرطبہ جانے والی سڑک پر مسافروں کو لوٹا کرتا تھا، حاکم اشبیلیہ کی یا تو ہمت نہ پڑتی تھی یا وہ سامان نہ رکھتا تھا کہ اس قزاق کے مقابلے کو اُٹھے، آخر کار استجہ کے ایک بہادر اسپینی مسلمان نے جس کا نام محمد بن غالب تھا ان قزاقوں کو نیست و نابود کرنے کا بیڑا اٹھایا مگر اس شرط سے کہ اشبیلیہ اور استجہ کی سرحد پر ستبیاتورس کے گاؤں کے قریب ایک قلعہ بنانے کی اجازت امیر عبداللہ کی طرف سے عطا ہو، امیر نے یہ درخواست منظور کر لی، ابن غالب نے قلعہ بنا کر ایک بڑی فوج اسپینی مسلمانوں، اور موالی بنی امیہ، اور بتر بربر کی اُس میں مقیم کر دی اور قزاقوں کو جلد معلوم ہو گیا کہ اب جس شخص سے مقابلہ ہے وہ حاکم اشبیلیہ نہیں ہے.

رعایا کی حفاظت اور امن کا انتظام ہو رہا تھا کہ ایک دن صبح ہوتے ہی مشہور ہوا کہ بنی خلدون (۳۴۱)

اور بنی حجاج کے لوگوں سے ابن غالب کی فوج کا جو قلعے میں رہتی تھی مقابلہ ہو گیا اور بنی حجاج کا ایک آدمی مارا گیا، اور اُس کے ساتھی اب اس کی لاش کو شہر میں لا رہے ہیں، یہ بھی خبر مشہور ہوئی کہ بنی حجاج نے حاکم اشبیلیہ کے اجلاس میں استغاثہ دائر کیا ہے لیکن حاکم نے ایسے مقدمہ میں فیصلہ سنا کر ذمہ داری اپنے سر لینے سے انکار کر دیا، اور مستغیثوں سے کہہ دیا کہ امیر اندلس سے فریاد کریں۔

اشبیلیہ میں یہ چرچے ہو رہے تھے کہ مستغیث قرطبہ روانہ ہوئے، اُن کے پیچھے پیچھے اشبیلیہ کے کچھ اسپینی رئیس بھی قرطبہ پہنچے، اُن کو معاملہ کی اصل کیفیت ابن غالب سے معلوم ہو گئی تھی، اُن کا ارادہ تھا کہ امیر کے دربار میں ابن غالب کی طرف سے وکالت کریں گے، ان لوگوں کا سردار ایک بڑا اسپینی رئیس تھا جس کا نام محمد بن عمر بن خطاب بن انجلینو تھا، اُس کے پردادا انجلینو نے اسلام قبول کیا تھا، جب سے اِس نومسلم خاندان کا نام "بنی انجلینو" چلا آتا تھا۔

فریادیوں نے امیر عبداللہ کے حضور میں پیش ہو کر عرض کیا کہ "ہم چپ چاپ اپنے رستے پر جا رہے تھے کہ ابن غالب نے ہم پر دفعتہً حملہ کیا، ہم نے اپنے کو بچانا چاہا، اور اس کوشش میں ہمارا ایک آدمی مارا گیا، ہم قسم کھانے کو تیار ہیں کہ ہمارا یہ بیان بالکل سچ ہے اور ہماری درخواست ہے کہ اس عہد شکن ابن غالب کو سزا دی جائے، اور ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ جس شخص نے آپ سے اسپینی مسلمان ابن غالب پر اعتماد کرنے کو کہا اس نے آپ کے ساتھ برائی کی، ابن غالب کے ساتھ جو لوگ ہیں تحقیقات پر معلوم ہو گا کہ اُن میں اکثر جرائم پیشہ ہیں اور بدترین خلائق میں ان کا شمار ہے، حضور یقین کر لیں کہ ابن غالب باغی اور دغا باز ہے، اس وقت وہ حضور کا خیر خواہ معلوم ہوتا ہے لیکن خوب معلوم ہے کہ خفیہ طور پر وہ ابن حفصون سے ملا ہوا ہے اور کسی نہ کسی دن اس مُلک کو ابن حفصون کے حوالے کر دیگا۔"

جب یہ بیان ختم ہوا تو محمد بن انجلینو نے آگے بڑھ کر امیر سے عرض کیا کہ "حقیقت حال یہ ہے کہ خلدون اور حجاج نے چاہا تھا کہ رات کے وقت ابن غالب کے قلعے پر اچانک یورش کر کے اُسے فتح کر لیں، لیکن ابن غالب ہوشیار تھا، جب دیکھا کہ قلعہ پر حملہ ہو رہا ہے تو

دشمن کی فوج کے مقابلہ میں وہ اپنی فوج لایا اور حملہ کرنے والوں میں کا ایک آدمی مارا گیا، اسمیں ابن غالب کا کچھ قصور نہیں ہے، اُس نے جو کچھ کیا اپنی حفاظت میں کیا اور وہ اپنے حقوق سے باہر نہیں ہوا، اے امیر! ان سرکش عربوں کے غلط بیان کو باور نہ فرما، ابن غالب صلہ کا مستحق ہے، وہ خیر خواہ ملازم ہے اور قزاقوں کو ملک سے دفع کرنے میں اُس نے تیری سب سے بڑی خدمت کی ہے"۔

امیر کو مقدمہ کے واقعات میں غالباً شبہ گذرا، اور خیال ہوا کہ اگر ایک فریق کے موافق فیصلہ کیا گیا تو دوسرا فریق ناراض ہو جائے گا، بہرکیف حکم ہوا کہ مقدمہ کی مزید تحقیقات کے لیے امیر اپنے فرزند محمد کو اشبیلیہ بھیجے گا۔ (۲۲۴ھ ۳:)

چنانچہ نوجوان شہزادہ محمد جو ولی عہد قرار پا چکا تھا، جلد اشبیلیہ پہنچ گیا، ابن غالب اور ابن حجاج کو اس نے اپنے روبرو طلب کیا باری باری سے جانبین کی شہادت سنی، لیکن ایک فریق نے دوسرے فریق کو ملزم قرار دینے پر سخت اصرار کیا اور کوئی گواہ جو طرف داری سے خالی ہو موجود نہ تھا، اس لیے شہزادہ پریشان ہوا کہ کیا فیصلہ کرے، ادھر اس کو فیصلہ میں تامل تھا ادھر فریقین میں غیظ و غضب بڑھتا جاتا تھا، اشبیلیہ کے اپینی رئیسوں میں جو غصہ تھا وہی تمام رعایا میں بھی پھیلنے لگا، آخرکار شہزادہ نے کہا کہ میں ابھی فیصلہ ملتوی رکھنا چاہتا ہوں اور تاوقتیکہ کوئی تجویز سنائی جائے ابن غالب اپنے قلعہ کو چلا جائے، اِس حکم کو سن کر اسپینیوں نے نتیجہ نکالا کہ وہ جیت گئے اور مشہور کر دیا کہ شہزادہ اُن کی طرف ہے، اور اگرچہ یہ درست ہے کہ کوئی باقاعدہ تجویز اُس نے نہیں سنائی ہے لیکن اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ عربوں کو غصہ دلانا نہیں چاہتا، بنی خلدون اور بنی حجاج نے بھی یہی نتیجہ نکالا اور وہ سخت ناراض ہو گئے اور اس قصد سے کہ بدلہ لینے کے لیے عَلَم بغاوت بلند کرنا چاہیے وہ سب شہر سے نکل گئے، کریب بن خلدون نے شرف اشبیلیہ کے بنی حضرموت کو بغاوت پر آمادہ ہونے کے واسطے تیار کیا، اور بنی حجاج کے رئیس عبداللہ نے بنی لخم کو جو علاقہ سنیدہ میں رہتے تھے اپنے علم کے نیچے جمع کیا، اور کریب بن خلدون اور عبداللہ بن حجاج نے لڑائی کا نقشہ سوچ کر یہ فیصلہ کیا کہ دونوں ایک ساتھ حملہ کریں، عبداللہ بن حجاج قرمونہ کو فتح کرے اور اسی دن

کریب حصن قوریہ پر جو شرف اشبیلیہ کی مشرقی سرحد پر تھا قبضہ کرلے، لیکن اس سے پہلے اُس کو چاہیے کہ امیر عبداللہ کے چچا ہشام کے گھوڑے اور بیل جو وادی الکبیر کے دہانے کے قریب ایک ٹاپو میں چرا کرتے ہیں اُن کو پکڑ کر ہانک لے جائے

کریب بن خلدون نے سرقہ مویشی کا ارتکاب اپنی شان کے خلاف سمجھا اور اس کام پر ایک اور شخص کو جس کا نام مہدی تھا مقرر کیا، یہ مہدی بڑا ہی اوباش اور آوارہ مزاج آدمی تھا اور اس کی حرکتوں سے اشبیلیہ کے لوگ اُس سے نفرت کرتے تھے، مہدی کریب کا حکم سنتے ہی پہلے قلعہ لبرشہ میں آیا، قلعہ دار سلیمان نے اس کی خاطر و مدارات کی، یہاں سے مہدی دریا کا ایک پاٹ تیر کر ٹاپو میں پہنچا جہاں ہشام کے دو سو بیل اور ایک سو گھوڑے ایک گلہ بان کی نگرانی میں چر رہے تھے، مہدی کے ساتھ جو عرب تھے اُنھوں نے اس گلہ بان کو مار ڈالا، اور بیلوں اور گھوڑوں کو قوریہ کے قلعے کی طرف ہانک لے گئے اور قلعہ پر قبضہ کرکے جانوروں کو اُس میں بند کر دیا، اس اثنا میں عبداللہ بن حجاج نے برنس بربر جنید کی مدد سے قرمونہ پر دفعتہً حملہ کرکے اُس پر قبضہ کرلیا، حاکم قرمونہ اشبیلیہ بھاگ گیا۔

عربوں کی اس جرات و بیباکی سے اشبیلیہ کے شہر میں ایک غل مچ گیا، شہزادہ محمد نے فوراً ایک قاصد اپنے باپ کے پاس روانہ کرکے دریافت کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے، اور مدد کے لیے فوج طلب کی۔

امیر عبداللہ کے پاس جس وقت شہزادہ کا قاصد پہنچا اور حال معلوم ہوا تو اس نے فوراً وزیروں سے مشورہ کیا، وزیروں میں کسی ایک بات پر اتفاق نہ ہوا، لیکن ایک وزیر نے امیر کو تعلیہ میں سمجھایا کہ " ابن غالب کو قتل کرکے عربوں سے مصالحت کرلی جائے، جب یہ مولد (اسپینی مسلمان) ابن غالب نہ ہوگا تو عرب چین سے بیٹھ جائیں گے اور قرمونہ اور قوریہ کو جن پر انھوں نے قبضہ کرلیا ہے آپ کو واپس کردیں گے اور آپ کے چچا ہشام کے بیل اور گھوڑے بھی چھوڑ دیں گے اور آپ کی بھی اطاعت اختیار کرلیں گے " (۳۴

ایک خیر خواہ اسپینی مسلمان کو بلا وجہ قتل کرکے اپنے مسلمانوں سے دشمنی باندھنی درآنحالیکہ اس کا یقین نہ تھا کہ ان کے دشمنوں یعنی عربوں سے مصالحت ہوجائیگی ایک دھوکے

دغاہی کا فعل نہ ہوتا، بلکہ اس میں حماقت بھی شامل ہوتی اور اس سے زیادہ غلط تدبیر دوسری نہ ہو سکتی تھی، لیکن امیر عبداللہ نے اس وزیر کی رائے پسند کی اور اپنے خادم جاد کو جو حال میں سوار القیسی کی قید سے رہا ہوا تھا حکم دیا کہ فوج لے کر قرمونہ جائے اور وہاں پہنچ کر ابن غالب کے الزام دینے والوں کا اپنے کو طرفدار ظاہر کر کے ابن غالب کو ہلاک کر دے، پھر عربوں کو امیر کا مطیع بنانے کی کوشش کرے، جہاں تک ممکن ہو مصالحت اور نرمی سے یہ کام انجام پاوے اور جب تک کل تدبیریں بیکار ثابت نہ ہوں عربوں کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے۔

جاد یہ حکم پاتے ہی فوج لے کر قرمونہ کی طرف چلا، گو اس فوج کشی کی غرض کسی پر ظاہر نہیں کی گئی تھی، مگر مشہور ہو گیا کہ جاد بنو خلدون کے مقابلہ کو نہیں بلکہ ابن غالب کے مقابلہ کو جا رہا ہے۔

ابن غالب ہوشیار ہو گیا اور اُس نے ابن حفصون سے مدد چاہی، مگر اسکے ساتھ ہی جاد کا خط ابن غالب کے پاس اس مضمون کا خط آیا، اندیشے کی کوئی بات نہیں ہے میری فوج کشی کی غرض وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو، میرا اصلی مقصد عربوں کو انکی زیادتیوں پر سزا دینے کا ہے، چونکہ تم سے اور عربوں سے نزاع ہے اس لیے میں تم سے مدد لینی چاہتا ہوں

ابن غالب اس خط کو پڑھ کر فریب میں آ گیا، اور جب جاد قلعہ قرمونہ کے قریب پہنچا تو ابن غالب تھوڑی سی فوج لے کر اس کے پاس چلا آیا، جاد نے بظاہر قرمونہ کے محاصرہ کا سامان کیا، لیکن جب شہر کے سامنے پہنچا تو بنی حجاج کے سردار عبداللہ بن حجاج کو اس مضمون کا خط لکھا کہ عرب اس بات کا وعدہ کریں کہ وہ امیر عبداللہ کی اطاعت قبول کر لیں گے تو میں ابن غالب کو قتل کر دوں، عربوں نے یہ بات منظور کر لی، جاد نے ابن غالب کو قتل کر دیا اور بنی حجاج قرمونہ کو خالی کر کے چلے گئے۔

جس وقت اشبیلیہ کے اسپینی مسلمانوں کو اس دغا کا حال معلوم ہوا جس نے اُن کے دوست ابن غالب کو موت کا شکار بنایا تو ان کا غیظ و غضب امیر عبداللہ کیطرف رجوع ہوا فوراً آپس میں مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ ابن غالب کی موت کا بدلہ جاد کے بھائی امیہ سے لینا

چاہیے، امیہ بڑا جری اور بہادر آدمی تھا اور اس وقت امیر عبداللہ کی طرف سے اشبیلیہ کا حاکم تھا، اس فیصلہ پر سب نے اتفاق کر لیا، لیکن جب تک اشبیلیہ کے شہر پر قبضہ نہ ہو اس فیصلہ پر کوئی عمل درآمد نہیں ہو سکتا تھا، محمد بن انجلینو نے اس بات کا وعدہ کیا کہ شہزادہ محمد کو جو اس وقت اشبیلیہ میں مقیم ہے وہ اس بات پر راضی کر لے گا کہ شہر کی حفاظت اسپینی مسلمانوں (مولدون) کے سپرد کر دی جائے، اب اسپینی روساء شہر نے اضلاعِ اشبیلیہ کے معدی عربوں اور بتر بربر کے پاس جو مورور میں رہتے تھے اور ہمیشہ سے دوست چلے آتے تھے مدد کے لیے پیغام بھیجا

قاصد جس وقت یہ پیغام لے جا رہا تھا ابن انجلینو مع اپنے دوستوں کے شہزادہ محمد کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا "ممکن ہے کہ امیر کے دربار میں ہم پر کوئی الزام عائد کیا گیا ہو اور ہم کسی ایسے جرم کے مرتکب ثابت کیے گئے ہوں جس کا ہم کو علم نہیں، ممکن ہے کہ امیر کی مجلس خاص میں ہماری ہلاکت کی کوئی تدبیر منظور ہوئی ہو، کیونکہ جاد جو مشہور عیار ہے ہم پر حملہ کرنے کی غرض سے ایک لشکرِ جرار لے کر آ رہا ہے، اس لشکر کا ہم کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتے اگر اس حالت میں آپ ہم کو بچا لیں اور ہماری منت پذیری کے واسطہ سے ہمیں اپنا وابستہ دولت سمجھ لیں تو ہم کو شہر کی کنجیاں دیدی جائیں اور شہر کی حفاظت ہمارے سپرد اس وقت تک رہے جب تک کہ معاملات کا آخری تصفیہ ہو، ہم حضور سے بدگمان نہیں ہیں، لیکن ہم خوب جانتے ہیں کہ اگر جاد کا لشکر ایک مرتبہ شہر میں داخل ہو گیا تو پھر آپ کی سرپرستی بھی ہمارے حق میں کچھ کارگر نہ ہوگی۔"

شہزادہ محمد عربوں سے پہلے ہی چشمک رکھتا تھا، فوج بھی جو شہر کے اندر اس کے تحت میں تھی کم اور کمزور تھی، اس لیے اب اس کو سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑا کہ اسپینی رئیسوں کی درخواست قبول کر لے۔

اس طرح مولدون یعنی اسپینی مسلمان شہر اشبیلیہ کے مالک ہو گئے اور اپنے دوستوں یعنی معدی عربوں کے منتظر ہو گئے کہ وہ کب آتے ہیں، ۹ جمادی الاول ۲۷۶ھ (۱۹ ستمبر ۸۸۹ء) کو منگل کے دن یہ معدی عرب اور بتر بربر اسپینی مسلمانوں کی کمک پر شہر کے اندر آ گئے، اور ان کی ایک بڑی جمعیت کے حاکم شہر امیہ کے قصر پر حملہ کر دیا، یہ حملہ ایسا یکلخت ہوا کہ امیہ کو جزئیاں

پہننے کی بھی مہلت نہ ملی اور وہ ننگے پاؤں گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے شہزادہ محمد کے محل میں آ گیا۔ باغیوں کو مایوسی ہوئی کہ شکار ہاتھ سے نکل گیا اس غصہ میں انہوں نے امیہ کے قصر کو لوٹ لیا اور شور مچاتے ہوئے شہزادہ محمد کے محل کی طرف چلے اور محل کا محاصرہ لیا۔ شہر کے سوداگر، مزدور اور پیشہ ور بھی ان کے ساتھ ہو لیے شہزادہ محمد نے اس پریشانی میں ابن انجلینو اور ابن سبارلقو۔ اور دیگر اسپینی رؤسا کے پاس آدمی بھیجے۔ کہ فوراً حاضر ہوں اور اس ہنگامہ کے فرد کرنے کی کوئی تدبیر بتائیں۔

اشبیلیہ کے اسپینی رؤسا جو ابھی تک اس ہنگامہ سے علیحدہ تھے پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے یہ لوگ حقیقت میں بڑی مشکل میں تھے۔ ایک طرف تو یہ خوف تھا کہ اگر شہزادے کے پاس گئے تو کہیں گرفتار نہ کر لیے جائیں دوسری طرف یہ صاف ظاہر تھا کہ اگر حاضری سے انکار کیا تو ان پر الزام ہوگا کہ انہی کے اشارہ سے یہ بغاوت ہوئی ہے۔ اور اسی بات کا ان کو ۳۴۵ سب سے زیادہ خوف تھا۔ غرض معاملہ کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر انہوں نے شہزادے کے پاس جانے کا قصد کر لیا۔ لیکن اتنی احتیاط کی کہ کپڑوں کے نیچے زرہ پہن لی اور جب محل میں جانے لگے تو اشبیلیہ کے چند مسلح لوگوں کو اور کچھ سپاہیوں کو جو مورور سے آئے تھے محل کے باہر والے دروازے پر یہ کہکر بٹھا دیا کہ اگر ظہر کی اذان تک ہم محل سے باہر نہ آئیں تو محل میں داخل ہو کر ہم کو نکال لانا۔

یہ بندوبست کر کے اشبیلیہ کے اسپینی رئیس شہزادہ محمد کی خدمت میں حاضر ہوئے شہزادہ بہت اخلاق سے ملا۔ ابھی گفتگو ہو رہی تھی کہ جن سپاہیوں کو دروازے پر بٹھایا تھا ان کو صبر نہ رہا، کچھ شبہ گذرا اور محل کا دروازہ توڑ کر صحن میں داخل ہو گئے اصطبل میں جا کر جس قدر گھوڑے اور خچر بندھے تھے انہیں کھول لیا، صحن سے جب اندر کی فصیل والے دروازے میں جانے لگے جو محل کے اس دروازے کے مقابل تھا جس سے داخل ہوئے تھے تو سامنے جو چیز حائل نظر آئی وہ خود امیہ حاکم اشبیلیہ تھا۔

امیہ بڑا زبردست لڑنے والا تھا۔ اصطبل میں بلوائیوں کا شور سنتے ہی پہلا کام اس نے یہ کیا کہ محمد بن انجلینو اور اس کے ہمراہیوں کو جو شہزادے سے گفتگو کر رہے تھے گرفتار کر لیا

اور فصیل والے دروازے کے بالاخانہ پر شہزادے کے نوکروں کو بٹھا دیا اور ان کے پاس نیچے پھینکنے کے لیے بہت سے پتھروں کا ایک انبار لگا دیا، چنانچہ جب اسپینی اور ان کے ساتھی دروازے کے قریب پہنچے تو اوپر سے تیروں اور پتھروں کی ایک بوچھاڑ آئی بلوائیوں کی تعداد بہت تھی مگر دروازے کے بالاخانے پر محافظوں کی نشست نے بہت کام دیا۔ امیہ اس وقت زخمی ہو گیا تھا۔ سر اور سینے سے خون بہہ رہا تھا، لیکن وہ خود لڑ کر اور محافظوں کو اشارے کر کے ان کی ہمت بڑھاتا تھا مگر محل کے لوگوں نے جان لیا کہ اب جان بچنی ممکن نہیں، وقت آ گیا ہے۔ لیکن مفت میں کیوں جان دیں۔ اس مایوسی نے ان میں غیر معمولی طاقت پیدا کر دی۔

لڑائی دوپہر سے سورج چھپنے تک ہوتی رہی، رات جب ہوئی تو بلوائی قصر کے صحن میں سو گئے صبح ہوتے ہی پھر لڑائی شروع کر دی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امیر عبداللہ کے خیر طلب اور وہ لوگ جو ہمیشہ قانون اور انتظام کی پابندی کے خواہاں رہتے تھے اور جن کا فرض تھا کہ حاکم شہر کی مدد کو آتے وہ اس وقت کیا کرتے تھے؟

جواب یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی، اس کمزوری کی حالت میں جو تدبیر اپنی جان بچانے کی سوجی تھی اسے کیونکر چھوڑ دیتے، غرض گھر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے اور حاکم شہر امیہ کو اس کی تقدیر پہ چھوڑ دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ امیہ کی بہتری چاہتے تھے لیکن اس خیال میں اتنی قوت نہ تھی کہ حاکم کی سلامتی کے لیے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیتے۔ لیکن پھر بھی یہ لوگ بیکار نہ رہے، جب بلوائیوں کا شور بہت بڑھا تو انہوں نے ایک قاصد جاد کے پاس بھیجکر اسے آگاہ کیا کہ اس کے بھائی امیہ اور شہزادہ محمد کی حالت ۳۴۶
بہت خطرے کی ہو گئی ہے۔ یہ خبر پہنچانی کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بہرکیف اب انتظار ہوا کہ دیکھئے جاد اس ہنگامے کو فرو کرنے وقت پر پہنچتا ہے یا نہیں جاد کو جب شہر کی حالت معلوم ہوئی تو جس قدر سوار بہم پہنچ سکے ان کو ساتھ لے اشبیلیہ روانہ ہو گیا ۹ رجمادی الاول ۲۷۶ھ ۹ ستمبر ۸۸۹ء کی صبح کو جب رات گذر کر پھر لڑائی محل کے صحن میں شروع ہوئی تو جاد اپنے سواروں

کو لیے شہر کے جنوب کیطرف آیا۔ اسپینی مسلمانوں کی ایک فوج نے اس کا راستہ روکنا چاہا لیکن جاد نے اس فوج کو قتل کر دیا۔ اور شہر کے اس محلے میں آیا جہاں عبداللہ بن اشعث قرشی رہتا تھا۔ یہ قرشی مروانی سلطنت کا خیر خواہ تھا۔ اس نے جاد سے کل حالات بیان کئے جاد نے سنتے ہی اپنے سواروں سے کہا۔ "دیر نہ کرو شہر پر فوراً دھاوا کر دو" اور اب جاد نے خود ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر بلوائیوں پر حملہ کیا۔ اشبیلیہ کے یہ بلوائی اپنی جگہ جمے رہے جاد کا گھوڑا ان کے نیچے ہی مر کر زمین پر گرا سوار بھی اب پیچھے ہٹنے لگے جاد نے اپنے لوگوں کی ہمت بڑھائی کہ پھر دھاوا کرو ایک ایک سوار کو اس کا نام لیکر پکارا۔ اور قسمیں دیں کہ دیکھو دل مضبوط رکھو جو جوانمرد تھے ان کی ہمت بڑھی اور بلوائیوں پر جھپٹ پڑے۔ بلوائیوں کے سرداروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان سے دست و گریبان ہونا چاہا۔ جاد اشبیلیہ کے ایک بلوائی سردار کی طرف تیز چلا اور قریب پہنچکر ایک ہی وار میں اس کا کام تمام کر دیا۔ بلوائیوں میں ابتری پڑی اور ان کی صفیں ٹوٹ کر بے ترتیب ہو گئیں جاد کے سواروں نے اب اور بھی جی توڑ کر حملہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں بلوائی چاروں طرف بھاگتے نظر آئے۔

جاد خوش ہو کر محل میں داخل ہوا اور اپنے بھائی امیہ سے گلے ملا اور شہزادہ محمد کے ہاتھ کو نہایت ادب سے بوسہ دیا اور کہا "الحمد للہ کہ میں نے آپ کی جان بچالی" امیہ نے کہا کہ "بھائی تم خوب وقت پر پہنچے۔ اگر آدھے گھنٹے کی بھی دیر کرتے تو پھر کوئی مددگار نہ ہوتی" شہزادے نے کہا "حقیقت یہ ہے کہ ہم موت کے لیے بالکل تیار ہو گئے تھے۔ مگر اب وقت یہ ہے کہ اپنے سینوں میں انتقام کے خیالات بھر لیں ان بلوائیوں کی سزا یہ ہے کہ ان کے گھر دن کو لوٹ لیا جائے محمد بن الجلینو اور اس کے ہمراہیوں کو جو اس سازش میں شریک تھے جلاد کے سپرد کر کے ان کی جائیداد ضبط کر لی جائے"

جس وقت ابن الجلینو اور اس کے ساتھی مقتل کو جا رہے تھے اس وقت اشبیلیہ کی حالت نہایت دردناک تھی۔ جاد کے سوار خون کے پیاسے اور مال کے بھوکے بھاگتے ہوئے آدمیوں کو قتل کرتے تھے اور ان کے گھروں کو لوٹتے تھے اسپینی مسلمانوں کی یہ خوش قسمتی تھی کہ ان میں اور ملازمین و موالی بنی امیہ میں جو اشبیلیہ میں سکونت رکھتے تھے دوستی اور ہمسائیگی کے تعلقات

تھے، اسی دوستی کی بنا پر بنی امیہ کے موالی نے شہر کے اسپینیوں کے لیے امان حاصل کر لیا اور کچھ دنوں بعد امیر عبداللہ کی طرف سے بھی معافی عام کا اشتہار جاری ہو گیا، اشبیلیہ میں امن ہو گیا مگر یہ چند روزہ تھا، اسپینی مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹنے کے قریب ہو گئے تھے

شہزادہ محمد اور جاد حبیب اشبیلیہ سے مع اپنی فوج کے قرطبہ واپس آئے تو ابن حفصون کے ۲۷۱ھ
قاصد امیر کے دربار میں اس پیغام کے ساتھ پہنچے کہ جاد کا سر کاٹ کر ہمارے حوالے کیا جائے کیونکہ وہ ابن غالب کا قاتل ہے جو ہمارا دوست تھا، یہ زمانہ تھا کہ ابن حفصون نے امیر عبداللہ سے مصالحت کر رکھی تھی

اس خیال سے کہ ابن حفصون کا زور ترقی پر ہے اور امیر عبداللہ کے دل میں اس کا خوف بیٹھ گیا ہے جاد کو اب اپنی جان کا خوف پیدا ہوا، گو ابن غالب کو اس نے امیر کے حکم سے قتل کیا تھا اور صرف امیر کا حکم بجا لایا تھا، لیکن خوف یہ ہوا اور یہ خوف کچھ بیجا نہ تھا کہ کہیں امیر اس کو اسپینیوں کے سردار ابن حفصون کے حوالے نہ کر دے، اس خطرے سے بچنے کی تدبیر سوائے بھاگ جانے کے دوسری نہ تھی، چنانچہ جاد نے رات کے وقت قرطبہ سے نکل کر اپنے بھائی امیہ حاکم اشبیلیہ کے پاس جانے کا قصد کیا، اس وقت جاد کے ساتھ اس کے دو بھائی ہاشم اور عبدالغافر اور چند دوست جن میں دو قرشی تھے اور کچھ نوکر اور غلام تھے، وادی الکبیر کے بہاؤ کے رخ اس کے کنارے کنارے چل کر یہ لوگ صبح ہوتے شنت فیلہ کے قلعہ میں پہنچ گئے، قلعہ دار نے تھوڑی دیر آرام کرنے کی اجازت دی، لیکن بدقسمتی سے بربر قزاق تماشکہ اس زمانہ میں ادھر آیا ہوا تھا، اور ابن غالب اسپینی کے بھائی قزاقوں کے اس گروہ میں شامل تھے، انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ کچھ سوار قلعے میں اترے ہیں اور ان میں جاد کو انھوں نے پہچان بھی لیا تھا، چونکہ اپنے بھائی ابن غالب کے خون کا بدلہ لینا ان کا فرض تھا اس لیے انھوں نے اپنے سردار سے کہا کہ ان سواروں کے گھوڑوں کو کھول لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے، گھوڑے قلعے کے باہر بندھے ہوئے تھے، تماشکہ اور اس کے گروہ والے یہ دیکھتے ہی گھوڑوں کی طرف چلے، جونہی گھوڑوں کی لگاموں پر ہاتھ ڈالا جاد کے نوکروں اور غلاموں نے غل مچایا، غل سنتے ہی جاد اور اس کے ہمراہی قلعے سے باہر نکل آئے

اور تلواریں سونت کر قزاقوں پر پل پڑے، قزاقوں نے جن کی تعداد زیادہ تھی اُن کے حملے کا جواب دیا، انجام یہ ہوا کہ جاو اور اس کے دونوں بھائی ہاشم اور عبدالغافر اور قریشیوں میں کا ایک آدمی سب جان سے مارے گئے۔

اس واقعہ کا نتیجہ اشبیلیہ کے اسپینیوں کے حق میں سخت ہلاکت کا ہوا، امیہ حاکم اشبیلیہ میں اب اتنی طاقت تو تھی نہیں کہ اپنے تین بھائیوں کے خون کا بدلہ اصلی مجرموں سے لیتا، اس لیے اسپینیوں سے بدلہ لینا چاہا، اور اس کی صورت یہ پیدا کی کہ تمام اسپینیوں کو اس نے بنی خلدون اور بنی حجاج کے حوالے کر دیا، ان لوگوں کو اس نے اشبیلیہ میں بلایا اور اُن کو اختیار دے دیا کہ تمام اسپینیوں کو چاہے وہ عیسائی ہوں یا مسلمان، خواہ اشبیلیہ میں رہتے ہوں، خواہ قرمونہ میں اور خواہ اضلاع کے باشندے ہوں۔ سب کو قتل کر دیں۔

اب سخت کشت و خون شروع ہوا جس میں عربوں نے ہزارہا اسپینیوں کو جان سے مار ڈالا، بہت سے اسپینی جان بچانے کو وادی الکبیر میں کود پڑے مگر سب غرق ہو گئے جو تھوڑے سے اسپینی اس قتل عام سے بچے وہ سابقہ دولت مندی و تمول سے محروم ہو کر افلاس اور تنگ دستی کی انتہا کو پہنچ گئے۔

یمانیہ نے مدتوں اس کشت و خون کے واقعہ کو یاد رکھا، اور دشمن کی تباہی کے بعد بھی اُن کی عداوت نہ مٹی، خرمن گاہوں پر اور شرف اشبیلیہ کے قریوں اور سنید کے علاقے میں جاڑے کی لمبی راتوں میں داستان گو اس واقعہ کو اپنے گیتوں کا مضمون بنا کر گاتے تھے اور یمنی عرب جن کی آنکھیں دشمنی سے چمکنے لگتی تھیں اُن اشعار کو سننے سے تھکتے نہ تھے جن کا مضمون یہ ہوتا تھا۔ ۳۴۸

ہاتھ میں تلوار لے کر ہم نے غلاموں کی اولاد کو غارت کر دیا، اُن کی بیس ہزار لاشیں زمین پر پھیلی پڑی تھیں۔ باقی کو دریا بہا لے گیا، دیکھو پہلے ان کی تعداد کس قدر زیادہ تھی اور اب اُن کا شمار کس قدر کم ہے۔

ہم آل قحطان ہیں اور اُن بادشاہوں کی اولاد ہیں جنہوں نے قدیم زمانہ میں یمن میں سلطنت کی تھی، اور جن کو ہم نے قتل کیا ہے وہ خود ہی غلام نہ تھے بلکہ غلاموں

کی اولاد بھی تھے

کمینے ہتے۔ شیروں کے جنگل میں شیروں کے مقابلے کو آئے تھے ! ہم ان کا مال کھا کر موٹے ہوئے ہیں ، ہم نے اُن کو جہنم واصل کیا تاکہ دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں وہ ثمود سے ملاقات کریں

اسناد :-

ابنِ حیان	ص ۴۹ تا ۵۶ ، ۵۹ ، ۶۳ تا ۶۵
اخبار مجموعہ	ص ۵۶
مقری	کتاب اول ص ۸۹
رازی	ص ۲۶
ابن القوطیہ	ص ۲۶،۴

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

چودھویں فصل

امیر عبداللہ اور سلطنت میں بدنظمی

اشبیلیہ کے اسپینی مسلمانوں کی تباہی سے جس قدر نفع عربی سرداروں کو پہنچا اتنا امیر عبداللہ ۳۴۹
کو نہیں پہنچا، اس ہنگامہ کے بعد بنی خلدون اور بنی حجاج صوبہ اشبیلیہ کے مالک ہوگئے، مروانی تخت کے وفاکیشوں میں اب اتنی ہمت نہ تھی کہ ان یمنی عربوں سے مقابلہ کرسکتے اور نہ اس کی کوشش انھوں نے کی، امیہ حاکم اشبیلیہ البتہ اُن کے درپے رہا، اُس نے جنید بربر، اور عبداللہ بن حجاج میں جو مل کر قرمونہ پر حکومت کرتے تھے نا اتفاقی پیدا کرادی، کریب بن خلدون کے فریق سے بہت سے وعدے کرکے اس کو اپنا بنانا چاہا، اور کوشش کی کہ ایک ہی وار میں کسی طرح ان تمام یمنی عربوں کا قلع قمع کردے، لیکن اس کی یہ کل مساعی بیکار ثابت ہوئیں، یہ واقعہ ہے کہ اس کے کہنے سے جنید بربر نے عبداللہ بن حجاج کو قتل کردیا، لیکن امیہ کو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا، کیونکہ بنی حجاج نے عبداللہ بن حجاج کی جگہ اس کے بھائی ابراہیم کو اپنا سردار منتخب کرلیا، ابراہیم بن حجاج بڑا دانشمند اور ہوشیار آدمی تھا، اور عبداللہ بن حجاج سے

کہیں زیادہ ڈرنے کے قابل شخص تھا، کریب بن خلدون، امیہ کی تجاویز سے جو اس نے پیش کیں بظاہر اتفاق کرتا رہا، لیکن وہ اتنا غافل نہ تھا کہ امیہ سے دھوکا کھا جاتا۔

غرض امیہ کی یہ کوشش کہ کسی طرح یمنی عربوں کو غارت کر دے بالکل ناکام رہی، امیہ نے اسی غرض سے شہر کے جس حصے میں جامع مسجد اور حاکم شہر کا قصر تھا اس کے گرد ایک فصیل تعمیر کرانی چاہی اور ظاہر کیا کہ اس احاطہ میں صرف فوج رہا کرے گی، عربوں کو شبہ ہوا کہ کہیں کسی دن مسجد میں جاتے یا مسجد سے نکلنے کے وقت امیہ کے لوگ اُن کو قتل نہ کر دیں، اس پر فصیل کی تعمیر کی اُنھوں نے مخالفت کی، لیکن اُمیہ کو اُن کی مخالفت کی پروا نہ ہوئی، اس پر شہر کے لوگوں نے ایک دن معماروں کو دیوار بنانے سے روکا، اُمیہ نے اِن لوگوں میں سے جو زیادہ سرکش معلوم ہوئے انھیں گرفتار کر لیا اور یہ سب فوجی سردار تھے، کچھ لوگوں کو ضمانت میں نظر بند کر لیا تاکہ اُن کے عزیز و اقارب مطیع رہیں ورنہ جو لوگ نظر بند ہو گئے ہیں وہ قتل کر دیے جائیں، لیکن اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔

عرب اس بات کو جانتے تھے کہ اگر امیہ کے دل میں اس بات کا ڈر بٹھا دیا جائے گا کہ ایک دن حملہ کر کے وہ اور اس کے خاندان والے سب ہلاک کر دیے جائیں گے تو پھر اس کی ہمت نہ ہوگی کہ ان کے رشتہ داروں کو جنھیں اُس نے ضمانت میں لے رکھا ہے قتل کر سکے، چنانچہ انھوں نے یہی کیا، ایک دن جب اُمیہ کی فوج کے اکثر لوگ رسد لانے کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے ان عربوں نے امیہ کے قصر پر حملہ کیا، امیہ فوراً مع ایسے سپاہیوں کے جو قصر کے اندر تھے قصر کی چھت پر چڑھا اور حملہ آوروں پر اُوپر سے پتھر برسائے، اور اُنکے رشتہ داروں کو جو ضمانت میں نظر بند تھے دیوار پر ایک ایسی جگہ کھڑا کیا کہ سب کو نظر آ سکیں، اور یہ ظاہر کیا کہ اگر عرب ایک قدم بھی آگے بڑھے تو اُن کے یہ عزیز فوراً قتل کر دیے جائیں گے

بلوائیوں نے اس کی بھی کچھ پروا نہ کی اور امیہ سے کہا کہ جب تمام صوبوں کے لوگوں نے امیر کی حکومت کا بار اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا ہے تو وہ بھی کسی سے کم یا پیچھے رہنا نہیں چاہتے اور طنزاً یہ بھی کہنے لگے کہ ہم صلح جو لوگ ہیں اور اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ اگر تمام سرکش صوبوں میں سے ایک بھی امیر عبداللہ کا مطیع ہو جائے گا تو ہم بھی فوراً اطاعت

قبول کرلیں گے، پس امیہ کے لیے اب یہی بات باقی ہے کہ وہ اشبیلیہ سے چلا جائے، اگر وہ چلا گیا تو ہم اس کو نقصان نہیں پہنچائیں گے

امیہ اگرچہ بہت خوددار اور ثابت قدم تھا مگر اس طوفان بے تمیزی کے سامنے اسے بھی جھکنا پڑا، اور جواب دیا کہ "اگر میری جان کو امان دو گے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا"۔ اس پر کریب بن خلدون، ابراہیم بن حجاج اور یمنی سردار مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے والے دالان میں گئے اور پانچ مرتبہ قسم کھائی کہ ہم امیہ کو کوئی گزند نہیں پہنچائیں گے اور خود اس کو کسی محفوظ جگہ پہنچادیں گے۔

امیہ قصر کی چھت سے جہاں وہ کھڑا تھا، ان لوگوں کی صورت دیکھ سکتا تھا اور ان کی آواز سن سکتا تھا، جب ان لوگوں کو قسمیں کھاتے سنا تو اس نے فوراً ان کے عزیزوں کو جو ضمانت میں نظربند تھے رہا کردیا، لیکن خود اشبیلیہ سے نکلنے میں جلدی نہ کی، بلکہ اپنے وعدہ پر پشیمان ہو کر خیال کیا کہ یہ بہت ہی کمزوری کی بات اس سے ہوئی ہے، بہر کیف یہ سمجھ کر کہ اب خطرے کا وقت نکل گیا ہے اس نے پھر کوشش کی کہ عربوں پر غالب آجائے، عربوں نے پھر مقابلہ شروع کردیا، اس مرتبہ امیہ نے قصد کرلیا کہ عربوں کی کسی بات کو نہ مانے گا، یہ قصد اس کا اس غضب کا تھا کہ اس کی دھن میں اس نے اپنے تمام اہل و عیال کو قتل کردیا، گھوڑوں کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے تمام مال و اسباب کو آگ لگا، قصر سے باہر دشمنوں کے سامنے آیا اور شمشیر بکف لڑتا ہوا آخر کار مارا گیا۔

امیہ کے مارے جانے پر بنی خلدون اور بنی حجاج کو پوری قوت حاصل ہوگئی، لیکن یہ سمجھ کر کہ ابھی تک قطعی مختار اور مطلق العنان ہونے کا وقت نہیں آیا ہے انھوں نے امیر عبداللہ کو اطلاع دی کہ امیہ حاکمِ اشبیلیہ نے امیر سے بغاوت کرنی چاہی تھی اس لیے ہم نے اسے قتل کردیا، امیر عبداللہ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس قتل پر بنی خلدون اور بنی حجاج کو سزا دیتا اس لیے ان یمنی عربوں کے قول کو تسلیم کرلیا اور ایک نیا حاکم مقرر کرکے اشبیلیہ روانہ کیا، یہ حاکم محض کاٹھ کی پتلی تھا اور اس پتلی کے نچانے کی ڈوریاں کریب اور ابراہیم کے ہاتھوں میں تھیں، باوجود حاکم کی نرم دلی کے ان ظالموں نے اسے ستانا شروع کیا، خفیف اخراجات

کے لیے بھی روپیہ نہ لینے دیتے اور رسد جو کچھ اس کے لیے مقرر تھی اس کو بھی کم کرتے جاتے تھے امیر عبداللہ نے اس خیال سے کہ شاید حالت کچھ بہتر ہو جائے اس حاکم کو واپس بلا کر دوسرا حاکم بھیجا اور اس کے ساتھ اپنے چچا ہشام کو بھی اشبیلیہ روانہ کیا لیکن اس نئے حاکم اور ہشام کے ساتھ فوج بالکل نہ تھی، اس وجہ سے یمنی عربوں کی قوت میں کسی طرح کی کمی پیدا نہ ہوئی، اس حاکم اور ہشام نے آتے ہی سمجھ لیا کہ اختیارات جس قدر ہیں وہ دراصل یمانیہ کے سرداروں کے ہاتھ میں ہیں۔

ہشام کا ایک لڑکا ساتھ تھا جس کا نام مطرف تھا، یہ نوجوان شہزادہ بڑا عیش پرست تھا ۳۵
مہدی کی حرموں میں سے ایک حرم سے آشنائی کر لی، مہدی کو خبر لگی تو رات کو ایک جگہ چھپ کر ہو بیٹھا جب مطرف اُدھر سے نکلا تو اس کو قتل کر دیا، اُس کے باپ ہشام کو جب معلوم ہوا تو بیٹا جہاں مرا پڑا تھا رات کے وقت وہاں جانا چاہا مگر اس خوف سے نہ جا سکا کہ کہیں اندھیرے میں اسے بھی قتل نہ کر دے، جب صبح ہوئی تو بیٹے کی لاش پر گیا۔ قاتل کو سزا دینے کا کیا ذکر تھا۔ اس کے تھوڑے دن بعد بنی خلدون کے ایک آدمی نے حاکم اشبیلیہ کا ایک خط امیر کے نام اس مضمون کا پکڑا کہ مطرف کے خون کا بدلہ لیا جائے اور اشبیلیہ میں جو بدنظمی اور بدعملی پھیل رہی ہے اس کا انسداد کیا جائے۔ بنی خلدون نے یہ خط اس غریب حاکم کو دکھا کر اس پر سخت لعنت و ملامت کی، اور اس کی بے عزتی یہاں تک کی گئی کہ کئی دن تک اس کو گرفتار کیے رکھا۔

۲۷۶ھ (۸۹۰ء) میں اشبیلیہ کی یہ حالت تھی جو اُوپر بیان ہوئی، یہ امیر عبداللہ کا چوتھا سال جلوس تھا، اشبیلیہ کے علاوہ اور جہاں جہاں اسپین میں اسلامی حکومت تھی وہاں کے لوگوں نے بھی امیر عبداللہ کی حکومت اور اطاعت سے سرکشی اختیار کر لی تھی، ہر عرب، افریقی، اور اسپینی سرداروں نے مروانی سلطنت کے حصے بخرے آپس میں کر لیے تھے، عربوں کا حصہ البتہ سب سے کم تھا ان کو صرف اشبیلیہ ہی میں پورے اختیارات حاصل ہوئے، باقی کل علاقوں میں وہ افریقیوں یا اسپینیوں کے مقابلے میں مضبوط نہ رہ سکے، بربر اور اسپینی صوبہ داروں میں اکثر مثلاً ابن عطاف صاحبِ منتیشہ، ابن سلیم صاحبِ مدینہ بنی سلیم داصلاح شوذر، ابن وضاح

صاحب لورقہ، الانکر صاحب سرقسطہ، امیر عبداللہ کے صرف ایسے احکام کی پابندی کرتے تھے جو اُن کو پسند آتے تھے، باوجود اس کے اِن سرداروں نے امیر عبداللہ سے علانیہ سرکشی اختیار نہیں کی تھی، کیونکہ اُن کو اپنی کمزوری کا بھی علم تھا اور امیر سے ایک دن مصالحت ہو جانے کا بھی خیال تھا۔

اسپین کے بربر جو اپنے قبیلی طرزِ حکومت کی طرف عود کر چکے تھے، قوت میں سب سے بڑھے ہوئے تھے اور کسی کی نہ سنتے تھے، طلاحی نے محض ایک سپاہی کی حیثیت سے ترقی کرتے کرتے جیان کے قلعے پر قبضہ کر لیا، خلیل اور سعید دو بھائی جو ایک پرانے خاندان کے آدمی تھے صوبہ البیرہ میں دو قلعوں کے مالک بن بیٹھے، اسپین کے جن صوبوں کو آج کل استری مدورا اور الن تیجو[1] کہتے ہیں، وہ سب کے سب بربر کے قبضے میں چلے گئے، ماردہ کے قریب اضلاع ترجیلہ میں نبو نفزہ پر بنی فرانیق حکومت کرتے تھے، ایک اور بربر سردار ابن تاکیت جو قبیلہ مصمودہ سے تھا اور جس نے امیر محمد کے زمانے میں استری مدورا کے صوبے میں علمِ بغاوت بلند کیا تھا، ماردہ پر متصرف ہو گیا تھا، ابن تاکیت نے عربوں اور قبیلہ کتامہ کے بربر کو ماردہ سے نکال دیا تھا، اور ابن مروان جلیقی صاحب بطلیوس سے متواتر لڑتا رہا تھا وجہ مخاصمت یہ تھی کہ جس زمانہ میں امیر اندلس کے لشکر نے ماردہ کا محاصرہ کیا تھا تو ابن تاکیت نے ابن مروان سے کمک مانگی تھی، ابن مروان نے فوج نہ بھیجی، لیکن بربر میں سب سے زیادہ مقتدر خاندان
بنی ذی النون کا تھا، اس خاندان کا سردار موسیٰ تھا، یہ بڑا ہی لٹیرا اور مفسد تھا، کبھی نچلا بیٹھنا ۳۵۲
نہ جانتا تھا، اور ملک میں ہر طرف آگ لگائے رکھتا تھا، جسمانی طاقت اور ظلم و ستم میں اس

---

[1] استری مدورا نام کے دو علاقے ہیں، ایک اسپین میں اور ایک پرتگال میں یہاں اسپین کے استری مدورا سے مراد ہے جو دو بڑے صوبوں پر مشتمل ہے ایک کا نام صوبہ قاصرش ہے اور دوسرے کا صوبہ بطلیوس صوبہ بطلیوس ہی کا ایک بڑا شہر ماردہ ہے، الن تیجو ملک پرتگال کا علاقہ ہے اسپین کے علاقے استری مدورا اور صوبہ ولبہ سے ملحق مغرب میں واقع ہے (مترجم)

[2] ابن خلدون۔ ص ۱۰

کے تین لڑکے یحییٰ، فتح اور مطرف بھی اُسی کے مثیل تھے یحییٰ بن موسیٰ اپنی قوم میں سب سے بڑھ کر ظالم اور عیار تھا، فتح بن موسیٰ صاحب اقلیش، اور مطرف بن موسیٰ صاحب فتہ تھا، مطرف اور بھائیوں کے مقابلہ میں کم شریر تھا، ان تینوں بھائیوں میں ہر ایک کے ساتھ قزاقوں کا ایک گروہ رہتا تھا جو دور دور تک ڈاکے مارتا تھا۔

اسپینی مسلمان اگرچہ بربر سے زیادہ قوت رکھتے تھے لیکن بربر کی مانند وحشی نہ تھے مسلمان اسپینیوں کے اکثر سردار تہذیب و شائستگی یعنی عربی تہذیب و شائستگی کو پسند کرتے تھے، اسپین کے ناتھوں سے بغاوت و سرکشی کرنے میں جس لیاقت اور ذہانت سے یہ کام لیتے تھے اُس کی فوقیت کو سب تسلیم کرتے تھے، صوبہ اکشنوبہ میں جس کا موجودہ نام الکاروی (الغرب) ہے اور جو اس وقت سلطنت پرتگال کا سب سے جنوبی حصہ ہے ایک شخص حکومت کرتا تھا، جو زاولفس عیسائی کا پڑپوتا تھا کسی وقت یہ خاندان مسلمان ہو گیا تھا، بکر کے باپ یحییٰ نے امیر محمد کے عہد حکومت کے ختم ہونے سے کچھ پہلے مروانی حکومت سے اپنے کو آزاد کر لیا تھا یحییٰ نے پہلے شنت ماریۃ الغرب کے شہر پر قبضہ کیا پھر رفتہ رفتہ کل علاقے کا مالک ہو گیا۔ یحییٰ کے بیٹے بکر نے شہر شلب میں شاہانہ تزک کے ساتھ رہنا شروع کیا، اُس کے دربار میں وزراء تھے، خزانہ اپنا علیحدہ تھا اور فوج بہت باقاعدہ اور قواعد داں تھی، شنت ماریہ کا قلعہ اس کی دیواریں اور برج پرانے زمانے کی نہایت مستحکم عمارتوں میں شمار ہوتے تھے، قلعے کے آہنی دروازے اور شہر کا بڑا گرجا جس کا درجہ اندلس کے گرجاؤں میں صرف کنیسۃ الغراب کے بعد تھا۔ تمام ملک میں مشہور تھا، کنیسۃ الغراب کی زیارت کو بہت دور دور کے عیسائی آیا کرتے تھے، مسافروں اور رعایا کو لوٹنے کی جگہ بکر بن یحییٰ اپنی رعایا پر یہ بات ظاہر کرتا رہتا تھا کہ وہ اُن کو حفاظت اور آسائش دینی چاہتا ہے، اسی وجہ سے لوگ کہا کرتے تھے کہ اکشنوبہ میں جب کوئی مسافر پہنچتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے دوستوں اور عزیزوں میں آگیا، بکر بن یحییٰ اگرچہ ابن حفصون اور ابن مروان جلیقی کی دوستی کی وجہ سے بہت با اثر اور با اختیار تھا مگر

---

[1] دیکھو فرحینی جلد ۲ ص ۳۶۴

وہ ان دوستوں کے برخلاف مزاجِ صلح و امن کو زیادہ پسند کرتا تھا، صوبہ اکشنونیہ میں امیر نے اُسے حاکم مقرر کیا تھا، بکر نے اس مرتبے کو قبول کر لیا تھا، کیونکہ اس میں اُس کا کوئی نقصان نہ تھا، اکشنونیہ سے شمال کی طرف اُس کا ہمسایہ اور دوست عبدالملک ابن ابی جواد باجہ اور مرتلہ کے شہروں پر حکومت رکھتا تھا، یہاں سے دور مشرق کی سمت میں باغہ کے پہاڑوں میں اسپینی مسلمان ابن مستنہ صاحبِ اختیار تھا، یہ ابن حفصون کا بڑا ہی چیمت و چالاک معاون تھا ابن مستنہ کے پاس بہت سے ایسے قلعے تھے جن کا فتح کرنا غیر ممکن تھا، منجملہ ان کے قلعہ قرقبولیہ تھا جسے آج کل کاراکوئی کہتے ہیں، صوبہ جیان میں جس قدر بڑے سردار تھے وہ سب ابن حفصون کے ہوا خواہ تھے، انہی سرداروں میں خیر ابن شاکر صاحب شوذر تھا، جو اُس زمانے سے کچھ دنوں پہلے جس کا ہم اس وقت ذکر کرتے ہیں سردار عرب سوار القیسی کے مقابلہ میں لڑا تھا، اور سوار کے بعض قلعوں کا مالک ہو گیا تھا، ان کے علاوہ سعید ابن ہذیل صاحب منت لیون تھا اور بنی ہابیل سے چار بھائی تھے جن کے پاس بہت سے قلعے تھے، ان میں مرغریلظہ اور نسنت اشیتبان کے قلعے شامل تھے ایک اسپینی مسلم سردار ابن شالیہ تھا جس کے قبضے میں حصن قسطلونہ اور چند اور قلعے تھے، ابن شالیہ بہت دولتمند تھا، شاعروں کو اکثر انعام و اکرام دیا کرتا تھا اور بڑی شان سے رہتا تھا۔ (۲۵۴)

عبدکیس، ابن شالیہ کا معتمد خاص تھا، یہ بڑا شاعر تھا، امیر عبداللہ کا دربار چھوڑ کر ابن شالیہ کا ملازم ہوا تھا، اپنے اشعار میں لکھتا ہے کہ:-

> "ہمارے بادشاہ (ابن شالیہ) کے محل اور قصور جنت کے محل و قصور ہیں، ان میں ہر طرح کا عیش و آرام میسر ہے اُن میں بڑے بڑے عالیشان کمرے ہیں جو معمولی ستون نہیں رکھتے، بلکہ از سرتا پا سنگِ مرمر کے ہیں جن کے اوپر طلا کار حاشیہ وٹا ہوا ہے۔"

ایک اور سردار وسیم بن اسحاق صاحب مرسیہ و لورقہ تھا جو تقریباً کل ارضِ تدمیر کا مالک تھا ابن اسحاق کو بھی شاعری کا بڑا شوق تھا، اور اس کی فوج میں پانچ ہزار سوار تھے، اس کی

ل ابن القوطیہ ص ۵۴

فیاضی اور اخلاق نے رعایا کو اس کا گرویدہ کر رکھا تھا۔

مگر ان تمام سرداروں میں امیر عبداللہ کا سب سے بڑا مقابلہ کرنے والا ابنِ حفصون ہی تھا اخیر دو سال میں اُس نے اپنے حق میں بہت سے فوائد حاصل کر لیے تھے۔ ۲۷۶ھ کے موسم بہار میں امیر عبداللہ ابن حفصون کے قلعہ ببشتر پر حملہ کرنے چلا، راستے میں چند قریوں پر قبضہ کیا باغیوں کی کچھ کھتیاں جلا دیں اور چالیس دن کی یہ فوج کشی بغیر کسی نتیجہ کے ختم ہوگئی، امیر جونہی قرطبہ میں واپس آیا ابن حفصون نے اسطبہ اور اشونہ کے شہروں پر قبضہ کر لیا استجہ کے لوگ ابن حفصون کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کو اپنا سردار مانتے ہیں، آپ ہمارے شہر اور فوج کے مالک ہو جایئے، قرطبہ کے لوگ استجہ کی نسبت کہتے تھے کہ "وہ بے انصافی کا گھر ہے نیک لوگوں نے وہاں کا رہنا چھوڑ دیا، اور بُرے لوگوں نے وہاں سکونت اختیار کی ہے"

ابن حفصون کی زیادتیوں سے پریشان ہو کر امیر عبداللہ پھر اُس پر حملہ کرنے قرطبہ سے نکلا، جس قدر فوج جمع کرنی ممکن تھی جمع کی، ابن حفصون کو کامیابیاں بہت ہو چکی تھیں، اب معاملات میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے امیر کی خدمت میں اُس نے شرائط صلح پیش کیں شرطیں یہ تھیں کہ جن علاقوں کا ابن حفصون مالک ہو گیا ہے اُن کا حاکم اور والی اب امیر کی طرف سے وہ مقرر کر دیا جائے، امیر عبداللہ نے اس خیال سے کہ معاملہ آسانی سے طے ہوتا ہے اس شرط کو مان لیا اور ابن حفصون کو ان علاقوں کی سندِ حکومت دیدی

لیکن ابن حفصون نے اس صلح کے معنی جو کچھ وہ خود سمجھتا تھا وہی سمجھے تھوڑے ہی دن گذرے تھے کہ اس نے بربر رئیس ابو حرب پر جو جزیرۃ الخضراء کا حاکم اور امیر عبداللہ کے بڑے خیر خواہوں میں تھا حملہ کر دیا، ابو حرب اس لڑائی میں مارا گیا، اور اس کے لشکر والوں نے جزیرۃ الخضرا کو اس اسبتی مسلمان ابن حفصون کے حوالے کر دیا۔

امیر عبداللہ بھی سمجھ گیا کہ ابن حفصون نے جو صلح کی تھی اس کے کیا معنی تھے، اب اس کو ابن حفصون کی طرف سے مطلق اطمینان نہ رہا، علاوہ ازیں خود ابن حفصون کے بعض ماتحت سرداروں کو شکایت ہوئی کہ جس قسم کی مصالحت ابن حفصون نے کی ہے، اُس کے معنی کمزوری اور کاہلی کے ہیں، ایسی مصالحت سے اُن کا سراسر نقصان تھا، کیونکہ رہزنی اور قزاقی میں جو مال

ہاتھ لگتا تھا اسی پر اُن کا گذر تھا، چنانچہ ابن حفصون کے بڑے گہرے دوستوں اور ساتھیوں میں سے ابن مستنہ اس کاہلی اور بیکاری سے اس قدر بیزار ہوا کہ وہ قرب وجوار کے عربوں سے جو قلعہ یحصب میں امیر کی خیر خواہ اور عافیت پسند رعایا کو لوٹنے کے لیے آن بسے تھے جا ملا اور ان کے ساتھ ڈاکے مارنے میں شریک ہونے لگا، رعایا نے امیر سے فریاد کی، امیر عبداللہ سخت پریشان ہوا، نہ تو اپنی خیر خواہ رعایا کو اس بُرے حال میں چھوڑ سکتا تھا، اور نہ اتنی فوج پاس تھی کہ اُن کی حفاظت کر سکتا، آخر کار بہت غور و فکر کے بعد ابن حفصون کو لکھا کہ ابن مستنہ اور اس کے ساتھ جو عرب ہیں ان کے تدارک کے لیے فوج روانہ کرتا ہوں، تم بھی اس فوج کے ساتھ جاؤ۔

ابن حفصون کچھ اور ہی بات دل میں سوچے ہوئے تھا، اس کو اس وقت ابن مستنہ کا جا اسپینی مسلمان تھا عربوں کے ساتھ شریک ہو جانا جن کی دشمنی اسپینیوں کے ساتھ ظاہر تھی سخت ناگوار گذرا تھا، چنانچہ اس نے امیر کے حکم کو امیر کی توقع سے بھی زیادہ جلد بجا لانا منظور کر لیا، لیکن جب شاہی فوج کے ساتھ شریک ہوا جس کا سردار ایک شخص ابراہیم ابن خمیر اموی تھا، تو خفیہ طور سے ابن مستنہ کو ایک خط لکھا، اس خط میں ابن مستنہ کو عربوں کے ساتھ شریک ہونے پر سخت ملامت کی، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ میں تم کو اسپینیوں کے قومی اغراض و مقاصد کا خیر خواہ اور حامی خیال کرتا ہوں، اس وقت تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ مروانی حکومت سے بغاوت جاری رکھو، جس لشکرِ شاہی میں اس وقت میں شامل ہوا ہوں وہ مجھ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔

ابن حفصون نے اِس خط میں کوئی بات بڑھا کر نہیں کہی تھی، شاہی لشکر کے لوگوں میں اسے بہت دخل حاصل تھا، اور اس کی موجودگی میں امیرِ لشکر ابنِ خمیر کوئی چیز نہ تھا، ابنِ حفصون جس طرح چاہتا تھا سپاہیوں سے برتاؤ کرتا تھا، ذرا ذرا سے شبہ پر اُن کو قید کر دیتا، اُن کے گھوڑے چھین چھین کر اپنے سواروں کو دے دیتا، اور جب ابراہیم ابن خمیر کوئی عرض کرتا تو فوراً اس کو کوئی معقول جواب دے کر بند کر دیتا،

غرض یہ شاہی لشکر اور ابن حفصون کی فوجوں کا ملک میں سے گذرنا محض ایک فوجی تماشہ تھی، کیوں کہ ابن حفصون اس بات کا وعدہ ابن مستنہ سے پہلے ہی کر چکا تھا کہ اس شاہی فوج کشی

سے ابن مستنہ کو کسی طرح کا نقصان نہیں پہنچے گا، اس نمائشی معرکہ آرائی میں ابن حفصون کو اس کا موقع اور مل گیا کہ ہر جگہ اسپینیوں سے معاملات طے کرتا چلے اور البیرہ کے لوگوں کی بھی مدد کرے، جن کو اس زمانہ میں سوار القیسی نے حسب مدینۃ البیرہ میں سخت شکست دی تھی، اس شکست کے جواب میں جو لڑائی ابن حفصون کی مدد سے پھر البیرہ والوں نے سوار سے لڑی اُس میں ابن حفصون کو کامیابی کم[1] ہوئی تھی، جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں (دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۲۲۱) حال میں جن لوگوں سے اُس نے اتحاد پیدا کیا اُن کے بھروسے پر اور یہ خیال کر کے کہ بعض دوست اُس کی سیاسی تدابیر میں اعتدال و تلوّن کے نقائص سے بیزار ہو چلے ہیں، ابن حفصون نے سوچا کہ وہ وقت اب آگیا ہے کہ دغا اور فریب کی نقاب اپنے چہرے سے اُتار پھینکے، اس لیے ابراہیم ابن خمیر اور چند اور اموی افسران لشکر کو قید کر دیا، اور امیر عبداللہ کے خلاف اشتہار جنگ دے دیا۔

قرطبہ کے عیسائیوں[2] میں بھی اُسے بہت سے لوگ ایسے مل گئے جو بڑے بکار آمد دوست ثابت ہوئے، اب عیسائیوں کے لیے وہ زمانہ نہ رہا تھا کہ جوشِ نصرانیت اور دنیا تلخوں سے عداوت ظاہر کرنے کا ذریعہ محض شہادت کا درجہ حاصل کرنا رہ گیا ہو، اب عام بدنظمی کی حالت میں عیسائیوں نے قومی آزادی کو بجائے شہادت کے ہتھیاروں کی مدد سے حاصل کرنے کا عزم کر لیا۔ اور بعض ایسے عیسائی بھی جو اب تک اپنی ہی قوم کو نقصان پہنچانے میں بنی امیہ کے بڑے کارگذار رہے تھے مروانیوں کی جان کے دشمن ہو گئے، ایسے ہی عیسائیوں میں ایک شخص تھا جس کا نام کاونٹ سروانڈو[3] تھا، یہ شخص ایک مفلس سرف (کاشتکار)

---

[1] زخمی ہونا پڑا، ایک ہاتھ کٹ گیا، میدان سے بھاگنا پڑا، اس قسم کی کامیابیاں شاید پہلے کم ہوئی تھیں، اس وقت مصنف کا ہیرو ابن حفصون ہے اسلیے اسکی مغویانہ حرکتوں کی تعریف اور اسکی سزاؤں کو گھٹا کر لکھنا ضروری ہے۔ مترجم

[2] اب تک ابن حفصون کے ساتھ جس قدر لوگ ہوئے تھے وہ صرف اپنے مسلمان ہی تھے، لیکن اب عیسائیوں سے اس کے تعلقات پیدا ہونے ہیں۔ مترجم

[3] عرب مورخوں نے اس کا نام شربند تومس لکھا ہے، بعض نے شربند کی بجائے شربیل لکھا ہے لیکن شربیل کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔ مترجم

کا لڑکا تھا جو کسی گرجا کی جائیداد سے متعلق تھا، امیر نے جو کام اس کے سپرد کیا امیر کی خوشنودی کی غرض سے اسے بجالایا، کبھی عذر نہ کیا، یہ خیال کر کے کہ امیر کو خوش کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے کہ خزانہ شاہی میں دولت کا اضافہ کرتا رہے اس نے اپنے ہم مذہب عیسائیوں پر اتنے محصول لگا دیے کہ وہ مجبور ہو کر عیسائی مذہب ترک کرنے لگے[1] اسی سرواندو کے زمانے کا ایک پادری مورخ لکھتا ہے کہ " سرواندو زندہ عیسائیوں کی جان تو لیتا ہی تھا، مگر مردہ عیسائیوں کی بھی عزت اس نے نہ کی، عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کو بھڑکانے کے لیے اس نے عیسائی شہیدوں کی لاشیں گرجاؤں کی قربان گاہوں کے نیچے سے نکلوا کر امیر کے وزراء کو دکھائیں اور کہا کہ "ان متعصب عیسائیوں کو دیکھو کہ جن مجرموں کو از روئے شرع سزا دی گئی تھی، ان کی عزت انھوں نے ایسی کی کہ گرجا کی قربانگاہ کے نیچے انھیں دفن کیا"

عیسائیوں کو جیسی عداوت سرواندو سے تھی اور کسی سے نہ تھی، پادریوں نے اس کی نسبت کریہہ الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لکھنے میں لغت کی کتابیں خالی کر دیں، لکھا کہ "وہ بدمذاق و بے حیا تھا، خود ستا، طامع، ظالم، حاسد اور جفاکار تھا، اور اس قدر غدار تھا کہ خدا کی مرضی کے خلاف چلتا تھا، وہ شیطان کا بچہ تھا"

چند اور اسباب بھی ایسے معقول تھے جن کی بنا پر سرواندو سے اس درجہ نفرت کی جاتی تھی، قرطبہ کے گرجاؤں پر سرواندو نے اس قدر بھاری محصول لگائے تھے کہ آمدنی میں اتنا نہ بچتا تھا کہ پادریوں کی تنخواہیں ادا ہو سکیں، جب پادری گھر بیٹھے تو ان کی جگہ ایسے لوگ پادری مقرر ہونے لگے جو مسلمانوں کے خوشامدی تھے، اور جن کو سرکار سے تنخواہ ملتی تھی، اور ان کا مقرر کرنے والا سرواندو تھا، علاوہ ازیں سرواندو عیسائیوں کے شہیدوں اور ان کے سرپرستوں کا جانی دشمن تھا، ایک موقع پر اس نے گرجا کے دو بڑے آدمیوں پر جن میں ایک سیمسن رئیس دیر اور دوسرا والیتوس اسقف قرطبہ تھا یہ الزام لگایا کہ

---

[1] عیسائیوں کو روپیہ اس قدر عزیز تھا کہ اس کے خوف سے مذہب تک تبدیل کر دیتے تھے (مترجم)

انھوں نے اپنے ماتحت عیسائیوں میں سے ایک عیسائی سے مسلمانوں کے بزرگان دین کو گالیاں دلوائیں، سروانڈو نے امیر سے عرض کیا کہ رئیس دیر اور اسقف کو بلاکر پوچھا جائے کہ آیا اس عیسائی کا بیان کہ اس نے اُن کے اغوا سے مسلمانوں کے بزرگانِ دین کو گالیاں دیں صحیح ہے یا غلط؟ اگر وہ اس کی صحت کے مقر ہوں تو اُن کو توہین مذہب کے جرم میں ماخوذ کرکے سزا دی جائے، اور اگر جان کا خوف اُن کو اس عیسائی کے بیان کی تصدیق سے باز رکھے تو پھر اُن کے ہاتھ میں خنجر دیے جائیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس عیسائی کو قتل کریں اگر اس سے بھی وہ انکار کریں تو ثابت ہو جائیگا کہ انھی کے کہنے سے اس عیسائی نے گالیاں دی تھیں اور پھر مجھ کو تلوار دیجائے کہ میں ان تینوں عیسائیوں کو قتل کردوں۔

سروانڈو کی اس تقریر کو اب بیس برس گذر لیے تھے، اس مدت میں زمانے ایسا رنگ بدلا کہ سروانڈو کے انداز کے آدمی بھی زمانے کے ساتھ بدل گئے، بہت کچھ غور و خوض کے بعد آیندہ کے نشیب و فراز کو سوچ کر اُس کو دفعتہً امیر عبداللہ سے سخت عداوت پیدا ہوگئی اس کے نزدیک اب امیر کے زوال میں مطلق شبہ نہ تھا، اور اب اس کو اسپینی قوم کے رہبر و سرپرست (یعنی ابن حفصون) سے جو بزعم خود عنقریب امیر کی جگہ تختِ اسپین کا مالک ہونیوالا تھا بے انتہا ہمدردی پیدا ہوئی، اپنے ہم مذہب عیسائیوں کے ساتھ جن پر ظلم کرچکا تھا مہربانی کا طریقہ اختیار کیا، اور ان کے ساتھ مل کر ایک بغاوت پیدا کرنی چاہی۔

بادشاہ کو سروانڈو کی اِن سازشوں کا حال معلوم ہوگیا، گرفتاریاں جاری ہوئیں سروانڈو کا بھائی پکڑا گیا، مگر وہ خود خبر پاتے ہی باغیوں کے گروہ سے علیحدہ ہوکر بھاگا، قرطبہ سے نکلنے کے بعد کسی بات کا خوف نہ رہا تھا، کیونکہ امیر عبداللہ کی بادشاہی قرطبہ سے باہر نہیں رہی تھی۔

سروانڈو کو قرطبہ سے نکلنے کے بعد کسی بات کا خوف نہ رہا تھا، قرطبہ سے جنوب میں

۱؎ اسپینی قوم میں یہاں عیسائیوں کی تخصیص نہیں ہے بلکہ عیسائی اور مسلمان دونوں شامل ہیں مترجم

۲؎ شریف ادریسی نے حصن بلائی کو قرطبہ سے ۵ فرسخ (۱۵ میل) کے فاصلہ پر شنتت یالہ کے (باقی بر صفحہ آیندہ)

حصن بلائی ایک دن کی راہ پر تھا، اس قلعہ پر اس نے قبضہ حاصل کرنا چاہا امیر کے اور قلعوں کی طرح یہ قلعہ بھی کسی کی نگرانی میں نہ رہا تھا، سروانذو اپنی کوشش میں کامیاب ہوا اور حصن بلائی پر اُس کا قبضہ ہوگیا، قبضہ ہونے پر ابن حفصون سے اتحاد پیدا کرنا چاہا، ابن حفصون نے نہایت خوشی سے اتحاد کر لیا، اور تھوڑے سے سوار اس کے پاس بھیج کر ہدایت کی کہ قرطبہ کے قرب و جوار میں ڈاکہ زنی جاری رکھے۔

اس قسم کے کاموں کے لیے سروانذو سے بہتر آدمی کہاں ملتا؟ ملک کے چپے چپے سے واقف تھا، عربی مورخ لکھتے ہیں کہ وہ بڑا شہسوار بھی تھا، شام کو حصن بلائی سے نکلتا اور صبح ہونے واپس آجاتا، رات بھر میں ہری کھیتیاں اور گاؤں جلا ڈالتا اور لاشیں زمین پر پڑی چھوڑ جاتا، جس سے معلوم ہوتا کہ کدھر کوچ کیا ہے۔ آخر کار اسی طرح کے ایک ڈاکے میں جان سے مارا گیا، لیکن اس کے ساتھی بدستور قزاقی اور کشت و خون میں جن کی ابتدا سروانذو نے کی تھی مصروف رہے۔

اسی زمانے میں ابن حفصون نے حصن بیانہ پر قبضہ کیا، اب گویا وادی الکبیر سے جنوب میں جس قدر بڑے قلعے تھے ان کا وہ مالک ہوگیا اور تقریباً کل اندلوسیہ[1] کی رعایا نے اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ امیر نے صوبہ البیرہ اور صوبہ جیان کے حاکم اپنی طرف سے مقرر کرنے چھوڑ دیے

ابن حفصون کو طاقت کا غرور تو ہو ہی گیا تھا، اب اُس نے اسپینی مسلمانوں پر اپنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) قریب لکھا ہے۔ اب اس کا نام اگیلار اسرحد الالہ ہے ۱۲۴۰ء کے سرکاری فرمان میں تو پہیز نے اسکا ذکر کیا ہے عبارت یہ ہے۔ "اگیلار جسے پہلے پولی (بلائی) کہتے تھے" ڈوزی کی کتاب تحقیقات جلد اول ص ۳۰۷

[1] اندلوسیہ سے مراد کل اندلس یا اسپین نہیں ہے بلکہ دریائے وادی الکبیر کے جنوب میں جو علاقے پڑتے ہیں اُن سے مراد ہے، یہ علاقے حسب ذیل ہیں ولبہ، اشبیلیہ، قادس، قرطبہ، غرناطہ، جیان، المریہ، مالقہ یہ تقسیم زمانہ حال کی ہے۔ جس زمانہ کے حالات لکھے جا رہے ہیں ممکن ہے اس میں اندلوسیہ کی حدود اس سے کم ہوں، بہرکیف اس فقرے میں مبالغہ ضرور معلوم ہوتا ہے۔ مترجم

سرداری کے دوام اور استقلال کی کوشش کی[۱]، قرطبہ پر جلد قبضہ کرنے اور کل اسپین کا بادشاہ بننے کا اب اس کو کامل یقین تھا، لیکن اتنا جانتا تھا کہ اگر وہ صرف اسپینیوں کا سردار اور سرپرست رہا تو عرب کبھی اس کی حکومت کو تسلیم نہ کریں گے۔ اس لیے اپنی مراد کو پہنچنے کے لیے سب سے مقدم اور ضروری بات یہ ہے کہ کسی طرح خلیفۂ بغداد سے اپنی امارت اسپین کا اعلان کروادے، اس سے اس کے اختیارات میں کسی طرح کی کمی نہیں ہوگی، کیونکہ خلفائے ۲۵۷
بغداد کی حکومت ایسے ملکوں سے جو دارالخلافہ سے دور رہتے تھے برائے نام ہوا کرتی تھی، اگر خلیفہ بغداد نے اسے اسپین کا امیر مقرر کر دیا تو پھر یہ امید ہو سکتی ہے کہ اسپین کے عرب اس کی اطاعت سے انکار نہ کریں، کیونکہ اس صورت میں اس کی حیثیت محض ایک اسپینی مسلمان کی نہیں رہے گی بلکہ وہ ایک ایسے حکمراں خاندان کا وکیل ہو جائے گا جس کی عرب سب سے زیادہ عزت کرتے تھے۔

غرض یہ تدبیر سوچ کر ابن حفصون نے ابن اغلب کی طرف سے جو اس وقت عباسی خلیفہ کی طرف سے والی افریقہ تھا خط و کتابت شروع کی اور اس کے خوش کرنے کے لیے تحائف بھیجے، ابن اغلب نے ابن حفصون کی درخواست کو توجہ سے سنا اور اس کی قدر افزائی کی اور وعدہ کیا کہ خلافت مآب سے اسپین کی سندِ حکومت عطا ہونے کے لیے اس کی سفارش کرے گا۔

ابن حفصون اس انتظار میں کہ اسپین میں عباسیوں کا علم بلند کرنے کے لیے خلیفہ بغداد کے پاس سے حکم آنے کو ہے قرطبہ کے قریب پہنچا اور استجہ کو اپنا مستقرِ حکومت بنا لیا استجہ سے وہ اکثر اوقات حصن بلائی کو دیکھنے آیا کرتا تھا کہ وہاں کی دیواریں اور برج جلد درست کرا دیے جائیں، تاکہ یہ مقام ایسا مستحکم ہو جائے کہ کوئی اسے فتح نہ کر سکے، دوسری وجہ حصن بلائی میں اکثر آتے رہنے کی یہ تھی کہ یہاں جو فوج مقیم تھی اس میں اضافہ کرتا رہے

---

۱ اس فقرے سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اب تک گویا ابن حفصون کو عیسائی اسپینیوں سے واسطہ رہا تھا حالانکہ عیسائیوں سے تعلقات اب شروع ہوئے تھے، اور اس وقت تک اسپینی مسلمانوں سے تعلق تھا (مترجم)

اور اگر ضرورت ہو تو فوجیوں کی ہمت بھی بڑھائے، ابن حفصون کو اب پورا یقین ہو چلا تھا کہ کچھ دنوں یا کچھ مہینوں کے بعد وہ قرطبہ میں فاتح قرطبہ بن کر داخل ہونے والا ہے

قرطبہ پر اس وقت مصائب و آفات کی تاریک گھٹا چھائی ہوئی تھی، گو دشمن نے شہر کا واقعی محاصرہ نہیں کیا تھا، لیکن شہر والوں کو وہی تکلیفیں پہنچ رہی تھیں جو کسی قلعہ کے لوگوں کو محصور ہونے کی حالت میں پہنچا کرتی ہیں، عربی مؤرخ لکھتے ہیں کہ قرطبہ کی حالت ایسی ہو رہی تھی جیسے کسی سرحدی شہر کی ہوتی ہے کہ معلوم نہیں کس وقت دشمن اس پر حملہ کر بیٹھے دریا پار سے جس وقت رات کو کسانوں نے رونے پیٹنے کی آوازیں آتیں، جن کو حصن بلائی کے سوار لوٹا کرتے تھے، تو قرطبہ میں لوگ سوتے سوتے چونک پڑا کرتے تھے، ایک مرتبہ انہی لٹیروں میں سے ایک سوار شہر میں گھس آیا اور پل اتر کر دروازۂ شہر پر جو مورت نصب تھی اس پر برچھی ماری۔

اسی زمانے کا ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ "سلطنت غارت ہو چکی ہے مصیبت پر مصیبت آتی بند نہیں ہوتی، لوٹ اور چوری کا بازار گرم ہے، ہمارے اہل و عیال غلام بنائے جا رہے ہیں"

امیر عبداللہ کی کمزوری اور پست ہمتی پر ہر طرف سے ملامت ہوتی تھی، سپاہیوں کو شکایت تھی کہ مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی، صوبوں سے جب خراج آنا بند ہوا تو خزانہ خالی ہو گیا، امیر نے کچھ رقمیں قرض لے رکھی تھیں، اور وہ سب اُن عربوں کو دینے دلانے میں صرف ہو گئیں جو اب تک امیر کے خیر خواہ چلے آتے تھے منڈیاں اور بازار خالی پڑے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ تجارت کا کاروبار بند ہے، روٹی بہت مہنگی ہو گئی تھی، آئندہ کیا ہو گا اس کے سوچنے تک کی کسی میں ہمت نہ تھی، سب کے دل افسردہ اور مغموم تھے، اس زمانے کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ "کوئی دن جاتا ہے کہ غلام اس ملک پر حکومت کریں گے اور شریف خاک میں لوٹتے ہوں گے" بنی اُمیہ کا علم جو عبدالرحمٰن الداخل اپنے ساتھ لائے تھے اسی زمانہ میں گم ہو گیا تھا، اس واقعہ سے اور بھی بُرے شگون لیے گئے تھا جو تمام مصیبتوں کو انسان کے اعمالِ بد کی سزا من جانب اللہ سمجھتے تھے اور

ابن حفصون کو غضب الٰہی کی ایک نشانی تصوّر کرتے تھے، اُنھوں نے اہل شہر کو اپنی پیشین گوئیوں سے اور بھی خوف زدہ کر دیا، وہ فرمانے لگے "حیف ہے تجھ پر اے قرطبہ! تف ہے تجھ پر اے شہر! جو ایک بیسوا کے برابر گناہوں اور ناپاکی میں مبتلا ہے، تو مصیبت اور تباہی کا مسکن ہے، نہ تیرا اب کوئی دوست ہے نہ حامی، جب وہ لمبی ناک والا خبیث (ابن حفصون) جس کی فوج میں آگے آگے مسلمان اور پیچھے پیچھے مشرکین (یعنی عیسائی) ہوں گے، تیرے دروازے کے سامنے آئے گا تو بس سمجھ لینا کہ تیرے دن پورے ہوئے، پھر تیرے آدمی بھاگ کر قرمونہ جائیں گے، اور پناہ کے لیے وہ ایسا مقام ہوگا جس پر لعنت بھیجنی چاہیئے تھی" اٰئمین منبر پر سے اس شہر کو "دار الفتن" کہہ کر کوستے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں دن اور فلاں وقت قرطبہ پر کفار کا قبضہ ہو جائے گا، ایک واعظ نے کہا "اے نفرت کے قابل قرطبہ! اللہ کا غضب تو نے خود اپنے اوپر نازل کرایا ہے، کیونکہ تو نے ایسے لوگوں کو عزیز سمجھ کر اپنے پاس جمع کیا ہے جو غیر ہیں، گنہگار ہیں اور عورتیں فاحشہ ہیں، اب اللہ کا عتاب تجھ پر نازل ہوگا ... ... تم دیکھتے ہو کہ اندلس میں جگہ جگہ نزاع برپا ہے پس اب دنیا کی چیزوں کا خیال نہ کرو، ہلاکت شروع ہو گی اُس جگہ سے جہاں دو پہاڑ کھڑے ہیں، ان میں ایک سیاہ ہے اور دوسرا بھورے رنگ کا ... ... ابتدا ہو گی ماہِ رمضان میں، پھر اس پر گزر یگا ایک مہینہ اور پھر ایک مہینہ، اور پھر اُس چوک پر جو "دار المحن" کے سامنے ہے ایک سخت آفت نازل ہو گی، پس اپنے اہل و عیال کی نگہبانی کرو، اے قرطبہ کے رہنے والو! احتیاط کرو کہ کوئی شخص جو تم کو عزیز ہو وہ "دار الفتن" اور بڑی مسجد کے قریب نہ جائے، کیونکہ اُس دن کسی کو مرد ہو یا عورت ہو، یا بچہ، زندہ نہ چھوڑا جائے گا قبل از عصر فتنہ شروع ہوگا اور غروب تک جاری رہے گا، صرف ایک جگہ یعنی ابی عبدہ کی پہاڑی پر جہاں پہلے گرجا تھا، پناہ مل سکے گی"[1]

فکر اور افسردگی امیر عبداللہ سے زیادہ کسی پر نہ تھی، جس تخت حکومت کو بڑی

---

[1] مطلب یہ ہے کہ ابن حفصون کے عیسائی اس مقام کی حرمت کریں گے اور خون سے آلودہ نہ کریں گے۔

آرزوؤں سے بھائی کا خون کرکے حاصل کیا تھا، آج وہی تخت کانٹوں کا بچھونا ہو گیا تھا، امارت کو قائم رکھنے کے جس قدر ذرائع و وسائل تھے وہ ختم ہونیکو تھے، اپنی دانست میں جو تدبیر سیاست اختیار کی تھی وہ درست تھی مگر وہ واقعی غلط ثابت ہوئی، اُس کے بھائی منذر نے جو سخت طریقہ دشمنوں کو مغلوب رکھنے اختیار کیا تھا، روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے اب اس پر عمل نہ ہو سکتا تھا امیر عبداللہ کو فتنہ و فساد، اور جنگ و پیکار سے قلبی نفرت تھی، وہ ایک عابد، پرہیزگار اور عافیت پسند بادشاہ تھا، لشکر گاہ یا میدانِ جنگ اس کو پسند نہ تھا، اس لیے مجبور تھا کہ امور سیاست میں نرمی اور صلح جوئی پر مصر رہے حتیٰ کہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ دغاباز ابن حفصون جس نے بار بار دھوکے دیئے تھے اب ایک بار پھر دھوکا دے، یہ اسپینی مسلم جس کو اپنی فتح کا یقین تھا امیر عبداللہ سے امان حاصل کرنے پر کیوں آمادہ ہوتا؟ امیر نے ایک بار پھر اس کو عمدہ شرائط پر امان دینی چاہی، مگر ابن حفصون نے حقارت کے ساتھ انکار کر دیا۔

ہر مرتبہ خفیف ہونے پر امیر عبداللہ نے آخر کار دنیا کے ذرائع سے ہاتھ کھینچ کر خدا سے التجا کی[1]، ایک درویش کے ساتھ گوشۂ تنہائی میں بیٹھا اور یہ اشعار کہے۔

دنیا کی سب چیزیں گذرنے والی ہیں، یہاں کسی چیز کو ثبات ہے گنہگار ایمانکی شان و شوکت کو چھوڑ اور راہ راست پر آ تھوڑے دن میں تو قبر میں ہوگا اور تیرے چہرہ پر خاک پڑی ہوگی، اب دین کے فرائض کی ادائیگی کی طرف توجہ کر عبادت میں مصروف ہو اور رحمت رب العلمین کا امیدوار ہو جا۔

آخر کار ایک دن ایسا بھی آیا کہ امیر عبداللہ نے ہمت کی، یہ واقعہ ۲۷۷ھ/۸۹۰ء کے ختم کے اس طرح ہوا کہ ایک دن ابن حفصون کا ایک قاصد ابن شاکر صاحب شذونہ کا سر لیے ہوئے امیر کے پاس آیا، اس سر کو دیکھ کر امیر عبداللہ کو امید ہوئی کہ ابن حفصون جس سے صلح و امن کے لیے بار بار کہا جا چکا ہے شاید اب راستی پر آجائے، امیر اس وقت ابن شاکر کے بریدہ سر کو اس بات کی ضمانت سمجھا کہ اب ابن حفصون سے مصالحت ہو جائیگی، کیونکہ ابن حفصون کو خود امیر

[1] دیکھو خوشانی کی کتاب ص ۳۲۲ - امیر عبداللہ درویشوں کی بڑی قدر کرتا تھا، خوشانی کی کتاب قضاۃ قرطبہ کے حالات میں ہے (اکسفرڈ کا قلمی نسخہ نکول کی فہرست نمبر ۱۲۷)

خود امیر عبداللہ نے اس بات سے آگاہ کیا تھا کہ خیر ابن شاکر صاحبِ شوذر گو بظاہر ابن حفصون کا دوست ہے لیکن درحقیقت وہ دسیم صاحبِ تدمیر کا ہوا خواہ ہے ابن حفصون کو اس کی تاب نہ تھی کہ کوئی اس کی قوت کو توڑنا چاہے، اس لیے اُس نے خیر ابن شاکر کو قتل کر کے اپنی دانست میں بڑا انصاف کیا اس واقعہ کی صورت اس طرح پیش آئی کہ ابن شاکر نے ابن حفصون سے مدد مانگی، ابن حفصون نے فوج روانہ کی، اس فوج کا سردار الاحیمر تھا اس کو خفیہ طور پر حکم دے دیا کہ ابن شاکر درحقیقت باغی ہے اس کا سر اُتار لینا۔

امیر عبداللہ کے اس خیال کو کہ ابن حفصون سے مصالحت ہو جائے گی خود ابن حفصون جلد رفع کر دیا، اُس نے قبرہ کے علاقے میں اُن قلعوں کا محاصرہ کر لیا جن کے مالک ابھی تک امیر عبداللہ کے خیر خواہ تھے۔

اب حالت اس قدر نازک ہو گئی کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھی، امیر عبداللہ نے سوچا کہ جو کچھ کھویا ہے، اگر اُسے پھر حاصل کرنا ہے تو جو کچھ اس وقت پاس ہے اس سب کو بازی میں لگانا پڑے گا، چنانچہ وزیروں کو بلا کر کہا کہ اب ابن حفصون سے لڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" وزیروں نے ان خطروں سے بادشاہ کو آگاہ کیا جو لڑائی میں پیش آنے ممکن تھے۔ کہنے لگے کہ "ابن حفصون کی فوج ہماری فوج سے کہیں زیادہ ہے اور ہم کو ایسے دشمن سے لڑنا پڑے گا جو کبھی امان نہیں دیتا۔" لیکن امیر عبداللہ کو جنگ پر اصرار ہوا کیوں کہ جاہ و دولت اور نام و عزت سب میں فرق آچکا تھا، اب میدانِ جنگ میں عزت کی موت مرنے کو اس نے اس بدنامی سے بہتر سمجھا۔

اسناد

ابن حیان ص ۶ تا ۲۲، ۲۳، ۳۹ تا ۴۰، ۵۶ تا ۵۹، ۶۸ تا ۷۱، ۷۷ تا ۷۸، ۹۹ تا ۱۰۰

تاریخ ابن حبیب، ص ۱۵۷ تا ۱۶۰،

اخبار مجموعہ ص ۱۱۱

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

پندرھویں فصل

جنگ حصن بلائی

جس وقت ابن حفصون نے سنا کہ امیر عبداللہ کا ارادہ لڑائی کا ہے، تو اُسے مسرت کے ساتھ حیرت بھی ہوئی، ابن مستنہ سے اسپینی زبان میں کہنے لگا "لو اب یہ گلّے کا گلّہ ہمارے ہاتھ آنے والا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ امیر کا دل بیٹھ جائے اور وہ لڑنے کا ارادہ فسخ کر دے، پانچ سو اشرفیاں اُس شخص کو انعام دوں گا جو خبر لائے کہ بادشاہ لڑنے نکلا ہے" اس کے تھوڑے ہی دن بعد ابن حفصون کو استجہ میں خبر لگی کہ ربض شقندہ کے میدان میں بادشاہ کا خیمہ نصب ہوا ہے، اُس نے ارادہ کیا کہ شاہی خیمے کو جلا دے کیونکہ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو امیر عبداللہ کی خوب ہنسی اُڑے گی، غرض کچھ سواروں کو ساتھ لے کر رات کے وقت شقندہ کے میدان میں پہنچا، بادشاہی حفاظت پر کچھ غلام اور تیرانداز مقرر تھے، ابن حفصون نے اُن پر چھاپہ مارا، مگر غلاموں اور تیراندازوں نے بڑی پامردی سے ابنِ حفصون کا مقابلہ کیا، اور اُن کا غل سن کر شہر سے سپاہی بھی مدد کو ٩١

آ پہنچے، چونکہ یہ محض ایک خفیف سی چال تھی اس لیے جب دیکھا کہ بات بگڑ گئی تو ابن حفصون نے اپنے سواروں کو حکم دیا کہ سرپٹ گھوڑے دوڑا کر حصن بلائی پہنچ جائیں (غالباً ابن حفصون خود بھی بھاگا ہوگا۔ مترجم) بادشاہی رسالے نے ابن حفصون کے سواروں کا تعاقب کیا اور اُن میں سے چند کو قتل کر دیا۔

اگرچہ یہ شب خون کوئی بڑا معرکہ نہ تھا لیکن اہل قرطبہ کی نظر میں وہ بڑی چیز تھا، صبح ہوتے ہی یہ لوگ شہر سے نکل کر ان سواروں کو دیکھنے آئے جو ابن حفصون کے کچھ گھوڑے گرفتار کر کے اور چند سواروں کے کٹے ہوئے سر ساتھ لیے شقندہ کو واپس آئے، شہر والوں نے فتح کی ان نشانیوں کی بڑی قدر اور تعریف کی اور خوش ہو کر کہنے لگے کہ "ابن حفصون قزاق ایسا بھاگا کہ شاہراہ سے بھٹک کر صرف ایک سوار کے ساتھ حصن بلائی پہنچ سکا۔

اس کے بعد ہی ایک اور معرکہ تھوڑے دن میں پیش آیا، اس میں فریقین کی فوجی قوت میں اتنا فرق تھا کہ نتیجہ امیر کے حق میں امید افزا نہ معلوم ہوتا تھا، امیر کی فوج صرف ۱۴ ہزار تھی جس میں صرف ۴ ہزار باقاعدہ فوج تھی، ابن حفصون کی فوج ۳۰ ہزار تھی بہر کیف امیر عبداللہ نے فوج کو کوچ کا حکم دیا اور لشکر حصن بلائی کی طرف بڑھا، جمعرات کے دن ۱۵ اپریل ۸۹۱ء (۱۲ محرم ۲۷۸ھ) کو بادشاہی لشکر اس دریا کے کنارے پہنچا جو حصن بلائی سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر بہتا تھا، فریقین نے سمجھ لیا کہ دوسرے دن یعنی جمعہ کو جو عیسائیوں کا جمعۃ الآلام[1] تھا ۴
لڑائی شروع ہوگی۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی امیر کی فوج لڑائی کے لیے وقت پر تیار ہوگئی، ابن حفصون نے پہاڑی کے نیچے جس کے اوپر حصن بلائی واقع تھا اپنی فوج آراستہ کی اگرچہ اپنی فتح کا کامل

---

[1] عیسائی میں حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کی برسی کا دن ہوتا ہے۔ مسیحی مجلس تنقید کے قاعدہ کے مطابق ۸۹۱ء کا یوم الصلب ۱۴ اپریل کو ہونا چاہیے تھا لیکن عرب مورخین نے حصن بلائی کی لڑائی ۲۷۸ھ میں اجو ۱۷ اپریل ۸۹۱ء سے شروع ہوا لکھی ہے، احتمال یہ ہے کہ اندلس کے عیسائی صلیب مسیح کا دن میجیتوس کے قاعدہ کے مطابق بتاتے تھے، اس قاعدہ کو قیصر ادریان نے اپنے ایک خط میں جو اسقف ایجیلا کو لکھا تھا بُرا کہا تھا۔

یقین تھا اور لڑائی کے شوق میں آپے سے باہر ہوا جاتا تھا، امیر عبداللہ کی حالت اِس کے برعکس تھی، اُس کی فوج کم تھی اور اسی کم فوج پر آج اسپین میں بنی اُمیہ کی قسمت کا فیصلہ تھا اگر اس فوج پر کوئی آفت نازل ہوئی تو پھر کچھ باقی نہ رہتا تھا، دوسری مصیبت یہ تھی کہ امیر لشکر عبدالملک بن اُمیہ لائق سپہ سالار نہ تھا، اُس نے ایک غلط نقل و حرکت ایسی کی کہ قریب تھا کل فوج دشمن کے قبضہ میں چلی جاوے، پہلے فوج کو آگے بڑھایا پھر جس مقام پر پہنچا اُسے ناپسند کر کے چاہا کہ پیچھے ہٹ کر ایک پہاڑی پر فوج کو لے جائے جو حصن بلائی سے شمال میں تھی، یہ ہو ہی رہا تھا کہ موالی بنی اُمیہ میں سے خاندان بنی عبدہ کا بہادر عبیداللہ جو مقدمۃ الجیش کا افسر تھا گھوڑا سرپٹ ڈالے امیر کی خدمت میں آیا اور کہنے لگا " اللہ ہم پر رحم کرے، اے امیر! آپ ہم کو کہاں لیے جاتے ہیں کیا ہم دشمن کو اپنی پیٹھ دکھائیں؟ دشمن ہم کو خوف زدہ سمجھ کر ہمارے ٹکڑے اُڑا دے گا۔" عبیداللہ کا خیال درست تھا، ابن حفصون نے عبدالملک کی غلطی دیکھ لی تھی اور وہ اِس سے نفع اُٹھانے کو تھا، امیر عبیداللہ کے اعتراض کو تسلیم کیا اور پوچھا کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ عبیداللہ نے کہا "بس بڑھے چلیے اور باقی سب خدا پر چھوڑ دیجیے" امیر نے کہا "اچھا، یہی ہونا چاہیے۔"

عبیداللہ امیر کا یہ حکم سنتے ہی اپنے رسالہ کی طرف پلٹا اور سواروں کو حکم دیا کہ فوراً دشمن پر دھاوا کر دیں، سواروں نے دھاوا کیا مگر فتح کی اُمید کسی کو نہ تھی، مشہور عالم یحییٰ بن یحییٰ کے فرزند ابو مروان فقیہ سے جو علم و فضل میں اپنے والد کی مثل شہرت رکھتے تھے، اور شیخ المسلمین کہلائے جاتے تھے، ایک فوجی افسر نے پوچھا " آپ اس لڑائی کا انجام کیا سمجھتے ہیں" ابو مروان بولے " اے بنی عم! سوائے خدا کے کلام کے میں کسی اور عبارت سے تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا، کلام الٰہی یہ ہے کہ " اگر اللہ تمہاری نصرت پر ہے تو کوئی تمہیں مغلوب نہیں کر سکتا، لیکن اگر اس نے تمہیں چھوڑ دیا تو پھر کون تمہاری مدد کر سکتا ہے؟

۶۶۳ مقدمۃ الجیش کے علاوہ لشکر کے اور حصے بھی فتح سے نا اُمید تھے، پیدلوں کو حکم ہوا تھا کہ اپنا سامان اتار کر خیمے نصب کریں اور لشکر کو قاعدہ کے مطابق ترتیب دیں یہ سپاہی

امیر کا خیمہ نصب کر رہے تھے کہ اس کا ایک کھمبا ٹوٹا اور خیمہ گر گیا، جس کسی نے یہ بات دیکھی بے اختیار کہنے لگا "یہ شگون بُرا ہے" لیکن امیر کے افسر فوج نے کہا "ہمت نہ ہارو یہ شگون بُرا نہیں ہے، لڑائی کے شروع میں ایک مرتبہ پہلے بھی ایسا ہوا تھا لیکن ہم کو فتح ہوئی تھی۔" یہ کہہ کر اس نے دوسرا کھمبا لگا کر خیمہ نصب کر دیا۔

فوج کی پہلی صف میں جس نے اب لڑائی شروع کر دی تھی فوجی سرداروں اور مشائخ نے اس بات کو ضروری سمجھا کہ جب کوئی شخص کسی بات کو نحس بتائے فوراً اس کی تردید کر دیں چنانچہ جب کوئی شخص اس قسم کی کسی علامت کی طرف اشارہ کرتا، تو یہ لوگ فوراً اپنے حافظہ کی تیزی بلکہ خیال آفریں دماغ کی مدد سے کوئی سابقہ نظیر جس میں وہی علامت فالِ نیک ثابت ہوئی تھی بیان کر دیتے، رئیسی جو براتا نبرد آزما اور مشہور شاعر تھا، پہلی صف میں زرہ اور خود پہنے لڑ رہا تھا، شمشیر اور نیزے کی ہر ضرب کے ساتھ ایک شعر کہہ دیتا تھا، اسی حال میں دفعتہً زخمی ہو کر گرا اور مر گیا، فوجیوں نے خوفزدہ ہو کر کہا "یہ بات نحس ہوئی، پہلا آدمی ہمارا مارا گیا مشائخ نے کہا ہرگز نہیں، یہ نحس نہیں بلکہ سعد ہے کیوں کہ وادی سلیط کی لڑائی میں جب کہ ہم طلیطلہ والوں سے لڑے تھے تو پہلا آدمی ہمارا مارا گیا تھا، لیکن فتح ہمیں ہوئی تھی۔"

رفتہ رفتہ لڑائی عام ہو گئی، شور اس بلا کا تھا کہ کان بہرے ہوئے جاتے تھے بوق و دہل کی صداؤں میں مسلمانوں کی قرآن خوانی اور عیسائیوں کے زور زور سے انجیل پڑھنے کی آوازیں شامل تھیں[1]

اب یکایک توقع کے خلاف شاہی فوج کے میسرہ نے ابن حفصون کے میمنہ کو توڑ دیا ابن حفصون کی فوج نے پیچھے ہٹنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ بھاگی اور اب امیر کی فوج میں ہر متنفس کو یہ شوق تھا کہ بھاگتے ہوئے دشمنوں کا سر کاٹنے میں کون بڑھا رہتا ہے

[1] اس بیان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ لڑائی میں ایک فریق مسلمان تھا اور دوسرا عیسائی، نہیں بلکہ دونوں فریق مسلمان تھے۔ اور ہر ایک میں عیسائی اور مسلمان موجود تھے۔ مترجم

امیر کی طرف سے فی سر ایک رقم مقرر کر دی گئی جو لبطور انعام کے ملتی تھی۔

امیر عبداللہ خود لڑائی میں شریک نہیں ہوا۔ شامیانے کے نیچے بیٹھا دوسروں کو اپنے لیے لڑتا ہوا دیکھتا رہا، اور اپنی معمولی ریاکاری سے قرآن کی ایسی آیات پڑھتا رہا[لہ] جن سے اس مضمون کی طرف اشارہ پایا جاتا تھا کہ "کسی کو اپنے لڑنے والوں کی تعداد، آلاتِ حرب اور شجاعت پر اعتماد ہے، اور مجھ کو صرف خدائے واحدہٗ لاشریک پر بھروسہ ہے"۔

شاہی فوج نے ابن حفصون کے میمنہ کو جب قطعی شکست دیدی تو اب دشمن کے میسرہ پر حملہ کیا، اس حصۂ فوج کا افسر خود ابن حفصون تھا، اُس نے شاہی فوج کے مقابلہ میں قائم رہنے کی حد سے زیادہ کوشش کی اور خود بھی حسبِ عادت ہمت سے لڑا، مگر آخر کار اس کی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے ابن حفصون کی فوج نے احتیاط سے کام نہیں لیا، بلکہ ہر کام میں جلدی اور تیزی کی، اس فوج کے سپاہی جس قدر جلد کسی بات پر جوش میں آجاتے تھے اُسی قدر جلد ہمت بھی ہار دیتے تھے، غرض ابن حفصون کے ساتھی قبل از وقت کامیابی سے مایوس ہو گئے اور آخر کار شاہی فوج کو پیٹھ دکھا کر بھاگے، اس بھاگتی فوج کے کچھ لوگوں نے استجہ کا رُخ کیا، امیری فوج نے اُن کا تعاقب کر کے سینکڑوں کو قتل کر ڈالا کچھ لوگ جن ۶۴
میں ابن حفصون بھی شامل تھا حصن بلائی کی طرف آئے اور وہاں کے قلعے میں پناہ لینی چاہی، دروازے پر فراریوں کے ہجوم سے قلعے کے اندر آنے کا راستہ بند ہو گیا تھا

لہ اس لڑائی کا حال جس طرح مصنف نے لکھا ہے اُس سے صاف ظاہر ہے کہ مصنف کو ابن حفصون کی شکست پر افسوس ہوا ہے، وہ ابن حفصون کی فوج کے بھاگنے کا ذکر بہت دبی زبان سے کرتا ہے دشمن کے سر کاٹنے کی وجہ بادشاہی فوج کا لالچ بتاتا ہے کہ مقررہ انعام حاصل کریں، پھر امیر عبداللہ کا قرآنی آیات پڑھنا اُسکی نظر میں ریاکاری ہے، غرض ایک ایک لفظ سے امیر عبداللہ کے ساتھ خصومت اور ابنِ حفصون باغی اور قزاق کے ساتھ ہمدردی ٹپکتی ہے، یہ ہیں یورپ کے مؤرخ جو یورپ میں بڑے انصاف والے سمجھے جاتے ہیں، یہ لوگ واقعات اکثر صحیح لکھتے ہیں مگر تحریر میں ایسا رنگ پیدا کرتے ہیں کہ واقعات کا جو اثر ہونا چاہیے اُس سے اُلٹا پیدا ہو، یہ اگرچہ ایک خوبی کمال ہے مگر ریاکاروں ہی کو مبارک رہے (مترجم)

جو لوگ نیٹے بھاگ کر آئے اُنھوں نے اندر جانے کی کوشش بہت کی مگر کامیاب نہ ہوئے ابن حفصون بھی گھوڑے پر سوار قلعے میں جانا چاہتا تھا مگر ممکن نہ ہوا، کچھ سپاہی جو قلعے کی فصیل پر کھڑے تھے اُنھوں نے ابن حفصون کی جان بچانے کے لیے رسیاں ڈال کر گھوڑی کی پیٹھ سے اسے اوپر کھینچ لیا۔

اِدھر ابن حفصون کے لوگ حصن بلائی کے دروازے پر ہجوم کیے اندر جانے کی کوشش میں تھے، اُدھر بادشاہی فوجیں دشمن کے لشکرگاہ کو لوٹ رہی تھیں، امیر عبداللہ کی فوج والے اس فتح سے بہت خوش تھے، کیونکہ ناامیدی کی حالت میں فتح نصیب ہوئی تھی، جس دشمن پر فتح پائی تھی اُس کے تمام لوگوں کو وہ عیسائی سمجھتے تھے، درآنحالیکہ اُن میں تعدادِ غالب اسپینی مسلمانوں کی تھی، خوشی کے نشے میں دشمنوں کو یہ کہہ کر اُن کی ہنسی اُڑاتے تھے کہ افسوس عید فصح سے دو دن پہلے اُن کو شکست کھانی پڑی، ایک سپاہی کہتا "واہ کیا خوب تماشا تھا! افسوس تو اُس کا ہے کہ بہت سے لوگ عید فصح میں شریک ہونے سے رہ گئے" دوسرا کہتا "اب کی عید فصح کی شان کیا پوچھتے ہو؟ قربانیاں بڑی کثرت سے ہوئی ہیں، کاش! ہر عید پر یہی رونق ہوا کرتی" تیسرا بولا "دیکھو تلوار کی کاٹ بھی کیسی بڑی معالج ہے، کیسا ہوش میں لائی ہے، عشاء ربانی میں یہ لوگ ماہی تشنہ کی طرح شرابیں پی لیتے اور ہم ہوش میں لاتے بھی تو ان کا نشہ نہ اترتا" جو تھے صاحب جو کسی قدر تاریخ میں بھی دخل رکھتے تھے بولے "آپ نے یہ بھی خیال کیا کہ ہماری آج کی لڑائی مرج راہط کی لڑائی سے کس قدر ملتی تھی، وہ بھی جمعہ کو ہوئی تھی جو عید کا دن تھا اور ہماری یہ فتح، شان و بزرگی میں اُس فتح سے جو بنی اُمیہ کو حاصل ہوئی تھی کسی طرح کم نہیں ہے۔ ذرا اُن سوروں کو تو دیکھو جن کی لاشیں ہاتھ پاؤں گئے پہاڑی کے نیچے پڑی ہیں، مجھے تو اس زمین پر افسوس ہے جس پر وہ پڑی ہوئی ہیں، اگر خدا اُسے زبان دیتا تو وہ ضرور شکایت کرتی"۔ اِس کے بعد امیر کے درباری شاعر ابن عبد ربہ نے اجو امیر ہشام بن عبدالرحمٰن الداخل کے موالی میں سے کسی شخص کی اولاد میں تھا) ایک طول طویل نظم میں اسی قسم کے اُجڈ سپاہیوں کے لطیفے سخت زبان اور بُرے مذاق میں لکھے

اگر کوئی خوبی اس نظم میں تھی تو یہ تھی کہ اس وقت کے ہواخواہانِ دولتِ مروانی اور اسپینی مسلمانوں اور عیسائیوں میں جو باہمی عداوت اور نفرت کے خیالات تھے، اُن کا نقشہ خوب کھینچا تھا۔

امیر عبداللہ کی فوج کے لیے ایک وجہ خوشی کی اور پیدا ہو گئی ابن حفصون نے چاہا کہ قلعہ بلائی میں رہ کر اُس کی حفاظت کرے، اور اس کا مطلق اندیشہ نہ کرے کہ شاہی فوج اُس کا محاصرہ کر لے گی، لیکن جو فوج استجہ سے اُس کا ساتھ دے کر لڑنے کو آئی تھی، اُس نے اس بنا پر حصن بلائی میں رہنے سے صاف انکار کیا کہ استجہ کی حفاظت اُن کا پہلا فرض ہے، اِن لوگوں کو خوف تھا کہ شاہی فوج استجہ کا ضرور محاصرہ کر لے گی، ابن حفصون نے استجہ والوں کو حصن بلائی سے جانے پر بہت روکا، بلکہ اُن کو زبردستی قلعے میں رکھنا چاہا مگر انھوں نے ایک نہ سُنی، شمالی فصیل کو ایک جگہ سے توڑ کر قلعے سے نِکل استجہ کو روانہ ہوئے۔

اِن لوگوں کے چلے جانے کے بعد قلعے میں بہت کم لوگ رہ گئے، اور اُنھوں نے کہا کہ ہم قلعے کی حفاظت نہیں کر سکتے، اس لیے ہم بھی اُسے خالی کیے دیتے ہیں۔ ابن حفصون نے ۶۵
بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے آخر کار مجبور ہو کر ابن حفصون بھی قلعہ چھوڑنے پر راضی ہو گیا، غرض قلعے سے سب نکلے، مگر کچھ دُور جانے کے بعد سب میں بھاگڑ پڑ گئی اور ایسی ابتری ہوئی کہ ابن حفصون رات کے وقت اندھیرے میں سوار ہو کر بھاگنے کے لیے گھوڑا تلاش کرنے لگا بڑی مشکل سے ایک عیسائی سوار نے اپنا دُبلا ناکارہ رہوار پیش کیا، ابن حفصون جلدی سے سوار ہوا، اور ایڑیں مار مار کر بہتیرا چاہا کہ گھوڑے کو سرپٹ ڈالے مگر وہ اس قدر کمزور تھا کہ سرپٹ تو کیسا، برسوں سے کبھی دُلکی بھی نہ چل سکا تھا، ابن حفصون کو جلدی تھی، کیونکہ شاہی فوج نے بلائی کے قلعے سے لوگوں کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا، اور اب وہ اُن کا تعاقب کر رہی تھی ابن مستنہ جو ابن حفصون کے برابر گھوڑے پر سوار تھا، باوجود سخت خطرے کے بے پرواہ تھا جیسا کہ اندلسیوں کی طبیعت کا خاصہ ہے، باتوں باتوں میں ابن حفصون سے کہنے لگا تم نے شرط کی تھی کہ پانچ سو اشرفیاں اُس شخص کو دوں گا جو امیر عبداللہ کے میدان جنگ میں آنے کی خبر لائے، معلوم ہے اس بڑے بول کے عوض میں زرِ اصل مع سُود کے نہیں مل گیا، بنی اُمیہ کو مار کر ملک سے نکالنا ہنسی کھیل نہیں ہے تم اُنھیں کیا سمجھتے ہو؟

ابن حفصون یونہی خون کے گھونٹ پی پی کر چپ تھا، اس قسم کی لطیف اور رنگین تقریر سننے کی تاب اُسے کب تھی، جھلّا کر بولا "درست ہے، اس وقت جو کچھ مصیبت آئی ہے وہ تم ہی جیسے بزدل آدمیوں کی وجہ سے آئی ہے، اگر تمہارا شمار آدمیوں میں ہونا ممکن ہو۔"

صبح ہوتے ہی ابن حفصون اور اُس کے ساتھ چار آدمی اور ارجذونہ کے شہر میں پہنچ گئے، یہاں تھوڑی دیر قیام کر کے ابن حفصون نے ارجذونہ والوں سے کہا کہ تم جس قدر جلد ممکن ہو قلعہ ببشتر کو روانہ ہو جاؤ، یہ حکم دے کر وہ خود بھی ببشتر چلا آیا۔

امیر عبداللہ نے اس اثنا میں حصن بلائی پر قبضہ کیا، قلعے سے بہت سا روپیہ سامان رسد اور آلات حرب ملے، دفتر سے فہرستیں منگوا کر دیکھیں تو ان میں امیر کی مسلمان رعایا کے نام بھی درج تھے اُس کے بعد اسیران جنگ طلب کیے گئے، حکم ہوا کہ جو لوگ مسلمان ہیں ان کی جان کو امان دی جاتی ہے مگر عیسائی اگر وہ اسلام قبول کرنا منظور نہ کریں تو قتل کر دیے جائیں، یہ عیسائی تقریباً ایک ہزار تھے، مذہب ترک کرنے سے سب نے انکار کیا، صرف ایک عیسائی نے عین اُس وقت جبکہ جلاد نے گردن مارنے کو تلوار اُٹھائی، جان بچانے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا، باقی سب نے بڑی پامردی کے ساتھ جان دی، شاید یہ گمنام عیسائی قرطبہ کے اُن متعصب عیسائیوں کے مقابلے میں شہید کہلائے جانے کے زیادہ مستحق تھے جنھوں نے چالیس برس ہوئے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گالیاں دے کر پادریوں کے نزدیک شہادت کا معزز درجہ حاصل کیا تھا۔

حصن بلائی میں کچھ فوج مقیم کر کے امیر عبداللہ نے استجہ کا محاصرہ کیا، چوں کہ یہاں کے قلعے میں فوج زیادہ تھی، اور جو لوگ باہر سے بھاگ کر یہاں آئے تھے اُنھوں نے بھی تعداد بہت بڑھا دی تھی، اس لیے شاہی فوج کا انھوں نے خوب مقابلہ کیا لیکن استجہ والوں کی بدقسمتی تھی کہ شہر میں کھانے پینے کا سامان شروع ہی سے کم تھا، چند ہفتوں کے بعد اس کمی کا اثر لوگوں کو محسوس ہونا شروع ہوا، جب تکلیف بڑھی تو اہل شہر نے اطاعت قبول کرنے کے لیے شرطیں پیش کیں، لیکن امیر نے بلاشرائط اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا، پہلے انھوں نے

انکار کیا، لیکن پھر بھوک پیاس کی تکلیف برداشت نہ ہوسکی، فصیلوں پر سے اپنے بھوکے اہل و عیال کو دکھانا شروع کیا اور رحم کی درخواست کی، امیر عبداللہ کو رحم آیا اور فوراً تمام محصورین کو امان دے دی۔ ضمانت میں کچھ لوگوں کو نظر بند کر کے استجہ پر ایک حاکم مقرر کیا، اور خود قلعہ ببشتر کی طرف کوچ کیا اور وہاں پہنچ کر قلعے کے قریب اپنا لشکر ڈال دیا۔

ببشتر کا قلعہ ایسے علاقے میں تھا جہاں کی ہر ایک چھوٹی بڑی پہاڑی، گھاٹی، اور درے سے ابن حفصون واقف تھا، اس قلعہ کو اس سے چھین لینا ممکن نہ تھا، قرطبہ کے سوار اور پیدل اس بات سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ اب اُن میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں آخرکار کہنے لگے کہ لڑائی بہت دنوں سے جاری ہے جو کچھ قوت اب لڑنے کی باقی ہے اُس کو ایسے معرکوں میں خرچ کرنا جن کا کوئی نتیجہ نہ ہو مناسب نہیں، اِس وقت جو دشمن سامنے ہے وہ محصور ہونے کی حالت میں کچھ کھونے کی جگہ اپنا ہی فائدہ نکال لے گا کیونکہ حالتِ حصار میں یہ دشمن جیسا کہ پہلے ہو چکا ہے۔ ہم پر پھر اپنی فوقیت ثابت کر دے گا امیر عبداللہ نے اس رائے سے اتفاق کیا اور ببشتر سے کوچ کر کے فوج کو ارعذونہ کی طرف بڑھنے کا حکم دیا، راستہ میں ایک تنگ درّے میں سے شاہی فوج کو گذرنا پڑا ابن حفصون نے یہاں فوج پر حملہ کیا، لیکن شاہی امیر لشکر عبید اللہ بڑی ہمت اور لیاقت کا آدمی تھا نہایت ہوشیاری سے کل فوج کو اس خطرے سے صحیح سلامت نکال لے گیا، ارعذونہ سے امیر عبداللہ فوج کو مدینۃ البیرہ لے گیا، اور مدینۃ البیرہ سے کچھ لوگوں کو ضمانت میں لیتا ہوا قرطبہ واپس چلا آیا۔

سند :-

ابن حیان ص ۷۷ تا ۸۰

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نومسلم

سولھویں فصل

امیر عبداللہ کے زمانۂ حکومت میں بدنظمی

(بسلسلۂ سابق)

حصن بلائی کی فتح نے امیر عبداللہ کو ایسے وقت میں بچالیا جبکہ سلطنت کے ہاتھ سے ٣٦٧ نکلنے میں کچھ باقی نہ رہا تھا، حصن بلائی، استنجہ، اور ارجذونہ جو قوم پرست فریق یعنی اسپینی مسلمانوں اور اسپینی عیسائیوں کے سرحدی مقام تھے امیر عبداللہ کی وہاں دوبارہ حکومت ہوگئی اس فریق کا مرکزِ حکومت مالقا وررَیہ کے علاقے میں ببشتر کا قلعہ تھا، صوبہ جیان سے ابن حفصون اپنی فوج پہلے ہی ہٹا چکا تھا، غرض جیان اور اسی طرح البیرہ بھی امیر کا مطیع ہوگیا، یہ فتوحات حقیقت میں بڑی کامیابیاں تھیں اور عوام پر اُن کا اثر اس وجہ سے اور زیادہ ہوا کہ کامیابی کی توقع کسی کو نہ تھی، ابن حفصون کے اقبال میں بہت کچھ فرق آگیا اس بات کو وہ خود بھی جانتا تھا، اُس نے افریقہ میں ابن اغلب کے پاس پہلے جس قدر ایلچی بھیجے تھے اُن کی عزت اور توقیر ہوئی تھی، مگر اب یہ بات بھی نہیں رہی، ابنِ اغلب نے

کہلا بھجوایا کہ افریقہ میں اس وقت خود مشکلات درپیش ہیں لہٰذا اسپین کے معاملات میں ہم دخل دینا نہیں چاہتے، اور حقیقت میں ابن اغلب کی طبیعت ایک ایسے جھوٹے دعویدارِ سلطنت کی مدد کرنے پر جو لڑائیوں میں پڑ چکا ہو قدرتی طور پر راغب نہ ہوسکتی تھی

غرض عباسی خلیفہ بغداد کی طرف سے اسپین کی سندِ حکومت ملنے کی اب ابن حفصون کو امید نہ رہی، ادھر امیر عبداللہ کی عظمت و بزرگی رعایا کے دل میں پھر ویسی ہی ہوگئی جیسی کہ پہلے تھی، عافیت پسند رعایا آئے دن کی بدنظمی سے تنگ آگئی تھی اور اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ حفاظت اور امن اگر میسر ہوسکتا ہے تو امیر کے ساتھ وفاداری میں ہوسکتا ہے، غرض امیر کی اطاعت قبول کرنے میں اب اُن کو کچھ پس وپیش نہ رہا اور ہمیشہ مطیع رہنے کا انھوں نے ارادہ کرلیا۔

اس میں کلام نہیں کہ اُن فتوح سے امیر عبداللہ کو بہت نفع ہوا تھا، اس نفع کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، لیکن اُن میں مبالغہ کو دخل دینا بھی آسان ہے ابنِ حفصون کی قوت کو بلاشبہ سخت نقصان پہنچا تھا، لیکن جس قدر زور وہ رکھتا تھا ابھی وہ پورا صرف نہ ہوا تھا، اور نہ اس گئی ہوئی قوت کو دوبارہ حاصل کرنے کی طرف سے اُسے مایوسی تھی، مگر اتنی ضرورت بیشک تھی کہ کچھ دنوں تک لڑائی بند رہے۔ تاکہ پھر بغاوت کرنے کے لیے جان آجائے، اسی خیال سے اُس نے امیر عبداللہ سے مصالحت کی درخواست کی، امیر نے درخواست اس شرط سے منظور کی کہ ابن حفصون اپنے لڑکوں میں سے ایک لڑکے کو بطور ضمانت کے دربار میں حاضر کردے، ابن حفصون نے یہ شرط مان لی، لیکن چونکہ موقع پاتے ہی پھر بغاوت کی نیت تھی اس لیے دھوکا دیا، اور بجائے اپنے لڑکے کے اپنے خزانچی کے بیٹے کو جسے متبنّیٰ کرلیا تھا، دربار میں بھیجدیا، ابن حفصون کا یہ جل پہلے تو نہ کھلا، لیکن بعد کو شبہ پیدا ہوا، امیر نے اس بے ایمانی اور فریب پر ابن حفصون کو سخت درشت لکھا اور ضمانت میں اُس کے صلبی لڑکے کو طلب کیا، ابن حفصون نے انکار کیا لڑائی پھر شروع ہوگئی، لیکن حیرت انگیز تیزی سے ابن حفصون نے اُن علاقوں کو پھر حاصل کر لیا جو اس کے ہاتھ سے نکل چکے تھے، ارجذونہ کے رہنے والوں پر اُسے بھروسا تھا، اُن (۳۶۸) کے پاس آدمی بھیجے کہ بغاوت پر انھیں ترغیب دیں، شہر والے بغاوت پر راضی ہوگئے

اور امیر عبداللہ نے جن دو آدمیوں کے سپرد شہر کی حکومت کی تھی اُن کو رات کے وقت گرفتار کرا دیا اور جب ابن حفصون فوج لیے ہوئے شہر میں داخل ہوا تو دونوں کو اس کے حوالے کر دیا (۲۷۹ھ/۸۹۲ء) زیادہ مدت نہ گذری تھی کہ البیرہ کے لوگوں کا ایک وفد ابن حفصون کے پاس آیا اور بیان کیا کہ انھوں نے بھی امیر کی اطاعت سے انحراف کیا ہے اور ابن حفصون کی مدد پر بھروسا رکھتے ہیں، ابن حفصون نے اُن کے حسب مراد اپنی فوج کا ایک حصہ مدینۃ البیرہ بھیجدیا، لیکن اس شہر میں امیر عبداللہ کے ہوا خواہ زیادہ تھے، انھوں نے ابن حفصون کی حکومت کو قبول نہیں کیا، اور حاکم البیرہ سے کمک حاصل کر کے ہتھیار سنبھال ابن حفصون کی فوج کو مدینۃ البیرہ سے نکال باہر کیا اپنی ایک مجلس شوریٰ قائم کی اور امیر عبداللہ نے جس آدمی کو شہر کا حاکم مقرر کر کے بھیجا تھا اُس کی حکومت کو تسلیم کیا، اس واقعہ پر آزادی کے حامی اسپینی چپ رہے، اُن کی یہ خاموشی بے سبب نہ تھی، وجہ یہ تھی کہ شاہی لشکر اس وقت ابن مستنہ کے قلعہ قرقبولیہ کا محاصرہ ڈالے ہوئے تھا، اور یہ قلعہ مدینۃ البیرہ سے زیادہ فاصلہ پر نہ تھا، لیکن جونہی شاہی لشکر قرقبولیہ سے ہٹ کر قرطبہ کو واپس ہونے لگا تو مدینۃ البیرہ کے اسپینیوں نے پھر سر اُٹھایا اور ابن حفصون سے خفیہ خط و کتابت کر کے رات کے وقت اُس کی فوج کے کچھ لوگوں کو شہر میں لے آئے، کچھ دن گذرنے کے بعد جب پہاڑوں پر روشنیوں کے ذریعہ سے اجو ابن حفصون کے مددگار خبر رسانی کے لیے روشن کیا کرتے تھے معلوم ہوا کہ مدینۃ البیرہ میں اپنی فوج پہنچانے کے لیے جو چال چلی تھی وہ چل گئی ہے تو ابن حفصون بذاتِ خود بہت سی فوج لے کر شہر میں رات کے وقت داخل ہوا، امیر کی وفادار رعایا باغیوں کے نعرے سن کر سوتے سے جاگ پڑی، اور ایسی بدحواس ہوئی کہ ان دشمنوں کا مقابلہ نہ کر سکی، اِس رعایا کو ابن حفصون نے یہ سزا دی کہ ان کا کُل مال و اسباب ضبط کر لیا، اور مدینۃ البیرہ کے حاکم کو جو امیر کی طرف سے تھا قتل کر دیا۔

مدینۃ البیرہ پر جب قبضہ ہو گیا تو ابن حفصون نے صاحبِ غرناطہ ابن جودی اور وہاں کے عربوں سے لڑنے کا قصد کیا، ابن جودی سمجھ گیا کہ لڑائی ہونی ضرور ہے، اور ہوگی بھی تو ایسی کہ یا تو عرب نہ رہے یا اسپینی ختم ہو گئے، اس لیے اُس نے اپنے تمام ساتھیوں کو اِس

لڑائی میں شرکت کے لیے طلب کیا، لڑائی ہوئی مگر ابن جودی شکست کھا گیا، ابن جودی نے یہ بے احتیاطی کی تھی کہ لڑائی ایسے موقع پر لڑا جو اس کے صدر مقام یعنی غرناطہ سے دور تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ شکست کھانے کے بعد اس کی فوج کو پناہ لینے کے لیے غرناطہ تک پہنچنے میں بقیہ کا پورا علاقہ طے کرنا پڑا، اس کوچ میں ابن حفصون کی فوج والوں نے اس کے بہت سے آدمی قتل کر دیے، ابن حفصون کی اس فتح کو البیرہ کے اسپینیوں نے اپنی پہلی شکستوں کا نعم البدل خیال کیا (مدینۃ البیرہ اور غرناطہ پاس پاس واقع تھے) اور سمجھے کہ عربوں کو یہ ہزیمت ایسی ہوئی ہے کہ وہ پھر کبھی نہ ابھریں گے۔

اس کامیابی پر ابن حفصون ایسا خوش ہوا کہ جیان پر قبضہ کرنے کے لیے بڑھا، یہاں بھی قسمت نے ساتھ دیا اور شہر جیان پر قبضہ ہو گیا، یہاں اپنی طرف سے ایک حاکم مقرر کر کے قلعے میں کچھ فوج مقیم کی اور ببشتر کو روانہ ہو گیا۔

غرض ۲۷۹ھ/۸۹۲ء میں حصن بلائی اور استجہ کے سوا اور جس قدر مقامات ابن حفصون کے قبضے سے پچھلے سال نکل گئے تھے ان پر دوبارہ مستولی ہو گیا، اور آیندہ پانچ برس تک سوائے البیرہ کے ہاتھ سے نکل جانے کے اور کسی قسم کی کمی اس کی قوت میں نہیں ہوئی، مدینۃ البیرہ کی (۳۶۹)
ایسی رعایا کو جو امیر کی وفادار تھی ابن حفصون نے رات کے وقت حالت بے خبری میں مغلوب کیا تھا، اس وقت وہ مجبور تھی مگر کبھی دل سے وہ ابن حفصون کی مطیع و مفتوح نہیں ہوئی تھی اس رعایا نے موقع پاتے ہی اس کا مقابلہ کیا، ۲۸۰ھ/۸۹۳ء میں امیر کا لشکر ببشتر کے قرب و جوار پر حملہ کرنے کے بعد مدینۃ البیرہ کے دروازے کے سامنے آیا، شاہی فوج کا سپہ سالار اس وقت امیر عبداللہ کا فرزند مطرف تھا، شہر والوں نے سر اطاعت خم کیا، مطرف نے اسپینیوں کو اس شرط سے امان دینے کا وعدہ کیا کہ وہ ابن حفصون کے فوج والوں اور حاکم کو جو اس نے مقرر کیا تھا اس کے حوالے کر دیں، رعایا جو امیر عبداللہ کی خیر خواہ تھی اس نے باغیوں کو سمجھایا کہ یہ شرط منظور کر لینی چاہیے، آخر کار یہ شرط منظور کی گئی، اور ابن حفصون کی فوج والے اور اس کا مقرر کردہ حاکم اب مطرف کے حوالے کر دیے گئے اور البیرہ اسی طرح پھر امیر کا مطیع ہو گیا، اب حب وطن اور شوق آزادی اسپینیوں میں ٹھنڈا پڑنے لگا، البیرہ کے لوگوں

کی لڑائی جن سے اب تک رہی تھی وہ امیر عبداللہ نہ تھا بلکہ غرناطہ کے عرب تھے، اور محض عربوں سے لڑنے کے لیے اُنھوں نے ابن حفصون سے مدد مانگی تھی، جب سے عرب غرناطہ والی لڑائی میں ہارے تھے اُن کا زور ٹوٹ گیا تھا کچھ تو شکست سے مرفہ ہوئے اور کچھ آپس کی ناانفاقی اور فساد نے اُن کی قوّت کو مضمحل کر دیا، ان کے دو فریق ہو گئے ایک فریق سعید ابن جودی کو اور دوسرا فریق محمد بن اضحیٰ ہمدانی صاحب الحمۃ کو اپنا سردار مانتا تھا، صاحب الحمۃ سے سعید ابن جودی کو ایسی سخت عداوت تھی کہ اس کا سر کاٹنے کے لیے انعام مقرر کر رکھا تھا، سعید کی بے احتیاطیوں اور بُرے چال چلن نے معاملات کی صورت اور بھی بگاڑ دی، احمقانہ نخوت اور اوباشی کی حرکتوں سے اُس نے اکثر روساء عرب کو اپنا دشمن بنا لیا تھا، آخرکار انہی سرداروں میں سے ابو عمر عثمان کی بیوی سے ناجائز تعلق پیدا کر کے اُس کا گھر بگاڑ دیا، ابو عمر نے اس کا بدلہ سعید بن جودی کے خون سے لیا اور ایک روز یہ سن کر کہ اس کی بیوی سعید سے ایک یہودی کے مکان میں ملاقات کرنے والی ہے ابو عمر فوراً ایک دوست کو ساتھ لیے اُس گھر میں چھپ کر ہو بیٹھا اور جونہی سعید بن جودی مکان میں داخل ہوا اُسے قتل کر دیا (ذیقعدہ ۲۸۴ھ ۸۹۷ء)

ابنِ جودی کے قتل سے دونوں فریقوں میں نزاع انتہا کو پہنچ گیا قاتل اور اُس کے دوستوں کو اتنا وقت ملا کہ بھاگ کر نولیشو کے قلعے میں جو غرناطہ سے شمال میں تھا پہنچ جائیں یہاں پہنچ کر انھوں نے ابن اضحیٰ کو اپنا سردار منتخب کیا، امیر عبداللہ سے وہ کسی طرح کا بگاڑ نہیں چاہتے تھے، چنانچہ اس انتخاب کی منظوری اُنھوں نے امیر سے چاہی اور یہ بھی عرض کیا کہ انھوں نے ابن جودی کو سلطنت کی بھلائی کے لیے قتل کیا ہے، کیونکہ اس کا ارادہ بغاوت کا تھا، اور اُس نے اِسی مضمون کے اشعار حسبِ ذیل لکھے تھے۔

"قاصد جا، اور امیر عبداللہ سے کہدے کہ سوائے بھاگنے کے اب تیرے لیے
جان بچانے کی کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ ایک بڑے مردِ میدان نے وادیٔ
قصب (زرسلوں والے دریا) کے کنارے اس کے خلاف عَلَمِ بغاوت بلند کیا ہے
اے مروان کے بیٹے اپنی حکومت ہمارے ہاتھ پر ہار جا، تیری سلطنت کے مستحق

در اصل ہم لوگ یعنی ابنائے بادیہ ہیں، قاصد! جلد جا، اور میرا گھوڑا الاجبن پر زری کا زین کسا ہے کیونکہ میرا ستارہ اس وقت عروج پر ہے"

ممکن ہے یہ اشعار سعید بن جودی کی تصنیف سے نہ ہوں مگر اس کی حالت کے مناسب ضرور تھے، بہرکیف یہ جو کچھ ہو عربوں نے جس ادب اور تمیز سے امیر کی خدمت میں سعید کے قتل کر دینے کی وجہ بیان کی، امیر اُس سے خوش ہوا، اور ابن اضحیٰ کو اپنا حاکم مقرر کر لینے کی اجازت اُن کو دے دی، لیکن سعید کے پرانے ہوا خواہوں نے ابن اضحیٰ کی سرداری قبول نہ کی، اُن کو اپنے سردار (۱۸۷) سعید کے قتل پر بہت غصہ تھا اور وہ سعید کی بُری حرکتوں اور خود اپنی شکایتوں کو جو سعید سے اُس کی زندگی میں رکھتے تھے بھول گئے تھے، محض اس کی بھلائیاں اُن کو یاد رہ گئی تھیں، مقدم بن موفی نے جس کو سعید نے بلا قصور تازیانے کی سزا دی تھی سعید کے مرثیے میں یہ اشعار لکھے :-

"اب محتاجوں کو روٹی اور کپڑا کون دے گا؟ اب وہ جسے سخاوت مجسم کہنا زیبا تھا قبر میں پڑا ہے، افسوس! میدانوں کو اب بغیر سبزے کے اور درختوں کو بغیر برگ و بار کے رہنا چاہیے، آفتاب کو اب طلوع نہ ہونا چاہیے، کیونکہ ابن جودی مر چکا ہے جن و انس میں اب اُس جیسا کوئی نظر نہ آئے گا"

مقدم شاعر کی زبان سے یہ اشعار سُن کر ایک عرب نے کہا "کیا تو اس کی تعریف کرتا ہے جس نے تجھے مارا تھا؟" مقدم نے کہا "قسم اللہ کی کہ اُس کے ناانصافی کے فیصلے نے بھی مجھے نفع پہنچایا، کیونکہ اُس سزا کو یاد کر کے میں نے بہت سے گناہوں سے جن کا مرتکب پہلے ہوا کرتا تھا توبہ کر لی، کیا اُس کا یہ ایسا احسان نہیں ہے جس کی شکر گذاری ضروری ہے، علاوہ اس کے جب سے مجھے تازیانے کی سزا ملی میں ہمیشہ اُس کے ساتھ بے انصافی کرتا چلا آیا، کیا تو خیال کر سکتا ہے کہ میری بے انصافی اُس کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی؟

سعید کے اور دوست بھی انتقام کے پیاسے ہو رہے تھے، اسدی نے ایک بڑی نظم میں لکھا کہ "ساقی جو شراب مجھے دے رہا ہے اُس میں اُس وقت تک کچھ مزہ نہیں ہے

جب تک دل کا یہ ارمان پورا نہ ہو لے کہ لوگ گھوڑوں پر سوار اُس شخص کے خون کا بدلہ لینے کو دھاوا کرتے ہوں جو اُن کے لیے عزت اور فخر کا باعث تھا۔

سعید کے خون کا بدلہ لے لیا گیا اور عربوں میں یہ ایک خونی نزاع قائم ہو کر برابر جاری رہا، امیر عبداللہ، اور اسپینی مسلمان اور اسپینی عیسائی خاموش بیٹھے دیکھا کیے کہ عرب ایک دوسرے کا گلا کیونکر کاٹتے ہیں۔

البیرہ کا مطیع ہو جانا امیر عبداللہ کے لیے بہت سودمند ہوا، مگر صرف یہی ایک کامیابی نہ تھی جو امیر کو ہوئی ہو، ابن حفصون کی نسبت تو امیر کا یہ خیال تھا کہ اُس سے لڑنے میں کچھ حاصل نہ ہوگا، اس لیے اب ایسے باغیوں سے لڑنا شروع کیا جو ابنِ حفصون کی طرح سخت نہ تھے امیر عبداللہ کی سیاسی تدبیر یہ نہ تھی کہ باغیوں کو بالکل ہی غارت کر دے، اُن کے شہروں اور قلعوں پر قطعی قبضہ کر لے کی کوشش بھی وہ نہ کرتا تھا، صرف اس بات کو کافی سمجھتا تھا کہ وہ اخراج دینا منظور کر لیں، اسی تحصیلِ خراج کے لیے وہ ہر سال اپنے لشکر دورہ پر بھیجتا تھا لیکن یہ لشکر کھیتوں کو تباہ اور دیہات کو جلا دیتے تھے، قلعوں کا محاصرہ کر لیتے تھے، لیکن جہاں کوئی باغی سردار خراج دینے پر راضی ہوا اور ضمانت میں اپنے آدمی دینے منظور کیے پھر فوراً اس کو امان مل جاتی تھی۔

اس قسم کی فوج کشی سے قطعی اور عمدہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے تھے، لیکن ایک طرح پر اس سے بے انتہا فائدہ بھی تھا، خزانہ میں روپیہ نہ رہا تھا، حکومت کو علم تھا کہ بڑی لڑائیاں (۳۷۱)
لڑنے کے لیے کثیر سامان کی ضرورت ہوتی ہے پس لشکروں کے اس دورے سے جو خراج وصول کرنے کے لیے ہوتا تھا روپیہ جس کی ضرورت تھی خوب حاصل ہو جاتا تھا، خاص کر سنہ ۲۸۲ھ/۸۹۵ء کی مہم میں جو اشبیلیہ پر کی گئی بہت روپیہ ملا، اس شہر کے سیاسی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اس کا حاکم وہی تھا جو امیر کی طرف سے مقرر ہوا تھا، امیر عبداللہ کے چچا ہشام کی سکونت بھی وہیں تھی، حکومت کی باگ خلدون اور حجاج کے ہاتھوں میں تھی اور یہ دونوں اپنی حالت سے مطمئن تھے، کیونکہ آزادی و خود مختاری کے لطف حاصل تھے اور اُن کے خطروں سے محفوظ تھے، جو چاہتے سو کرتے، خراج کبھی ادا نہ کرتے، مگر پھر بھی

امیر سے باغی نہ تھے، اسی حالت کو قائم رکھنے میں اُن کا فائدہ تھا، ۲۸۲ھ/۸۹۵ء میں جس وقت امیر عبداللہ کا ایلچی اُن سے فوجی امداد طلب کرنے آیا تو ابراہیم بن حجاج اور کریب کا بھائی خالد بن خلدون خود اپنی اپنی فوجیں لے کر کمک پر روانہ ہوئے اُن کے ہمراہ سلیمان حاکمِ شذونہ اور اُس کا بھائی مسلمہ بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر مدد کو گئے

عام طور پر خیال کیا جاتا تھا کہ جو شاہی مہم اس وقت قرطبہ سے جانے والی ہے وہ ارض تدمیر کے اسپینی مسلمانوں سے لڑنے کو جا رہی ہے، لیکن جب معلوم ہوا کہ شاہی لشکر قرطبہ سے مشرق کی سمت میں نہیں بلکہ مغرب کی طرف اشبیلیہ کو فتح کرنے کی غرض سے کوچ کرنے والا ہے تو کریب بن خلدون جو اس وقت اشبیلیہ میں موجود تھا سخت پریشان و سراسیمہ ہوا، سلیمان حاکم شذونہ کسی طرح بیچ ہی میں سے مل گیا تھا، لیکن باقی روساء اشبیلیہ یعنی ابراہیم بن حجاج، کریب کا بھائی خالد بن خلدون اور مسلمہ گرفتار ہو گئے۔

کریب نے فوراً فیصلہ کر کے جلد اُس پر عمل کرنا ضروری سمجھا، فوراً قصرِ اشبیلیہ کے دروازوں پر پہرا بٹھا کر اس کمرے میں پہنچا جہاں ہشام بیٹھا تھا، آنکھیں غصہ سے سُرخ ہو رہی تھیں، اسی حال میں ہشام سے کہنے لگا "خبر بہت اچھی ہے، مطرف نے میرے بھائی خالد کو، اور میرے اور عزیزوں کو جو فوج میں تھے گرفتار کر لیا ہے، واللہ! اگر ان میں سے کسی ایک کی بھی جان گئی تو تمہارا سر فوراً قلم کر دونگا، مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ مطرف کیا کرتا ہے، لیکن اس سے پہلے کہ کچھ معلوم ہو، تم اور تمہارے سارے نوکر میری قید میں ہیں، تمہارا کوئی ملازم کسی بہانے سے بھی، چاہے اس میں کھانے پینے کی چیزیں خریدنی ہی کیوں نہ ہوں، اس قصر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا، اگر قصر میں سامانِ خورد و نوش کم ہے تو مجھے اس کی مطلق پروا نہیں، جب تلوار تمہارے سر پر ہر وقت تُلی رہے گی تو کیا تم اس میں خوش ہو گے؟ کیا بھوک سے مر جانے کا خیال دل کو اطمینان بخشے گا؟ اگر تمہیں اپنی جان بچانی ہے تو اس کی تدبیر صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ شہزادہ مطرف کو اس مضمون کا خط لکھو کہ "میرا ٹکریب کے عزیزوں کی جان کا ذمہ دار ہے" یہ بھی لکھو کہ جن لوگوں کو شہزادے نے قید کیا ہے اُن کو فوراً رہائی دی جائے"!

ہشام نے یہ سمجھ کر کہ کریب فقط دھمکیاں دے کر چپ بیٹھنے والا آدمی نہیں ہے مطرف ۲۷۳
کو خط لکھا، لیکن اس خط کا نتیجہ وہی نکلا جو قیاس کیا جاتا تھا، مطرف نے قیدیوں کو رہا نہیں کیا، اور اشبیلیہ کی طرف کوچ جاری رکھا، اشبیلیہ کے قریب پہنچ کر کریب کو حکم بھیجا کہ شہر کے دروازے کھول دیے جائیں، کریب نے اپنے اسیر عزیزوں کی جان کا خیال کر کے کہ اگر حکم عدولی کرتا ہوں تو ان کی جان جائے گی اور یہ سوچ کر کہ لبلہ اور شذونہ سے امدادی فوجیں جب تک نہ آجائیں گی شاہی فوج کا مقابلہ ممکن نہ ہوگا احتیاط سے کام لیا، شاہی فوج کے لوگوں کو تھوڑی تھوڑی تعداد میں بازار میں سودا خریدنے کے لیے آنے دیا، کریب نے خراج دینے کا وعدہ بھی مطرف سے کر لیا اور امیر عبداللہ کے چچا ہشام پر سے قید بھی اٹھا دی ہشام کی سب سے بڑی آرزو اس وقت یہی تھی کہ کسی طرح اشبیلیہ کی چار دیواری سے نکل کر صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ جائے۔

اس کے بعد مطرف نے طالب بن مولود پر فوج کشی کی، طالب اشبیلیہ کے مولدوں کا بڑا طرف دار تھا، وادی ایرہ (وادی آرہ) کے کنارے قلعہ منت فیق، اور شریش کے قریب قلعہ منت اگودو کا مالک تھا، شروع میں مطرف کا خوب مقابلہ کرتا رہا، لیکن پھر عاجز ہوا اور خراج دینے کا وعدہ کیا، اور اپنے کچھ آدمی ضمانت میں مطرف کے ساتھ کر دیے، مدینہ ابن سلیم اور شہر بکہ کے حاکموں نے بھی سر اطاعت جھکا دیا۔

یہاں سے مطرف حصن نبرشیہ پہنچا اور اس قلعہ کو بزور کر کے فتح کر لیا اور اس میں کسی قدر شاہی فوج مقیم کر دی، لیکن صاحب نبرشیہ سلیمان نے جو اس وقت ارکش میں تھا شاہی لشکر پر مربانہ (حصن امرنیہ) پہنچنے سے پہلے حملہ کیا اور اسے بہت نقصان پہنچایا: اس نقصان پر مطرف کو اتنا غصہ آیا کہ سلیمان کے تین رشتہ داروں کو جو اس کی قید میں تھے قتل کر دیا۔

اگست کا مہینہ ختم ہونے کو تھا کہ شاہی لشکر اشبیلیہ کے سامنے دوبارہ نمودار ہوا مطرف کو یقین تھا کہ کریب اس مرتبہ بھی ایسا ہی سیدھا ثابت ہوگا جیسا کہ پہلے ہوا تھا، لیکن یہ بات نہ بائی، کریب نے اس عرصہ میں بہت کچھ اہتمام کر لیا تھا، اور اشبیلیہ کے شہر کو اس

قابل کر دیا تھا کہ وقت پر دشمن سے اپنی حفاظت کر سکے، اُس کے سب ہوا خواہ اور اتحادی بھی اُس کا ساتھ دینے کو اشبیلیہ پہنچ گئے تھے، غرض کریب نے اب مطرف کے مقابلہ کا مصمم قصد کر لیا، مطرف جب اشبیلیہ پہنچا تو دیکھا کہ شہر کے دروازے بند ہیں، اس پر اُس نے کریب کے بھائی خالد بن خلدون اور ابراہیم بن حجاج کے پاؤں میں بیڑیاں ڈلوا دیں، مگر کریب پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوا، شاہی فوج سے لڑتے شہر سے نکلا اور اُس کے مقدمۃ الجیش پر حملہ کر دیا، تھوڑی دیر تک اس حملہ کا کوئی نتیجہ معلوم نہ ہوا، اتنے میں مطرف کے سردار ان لشکر نے مل کر کریب پر حملہ کیا اور اشبیلیہ کی فوجوں کو پیچھے ہٹا دیا، اب مطرف نے خالد بن خلدون اور ابراہیم بن حجاج کو جو اُس کی قید میں تھے جسمانی تکلیفیں پہنچائیں، اور تین دن تک اشبیلیہ پر حملہ جاری رکھا۔

مطرف کے حملے شہر پر بے سُود ثابت ہوئے، اور اب خالد اور ابراہیم سے اور زیادہ بدلہ لینے کی غرض سے مطرف نے وادی الکبیر کے کنارے ایک قلعہ پر جو خاص ابراہیم کا تھا قبضہ کر لیا اور دریا میں جس قدر جہاز ابراہیم کے تھے اُن کو جلا دیا، اور قلعہ کی دیواروں کو مسمار کرنے کا حکم دے دیا، ابراہیم کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں، اور اسی حالت میں مطرف کے حکم سے اپنے ہی قلعہ کی دیواروں کو ڈھانے میں کدال چلا رہا تھا۔

مطرف نے ایک اور قلعہ کو جو کریب کا تھا اسی طرح مسمار کیا، اس کے بعد مطرف قرطبہ واپس چلا آیا۔

حبب لشکر شاہی قرطبہ میں پہنچ لیا، اور اشبیلیہ والوں نے خراج ادا کر دیا، تو ایک ۲ھ
وزیر نے امیر عبداللہ کو صلاح دی کہ اشبیلیہ کے قیدیوں کو اس بات کا حلف لے کر کہ وہ تخت کے مطیع رہیں گے رہا کر دیا جائے، مگر امیر عبداللہ کی حالت یہ تھی کہ ابن حفصون سے تو مصالحت چاہا کرتا تھا، مگر روسائے عرب کو اپنا بنانے کی کبھی پروا نہ کرتا تھا، وزیر نے یہ بھی عرض کیا کہ عرب کے ان شریفوں کو قید میں رکھنے سے آپ گویا ابن حفصون کو مدد پہنچا رہے ہیں کیونکہ ابن حفصون اب ان عربوں کے قلعوں پر قبضہ کرے گا، اس لیے یہی بہتر ہے کہ ان عربی رئیسوں پر احسان کر کے اُن کو اپنا خیر خواہ بنائیے، ایسی صورت میں وہ اپنی مسلمانوں کے سردار

ابن حفصون کے مقابلہ میں امیر کی مدد کریں گے۔

امیر عبداللہ نے وزیر کی یہ صلاح مان لی، قیدیوں کو اس شرط سے رہا کیا کہ وہ اپنے کچھ لوگوں کو ضمانت میں دیں اور جامع قرطبہ میں جاکر پچاس پچاس مرتبہ مطیع رہنے کی قسم کھائیں چنانچہ قیدیوں نے شرط کے مطابق مسجد میں جاکر قسمیں کھائیں اور اپنے آدمی بطور ضمانت کے پیش کردیے، اُن میں ابراہیم بن حجاج کا بیٹا لڑکا عبدالرحمٰن بھی تھا، لیکن جب یہ قیدی رہا ہوکر اشبیلیہ پہنچے تو تھوڑے ہی دنوں بعد اُنھوں نے اپنی قسم توڑدی، خراج ادا کرنا بند کردیا، اور علانیہ باغی ہوگئے، ابراہیم بن حجاج اور کریب بن خلدون نے اشبیلیہ کے علاقے کو برابر حصّوں میں باہم تقسیم کرلیا۔

یہ حالت ۲۷۶ھ تک قائم رہی، لیکن یہ باہمی تقسیم ہی ابراہیم اور کریب کے مابین باعث نزاع ہوگئی اور دونوں آپس میں لڑنے لگے، امیر عبداللہ نے اُن میں لڑائی اور تیز کردی، کریب کو اطلاع دی گئی کہ ابراہیم نے بہت حقارت سے اس کا ذکر کیا ہے، اور ابراہیم کے کانوں میں یہ ڈالا گیا کہ کریب اس کی نسبت بہت بُری رائے رکھتا ہے ایک دن امیر عبداللہ کے پاس خالد بن خلدون کا خط آیا جس میں ابراہیم بن حجاج سے سخت عداوت اور رنجش ظاہر کی گئی تھی، امیر عبداللہ نے اُسی خط پر اپنا جواب لکھ کر دوسرے مراسلات کے ساتھ ایک ملازم کے سپرد کیا، اتفاق سے وہ خط اُس نوکر کے ہاتھ سے کہیں گر گیا، ایک خواجہ سرا نے اُسے پڑا پایا، اُٹھاکر پڑھا اور انعام کی اُمید میں ابراہیم کے ایک ایلچی کو یہ کہہ کر دیا کہ یہ خط ضرور اپنے آقا کے پاس پہنچادے۔

خط کو دیکھتے ہی ابراہیم کو یقین ہوگیا کہ بنی خلدون اُس کی حکومت کو اُٹھانے کے لیے بلکہ اُس کی آزادی اور جان لینے کے لیے سازش کررہے ہیں، اِس یقین کے بعد ابراہیم نے علانیہ نہیں بلکہ کسی حیلے سے بنی خلدون سے بدلہ لینا چاہا، بہت کچھ اظہارِ دوستی کے ساتھ بنی خلدون کو اپنے گھر کھانا کھلانے بلایا، بنی خلدون (کریب اور خالد) دعوت قبول کرکے ابراہیم کے گھر گئے، دسترخوان پر جب بیٹھ لیے تو ابراہیم نے خالد کو وہ خط دکھایا، اور کریب اور خالد دونوں کو نہایت سخت سُست کہا، خالد غصے میں کھڑا ہوگیا اور آستین سے خنجر

نکال ابراہیم کے سر پر ایک ہاتھ مارا، ابراہیم کا عمامہ کٹ گیا اور چہرہ زخمی ہوا، لیکن ابراہیم کے نوکروں نے یہ دیکھتے ہی دوڑ کر کریب اور خالد دونوں کو قتل کر دیا، ابراہیم نے ان دونوں کے سر صحن میں پھینک دیے اور بنی خلدون کے ساتھ جو سپاہی محافظ کے طور پر آئے تھے اور دروازے پر موجود تھے، اُن پر حملہ کیا، اُن میں سے بعض مارے گئے، باقی بھاگ گئے

۲۸۶ھ کریب اور خالد بن خلدون دونوں بھائیوں کے مرنے پر ابراہیم بن حجاج صوبہ اشبیلیہ کا مالک ہو گیا؛ اور اب اس خیال سے کہ بیٹا امیر عبداللہ کے پاس نظر بند ہے اور اس قتل کو امیر کی نظر میں ایک جائز فعل قرار دینا مناسب ہوگا امیر کی خدمت میں ایک خط لکھا اور اُس میں یقین دلایا کہ وہ کریب اور خالد کو قتل کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا، بنی خلدون وہ لوگ تھے جو ہمیشہ اُس کو امیر سے بغاوت کرنے پر اشتعال دیا کرتے تھے، اگرچہ اُنکے منصوبوں کو کبھی سچے دل سے اس نے پسند نہیں کیا اب اگر امیر اُسے اشبیلیہ کی سندِ حکومت عطا فرمائے تو انتظام حکومت کے جملہ مصارف اپنی جیب سے ادا کرنے کے بعد وہ سات ہزار دینار سُرخ بطور خراج کے امیر کی خدمت میں سالانہ بھیجتا رہے گا۔

امیر عبداللہ نے ابراہیم بن حجاج کی یہ درخواست منظور کر لی، لیکن اپنی طرف سے ایک آدمی جس کا نام قاسم تھا اشبیلیہ اس غرض سے روانہ کیا کہ ابراہیم کے ساتھ ہو کر اشبیلیہ پر حکومت کرے، ابراہیم حکومت میں دوسرے کی شرکت کب چاہتا تھا، چنانچہ چند ماہ کے بعد قاسم کو کچھ اس طرح سمجھایا کہ وہ برضا و رغبت اپنے عہدے سے علیحدہ ہو گیا۔

قاسم سے پیچھا چھڑا کر اب ابراہیم اس کوشش میں ہوا کہ اپنے لڑکے عبدالرحمن کو کسی طرح امیر عبداللہ کے قبضے سے نکال کر اپنے پاس بلا لے، امیر کی خدمت میں بار بار عرضداشتیں گذرانتا رہا، مگر امیر نے عبدالرحمن کو واپس کرنے سے قطعی انکار کر دیا، اس پر امیر کو متنبہ کرنے کے لیے ابراہیم نے خراج روکنے کی دھمکی دی، اور ابن حفصون سے بھی سازش کر لی

سنہ ۲۸۹ھ

ابراہیم کے دوست ہو جانے سے اسپینیوں کا سردار ابن حفصون، جو اس واقعہ سے تین برس پہلے (یعنی ۸۹۹ء ۲۸۶ھ میں) استجہ پر قبضہ کر چکا تھا دل میں بہت خوش ہوا اور

اس دوستی کے پیغام سے ایک سال قبل (یعنی ۲۸٦ھ ۸۹۹ء میں) بہت کچھ تذبذب اور تامل کے بعد آخرکار قطعی فیصلہ کر کے اس نے مع اہل وعیال اسلام چھوڑ کر اپنا آبائی مذہب اختیار کر لیا تھا چنانچہ اب وہ اور اس کے اہل وعیال سب عیسائی ہو چکے تھے دل میں تو وہ برسوں سے عیسائی تھا لیکن اس خوف سے کہ اسپینی مسلمان جو اس کے دوست ہیں اس کے مرتد ہونے پر بگڑ جائیں گے۔ اس نے مدت تک اپنا عیسائی ہونا ظاہر نہیں کیا، اس کا باپ حفصون کئی سال پہلے ہی اسلام ترک کر کے عیسائی ہو چکا تھا اور اب بیٹے نے باپ کی پیروی کی

ابن حفصون کو اسلام ترک کرنے کے متعلق جو خوف تھا وہ غلط نہ تھا، یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہ مرتد ہو گیا ہے، اسپینی مسلمان جو اب تک اس کا دم بھرتے تھے اس سے علیحدہ ہو گئے یحییٰ ابن انتکہ جو اس کی فوج کا بڑا نامی سردار تھا بگڑ گیا "ابن حفصون مسلم" کی ماتحتی پر اسے فخر تھا، لیکن "ابن حفصون نصرانی" کی ماتحتی اسے ہرگز گوارا نہ ہوئی، عمر بن حفصون نے اپنا عیسائی نام شمو ایل رکھا۔ بربر ابن خلیع التکرانی القنیط کا حاکم ابن حفصون کا بڑا دوست تھا مگر اب اس نے ابن حفصون سے لڑائی چھیڑ دی اور امیر عبداللہ کی اطاعت کا اظہار کرنے لگا

ابن حفصون کے ارتداد سے ہر طرف ایک عجیب اثر پیدا ہوا، مسلمانوں کو اس سے بیحد نفرت ہو گئی اور کہنے لگے کہ "اس ملعون عیسائی کی حکومت میں ممتاز عہدے ہمیشہ عیسائیوں کو دیے جاتے تھے، مسلمانوں کو اس کی حکومت میں کبھی بہتری کی امید نہیں ہوئی اور کبھی اس نے مسلمانوں کا اعتبار نہیں کیا۔"

اب مسلمانوں نے مسلمانوں کو سمجھانا شروع کیا کہ اگر سب نے تن واحد بن کر اس خبیث کو دنیا سے نہ نکالا تو عاقبت میں بخشش ہونی مشکل ہو جائیگی۔

ابن حفصون کے لیے ایسی حالت میں اس سے بڑھ کر اطمینان کی بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ عرب کا ایک سردار اور وہ بھی اشبیلیہ کا ابراہیم بن حجاج اس سے ربط واتحاد پیدا کرے دوست اور ہوا خواہ پیدا کرنے کی اس وقت اسے ضرورت تھی، افریقیہ میں حاکم اصیلا ابراہیم بن قاسم سے اور شمالی اسپین میں بنی قسی اور بادشاہ لیون سے خط وکتابت شروع کر دی تھی، لیکن ابراہیم بن حجاج سے دوستی ہو جانے میں جس قدر نفع تھا وہ کسی اور کی

دوستی میں نہ تھا، کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس سے مسلمانوں کی رائے پھر اس کی نسبت اچھی ہو جائیگی اس خیال سے اُس نے ابراہیم سے جلد عہد و پیمان کیا اور جب ابراہیم نے فوج اور روپیہ اس کے پاس بھیجا تو ابن حفصون کو پھر وہی قوت حاصل ہو گئی جو پہلے رکھتا تھا۔

امیر عبداللہ کا طالع بد کسی طرح دُور نہ ہوتا تھا، جو تدبیر کرتا تھا اُلٹی پڑتی تھی، اُس کی تمام کوششیں کہ رؤساء عرب میں جو اس وقت سب سے زیادہ صاحب اقتدار ہے اُس سے مصالحت ہو جائے، ایسی ہی ناکام رہی جیسے اسپینی فریق کے سردار ابن حفصون سے مصالحت بیکار ثابت ہو چکی تھی، امیر عبداللہ کی حالت فی الحقیقت نازک ہو گئی تھی، اس وقت جو سازش ابن حجاج اور ابن حفصون میں امیر کے خلاف ہوئی تھی وہ ایسی سخت تھی کہ اُس کے رفع کرنے کے لیے جسقدر فوج رکھتا تھا اُس کو یکجا کر کے میدان میں لانا ضروری تھا، لیکن تمام فوج کو ایک ہی معرکہ کے لیے یکجا کرنے کے معنی یہ تھے کہ تحصیلِ خراج کے لیے جو مہمیں ہر سال بھیجی جاتی تھیں وہ بند کر دی جائیں، اگر ان مہموں میں فوجوں کا بھیجا جانا بند کیا جاتا تھا تو باغیوں سے خراج وصول ہونا غیر ممکن ہو جاتا تھا، اور بغیر روپے کے خوف تھا کہ سب کام بگڑ جائیں گے۔ پس اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ابن حفصون سے پھر مصالحت کرنے کی خفت اُٹھائے، اور مصالحت کی شرائط بھی ایسی آسان ہوں کہ دشمن کو اُن سے انکار کرتے بن نہ پڑے[1]۔ ہم کو نہیں معلوم کہ وہ کیا شرطیں تھیں، صرف اس قدر اطلاع ملتی ہے کہ اس بارے میں طول طویل خط و کتابت

---

[1] پروفیسر ڈوزی اس مقام پر خود حاشیہ لکھتے ہیں کہ ابن حیان کا بیان ہے کہ اس مصالحت کی درخواست پہلے ابن حفصون کی طرف سے ہوئی، مگر پروفیسر اس کو خلاف قیاس سمجھتے ہیں، یہاں ہم کو صرف یہ کہنا ہے کہ جس مصالحت کی شرائط ہیں جو آگے بیان ہوئی ہیں ابن حفصون کو اپنا پرانا دوست ابن مستنہ اور ایک معتبر ملازم خلف بطور ضمانت کے دربار امیر میں حاضر کرنا پڑا ہو، اس میں خفت ابن حفصون کی ہوتی ہے یا امیر عبداللہ کی، ابن مستنہ اور خلف کے علاوہ جو دو آدمی ضمانت میں پیش ہوئے وہ غالباً ابن حفصون کے لڑکے تھے، مصنف اکثر تاریخی واقعات کو صحت کے ساتھ بیان کرنے سے پہلے اُنھی واقعات کی بنا پر مسلمان بادشاہوں کی مذمت میں جو تمہید قائم کرتا ہے وہ واقعات کے پڑھنے سے ہمیشہ مستنبط نہیں ہوتی۔ مترجم

اور ۲۸۹ھ / ۹۰۱ء میں مصالحت ہوگئی، ابن حفصون نے اپنے چار آدمی بطور ضمانت کے امیر کے دربار میں بھیج دیے ایک اُن میں اس کا سب سے بڑا دوست ابن مستنہ تھا، اور دوسرا غلف جو اس کے خزانے کا افسر تھا۔

یہ مصالحت بھی بہر حال چند روزہ تھی، ہم کو اُس کا علم نہیں کہ شرائط صلح کو ابن حفصون نے اپنے حق میں مضر سمجھ کر خود توڑ دیا، یا امیر عبداللہ ان کی پابندی نہ کرسکا، بہر حال ۲۹۰ھ / ۹۰۲ء میں لڑائی پھر شروع ہوگئی۔

اسی سال عمر بن حفصون نے قرمونہ کے شہر میں ابراہیم بن حجاج سے ملاقات کی اور کہا کہ "آپ اُس فوجِ سوارہ کو میری مدد کے لیے بھیجیں جو نجیب عرب" کی سرکردگی میں ہے (ابن حفصون کی مراد نجیبِ عرب کہنے سے فجل بن ابی مسلم سے تھی جو اشبیلیہ کے سب سے بڑے رسالہ کا سردار تھا) یہ میں اس لیے طلب کرتا ہوں کہ مجھے شاہی لشکر کے سپہ سالار ابن ابی عبدہ سے لڑنا ہے، اور مجھے پورا بھروسہ ہے کہ میں اسے شکست دے دونگا۔"

جہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی وہاں فجل بھی موجود تھا چونکہ فجل ڈال کا لوٹا عرب تھا اس لیے (۲۷۶
اس کو ایک اسپینی کے مقابلے میں مروانی امیر سے زیادہ ہمدردی تھی، ابن حفصون کی گفتگو جس میں دوسرے کی حقارت اور اپنی نخوت ظاہر ہوتی تھی اُسے نہایت شاق گذری، فجل نے ابن حفصون سے کہا کہ "اے ابو حفص! ابن ابی عبدہ کی فوج کا ذکر حقارت سے نہ کر، وہ تعداد میں ہم سے کم سہی مگر عظمت میں ہم سے بڑا ہے، اگر تمام اسپین مل کر بھی اُس کے مقابلہ پر آئے گا تو ابن ابی عبدہ کبھی پیٹھ نہ دکھائے گا۔"

ابن حفصون نے جواب دیا "اے سردار! آپ کی یہ گفتگو فضول ہے، ابن ابی عبدہ کیا کرسکتا ہے، اُس کے پاس کتنے سوار ہیں؟ میرے پاس اس وقت چھ ہزار سوار ہیں اور اُن میں ابن مستنہ والے پانچ سو سوار اور شامل سمجھیے اور پھر اتنے ہی تمہارے سوار ہیں جس وقت یہ سب ایک جگہ ہو جائیں گے، تو ہم قرطبہ کو جیتا چبا جائیں گے۔"

فجل بولا "یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہم کو شکست ہو جائے، میں اس لڑائی کی اگر صلاح نہ دوں تو بُرا نہ ماننا، کیونکہ ابن ابی عبدہ کے سواروں سے جس قدر تم واقف ہو اتنا ہی میں واقف ہوں۔"

ہوں۔ باوجود نجل کی مخالفت کے ابنِ حجاج نے ابن حفصون کی رائے سے اتفاق کرلیا، اور نجل کو حکم دیا کہ اپنے رسالہ کو ابن حفصون کے رسالہ کے ساتھ شامل کر کے لڑائی میں مصروف ہو جاسوسوں کے ذریعہ سے جس وقت معلوم ہوا کہ اموی سالارِ فوج ابن ابی عبدہ نے دریائے شنجل سے آ کر اسطبہ کے علاقے میں صف آرائی کی ہے تو ابن حفصون حملہ کرنے کو آگے بڑھا، ابن حفصون کے پاس اس وقت صرف سوار تھے، پیدل فوج نہ تھی، پھر بھی اس کو بڑی شاندار فتح حاصل ہوئی، اس کی فوج نے شاہی فوج کے پانچ سو سے زیادہ آدمی قتل کر دیئے، شام ہوتے ہوتے ابن حفصون کے پاس پندرہ ہزار پیدل فوج پہنچ گئی اس فوج کو ابن حفصون نے قطعاً آرام نہ لینے دیا، اور آگے بڑھے چلنے کو کہا نجل کے خیمہ میں پہنچا تو کہنے لگا "اے سردار! اب میدان جنگ میں چلنا چاہیئے" نجل نے کہا کس کے مقابلہ میں؟" ابن حفصون بولا "ابن ابی عبدہ کے مقابلہ میں" نجل نے کہا "اے ابو حفص! کیا ایک دن میں دوبار فتح حاصل کرنی چاہتے ہو؟ کہیں خدا ناراض نہ ہو جائے، یہ خدا کی جناب میں ناشکر گذاری ہوگی، تم نے دشمن کو خوار کیا ہے اور اس کا ایسا سخت نقصان کیا ہے جس کی تلافی کے لیے ایک مدت دراز درکار ہے، ابن ابی عبدہ میں دس برس سے پہلے اتنی قوت نہیں آئے گی کہ اپنا انتقام ہم سے لے سکے اس وقت اس کو اتنا نہ ستانا چاہیئے کہ وہ اپنی جان سے مایوس ہو جائے"

ابن حفصون نے جواب دیا "ہم ایسی عمدہ فوجیں اس کے سر پہ بھیجیں گے کہ اگر گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگنے اور جان بچانے کا ولت مل جائے تو اسکو خدا کا شکر کرنا ہوگا۔"

مجبوراً نجل اٹھا، چار آئینہ سینے پر باندھتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "خدا گواہ ہے کہ میں اس سخت معاملہ میں کوئی حصہ نہیں رکھتا"

اب ابن حفصون اور نجل اور دوسرے اتحادیوں کی فوجیں اس ارادہ سے چل پڑیں کہ ابن ابی عبدہ کی فوج پر حالتِ بے خبری میں حملہ کریں گی۔

(۳۴۷ ابن ابی عبدہ اس شکست پر سخت پیچ و تاب میں تھا، لشکر کے سرداروں کیساتھ دسترخوان پر بیٹھا ہی تھا کہ دور سے گرد کا ایک غبار اٹھتا نظر آیا، لشکر کا ایک افسر جس کا

نام عبدالواحد روطی تھا دستر خوان سے اُٹھ کر خیمہ کے باہر آیا اور غور سے دیکھنے لگا، کچھ دیکھ کر خیمہ میں واپس آکر کہنے لگا کہ "تاریکی زیادہ ہے، صاف نظر نہیں آتا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ابن حفصون سواروں اور پیدلوں کی فوج لیے اِدھر آرہا ہے اور اس طرح آرہا ہے کہ ہم بے خبر رہیں اور وہ حملہ کر دے۔"

یہ سنتے ہی ابن ابی عبدہ اور جس قدر سردار وہاں موجود تھے، سب نے ہتھیار سنبھال لیے گھوڑوں کی طرف دوڑ اُن کی پیٹھوں پر لپک کر چڑھ گئے اور دشمن کے مقابلہ پر فوجیں لے روانہ ہوئے، جس وقت ابن حفصون کی فوج کے قریب پہنچے، تو ابن ابی عبدہ نے اپنی فوج کے سرداروں سے کہا کہ نیزے پھینک دو، صرف تلواروں سے لڑو۔" فوجیوں نے فوراً اس حکم کی تعمیل کی، اور اب وفادا ان دولت مروانیہ نے باغی ابن حفصون پر اس زور کا حملہ کیا کہ ایک ہی وار میں اس کے ڈیڑھ ہزار آدمیوں کے سر قلم کر دیے، اور ابن حفصون اور اس کی فوج کو مجبور کیا کہ اپنے لشکرگاہ کی طرف بھاگ کر پناہ لے۔

دوسرے دن صبح امیر عبداللہ کو معلوم ہوا کہ ایک شکست کے بعد بڑی فتح نصیب ہوئی ہے، امیر کو ابن حفصون اور ابراہیم پر جنھوں نے صلح کے بعد عہد شکنی کی تھی بے انتہا غصہ تھا، اسی حالت میں اس نے اُن لوگوں کی نسبت قتل کا حکم جاری کیا، جو مصالحت کے وقت ابن حفصون اور ابراہیم نے بطور ضمانت کے دربار میں حاضر کر دیے تھے، ابن حفصون کے چار آدمیوں میں سے تین قتل کر دیے گئے، ابن مستنہ اللبہ حلف اطاعت لے کر بچ گیا اب ابراہیم کے لڑکے عبدالرحمٰن کے قتل ہونے کی باری آئی، ابراہیم نے دربار شاہی میں لوگوں کو اپنا خیر خواہ بنانے میں قولے دورمے کوئی بات اُٹھا نہ رکھی تھی، اور امیر سے بھی بار بار اقرار کر چکا تھا کہ جس دن میرا لڑکا میرے پاس بھیج دیا گیا اُسی دن امیر کی اطاعت قبول کر لونگا، اس وقت دربار شاہی میں ایک شخص بدر نامی عبدالرحمٰن بن ابراہیم کی خیر چاہنے والوں میں تھا، جس وقت جلاد نے عبدالرحمٰن کا سر اُڑانے کو تلوار اُٹھائی تو بدر نے امیر سے عرض کیا "ایک ذرا توقف فرمایا جائے، میری تقصیر معاف ہو، مگر میری بات سن لی جائے، ابن حفصون کے یکغول حضور کے حکم سے ابھی قتل ہو چکے ہیں، اگر ابراہیم کا

فرزند بھی قتل کر دیا گیا تو ابن حفصون اور ابراہیم دونوں تخت کے خلاف اپنی عداوت اور سازشوں کو ہمیشہ جاری رکھیں گے، ابن حفصون سے مصالحت الٰبتہ ممکن نہیں کیوں کہ وہ اسپینی ہے، لیکن ابراہیم بن حجاج عرب ہے، اُس کو تخت کا خیر طلب اور وفا کیش بنانا غیر ممکن نہیں۔"

امیر عبداللہ نے بدر کی تقریر سنکر وزرا کو طلب کر کے اُن سے مشورہ کیا،[1] سب نے یک زبان ہو کر بدر کے مشورے کو پسند کیا، بدر نے دوبارہ عرض کیا کہ اگر ابن حجاج کے لڑکے کو اس کے باپ کے پاس بھیج دیا گیا تو یقین کر لیجیے کہ اشبیلیہ کا یہ شریف عرب ہمیشہ کے لیے مطیع ہو جائے گا۔"

بدر نے یہ دیکھ کر کہ امیر کو اب تک عبدالرحمن کے چھوڑنے میں تذبذب ہے اپنے ایک دوست نجیبی سے جو افسر خزانہ تھا اور دربار میں بہت رسوخ رکھتا تھا کہا کہ فوراً سب کی طرف سے ایک عرضداشت اس مضمون کی امیر کی خدمت میں خود پیش کرو کہ بدر نے جو کچھ صلاح دی ہے وہ لائق منظوری ہے۔

اس عرضداشت کو پڑھنے پر امیر کو جو کچھ تردد و تذبذب تھا وہ جاتا رہا، اور نجیبی کو حکم دیا کہ ابراہیم بن حجاج کے بیٹے کو اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔[2]

برسوں کے بچھڑے فرزند کو گلے سے لگا کر جو خوشی ابراہیم کو ہوئی ہوگی، اُس کے ذکر کی (۲۸۱ھ
ضرورت نہیں، چھ برس سے کوئی دقیقہ کوشش کا باقی نہ رکھا تھا کہ کسی طرح بادشاہ کی حراست سے اپنے لخت جگر کو آزاد کروائے، ابراہیم نے اب اظہار احسانمندی میں ہرگز کوتاہی نہ کی،

کریب بن خلدون کی موت پر ابراہیم کا امیر عبداللہ کو یہ لکھنا غلط نہ تھا کہ ابراہیم کو کریب ہی ہمیشہ امیر کے خلاف بغاوت کی ترغیب دیا کرتا تھا۔ کریب حقیقت میں ابراہیم کا نفس ناطقہ بن گیا تھا اور وہ بھی برائی کے لیے،

---

[1] امیر عبداللہ کے جس قدر وزیر تھے اتنے کسی بادشاہ کے نہ تھے، اُن کی تعداد تقریباً ۳۰ لکھی گئی ہے۔

[2] ابن حیان نے غلطی سے اس واقعہ کا ۲۸۰ھ میں پیش آنا لکھا ہے، لیکن صحیح تاریخ ۲۸۱ھ ہے

چونکہ اب کریب زندہ نہ تھا، اس لیے ابراہیم کی طبیعت میں ایک بڑا انقلاب پیدا ہوا ابن حفصون سے اُس کے تعلقات بالکل تو قطع نہ ہوئے کیوں کہ تحائف آتے جاتے رہتے تھے لیکن امیر کے خلاف بغاوت کرنے پر جو باہمی اتحاد ہوا تھا وہ بیشک ٹوٹ گیا، اب ابراہیم امیر عبداللہ کا دشمن نہ رہا بلکہ وقت پر خراج ادا کرنے لگا، اور حسب ضرورت امدادی فوجیں امیر کی خدمت میں بھیجتا رہا، اب وہ امیر عبداللہ کے تحت میں ایک والیٔ ریاست کی حیثیت رکھنے لگا، اپنی ریاست کی حدود میں اُس کو کامل اختیارات حاصل تھے، فوج رکھتا تھا جس کے سپاہی تنخواہ دار تھے، اشبیلیہ میں قاضی اور صاحب الشرطہ سے لے کر معمولی ناظر تک کا عزل ونصب سب اُسکے اختیار میں تھا، شاہانہ کرّوفرّ سے رہتا تھا، ایک مجلس شوریٰ بھی رکھتا تھا، پانچ سو سوار بطور حرس (باڈی گارڈ) کے اُس کے قریب حاضر رہتے تھے، طراز یعنی لباس زرین جس پر طلائی کام میں اُس کا نام اور خطابات کڑھے ہوتے تھے پہنتا تھا اپنے اختیارات سے کام لینے میں فیاضی وسخاوت کو مدنظر رکھتا، عدل وانصاف میں سختی کرتا خطا کاروں پر رحم نہ کرتا، ملکی انتظام میں اُس کے ارادے کی پختگی ظاہر ہوتی تھی، اپنے زمانہ کا بادشاہ ہی نہیں بلکہ بہت بڑا تاجر بھی تھا، عالم اور علم دوست تھا، بہت سے جہازوں کا مالک تھا جو غیر ملکوں میں پہنچکر وہاں کے بادشاہوں کی طرف سے اس کے پاس سوغاتیں لایا کرتے تھے، عرب سے جو علماء وفقہاء آتے وہ اس کے دربار میں عزت پاتے، مصر کے پارچہ خانوں سے عمدہ عمدہ کپڑے لائے جاتے، اور بغداد سے ارباب نشاط حاضر ہوتیں، ابو محمد عذری بذری حجاز کا مشہور نحوی ابراہیم بن حجاج کے دربار کی زینت تھا، اس باکمال زباندان کی یہ کیفیت تھی کہ جہاں کسی کے منہ سے کوئی غلط یا بے محل لفظ سنتا فوراً کہہ اُٹھتا "لوگو! کیوں اپنی زبان پر ظلم کرتے ہو" یہ شخص لسانی صحت وپاکیزگی میں استاد مانا جاتا تھا، مشہور مغنیہ قمر بھی دربار کی رونق تھی، اس کنیز کے حسن وجمال اور ذہانت ولیاقت کی تعریفیں ابراہیم نے اس قدر سنی تھیں کہ زر کثیر خرچ کرکے اُسے خرید لیا تھا، قدرتی فصاحت اور شاعری میں کمال کے ساتھ ایک دلفریب غرور بھی ایسا رکھتی تھی جو سب کو اُس کی طرف متوجہ رکھتا تھا، ایک روز دربار کے چند سبک سر امیروں نے جن کو اپنی عالی نسبی پر ناز تھا، قمر کے سامنے اس کے

سوابق اور ادنی النسب پر کچھ کہدیا، قمر نے جواب میں یہ اشعار کہے:۔

لوگ کہتے ہیں کہ قمر جب یہاں آئی تو بدن کو چیتھڑے لگے ہوئے تھے، مگر یہاں اب تک اُس کا یہ کام رہا ہے کہ اپنی چشم بیمار سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتی رہے سڑکوں پر کیچڑ پانی میں وہ پھرا کرتی تھی شہر شہر آوارہ گرد تھی، وہ کمینے خاندان کی عورت ہے، شریفوں میں اس کا شمار نہیں، نامہ نویسی اور شعر کہنا اس کی سب سے بڑی لیاقت ہے، افسوس! جو لوگ اس قسم کی باتیں بناتے ہیں اگر وہ احمق نہ ہوتے تو کسی غریب الوطن کی نسبت ایسا نہ کہتے، واللہ! یہ کیسے لوگ ہیں جو ایسی شرافت سے نفرت رکھتے ہیں جسے فی الحقیقت شرافت سمجھنا چاہیے، حقیقی شرافت وہی ہے جو فہم و ذکا سے پیدا ہو کرتی (۳۷۹)
ہے جو مجھ کو ان ناخواندہ احمقوں سے نجات دے، دنیا میں سب سے زیادہ شرمناک چیز جہالت ہے، اور اگر جہالت ہی عورت کے لیے جنت میں داخل ہونے کا پروانہ ہے تو پھر میری یہی آرزو ہوگی کہ پروردگار مجھے دوزخ میں بھیجدے:۔

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسپین کے عربوں کی نسبت قمر نے اچھی رائے قائم نہیں کی تھی، اُسے بغداد کی اعلیٰ تہذیب و شائستگی دیکھنے کی عادت تھی، لہذا ایسے ملک میں وہ بے لطف رہی جہاں پرانے زمانے کی بہت سی سخت و کرخت باتیں اب تک چلی آتی تھیں، ابراہیم بن حجاج قمر کی نگاہ میں بڑی چیز تھا، چنانچہ اُس کی تعریف میں قمر نے یہ شعر کہے تھے:۔

"تمام مغرب میں صرف ایک شخص ہے جو شریف ہے، اور وہ ابراہیم ہے جسے شرافت مجسم کہنا زیبا ہے، اُس کے ساتھ رہنا سب سے بڑھکر مایہ مسرت ہے اور جسے یہ مسرت حاصل ہو چکی ہو، پھر اُس کے لیے دوسرے ملک میں جاکر رہنا ایک مصیبت ہے:"

قمر نے جہاں ابراہیم کی سخاوت اور فیاضی کی تعریف کی ہے وہاں مبالغہ نہیں کیا، اس باب میں سب لوگ اُس سے متفق الرائے تھے۔

قرطبہ کے شاعر جو امیر عبداللہ کی خشت سے بھوکے مرنے لگے، ابراہیم کے دربار میں چلے گئے اُن کا ملک الشعرا ابن عبدربہ بھی اسی زمرہ میں تھا، ابراہیم نے ان لوگوں کو ہمیشہ شاہانہ عطیات سے ممتاز کیا، صرف ایک مرتبہ اپنا ہاتھ روکا، اور وہ موقع یہ تھا کہ خلیفہ نامی قرطبہ

کا مشہور ہجو گو جس کا کلام زہر سے کم نہ تھا ابراہیم کے دربار میں حاضر ہوا، اور ایک نظم پڑھی جس میں دربارِ قرطبہ کے وزیروں اور ممتاز لوگوں کی سخت مذمت تھی، جب نظم پڑھ چکا تو ابراہیم نے کہا "تم سمجھتے ہو کہ ایسی بیہودہ باتیں سننی میں پسند کرتا ہوں؟ تمہاری یہ سخت غلطی ہے" ہجو گو کو خالی ہاتھ قرطبہ واپس آنا پڑا، دل میں غصہ اور زہر تو بھرا ہی تھا اسی حالت میں یہ شعر کہے:۔

"اے بیوی! مجھے الزام نہ دے، جس سفر سے واپس آیا ہوں اُس سفر پر رو، جس میں
مجھے بے انتہا تکلیف پہنچی ہے، میں سمجھا تھا کہ وہاں ایک بڑا فیاض اور سخی رہتا ہے
مگر معلوم ہوا کہ وہ بالکل بے وقوف اور خسیس ہے۔

ابراہیم بن حجاج ایسا آدمی نہ تھا کہ اس قسم کی خرافات سن کر چپ ہو جاتا، جس وقت معلوم ہوا کہ اس شاعر نے اس طرح بدلہ نکالنا چاہا ہے تو اُس کو کہلا بھجوایا "اگر تم ایسی لغو (۳۸۰)
باتوں سے باز نہ آؤ گے تو قرطبہ ہی میں تم اپنے بستر پر ہو گے کہ تمہارا سر اتار لیا جائے گا۔"
اس کے بعد خلیفہ نے کوئی ہجو ابن حجاج صاحبِ اشبیلیہ کی نہیں لکھی۔

اسناد

ابنِ حیان ص ۵، ۸ تا ۱۱، ۲۲؛ ۷۴ تا ۸۴؛ ۵۹ تا ۶۳، ۷۰، ۷۷؛ ۸۰ تا ۸۴
۹۰ تا ۹۸، ۱۰۲

نویری ص ۴۶۶

ابنِ خلدون ص ۱۱

مقری جلد ۲ ص ۹۷، ۳۶۱

ابن الخطیب (عربی مضمون کتابوں پر تعلیقات مولفہ ڈوزی ص ۲۵۹)

ابن عذاری۔ جلد ۱ ص ۲۴۱

جلد ۲ ص ۱۲۸ تا ۱۳۲، ۱۴۳

ابن القوطیہ ص ۴۵ تا ۴۷

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مسلم

سترھویں فصل

امیر عبدالرحمٰن ثالث

امیر عبداللہ سے ابراہیم بن حجاج کی مصالحت تاریخ اندلس میں ایک عصر جدید کی ابتدا ہوگئی (۳۸۱)
اس مصالحت نے امیر عبداللہ کی قوت وسطوت کو دوبارہ زندہ کر دیا، اسپین کے مغربی حصّہ
میں اشبیلیہ بغاوت سرکشی کا مرکز تھا، جب یہاں کی بغاوت دور ہوئی تو مغربی حصّے کے باقی
صوبوں نے جزیرۃ الخضراء سے لے کر لبلہ تک مجبوراً امیر کی اطاعت قبول کر لی، امیر عبداللہ
کے زمانۂ حکومت کے اخیر نو برس ایسے تھے جن میں ملک کا خراج وقت پر وصول ہو جاتا تھا
اور اب اس کام کے لیے ہر سال فوجیں بھیجنے کی ضرورت نہ رہی تھی، اس کی وجہ سے ملک کے
جنوبی اضلاع میں جہاں بغاوت ابھی تک جاری تھی، کل فوجی قوت کو صرف کر دینے کا موقع
مل گیا، یہ عمدہ نتیجہ بدر کے عاقلانہ مشورے اور صوابدید کا تھا، امیر اس وفادار ملازم کا دل
سے ممنون تھا، اور اس کے ساتھ ہمیشہ سلوک کرتا رہا پہلے اس کو وزیر کا خطاب دیا پھر

موانست پیدا کر کے اس کو اپنا معتمدِ خاص سمجھنے لگا۔

بدر اگرچہ ازروئے ضابطہ وزیر اعظم نہ تھا، لیکن امیر کو اُس پر اِس قدر اعتماد تھا کہ اس جلیل القدر منصب کی کل خدمات وہی ادا کرتا تھا۔

ملک کے جنوبی حصّے کی بغاوت فرو کرنے میں امیر عبداللہ کو برابر کامیابی ہوتی رہی ۹۰۳ء (۲۸۹ھ) میں شاہی لشکر نے جیان پر قبضہ کرلیا، ۹۰۵ء (۲۹۱ھ) میں وادی بلون کی لڑائی ابن حفصون سے جیت لی، ۹۰۶ء (۲۹۲ھ) میں بنی الخلیع سے القنیط کا قلعہ چھین لیا، ۹۰۷ء (۲۹۳ھ) میں ارجذونہ کو خراج دینے پر مجبور کیا، ۹۰۹ء (۲۹۶ھ) میں ابن مستنہ سے نقوش کا قلعہ نکال لیا، ۹۱۰ء (۲۹۷ھ) میں شہر بیاسہ پر قبضہ کیا ۹۱۱ء (۲۹۸ھ) میں حصن اشر کے لوگوں نے اپنے حاکم فضل بن سلامہ سے جو ابن مستنہ کا داماد تھا بغاوت کی اور فضل کو قتل کر کے اس کا سر امیر عبداللہ کے پاس روانہ کیا۔

ملک کے شمالی حصہ میں بھی دولتِ اموی کو ترقی ہوئی، ۸۹۸ء (۲۸۴ھ) میں ایک نہایت نازک موقع پیش آیا یعنی خوف پیدا ہوا کہ جنوبی حصۂ ملک کے اسپینی سردار ابن حفصون اور شمالی حصۂ ملک کے اسپینی سردار محمد بن لُب میں بنی امیہ کی سلطنت کے خلاف سازش ہونے والی ہے، محمد بن لُب نومسلم اسپینی خاندان بنی قسی کا رئیس تھا۔ اُس نے ابن حفصون سے صوبہ جیان میں آکر ملنے کا وعدہ اس غرض سے کیا تھا کہ مروانی سلطنت کے خلاف کوئی کارروائی ابن حفصون سے مل کر کرے، مگر یہ وعدہ اس وجہ سے ایفا نہ ہو سکا کہ اسی زمانہ میں اُس سے اور حاکم سرقسطہ الانقر (الانکس سے لڑائی چھڑ گئی تھی، محمد بن لُب جب خود نہ جاسکا تو اس نے اپنے لڑکے لُب بن محمد کو ابن حفصون سے مشورہ کرنے کے لیے جیان روانہ کیا، لُب بن محمد جیان پہنچکر ابن حفصون کا انتظار کرنے لگا، اسی انتظار میں تھا کہ محاصرہ سرقسطہ میں باپ کے مارے جانے کی خبر سُنی، یہ خبر سُنتے ہی ابن حفصون سے بغیر ملے وطن کو واپس چلا گیا، اس کے بعد پھر اس سازش کا حال کسی نے کچھ نہ سنا، درآنحالیکہ اس سازش کی خبر نے دربارِ قرطبہ میں ایک ہلچل ڈال دی تھی، مگر اب صورت یہ ہوئی کہ لُب بن محمد بجائے مخالفت کرنے کے امیر عبداللہ کے لطف و کرم کا متمنی ہوگیا، اور امیر نے اس کو طلیطلہ اور طرسونہ

کی سندِ حکومت عطا فرمائی، لب بن محمد اپنے پڑوسی والیانِ ریاست مثلاً حاکمِ وشقہ، بادشاہِ لیون، حاکمِ برشلونہ، حاکمِ بالمرز، بادشاہ نبرہ[1] سے لڑنے میں برابر مصروف رہا آخرکار بادشاہ نبرہ سے ایک معرکۂ جنگ میں ود مدا گیا (۲۹۲ھ / ۹۰۷ء)

لب بن محمد کے مارے جانے پر اس کا بھائی عبداللہ بن محمد اس کا جانشین ہوا، اس نے بھی لڑائی امیر عبداللہ سے نہیں بلکہ بادشاہ نبرہ سے شروع کی، غرض بنی قسی اب بنی امیہ کے حق میں خطرناک نہ رہے۔

سیاسی مطلع آفات کے گرد و غبار سے پاک ہو چلا تھا، دارالامارت قرطبہ میں آیندہ کے لیے اچھی امیدیں قائم ہونے لگیں، شاعروں نے ایسے دھوم کے قصیدے پڑھنے شروع کیے جو برسوں سے نہ پڑھے تھے، مگر سلطنت نے اب تک جو کچھ ترقی کی تھی اس کی رفتار بہت سست تھی، معاملات نے ابھی تک کوئی قرار واقعی صورت اختیار نہ کی تھی کہ ۱۵ ار اکتوبر ۹۱۲ء (۲۹ صفر ۳۰۰ھ) کو امیر عبداللہ نے اپنی عمر کے اٹھہترویں برس میں ۲۲ سال سلطنت کر کے انتقال کیا۔

امیر عبداللہ کے سب سے بڑے بیٹے امیرزادہ محمد کا لڑکا عبدالرحمٰن پہلے سے ولیعہد مقرر ہو چکا تھا، یہ امیرزادہ محمد وہی ہے جس کو باپ کے اشارے سے اس کے بھائی مطرف نے قتل کرا دیا تھا، عبدالرحمٰن بالکل ہی زمانہ شیر خواری میں یتیم ہوا تھا، دادا نے پرورش کیا، اور اپنے فرزند امیرزادہ محمد کے قتل کا صدمہ کبھی دل سے دور نہ ہوا، اس فرزند کے یتیم بچے کے ساتھ امیر عبداللہ نے اتنی ہی محبت کی جتنی محبت کی توقع امیر عبداللہ سے کی جا سکتی تھی، اس کو اپنا ولیعہد مقرر کیا، عبداللہ کی وفات کے وقت عبدالرحمٰن پورا بائیس برس کا بھی نہ تھا، خوف یہ تھا کہ کہیں اس کے باپ کے بھائی اور چچا تخت نشینی کا کوئی جھگڑا نہ اٹھائیں، لیکن کسی نے مخالفت[2] نہ کی بلکہ خاندان کے لوگوں اور دربار کے

---

[1] ان میں حاکم وشقہ تو مسلمان تھا باقی کے چاروں عیسائی تھے

[2] دیکھو ابن عذاری کی تاریخ اندلس پر پروفیسر ڈوزی کا لکھا ہوا دیباچہ ص ۴۷ تا ۵۰

معززین نے عبدالرحمٰن کی امارت کو سپین کے حق میں مبارک خیال کیا اور اس کی تخت نشینی کو سلطنت کی آئندہ شان و شوکت میں ترقی کی دلیل سمجھا، واقعہ یہ تھا کہ عبدالرحمٰن نے اتنی ہی سی عمر میں دوسروں کو خوش کرنا اور اُن کا دل رکھنا سیکھ لیا تھا، جس قدر لوگ اِس نوجوان شہزادے سے واقف تھے وہ اُس کے حسنِ لیاقت کے گرویدہ تھے۔

دادا کے وقت سے جو کام شروع ہوا تھا اُس کو جاری رکھنے میں عبدالرحمٰن نے بالکل جداگانہ ۳۸۲
اصول قائم کیے، امیر عبداللہ کی پیچیدہ و تذبذب تدبیرِ سیاست کی جگہ اُس نے ایک بیباک اور بالکل پاک صاف طرزِ عمل اختیار کیا جس میں استقلال اور مضبوطی دونوں چیزیں موجود تھیں، اپنے باغیوں سے اُس نے کچھ چناں چنیں نہیں کی، بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ ہم کو جو چیز چاہیے وہ خراج نہیں ہے۔ دراصل وہ تمہارے شہر اور قلعے ہیں، جو لوگ اطاعت قبول کریں گے اُن کو پوری معافی دی جائے گی، باقی سب کو قابلِ عبرت سزا ملے گی، عبدالرحمٰن کے اِس قسم کے مطالبات سے احتمال ہوتا تھا کہ کل اسپین اُس کے خلاف متحد ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا، اُس کے عزمِ راسخ نے رعایا کو ناراض نہیں کیا بلکہ جو ناراضی چلی آتی تھی اُسے مٹا دیا، اُس کی سیاسی تدابیر میں بے سمجھے بوجھے تعجیل نہ تھی، بلکہ زمانے اور وقت کو دیکھ کر سیاسی حالت پر نظر کرکے جو کام کرنا ہوتا تھا، کرتا تھا۔

اِن باتوں سے بتدریج ایک عالمگیر انقلاب تمام ملک میں پیدا ہو گیا، روساء عرب کی جماعت اب وہ نہ تھی جو امیر عبداللہ کی تخت نشینی کے وقت تھی، اُس کے بڑے بڑے سردار اب موجود نہ تھے، سعید بن جودی اور کریب بن خلدون مر چکے تھے، ابراہیم بن حجاج کا بھی حال ہی میں انتقال ہو گیا تھا (۲۹۷ یا ۲۹۸ھ / ۹۱۰ یا ۹۱۱ء) اب بغاوت کرنے کے لیے کوئی صاحب عقل و تدبیر ایسا نہ تھا جو اُن کی خالی جگہ کو پُر کرتا، اپنی قوم کے سردار اور سرغنے[1] البتہ اب تک موجود تھے اور اُن کی قوت میں بھی کچھ کمی نہ آئی تھی، لیکن یہ لوگ اب بوڑھے ہو چلے تھے، اُن کی فوجوں میں بھی اب طاقت اور ہمت نہ رہی تھی جو تیس برس پہلے تھی، اب یہ

[1] مسلمان اور عیسائی دونوں

کیفیت نہ تھی کہ اپنے ملک کو اغیار کی حکومت سے آزاد کرانے کے لیے تمام اسپینی خواہ مسلمان ہوں خواہ عیسائی، ایک جان ہو کر اُس کے مقابلے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں، وہ پہلا جوش و خروش اب سرد ہو گیا تھا تیس برس پہلے کی دم خم رکھنے والی نسل کی جگہ اب ایک ایسی نسل تھی جس کو سلطنت سے شکایت رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی، اور نہ اُس میں اپنے بزرگوں کا سا غرور اور جوش تھا، اور نہ اُس پر امیر کی طرف سے ظلم ہوتے تھے اور نہ کوئی وجہ ناراضی کی اس کو تھی، در پردہ کچھ شکایتیں تھیں، مگر وہ اس بات کی نہ تھیں کہ ملک پر ایک مطلق العنان بادشاہ حکومت کرتا ہے بلکہ صرف بدنظمی اور خانہ جنگی کے متعلق تھیں، اب تک وہ یہی دیکھتے رہے تھے کہ شاہی لشکر کے سپاہی یا باغی، کھیتیاں جن میں اچھی فصل ہونے کی امید تھی اُجاڑتے پھرتے ہیں، زیتون کے پھولے اور نارنگیوں کے پھلے درختوں کو کاٹ کاٹ کر زمین پر گراتے ہیں، گاؤں جلا کر خاک سیاہ کر دیتے ہیں، یہ سب کچھ تو دیکھا تھا، مگر جس چیز کو نہ دیکھا، اور ہمیشہ انتظار ہی میں رہے وہ قومی تحریک کی سرسبزی تھی[1] امیر کا تخت حکومت بعض اوقات متزلزل نظر آنے لگتا تھا، مگر پھر چند روز میں ایک کوہ راسخ کی طرح وہ مستحکم ہو جاتا تھا، یہ باتیں قوم پرستوں کے لیے ہمت شکن تھیں، لوگ اس بات کو خوب سمجھتے تھے گو زبان سے نہ کہتے ہوں کہ جب کوئی مفتوح قوم اپنی قومی حکومت قائم کرنے کے لیے ہنگامہ کرتی ہے، تو یہ ہنگامہ اگر پہلے ہی جوش و خروش میں کامیاب نہ ہوا تو پھر کبھی
(۳۸۴) وہ سرسبز نہیں ہوتا اگر یہ خیال اُس زمانے میں عام تھا جبکہ کامیابی کبھی ایک فریق کو اور کبھی دوسرے فریق کو حاصل ہوتی تھی، تو ایسے زمانے میں وہ اور بھی مضبوط ہو گیا ہو گا جبکہ باغیوں کو شکستوں پر شکستیں ہوتی تھیں، اور بجائے ترقی کے اب وہ تنزل کے راستے پر پڑ لیے تھے، اب لوگوں پوچھتے تھے کہ ایسے کشت و خون سے جس میں بڑے بڑے بہادروں

---

[1] مصنف چونکہ یورپ کا عیسائی ہے اس لیے مطلق العنان حکومت کی طرف سے اسکے دل میں ایک قدرتی مخالفت ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ حکومت بنی امیہ کے خلاف بغاوتوں کو قومی تحریکیں بتاتا ہے، اور اُن کے سرسبز نہ ہونے پر اس کے قلم سے ایک قسم کا افسوس ٹپک رہا ہے۔ مترجم۔

کی جانیں تلف ہوں نتیجہ ہی کیا نکلتا ہے؟ کیا ان بہادروں کا مرنا اُن لڑائیوں اور خونریزیوں کی سزا نہیں ہے جنھیں خدا ناپسند کرتا ہے؟ بڑے شہروں کے باشندے جو امن وآسائش کے خاص طور پر آرزومند تھے، وہ سب سے پہلے اپنے دل سے یہی سوال کرتے تھے اور جب کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ ملتا تھا تو سب باتوں پر نظر کر کے نتیجہ نکالتے تھے کہ امن و عافیت جس قیمت پر بھی ملیں، بشرطیکہ تجارت وصنعت اور جو ثروت اُن سے پیدا ہوتی ہے وہ سب ساتھ رہیں تو پھر وہ بدرجہا بہتر حُبِّ قوم اور حُبِّ وطن کی اُن لڑائیوں سے ہیں جن میں بدنظمی اور بدعملی پیدا ہوتی ہو۔

البیرہ والوں نے خود اپنی تحریک سے امیر کی اطاعت قبول کی، جیان پر شاہی فوج نے بلا مزاحمت قبضہ پایا، ارجذونہ نے خراج دینا منظور کر لیا، نواح جنوب کے کوہستان یعنی ریّہ اور مالقہ کے اضلاع میں جو سرکشی اور بغاوت کے مرکز تھے البتہ لوگ چین سے نہ بیٹھے لیکن خستگی و پست ہمتی کی علامتیں اُن میں بھی ظاہر ہونے لگیں۔ اب پہاڑی لوگ باغیوں کی فوج میں بھرتی ہونے کے لیے اس طرح نہ آتے تھے جیسے پہلے آیا کرتے تھے، مجبور ہو کر ابن حفصون نے بھی امیر عبداللہ کی تقلید کی، اور طنجہ کے لوگوں کو بلا کر انھیں تنخواہ پر فوج میں بھرتی کرنے لگا۔[1] جس وقت یہ طریقہ شروع ہوا تو لڑائی کی نوعیت بدل گئی، اب ہر فریق اس کوشش میں ہوا کہ افریقہ سے سپاہ حاصل کرنے کے جو وسائل فریق مخالف رکھتا ہے

---

[1] ۸۹۶ء (۲۸۳ھ) میں باشِس کے محاصرہ کے وقت امیر عبداللہ کے بہت سے سپاہی جن میں سوار اور پیدل دونوں تھے، زیادہ تنخواہ کے لالچ میں دشمن سے جا ملے یہی کیفیت لورقہ میں ہوئی، ۸۹۷ء (۲۸۴ھ) میں طنجہ کے رہنے والے بارہ سپاہیوں نے ابن حفصون کی نوکری چھوڑ کر امیر کی ملازمت اختیار کر لی امیر عبداللہ کے آخری سالِ جلوس میں بربر فوج کے کئی دستوں نے امیر کی نوکری چھوڑ کر ابن حفصون کی نوکری کر لی، لیکن نئے ساتھیوں میں پہنچ کر جلد بگاڑ ہو گیا اور اس ہنگامے میں بہت سے بربر قتل ہو گئے، جو باقی بچے وہ امیر عبداللہ کی فوج میں پھر بھرتی ہو گئے، امیر نے اُن کا قصور معاف کر دیا تھا (ابن حیان ص ۸۸ تا ۸۹، ۹۱، ۱۰۷ عریب ابن سعد القرطبی کی تاریخ افریقہ و اندلس، جلد ۲ ص ۱۵۲

اُن سے اُسے محروم کر دیا جائے، اب جو لڑائی ہوتی اس میں نہ تو پہلے زمانہ کی لڑائیوں کی طرح کوشش کی جاتی اور نہ زیادہ خونریزی ہوتی، طنجہ کے بربر جو زیادہ تنخواہ کی طمع میں ایک آقا کو چھوڑ کر دوسرے کی ملازمت اختیار کرنے کو تیار رہتے تھے، لڑائی کو کسب دولت کا ایک ذریعہ سمجھنے لگے، لڑائی میں دشمن کو مارنے سے اس لیے پرہیز کرتے کہ ممکن ہے آج جو دشمن بن کر لڑ رہا ہے کل یہی دوست بن کر ہمارے ساتھ لڑائی میں شریک ہو، بہت سی لڑائیاں ایسی ہونے لگیں جن میں دو تین سے زیادہ آدمی کام نہ آتے، بعض میں کوئی بھی قتل نہ ہوتا جہاں دو چار آدمی زخمی اور دو چار گھوڑے لنگڑے کر دیے، سمجھے کہ بس بہت کچھ ہو لیا،

ایسی سپاہ کو لڑا کر یہ اُمید رکھنی کہ اغیار کی حکومت کو نیست و نابود کر کے قومی آزادی حاصل کی جائے گی ایک لغو بات تھی، بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ باغیوں کے بڑے بڑے پرجوش اور غضبناک حملے بھی حصولِ آزادی میں ناکام رہ چکے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ حفصون بھی اس بات کو سمجھتا تھا، کیونکہ سنہ ۹۰۹ء (سنہ ۲۹۶ھ) میں اُس نے (قومی آزادی حاصل کرنے کا خیال چھوڑ کر) عبید اللہ شیعی کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا[1] تھا، جو اُس وقت افریقیہ میں (۲۸۷)
اغالبہ سے سخت بغاوت میں مصروف تھا، لیکن دولتِ شیعہ سے ابن حفصون کے اس عجیب تعلق اور سازش کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، بہرکیف اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ابن حفصون کو اب اپنے اہلِ وطن یعنی اسپینیوں پر بھروسا نہ رہا تھا۔

قومی تحریک میں ہمت اور جوش کی کمی کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ جو اسپینی لوگ قلعوں کے مالک بن بیٹھے تھے، بالخصوص صوبہ جیان اور البیرہ کے صاحبانِ قلاع

---

[1] مصنف نے اس بات پر اکثر زور دیا ہے کہ اسپینی مسلمان بھی بنی امیہ کی سلطنت کو اغیار کی سلطنت سمجھتے تھے، میرے خیال میں قومی آزادی کا سوال اُس وقت تھا ہی نہیں، مطلق العنان حکومتوں میں جو بغاوتیں تاریخ میں معمولاً ہوا کرتی تھیں، وہی اسپین میں بھی ہوتی تھیں اور بس۔ مترجم

[2] ابن حفصون نے اس سے پہلے اپنی قوم کے لیے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے عباسی خلیفہ کی غلامی کرنی چاہی تھی۔ مترجم

وہ نہایت آوارہ اور بدچلن ہو گئے تھے، اُن کے ذہن سے یہ بات نکل گئی تھی کہ دولت مروانیہ پر اُن کے خروج محض اپنے ملک کو اُن سے آزاد کرانے کے لیے تھے[1] پہاڑوں کی بادل چھائی ہوئی اونچی چوٹیوں پر اپنے قلعوں میں اب اُن کی حیثیت محض قزاقوں کی رہ گئی تھی، مذہب یا قانون سے اب اُن کو کوئی واسطہ نہ تھا، قلعوں کی فصیلوں پر مسافروں کی تاک میں بیٹھے رہتے اور جب کوئی قافلہ یا کارواں نظر آتا تو اس پر ایسے گرتے جیسے شکاری پرندہ شکار پر گرتا ہو، پھر دوست دشمن کسی میں فرق نہ کرتے، اُنھیں لوٹنے اور مار ڈالنے کے سوا دوسرا کام نہ تھا، کوئی گاؤں اور شہر ایسا نہ تھا جہاں کے آدمی اِن ظالموں کے حق میں دل سے بددعا نہ کرتے ہوں، جو شخص اِن قزاقوں کے برجوں اور قلعوں کی فصیلوں کو گرا دے وہ مظلوموں کے شکریہ کا مستحق ہوتا تھا، لیکن یہ کام سوائے امیر اندلس کے دوسرے کے بس کا نہ تھا، اس لیے رعایا کی اُمیدیں قدرتی طور پر امیر کی طرف متوجہ ہوئیں۔

یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ لڑائی اب قومی[2] یا عام لڑائی نہ رہی بلکہ مذہبی لڑائی ہو گئی ابن حفصون پہلے مسلمان اور عیسائی میں کوئی فرق نہ سمجھتا تھا، فقط اسپینی ہونا اور قومی آزادی حاصل کرنے پر آمادگی، اور ہتھیار اُٹھانے کی قابلیت، ایسی چیزیں تھیں جو لوگوں کو ابن حفصون کی جماعت میں شامل ہونے کے قابل بنا دیتی تھیں، لیکن جب ابن حفصون اور اس کے دوست ابن مستنہ نے علانیہ اسلام ترک کر کے عیسائی مذہب

---

[1] صاحب اختیار بننے کی کوشش تھی، ملک کو آزاد کرانے کا خیال تھا ہی نہیں۔ مترجم

[2] قومی لڑائی سے مطلب اُن لڑائیوں سے ہے جو اسپین کے خاص باشندے خواہ عیسائی ہوں خواہ مسلمان مروانیوں کی سلطنت کو غیر ملک والوں کی سلطنت سمجھ کر اٹھانے کے لیے لڑتے تھے، عام لڑائی سے مراد ایسی لڑائیاں ہیں جو عربی سرداروں اور بربر کی قوموں اور اسپین کی رعایا نے مروانی سلطنت کو غارت کرنے کے لیے لڑیں مذہبی لڑائی سے غالباً مطلب یہ ہے کہ ابن حفصون عیسائی ہو کر عیسائیوں کا طرفدار اس نیت سے ہوا کہ مسلمانوں کی سلطنت اسپین سے غارت کر دے اگر یا اب عرب، بربر اور اسپینی مسلمان، ابن حفصون کو اپنا حریف مقابل سمجھنے لگے یا فقط یہ کہیے کہ اب لڑائی عیسائیوں اور مسلمانوں میں ٹھن گئی، ملک اور قوم کا خیال کافور ہوا۔ مترجم

قبول کر لیا، اور اس مذہب کو اُس کی پرانی شان و شوکت پر لانے کے لیے ایسے علاقوں میں جن پر یہ دونوں نصرف رکھتے تھے بڑے بڑے گرجا تعمیر ہو گئے، تو پھر صورتِ حالات بالکل بدل گئی، اب ابن حفصون بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شموایل نے (جو عیسائی ہو لے پر اُس نے اپنا نام رکھا تھا) سوائے عیسائیوں کے دوسرے مذہب والے کا اعتبار نہ کیا، اپنے علاقے میں ایسے عہدے اور مناصب جن میں روپیہ زیادہ حاصل ہوتا تھا صرف عیسائیوں کے لیے مخصوص کر دیے، اب ببشتر کا قلعہ نصرانی تعصب کا مرکز بن گیا اور یہ تعصب سختی میں اُس مذہبی جنون کا ہم پلہ تھا جو ساٹھ برس پہلے قرطبہ کے راہبوں سے ظاہر ہوا تھا، اس کی پہلی مثال ابن حفصون کی بیٹی ارجنتیا نے جو سخت متعصب عیسائی تھی، پیش کی، ابن حفصون نے بہت چاہا کہ یہ بیٹی اپنی ماں کولمبیا کے مرنے پر باپ کا گھر سنبھالے، لیکن بیٹی نے بجائے اس کے قلعہ ببشتر میں ایک خانقاہ تیار کرائی، اور اس طرف سے قطعی مایوس ہو کر کہ کبھی (عیسائی) اسپینیوں کو مسلمانوں کی حکومت سے آزادی ملے گی، شوقِ شہادت میں راہبہ بن کر خانقاہ میں معتکف ہو گئی، ایک پادری نے یہ کہہ رکھا تھا کہ وہ کسی وقت میں مسیح پر اپنی جان فدا کرے گی، غرض نصرانیت کے ساتھ یہ وفورِ شوق اور اسلام سے جانی عداوت اُن لوگوں کے حق میں تنگ راہ ہو گئی جو قومی آزادی حاصل کرنے کے (۸۶۱ لیے سرِ بکف رہا کرتے تھے۔

اسپینی مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ عربوں سے عداوت رکھنے کے باوجود اُن کو اسلام سے جو عربوں ہی سے اُنھیں پہنچا تھا بے حد شغف تھا، یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ اسپین کا باشندہ اپنے مذہب کا خواہ وہ کوئی مذہب ہو ہمیشہ نہایت سختی سے پابند ہوتا ہے، ہرف اور سرفوں کی اولاد پہلے ہی کوشش کر چکی تھی کہ عیسائیت کو فروغ نہ ہو، کیونکہ اُس میں اندیشہ تھا کہ پھر اُن کی حالت ویسی ہی زبوں ہو جائے گی جیسی کہ عیسائی حکومت میں رہ چکی تھی۔

غرض مذہب اب ایک ایسی چنگاری ہو گیا جس سے ہر طرف آگ لگائی جانے لگی، ہر جگہ اسپینی عیسائی اور اسپینی مسلمان ایک دوسرے کو رشک و عداوت کی نظر سے دیکھنے لگے، اور اس کی وجہ سے بعض علاقوں میں سخت کشت و خون بھی ہوا، صوبہ جیان میں

ابن الشالیہ نے جو اسپینی مسلمان تھا جب حصنِ قسطلونہ پر دوبارہ قبضہ کیا، جسے اسپینی عیسائیوں نے اسپینی مسلمانوں سے لے لیا تھا، تو اُس نے قلعہ میں جس قدر عیسائی تھے ان کو قتل کر دیا (۲۸۵ھ ۸۹۸ء)

پس قومی آزادی کا متمنی فریق اب اتنا قوی نہ رہا جیساکہ وہ معلوم ہوتا تھا، اب اس میں وہ مشتعل مقدس جس سے اور صرف جس سے شجاعت اور جواں مردی کے بڑے بڑے کام انجام پاتے ہیں، بہت ہی دھیمی چل رہی تھی آپس میں نفاق پیدا ہونے کے علاوہ اب لڑتے لڑتے تنگ بھی گئے تھے، ان میں بہت لوگ ایسے تھے جو امیر سے مصالحت کرنے کے خلاف نہ تھے، کیوں کہ مذہب کی حفاظت کرنے والا امیر ہی تھا، مگر شرط یہ تھی کہ یہ امیر امیر عبداللہ نہ ہو، کیونکہ امیر عبداللہ جیسے شخص سے مصالحت کا خیال آنا دشوار تھا، یہ وہ امیر تھا جس نے اپنے دو بھائیوں کو زہر دے کر مارا تھا اور ایک کو قتل کیا تھا اور یہی درجہ اپنے دو بیٹوں کا محض شبہ پر بغیر تحقیقات کے کیا تھا، لیکن عبداللہ اب زندہ نہ تھا، اور اس کا جانشین اُس سے کسی بات میں مشابہ نہ تھا۔

عبدالرحمن میں ایسی تمام خوبیاں موجود تھیں جن سے رعایا کو بادشاہ کے ساتھ وابستگی اور بادشاہ پر بھروسا پیدا ہوتا ہے رعایا کا دل رکھنے، شاہانہ کر و فر دکھانے، اور حکومت کے فن میں وہ طاق تھا، جس وقت سامنے ہوتا تھا تو حاضرین کے قلب اس کی حرکات و سکنات سے مسخر ہو جاتے تھے، یہ تسخیر قلوب کا مادہ بادشاہوں میں بیکار نہیں ہوتا وہاں پر افسوں کا کام دیتا ہے، شانِ فرمانروائی اس کی ہر ادا سے ظاہر تھی، جو شخص قریب ہوتا، اُس کی لیاقت و قابلیت، حسنِ اخلاق و مروت اور رعایا پروری کی تعریف کرتا، رعایا پروری کا ثبوت محصولوں کے کم کرنے سے مل چکا تھا، نرم اور جلد اثر قبول کرنے والی طبیعتیں اس کے باپ کی بدقسمتی کو یاد کر کے کہ عین جوانی میں قتل کر دیا گیا، اور ایک مرتبہ قوم پرستوں کے عَلَم کے نیچے ببشتر کے قلعے میں بھی پناہ لینے چلا آیا تھا، متاثر

ؔ دیکھو تاریخ مولفہ ابن عذاری پر پروفیسر ڈوزی کا لکھا ہوا دیباچہ ص ۴۴ تا ۶۲

ہوتی تھیں۔

غرض یہ نوجوان بادشاہ بڑی مبارک ساعت میں تخت پر بیٹھا تھا، اسپین میں بڑے بڑے شہروں کے لوگ منتظر تھے کہ کب بادشاہ اُن کے شہر میں آئے اور وہ اطاعت قبول کریں اس کی پہلی مثال استجہ کے شہر والوں نے پیش کی، ۳۱؍دسمبر ۹۱۲ء (۱۰؍جمادی الاول ۳۰۰ھ) ۳۸۷ کو امیر عبداللہ کی موت کے ڈھائی مہینے بعد اس شہر نے محاصرہ کرنے والوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے، محاصرین کا سردار بدر تھا، جسے حاجب کا خطاب مل چکا تھا، لیکن عبدالرحمٰن کی خواہش تھی کہ وہ خود میدانِ کارزار میں اُتر کر فتحیابی کا تاج اپنے سر پر رکھے چنانچہ ۳۰۰ھ ہجری کے موسم بہار (اپریل ۹۱۲ء) میں لشکر کی سپہ سالاری اس نے خود اختیار کی اور صوبہ جیان میں جو لوگ خود مختار بن کر قلعہ نشین ہو گئے تھے، اُنھیں مغلوب کرنے کا ارادہ کیا، شاہی فوجوں کو یہ دیکھے ہوئے برسوں ہو گئے تھے کہ بادشاہِ وقت سالارِ لشکر بن کر اُن کے آگے آگے ہو، ۸۹۲ء (۲۷۹ھ) میں حصن قرقبہ والی لڑائی میں امیر عبداللہ فوج کی افسری پر آخری بار نکلا تھا، اس کے بعد فوج کو یہ دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا کہ بادشاہ اُس کا افسر ہو، شاہی لشکر سے بادشاہِ وقت کی غیر حاضری سپاہ پر بُرا اثر ڈالتی تھی،

بہرکیف جب عبدالرحمٰن امیر لشکر بن کر فوجوں کے سامنے آیا، تو فوجیں، اس نوجوان خوبرو بادشاہ کو دیکھ کر خوش ہوئیں اور سمجھیں کہ یہ تاجدار ہماری فتح و فیروزی ہی میں شریک نہ ہوگا بلکہ مصیبت اور خطروں میں بھی ہمیشہ ساتھ دے گا، یہ خیال کرتے ہوئے فوجوں نے اپنے بادشاہ کا بہت خوش ہو کر دل سے خیر مقدم کیا

عبدالرحمٰن جب صوبہ جیان میں داخل ہوا تو معلوم ہوا کہ ارجذونہ میں جو باغی فریق رہتا ہے اُس سے ابن حفصون نے سازش کر رکھی ہے اور ابن حفصون کو ارجذونہ پر جلد قبضہ حاصل ہونے کی امید ہے، عبدالرحمٰن نے یہ حال معلوم کرتے ہی ایک فوج ارجذونہ کو روانہ کی، اور سردار فوج سے کہدیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو شہر پر قبضہ کر لیا جائے، سردار فوج نے پہنچتے ہی شہر پر قبضہ کیا اور ابن حفصون کی اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔

اب عبدالرحمٰن قلعہ منت لیون کے محاصرے کے لیے بڑھا، اس قلعہ کا حاکم اس وقت

سعید بن ہذیل تھا، یہ عمر بن حفصون کا بڑا پرانا ساتھی تھا، مگر سعید نے لڑنے کی بجائے پیغام صلح بھیجنا پسند کیا، شاہی فوج نے اتوار کو قلعہ کا محاصرہ کیا تھا اور منگل کے دن سعید بن ہذیل نے اطاعت قبول کرلی۔

ابن شالیہ، اسحاق بن ابراہیم، صاحب منت لشہ اور دس ایسے ہی اور سرداروں نے جو قلعوں میں مالک بنے بیٹھے تھے، اظہار اطاعت اور طلب امان میں اتنا انتظار بھی نہ کیا کہ عبدالرحمٰن ان کے دروازے تک پہنچتا

بادشاہ نے ان سرداروں کو امان دے کر مع اُن کے اہل وعیال کے قرطبہ بھیجدیا اور جو قلعے اُنھوں نے خالی کیے ان میں اپنی فوج کے افسر متعین کردیے

صوبہ البیرہ میں بھی یہی واقعات پیش آئے، کسی نے امیر عبدالرحمٰن کا راستہ نہ روکا یہاں تک کہ وہ شہر فینانہ میں آیا، یہاں ابن حفصون کے ساتھی بہت زوروں پر تھے، ان لوگوں نے شہر والوں کو سمجھایا کہ قلعہ بہت مضبوط ہے اُس کو کوئی فتح نہیں کرسکتا، اس لیے بادشاہ کی اطاعت قبول نہ کریں، اہل فینانہ اُن کے کہنے میں آگئے اور مقابلے پر آمادہ ہوئے لیکن قلعہ کو نہ بچاسکے،

حصن فینانہ پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا، شہر والوں نے جونہی دیکھا کہ نیچے پہاڑ کے دامن پر جو مکانات تھے اُن میں آگ لگادی گئی ہے تو جو لوگ زیادہ ہمت والے نہ تھے انھوں نے صلح کا پیغام بھیجا، بادشاہ نے اس شرط پر کہ جو باغی اطاعت قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں وہ بادشاہ کے حوالے کیے جائیں، فینانہ کے لوگوں کو امان دے دی۔

اس کے بعد عبدالرحمٰن نے جبل الشلیر کے سخت اور دشوار علاقوں کا دورہ کیا، یہاں بھی جس قدر قلعوں میں وہاں کے سردار جمع ہوگئے تھے، اُنھوں نے بلا استثنا اطاعت
قبول کی، یہاں عبدالرحمٰن کو خبر پہنچی کہ ابن حفصون مدینۃ البیرہ پر حملہ کرنے کو ہے، امیر نے سنتے (۳۸۸
ہی البیرہ کو فوج کمک روانہ کی، البیرہ میں جو شاہی فوج پہلے سے موجود تھی، اس کمک کے پہنچتے ہی دشمن پر ٹوٹ پڑی، اور غرناطہ سے نزدیک ایک مقام پر دشمن کو شکست دیکر ابن حفصون کے پوتے کو گرفتار کرلیا۔

اسی اثنا میں عبدالرحمٰن نے حصن شبلیس کا محاصرہ کیا جہاں متعدد قلعوں کے عیسائی
پناہ لینے کو جمع ہو گئے تھے، پندرہ دن تک محاصرہ جاری رہا، اس کے بعد اسپینی مسلمانوں نے
بادشاہ سے عفو تقصیر اور پناہ چاہی اور وعدہ کیا کہ جو لوگ قلعہ میں عیسائی ہیں وہ بادشاہ کے
حوالے کر دیئے جائیں گے، اس وعدہ پر اُن کو امان دی گئی، مسلمانوں نے عیسائیوں کو بادشاہ
کے حوالے کر دیا اور وہ سب قتل کر دیے گئے۔

حصن شبلیس کو زیر کرنے کے بعد شلوبینہ (یا شلوبانیہ) سے گذر کر البیرہ کی طرف کوچ
کرنے میں عبدالرحمٰن نے دو بلند قلعوں کو جن میں سے ایک کا نام قشنت اشتیبان اور دوسرے
کا نام نبہ فراط تھا فتح کیا، یہ دونوں قلعے آشیانہ عقاب کہلاتے تھے ان میں رہزن اور قزاق
بسنے لگے تھے، البیرہ اور غرناطہ کے حق میں یہ لوگ ہر وقت خوف اور خطرے کا موجب
رہا کرتے تھے۔

البیرہ اور جیان کے صوبوں میں امن و امان قائم کرنے کے لیے تین ماہ کی فوج کشی کافی
ہوئی، اور اس کے بعد یہ صوبے رہزنوں اور قزاقوں سے پاک ہو گئے۔

اب اشبیلیہ کے خود سر سرداروں کی باری آئی، ابراہیم بن حجاج کا جب انتقال ہوا تھا
تو اس کا بڑا لڑکا عبدالرحمٰن بن ابراہیم اشبیلیہ میں باپ کا جانشین، اور چھوٹا لڑکا محمد بن ابراہیم
قرمونہ کا حاکم تھا، ۹۱۳ء/۳۰۱ھ میں عبدالرحمٰن بن ابراہیم نے انتقال کیا، اُس کے مرنے
پر محمد بن ابراہیم نے جو شاعروں کا بڑا قدردان اور باپ کی طرح ان کو انعام و اکرام دینے
میں فیاض تھا، یہ چاہا کہ قرمونہ کے علاوہ اشبیلیہ پر بھی حکومت کرنے لگے، لیکن اس میں کامیابی
نہ ہوئی، محمد بن ابراہیم کا میلانِ طبیعت اشبیلیہ میں مطلق العنان بن کر حکومت کرنے کا تھا،
مگر اشبیلیہ کے لوگ آزاد رہ کر خود اپنے اوپر حکومت کرنا چاہتے تھے، محمد بن ابراہیم پر یہ الزام
لگایا گیا جو غالباً غلط تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو زہر دیا تھا، قصہ کوتاہ اشبیلیہ والوں
نے احمد بن مسلمہ کو جو محمد بن ابراہیم کا عموزاد تھا، اپنا حاکم منتخب کر لیا، محمد بن ابراہیم کو اس
کا سخت ملال ہوا، چوں کہ احمد بن مسلمہ کا تقرر ابھی تک عبدالرحمٰن نے منظور نہیں کیا تھا
اور ایک فوج بھی اشبیلیہ کے محاصرہ کو امیر کی طرف سے روانہ ہو چکی تھی، اس لیے محمد بن ابراہیم

نے قرطبہ میں حاضر ہوکر امیر کے سامنے اپنی خدمات پیش کیں، امیر نے محمد بن ابراہیم کی درخواست منظور کی۔

امیر عبدالرحمٰن کی فوج نے اشبیلیہ کا محاصرہ اس قدر سختی سے کیا کہ احمد بن مسلمہ کو مدد حاصل کرنے کی ضرورت ہوئی اور اُس نے ابن حفصون سے مدد چاہی، ابن حفصون کے لیے یہ دوسرا موقع آیا کہ رؤساء عرب کی امداد ایسی حالت میں کرے جبکہ مروانی سلطنت کی طرف سے اُن پر حملے ہوتے ہوں، عمر بن حفصون کمک کے لیے اٹھا مگر اب تقدیر نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، اشبیلیہ پہنچکر عربی سرداروں کے ساتھ شریک ہوا، اور شاہی فوج پر جس کا صدر مقام وادی الکبیر کے داہنے کنارے پر ایک قلعہ تھا، حملہ کیا، لیکن ایسی سخت شکست کھائی کہ اشبیلیہ والوں کو اُن کے حال پر چھوڑ کر ببشتر کے قلعہ کی طرف تیزی سے بھاگا۔

احمد بن مسلمہ اور دیگر سردارانِ اشبیلیہ نے سمجھ لیا کہ اب زیادہ مقابلہ فضول ہوگا اس لیے بدر کے پاس پیغام صلح بھیجا، بدر حال ہی میں لشکر میں آیا تھا، اہل اشبیلیہ نے بدر سے اس بات کا وعدہ لے کر کہ اُن کے طور طریقے وہی رہیں گے جو ابن حجاج کے وقت میں تھے ۱۰/ دسمبر ۹۱۳ء ۱۱/ جمادی الاول ۳۰۱ھ کو اپنے شہر کے دروازے شاہی فوج پر کھول دیے (۲۸۹)

محمد بن ابراہیم کو یقین تھا کہ اشبیلیہ پر امیر عبدالرحمٰن کی فتح اس کے حق میں مفید ثابت ہوگی، شہر کے متعلق جو گفت و شنید امیر اور اہل اشبیلیہ کے درمیان ہوئی تھی اُس سے محمد بن ابراہیم کو بالکل بے خبر رکھا گیا تھا، غرض جب بدر کے پاس سے اُس کے نام اس مضمون کا خط آیا کہ "اشبیلیہ فتح ہوچکا ہے محمد بن ابراہیم کو چاہیئے کہ قرطبہ سے چلا جائے" تو اُسے سخت حیرت ہوئی اور نہایت غصّے کی حالت میں انتقام کے ارادے سے وہ قرطبہ سے قرمونہ روانہ ہوگیا، راستے میں قرطبہ والوں کے کچھ مواشی پکڑ لیے اور قرمونہ میں قلعہ نشین ہوکر سب کے مقابلہ پر آمادہ ہوگیا۔

امیر عبدالرحمٰن کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے بہت نرمی اور صلاحیت سے کام لیا محمد بن ابراہیم کے پاس ایک افسر کے ذریعے یہ کہلا بھجوایا کہ "اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ

قلعوں کے مالک رعایا کا مال لُوٹ لیا کرتے تھے اور کوئی ان کا کچھ نہ کر سکتا تھا، پس تم پر فرض ہے کہ جس جس کے مواشی تم نے پکڑ لیے ہیں اُن کو واپس کر دو۔ محمد بن ابراہیم نے یہ حکم سنتے ہی جن کے مواشی پکڑ لیے تھے اُن کو واپس کر دیے۔

مگر محمد بن ابراہیم باوجود ذہین اور ہوشیار ہونے کے یہ نہ سمجھا کہ زمانہ فی الحقیقت بدل چکا ہے، اتنا سنتے ہی کہ اشبیلیہ کی فصیل امیر کے حکم سے منہدم کر دی گئی ہے قبضہ کرنے کی غرض سے اشبیلیہ پر حملہ کر دیا، یہ حرکت سخت کوتاہ اندیشی کی تھی اور اُس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

امیر عبدالرحمن نے یہاں تک تحمل کیا کہ ایک مرتبہ پھر قاصد سمجھانے کے لیے بھیجا اور کہا کہ "دیکھو تم کو پھر متنبہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے خیالات بہت پرانی قسم کے ہیں، اب بھی اُن سے پرہیز کرو" یہ قاصد قاسم بن ولید کلبی تھا، جو قرطبہ میں صاحب الشرطہ تھا، اس کام کے لیے قاسم سے بہتر دوسرا شخص نہ ہو سکتا تھا، کیونکہ وہ امیر عبداللہ کے زمانہ میں چند ماہ تک ابراہیم بن حجاج کے ساتھ حاکم اشبیلیہ رہ چکا تھا، اور محمد بن ابراہیم کا پُرانا ملنے والا تھا، حال میں جس وقت اشبیلیہ کا محاصرہ ہو رہا تھا تو یہ دونوں ایک ہی جگہ مقیم تھے۔

امیر عبدالرحمن نے جو کچھ سوچا تھا وہی ہوا قاسم نے ایسی لیاقت اور ہوشیاری سے کام لیا کہ آخر کار محمد بن ابراہیم قرطبہ حاضر ہونے پر راضی ہو گیا، مگر اس شرط کے ساتھ کہ قرمونہ میں اس کا ایک نائب حکومت کرے، امیر نے یہ شرط منظور کر لی، اور محمد بن ابراہیم قرطبہ میں ۱۴ اپریل ۹۱۳ء (۱۵ رمضان ۳۰۰ھ) کو بہت سے ہمراہیوں کے ساتھ چلا آیا، امیر بہت خاطر و مدارات کے ساتھ اس سے پیش آیا، اور اسکے خادموں اور ملازموں کو انعام و اکرام دیا، خود محمد کو قلمدان وزارت دے کر حاجب کبیر کا خطاب دیا اور ایک نئی جنگ میں جو شروع ہونے والی تھی اُسے شریک ہونے کا حکم دیا

امیر عبدالرحمن نے یہ عزم کر لیا تھا کہ امیر عبداللہ کے زمانے سے جو پرانی بغاوت چلی آتی ہے اس کا مقابلہ ٹھیک اس جگہ کرے، جہاں سے وہ شروع اور پیدا ہوئی تھی، یعنی ریّہ کے پہاڑی علاقے کی اچھی طرح خبر لے، امیر کو یہ اُمید نہ تھی کہ جس طرح پچھلے سال البیرہ اور ۹۰۶ء

جیان کے صوبوں میں جلد جلد کامیابی ہوئی تھی کوہستان ریہ میں بھی اسی طرح کامیابی ہو جائے گی، کیونکہ ریہ کے علاقے میں جہاں اب مسلمان باقی نہ تھے صرف عیسائیوں سے مقابلہ تھا، اور یہ معلوم تھا کہ اسپینی عیسائی مقابلہ کے وقت زیادہ سختی اور ثابت قدمی سے کام لیتے ہیں، مگر اُس کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ ان عیسائیوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جب اُن کو سمجھایا جائے گا کہ امیر جس قدر مستقل مزاج ہے ویسا ہی عادل اور منصف بھی ہے تو وہ اطاعت قبول کرلیں گے۔

امیر عبدالرحمٰن اور اُس کی حکومت کے بارے میں اس امر کا اعتراف مقتضائے انصاف ہے کہ جو عیسائی تخت کی اطاعت اختیار کرلیتے تھے اُن کے ساتھ انتہا درجے کی رعایت برتی جاتی تھی، اس کی مثال میں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے، ایک عیسائی امیر زادہ تھا جس کو اطاعت قبول کئے ہوئے ایک سال گذرا تھا، اس عیسائی کی ایک حرم تھی، اس حرم نے عیسائی امیرزادے سے قطع تعلق کرنے کی غرض سے قاضی سے فریاد کی کہ "میں مسلمان ہوں اور چونکہ کوئی عیسائی کسی مسلمان عورت کو اپنی حرم نہیں بنا سکتا، اس لیے مجھے اس شخص سے آزاد سمجھا جائے"۔

حاجب بدر کو جس وقت معلوم ہوا کہ اس عورت نے قاضی کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا ہے تو فوراً ایک قاصد کی معرفت قاضی کو کہلا بھیجا کہ "جس عیسائی امیر زادے کی یہ حرم ہے وہ ازروئے عہد نامہ قرطبہ میں مقیم ہے عہدنامے کی شرائط میں سر مو فرق نہیں آسکتا۔ اور شرائط کی پابندی ایک ایسا فرض ہے جس کا حال آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے، پس اس کنیز کو اس کے مالک سے علیحدہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے"

قاضی صاحب حاجب کا یہ پیغام سن کر حیرت میں ہوئے اسمجھے کہ حاجب، قاضی کے اختیارات میں دخل دینا چاہتا ہے، پہلے تو انھوں نے اس بات کا اطمینان کیا کہ پیغام بھیجنے والا فی الحقیقت میں حاجب بدر ہے کوئی اور نہیں ہے، جب اطمینان ہوگیا تو انھوں نے قاصد سے کہا کہ اپنے آقا سے کہہ دینا کہ "عہد وقسم کا لحاظ کرنا ہر حال میں میرا فرض ہے خواہ اس میں میری ہی ذات سے کوئی مقدمہ متعلق کیوں نہ ہو، اس عورت نے جو مسلمان ہے

اور آزاد ہے جس بات کا دعویٰ کیا ہے اُس کا میں فیصلہ کرونگا، بشرطیکہ اس کام میں مجھے
کوئی روکے نہیں "
حاجب بدر نے جب یہ جواب سُنا تو اُسے قاضی صاحب کی نیت معلوم ہوگئی، اور
دوبارہ قاضی صاحب کو کہلا بھجوایا "میں نہیں چاہتا کہ عدالت کے اختیارات میں دخل دوں
مجھ کو حق حاصل نہیں ہے کہ کوئی بات ایسی آپ سے چاہوں جو عدل و انصاف کے خلاف
ہو، مجھے صرف یہ کہنا تھا کہ اس عیسائی مدعا علیہ سے ایک عہدنامہ ہوچکا ہے، فیصلہ
کے وقت اُس کے ایسے حقوق کا آپ لحاظ کریں گے جو از روئے عہدنامہ اُسے حاصل
ہیں، یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ عیسائیوں کیساتھ انصاف کرنا آپ کا فرض ہے، رہا فیصلہ
کرنا، وہ آپ کے اختیار میں ہے "
یہ دریافت نہیں ہوتا کہ قاضی صاحب نے بدر کی اس دلیل کو تسلیم کیا، یا قانون کے
مقابلہ میں عہدناموں کو بالائے طاق رکھا، بہرکیف بدر نے اس معاملہ میں جو کچھ کیا، اُس
سے حکومت کا عدل و انصاف ثابت ہوتا ہے، اور ظاہر ہوتا ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ
کس قدر سلوک اور رعایت مدِنظر تھی، سلطنت کی یہ پالیسی نہایت درجہ عقل و انصاف (۳۹۱)
پر مبنی تھی، اور عبدالرحمٰن کے مزاج اور طبیعت کے بالکل موافق تھی، بادشاہ میں مذہبی تعصب
اس قدر کم تھا کہ ایک موقع پر اُس نے عہدۂ قضا پر ایک ایسے نومسلم کو مقرر کرنا چاہا جس
کے ماں باپ ابھی تک عیسائی تھے، فقیہوں نے بہت مشکل سے بادشاہ کو اس قصد سے باز رکھا
کوہستانِ ریہ کے عیسائی سرداروں کے متعلق امیر عبدالرحمٰن کی توقعات غلط نہ نکلیں
اُن میں سے بہتوں نے اطاعت قبول کی اور بادشاہ نے اُنھیں امان دی، قلعہ طلوکش
میں ابن حفصون کے موجود ہونے سے وہاں کی فوج کو بہت ڈھارس ہوگئی اور اس نے
شاہی فوج کا ایسا مقابلہ کیا کہ قلعہ فتح نہ ہو سکا، ایک موقع پر بہت خون ریزی بھی ہوئی اس
خون ریزی کا موقع ایک نقب تھی جو شاہی فوج نے قلعہ کی دیوار میں لگائی تھی، ایک
اور قلعہ کے لوگوں نے بھی سخت مقابلہ کیا، عبدالرحمٰن نے قسم کھائی کہ جب تک قلعہ فتح نہ
ہو جائے گا دانہ پانی حرام ہے، لیکن اس کی تکلیف زیادہ نہ اُٹھانی پڑی، یہ قلعہ اور اس کے

ساتھ ایک اور قلعہ جلد فتح ہو گیا، سرکاری جہازوں نے بھی عمدہ خدمت اس طور پر انجام دی کہ چند جہاز جو ابن حفصون کے لیے رسد اور غلہ بھر کر لا رہے تھے اُن کو گرفتار کر لیا۔

ابن حفصون اب ایسا تنگ رہتا تھا کہ کھانے پینے کی چیزیں بھی اُسے افریقہ سے منگوانی پڑتی تھیں۔

امیر عبدالرحمٰن جب قرطبہ کو واپس ہونے لگا تو جزیرۃ الخضراء سے ہوتا ہوا صوبہ شذونہ اور مورور میں آیا اور یہاں سے قرمونہ کا خاص طور پر معائنہ کرنے کے لیے بڑھا، ۲۸ جون ۹۱۴ء ۲۳ ذیقعد ۳۰۱ھ کو قرمونہ کے دروازے کے سامنے پہنچا۔

قرمونہ میں محمد بن ابراہیم بن حجاج کا نائب حبیب بغاوت شروع کر چکا تھا، یہ دریافت نہیں ہوتا کہ یہ بغاوت اُس نے خود کی تھی، یا محمد بن ابراہیم سے اشارہ پا کر کی تھی، بعض مورخوں کا بیان ہے کہ محمد بن ابراہیم کے ایما سے یہ بغاوت ہوئی تھی، امیر عبدالرحمٰن کو بھی یہی یقین تھا اس لیے محمد بن ابراہیم کو وزارت سے معزول کر کے قید کر دیا۔

اب قرمونہ کا محاصرہ شروع ہوا، حبیب نے ۲۰ دن تک شاہی فوج کا مقابلہ کیا، مگر پھر مجبور ہوا اور اطاعت قبول کر لی، محمد بن ابراہیم چونکہ اب ایک عضو معطل ہو گیا تھا۔ اس لیے اُسے قید سے رہا کر دیا، لیکن یہ آزادی اُسے بہت دن نصیب نہ رہی اپریل ۹۱۵ء شوال ۳۰۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا، اور بنی حجاج اشبیلیہ میں یہ آخری شخص تھا جس نے صفحۂ تاریخ پر اپنا کارنامہ لکھا۔

اسی سال امساکِ باراں کی وجہ سے ملک میں سخت قحط پڑا، تمام لڑائیاں بند ہو گئیں قرطبہ میں ہزارہا آدمی فاقوں سے مرنے لگے، اموات کی یہ کثرت تھی کہ مُردوں کو دفن کرنے کو بھی آدمی نہ ملتے تھے، امیر عبدالرحمٰن اور اُس کے وزراء نے حتی الامکان رعایا کی اِس مصیبت کو رفع کرنا چاہا، لیکن ایسے باغیوں کو روکنا مشکل تھا جو بھوک سے مجبور ہو کر پہاڑوں سے اتر کر دیس میں جہاں کہیں کچھ تھوڑا بہت غلہ ہوتا تھا، لوٹ کر پھر پہاڑوں میں جا چھپتے تھے۔ (۳۹۲)

۹۱۶ء (۳۰۳ھ) میں مشرق میں اوریولہ، اور مغرب میں لبلہ فتح کر لیا گیا

امیر عبدالرحمن نے اب اتنی قوت حاصل کرلی کہ جنوب کی بغاوتوں کو فرو کر کے شمال کے باغی عیسائیوں کی طرف فوجیں روانہ کرے، اسی زمانہ میں عمر بن حفصون مرگیا (۳۰۴ھ ۹۱۷ء) اور مرواتی سلطنت کو ایک پرانے باغی اور دشمن سے نجات ملی۔

قرطبہ کے لوگ (اس قزاق کی موت پر) بہت خوش ہوئے اور ملک سے بغاوت اُٹھ جانے کا اب ان کو یقین ہوگیا۔

اس سورما اسپینی کو جس نے تیس برس سے زائد اپنے وطن کے فاتحوں کا مقابلہ کر کے اُن کو ہیچ سمجھا تھا، جس کے خوف سے بنی اُمیہ اکثر تخت پر بیٹھے ہوئے لرز اُٹھتے تھے، خدا کی جناب میں شکر گذار ہونا چاہیے تھا کہ اس کو اپنے وقت پر مرنے کی اجازت ملی اور ایسے وقت مرا کہ اپنے فریق کا بُرا انجام جو دل شکن ہوتا، دیکھنا نصیب نہ ہوا، وہ بغیر مغلوب و مفتوح ہوئے مرا، اور جو سامان (باغیوں کی سرکوبی کے لیے) اس وقت پیدا ہو چلے تھے ان کو دیکھتے ہوئے ابن حفصون کی اس سے زیادہ کیا تمنا ہوسکتی تھی کہ خیریت کے ساتھ بستر پر دم نکلے اپنے باپ دادا کے ملک کو آزاد کرنا اور اپنی فاتحے ایک حکمراں خاندان کا سلسلہ چلانا اس کی قسمت میں نہ تھا، مگر باوجود اس کے وہ ایک ہیرو کی شکل میں ہمارے (یعنی عیسائیوں کے) سامنے آتا ہے۔ جس کی مثل ملک اسپین نے وریاتھوس کے زمانے سے اب تک دوسرا پیدا نہ کیا تھا وریاتھوس وہ تھا جس نے قسم کھائی تھی کہ اپنے وطن اسپین کو رومانیوں کی حکومت سے آزاد کریگا۔

اسناد:- ابن القوطیہ ص ۷۴

ابن حیان ص ۸تا ۱۳، ۸۱ تا ۹۵، ۱۰۲ تا ۱۰۷

ابن عذاری جلد ۲ ص ۱۴۳، ۱۶۱ تا ۱۶۲، ۱۳۳ تا ۱۳۵

عریب جلد ۲ ص ۱۴۵ تا ۱۴۸

خوشانی ص ۱۴۳ تا ۱۴۷

ابن خلدون ص ۱۱ تا ۱۲

المجموعہ ص ۹۷

اخبار مجموعہ ص ۱۱۲

کتاب ثانی

اسپینی عیسائی اور اسپینی نو مُسلم

اٹھارویں فصل

۱ امیر عبدالرحمٰن کو کامل اختیارات کا حاصل ہو جانا

جبال ریہ میں ابھی دس برس اور لڑائی جاری رہی، عمر بن حفصون نے چار لڑکے چھوڑے ٣٩٣
تھے۔ جعفر، سلیمان، عبدالرحمٰن اور حفص یہ سب باپ کے ساتھ مرتد یعنی عیسائی ہو چکے
تھے) ان میں سوائے ایک لڑکے کے سب میں باپ کی سی دلیری و مردانگی تھی
مگر باپ کی سی لیاقت کسی میں نہ تھی، ۹۱۸ء کے ماہِ مارچ (رمضان ۳۰۵ھ) میں
منجھلے لڑکے سلیمان کو مجبوراً شاہی فوج میں بھرتی اور عیسائی بادشاہ لیون اور نبرہ
کے مقابلہ میں لڑائی پر جانا پڑا، سنجھلا لڑکا عبدالرحمٰن جو قلعہ طلوس میں حکومت کرتا تھا۔
جنگجو طبیعت کا آدمی نہ تھا، بلکہ علم سے مناسبت رکھتا تھا، اُس نے تخت کی اطاعت
قبول کر لی اور وہ قرطبہ بھیج دیا گیا، یہاں ساری عمر قلمی کتابیں نقل کرنے میں بسر کر دی سب
سے بڑے لڑکے جعفر کی قوت کم سے کم امیر عبدالرحمٰن کی نظر میں اب تک بڑھی ہوئی تھی،
کیونکہ ۹۱۹ء (۳۰۶ھ) میں ببشتر کے محاصرے کے وقت امیر نے اس کو اتنا بڑا

آدمی سمجھا کہ بالمشافہ اس سے گفتگو کی، جعفر نے سالانہ خراج ادا کرنا اور ضمانت میں اپنے آدمی پیش کرنے چاہے، امیر نے اُس کی درخواست منظور کر لی۔

اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد جعفر نے ایک ایسی غلطی کی جو اُس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی، جعفر کا ہمیشہ سے خیال تھا کہ باپ کا یہ اعلان کرنا کہ وہ اور اس کے خاندان کے لوگ عیسائی ہو گئے ہیں سخت کوتاہ اندیشی کی بات تھی، یہ خیال کسی قدر صحیح بھی تھا، کیونکہ ابن حفصون کے اس تبدیل مذہب نے اسپینی مسلمانوں کو فوراً اس کا دشمن بنا دیا تھا، لیکن اب اس کا کوئی علاج نہ تھا، اس حالت کو نہ ابن حفصون اور نہ اُس کے لڑکے بدل سکتے تھے، بجز عیسائی رہنے کے اب کوئی چارہ نہ تھا، موت اور زندگی دونوں میں عیسائیوں ہی کا ساتھ تھا، کیونکہ ملک کو غیروں کی حکومت سے آزاد کرنے کی دلی تمنا اب عیسائیوں ہی میں باقی تھی، اسپینی مسلمان اس معاملہ میں عیسائیوں کو دھوکا دے دیتے تھے قلعہ بلدہ کے محاصرے میں یہ بات بخوبی ثابت ہو چکی تھی، جس وقت شاہی فوج نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا تو محصور فوج کا وہ حصہ جو مسلمان تھا شاہی فوج سے جا ملا، اور قلعہ فتح ہونے پر عیسائیوں کو قتل ہونا پڑا، ایک عیسائی بھی زندہ نہ چھوڑا گیا، بہر کیف جعفر نے حالات کو صحیح طور پر نہ سمجھا وہ اس یقین میں رہا کہ اسپینی مسلمانوں سے اب بھی مصالحت ہو سکتی ہے، اسی نیت سے اس نے پھر مسلمان ہو جانے کا قصد ظاہر کیا، اس ارادے کا ظاہر کرنا اس کی ہلاکت کا باعث ہو گیا، عیسائی فوج کو جو اس کے تحت میں تھی ایک مسلمان کی ماتحتی سے سخت کراہت محسوس ہوئی فوراً بغاوت
۹۴ کر دی، اور جعفر کے بھائی سلیمان کے اشارہ پر جعفر کو قتل کر دیا[1] (۳۰۸ھ ۹۲۰ء) سلیمان

---

[1] جو یورپین مورخین اعتراضاً لکھا کرتے ہیں کہ اندلس میں مرتد کو قتل کر دیا جاتا تھا، وہ ذرا دیکھیں کہ خود ان کے ہم مذہب کیا کرتے ہیں! جعفر غریب مسلمان نہیں ہوتا بلکہ صرف ارادہ ہی کرتا ہے کہ فوراً سب دیندار عیسائی مشتعل ہو جاتے ہیں، بغاوت شروع ہو جاتی ہے اور مذہب کے شیدائی عیسائیوں کے ہاتھوں بے گناہ جعفر کا خون ہو جاتا ہے، بات یہ ہے کہ انسان کو دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آ جاتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر دکھائی نہیں دیتا۔ (اسٹینلے)

اس وقت ببشتر کے قلعے سے قریب ہی کہیں مقیم تھا جعفر کے مارے جانے پر فوج نے سلیمان کو ببشتر کا حاکم مان لیا۔

ببشتر میں سلیمان کا زمانۂ حکومت پر از آفات ثابت ہوا، اور یہ مقام اب فتنہ فساد کا مرکز بن گیا، سلیمان کو اس تمام عرصہ میں ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا عیسائیوں میں بغاوت ہوئی، سلیمان ببشتر سے نکال دیا گیا باغیوں نے قید خانہ توڑ کر قیدیوں کو آزاد کیا اور سلیمان کا محل لوٹ لیا، لیکن چند روز کے بعد سلیمان کے ہوا خواہ پھر ببشتر پہنچ گئے سلیمان بھی بھیس بدل کر قلعہ میں داخل ہوا، اور ببشتر کے رہنے والوں کو لوٹ کا لالچ دلا کر ہتھیار باندھنے پر آمادہ کیا، اس طریقہ سے سلیمان پھر ببشتر پر حکومت کرنے لگا چونکہ انتقام لینا فرض تھا، اس لیے اپنے تمام مخالفین کو (جو عیسائی تھے) قتل کر ڈالا، چنانچہ اسی زمانہ کے ایک مسلمان مورخ نے لکھا ہے کہ "اللہ کو منظور ہوا کہ ایک کافر دوسرے کافر کا گلا کاٹے تا کہ دنیا سے ان کا تخم غارت ہو"

سلیمان دوبارہ ببشتر کا حاکم ہو کر بہت دن نہ جیا، ایک ہنگامے میں کسی نے اسے گھوڑے سے نیچے گرا دیا ۱۶ فروری ۹۲۷ء (۳۰ ذیقعد ۳۱۴ھ) تخت مردانیہ کے وفاداروں نے اسے وہیں قتل کر دیا[1]، اور اس کے مردے سے بھی اس طرح انتقام لیا کہ لاش سے سر اور ہاتھ پاؤں کاٹ کر علیحدہ کر دیے

سلیمان کی ہلاکت کے بعد اس کا بھائی حفص ببشتر کا حاکم ہوا، لیکن اب اس خاندان کی تباہی کی ناگزیر ساعت آن پہنچی تھی، جون ۹۲۷ء (۳۱۵ھ) میں امیر عبدالرحمٰن نے ببشتر کا محاصرہ کیا اور مصمم قصد کر لیا کہ جب تک قلعہ فتح نہ ہو جائیگا محاصرہ نہ اٹھایا جائیگا مٹی کے اونچے اونچے مورچے اور پشتے قلعہ ببشتر کے مقابل چاروں طرف قائم کیے قریب ہی ایک برباد شدہ رومانی قلعہ تھا، اس کی مرمت کرائی اور قلعہ ببشتر اور اس کے شہر کو چاروں

---

[1] اب ملک اسپین ایسے زمانہ سے گذر رہا تھا جبکہ تخت مردانیہ کے وفادار عیسائی اور مسلمان دونوں تھے معلوم نہیں سلیمان کو کس نے قتل کیا مترجم اردو

طرف سے اس قلعہ اپنی زد میں کر لیا کہ آمد و رفت بالکل بند ہو گئی، چھ مہینے تک حفص اسی حالتِ حصار میں رہا، آخر کار ۱۲ جنوری ۹۲۸ء (۱۶ ذیقعدہ ۳۱۵ھ) جمعہ کے دن امیر عبدالرحمٰن کی فوج نے ببشتر فتح کر لیا، حفص اور ببشتر کے باشندے زیر حراست قرطبہ روانہ کر دیے گئے حفص نے بعد کو بادشاہی فوج میں شامل ہو کر شاہی خدمات انجام دیں۔

حفص کی بہن ارجنتیا ایک مسیحی خانقاہ میں گوشہ نشین ہو گئی، یہ اگر چاہتی تو یہاں عافیت کے ساتھ اپنی زندگی گذار دیتی، مگر اُس کو اِس گمنامی کی حالت میں زندہ رہنا منظور نہ ہوا، مذہبی تعصب حد سے زیادہ رکھتی تھی اور ایک مدت سے تاجِ شہادت سر پر رکھنے کی آرزو مند تھی اس نے بار بار اپنا عیسائی ہونا حکام پر ظاہر کر کے انھیں اشتعال دیا، شرع[1] کے مطابق اور قانون کی نظر میں وہ مسلمہ تھی، کیونکہ جس وقت وہ پیدا ہوئی تھی تو اس کا باپ (ابن حفصون) مسلمان تھا، حکام وقت نے ارتداد کے جرم میں اُس کی نسبت قتل کا حکم سنایا[2]۔ ارجنتیا نے ہمت اور استقلال سے

---

[1] یہ غلط ہے شریعت کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جس کی رُو سے عیسائی والدین کی اولاد مسلمان سمجھی جائے خواہ پیدائش کے وقت اس کے ماں باپ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، ماں باپ کے زیر سایہ جس مذہب میں اولاد نے نشو و نما پائی ہے، بلوغت تک اُس کا وہی مذہب سمجھا جاتا ہے بالغ ہونے کے بعد اختیار ہے کہ چاہے جو مذہب اختیار کرے، اور یہاں تو صورت ہی دوسری ہے، ارجنتیا بالغ ہے اور اسکا اپنا اقرار و اصرار عیسویت پر موجود ہے، پھر کونسا قانون اس کو "مسلمہ" قرار دے گا۔ اسمٰعیل

[2] ہم پہلے بھی ایک حاشیہ میں بدلائل اس بات کو ثابت کر چکے ہیں کہ شریعتِ اسلام میں محض ارتداد کی سزا قتل ہرگز نہیں جب تک کہ اُس کے ساتھ حکومتِ وقت سے بغاوت، سرکشی اور فتنہ انگیزی شامل نہ ہو، اور اس صورت میں یہ سزا بغاوت اور فتنہ انگیزی کی ہو گی نہ کہ ارتداد کی، شریعتِ اسلامیہ کا قانون یہی ہے، اور قوی قرائن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسپین میں بھی صرف انہی مرتدین کو سزائے قتل دی جاتی تھی جو ارتداد کے ساتھ باغی بھی ہو جاتے تھے، حکومت کے خلاف سازشیں کرتے تھے اور لوگوں کو بغاوت پر اکساتے تھے، ارجنتیا نے بھی غالباً یہی حرکات کی ہوں گی، جن کے باعث وہ قابل گردن زدنی ٹھہری اس کے حد سے بڑھے ہوئے مذہبی تعصب کی وجہ سے یہ بات بہت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے (باقی بر صفحہ آئندہ)

جان دی اور ثابت کر دیا کہ دلیری اور ہمت میں عمر بن حفصون کی بیٹی تھی (۹۳۱ء ۳۱۹ھ)

ببشتر کی فتح کے بعد امیر عبدالرحمٰن بنفس نفیس ببشتر آیا تاکہ اُس قلعہ کا ملاحظہ کرے جس نے پچاس برس تک چار بادشاہوں[1] کے حملوں سے برابر اپنے کو محفوظ رکھا تھا، امیر نے جس وقت اس قلعہ کی بلند فصیل پر کھڑے ہو کر اس کے مورچوں اور برجوں کو، اور اُس پہاڑ کو دیکھا جس پر یہ قلعہ واقع ہوا تھا، اور پہاڑ کے چاروں طرف نہایت عمیق غاروں پر نظر ڈالی، تو کہنے لگا کہ واقعی اس سے بڑھ کر کوئی مضبوط قلعہ دنیا میں نہ ہوگا۔"

اس زبردست قلعہ کی فتح پر امیر عبدالرحمٰن خدا کی جناب میں سجدۂ شکر بجا لایا، مورخوں نے لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن جتنے دن ببشتر میں رہا روزے رکھتا رہا، لیکن اس کی نیک نامی اور شہرت کے لیے یہ بات افسوسناک تھی کہ اُس نے بالکل مجبور ہو کر ایک ایسا حکم دیا جو نہ دینا چاہیے تھا، اس موقع پر چند فقیہ بھی بادشاہ کے ہمراہ ایسے قلعے کو دیکھنے آئے تھے جو نصرانیت کا ستون محکم اور پشت پناہ تھا، عیسائی مذہب سے اِن فقیہوں کو نفرت تھی اور اب انھوں نے عبدالرحمٰن کو اس وقت تک چین نہ لینے دیا جب تک اُس سے یہ حکم نہ لے لیا کہ ابن حفصون اور جعفر کی قبریں اکھیڑ ڈالی جائیں۔

جب یہ قبریں کھولی گئیں تو ان متعصب فقیہوں نے دیکھا کہ وہ دونوں مرنے والے عیسائیوں کے طریقے کے مطابق اپنی اپنی لحد میں پڑے ہوئے ہیں۔ مگر ان مبارزوں کے خواب مرگ میں مخل ہونے پر ان فقیہوں کو شرم نہ آئی[2]۔ اُن کے حکم سے لاشیں باہر نکلوائی گئیں، اور اُن کو گھسیٹتے ہو

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اگر محض ارتداد کی سزا اسپین میں قتل ہوتی تو پھر اسی اجنبیا کے دونوں بھائی سلیمان اور حفص جنھوں نے شاہی فوج میں نوکری کر لی تھی۔ سزا سے کس طرح بچ سکتے تھے، نیز میسرا بھائی عبدالرحمٰن جو خاص قرطبہ میں رہتا تھا۔ کیوں نہ قتل کیا گیا؟ اور ان تینوں بھائیوں کے متعلق ہرگز ثابت نہیں کہ انھوں نے دوبارہ اسلام اختیار کیا ہو۔ سملائل

[1] وہ چار بادشاہ یہ ہیں۔ محمد بن عبدالرحمٰن الاوسط۔ منذر بن محمد۔ عبداللہ بن محمد۔ عبدالرحمٰن ثالث۔ اس میں عبدالرحمٰن ثالث کا زمانہ بھی جس میں ببشتر فتح ہوا۔ محض اس لیے شامل کر لیا گیا ہے تاکہ ببشتر کی عظمت ثابت ہو۔ مترجم

[2] شرم کیوں آتی؛ اس زمانہ میں قزاقوں، مفسدوں اور باغیوں کے لیے یہ سزا کوئی غیر معمولی (باقی بر صفحۂ آئندہ)

قرطبہ بھیجے گئے، تاکہ صلیبوں پر انھیں میخوں سے جڑ دیا جائے، اسی زمانے کے ایک مورخ نے بہت خوش ہو کر لکھا ہے کہ "یہ لاشیں سلطنت کے بدخواہوں کے لیے عبرت اور مومنوں کے لیے خدا کے شکر کا موقع ہو گئیں"۔

عیسائیوں کے قبضے میں جس قدر قلعے تھے اب اُن سب نے جلد اطاعت قبول کر لی اور امیر کے حکم سے یہ سب قلعے مسمار کر دیے گئے صرف چند قلعے جو ملک کی حفاظت یا رعایا پر رعب قائم رکھنے کے لیے ضروری تھے باقی رکھے گئے، ان قلعوں میں جو بڑے لوگ رہتے تھے مگر سلطنت کے دشمن تھے وہ سب قرطبہ روانہ کر دیے گئے۔

علاقہ ریہ میں امن قائم کرنے کے زمانہ میں امیر نے ملک کے دوسرے حصّوں میں بھی بغاوتیں فرو کر دی تھیں، کوہستان باغہ میں ابن مستنہ کے لڑکے نے مجبوراً اپنے قلعے امیر کے حوالے کر دیے، صوبہ البیرہ میں بنی مہلب کے بربر قبیلے نے ہتھیار ڈال دیے منت ریسح جو جیان اور البیرہ کی سرحد پر واقع تھا فتح ہو گیا، یہ قلعہ ایک بلند اور سیدھے اٹھے ہوئے پہاڑ پر تھا، مدت سے اس نے سلطنت کو سخت پریشان کر رکھا تھا، عیسائی قزاقوں کا ایک گروہ یہاں رہتا تھا، اور پہاڑ سے نیچے اتر کر دیہات کو لوٹنا اور مسافروں کو جان سے مارنا اس کا پیشہ تھا، ۳۱۰ھ (۹۲۲ء) میں اس قلعہ کا ایک ماہ تک محاصرہ جاری رکھا گیا، مگر اس وقت کامیابی نہ ہوئی، چار برس کے بعد البتہ وہ فتح ہو گیا

۳۱۲ھ (۹۲۴ء) میں صوبہ بلنسیہ کے بہت سے باغیوں نے تخت کی اطاعت قبول کی، اسی سال امیر عبدالرحمٰن نے شمالی سرحد سے بنی قسی کے لوگوں کو ہٹا کر انھیں شاہی فوج میں شامل کیا یہ لوگ آپس کی لڑائیوں میں اور عیسائی بادشاہ نبرہ سے لڑتے لڑتے بہت کمزور ہو گئے تھے اسکے دو برس بعد امیر لشکر عبدالحمید نے بڑی کامیابی کیساتھ ایک لڑائی بنی ذی النون سے لڑی

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) سزا نہ تھی، عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کی تاریخوں میں اس قسم کی سزاؤں کا ذکر ملتا ہے، مصنف پادریوں اور فقیہوں دونوں کا دشمن معلوم ہوتا ہے، صرف فرق یہ ہے کہ پادریوں کی مذمت میں وہ اُن کا ادب ملحوظ رکھتا ہے اور فقیہوں کے لیے اس کا لحاظ اس کے نزدیک بے ضرورت ہے (مترجم

۳۹۶ جنوبی ملک کی طرف سے بےخوف و مطمئن ہونے کے بعد دیگر اطراف میں باغیوں کی سرکوبی کے لیے فوجیں روانہ کی گئیں، عبدالرحمٰن کی معرکہ آرائیاں بہت تیزی سے عمل میں آتی تھیں اور اُن کا نتیجہ قرار واقعی ہوتا تھا، ۳۱۶ھ ۹۲۸ء میں ایک مہم شیخ اسلمی کے مقابلہ کے لیے روانہ کی گئی، شیخ اسلمی ارضِ تدمیر میں لقنت اور قلیوشہ پر حکومت کرتا تھا، یہ عرب تھا اور بڑا ہی سخت آدمی تھا، دینداری کا بہت زعم تھا، زیادہ عمر ہو جانے کی وجہ سے علاقوں کا انتظام اپنے بیٹے کے سپرد کر کے بقولِ خود آخرت کی بہتری کے لیے عبادتِ الٰہی میں مصروف ہو گیا، صوم و صلوٰۃ ادا کرنے اور وعظ و تلقین سننے کا بڑا پابند تھا، مگر یہ باتیں بھی گاہے ماہے اُسے لوٹ مار کرنے سے باز نہ رکھتی تھیں، جب اس کا بیٹا ایک لڑائی میں وفاداران امیر کے ہاتھ سے قتل ہو گیا تو پھر دنیاداری اختیار کر کے اپنے علاقوں پر حکومت کرنے لگا، لیکن یہ حکومت زیادہ دن نہ رہی، امیر عبدالرحمٰن نے اپنے سپہ سالار احمد بن اسحاق کو شیخ کی طرف روانہ کیا، احمد نے اسلمی کے کل قلعوں پر قبضہ کر لیا، شیخ اسلمی نے مجبوراً اطاعت قبول کی اور امیر کے حکم سے وہ اور اس کے اہل و عیال سب قرطبہ روانہ کر دیے گئے، اسی زمانہ میں ماروہ اور شنترین کے علاقے شاہی فوج کے سامنے سرنگوں ہوئے، یہ فوج بھی امیر عبدالرحمٰن نے روانہ کی تھی، نوبت تلوار چلانے کی بھی نہیں آئی کہ سب نے مطیع ہونا منظور کر لیا، ایک سال گذرنے پر شہر باجہ نے بھی دو ہفتے کے محاصرہ کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

اب امیر عبدالرحمٰن نے حاکم اکشنوبہ خلف بن بکر کو دھمکی دی، خلف (یہ اسپینی مسلمان تھا) خراج ادا کرنے پر رضامند ہو گیا، اور اس سے پہلے خراج ادا نہ کرنے کی یہ معذرت کی کہ اس کے علاقے اور دارالامارت قرطبہ میں فاصلہ زیادہ ہے، خلف بن بکر کی رعایا خلف سے ایسا ہی اُنس رکھتی تھی جیسا کہ اُس کے بزرگوں سے اُس وقت کی رعایا رکھتی تھی، امیر عبدالرحمٰن نے یہ خیال کر کے کہ اگر اس کو مسندِ حکومت سے اُتار دیا تو ممکن ہے اکشنوبہ کی رعایا میں بددلی پیدا ہو، خلف کو اس کی حکومت پر برقرار رکھا اور لکھا کہ "تم ہماری رعیت نہیں بلکہ ہمارے مددگار ہو، مگر سالانہ خراج وقت پر ادا کرتے رہو اور کسی باغی کو اپنے علاقے میں آباد نہ ہونے دو"

بطلیوس پر دیگر مقامات کی طرح آسانی سے قبضہ نہ ہو سکا، یہاں ابن مروان جلیقی کی

اللاد حکومت کرتی تھی، مگر یہ مشہور شہر بھی ایک سال کے محاصرے کے بعد ۳۱۸ھ ۹۳۰ء میں فتح ہو گیا۔

اب امیر عبدالرحمٰن کو اپنے بزرگوں کے متروکے پر کلیتہً متصرف ہونے کے لیے صرف طلیطلہ کو مطیع کرنا باقی رہ گیا، اس شہر کے فتح کرنے کے لیے جو اہتمام کیا گیا اُس میں پہلی بات یہ تھی کہ فقیہوں کا ایک وفد اہل طلیطلہ کے پاس بھیجا تاکہ وہ اُن کو سمجھائے کہ تمام ملک مطیع ہو چکا ہے اب اُن کو بھی اطاعت قبول کر لینی چاہیے اور جمہوری حکومت کے خیالات اب دل سے دور کر دینے چاہئیں، مگر یہ وفد بیکار ثابت ہوا، اہل طلیطلہ آزادی پر جان فدا کرتے تھے، کبھی بنی قسی کی سرپرستی میں جو اسپینی مسلمان تھے، اور کبھی لیون کے عیسائی بادشاہوں کے ظل حمایت میں اسّی برس سے آزادی کے مزے لوٹ رہے تھے، فقیہوں کو اُنھوں نے ایسا جواب دیا جس میں غرور تو نہ تھا، لیکن اصل مطلب سے وہ دور تھا۔

امیر عبدالرحمٰن نے یہ دیکھ کر کہ طلیطلہ کے خلاف سخت ترین طریقے اختیار کرنے ہوں گے حسب عادت جلد اور قطعی فیصلے کیساتھ تمام تدابیر سوچ لیں، اس بڑی مہم کے لیے جو لشکر جمع کیا جا رہا تھا وہ ابھی پورا جمع بھی نہ ہوا تھا کہ مئی ۹۳۰ء (ربیع الآخر ۳۱۸ھ) میں اپنے وزیر سعید بن منذر کو اس حکم سے روانہ کیا کہ طلیطلہ پہنچتے ہی شہر کا محاصرہ کر لے، جون کے مہینے میں خود فوجوں کو لیے حملے کی غرض سے چلا، اور اپنا خیمہ دریائے غادہ کے کنارے قلعہ مورا کے قریب نصب کیا، مورا کے قلعے دار کو طلب کر کے حکم دیا کہ قلعہ فوراً ہمارے سپرد کیا جائے، قلعہ دار کے لیے امیر کا طلب کرنا ہی کافی تھا، یہ اسپینی مسلمان تھا، فوراً سمجھ گیا کہ امیر کے حکم سے سرتابی کرنی لاحاصل ہوگی، قلعہ بادشاہ کے حوالے کیا

عبدالرحمٰن نے قلعہ مورا میں کچھ فوج اُتار دی، اور اپنا خیمہ ایک پہاڑ پر جس کا اسپینی نام جرنکاسس (جبل القصب) تھا نصب کیا، اس کے بعد اِدھر اُدھر باغات اور تاکستان دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ باب طلیطلہ سے باہر دروازہ کے قریب ہی جو بڑا گورستان ہے اس کو اپنا صدر مقام قرار دے، چنانچہ باقی فوج اس وسیع گورستان کے احاطہ میں مقیم کر دی شہر کے قریب جس قدر کھیتیاں یا پھلوں کے درخت تھے اُن کو کٹوا دیا، اور جو گاؤں نزدیک

آباد تھے اُن میں آگ لگوادی، اور اب پوری طاقت کے ساتھ طلیطلہ پر حملہ شروع کیا۔ باوجود اس اہتمام کے شہر کا محاصرہ دو برس تک قائم رہا۔ امیر عبدالرحمٰن نے جس کی ہمت میں کوئی چیز فرق پیدا نہیں کر سکتی تھی کوہ جرنکاس (جبل القصب) پر ایک شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا جب چند روز میں یہ شہر تعمیر ہو گیا تو اس کا نام الفتح رکھا، اس شہر کے تعمیر کرنے کے معنی یہ تھے کہ گویا اہل طلیطلہ سے اس بات کا عہد و پیمان ہو گیا ہے کہ اب محاصرہ کبھی نہ اُٹھایا جائے گا

طلیطلہ کے محصورین اب بھی عیسائی بادشاہ لیون کی قوت پر بھروسا کیے ہوئے تھے لیکن اس عیسائی بادشاہ کی فوج کو شاہی فوج نے پہلے ہی شکست دے دی تھی، آخر کار اہل شہر کو قحط نے ایسا مجبور کیا کہ اُنھوں نے شہر کے دروازے کھول دیے

طلیطلہ والوں پر قبضہ پاکر امیر عبدالرحمٰن کو وہی خوشی ہوئی جو ببشتر کو فتح کرنے پر ہوئی تھی، فوراً خدا کے سامنے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ سجدۂ شکر بجالایا۔

اب وہ وقت آگیا کہ عرب، اسپینی اور بربر سب ہی مطیع و منقاد ہو کر شاہی سطوت اور دبدبے کے سامنے سر جھکادیں، شخصی اور مطلق العنان طرز حکومت کا رنگ اب پہلے سے بھی زیادہ جما، مگر کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلی، اس طرز حکومت کے مختلف النوع مخالفین نے برسوں کے مقابلے میں جو جو نقصانات اُٹھائے تھے وہ سب کے حق میں برابر نہ تھے، مثلاً عرب جو اسپین میں ذاتی آزادی کے ایسے ہی حامی تھے جیسے فرانس اور اٹلی میں نیوٹن قوم کے سردار رہ چکے تھے سب سے زیادہ نقصان میں رہے، وہ مجبور ہو گئے کہ اب ایک ایسے طرز حکومت کے مطیع ہو کر رہیں جو پہلے طریقۂ حکومت سے جسے اُنھوں نے غارت کرنا چاہا تھا کہیں زیادہ شخصی حیثیت رکھتا تھا، یہ جدید طرز حکومت ایسا تھا جو حقیقت میں اُن کا دشمن تھا۔ اور جو ملکی معاملات میں قوت اور اثر رکھنے سے اُن کو مستقل اور باقاعدہ طور پر محروم کرنا چاہتا تھا۔

غرض اس زمانہ سے جس قدر بادشاہ مروانیوں کے اسپین میں تخت پر بیٹھے، اُنکے ۳۹۸
عہد میں شرفاء عرب اپنی قوت اور حکومت کی بلندی سے برابر پستی میں گرتے چلے گئے، ان کا یہ انحطاط ایسا تھا جس سے اسپین کے اصلی باشندوں کی تسکین اور اشک شوئی

ہوئی، اور ساتھیں ایسا معلوم ہوا کہ گویا فتح انہی کی ہوئی ہے۔

چونکہ امیر عبداللہ کے زمانے میں اسپینی مسلمانوں اور اسپینی عیسائیوں کی لڑائیاں زیادہ تر رؤساء عرب کے مقابلہ میں لڑی گئی تھیں، اس لیے اب عربوں کو گرا ہوا دیکھ کر اسپینیوں نے بڑے لاف وگزاف سے کہنا شروع کیا کہ کامیابی آخر کار ہم ہی کو نصیب ہوئی۔ اس کی ایک وجہ بھی تھی، کیونکہ اگر کوئی اور آرزو ان کے دل کی نہ نکل سکی تھی، تو کم سے کم اتنا تو ضرور ہوا تھا کہ عرب جس طرح آئے دن اُن کی تذلیل اور تحقیر کرتے رہتے تھے اُس سے نجات مل گئی، امیر عبدالرحمٰن نے جس مقصد کو پیشِ نظر رکھا تھا اور جسے ایک زمانے کے بعد اس نے حاصل کر لیا، یہ تھا کہ ملک کی تمام مختلف قوموں کو کوٹ پیٹ کر ایسا یکجان کر دے کہ وہ ایک مضبوط اور متحد قوم واحد بن جائیں پرانے زمانے کی قومی تفریقیں بالکل یا بہت کچھ مٹ چکی تھیں، اب جو کچھ تفریق نظر آتی تھی وہ رُتبے اور دنیاوی حالت کی تھی، یہ سچ ہے کہ فرق مٹ کر مختلف قومیں ایک ہی سطح پر آگئیں، اس اعتبار سے مساوات بیشک قائم ہوئی، لیکن یہ مساوات حکمراں ہونے کی حالت میں نہیں بلکہ مطیع ہونے کی حالت میں قائم ہوئی، پھر بھی اسپینیوں کی نظر میں یہ ایک بڑا نفع تھا، اور سرِ دست وہ اس سے زیادہ کچھ چاہتے بھی نہ تھے، آزادی کی نسبت اُن کے سینوں میں جو خیالات تھے وہ بہت ہی غیر واضح تھے، مطلق العنان حکومتِ شخصی یا انتظامِ شخصی کی طرف سے اُنھیں کوئی ناراضگی نہیں تھی، اس قسم کی حکومت اُن کی رعایات میں ہمیشہ سے چلی آتی تھی اور شاہانِ قسطنطنیہ اور قیصرانِ روما کے دورِ حکومت میں انھوں نے اسی طرزِ حکومت کے سوا کوئی دوسرا طرزِ حکومت دیکھا بھی نہ تھا، اور یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ جس وقت اسپینی مروانیوں کی حکومت کا جُوا اپنی گردن سے اُتارنا چاہتے تھے، اس وقت بھی کے لیے ان کی کوششیں خفیف تھیں۔

اسناد:-

عریب جلد ۲ ص ۱۰۴ ۱۷۵ تا ۲۲۴

ابن خلدون ص ۱۲ تا ۱۳

اسپانا سگرادا سی ۴

ابن القوطیہ ص ۷۴

ابن حیان ص ۱۶ تا ۱۷

عبرت نامۂ اندلس

حصّۂ دوم

کتابِ ثالث

خلافت

پہلی فصل

فاطمیین

اندلوسیہ یعنی جنوبی اسپین کے صوبہ جات قرطبہ، اشبیلیہ، لبلہ، جیان، مالقہ اور غرناطہ میں جو بغاوتیں دولتِ بنی امیہ کے خلاف برپا ہوئیں، اُن کی مفصل داستان لکھنے میں ہم ۳۲۰ھ / ۹۳۲ء تک پہنچ جاتے ہیں، اِس سال بغاوتوں کا سلسلہ خاتمے کو پہنچا، اب ہم ملکِ اسپین سے باہر ایک عظیم الشان کشمکش میں متوجہ ہوتے ہیں اور اسی غرض سے ہمیں امیر عبدالرحمن کے ابتدائی دورِ حکومت کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

اسپینیوں اور عربی رئیسوں کی بغاوت ہی ایسا خطرہ نہ تھا جس سے سلطنت کی زلیست کو اندیشہ ہو، بلکہ دو ہمسایہ سلطنتیں ایک پرانی اور دوسری حال کی قائم کی ہوئی، اُس کے حق میں اندیشہ ناک تھیں، پرانی سلطنت لیون کی تھی اور نئی سلطنت افریقہ کی خلافت تھی جسے قریب ہی کے زمانے میں شیعوں کے فرقۂ اسماعیلیہ نے افریقہ میں قائم کیا تھا۔

تمام شیعوں کا اس امر پر اتفاق تھا کہ امامت یعنی مسلمانوں پر دینی اور دنیوی سرداری رکھنا حضرت علیؓ کی ذات سے مخصوص تھا اور یہ کہ امام معصوم ہوتا ہے، اُس سے کوئی غلطی یا خطا سرزد نہیں ہوتی، گو اصولِ مذہب میں کُل شیعہ متفق تھے لیکن اس پر بھی اُن میں کئی فرقے ہوگئے، ان فرقوں میں امام ششم یعنی حضرت جعفر صادقؓ کے فرزندوں کی نسبت کہ اُن میں کسے حقِ امامت حاصل ہے؟ اختلاف پیدا ہُوا حضرتِ جعفر صادقؓ کے کئی فرزند تھے، اُن میں سب سے بڑے اسمٰعیلؓ تھے اور اُن سے چھوٹے موسٰیؓ، جنابِ اسمٰعیلؓ کا انتقال چونکہ حضرت جعفرِ صادقؓ کی زندگی میں ۱۴۵ھ/۷۶۲ء میں ہوگیا تھا، اس لئے اُن کے انتقال کے بعد زیادہ تر شیعوں نے حضرت جعفر صادقؓ کے چھوٹے صاحبزادے یعنی حضرت موسٰی کاظمؓ کو امام تسلیم کیا۔ باقی شیعوں نے جو تعداد میں کم تھے، جنابِ موسٰی کاظمؓ کی امامت کو نہ مانا اور کہا کہ جنابِ اسمٰعیلؓ کا امام ہونا خود حضرت جعفر صادقؓ سے نص کے طور پر بیان ہو چکا ہے، چونکہ نص بدل نہیں سکتا اس لئے اسماعیلیہ نے حضرت جعفرؓ کی وفات پر جناب اسمٰعیلؓ اور اُن کی اولاد کے سوا کسی میں امامت کو تسلیم نہیں کیا، لیکن جنابِ اسمٰعیلؓ کی اولاد شہرت کی طالب نہیں تھی شیعیانِ علیؓ کے تمام گذشتہ معرکوں میں ناکامی کو یاد کرکے اور ایسے مصائب سے بچنے کے لئے جو اُن کے بزرگوں کو برداشت کرنے پڑے تھے، اور اظہارِ اطاعت کے اُس خطرناک طریقے سے اجتناب کرنے کے لئے جو شیعوں میں مصلحتِ وقت سمجھ کر اختیار کیا جاتا تھا۔ اولادِ اسمٰعیلؓ نے وطن ترک کرکے خراسان اور قندھار میں تنہا بسری اختیار کی[1]

(۴۰۲) جب اسماعیلیہ کے بانی یعنی جناب اسمٰعیلؓ کی اولاد اُن کو چھوڑ کر دُور جا بسی، تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ یہ فرقہ بہت جلد معدوم ہو جائے گا۔ لیکن ایک ایرانی شخص کی ہمت اور لیاقت نے اِس فرقہ کو از سرِ نو زندہ کر دیا۔

ایران اور اسپین میں اسلام کی اشاعت اور ترقی قریب قریب ایک ہی انداز پر ہوئی

---

[1] الجوینی۔ جنرل ایشیاٹک سلسلہ ۵ جلد ۷، ص ۲۶۳ تا ۲۶۴

تھی، اسلام اگرچہ اپنے حلقہ میں کثرت سے غیر مذہب والوں کو مسلمان کر کے شامل کر چکا تھا، مگر غیر مذاہب کو اسلام نے نیست و نابود نہیں کیا تھا، ایران میں مجوسی مذہب بھی اسلام کے ساتھ ساتھ رائج تھا، اگر مسلمان سختی کرنی چاہتے تو رسول اللہ صلعم کے حکم کے مطابق مجوسیوں سے کہتے کہ "اسلام قبول کرو، اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو لڑو"[1] کیونکہ مجوسیوں کے پاس کوئی کتاب ایسے پیغمبر کی لائی ہوئی جسے مسلمان نبی سمجھتے موجود نہ تھی، خلاصہ یہ کہ مجوسی اہلِ کتاب نہ تھے جس کی وجہ سے اُن سے مذہبی رواداری رکھنی مسلمانوں پر فرض ہو جاتی، مجوسیوں کی تعداد ایران میں اس کثرت سے تھی کہ مسلمان ارشادِ پیغمبرؐ کی تعمیل نہ کر سکے، گبر کو اپنے مذہب کے ساتھ بے حد شغف تھا، اپنا مذہب ترک کر کے دوسرے مذہب کو اختیار کرنے سے انہیں انکار تھا، اس صورت میں اُن سب کو اس بنا پر غارت کر دینا کہ وہ اپنے ہی طریقے پر آخرت میں امیدوارِ نجات تھے مسلمانوں کے خیال میں نہ آسکتا تھا، ایسا کام نہ صرف ایک ظالمانہ فعل ہوتا بلکہ سخت خطرناک بھی ہوتا، کیونکہ اس صورت میں مسلمانوں کے خلاف ایک عالمگیر بغاوت پیدا ہو جاتی، غرض ترحم اور تدبیر دونوں مقتضی تھے کہ مسلمان ایسے سخت قانون کی تعمیل سے پرہیز کرتے، چنانچہ آتش پرستوں کے ساتھ بھی مذہبی رواداری کے قاعدے کو ملحوظ رکھ کر مسلمانوں نے انہیں اُن کے مذہب پر علانیہ قائم رہنے کی اجازت دے دی، ایران کے ہر شہر اور گاؤں میں آتش کدے تھے، حکومت فقیہوں کی زیادتیوں سے آتش پرستوں کو بچاتی تھی، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ملاؤں اور موذنوں کو جنھوں نے آتش کدوں کو مسجدیں بنانا چاہا سزا دی گئی۔

---

[1] یہاں "جزیہ" ادا کرنے کی ایک شرط مصنف نے چھوڑ دی اور صرف اسلام قبول کرنے یا لڑنے کی شرط مان کر آگے کی بحث قائم کی ہے، لیکن یہ مصنف کی غلطی ہے۔ دیکھیے پریچنگ آف اسلام مصنفہ آرنلڈ صفحہ ۱۰۸۔ کتاب الخراج صفحہ ۷۲ میں صاف لکھا ہے کہ "جتنے مشرکین ہیں مجوسی، بت پرست، آتش پرست، سنگ پرست، صابی، ستارہ پرست، سامری ان سب سے جزیہ لیا جائے گا" یعنی ان لوگوں کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہیں، اس غلطی کی وجہ سے مصنف کے آگے کے جملے بھی ایک بے جا اعتراض ہو جاتے ہیں (مترجم)

لیکن اگر اسلامی حکومت نے آتش پرستوں کے ساتھ رواداری اختیار کی جو در حقیقت عافیت پسند رعایا تھے اور سلطنت میں کسی قسم کا نقضِ امن پیدا نہ کرتے تھے، تو یہ ضروری نہ تھا کہ حکومت ایسے نومسلموں سے بھی درگذر کرتی جو ظاہر میں مسلمان تھے لیکن در پردہ اسلام میں اپنے مذہب کو پیوند لگا کر اُس کی اصلیت کو بگاڑنے کے درپے تھے، ایران اور اسپین دونوں ملکوں میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو دُنیا طلبی کے خیال سے مسلمان ہوئے تھے، اور اِس قسم کے لوگ بالعموم وہی ہوتے تھے جن کی طبیعتیں مضطرب اور حریص ہوتی تھیں، جب عربوں نے جو ہر ملک میں وہاں کے باشندوں سے علیحدہ رہنا پسند کرتے تھے، ان نومسلموں کو مُنہ نہ لگایا تو اُنھوں نے اپنی قوم اور قومی سلطنت کو پھر زندہ کرنے کی آرزو دِل میں پیدا کرلی اور اِسی بنا پر فتنے برپا کرنے شروع کر دیئے، ایسے مفسدہ پردازوں پر حکومت نے سختی اختیار کی، حتیٰ کہ عباسی خلیفہ مہدی نے ان لوگوں کے تدارک کے لئے ایک خاص عدالت قائم کی جو خلیفہ ہارون الرشید کے زمانے تک قائم رہی، سیاست میں سختی پر بغاوت کا پیدا ہو جانا ایک معمولی بات ہے، چنانچہ خرّمیوں کے سردار بابک نے صوبہ آذربائیجان میں بغاوت کردی، خرّمیوں کا گروہ بالکل آزاد اور اوباش سمجھا جاتا تھا، سال ۲۰۱ھ (۸۱۶ء) سے ۲۲۱ھ (۸۳۶ء) تک یعنی کامل بیس برس ایران کے اس ابنِ حفصون نے عباسی خلفا کی فوجوں کا مقابلہ کیا اور جب تک ڈھائی لاکھ آدمی ضائع نہ ہو لئے بابک گرفتار نہ ہو سکا لیکن ایسی بغاوتوں کا فرو کرنا جن میں تیر اور تلوار سے کام لیا جاتا ہو مشکل نہ تھا، ان سے کہیں زیادہ دشوار اُن خفیہ سازشوں اور خُفیہ جماعتوں کا مٹانا تھا جو سیاسی سختیوں سے پیدا ہو گئی تھیں، یہ خفیہ سوسائٹیاں پُرانے ایرانی مذاہب کے عقائد کی یا اس سے بھی زیادہ خطرناک چیز یعنی فلسفیانہ خیالات کی اشاعت چاہتی تھیں، کیونکہ ایشیا میں کثرتِ مذاہب اور اُن کے اختلاف ایسے آزاد خیال لوگوں کو پیدا کر دیتے تھے جو تمام مذہبوں کی تردید کرتے تھے اور کہتے تھے کہ مذہبی طریقے جس قدر ہیں وہ جاہلوں سے منوانے کے لئے ہیں، شائستہ لوگوں پر وہ کوئی حکم نہیں رکھتے، پیغمبروں کی نسبت کہتے تھے کہ وہ سب جھوٹے تھے اور اُن کا مقصد صرف لوگوں پر حکومت کرنا تھا۔

اِنہیں خفیہ سوسائیٹیوں اور سازشی جماعتوں سے نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری)
کے شروع میں فرقہ اسماعیلیہ کا دوسرا بانی پیدا ہُوا، اُس کا نام عبداللہ بن میمون تھا، یہ ایک
ایرانی خاندان کا آدمی تھا جس کے بزرگ مقلدانِ بردِ سانیس[1] کے معتقدات کے پَیرو تھے،
اُنھوں نے اِس جہان کے دو صانع مانے تھے ایک خالقِ خیر (نورِ محض) اور دُوسرا فاعلِ شر
(ظلمت) تھا، عبداللہ کا باپ میمون ایک آزاد خیال آدمی اور آنکھوں کا علاج کرنے والا
(قداح) تھا، سحر اور شعبدے بھی دکھایا کرتا تھا، اُس کے دوستوں میں سے ستر آدمی آتک
اپنے فاسد خیالات کی وجہ سے بحکم عدالت قتل ہو چکے تھے، میمون جان کے خوف
سے بیت المقدس میں جا بسا، یہاں اُس نے خفیہ طور پر لوگوں کو سحر کی تعلیم دینی شروع کی،
اور شیعہ مذہب کا اپنے کو سخت پابند بتایا، عبداللہ نے سحر اپنے باپ سے سیکھا تھا، لیکن
اس کے ساتھ ہی وہ فقہ و حدیث اور حکمت کا بھی پُورا عالم تھا، کچھ دن تک شعبدے دکھا کر
پیغمبری کا دعویٰ کرنا چاہا، لیکن جب دیکھا کہ اِن ترکیبوں سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا تو
اُس نے ایک بڑے ہی حوصلے اور ہمت کا کام سوچا۔

وہ کام یہ تھا کہ فاتح اور مفتوح قوموں کو کسی طرح ایسا متفق کر دے کہ وہ قوم واحد بن
جائیں، اِس نیت سے اُس نے ایک بڑی خفیہ مجلس قائم کرنی چاہی، اُس کے ارکان کے
لئے مختلف مدارج وضع کئے، بہت سے آزاد خیال آدمیوں کو جو مذہب کو عوام کے روکنے
کے لئے بطور ایک لگام کے سمجھتے تھے، نیز مختلف مذاہب کے متعصب لوگوں کو اس میں شریک (۴۰۴)
کرنا چاہا اور کوشش کی کہ خوش عقیدہ لوگوں سے ایسے کام لئے جائیں جو بد عقیدہ لوگوں
کو قوت بخشیں، فاتحوں کو ایسی باتیں سکھائی جائیں کہ جو سلطنت اُنھوں نے قائم کی ہے،
اُس کو وہ خود ہی اُلٹ دیں۔

غرض عبداللہ بن میمون نے چاہا کہ ایک ایسا فرقہ بنائے جس میں متعدد آدمی شریک
ہوں، آپس میں بالکل اتفاق رکھیں اور جو قواعد اور ضابطے اُن کے لئے مقرر ہوں،

---

[1] بردِ سانیس ایک جدید مذہب کا بانی اور ملک شام کا باشندہ تھا، دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے (انجیل)

اُن کے سختی سے پابند رہیں، اگر یہ مقصد حاصل ہو گیا تو پھر تختِ حکومت اگر اُس کو نہیں، تو اُس کی اولاد کو ضرور حاصل ہو جائے گا[۱]۔

یہ ایک عجیب منصوبہ تھا، جسے عبداللہ بن میمون جیرت انگیز فراست بے مثل ذہانت اور اُس گہرے علم کے ساتھ جو انسان کے دل کا اُسے حاصل تھا عمل میں لانے کے لئے مصروف ہو گیا۔

اِس خفیہ جماعت کو قائم کرنے میں عبداللہ بن میمون نے عیاری اور ہوشیاری سے بھی کام لیا، بظاہر اِس کا تعلق فرقۂ اسماعیلیہ سے تھا، یہ فرقہ اِس زمانے میں کسی سردار کے نہ ہونے سے مٹنے کے قریب تھا، عبداللہ نے اُسے پھر زندہ کرنے کا عہد کر کے اُس میں جان ڈالنی شروع کی، اُس کا عقیدہ تھا کہ دنیا بغیر امام کے کبھی نہیں ہوئی، اماموں کا سلسلہ باپ سے بیٹے کی طرف حضرت آدمؑ کے وقت سے چلا آتا ہے اور اسی طرح قیامت تک چلا جائے گا امام کے ہاں اُس کی جانشینی کے لئے جب تک لڑکا پیدا نہ ہو جائے امام مرتا نہیں، لیکن امام ہمیشہ ظاہر و حاضر نہیں ہوتا، کبھی ظاہر ہوتا ہے کبھی مستور رہتا ہے، اِس طرح جیسے رات اور دن ایک کے بعد ایک آتے ہیں، جب امام حاضر ہوتا ہے تو اُس کی تعلیم مستور ہوتی ہے لیکن جب امام مستور ہوتا ہے تو اُس کے داعی تعلیم دینے کے لئے دنیا میں آتے ہیں[۲]۔

عبداللہ ان نکات کو قرآن شریف سے ثابت کرتا تھا، اسماعیلیہ کی اچھی امیدوں کو قائم رکھنے میں اُس کا کام نکلتا تھا، یہ فرقہ امامِ مستور کا قائل تھا، لیکن ایک دن امام کے ظاہر ہونے کا اور اُس کے ساتھ دنیا میں امن و سلامتی اور انصاف کے آنے کا بھی اُسے یقین تھا، لیکن درحقیقت عبداللہ بن میمون فرقۂ اسماعیلیہ کا دل میں دشمن تھا اور حضرت علیؓ کی اولاد سے عقیدت مندی محض اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لئے اختیار کی تھی، اندرونی طور پر وہ

---

[۱] یہ خیال پروفیسر ڈوزی کا اِسی حالت میں صحیح ہو سکتا ہے جب کہ فاطمی خلفاء کو عبداللہ بن میمون کی اولاد میں سمجھا جائے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اکثر مسلمان مورخ فاطمی خلفاء کو عبداللہ ابنِ میمون کی اولاد سے نہیں سمجھتے۔ مترجم۔

[۲] الجوینی۔ جرنل ایشیاٹک۔ سلسلہ ۵، جلد ۷، ص ۲۶۴ تا ۲۶۵

پکا ایرانی تھا، حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد اور تمام عربوں کو ایک ہی زمرہ میں خیال کر کے سب سے منحرف تھا، اس بات کو وہ خوب سمجھے ہوئے تھے کہ ایرانی اگر کسی علوی کی حکومت قائم کرنا چاہیں گے تو ایرانیوں کو ہرگز اس سے کوئی نفع نہ پہنچے گا چنانچہ اُس نے اپنے دوستوں کو صلاح دی کہ حضرت علیؓ کی اولاد میں سے جو کوئی بھی ملے اُسے فوراً ہلاک کر دیا جائے۔

عبداللہ بن میمون شیعوں میں اپنے سچے خیر خواہ تلاش نہ کرتا تھا، بلکہ آتش پرستوں، مانیوں، حرّان کے مشرکوں اور یونانی فلسفہ کے طلبہ میں وہ اپنے مونس و غمخوار پیدا کرنے چاہتا تھا، فلسفہ یونان کے شیدائیوں سے اُس کو فی التحقیقت بہت توقعات تھیں اور وہ صرف اُنہی پہ اپنے منصوبے کا آخری راز ظاہر کر سکتا تھا اور اُنہی سے کہہ سکتا تھا کہ
(۴۰۵) کیا امام، کیا مذہب، کیا اخلاق یہ سب دھوکے اور فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہیں، باقی بنی نوعِ انسان جن کو وہ گدھا کہتا تھا اُس کے نزدیک اس قابل نہیں تھے کہ کسی چیز کے اصول کو سمجھ سکیں، لیکن جن کو گدھا کہتا تھا اُن سے کام لینے میں پرہیز نہ کیا بلکہ اس کی خواہش رکھی کہ اُن سے کام لے، مگر اس کے ساتھ ہی اس احتیاط کو ملحوظ رکھتا تھا کہ جو لوگ بہت ہی خوش اعتقاد اور منکسر المزاج ہوں اُن کو اپنے نو ایجاد مذہب میں صرف ابتدائی درجہ دے، جو داعی کا درجہ تھا۔ داعیوں کو ہدایت ہوتی تھی کہ اپنے اصلی خیالات کو پوشیدہ رکھنا اُن کا سب سے پہلا فرض ہے، جن لوگوں سے ملیں بالکل اُنہی کی طرز کے خود بھی بن جائیں یہ داعی طرح طرح کے بھیس میں ہوتے تھے اور تقریر میں ایسے معمے بیان کرتے تھے کہ سُننے والے اُن کے مشتاق ہو جاتے تھے، جاہلوں کو شعبدے دکھا کر جو معجزے سمجھے جاتے یا اُن سے ایسی گفتگو کر کے جو اُن کو بہت ہی دل کش معلوم ہوتی اپنے دام میں پھنساتے، زاہدوں اور عابدوں کے سامنے زاہد اور عابد بن کر اُن کے دلوں کو قابو میں لاتے، جو لوگ مذہب کو ایک رازِ سربستہ سمجھتے تھے اُن کے سامنے وہ بھی ویسے ہی بن جاتے، ہر شے اور منظرِ قدرت کے ایک پوشیدہ معنی بیان کرتے، تمثیلوں کی صراحت استعاروں میں بڑی رنگین بیانیوں سے کرتے۔

اس پُر آفات زمانے میں اِن داعیوں نے ہر طرح اپنا نفع حاصل کیا، اس وقت ہر فرقہ اس امید میں تھا کہ اب نجات کا زمانہ آنے والا ہے، ایسے خیال والوں سے بھی عبداللہ نے دعاۃ کا کام لیا، ان داعیوں نے مسلمانوں سے کہنا شروع کیا کہ مہدیٔ آخر الزمان جلد آنے والے ہیں۔ اِسی طرح یہودیوں کو مسیح اور عیسائیوں کو فارقلیط کے جلد نمودار ہونے کی خبریں دیں۔ سُنّی المذہب عربوں کو بھی یہ داعی اپنا بنانا چاہتے تھے، اگرچہ سُنّی عربوں کو اپنے عقائد کا پیرو بنانا بہت مشکل تھا، کیونکہ مذہب سنت والجماعت سب سے زیادہ رائج اور قوی تھا، عربوں کی شرکت سے انہوں نے یہ نفع سوچا تھا کہ حکومت کی بازپرس اور شبہ سے بچ سکتے ہیں، ان عربوں کی دولت کی بھی اُن کو ضرورت تھی تاکہ اُس کی مدد سے اپنے کام کو ترقی دیں، یہ لوگ عربوں کی تعریف کرکے اُن کا غرور بڑھاتے تھے اور اُن کو یقین دلاتے تھے کہ دُنیا کی تمام دولت کے مالک وُہی ہیں اور ایرانی پیدائشی غلام ہیں، یہ داعی روپے سے نفرت رکھتے تھے، زُہد اور پارسائی میں غلو دکھا کر عربوں کے معتمد علیہ بننا چاہتے تھے، عربوں کو جب اِن کی جانب سے اعتماد ہوگیا تو پھر اُنہیں اپنی درخواستوں سے ستانا شروع کیا اور اُن کو اس بات کا یقین دلایا کہ روپے سے مدد کرنی اُن کا فرض ہے، بلکہ اگر وہ کل مال ومتاع اُن کے لئے وقف کردیں تو مناسب ہے۔

اِن کوششوں کا عجیب نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف مذاہب اور عقائد کے لوگوں کا ایک انبوہِ کثیر متفق ومتحد ہوکر ایک ایسے کام میں ہمہ تن مصروف ہوگیا جس کی اصلی غرض صرف چند ہی لوگوں کو معلوم تھی، لیکن اس کام میں ترقی کی رفتار بہت سُست تھی اور عبداللہ بن میمون خوب جانتا تھا کہ اُس کی زندگی میں یہ کام ختم نہ ہوسکے گا، اُس نے کل کاروبار اپنے لڑکے احمد کے سپرد کیا جو باپ کے بعد جانشین ہُوا۔

احمد اور احمد کے بعد کے جانشینوں کے زمانے میں فرقہ اسمعیلیہ نے اور بھی ترقی کی، کیونکہ ۴۰۶
شیعوں کے دوسرے فرقے یعنی فرقۂ اثنا عشری کے لوگ بھی بکثرت اس میں شامل ہوگئے تھے، اثنا عشری لوگ حضرت جعفر صادق رض کے چھوٹے صاحبزادے حضرت موسیٰ کاظم رض کی اولاد میں امامت کا سلسلہ مانتے تھے، لیکن چونکہ اِس سلسلے کے بارھویں امام جن کا نام محمد المہدی تھا

بارہ برس کے سن میں ایک غار میں جا کر مع اپنی والدہ اور ہمراہیوں کے غائب ہو گئے تھے (۲۶۶ھ ۸۷۹ء) اور اثنا عشری اس غار سے اُن کا اِنتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے، اِس لئے انہیں جماعتِ اسماعیلیہ میں شامل ہونے کی ترغیب آسانی سے ہو گئی اور اسماعیلیہ اس وجہ سے قابلِ ترجیح معلوم ہوئے کہ اُن کے پاس ایک زندہ امام موجود ہے جو موقع پاتے ہی ظاہر ہونے والا ہے۔

۲۷۱ھ ۸۸۴ء میں ایک اسمٰعیلی ابنِ حوشب نے جو پہلے اثنا عشری تھا یمن میں وعظ کہنا شروع کیا اور صنعاء پر قبضہ کر کے سلطنتِ اسلامیہ کے ہر صوبے اور ملک میں اپنے داعی پھیلا دیئے، ان دعاۃ میں سے دو شخص بربر کے قبیلہ کتامہ میں جو افریقیہ کے علاقہ قسنطنیہ میں آباد تھے تعلیم اور تلقین کی غرض سے پہنچے اور جب ان دونوں کا اِنتقال ہو گیا تو ابنِ حوشب نے اُن کی جگہ اپنے تلامذہ میں سے ایک شخص کو جس کا نام ابو عبداللہ تھا مقرر کیا۔

ابو عبداللہ نہایت مستعد، ہوشیار اور بڑا خطیب تھا، موقع و محل خوب پہچانتا تھا تنگ و ضعیف الخیال بربر کو مرید بنانے کے لئے جو باتیں اختیار کرنی چاہیئے تھیں اُن کا پورا ماہر تھا۔

ابو عبداللہ اگرچہ اسماعیلیہ طریقے میں ادنیٰ درجہ رکھتا تھا لیکن جو کام اُس کے سپرد ہوا تھا اُس کے لئے بے حد موزوں تھا۔ دعاۃ اسمٰعیلیہ کی یہ حالت تھی کہ وہ اپنے فرقے کی اصلی غایت سے لاعلم تھے، ابو عبداللہ نے اپنے کام کی ابتدا اس طرح کی کہ کتامہ کے بچوں کا معلّم بنا اُن کے والدین کی نظروں میں اپنا اعتبار بڑھایا اور جب اُس کو اپنے کامیاب ہونے کا یقین ہونے لگا تو پھر معلمی کا بھیس اتار پھینکا اور کہا کہ "میں مہدی آخرالزمان کی بشارت دینے آیا ہوں"، کتامہ سے کہا کہ "اگر وہ ایک نیک کام کے لئے مسلح ہو کر لڑیں گے تو دین اور دنیا دونوں میں فائدہ ہو گا"۔

غرض ابو عبداللہ کی معمّے آمیز باتوں سے کتامہ بغاوت کرنے پر راضی ہو گئے اور چونکہ اُن کی تعداد بمقابلہ دیگر قبائلِ بربر کے افریقیہ میں بہت زیادہ تھی اور اُن کا جوش آزاد

رہنے اور جنگ آوری کا بہت کچھ باقی تھا اِس لئے بغاوت میں بہت جلد کامیابی ہوئی اور بنی اغلب کے آخری حکمراں کے بہت سے شہر اُنہوں نے چھین لئے، بنی اغلب کا خاندان اس وقت تقریباً سو برس تک سلطنت کر چکا تھا، اس کے آخری بادشاہ کو کتامہ نے اِس قدر ستایا کہ وہ اپنے قصر سے تنہا نکل بھاگا، اپنی بیوی کو بھی پیچھے چھوڑ گیا، ابوعبداللہ نے اس کی جگہ مہدی کو تخت پر بٹھایا (۲۹۰ھ ۹۰۹ء)

یہ مہدی اصل میں ایک شخص سعید[1] تھا جو اس وقت فرقہ اسمٰعیلیہ کا سردار تھا، اور عبداللہ القداح (یعنی معالجِ چشم) کی اولاد سے تھا، سعید کو دعویٰ تھا کہ وہ حضرت علیؓ کی اولاد سے ہے، غرض (سعید) مہدی نے اب عبیداللہ کا نام اختیار کر کے اغلبیوں کی حکومت پر قبضہ کیا، خلیفہ اور بانی خاندانِ فاطمیین ہونے کی وجہ سے اُس نے اپنے عقائد اور اصول پوشیدہ رکھنے میں بہت احتیاط کی، شاید کوئی اور ملک مثلاً ایران میں اس کو یہ فتح ہوئی ہوتی تو وہ ایسا نہ کرتا، لیکن ایک نیم وحشی قوم کی مدد سے اُس کو تخت حاصل ہوا تھا، جو فلسفیانہ خیالات سے مطلق ناآشنا تھی، اس وجہ سے اُس نے خود ہی اپنے عقائد کو مخفی نہ رکھا بلکہ اسمٰعیلی طریقے میں جو لوگ درجۂ اعلیٰ تک تعلیم پائے ہوئے تھے اُن کو بھی نامناسب موقعوں پر اپنے خیالات کے ظاہر کرنے سے روکا۔

فرقہ اسماعیلیہ کی اصلی کیفیت گیارھویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) کے شروع تک کسی پر نہ کھلی، اِس صدی سے فاطمیوں کی حکومت اِس قدر مستحکم ہوگئی کہ پھر اُن کو کسی کا خوف نہ رہا، عساکر و افواج کی مضبوطی اور دولت کی بہتات نے اُن کو اِس بات سے

---

[1] سعید (یا مہدی یا عبیداللہ) کو بعض مسلمان مؤرخوں مثلاً ابنِ خلدون اور مقریزی نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد سے مانا ہے اور کہا ہے کہ عبداللہ ابن میمون کی اولاد سے اُسے سمجھنا غلطی ہے۔ ان مؤرخوں کا بیان ہے کہ جب فاطمی خلفاء کی طاقت بہت بڑھی تو عوام میں اُن کا وقار کم کرنے کی غرض سے عباسی خلیفہ القادر باللہ نے بغداد کے علماء سے یہ کہلوایا کہ "فاطمی خلیفہ عبداللہ ابن میمون القداح کی اولاد سے ہیں۔" مترجم

بے پروا کر دیا کہ وہ اپنا اہل بیت سے ہونا ثابت کرتے رہیں[۱]۔

ابتدا میں اسمٰعیلیہ بھی بعض اور مسلم فرقوں کی طرح مذہبی رواداری کو گوارا نہ کرتے تھے، اختلافِ عقائد کی بنا پر بڑے بڑے عالموں اور فقیہوں کو سزائیں دی گئیں، ہاتھ پاؤں کاٹے گئے صلیب پر چڑھایا گیا، خلفائے راشدین میں سے تین خلفاء کا ذکر تعظیم سے کرنے[۲] یا شیعہ مذہب کے کسی مسئلہ کو بھول جانے یا امام مالک کے طریقے کے مطابق فتویٰ دینے پر سزائے صلیب تک دی جاتی تھی، جو لوگ طریقہ اسمٰعیلیہ میں شریک ہوتے تھے اُن کو اُس طریقہ کی تمام باتوں کی سختی سے پابندی کرنی پڑتی تھی، اگر کسی نے اس طریقہ میں شامل ہو کر اُسے ترک کیا اور ترک کرنے کے بعد اپنی جان بھی بچانی چاہی تو اُس کو یہ دیکھنا پڑتا تھا کہ پہلے اُس کی بیوی کے ساتھ کوئی دوسرا زنا کرتا، پھر خود اُس پر مار پڑتی، اور سب لوگ اُس کے منہ پر تھوکتے۔

اس میں شک نہیں کہ عبید اللہ نے اپنے سپاہیوں کو اس قسم کے ظلموں سے باز رکھنا چاہا مگر اس میں اُسے کامیابی نہ ہوئی، رعایا نے یہ کہہ کر کہ اُن کو ایسے خدا کی ضرورت نہیں ہے جو نظر نہ آتا ہو خلیفہ کو اس شرط سے خدا ماننے پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ جو چاہیں سو کریں کوئی اُن کا مزاحم نہ ہو، خلیفہ کو خدا بنانا ایرانیوں کے خیال کے مطابق تھا، کیونکہ ایرانی اپنے بادشاہوں کو خدا کا اوتار مانتے تھے۔

عبید اللہ کے وحشی لشکر نے شہروں پر قبضہ کر کے جو جو ظلم کئے ہیں اُن کی مثال نہیں ملتی، برقہ میں امیرِ لشکر نے بعض شہر والوں کے ٹکڑے کر کے اُن کی بوٹیاں آگ پر بھونیں اور جو شہر والے

---

۱ خلیفہ معز سے جب کسی نے اس بات کا ثبوت طلب کیا کہ وہ اہلِ بیت سے ہیں؟ تو خلیفہ نے تلوار برہنہ کر کے کہا "دیکھو یہ تلوار ہمارا شجرہ نسب ہے" یہ کہہ کر روپے اور اشرفیاں لوگوں میں پھینک کر کہا "اور یہ ہمارے اہلِ بیت ہونے کا ثبوت ہے"۔ یہ دیکھ کر سب نے ثبوت کو ناقابلِ تردید سمجھ لیا۔

۲ عبید اللہ نے حکم دیا تھا کہ حضرت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابہ پر سوائے حضرت علیؓ اور چار اور بزرگوں کے نماز میں لعن کیا جائے۔

اگر فاطمیین کو اسپین میں قدم جمانے میں کامیابی ہو جاتی تو اِس ملک میں بہت لوگ اُن کے ہوا خواہ اور پیرو ہو جاتے، مہدی آخر الزماں کے آنے کا خیال اور اسلامی ملکوں کی طرح یہاں بھی موجود تھا، سنہ ۲۸۹ھ (۹۰۱ء) میں جیسا کہ آئندہ بیان ہو گا اموی شہزادوں میں سے ایک شخص نے اسپین میں مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا، فاطمیوں کی خلافت[1] قائم ہونے سے بیس برس پہلے ایک مشہور فقیہہ عبدالملک بن حبیب (سنہ ۲۳۹ھ ۸۵۳ء) نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں پیشین گوئی کی تھی کہ "حضرت فاطمہؓ کی اولاد سے ایک شخص اسپین میں سلطنت کرے گا، اور وہ قسطنطنیہ کو بھی فتح کرے گا (جو ابھی تک دینِ عیسوی کا مرکز مانا جاتا تھا) یہ بادشاہ قرب و جوار کے ملکوں کے تمام مردوں کو قتل کرے گا اور اُن کی عورتوں اور بچوں کو بیچ ڈالے گا، یہاں تک کہ ایک ایک لڑکا ایک ایک چابک اور ایک ایک لڑکی ایک ایک مہمیز کے بدلے فروخت ہو جائے گی"

درجۂ ادنیٰ کی جماعتیں تو حسبِ معمول ایسی باتوں کا یقین کر لیا کرتی تھیں، لیکن فاطمیین کو غالباً تعلیم یافتہ اور بالخصوص آزاد خیال لوگ بھی ایسی باتوں کے ماننے والے ضرور بل جانے تھے اسپین میں فلسفے کا چرچا پانچویں مروانی تاجدار امیر محمد کے زمانے سے شروع ہوا تھا، لیکن ۲۰۹۱
فلسفہ اس ملک میں بدنام تھا اور مذہبی ناروا داری یہاں ایشیا کے ملکوں کی نسبت بڑھی ہوئی تھی، اسپین کے علماء جو مشرق کا سفر کر چکے تھے، خلفاء بنی عباس کی مذہبی رواداری کا ذکر کیا کرتے تھے، بالخصوص ایسی مجلسوں کا حال وہ بہت غصہ سے بیان کرتے تھے، جن میں مختلف مذاہب اور طریقوں کے علماء جمع ہو کر مسائلِ الٰہیات پر بغیر آسمانی صحیفوں کا لحاظ کئے بحث کیا کرتے تھے اور جہاں خود مسلمان بعض وقت کلام اللہ کی بے ادبی کرتے تھے[2] عام لوگوں کو فی الواقع فلسفیوں سے نفرت تھی، اُن کو وہ ناپاک اور مردود جانتے تھے اور آمادہ رہتے تھے کہ موقع پاتے ہی انہیں سنگسار کر دیں یا زندہ جلا دیں، اِس خوف سے آزاد خیال اور فلسفی اپنے خیالات ظاہر نہ کرتے تھے، مگر یہ قید قدرتی طور پر انہیں سخت ناگوار تھی اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا یہ لوگ ایک ایسے حکمران خاندان کے معاون و مددگار نہ ہو جائیں گے

---

[1] تاریخ ابنِ حبیب ص ۱۶۰

[2] جرنل ایشیاٹک سلسلہ ۵ جلد ۲ ص ۹۳

وہاں موجود تھے اُن کو یہ بھُنا ہوُا گوشت کھلایا اور پھر سب کو آگ میں زندہ ڈال دیا، مظلوم افریقی خوف سے گونگے ہو گئے اور انہیں اِن ظلموں سے نجات کی اُمید صرف مرنے کے بعد باقی رہ گئی۔ ایک عہد نویس مؤرخ نے لکھا کہ "جب خدا ایسے ظلموں کو روا رکھتا ہے تو (۹۰۸ء)
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دُنیا اب اُس کی توجہ کے لائق نہیں رہی، لیکن قیامت کا دِن آنے والا ہے، خدا اُس دن انصاف کرے گا۔"

فاطمیوں کے اِس دعوے نے کہ وہ ساری دنیا کی بادشاہی کے مستحق ہیں۔ دوسری اسلامی سلطنتوں کی نظر میں انہیں خوف ناک بنا دیا، سب سے زیادہ اسپین میں وہ خطرے کا باعث ہو گئے، اِس خوبصورت اور زرخیز ملک پر مدّت سے اُن کا دانت تھا، عبیداللہ نے اغالبہ کے ملک پر ابھی پُورا قبضہ بھی نہ پایا تھا کہ عمر بن حفصون سے نامہ و پیام جاری ہو گیا، اور اسپین کے اس مشہور باغی نے عبیداللہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا، اِس عجیب سازش کا کوئی نتیجہ پیدا نہ ہوُا، لیکن فاطمیین کی ریشہ دوانی میں فرق نہ آیا، اُن کے جاسوس اسپین میں ہر جگہ تاجروں کے بھیس میں پھرنے لگے، یہ لوگ اپنے آقاؤں کی اطلاع کے لئے سفر کے حالات جس طرح لکھتے تھے اُس کا حال اِبنِ حوقل کے سفرنامہ پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے، ابنِ حوقل بھی انہی جاسوس تاجروں میں تھا، یہ سیاح اسپین کے حالات شروع کرتے ہی لکھتا ہے[1]، کہ جو چیز غیر ملک والوں کو اس جزیرہ میں قدم رکھتے ہی متعجب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ملک ابھی تک اُسی بادشاہ کے قبضے میں ہے جو اُس پر حکومت کرتا ہے، یہاں کے رہنے والے مُردہ دل اور غلاموں کی سی طبیعت رکھتے ہیں، وہ نامرد ہیں، گھوڑے کی سواری نہیں جانتے اور ہرگز اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ ایک تربیت یافتہ فوج کے مقابلے میں تابِ مقاومت لا سکیں، تاہم ہمارے آقا یعنی فاطمی خلیفۂ مصر خدا اُن پر اپنی برکتیں نازل رکھے، اِس مُلک کی قدر و قیمت سے خوب واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ اس ملک کی آمدنی کس قدر زیادہ ہے اور اِس میں کیا کیا حُسن اور خوبیاں ہیں۔"

---

[1] ابنِ حوقل کی کتاب، قلمی نسخہ، ص ۲۶

جس کے خیالات اُن سے مِلتے جُلتے ہیں، قیاس غالب یہ تھا کہ وہ ضرور مددگار ہو جائیں گے، فاطمیوں کا بھی یہی خیال تھا، چنانچہ دریافت ہوتا ہے کہ اُنھوں نے عقائدِ اسمٰعیلیہ کی ایک انجمن اسپین میں قائم کرنے کی کوشش کی اور اپنے ایک فلسفی ابن مسرّہ نامی کو اپنے مذہب کی دعوت کے لئے اسپین روانہ کیا (سنہ ۲۶۹ھ/۸۸۳ء - ۳۱۹ھ/۹۳۱ء) یہ ابنِ مسرّہ قرطبہ کا مشہور فلسفی درحقیقت وحدت الوجود کا ماننے والا تھا. چند یونانی کتابوں کا اکثر مطالعہ کیا کرتا تھا، عرب ان کتابوں کو انباذ قلس[1] کی تصنیف سے بتاتے تھے آخرکار ابنِ مسرّہ ملحد قرار پاکر ملک بدر کیا گیا۔ اسپین سے نکل کر وہ مشرق چلا گیا اور وہاں اُس نے مختلف فرقوں کے عقائد سے واقفیت پیدا کی، معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ اسماعیلیہ کی خفیہ جماعت میں شامل ہوگیا، اِس بات کا یقین اِس سے ہوتا ہے کہ جب وہ پھر اسپین میں آیا تو اپنے خیالات جس طرح جوانی میں ظاہر کیا کرتا تھا اب ظاہر نہیں کئے بلکہ بڑا زاہد اور متّقی بن گیا، اسپین کی خفیہ انجمن کے افسروں نے اُس کو سمجھا دیا کہ سُنّی مذہب کا بھیس اختیار کرے، غرض سُنّی بن کر اپنی سحر بیانی سے وہ جاہلوں کو گمراہ کرتا رہا، بہت آدمیوں کو اپنا شاگرد بنا کر پہلے ایمان سے شک کی تعلیم اور پھر شک سے قطعی انکار کی تعلیم دینے لگا، لیکن شرع کے عالموں اور فقیہوں کو دھوکا نہ دے سکا، اِن لوگوں نے گھبرا کر اِس حلیم کو تو نہیں (کیونکہ امیر عبدالرحمٰن الناصر ایسی حرکت کب روا رکھ سکتا تھا) مگر اُس کی کتابوں کو جلوا دیا[2]۔ اگرچہ اس بات کا کوئی صریح ثبوت نہیں ہے کہ ابن مسرّہ اسمٰعیلی مذہب رکھتا تھا اور اِس مذہب کا داعی ہوگیا تھا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ فاطمیوں نے اسپین میں اپنا ایک ہوا خواہ فرقہ قائم کرنے کی کوشش کی اور اس میں انہیں قدرے کامیابی بھی ہوئی[3]، اگر اسپین میں فاطمیین کی حکومت ہو جاتی تو آزاد خیال لوگ بہت خوش ہوتے،

---

[1] یہ شخص سسلی کا رہنے والا، مشہور فلاسفر اور نامور شاعر تھا، ۴۴۴ برس قبل مسیح گزرا ہے۔ (اسمٰعیل)

[2] اماری - فہرست کتب عربی (تاریخ الحکماء) ص ۶۱۴ تا ۶۱۵ - ابوبکر الزبیدی نے ایک رسالہ ابنِ مسرّہ کے ردّ میں لکھا۔

[3] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۴۲۷

عام رعایا کے حق میں یہ حکمران خاندان خدا کا قہر ثابت ہوتا، ابن حوقل سیاح کے ایک قول سے جس سے وحشت اور سنگدلی برستی ہے ظاہر ہوتا ہے کہ کتامہ کا متعصب گروہ عیسائیوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرتا، ابن حوقل یہ ذکر کر کے کہ عیسائی دیہات اور قصبات میں ہزاروں کی تعداد میں بستے ہیں لکھتا ہے کہ "یہ لوگ اکثر بغاوتیں کر کے سلطنت کو مشکلات میں مبتلا رکھتے ہیں" آگے چل کر مشورہ دیتا ہے کہ "اس کا ایک علاج ایسا موجود ہے کہ عیسائی آئندہ حکومت کو مطلق نہ ستا سکیں اور وہ یہ کہ ان کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے"۔ اس علاج پر جو اعتراض اسے خود معلوم ہوا تھا وہ یہ تھا کہ "کل عیسائیوں کو ہلاک کرنے میں وقت بہت ضائع ہو گا"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کتامہ کی حکومت اسپین میں ہو جاتی، تو وہ عبدالملک بن حبیب کی پیشین گوئی کا حرف حرف صحیح ثابت کر دکھاتے۔

اسپین کے عربوں کو جنوب کی سمت میں تو فاطمیین سے خطرہ تھا اور ملک کے شمالی اطراف میں لیون کی عیسائی ریاست روز بروز قوت پکڑتی جاتی تھی، یہ خطرہ جنوب کے خطرے سے بھی بڑھ کر تھا۔

لیون کی عیسائی ریاست کی ابتدا بہت ہی حقیر تھی، آٹھویں صدی عیسوی میں جب لیون کے عیسائیوں نے اپنا علاقہ مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو تین سو عیسائی اس علاقہ سے بھاگ کر اشتوراس کے پہاڑوں میں پناہ گزین ہوئے، ان تین سو آدمیوں کا سردار پلیجیس تھا، جسے عربوں نے بلائی لکھا ہے، اور جس پہاڑ میں انھوں نے پناہ لی تھی اسے صخرہ بلائی کہا ہے، جس مقام پر انھوں نے پناہ لی تھی وہ پہاڑ کی ایک تنگ گھاٹی تھی، جس کے دونوں طرف اونچی اونچی چٹانیں تھیں اور بیچ کا راستہ اس قدر تنگ تھا کہ ایک سوار بھی مشکل سے اس میں سے گذر سکتا تھا، اس چھتے میں تین سو عیسائیوں نے وطن سے بھاگ کر سکونت اختیار کی تھی، مگر یہ مقام ایسا تھا کہ چند ہمت والے آدمی بڑی سے بڑی فوج کا بھی آسانی سے مقابلہ کر سکتے تھے اور اشتوراس کے رہنے والوں کو ایسے واقعات کسی وقت میں پیش بھی آ چکے تھے، لیکن یہ تین سو پناہ گزین نہایت تنگی اور عسرت کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے، ان میں سے بہت لوگ تو ساتھ چھوڑ کر چلے گئے تھے اور بہتیرے فاقوں سے مر چکے

تھے، غرض بلائی کے ساتھی کم ہوتے ہوتے صرف چالیس نفوس رہ گئے جن میں تیس مرد تھے اور دس عورتیں. پہاڑوں کی جھریوں میں مکھیوں کے چھتوں سے شہد نکال کر مشکل سے گذر کرتے تھے مسلمانوں نے ان سے کچھ مزاحمت اس خیال سے نہ کی کہ تیس آدمیوں سے خوف کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس کے علاوہ یہ گھاٹی ایسی تنگ و تاریک تھی جہاں کے معرکوں میں پہلے بھی صدہا حملہ آوروں کی جانیں جا چکی تھیں، ایسی جگہ دشمن کے تعاقب کو مسلمانوں نے ایک بیکار زحمت سمجھا

مسلمانوں کی اس غفلت اور بے توجہی سے بلائی کو مہلت مل گئی اور اس زمانے میں اس نے اپنے گروہ کو مضبوط کر لیا اور جب لڑائی کے بھاگے ہوئے عیسائی اس کے پاس بہت سے جمع ہو گئے تو مسلمانوں کی ایسی آبادیوں پر جو صخرہ بلائی سے قریب تھیں اس نے لوٹ مار شروع کی، اس وحشی گروہ کی سرکوبی کے لئے بربر سردار ابی نسعہ نے جو اس زمانے میں اشتوراس کا حاکم تھا اپنے ایک فوجی افسر علقمہ کو بلائی کے مقابلے پر بھیجا، لیکن علقمہ کو بلائی کے مقابلے میں کامیابی نہ ہوئی بلکہ شکست ہو گئی اور وہ خود بھی اس لڑائی میں مارا گیا۔

بلائی کی اس کامیابی پر اشتوراس کے عیسائی باشندوں کی ہمت بڑھی اور وہ ابی نسعہ حاکم اشتوراس کے خلاف بغاوت کر بیٹھے، ابی نسعہ کے پاس اس قدر فوج نہ تھی کہ اس بغاوت کو فرو کر دیتا۔ اس لئے گیجون کے شہر سے جو اشتوراس میں اُس کا مستقر حکومت تھا لیون کے شہر کی طرف چلا، سات فرسخ نہ چلا ہوگا کہ عیسائیوں نے حملہ کر کے اُس کو سخت نقصان پہنچایا، نتیجہ یہ ہوا کہ جب لیون پہنچ کر اپنے فوجیوں سے کہا کہ پہاڑوں میں جا کر بلائی کا پھر مقابلہ کریں تو اُنہوں نے ایسی جگہ جانے سے انکار کر دیا جہاں اُن کا سخت نقصان ہوا تھا۔

غرض اشتوراس کے عیسائیوں نے عربوں کی حکومت سے آزاد ہو کر کچھ عرصے کے بعد بہت کچھ قوت حاصل کر لی، اشتوراس کے علاقے سے مشرق میں ساحل بحر سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی ریاست کنتابریا نامی عیسائیوں کی تھی، جو مسلمانوں کی محکوم نہیں ہوئی تھی، اس ریاست کا رئیس ادفونش (الفونسو) تھا جب اُس نے بلائی کی لڑکی سے عقد کر لیا تو کنتابریا کی ریاست کے علاوہ وہ اشتوراس کے علاقے کا بھی مالک ہو گیا اور اب یہاں عیسائیوں کی قوت

پہلے سے دوچند ہو گئی اور انہوں نے ارادہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو گا مسلمانوں کو جنوب کی طرف ہٹاتے چلے جائیں گے۔

حالات کچھ ایسے پیش آتے رہے کہ اس میں انہیں کامیابی ہوئی، شمالی علاقوں میں جس قدر مسلمان آباد تھے اُن میں بربر کی تعداد سب سے زیادہ تھی، انہوں نے کچھ عرصے سے خوارج کے عقائد اختیار کر لئے تھے اور اب انہوں نے عربوں کے خلاف ایک ہنگامہ برپا کیا اور عربوں کو وہاں سے نکال دیا۔ لیکن جب ان کو نکالنے میں بربر جنوب کی طرف بڑھے تو عربوں سے شکست کھا گئے اب عربوں نے اُن کا تعاقب کیا اور اُن میں سے بہتوں کو قتل کر دیا۔

کچھ تو اس لڑائی نے اور کچھ قحط نے بربر کی حالت خراب کر دی، یہ قحط سنہ ۱۳۳ھ / ۷۵۰ء سے شروع ہو کر پانچ برس تک مسلسل رہا تھا، اس لئے بربر کے اکثر قبیلوں نے ارادہ کیا کہ اسپین چھوڑ کر اپنے وطن افریقیہ کو چلے جائیں۔

جب بربر کے قبائل اسپین کے شمالی علاقوں سے کوچ کرنے لگے تو ۱۳۴ھ / ۷۵۱ء میں جلیقیہ کے عیسائیوں نے مسلمانوں سے بغاوت کر کے ادفونش (الفونسو) کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا گویا اب اسپین میں اشتوریاس، کنتابرایا اور جلیقیہ کے علاقے ایک ہی عیسائی بادشاہ کے تحت میں آ گئے، اور اُس کی مدد سے جس قدر مسلمان ان شمالی علاقوں میں آباد تھے اُن میں قتل عام شروع کیا اور جو مسلمان قتل ہونے سے بچے انہیں مجبور کیا کہ وہ اشتورقہ کی طرف چلے جائیں، سنہ ۱۳۶ھ / ۷۵۲، ۷۵۴ء میں بربر کے قبائل اور بھی جنوب کی طرف ہٹتے چلے گئے، اور بر شمال میں براغہ، برتقال اور بازو کے شہروں کو خالی کر دیا، یہ تینوں شہر ساحل اطلانتک البحر محیط سے قریب تھے، غرض ساحل کے حصے دریائے دویرہ کے دہانے تک مسلمانوں سے خالی ہو گئے۔

بربر اور بھی جنوب کی طرف ہٹے اور انہوں نے اشتورقہ، لیون، سمورہ، لیدسمہ اور ظلمنکہ کے شہر بھی چھوڑ دیئے اور قوریہ کے شہر میں سکونت اختیار کی، بلکہ اُس کو بھی چھوڑ کر اور جنوب کی طرف ماردہ میں چلے آئے۔ شمال مشرقی اطراف میں انہوں نے سب بلدانہ شنت مانکش، شقوبیہ، وابلہ، اوقہ، وشمہ، مرندہ زیرساحل وادئ ایرہ (ایبرو) سیلنی سیمر،

الیسانکو (یہ دو اخیر شہر صوبہ رلیوسیجا میں تھے) خالی کر دیے،

اب اسلامی سلطنت کے بڑے سرحدی شہر مغرب سے مشرق کی جانب قلمریہ (دریائے منڈیق کے کنارے) طلبیرہ اور طلیطلہ (دریائے تاجہ کے کنارے) وادی الحجارہ، تطیلہ اور نبلونہ شمالی علاقوں میں باقی رہ گئے۔

غرض آپس کے نزاعات اور خانہ جنگیوں اور قحط سالی سب نے مل کر اسپین کے ایک حصّہ کو مسلمانوں کی حکومت سے نکلوا دیا۔ ان مقامات میں مسلمانوں کی حکومت چالیس برس سے زیادہ نہ رہی۔

اوفونشس کو بھی اپنے کاموں کا کوئی بڑا پھل نہ ملا، جن علاقوں کو مسلمان چھوڑ گئے تھے اُن میں وہ پہنچا اور جو مسلمان وہاں نظر آئے اُن کو قتل کیا، ان علاقوں میں زراعت کے لئے نہ تو اُس کے پاس آدمی تھے اور نہ وہاں کے قلعوں کی مرمّت کے لئے روپیہ تھا جنھیں مسلمان چلتے وقت مسمار کر گئے تھے، غرض وہ ان علاقوں پر واقعی قابض و متصرف نہ ہو سکا، البتہ جس قدر عیسائی اُس کو وہاں ملے اُن کو اپنے وطن لے گیا اور اُن علاقوں کے ایسے حصّوں کا مالک ہو گیا جو اُس کی عملداری سے ملحق تھے، ان حصّوں میں لیبانہ (جو صوبہ سنتاندر کا جنوب مشرقی حصّہ تھا) اور قشتالیہ قدیم جسے اس وقت بردولیہ کہتے تھے اور علاقہ جلیقیہ کا ساحل غالباً شہر لیون سمیت شامل تھے، باقی ملک جہاں سے مسلمان چلے گئے تھے مدت تک برباد رہا اور قدرتی طور پر شمال کے رہنے والے عیسائیوں اور جنوب کے رہنے والے مسلمانوں میں ایک حدِ فاصل بنا رہا[1]

لیکن جو کام اوفونشس (الفونسو) سے ختم نہ ہو سکا وہ اُس کے جانشینوں نے ختم کیا، شمال کے عیسائیوں نے عربوں کے مقابلہ میں لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری رکھ کر آخر کار لیون کو اپنا دار الحکومت بنا لیا، اور ایسے بڑے شہروں اور قلعوں کو جو برباد ہو چکے تھے

---

[1] بڑے بڑے شہر استورقہ اور رتوی سنہ ۸۵۰ء (یعنی سنہ ۲۳۶ھ) تک برباد رہے، کتاب تحقیقات مصنّفہ ڈوزی (مطبوعہ سنہ ۱۸۸۱ء) جلد ۱ ص ۱۲۳ –

رفتہ رفتہ پھر درست کر لیا نویں صدی عیسوی (دوسری صدی ہجری) کے آخری نصف حصے میں جب کہ امیر سے اسپین کے تمام جنوبی علاقے باغی ہو گئے تھے عیسائیوں کو ترقی کرنے کا موقع ملا، اور اُنہوں نے لیون سے جنوب کی سمت میں بڑھتے بڑھتے وادی دویرہ تک اپنی سرحد پہنچا دی، اور یہاں اُنہوں نے چار مضبوط قلعے تعمیر کئے، یعنی سمورہ[1]، شنت مانکش[2]، شنت اشتیبان[3] غرناج[4] وشمہ[5] یہ قلعے مسلمانوں کے حملوں کو روکنے کے لئے عیسائیوں کے حق میں مستحکم مقامات ہو گئے لیکن دریائے دویرہ سے وادی آنہ تک جو وسیع قطعۂ زمین بنجر و ویران تھا اُس پر نہ تو لیون کے عیسائی قابض تھے اور نہ عرب، یہ قطعۂ ارض متنازعہ فیہ سمجھا جاتا تھا، مغرب میں لیون کے عیسائیوں کی سرحد مسلمانوں کے ملک سے بالکل جا ملی تھی، کیونکہ عیسائیوں کی سرحد دریائے منڈیق کے اس پار کچھ دُور تک پہنچی ہوئی تھی، لیکن یہ سرحدیں ایسی تھیں کہ کبھی مسلمان اور کبھی عیسائی اُن کو توڑ کر اپنا دخل آگے کرتے تھے، اگر قرطبہ کے تخت سلطنت پر بادشاہ کمزور ہوا، تو عیسائی لوٹ مار کرتے ہوئے دریائے تاجہ اور وادی آنہ کے کناروں تک پہنچ جاتے تھے، ان نواح میں اکثر بربر آباد ہوتے تھے، اُن کی آپس کی لڑائیاں اُن کو اس قدر کمزور کئے رکھتی تھیں کہ وہ عیسائیوں کی روک تھام نہ کر سکتے تھے اور بعض اوقات یہاں تک نوبت آجاتی تھی کہ ان لٹیرے عیسائیوں کو روپیہ دے کر اپنی جان چھڑاتے تھے۔

لیکن آخر کار وہ وقت آیا کہ مسلمان عیسائیوں کی اِن زیادتیوں کا بدلہ لینے کی کوشش کریں، ۲۸۷ھ / ۹۰۱ء میں ایک اُموی شہزادہ جس کا نام احمد بن معاویہ تھا اور جو علومِ سحر کا ماہر اور تخت کا مدعی تھا بربر کے قبیلوں میں مہدی بن کر ظاہر ہوا، اور سمورہ پر حملہ کرنے کے لئے اُس نے تمام قبائل بربر کو اپنے علم کے نیچے جمع کیا، سمورہ کا قلعہ اذفونش (الفونسو سوم) کے عہد میں اذفونش کے ساتھیوں اور طلیطلہ کے عیسائیوں نے مل کر ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء میں دوبارہ تعمیر کیا تھا، بربر اِس قلعے اور شہر سے خائف رہتے تھے، کیونکہ لیون کے عیسائیوں نے اپنے علاقے کی جنوبی سرحد پر اِس قلعہ کو جس کے گرد سات فصیلیں اور اتنی ہی خندقیں تھیں، لوٹ مار کرنے کے بعد اپنی جائے پناہ قرار دیا تھا اور وقتاً فوقتاً جس قدر مال و زر مسلمانوں کا لوٹتے تھے وہ سب اِسی قلعے میں جمع کرتے تھے۔

قبائلِ بربر کو اپنے عَلم کے نیچے جمع کرنے میں احمد بن معاویہ کو بہت کامیابی ہوئی، کیونکہ یہ لوگ اعتقاد کے ضعیف اور انتقام کے پیاسے ہو رہے تھے، جلد احمد کے پاس چلے آئے احمد طرح طرح کی کرامات دکھاکر اُن کو یقین دلاتا تھا کہ عیسائیوں کے قلعوں کے سامنے پہنچتے ہی اُن کی دیواریں آپ سے آپ گر پڑیں گی۔ غرض چند ماہ میں احمد نے ساٹھ ہزار بربر کا لشکر جمع کر لیا اور اب دریائے دویرہ کا رُخ کیا۔ سمورہ[1] پہنچ کر ایک خط اوفونش سوم کے نام جو اُس وقت سمورہ میں موجود تھا اس مضمون کا لکھا کہ "اگر اوفونش اور اُس کی رعایا نے فوراً اسلام قبول نہیں کیا تو وہ سب غارت کر دیے جائیں گے"۔ یہ خط پڑھ کر اوفونش اور اُس کے درباری مارے غصہ کے لرز اٹھے اور احمد بن معاویہ پر حملہ کرنے کی غرض سے گھوڑوں پر چڑھ فوراً چل پڑے، بربر کے رسالوں نے مقابلہ کیا، دریائے دویرہ میں اس وقت پانی کم تھا، کیونکہ جون کا مہینہ تھا، اس لیئے دریا کی گذرگاہ میں لڑائی ہونے لگی قسمت نے لیون کے عیسائیوں کا ساتھ نہ دیا۔ بربر نے عیسائیوں کو شکست دے دی اور اُن کو سمورہ میں واپس نہ جانے دیا بلکہ دیہات کی طرف بھگا دیا۔

لیکن اِس پہلے ہی معرکہ میں مسلمانوں کی فتح ایسی علامت نہ تھی جس سے لڑائی کے قرار واقعی انجام کا پتہ چل جاتا، احمد نے مہدی بن کر اپنی سپاہ میں بہت رسوخ پیدا کر لیا تھا اور اُس میں خود بینی اس قدر ہو گئی تھی کہ سپاہ کو زبان سے نہیں بلکہ اشاروں سے حکم دیتا تھا اور اس کے انہی اشاروں پر کل فوج نہایت مستعدی سے کام کرتی تھی، لیکن جس قدر سپاہیوں میں اُس کی عزت اور قدر بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر فوج کے سرداروں میں اُس کی طرف سے حسد کو ترقی ہوتی تھی، اِن سرداروں کو یہ خیال ہُوا کہ اگر یہ مہدی عیسائیوں سے لڑائی جیت گیا تو وہ ہمارے قبیلوں کا سردار بن جائے گا، اُس کے مہدی ہونے کے یہ لوگ قائل نہ تھے نتیجہ ان سرداروں نے احمد کو قتل کرنے کا ارادہ کیا، لیکن وہ اس ارادہ میں کامیاب نہ ہوتے لڑائی سے بھاگتے ہوئے عیسائیوں کے پیچھے مسلمان جا رہے تھے کہ بربر کے قبیلہ نفرہ

---

[1] سمورہ دریائے دویرہ کے داہنے کنارے پر واقع تھا۔

کے سب سے بڑے سردار نے جس کا نام زلل بن لعیش تھا اپنے دوستوں سے کہا کہ "لیون کے عیسائیوں کو شکست دینے میں انہوں نے سخت حماقت کی ہے، جس کی اصلاح فوراً ہونی چاہیئے" (۴۱۴ء

بہت سے فوجی ابنِ لعیش کے ساتھ ہو گئے اور انہوں نے باہم یہ فیصلہ کیا کہ مہدی نے جو جو تدبیریں سوچی ہیں اُن سب کو اُلٹ دینا چاہیئے، چنانچہ ابن لعیش نے اپنے ساتھیوں کو میدان سے ہٹ جانے کا حکم دے دیا اور جب وہ دریائے دویرہ سے اُتر کر اُس کے داہنے کنارے پر پہنچ گئے جہاں اُن کی چھاؤنیاں تھیں تو انھوں نے اپنا کل مال و اسباب جمع کر کے یہ ظاہر کیا کہ اُن کو شکست ہو گئی ہے اور عیسائی اُن کے تعاقب میں ہیں (حالانکہ مضمون اُلٹا تھا) لشکر کے اور لوگوں نے اُن کے کہنے کا یقین کر لیا، کیونکہ یہ تھوڑے سے آدمی تھے، ابنِ لعیش کے ساتھ اُس کے کل ساتھی موجود نہ تھے، کیوں کہ انھوں نے یا تو اُس کے حکم کو مانا نہ تھا یا سُنا نہ تھا۔

غرض شکست کی خبر سُن کر بربر کے لشکر میں ابتری پڑ گئی اور یہ سمجھ کر کہ سلامتی بھاگنے میں ہے بہت سی فوج دریائے دویرہ کی طرف بھاگی، سمورہ کے قلعے میں جو عیسائی ابھی تک موجود تھے وہ بربر کو بھاگتے دیکھ کر قلعے سے نکل کر حملہ کرنے لگے اور بربر کے بہت سے آدمیوں کو جو دریا پر جانا چاہتے تھے قتل کر دیا، لیکن مسلمانوں کی فوجوں نے جو دریائے دویرہ کے بائیں کنارے پر تھیں عیسائیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا، دو دن تک یہی حالت رہی کہ عیسائیوں کو کسی قسم کی کامیابی نہ ہوئی، لیکن جب احمد بن معاویہ المہدی کی فوج والوں نے اُس سے علیحدہ ہونا شروع کیا تو عیسائیوں کی قسمت جاگ اُٹھی اور اُن کے حق میں یہ بڑی مدد ہو گئی۔

مہدی نے اپنی فوج والوں کو بہت سمجھایا کہ "فتح بالآخر ہماری تقدیر میں اُتری ہے، میدان نہ چھوڑو" مگر کسی نے اُس کا کہنا نہ مانا، تیسرے دن جب مہدی نے دیکھا کہ سب نے ساتھ چھوڑ دیا ہے تو ناامید ہوا اور اس خیال سے کہ اس شرمندگی کے بعد زندگی عبث ہو گی گھوڑے کو مہمیز کیا اور عیسائیوں کے بیچ میں پہنچ کر جیسی موت حاصل کرنی چاہتا تھا، وہ حاصل کی عیسائیوں نے احمد کی لاش سے انتقام لیا اور اُس کا سر کاٹ کر سمورہ کے

دروازے پر نصب کر دیا۔

اس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیون کے عیسائیوں کی ہمت بڑھی، طلیطلہ کے عیسائیوں اور بالخصوص ریاست نبرہ کے والی شانجہ اعظم کی مدد پر بھروسہ کر کے اب عیسائی اسلامی اسپین کو ایسا شکار سمجھنے لگے جو کبھی اُن کے ہاتھ سے بچنے نہ پائے گا۔

ریاست نبرہ کے بادشاہ شانجہ اعظم کو اس وقت بہت قوت حاصل تھی، اس لئے جنوبی انطارع اسپین کو جو مسلمانوں کے قبضے میں تھے عیسائیوں نے اُسی نظر سے دیکھنا شروع کیا جیسے قزاق اور لٹیرے مسافر کے مال کو دیکھتے ہیں، لیکن یہ عیسائی اگرچہ صاحبِ ریاست ہو گئے تھے مگر ابھی تک ایسے مفلس اور تنگ دست تھے کہ اُن کے پاس سکّہ نہ تھا، مال کے عوض میں مال دے کر خرید و فروخت کرتے تھے، ان کے پادریوں نے جن کے وہ بے انتہا معتقد تھے اور نذرانے دے دے کر اُن کو بہت مالدار بنا دیا تھا یہ سمجھا دیا کہ "آسمانی بادشاہی" میں شریک ہونے کے لئے مسلمانوں سے لڑنے سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں ہے، اندلوسیہ یعنی اسپین کے جنوبی علاقے جو بہت دولت مند ہیں اور مسلمانوں کے قبضے میں ہیں اُن کو لوٹنے میں دین اور دُنیا دونوں کی برکتیں حاصل ہوں گی۔ اور اب اُن کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کیا اسلامی اسپین اُن کے پنجے سے کبھی بچ سکے گا؟ اگر وہ بچ گیا تو پھر عیسائیوں کی تقدیر ہمیشہ کے لئے پھوٹ جائے گی۔

لیون کے عیسائی ایسے ظالم اور سفاک تھے کہ لڑائی جیت کر دشمن کو امان دینی نہ جانتے تھے، جہاں کسی شہر پر اُن کا قبضہ ہوا شہر کے کل آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے[۱] مسلمانوں نے جیسی جیسی رعائتیں عیسائیوں کے ساتھ کی تھیں عیسائیوں سے اُن کی توقع ہونی قطعی ممکن نہ تھی، اب سوال یہ تھا کہ ان وحشی عیسائیوں کے ہاتھوں جو لکھنا پڑھنا تک نہ جانتے تھے۔ عربی تہذیب و تمدن کا جو روز افزوں ترقی پر تھا کیا درجہ ہوگا؟ ان وحشی جاہل عیسائیوں کا یہ حال تھا کہ جب انہیں اپنے کھیتوں کی پیمائش کرنی ہوتی تھی تو کسی مسلمان کو بلوا کر پیمائش

[۱] اگرچہ مصنف نے تصریح نہیں کی مگر اس قسم کے قتلِ عام میں غالباً عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے ہوں گے (مترجم)

کرانتے تھے اور جب کتب خانہ کا لفظ بولتے تھے تو اُن کی مراد صرف ایک کتاب یعنی انجیل سے ہوتی تھی،

اوپر کے اِس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر عبد الرحمٰن کو اپنے ابتدائی دورِ حکومت میں جو کام کرنا تھا وہ ایک عظیم الشان اور نہایت شریفانہ کام تھا، اُس کو صرف اپنے ملک ہی کو نہیں بلکہ تہذیب و تمدن کو بھی آفات سے محفوظ رکھنا تھا اور جو مشکلات اس کو درپیش تھیں وہ دشوار تریں اور سخت تھیں، اوّلاً اپنی ہی رعایا کو مطیع و محکوم کرنا تھا، پھر ایک طرف شمال کے عیسائی وحشیوں کو اپنے سے دُور رکھنا تھا جن کی گستاخیاں اسلامی سلطنت کے ضعف کے ساتھ بڑھتی جاتی تھیں، دوسری طرف جنوب کے وحشیوں سے مقابلہ تھا جنہوں نے افریقہ کے ایک حصّے پر دفعتہً قبضہ پالیا تھا اور اس خیال میں تھے کہ جنوبی اسپین کے علاقے ہمارے ہاتھ کے نیچے ہیں۔

باوجود ان تمام دشواریوں کے امیر عبد الرحمٰن کو کبھی کسی بات کا خوف نہ ہوا، یہ تو ہم ابھی پڑھ ہی چکے ہیں کہ اپنے ملک کو کس طرح مطیع کر کے عبد الرحمٰن نے اُس میں امن و امان پیدا کیا تھا، اب یہ دیکھنا ہے کہ باہر کے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لئے اُس نے کیا کیا سامان کیے ؟

اسناد :-

عریب	جلد ۱ ص ۱۹۰
ابن عذاری	جلد ۱ ص ۲۹۵
	جلد ۲ ص ۲۷
سعید طلیطلی	ص ۲۴۶
حمیدی	ص ۲۷ / ۴۷
ابو المحاسن	جلد ۱ ص ۴۲۰ تا ۴۲۱
ابن خلکان	جلد ۷ ص ۶۱

مقری جلد ۱ ص ۱۳۶

جلد ۲ ص ۹، ۱۰، ۱۲۱، ۳۷۶، ۶۷۱ تا ۶۷۲

عبیدو ر ص ۵۸

موناکی سیلنسیس کرونیکون، اسپینا سگرادا۔ جلد ۱۷ ص ۲۷۰ تا ۳۳۰

کرونیکون کرنم بری سنسی جلد ۲

کرونیکون البیلدی ص ۶۴

ابن حیان ص ۸۳، ۹۸ تا ۱۰۲

کرونیکون دی ساپیرد۔ اسپینا سگرادا۔ ص ۱۴

کتابِ ثالث

خلافت

دُوسری فصل

امیر عبدالرحمٰن ثالث کا سب پر غالب آنا

امیر عبدالرحمٰن ثالث کی حکومت کا ابتدائی زمانہ تھا کہ لیون کے عیسائیوں سے ایک نزاع ۱۲۱
پیدا ہُوا، بانی اس نزاع کا عبدالرحمٰن نہ تھا، ابتدا اس جھگڑے کی اس طرح ہوئی کہ لیون
کے رئیس اردون ثانی نے ماردہ کے علاقے میں ڈاکے ڈالنے شروع کئے، الحنش یا الحنث
کے قلعے پر قبضہ کر کے جس قدر مسلمان وہاں موجود تھے اُن کو قتل کر دیا، عورتوں اور بچوں کو
گرفتار کر کے غلام بنایا، ماردہ سے قریب ہی بطلیوس کا شہر تھا اور ان دونوں شہروں کے والی
تختِ قرطبہ سے باغی اور منحرف تھے، اردون رئیس لیون کی لوٹ مار سے بطلیوس کے لوگ
اس قدر خائف ہوئے کہ انہوں نے تجارت کا بہت قیمتی مال جمع کر کے اپنے والی شہر کی معرفت
اردون کو بطور نذرانے کے پیش کر کے امان چاہی، اردون نے اہلِ بطلیوس کو نہیں لوٹا۔
اور مقامات پر لوٹ مار میں جو کچھ مال ہاتھ آیا تھا اُسے ساتھ لئے دریائے تاجہ اور دریائے

دویرہ کو عبور کرتا ہوا ایک فاتح کی صورت اختیار کر کے اپنے دار الحکومت لیون کو واپس آیا، یہاں آکر اس فتح کی شکر گزاری میں ایک گرجا تعمیر کرا کے حضرت مریم کے نام سے اُسے معنون کیا، (کیا عجب ہے یہ گرجا لوٹ کے مال سے تعمیر ہوا ہو۔ مترجم)

اردون والی لیون نے جن علاقوں کو لوٹا تھا وہ تختِ قرطبہ سے باغی تھے اور ابھی تک امیر عبدالرحمٰن کی اطاعت اُنہوں نے قبول نہیں کی تھی، امیر اگر چاہتا تو ایسے باغیوں کے علاقوں کے لُٹنے کی پروا نہ کرتا، مگر یہ بات اُس کی تدبیر سیاست کے خلاف تھی، یہ امر ثابت کر کے کہ مصیبت کے وقت بادشاہ ہی معاون اور مددگار ہو سکتا ہے وہ باغی رعایا کا دل رکھنا چاہتا تھا، عبدالرحمٰن نے اردون کو ان کی قزاقیوں کی سزا دینے کا قطعی ارادہ کر لیا، اور ماہ جولائی ۹۱۶ء (محرم ۳۰۴ھ) میں اُس نے ایک لشکر ابن ابی عبدہ کی سرکردگی میں جو اُس کے دادا کے باپ امیر محمد کا پرانا سپہ سالار تھا روانہ کیا، لیون پر مہدی کی مہم کے بعد سے اب پندرہ برس ہوئے تھے یہ پہلی فوج کشی مروانیوں کی طرف سے ہوئی تھی، لڑائی میں لیون والوں کو شکست ہوئی اور مسلمانوں کو مالِ غنیمت بہت ملا۔

اس کے ایک سال بعد ۳۰۵ھ ۹۱۷ء میں سرحد کے مسلمانوں نے امیر عبدالرحمٰن سے عرض کیا کہ لیون والوں نے دریائے تاجہ کے کنارے شہر طلبیرہ کے مضافات کو جلا دیا ہے، ان عیسائیوں کا تدارک ہونا چاہیئے، امیر نے ابن ابی عبدہ کو اہلِ لیون کے مقابلہ میں پھر فوج کشی کا حکم دیا، ابن ابی عبدہ ایک بڑا لشکر لے کر روانہ ہوا جس میں تنخواہ دار سپاہی بھی جو افریقہ کے شہر طنجہ سے بھرتی ہوئے تھے شامل تھے، امیر لشکر ابن ابی عبدہ کو حکم تھا کہ قلعہ شنت اشتبان، غرماج یا قاسطر موریش کا جاتے ہی محاصرہ کر لے، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

شروع میں معلوم ہوتا تھا کہ مسلمان لڑائی جیت لیں گے، قلعہ کو عیسائی گو بچانے کی بہت کوشش کرتے تھے مگر مسلمانوں نے اُن کی حالت بہت زبوں کر دی تھی اور وہ تنگ ہو کر ہتھیار ڈالنے کو تھے کہ اردون اُن کی مدد کے لئے آگیا، اور ابن ابی عبدہ پر اُس نے حملہ کیا، ابن ابی عبدہ کی فوج میں بدقسمتی سے صرف طنجہ کے تنخواہ دار سپاہی موجود نہ تھے بلکہ بہت سے سرحدی بھی تھے جن کی ہمت و مردانگی پر بھروسا کرنا ممکن نہ تھا، یہ

سرحدی لوگ آدھے بربر اور آدھے اسپینی دوغلی نسل کے تھے، اُن کی حالت یہ تھی کہ جب لیون کے عیسائی اُن کو لوٹتے تھے تو امیر سے مدد کے خواستگار ہوتے تھے، خود اتنی طاقت نہ رکھتے تھے کہ دشمن سے اپنے کو بچائے رکھیں اور اُس کے ساتھ اس قدر عقل بھی نہ تھی کہ امیر کے مطیع اور فرمانبردار ہو کر رہتے، غرض ان سرحدی لوگوں نے لیون والوں سے شکست کھائی اور اس طرح بھاگے کہ تمام لشکر کو بے ترتیب کر دیا۔

ابن ابی عبدہ نے یہ دیکھ کر کہ لڑائی ہاتھ سے جاتی رہی میدان سے ہٹنا گوارا نہ کیا، بہت سے جاں نثار سپاہی اُس کے گرد جمع ہو گئے یہ سب اپنے سپہ سالار کے ساتھ عیسائیوں کی تلواروں سے کٹ کر جاں بحق ہوئے۔

عربی مورخوں کا بیان ہے کہ مسلمانوں کا لشکر میدان سے ہٹ کر صحیح سلامت اسلامی حدود کے اندر آ گیا تھا، لیکن عیسائی مورخ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ شکست ایسی سخت ہوئی تھی کہ تمام جنگل، پہاڑ اور میدان، دریائے دویرہ سے لے کر اتنیشہ تک مسلمانوں کی لاشوں سے پٹے پڑے تھے۔

امیر عبدالرحمٰن ہمت ہارنے والا آدمی نہ تھا، فوراً اس نقصان کی تلافی کا بندوبست کیا، مگر دوسرے سال عیسائیوں سے لڑنے کی تیاریاں کرتا تھا کہ افریقیہ میں چند مشکل معاملات کی طرف اُسے متوجہ ہونا پڑا۔

فاطمیین افریقیہ سے امیر عبدالرحمٰن کی کوئی لڑائی ابھی تک شروع نہیں ہوئی تھی، لیکن اُنھوں نے موریتانیہ[1] کو فتح کر لینے کا قصد کر لیا تھا، اگرچہ اُنھوں نے کوئی ایسی بات نہ کی تھی کہ امیر عبدالرحمٰن سے لڑائی چھڑ جاتی، لیکن عبدالرحمٰن سمجھ گیا کہ موریتانیہ کو تسخیر کرتے ہی فاطمیین اسپین پر بھی ہاتھ ڈالیں گے، اس لئے موریتانیہ کی ریاستوں کی مدد کرنی اُس کا فرض ہے تاکہ فواطم اُن کو مغلوب نہ کر سکیں اور موریتانیہ کا علاقہ افریقہ کے فاطمیوں اور اسپین کے مروانیوں کی سلطنتوں میں ایک دیوار کی مثل حائل رہے، مگر اس کام کے لئے

---

[1] موریتانیہ سے مطلب موجودہ علاقہ مراکش مع ملک الجیریا کے نصف مغربی حصے کو سمجھنا چاہیئے۔ مترجم

اعلانِ جنگ کرنا قبل از وقت اور خلافِ مصلحت ہوتا، کیونکہ ابھی ایک بغاوت اپنے ہی ملک میں فرو کرنی تھی اور شمال کے عیسائیوں کا زور توڑنا بھی لازمی تھا، اس صورت میں یہ درست نہ تھا کہ فاطمیوں سے لڑائی چھیڑ کر اس بات کا اندیشہ پیدا کر لیا جائے کہ ایک دن فاطمی اپنے جہازوں کے ذریعے اسپین میں فوجیں لا اُتاریں، مناسب تدبیر یہی تھی کہ مورِیتانیہ میں جو والیانِ ریاست فاطمیوں کی دست برد سے اپنے کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے، اُن کو مدد پہنچائی جائے۔

اس تدبیر پر عمل کرنے کا موقع اُس وقت آیا جب کہ ۳۰۹ھ؁ میں فاطمیوں نے مورِیتانیہ کی ریاست نکور[1] پر حملہ کیا، نکور کا بادشاہ عربی نژاد تھا اور نکور کے علاقے پر اُس کی حکومت افریقیہ میں اسلامی فتوحات کی ابتدا سے چلی آتی تھی، اس حکمران خاندان کی اسلامی حمیّت و غیرت مشہور تھی اور جس زمانہ سے اس خاندان کی دو شہزادیوں کو جن کے نام امتہ الرحمٰن اور خنولہ تھے اور جو واقف بن معتصم بن صالح کی بیٹیاں تھیں، نارمن قزاقوں کی قید سے روپیہ دے کر محمد بن الحکم امیرِ اسپین نے رہا کرایا تھا، اُس وقت سے شاہانِ نکور کے تعلقات سلاطینِ اسپین سے اور زیادہ ہو گئے تھے اسی خاندان کے ایک بزرگ جو بڑے فقیہہ تھے اور چار حج کر چکے تھے امیر عبداللہ کے زمانے میں اسپین میں جہاد میں شریک ہونے کی غرض سے آئے تھے، لیکن جب ساحلِ اسپین پر اُترے تو عمر بن حفصون نے اُن کا کُل مال و اسباب لوٹ لیا اور اُن کے نوکروں کو قتل کر دیا، چنانچہ جب امیر عبداللہ کے پاس یہ پہنچے تو تنہا تھے، اُس کے بعد یہ ایک معرکہ میں جو دلیسم والی ندومیر کے مقابلے میں ہوا مارے گئے قصہ مختصر جس وقت مورِیتانیہ پر فاطمیوں نے فوج کشی کی تو نکور میں سعید ثانی اُس وقت بادشاہی کرتا تھا، فاطمیوں کے امیرِ لشکر نے جس وقت سعید کے پاس اطاعت

---

[1] نکور، علاقہ ریف (مراکش) کا ایک شہر تھا۔ راس ترس فورکاس سے مغرب جنوب مغرب میں ۸۰ فرسخ کے فاصلے پر۔ اس شہر کا نام بعد کو "مزمہ" رکھ دیا گیا۔
(کتاب "تحقیقات" مصنفہ ڈوزی مطبوعہ ۱۸۸۱ء جلد ۲ صفحہ ۲۷۹)

قبول کرنے کا پیغام بھیجا تو سعید نے قطعی انکار کر دیا اور اپنے ملک الشعراء احمس کے ذریعے سے جو اسپینی مسلمان تھا فاطمیین کی توہین بھی کی، خلیفہ عبیداللہ المہدی کے پیغام کے ساتھ چند اشعار بھی لکھے ہوئے سعید کے پاس بھیجے گئے تھے جن کا مطلب یہ تھا، کہ اگر اہل نکور نے اطاعت قبول نہ کی تو وہ بالکل غارت اور تباہ کر دیے جائیں گے، لیکن اگر وہ مطیع ہو گئے تو پھر عدل و انصاف اُن کے ملک میں قائم ہو جائے گا۔ اِن اشعار کا جواب نکور کے ملک الشعراء احمس طلیطلی نے مندرجہ ذیل اشعار میں دیا:۔

"خانہ کعبہ کی قسم تو جھوٹ بولتا ہے، تو جانتا بھی نہیں کہ عدل و انصاف کسے کہتے ہیں، ابتدائے آفرینش سے تا ایں دم راستی اور نیکی کا کوئی کلمہ کبھی تیری زبان سے نکلا ہی نہیں، تو مکار ہے اور کافر ہے۔ تیری ہدایت اور تلقین بیوقوفوں کے لئے ہے، شریعت جس کے محکوم ہمارے تمام اعمال ہونے چاہئیں اُسے تو نے توڑ دیا ہے، ہماری خواہشوں میں جو چیز سب سے اعلیٰ اور افضل ہے وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ہے۔ مگر تیرا دل ایسی چیزوں پر جما ہے، جو قبیح اور مذموم ہیں۔"

عبیداللہ المہدی کو اِن اشعار پر ایسا غصہ آیا کہ فوراً حاکم تاہرت مصالہ کو نکور پر حملہ کرنے کا حکم بھیج دیا۔ یہاں کا بادشاہ سعید بڈھا آدمی تھا، نکور کی شہر پناہ نہ تھی کہ اُس میں پناہ لیتا۔ مجبوراً فوج لے کر دشمن کے مقابلہ کو نکلا، تین دن تک کامیابی کے ساتھ دشمن کو روکے رکھا، لیکن آخر کار اُس کے ایک فوجی افسر نے اُسے دھوکا دیا اور سعید مع اپنی سپاہ کے میدانِ کارزار میں مارا گیا یہ واقعہ ۳۰۵ھ ۹۱۷ء کا ہے۔

سعید کے مارے جانے پر مصالہ حاکم تاہرت، نکور میں داخل ہوا شہر کے مردوں کو قتل کیا، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لونڈی غلام بنایا۔

سعید کے تین بیٹے تھے، باپ نے لڑائی سے پہلے ہی اُن کو ہوشیار کر دیا تھا، چنانچہ

لہ دیکھو اِسی تصنیف کی کتاب ثانی۔ فصل ۱۷

یہ تینوں بھائی جہاز پر سوار ہو اسپین کے ساحل پہ مالقہ کے شہر میں صحیح سلامت جا اُترے، امیر عبدالرحمٰن کو خبر ہوئی تو عمالِ مالقہ کو حکم بھیجا کہ شہزادوں کی مہمانداری بہت تپاک سے کی جائے اور ایک خط شہزادوں کو اِس مضمون کا لکھا کہ ”اگر آپ کی مرضی ہو تو ملاقات کے لئے قرطبہ تشریف لائیں اور اگر مالقہ ہی میں قیام کرنا پسند کرتے ہیں تو وہیں قیام کریں“۔ شہزادوں نے جواب دیا کہ ”ہم ایسے مقام پہ رہنا پسند کرتے ہیں جو ہماری ریاست سے جہاں اس وقت ہنگامہ برپا ہے نزدیک ہو کیونکہ ہمیں جلد وطن واپس جانے کی امید ہے“۔ (۱۹م)
چنانچہ اُن کی یہ اُمید پوری ہوئی: نکور فتح کرنے کے بعد مصالہ چھ مہینے تک وہیں مقیم رہا، اس کے بعد کنامہ کے ایک سردار کو جس کا نام ذلول تھا نکور کا حاکم بنا کر خود تاہرت واپس چلا گیا، ذلول کے پاس فوج کم تھی، نکور کے چند ہوا خواہ شہزادوں کو مالقہ میں ایک ایک بات کی خبر پہنچاتے رہے، شہزادوں نے جہازوں کا بندوبست کیا اور مالقہ سے نکور روانہ ہو گئے اور آپس میں یہ طے کیا کہ جو بھائی نکور میں پہلے پہنچے وہی تخت کا مالک ہو۔ چنانچہ سب سے چھوٹا بھائی صالح سب سے پہلے ساحلِ نکور پر پہنچا، ساحل کے بربر قبیلے صالح کے آنے سے بہت خوش ہوئے اور فوراً اُسے اپنا امیر مان لیا۔

اب صالح نے اِن بربر قبائل کی مدد سے نکور پر حملہ کیا، ذلول اور اُس کی فوج کو جو نکور میں تھی قتل کر دیا۔

صالح جب ریاست کا مالک ہو گیا تو اُس نے امیر عبدالرحمٰن کو خط لکھا، اور اُس کی مہمان نوازی کا شکریہ لکھ کر نکور پہ پھر قبضہ پانے کا مژدہ سنایا، اس کے ساتھ ہی صالح نے اپنی کل ریاست میں اس امر کا اعلان کر دیا کہ یہ ریاست امیر عبدالرحمٰن کو اپنا سرپرست اور بادشاہ تسلیم کرتی ہے۔ عبدالرحمٰن نے اس کے جواب میں صالح کو بہت سے خیمے اور عَلَم اور ہتھیار بھیجے۔

نکور کے معاملات کی وجہ سے اگر امیر عبدالرحمٰن اردون بادشاہِ لیون سے ابن ابی عبدہ کی موت اور اُس کی سپاہ کا بدلہ لینا بھول بھی جاتا تو بھی شمال کے عیسائی ایسے نہ تھے کہ اُس کو اپنی طرف متوجہ نہ کر لیتے ۳۰۵ھ/۹۱۸ء کی فصلِ ربیع میں اردون بادشاہِ لیون نے اپنے

دوست شانجہ رئیس نبرہ کے ساتھ ہو کر تاجرہ اور قطیلہ کے نواح میں ڈاکے مارنے شروع کئے اور پھر تقیرہ کے مضافات پر قبضہ کر کے اُس کے قلعے کی عالیشان مسجد کو جلا دیا، عبدالرحمٰن نے سُنتے ہی اپنے حاجب بدر کو ایک لشکر کے ساتھ مقابلہ کے لئے روانہ کیا اور سرحدی علاقوں میں فرمان بھیجا کہ وہاں کے لوگ ایک مرتبہ اور شاہی لشکر کے ساتھ ہو کر لڑیں تاکہ جو نقصان گذشتہ سال ہوا ہے اُس کی تلافی ہو جائے۔

یہ لشکر قرطبہ سے ۷ر جولائی ۹۱۸ء (۲۴ر محرم ۳۰۶ھ) کو روانہ ہؤا، لیون کی عملداری میں قدم رکھتے ہی عیسائی فوجوں نے قرطبہ کی فوجوں پر سخت حملہ کیا، ان عیسائیوں نے پہاڑوں میں اپنا ایک حصار قائم کر لیا تھا، ۱۴ر اور ۱۵ر اگست ۹۱۸ء (۲ر اور ۴ر ربیع الاوّل ۳۰۶ھ) کو متونیا کے مقام پہ دو مرتبہ سخت لڑائی ہوئی، دونوں میں عیسائیوں کو شکست اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

یہ شکستیں عیسائیوں کو ایسی زبردست ہوئیں کہ خود عیسائیوں کے مؤرخ اِس بات کے مقر ہیں کہ عیسائی اپنے دل کو صبر و تسکین دینے کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام کے وہ اقوال یاد کرنے لگے جو آپ نے لڑائیوں کے غیر متیقن نتائج کی نسبت فرمائے تھے۔

امیر عبدالرحمٰن نے ان لڑائیوں کو فتح کر کے ابن ابی عبدہ والی شکست کا بدلہ نکال لیا، مگر یہ سمجھ کر کہ ابھی لیون والے اچھی طرح سیدھے نہیں ہوئے ہیں اور اس شوق میں کہ جو سرخروئی اپنے افسرانِ فوج کو کفار سے لڑ کر حاصل ہوئی ہے وہی خود بھی حاصل کی جائے جون ۹۲۰ء (محرم ۳۰۸ھ) میں امیر عبدالرحمٰن نے بنفسہٖ اپنی فوج کی سپہ سالاری اختیار کی، قلعہ وشمہ کو ایک تدبیر سے فتح کیا، اِس قلعے کے حاکم نے اِس شرط پر کہ اُس کے قلعے کو صحیح سلامت چھوڑ دیا جائے امیر عبدالرحمٰن سے بہت سے وعدے وعید کر لئے امیر نے اس عیسائی حاکم کی بُزدلی سے نفع اٹھایا اور یہ ظاہر کر کے کہ اُس کی درخواست منظور کی گئی، مدینہ سالم کے راستے دریائے آبرہ کا رخ کیا، لیکن راستے ہی سے لشکر کو بائیں ہاتھ مڑنے کا حکم دے کر دریائے دویرہ کے کنارے کنارے چلا اور ایک دستہ سواروں کا وشمہ کے مضافات کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے پہلے سے روانہ کر دیا، وشمہ کے لوگ غافل تھے (۴۲۰)

سواروں کے رسالے کو دیکھ کر ایسے بدحواس ہوئے کہ فوج کے کل سپاہی قلعہ چھوڑ کر بھاگتے ہوئے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ گئے، اب مسلمانوں نے قلعہ وشمہ کو بلاکشت وخون فتح کر کے اُس میں آگ لگا دی۔

وشمہ کے بعد شاہی فوج شنت اشتیبان غرماج کے قلعے کی طرف بڑھی، فوج جب قلعے تک پہنچی تو اُسے خالی پایا، قلعہ والے پہلے ہی بھاگ گئے تھے، مسلمانوں نے اِس قلعہ کو اور اُس کے پاس کے ایک قلعہ کو جس کا نام القبیلہ تھا منہدم کر دیا، اس کے بعد لشکرِ شاہی فلنہ کی طرف بڑھا، یہ بڑا پرانا شہر تھا جس کے ویرانے ابھی تک باقی ہیں، معلوم ایسا ہوتا تھا کہ لیون کے لوگوں نے قصد کر لیا تھا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کسی مقام پر بھی نہ کریں گے، کیونکہ مسلمان جب فلنہ میں پہنچے تو یہ بھی خالی تھا، شاہی فوج والوں نے اس شہر کے اکثر گرجا اور مکانات مسمار کر دیے۔

شانجہ رئیسِ نبرہ کی لوٹ مار سے نطیلہ کے لوگوں نے تنگ آ کر امیر سے درخواست کی، امیر نے شانجہ کی سرکوبی کے لئے اپنا لشکر نبرہ کی طرف بڑھایا، لشکر سے چھوٹی چھوٹی منزلیں طے کرائیں تاکہ وہ تھکے نہیں، فلنہ سے پانچ دن کے سفر میں شاہی لشکر نطیلہ پہنچ گیا، شاہی سواروں کا ایک رسالہ حاکمِ نطیلہ محمد بن لب کے تحت میں تھا، عبدالرحمٰن نے محمد بن لب کو قلعہ قرقر (یا کرکر) پر حملہ کرنے کا حکم دیا، یہ قلعہ رئیسِ نبرہ، شانجہ نے نطیلہ کے لوگوں کو ہر وقت خوف میں رکھنے کے لئے تعمیر کرایا تھا، محمد بن لب کا رسالہ جس وقت قلعہ میں پہنچا تو اُسے خالی پایا، اِسی طرح جب قلعہ کرکر سے بڑھ کر قلہرہ میں لشکر پہنچا، جہاں شانجہ اس وقت تھا، تو وہ بھی خالی نظر آیا، شانجہ اِسلامی فوج کے آنے کی خبر سُنتے ہی قلہرہ سے بھاگ کر ارنیط چلا گیا تھا۔

بہرکیف جب مسلمانوں نے دریائے ابرہ کو عبور کر لیا تو شانجہ نے مسلمانوں کے مقدمۃ الجیش پر حملہ کیا، لڑائی زور شور سے شروع ہو گئی اور مسلمانوں نے دکھا دیا کہ خالی قلعوں اور شہروں پر قبضہ کرنے کے علاوہ بھی وہ کچھ کام کرنا جانتے ہیں، چنانچہ اس موقع پر انھوں نے عیسائیوں کو نہایت سخت شکست دی اور اُن کو میدانوں سے بھگا کر پہاڑوں

کی طرف ہانک دیا۔

شکست کھا کر اور مسلمانوں کے مقابلہ میں تنہا ہمت ہار کر شانجہ نے اردون سے مدد چاہی، اردون مدد پر تیار ہوا اور اب دونوں نے شاہی لشکر کے آگے یا پیچھے کے حصّے پر جیسا موقع ہوا حملہ کرنا چاہا، اس عرصے میں اُن عیسائیوں نے جو ابھی تک پہاڑوں میں تھے یہ کیا کہ شاہی لشکر جب گھاٹیوں اور درّوں میں سے گزرنے لگا، تو نقصان پہنچانے کے لئے اُس کے دائیں بائیں ہو لئے اور جب خود بلندی پر ہوئے اور مسلمانوں کی فوج پہاڑوں کے نیچے ہوئی تو پتھر لڑھکا لڑھکا کر مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچانے لگے کبھی مسلمانوں کو ڈرانے کے لئے نہایت شدت سے شور و غُل مچاتے تھے۔ ۷۲۱ء

اسلامی فوج اِس وقت فی الحقیقت بہت خطرے کی حالت میں تھی، اِس وقت اُس کو اُن پہاڑی عیسائیوں سے واسطہ پڑا تھا جن کے بزرگوں نے بادشاہ افرنجہ قرلہ کی فوج کو اِنہی پہاڑوں میں دَرّہ شاذر سے گذرتے وقت غارت کر دیا تھا، اپنے بزرگوں کی غارت گری ان پہاڑی قوموں کو یاد تھی اور اب وہ امیر عبدالرحمٰن کی فوجوں کا بھی وہی درجہ کرنا چاہتے تھے جو اُن کے بزرگوں نے قرلہ کی فوجوں کا کیا تھا، امیر عبدالرحمٰن اس خطرہ کو خوب سمجھ رہا تھا، چنانچہ ایک کشادہ گھاٹی جب راہ میں آئی جسے نزسلوں کی گھاٹی (وادی قصب یا المقصبہ[1]) کہتے تھے تو وہاں کل لشکر کو قیام کا حکم دے دیا۔

اب عیسائیوں سے ایک بڑی غلطی ہوئی، پہاڑوں اور پہاڑیوں پر سے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی جگہ اب وہ میدان میں اُتر آئے اور جب مسلمانوں نے لڑنا چاہا تو بجائے ہٹ جانے کے لڑائی پر مستعد ہو گئے۔

اِس حماقت و جسارت کا نتیجہ یہ ہُوا کہ مسلمانوں نے اُن کو نہایت ہولناک شکست دی، عیسائی میدان سے بے تحاشا بھاگے، مسلمانوں نے ان بھاگتے ہوئے عیسائیوں کا غروبِ آفتاب تک پیچھا کیا، اور اُن کے بڑے بڑے فوجی سرداروں کو گرفتار کر لیا،

---

[1] یہ مقام اسپین میں مریڈہ اور سالیناس دی اورد کے درمیان واقع ہے

ان میں دو اسقف (بشپ پادری) بھی تھے، ایک کا نام ہرموجیوس اور دوسرے کا نام دلکی دلیوس تھا، ایک شہر توئی کا اور دوسرا ظلمنکہ کا رہنے والا تھا، یہ دونوں آدمی اُس زمانے کے دستور کے مطابق باوجود پادری ہونے کے مسلح ہو کر لڑائی میں شریک تھے، اس زبردست شکست میں تقریباً ایک ہزار عیسائیوں نے میدان سے فرار ہو کر قلعہ مویز میں پناہ لی، امیر عبدالرحمٰن نے اِس قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور اُس پہ قبضہ حاصل کر کے جس قدر آدمی اِس قلعہ کو مسلمانوں سے بچا رہے تھے اُنہیں قتل کر دیا۔

اب مسلمان نبرہ کے علاقے پہ مسلط ہو گئے اور عیسائیوں کے ایسے قلعوں کو جن میں تاب مقابلہ نہ تھی مسمار کر دیا اور اس بات پہ فخر کرنے لگے کہ دس میل کے دَور میں جو کچھ اُنہوں نے پایا اُسے جلا کر خاک کر دیا، غنیمت کا مال بہت مِلا، بالخصوص غلّہ، یہ اِس کثرت سے ہاتھ آیا کہ سپاہیوں کے ہاتھ برائے نام قیمت پر فروخت ہوا اور جو بچا اور اُس کے لے جانے کا بندوبست نہ ہو سکا، وہ جلا دیا گیا۔

مظفر اور منصور امیر عبدالرحمٰن نے ۸ ستمبر ۹۲۰ء (۲۰ ربیع الآخر ۳۰۸ھ) کو لشکر کو واپسی کا حکم دیا، جب لشکر کوچ کرتا ہوا اَنتیشہ میں پہنچا (جو مدینہ سالم سے مغرب کی سمت میں کچھ فاصلہ سے تھا) تو سرحدی فوجوں کو جنہوں نے ترسلوں والی گھاٹی (المقصبہ) کی لڑائی میں بڑے بڑے کام کئے تھے بہت سا انعام و اکرام دے کر اُن کی چھاؤنیوں کو واپس کر دیا، ۲۴ ستمبر ۹۲۰ء (۷ جمادی الاوّل ۳۰۸ھ) کو امیر عبدالرحمٰن قرطبہ میں داخل ہوا، کل تین ماہ دارالحکومت سے باہر رہا۔

عبدالرحمٰن کو اب یہ امید ہو سکتی تھی کہ اتنی لڑائیوں اور فتوحات کے بعد عیسائیوں کو اِسلامی عملداری میں پھر ڈاکے ڈالنے کی جرأت نہ ہو گی۔ لیکن مقابلہ ایسے دشمنوں سے تھا جو آسانی سے ہمت نہ ہارتے تھے، چنانچہ ۳۰۹ھ/۹۲۱ء میں رئیس لیون اردون نے اسلامی علاقوں پہ پھر فوج کشی کی، اگر ایک عیسائی مؤرخ کی تحریر کو باور کیا جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ اردون اِسلامی علاقے میں اِس قدر اندر پہنچ گیا تھا کہ قرطبہ وہاں سے ایک دِن کی راہ پہ تھا، لیکن اِس عیسائی مؤرخ نے اپنے ہم وطن عیسائیوں کی کامیابیوں میں ہمیشہ مبالغہ

کیا ہے، بہرکیف اِس کے دو برس بعد ۳۱۱ھ/۹۲۳ء میں اردون نے شہر ناجرہ پر قبضہ کر لیا اور اُس کا دوست شانجہ رئیسِ نبرہ بقیرہ کے شہر پر مستلط ہو گیا۔

بقیرہ پر جب عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تو اسلامی اسپین میں ہلچل پڑ گئی ہکیونکہ بیان ہوا ہے کہ جن جن مسلمانوں نے اس شہر کو بچانے کی کوشش کی تھی اُن سب کو عیسائیوں نے قتل کر دیا، ان لوگوں میں بڑے بڑے عالی نسب خاندانوں کے مسلمان تھے، یہ قتل ایسا تھا کہ اگر عبدالرحمٰن عیسائیوں سے اس کا انتقام نہ بھی لینا چاہتا تو بھی رائے عامہ انتقام لینے پر مجبور کرتی، مگر عبدالرحمٰن کو اِس کی ضرورت نہ تھی، بقیرہ کے واقعات پر اُس کو اِتنا غصہ آیا کہ لڑائی کے موسم کا بھی انتظار نہ کیا۔ اپریل ۹۲۴ء (محرم ۳۱۲ھ) کو وہ اپنا لشکر لیے قرطبہ سے نکلا تاکہ بقول ایک مسلمان مورخ کے "خدا اور خدا کے دین کا اس خبیث قوم کفار سے بدلہ لے"۔ ۱۰ جولائی ۹۲۴ء (۱۴ ربیع الآخر ۳۱۲ھ) کو امیر عبدالرحمٰن ریاستِ نبرہ میں پہنچ گیا۔

عبدالرحمٰن کے نام سے اب عیسائیوں پر ایسا خوف غالب ہوا کہ اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی اُنھوں نے اپنے قلعے خالی کر دئے۔ کرکر، بیر الته، فالکس، کرکفنیلو کے قلعوں سے امیر کا گذر ہوا، ہر مقام کو لوٹتا اور آگ لگاتا ہوا دار الریاست نبرہ یعنی شہر بنبلونہ کے قصد سے ملک میں گھس پڑا۔ شانجہ رئیسِ نبرہ نے شاہی فوج کو پہاڑی دروں میں روکنا چاہا لیکن ہر موقع پر شکست کھائی اور نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا اور عبدالرحمٰن بنبلونہ پہنچ گیا، یہاں دیکھا تو شہر خالی پڑا تھا، مسلمانوں نے شہر کے بہت سے مکانات اور شہر کے بڑے گرجا کو گرا دیا، اِس گرجا میں عیسائی زیارت کے لئے آیا کرتے تھے۔

اِس گرجا کو گرانے کے بعد امیر نے ایک اور گرجا کے مسمار کرنے کا حکم دیا، عیسائی اِس گرجا کی بہت تعظیم کرتے تھے، شانجہ نے زرِ کثیر صرف کر کے ایک پہاڑی پر اِسے تعمیر کرایا تھا، گرجا کے بچانے میں شانجہ نے بہت کوشش کی، مگر سب کوششیں فضول ثابت ہوئیں، ملک کو بچانے کی بھی جس قدر کوششیں عیسائیوں نے کیں اُن کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا، قشتالہ سے جس کا دار الحکومت برغش تھا، فوجِ کمک عیسائیوں کے پاس

پہنچی، دو مرتبہ عیسائی فوجوں نے مل کر شاہی لشکر پر حملہ کیا، لیکن ہر مرتبہ شکست کھائی اور
نقصان کے ساتھ پسپا ہونا پڑا۔

بنبلونہ کی اس لڑائی میں مسلمان بہت کم ضائع ہوئے اور اب شانجہ رئیسِ نبرہ
کو جو بہت مغرور تھا امیر عبدالرحمٰن کے سامنے گردن جھکانی پڑی اور آئندہ ایک مدّت
کے لئے وہ اس قابل نہ رہا کہ مسلمانوں کا مقابلہ کرتا۔

ریاست لیون کی طرف سے بھی عبدالرحمٰن کو اب کچھ اندیشہ نہ تھا، کیونکہ جنگِ بنبلونہ
سے پہلے ہی اُس کا رئیس اردون ثانی مر چکا تھا، اُس کا جانشین یعنی اُس کا بھائی
فردیلہ ثانی بھی ایک سال حکومت کر کے مر گیا، اُس کی زندگی کا بڑا کام فقط یہی تھا کہ شانجہ ۳۲۳ء
بادشاہِ نبرہ کو کچھ فوج مدد کے لئے بھیج سکا تھا، فردیلہ کے مرنے پر اُس کے متوفی بھائی
اردونِ ثانی کے دونوں بیٹوں شانجہ اور ادفونش میں تخت کے لئے نزاع پیدا ہوا، رئیسِ نبرہ
شانجہ نے ادفونش کی مدد کی، کیونکہ ادفونش اُس کا داماد تھا، غرض نبرہ کی مدد سے شروع میں
ادفونش لیون کا رئیس ہو گیا، لیکن اُس کے بھائی شانجہ کے دل میں غبار رہا اور ریاست
حاصل کرنے کی کبھی ہمت نہ ہاری، فوراً ایک لشکر مرتّب کر کے علاقہ جلیقیہ کے شہر شنت یاقب
میں پہنچا اور وہاں تاجِ شاہی اپنے سر پر رکھا، پھر فوج کشی کر کے لیون کے شہر کا محاصرہ کر لیا
اور شہر پر تصرّف کر کے اپنے بھائی ادفونش کے قبضے سے حکومت نکال لی، اس کے دو
برس بعد ۳۱۶ھ / ۹۲۸ء میں ادفونش نے رجوا پنے خاندان میں اسی نام کا چوتھا رئیس تھا اپنے
بھائی شانجہ کو لیون سے بے دخل کر دیا۔ اس میں اہلِ لیون نے اُس کی مدد کی تھی۔ اگرچہ
لیون اس وقت شانجہ کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، مگر جلیقیہ پر اُس نے اپنا قبضہ قائم رکھا۔

شمال کے ان والیانِ ریاست کی خانہ جنگیوں سے عبدالرحمٰن نے کچھ بحث نہ رکھی، اس
وقت عیسائیوں میں لڑائیاں شروع ہو جانے سے عبدالرحمٰن کو موقع مل گیا کہ اپنی قلمرو
میں جہاں جہاں بغاوت کی آگ اب تک موجود تھی اُسے ٹھنڈا کر دے۔

چونکہ امیر عبدالرحمٰن اب اپنی سب مرادوں کو پہنچ چکا تھا، اس لئے اس نے ایک
بڑا اونچا درجہ اپنے لئے حاصل کرنا چاہا، اسپین کے اُموی بادشاہوں نے اپنے لئے

ملک یا امیر یا ابن الخلفاء کا لقب کافی سمجھا تھا، خلیفہ کا معزز لقب اُن کے نزدیک انہی تاجداروں کو شایاں تھا جو محافظِ حرمین[1] تھے، اور یہ محافظ خلفائے عباسیہ تھے، جو بنی امیہ کے جانی دشمن چلے آتے تھے، مگر اِس وقت تک اسپین کے اُموی بادشاہوں نے یہ ممتاز لقب اپنے دشمنوں کے لئے چھوڑ رکھا تھا، لیکن عباسی خلفاء اب حاجبوں اور وزیروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے اور اُن کی حکومت اور اختیارات شہر بغداد کی حدود سے باہر نہ رہے تھے۔ شہروں اور صوبوں کے حاکم ہر جگہ خود مختار ہو گئے تھے، اِن وجوہ سے اب کوئی چیز امیر عبدالرحمٰن اُموی کو خلیفہ کا لقب اختیار کرنے میں مانع نہ رہی تھی، امیر عبدالرحمٰن کی رعایا بالخصوص اس لقب کو بہت قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے تھے، غرض امیر عبدالرحمٰن نے ۱۶ جنوری ۹۲۹ء (۲۳ ذی قعد ۳۱۶ھ) یوم جمعہ کو حکم دیا کہ تمام خطبوں اور سرکاری کاغذات میں اُس کا نام "امیر المؤمنین حامیٔ دین عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ" پڑھا اور لکھا جایا کرے۔

اِسی زمانہ میں امیر عبدالرحمٰن یعنی خلیفہ ناصر کو افریقہ کی طرف توجہ کرنی پڑی بربر کے قبیلہ مغراوہ کے سردار محمد بن خزر سے مراسم دوستی پیدا ہوئے، ابن خزر نے فاطمیوں کی فوجوں کو شکست دے کر اُن کے سردار مصالہ کو اپنے ہاتھ سے قتل کر کے فاطمیوں کو مغرب اوسط سے بے دخل کر دیا تھا (مغربِ اوسط کو سمجھنا چاہیئے کہ وہ آج کل کے علاقہ الجیریا اور ان سے مطابق ہوتا تھا) ابنِ خزر نے مغربِ اوسط کے باشندوں کو مجبور کیا کہ وہ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ کو اپنا بادشاہ تسلیم کریں، قبیلہ مکناسہ کے بہادر سردار ابن ابی العافیہ کو بھی (۴)
فاطمیوں سے توڑ لینے میں خلیفہ ناصر کو کامیابی ہوئی۔ ابن ابی العافیہ اس وقت فاطمیوں کا بڑا مددگار اور دست و بازو بنا ہوا تھا۔ ساحلِ افریقہ کے کسی قلعے پر خلیفہ ناصر کو قبضہ رکھنا ضروری تھا، اس کے لئے قلعہ سبتہ تجویز ہوا، ناصر نے اسے پسند کیا اور وہ ۳۱۹ھ / ۹۳۱ء میں اُسے تفویض کر دیا گیا۔

[1] ابن خرداذبہ، اکسفورڈ کا قلمی نسخہ، ص ۹۰

اِس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ شمالی اسپین کے عیسائی اِس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ خلیفہ ناصر کو افریقیہ کے معاملات میں مصروف رہنے کی بنے تکلف مہلت حاصل رہے عیسائیوں کی خانہ جنگی کے سِلسلے میں اُن کی اخیر لڑائی ۳۱۷ھ / ۹۲۹ء میں ختم ہو گئی تھی ۳۱۹ھ / ۹۳۱ء میں ایک نئی جنگ شروع ہوئی، اس سال اوفونش (چہارم) نے اپنی بیوی کے مرنے کا نہایت رنج والم کیا، حتیٰ کہ تخت وتاج اپنے بھائی رومیر (ثانی) کو دے کر خود سہاجون کی مسیحی خانقاہ میں تارک الدنیا ہو کر جا بیٹھا، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں رہبانیت سے ایسا بیزار ہوا کہ خانقاہ سے نِکل کر علاقہ شنت مانکش میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا، پادریوں کی نظر میں تارک الدنیا ہونے کے بعد پھر دنیا کا آدمی بننا بڑا گناہ تھا اور اس میں مذہب کی بھی توہین ہوتی تھی، اِس لئے انہوں نے اوفونش کو ڈرایا کہ اگر وہ پھر خانقاہ میں واپس نہ آیا تو مرنے کے بعد دوزخ کا کندہ بننا پڑے گا، مجبوراً اوفونش نے پادریوں کی نصیحت پر عمل کیا، لیکن چونکہ طبیعت کا کمزور اور مزاج میں تلوّن رکھتا، اس لئے دُنیا چھوڑنے کا اُسے افسوس ہوا اور رہبانیت کے حلقے سے نکل کر پھر دُنیا دار ہو گیا اور یہ دیکھ کر کہ اس کا بھائی رومیر (ثانی) لیون سے طلیطلہ والوں کی مدد کے لئے گیا ہوا ہے (کیونکہ اس زمانہ میں امیر عبدالرحمٰن نے طلیطلہ کا محاصرہ کر رکھا تھا) اوفونش نے لیون پر قبضہ کر لیا، رومیر یہ سُنتے ہی طلیطلہ سے بھاگا ہوا لیون آیا، بھائی کو شہر پر مسلط پا کر شہر کا محاصرہ کر لیا اور بالآخر اوفونش سے شہر چھین لیا اور اِس خیال سے کہ بھائی پھر تاج و تخت کا مدعی نہ ہو اوفونش کو اندھا کرا دیا اور اپنے چچا یعنی فرویلہ ثانی کے بیٹوں کی آنکھوں میں بھی سلائیاں پھروا دیں کیونکہ انہوں نے بغاوت میں اوفونش کا ساتھ دیا تھا[1]

عیسائیوں کی ریاستوں میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں خلیفہ ناصر نے انہیں جلد معلوم کر لیا اب وہ زمانہ نہ رہا تھا کہ لیون کی ریاست کو بے حقیقت سمجھا جاتا، بہادر اور جنگ جو رومیر رئیسِ لیون مسلمانوں کا دشمن بلکہ خون کا پیاسا تھا، تختِ حکومت پر بیٹھتے ہی طلیطلہ والوں کی

---

[1] اندھا کرا دینے کی غرض یہ تھی کہ تخت نہ مل سکے۔

مدد کی۔ طلیطلہ کے سوا تمام ملک میں کہیں کوئی جمہوری طرز حکومت کی ریاست نہ تھی یہ ریاست اب تک لیون کی محافظ اور دوست رہی تھی اور صرف اُسی میں اتنا دم تھا کہ ناصر کی فوجوں کا مقابلہ کرتی رہی تھی۔ رومیر لشکر لے کر اہل طلیطلہ کی مدد کے لئے طلیطلہ پہنچا تھا، راستہ میں مجریطہ کے شہر کو فتح بھی کیا لیکن طلیطلہ کو خلیفہ ناصر کی فتح سے نہ بچا سکا۔ شاہی فوج نے جو اس شہر کا محاصرہ کئے ہوئے تھی، جس وقت رومیر کے لشکر کو آتے ہوئے دیکھا تو اپنی ایک فوج کو اُس کے مقابلے کے لئے آگے بڑھایا اور رومیر کے لشکر کو جدھر سے وہ آیا تھا شکست دے کر اُسی طرف بھگا دیا، طلیطلہ بدستور محاصرہ کی حالت میں رہا، آخر کار جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں طلیطلہ کے لوگوں نے مایوس ہو کر خلیفہ ناصر کی اطاعت قبول کر لی [1]

۳۲۱ھ/۹۳۳ء میں رومیر کی قسمت اتنی بُری نہیں رہی جیسی کہ طلیطلہ کی امداد کے وقت رہی فرنان گانزولز (جسے عرب فرولند تومس لکھتے ہیں) قشتالہ کے عیسائی حاکم سے سن کر کہ مسلمان وشمہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، رومیر فوج لے کر وشمہ کی طرف چلا اور مسلمانوں کو ۵۱
وہاں شکست دی، خلیفہ ناصر نے دوسرے ہی برس یعنی ۳۲۲ھ/۹۳۴ء میں رومیر سے اس کا انتقام لیا، اور وشمہ کے میدانوں کو بتا دیا کہ جہاں سے مسلمانوں کو ہٹتے دیکھا تھا وہاں انہیں فتح کرتے ہوئے بھی دیکھیں، رومیر اس موقع پر پہاڑوں سے باہر نہ نکلا، خلیفہ ناصر نے بہت کوشش کی کہ وہ میدان میں مقابلہ پر آئے مگر کھلے میدان میں لڑنا رومیر نے اپنے حق میں بہتر نہ سمجھا۔

اب خلیفہ ناصر نے وشمہ میں کچھ فوج اس قلعے کے محاصرہ پر چھوڑ کر شمال کی طرف بڑھنا شروع کیا، ناصر کی فوج نے اس کوچ میں بڑے بڑے ظلم کئے، خاص کر افریقی فوجوں نے جو دارالحرب میں پہنچ کر کسی پر رحم کرنا نہ جانتی تھیں، برغش کے قریب انہوں نے سینٹ پیڈرو کے راہبوں جن کی تعداد دو سو تھی قتل کر دیا، برغش کے شہر کو جو قشتالہ کا دارالریاست تھا مسمار کر دیا اور یہی درجہ یہاں کے اور بہت سے قلعوں کا کیا۔

زیادہ زمانہ نہ گزرنے پایا تھا کہ شمالی علاقوں میں معاملات نے ایک دوسری ہی خطرناک

---

[1] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۲۹۰

صورت اختیار کی، وہ یہ کہ خلیفہ ناصر کے خلاف ایک زیر دست سازش کی گئی اس سازش کا بانی اور اُس کو فروغ دینے والا محمد بن ہاشم تجیبی تھا۔

بنی ہاشم فتوحات طارق کے زمانہ سے علاقہ ارغون میں جس کا صدر مقام سرقسطہ سمجھنا چاہیئے آباد چلے آتے تھے، ان لوگوں نے بڑی بڑی خدمات امیر محمد بن حکم کے زمانہ میں کی تھیں جب کہ اسپینی مسلمانوں کے خاندان بنی قسی[1] کو ارغون کے علاقے میں بہت زور حاصل ہو چلا تھا، اب چالیس برس سے بنی ہاشم کے خاندان میں شمال کے سرحدی اضلاع کی گورنری نسلاً بعد نسل قائم چلی آتی تھی، عرب کے شریف اور نجیب خاندانوں میں صرف یہی ایک خاندان تھا جسے خلیفہ ناصر نے حکومت کے مدارج اعلیٰ پر برقرار رکھا تھا، باقی عربی خاندانوں کو سابقہ حکومت و ریاست سے بے دخل کر دیا تھا۔

محمد بن ہاشم خلیفہ ناصر کا خیر خواہ نہ رہا تھا، یا تو اس وجہ سے کہ عربی خاندانوں کی جو بے وقعتی خلیفہ نے کی تھی اُس کا بدلہ لینا چاہتا تھا یا یہ خیال دل میں جما لیا تھا کہ ناصر کا سلوک اُس کے ساتھ محض اس بنا پر ہے کہ ناصر اُس سے ڈرتا ہے یا خیر خواہ نہ رہنے کا یہ سبب ہو کہ خود تاج و تخت پانے اور اپنی اولاد میں سلطنت چھوڑ جانے کے خواب و خیال میں رہتا ہو، بہر کیف جو کچھ بھی خیال ہو وہ خلیفہ ناصر کا بدخواہ ہو گیا اور لیون کے عیسائی بادشاہ ردمیر سے مراسم دوستی پیدا کئے اور اُس سے وعدہ کیا کہ اگر خلیفہ ناصر کے خلاف وہ اُس کی مدد کرے گا تو محمد بن ہاشم ردمیر کو اپنا بادشاہ تسلیم کرے گا۔

ردمیر نے یہ نامہ و پیام بہت ہی توجہ سے سُنے، نتیجہ یہ ہُوا کہ ۳۲۱ھ ۹۳۳ء میں محمد بن ہاشم نے تختِ قرطبہ سے بغاوت کا اظہار اس طور پر کیا کہ جب ناصر نے اُسے حکم بھیجا کہ اسلامی لشکر میں اپنی فوج لے کر شامل ہو، تو اُس نے اس حکم کو نہ مانا، اِس واقعہ کے تین سال بعد اُس نے

---

[1] یہ ایک بہت پرانا قسیقیط کا خاندان تھا، جس نے ابتدائی فتوحاتِ عرب کے زمانہ میں عیسائی مذہب ترک کر کے اِسلام قبول کیا تھا، بنی تجیب سے اِس خاندان کی لڑائیوں کا حال پروفیسر ڈوزی نے اپنی کتاب "تحقیقات" (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) کی جلد ا: بہ بیان کیا ہے۔

رودمیر کو اپنا بادشاہ اور سرپرست تسلیم کر لیا، ابنِ ہاشم کے تحت میں سرحدی فوجوں کے مسلمان سرداروں میں سے بعض نے اس کا ساتھ نہ دیا اور علیحدہ ہو گئے۔

رودمیر نے کئی قلعے ناصر کے قبضہ سے نکال کر ابنِ ہاشم کے سپرد کر دیے، اس کے بعد رودمیر اور ابنِ ہاشم نے خلیفہ ناصر کے خلاف بادشاہ نبرہ سے اتحاد پیدا کیا، نبرہ کا بادشاہ اس وقت نوجوان غرسیہ تھا جو اپنی ماں ملکہ طوطہ بیوہ شانجہ کی سرپرستی میں حکومت کرتا تھا۔ ر۴۳۶

غرض شمالی اضلاع نے خلیفہ ناصر کے خلاف سخت سازش کر لی اور جن خطروں کو ناصر رفع کر چکا تھا اب پھر وہی در پیش ہو گئے، مگر ناصر اُسی دبدبے اور شان سے جو وہ ہمیشہ سے رکھتا تھا اس خطرے کو بھی دور کرنے اٹھا۔

سنہ ۳۲۴ھ/ ۹۳۶ء میں ایک لشکرِ جرار لے کر خلیفہ ناصر قلعہ ایوب کی فتح کو نکلا، اس قلعہ کا حاکم ابن ہاشم کا ایک عزیز مطرف نامی تھا، رودمیر کی بھیجی ہوئی عیسائیوں کی ایک فوج قلعے میں مقیم تھی، شاہی فوج نے لڑائی شروع کی، لڑائی کے شروع ہی میں مطرف جان سے مارا گیا اُس کے مرنے پر اُس کا بھائی حکم فوراً اُس کی جگہ لڑنے لگا، لیکن جب شہر میں لڑتے لڑتے پسپا ہو کر قلعہ بند ہو جانا پڑا، تو حکم نے خلیفہ ناصر سے امان طلب کی، امان اپنے لئے اور مسلمانوں کے لئے حاصل کر کے شہر اور قلعہ ناصر کے حوالے کر دیا، قلعہ میں البتہ عیسائی جس قدر موجود تھے اُن کا امان نامہ میں ذکر نہ تھا، اس لئے وہ سب قتل کر دیے گئے۔

خلیفہ ناصر الدین اللہ نے قلعہ ایوب کے شہر اور قلعہ کو فتح کر کے تقریباً تیس ۳۰ قلعے اور فتح کئے اور پھر یکے بعد دیگرے نبرہ اور سرقسطہ کی طرف متوجہ ہوا، سرقسطہ کا محاصرہ اپنے ہی خاندان کے ایک اُموی کو جس کا نام احمد بن اسحاق تھا سپرد کیا، احمد بن اسحاق شاہی افواجِ سوارہ کا سالار تھا، اور حال میں تمام ثغورِ شمال کا حاکم مقرر کیا گیا تھا، لیکن باوجود ان احسانات کے ابن اسحاق نے خلیفہ ناصر کو سخت شکایت کا موقع دیا۔

اگرچہ بنی اسحاق برسوں تک مفلسی اور گمنامی کی حالت میں اشبیلیہ میں آباد رہے تھے اور سلاطینِ قرطبہ کے خلاف بعض مرتبہ سازشوں میں شریک بھی ہو چکے تھے، لیکن خلیفہ ناصر نے اُن کی قرابت مندی سے گو دور کی تھی کبھی انکار نہیں کیا تھا اور ان پر لطف و کرم

بھی اکثر کیا کرتا تھا، باوجود اِس کے بنی اسحاق اپنی حالت سے خوش نہ تھے، جاہ پرستی اور دُنیا کی طلب اُن میں بڑھی ہوئی تھی، احمد اس وقت اپنے خاندان کا رئیس تھا، اب اُس کو یہ دعویٰ ہوا کہ ناصر اُسے اپنا ولی عہد مقرر کرے، سرقسطہ کا محاصرہ اس نے بہت بے پروائی اور کاہلی سے کیا اور اُسی زمانہ میں یہ حماقت کی کہ ایک خط بھی اِس مضمون کا کہ اُسے ولی عہد مقرر کیا جائے خلیفہ ناصر کو لکھ بھیجا۔

ناصر اِس خط کو پڑھ کر آگ بگولہ ہو گیا اور اُس کا حسبِ ذیل جواب دیا:۔

"چونکہ ہم تجھے خوش کرنا چاہتے تھے اِس لئے تجھ پر احسان کیے، لیکن اب معلوم ہوا کہ تیری خصلت کو بدلنا ممکن نہیں، مفلسی اور تنگ دستی تیرے حال کے مناسب ہے، کیونکہ دولت نے جس کا تو خوگر نہ تھا تجھ میں غرور اور نخوت کو پیدا کر دیا، کیا تیرا باپ ابنِ حجاج کی فوج کا ایک ذلیل سوار نہ تھا؟ کیا تو اشبیلیہ میں گدھے نہیں بیچا کرتا تھا؟ ہم نے تیرے (۴۲۷) خاندان کو جب اُس نے لجاجت کی اپنی پناہ میں لیا۔ اُس کی مدد کی، اور اُسے صاحبِ دولت و اختیار بنا دیا، ہم نے تیرے باپ کو وزیر بنا کر تجھے سلطانی افواجِ سوارہ کا سپہ سالار اور اپنے ثغورِ شمال میں سب سے بڑے مقام کا والی مقرر کیا، اب تو ہمارے حکموں سے سرتابی کرتا ہے جس چیز میں ہمارا فائدہ ہے تو اُس کی طرف سے غافل ہے اور اِن باتوں کو یہاں تک پہنچایا ہے کہ اب ہمارا ولی عہد بننا چاہتا ہے، تیرے میں کون سی خوبیاں ہیں اور کون سے تجھے ایسے حقوق ہیں جن کی بنا پر تجھے یہ دعویٰ ہوا ہے؟ تیرے اور تیرے خاندان کے لئے کسی کے یہ اشعار صادق آتے ہیں:۔

"تو کمینہ ہے، ٹاٹ میں حریر کا پیوند نہیں لگتا، اگر تم قریشی ہو، جیسا کہ تم کو دعویٰ
سے تو پھر اس نامور خاندان کی بیویاں کیوں نہیں کرتے؟ لیکن اگر تم قبطی ہو تو
پھر تمہارا دعویٰ لغو ہے۔"

کیا تیری ماں بُڑھیا حمدونہ ساحرہ نہ تھی؟ کیا تیرا باپ ایک معمولی سوار نہ تھا؟ کیا تیرا دادا حوشرہ، ابنِ عباسؓ کے گھر کا دربان نہ تھا اور اُس شریف کی ڈیوڑھی پر بیٹھا رسیاں نہیں بٹا کرتا تھا اور بوریے نہیں بُنتا تھا؟ اللہ کی تجھ پر لعنت ہو اور ان پر جنہوں نے ہمیں

دھوکا دے کہ تجھے ہماری خدمت پر مقرر کرایا، کمینے، سگ بچے، آ اور ذلت کے ساتھ ہمارے قدموں میں گر۔"

جب خلیفہ ناصر نے احمد بن اسحاق کو ذلت کے ساتھ شاہی ملازمت سے برطرف کر دیا تو احمد کے بھائی اُمیّہ نے خلیفہ کو جان سے مار ڈالنے کی ایک سازش کی، اس کا حال ناصر پر کھل گیا اور احمد اور امیّہ دونوں جلاوطن کر دیے گئے۔

امیّہ نے شنترین پر قبضہ کر کے علَم بغاوت بلند کیا اور دارالحرب میں جا کر رومیر بادشاہ لیون سے مراسم دوستی پیدا کئے اور اِس عیسائی بادشاہ کے ساتھ یہ خیر خواہی کی کہ اسلامی سلطنت میں جس قدر مقامات ایسے تھے جہاں سے دشمن کامیابی کے ساتھ حملہ کر سکتا تھا وہ اُس پر ظاہر کر دیے۔

ایک روز ایسا ہُوا کہ امیہ شنترین سے کہیں باہر گیا ہُوا تھا، اِس غیرحاضری کی حالت میں اسی کے ایک سردار نے شہر میں خلیفہ ناصر کی حکومت کا اعلان کر دیا، امیہ کو جس وقت معلوم ہوا تو رومیر بادشاہ لیون کے پاس چلا گیا۔

امیہ کا تو یہ حال ہُوا اور احمد بن اسحاق خلیفہ ناصر کے خلاف لوگوں کو ابھارنے اور بغاوت پر آمادہ کرنے میں برابر مصروف رہا، فاطمیوں سے دوستی پیدا کر کے چاہا کہ اسپین کی سلطنت کسی طرح دولتِ شیعہ کے قبضے میں آ جائے، خلیفہ ناصر کو اس سازش کا حال معلوم ہو گیا، احمد گرفتار ہُوا اور شیعہ قرار پا کر قتل کر دیا گیا۔[1]

اِسی زمانے میں خلیفہ ناصر کو اضلاعِ شمال میں عیسائیوں کے مقابلے میں بہت کامیابی ہوئی تھی، جس وقت محمد بن ہاشم کا سرقسطہ میں محاصرہ کیا گیا تو اُس نے تنگ آ کر عفوِ تقصیر چاہا، چونکہ ابنِ ہاشم سلطنت میں بڑا صاحبِ اقتدار تھا، بلکہ خلیفہ کے بعد اُسی کا درجہ مانا جاتا تھا، اس لئے ناصر نے اُس کا قصور معاف کر کے پھر اُس کو اپنے عہدے پر بحال کر دیا۔

نبرہ کی عیسائی ملکہ طوطہ کو جب شکست پر شکست ہونے لگی، تو اُس نے بھی خلیفہ ناصر

---

[1] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۴۰۹

سے رحم کی درخواست کی اور ناصر کو مالکِ نبرہ کا بادشاہ تسلیم کیا۔

غرض اسپین میں لیون کی عملداری اور صوبہ قیطلونیہ (شمال مشرقی علاقے) کے ایک حصے کے خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر الدین اللہ تمام جزیرہ نمائے اسپین کا بلاشرکتِ غیرے مالک اور بادشاہ ہو گیا۔

اسناد:-

مونا کی سی لین سیس کرونیکون	ص ۴۴ تا ۴۰
ابنِ خلدون	ص ۱۴ تا ۱۵
عریب	جلد ۲ ص ۱۷۵ تا ۱۸۱، ۱۸۳ تا ۱۸۹،
	۱۹۵ تا ۲۰۱، ۲۱۱ تا ۲۱۲، ۲۲۰ تا ۲۲۲
کرونیکون دی ساmپیرو	ص ۱۷ تا ۱۹، ۲۲
انبجری	ص ۹۴ تا ۹۷ (اڈیشن سلین)
ابنِ حیان	ص ۱۵
ابنِ عذاری	جلد ۱ ص ۱۷۸ تا ۱۸۳
	جلد ۲ ص ۱۶۲
ابنِ خلدون (تاریخِ بربر)	جلد ۱ ص ۲۸۲ تا ۲۸۵ (متن)
اخبار مجموعہ	ص ۱۱۴

کتابِ ثالث

خلافت

تیسری فصل

فرنان گونزولنز (عربی نام فرولند) فومس

۷۲۹۱ زمانہ تخت نشینی سے لے کر ۲۰ برس تک امیر عبدالرحمٰن ثالث نے ہر لڑائی میں فتح پائی لیکن تقدیر کو پلٹتے دیر نہیں لگتی، جہاں ہمیشہ اچھے دن دیکھے تھے وہاں ایک برا دن بھی دیکھنا پڑا۔

اِس عرصہ میں سلطنت میں بڑا انقلاب پیدا ہو گیا تھا، اُمراءِ دولت جو پہلے سب کچھ تھے اب کوئی بات اُن کی چلنے نہیں پاتی تھی۔ ناصر کے وزیرِ حکومت نے اُن کو مٹی کر دیا تھا، خلیفہ کو اُن سے نفرت ہو گئی تھی، وہ اس نکتے کو سمجھے ہوئے نہ تھا کہ ملک کے شرفاء کو خاص خاص اختیارات جن کی تعریف بخوبی کر دی گئی ہو عطا کر کے سلطنت کا معتمد بنانا حکمرانی کی ایک ضروری شرط ہے۔ ایک دن المانیہ (جرمنی) کے بادشاہ اوتھو اوّل[1] (جسے عرب اوتوہ کہتے تھے)

[1] یہ اوتو دی گریٹ مشہور تھا، اپنے شہنشاہ ہنری کی وفات پر جرمن قوم کا بادشاہ ہوا۔ اور سنہ ۹۳۶ء سے سنہ ۹۷۳ء تک حکومت کی۔

کے ایلچی دربارِ ناصر میں حاضر تھے، خلیفہ نے ایک ایلچی سے کہا کہ "میں تسلیم کرتا ہوں تمہارا بادشاہ بڑا دانش مند اور صاحبِ فراست ہے، لیکن اُس کے طریقۂ حکمرانی میں ایک بات ایسی ہے جسے میں پسند نہیں کرتا اور وہ یہ ہے کہ حکومت کو کلیتہً اپنے ہاتھ میں رکھنے کی بجائے وہ اپنے ماتحتوں کو حکومت میں شریک و سہیم کرتا ہے، بلکہ اُن کے قبضے میں ملکوں کا انتظام دے دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس طریقہ سے بادشاہ کا اعتبار اُن کے دلوں میں قائم ہو جائے گا، مگر یہ سخت غلطی ہے، امرائے سلطنت کے اختیارات میں وسعت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتے کہ اُن کا غرور بڑھ جائے اور اُن کی اولاد بغاوتیں برپا کرے۔"

یہ بالکل سچ ہے کہ خلیفہ ناصر اِس غلطی کا مرتکب نہیں ہوا لیکن ایک دوسری غلطی اُس سے ہوئی جو اس غلطی سے کم نتیجہ خیز نہ تھی۔

ناصر کی حکومت مطلق العنان تھی، یہاں تک کہ $\frac{۳۱۹}{۹۳۲}$ھ میں اُس نے حاجب کا عہدہ بھی تخفیف کر دیا، پُرانے امیروں اور شریفوں کی جگہ سلطنت کے اکثر مناصب جلیلہ پر ایسے لوگوں کو مقرر کرنا شروع کیا، جو حسب و نسب کے اچھے نہ تھے یہ ادنیٰ موالی یا غیر ملک کے آدمی ہوتے تھے، یعنی ایسے لوگ ہوتے تھے جن کا دار و مدار خلیفہ ناصر کی خوشی پر منحصر تھا، اور ناصر جو کام چاہتا اُن سے لے سکتا تھا، ان میں بھی جن پر خاص توجہ تھی وہ صقالبہ کا گروہ تھا، اِس گروہ نے جو کچھ ترقی کی اُس کا آغاز ناصر ہی کے عہد سے ہوتا ہے، چونکہ صقالبہ نے اِسلامی اسپین کی تاریخ میں بہت کچھ حصّہ لیا تھا، اِس لئے اُن کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۴۳۰) ابتدا میں لفظ سلاڈ یا اِسکالاوی (جسے عربوں نے صقالبہ یا صقالبہ کر لیا) اُن امیروں پر عاید ہوتا تھا جن کو جرمانی قومیں اسکالاوی قوموں سے لڑ کر گرفتار کر لیتی تھیں اور پھر اسپین کے ساحل پر لا کر انہیں فروخت کر دیتی تھیں، لیکن ایک مدت کے بعد اسکالاوی کے علاوہ وہ اور قوموں کے لوگ بھی صقالبہ میں شمار ہونے لگے، پھر یہ نام رفتہ رفتہ تمام ایسے غیر ملک والوں کے لئے (خواہ وہ کسی قوم و نسل کے ہوں) مستعمل ہونے لگا، جو اندلسی امیروں کے گھروں میں

لہ قرطبہ کے عربی مؤرخ بادشاہ اوتو اوّل کو بھی بادشاہِ صقالبہ لکھتے ہیں

خواجہ سرا ہو کر یا فوج میں سپاہی بن کر کام کرتے تھے، دسویں صدی عیسوی (چوتھی صدی ہجری) کے ایک عرب سیاح نے صاف لفظوں میں بیان کیا ہے کہ صقالبہ میں جو خلیفہ اندلس کے ملازم تھے اُن میں جلیقیہ (اسپین) افرنجہ (فرانس) المانیہ (جرمنی) لمباردی (اٹلی) کلابری (اٹلی) اور بحرِ اسود کے شمالی ساحل کے رہنے والے شامل تھے۔ ان میں سے بعض کو اندلس کے بحری قزاق پکڑ لائے تھے اور بعض اٹلی کی بندرگاہوں میں خریدے گئے تھے، یہودیوں کا شیوہ تھا کہ جب مخلوق خدا پر مصیبت پڑتی تھی تو وہ اس وقت آدمیوں کے بچوں کی (خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں) تجارت کیا کرتے تھے، انہیں پکڑ کر بندرگاہوں میں لاتے تھے اور وہاں سے یونانیوں یا وینس والوں کے جہازوں میں انہیں بھر کر اسلامی ممالک میں بردہ فروشوں کے ہاتھ بیچتے تھے،

صقالبہ کی ایک دوسری قسم وہ تھی جو آختہ ہو کر امیروں کی محل سراؤں میں خواجہ سرائی کرتی تھی، یہ لوگ فرانس سے آتے تھے، یہاں لڑکوں کو مخنث کر کے فروخت کرنے کے بڑے بڑے کارخانے یہودیوں نے کھول رکھے تھے، چنانچہ وردون کا کارخانہ اس کام میں بہت مشہور تھا، اور فرانس کے جنوبی علاقوں میں ایسے ہی اور کارخانے بہت سے موجود تھے۔

چونکہ اسپین میں پہنچنے کے وقت یہ غلام بہت کم سن ہوتے تھے، اس لئے اپنے آقاؤں کا مذہب، زبان اور رسم و رواج بہت جلد سیکھ لیتے تھے، اُن میں سے بعض کو اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت دی جاتی تھی اور صقالبہ میں ایسے عالموں کا ذکر پڑھنے میں میں آتا ہے جنھوں نے بڑے بڑے کتب خانے قائم کئے اور شعر و شاعری میں بڑے نام آور ہوئے، صقالبہ میں عالموں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ انہی میں سے ایک شخص حبیب نامی نے صرف صقالبہ کی شاعری اور سیر و سفر پر ایک بڑی کتاب لکھ ڈالی۔

سلاطینِ قرطبہ کے درباروں اور فوجوں میں صقالبہ کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی، لیکن خلیفہ ناصر کے وقت میں وہ سب سے بڑھ گئی، ایک بیان کے مطابق اُن کا شمار ۳۷۵۰ اور دوسرے بیان کے مطابق ۶۰۸۷ بلکہ ۱۳۷۵۰ تھا، غالباً یہ اعداد عہدِ ناصر کے مختلف زمانوں کے ہیں، کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ خلیفہ ناصر نے صقالبہ کی تعداد میں اضافہ کرنے

سے کبھی بس نہیں کی ، یہ صقالبہ اگرچہ خود غلام ہوتے تھے ، مگر غلام اُن کی خدمت میں رہتے تھے بڑی بڑی املاک اور جاگیروں کے مالک ہوتے تھے ، فوج اور دیوانی کے نہایت ذمہ داری کے عہدوں پر خلیفہ اُن کو مقرر کرتا تھا ، اس وجہ سے پرانے امیر اور رئیس جو مشاہیر عرب کی اولاد تھے ان نوعزت صقالبہ کے سامنے ذلیل اور حقیر ہوتے رہتے تھے ، اس صورت میں ان عربی رئیسوں کو صقالبہ سے جس قدر نفرت ہوتی کم تھی ۔

غرض جس حالت میں کہ شرفاء عرب ناصر کے دشمن ہو رہے تھے ، ناصر نے بادشاہِ لیون کے مقابلہ میں ایک ایسی لشکر کشی کا ارادہ کیا جو کبھی پہلے نہ کیا تھا ، اِس مہم عظیم کے لئے (۲۳۱)
اُس نے بہت روپیہ صرف کیا اور ایک لاکھ آدمی جمع کر کے لشکر مرتب کیا اور یہ امید کی کہ اس مرتبہ کامل فتح ہو جائے گی ، لیکن بڑی غلطی یہ کی کہ اِس لشکر کی سرداری نجدہ کو دی ، جو صقالبہ میں سے تھا ۔

ایک صقلبی کے امیر لشکر ہونے پر عربی اُمراء فوج ناراض ہو گئے ، اور غصّہ کی حالت میں اُنہوں نے اپنی اس تذلیل کا بدلہ لینے کا قطعی ارادہ کر لیا اور یہ سوچ لیا کہ اِس جنگ میں ناصر کو ایسی شکست دلوائیں گے جسے وہ کبھی نہیں بھولے گا ۔

$\frac{۳۲۷}{۹۳۹}$ھ میں شاہی فوج قرطبہ سے شنت مانکش کی طرف بڑھی ، ردمیر ثانی رئیسِ لیون اور معاون ملکہ طوطہ جو نبرہ میں حکومت کرتی تھی ، دونوں اپنی اپنی فوجیں شاہی فوج کے مقابلے پر لائے ، ۵ ر اگست ۹۳۹ء (۹ ر شوال ۳۲۷ھ) کو شنت مانکش پر فریقین میں بڑی جنگ ہوئی ، دورانِ جنگ میں عربی سردار یہ ظاہر کر کے کہ اُن کو شکست ہو گئی ہے مع اپنی فوجوں کے پیچھے ہٹے ، وہ یہ نہ سمجھے تھے کہ اس حرکت کے اور کیا نتیجے ہونے والے ہیں ۔

اِن لوگوں کے میدان سے ہٹتے ہی لیون والوں نے اسلامی فوجوں کا تعاقب کیا ، جب موضع الخندق میں جو ظلمنکہ کے جنوب میں دریائے تورمس کے کنارے واقع ہے اسلامی فوجیں پہنچیں تو انہوں نے پھر اجتماع اور ترتیب کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا ۔ اس مقابلہ میں مسلمانوں کو شکست ہو گئی ، ناصر جو فوجوں کے ساتھ تھا عیسائیوں کی تلواروں سے بال بال بچ گیا ۔

جب شکست ہو گئی تو فوجیں بجائے اس کے ترتیب سے پیچھے ہٹ آئیں ، اُن میں

بھاگڑ پڑی، کسی قسم کا انتظام نہ رہا، صفیں ٹوٹ گئیں، سوار اور پیدل دونوں بھاگے،
افسروں اور سپاہیوں کی لاشیں جا بجا راستوں میں پڑی نظر آنے لگیں، فوجوں کے دستے کے
دستے غارت ہو گئے۔ بادشاہ رومیر کو فتح ہو گئی اور اُس کی خبر دُور دُور پہنچی، جرمانیہ کی سرحدوں
اور مشرقی ملکوں تک اُس کی شہرت ہو گئی، ہر جگہ مختلف خیالات اس واقعہ نے پیدا کئے،
عیسائی خوش ہوئے، مسلمان ڈرے، عیسائیوں نے اس فتح کو نصرانیت کے حق میں فالِ نیک
سمجھا کہ ایک دن اسلام پر اُسے فروغ ہو جائے گا، مسلمان اس فکر میں ہوئے کہ اس بلائے بد
کو کس طرح ہو دفع کرنا چاہیئے، خلیفہ ناصر خفیف ہوا، نجدہ مارا گیا، حاکم سرقسطہ محمد بن ہاشم
شنت مانکش پر پہلے ہی حملے میں گرفتار ہو کر لیون کے قید خانہ میں دن کاٹنے لگا، مسلمانوں
کا تقریبًا کل لشکر اس لڑائی میں غارت ہو گیا، حیرت یہ ہے کہ خود ناصر کیسے بچ گیا جس (۴۳۲)
وقت میدانِ جنگ سے واپس ہوا ہے تو صرف پینتالیس ۴۵ آدمی اُس کے ساتھ تھے۔

اِن واقعات نے خلیفہ ناصر کے دل پر ایسا اثر کیا کہ پھر کبھی کسی لڑائی میں بذاتِ خود
شریک نہیں ہوا۔

علاقہ قشتالیہ کے لوگ لیون کی ریاست کے ماتحت تھے یہ لوگ لیون کی حکومت
سے اپنے کو علیحدہ کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اردون ثانی ہی کے زمانہ میں جو موجودہ بادشاہ
لیون رومیر کا باپ تھا، اہلِ قشتالیہ نے علانیہ بغاوت شروع کر دی تھی، رومیر نے
اطلاعِ عام دی کہ اس نزاع کو مصالحت طے کرنے کے لئے ایک مجلسِ شوریٰ دریائے کاریون
کے کنارے منعقد کی جائے گی، یہ دریا قشتالیہ کے علاقے کو لیون کی ریاست سے جدا کرتا تھا
اس اطلاع پر قشتالیہ کے چار بڑے رئیس مجلس میں شرکت کے لئے آئے، مگر رومیر
نے اُن کو حراست میں لے کر قتل کر دیا۔ لیون کے لوگوں نے اتنا تو ضرور تسلیم کیا کہ
قتل کے ان وقوعوں میں کسی قدر بے ضابطگی ہوئی ہے، مگر جو کچھ ہوا تھا اُس کو اپنے
بادشاہ کی بیحد ہوشیاری سمجھ کر بادشاہ کی تعریفیں کرنے لگے۔

اہلِ قشتالیہ کی کیفیت کچھ اور تھی، اِن رئیسوں کے مارے جانے پر کوئی اُن کا
سردار نہ رہا اور وہ بالکل بے یار و مددگار ہو گئے، لیکن انہوں نے اُس دن کے آنے کی دُعائیں

مانگنی بند نہ کیں جس دن اُن کا کوئی لائق سردار ایسا پیدا ہو جو اِن دغابازانہ اور بے ایمان لیونیوں سے اُن کے رئیسوں کے خون کا بدلہ لے، آخر کار وہ دن آیا کہ اُن کی دعائیں قبول ہوئیں اور ایک شخص اُن کی طرف سے انتقام لینے والا فرنان گونزولز (فرولند) کی صورت میں نمودار ہوا، عہدِ وسطیٰ کے عیسائی شاعروں نے فرولند کو قشتالیہ والوں کا بڑا ہیرو مانا ہے، اور قشتالیہ کے باشندے اُس کو بڑی عزت سے یاد کرتے ہیں، جس زمانہ میں خلیفہ ناصر کی فوجیں قشتالیہ میں وہاں کی خانقاہوں اور قلعوں یہاں تک کہ قشتالیہ کے کے دار الریاست برغش کو جلانے اور غارت کرنے میں مصروف تھیں، اُس وقت ممکن نہ تھا کہ فرولند، بادشاہِ لیون، رومیر کی حکومت سے اپنے علاقے کو آزاد کر لینا، لیکن موضع الخندق کی جنگ کے بعد یہ یقین کر کے کہ کم سے کم موجودہ زمانے کے عربوں کی طرف سے کوئی خوف نہیں رہا ہے اور یہ سمجھ کر کہ لیون کی حکومت سے گلوخلاصی حاصل کرنے کا جو قصد کیا گیا تھا اب اُس کا وقت آن پہنچا ہے فرولند نے بادشاہِ لیون رومیر کو اشتہارِ جنگ دے دیا۔

فرولند اور رومیر میں جب اِس طرح لڑائی چھڑ گئی تو خلیفہ ناصر کو موقع ملا کہ اپنا لشکر درست کرے چنانچہ نومبر ۹۴۰ء (صفر ۳۲۹ھ) میں لشکر مرتب کر کے لیون کے سرحدی علاقوں کو برباد اور غارت کرنے کے لئے روانہ کر دیا، احمد بن یعلیٰ حاکم بطلیوس اِس مہم کا سرِ لشکر مقرر ہوا۔

اِسی زمانہ میں خلیفہ ناصر کو جو نقصان (جنگِ خندق میں ہزیمت سے) پہنچا تھا، بخت کی یاوری سے افریقیہ میں اُس کی تلافی ہو گئی۔

اِس میں شبہ نہیں کہ خلیفہ ناصر کو افریقیہ کے متعلق بہت سی باتوں میں کامیابی ہوئی تھی، لیکن اگر ایک طرف کامیابی تھی تو دوسری طرف نقصان بھی تھا، کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ افریقیہ میں ناصر کے زیر دست والیانِ ریاست فاطمیوں سے شکست کھا جاتے تھے، (۴۳۳)
ناصر ہمیشہ اس کوشش میں رہا کہ یہ والیانِ ملک متفق ہو کر فاطمیوں کا مقابلہ کرتے رہیں، لیکن یہ کوشش ہمیشہ بااثر ثابت نہ ہوئی۔ فاطمیوں کے مقابلہ میں متفق ہو کر لڑنا تو درکنار ناصر اُن کو آپس میں لڑنے سے بھی باز نہ رکھ سکا، بہر کیف اس نے اپنی خوش تدبیری سے

فاطمیوں کو لڑائیوں سے اتنی مہلت نہ لینے دی کہ اسپین کے ساحل پر فوج کشی کی طاقت اور جرأت اُن میں پیدا ہو جاتی، اور یہی ناصر کا شروع سے مقصد تھا، اب تاریخ بتاتی ہے کہ ناصر کو ایک اور ذریعہ سے بڑا نفع پہنچنے والا ہے۔

دولتِ بنی فاطمہ کے خلاف اب ایک ایسے دشمنِ صعب نے عَلَمِ بغاوت بلند کیا کہ جس قدر دشمن اِس سلطنت کے اب تک پیدا ہوئے تھے وہ سب مل کر بھی اِس کے برابر نہ ہوتے تھے یہ دشمن بربر کے قبیلہ اِفورین کا ایک شخص ابو یزید نامی تھا، یہ ایک تاجر کا بیٹا تھا، جوانی میں خوارج کی صحبت رہی تھی، خارجی عقیدے کے لوگ اب تک افریقہ میں کثرت موجود ہیں، باپ کے مرنے پر ابو یزید تنگدست ہو گیا، لڑکے پڑھا کر بسر اوقات کرتا تھا، ابو عبداللہ بانیٔ دولتِ شیعہ کی طرح اس نے بھی پہلے معلّم اور پھر داعی بن کر بربر کے قبائل کو سمجھانا شروع کیا کہ دینِ حق اور آزادی کے لیے خروج کرو، لوگوں نے اِس شرط سے وعدہ کیا کہ اگر کامیابی ہوئی اور دار السلطنت افریقیہ یعنی قیروان پر قبضہ ہو گیا تو حکومت کا طرز جمہوری رکھنا ہوگا یعنی سب کے مشورے سے سلطنت کا انتظام کیا جائیگا۔

ابو یزید کی فتوحات بھی ایسی ہی عجیب تھیں جیسی کہ ابو عبداللہ شیعی کی چند سال پیشتر ظہور میں آچکی تھیں، اِس بدصورت، پستہ قد، صوف کا جُبّہ پہنے گدھے پر سوار ابو یزید کے سامنے دولتِ شیعہ کی بڑی بڑی فوجیں مقابلہ پر آتے ہی ایسی پانی ہو جاتی تھیں جیسے گرمی کے موسم میں برف پگھل جاتی ہے۔ سُنّیوں کا دل فاطمیوں کے مذہبی تشدّد اور اُن کے اکابرِ دین کی تشنیع کرنے سے ایسا زخمی ہو رہا تھا کہ وہ سب ابو یزید کے ساتھ ہو گئے، بڑے بڑے مشائخ، عابد اور زاہد جو گوشہ نشین ہو چکے تھے اِس خارجی سردار کی کمک پر تلواریں سنبھال کر کھڑے ہو گئے، اب ابو یزید کا یہ کام تھا کہ سُنّیوں نے اُس کی مذہبی رواداری کے متعلق جو اُمیدیں قائم کی تھیں اُن کو پورا کرتا رہے۔ ۳۳۳ھ؁ ۹۴۴ء میں جس وقت فاطمیوں کے دار الحکومت قیروان پر قبضہ ہوا تو خطبوں میں خلفائے راشدین میں سے خلیفہ اوّل اور خلیفہ ثانی کے لیے دعا کی، اور شہر کے لوگوں سے کہا کہ مذہبِ مالکی جس کی فاطمیوں نے ممانعت کر دی تھی اُس کے وہ پھر پابند ہو سکتے ہیں۔ اب سُنّیوں کو بڑا سہارا ہو گیا، اور وہ

علم و طبل سے پھر اپنے جلوس نکالنے لگے جنہیں بنی فاطمہ نے برسوں سے بند کر رکھا تھا ابو یزید ایسے موقعوں پر خود سُنّیوں کے ساتھ شریک ہوتا تھا، سُنّیوں کے ساتھ مذہبی رعایت دکھانے کے لیے اُس نے یہاں تک کیا کہ اسپین کے خلیفہ ناصر کے ساتھ مراسمِ اتحاد پیدا کیے، اور ایک سفارت بھیج کر اگر دینی اعتبار سے نہیں تو دنیوی طریق پر خلیفہ ناصر کو ان تمام ممالک کا سرپرست اور بادشاہ مان لیا جو اُس نے فتح کئے تھے، غرض فاطمیین کا بحرِ اقبال اس وقت حالتِ جزر میں ہو گیا۔

جس وقت ابو یزید، فاطمی خلیفہ قائم بامر اللہ جانشین عبید اللہ المہدی کا محاصرہ شہر مہدیہ میں کیے ہوئے تھا، اُس وقت عبد الرحمن الناصر لدین اللہ نے اپنے افریقی ہوا خواہوں کے ذریعہ سے افریقہ کے تمام شمال مغربی ممالک پر اپنا سکہ بٹھا کر قائم بامر اللہ کے خلاف ہر طرف سے دشمنوں کو اُبھار دیا۔

ناصر نے اٹلی کے بادشاہ، اور ملک پراونس کے بادشاہ ہوجیس سے بھی مراسمِ دوستی پیدا کیے، ہوجیس کو فاطمیوں کے امیر البحر سے انتقام لینا تھا، کیونکہ اُس نے پراونس کے شہر جلینوا پر قبضہ کر لیا تھا، اسی طرح قیصر قسطنطنیہ سے بھی پیمانِ آشتی ہو گیا، کیونکہ قائم بامر اللہ جزیرہ صقلیہ کو جو قیصر کے مقبوضات سے تھا فتح کر چکا تھا، قیصر چاہتا تھا کہ اُس جزیرہ کو فاطمی خلیفہ کے قبضے سے نکال لے۔

لیکن اب چشم زدن میں رنگ کچھ اور ہی ہو گیا، ابو یزید کو اتنی فتوحات حاصل ہوئیں کہ اُس میں غرور پیدا ہو گیا۔ جو قوت اُسے حاصل ہوئی تھی اُس پر قناعت نہ کی، اور جن ذریعوں سے ترقی کی تھی اُن کو بھول گیا، ظاہری شان و شوکت کا شوق پیدا ہوا، صوف کے موٹے جھوٹے جُبّہ کی بجائے اب دیبا و حریر پہننے، اور ابلق گدھے کی سواری کی جگہ پُر تکلف ساز و سامان سے آراستہ گھوڑوں پر سوار ہونے لگا، اور یہی حماقت اُس کی تباہی کا باعث ہو گئی، کیونکہ اُس کے معاونوں اور مددگاروں میں زیادہ تر لوگ ایسے تھے جو جمہور کے مشورے سے حکومت کرنا، اور جملہ طبقاتِ انسانی میں مساوات کا درجہ پیدا کرنا پسند کرتے تھے، اس لیے جب انہوں نے ابو یزید کا یہ رنگ دیکھا تو اُن

کے اعتقاد میں فرق پیدا ہوا، اور انہوں نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بعض لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور بعض دشمن سے جا ملے، یہ کیفیت دیکھ کر ابو یزید کو ہوش آیا، عیش اور نمود کی عادتیں ترک کر کے صوف کا جُبّہ اور پہلی سی سادہ و سخت زندگی اختیار کی، لیکن اصلاح دیر میں سوجھی، اب وہ پہلی سی بات باقی نہ رہی، سُنّیوں کی امداد پر اب تک بھروسہ کر سکتا تھا، لیکن ایک دن غصہ میں آ کر اُن پر بھی ثابت کر دیا کہ مذہبی رواداری جس کا وہ پابند تھا سچے دل سے نہ تھی بلکہ محض ایک دھوکا تھی، فاطمیوں سے لڑائی کے ایک موقع پر لڑائی شروع ہونے سے پہلے اپنی سپاہِ خوارج کو حکم دیا کہ قیروان کے سُنّی سپاہی جس قدر ساتھ ہیں اُن سے علیحدہ ہو جائے، تاکہ فاطمی اُن کو قتل کر ڈالیں، خارجی سپاہیوں نے اس دغابازی کے حکم کی پابندی کی۔

اُس دن سے سُنّیوں کو ابو یزید سے جانی دشمنی ہو گئی، اب اُنہوں نے ایک ظالم کا دوسرے ظالم سے، اور ایک خود مختار و مطلق العنان بادشاہ کا دوسرے خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ سے اپنے ذہن میں مقابلہ کیا، اور آخر میں فاطمیوں کی حکومت کو قبول کرنا بہتر سمجھا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ منصور جو حال میں تخت نشین ہوا تھا وہ اپنے بزرگوں سے بہت زیادہ لائق تھا۔

مہدیہ کا محاصرہ اٹھا کر ابو یزید مجبوراً قیروان واپس آیا، یہاں کے باشندوں نے اُسے جان سے مارنے کے لیے سازش کر رکھی تھی، مگر اتفاق سے بال بال بچ کر روپوش ہوا، مدت تک سپاہی اُس کی تلاش میں رہے، آخر کار ایک دن جب کہ زخموں سے چُور تھا (۴۳۵
اُسے گرفتار کر لیا، گرفتاری کے بعد ایک لوہے کے پنجرے میں قید رکھا، اور جب ۳۳۵ھ/۹۴۶ء میں وہ مر گیا تو اُس کی کھال میں بھُس بھروا کر قیروان کے گلی کوچوں میں گشت کرایا، اور پھر مہدیہ کی فصیل میں لاش ایک جگہ لٹکا دی گئی جہاں وہ مدت تک لٹکی رہی، یہاں تک کہ ہوا کے جھونکوں سے لاش کے چیتھڑے ہو گئے اور وہ بھی کچھ دنوں میں اُڑ اُڑا کر ختم ہو گئے۔

افریقہ میں خوارج کی اس شکست سے خلیفہ ناصر کو ایسا ہی صدمہ پہنچا جیسا کہ شنت مانکش اور الخندق کی شکستوں میں پہنچا تھا، اب مغربِ اقصیٰ کے جو علاقے فاطمیوں

کے قبضے سے نکل گئے تھے پھر جلد اُن کے تصرف میں آگئے، اور یہاں کی جو ریاستیں ناصر کی ہوا خواہ ہو گئی تھیں اُن کے رئیس مجبور ہوئے کہ قرطبہ میں جا کر پناہ لیں۔

شمالی اسپین میں جو حالات پیش آرہے تھے وہ خلیفہ ناصر کے حسبِ مراد تھے، یعنی عیسائی بادشاہوں میں خانہ جنگی کا بازار گرم تھا، بادشاہِ لیون ردمیر ثانی، اور فردلند رئیسِ قشتالیہ میں (جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے) لڑائی شروع ہو چکی تھی، اِس جنگ میں ردمیر کی قسمت نے یاوری کی، فردلند اتفاق سے اُس کے ہاتھ آگیا، فوراً لیون کے قید خانے میں اُسے بھیج دیا، اور اُس کی جگہ قشتالیہ کا حاکم پہلے آسر فرناندیس رئیسِ منت شون کو، اور اُس کے بعد اپنے لڑکے شانجہ کو مقرر کیا، ردمیر نے فردلند کی زمینیں اور علاقے ضبط کر لیے، اور اُس کے مال و جائیداد کو اپنے تصرف میں لایا، بلکہ قشتالیہ کے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے وہاں کے بڑے بڑے سرداروں اور پادریوں میں فردلند کے مال کا کچھ حصہ تقسیم کیا، لیکن جس نیت سے ایسا کیا تھا وہ پوری نہ ہوئی۔

اہلِ قشتالیہ کا یہ حال تھا کہ اگرچہ ردمیر کی مہربانیوں سے نفع اٹھاتے تھے، مگر دل سے خیر خواہ اپنے معزول سردار فردلند کے تھے، اور ردمیر کے انعام و اکرام تقسیم کرنے کو سمجھتے تھے کہ ایک غاصبِ حکومت لوگوں کو رشوت دے رہا ہے۔

بیع ناموں اور دستاویزات میں تاریخ ڈالنے کے بعد دستور تھا کہ بادشاہِ وقت اور حاکمِ قشتالیہ کا نام لکھا جاتا تھا، لیکن قشتالیہ کے لوگ ردمیر کے مقرر کیے ہوئے حاکم کا نام اُس وقت تک نہ لکھتے جب تک کوئی دباؤ اُن پر نہ ہوتا، ہمیشہ اپنے پُرانے حاکم فردلند کا نام کاغذات پر درج کرتے اور اُس کے ساتھ اپنی وفاداری اور طریقوں سے بھی ظاہر کرتے مثلاً پتھر کا ایک بُت اُس کی صورت کا بنا کر روزانہ اُس کی پرستش کرتے۔

جب فردلند کو لیون کے قید خانے میں ایک مدت گذری تو قشتالیہ کے لوگوں کو صبر نہ رہا، اور انھوں نے اُسے قید سے چھڑانے کا قصد کر لیا۔ اُن کے اس قصد کو ایک شاعر نے نظم میں خوب بیان کیا ہے:

سب نے مل کر قسم کھائی کہ وہ بغیر اپنے سردار (فردلند) کو ساتھ لیے قشتالیہ واپس

نہ آئیں گے، اُس کا بُت انہوں نے ایک رتھ پر رکھا ہے، اور ارادہ کر لیا ہے کہ واپس (۳۳۴ھ
نہ آئیں گے جب تک سردار اُن کے ساتھ نہ ہو گا، بُت کو تعظیم دے کر سردار کا عَلَم بُت
کے پہلو میں رکھ دیتے ہیں، اور پھر بڈھے اور جوان سب بُت کے ہاتھ کو چومتے ہیں
برغش اور اُس کے نواح برباد پڑے ہیں، عورتوں اور چھوٹے بچوں کے سوا وہاں
کوئی باقی نہیں ہے"۔

ردمیر نے جب دیکھا کہ قشتالیہ کے لوگ اپنے سردار کی رہائی پر بہت مُصر ہیں، تو وہ ڈرا اور اُن کے کہنے کے مطابق فردلند کو رہا کر دیا، مگر شرطیں ایسی کیں جن سے فردلند کی بہت تحقیر و تذلیل ہوتی تھی، اِن شرطوں کے بموجب اُسے حلفِ اطاعت لینے، اور اپنے کُل مقبوضات سے دست کش ہونے، اور بادشاہ ردمیر کے بڑے لڑکے اردون سے اپنی بیٹی کے عقد کر دینے پر مجبور کیا۔

اِن شرطوں کو مان کر رہائی حاصل کرنا رہائی کو بڑے مولوں خریدنا تھا، جس بادشاہ نے ایسے شرائط نامے پر دستخط کرائے ہوں اُس کی نسبت فردلند کا یہ قصد کر لینا کہ کبھی اُس کی مدد نہ کرے گا ایک قدرتی امر تھا۔

قشتالیہ کے لوگ بھی جب انہیں اپنے سردار کو پھر اُس کے پُرانے مرتبۂ حکومت پر لانے میں کامیابی نہ ہوئی تو ردمیر سے ایسے ہی ناراض رہنے لگے جیسے کہ پہلے تھے۔

غرض بادشاہِ لیون ردمیر ثانی اپنے ہی ہاتھوں ایک بہادر سپہ سالار اور ایک بہادر رعایا کی مدد سے محروم ہو گیا، اور اسی چیز نے ردمیر کو مسلمانوں کے مقابلہ میں کمزور کر دیا، چنانچہ جب ۳۳۳ھ/۹۴۴ء میں مسلمانوں نے اُس کے ملک پر حملہ کیا، اور اسی طرح ۳۳۶ھ/۹۴۷ء میں دو حملے کیے، تو ردمیر ان حملوں کا جواب نہ کر سکا (مطلب یہ ہے کہ ردمیر نے تین بار مسلمانوں سے اور شکستیں کھائیں۔ مترجم)

اِسی زمانے میں مسلمانوں نے مدینہ سالم کی شہر پناہ اور قلعے کی مرمت کی، ردمیر میں اتنی قوت نہ تھی کہ اُن کو روک سکتا، مسلمانوں نے اِس شہر کی دیواروں اور قلعے کو اس درجہ مستحکم کر لیا کہ قشتالیہ کے عیسائیوں سے مقابلہ کرنے کے لیے سلطنتِ اسلامیہ کے حق

میں وہ ایک بڑا مضبوط مقام ہوگیا۔

اب حالت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ وہی رومیر جو شبنت مانکش اور الخندق کے معرکوں میں فتح یاب ہوا تھا، اب اس قابل رہ گیا تھا کہ مسلمان حملے کریں اور رومیر اپنی جان بچائے ۳۳۹ھ ۹۵۰ء میں البتہ اُس میں اتنا دم آیا کہ مسلمانوں کے ملک پر چڑھائی کی، اور طلبیرہ کے قریب فتح حاصل ہوئی، لیکن (شکستوں سے قطع نظر کرکے۔ مترجم) یہ اُس کی آخری فتح تھی، جنوری ۹۵۱ء (رجب ۳۳۹ھ) میں اُس کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

رومیر کے مرنے پر تخت نشینی کا جھگڑا اٹھا، رومیر نے دو شادیاں کی تھیں، پہلی بیوی جلیقیہ کی رہنے والی تھی، اُس سے ایک لڑکا تھا جس کا نام اردون تھا، دوسری بیوی یوراکہ بادشاہ نبرہ و غرسیہ کی بہن تھی، اُس سے بھی ایک لڑکا تھا جس کا نام شانجہ تھا۔

اردون نے ولدِ اکبر ہونے کی وجہ سے تخت کا دعویٰ کیا، لیکن شانجہ بھی جو بادشاہِ نبرہ غرسیہ کا بھانجا تھا، اہلِ نبرہ کے بل پر سلطنت کا مدعی ہوا، اور یہ ترکیب اور کی کہ فردلند اور اہلِ قشتالیہ کو اپنا طرفدار بنا لیا، فردلند کے لیے اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس معاملہ میں وہ کس کا طرفدار بنے، اردون اگرچہ فردلند کا داماد تھا مگر فردلند کو داماد کے ساتھ کچھ ہمدردی نہ تھی کیونکہ بیٹی زبردستی دینی پڑی تھی۔

شانجہ بھی فردلند کا رشتہ دار تھا، کیونکہ وہ فردلند کی بیوی کی سگی بہن کا بیٹا تھا، شانجہ کا ساتھ دینے میں فردلند کو اپنی ساس طوطہ ملکہ نبرہ سے مدد ملنے کی بھی اُمید ہو سکتی تھی، اگر فردلند کو کچھ تذبذب بھی ہوا ہوگا تو شانجہ کے اس وعدے سے رفع ہوگیا ہوگا کہ شانجہ کا ساتھ دینے کی صورت میں فردلند کی ضبط شدہ جائیداد واگذاشت کردی جائے گی اور اُس کو بدستورِ سابق قشتالیہ کا حاکم کردیا جائے گا۔ (۴۳۷)

اب شانجہ اور نبرہ کی فوج مع فردلند کی فوج کے شہر لیون پر حملہ کرنے کو روانہ ہوئی، تاکہ اردون ثالث سے ریاست چھین کر شانجہ کو دے دی جائے۔

ایک عربی مورخ نے ٹھیک لکھا تھا کہ "خدا نے ان کافروں میں خانہ جنگی ڈال دی تاکہ فتح و کشائش مسلمانوں کو نصیب رہے" اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اِدھر تو عیسائی لیون

کی شہر پناہ کے نیچے عیسائیوں کا گلا کاٹ رہے تھے، اُدھر ناصر کے امراء لشکر تمام سرحدی مقامات پر لڑائیاں سر کر رہے تھے، شمالی اسپین سے جو خبر قرطبہ میں آتی تھی وہ مژدۂ فتح ہوتی تھی، گرجا کے گھنٹے اور گھنٹیاں، صلیبیں، اور عیسائیوں کے کٹے ہوئے سر فتح کی نشانیوں کے طور پر قرطبہ میں لوگوں کو دکھائے جاتے تھے۔ ۳۴۴ھ ۹۵۵ء میں ایک موقع پر عیسائیوں کے پانچ ہزار بریدہ سر لوگوں کو دکھائے گئے، بیان کیا گیا ہے کہ اس شمار سے دوچند قشتالی شکست کھاکر جان سے مارے گئے تھے۔

یہ سچ ہے کہ فردلند کو شنت اشتیبان کے قلعے کے قریب اردون ثالث کے مقابلہ میں ایک فتح ہوئی تھی، اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اردون ثالث نے اپنے بھائی شانجہ کو شکست دے کر اہلِ جلیقیہ کو (جنہوں نے بغاوت کردی تھی) مجبور کیا تھا کہ وہ اردون کو اپنا بادشاہ تسلیم کریں اور جلیقیہ کے شہر اشبونہ کو لوٹ کر کسی قدر انتقام بھی لیا تھا، لیکن یہ غارت گری اُس تباہی کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھی جو مسلمانوں نے عیسائیوں میں ڈال رکھی تھی۔

اردون ثالث کو اپنے ہی ملک میں بغاوت کا ایسا خوف تھا کہ وہ جلد امن و امان پیدا ہونے کا آرزومند ہوگیا، چنانچہ ایک ایلچی قرطبہ روانہ کیا کہ خلیفہ ناصر کے سامنے اُس کی طرف سے امن کی درخواست پیش کرے اور مصالحت کی کوشش کرے۔

خلیفہ ناصر بھی اس وقت عیسائیوں سے لڑائیاں بند کرنی چاہتا تھا، کیونکہ اُس کو دوسری طرف لڑائی چھیڑنی تھی، اِس لیے اردون ثالث کی درخواست کو اُس نے بے توجہی سے نہ سنا، دوسرے برس اُس نے قرطبہ سے ایک سفارت اردون ثالث کے پاس بھیجی، اس سفارت میں محمد ابن حسین، اور حسدائی بن شپروط، جو یہودیوں کا زبردست عالم اور محکمۂ مسائر کا افسرِ اعلیٰ تھا شامل تھے، مصالحت کی گفتگو میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا، اردون ثالث نے ناصر کی شرائط کا پابند رہنا قبول کرلیا، شرائط غالباً یہ تھیں کہ اردون اپنے بعض قلعوں کو خالی اور بعض کو منہدم کردے۔ اس عہدنامہ کا مسودہ تیار ہوتے ہی ایک سفارت خلیفہ ناصر کے پاس اس غرض سے آئی کہ عہدنامہ کی منظوری حاصل کرے۔

اگرچہ یہ عہدنامہ ایسا تھا جس میں مسلمانوں کا فائدہ تھا اور عیسائیوں کی بھی عزت قائم

ہتی تھی، لیکن عبدالرحمٰن الناصر کو خیال ہوا کہ جو شرائط عہد نامہ میں لکھی گئی ہیں اُن سے بھی زیادہ
مفید شرائط لکھوائی جا سکتی ہیں، لیکن اب ناصر کی عمر قریب ستر برس کے پہنچی تھی، اس (۴۳۸)
کی خبر نہ تھی کہ کل کیا پیش آئے، اس لیے اس معاملہ کو زیادہ تر اپنے فرزند حَکَم کے متعلق
سمجھ کر اُس سے مشورہ کیا اور اُس کے فیصلہ پر کُل معاملہ چھوڑ دیا، حَکَم کی طبیعت عافیت
پسند تھی عہد نامہ کی شرطیں پسند کر کے منظور کر لیں، خلیفہ ناصر نے عہد نامہ پر اپنی مہر کر دی،
اس کے کچھ عرصہ بعد اُس نے فردلند سے بھی مصالحت رکھنے کا عہد و پیمان لے لیا، خلاصہ
یہ کہ اب اسپین میں اہلِ نبرہ کے سوا مسلمانوں کا کوئی دشمن نہ رہا۔

خلیفہ ناصر نے اس موقع پر خلافِ عادت کسی قدر زیادہ مراعات عیسائیوں کے
حق میں اس وجہ سے منظور کیں کہ اس وقت افریقہ میں فاطمیوں سے جنگ کرنی تھی،
خلفائے بنی فاطمہ کی قوت کو اس وقت عروج تھا، یورپ کے بادشاہوں سے انتقام
لینے کا غیظ و غضب اُن میں بھرا تھا، یورپ کے بادشاہ یہ سمجھ کر کہ اب فاطمیوں کے زوال
کا وقت قریب آن پہنچا ہے بہت خوش تھے، اس عرصہ میں فاطمیوں نے پہلے بیزنطیہ کے
شہنشاہ یعنی قیصر قسطنطنیہ کو اپنا زور دکھا کر اٹلی میں کلابری کے علاقے کو غارت کرنا شروع
کیا، پھر خلیفہ ناصر کی باری آئی، اور ۳۴۴ھ / ۹۵۵ء میں گمان ہوا کہ فاطمی خلیفہ چہارم یعنی المعزلدین
اللہ[1] کی طرف سے اسپین پر فوج کشی ہونی ضروری ہے۔

واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ ناصر نے ایک جہاز مالِ تجارت سے بھرا ہوا اسکندریہ روانہ
کیا تھا، راستہ میں اُسے ایک جہاز ملا جو جزیرہ صقلیہ سے مصر جاتا تھا، اس جہاز میں وہ
قاصد تھا جو حاکمِ صقلیہ نے اپنے آقا خلیفہ معز کی خدمت میں روانہ کیا تھا، ناصر کے جہازی
افسروں کو اس بات کا علم ہو گیا، یہ بھی ممکن ہے کہ ناصر نے اسی خیال سے اپنا جہاز روانہ
کیا ہو کہ اسپین پر فاطمیوں کی فوج کشی کے متعلق کاغذات جن میں حملہ کرنے کی تدبیریں
درج ہیں صقلیہ سے مصر بھیجے جا رہے ہیں، الغرض اسی بنا پر اپنے جہاز کے معلم کو خفیہ طور

---

[1] دیکھو ہماری کی تاریخ مسلمانانِ صقلیہ۔ جلد ۲ ص ۴۴ تا ۴۸

پر حکم دے دیا ہو کہ اگر کوئی جہاز صقلیہ سے مصر جاتا ہوا ملے تو اُسے روک لینا۔ غرض جو کچھ بھی ہو، اسپینی جہاز کے کپتان نے صقلیہ والوں کے جہاز پر حملہ کر کے اُسے گرفتار کر لیا، جہاز کو لوٹا، اور جس قدر کاغذات ملے انہیں اپنے قبضے میں کر لیا۔

خلیفہ معزلدین اللہ نے اس کا جلد انتقام لیا، حاکم صقلیہ نے خلیفہ معز کے حکم سے ایک بیڑا جہازوں کا تیار کیا، اور اس بیڑے کو لے کر وہ اسپین روانہ ہوا، ساحل المریہ پر پہنچ کر وہاں کی بندرگاہ میں جس قدر جہاز موجود تھے ان میں سے کچھ چھین لیے اور کئی میں آگ لگا دی اور اُس اسپینی جہاز کو بھی جس کی وجہ سے یہ بیڑا بھیجا گیا تھا راستہ میں گرفتار کر لیا، یہ جہاز اس وقت بہت سا قیمتی مال اور چند گانے والیاں جن کی طلبی ناصر کے دربار میں ہوئی تھی، اسکندریہ سے اسپین کو لا رہا تھا۔ صقلیہ کے حاکم نے بندرگاہِ المریہ پر جہاز گرفتار کر کے اور بعض میں آگ لگا کر ساحل پر اپنی فوجیں اُتار دیں، اور المریہ کے شہر اور (۴۳۹)
اُس کے قرب و جوار کو خوب لُوٹا، اور پھر صقلیہ واپس چلا آیا۔

خلیفہ ناصر نے فاطمیوں کے اس بحری حملے کا نہایت سختی سے جواب دیا، پہلا کام تو یہ کیا کہ فاطمیوں کے حق میں بددعا کرنے کا حکم تمام مسجدوں میں گشت کرا دیا، دوسرا کام یہ کیا کہ اپنے امیر البحر غالب کو حکم دیا کہ افریقیہ کے ساحلی مقامات کو خوب لُوٹے۔

لیکن ناصر کی یہ مہم زیادہ سر سبز نہ ہوئی، اگرچہ شروع شروع میں اندلسیوں کو کسی قدر کامیابی ہوئی مگر افریقیہ کی حفاظت کے لیے فاطمیوں کا لشکر موجود تھا، اُس نے اندلس والوں کو مجبور کیا کہ جہازوں پر سوار ہو کر اپنے ملک کو واپس چلے جائیں۔

فاطمیوں کے ساتھ یہ معاملات اُس وقت پیش آ رہے تھے جب کہ لیون کا بادشاہ اردون ثالث ناصر سے مصالحت کا نامہ و پیام کر رہا تھا، چونکہ ناصر فاطمیوں کے مقابلہ میں اپنی پوری قوت افریقیہ میں صرف کرنی چاہتا تھا، اس لیے اسپین میں اُس نے شمال کے عیسائیوں سے مصالحت کر لینی پسند کی، اور یہی وجہ تھی کہ بادشاہِ لیون سے جو عہد نامہ اس وقت ہوا اُس کی شرائط میں ناصر نے سختی سے کام نہیں لیا۔

عیسائیوں سے مصالحت کے بعد ناصر نے افریقہ کی طرف توجہ کی، اور افریقہ پر

لشکر کشی کے لیے بڑا اہتمام ہونے لگا، بندر گاہوں میں سفینہ ساز جہازوں اور کشتیوں کے بنانے میں دن رات مصروف رہنے لگے، ایک دم کی مہلت اُن کو نہ تھی، اندرونِ ملک سے فوجیں ساحلِ اسپین کی طرف روانہ ہونے لگیں، اور ہزارہا سپاہی جہازوں کے لیے بھرتی ہونے لگے۔

یہ سامان ہو ہی رہے تھے کہ ۳۴۵ھ (۹۵۶ء) کے موسم بہار میں اردون ثالث بادشاہِ لیون کے مرنے کی خبر آئی، اس واقعہ سے خلیفہ ناصر کی تمام تدبیروں نے کچھ اور ہی صورت اختیار کر لی۔

ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اردون کو چند شرائط پر امان دی گئی تھی، ان کے بموجب بعض قلعوں کو خالی کرنا اور بعض کو منہدم کرنا اردون کا لازمی فرض تھا۔ لیکن اردون کے بعد جب اُس کا بھائی شانجہ جو اردون کا حریفِ مقابل رہ چکا تھا، لیون میں تخت نشین ہوا تو اُس نے عہدنامہ کی ان بڑی شرطوں کے ایفا سے انکار کیا، اس لیے اب جو سامانِ جنگ افریقہ پر فوج کشی کے لیے ہوا تھا، وہ بادشاہِ لیون شانجہ کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا طلیطلہ کے حاکم احمد بن یعلیٰ[1] کو حملہ کرنے کے لیے حکم بھیج دیا، احمد فوجیں لے کر شمال کی طرف بڑھا، اور جولائی کے مہینے میں بادشاہ لیون شانجہ کو نہایت فاش شکست دی، ناصر کو اس فتح سے کسی قدر تسلی ضرور ہوئی، لیکن اگر عزت کا سوال پیدا نہ ہو جاتا تو ناصر اس وقت شانجہ سے جنگ کرنا پسند نہ کرتا، لیکن اب اس سے بھی زیادہ تسلی بخش واقعہ پیش آیا، یعنی ناصر نے اپنے دشمن شانجہ کو اپنے قدموں میں گرتے دیکھا۔

ابن الابار - ص ۲،۲۴،۱۴۰
مقری جلد ا ص ۹۲، ۲۳۵، ۲۷۲، ۲۳۳ تا ۲۷۲۔ جلد ۲ ص ۵۷
ابن حوقل (لیڈن کا قلمی نسخہ) ص ۳۹
ابن عذاری - جلد ۲ ص ۲۲۴ تا ۲۲۷، ۲۲۹ تا ۲۳۰، ۲۳۳ تا ۲۳۸
کرونیکون دی سامپیرو - ص ۱۹، ۲۳ تا ۲۵
ابنِ خلدون - ص ۱۵

[1] ابنِ یعلیٰ کو خلیفہ ناصر نے طلیطلہ کی سندِ حکومت ۳۴۳ھ ۹۵۴ء میں عطا کی تھی۔

کتاب ثالث

خلافت

چوتھی فصل

شانجہ "الجسیم"

ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ شانجہ (رئیس لیون) مغرور و متکبر تھا، یہ فقرہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے کسی ہم عصر عیسائی مورخ سے اخذ کیا ہے، کیونکہ عربی اور عیسائی دونوں قسم کے مورخوں کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ شانجہ رؤساء ملک کا زور توڑ کر ایسی ہی مطلق العنان حکومت کرنی چاہتا تھا جیسی کہ اُس کے باپ دادا کو حاصل رہی تھی، اسی بنا پر ملک کے رئیسوں اور شریفوں کو شانجہ سے دشمنی ہو گئی اور دشمنی کے ساتھ ایک قسم کی کراہت بھی اُس سے پیدا ہوئی۔

شانجہ میں فی الحقیقت اب وہ خوبیاں باقی نہ رہی تھیں جن کی وجہ سے اُس کی رعایا اُسے پہلے عزیز رکھا کرتی تھی، یہ بادشاہ حد سے زیادہ موٹا ہو گیا تھا، گھوڑے کی سواری سے معذور تھا، اور پیادہ پا چلنے میں بھی جب تک ایک نوکر کا سہارا نہ لے، چلنا ممکن نہ تھا۔ اس

مٹاپے کی وجہ سے اُس کی ہنسی اُڑتی رہتی تھی، اور کچھ دنوں کے بعد نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایسے نامعقول اور بدقوارہ بادشاہ کو تخت سے اُتارنے کے لیے سرگوشیاں ہونے لگیں۔ فرذلند نے جو شاہ ساز بننا چاہتا تھا، اور اس میدان میں ایک مرتبہ پہلے بھی بے سود کوشش کر چکا تھا، اہلِ لیون میں شانجہ کی طرف سے بدگمانی اور ناراضی پھیلانی شروع کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شانجہ کے خلاف فوج میں ایک سازش ہوئی اور ۳۴۷ھ / ۹۵۸ء کے موسمِ بہار میں وہ ریاست لیون سے نکال دیا گیا۔

تخت سے معزول ہو کر شانجہ دل میں ملول بنبلونہ کو روانہ ہوا جہاں اُس کا ماموں غرسیہ رہتا تھا، اس اثنا میں فرذلند اور لیون کے بڑے لوگوں نے کسی دوسرے آدمی کو لیون کی بادشاہی کے لیے منتخب کرنا چاہا، سب نے اردون کی نسبت رائے دی، کہ اس نام کا چوتھا شخص اپنے خاندان میں تھا، یہ اردون بادشاہِ لیون ادفونش چہارم کا بیٹا تھا، اس لیے شانجہ کا چچازاد بھائی تھا، لیکن اردون میں سوائے اِس کے کہ شاہی خاندان کا آدمی تھا اور کوئی خوبی ایسی نہ تھی کہ جو انتخاب کرنے والوں کی نظر میں اُس کی سفارشی ہوتی، صورت شکل کا بُرا اور کوزپشت تھا، اُس کے ساتھ دنی الطبع، خبیث اور شریر تھا، چنانچہ بعد کو اُس کا نام "اردونو ایل مالو" یعنی "اردون الخبیث" ہو گیا۔

بہر کیف چونکہ خاندانِ شاہی میں کوئی بالغ مرد سوائے اردون کے موجود نہ تھا، (۴۴۱)
اِس لیے اُس کو منتخب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، فرذلند حاکمِ قشتالیہ اپنی لڑکی یوراکہ کا جو اردون ثالث کی بیوہ تھی، اردون چہارم سے عقد کر چکا تھا۔ یوراکہ گویا اب دوبارہ لیون کی ملکہ بنی۔

اِدھر لیون میں تو نیا بادشاہ منتخب ہو رہا تھا، اُدھر شانجہ لیون سے نکل کر بنبلونہ میں بیٹھا اپنی مصیبت کی داستان سناتا تھا۔ شانجہ کی نانی ملکہ طوطہ جو اَب بڑھیا ہو گئی تھی مگر شوقِ حکمرانی میں فرق نہ آیا تھا اب تک اپنے بیٹے غرسیہ کے نام سے نبرہ پر حکومت کر رہی تھی، اگرچہ غرسیہ کی عُمر حکومت کرنے کے لائق ہو گئی تھی۔ جب اُس نے اپنے نواسے کی مصیبتوں اور تکلیفوں کا حال سُنا تو نواسے کو تسلّی و تشفی دی، اور

تخت لیون پر بحال کرادینے کا اُس سے وعدہ کیا۔

ملکہ طوطہ نے وعدہ تو کرلیا مگر یہ کام مشکل تھا، کیونکہ لیون میں جہاں سے شانجہ نکالا گیا تھا کوئی اُس کا دوست اور مددگار نہ تھا، دوسرے نبرہ کی ریاست میں اتنا دم نہ تھا کہ وہ لیون اور قشتالیہ کی متحدہ قوت کا مقابلہ کرسکتی، اس لیے ملکہ طوطہ کو ایک ایسے مددگار اور معاون کی ضرورت ہوئی جو بہت ہی قوی اور زبردست ہو، اور اُس کی مدد ایسی ہو کہ تخت پر بحال ہونے کے بعد شانجہ تخت پر برقرار رہ سکے، اس کے ساتھ اس کی بھی ضرورت تھی کہ شانجہ کی فربہی بھی کسی طرح کم ہو، جو سب کے لیے محلِ ظرافت بنی ہوئی تھی، یہ مٹاپا پیدائشی نہ تھا بلکہ کسی مرض سے پیدا ہوگیا تھا، اگر کوئی طبیب حاذق مل جاتا تو اس کا علاج ممکن تھا۔ اچھے طبیب کا ملنا قرطبہ ہی میں ممکن تھا، کیونکہ یہ شہر فضل وکمال کا مرکز تھا، اور یہاں ہر قسم کے اعلیٰ سے اعلیٰ طبیب موجود تھے،

غرض تمام امور پر غور کرکے ملکہ طوطہ نے سوچا کہ صرف قرطبہ ہی ایسا مقام ہے جہاں ایک زبردست حامی وسرپرست اور ایک عمدہ طبیب مل سکتا ہے، پس ملکہ نے ارادہ کیا کہ خلیفہ ناصر سے ایک طبیب جو اُس کے نواسے کا علاج کردے، اور ایک لشکر جو اُس کے نواسے کو لیون کے تخت پر بٹھادے مانگے،

لیکن ایسا سوال کرنے میں ملکہ کی عزت میں بٹا لگتا تھا، کیونکہ اُسے ایک ایسے بادشاہ کے سامنے سائل بننا پڑتا تھا جس کو وہ کافر سمجھتی تھی، جس سے تیس [۳۰] برس تک لڑائیاں ہوتی رہی تھیں، جس نے مشکل سے ایک سال بھی ایسا نہیں جانے دیا تھا جس میں ملکہ کے مُلک اور مقبوضات کو غارت، اور گاؤں اور قصبات کو جلاکر خاک نہ کیا ہو، پس ایسے شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانا ملکہ کی طبیعت کے خلاف تھا، لیکن نواسے کی محبت اور اُس کو پھر تندرست اور صاحبِ تخت دیکھنے کی آرزو نے بالکل مجبور کردیا، نواسے کی مصیبتوں کے خیال سے طلبِ امداد میں اس بات کی غیرت نہ رہی کہ ایک مسلمان بادشاہ کے سامنے جس سے عداوت چلی آتی تھی درخواست پیش کرے۔ بہرکیف طوطہ ملکۂ نبرہ نے ایک سفارت ان مقاصد سے جو اوپر بیان ہوئے خلیفہ ناصر کی خدمت میں بھیجی۔

سفارت نے دربار میں حاضر ہو کر ملکہ کی درخواست پیش کی، ناصر نے بہت خوش ہو کر درخواست منظور کی، اور شانجہ کے علاج کے لیے ایک شاہی طبیب بھیجنے کا حکم دیا، اور سفیروں سے کہا کہ ہم اپنا ایک وزیر بنبلونہ روانہ کرتے ہیں، یہ وزیر ملکہ کے سامنے چند شرائط پیش کرے گا، اگر ملکہ اُن شرائط کو منظور کرے گی تو ہم شانجہ کو لیون کے تخت پر بٹھانے کے لیے فوج روانہ کریں گے۔

جب یہ سفیر قرطبہ سے رخصت ہونے لگے تو خلیفہ ناصر نے یہودی طبیب حسدائی کو خاص خاص ہدایتیں دے کر ملکہ نبرہ کے پاس جانے کا حکم دیا، حسدائی سے بہتر کوئی شخص اس کام کے لیے وضع نہ ہوا تھا، سیاسی معاملات کو خوبی سے طے کرنے کے لیے جو خوبیاں کسی میں ہونی چاہئیں وہ سب اس طبیب میں موجود تھیں، عیسائیوں کی زبان میں بالکل بے تکلف بلکہ بڑی فصاحت سے گفتگو کر سکتا تھا، طبیبِ حاذق ہونے کے علاوہ امورِ حکمرانی میں بڑا ہوشمند تھا، اُس کے فضل و کمال اور سلامتی رائے کی تعریف ہر شخص کی زبان پر تھی، چنانچہ ایک سفیر نے جو جرمانیہ کی مشرقی سرحد سے قرطبہ آیا تھا اُس کی تعریف میں کہا تھا کہ "یہ حکیم تدبر مملکت میں درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہے"۔ (۴۴۱)

بنبلونہ پہنچ کر حسدائی نے شانجہ کو تندرست کر دینے کا وعدہ کر کے اُس کے دل میں جگہ کر لی، مگر یہ بات جتا دی کہ علاج کے معاوضہ میں اُس کو اپنے دس قلعے ناصر کو تفویض کرنے ہوں گے، شانجہ نے جواب دیا کہ لیون کا تخت ملتے ہی وہ دسوں قلعے خلیفہ ناصر کے حوالے کر دے گا۔

لیکن ناصر کی شرائط صرف یہی نہ تھیں، بلکہ چلتے وقت ناصر نے حسدائی کو ہدایت کر دی تھی کہ ملکہ طوطہ سے اس بات کا اقرار ضرور لے کہ وہ بذاتِ خود دربارِ خلافت میں میں حاضر ہو گی، اور اپنے بیٹے غرسیہ اور نواسے شانجہ کو بھی ساتھ لائے گی۔

اس اثنا میں خلیفہ ناصر کو اپنا کرو فر، اور رعایا کو اس بات کا تماشہ دکھا کر خوش کرنے کے لیے کہ ایک عیسائی ملکہ اور دو عیسائی بادشاہ کس طرح دربارِ خلافت میں حاضر ہو کر اُس کے قدموں پہ گرتے ہیں اور عاجزی و الحاح سے اُس کی مدد کے طالب ہوتے ہیں

اس شرط پر اصرار کرنا ضروری تھا کہ ملکہ طوطہ، شانجہ اور غرسیہ قرطبہ میں حاضر ہوں، لیکن یہ خیال پہلے ہی گذرا تھا کہ ملکہ اس سے انکار کرے گی، کیونکہ ایک خفت تو اُسے پہلے یہ ہو چکی تھی کہ مجبور ہو کر اپنے جانی دشمن سے اتحاد پیدا کرنا پڑا تھا، اب یہ دوسری ذلت تھی کہ قرطبہ کا سفر اختیار کرے، اور یہ ذلت پہلی ذلت سے بڑھ کر تھی، اوّلاً ملکہ سے یہ کہنا کہ وہ قرطبہ چلے، اور پھر اس پر راضی بھی کر لینا حسدائی کی سفارت کا سب سے نازک اور مشکل کام تھا، ملکہ سے اس قسم کا قول و قرار لینے میں بڑی لیاقت اور ہوشیاری درکار تھی، لیکن یہ یہودی طبیب جیسا لائق مشہور تھا ویسا ہی اس موقع پر اپنے کو لائق ثابت بھی کیا، اور مغرور ملکہ نبرہ بقول ایک شاعر کے حسدائی کی شیریں کلامی اور دانشمندی سے بیحد متاثر ہوئی، اور اس خیال سے کہ نواسے کو پھر تخت پر بٹھانا اس سے کم قیمت میں میسر نہیں ہو سکتا، طبیعت پر جبر کر کے قرطبہ چلنے پر رضامند ہو گئی۔

(۳۴۴) اب اسپین نے ایک عجیب تماشا دیکھا، ملکہ نبرہ مع اپنے خدم و حشم، اور روساء قوم اور پادریوں کی ایک بڑی جماعت کے چھوٹی چھوٹی منزلیں طے کرتی ہوئی بنبلونہ سے قرطبہ کو جاتی ہے، ملکہ کے ساتھ اُس کا فرزند غرسیہ اور نواسہ شانجہ بھی تھا جس کے مرض میں ابھی تک افاقہ نہ ہوا تھا اور حسدائی کا سہارا لے کر چلتا تھا۔

دربارِ خلافت میں عیسائی بادشاہوں کی حاضری مسلمانوں کے قومی تفاخر کے لیے تو اطمینان بخش تھی ہی، لیکن یہودی بھی خوشی سے باغ باغ ہو رہے تھے، اور سمجھتے تھے کہ یہ کُل کارنامہ اُنہی کے ایک ہم مذہب کا ہے، یہودی شاعروں نے حسدائی کی تعریف میں ایک دوسرے کو مات کرنا چاہا، ایک شاعر نے لکھا:۔

"پہاڑو! یہودہ کے سردار کے سامنے سرنگوں ہو جاؤ، سب ہنسو اور خوش ہو ویرانو، اور جنگلو! نغمہ سرائی کرو صحرا کی زمینو، پھولوں اور میووں کے باغ بنجاؤ۔ کیونکہ بیت الحکمت کا سردار تشریف لا رہا ہے، خوشی و خرمی اور نغمے اُس کے ساتھ ساتھ ہیں، جس وقت وہ یہاں نہ تھا تو شہر کی دیواریں افسردہ تھیں اور شہر تاریک معلوم ہوتا تھا، غریب یہودی جن کو اُس کی

صورت دیکھنی نصیب نہیں ہوتی تھی مبتلائے الم تھے۔ مغرور لوگ ہم پر حکومت چلاتے تھے، غلامی میں ہمیں بیچا اور خریدا جاتا تھا، ہمارا مال نگلنے کو سب منہ پھاڑے ہوئے تھے ہم پر یہ دشمن شیروں کی طرح دہاڑتے تھے، ہم حالتِ خوف میں رہتے تھے، کیونکہ ہمارا پناہ دینے والا ہم سے دُور ہو گیا تھا، خدا نے ہمارے سردار کو پھر ہمارے پاس بھیجا، دیکھو! وہ خلیفہ کے دائیں طرف کھڑا ہے، خلیفہ اُس کو شہزادہ کہتا ہے، اور خلیفہ نے بڑے تدبر سے اُس کا درجہ بڑھا دیا ہے، جس وقت وہ قریب سے گذرتا ہے تو کسی کو لب کھولنے کی مجال نہیں ہوتی، بغیر تیر و تلوار کے صرف اپنی باتوں سے اُس نے ان لحم نجس کھانے والوں کے متحصن شہروں کو فتح کیا ہے"

ملکہ اور دونوں بادشاہ یعنی غرسیہ اور شانجہ جب قرطبہ پہنچ گئے تو خلیفہ ناصر نے ایک بڑا دربار کیا، یہ دربار اُن درباروں میں سے تھا جن کی شان و عظمت کو دیکھ کر باہر والے بیحد متاثر ہوتے تھے، اور اسپین میں اسلامی سلطنت کی قوت اور دولت کا اِس سے بخوبی اندازہ کر سکتے تھے۔

اِس امر میں شبہ کی ضرورت نہیں کہ ناصر کے لیے یہ دن بہت ہی خوشی اور اطمینان کا تھا[1] وہ دیکھتا ہوگا کہ اُس کے پُرانے دشمن اور بدخواہ ردمیر ثانی فاتح شنت مانکش و الخندق کا فرزند شانجہ، اور وہ بہادر ملکہ جو لڑائیوں میں خود اپنی فوجوں کو خلیفہ کے مقابلہ پر لاتی تھی اِس وقت دونوں اُس کے قدموں پر سر رکھتے ہیں

اس قسم کے خیالات خلیفہ ناصر کے دل میں جو کچھ بھی ہوں، لیکن کسی علامت سے اُس نے انہیں ظاہر نہ ہونے دیا، اور اپنے معزز مہمانوں کا بڑے تپاک اور اخلاق سے استقبال کیا۔ شانجہ نے دس قلعوں کے سپرد کرنے کا وعدہ جو حسدائی سے کیا تھا اُس کی تجدید خلیفہ ناصر کے سامنے کی، تصفیہ یہ ہوا کہ جس وقت مسلمانوں کی فوج لیون کی ریاست پر

---

[1] مگر اس پُرانے دشمن اور بدخواہ کو الخندق کی جنگ کے بعد خلیفہ ناصر تین بار سخت شکستیں دے چکا تھا، اور یہ خوشی اور اطمینان اِس سے پہلے بھی اُسے نصیب ہو چکا تھا۔ مترجم اردو

حملہ کرے، نبرہ والے قشتالیہ پر فوج کشی کر دیں۔ تاکہ فردلند جو اس وقت لیون کی کمک پر ہے قشتالیہ کو بچانے کی فکر میں لیون سے ہٹ جائے[1]

اس زمانے میں خلیفہ ناصر افریقیہ کی طرف سے غافل نہ ہوا تھا، لڑائی کی تیاریاں جاری تھیں جس سال ملکۂ نبرہ قرطبہ میں آئی ہے اُسی سال خلیفہ ناصر نے ستر جہازوں میں اپنی فوجیں سوار کرا کے اور احمد بن یعلیٰ کو اُن کا سپہ سالار مقرر کر کے افریقیہ روانہ کیا تھا، یہ مہم کامیاب ہوئی، اندلس کی فوجوں نے مرسیٰ الخرزیہ کو آگ لگا دی، اور سوس (۳۴۴ھ) اور طرقہ کے شہروں کو غارت کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مسلمانوں کی ایک فوج نے ریاست لیون پر حملہ کیا۔ شانجہ اس فوج کے ساتھ تھا حسدائی کے علاج سے اُس کا مٹاپا دُور ہو گیا تھا اور اب وہ پھر پہلے کی طرح چھریرا جسم کا چست و چالاک آدمی ہو گیا تھا اسلامی فوج کو پہلے ریاست لیون کے شہر سمورہ پر قبضہ کرنا پڑا[2]، چنانچہ اُس پر قبضہ کیا گیا اور اپریل ۹۵۹ء (صفر ۳۴۸ھ) تک ریاست لیون کے ایک بڑے حصہ پر مسلمانوں کی مدد سے شانجہ کی حکومت پھر قائم ہو گئی، لیون کا شہر جو دارالریاست تھا اردون چہارم کے قبضے میں رہا جسے فردلند نے لیون کے تخت پر بٹھایا تھا، لیکن جب سنہ ۹۶۰ء (۳۴۹ھ) کے موسم خریف میں یہ بادشاہ لیون سے بھاگ کر اشتوراس کے علاقے میں پناہ گزین ہوا تو لیون کے شہر پر بھی شانجہ کا قبضہ ہو گیا۔

جس وقت شانجہ پوری ریاست پر قابض ہو گیا تو اُس نے خلیفہ ناصر کو شکریہ کا خط لکھا اور اُس کے ساتھ ہی لیون میں اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان قرب و جوار کے علاقوں میں کیا۔ اس اعلان کی غرض سے جو خطوط اُس نے روانہ کئے ان میں فردلند قومس قشتالیہ کی بدخواہی اور دشمنی کا ذکر سخت الفاظ میں کیا، ممکن ہے شانجہ کو اس وقت بھی فردلند

---

[1] کتاب "تحقیقات" مصنفہ ڈوزی، مطبوعہ ۱۸۸۱ء جلد ۱ ص ۹۸

[2]

کی مخالفت کا شوق ہو لیکن اگر یہ خوف تھا تو وہ جلد رفع ہو گیا۔ قرطبہ میں جس طرح طے پایا تھا اُسی کے مطابق اہلِ نبرہ نے قشتالیہ پر فوج کشی کر دی اور اسی سال یعنی ۳۴۹ھ ۹۶۰ء میں اُنہوں نے فرولند سے لڑ کر اُسے قید کر لیا، غرض اس طور سے اردون چہارم کی بادشاہی کا خاتمہ ہوا، اِردون کی رعایا پہلے ہی اُسے نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی، صرف فرولند کی مدد سے جس کا وہ آوردہ تھا اُسے لیون کا تخت مِل گیا تھا، اشتوراس والوں نے بھی جن میں اُس نے پناہ لی تھی اُسے اپنے علاقے سے نکال دیا، اشتوراس سے نکلنے پر اُس نے قشتالیہ کے دار الحکومت برغش میں سکونت اختیار کی، اس کا حال آگے بھی بیان ہوگا۔

جس زمانہ میں یہ واقعات اسپین کے شمال میں پیش آ رہے تھے اُسی زمانے میں خلیفہ ناصر کا مزاج ناساز ہوا، مارچ (محرم ۳۵۰ھ) کا مہینہ تھا، ہوا نہایت سرد چلتی تھی، احتیاط کی نہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ناصر الیبا سخت بیمار پڑا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ اطبا نے علاج میں بہت کوشش کی تو مرض میں کچھ افاقہ پیدا ہوا اور جولائی (جمادی الاول ۳۵۰ھ) میں وہ اِتنا تندرست ہو گیا کہ دربار کر کے اہلِ دربار کو حاضر ہونے کی عزت بخشی، لیکن یہ صحت عارضی تھی۔ مرض نے پھر حملہ کیا اور ۱۶ اکتوبر ۹۶۱ء (۲ رمضان ۳۵۰ھ) کو شمسی حساب سے عمر کے (۵۴۴
ستّرویں سال میں اُنچاس برس حکومت کر کے اس جہانِ فانی سے رحلت کی۔

اسپین کے سلاطین بنی امیہ میں عبد الرحمٰن ثالث سب سے بڑا بادشاہ گذرا ہے جو کام اُس نے کئے وہ کام نہ تھے بلکہ قریب قریب معجزے تھے، جس وقت وہ تخت نشین ہوا ہے تو تمام ملک بد نظمی و خانہ جنگی کا شکار ہو رہا تھا۔ ہر طرف فتنہ و فساد برپا تھا، سلطنت مختلف النسل لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی تھی جو شمال کے عیسائیوں کی لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا شکار ہو رہی تھیں اور نوبت اِس کے قریب پہنچی تھی، کہ اِن ریاستوں کو کہیں تو لیون کے عیسائی اور کہیں افریقیہ کے فاطمی ایک دن اپنا لقمہ بنا لیں باوجود بے شمار مشکلات کے عبد الرحمٰن نے اندلس کو اندلسی دشمنوں کے فساد اور بیرونی دشمنوں کی حکومت سے بچا لیا۔

اسپین میں اسلامی حکومت کو جو اعلیٰ رتبہ عبد الرحمٰن ثالث نے بخشا وہ کبھی پہلے اُسے

حاصل نہ ہوا تھا۔ اندرونِ ملک سلطنت میں امن و استحکام پیدا کیا، بیرونِ ملک اُس کی عزت اور وقعت قائم کی، ملک کے مالیئے کا ایک ثلث جس کی رقم باسٹھ لاکھ پینتالیس ہزار دینارِ سرخ ہوتی تھی مصارفِ سلطنت کے لئے کفایت کرتا تھا، دوسرا ثلث بیت المال میں محفوظ کر دیا جاتا تھا، تیسرا ثلث تعمیرات پر صرف ہوتا تھا، ۳۴۰ھ / ۹۵۱ء میں بیت المال میں دو کروڑ دینار سرخ موجود تھے۔

ایک سیاح نے جسے مالی معاملات میں دستگاہ تھی لکھا تھا کہ "زمانۂ موجودہ میں دولتمندی کے اعتبار سے اسپین کے عبدالرحمٰن اور عراق کے بنی حمدان[1] سے بڑھا ہوا دنیا میں کوئی نہیں ہے"۔ ملک کی حالت خزانہ کی مرفہ الحالی سے مطابق تھی، زراعت، صنعت، تجارت، فنون اور علوم سب کو ترقی تھی، سیاحوں کی نظر ہر طرف سرسبز کھیتوں کو دیکھ کر خوش ہوتی تھی، کھیتوں کی آبپاشی کے لئے باقاعدہ ذرائع موجود تھے، جن سے خشک اور بنجر زمینیں بھی زرخیز بنا دی گئی تھیں۔ سیاحوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ایسے اضلاع میں بھی جہاں تک پہنچنا مشکل تھا۔ امن و انتظام موجود تھا اور یہ سب پولیس کی عمدہ نگرانی کا نتیجہ تھا، اشیاء کی ارزانی بھی تعجب خیز تھی، لذیذ سے لذیذ پھل برائے نام قیمت پر ملتے تھے لوگوں کے لباس میں صفائی اور بانکپن تھا سب خوش حال تھے، پیدل چلنے کی جگہ کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے پاس خچر سواری کے لئے نہ ہو۔ قرطبہ، المریہ اور اور مقامات مختلف صنعتوں کی وجہ سے مالا مال ہو رہے تھے تجارت کو اس قدر ترقی تھی کہ محکمہ سائر کے افسر اعلیٰ نے اپنی کیفیت میں لکھا کہ درآمد اور برآمد کے مال پر جو محصول لیا جاتا ہے۔ اُس کی رقم ملک کے مجموعی مالیے کا ایک بڑا حصہ ہے قرطبہ میں پانچ لاکھ باشندے، تین ہزار مسجدیں، متعدد عالیشان محل اور ایک لاکھ بیس ہزار سکونت کے مکانات تھے۔ تین سو حمام، اٹھائیس محلے اور باڑے تھے اور یہ سب اتنے تھے کہ بغداد کے سوا جس سے اہلِ قرطبہ اپنے شہر کا فخریہ مقابلہ کیا کرتے تھے کوئی دوسرا اُس کا ہمسر نہ تھا، قرطبہ کی شہرت جرمانیہ کے ملک تک پہنچی تھی، چنانچہ سیکسن قوم کی (۲۶)

---

[1] حمدان کا خاندان حلب میں حکومت کرتا تھا۔ ۳۱۱ھ / ۹۲۳ء تا ۳۹۴ھ / ۱۰۰۳ء

ایک راہبہ جس کا نام ہروس ویتھا تھا اور جو اپنی تصنیف کردہ نظموں اور قصوں کی وجہ سے دسویں صدی عیسوی کے آخری نصف حصے میں شہرۂ آفاق تھی، لکھتی ہے کہ "قرطبہ دنیا کا ایک گوہر آبدار ہے"۔

قرطبہ کے قریب جو شہر خلیفہ ناصر نے تعمیر کرایا تھا وہ بھی کچھ کم تعریف کے قابل نہ تھا، ناصر کی ایک کنیز مرتے وقت بہت سی دولت ناصر کے نام چھوڑ گئی تھی، خلیفہ نے چاہا، کہ اس روپیہ کو اسیرانِ جنگ کو رہا کرانے میں صرف کرے، چنانچہ لیون اور نبرہ کے علاقوں میں آدمی دوڑائے گئے کہ کوئی مسلمان قیدی ہو تو معلوم کریں، لیکن جب ان لوگوں کو کہیں کوئی مسلمان قیدی نہیں ملا تو خلیفہ کی چہیتی ملکہ زہرا نے عرض کیا کہ اس روپے سے ایک شہر بنوا دیجئے اور اُس کا نام میرے نام پر رکھیئے۔ خلیفہ نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔

دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کی طرح خلیفہ ناصر کو بھی عمارتیں بنوانے سے عشق تھا۔ چنانچہ نومبر ۹۳۶ء (ذی الحجہ ۳۲۴ھ) میں قرطبہ سے تقریباً ایک فرسخ شمال میں ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی گئی، جس سے ملکہ زہرا کی یادگار قائم ہوئی اس شہر کو عالیشان بنانے میں کوئی بات فروگذاشت نہیں کی گئی، پچیس برس تک دس ہزار مزدوروں اور معماروں، اور پندرہ سو باربرداری کے جانوروں نے اس شہر کو بنانے میں محنت و مشقت کی، پھر بھی بانیٔ شہر کی زندگی میں وہ ختم نہ ہو سکا۔

خلیفہ ناصر نے چار سو درہم ہر ایسے شخص کو جو اس نئے شہر میں آباد ہو، دینے کا حکم دے رکھا تھا، اس وجہ سے صدہا آدمی مدینۃ الزہرا میں آباد ہونے چلے آئے [1]۔ بادشاہی محل جو اس شہر میں تعمیر ہوا اُس میں مشرق اور مغرب کے عجائبات موجود تھے۔

---

[1] مدینۃ الزہرا کے مقام پر آج کل جو کھدائی ہو رہی ہے اگر اُس کی کیفیت پڑھنی ہو تو اخبار ٹائمس (انگلستان) مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۱۰ء ملاحظہ ہو۔ مضمون کی سرخی ہے "ایک عربی پومپی آئی" اس کھدائی سے جو اشیاء برآمد ہوئیں اور جو صنعت اُن سے ظاہر ہوتی ہے اُس کے حالات کے لئے ویلشا کا مضمون اگست ۱۹۱۱ء کے برلنگٹن میگزین میں دیکھو۔

محل بہت بڑا تھا، اُس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ صرف اُس کی محلسرا میں چھ ہزار مستورات رہتی تھیں۔

خلیفہ عبدالرحمٰن کی قوت و سطوت فی الحقیقت عظیم الشان ہو گی، اُس نے ایک بڑا شاندار بیڑا جہازوں کا ایسا تیار کر لیا جس سے تمام بحرِ متوسط پر فاطمیین کے مقابلہ میں ناصری عمل دخل ہو گیا اور سبتہ پر قبضہ کرنے سے تمام مغربِ اقصیٰ پر حکومت کی کنجی ہاتھ لگ گئی، ایک کثیر قواعد دان لشکر کی وجہ سے جو غالباً اس وقت دنیا میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا شمالی اسپین کے عیسائیوں پر غلبہ حاصل رہا۔ اس زمانے کے مغرور سے مغرور بادشاہ خلیفہ ناصر سے دوستی پیدا کرنے کے آرزومند رہتے تھے۔ بزنطیہ کے شہنشاہ اور جرمانیہ، اٹلی اور فرانس کے بادشاہوں نے دربارِ ناصر میں اپنی سفارتیں بھیجیں۔

اس فروغِ حکومت کی عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا تھا، لیکن عہدِ ناصر کی تاریخ پڑھنے والے کو جو چیز سب سے زیادہ تعریف و حیرت کی معلوم ہوتی ہے وہ عمارت نہیں ہے عمارت کا معمار ہے، کس بلا کا ہمہ گیر وہ دماغ ہو گا جو چھوٹی سے چھوٹی چیز سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ منصوبوں کو سوچنے اور احاطہ کرنے پر قادر تھا، اس شخص نے اپنی عقل و ذہانت سے قوم کے افراد کو متحد کیا، وسائلِ دولت و ثروت کو مجتمع کیا اور مختلف سلطنتوں سے اتحاد پیدا کر کے توازنِ قوت قائم کر دیا، مذہبی رواداری سے کام لے کر اپنی سیاسی مجلسوں میں غیر مذہب کے لوگوں کو شریک کیا۔

ایسا شخص عہدِ وسطیٰ کا خلیفہ نہیں بلکہ زمانۂ موجودہ کا ایک عاقل و دانش مند بادشاہ معلوم ہوتا ہے۔

اسناد :-

ابنِ حوقل	ص ۳۸ ، ۴۰ تا ۴۲
کرد نیکوں دی سامپیرو	ص ۲۶
مقری	جلد ا ص ۲۵۲ تا ۲۵۳ ، ۳۴۴ تا ۳۴۶ ، ۴۰۰
ابنِ عذاری	جلد ۲ ص ۱۶۱ ، ۲۰۰ ، ۲۳۸ تا ۲۳۹ ، ۲۴۶ تا ۲۴۸
ابنِ خلدون	ص ۱۵ ، تاریخِ بربر ، جلد ۲ ص ۵۲۲ (ترجمہ)
اسپینا سگرادا	جلد ۳۴ ص ۲۶۷ تا ۲۷۰

○

نبرہ اور لیون کی عیسائی ریاستوں کے حکمرانوں کی تفصیل کے لئے ذیل میں دو شجرے درج کئے جاتے ہیں ، جن سے علاوہ ناموں کے اُن کے آپس کے رشتہ داری کے تعلقات بھی بآسانی سمجھ میں آ سکتے ہیں :-

ریاست نبرہ

شانجہ بادشاہ نبرہ
(شادی ہوئی ملکہ طوطہ سے)

اُوراکہ لڑکی (اس کی شادی رودمیر ثانی سے ہوئی جو لیون کا بادشاہ تھا)	غرسیہ بادشاہ نبرہ (بادشاہی فی الحقیقت اس کی ماں ملکہ طوطہ کرتی تھی)	بیٹی (اس کی شادی فرولند بن عبد شلب سے ہوئی ، یہ رئیسِ قشتالیہ تھا ۔)	بیٹی (اس کی شادی اوردنش چہارم بادشاہِ لیون سے ہوئی ۔)

ریاست لیون

اردون ثانی
بادشاہ لیون

فرویلہ

شانجہ
(لیون سے بے دخل ہوکر
جلیقیہ میں حکومت کرنے لگا)

ادفونش چہارم
بادشاہ لیون
(شادی بادشاہ نبرہ کی ایک بیٹی سے ہوئی)

اردون چہارم "الخبیث"
بادشاہ لیون
(اسے فرولند نے تخت پر بٹھایا تھا
اس کی شادی اردون ثالث کی
بیوہ سے ہوئی تھی جو فرولند کی
بیٹی تھی۔)

بادشاہ نبرہ کی بیٹی = **رومیر ثانی** = جلیقی بیوی
(یوراکہ سے شادی ہوئی)

شانجہ الجسیم
بادشاہ لیون
تخت سے اُتارا گیا
مسلمانوں کی مدد سے
پھر بادشاہ ہوا)

اردون ثالث
بادشاہ لیون
(فرولند رئیس قشتالیہ کی
بیٹی سے شادی ہوئی۔

کتابِ ثالث

خلافت

پانچویں فصل

خلیفہ الحکم ثانی ، المستنصر باللہ

شاہانِ لیونؔ اور نبرہؔ کی بہتری اور بھلائی کے لئے خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر نے بہت سے کام کئے تھے، مگر اِن نصرانی بادشاہوں کو خلیفہ کے مرنے کا مطلق افسوس نہ ہوا، بلکہ خوش ہوئے کہ عہد ناموں کی شرطوں اور خلافتِ قرطبہ کی اطاعت سے رُو گردانی کا اچھا موقع ہاتھ آیا، مسلمانوں کی اطاعت اب اُن کو اس وجہ سے مکلّف تھی کہ اس کی ضرورت نہ رہی تھی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شرائط حالتِ مجبوری میں لکھنی پڑتی ہوں اُن کے توڑنے کے لئے ایسے موقعے اچھے ہوا کرتے ہیں[1] ۹۶۱ء

خلیفہ ناصرؔ کے جانشین الحکم مستنصر باللہ کی نسبت مشہور تھا کہ اس کی طبیعت جنگجو نہیں ہے اور ممکن ہے کہ عہد و پیمان ریاستوں سے اُس کے باپ کے زمانے میں ہوئے

[1] نصرانی بادشاہوں کو اخلاق سے بحث نہ تھی ۔ مترجم اردو

تھے اُن کی پابندی اپنے زمانہ میں سختی سے نہ کرے، بہر کیف اِن نصرانی بادشاہوں نے مناسب سمجھا کہ ابھی کچھ دنوں یہ دیکھ لینا چاہیئے کہ الحکم کو میدانِ جنگ میں الناصر کے برابر کامیابی ہوتی ہے یا نہیں؟

مگر اِن عیسائی بادشاہوں کی بدنیتی کا حال الحکم پر جلد کھل گیا، شانجہ بادشاہِ لیون کو جب حکم پہنچا کہ عہدنامہ میں جن قلعوں کا ذکر ہوا ہے وہ خلیفہ کے سپرد کئے جائیں تو وہ حیلے حوالے کرنے لگا، غرسیہ بادشاہِ نبرہ سے جب کہا گیا کہ فرولند بن عبد شلب جو اُس کے پاس قید ہے دولتِ قرطبہ کے حوالے کیا جائے تو اُس نے صاف اِنکار کر دیا[1]، صرف اِنکار ہی نہیں کیا بلکہ فرولند کو اس شرط پر قید سے رہا کر دیا کہ وہ اپنے داماد اردون چہارم سے کوئی واسطہ نہ رکھے۔ اردون، اشتوراس سے فرار ہو کر اس وقت قشتالیہ کے دارالحکومت برغش میں مع اہل و عیال کے سکونت رکھتا تھا، فرولند نے قید سے رہا ہوتے ہی اردون کی نسبت برغش سے خارج البلد کئے جانے کا حکم دیا، اردون کو اب اپنی بیوی اور دو بیٹیوں سے جدا ہونا پڑا اور فرولند کے حکم سے ایک دستہ فوج کے زیر حراست وہ برغش سے مسلمانوں کے علاقے میں پہنچا دیا گیا۔

فرولند نے لیون اور نبرہ کے بادشاہوں کی طرح خلافتِ قرطبہ سے کوئی پیمانِ صلح نہیں کیا تھا، اس لئے خلافت سے اس نے پھر سرکشی اختیار کی، نتیجہ یہ ہوا کہ فروری ۹۶۲ء محرم ۳۵۱ھ میں خلیفہ الحکم نے اپنے والیانِ صوبہ جات اور سردارانِ لشکر کو جنگ کے لئے فوجیں آراستہ کرنے کا حکم دے دیا۔

اسی اثنا میں اردونِ چہارم، لیون کے مسیحی اُمراء کو جو اُس کے بڑے مونس و غمگسار تھے ساتھ لے مدینہ سالم میں آیا، یہاں یہ دیکھ کر کہ مسلمان لڑائی کی تیاریاں کر رہے ہیں، اُس کو اپنی بہتری کی اُمید ہوئی اور دل میں سوچنے لگا کہ جس طرح اُس کے ابنِ عم شانجہ نے عبدالرحمٰن الناصر کی مدد سے اپنی کھوئی ہوئی حکومت پھر حاصل کر لی تھی، اب وہ بھی

---

[1] کتاب "تحقیقات" مصنفہ ڈوزی (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) ص ۹۸

اپنی حکومت خلیفہ مستنصر کی مدد سے حاصل کرنے کی کوشش کرے، چنانچہ غالب مولائے الحکم سے جو مدینہ سالم کا حاکم تھا اُس نے اپنا مقصد ظاہر کیا کہ قرطبہ جا کر وہ خلیفہ الحکم کی پناہ میں آنا چاہتا ہے۔

غالب نے اس معاملہ میں خلافت پناہی سے استصواب کیا، الحکم کو اس کا افسوس کیوں ہوتا کہ ایک شخص ایک عیسائی ریاست کا مدعی ہو کر اُس کے دربار میں حاضر ہونا چاہتا ہے مگر اُس نے کوئی وعدہ بے سوچے سمجھے نہ کرنا چاہا اور غالب کو جواب دیا کہ اردون کو قرطبہ میں لے آؤ، مگر میں ابھی کوئی وعدہ اُس کے حق میں بہتری کا نہیں کر سکتا۔ (۳۴۹)

غالب یہ حکم پاتے ہی ماہ اپریل ۹۶۲ء (ربیع الاوّل ۳۵۱ھ) کے شروع میں اردون کو اور جو عیسائی اُمراء اُس کے ہمراہ تھے اُن کو ساتھ لے کر مدینہ سالم سے قرطبہ کی طرف روانہ ہو گیا، راستہ میں دربارِ خلافت سے بھیجے ہوئے سواروں کا ایک دستہ ملا جو مہمانوں کے استقبال اور مضافاتِ قرطبہ تک اُن کی معیت کے لئے آیا تھا، جب قرطبہ قریب آ گیا تو یہاں اور زیادہ فوج ملی، اردون نے اس فوج کے افسروں سے راہ و رسم پیدا کرنے اور اُن کی خوشامد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور جب قرطبہ میں داخل ہوا تو عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ کا مدفن دریافت کرنے لگا جس وقت روضۂ ناصر اُس کو بتایا گیا فوراً سر سے ٹوپی اُتار لی اور قبر کی طرف منہ کر کے اُس شخص کے حق میں دعائیں مانگنے لگا جس نے تھوڑا زمانہ ہوا تھا کہ اُس کو تاج و تختِ لیون سے محروم کر دیا تھا، اِس وقت اردون کو لیون کی حکومت حاصل کرنے کے سوا دوسرا خیال نہ تھا اور اس مقصد کے حصول کے لئے کوئی ذلت بھی ایسی نہ تھی جس کا گوارا کرنا اُسے شاق گذرتا۔

اردون جب قرطبہ پہنچا تو قصرِ ناعورہ میں ٹھیرایا گیا، دو دن اس پُر تکلف و آراستہ محل میں قیام کے بعد اطلاع ملی کہ خلافت مآب قصرِ زہرا میں اُس کو شرفِ حضوری بخشیں گے، اردون نے دیبا سپید کا لباس پہنا (غالباً اس خیال سے کہ سپید رنگ بنی اُمیہ کا مخصوص رنگ ہے) اور ایک رومی ٹوپی سر پر رکھی جس میں جواہرات ٹکے ہوئے تھے، اِس موقع پر اندلسِ اسلامیہ کے چند مسیحی امراء مثلاً قرطبہ کے عیسائیوں کا قاضی ولید بن خیزران، اور

طلیطلہ کا مطران عبید اللہ بن قاسم اِس غرض سے اردون کے پاس آئے کہ دربارِ مستنصر میں حاضری سے پہلے وہاں کے قواعد اور آداب سے جن کی پابندی لازمی ہے اردون کو آگاہ کر دیں ۔

قصرِ ناعورہ سے قصرِ زہرا تک تمام راستے میں فوجوں کی صفیں دو طرفہ کھڑی تھیں ، اردون اور اُس کے ہمراہیوں نے اس کیفیت کو دیکھ کر ظاہر کیا کہ گویا اس منظر نے انہیں بہت ہی حیرت زدہ بلکہ خوف زدہ کر دیا ہے ، نیچی نظریں کر کے نشانِ صلیب ہاتھوں کے اشارے سے بنانے لگے[1]، قصرِ زہراء کے پہلے دروازے پر جب پہنچے تو سوائے اردون اور اُس کے لیونی سرداروں کے سب لوگ گھوڑوں پر سے اُتر پڑے ، باب السدہ پر یہ لیونی سردار بھی پیدل ہو گئے ، صرف اردون اور ابن طلس جس کی خدمت خلیفہ کے سامنے اردون کو پیش کرنے کی تھی ، گھوڑوں پر سوار رہے ، یہاں تک کہ وہ اُس صحن میں آئے جہاں اردون اور اس کے عیسائی امراء کے لئے نشست مقرر ہوئی تھی ، یہ وہی مقام تھا جہاں شاہانِ کو طلبِ امداد کے لئے خلیفہ کے سامنے حاضر ہونے کا انتظار کرنا پڑا تھا ۔

---

[1] نشانِ صلیب یا اشارۂ صلیب سے مراد یہ ہے کہ رومن کیتھولک مذہب کے عیسائی جب کسی بلا سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو ہاتھ سے کوئی اشارہ یا علامت ایسی پیدا کرتے ہیں جس سے معلوم ہو کہ صلیب کا نشان بنا رہے ہیں یہ ایسی ہی بات ہے جیسے مسلمان خوف یا خطرے کے وقت "الحفیظ"، "الامان"، "لاحول" پڑھتے ہیں مصنف لکھتا ہے کہ خوف ظاہر کیا یعنی واقعی خوف نہ تھا ، لیکن مصنف کا یہ قول بلا دلیل اور بلا ثبوت ہے ، قرائن ، ماحول اور واقعات اس بات کو روزِ روشن کی طرح واضح کر رہے ہیں کہ اِس وقت اُس کے دل پر شاہی ہیبت و شوکت اپنی پوری قوت کے ساتھ طاری تھی ، اگر یہ سارا خوف ظاہری اور بناوٹی تھا تو اردون جو اِس وقت مسلمانوں کو خوش کرنا اور خلیفہ سے امداد لینی چاہتا تھا ہرگز نشانِ صلیب نہ بناتا جو مسلمانوں کے نزدیک ایک لغو کام تھا ، اِس سے ظاہر ہے کہ اُس کا یہ فعل بالکل اضطراری تھا نہ کہ ارادی ، لیکن مصنف کو کتاب کے عیسائی ناظرین کی خاطر بہت منظور ہے اِس لئے جہاں کہیں عیسائیوں کی ذلت کا حال ہوتا ہے ۔ وہاں اپنی قوتِ بیان کو کام میں لا کر عیسائیوں کے دِل پر اثر پیدا نہیں ہونے دیتا (مترجم اردو)

کسی قدر توقف کے بعد لیبی مہمانوں کو دربارِ خلافت کے ایوان میں داخل ہونے کا
حکم ہوا، ایوان کے دروازے سے اردون نے ادب سے ٹوپی اور اوپر کی ردا اتار دی، (۴۵۰
اس کے بعد اُسے تخت کے قریب آنے کا اذن ہوا، خلیفہ حکم مستنصر باللہ اس وقت مجلسِ شرقی میں سریرِ سلطنت پر رونق افروز تھے، اُن کے بھائی، بھتیجے، وزراء اور اُمراء اپنے اپنے مرتبے پر چپ و راست بیٹھے تھے، انہی میں قاضی القضاۃ منذر بن سعید اور دیگر حکام عالی قدر اور فقہا بھی تھے۔

اردون تختِ خلافت کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا، چند قدم چلتا اور گھٹنے زمین پر ٹیک کر تعظیم دیتا، یہاں تک کہ تخت کے قریب پہنچ گیا، خلافت پناہی نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا، اردون نے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پیچھے ہٹا، مگر اس احتیاط کے ساتھ کہ خلیفہ کی طرف پشت نہ ہو، اسی طرح پیچھے ہٹتا ہوا دیبا کی مطلا و مذہب مسند پر جو اُس کے لئے اورنگِ خلافت سے تقریباً پانچ گز کے فاصلے سے بچھائی گئی تھی بیٹھ گیا، لیون کے جو اُمرا اس کے ساتھ تھے وہ بھی اپنے بادشاہ کی طرح آدابِ شاہی بجا لائے اور باری باری سے خلیفہ کے ہاتھ کو بوسہ دے کر اردون کے پیچھے جا بیٹھے، خلافت مآب اور اردون کے درمیان ترجمانی کی خدمت کے لئے ولید بن خیزران قرطبہ کے عیسائیوں کا قاضی حاضر دربار تھا۔

خلیفہ مستنصر کچھ دیر تک خاموش رہے تاکہ معزول بادشاہِ لیون کے دل پر جو اثر اس عظیم الشان دربار کا ہونا لازم تھا، وہ زائل ہو کر اس کے حواس درست ہو جائیں، جب خلافت پناہی نے دیکھا کہ اردون کی تسکین ہو گئی ہے، تو انہوں نے کلام کا افتتاح اس طریقہ سے کیا "ہمارے حضور میں تمہارا آنا باعثِ کامیابی ہوا، ہمارے جود و سخا سے تمہاری اُمیدیں بر آئیں گی، تم دیکھو گے کہ ہم تمہارے اچھے مشیر ہیں اور جتنا تم مانگو گے اُس سے بھی زیادہ پاؤ گے۔"

جب خلیفہ کے الفاظِ احسان و کرم اردون کو ترجمہ کر کے سنائے گئے تو اُس کا چہرہ بشاش ہو گیا، فوراً اپنی مسند سے اُٹھ کر آگے بڑھا اور تخت کی سیڑھیوں پر جو غالیچہ بچھا تھا

اُسے چوم کر کہنے لگا "میں امیر المؤمنین کا غلام ہوں اور ان کو اپنا آقا اور مالک جانتا ہوں
حضور کے مراحمِ خسروانہ پر بھروسہ رکھتا ہوں، مجھ پر اور میری رعایا پر خلافت پناہی کو پورے
اختیارات حاصل ہیں، جہاں کہیں جانے کا ارشاد ہوگا وہیں جاؤں گا اور نہایت خلوص
اور وفاداری سے حضور کی خدمت میں رہوں گا۔"

خلیفہ نے جواب دیا "ہم تم کو لائقِ التفات سمجھتے ہیں، ہم یہ معلوم کرکے بہت
خوش ہوگئے کہ ہم تم کو تمہارے تمام ہم مذہبوں پر فضیلت دیتے ہیں، تم کو خوش ہونا چاہیئے
کہ تم ہمارے سایہ عاطفت میں پناہ کے لئے یہاں چلے آئے۔"

جب مستنصر نے یہ الفاظ کہے تو اردون پھر ایک بار زمین بوس ہوا اور خلیفہ کو دعائیں دے
کر کہنے لگا "زیادہ مدت نہیں ہوئی ہے کہ میرے ابنِ عم شانجہ نے میرے برخلاف
خلیفہ مرحوم الناصر الدین اللہ سے مدد مانگی تھی، اُس کی درخواست منظور ہوئی تھی اور اس کو
وہ مدد ملی جو ایک بادشاہِ عالی مقام کے سوا دوسرا نہ دے سکتا تھا میں بھی امیدوارِ اعانت
ہوں، لیکن میری امیدواری کی وجوہ مختلف ہیں، میرا ابنِ عم شانجہ مجبور اور مضطرب ہو کر
یہاں حاضر ہوا تھا، اُس کی رعایا اُس کو بُرا کہتی تھی اور اُس کی دشمن ہوگئی تھی اسی رعایا
نے اُس کی جگہ مجھے بادشاہ بنایا، حالانکہ میرا خدا شاہد ہے کہ میں نے اس عزت کی کبھی خواہش
نہ کی تھی، پس جب رعایا نے مجھے بادشاہ بنایا تو میں نے شانجہ کو تخت سے معزول کرکے
ملک بدر کر دیا، مگر اُس نے آخر کار خلیفہ مرحوم الناصر سے منت و سماجت کرکے ایک ۵۱۱
فوج حاصل کی جس نے اُسے تخت پر بٹھا دیا، مگر شانجہ نے اپنے محسن و مربی خلیفہ ناصر
اور میرے آقا امیر المؤمنین سے عہد شکنی کی اور جو عہد و پیمان کئے تھے اُنہیں بالغانہ
کیا، لیکن میں شانجہ کی طرح کسی مجبوری سے نہیں بلکہ برضا و رغبت اپنی عملداری چھوڑ
کر یہاں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ خود اپنے تئیں اور اپنے سپاہیوں اور قلعوں کو امیر المؤمنین
کے سپرد کر دوں، کیا اس حالت میں میرا یہ عرض کرنا غلط ہوگا کہ میرے ابنِ عم شانجہ
میں اور مجھ میں بڑا فرق ہے اور میں یہ بھی گذارش کر سکتا ہوں کہ میں شانجہ سے زیادہ
لائقِ اعتبار اور مستحق مراحمِ شاہی ہوں۔"

خلیفہ نے جواب دیا "ہم نے تمہاری درخواست سنی اور تمہارے خیالات معلوم کئے، چند روز میں ہماری عنایاتِ شاہانہ تمہاری نیاز مندی کا بدل کر دیں گی۔ اور ہمارا احسان تم پر اُس سے زائد ہو گا جس قدر ہمارے والد رضی اللہ عنہ نے تمہارے مخاطب پر کیا تھا، اگرچہ اُس کو یہاں پہلے حاضر ہونے کی فضیلت تم پر حاصل ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم تمہاری ویسی ہی قدر نہ کریں جیسی تمہارے مخالف کی ہوئی تھی اور جو مراعات پہلے اُس کے ساتھ ہوئی ہیں وہی تمہارے ساتھ نہ کریں، ہم تم کو تمہارے ملک کی طرف کامیابی کے ساتھ روانہ کریں گے اور تمہاری حکومت کی بنیادوں کو مستحکم کر دیں گے اور تم کو اُن لوگوں پر بادشاہ بنا دیں گے جو تم کو پہلے بادشاہ مانتے تھے اور اس معاملۂ خاص میں ہم تم کو ایک تحریر عطا کریں گے جو تمہارے پاس رہے گی اور اس تحریر میں تمہارے ابنِ عم اور تمہارے ملک کی حدود بیان کر دی جائیں گی اور تمہارا جس قدر ملک اُس کے تصرف میں ہے وہ تم کو دلوا کر تمہارے مخالف کو اُس پر فوج کشی کی قطعی ممانعت کر دی جائے گی، بہرکیف ہمارے احسانات تم پر تمہاری امیدوں سے بڑھ کر ظاہر ہوں گے ہم جو کچھ کہتے ہیں اُس پر اللہ تعالیٰ کو گواہ کرتے ہیں"

جس وقت الحکم نے اپنی تقریر ختم کی تو اردون اپنی مسند سے اُٹھا اور خلافت پناہی کے سامنے ایک بار پھر زمین بوس ہو کر سپاس گذاری کرتا ہوا دربار کے کمرے سے اس طرح رخصت ہوا کہ خلیفہ کی طرف پشت نہ ہو۔ جب دوسرے کمرے میں آیا ۔ تو خواجہ سراؤں سے کہنے لگا کہ خلافت مآب کی عظمت و جلالت دیکھ کر اُس کے ہوش و حواس بجا نہ رہے تھے اور وہ سخت مرعوب ہو گیا تھا، اس کمرے میں جب اُس کی نظر ایک کرسی پر پڑی جس پر خلیفہ بیٹھا کرتے تھے تو اُس کے دیکھتے ہی تعظیماً سجدے میں گر گیا۔ اس کے بعد خواجہ سرا اس کو حاجب جعفر صقلبی کے پاس لے گئے، اردون نے جعفر کو دیکھتے ہی بہت ادب سے سلام کیا اور اُس کا ہاتھ چومنا چاہا، مگر جعفر نے اُسے ایسا نہ کرنے دیا، اور خود جھک کر اُس سے بغل گیر ہوا اور اپنے پاس اُسے بٹھا لیا اور کہا کہ امیر المومنین نے اپنی تقریر میں جو کچھ ارشاد کیا ہے اُس پر یقیناً عمل ہو گا، اس کے بعد جعفر صقلبی نے خلیفہ

کی طرف سے اردون کو خلعت پہنایا، اردون کے ہمراہیوں کو بھی حسب حیثیت خلعت
عطا ہوئے اور اب جعفر کو سب نے نہایت ادب سے سلام کیا اور اُس کا شکریہ ادا کیا، اور
کمرے سے چل کر صحن میں آئے، یہاں خلافت پناہی کی طرف سے اردون کی سواری کے لئے (۴۵۲)
گھوڑا پیش ہوا جس کا ساز و سامان بہت قیمتی تھا، اردون گھوڑے پر سوار ہو کر نہایت شاد
و خوش کام اپنے لیونی امراء اور ابنِ طلس کے ساتھ قصر ناعورہ میں جہاں مقیم تھا واپس آیا۔
اس کے تھوڑے دن بعد ایک عہد نامہ دستخط کرنے کے لئے پیش کیا گیا، اِس عہد نامے میں
شرطیں تھیں کہ اردون خلیفہ سے ہمیشہ صلح و امن رکھے گا اور اپنے بیٹے غرسیہ کو بطورِ یرغمال
امیر المومنین کے سپرد کر دے گا۔ فرولند بن عبد نشلب سے کبھی اتحاد قائم نہ کرے گا۔

جس وقت اردون نے اِس عہد نامہ پر دستخط کر دیے تو خلیفہ مستنصر نے اپنے مولیٰ
غالب کی سرکردگی میں ایک فوج اردون کے سپرد کی، عیسائیوں کے قاضی ولید بن خیزران[1]
کو اور قرطبہ کے اسقف[2] اصبغ بن عبد اللہ بن نابیل اور مطرانِ طلیطلہ عبید اللہ بن قاسم[3]
کو اردون کے صلاح و مشورے کے لئے مقرر کیا اور غرسیہ ابنِ اردون کو بھی انہی عیسائی
امراء خلافت کے سپرد کر دیا اور ہدایت کر دی کہ جہاں تک ممکن ہو اردون اور اہلِ لیون
میں اِس بات پر مصالحت کرا دیں کہ اردون اُن کا بادشاہ تسلیم کیا جائے۔

یہ تمام واقعات بڑے اہتمام کے ساتھ ہر طرف مشہور کئے گئے تاکہ شانجہ مرعوب ہو
جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا، شانجہ سمجھ گیا کہ اب واقعی اُس کی حالت خطرناک ہے جلیقیہ کے
وسیع علاقے نے شانجہ کی اطاعت سے قطعی انکار کر دیا تھا، اب یہ صاف نظر آنے لگا کہ اگر
اردون نے مسلمانوں کی مدد سے حملہ کیا تو جلیقیہ کے لوگ شانجہ کا ساتھ نہ دیں گے، جلیقیہ

---

[1] ابنِ خلدون نے اِس نام کو ولید بن مغیث لکھا ہے۔

[2] ابنِ خلدون نے اسقف کی جگہ جاثلیق لکھا ہے، یہ لقب اسقفِ قرطبہ کو بھی اسی طرح دیا گیا ہے
جیسے نسطوری عیسائیوں کے اسقف کو دیا گیا تھا۔

[3] ابنِ خلدون نے عبد اللہ لکھا ہے۔

کے علاوہ اور علاقوں کے لوگ بھی جنھوں نے شانجہ کی اطاعت کر لی تھی مگر دل میں اُسے
ناپسند کرتے تھے، شانجہ کو دوبارہ ملک بدر کرنے پر آمادہ ہو گئے تاکہ اِس طریقے سے
اپنے ملک کو دشمن کے حملے سے بچا لیں۔

شانجہ نے اس تردد کی حالت میں یک دم فیصلہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے، چنانچہ مئی کے
مہینے میں (ربیع الآخرہ ۳۵۱ھ) اُس نے چند پادریوں اور عیسائی رئیسوں کو جو قومس کا رتبہ
رکھتے تھے قرطبہ روانہ کیا تاکہ خلیفہ مستنصر سے عرض کریں کہ عہد نامے کی تمام شرطیں پوری
کرنے پر وہ آمادہ ہے۔

جس وقت مستنصر کو یہ معلوم ہوا تو سمجھا کہ جس چیز کی ضرورت تھی وہ خود بخود حاصل ہو گئی
اردون کو مدد دینے کے جس قدر وعدے کئے تھے وہ سب بھول بسر گئے اور ریاست لیون
کے اس بدقسمت دعویدارِ تخت کی تمام خوشامدیں اور زمین بوسیاں اکارت گئیں، اردون
اِس حالتِ مایوسی میں زیادہ دن نہ جیا، تاریخ میں اس کے بعد اُس کا ذکر صرف اتنا ہی
آتا ہے کہ قرطبہ میں اُس کا انتقال ہو گیا اور اِس بات کے باور کرنے کی معقول وجہ ہے کہ
اُس کی موت کا واقعہ ۹۶۲ء (ذیقعدہ ۳۵۱ھ) کے ختم ہونے سے پہلے پیش آیا۔

اردون کی موت سے شانجہ کے تمام خوف دُور ہو گئے، فرولند قومسِ قشتالیہ اور
نبرہ کا بادشاہ اور قطلونیہ کے نوابان بوریل اور میرون، شانجہ کے دوست اور مددگار تھے،
اُن کے بھروسے پر اب شانجہ نے دولتِ قرطبہ سے سرکشی اختیار کی اور عہد ناموں میں جو شرطیں
ہوئی تھیں اور جن کی پابندی اب تک ہوتی رہی تھی اُن کی پروا نہ کی۔

خلیفہ الحکم بہت تذبذب اور مجبوری کے بعد آمادہ ہوا کہ عیسائیوں کو اشتہارِ جنگ
دے دے، چنانچہ اس غرض سے پہلے قشتالیہ کی طرف متوجہ ہوا اور قلعہ شنت اشتیبان غرماج
کو فتح کر لیا، فرولند بن عبد شلب کو امان طلب کرنے پر مجبور کیا، چنانچہ اُس نے امان مانگی،
مستنصر نے درخواست منظور کی، لیکن اس کے بعد بہت جلد فرولند نے پھر عہد شکنی کی،
اِس پر مستنصر نے غالب کو لڑنے کا حکم بھیج دیا، غالب نے انتیشہ کے مقام پر فرولند کو
شکست دی، اس کے بعد غرسیہ بادشاہِ نبرہ کی باری آئی، یحییٰ بن محمد تجیبی حاکمِ سرقسطہ

نے فوج کشی کر کے غرسیہ کو شکست دی اور اس کے شہر قلہرہ کو بھی فتح کر لیا، مستنصر نے اس شہر کے گرد نئی فصیل تیار کرائی اور قلعہ غرماج کو بھی جو بوسیدہ ہو گیا تھا از سرِ نو درست کرایا۔

مستنصر باللہ فی الواقع جنگ و جدل سے پرہیز کرتا تھا اور لڑائی پر بہت تامّل اور تذبذب کے بعد آمادہ ہوا کرتا تھا، لیکن جب لڑائی شروع کر دیتا تھا تو پھر اس شدّ و مدّ سے لڑتا تھا کہ دشمن کو پناہ مانگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا تھا۔

غرض شانجہ بادشاہِ لیون ۳۵۶ھ / ۹۶۶ء میں خلیفہ مستنصر باللہ سے امان کا خواستگار ہوا۔ قیطلونیہ کے نوابان بوریل اور میرون جن کو اسلامی فوجوں نے پے در پے شکستیں دی تھیں، شانجہ کی طرح مجبور ہوئے کہ مستنصر سے پناہ کے طالب ہوں اور اسلامی سرحد سے جو قلعے اُن کے متصل تھے اُن کو خود ہی خلیفہ کے حکم سے مسمار کر دیں، غرسیہ بادشاہِ نبرہ نے اپنی ریاست کے پادریوں اور معزّزین کی ایک جماعت اس درخواست کے ساتھ بھیجی کہ خلیفہ مستنصر اُس سے بھی صلح کر لیں، جلیقیہ کے رئیسِ اکبر کونٹ اُرڈونگیو دلاسکیز نے جسے عربوں نے قومس رذریق بن بلاکس لکھا ہے اپنی ماں کو خلیفہ مستنصر کے دربار میں بھیجا، خلیفہ نے اُس کی بہت عزّت کی اور نہایت قیمتی تحائف اس کو دیے[1]۔

خلیفہ الحکم نے عیسائی ریاستوں سے جو صلح اس وقت کی وہ ہمیشہ قائم رہی، اُس کی

---

[1] نفح الطیب میں اس معزز خاتون کے دربارِ خلافت میں آنے کا حال اس طرح بیان ہوا ہے۔ "الحکم نے اس ملکہ کے استقبال کے لئے اپنے اہلِ دولت کو بھیجا اور اُس سے ملاقات کے لئے ایک دن دربار کیا، یہ دن بھی یادگار تھا، رذریق کی ماں کو کامیابی ہوئی اور اُس کے بیٹے سے عہد نامۂ صلح ہو گیا ملکہ کو بہت سا مال عطا ہوا اور وہ اس قدر تھا کہ اُس نے اپنے ہمراہیوں میں اُسے تقسیم کیا، خود اُس کو بھی بہت سے تحائف دیے گئے اور سواری کے لئے ایک بہت قیمتی خچر زرّیں زین و لگام کا جس پر دیبا کا زین پوش پڑا تھا دیا گیا۔ چلتے وقت دربارِ حکم میں رخصت ہونے آئی، اس پر خلیفہ نے اُس کے زادِ راہ کے لئے بہت کچھ سامان دے کر اُسے رخصت کیا" (مترجم اردو)

ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکم خود امن و امان زیادہ پسند کرتا تھا، دوسرے یہ عیسائی ریاستیں خود ایسی بدنظمی میں مبتلا ہوئیں کہ اُس سے نکلنے کی کوئی امید نہ رہی، مسلمانوں سے لڑنے کا اب اُن کو خواب تک نظر نہ آسکتا تھا۔

شانجہ بادشاہِ لیون اور الحکم کے درمیان صلح کی گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ شانجہ نے جلیقیہ کے علاقے پر حملہ کر دیا، جلیقیہ نے کبھی شانجہ کی اطاعت قبول نہیں کی تھی، اس حملے میں شانجہ نے دریائے دویرہ کے شمالی اطراف میں ایک علاقے کو فتح کر لیا، دریا کے دوسرے کنارے پر جنوب میں قومس فرنبند دگون سالو وگون زالیز (فرولند بن عبد شلب) نے بہت سی فوج شانجہ کے مقابلہ کے لئے جمع کر لی تھی، فرولند نے شانجہ سے ملاقات چاہی، ملاقات ہوئی لیکن دغاباز فرولند نے ایک زہر آلود میوہ شانجہ بادشاہِ لیون کو کھلوا دیا، زہر نے شانجہ کے قلب پر اثر کیا، فوراً نہیں مرا لیکن لکنت کے ساتھ اشاروں میں کہا کہ فوراً اُسے لیون لے جائیں، مگر اس سفر میں تیسرے دن شانجہ کو موت آگئی[۱]

شانجہ بادشاہِ لیون کے بیٹے کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی، اُس کا نام رومیر تھا اور اس نام کا یہ اپنے خاندان میں تیسرا شخص تھا، اپنی خالہ ایلویرا کی تولیت میں باپ کا جانشین ہوا، ایلویرا، لیون میں خانقاہِ سلوادور کی راہبہ تھی، لیکن رُوساء قوم نے ایک عورت اور ایک بچے کی اطاعت قبول کرنی گوارا نہ کی اور جلد اپنے خودمختار ہونے کا اعلان کر دیا، اب لیون کی ریاست بہت سے چھوٹے چھوٹے رئیسوں میں تقسیم ہو کر بالکل کمزور ہو گئی، اسی زمانہ میں نارمنڈی کے بادشاہ ریچرڈ اوّل کے پاس ڈین قوم کا ایک گروہ اٹھارہ ہزار آدمیوں کا تھا، بادشاہ کو جب ان کی ضرورت نہ رہی تو اُن کو اسپین روانہ کر دیا، اسپین میں آکر اس قوم نے جلیقیہ کے علاقے کو تین برس تک خوب لوٹا اور غارت کیا[۲]، کوئی آشنانہ

۳۵۲)

۱؎ ۹۶۶ء کے آخر میں (۳۵۶ھ) شانجہ فوت ہوا۔ رسکو، تاریخِ لیون جلد ۱ ص ۲۱۲

۲؎ جلیقیہ پر اس خروج کشی کے حالات معلوم کرنے ہوں تو دیکھو ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" مطبوعہ ۱۸۸۱ء ص ۲۹۴ - اور اس کے بعد کے صفحات۔

نہ تھا کہ اس کا سدباب کرتا۔

جب یہ حالت یہ تھی تو الیہ بیا جو نابالغ رومیر کی ولیہ تھی مسلمانوں سے لڑنے کی ہمت نہ کرسکتی تھی،

مسلمانوں کے حملے قشتالیہ پر جاری رہے لیکن ۳۵۵ھ ۹۶۵ء میں وہاں کا حاکم فردلند بن عبادشلب مرگیا، اُس کے مرنے سے خلیفہ الحکم کو قشتالیہ اور اُس کے نواح کی طرف سے اطمینان ہوگیا اور اتنی مہلت ملی کہ علمی کاموں اور اپنے ملک کو ترقی دینے میں مصروف ہو۔

گو خلیفہ الحکم کے بزرگ بھی عالم و علم دوست اور کتابیں جمع کرنے کے شائق تھے، لیکن الحکم کے برابر کوئی عالم و فاضل بادشاہِ اسپین میں نہیں گذرا، نہ علوم و معارف میں کسی کو اِتنی قدرت ہوئی اور نہ کسی نے اتنی کتابیں جمع کیں، خلیفہ کے گماشتے قاہرہ، بغداد، دمشق اور اسکندریہ میں موجود رہتے، یہ لوگ کتابیں نقل کرتے یا اُن کو مول لیتے تھے، قطع نظر اس کے کہ کتاب پرانی ہے یا نئی، جس قیمت پر ملتی خرید لی جاتی۔ اِن نادر خزانوں سے الحکم کا قصر معمور تھا، ہر طرف کاتب، خطاط اور جلد ساز بیٹھے کام کرتے تھے۔

المستنصر باللہ کے کتب خانہ کی فہرست چوالیس جلدوں میں تھی اور ہر جلد میں بیس اور بقول بعض مورخین پچاس ورق تھے، اِن جلدوں میں صرف کتابوں کے نام لکھے ہوئے تھے، بعض مصنفوں نے لکھا ہے کہ کتابوں کی تعداد چار لاکھ تھی اور ان تمام کتابوں کو خلیفہ الحکم نے پڑھا تھا اور ان میں بہت سی ایسی تھیں جن کے شروع یا اخیر میں مصنف کتاب کا نام، اُس کی کنیت، خاندان اور قبیلے کا نام، سال ولادت، سال وفات یا کوئی عجیب واقعہ اُس کی زندگی کا اپنے قلم سے لکھ دیا تھا۔ یہ حواشی جو خلیفہ الحکم نے نہایت محنت سے سینکڑوں کتابوں پر لکھے تھے واقعی بہت قابلِ قدر تھے۔

ادبیاتِ عرب یعنی فنِ رجال، اخبار و انساب میں خلیفہ الحکم اپنا مثل نہ رکھتے تھے، علماء اندلس اُن کے لکھے ہوئے حواشی کو مستند قرار دیتے تھے، ایران اور شام میں جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، مشرق میں ابھی کوئی اُن کو پڑھنے بھی نہ پاتا تھا کہ خلیفہ کو اُن کی خبر

لگ جاتی تھی، چنانچہ جس وقت دریافت ہوا کہ عراق کا ایک مؤرخ ابو الفرج اصفہانی عرب کے شاعروں اور مغنیوں[1] پر ایک کتاب لکھ رہا ہے، تو اُس کو ایک ہزار دینار سرخ اس درخواست کے ساتھ بھیجے کہ کتاب ختم ہوتے ہی اُس کی ایک نقل فوراً قرطبہ روانہ کی جائے۔ (۵۵۲)

ابو الفرج نہایت شکر گزار ہوئے اور خلیفہ کے ارشاد کی جلد تعمیل کرنی چاہی اور جب کتاب ختم کر لی جس کی تعریف اب تک اہلِ علم کی زبان پر ہے تو اُس کی ایک نقل بہت اہتمام سے تیار کر کے مع ایک قصیدے کے جس میں بنی امیہ کے شجرہ نسب سے بحث کی گئی تھی المستنصر باللہ کی خدمت میں روانہ کی، خلافت مآب نے ابو الفرج کو دوبارہ انعام دیا۔

علماء کے حق میں خواہ اسپین کے ہوں یا باہر کے مستنصر باللہ بہت سخی تھے اور یہی وجہ تھی کہ اُن کے دربار میں اہلِ علم کا مجمع رہتا تھا، خلافت پناہی نہ صرف علماء کو بلکہ فلسفیوں کو بھی اپنی پناہ میں لے لیتے تھے، تاکہ وہ متعصب لوگوں سے بے خوف ہو کر تحصیلِ علوم میں مصروف رہیں۔

ایسے معارف پرست اور علم دوست بادشاہ کے سایہ عاطفت میں تمام علوم و فنون کو ترقی رہی، ابتدائی مدارس اچھے تھے اور بہت تھے، اسپین اسلامیہ میں ہر متنفس لکھنا پڑھنا جانتا تھا، لیکن مسیحی یورپ میں سوائے بڑے درجے کے لوگوں یا پادریوں کے سب ناخواندہ ہوتے تھے، نحو اور معنی کی تعلیم بھی مدارس میں عام تھی۔

باوجود اس ترقی کے خلافت پناہی کو یہی یقین تھا کہ تعلیم کی اشاعت ابھی تک خاطر خواہ نہیں ہے، غریبوں کے خیال سے خاص قرطبہ میں انہوں نے ۲۷ مدرسے ایسے کھول دیے تھے، جن میں غریبوں کے بچے مفت پڑھتے تھے، معلموں کی تنخواہ بادشاہ کے صرف خاص سے ملتی تھی، جامع مسجد قرطبہ میں جہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ ابوبکر بن معاویہ قرشی حدیث کا سبق دیتے تھے، ابو علی القالی بغدادی نے ایک بڑی مستند کتاب زبانی لکھوا دی اس میں قدیم عربوں اور اُن کی زبان اور ضرب الامثال اور شاعری کے تفصیلی حالات

---

[1] کتاب الاغانی (یہ کتاب شائع ہو چکی ہے) دیکھو مسٹر ہیوارٹ کی تصنیف "ادبیاتِ عرب" (مطبوعہ ۱۹۰۳ء) ص ۱۴۱

تھے، اِس مختلف مضامین کی کتاب کو امالی کے نام سے بعد کو شائع کیا، نحو کی تعلیم ابن القوطیہ دیتے تھے جو ابو علی القالی کی رائے میں اسپین کے بہترین نحوی تھے، دیگر علوم کے عالم بھی شہرت میں کم نہ تھے اس دار العلوم قرطبہ میں طلبہ کی تعداد جو اِن علماء کے درس میں حاضر ہوتے تھے ہزارہا تھی۔ اکثر طلبہ فقہ پڑھتے تھے، کیونکہ اِس علم کو پڑھ کر اُن کو سلطنت میں بڑے بڑے عہدے مل جاتے تھے

(۴۵۶) اِسی بیت العلوم کا ایک طالب علم الیسا نکلا جس کی شہرت نہ صرف اسپین میں بلکہ تمام عالم میں ہوئی اور اب اُسی شخص کے عجیب و غریب حالات لکھنے کی طرف ہم متوجہ ہوتے ہیں

اسناد:۔

مقری	جلد ۱ ص ۱۳۶، ۲۵۲ تا ۲۵۶
کرونیکون دی ساہیرو	ص ۲۶ تا ۲۸
ابنِ خلدون	ص ۱۶ تا ۱۷ اور مقدمہ
ابن عذاری	جلد ۲ ص ۲۵۰ تا ۲۵۷، ۲۶۴، ۳۹۶
میا کی قلمی کتاب	مندرجہ میمو ریاس دی لا اکادمیا دی لا ہسٹوریا۔ ٹی ۴ ص 15
کرونیکون ایرنسی	ص ۱۰
مونا کی سی لینس	ص ۷۰
ابن الابار	ص ۱۰۱ تا ۱۰۳
سعید طلیطلی	ص ۲۴۶
ابنِ خلکان (ترجمہ)	جلد ۱ ص ۲۱۰ تا ۲۱۲

کتابِ ثالث

خلافت

چھٹی فصل

ابنِ ابی عامر

خلیفہ مستنصر باللہ کی حکومت کا ابتدائی زمانہ ہے مضافاتِ قرطبہ کے ایک باغ میں درختوں کے نیچے پانچ طالب علم بیٹھے چنے گنک اور میوے کھا رہے ہیں، کھا پی کر آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں ہونے لگیں، مگر ایک طالب علم کسی خیال میں مستغرق بالکل گنگ بیٹھا ہے، یہ ایک بلند قامت خوبرو نوجوان ہے صورت سے شرافت اور تمکنت بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ غرور اور تکبّر برس رہا ہے اور ہیئت مجموعی ایسی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا نے گھر سے کار فرمائی کے لئے دنیا میں قدم رکھا ہے۔ آخر کار یہ طالبِ علم حالتِ سکوت سے دفعتاً چونک کر کہتا ہے "دوستو! ذرا میری بات بھی سن لو، میں ایک دن اس ملک پر حکومت کرنے والا ہوں"۔ اتنا فقرہ منہ سے نکلنا تھا کہ دوستوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ مگر اس نوجوان طالب علم پر کچھ اثر اس قہقہے کا نہ ہوا اور وہ کہنے لگا۔

"اچھا تو اب یہ کہنا ہے کہ میرے دورِ حکومت میں جس عہدے پر جو صاحب ممتاز ہونا چاہتے ہوں وہ ابھی سے مجھ سے کہہ دیں، صاحبِ حکومت ہونے پر وہی عہدہ جو اس وقت مانگو گے ملے گا۔"

اس پر ایک طالبِ علم بولا "یہی بات ہے تو سُنیئے! آج کی یہ میٹھی روٹیاں اور خستہ کُنک بڑے ہی لذیذ تھے، مجھے تو آپ بازاروں کا مہتمم بنا دیجئے گا تاکہ مفت میں جی بھر کر جکو تھیاں کھاتا پھروں۔"

دوسرے نے کہا "یہ میٹھے انجیر جو ہم نے ابھی کھائے ہیں خاص میرے وطن مالقہ کے تھے، اِس لئے مجھے تو جب حضور بادشاہ ہوں تو مالقہ کا قاضی مقرر فرما دیں۔"

تیسرا بولا "میں تو قرطبہ کے باغوں پہ فدا ہوں، اگر عاملِ قرطبہ کا منصب عنایت ہو تو زہے نصیب"

چوتھا طالبِ علم خاموش رہا اور اپنے دوست کی اِس بلند پروازی پہ دِل ہی دِل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ مگر مکتب کے یار کب خاموش بیٹھنے دیتے تھے انہوں نے اصرار کیا کہ "تم بھی کچھ مانگو" آخر کار یہ طالبِ علم جل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے نوجوان دوست کی داڑھی ہیں ہاتھ دے کر کہنے لگا "سُنیئے! اگر آپ اسپین کے بادشاہ ہو گئے تو میری نسبت صرف یہ حکم دینا کافی ہو گا کہ میرے سارے جسم پر شہد مل دیا جائے تاکہ مکھیاں بیٹھ کر خوب کاٹیں اور پھر گدھے پر اس طرح سوار کرا کے کہ دُم کی طرف منہ ہو، قرطبہ کے گلی کوچوں میں پھرایا جائے۔"

یہ جلی کٹی باتیں سُن کر اُس خوبرو نوجوان طالبِ علم نے اِس دوست کو بہت غیظ و غضب سے دیکھا، مگر پھر غصّہ پی کر کہنے لگا "بہتر ہے، انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا، جو چیز جس دوست نے اِس وقت طلب کی ہے جس دن بادشاہ ہُوا اُسی دن خود وہ چیز مجھے یاد آجائے گی۔"

۱۸۱ آخر کار یہ صحبت ختم ہوئی، دوست رخصت ہوئے اور وہ نوجوان بھی جس نے بہت بڑھ چڑھ کر اپنی نسبت بادشاہ ہونے کی خبر سنائی تھی اپنے گھر چلا گیا، یہ نوجوان اپنی

ننہیال کے ایک عزیز ابو عبد اللہ محمد بن اسحاق یمنی کے ساتھ رہا کرتا تھا، گھر کے بالا خانے پر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی اُس کے لئے مخصوص تھی، جب گھر پہنچا تو وہ عزیز بھی اُس کے ساتھ کوٹھڑی میں آ کر پاس ہو بیٹھا اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنی چاہیں، مگر وہ نوجوان اپنے کسی خیال میں ایسا منہمک تھا کہ اس عزیز کی طرف مطلق متوجہ نہ ہوا، اگر کسی بات کا جواب بھی دیا تو یوں ہی ٹوٹی ٹوٹی سی کوئی بات کہہ دی، یمنی یہ حالت دیکھ کر سلام کہتا ہوا کوٹھڑی سے باہر نکل آیا، دوسرے دن جب کھانے کا وقت آیا تو وہ طالب علم بالا خانہ سے نیچے نہ اُترا تب ابنِ اسحاق یمنی کو خبر ہوئی اور وہ بالا خانے پر گیا تو دیکھا کہ جس طرح کل بیٹھا چھوڑ گیا تھا وہ طالب علم اُسی طرح بیٹھا ہے، پلنگ پر بچھونے کی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ رات کو کوئی اُس پر لیٹا تک نہیں، یہ حال دیکھ کر یمنی نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آج رات آپ بالکل نہیں سوئے"۔ طالب علم بولا "میں یہ سوچتا تھا کہ جب اسپین کی حکومت مجھ کو مل جائے گی تو آج کل جو قاضئ شہر ہیں جب وہ میرے عہد میں مر جائیں گے تو اُن کی جگہ کسے قاضی مقرر کروں گا۔ دل ہی دل میں میں نے تمام اسپین کے شہروں کو چھان مارا مگر سوائے ایک شخص کے کوئی اور سمجھ میں نہ آیا"۔ عزیز کہنے لگا "شاید وہ محمد بن اسحاق بن سلیم ہوں گے"۔ طالب علم نے جواب دیا۔ "ہاں واللہ! یہی شخص ہیں جن پر میرے اور آپ کے دل نے اتفاق کیا ہے"۔

ان باتوں سے ظاہر تھا کہ اس طالب علم کے دل میں کوئی خیال ایسا بندھا تھا جس نے رات کی نیند حرام کرنے کے علاوہ دن کی بیداری میں بھی خواب کی سی حالت پیدا کر دی تھی۔

آئیے، اب ذرا اس نوجوان کا حسب ونسب دریافت کریں جو قرطبہ کی لکھوکھا مخلوق میں ایک معمولی پانی کے قطرے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا، مگر حوصلہ اور عزم نہایت بلند رکھتا ہے اور اگرچہ دربارِ خلافت میں کوئی اس کا مربی وسرپرست نہیں ہے مگر اُس کو پورا یقین ہے کہ ایک دن سلطنت میں وزیر اعظم کے درجے تک پہنچے گا۔

اس نوجوان طالبِ علم کا نام "ابو عامر محمد" اور اُس کے خاندان کا نام "بنی ابی عامر" ہے قبیلہ یمانیہ کے نماندان معافر سے اُسے تعلق ہے، یہ خاندان شریف

ہے گو نامور نہیں، اُس کے جدِّ اعلیٰ عبد الملک المعافری[1] اُن چند شرفاءِ عرب میں سے تھے جو طارق کی فوجِ بربر کے ساتھ فتحِ اندلس میں شریک ہوئے تھے، اِس موقع پر عبد الملک اُس دستۂ فوج کے افسر تھے جس نے کارتیہ کے ساحلی شہر کو فتح کیا تھا[2]، اس عمدہ خدمت کے صلہ میں اُن کو جزیرۃ الخضراء کے علاقے سے دریائے وادی آرہ کے کنارے طرش کا قلعہ مع اُس کی زمینوں کے جاگیر میں دیا گیا تھا، لیکن عبد المالک کی اولاد نے اس قلعے اور جاگیر میں کبھی کبھی سکونت رکھی، جوانی میں اُن کا زیادہ تر وقت قرطبہ میں گزرتا تھا، تاکہ دربارِ خلافت میں یا عمالِ سلطنت کے سلسلہ میں کوئی جگہ مل جائے، چنانچہ عبد الملک المعافری کے ۷۵۹
پوتے کے فرزند اور پوتے، یعنی ابو عامر محمد بن ولید اور عامر نے ایسے ہی منصب حاصل کئے، عامر نے اکثر بڑے بڑے عہدوں پر کام کیا تھا یہ امیر محمد بن عبد الرحمٰن کے بڑے مقربوں میں سے تھے، یہاں تک کہ امیرِ موصوف نے اپنے سکوں اور رائتیوں پر ان کا نام نقش کرایا تھا، عبد الملک المعافری ہی کی اولاد میں محمد بن عبد اللہ جو ہمارے نوجوان طالب علم کے دادا تھے آٹھ برس تک اشبیلیہ کے قاضی رہے اور اسی نوجوان طالب علم کے باپ ابو حفص عبد اللہ بڑے دیندار اور فاضل فقیہ تھے، حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہو چکے تھے، اس خاندان کے لوگوں کی شادیاں اکثر بڑی جگہ ہوئی تھیں، ابو عامر محمد کے دادا محمد بن عبد اللہ کی شادی ایک اسپینی مسلمان یحییٰ بن اسحاق نصرانی کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یحییٰ بن اسحاق، خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر الدین اللہ کے پہلے درباری طبیب تھے، پھر وزیر ہوئے اور اخیر میں بطلیوس کے حاکم مقرر ہو گئے تھے، ابو عامر محمد کی ماں کا نام بریہہ

---

[1] ابو عامر محمد سے عبد الملک المعافری تک کا شجرۂ نسب حسبِ ذیل ہے:۔

عبد الملک المعافری — ولید — الولید — ابو عامر محمد — عامر — عبد اللہ — محمد — ابو حفص عبد اللہ — ابو عامر محمد

[2] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۲۳۱

تھا، یہ ایک عامل شہر ابن برطال تمیمی کی بیٹی تھیں۔ ابو عامر محمد کا خاندان گو قدیم اور معزز تھا مگر اُس کے لوگوں کا شمار امراءِ عرب میں نہ تھا، یہ لوگ زیادہ تر اہلِ قلم تھے اہلِ سیف نہ تھے، کوئی عامری سوائے عبد الملک کے جو اس خاندان کا جدِ اعلیٰ تھا فوج میں ملازم نہ رہا تھا، جو اُس وقت ملازمت کا سب سے زیادہ باوقعت صیغہ سمجھا جاتا تھا، اِس خاندان کے سب لوگ یا تو عمال کی خدمت پر رہے، یا دربارِ خلافت میں کوئی عہدہ اُن کو ملا۔ ابو عامر محمد[1] کی تعلیم بھی اِسی خیال سے ہوئی تھی کہ محکمۂ قضا میں کوئی جگہ مل جائے، بہر کیف ایک دن ایسا آیا کہ محمد بن ابی عامر کو بزرگوں کے گھر یعنی قلعہ طرّش کے بوسیدہ برجوں اور دیواروں سے رخصت ہو کر ایک طالبِ علم کی حیثیت سے قرطبہ آنا پڑا، یہاں جامع قرطبہ میں اُن نامور عالموں سے تعلیم و تربیت پائی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

محمد ابن ابی عامر نہایت ذہین، شدید العزم اور پُر جوش طبیعت رکھتا تھا، وہ نہایت عالی خیال مگر آتش مزاج تھا، جو بات دماغ میں سما جاتی، اُسی کا بندہ ہو جاتا، پھر کوئی قوت اُس خیال کی مزاحم نہیں ہو سکتی تھی، کتابیں جو اُس کے مطالعہ میں رہتی تھیں وہ اپنی ہی قوم کی پُرانی کتبِ تواریخ تھیں اور اُن کے بوسیدہ اوراق میں بھی صرف ایسے لوگوں کے کارنامے اُسے محظوظ و مسحور کرتے تھے جو کسی وقت میں اُس سے بھی کمتر درجے کے لوگ تھے لیکن پھر ترقی کرتے کرتے سلطنت کے اعلیٰ ترین مرتبوں پر پہنچ گئے تھے، ایسے لوگوں کی سوانح کو وہ بطورِ مثال کے پیشِ نظر رکھتا تھا، چونکہ اپنے خیالات اپنے ہی تک نہ رکھتا تھا، بلکہ دوسروں سے بھی اُن کو بیان کرتا تھا، اِس لئے اکثر دوست اُس کو مختل الحواس سمجھتے تھے، مگر دراصل ایسا نہ تھا، اُس کے بڑے حوصلے خللِ دماغ کی وجہ سے نہ تھے۔ بلکہ وہ محض اِس بات کی علامت تھے کہ ایک دن وہ بڑا آدمی ہو جائے گا۔

---

[1] یہ نام اکثر محمد بن ابی عامر لکھا جاتا ہے۔ محمد اصل نام تھا۔ کنیت ابو عامر تھی۔ اِس لئے نام دراصل ابو عامر محمد ہونا چاہیے۔ لیکن خاندان کا نام بنی ابی عامر تھا اور خود اپنا نام محمد تھا، اس لئے محمد بن ابی عامر مستعمل ہونے لگا۔ مترجم۔

بڑا ذی فہم، ذکی، صاحبِ ہمت و تدبیر، اور ضرورت کے وقت بے دریغ کام کر جانیوالا
شخص تھا، اس کے ساتھ ہی موقع محل دیکھ کر نرم بھی پڑ جاتا تھا، مزاج میں بیحد احتیاط تھی ۷۶۰)
اور اگر حالات مجبور کریں تو دغا اور فریب سے نہ چوکتا تھا، حصولِ مقصد میں کسی قسم کا تردد
یا تذبذب مانع نہ ہوتا تھا اور اس کے لئے جو ذریعہ بھی ہاتھ لگے اُس کے اختیار کرنے
سے مطلق پرہیز نہ تھا، قوت اور جسارت انتہا درجے کی رکھتا تھا، اور جو ارادہ
ایک مرتبہ کر لیا پھر اُس کی پیروی نہایت ہمت اور شدید قوت سے کرتا تھا۔
جہاں کسی چیز کو اپنا نصب العین قرار دیا پھر تمام قوائے ذہنی شدت سے تحریک میں آکر
صرف اُسی ایک چیز کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے، زندگی کی ابتدا بہت ادنیٰ حیثیت
سے ہوئی تھی، تعلیم سے فارغ ہوا تو بسر اوقات کے لئے قصرِ خلافت کے قریب ایک
دوکان کھولی، یہاں وہ ایسے سائلوں کی عرضیاں لکھا کرتا تھا جو بارگاہِ خلافت میں کچھ
عرض کرنا چاہتے تھے، اس شغل میں کچھ دنوں رہنے کے بعد قرطبہ کے محکمۂ قضا میں اُسے
ایک ماتحت کی جگہ مل گئی، لیکن وہ اپنے افسر یعنی قاضیٔ قرطبہ کو اپنے اوپر مہربان نہ بنا
سکا، قاضی صاحب وہی ابن السلیم تھے جن کی عزت ابنِ ابی عامر شروع ہی سے
دل میں رکھتا تھا اور یہ عزت بجا تھی، کیونکہ قاضی ابن السلیم نہایت راستباز اور جید
عالم تھے اور قرطبہ کے بہترین قاضیوں میں اُن کا شمار تھا[1] لیکن طبیعت خشک تھی،
صرف معاملہ فہمی سے بحث رکھتے تھے اور جو لوگ اپنی ہی طبیعت اور مزاج کے نہ ہوتے
اُنہیں پسند نہ کرتے، محمد ابن ابی عامر قاضی صاحب کا ماتحت تھا، قاضی صاحب اُس کے
عجیب و غریب خیالات سن کر اور ہر وقت طبیعت کو غیر حاضر دیکھ کر اُس سے ناخوش
رہنے لگے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اس ماتحت سے پیچھا چھوٹے، اتفاق دیکھئے
کہ قاضی صاحب کی یہ ناراضی ابنِ ابی عامر کے حق میں نہایت مفید ثابت ہوئی، اور

---

[1] ابن السلیم دسمبر ۹۶۶ء ذی الحجہ ۳۵۵ھ میں منذر بن سعید بلوطی کی وفات پر قرطبہ کے
قاضی مقرر ہوئے تھے (خوشانی ص ۳۵۲)

اُسے دربارِ خلافت میں وہی ملازمت مِل گئی جس کی اُس کو بڑی تمنّا تھی، یہ واقعہ اس طرح پیش آیا کہ حاجب مصحفی سے قاضی صاحب نے ابنِ ابی عامر کی شکایت کی اور کہا کہ اگر اُس کو کہیں اور جگہ مل جاتی تو بہتر ہوتا، حاجب مصحفی نے خیال رکھنے کا وعدہ کیا، اس کے کچھ عرصہ کے بعد خلیفہ الحکم کو اپنے بڑے فرزند عبدالرحمٰن کی جائداد کے لئے ایک منتظم کی ضرورت ہوئی، عبدالرحمٰن کی عمر اس وقت پانچ برس کی تھی، مصحفی نے ابنِ ابی عامر کی سفارش کی، لیکن اس جگہ کا ملنا زیادہ تر خلیفہ کی چاہیتی ملکہ سلطانہ صبح کی رائے اور مرضی پر موقوف تھا، سلطانہ صبح کی اصل قوم بشکنس سے تھی اور اُن کو اپنے شوہر پر بڑا قابو حاصل تھا، ملکہ کے حضور میں بہت سے امیدوار پیش ہوئے، لیکن اُن میں ابنِ ابی عامر کی صورت و شکل اور رشِ اُستہ اطوار نے ملکہ پر جس قدر اثر کیا کسی اور نے نہیں کیا، سب امیدواروں میں ابنِ ابی عامر کا انتخاب ہوا اور ۲۳ فروری ۹۶۷ء (۱۰ ربیع الاوّل ۳۵۶ھ) کو وہ شہزادہ عبدالرحمٰن کی جائیداد کے منتظم پندرہ دینار سُرخ ماہوار پر مقرر ہو گئے۔ اُس وقت ابنِ ابی عامر (۶۱م) کی عمر ۲۶ برس کی تھی، اب انہوں نے سلطانہ صبح کو خوش کرنے اور اپنے اوپر مہربان بنانے کی کوشش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا اور اس میں اُن کو اس درجہ کامیابی ہوئی کہ ملکہ صبح نے اُن کو اپنی جایداد کا منتظم مقرر کر دیا، سات مہینے اِس خدمت کو بجا لانے کے بعد وہ دارالضرب کے افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیے گئے[1]، اِس جگہ کے ملنے سے زرِ کثیر اُن کی تحویل میں رہنے لگا اور اس روپیہ سے بڑے بڑے لوگوں کو اپنا دوست اور ہوا خواہ بنانے کا موقع اُنہیں مِل گیا، جب کبھی دربار کے کسی امیر کو روپیہ کی ضرورت ہوتی اور ایسی ضرورت مسرفانہ طرزِ معاشرت رکھنے کی وجہ سے اکثر پیش آتی تھی تو محمد ابن ابی عامر اُس کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے، قصہ مشہور ہے کہ خلیفہ مستنصر کے مولیٰ اور دربارِ خلافت کے معزز ملازم محمد بن افلح جب بیٹی کے بیاہ میں کثرت سے روپیہ صرف کر کے قرضدار ہو گئے تو وہ ایک زین جواہرات سے مرصع دارالضرب میں لائے اور ابنِ ابی عامر سے کہا کہ اِس کو

---

[1] اُس زمانہ کے سکوں پہ محمد ابن ابی عامر کا نام موجود ہے۔

رہن رکھ کر کچھ روپیہ دو اور یہ بھی کہا کہ "بس اب یہی ایک قیمتی چیز میرے پاس رہ گئی ہے ۔"

ابنِ افلح نے پوری بات بھی نہیں کہی تھی کہ محمد بن ابی عامر افسرِ دار الضرب نے ایک ماتحت کو حکم دیا کہ اِس زین کو وزن کر کے اُس کے برابر چاندی تول کر ابنِ افلح کو دے دو ۔

ابنِ افلح یہ سُن کر سمجھے کہ یونہی کہہ دیا ہے ، کیونکہ لوہے اور چمڑے کی وجہ سے زین بہت بھاری تھی ، تھوڑی دیر میں جب اُن سے کہا گیا کہ روپیہ کے لئے دامن پھیلائیں ، تب اُن کو یقین ہوا کہ یہ دھوکا نہیں بلکہ واقعی ابنِ ابی عامر کی فیاضی ہے اور یہ اتنا روپیہ ہے کہ قرضہ ادا ہونے کے بعد بھی بڑی رقم بچ رہے گی ۔

اِس واقعہ کے بعد ابنِ افلح یہ کہا کرتے تھے کہ "میں ابنِ ابی عامر کو اس قدر عزیز رکھتا ہوں کہ اگر وہ مجھے اپنے بادشاہ سے بھی باغی ہونے کو کہیں تو مجھے اُن کے حکم پر عمل کرنے میں ذرا پس و پیش نہ ہو ۔"

اِن طریقوں سے ابنِ ابی عامر نے ایک فریق ایسا پیدا کر لیا جو ہر وقت اُن کی خیر خواہی کا دم بھرتا تھا لیکن سب سے بڑا فرض اپنا وہ یہی سمجھتے رہے کہ سلطانہ صبح کی تمام فرمائشیں پوری ہوتی رہیں ، اُنھوں نے ملکہ کو ایسے ایسے نادر تحفے پیش کئے جو کسی نے آج تک پیش نہ کئے تھے ، اس خدمت میں جو باتیں انھوں نے پیدا کیں ، وہ حقیقت میں اُن کی دانائی اور ذہانت کا نتیجہ تھیں ، ایک مرتبہ شاہی قصر کے نمونے پر ایک چھوٹا سا چاندی کا محل بہت روپیہ صرف کر کے تیار کرایا اور جب یہ قیمتی کھلونہ تیار ہو گیا ، تو غلاموں کے سروں پر رکھوا کر قصرِ خلافت کو لے گئے ، راستے میں جب شہر کے لوگوں نے اُسے دیکھا تو سب دنگ رہ گئے ، کیونکہ چاندی کا ایسا خوبصورت کام انھوں نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا ۔

سلطانہ صبح اس عجیب تحفے کی تعریف ہمیشہ کرتی رہیں اور اب کوئی موقع ایسا نہ جانے پاتا تھا کہ ابنِ ابی عامر کی تعریف و توصیف اور ترقی نہ کر دیتی ہوں ، دونوں کے باہمی مراسم ایسے بڑھے کہ بدنامی کی صورت پیدا ہونے لگی ، بہرکیف

ابنِ ابی عامر حریمِ خلافت کی دیگر بیگمات کو بھی خوش کرنے میں کبھی غفلت نہ کرتے، اُن کی فیاضی و شیریں کلامی اور مودّب و مہذب طریقوں نے سب کا دل لُبھا لیا، خلیفہ الحکم جو اب ضعیف ہو چکے تھے، اس حالت کو کبھی سمجھ نہ سکے اور ایک دن ایک مصاحب سے فرمانے لگے کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس نوجوان ابنِ ابی عامر نے میری بیگمات کا دل کیوں کر اپنے قابو میں کر لیا ہے؟ اُن کی تمام فرمائشیں میں پوری کرتا ہوں، لیکن کوئی چیز جو ابنِ ابی عامر کے پاس سے نہ آئی ہو وہ اُن کی خاطر ہی میں نہیں آتی، حیران ہوں کہ ابنِ ابی عامر کو ایک ہوشیار ملازم سمجھوں یا جادوگر؟ بیت المال کا جو روپیہ اُس کے ہاتھوں سے گزرتا ہے اس کی طرف سے مجھے کبھی پورا اطمینان نہیں ہوتا۔"

اس میں شک نہیں کہ دار الضرب کے نوجوان افسر کے متعلق جن باتوں کی طرف الحکم نے اشارہ کیا تھا، ابنِ ابی عامر نے اُن میں بہت خطرناک طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ دوستوں کے ساتھ فیاضی ضرور کرتا تھا مگر یہ فیاضی شاہی خزانہ کے نقصان کے ساتھ عمل میں آتی تھی، چونکہ اُس نے جلد جلد ترقی حاصل کی تھی، اس لئے بہت سے دشمن اور حاسد بھی پیدا کر لئے تھے، چنانچہ آخر نوبت یہاں تک آئی کہ خلیفہ کے حضور میں ابنِ ابی عامر پر بد دیانتی اور غبن کا الزام لگایا گیا، خلیفہ نے حساب فہمی کے لئے اور جو رقم فاضل نکلتی تھی اُس کی ادائیگی کی غرض سے ابنِ ابی عامر کو قصرِ خلافت میں فوراً طلب کیا، ابنِ ابی عامر نے کہلا بھیجا کہ ابھی حاضر ہوتا ہوں اور یہ کہہ کر خود وزیر ابنِ حدیر کے پاس گئے اور کل معاملہ صاف صاف بیان کر کے کہ حالت خطرناک پیدا ہو گئی ہے، جو رقم اُن پر لگائی گئی تھی، وزیر سے قرض مانگی، ابنِ حدیر نے فوراً روپیہ قرض دے دیا، اب ابنِ ابی عامر حساب اور وہ رقم جو ان کے ذمہ لگائی گئی تھی لے کر خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے معاملہ بالکل اُلٹ گیا، الزام لگانے والے بہت خجل و شرمندہ ہوئے اور ان کی ذلت کے ابنِ ابی عامر کی عزت کا باعث ہو گئے، خلیفہ نے ان لوگوں کو جھوٹا

سمجھا اور دارالضرب کے لائق مہتمم کی بہت تعریف کی اور اُس کے مراتب میں اضافہ کیا۔

دسمبر ۹۶۸ء (مطابق محرم ۳۵۷ھ) کے شروع میں الحکم نے ابنِ ابی عامر کو چند ایسی جاگیروں کا جن کے مالک زندہ نہ تھے مہتمم مقرر کیا اور اِس کے گیارہ مہینے کے بعد اُن کو اشبیلیہ اور لبلہ کا قاضی کر دیا، جس وقت الحکم کے بڑے صاحبزادے عبد الرحمٰن کا اِنتقال ہو گیا تو ابنِ ابی عامر چھوٹے صاحبزادے ہشام کے اتالیق مقرر کئے گئے، ہشام اب ولی عہد ہو گئے تھے (جولائی ۹۷۰ء مطابق رمضان ۳۵۹ھ) ابنِ ابی عامر کی یہی عزت افزائی نہیں ہوئی بلکہ فروری ۹۷۲ء (ربیع الآخر ۳۶۱ھ) میں وہ فوج خاصہ کے ایک دستے کے سردار مقرر کئے گئے، اِس فوج کا کام شہر میں امن و امان قائم کرنا تھا۔

غرض ۳۱ برس کی عمر میں پانچ یا چھ بڑی تنخواہ کے مناصب پر مامور رہنے کے (۳۶۳ھ)
بعد اب ابنِ ابی عامر بڑے کر و فر سے زندگی بسر کرنے لگے، قصرِ رصافہ کے قریب ایک عالی شان مکان میں رہتے تھے جو اب مرجعِ خاص و عام ہو چلا تھا، ہر وقت بڑے بڑے عہدہ داروں کا ایک ہجوم لگا رہتا تھا، یہ عہدہ دار جن میں معتمد اور ماتحت شامل تھے، اونچے خاندانوں سے منتخب ہوئے تھے، اہلِ غرض کی بھی ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی، ابنِ ابی عامر نے لوگوں میں ہر دلعزیز بننے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دیا اور اِس میں وہ کامیاب رہے، اُن کی سخاوت، فیاضی، عمدہ خصائل اور اخلاقِ حمیدہ کی تعریف سب کی زبان پر رہنے لگی اور اُن کی خوبیوں میں کسی کو کلام نہ رہا۔

قریہ طرش کا یہ طالبِ علم اگرچہ بڑے درجہ پر پہنچ گیا تھا، مگر اُس کی کوشش یہی تھی کہ اس سے بھی بلند مرتبہ حاصل ہو اور اُس نے اِسی غرض سے اُمرائے لشکر سے مراسم پیدا کرنے ضروری سمجھے، موریتانیہ (مغرب اقصیٰ) میں واقعات ایسے پیش آئے کہ اُن کو اس کا موقع بھی مل گیا۔

مغربِ اقصیٰ میں بنی امیہ اور بنی فاطمہ میں لڑائی کا سلسلہ کبھی بند نہ ہُوا۔ عبدالرحمٰن الناصر فاطمیوں سے اس لئے برسرِ جنگ رہتا تھا کہ اسپین کو اُن کے حملوں سے بچائے رکھے، لیکن جس زمانہ کا ہم اِس وقت ذکر کر رہے ہیں، اس وقت فاطمیوں کی طرف سے حملے کا اندیشہ نہ تھا، فواطم کی توجہ مصر کی طرف مبذول ہو گئی تھی، ۹۶۹ء (مطابق ۳۵۸ھ) میں اُنھوں نے مصر فتح کر لیا اور تین برس کے بعد فاطمی خلیفہ معزالدین اللہ منصوریہ کے شہر کو چھوڑ کر جو فاطمیوں کی سلطنت کا پایہ تخت تھا، دریائے نیل کے کنارے آباد ہو گئے اور بربر کے قبیلہ صنہاجہ سے ابوالفتوح یوسف ابنِ زیری کو افریقیہ اور موریتانیہ (مغربِ اقصیٰ) کا والی مقرر کرتے گئے۔

اس زمانہ سے اسپین کو ایسے لوگوں سے جو حضرت علی کرم اللہ وجہ کی اولاد (یعنی علویین) سے ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے کوئی خوف نہ رہا، چونکہ افریقہ کے اسپینی مقبوضات کی آمدنی اُن کے مصارف سے کم تھی، اس لئے خلیفہ حکم کے لئے یہی بہتر ہوتا کہ وہ اپنے مقبوضات سے دستبردار ہو جاتے، لیکن اس میں انہوں نے اپنی کسرِ شان سمجھی اور افریقی علاقوں کو چھوڑنے کی بجائے اُن کی سرحدوں کو اور بھی آگے بڑھانا چاہا، اِن علاقوں سے جو ملک متصل تھے اُن پر بنی ادریس کے شہزادے حکومت کرتے تھے، خلیفہ الحکم نے اُن کو بے دخل کرنے کے لئے جنگ شروع کر دی۔

بنی ادریس کے انہی شہزادوں میں حسن ابنِ قنون جو تنجہ، اصیلا اور ساحل کے دیگر مقامات پر حکومت کرتا تھا کبھی اسپین کے بنی امیہ کی طرف ہو جاتا اور کبھی فاطمیوں کی طرف، غرض جس کو جیت میں دیکھتا اُسی کا ساتھی بن جاتا۔ لیکن واقعی میلانِ طبیعت اُس کا فاطمیوں کی طرف تھا۔ کیونکہ بنی امیہ کی نسبت بنی فاطمہ اُس کو کم خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ فاطمیوں کی سرحد سے ابنِ قنون کے علاقے ملے ہوئے تھے

غرض فاطمی خلیفہ معزالدین اللہ کا نائب ابوالفتوح جس وقت مغرب اقصیٰ میں

فاتح بن کر ظاہر ہوا۔ تو ابنِ قنون پہلا شخص تھا جس نے ابو الفتوح کے ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ ۶۲

ابنِ قنون کی اس حرکت پر کہ وہ مخالف سے جا ملا، خلیفہ الحکم کو اس سے خصومت ہوئی، چنانچہ جس وقت ابو الفتوح صنہاجی مغرب اقصیٰ سے چلا گیا تو الحکم نے ابنِ قنون کی سرکوبی کے لئے ابنِ طملوس کو فوج کشی کا حکم دیا، ماہ اگست ۹۷۳ء کے شروع (ذی القعدہ ۳۶۲ھ) میں ابنِ طملوس بہت سی فوج جہازوں میں سوار کر کے چلا، سبتہ میں جو اندلسی فوج مقیم تھی اُس کا بڑا حصہ اُس کے ساتھ ہو گیا۔ اس کل فوج سے ابنِ طملوس نے طنجہ پر حملہ کیا، ابنِ قنون جو طنجہ پر حکومت کرتا تھا مقابلہ کے لئے باہر آیا، لیکن اُس کو قطعی شکست ہو گئی اور شکست اِس طرح ہوئی کہ پھر وہ طنجہ میں داخل نہ ہو سکا، جب طنجہ کے لوگ بغیر حاکم کے رہ گئے تو انہوں نے ابنِ طملوس کی اطاعت قبول کر لی، کیونکہ ابن طملوس نے سمندر کی طرف سے طنجہ میں آمد و رفت کا سلسلہ بند کر دیا تھا اور خشکی کی سمت میں اُس کی فوج نے دلول اور ارزیلہ فتح کر لئے تھے۔

اِس حد تک اُموی فوجیں فتحیاب رہیں، لیکن اچھی قسمت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی، ابنِ قنون نئی فوجیں فراہم کر کے مقابلہ کی غرض سے طنجہ کی طرف بڑھا، ابنِ طملوس جواب کے لئے آیا، لیکن شکست کھا کر میدانِ جنگ میں مارا گیا۔ اس پر ادریسی شہزادوں نے جو اب تک بنی امیۂ اسپین کے ماتحت تھے عَلَم بغاوت بلند کیا اور الحکم کے سردارانِ فوج نے جو طنجہ میں چلے آئے تھے خلیفہ کو کہلا بھجوایا کہ اگر کمک نہ آئی تو بنی امیہ کی سلطنت کے مغرب اقصیٰ میں ختم ہونے میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔

اِس خطرہ کو دیکھ کر الحکم نے اپنا بہترین لشکر بہترین سپہ سالار غالب کی سرکردگی میں مغرب اقصیٰ بھیجنے کا ارادہ کر لیا، چنانچہ غالب کو قرطبہ میں طلب کیا اور اس کو ہدایت کی کہ "دیکھو احتیاط سے کام لینا اور فتح یاب ہو کر واپس آنا، اور

سمجھ لو کہ جو شکست ہم کو ہو چکی ہے اُس کی تلافی میدانِ جنگ میں تمہارے مر جانے سے نہ ہو گی، روپیہ کی کمی نہیں ہے، باغیوں کے دستوں میں روپیہ خوب تقسیم کرو، اور تمام ادریسی شہزادوں کو اُن کے علاقوں سے معزول کر کے اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے یہاں حاضر کر دو"۔

غالب نے چیدہ و منتخب فوج سوارہ کے ساتھ جہازوں میں بیٹھ کر بحرِ زقاق عبور کیا۔ سبتہ اور طنجہ کے درمیان قصرِ مصمودہ کے مقام پر اُترا اور فوراً ابن قنون کے مقابلہ کے لئے کوچ بول دیا، ابنِ قنون نے غالب کو روکنا چاہا، جم کر کوئی لڑائی نہیں ہوئی، اِدھر اُدھر معرکے چند روز تک ہوتے رہے، غالب نے دشمن کے فوجی افسروں کو روپیہ پہنچانے کا بندوبست کیا اور اس میں اُسے پوری کامیابی ہوئی بڑی بڑی رقمیں، زرق برق لباس اور خلعت اور مرصع تلواریں دیکھ کر ابن قنون کے فوجی سردار اپنا رایت چھوڑ کر علَم بنی امیہ کے سایہ میں آگئے، اب ادریسیوں کو جنھوں نے بغاوت کر دی تھی، اِس کے سوا چارہ نہ رہا کہ سبتہ کے قریب ایک قلعہ میں پناہ لیں، یہ قلعہ ایک پہاڑی سلسلہ پر بہت بلندی سے واقع تھا، اور اسم بامسمیٰ حجرالنسر کے نام سے مشہور تھا۔

(۵۴ھ) غالب کی ان ابتدائی کامیابیوں کی خبر سن کر خلیفہ الحکم خوش ہوئے، لیکن جب معلوم ہوا کہ غالب نے بربر کے فوجی سرداروں کو رشوت دینے میں بہت روپیہ صرف کر دیا ہے، تب خیال ہوا کہ غالب نے ہدایت کے الفاظ پر ضرورت سے زیادہ عمل کیا، گو یہ بات درست ہو کہ روپیہ کل مغرب اقصیٰ میں صرف ہوا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُس میں سے کچھ روپیہ غبن بھی ہوا، سرکاری خزانہ پر مصارف کا بار حد سے بڑھ گیا، اِس اسراف یا تصرّف بے جا کو بند کرنے کے لئے خلیفہ الحکم نے ارادہ کیا، کہ افریقیہ میں ایک دیانتدار شخص بطور محاسبِ خاص کام کرے اور اِس منصب کے لئے اُنہوں نے محمد بن ابی عامر کو منتخب کیا اور اُسے مغربِ اقصیٰ کا قاضی القضاۃ مقرر کر کے روانہ کر دیا اور ہدایت کر دی کہ جس قدر افسرانِ فوج ہیں اُن کے

چال چلن اور ان کی مالی حالت پر خاص طور سے نظر رکھے اس کے ساتھ ہی مغرب اقصیٰ کے تمام حکام کے نام فرمان بھیجا کہ کوئی کام بغیر ابنِ ابی عامر کی صلاح اور منظوری کے نہ کیا جائے۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ابنِ ابی عامر کو فوج اور اس کے افسروں سے واسطہ ہوا، اس قسم کا واسطہ ہونا وہ چاہتا ضرور تھا، لیکن جن حالات میں وہ پیش آیا وہ پسندیدہ نہ تھے، جو کام سپرد ہوا تھا وہ بہت مشکل تھا، ابنِ ابی عامر کا ذاتی فائدہ تو اس میں تھا کہ فوج کے سرداروں سے دوستانہ تعلقات پیدا ہوتے، لیکن کام یہ ملا کہ اِن سرداروں کی ایک طرح پر نگرانی کرے اور اُن کو اپنے قابو میں رکھے، یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو فوجی افسروں کو خواہ مخواہ ناگوار گذرتیں، لیکن ابنِ ابی عامر کی فراست اور تدبیر کچھ ایسی تھی کہ اُس کا بھید وہی جانتا تھا، چنانچہ اُس نے اس خوبی سے کام چلایا کہ اپنا فائدہ بھی ہاتھ سے نہ گیا اور جس خدمت پر بھیجا گیا تھا وہ بھی بخیر و خوبی انجام پاگئی۔

خلیفہ حکم اس کارگزاری پر خوش ہوئے، کیونکہ ابنِ ابی عامر نے فوجی سرداروں کی نگرانی اس عمدگی سے کی کہ بجائے کسی قسم کے ملال کے جس کا خوف تھا، یہ لوگ ابنِ ابی عامر کی تعریفیں کرتے تھے۔ افریقہ کے والیانِ ریاست اور قبائلِ بربر کے رئیسوں سے بھی ایسے مراسم پیدا کئے جو آگے چل کر خود ابنِ ابی عامر کے حق میں بہت بکار آمد ثابت ہوئے، اہلِ لشکر کا طرزِ معاشرت خود بھی ایسا اختیار کیا کہ افسر اور سپاہی سب کو اُس کے ساتھ ایک اُنس پیدا ہوگیا اور لوگوں کو معلوم ہونے لگا کہ قاضی القضاۃ نرے قاضی ہی نہیں ہیں بلکہ مردِ میدان بھی ہیں۔ ۹۷۲ء

اس اثنا میں غالب نے ادریسی والیانِ ریاست کو مطیع و منقاد کیا اور پھر ابنِ قنون کو اُس کے بلند آشیانے یعنی قلعہ حجر النسر میں محصور کرنا چاہا، یہ قلعہ گویا الیسا نہ تھا جس کا فتح کرنا غیر ممکن ہوتا، لیکن اُس کے سخت و دشوار گذار ہونے میں کلام نہ تھا، خلیفہ حکم نے اس زمانہ میں اُن قلعوں کی مقیم فوجوں سے جو اسپین میں اُس کی شمالی سرحد کی حفاظت کرتے تھے، بہت سی فوجیں بطورِ کمک مغربِ اقصیٰ

روانہ کیں اور ثغورِ شمال (یعنی شمال کے سرحدی علاقوں) کے حاکم وزیر یحییٰ بن محمد التجیبی کو ان فوجوں کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا، یہ کمک ماہ اکتوبر ۹۷۳ھ (مطابق محرم ۳۶۳ھ) میں مغربِ اقصیٰ (موریتانیہ) پہنچی اور اب قلعہ حجر النسر کا محاصرہ اِس شدت و قوت سے کیا گیا کہ آخر کار فروری ۹۷۴ء (مطابق جمادی الاول ۳۶۳ھ) میں ابن قنون نے مجبور ہو کر اطاعت قبول کر لی، عہد نامۂ صلح میں یہ شرطیں لکھی گئیں کہ ابن قنون اور اُس کے اہل و عیال اور اُس کے سپاہیوں میں سے کسی کو جان سے نہ مارا جائے اور دشمن کسی کا مال یا کسی کی جائداد ضبط نہ کرے، اس کے ساتھ ایک شرط یہ بھی تھی، کہ ابنِ قنون حجر النسر کے قلعے کو خالی کر کے قرطبہ میں حاضر ہو جائے۔

موریتانیہ (مغرب اقصیٰ) میں جب امن ہو گیا تو غالب بحرِ زقاق عبور کر کے ابنِ قنون اور دیگر شہزادگانِ بنی ادریس کو ساتھ لئے قرطبہ میں داخل ہوا خلیفہ المستنصر باللہ اور تمام اعیانِ دولت فتح مند غالب کے استقبال کو شہر سے باہر آئے، غالب کا یہ ورود دار السلطنت بنی امیہ میں اس شان کا تھا کہ ایسا پہلے کسی کی نظر سے نہ گذرا تھا، یہ واقعہ ۲۱ ستمبر ۹۷۴ء (مطابق دوشنبہ یکم محرم ۳۶۴ھ) کا ہے، خلیفہ مستنصر باللہ نے مفتوحین پر بالخصوص ابنِ قنون پر بے حد عنایات کیں، ہر قسم کے تحائف اُس کو دیے اور اُس کے ساتھیوں کو جو شمار میں سات سو تھے اور جرأت اور مردانگی میں مشہور تھے اپنا ملازم کر کے فوج میں بھرتی کر لیا۔

قرطبہ میں غالب کا یہ داخلہ حیاتِ مستنصر کی شان و عظمت کا آخری جلوہ تھا، چند ماہ کے بعد دسمبر ۹۷۴ء (مطابق ربیع الاول ۳۶۴ء) میں خلیفہ مستنصر فالج میں مبتلا ہو گئے اور یہ خیال کر کے کہ اب زندگی آخر ہونے کو ہے نیک کاموں میں خاص طور پر مصروف ہوئے، سَو غلاموں کو آزاد کیا، اسپین کے تمام اسلامی صوبوں میں محصولوں کا چھٹا حصّہ کم کر دیا اور حکم دیا کہ زین سازوں والے بازار کا کرایہ جس کی آمدنی صرفِ خاص میں جمع ہوتی تھی، وہ غریب بچوں کی تعلیم کے لئے معلموں کی تنخواہوں میں خرچ کی جائے، سلطنت کے معاملات جن کے طے کرنے میں اب وہ بہت کم

شریک ہونے تھے وزیر مصحفی کے سپرد کر دیے اور لوگوں پہ بہت جلد ثابت ہو گیا
کہ حکومت کی باگ اب بجائے خلیفہ کے دوسروں کے ہاتھ میں ہے، وزیر مصحفی
جو اپنے آقا سے کفایت شعاری میں بڑھے ہوئے تھے، اس نتیجہ پر پہنچے کہ افریقہ
کے ماتحت صوبجات اور ادریسی شہزادوں کے مصارف سلطنت پر ضرورت
سے زیادہ بار ہو رہے ہیں، پس بنظر تخفیف ادریسی شہزادوں سے یہ شرط
کرکے کہ وہ موریتانیہ واپس نہ جائیں گے اُن سب کو تونس روانہ کر دیا، تونس
سے یہ لوگ اسکندریہ چلے گئے، اس کے ساتھ ہی وزیر مصحفی نے یحییٰ ابن محمد التجیبی
کو افریقہ سے بلا لیا، غالب جب سے افریقہ سے اسپین چلے آئے تھے، افریقی (۷۶۷
مقبوضات پر یحییٰ ہی حاکم تھے، چلتے وقت اُنہوں نے افریقہ ہی کے دو رئیسوں یعنی
جعفر اور یحییٰ کو جو علی بن حمدون کے بیٹے تھے مغرب اقصیٰ کا انتظام سپرد کیا۔

اس اخیر تدبیر یعنی محمد التجیبی کو افریقہ سے واپس طلب کرنے میں کفایت شعاری
ہی مدِ نظر نہ تھی، بلکہ اُس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ شمالی اسپین میں عیسائیوں نے فتنہ
انگیزی شروع کی تھی جس کا انسداد ضروری تھا، ان عیسائیوں نے خلیفہ کی علالت
اور ملک سے بہترین فوجوں کی روانگی دیکھ کر ۹۷۵ء کے موسم بہار (۳۶۵ھ) میں
مسلمانوں سے لڑائیاں شروع کر دیں، یہ لڑائیاں عیسائیوں نے تجیبی خاندان سرقسطہ
کے ایک شخص ابو الاحوص معن[1] کی پشت گرمی سے شروع کی تھیں اور مسلمانوں
کے کئی قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا، جس وقت یہ بہادر تجیبی یعنی یحییٰ ابن محمد اسپین
میں واپس آیا تو مصحفی نے ملک کی حفاظت مقدم سمجھی اور یحییٰ کو اُس کی قدیم جگہ
یعنی سرحدِ شمال کی حکومت پر مامور کر دیا۔

خلیفہ مستنصر نے زندگی کے آخری ایام اس کوشش میں صرف کیے کہ اُن کا
بیٹا ہشام جو ابھی سے کم سن تھا، اُن کے بعد تخت کا مالک ہو، الحکم مسندِ

۱؎ دیکھو ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" مطبوعہ ۱۸۸۱ء ص ۲۲۱

خلافت پر بیٹھنے سے پہلے صاحب اولاد نہ ہوئے تھے، اُن کی اولاد کی تمنا بہت تھی، جب اِس طرف سے مایوسی ہونے لگی تو یہ محض خدا کی دین تھی کہ ڈھلتی عمر میں سیدہ صبح کے بطن سے ایک لڑکا ۳۵۱ھ (۹۶۲ء) میں پیدا ہوا جس کا نام عبدالرحمٰن رکھا گیا، اس کے تین برس بعد اسی ملکہ کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا، ان دو بچوں کے پیدا ہونے سے الحکم بیحد خوش تھے، ملکہ صبح کو اسی زمانہ سے خلیفہ کے مزاج میں بڑا دخل ہو گیا، لیکن بڈھے ماں باپ کے لئے ایک دن سخت رنج والم کا آیا۔ بڑا بیٹا عبدالرحمٰن کم سنی میں گذر گیا۔ چھوٹا بیٹا ہشام زندہ رہا، اب الحکم اس فکر میں رہنے لگے کہ ممکن ہے اس بچے کی کم سنی کی وجہ سے رعایا اِس کو تخت پر نہ بٹھانا چاہے اور اُس کے چچاؤں میں سے کسی کو اُس کا جانشین کر دے، اس قسم کا اندیشہ بالکل قدرتی امر تھا، اب تک تختِ قرطبہ پر کوئی نابالغ نہ بیٹھا تھا اور نابالغ بادشاہ کے زمانے میں بادشاہ کے نام سے دوسروں کا حکومت کرنا عربی مزاج اور طبیعت کے بالکل خلاف تھا، لیکن الحکم یہ گوارا نہ کر سکتے تھے کہ اُن کے فرزند ہشام کے سوا کوئی دوسرا تخت کا وارث ہو، اس کے علاوہ ایک پیشین گوئی چلی آتی تھی کہ بیٹے یا پوتے کے سوا اگر بھائی یا بھتیجے کے پاس سلطنت گئی تو بنی امیہ سلطنت سے محروم ہو جائیں گے۔

بیٹے کو اپنا جانشین کرنے کے لئے خلیفہ الحکم نے مناسب سمجھا کہ اپنی ہی زندگی میں جہاں تک جلد ممکن ہو رعایا سے فرزند کی بیعتِ اطاعت لے لی جائے اس لئے انہوں نے اعیانِ دولت اور امراء و رؤسائے ملک کا ایک جلسہ منعقد کیا، جس دن یہ (۹۶۸ء
جلسہ ہوا اُسی دِن[1] خلافت پناہی نے اپنا ارادہ ظاہر کر کے لوگوں سے کہا کہ وہ ایک وثیقے پر جس میں ہشام کا ولی عہد ہونا بیان تھا اپنے اپنے دستخط کر دیں، کسی شخص کی جرأت نہ ہوئی کہ دستخط کرنے سے انکار کرتا، اسی جلسہ میں خلیفہ نے ابن ابی عامر اور میسور الجعفری[2]

---

[1] ۵ فروری ۹۷۶ء مطابق یکم جمادی الآخرہ ۳۶۵ھ

[2] میسور کو الجعفری اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ ملکہ صبح کا مولیٰ تھا اور ملکہ کو المستنصر باللہ پیار سے جعفر کہا کرتے تھے۔ خلفاء اکثر بیگمات کے نام مردوں کے سے رکھ دیتے تھے۔

کو جو سلطانہ صبح کا مولیٰ تھا حکم دیا کہ اِس وثیقے کی نقلیں اسپین اور افریقہ کے ممالکِ محروسہ میں تقسیم کی جائیں اور نہ صرف اُمراء و اکابرِ ملک بلکہ تمام رعایا بھی اس پر اپنے دستخط کرے، اس حکم پر فوراً عمل ہوا، چونکہ خلیفہ مستنصر کا رعب سب کے دلوں پر غالب تھا، لہٰذا کوئی شخص نافرمانی نہ کر سکتا تھا تمام اطراف سے وثیقے کی نقلیں دستخط کی ہوئی آنی شروع ہوئیں اور اب ہشام بن عبدالملک کا نام بھی خطبے میں شامل ہوا

یکم اکتوبر ۹۷۶ء (مطابق ۲ صفر ۳۶۶ھ) کو خلیفہ حکم المستنصر باللہ کا انتقال ہوگیا اور وہ اس بات کا یقین اپنے ساتھ لے گئے کہ اُن کے بعد اُن کا بیٹا ہشام مسندِ خلافت پر بیٹھے گا اور مصحفی اور ابنِ ابی عامر جن کو خلیفہ نے وزیر مقرر کر دیا تھا اس بات کو دیکھتے رہیں گے کہ اندلس کے لوگ اپنا عہد پورا کرتے ہیں۔

اسناد:-

ابنِ عذاری — جلد ۲ ص ۲۴۹، ۲۵۱ تا ۲۵۳، ۲۶۰ تا ۲۷۰، ۲۷۳ تا ۲۷۶

ابن الخطیب — رقمی نسخہ ۷، ص ۱۱۷

عبدالواحد — ص ۱۷ تا ۱۹، ۲۶

مقری — جلد ۱ ص ۲۵۲ تا ۲۵۹، ۹۴ جلد ۲ ص ۵۹، ۶۱

ابنِ ابی اصیبعہ

ابن الآبار — ص ۱۴۸، ۱۵۲

قرطاس — ص ۵۶، ۵۸

ابنِ خلدون - تاریخ بربر جلد ۲ ص ۱۴۹، ۱۵۲ جلد ص ۲۱۵ تا ۲۱۶ (ترجمہ)

ابنِ عبدالملک مراکشی (پیرس قلمی نسخہ) ص ۴۸۲ ضمیمہ ص ۱۰۱۷

کتابِ ثالث

خلافت

ساتویں فصل

ہشام بن حکم کی تخت نشینی

(٤٦٩) خلیفہ الحکم مستنصر باللہ کا جس وقت دم نکلا ہے تو فائق اور جوذر دو خواجہ سرا اُن کے قریب تھے اور صرف اِنہی دو آدمیوں کو اس کا علم تھا کہ خلیفہ قیدِ حیات سے آزاد ہو چکے ہیں، اس واقعہ کو دیکھتے ہی اِن دونوں خواجہ سراؤں نے سوچ لیا کہ جب تک ہم لوگ آپس میں تصفیہ نہ کرلیں کہ اپنی بہتری کو مدِ نظر رکھ کر کیا بات اختیار کرنی چاہیئے، اُس وقت تک خلیفہ کی موت کی اطلاع کسی کو نہ کریں۔

فائق اور جوذر دونوں خلیفہ الحکم کے غلام تھے، ایک اُن میں شاہی توشہ خانہ کا داروغہ تھا اور دوسرا صاحب الصقور تھا، یعنی شکار کے باز اور بہری اُسی کی تحویل میں رہتے تھے، یہ دونوں خواجہ سرا بڑے معزز اور بارسوخ تھے اور اُنھوں نے بہت سے ملازمانِ قصر کو جو نہ خواجہ سرا تھے اور نہ غلام، روپیہ دے دے کر اپنے قابو میں کر رکھا تھا، اِس کے علاوہ اُن کے تحت میں ایک ہزار آختہ صقلبی تھے، جو

خلیفہ کے غلام تھے ، لیکن یہ صقلبی غلام سب کے سب بڑے خوش حال، صاحب جاگیر و جائیداد اور عالیشان محلوں کے رہنے والے تھے ، وہ دربار کی رونق اور زینت سمجھے جاتے تھے اور انہیں بڑی بڑی مراعات حاصل تھیں ، لیکن اہل قرطبہ کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا، یہ صقلبی ہزار ہا طریقوں سے قرطبہ کے لوگوں کو ستاتے اور اور نقصان پہنچاتے تھے ، المستنصر باللہ باوجودیکہ بڑے عادل اور منصف تھے ، لیکن ان صقالبہ کی حرکتوں بلکہ ان کے جرائم سے چشم پوشی اختیار کرتے تھے ، جب کبھی کوئی شخص ان غلاموں کی زیادتیوں کی شکایت کرتا تھا تو وہ یہی جواب دیتے تھے کہ "یہ لوگ میری حرم سرا کے محافظ و نگہبان ہیں ، مجھے ان پر کامل اعتبار ہے کہ اگر عزت اور اخلاق کے ساتھ ان سے برتاؤ کیا جائے گا تو ہرگز کوئی موقع شکایت کا پیدا نہ ہو سکے گا ۔"

غرض اس طرح خلیفہ کی حمایت اور رعایت سے یہ لوگ بہت ہی بے باک اور مغرور ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ سلطنت میں ہمارے برابر کوئی صاحب اقتدار نہیں اور ان کے سردار فائق اور جوذر تو یہاں تک آپے سے باہر ہوئے تھے کہ خلیفہ کا انتخاب کرنا بھی گویا انہی کی رائے اور مشورے پر منحصر تھا ، ہشام کا خلیفہ ہونا انہیں ناگوار تھا ، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ نابالغی کے زمانہ میں ہشام اگر تخت نشین ہوا تو وزیر مصحفی جس سے وہ پہلے ہی بیزار چلے آتے تھے کل سپید و سیاہ کا مالک ہو جائے گا، پھر ان کے اختیارات کچھ نہ رہیں گے ۔

اس میں کلام نہ تھا کہ قوم نے ہشام کی ولیعہدی پر بیعت کی تھی اور اس کے آئندہ خلیفہ ہونے کو بحلف منظور کیا تھا، لیکن سیاسی معاملات میں جو حلف لئے جاتے ہیں ان کی حقیقت سے جیسا کہ واقف ہونا چاہیئے فائق اور جوذر خوب
واقف تھے اور جانتے تھے کہ زیادہ تر لوگوں نے ہشام کی بیعت بہت تامل اور (۴۷۰)
تذبذب کے بعد کی تھی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ عامۃ الناس اس بات کے

خلاف ہیں کہ ایک نابالغ مسندِ خلافت پر بیٹھے اور نابالغی کے زمانہ میں وزراء اُس کے نام سے حکومت کریں، قوم کبھی گوارا نہ کر سکتی تھی کہ بارہ برس کے ایک لڑکے کو دین اور دنیا دونوں کا سردار بنالے، لیکن اگر ہشام کو تخت سے محروم رکھا تو اس میں ذرا شبہ نہ تھا کہ صقالبہ سخت بدنام ہو جائیں گے۔ البتہ اگر شاہی خاندان سے کسی زیادہ عمر کے لائق شخص کو خلیفہ بنایا تو پھر یہ کل بدنامی رفع ہو جائے گی، علاوہ ازیں ایک بات اس میں یہ اور نکلتی تھی کہ جس شخص کو وہ خلیفہ قرار دیں گے وہ اُن کا احسان مند ہوگا اور سمجھتا رہے گا کہ انہی کی کوشش سے اُسے تخت نصیب ہوا ہے، پھر ہم ہی اُس کے نام سے سلطنت کے مالک ہو جائیں گے۔

یہ سب باتیں سوچ کر خواجہ سراؤں نے تصفیہ کر لیا کہ ہشام کو خلیفہ نہ ہونے دیں، بلکہ ہشام کے چچا مغیرہ کو جس کی عمر اُس وقت ۲۷ برس کی تھی اِس شرط پر خلیفہ بنائیں کہ وہ ہشام کو اپنا ولیعہد مقرر کرے، آقائے مرحوم کی وجہ سے اتنا خیال ضرور ان لوگوں کو تھا کہ ہشام کے حقوق کو بالکل نظر انداز نہ کریں۔

جوذر نے کہا کہ "اپنے طریقۂ عمل کے بارہ میں جو کچھ فیصلہ کرنا تھا وہ ہم نے کر لیا ہے، اب ہمارا فرض ہے کہ مصحفی کو طلب کر کے اپنی موجودگی میں اس کا سر قلم کر دیں، اور پھر جو کچھ اس وقت تجویز کیا ہے وہی کریں۔" لیکن فائق جو زیادہ دور اندیش نہ تھا اور جوذر سے زیادہ رحمدل تھا، قتل کی تجویز سن کر ڈر گیا اور کہنے لگا کہ یا اخی! کیا آپ ہمارے آقا کے وزیر کو جان سے مارنا چاہتے ہیں؟ درآں حالیکہ کوئی قصور اُس سے ایسا سرزد نہیں ہوا ہے کہ اُسے قتل کیا جائے، ہمیں زیبا نہیں کہ اپنا کام خونِ ناحق کے ارتکاب سے شروع کریں۔ میرے خیال میں مصحفی سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے وہ ہمارے مقاصد میں مخل نہ ہوگا۔"

جوذر کو اس بات کا یقین نہ آیا، لیکن فائق چونکہ اُس کا افسر تھا اِس لئے زیادہ اصرار نہ کر سکا اور خاموش ہو گیا۔

اب اِن دونوں خواجہ سراؤں نے یہ تصفیہ کیا کہ مصحفی کو بہ لطائف الحیل اپنے

مقصود بر رضامند کر لینا چاہیئے، چنانچہ اُنہوں نے اُسے قصرِ خلافت میں بلایا جب مصحفی آیا تو خلیفہ کی موت سے اُسے مطلع کیا اور تخت نشینی کے بارے میں جو بات انہوں نے سوچی تھی وہ بھی اُس سے کہہ دی اور اُسے اپنا شریک بنانا چاہا۔

اِن خواجہ سراؤں کی تدبیر مصحفی کو نہایت شاق گذری، لیکن یہ سمجھ کر کہ دونوں بڑے فتنہ پرداز ہیں اور جو دل میں آئے گا وہی کر گزریں گے مصحفی نے بظاہر ان کی تجویز سے اتفاق کر لیا اور کہا "آپ نے جو امر تجویز کیا ہے وہ انتہا درجہ قرینِ عقل ہے، جو کچھ سوچا ہے وہی کیجئے، میں اور میرے احباب جہاں تک ممکن ہوگا آپ کی مدد کریں گے لیکن بہتر ہوگا کہ اکابرِ قوم اور مشیرانِ دولت سے اس امر میں مشورہ کر کے ان کی منظوری حاصل کر لی جائے، کیونکہ آئندہ بغاوت روکنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے، رہا میں، تو میرے ذمہ جو خدمت ہے وہ صاف ہے، میں قصر کے دروازے پر پہرہ دوں گا اور آپ کے حکم کا منتظر رہوں گا۔"

(۹۷۶ء) مصحفی نے اِس بناوٹ کی تقریر سے فائق اور جوذر کا اطمینان کر دیا، اب اُس نے اپنے چند دوستوں کو جمع کیا، اُن میں مصحفی کا بھتیجا ہشام، ابنِ ابی عامر، زیاد بن افلح (مولائے حکم المستنصر باللہ) قاسم بن محمد (یعنی ابنِ طملوس کا فرزند، یہ ابنِ طملوس وہی ہے جو افریقیہ میں ابن قنون سے جنگ کرتے ہوئے مارا گیا تھا) اور چند اور بڑے لوگ شامل تھے، اسپینی رسالوں کے اعلیٰ افسروں اور افریقیہ والی فوجوں کے سرداروں یعنی بنی برزال کو بھی جن پر بہت بھروسا اور اعتبار تھا مصحفی نے طلب کیا، اس طرح اپنے فریق کے تمام لوگوں کو جمع کر کے خلیفہ کے انتقال کی خبر اور خواجہ سراؤں کی تجویز سے اُن کو مطلع کیا اور کہا "اگر ہشام تخت نشین ہوئے تو ہم کو کسی بات کا خوف نہ ہوگا، لیکن اگر ہشام کی بجائے مغیرہ ہوئے تو ہم سب اپنی اپنی خدمت سے برطرف اور کیا عجب ہے کہ زندگی سے بھی سبکدوش کر دیے جائیں، کیونکہ مغیرہ کو ہم سب سے نفرت ہے۔"

تمام حاضرین نے مصحفی سے اتفاق کیا اور یہ تجویز کی کہ خواجہ سراؤں کے منصوبے کو اس طرح توڑنا چاہیئے کہ الحکم کی موت کے مشہور ہونے سے پہلے ہی اس کے بھائی مغیرہ

کا کام تمام کر دیا جائے، مصحفی نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا، لیکن جب وہ پوچھنے لگا، کہ یہ کام کون کرے گا؟ تو کسی کے منہ سے کچھ نہ نکلا، کیونکہ کوئی شخص ایسے کام کو انجام دے کر اپنے نام کو داغ لگانا نہیں چاہتا تھا۔

اب ابن ابی عامر نے حاضرین سے خطاب کیا "ہمیں اپنے ارادے میں ناکامی کا خیال تک نہ گذرنا چاہیئے، ہم اپنے سردار مصحفی کی مدد پر ثابت قدم ہیں اور اُس کے حکم پر عمل کرنا ہمارا فرض ہونا چاہیئے، چونکہ حاضرین میں سے کوئی بھی اس کام کو تکمیل تک پہنچانے پر رضامند نہیں معلوم ہوتا، اِس لئے میں سردار کی اجازت سے اِس کام کے لئے تیار اور آمادہ ہوں، آپ کسی بات کا خوف نہ کریں اور مجھ پر پورا بھروسا رکھیں"۔

اِس تقریر کو سُن کر سب لوگ حیران رہ گئے، کس کو خیال ہو سکتا تھا کہ دیوانی کا ایک ملازم قتل انسانی کا ارتکاب بطور ایک فرض منصبی کے اپنے ذمّے لے گا، حالانکہ فوجی افسر بھی جنہیں رات دن کشت و خون سے واسطہ رہتا تھا اِس پر آمادہ نہ ہو سکے تھے، بہرکیف ابن ابی عامر کی اِس ہمت اور جرأت کو سب نے پسند کیا اور اِس بات کو تسلیم کرنے لگے کہ جس تجویز پر سب متفق ہوئے ہیں اُس کو عمل میں لانا ابن ابی عامر ہی سے ممکن ہے، چونکہ شہزادہ ہشام سے اُس کا رات دن کا ملنا ہے اور شاہی خاندان کے اور لوگ بھی اُس کی بہت عزت اور قدر کرتے ہیں، اس سے ایسے نازک کام کے واسطے وہی موزوں ہو سکتا ہے۔

مجمع برخاست ہوتے ہی ابن ابی عامر گھوڑے پر سوار ہوا، سپہ سالار بدر اور فوج محافظ کے سو سواروں اور اسپینی فوج کے چند دستوں کو ساتھ لے کر مغیرہ کے محل کی طرف چلا، جب وہاں پہنچا تو فوج محافظ کے سپاہیوں کو دروازے پر کھڑا کر کے محل کے گرد سواروں کا حلقہ قائم کیا اور محل میں داخل ہو کر اطلاع دی کہ خلیفہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ہشام اُن کی جگہ تخت نشین ہوئے ہیں، لیکن وزیروں کو خوف ہے کہ آپ ہشام کا تخت نشین ہونا پسند نہ کریں گے، اس لئے انہوں نے مجھے آپ کی رائے دریافت کرنے بھیجا ہے۔

مغیرہ یہ الفاظ سُن کر زرد پڑ گیا، وہ ان کے معنی خوب سمجھتا تھا، یہ خیال کر کے کہ اب اُس کی موت کا وقت قریب آگیا ہے، بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "بھائی کی موت کی خبر سُن کر جو صدمہ مجھے ہوا ہے اُس کا بیان کرنا میری قدرت سے باہر ہے، لیکن مجھے اِس بات سے بے حد خوشی ہوئی کہ میرا بھتیجا تخت پر بیٹھا ہے، خدا کرے اُسے مدتوں سلطنت کرنی نصیب ہو، اور اقبال ہمیشہ اُس کا ساتھ دے، مہربانی کر کے جن لوگوں نے آپ کو یہاں بھیجا ہے اُن کو مطلع کر دیجئے کہ میں سب باتوں میں آپ کا مطیع اور فرمانبردار رہوں گا میں خلافتِ ہشام کی بیعت کر چکا ہوں اور اُسی پر قائم ہوں، اور جو کچھ قول و اقرار مجھ سے لینے ہوں وہ بھی لے لیے جائیں، لیکن اگر تم کسی اور قصد سے آئے ہو تو میں تم سے رحم کی درخواست کرتا ہوں، اور تم کو خدائے لایزال کی قسم دلا کر کہتا ہوں کہ اپنے ارادے پر غور کرو، اور میری جان لینے سے باز آؤ۔"

اِس نوجوان شہزادے کی تقریر پر ابنِ ابی عامر کو رحم آگیا، اور جو باتیں اُس نے کہیں اُن کو سچا سمجھا، جس قتل سے اپنا اور سلطنت کا فائدہ ہو اُس کے ارتکاب سے ابنِ عامر کو مطلق پرہیز نہ تھا، لیکن ایسے شخص کے خون سے وہ اپنے ہاتھ رنگنے نہیں چاہتا تھا جس سے کسی قسم کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو، پس اُس نے مصحفی کو ایک پرچہ اس مضمون کا لکھ کر بھیجا کہ "شہزادہ مغیرہ سچے دل سے مطیع ہے، اور کسی قسم کی بدگمانی اُس کی طرف سے نہ ہونی چاہیئے، اِس بنا پر میں درخواست کرتا ہوں کہ مغیرہ کی جان سلامت رکھی جائے۔"

ابنِ ابی عامر نے جس سپاہی کے ہاتھ یہ رقعہ بھیجا تھا وہ بہت جلد جواب لایا، جس کے آخری جملے یہ تھے "تمہارے اس تذبذب سے سب باتیں بگڑ جائیں گی، مجھے شبہ ہے کہ تم مغیرہ سے مل گئے ہو، اور ہمارے ساتھ دغا کرنی چاہتے ہو، جو خدمت تمہارے سپرد ہوئی ہے اُسے بجا لاؤ، ورنہ دوسرا آدمی اس کام پر مقرر کیا جائے گا۔"

ابنِ ابی عامر نے یہ خط مغیرہ کو دکھایا، جو اُس کے لیے پروانۂ موت تھا، اب

جو کچھ گذرنے والا تھا وہ ابن ابی عامر کو دیکھنا گوارا نہ ہوا، اس لیے وہ کمرے سے باہر نکل آیا، اور سپاہیوں کو اندر جانے کا حکم دیا، سپاہی جانتے تھے کہ ان سے کیا توقع کی جاتی ہے، انہوں نے رسّی ڈال کر مغیرہ کا گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالا، اور لاش کو ایک کمرے میں لٹکا دیا، اور محل کے نوکروں سے کہہ دیا کہ "جب مغیرہ سے اصرار کیا گیا کہ ہشام کی اطاعت قبول کریں تو انہوں نے اپنے گلے میں پھانسی ڈال لی، اور مر گئے"۔ تھوڑی دیر کے بعد سپاہیوں کے پاس ابن ابی عامر کا حکم آیا کہ مغیرہ کی لاش کو اُسی کمرہ میں جس میں وہ مردہ پڑا ہے، دفن کر کے کمرے کو چاروں طرف سے تیغہ کر دیا جائے۔

ابن ابی عامر جب یہ خدمت بجا لاچکا تو وزیر مصحفی کے پاس آیا، اور اُس کو اطلاع دی کہ آپ کے حکم کی تعمیل کر دی گئی ہے، مصحفی نے اس کا بہت شکریہ ادا کیا اور اظہارِ شکر گذاری کے طور پر اُسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ ۳۷۴ء

فائق اور جوذر کو جلد معلوم ہو گیا کہ مصحفی نے دھوکہ دیا، اور اُن کے منصوبے کو بالکل غارت کر دیا، دونوں کو بے انتہا غصہ آیا، بالخصوص جوذر کو، اور وہ فائق سے کہنے لگا "اب تو تم بھی قبول کرو گے کہ پہلی بات جو اپنی ترقی کے لیے میں نے بتائی تھی وہ مصحفی کو درمیان سے ہٹانا تھا، لیکن تم اس بات کو نہ پہنچے"۔

بہر کیف جو کچھ پیش آیا تھا اُس کو بظاہر ان خواجہ سراؤں نے گوارا کر لیا، اور مصحفی کی خدمت میں حاضر ہو کر بہت کچھ معذرت کی، اور اس بات کا اقرار کیا کہ عجلت میں جو کچھ ہم نے فیصلہ کیا تھا وہ غلط تھا، اور مصحفی نے جو کچھ کیا وہی مناسب اور قرین مصلحت اور ہماری تجویز سے بہتر تھا، مصحفی اگرچہ صقالبہ سے اتنی ہی نفرت رکھتا تھا جتنی نفرت صقالبہ کو اُس سے تھی، مگر سردست کوئی صورت اُن کو سزا دینے کی اُسے نظر نہ آئی، پس اُس نے جوذر اور فائق کی معذرت قبول کی، اور بظاہر پورے طور پر امن و امان قائم ہو گیا۔

دوسرے دن (یعنی دوشنبہ ۲ر اکتوبر ۹۷۶ء مطابق ۳ر صفر ۳۶۶ھ) منادی کے

ذریعہ سے اہلِ قرطبہ کو قصرِ خلافت میں مدعو کیا گیا، جب لوگ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ ہشام مسندِ خلافت پر رونق افروز ہے، اُس کے قریب مصحفی اور دائیں بائیں فائق اور جوذر و دیگر ارا کینِ دولت حاضر ہیں، قاضی ابن السلیم نے پہلے ہشام کے چچاؤں اور چچازاد بھائیوں سے، پھر وزیروں سے، پھر درباریوں اور قریشیوں کے سرداروں اور دیگر عمائدِ شہر سے بیعت لی، جب یہ ہو لیا تو باقی حاضرین سے بیعت لینے کا کام ابنِ ابی عامر کے سپرد ہوا، یہ کام آسان نہ تھا، کیونکہ بعض لوگوں کو بیعت کرنے سے اِنکار تھا، بہر صورت ابنِ ابی عامر نے فصیح و بلیغ تقریروں سے انہیں رضامند کر لیا، اور اِس میں اُسے اِس درجہ کامیابی ہوئی کہ سوائے دو چار آدمیوں کے سب نے ہشام کی خلافت منظور کر لی، ہر شخص کی زبان پر اس وقت ابنِ ابی عامر کی لیاقت اور قابلیت کی تعریف تھی

یہاں تک مصحفی اور اُس کے ساتھیوں کے حق میں سب باتیں درست ہوئیں اور سیاسی مطلع بالکل صاف اور روشن نظر آتا تھا۔ عامۃ الناس خاموش اور مطیع معلوم ہوتے تھے، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ نابالغ بادشاہ کے زمانے میں دوسروں کا حکومت کرنا انہوں نے قبول کر لیا، گو اِس سے پہلے اُن کو یہ بات گوارا نہ تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ظاہری حالات اُن کو دھوکہ دے رہے تھے، راکھ میں آگ کی چنگاریاں دبی تھیں، خفیہ طور پر لوگ اُن امراء پر لعنت بھیج رہے تھے جنہوں نے حرص اور حُبِ جاہ میں بدقسمت مغیرہ کو ہلاک کر کے عنانِ حکومت اپنے قبضے میں کر لی ہے، خواجہ سراؤں نے چپکے چپکے قرطبہ کے لوگوں میں اور آگ لگائی۔ غرض تھوڑے دنوں میں رعایا میں ایسی ناراضی پھیلی کہ ایک نہ ایک دن اس ناراضی کا بغاوت کی شکل میں بدل جانا ممکن (۴۷۴)
معلوم ہونے لگا۔

ابنِ ابی عامر اہلِ قرطبہ کے خیالات سے بے خبر نہ تھا، اُس نے مصحفی کو مشورہ دیا کہ رعایا پر رعب قائم رکھنے کے لیے فوجوں کو اُن کے سامنے سے گذارنا چاہیئے اور اس محبت اور تعلق کو جگانے کے لیے جو رعایا کے دل میں خلیفہ کی ذات کے ساتھ "موجود ہے" مناسب ہے کہ خلیفہ ہشام کی صورت رعایا کو دکھائی جائے، اور رعایا کا دل خوش کرنے

کے لیے کچھ محصول بھی معاف کیے جائیں، وزیر مصحفی نے یہ مشورہ پسند کیا اور طے پایا کہ ہفتہ کے دن ساتویں اکتوبر ۹۷۶ء (مطابق ۸ صفر ۳۶۶ھ) کو ہشام کا جلوس نکالا جائے، اُسی دن صبح کے وقت مصحفی جواب تک وزیر کا درجہ رکھتے تھے حاجب یعنی وزیر اعظم کے عہدے پر ممتاز کیے گئے، یا خود ہی انہوں نے یہ درجہ حاصل کر لیا، ابن ابی عامر سلطانہ صبح کی خاص سفارش سے وزیر مقرر ہوئے، اور سلطنت کا انتظام مصحفی اور ابن ابی عامر کے سپرد کر دیا گیا، نوعمر خلیفہ ہشام گھوڑے پر سوار ہو کر قرطبہ کے بازاروں میں نکلے، پیچھے پیچھے سواروں کا رسالہ تھا اور ابن ابی عامر ساتھ تھے، اسی حالت میں فرمان جاری ہوا کہ روغنِ زیتون پر جو محصول لیا جاتا تھا، اور جو محصولوں میں سب سے تکلیف دہ اس وجہ سے تھا کہ غریب آدمیوں کو اُس کا برداشت کرنا مشکل تھا وہ معاف کیا گیا۔

جلوس کے نکلنے اور بالخصوص محصول کے معاف کیے جانے سے رعایا پر ویسا ہی اچھا اثر ہوا جس کا پہلے سے خیال کیا گیا تھا، اور چونکہ ابن ابی عامر نے اپنے ہوا خواہوں کے ذریعے سے رعایا میں یہ بات مشہور کر دی تھی کہ محصول کی معافی انہوں نے ہی تجویز کی تھی اس لیے غریبوں اور مفلسوں میں وہ بالعموم اُن کے دوست اور خیر طلب مشہور ہو گئے۔

مگر خواجہ سرا خفیہ سازشیں کرنے سے باز نہ آئے، جاسوسوں نے مصحفی کو خبر کی کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی نسبت شبہ ہے کہ وہ خواجہ سراؤں اور قصر سے باہر شہر کے لوگوں میں درمیانی بن گئے ہیں، یہ لوگ قصر میں باب الحدید کے راستے سے آمد و رفت رکھتے ہیں۔ مصحفی نے یہ خبر پا کر قصر کے اس دروازے کو تیغہ کر وا دیا، اور اب قصرِ خلافت میں آنے کے لیے صرف باب السدہ رہ گیا۔

حاجب مصحفی نے ابن ابی عامر کو حکم دیا کہ فائق اور جوذر کے ایسے ملازمین جو مسلح ہیں مگر نہ وہ آختہ ہیں اور نہ غلام، اُن کو اِن دونوں خواجہ سراؤں سے جدا کر دیا جائے، ابن ابی عامر نے اس حکم کو بجا لانے کا وعدہ کیا، اور اب رشوتیں پہنچا کر اور طرح طرح کے

وعدے کر کے ابن ابی عامر نے اس بات میں اتنی کامیابی حاصل کی کہ پانچ سو مسلح ملازم فائق اور جوذر کی ملازمت چھوڑ کر ابن ابی عامر کے پاس ملازم ہو گئے، چونکہ ابن ابی عامر کو ان لوگوں کے علاوہ بنی برزال کی افریقی فوجوں پر بھی بھروسا تھا، اس لیے اب اس کی قوت مخالفین کی قوت سے بڑھ گئی۔

جوذر کو معلوم ہو گیا کہ یہ کُل کارروائی ابن ابی عامر کی ہے، اُس کو اِس بات پر ایسا (۷۵)
غصہ آیا کہ صاحبِ صقور کی خدمت سے مستعفی ہو گیا، مگر یہ سب دکھاوے کی باتیں تھیں جوذر کو یقین تھا کہ اُس کو علیحدہ کرنا مشکل ہے اس لیے اُس کا استعفےٰ منظور نہ ہوگا اور جب استعفےٰ منظور نہ ہوگا تو اس کو موقع ملے گا کہ آئندہ ملازمت میں رہنے کی جو شرائط چاہے گا اپنے مخالفوں سے لکھوائے گا۔

لیکن جوذر کا یہ خیال غلط نکلا، اُس کا استعفےٰ منظور کر لیا گیا، جوذر کے فریق والوں کو اس پر بہت غصہ آیا، مصحفی اور ابنِ ابی عامر کو بہت سخت دشنام کہنے لگے اور دھمکیاں دینی شروع کیں، اس فریق کے بڑے لوگوں میں ایک شخص دُرّی زبان درازی میں سب سے بڑھا ہوا تھا، یہ حالت دیکھ کر مصحفی نے ابن ابی عامر سے کہا کہ اِس کا کوئی تدارک ہونا چاہیئے، ابنِ ابی عامر کے پاس تدارک موجود تھا، دُرّی علاقہ بیاسہ کا حاکم تھا، اور اہلِ بیاسہ اِس حاکم کے اہلکاروں کے جور و ظلم اور زر کشی سے تنگ رہتے تھے، ابنِ ابی عامر پر یہ حال کھل گیا، اس نے اپنے طور پر اہلِ بیاسہ کو باور کرا دیا کہ اگر وہ اُس کے اہلکاروں کی کوئی شکایت پیش کریں گے تو وہ ضرور سنی جائے گی اور فیصلہ اہلِ بیاسہ کے حق میں ہوگا۔

بیاسہ کے لوگوں کو اتنا اشارہ کافی تھا، انہوں نے دُرّی کی شکایت کی، خلافت کی طرف سے دُرّی کو دار الوزارت میں حاضر ہونے کا حکم گیا، دُرّی نے حکم کی تعمیل کی لیکن جب قصر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں بہت سی فوج موجود ہے، اس پر اُسے اپنی جان کا خوف پیدا ہوا اور اُس نے واپس جانا چاہا، لیکن ابن ابی عامر نے اس کا گلا پکڑ لیا اور واپس نہ جانے دیا، اِس ہشت مشت میں دُرّی نے ابنِ ابی عامر (کی) داڑھی پکڑ لی

ابنِ ابی عامر نے سپاہیوں کو آواز دی، اسپینی قوم کے سوار جو قریب تھے اُن کو مطلق جنبش نہ ہوئی، کیونکہ وہ دُرّی سے ڈرتے تھے اور اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت ان میں نہ تھی، لیکن بنی برزال کے سپاہیوں کو اس قسم کا کوئی ڈر نہ تھا، وہ فوراً دوڑ پڑے اور دُرّی کو پکڑ کر مارنے پیٹنے لگے، ایک سپاہی نے تلوار چپٹے رُخ سے ایسی لگائی کہ دُرّی بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا، اِسی حالتِ بیہوشی میں اُسے اٹھا کر جہاں وہ مقیم تھا لے گئے، اور یہاں رات کے وقت کسی نے اُسے ہلاک کر دیا۔

صقالبہ کے اس سردار کے قتل سے مصحفی اور ابنِ ابی عامر سمجھ گئے کہ اب صقالبہ سے پوری لڑائی ٹھن گئی ہے، اس لیے جلد فیصلہ کر لیا کہ اِس حالت میں کیا کرنا ہوگا، چنانچہ فائق اور اُس کے دوستوں کے پاس خلیفہ کا حکم پہنچا کہ قصرِ خلافت سے فوراً باہر نکل جائیں، اس کے بعد اُن پر بددیانتی کا الزام لگایا گیا اور بھاری جرمانہ کیا گیا، اِن جرمانوں کے ادا کرنے سے وہ اتنے مفلس ہو گئے کہ وزراء کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے کے قابل نہ رہے، فائق (۴۷۶)
پر جو صقالبہ میں سب سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا سب سے زیادہ سختی کی گئی، اور اس کو جلاوطن کر کے جزائرِ شرقِ الاندلس کے ایک جزیرے میں بھیج دیا، جہاں وہ آخر کار مر گیا، صقلبی خواجہ سرا جن کے جرائم زیادہ سنگین نہ تھے اپنی اپنی جگہ برقرار رہے، ان میں سے ایک شخص جس کا نام سکر تھا قصر کی فوجِ محافظ کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

یہ تدبیریں گو مصحفی اور ابنِ ابی عامر کی خود غرضی کا نتیجہ تھیں، مگر عوام الناس میں ان امراء کے ہر دلعزیز ہونے کا بھی باعث ہو گئیں، قرطبہ کے لوگوں کو صقالبہ کے ظلم و ستم کی وجہ سے اُن سے سخت عداوت ہو گئی تھی، اب ان کی تباہی پر اہلِ قرطبہ خوش ہوئے۔

لیکن اس زمانہ میں شمال کے عیسائیوں کے تدارک میں حکومت کی طرف سے غفلت ہوئی، شمال کے عیسائی جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں خلیفہ الحکم کی موت کی خبر سُن کر روز بروز دلیر ہوتے گئے تھے، یہاں تک کہ قرطبہ کے دروازوں تک آ کر ڈاکے ڈالنے لگے، ان کے دفع کرنے کے لیے مصحفی کے پاس نہ روپیہ کی کمی تھی اور نہ آدمیوں کی، لیکن مصحفی رموزِ جنگ سے اس قدر نا آشنا تھا کہ ملک کو دشمنوں سے بچانے کی کافی تدبیر کرنے میں قاصر رہا،

سیدہ صبح عیسائیوں کے بڑھے چلے آنے سے اور رعایا میں بے چینی دیکھ کر پریشان رہنے لگیں، ابنِ ابی عامر سے انہوں نے یہ پریشانی بیان کی، ابنِ ابی عامر پہلے ہی سے مصحفی کی کم زوری و کم لیاقتی پر پیچ و تاب میں رہا کرتے تھے، چنانچہ انہوں نے سلطانہ صبح کو مشورہ دیا کہ "اگر مجھ کو ضروری سامان اور فوج کی افسری عنایت ہو تو عیسائیوں کو شکست دینے کا میں ذمہ لیتا ہوں"۔

اس مشورہ کا خلاصہ یہ تھا کہ ابنِ ابی عامر نے مصحفی کو جتا دیا کہ اگر وہ اسی طرح کاہل وجود رہا تو ایک دن کل اختیارات اُس کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ اور ابنِ ابی عامر نہ صرف اپنا فرضِ منصبی سمجھ کر بلکہ اپنے حق میں ذاتی طور پر مفید جان کر عیسائیوں کے مقابلہ میں بلا تاخیر خود کوئی سخت کارروائی شروع کر دے گا۔

مصحفی نے ابن ابی عامر کے اس مشورہ کو درست سمجھ کر وزرار کا ایک جلسہ منعقد کیا اور اس میں یہ تحریک پیش کی کہ شمال کے عیسائیوں کے مقابلہ میں ایک مہم جلد روانہ ہونی چاہیئے۔

اس تحریک سے گو سب نے نہیں لیکن زیادہ تر حاضرین نے اتفاق کیا۔ وزرا کی جماعت میں بڑی بحث یہ تھی کہ اِس مہم کا سردار کون ہو؟ کیونکہ یہ کام ان کو نہایت سخت ذمہ داری کا معلوم ہوتا تھا۔ اور کوئی شخص بھی اس ذمہ داری کے لیے آمادہ نہ تھا، لیکن ابن ابی عامر نے کہا "میں فوجوں کا سالار بن کر جانے کے لیے تیار ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ ساتھ لے جانے کے لیے فوجیں میں خود منتخب کروں گا، اور اس مہم کے مصارف کے لیے ایک لاکھ دینار سرخ مجھے دیئے جائیں"۔

یہ رقم ایسی بھاری تھی کہ وزراء میں سے ایک وزیر اس پر معترض ہوا، ابن ابی عامر نے کہا "اگر روپے کا خیال ہے تو میں دو لاکھ دینار دیتا ہوں، تم خود سپہ سالار بن کر چلے جاؤ"۔ وزیر جس نے اعتراض کیا تھا اس پر راضی نہ ہوا، اور آخر کار یہ طے پایا کہ فوجیں ابنِ ابی عامر کی سرگردگی میں روانہ کی جائیں، اور مصارفِ جنگ کے لیے جو رقم وہ طلب کرتے ہیں ادا کی جائے۔

فروری ۹۷۷ء (مطابق جمادی الآخرہ ۳۶۶ھ) کے اخیر میں ایسی فوجیں ساتھ لے کر جو انہوں نے خود ملک کے ہر حصے سے منتخب کی تھیں، ابن ابی عامر عیسائیوں سے لڑنے کے لیے شمال کی جانب روانہ ہوگئے، سرحد سے گزر کر قلعہ الحمہ[1] (لوس بانوس) کا جو رومیر ثانی نے سبت مانکش کی فتح کے بعد تعمیر کرایا تھا محاصرہ کرلیا، قلعہ کے باہر کی زمینوں کو لوٹنے کا حکم دیا، اور اس طرح بہت سا مالِ غنیمت حاصل کیا۔ اور اپریل کے وسط میں بہت سے عیسائی قیدیوں کو ساتھ لیے قرطبہ میں واپس آئے۔ اس لڑائی کا نتیجہ گو بہت وقعت کے قابل نہ تھا، لیکن قرطبہ میں بڑی خوشیاں منائی گئیں، کیونکہ جب سے عیسائیوں نے لڑائی اور لوٹ مار شروع کی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے حملہ میں تقدیم کی تھی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں نے عیسائیوں کو اس موقع پر ایسا سبق دیا جسے وہ بہت دن تک نہ بھولے، اور اب اُن کے وہ حملے جو قرطبہ کے قرب و جوار تک ہوا کرتے تھے، اور جن سے اہلِ قرطبہ کی نیند اُڑ جاتی تھی، قطعی بند ہو گئے، شہر کے لوگوں کی مسرت و اطمینان کے لیے ایک ایسی ہی بات کچھ کم نہ تھی۔

گو اس فتح کے بیان میں مسلمانوں نے مبالغہ کیا ہو، لیکن ابنِ ابی عامر کو اس لڑائی سے جس قدر فائدہ پہنچا اس کے بیان میں مبالغہ نہیں ہو سکتا، فوج والوں کا دل رکھنے کے لیے جنہیں اب تک یقین نہ آتا تھا کہ ایک قاضیٔ شہر فوج کی سپہ سالاری کیونکر کر سکتا ہے، ابنِ ابی عامر نے مصارفِ جنگ کا روپیہ اُن میں بڑی کشادہ دستی سے تقسیم کیا، زمانۂ جنگ میں بھی ابنِ ابی عامر کا دسترخوان تمام فوج والوں کے لیے ہر وقت بچھا رہتا تھا۔

غرض ابنِ ابی عامر کی تدبیر چل گئی، فوج کے افسر اور نوجوان سب کے سب اُس

---

[1] لوس بانوس کو عربی مورخ الحمہ لکھتے ہیں، یہ لفظ بلنیوس کا لفظی ترجمہ عربی میں ہے، اور موجودہ مقام لوس بانوس کے لیے سامپیرو نے بلنیوس ہی استعمال کیا ہے۔

کے اخلاق اور فیاضی کے مداح تھے، اور اُس کے باورچیوں کی تعریف بھی ہر وقت اُن کی زبان پر تھی۔ ابن ابی عامر کو اب فوج والوں پر پورا بھروسا ہوگیا، اور ظاہر ہوگیا کہ جب تک وہ اِسی طرح اُن کے ساتھ سخاوت کرے گا اُس وقت تک فوج کے لوگ دل و جان سے ساتھ دینے کو تیار رہیں گے۔

اسناد:-

ابن عذاری جلد۲ ص ۲۷۰، ۲۷۶ تا ۲۸۲

مقری جلد ۲ ص ۵۹ تا ۶۱

ابن الابار ص ۱۴۱، ۱۴۰

کتابِ ثالث

خلافت

اٹھویں فصل

ابوالحسنؒ جعفر بن عثمان الملقب بہ مصحفی کا تنزل

ابن ابی عامر کو جتنی ترقی ہوتی گئی مصحفی اُتنے ہی گرتے گئے، مصحفی کوئی غیر معمولی لیاقت کے آدمی نہ تھے، خاندان بھی اُن کا ادنیٰ تھا، اُن کے باپ عثمان علاقہ بلنسیہ کے ایک بربر تھے مگر خلیفہ الحکم کے اُستاد رہ چکے تھے۔ شروع ہی سے اُستاد کی محبت اور عزت کے ساتھ اُن کے بیٹے کی محبت اور عزت بھی الحکم کے دل میں بڑھتی گئی تھی، مصحفی میں اُن خوبیوں کی بھی کمی نہ تھی جن کی الحکم قدر کرتے تھے، علاوہ ذوقِ علم رکھنے کے ساتھ شاعر بھی تھے، اور اُن کی اچھی قسمت تو واقعی حیرت انگیز تھی، شروع میں خلافت مآب نے اُن کو اپنا معتمدِ خاص بنایا، پھر شہر کی فوجِ محافظ کے جزِ ثانی کا افسرِ اعلیٰ مقرر کیا، اِس کے بعد وہ جزیرہ میورقہ کے حاکم ہوئے، اور آخر میں درجۂ اوّل کی وزارت پر ممتاز کئے گئے، لیکن اُن کو کبھی اس بات میں کامیابی نہیں ہوئی کہ لوگوں کو وہ اپنا دوست اور خیر خواہ بنائے رہتے، ایک نو ترقی یافتہ آدمی کی طرح اُن میں تعلّی اور نخوت پیدا ہو گئی، اور یہ چیز اراکینِ دولت کو بے حد شاق گذرنے لگی، اِس

خیال سے کہ وہ ایک ادنیٰ خاندان کے آدمی ہیں یہ لوگ اُن سے متنفر رہا کرتے تھے، جس وقت حاجب کے عہدے پر مقرر ہوئے تو غرور اور نخوت کے عیوب طبیعت سے دُور کرنے چاہے، اور کچھ دنوں کو وہ دُور ہو بھی گئے، لیکن پھر وہی خود ستائی اور خود نمائی طبیعت میں پیدا ہو گئی، اُن کی دیانتداری میں بھی لوگ بہت شبہ کرتے تھے، اور یہ واقعہ ہے کہ اس زمانہ میں اعلیٰ مناصب رکھنے والے اِس عیب سے بہت کم خالی تھے، لیکن مصحفی بددیانتی سے جو کچھ پیدا کرتے تھے اگر اُس کو دوستوں میں تقسیم کرتے رہتے تو اس عیب کی قدرے تلافی ہو جاتی، مگر اُن کی عادت تھی کہ جس قدر ملتا تھا وہ اپنے ہی پاس رکھتے تھے، اور یہ حرکت ایسی تھی جسے کوئی معاف نہ کر سکتا تھا،

اِس کے علاوہ ایک بڑا قصور اُن کی طبیعت کا یہ بیان ہوا ہے کہ سرکاری عہدے وہ اکثر اپنے ہی عزیزوں کو دیا کرتے تھے۔ سلطنت کے تقریباً کُل مناصب پر انہی کے بیٹے بھتیجے مقرر تھے،

سیاست اور تدبیر مملکت میں جسے اعلیٰ قابلیت کہتے ہیں وہ مصحفی نہ رکھتے تھے، دفتر وزارت کے معمولی کام انجام دے دیتے تھے، لیکن اس کے علاوہ کسی سیاسی معاملہ میں سوچ کر فیصلہ کرنا، اور اس فیصلہ پر عمل کرنا ان کو نہ آتا تھا، اِس وجہ سے معاملات کا تصفیہ اور اُن کی تکمیل دوسروں کے سپرد ہوتی تھی، اور یہ خدمت بالعموم وہ ابنِ ابی عامر سے لیا کرتے تھے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ کیا ابن ابی عامر اُن کے رازدار اور اصلاح کار ہمیشہ بنے رہیں گے اور دور اندیش لوگوں کو اِس میں شبہ تھا، اور یقین تھا کہ ابنِ ابی عامر جو اس وقت در پردہ وزارت کر رہے ہیں کوئی دن جاتا ہے کہ واقعی وزیر ہو جائیں گے،

یہ خیال درست تھا، ابن ابی عامر نے ابھی سے مصحفی کو گرانے کا ارادہ کر رکھا تھا، اور اس کے لیے وہ خفیہ طور پر ہمہ تن مصروف بھی ہو گئے تھے۔

بظاہر مصحفی کے ساتھ ابنِ ابی عامر کے برتاؤ میں کوئی فرق پیدا نہ ہوا، اور جو ادب اور تعظیم وہ اُن کی کرتے تھے اُس میں کسی طرح کی کمی نہ کی، لیکن پسِ پردہ ہر بات میں اُن کو زک دینے کے درپے رہے، اور کوئی موقع ایسا نہ جانے دیا کہ اُن کی ناقابلیت اور غلطیوں

کو سلطانہ صبح پر ظاہر نہ کیا ہو۔

مصحفی کو ابنِ ابی عامر کی طرف سے مطلق بدگمانی نہ تھی، خوف کرنا تو درکنار مصحفی ان کو اپنا سب سے بڑا دوست اور رفیق سمجھتے تھے، لیکن جس شخص سے اُن کو واقعی خوف تھا وہ غالب سرحدِ شمال کا حاکم تھا، تمام افواج و عساکر پر غالب کے اقتدار کی انتہا نہ تھی، غالب کو بھی مصحفی سے عداوت تھی، اور عداوت کو چھپانے کی بھی اُسے پروا نہ تھی، بیشمار لڑائیاں سر کر چکا تھا، جتنا غرور کرتا بجا تھا، غصہ اُس کو اس بات پر آیا کرتا تھا کہ ایک ایسا ہیچ آدمی جس نے کبھی میان سے تلوار تک نہ کھینچی ہو حاجب کے درجے پر پہنچ جائے۔

اب غالب علانیہ دعوے کرنے لگے کہ حاجب کا منصب ان کا حق ہے، ضابطے اور قاعدے کے بموجب وہ مصحفی کے ماتحت تھے، لیکن غالب نے اپنے طرزِ عمل سے یہ بات صاف ظاہر کر دی کہ سلطنت ان کی وفاداری پر ہمیشہ بھروسہ نہیں کر سکتی، جب سے الحکم کا انتقال ہوا تھا وہ عیسائیوں سے لڑنے میں بہت تساہل کرنے لگے تھے، حالانکہ شروع میں عیسائیوں سے لڑائی میں اُن کی تیزی اور جدّت مشہور تھی۔

اب تک غالب نے قومی خیانت یا بغاوت نہیں کی تھی، اور نہ عیسائیوں سے کبھی مدد چاہی تھی، لیکن اُن کے طریقوں سے معلوم ہوتا تھا کہ عنقریب وہ یہ سب باتیں کر گزریں گے اور مصحفی کا زوال ایک یقینی امر ہو جائے گا، کیونکہ ایک ایسے زبردست سپہ سالار اور سلطنت کی بہترین افواج کے مقابلہ میں جب کہ عیسائی بھی کمک پر ہوں، مصحفی کا ٹھیرنا ممکن نہ تھا، اس کے علاوہ خیال تھا کہ جس دن اس قسم کے مقابلہ کی نوبت آئی مصحفی کے دشمنوں کو موقع مل جائے گا کہ وہ اُن کے مرتبے اور دولت کے تو کیا، جان تک خواہاں ہو جائیں۔

مصحفی اتنے کم عقل نہ تھے کہ ان خطروں کی طرف سے جو در پیش تھے آنکھیں بند کر لیتے اس حالت پریشانی میں انھوں نے اپنے وزیروں سے مشورہ کیا، خاص کر ابنِ ابی عامر سے سب نے صلاح دی کہ جس قیمت پر بھی ہو غالب سے دوستی پیدا کرنی ضروری ہے، مصحفی اس صلاح کو مان گئے، اور ابنِ ابی عامر نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ دونوں میں ملاپ کرا دیں گے، چنانچہ انھوں نے کہا کہ "شمال کے عیسائیوں سے اب لڑائی کا زمانہ آ رہا ہے وہاں غالب سے ملاقات

ہوگی تو اس امر میں گفتگو کا موقع ملے گا، اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہوگا میں آپ دونوں صاحبوں میں مصالحت ہو جانے کی کوشش کروں گا۔"

لیکن ابنِ ابی عامر نے جو کچھ کہا وہ بالکل تصنع تھا، دل میں اُن کا ارادہ کچھ اور ہی تھا، حصولِ جاہ و منزلت میں بلند پروازی کا شوق کہتا تھا کہ دولت و اقبال کی اونچی سے اونچی چوٹی پر پہنچنے کے لیے پیچیدہ سے پیچیدہ راہیں اختیار کرنے سے بھی نہ چوکو، اس لیے بجائے (۴۸۰) اس کے کہ غالب اور مصحفی میں صلح کرا دیتے، انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ دونوں کی مخالفت میں اور شدت پیدا کرا دیں گے، اور اب وہ اسی کوشش میں مصروف ہو گئے، مصحفی سے تو یہی کہتے رہے کہ میں سچے دل سے آپ کی بھلائی کا خواہاں ہوں، لیکن سیدہ صبح سے غالب کی اعلیٰ قابلیتوں کی بے حد تعریف کر کے بار بار کہا کہ غالب جیسے شیر دل اور شجاع کو امارتِ لشکر سے علیحدہ کرنا کسی طرح ممکن نہیں، بلکہ جو درجہ اس وقت غالب کو حاصل ہے اُس سے بھی بڑھ کر درجہ عنایت کر کے اُن کی ملازمت کو برقرار رکھنا ضروریات سے ہے۔

سیدہ صبح کو ابنِ ابی عامر کا اس طور سے مشورہ دینا بیکار نہ گیا، انہوں نے اپنی سفارش اور اثر سے غالب کو ذوالوزارتین[۱] یعنی صیغہ دیوانی و فوج دونوں کی اعلیٰ افسری دلوا دی، اور سرحدی لشکر کی سپہ سالاری اُن کی بدستور قائم رہی، مصحفی غالب کی اس ترقی میں مانع نہ ہوئے بلکہ اس سے خوش ہوئے، کیونکہ ابنِ ابی عامر نے اُن کو یقین دلا دیا تھا کہ غالب سے مصالحت کرنے کی یہ پہلی سیڑھی ہے۔

۲۳ مئی ۹۷۷ء (مطابق چہارشنبہ یکم شوال ۳۶۶ھ) کو یعنی شمالی سرحد کی لڑائی سے واپس آئے ہوئے ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا کہ ابنِ ابی عامر لشکرِ قرطبہ کے افسرِ اعلیٰ مقرر ہو کر عیسائیوں سے دوبارہ لڑنے کے لیے سرحدِ شمال کی طرف روانہ ہو گئے، مجریط کے شہر میں غالب سے ملاقات ہوئی، ابنِ ابی عامر غالب سے بہت تعظیم و تکریم سے ملے، اور مصحفی کی نسبت یہ کہہ کر کہ وہ ہرگز اتنے بڑے عہدے کے لائق نہیں ہیں، غالب کا دل اپنے

---

[۱] یعنی دو دستاروں والا، دیکھو ابن خلکان (سلین کا ترجمہ) جلد ۳ ص ۱۳۰

قابو میں کر لیا، اب ابنِ ابی عامر اور غالب میں بے انتہا دوستی ہو گئی، اور دونوں نے مصحفی کو اُن کے درجے اور مرتبے سے گرانے پر اتفاق کر لیا، اس کے بعد دونوں نے سرحد عبور کر کے قلعہ مولہ کو عیسائیوں سے فتح لیا، اس قلعہ سے بہت مالِ غنیمت اور قیدی ہاتھ آئے، اس لڑائی کے ختم ہونے پر جب ابنِ ابی عامر غالب سے رخصت ہونے لگے تو غالب نے ابنِ ابی عامر سے کہا کہ "اس مہم میں تم کو فتح ہوئی ہے، اس فتح سے تمہاری بہت نیک نامی اور شہرت ہو گی، اور اہلِ دربار اس فتح کی خوشی میں اس بات پر غور نہ کریں گے کہ تمہاری آخری نیت کیا ہے؟ دربار کی اس حالت سے تم نفع اٹھانا اور جب تک مصحفی کے بیٹے محمدؐ کو جو قرطبہ میں عامل کا درجہ رکھتا ہے اُس کے درجے سے ہٹا کر خود عاملِ قرطبہ نہ ہو جاؤ قصرِ خلافت سے باہر قدم نہ رکھنا" ابنِ ابی عامر نے ان ہدایات پر چلنے کا وعدہ کیا اور قرطبہ واپس آئے، غالب سرحدی علاقہ میں اپنے مستقرِ حکومت کو روانہ ہو گئے۔

عیسائیوں سے یہ لڑائی فی الحقیقت غالب جیتے تھے، غالب ہی نے لڑائی کا نقشہ قائم کیا تھا، اور اُسی کے مطابق یہ معرکہ سر کیا تھا، غالب ہی کے حکم پر ابنِ ابی عامر عمل کرتے رہے تھے، کیونکہ میدانِ جنگ میں وہ ابھی تک مبتدی تھے، اور غالب جیسے آزمودہ کار سپہ سالار سے کسی بات میں مخالفت نہ کر سکتے تھے، غرض لڑائی اگرچہ غالب کی جیتی ہوئی تھی، لیکن اُنہوں نے اپنے نوجوان دوست کی ترقی کے خیال سے خلیفہ کو ایک مراسلہ کے ذریعے سے اطلاع دی کہ ابنِ ابی عامر نے میدانِ جنگ میں حیرت انگیز کام
کیے ہیں، اس فتح کا سہرا اُنہی کے سر بندھنا چاہیے، اور وہ واقعی بڑے انعام و اکرام (۴۸۱
کے مستحق ہیں،

یہ مراسلہ ابنِ ابی عامر کے قرطبہ پہنچنے سے پہلے دربارِ خلافت میں موصول ہو گیا تھا، اہلِ دربار اُس کو پڑھتے ہی ابنِ ابی عامر کے مداح اور طرفدار ہو گئے، اور جب وہ قرطبہ میں آئے تو مصحفی کے لڑکے کو عاملِ قرطبہ کے عہدے سے علیحدہ کر کے اُس کی جگہ خود حاصل کرنے میں اُنہیں مطلق دشواری نہیں ہوئی، جو شخص دو مرتبہ دشمن پر فتح پا کر آیا ہو، اور

جس کی تعریف اُس زمانہ کے سب سے بڑے سپہ سالار نے کی ہو، اُس کی ترقی میں مزاحمت کرنے کی کس کو ہمت ہو سکتی تھی، اِس کے علاوہ مصحفی کے لڑکے کی جو عاملِ قرطبہ تھا لوگ عزّت بھی نہ کرتے تھے، اُس کی ترقی محض اُس کے باپ کی وجہ سے ہوئی تھی، بجائے اِس کے کہ اپنے حُسنِ عمل سے اچھا نام پیدا کرتا، وہ سخت بدنام اور نالائق ثابت ہو چکا تھا، لالچ اُس کے مزاج میں اِس قدر تھا کہ خفیف سے خفیف رشوت ملنے پر سنگین سے سنگین جرم سے بھی چشم پوشی کر جاتا تھا، یہ شکایت غلط نہ تھی کہ اُس زمانہ میں قرطبہ میں امن و انتظام کچھ نہ رہا تھا، چوروں اور لُیٹروں نے شہر میں ایک آفت بپا کر رکھی تھی، غریب رعایا چوری اور قتل کے خوف سے رات کو سوتی نہ تھی، اور دارالحکومت کے رہنے والوں کو وہ خطرے پیش رہتے تھے کہ سرحدی شہروں کی بھی یہ حالت نہ تھی۔

ابنِ ابی عامر خلعتِ فاخرہ پہنے ہوئے جو ابھی دربار سے ملا تھا، اور ہاتھ میں پروانۂ تقرر لیے ہوئے عاملِ شہر کے دفتر میں آئے، وہاں دیکھا کہ مصحفی کا بیٹا محمد مصحفی بڑی شان سے مسندِ عدالت پر بیٹھا ہے، ابنِ ابی عامر نے فرمانِ تقرر اُسے دکھا کر کہا کہ اب یہ مسند چھوڑئیے، محمد مصحفی ایک آہِ سرد بھر کر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔

ابنِ ابی عامر نے عاملِ شہر ہوتے ہی دارالخلافت میں امن و حفاظت کی غرض سے نہایت سخت احکام جاری کیے، پولیس کے کارکنوں سے کہہ دیا کہ "میں تمام مجرموں کا خواہ وہ ادنیٰ درجہ کے آدمی ہوں یا اعلیٰ درجہ کے سخت تدارک کروں گا، اور اگر پولیس کے آدمیوں نے رشوت ستانی کی تو سخت سزا دوں گا۔" تمام اہلکار یہ دیکھ کر کہ ابنِ ابی عامر سخت آدمی ہے اور ہر وقت اُس کی نظر ماتحتوں پر رہتی ہے اپنے فرائضِ منصبی درستی سے ادا کرنے لگے، جس کا نتیجہ شہر کے حق میں اچھا ہوا، چوریاں اور خون کے وقوعے رفتہ رفتہ بہت کم ہو گئے، امن و حفاظت نے پھر اپنی صورت دکھائی، قانون نے نگرانی اور پاسبانی کی، اور رعایا پاؤں پھیلا کر سوئی، ابنِ ابی عامر نے اپنے اِس قول کی کہ مجرم پر خواہ بڑا آدمی ہو یا چھوٹا، مقدمہ قائم کیے بغیر نہ چھوڑوں گا تصدیق بھی کر دی، اور وہ اِس طرح کہ جب خود اُن کے بیٹے سے کوئی جرم ہوا، اور پولیس نے اُسے گرفتار کر کے پیش کیا تو اُس کو تازیانے کی سزا ایسی سخت

دی کہ وہ اُسی میں مر گیا۔

آخر کار مصحفی کی آنکھیں کھلیں۔ بیٹے کی برخاستگی کا حال دیکھ کر کہ اُن کی غیر حاضری میں اور بغیر اُن کے علم کے ایسا کیا گیا، اُن کو مطلق شبہ نہ رہا کہ ابن ابی عامر دونوں طرف ملا ہوا ہے اور دراصل دھوکہ دے رہا ہے، لیکن مصحفی کیا کر سکتے تھے، حریفِ مقابل کے اختیارات اُن کے اختیارات سے کہیں زیادہ ہو گئے تھے، ابنِ ابی عامر کو سلطانہ صبح کا بھروسہ تھا، مشہور یہ ہو گیا تھا کہ ملکہ پر وہ عاشق ہو گئے ہیں، اِس کے علاوہ قوم کے شریفوں میں جو لوگ بنی امیہ کے موالی تھے اور دربار کے بڑے عہدے اُنھی کی اولاد کو ملا کرتے تھے وہ سب ابنِ ابی عامر کی مدد پر تیار تھے، اور ایک نو دولت آدمی کو جو بیجا طور پر مغرور ہو گیا ہو، ایسے شخص پر کب ترجیح دے سکتے تھے جو عرب کے ایک قدیم اور شریف خاندان کا رکن ہو۔ (۲۸۴

ابنِ ابی عامر کو فوج کا بھی پورا بھروسہ تھا جو روز بروز اُن سے زیادہ مانوس ہوتی جاتی تھی، قرطبہ کے باشندوں کو بھی جب سے امن و سلامتی نصیب ہوئی تھی، اُس وقت سے وہ ابنِ ابی عامر ہی کا دم بھرنے لگے تھے۔ اِن سب کے جواب میں مصحفی کے پاس کیا رکھا تھا؟ چند متفرق لوگ جن کی ترقی اُن کی وجہ سے ہوئی تھی البتہ اُن کے دوست تھے، مگر یہ بھی اتنے شکر گذار نہ تھے کہ اِن کا پورا اعتبار کیا جاتا، مصحفی اور ابنِ ابی عامر کی لیاقتوں کے مقابلہ کرنے میں کوئی مناسبت نہ پائی جاتی تھی، ایک کی قابلیت معمولی تھی، دوسرے کی لیاقت آسمان تک پہنچی ہوئی تھی۔

مصحفی ان باتوں کو خوب سمجھتے تھے، اور اپنے بچاؤ کی صورت اسی میں دیکھتے تھے کہ کسی طرح غالب کو اپنے اوپر مہربان کر لیں، چنانچہ انھوں نے غالب کو خط لکھا، اور اُس میں بہت سے ایسے وعدے وعید جو غالب کو پسند آئیں کیے، اور آخر میں تعلقات کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے اپنے لڑکے عثمان کی شادی کا پیغام غالب کی بیٹی اسماء سے دیا، غالب خوشامد سے خوش ہوئے، اور دل سے کدورت دور کر کے جواب دیا کہ جو جو وعدے کیے گئے ہیں اور شادی کا پیغام دیا گیا ہے وہ سب اُنہیں منظور ہیں مصحفی نے

بہت جلد شادی کے متعلق ایک تحریر تیار کرا کے اُس پر غالب کے دستخط لے لئے۔

ابنِ ابی عامر کو ان باتوں کی جو فی الحقیقت اُن کے نقصان کا باعث تھیں، کچھ خبر نہ تھی، جس وقت معلوم ہُوا تو انہوں نے اس شادی کو رد کرنے کے لئے جس قدر تدبیریں ممکن تھیں اختیار کیں اور اُن کے کہنے سے دربار کے بڑے بڑے بارسوخ اُمراء نے اور خود ابنِ ابی عامر نے غالب کو خط بھیج کر متنبہ کیا کہ مصحفی نے درحقیقت یہ ایک جال پھیلایا ہے، غالب کو جو شکایتیں مصحفی سے تھیں اُن کی طرف بھی اشارہ کیا اور اُن وعدوں کو یاد دلایا جو گزشتہ جنگ کے زمانہ میں ابن ابی عامر اور غالب میں ہوئے تھے، ابنِ ابی عامر نے شادی کے بارے میں لکھا کہ "اگر بیٹی کو عزت کے ساتھ بیاہنا منظور ہے تو بجائے مصحفی کے لڑکے کے میرے ساتھ اُس کی شادی کی جائے اور ہرگز ایک ادنیٰ خاندان والے نودولت شخص کے ساتھ یہ رشتہ پیدا نہ کیا جائے۔"

(۴۸۳ء غالب کو اب یقین ہوگیا کہ واقعی اُن سے غلطی ہوئی، چنانچہ انہوں نے مصحفی کو لکھ دیا کہ جو شادی مدنظر تھی وہ اب نہیں ہو سکتی۔

اگست یا ستمبر ۹۷۷ء (مطابق ذی الحجہ ۳۶۶ھ) میں ایک نئی تحریر تیار کی گئی، جس میں اسماء اور ابن ابی عامر کی شادی طے پائی، اس کے کچھ دنوں بعد ۸ ستمبر ۹۷۷ء (مطابق ۱۲ محرم ۳۶۷ھ) کو ابنِ ابی عامر شمال کے عیسائیوں سے پھر لڑنے گئے اور قرطبہ سے طلیطلہ کے راستے میں سرحد پر اپنی فوج کو غالب کے لشکر سے جا ملایا، عیسائیوں سے دو قلعے اور شلمنکہ کے مضافات فتح کر لئے،

ابنِ ابی عامر جب اِس مہم سے فتح پا کر واپس آئے تو اُن کو ذوالوزارتین کا خطاب ملا اور ۸۰ دینارِ سُرخ اُن کا مشاہرہ مقرر ہوا، یہ مشاہرہ اتنا تھا کہ حاجب مصحفی کو بھی اس سے زیادہ نہ ملتا تھا۔

شادی کی تاریخ اب قریب آنے لگی، سیدہ صبح نے اگر اُن کا تعلق ابن ابی عامر سے تھا بھی، تو انہوں نے اس شادی پر کسی قسم کا رشک یا خوشی کا اظہار نہ کیا اور خلیفہ ہشام یا یہ کہنا چاہیئے کہ ملکہ صبح نے غالب کو لکھا کہ وہ خود بھی اپنی بیٹی کے ساتھ قرطبہ

آئیں غالب اپنی لڑکی کے ساتھ قرطبہ آئے اور یہاں شاہانہ الطاف واکرام بہت کچھ اُن پر ہوئے حاجب کا خطاب انہیں عنایت ہوا، ذوالوزارتین کا خطاب پہلے ہی مِل چکا تھا، اس خطاب سے مصحفی اب تک محروم تھے ۔

اب غالب اراکینِ دولت میں سب سے بڑے آدمی ہو گئے اور ہر بڑے موقع پر صدر نشین ہونے لگے، مصحفی دائیں طرف اور ابنِ ابی عامر اُن کی بائیں طرف بیٹھتے تھے، نوروز جو درحقیقت عیسائیوں کا تہوار تھا مگر مسلمان بھی اُس میں شریک ہوتے تھے، ابنِ ابی عامر اور اسماء بنتِ غالب کا نکاح ہوا، خلیفہ ہشام نے شادی کے کُل مصارف اپنے ذمّے لئے، ضیافتیں اس شان کی ہوئیں کہ کبھی نہ ہوئی تھیں اور جس وقت دُلہن اپنے گھر سے رخصت ہو کر دُولھا کے گھر آئی تو اُس کا جلوس ایسی دھوم دھام کا تھا کہ قرطبہ والوں کی نظر سے اس شان کا جلوس کبھی پہلے نہ گذرا تھا ۔

جس دن سے غالب نے اپنی بیٹی کی شادی مصحفی کے بیٹے سے کرنی نامنظور کی تھی مصحفی سمجھ گئے تھے کہ اب اپنی خیر نہیں اور واقعی اُن کا کوئی یار و مددگار نہ رہا تھا، ایسے لوگ بھی جو اُن کے ساختہ و پرداختہ تھے اُن کے مخالفوں سے جا ملے ایک وقت وہ تھا کہ جب اپنے محل سے نکل کر دربار کو جاتے تھے تو ہر شخص کوشش کرتا تھا کہ اُن کے پیچھے پیچھے چلے، اب دربار کو جاتے تھے مگر کوئی ساتھ نہ ہوتا تھا، اختیارات بھی اُن کے کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئے، سلطنت کے اہم ترین معاملات اُن کے پسِ پشت طے ہونے لگے، بدنصیبی سے اس عالمِ ضعیفی میں یہ بھی دیکھنا پڑا کہ مطلعِ تقدیر پر مصیبت کا اول خوب گھر کر آیا ہے اور اب کوئی دم میں طوفان سر پر ٹوٹنے والا ہے، وہ لاچار اور مجبور ہو کر اِس طوفان کے منتظر ہو گئے ۔

مگر مصیبت کا مینہہ وہم و گمان سے بھی بڑھ کر برسنا شروع ہوا، ۲۶ مارچ ۹۷۸ء (مطابق ۱۳ شعبان ۳۶۷ھ) کو پیر کا دن تھا کہ مصحفی اُن کے بیٹے اور بھتیجے اپنے عہدوں اور خطابوں سے محروم کر دیے گئے اس کے بعد مصحفی اور اُن کے عزیز حراست میں لے لئے گئے اور مصحفی کی جایداد کی نسبت حکم ہوا کہ اُس وقت تک ضبط سرکار سمجھی جائے

جب تک کہ بد دیانتی کے مقدمات کا جو اُن پر دائر ہوئے ہیں کچھ فیصلہ نہ ہو جائے۔

اِس واقعہ پر مصحفی کو حیرت نہ ہونی چاہیئے تھی، مگر جب وہ پیش آیا تو زار و قطار رونے لگے، مدتِ دراز کی ملازمت میں جو جو بے انصافیاں دوسروں کے ساتھ کی تھیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں، معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے کلیجے پر سِل رکھ دی ہے، جس وقت بیوی بچوں سے رخصت ہونے لگے تو کہا "اب تم مجھ کو پھر زندہ نہ دیکھو گے، ایک شخص نے مجھے بد دعا دی تھی، اُس کی بد دُعا آج قبول ہو گئی، چالیس برس سے میں آج کے دن کا منتظر تھا"۔

جب لوگوں نے پوچھا کہ "اِس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" تو کہنے لگے، "عبدالرحمٰن الناصر تخت پر تھے کہ مجھ کو ایک قیدی کے مقدمہ میں فیصلہ سُنانا اور اُسے سزا دینی پڑی، میں نے اُسے دراصل بے گناہ پایا، لیکن خود غرضی سے مجبور ہو کر میں نے اُس پر جرم ثابت کر دیا اور اُس کو نہایت سخت سزا دی، اُس کی جائیداد ضبط کر لی اور اُسے قیدِ خانہ بھیج دیا، مدتوں وہ بے گناہ زندان میں پڑا رہا، اُسی زمانہ میں ایک رات میں سوتا تھا کہ دفعتاً ایک آواز میرے کان میں آئی کہ "اس آدمی کو قید سے رہا کر دے ہم نے اُس کی فریاد سُن لی ہے اور ایک دن تیرا بھی وہی حال ہو گا جو حال تو نے اِس بے قصور کا کیا ہے" میں یہ آواز سُن کر چونک پڑا بے حد خوف مجھ پر طاری ہوا اُس قیدی کو میں نے بلوایا اور اُس سے اپنے قصور کی معافی چاہی، لیکن اس نے معاف کرنے سے اِنکار کیا۔ تب میں نے اُسے قسم دلا کر پوچھا کہ اُس نے خدا کی جناب میں میری نسبت کوئی بد دُعا کی تھی؟ اُس نے جواب دیا "ہاں۔ میں نے خدا سے دعا مانگی تھی کہ تو بھی ایسے ہی تنگ و تاریک قید خانے میں مرے جیسے کہ میں اس تنگ و تاریک زندان میں برسوں سے پڑا سسک رہا ہوں"۔ مصحفی کہنے لگے کہ "اتنا سُن کر وہ اپنی نا انصافی پر سخت نادم ہوا، اور میں نے اُس قیدی کو رہا کر دیا، لیکن افسوس یہ ندامت اور پشیمانی اُس وقت ہوئی جب کہ وقت نکل چکا تھا۔

مصحفی اور اُن کے بیٹے مدینۃ الزاہرا کے سرکاری قید خانہ میں پہنچا دیئے گئے سب سے

پہلے مصحفی کا بھتیجا ہشام مصحفی ابن ابی عامر کے حملے کا نشانہ بنا، یہ فوج میں افسر تھا آخری لڑائی جو عیسائیوں سے ہوئی تھی اُس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ لڑائی میں سے فتح کی ہے، یہ قید خانہ میں پہنچتے ہی قتل کر دیا گیا، اب رہے مصحفی، اُن کا مقدمہ مجلس وزراء کے سامنے ہوا اور مدت تک چلتا رہا، انہوں نے زمانہ ملازمت میں جو جو بد دیانتیاں کی تھیں اُن کی شہادت بہت کافی تھی، اسی شہادت کی بنا پر اُن کی جائداد کا ایک حصہ ضبط کر کے باغ رصافہ کے قریب اُن کی سکونت کا عالیشان مکان نیلام کر دیا گیا، نئے نئے الزام اُن پر عائد کئے جانے لگے، ابن ابی عامر کے خوش کرنے کو وزراء نہایت شوق سے منتظر رہتے تھے کہ مصحفی پر نئے نئے الزام قائم ہوں۔

مصحفی پر اکثر الزامات پایہ ثبوت کو پہنچتے رہے، اور اُن کی جائداد جستہ جستہ نیلام
(۴۸) ہو کر آخر بالکل ہی ختم ہو گئی، لیکن وزراء یہ سمجھ کر کہ ابھی جان باقی ہے مصحفی کو برابر ستاتے
رہے اخیر مرتبہ جب وہ عدالت کے سامنے لائے گئے تو بڑھاپے اور قید کی تکلیفوں نے انہیں اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ قید خانہ سے دار الوزارت تک بمشکل گھسٹتے ہوئے چلے، سرہنگ جو ساتھ تھے بڑی درشتی اور بے رحمی سے کہتے تھے کہ "جلدی کیوں نہیں چلتا؟ وزیر کب تک تیرے انتظار میں بیٹھے رہیں گے؟" مصحفی جواب دیتے تھے "تھوڑے دن اور صبر کرو، تم میری موت چاہتے ہو، مگر گھبراؤ نہیں یہ آرزو بھی ایک دن پوری ہو جائے گی۔ میں موت خریدنے کے لئے تیار ہوں مگر اللہ تعالیٰ نے اُس کی قیمت اتنی زیادہ رکھی ہے کہ میں اُسے ادا نہیں کر سکتا" اُس کے بعد اپنے یہ اشعار انہوں نے پڑھے:۔

"قسمت کا اعتبار نہ کرو، کیونکہ اُس میں تلوّن ہے۔ تھوڑے دن ہوئے کہ شیر
مجھ سے ڈرتے تھے اور اب میں ایک لومڑی کو دیکھ کر ڈر جاتا ہوں، افسوس!
یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ ایک لائق مرد بھی ایک کمینے سے رحم کا طالب ہوتا ہے۔"

دار الوزارت میں پہنچ کر مصحفی ایک گوشے میں جا بیٹھے، کسی وزیر کو انہوں نے سلام نہیں کیا، وزیر ابن جابر جو ابن ابی عامر کا بڑا خوشامدی تھا، مصحفی سے کہنے لگا "کیا تم ایسے بدتمیز ہو گئے ہو کہ معمولی اخلاق سے بھی واقف نہیں رہے؟" مصحفی خاموش رہے،

مگر جب ابن جابر نے اور زیادہ توہین کی تو مصحفی بولے "تو کب تمیز سے واقف ہے؟ میرے احسانات کے جواب میں ناشکر گذاری کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ مجھ میں تمیز نہیں" یہ سُن کر ابن جابر گھبرایا مگر فوراً سنبھل کر کہنے لگا "تم جھوٹے ہو، تم نے مجھ پر کون سا احسان کیا تھا؟" اس کے بعد ابن جابر نے اپنی شکایتیں جو مصحفی سے اُسے تھیں بیان کیں، جب وہ چُپ ہوا تو مصحفی بولے "جو باتیں تم نے کہی ہیں اُن کی بابت شکریہ کا میں مستحق نہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جب روپیہ تمہارے پاس امانت رکھا گیا اور تم نے اُس میں خیانت کی جس کی سزا میں الحکم مستنصر باللہ تمہارا ہاتھ کٹوا دیتے، تو اُس وقت میری ہی سفارش سے تمہاری خطا معاف ہوئی تھی۔ ابن جابر نے قسم کھائی کہ "میرے ذمّے یہ ایک بہتان ہے" مصحفی نے بآوازِ بلند کہا "جو لوگ اس واقعہ کا علم رکھتے ہوں اُن سے میں قسم دلا کر پوچھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟" اس پر وزیر ابن عباس نے کہا "جو کچھ تم نے کہا اس میں سے کچھ صحیح بھی ہے، اس وقت حالات ایسے ہیں کہ ان گذری ہوئی باتوں کا جتانا ہمیں زیبا نہیں ہے" مصحفی نے کہا "یہ تم سچ کہتے ہو، لیکن ابن جابر پر مجھ کو صبر نہ رہا، اور مجبور ہو کر جو کچھ دل میں تھا وہ زبان پر آ گیا"

دوسرا وزیر ابن جوہر نامی اس قصّہ کو سُنتا تھا، اور اُس کا غصّہ تیز ہوتا جاتا تھا، مصحفی سے اُس کو محبت نہ تھی، اور دل کے ساتھ وہ بھی مصحفی کو تباہ کرنے پر رضامندی ظاہر کرنے لگا تھا، لیکن اتنا ضرور جانتا تھا کہ دشمن کی بھی عزت کرنی چاہیئے۔ بالخصوص ایسے دشمن کی جو مغلوب ہو چکا ہو، چنانچہ اُس نے ابنِ جابر سے ایسے تحکمانہ لہجے میں جو ابن عباس کو بوجہ قدیم ملازم سلطنت اور شرافتِ نسب میں تقریباً خلیفۂ وقت کے برابر ہونے کے زیب دیتا، کہا "ابنِ جابر! کیا تمہیں علم نہیں ہے کہ جن لوگوں پر خلیفہ کا عتاب ہوتا ہے وہ ارکانِ سلطنت کو سلام کرنے کے مجاز نہیں ہوتے، وجہ اُس کی صاف ہے، اگر ارکانِ سلطنت نے اُن کے سلام کا جواب دیا تو خلیفہ کے تقصیر دار ہوئے، اور اگر جواب نہ دیا تو خدا کی جناب میں خطا دار ٹھیرے، ایک شخص جو بے عزت کیا گیا ہے اُس پر فرض نہیں ہے کہ وہ عمائد سلطنت کو سلام کرے، مصحفی اس بات سے واقف ہے"

وزیر ابن جوہر کی یہ گفتگو سُن کر ابن حجابہ نادم ہوا اور پھر کچھ نہ بولا، اور مصحفی کی بے آب آنکھوں میں خوشی کی ایک خفیف سی جھلک پیدا ہوئی۔

اب مصحفی پر مقدمہ شروع ہوا، جب مزید جرمانہ کرنے کے لئے مصحفی پر نئے نئے الزام لگائے جانے لگے تو مصحفی نے کہا "مجھ سے جیسی چاہے قسم لے لو کہ اب جرمانہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں ہے، اگر تم مجھے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دو گے تب بھی جرمانہ دینے کو میرے پاس ایک درہم نہ نکلے گا"۔ عدالت نے قیدی کی بات کا یقین کیا اور مصحفی قید خانے واپس کر دیے گئے۔

اب مصحفی کی حالت یہ تھی کہ کبھی قید خانے بھیج دئے جاتے تھے اور کبھی رہا کر دئے جاتے تھے، ہر طرح سے حالت سخت مصیبت کی تھی، ابنِ ابی عامر کو ان کی ایذا رسانی میں ایک وحشیانہ خوشی حاصل ہوتی تھی، مصحفی کے ساتھ جن کی حیثیت اب ایک معمولی آدمی کی تھی اور جو دنیا میں اب کسی متنفس کو نقصان نہ پہنچا سکتے تھے، ابنِ ابی عامر کو کیوں ایسی سخت عداوت تھی؟ اس کا اصلی سبب دریافت کرنا مشکل ہے، ممکن ہے کہ قتلِ مغیرہ میں مصحفی کا ابنِ ابی عامر کو مجبور کرنا کہ اُس میں شریک ہو مصحفی کا ایسا فعل ہو جسے ابنِ ابی عامر معاف نہ کر سکتا ہو۔

بہرکیف جو کچھ بھی ہو ابن ابی عامر جہاں کہیں جاتے مصحفی کو اپنے ساتھ رکھتے، معمولی ضروریاتِ زندگی سے بھی اُن کو محروم کر دیا تھا، ابنِ ابی عامر کا ایک کاتب بیان کرتا ہے کہ شمال کے عیسائیوں سے ایک لڑائی میں ابنِ ابی عامر کے خیمے کے پاس مصحفی بیٹھے تھے اور پیٹ بھرنے کو پانی میں آٹا گھلا ہوا پی رہے تھے، یہ غذا بہترین میسّر ہوئی تھی جو اُن کا

لہ نفح الطیب میں محمد بن اسمٰعیل کاتب منصور کی زبانی بیان ہوا ہے کہ "منصور مصحفی کو لڑائیوں میں اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے، اتفاق سے ایک مرتبہ جلیقیہ کے مقابلہ میں ایک مہم گئی ہوئی تھی، ایک رات منصور نے حکم دیا کہ کوئی شخص آگ نہ جلائے، تاکہ دشمن کو اسلامی فوج کے مقام کی اطلاع نہ ہو، واللہ میں نے دیکھا کہ مصحفی کے بیٹے عثمان نے کچھ آٹا لے کر پانی میں گھولا اور سدِ رمق کے لئے ان کو پلایا"۔ پانی میں آٹا گھول کر پلانے کی وجہ یہ تھی کہ آگ جلانے کی ممانعت کی وجہ سے روٹی پکا کر نہ دے سکتے تھے (مترجم)

بیٹا عثمان باپ کے لئے حاضر کر سکتا تھا۔

رنج اور مایوسی نے مصحفی کو گھلا دیا تھا، وہ نہایت پُر درد اور مؤثر اشعار میں اپنی اس حالتِ زار کو بیان کیا کرتے تھے، اور داروغہ مجالس سے کہہ چکے تھے کہ میں ہر وقت موت کا منتظر ہوں، لیکن اس حال میں بھی وہ بہت دنوں زندہ رہے، جس طرح اقبال مندی کے زمانہ میں ناعاقبت اندیشی اور پست ہمتی طبیعت کا خاصہ رہی تھی، اسی طرح حالتِ زوال میں غیرت بھی کم ہوگئی، چنانچہ ابن ابی عامر کے سامنے جب ایک مرتبہ روباہ کہہ چکے تھے چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے عرضیاں پیش کرتے تھے، ایک مرتبہ عرضی دی کہ اپنے بچوں کے پڑھانے پر مجھے نوکر رکھ لو، ابن ابی عامر کو خیال ہوا کہ اس میں کوئی چال ہے، مصحفی ابھی دنیا میں اتنا بے عزت نہیں ہوا ہے کہ ایسی درخواست کرے، اس کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ میری نیک نامی میں فرق پیدا کرے اور لوگوں پر ثابت کرے کہ میں سخت احمق ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ مصحفی کی ڈیوڑھی پر حاضر رہا کرتا تھا، ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جنہوں نے مجھے اس حال میں دیکھا تھا، اب مصحفی کی یہ درخواست کہ میرے صحن میں بیٹھ کر لڑکے پڑھائے، اس لئے ہے کہ اس کی ذلت کی حالت کو دیکھ کر لوگ میری ذلت کا زمانہ یاد کریں۔

مصحفی پانچ برس تک اس مصیبت اور ذلت کی حالت میں زندہ رہے، سخت جانی کا یہ حال ہوا کہ بیمار پڑ کر نہ مرے، موت بھی آئی تو پھانسی یا زہر کے ذریعہ سے آئی، مورخوں کو اس میں اختلاف ہے کہ گلا گھونٹ کر مارے گئے یا زہر دیا گیا۔

ابن ابی عامر نے جب سنا کہ پرانا حریف مرگیا، تو اپنے دو کاتبوں کو حکم دیا کہ میت کی تجہیز و تکفین کا انتظام کریں، ان میں سے ایک کاتب محمد بن اسماعیل نامی نے مصحفی کو آخری منزل پہنچانے کا حال چشم دید اس طرح لکھا ہے:۔

"لاش سے کوئی علامت ایسی ظاہر نہ ہوتی تھی کہ موت کسی خارجی صدمہ سے ہوئی ہے ایک بوسیدہ و دریدہ قبا جو کسی دربان کی تھی لاش پر پڑی تھی، میرے ساتھی محمد بن مسلمہ نے ایک آدمی بھیج کر غسال کو بلوایا، یہ واقعہ میں صحیح بیان کرتا ہوں کہ کواڑ کے ایک پٹ پر جو چول سے ٹوٹ

جانے سے گر پڑا تھا مُردے کو غسل دیا گیا، جب جنازہ لے کر چلے تو صرف مسجد کا امام جسے نمازِ جنازہ پڑھنے کو بُلایا تھا، ساتھ تھا۔ کسی راہگیر کا جنازے کے ساتھ چلنا تو کجا! کوئی جنازے کی طرف دیکھنے کی بھی ہمت نہ رکھتا تھا، زمانہ کی یہ گردش دیکھ کر میں نے عبرت ناک سبق حاصل کیا، ایک دن جب کہ مصحفی امر و نہی کے مالک تھے میں نے چاہا تھا کہ خود قریب جا کر ایک عرضی پیش کروں، چنانچہ جدھر سے مصحفی کی سواری گذرنے والی تھی میں وہاں جا کر کھڑا ہو گیا، جب سواری آئی تو ایک جم غفیر اُن کے ساتھ تھا، اور راستے میں جو لوگ اُن کو قریب سے دیکھنا یا سلام کرنا چاہتے تھے وہ اس کثرت سے تھے کہ باوجود سخت کوشش کے میں اُن تک نہ پہنچ سکا، اور ایک کاتب کو جو اُن کی سواری کے قریب عرضیاں لینے کے لئے گھوڑے پر سوار تھا میں نے اپنی عرضی دے دی جب مصحفی کو دفن کر کے گھر واپس آیا تو اُس دن کا اور آج کے دن کا مقابلہ کرنے لگا، تقدیر کی گردشوں کے خیال سے دل بیٹھنے لگا، اور میں نہایت افسردہ اور غمگین ہو گیا۔"

اسناد:-

ابن الابار ص ۱۴۱ تا ۱۴۲

ابن عذاری ج ۲ ص ۲۶۸، ۲۷۱، ۲۸۲ تا ۲۹۱

نویری ص ۴۷۰

مقری ج ۱ ص ۳۹۵ تا ۳۹۶، ۲۷۵، ۲۷۶

ج ۲ ص ۶۰ تا ۶۲

کتاب ثالث

خلافت

نویں فصل

المنصور

(۷۸۶)

جس دن مصحفی حاجب کے منصب سے معزول ہو کر گرفتار ہوئے اور ابن ابی عامر ترقی پا کر حاجب کے درجے پر پہنچے۔ اسی دن سے ابن ابی عامر اور غالب جن کی بیٹی سے ابن ابی عامر نے شادی کی تھی، مل کر سلطنت کا انتظام کرنے لگے۔ ابن ابی عامر کے اختیارات اب اس قدر وسیع ہو گئے تھے کہ ان کی مخالفت کرنی دیوانگی کے برابر تھی، مگر باوجود اس کے مخالفت کی گئی۔ شروع میں جس فریق کی خواہش تھی کہ خلیفہ حکم کا کم سن لڑکا ہشام تخت نشین نہ ہو بلکہ ہشام کا چچا تخت پر بیٹھے، وہ اب تک موجود تھا، اور جوذر صقلبی بدستور اس فریق کا سردار تھا۔ قرطبہ کے گلی کوچوں میں باوجود پولیس کی نگرانی کے ہجویہ اشعار لوگوں کی زبانوں پر ایسے جاری تھے جن سے اس مخالف فریق کے موجود ہونے کا کافی ثبوت ملتا تھا۔ ابن ابی عامر کے جو مراسم اور تعلقات سیدہ صبح سے

تھے، اور یہ تعلقات بہت قریب کے بتائے جاتے تھے۔ اُن کی طرف کوئی شخص اشارہ کرتا تھا تو ابنِ ابی عامر کو سخت ناگوار ہوتا تھا، چنانچہ جب ایک شخص نے اپنی کنیز کو جو گانا اچھا جانتی تھی کچھ اشعار جن کا موضوع سیّدہ صبح تھیں سکھا کر اس خیال سے پیش کیا کہ کنیز کے دام اچھے اٹھائے گا، تو ابنِ ابی عامر نے اُس لونڈی کو قتل کرا دیا، باوجود اِس کے لوگ گلیوں اور سڑکوں پر اس قسم کے بازاری اور فحش اشعار گاتے ہوئے نکلتے تھے:-

"دُنیا کا خاتمہ قریب ہے، تباہی آن پہنچی ہے اگناہوں کا زور ہے اخلیفہ بچہ ہے، اور دو عاشق بچّے والی میں حصّہ لگے ہوئے ہیں"[1]

جو لوگ دربارِ خلافت کی مذمت کرتے تھے اُن کو کوئی خطرہ نہ تھا۔ لیکن جوذر نے اِس سے بھی آگے قدم بڑھایا، قاضی عبدالملک بن منذر سے مل کر ایک سازش کی، جس کی غرض یہ تھی کہ نوعمر خلیفہ ہشام کو قتل کر کے عبدالرحمٰن الناصر کے ایک دوسرے پوتے کو جس کا نام عبدالرحمٰن (بن عبید اللہ بن عبدالرحمٰن الناصر) تھا مسندِ خلافت پر بٹھا

---

[1] پروفیسر ڈوزی یہاں علامہ مقری کی عبارت کا نہیں بلکہ زیادہ تر ابنِ عذاری کی تحریر کا پابند معلوم ہوتا ہے، علامہ مقری نے لکھا ہے کہ سیّدہ صبح کو ابنِ ابی عامر کے ساتھ "غلط طور پر متہم کیا جاتا تھا، یہ لوگوں کا بہتان تھا" دوسرا عاشق قاضی ابن سلیم کو بتایا جاتا تھا۔ ابنِ عذاری نے جو اشعار لکھے ہیں اُن میں کوئی جملہ ان لوگوں کی صفائی میں نہیں لکھا۔ وہ اشعار یہ ہیں:-

اِقْتَرَبَ الوَعْدُ وَحَانَ الهَلَاكُ	وعدہ اجل قریب آگیا اور ہلاکت میں آسانی ہو گئی
وَكُلُّ مَا تَحْذَرُهُ قَدْ أَتَاكَ	جن چیزوں سے تم بچتے اور ڈرتے ہو وہی سامنے آگئیں
خَلِيفَةٌ يَلْعَبُ فِي مَكْتَبٍ	خلیفہ ایسا ہے کہ مکتب میں کھیل رہا ہے
وَأُمُّهُ حُبْلَى وَقَاضٍ نَيَاكَ	اور اُس کی ماں حاملہ ہے اور قاضی .....

مقری میں یہ مضمون کتابِ اوّل کے صفحہ ۳۹۶ پر، اور ابن العذاری کی دوسری جلد میں صفحہ ۳۰۰ پر آیا ہے۔ (مترجم اُردو)

دیا جائے، اس سازش میں بہت سے قاضی اور فقیہہ اور عالم مع مشہور شاعر رمادی کے شریک تھے، رمادی اُن لوگوں میں سے تھے جو مصحفی کے زمانۂ عروج ختم ہونے کے بعد بھی مصحفی کے دوست رہے، مگر ابن ابی عامر سے اس شاعر کو جانی دشمنی تھی، اور ہر وقت انتقام کی آگ اُس کے دل میں سلگتی رہتی تھی، چنانچہ اُس نے ابن ابی عامر کی ہجو میں بعض نظمیں نہایت سخت لکھی ہیں۔

اہل سازش کو اپنی کامیابی کا اس لئے یقین تھا کہ وزیر زیاد ابن افلح جو اس وقت عامل قرطبہ تھا وہ بھی سازش میں شریک تھا، اسی ابن افلح سے مشورہ کرکے قتل کا دن اور مقام طے کیا گیا تھا، جوذر گو اب درباریوں میں نہ تھا مگر اپنے منصب کے اعتبار سے خلیفہ تک اُس کی رسائی ہر وقت ممکن تھی، اس لئے قتل کرنے کا کام اُس کے سپرد ہوا، اور یہ فیصلہ کر لیا کہ قتل کے بعد ہی عبدالرحمٰن کی خلافت کا اعلان کر دیا جائے گا۔

یوم مقررہ کو جونہی زیاد ابن افلح عامل شہر مع اپنے ملازمین کے قصر خلافت سے نکل کر اپنے گھر گیا جو شہر میں کسی دُور کے محلّے میں تھا، جوذر نے خلافت پناہی کے حضور میں باریابی کی اجازت چاہی، اجازت عطا ہوئی، خلیفہ کے کمرے میں پہنچتے ہی جوذر نے چاہا کہ تلوار کا ایک ہاتھ ہشام پر لگائے، لیکن جوذر وار نہ کرنے پایا تھا کہ ایک شخص ابن عروس جو اتفاق سے ہشام کے قریب تھا جوذر کو لپٹ گیا، اب دونوں میں کشتی ہونے لگی، اس کشمکش میں جوذر کے کپڑے پھٹ گئے، ابن عروس نے فوراً سپاہیوں کو آواز دی اور جوذر گرفتار کر لیا گیا۔

زیاد ابن افلح اتنا سنتے ہی کہ معاملہ بگڑ گیا ہے، دوڑا ہوا قصر خلافت میں آیا، زیاد کو ابن عروس نے اُس کی غفلت پر بہت سخت و سست کہا، بلکہ یہاں تک صاف صاف کہہ دیا کہ جوذر کے جرم میں زیاد کی بھی شرکت ہے، عامل شہر زیاد نے اپنی غفلت کے متعلق بہت سے عذر اور اپنی خیر خواہی کے ثبوت میں بہت سی دلیلیں پیش کیں، اور اپنی طرف سے شبہ رفع کرنے کے لئے جس قدر لوگ مشتبہ تھے انہیں گرفتار کر کے مع جوذر کے مدینۃ الزہرا کے جیل خانے میں بھیج دیا۔

باغیوں کا مقدمہ بلا توقف شروع ہوا اور بہت جلد تجویز سُنادی گئی، عبد الملک بن منذر پر جو عدالتِ مرافع کا صدر رہ چکا تھا بغاوت کا جرم ثابت ہوگیا، لیکن جرم کی سزا قاضیوں نے خود نہیں تجویز کی، صرف اتنا کہا کہ مقدمہ قرآن کی اس آیت کے تحت میں آتا ہے اِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (سورۂ مائدہ، رکوع ۵) ترجمہ: "جو لوگ اللہ اور اُس کے رسول سے لڑنے اور فساد پھیلانے کی غرض سے ملک میں دوڑے دوڑے پھرتے ہیں، اُن کی سزا تو بس یہی ہے کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر قتل کر دیئے جائیں، یا اُن کو سُولی دی جائے، یا اُن کے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کاٹ دیئے جائیں، یا اُن کو دیس نکالا دیا جائے" چونکہ یہاں مختلف سزائیں بیان ہوئی تھیں اس لئے عدالت نے اس امر کی تجویز کہ کون سی سزا دی جائے خلیفہ کی رائے پر چھوڑی، ہشام چونکہ امورِ سلطنت میں دخل نہ رکھتے تھے اس لئے (۴۴ سزا کا فیصلہ مجلسِ حکومت کی مرضی پر رہا، زیاد ابن افلح جو اس مجلس کا رُکن تھا اور بہت چاہتا تھا کہ ابنِ ابی عامر کو اپنے اُوپر پھر مہربان کرے پہلا شخص تھا جس نے عبد الملک بن منذر کے لئے ان سزاؤں میں سے سخت ترین سزا تجویز کی، چنانچہ سزا منظور کی گئی اور عبد الملک کو سُولی پر چڑھا دیا گیا، عبد الرحمٰن بن عبید اللہ بن الناصر جسے اہلِ سازش نے خلیفہ بنانا چاہا تھا وہ بھی قتل کر دیا گیا، یہ معلوم نہ ہوا کہ جوذر کی نسبت کیا حکم ہوا لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ اُسے بھی سُولی کی سزا ملی ہوگی، شاعر رمادی کی قسمت گو ایسی تو نہ رہی کہ جس کی کوئی تمنا کرتا، مگر پھر بھی قابلِ برداشت تھی، ابنِ ابی عامر نے اُسے جلاوطن کرنا چاہا لیکن اس شاعر کے دوستوں نے منت سماجت کر کے اُسے قرطبہ میں سکونت رکھنے کی اجازت دلوا دی، مگر اس کے ساتھ ہی شہر میں منادی ہوئی کہ کوئی آدمی رمادی سے بات نہ کرے جو کوئی ایسا کرے گا اُسے سخت سزا دی جائے گی، رمادی کو اب ہر وقت چُپ رہنا پڑا[1]، ایک

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس شاعر کا قصور بعد میں معاف ہوگیا تھا، کیونکہ ۳۷۶ھ/۹۸۶ء میں جو شعراء برشلونہ کی مہم میں ابنِ ابی عامر کے ساتھ گئے تھے اُن میں رمادی بھی تھا۔

عرب مصنف لکھتا ہے کہ "قرطبہ کے بازاروں میں جہاں کثرت سے لوگ ہوتے تھے، رمادی اس طرح نظر آتا تھا جیسے کوئی مُردہ چل رہا ہو۔"

اس سازش سے ثابت ہو گیا کہ اس وقت ابنِ ابی عامر کے سب سے بڑے دشمنوں میں وہ لوگ تھے جن کے ساتھ زمانۂ طالب علمی میں ابنِ ابی عامر ادب اور فقہ پڑھا کرتا تھا، اس دشمنی کا سبب کسی قدر رشک وحسد بھی تھا، کل کی بات تھی کہ یہی ابنِ ابی عامر اُن کا ہم مکتب اور برابر کا درجہ رکھنے والا آدمی تھا مگر آج اُسے ایسا عروج ہوا کہ علماء و فقہاء کو اُس سے رشک پیدا ہو جانا کوئی عجیب بات نہ تھی، لیکن رشک وحسد کی وجہ صرف یہ عروج نہ تھا، اور نہ یہ عروج رشک وحسد کی سب سے بڑی وجہ تھا، عالموں کی نظروں میں ابنِ ابی عامر کے گر جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ علماء اُس کو مذہب کی طرف سے غافل اور بے پروا سمجھنے لگے تھے، قرطبہ کے علماء کے سامنے جن لوگوں نے زانوئے ادب طے کیا تھا اُن میں بجز چند شائقینِ فلسفہ اور کچھ آزاد خیال لوگوں کے سب نہایت راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، ابنِ ابی عامر صحیح یا غلط طور پر ایسا آدمی سمجھا جاتا تھا جو اسلام کا زیادہ پابند نہ تھا، مخالفوں سے یہ تو ممکن نہ تھا کہ مذہب کے متعلق ضعیف خیالات رکھنے کا الزام اُس پر علانیہ عائد کر دیتے لیکن اُنھوں نے اس مسئلہ پر بحث چھیڑ دی کہ کیا ابنِ ابی عامر فلسفہ اور حکمت کے شائق نہیں ہیں؟ فلسفہ پڑھنا اُس زمانہ میں بڑا جرم سمجھا جاتا تھا، ابنِ ابی عامر اس بات سے خوب واقف تھے، اُن کے فلسفی ہونے نہ ہونے میں تو کلام ہو سکتا ہے، مگر اس میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں کہ فطرۃً وہ ایک مدبرِ سلطنت تھے، دشمنوں کا اعتراض کہ وہ فلسفہ سے رغبت رکھتے ہیں، ایسا اعتراض تھا جو ضرور ایک نہ ایک دن اُن کی تباہی کے لئے مخالفوں کی طرف سے اٹھایا جانا تھا، پس اس اعتراض کو رفع کرنے کے واسطے انھوں نے ارادہ کر لیا کہ کوئی کام نہایت صحیح عقیدت مندی کا ایسا کرنا چاہیئے کہ سر کار کا پکا مسلمان ہونا تمام دشمنوں پر ثابت ہو جائے۔

چنانچہ ابنِ ابی عامر بناہ بن ذکوان اور زبیدی وغیرہ چند عالموں کو جو اُس وقت بڑی شہرت رکھتے تھے طلب کر کے خلیفہ مستنصر باللہ کے کتب خانے میں لائے اور ۹۱ھ

وہاں ان بزرگوں سے کہا کہ "فلسفہ اور ہیئت اور اسی قسم کی جس قدر کتابیں ایسی ہوں کہ اُن کا پڑھنا از روئے مذہب دُرست نہ ہو اُن سب کو تلف کر دینے کا میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے، اب آپ اس قسم کی زہر آلودہ کتابوں کو چُن کر علیحدہ کر دیں" علماء سُنتے ہی اس کام میں مصروف ہو گئے،

جب کتابیں علیحدہ کر دی گئیں تو حاجب ابنِ ابی عامر نے اُن کے جلائے جانے کا حکم صادر کیا، اور اپنے خوش عقیدہ ہونے کے ثبوت میں بہت سی کتابیں خود اپنے ہاتھ سے آگ میں جھونک دیں۔

یہ فعل اگرچہ علم کو برباد کرنے کا تھا، اور ابنِ ابی عامر جیسا روشن ضمیر اس بات کو اچھی طرح سمجھتا بھی تھا، لیکن جو کچھ بھی ہو کتابیں جلا ڈالنے کا اثر فقہا اور عام لوگوں پر بہت اچھا ہوا، اور اس وجہ سے اور بھی اچھا ہوا کہ اُس دن سے ابنِ ابی عامر فلسفے کے دشمن اور مذہب کے حامی ہو گئے، واعظوں کی بیجا عزت کر کے طرح طرح کی عنایات اُن پر کرنے لگے، اُن کے وعظ و تلقین کو خواہ وہ اُن میں کتنا ہی طول پیدا کرتے بہت صبر اور توجہ سے سنتے، نیز اپنے قلم سے کلام مجید لکھا اور ہمیشہ سفر میں اُسے اپنے ساتھ رکھا۔

اس طرح راسخ الاعتقاد مسلمان ہونے میں شہرت پیدا کر کے، اور اس شہرت کو ایسی پختہ بنیاد پر قائم کر کے کہ آئندہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ ہو ابنِ ابی عامر نے اب ہشام کی طرف توجہ کی، کیونکہ ہشام اب جوان ہو کر اس قابل ہو چلے تھے کہ اُن سے خوف کیا جاتا۔

علامہ زبیدی اتالیقِ ہشام کا بیان ہے کہ ہشام بچپن میں بہت ذہین اور ہوشیار معلوم ہوتے تھے، علم جلد اور آسانی سے سیکھتے تھے، قوتِ فیصلہ ایسی تیز تھی جو اور بچوں میں کم پائی جاتی تھی، لیکن جب بالکل ہی نوعمر آدمی میں باپ کی جگہ تخت پر بیٹھے تو اُن کی ماں سلطانہ صبح اور ابنِ ابی عامر نے اُن کے قوائے عقلیہ کو کمزور کرنے میں مسلسل کوشش کی، یہ کہنا کہ ان لوگوں نے ہشام کو چونکہ ہر وقت ہوا و ہوس میں منہمک کرا دیا دُرست نہیں ہے، یہ خیال بعد میں اس وجہ سے پیدا ہوا کہ ہشام لاولد مرے

تھے، لیکن کوئی شہادت اِس امر کی کہ وہ عیاش بنا دیئے گئے تھے موجود نہیں ہے، گو یہ سچ ہے کہ اُن کی عقل و ذہانت کو حتی الامکان مذہبی امور کی پابندی ہی میں مصروف کر کے دُنیا کے کام کا اُن کو نہ رکھا تھا، اور اُن کے دل پہ یہ بات نقش کر دی تھی کہ اگر سلطنت کے کاروبار اپنے ہاتھ میں لیئے تو پھر دین کی طرف سے طبیعت ہٹ جائیگی، جس سے عاقبت کے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

سلطانہ صبح اور ابنِ ابی عامر کو ان کوششوں میں کسی قدر کامیابی ہوئی، ہشام نیک کاموں میں مصروف ہوئے، قرآنِ مجید کی تلاوت نہایت ذوق و شوق سے کرتے، نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے، لیکن باوجود ان سب باتوں کے اُن کی عقل و ذہانت اتنی کم نہ (۷۹۲)
ہوئی تھی کہ ابنِ ابی عامر اُن سے خوف نہ کرتے، ابنِ ابی عامر کو ہر وقت اِس کا ڈر تھا کہ کہیں کوئی شخص اِس نوجوان کی طبیعت پہ قابو حاصل کر کے اصلی حالات سے اُسے آگاہ نہ کر دے۔

جب تک امورِ سلطنت خلیفہ ہشام کے قصر میں طے پاتے تھے یہ خوف ابنِ ابی عامر کے دل سے دُور نہ ہو سکتا تھا۔ متعدد افسرانِ فوج و دیوانی ہر وقت قصرِ خلافت میں آمد و رفت رکھتے تھے اور ایسا اتفاق جلد پیدا ہو سکتا تھا کہ اُن میں سے کوئی نہ کوئی خلیفہ کے مزاج میں دخل پیدا کر لے، اگر ایسا آدمی قابل اور جاہ پرست ہوا تو وہ چشم زدن میں ابن ابی عامر کو تباہ کر دے گا۔ پس اِس خوف کو دُور کرنا ضروری ہوا، اور ابنِ ابی عامر نے یہ طے کر لیا کہ سلطنت کے تمام کاروبار قصرِ خلافت سے باہر کہیں انجام پانے چاہیئیں، اِس خیال سے اُنہوں نے ایک نیا شہر قرطبہ سے مشرق میں وادی الکبیر کے کنارے بنوانا شروع کر دیا، اِس شہر میں ایک عالیشان قصر اپنے لئے اور باقی محل دیگر ارکانِ سلطنت کے لئے تیار کرائے، شہر کا نام مدینۃ الزہرہ رکھا، دو برس میں اِس کی تعمیر ختم ہوئی، اور تیاری پر تمام سرکاری دفاتر اِس میں منتقل کر دیئے گئے۔

مدینۃ الزاہرہ کی شہر پناہ کے اندر آبادی بہت جلد بڑھ گئی، بڑے بڑے لوگ قرطبہ سے اُٹھ کر نئے شہر میں آن بسے، تاکہ اُس شخص کے قریب رہیں جو اِس وقت مرجع

خاص وعام تھا، طبقۂ اعلیٰ کے لوگوں کے بعد اس شہر میں تاجر آکر آباد ہونے شروع ہوئے، یہاں تک کہ مدینۃ الزاہرہ کی آبادی اتنی بڑھی کہ اس کے بیرونی حصے بڑھتے بڑھتے بہت جلد قرطبہ کے مضافات سے آملے۔

اب خلیفہ ہشام پر پوری نگرانی اور معاملات سلطنت سے انہیں بے سروکار رکھنا بہت آسان ہوگیا، ابن ابی عامر نے اس کے علاوہ اور تدبیریں بھی ایسی کیں کہ خلیفہ ہشام کو امورِ سلطنت سے مطلق تعلق نہ رہے، ہشام جس قصر میں رہتے تھے اس پر سپاہی اور دربان متعین کرنے کے ماسوا تمام قصر کے گرد دیواریں اور دیواروں سے ملی ہوئی خندقیں تیار کرادیں جو شخص ان کے قریب جاتا اُسے سزا دی جاتی۔

اس کل اہتمام کے بعد خلیفہ ہشام کی حالت بالکل ایک قیدی کی سی ہوگئی، قصر سے باہر قدم نہیں نکال سکتے تھے، اُن کی ہر بات اور ہر نقل وحرکت کی خبر ابن ابی عامر کو دی جاتی تھی، رعایا کے متعلق جو کچھ ابنِ ابی عامر خلیفہ کی خدمت میں عرض کر دیتے تھے اُس کے سوا انہیں کسی بات کی اطلاع نہ ہوتی تھی۔

چونکہ اس پر بھی احتیاط کی ضرورت تھی، اس لئے ابنِ ابی عامر نے مشہور کرایا کہ خلیفہ ہشام نے عنانِ حکومت اُن کے سپرد کردی ہے تاکہ خود یادِ الٰہی میں زیادہ توجہ کے ساتھ مصروف رہیں، لیکن بعد میں جب اپنی کامیابی کا پورے طور پر اطمینان ہوگیا، تو ہشام کی مطلق پروا نہ رکھی، بلکہ خلیفہ کا نام تک لینے کی ممانعت کردی۔

اسی زمانہ میں ابن ابی عامر نے ایک اور تدبیر سوچی جو سلطنت کے لئے نہایت بکار آمد تھی، یعنی انہوں نے فوج کی از سرِ نو تنظیم کرنی چاہی۔

دو بڑے مقاصد تھے جن کی بنا پر انہوں نے فوجی تنظیم کرنی چاہی، ایک[1] قومی مفاد، دوسرے[2] اپنا ذاتی فائدہ۔

اس خواہش سے کہ اسپین کا شمار بھی یورپ کی بڑی سلطنتوں میں ہونے لگے، انہوں نے پہلے اپنے ساتھی غالب کو اُس کی جگہ سے ہٹانا چاہا، فوجی انتظام اس وقت جو کچھ تھا، اس میں شک نہیں کہ وہ ناقص تھا، سردارانِ جُند کے اختیارات بہت بڑھے ہوئے (۳۹۳)

تھے،؎ اور جو سپاہ خاص خلیفہ کے تحت میں تھی وہ بہت کم تھی، یہ سچ ہے کہ خلیفہ اپنے حکم سے نہ صرف جُند کے رسالوں کو بلکہ سرحد کی افواجِ سوارہ کو بھی طلب کر سکتا تھا مگر عام دستور یہی تھا کہ جب تک شدید ضرورت نہ ہو سرحد کی فوجیں جو فوجوں میں بہترین تھیں اپنی جگہ سے نہ ہٹائی جائیں، سرحد کی فوجوں کے بعد جس قدر فوجیں باقی رہتی تھیں اُن میں صرف پانچ ہزار سوار تھے، حالانکہ فوج میں سواروں کے رسالے نہایت ضروری تھے کیونکہ لڑائیوں کا فیصلہ اُنہی پر مبنی تھا، اِس قلیل فوجِ سوارہ میں بہت سی باتیں اصلاح طلب تھیں، ابنِ حوقل لکھتا ہے کہ "اندلس کے سوار جن کے پاؤں رکاب میں نہیں ہوتے، گھوڑوں کی پیٹھ سے پاؤں لٹکائے رکھتے ہیں، اور یہ بات بہت بُری معلوم ہوتی ہے، اسپین کے سپہ سالاروں نے ہمت و مردانگی سے نہیں بلکہ حیلوں اور ترکیبوں سے فتوحات حاصل کی ہیں"

ابنِ حوقل نے جو کچھ لکھا ہے اُس کا بجنسہٖ یقین کر لینا درست نہیں، کیونکہ اندلس کے حالات لکھنے میں اُس کی غرض یہ تھی کہ اُس کا آقا یعنی فاطمیوں کا خلیفہ جزیرہ نمائے اسپین کو فتح کرے، یہی وجہ ہے کہ اسپینی فوج کی اُس نے بہت مذمت کی ہے، مگر باوجود اس کے اُس کا اعتراض کسی قدر درست بھی ہے، اور اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عیش و عشرت میں پڑ کر اور موسم کے اثر سے کمزور ہو کر اسپین کے عربوں کی شجاعت اور ہمت میں کمی آ چلی تھی ابنِ ابی عامر ایسی فوج سے ملک گیری میں ترقی کرنے کی اُمید نہ رکھ سکتا تھا، اس کے علاوہ اُس کو بھروسا تھا کہ اُس فوج سے جو خلیفہ کے تحت میں تھی وہ غالب کی سرحدی فوج پر حملہ کر سکتا ہے، اور اس حملے کا پیش آنا ایک نہ ایک دن ناگزیر معلوم ہو رہا تھا، غالب نے ابنِ ابی عامر کی اُس وقت بہت مدد کی تھی جب کہ وہ مصحفی کو اُس کے مرتبے سے گرانا چاہتا تھا، مصحفی کا جب تنزل پیش آ گیا تو اب غالب، ابنِ ابی عامر کے کسی کام کا نہ رہا، بلکہ ترقی کی راہ میں مخل نظر آیا۔

غالب، ابنِ ابی عامر کی بعض باتوں کو بہت ناپسند کرتا تھا، خلیفہ ہشام کو جس طرح

؎ دیکھو ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" مطبوعہ ۱۸۸۱ء جلد ا ص ۸۰ تا ۸۲

اُس نے قید میں کر رکھا تھا، وہ غالب کو سخت ناگوار تھا، غالب چونکہ خلیفہ الناصر کا مولی
اور سلاطینِ بنی امیہ کا وفادار خادم تھا، اس لیے اُس کو یہ دیکھ کر افسوس کے ساتھ غصہ بھی
آتا تھا کہ اُس کے آقائے مرحوم کا پوتا کس طرح ایک مجرم کی طرح حالتِ اسیری میں زندگی بسر
کر رہا ہے۔

ابن ابی عامر کی حالت یہ تھی کہ جہاں کسی نے ایک مرتبہ اُس کی مخالفت کی، پھر وہ ہمیشہ
کے لئے اُس کا دشمن ہو جاتا تھا، چنانچہ اب یہ دیکھتے ہی کہ غالب اُس کا مخالف ہو
گیا ہے وہ غالب کو ختم کرنے کی فکر میں ہوا، تردد صرف یہ تھا کہ اس کام کے لئے کون
سا طریقہ اختیار کرے۔

غالب، مصحفی تو تھا نہیں، کہ محض سازشیں اُس کا کام تمام کرنے کے لئے کافی ہو جاتیں
وہ ایک مشہور، شیر دل و جانباز سپاہی اور لڑائی کے میدانوں کا پرانا سورما تھا، اگر اُس نے
خلیفہ ہشام کو ابن ابی عامر کے پنجے سے نکالنے کا مصمم قصد کر لیا تو پھر اسپین کی کل فوج اُس
کی طرفدار ہو جائے گی، کیونکہ اہلِ فوج کا وہ چشم و چراغ تھا۔ ابن ابی عامر ان سب باتوں کو پہنچا
ہوا تھا، سمجھ گیا کہ اس کا علاج سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ ایک فوج ایسی مرتب کی جائے
جو ہمیشہ اُس کی ذات سے وابستہ رہے، اس فوج میں جو لوگ بھرتی کئے جائیں وہ باہر کے ۴۹
ملک کے ہوں، موریتانیہ (مغرب اقصیٰ) اور اسپین کے مسیحی علاقوں کی طرف اُس کی نظر گئی،
اور خیال ہوا کہ وہاں کے لوگوں سے فوج مرتب کی جا سکتی ہے۔

اب تک ابن ابی عامر نے موریتانیہ (مغرب اقصیٰ) کی طرف توجہ نہ کی تھی، جس زمانہ میں
وہ قاضی القضاۃ ہو کر مغرب میں ٹھیرا ہوا تھا، اُس وقت اُسے یقین ہو گیا تھا کہ جو علاقے
اسپین سے دور اور غیر آباد ہوں اُن پر حکومت رکھنے میں اسپین کا کوئی فائدہ نہیں ہے،
مصحفی کی بھی اُس وقت یہی رائے تھی، ابن ابی عامر نے اس رائے سے اتفاق کر کے صرف
سبتہ میں ایک بڑی فوج مقیم رکھنی کافی سمجھی، باقی تمام مغرب اقصیٰ کا انتظام اُسی ملک کے
رئیسوں کے سپرد کیا، اور ہر قسم کی مالی امداد سے اُن کو اپنا خیر خواہ بنائے رکھا۔

اسپین کے فائدے کے لئے یہ تدبیر اچھی تھی لیکن موریتانیہ (مغرب اقصیٰ) کے حق میں

اُس کے نتائج موجبِ تباہی ثابت ہوئے۔

یہ دیکھ کر کہ مغربِ اقصیٰ کو اب باہر سے مدد نہیں پہنچتی، حاکمِ افریقیہ بلکین نے ۳۶۹ھ / ۹۷۹ء میں مغربِ اقصیٰ پر حملہ کر دیا، بلکین کو فتح پر فتح حاصل ہوتی چلی گئی، اور والیانِ ریاست جو اُموی خلیفۂ اسپین کو بادشاہ تسلیم کرتے تھے، بھاگ کر سبتہ میں جمع ہو گئے، بلکین کی یہ فتوحات ابنِ ابی عامر کے منصوبے میں مخل نہ ہوئیں، بلکہ اُن سے مدد پہنچی،

جس وقت سبتہ میں یہ والیانِ ریاست اور اُن کے ہمراہی بربر کثرت سے اکٹھے ہو گئے تو اُن کی حالت سخت تکلیف کی ہو گئی، بلکین نے اُن کی تمام چیزوں پر قبضہ کر لیا تھا اور اب اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ضروریاتِ زندگی کو کہاں سے اور کیونکر مہیا کریں یہ وقت تھا کہ ابنِ ابی عامر کو اپنی فوج کے لیے عمدہ سوار مہیا کرنے کا اچھا موقع ملا، سبتہ میں جس قدر بربر تھے اُن کو ابنِ ابی عامر نے کہلا بھیجا کہ "اگر وہ اسپین میں آ کر فوجی خدمت قبول کریں گے تو پھر اُن کو کسی چیز کی کمی نہ رہے گی، اور تنخواہ بھی نہایت معقول دی جائے گی" یہ سُن کر بہت سے بربر نے اسپین میں فوجی ملازمت قبول کر لی، جعفر رئیسِ زاب جو دلاوری اور جوانمردی میں مشہور تھا اسپین میں چھ سو سواروں کا ایک رسالہ لایا، اور ابنِ ابی عامر کی ملازمت اختیار کی۔

غرض جس قدر بربر اُس وقت اسپین میں آئے وہ ہر طرح پر آسودہ حال ہو گئے، ابنِ ابی عامر نے اُن کے ساتھ بے مثل فیاضی کی۔ ایک عرب مورخ لکھتا ہے کہ "جب یہ بربر اسپین میں آئے تو اُن کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے، چیتھڑے لٹکتے تھے، گھوڑے ہڈیوں کے ڈھانچے تھے، لیکن تھوڑے ہی دنوں میں یہی بربر پُر تکلف لباس پہنے، تیز اور طرار گھوڑوں پر سوار بازاروں میں نظر آنے لگے، عالیشان حویلیاں اور مکان اُن کو رہنے کے لئے دیئے گئے۔" رفتہ رفتہ اُن میں حرص بڑھی اور ابنِ ابی عامر سے طرح طرح کی فرمائشیں کرنے لگے۔ مگر ابنِ ابی عامر اُنہیں بہت کشادہ دستی سے انعام و اکرام دینے سے کبھی نہ اُکتائے، اور بربر جس قدر ان کے شکر گذار ہوتے تھے اُسی قدر اُن کے دل پر اثر ہوتا تھا۔

(۸۹۵) ابنِ ابی عامر عوام کے طعن و تشنیع سے ان بربر کو بچاتے تھے، بربر ہمیشہ اپنی مادری زبان میں بات چیت کرتے تھے، اسپین کے عرب اُن کی بولی بالکل نہ سمجھتے تھے، جب بربر ٹوٹی پھوٹی عربی بولتے تو عرب اُن پر ہنستے، ابن ابی عامر کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے نو واردِ بربر کا مضحکہ اُڑانے کی سخت ممانعت کر دی۔

ایک دن ابنِ ابی عامر فوجِ بربر کا معائنہ کر رہے تھے کہ ایک بربر سردار جس کا نام وانَ زمار تھا سامنے آیا اور بہت غلط عربی میں کہنے لگا "آقا! میرا سوال یہ ہے کہ ایک مکان مجھے دیا جائے جہاں میں رہ سکوں، آج کل مجھے میدان میں سونا پڑتا ہے" ابن ابی عامر نے پوچھا "کیوں؟ یہ کیوں؟ کیا جو مکان ہم نے تمہیں دیا تھا وہ تم نے علیحدہ کر دیا؟" بربر نے جواب دیا "حضور ہی کی دی ہوئی نعمتوں نے مجھے اُس مکان سے نکال دیا، جاگیر میں جو وسیع اراضی حضور نے عطا فرمائی تھی اس کے اناج سے سارا گھر بھر گیا ہے، رہنے کو بالکل جگہ نہیں رہی، شاید حضور یہ فرمائیں کہ اگر اناج سے تمہیں یہ تکلیف پہنچی ہے تو اناج کو گھر سے نکال کر باہر پھینک دو، لیکن حضور جانتے ہیں کہ میں بربر ہوں جو تھوڑا زمانہ ہوا کہ بالکل محتاج و تنگدست حالتِ فاقہ کشی میں تھا، ایسا شخص اناج جیسی نعمت کو کیونکر گھر سے نکال کر باہر پھینک سکتا ہے؟" ابنِ ابی عامر نے ہنس کر کہا "ہم تمہیں اعلیٰ درجہ کا خطیب تو نہیں کہہ سکتا، لیکن تمہاری باتیں ہمارے عالموں کی بلیغ تقریروں سے کہیں زیادہ فصیح اور پُر اثر ہیں" اس کے بعد ابنِ ابی عامر اسپین کے لوگوں سے جو قریب کھڑے تھے، مخاطب ہوئے اور کہا "دیکھو ادائے مطلب اور حسنِ سوال کا طریقہ اس بربر سے سیکھو۔ یہ شخص جس کی باتوں کی تم ہنسی اڑاتے ہو، باوجود تمہاری شیریں بیانی کے اس وقت تم سب پر چھا گیا ہے، جو کچھ اس کو ہم سے ملا اُسے بھولا نہیں، تمہاری طرح نہیں ہے کہ انعام و اکرام پاتے بھی جاؤ اور حجت بھی کرتے جاؤ" یہ کہہ کر ابنِ ابی عامر نے وان زمار کو ایک عالیشان مکان سکونت کے لئے دیا۔

ابنِ ابی عامر نے جس طرح بربر کو اپنی فوج میں بھرتی کیا، اُس کا حال تو آپ نے

سُن لیا، اب اسپین کی عیسائی ریاستوں سے عیسائیوں کی بھرتی کا حال سُنیئے، ابن ابی عامر
نے عیسائیوں کو بھی رسالوں میں نوکر رکھا، لیون، قشتالیہ اور نبرہ کے عیسائی مفلس
اور تنگ دست، لالچی اور طامع تھے، قومی غیرت اُن میں نہ تھی، اچھی تنخواہوں کی طمع میں
انہوں نے مسلمانوں کی فوجی ملازمت قبول کرلی[1]، اور اسلامی عَلَم کے سایہ میں آتے ہی ابن
ابی عامر کی فیاضی، لطف و کرم، اور عدل و انصاف سے جو ہر موقع پر اُن کے ساتھ کیا
گیا، در آنحالیکہ عدل و انصاف اُس زمانہ میں بہت کم تھا، وہ ابن ابی عامر کا دم بھرنے
لگے، عیسائی فوجوں پر ابن ابی عامر خاص طور سے مہربانی کرتے تھے، اتوار کا دن تمام
سپاہیوں کے لئے خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں، تعطیل کا دن رکھا تھا، کسی عیسائی اور
مسلمان میں کوئی نزاع ہوتا تھا تو ہمیشہ عیسائی کی طرفداری کی جاتی تھی، اس لئے تعجب کا
مقام نہ تھا کہ عیسائی بھی ابن ابی عامر کی ذات سے ایسے ہی وابستہ ہوجائیں جیسے کہ بربر
تھے، یہ عیسائی درحقیقت ابن ابی عامر کے آدمی ہو گئے تھے، اُدھر تو وہ اپنے وطن
کو بھول گئے تھے، اِدھر اسلامی اسپین اُن کا وطن نہ بن سکتا تھا، کیونکہ وہ یہاں کی زبان (۹۱
مطلق نہ سمجھ سکتے تھے، پس اُن کا وطن جو کچھ تھا وہ لشکر گاہ تھا، تنخواہیں اُن کو خلافت
کے خزانے سے ملتی تھیں، لیکن وہ اپنے آپ کو خلافت کا ملازم نہیں بلکہ ابن ابی عامر
کا ملازم سمجھتے تھے، جو کچھ خوشحالی اُنہیں نصیب ہوئی تھی وہ ابن ابی عامر کی بدولت ہوئی تھی
اور اُنہی کو وہ اپنا مالک اور آقا جانتے تھے اور جو حکم ان سے ملتا تھا وہی بجالاتے تھے،
ابن ابی عامر نے فوج میں غیر ملک والوں کی تعداد بڑھا کر اسپینی فوج سوارہ کی کُل تنظیم بدل
دی، اِس وقت تک فوجوں کی حالت ایسی نہ تھی کہ اُن پر سلطنت کو پورا قابو ہوتا، مدت
سے یہ طریقہ چلا آتا تھا کہ فوجیں اور فوجوں کی شاخیں قبائل اور قبائل کی شاخوں سے
مرتب ہوتی تھیں، اگر فوج کسی ایک قبیلے کے لوگوں کی ہے تو اُس فوج کی شاخیں بھی
اُسی قبیلے کی فروع سے قائم کی جاتی تھیں، ابن ابی عامر نے یہ طریقہ بند کر دیا، عربوں کو

---

[1] عیسائیوں کی طرفداری میں مصنف نے یہ ایک قسم کی معذرت کی ہے کہ کیوں عیسائیوں نے مسلمانوں کی خدمت منظور کی (مترجم اُردو)

بلا امتیاز اِس بات کے کہ وہ کس قبیلے کے ہیں، مختلف فوجوں میں تقسیم کر دیا، ایک صدی پہلے
جب کہ عربوں میں عصبیت کا جوش پوری قوت پر تھا اگر ایسا کیا جاتا تو سخت اعتراض پیدا
ہوتا، بلکہ ممکن تھا کہ ملک میں بغاوتیں برپا ہو جاتیں، کیونکہ اِس طریقے سے فوجوں میں داخلے
کے قواعد بالکل بدل جاتے اور پُرانے امراء عرب کو جو اختیارات حاصل تھے وہ بھی سلب
ہو جاتے، قبیلوں کی رعایت سے فوجوں کی ترتیب اب قصّہ پارینہ ہو چکی تھی، بہت سے
عرب ایسے تھے جن کو یہ خبر بھی نہ تھی کہ وہ کس قبیلے کے آدمی ہیں؟ لوگوں کے انساب میں
جو خلطِ مبحث پیدا ہو گیا تھا اُس نے بڑے بڑے نسّابوں کو بھی مایوس کر دیا تھا، یہ سچ ہے
کہ خلیفہ مستنصر نے جو بڑے قدامت پرست اور تاریخ قدیم کے جیّد عالم تھے، جداولِ انساب
کی ترتیب کے لئے بڑے بڑے عالموں کو مقرر کیا تھا، اور چاہا تھا کہ ہر شخص اپنے قبیلہ کے
اعتبار سے اُسی قبیلہ میں سمجھا جائے، لیکن اُن کی یہ کوششیں مصلحت اور زمانے کی
روش کے خلاف تھیں، کیونکہ ہر جگہ میلان اس بات کا تھا کہ مختلف نسلیں مِل جُل کر یکجا ہو
جائیں، مختلف نسلوں کو تنِ واحد بنانے کا کام عبدالرحمٰن الناصر نے شروع کیا تھا، اور
مسلمانوں نے اُسے پسند بھی کیا تھا، اب ابنِ ابی عامر نے خلیفہ الناصر کی کوششوں
کی تکمیل کرنی چاہی۔

ابنِ ابی عامر نے اپنے خسر غالب سے لڑائی کی تیاری تو شروع کر دی مگر تعلقات
کے ظاہری اخلاق میں فرق نہ آنے دیا، غالب بھی اتنے کم عقل نہ تھے کہ فوجی انتظام میں
جو ردّ و بدل داماد کر رہا تھا اُس کی غایت کو نہ سمجھتے ہوں، وہ اِس بات کو تاڑ گئے تھے کہ
یہ سب کچھ میری مخالفت میں عمل میں آ رہا ہے، ایک روز سرحد کے ایک قلعے کی دیوار
پر کھڑے دونوں باتیں کر رہے تھے کہ غالب نے ابنِ ابی عامر کو بہت سخت و سُست
کہا ابنِ ابی عامر نے بھی کچھ کم سختی سے جواب نہیں دیا، بات اتنی بڑھی کہ غالب نے طیش
میں آ کر کہا "کُتّے، تو چاہتا ہے کہ کل اختیارات تیرے ہی ہاتھوں میں رہیں اور شاہی
خاندان کو تو غارت کر دے" غصّہ تو آ ہی رہا تھا، تلوار سونت کر ابنِ ابی عامر پر جھپٹ
پڑے، چند فوجی افسر جو قریب تھے انہوں نے روکنا چاہا، مگر پورے طور پر نہ روک

سکے اور غالب نے ابنِ ابی عامر کو زخمی کر دیا، مگر زخمی کرنے کے بعد غالب کو خوف پیدا ہوا اور وہ قلعہ کی دیوار پر سے نیچے کود پڑے، کودنے میں اتفاق سے دیوار کا ایک پتھر پکڑ لیا، جس سے وہ نیچے نہیں گرے اور اس طرح جان بچ گئی۔

اس واقعے کے بعد جنگ ہونی لازمی تھی، اور اس میں کچھ زیادہ توقف بھی نہ ہوا، غالب نے خلیفہ ہشام کے حقوق کی حمایت اختیار کی اور سواروں کی ایک فوج اُن کے ساتھ ہو گئی، لیون کی عیسائی ریاست سے اُن کو کمک پہنچی، بہت سی لڑائیاں ہوئیں، جن میں بعض معزز و ممتاز اہلِ دربار کام آئے، اخیر لڑائی میں ابنِ ابی عامر کی فوج شکست کھا کر بھاگنے کو تھی کہ غالب نے ایک رسالہ کو لے کر دھاوا کیا، مگر بدقسمتی سے کاٹھی کے اونچے سرے میں غالب کا سر زور سے لگا، اس صدمے سے زخمی ہو کر وہ گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے، اتنا دیکھتے ہی کہ غالب زمین پر گر پڑے ہیں، اُن کی فوج اور کمک کی عیسائی سپاہ میدان سے بھاگی اور ابن ابی عامر کو پوری فتح ہو گئی، غالب کی لاش میدان کے کشتوں میں سے برآمد ہوئی (مئی ۹۸۱ء ۳۷۱ھ)

ابنِ ابی عامر نے غالب ہی کو شکست دینے پر بس نہیں کی، بلکہ لیون کے عیسائیوں کو بھی اس جرم میں سزا دینی چاہی کہ اُنہوں نے دشمن کی مدد کی تھی، تاکہ قوم پر ظاہر ہو جائے کہ ایک عمدہ فوج مرتب کرنے سے اپنا ہی ذاتی نفع مقصود نہ تھا بلکہ قوم کے پاسِ عزت کا بھی خیال اُس میں شامل ہے، چنانچہ لیون کی عیسائی ریاست پر فوج کشی کر کے اُسے سخت سزا دی۔

اس لشکر کشی میں مقدمۃ الجیش کا سردار اُموی خاندان کا ایک شہزادہ عبداللہ نامی تھا اُس نے لیون کے علاقے میں داخل ہو کر شہر سمورہ کا محاصرہ کر لیا، (جولائی ۹۸۱ء مطابق محرم ۳۷۱ھ) قلعہ سمورہ پر قبضہ تو نہ ہو سکا، لیکن اُس کے مضافات کو خوب لوٹا اور غارت کیا چار ہزار عیسائیوں کو قتل کیا[۱]، لیون کے صرف ایک ضلع میں ایک ہزار گاؤں اور قصبات

---

[۱] چار ہزار عیسائی قید ہوئے تھے اور چار ہزار قتل۔ زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) کے صفحات ۳، ۷ تا ۹، ۱ دیکھیں۔

کو جو بکثرت آباد تھے، اور اُن میں مسیحی خانقاہیں اور گرجا بھی تھے، بالکل تاراج کر ڈالا، رومیر ثانی بادشاہ لیون جس کی عمر اس وقت پورے ۲۰ برس کی بھی نہ تھی گھبرا کر قومس قشتالیہ غرسیہ فرولند اور بادشاہِ نبرہ سے جا ملا، اور یہ تینوں والیانِ ریاست متحد ہو کر ابن ابی عامر کے مقابلہ کو بڑھے، رودطہ[1] کے مقام پر جو شبنت مانکش سے جنوب مغرب میں تھا جنگ ہوئی بادشاہوں کو شکست ہوئی اور شبنت مانکش کا مضبوط قلعہ مسلمانوں نے فتح کر لیا، دیہ وہی مقام ہے جس کے قریب عبد الرحمٰن الناصر کو عیسائیوں سے شکست ہوئی تھی، اور عیسائی مورخوں نے بڑی آب وتاب سے اُس کا حال لکھا تھا، مترجم) شبنت مانکش کے لوگ قید کم کئے گئے، سپاہی اور شہر کے لوگ اکثر قتل ہوئے۔

جاڑا اگرچہ بڑھتا چلا جاتا تھا مگر ابنِ ابی عامر کو اس کی پرواہ نہ ہوئی، اور وہ شمال مغرب کی سمت میں فوجیں لئے ہوئے آگے بڑھے، لیون کے شہر پر جو مسیحی سلطنت لیون کا پایۂ (۴۹۸)
تخت تھا حملہ کیا، رومیر شہر سے نکل کر مقابلہ پر آیا، اس جرأت پر تقدیر نے بھی اس کی مساعدت کی، رومیر نے مسلمانوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے اُن کے لشکر گاہ تک پہنچا دیا، لشکر گاہ میں ابنِ ابی عامر ایک بلند تخت پر بیٹھے تھے تاکہ جنگ کا حال بھی دیکھتے رہیں اور ضروری ہدایتیں بھی دیتے رہیں۔

جس وقت ابن ابی عامر نے اپنی فوج کو ہٹتے دیکھا، تو غصہ اور رنج سے کانپ گئے، ٹوپی سر سے اُتار کر پھینک دی، اور پیشانی زمین پر رگڑنے لگے، فوج کے لوگ جانتے تھے کہ سپاہ جس وقت اپنے فرائض ادا کرنے میں قاصر رہتی ہے تو اظہار رنج و ملال میں ابن ابی عامر یہی حرکت کیا کرتے ہیں۔

آقا کی پیشانی زمین پر دیکھتے ہی اہلِ لشکر پر ایک طلسم کا سا اثر ہوا، اور وہ اپنی اِس پسپائی پر اس قدر نادم ہوئے کہ یک لخت سب نے مل کر اس داغِ ناکامی کو مٹانا چاہا،

---

[1] یہ وہ رودطہ نہیں ہے جو سر قسطہ سے مغرب میں واقع ہے اور جس کا ذکر تاریخِ اندلس میں اکثر آیا ہے یہ رودطہ سامنکاس (شبنت مانکش) کے قریب ایک چھوٹا سا مقام تھا۔

زور زور سے نعرے لگا کر اس غضب کا یلغار کیا کہ عیسائی فوجیں تاب نہ لاسکیں، اور میدان سے بے تحاشا بھاگیں، مسلمانوں نے تعاقب کرتے کرتے شہر لیون کے دروازوں تک اُن کو پہنچا دیا، اگر برف و باراں کا ایک سخت طوفان اُس وقت نہ آجاتا، تو شہر لیون کو فتح کر لینے میں کچھ باقی نہ رہا تھا۔

اب چونکہ جاڑا بہت سخت پڑنے لگا تھا اس لئے موسم کی سختی سے مجبور ہو کر ابنِ ابی عامر قرطبہ واپس چلے آئے، اور یہاں آتے ہی اُنھوں نے المنصور کا لقب اختیار کیا، اس قسم کے القاب خلفاء کے لئے مخصوص ہوا کرتے تھے، اب ہم بھی ابنِ ابی عامر کو اس کتاب میں المنصور ہی کے خطاب سے یاد کریں گے۔

ابنِ ابی عامر نے علاوہ اس لقب کو اختیار کرنے کے حکم دیا کہ تمام آداب و مراسم جو خلفاء کے سامنے ادا کئے جاتے تھے وہی اُن کے سامنے بھی ادا کئے جائیں، چنانچہ وزراء بلکہ شہزادگانِ بنی اُمیہ بھی جب منصور کے سامنے آتے تو اُن کے ہاتھ کو بوسہ دیتے، لوگ منصور کے لطف و کرم کے اس درجہ متمنی رہتے تھے کہ منصور کے شیر خوار بچوں کے ہاتھوں کو بھی چومتے تھے۔

منصور کے اختیارات کی اب انتہا نہ تھی، اب ملک میں کوئی ایسا بڑا آدمی نہ رہا تھا جسے اُن کا حریفِ مقابل سمجھیں، لیکن خود منصور کا یہ خیال نہ تھا، اُن کو یقین تھا کہ ابھی تک ایک شخص ایسا ہے جو اُن کا حریف بن سکتا ہے، اس سے اُن کی مُراد جعفر بادشاہِ زاب تھی۔

غالب سے مقابلہ کے زمانہ میں جعفر نے منصور کی بہت مدد کی تھی، جعفر کو عالی نسبی اور شجاعت میں مشہور نام تھا، لیکن منصور اور امراء دربار کو اُس سے حسد پیدا ہو گیا تھا اب منصور سے ایک ایسی حرکت ہوئی کہ ہمیشہ کے لئے نام کو داغ لگ گیا، بنی تجیب کے دو شخصوں کو جن کے نام ابو الاحوص معن اور عبد الرحمٰن بن مطرف تھے، منصور نے خفیہ طور پر حکم دے کر جعفر کو ضیافت میں بلایا، جعفر نے ضیافت میں آنا قبول کیا، دعوت میں ۳۹۹)
بہت تکلف کیا گیا، عمدہ عمدہ شرابیں دسترخوان پر چُنی گئیں، ایک ملازم نے جام شراب

بھر کر منصور کو پیش کیا، منصور نے کہا "یہ جام اُس کو دو جس کی میں سب سے زیادہ عزّت کرتا ہوں" ملازم پریشان ہوا اور نہ سمجھا کہ شراب کس کو دے، تب منصور نے کہا "نادان، ساغر وزیر جعفر کو پیش کر" جعفر اس عزّت افزائی پر خوش ہوا، اور ملازم کے ہاتھ سے شراب لے کر ایک ہی سانس میں چڑھا گیا، نشہ ایسا ہوا کہ کسی کا لحاظ نہ رہا، بے اختیار رقص کرنے لگا، اِس حرکت کو دیکھ کر اور مہمان بھی بے تکلّف ناچنے لگے،

رات کو دیر تک یہ جلسۂ رقص و سُرود قائم رہا، جس وقت لوگ چلنے لگے تو جعفر کو نشہ بہت زیادہ تھا، جھُومتا جھامتا دو چار نوکروں کے سہارے گھر کو جانے لگا، راستے میں دونوں تجیبیوں کے سپاہیوں نے اُس پر حملہ کیا، جعفر مقابلہ کے لئے پُورا سنبھلا بھی نہ تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ (۲۲ جنوری ۹۸۳ء مطابق ۴ شعبان ۳۷۳ھ)

جعفر کی لاش سے اُس کا سر اور داہنا ہاتھ کاٹ کر منصور کے پاس پہنچایا گیا، منصور نے کہا کہ "میں اُن لوگوں سے واقف نہیں ہوں جو جعفر کے قتل کا باعث ہوئے ہیں" جعفر کی موت پر منصور نے بیحد افسوس اور غم کا اظہار کیا۔

اسناد۔ ابنِ حزم (عشق) ص ۳۲، ۳۸، ۵۹، ۱۰۱

ابن الابار ص ۱۰۳، ۱۵۱ تا ۱۵۵

ابنِ عذاری ج ۱ ص ۲۴۰ - ج ۲ ص ۲۵۸، ۳۱۶

مقری ج ۱ ص ۱۳۶، ۱۸۶، ۲۶۰ تا ۲۸۶، ۳۹۶ ج ۲ - ۵۱، ۹۴، ۴۴۲

ابنِ خلدون (تاریخِ بربر) جلد ۲ ص ۵۵۳ جلد ۳ ص ۲۳۷

عبدالواحد ص ۱۷

ابن الخطیب (قلمی نسخہ G) ص ۱۸۱

سعید طلیطلی ص ۲۴۶

ابن حوقل ص ۴۰

موناکی سی لین پول - C ۷۰۰

نویری ص ۴۷

کتاب ثالث

خلافت

دسویں فصل

المنصور

ممکن ہے کہ جعفر کے قتل میں المنصور کی سازش کا شبہ لوگوں کو گذرا ہو، ممکن ہے نہ گذرا ہو، لیکن نئی نئی فتوحات کی خوشی میں سب کے دل سے یہ قتل بہت جلد فراموش ہو گیا، مسیحی سلطنت لیون کے اندرونی معاملات نے ایسی شکل اختیار کی کہ وہ المنصور کے حق میں مفید ثابت ہوئی، ۹۸۱ء (۳۷۱ھ) کی جنگ سے جو جو آفات[1] ردمیر بادشاہ لیون پر آئیں وہ آخر کار اُس کی تباہی کا باعث ہو گئیں، لیون کے شرفاء اور امراء ایسے بادشاہ سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے جس کی قسمت ایسی کھوٹی ہو، لیکن اس کے ساتھ خود تخت کا دعوٰی کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے، علاقہ جلیقیہ میں (جو ریاست لیون کا ایک حصہ تھا) بغاوت ہو گئی، یہاں کے رئیسوں نے ردمیر بادشاہ لیون کے چچا کے

[1] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۷۹۴ و ۷۹۸ - مترجم

بیٹے برمند کو صاحبِ تخت بنانے کا ارادہ کر لیا، اور ۱۵ اکتوبر ۹۸۲ء (۲۳ ربیع الآخر ۳۷۲ھ) کو جلیقیہ کے شہر شنت یاقب میں تاج شاہی اُس کے سر پر رکھ دیا گیا، گویا ریاست لیون کا بھی اُسے بادشاہ بنا دیا، رومیر بادشاہِ لیون نے یہ خبر سنتے ہی برمند پر چڑھائی کر دی، لیون اور جلیقیہ کی سرحد پر ایک مقام تھا جس کا نام پورتیلا دی ارنیاس تھا، یہاں رومیر اور برمند میں لڑائی ہوئی، لڑائی اگرچہ سخت تھی مگر کچھ فیصلہ نہ ہو سکا، اس کے بعد برمند کو فتح پر فتح ہونی شروع ہوئی، یہاں تک کہ مارچ ۹۸۴ء (شوال ۳۷۳ھ) میں برمند نے لیون کا شہر رومیر سے چھین لیا، رومیر نے اس زمانے میں شہر اشتورقہ کے قریب پناہ لی تھی، جب دیکھا کہ لیون ہاتھ سے نکل گیا تو قطعی شکست سے بچنے کے لئے المنصور سے مدد چاہی، اور المنصور کو اپنا بادشاہ ماننے کی درخواست کی، اس کے تھوڑے ہی دن بعد بادشاہ رومیر مر گیا، اُس کی ماں نے مسلمانوں کی مدد حکومت کی، لیکن کچھ مدت کے بعد وہ مسلمانوں کی مدد سے محروم ہو گئی، کیونکہ برمند اس بات کو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ اگر رومیر کی طرح اُس نے منصور کو اپنا مالک اور سرپرست نہ بنایا، تو سرکش رؤساء ملک کو قابو میں رکھنا بے حد مشکل ہو جائے گا۔ برمند نے منصور سے مدد مانگی، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس مدد کے معاوضہ میں برمند نے رومیر کی ماں سے بھی بڑھ کر قول، قرار کر لئے تھے، کیونکہ منصور نے برمند کی درخواست منظور کر کے ایک بڑی فوج اُس کے پاس بھیج دی اسلامی فوج کی مدد سے برمند نے اپنی ریاست کے متمرد عیسائی رئیسوں کو زیر کیا، لیکن اب برمند اپنی ہی ریاست میں المنصور کا ایک نائب یا زیردست ہو گیا، اور اسلامی فوج لیون میں ریاست کی نگرانی اور برمند کی حفاظت کے لئے رہنے لگی۔

منصور نے اس طریقہ سے عیسائیوں کی ریاست لیون کو مسلمانوں کی ایک باج گذار ریاست بنا کر اسپین کے شمال مشرقی صوبہ قیطلونیہ کا قصد کیا، چونکہ اسپین کا یہ علاقہ شاہانِ افرنجہ (فرانس) کے تحت میں تھا، اس لئے اسپین کے خلفاء نے اُس کے ساتھ دوستانہ (۵۰
برتاؤ رکھا تھا، تاکہ فرانسیسیوں سے خواہ مخواہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو جائے، لیکن حاجب منصور کو اس کی مطلق پروا نہ ہوئی، منصور کو معلوم تھا کہ فرانس خود طائف الملوکی کا شکار

ہو رہا ہے، اور قسطلونیہ میں جو اُمراء صاحبِ اختیار ہیں اُن کو فرانس سے کچھ مدد ملنے کی توقع نہیں ہو سکتی، غرض بہت سا لشکر فراہم کر کے حاجب المنصور ۵ رمئی ۹۸۵ء (۱۱ ر ذی الحجہ ۳۷۴ھ) کو قسطلونیہ روانہ ہو گئے، چالیس شاعر ساتھ تھے کہ فتح کے موقع پر قصیدے لکھ کر پڑھیں،[1] قرطبہ سے کوچ کر کے البیرہ، بیاسہ، اور مورقہ کے شہروں سے گذرتے ہوئے صوبۂ مُرسیہ میں آئے، یہاں المنصور ابنِ خطاب کے مہمان ہوئے، ابنِ خطاب کوئی سرکاری عہدہ نہ رکھتے تھے، لیکن وہ بہت بڑے زمیندار اور وسیع علاقوں کے مالک تھے، اور ان علاقوں کی آمدنی کثیر تھی، یہ بنی اُمیّہ کے موالی بھی تھے، اور غالباً نسلِ فسیقوط سے بادشاہ تدمیر قوطی کی اولاد میں سے تھے، تدمیر صوبہ مُرسیہ کا بادشاہ تھا جس نے فتوحاتِ اسلامیہ کے شروع میں مسلمانوں سے اپنے حق میں عمدہ شرائط پر صلح کی تھی، اور ایک مُدّت تک خود اور اُس کے بیٹے اتھانا جلد نے مُرسیہ پر خود مختارانہ حیثیت سے حکومت کی تھی، بہر کیف یہ جو کچھ بھی ہو ابنِ خطاب[2] جس قدر دولتمند تھے اُسی قدر حوصلے سے المنصور کی خاطر و مدارات میں مصروف ہوئے، تیرہ دن تک المنصور، اور جو امراء اُن کے ہم رکاب تھے، اور تمام اہلِ فوج وزیر سے لے کر معمولی سوار تک اُن کے مہمان رہے، منصور کے سامنے جو دستر خوان بچھتا تھا اُس پر دنیا بھر کی نعمتیں ہوتی تھیں، انہوں نے اپنے باورچیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ ہر وقت نئی نئی قسم کے کھانے دستر خوان پر ہوں انہوں نے خاطر تواضع میں یہاں تک اہتمام کیا کہ منصور کے لئے ایک روز غسل کے پانی کی جگہ عرقِ گلاب رکھا گیا، المنصور خود نہایت تکلّف سے رہتے تھے، مگر میزبان کی تواضع نے اُنہیں متحیّر کر دیا، اُنہوں نے ابنِ خطاب کی بہت تعریف کی اور اظہارِ خوشنودی میں زمین کے محصول کا ایک حصّہ اُن کو معاف کر دیا، اور صوبہ مُرسیہ کے عمّال کو جو خلافت کی طرف سے علاقے کا انتظام

---

[1] ابن الخطیب نے ان شاعروں کے نام لکھے ہیں

[2] ساتویں صدی ہجری میں بنی خطاب اپنے تئیں عرب کہتے تھے، لیکن چوتھی صدی ہجری میں اِن کے بزرگوں کو عرب ہونے کا دعویٰ نہ تھا۔

کرتے تھے ہدایت کردی کہ ابنِ خطاب کے ساتھ ہمیشہ بہت ادب اور تعظیم سے پیش آیا کریں، اور ہر معاملہ میں اُن کی خوشی اور مرضی دریافت کرلیا کریں۔

مُرسیہ سے روانہ ہوکر منصور نے قیطلونیہ کی طرف کوچ کیا، راستے میں قونسس بوریل کو شکست دے کر یکم جولائی ۹۸۵ء (۹ صفر ۳۷۵ھ) چہار شنبہ کے روز شہر برشلونہ کے سامنے پہنچ گئے، اس کے پانچویں دن یعنی دوشنبہ کو حملہ کرکے برشلونہ کا مشہور شہر فتح کرلیا، شہر میں جو باشندے یا سپاہی ملے ان میں اکثر کو قتل کیا، باقی کو غلام بنایا، اس کے بعد شہر لوٹا گیا، اور پھر اُس میں آگ لگادی گئی۔

المنصور لڑائی سے تھکنا نہ جانتے تھے، جتنی لڑائیاں لڑے اُن میں برشلونہ کی لڑائی اُن کی تیئیسویں جنگ تھی،[۱] ان کا فتوحات کا شوق کسی طرح کم ہونا نہ جانتا تھا، برشلونہ سے واپسی ہوئی تھی کہ مورتیابنیہ (مغربِ اقصیٰ) میں جنگ کرنے کا ارادہ کرلیا، کئی برس سے (۱۰۰۲)
یہ ملک بلکین والی افریقیہ کے تحت میں تھا، لیکن بلکین کے آخری دورِ حکومت میں اور اُس کے مرنے (مئی ۹۸۴ء مطابق ۳۷۴ھ) کے بعد مغربِ اقصیٰ کے ایسے رئیسوں نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کردیے تھے جو بنی اُمیّہ کے فریق سے تعلق رکھتے تھے، بہت سے شہر مثلاً فاس، سلجلماسہ نے پہلے ہی سے فاطمیین کی حکومت سے آزادی حاصل کرلی تھی، اب یہاں افریقہ کا ایک بھولا بسرا شہزادہ پھر نمودار ہوتا ہے، یہ شہزادہ خاندانِ ادریس کا ابنِ قنون ہے، خلیفہ الحکم کے زمانہ میں جیسا کہ اوپر آچکا ہے ابنِ قنون نے غالب کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے، اور افریقہ سے وہ قرطبہ پہنچا دیا گیا تھا، قرطبہ کے زمانۂ سکونت میں حاجب مصحفی نے اسے تونس میں رہنے کی اس شرط سے اجازت دے دی تھی کہ وہ مغربِ اقصیٰ کو واپس نہ جائے، معلوم ہوتا ہے کہ اس شرط پر قائم رہنے کی نیت ابنِ قنون پہلے ہی نہ رکھتا تھا، چنانچہ وہ تونس سے فاطمی خلیفہ کے پاس حاضر

---

[۱] المنصور متعدد لڑائیاں رئیس قشتالیہ اور رئیس نبرہ سے لڑے تھے، مگر ان لڑائیوں کی تفصیل کہیں دستیاب نہیں ہوئی۔

ہوا، اور دس برس تک اسی بات پر اصرار کرتا رہا کہ مغربِ اقصیٰ میں وہ پھر برسرِ حکومت کر دیا جائے آخر کار اُس کو کچھ فوج اور روپیہ دیا گیا، اور وہ مغربِ اقصیٰ واپس آیا، اور یہاں روپیہ صرف کر کے بربر کے بہت سے سرداروں کو اپنا حامی بنا لیا۔ اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ جلد اپنا مقصد حاصل کر لے گا اور مغربِ اقصیٰ کا مالک ہو جائے گا، لیکن حاجب المنصور یہ کب پیش آنے دیتے تھے: فوراً اپنے چچا زاد بھائی عسقیلیجہ کو بہت سی فوج دے کر موریتانیہ روانہ کر دیا، عسقیلیجہ اور ابنِ قنون میں لڑائی ہوئی مگر مدت تک جاری نہ رہی، ابنِ قنون میں اتنی قوت نہ تھی کہ دشمن کا کامیابی سے مقابلہ کر سکتا، چنانچہ اس شرط پر کہ اُس کی جان سلامت رکھی جائے اور پھر وہ قرطبہ بھیج دیا جائے ابنِ قنون نے اطاعت قبول کرنی چاہی، عسقیلیجہ نے یہ شرطیں منظور کر لیں اور ابنِ قنون نے اطاعت اختیار کر لی۔

عسقیلیجہ کا ایک ایسے شخص کی پیش کردہ شرائط کو منظور کرنا قرینِ مصلحت نہ تھا جو ملک گیری کی حرص رکھنے کے علاوہ دھوکا دینے والا بھی ثابت ہو چکا تھا، اس امر میں شبہ ہو سکتا ہے کہ عسقیلیجہ کو اس قسم کی شرائط منظور کرنے کا اختیار بھی تھا یا نہیں، عربی مورخ اس معاملہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالتے، لیکن حاجب المنصور سے اس معاملہ میں جو کچھ عمل میں آیا اُس سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ عسقیلیجہ کا شرائط کو منظور کر لینا اس کے اختیارات سے خارج تھا، چنانچہ حاجب منصور نے ان شرائط کو لعدم قرار دیا، ابنِ قنون نظربند کر کے قرطبہ میں لایا گیا، اور رات کے وقت اُس سڑک پر جو جزیرۃ الخضرا سے قرطبہ کو آتی تھی ماہ ستمبر یا اکتوبر ۹۸۵ء (جمادی الاول ۳۷۵ھ) میں قتل کر دیا گیا۔

ابنِ قنون گو ایک جابر اور خودسر حاکم تھا جو قلعہ حجر النسر کی فصیلوں پر سے قیدیوں کو نیچے پھینک دیا کرتا تھا۔ لیکن جن حالات میں وہ قتل کیا گیا وہ ایسے تھے کہ سب کو اُس پر رحم آیا، ہر شخص کو اُس کے شریف و نجیب ہونے کا علم تھا، ابنِ قنون بنی ادریس سے تھا جو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی اولاد میں سے تھے، جن سواروں کو اُس کے قتل کا حکم ملا تھا اُنہوں نے بھی تامل اور تذبذب کے بعد اُسے قتل کیا تھا، قتل کے بعد ہوا کا ایک بگولہ اٹھا اور جب اُس کے صدمے سے یہ تینوں سوار گر پڑے تو سمجھے کہ ہم اسی خونِ ناحق کے عذاب

۱۵۰۳ میں مبتلا ہوئے ہیں، بعض لوگوں کو منصور کے اِس فعل پر سخت غصہ آیا، بعض نے کہا کہ منصور عہد شکنی کا مرتکب ہوا ہے، کیونکہ جب عسقبلیجہ نے شرطیں منظور کرلی تھیں تو اُس کا فرض تھا کہ اُس کی منظوری کو اپنی منظوری سمجھتا۔

اِس قسم کے اعتراض علی الاعلان کیے جاتے تھے، بالآخر رعایا میں ناراضی اِس قدر بڑھنے لگی کہ منصور اُسے نظر انداز نہ کر سکے اور بہت فکر مند رہنے لگے، جس وقت معلوم ہوا کہ عسقبلیجہ اور لوگوں سے بھی زیادہ ابن قنون کے قتل پر ناراض ہوا ہے، اور منصور کے آدمیوں کے سامنے کہہ چکا ہے کہ ابن قنون کے قتل میں دھوکے اور فریب سے کام لیا گیا ہے تو منصور کو بہت غصہ آیا، اور اُس نے عسقبلیجہ کو اس کلام پر سخت سزا دینی چاہی چنانچہ اُسے فوراً واپس اسپین آنے کا حکم بھیجا، اور جب وہ آیا تو تصرفِ مجرمانہ اور بغاوت کا الزام لگا کر اُس کے قتل کا حکم دیا، اور وہ اکتوبر یا نومبر ۹۸۵ء (جمادی الآخر ۳۷۵ھ) میں قتل کر دیا گیا۔

اِس قتل پر لوگوں میں اور بھی غُل مچا، ابن قنون کے قتل پر تو افسوس اور غصہ تھا ہی اب عسقبلیجہ کے قتل کا غم و غصہ اُس پر اضافہ ہوا، لوگ کہتے تھے کہ اِس سے بڑھ کر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ عسقبلیجہ منصور کا عزیز تھا مگر منصور نے صلۂ رحم کا بھی خیال نہ کیا، اور ایسے عزیز کی جان کے درپے ہو کر اُسے قتل کر ڈالا۔

ابن قنون کے عزیز و اقارب اِس اُمید میں تھے کہ ابن قنون کی حکومت مغرب اقصیٰ میں قائم ہو جائے گی، لیکن اُس کے قتل کے بعد وہ لوگوں کو منصور کے خلاف بھڑکا کر فتنے اٹھانے میں بہت کوشش کرنے لگے، جس وقت منصور کو ابن قنون کے عزیزوں کی یہ حرکت معلوم ہوئی تو اُنھوں نے بنی ادریس کی جلاوطنی کا حکم دیا، اب بنی ادریس اسپین اور مغرب اقصیٰ دونوں سے خارج کیے گئے، جس وقت یہ لوگ رخصت ہونے لگے تو ایک شخص نے جس کا نام ابراہیم بن ادریس تھا حاجب منصور پر ایک نظم میں آخری حملہ کیا، یہ نظم اگرچہ بہت لمبی تھی مگر مقبولِ خاص و عام ہوئی، نمونہ کے طور پر چند اشعار کا مطلب یہاں لکھا جاتا ہے:

"میں ایک مصیبت زدہ جلاوطن آدمی ہوں، میری بدقسمتی کی انتہا نہیں ہے، بدنصیبی میرے تعاقب میں ہے، قرض کی مدّت شروع ہوتے ہی قرض خواہ کا تقاضہ شروع ہو جاتا ہے .... واقعات ایسے پیش آئے، جنھوں نے عقل زائل کردی، ہماری مصیبتیں سخت و نا ختم ہیں، آنکھوں کا یقین بھی دل سے جاتا رہا، کیونکہ ہر وقت دھوکہ دیتی ہیں، کیا بنی اُمیّہ اب تک زندہ ہیں؟ اور گوارا کرتے ہیں کہ یہ کوز پشت[۱] اُن کی سلطنت کا مالک بنا بیٹھا رہے؟ دیکھو! جس سواری میں ایک بھورا بندر بیٹھا ہے اُس کے جلو میں سپاہی چلتے ہیں .... اے اُمیّہ کے بیٹو! پہلے تو تم آدھی رات میں ستاروں کی مانند چمکتے تھے، اب وہ تمہاری شان و شوکت کیا ہوئی؟ ایک زمانہ تھا کہ تم شیرِ نیستان تھے، مگر اب کچھ بھی نہ رہے۔ اسی وجہ سے تو یہ روباہ تمہاری سلطنت پر قابض ہو گیا ہے۔"

"روباہ" یا "ثعلب" کا لفظ منصور کی نسبت سب سے پہلے مصحفی نے اپنی نظم میں لکھا تھا، لیکن لوگوں میں اب تک منصور کا یہی لقب چلا آتا تھا، اب منصور کو فکر ہوئی کہ جہاں تک ممکن ہو جلد کوئی تدبیر ایسی کرنی چاہیئے کہ رعایا کو اُس طرف سے حُسنِ ظن پیدا ہو، اسی خیال سے جامع مسجد قرطبہ کو زیادہ وسعت دے کر تعمیر کرانا چاہا، چونکہ افریقہ کے لوگ بکثرت فوجوں میں بھرتی ہو کر قرطبہ رہنے لگے تھے، اس لیئے اُن کے اور قرطبہ کے باشندوں کے لئے اب مسجد میں کافی گنجائش نہ رہی تھی، عمارت کو وسیع کرنے کے لئے زمین کی اور اُس پر جو مکانات تھے اُن کے مالکوں کو بے دخل کرنے کی ضرورت پیش آئی، یہ کام بہت نازک تھا، اور اُس کو اس طرح انجام دینا تھا کہ لوگ خوش ہو کر زمین اور مکان دے دیں، المنصور ان باتوں میں اُستاد تھے، مکان کے مالک کو اپنے سامنے

---

[۱] یہ جھوٹی مذمت ہے، غیر طرفدارانہ شہادت سے ثابت ہے کہ منصور بہت وجیہہ شخص تھا

بُلواتے اوّل تو یہ ملاقات ہی مالکِ مکان کی عزّت کا باعث ہوتی، پھر اُس سے کہتے "مجھی میں جامع مسجد کی عمارت میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں، مسجد وہ مقام ہے جس میں لوگ خدائے ذوالجلال کی عبادت کرتے ہیں، اور میں مسلمانوں کی فلاح کے لئے تمہارا مکان بیتُ المال کے صرف سے خریدنا چاہتا ہوں، خزانۂ عامرہ اس وقت مالِ غنیمت سے جو ہم نے کُفار سے حاصل کیا ہے پُر ہے، اپنے مکان کی جو کچھ قیمت سمجھتے ہو بتاؤ، قیمت کم کر کے کہنے کی ضرورت نہیں، جو قیمت سمجھو بے تکلف کہو" یہ تقریر سُن کر مالکِ مکان اپنی دانست میں زیادہ سے زیادہ قیمت کہتا، مگر منصور کہتے "یہ قیمت تو تم نے کم کہی ہے، تم حد سے زیادہ انکسار کرتے ہو، اچھا جو کچھ تم نے کہا ہے اُس سے دوچند قیمت دوں گا" اس کے بعد اس قیمت در مالکِ مکان کو قیمت ہی نہیں دی جاتی تھی بلکہ مکان کے عوض میں ایک دوسرا مکان بھی سکونت کے لئے عطا ہوتا تھا

باوجود اس فیاضی کے ایک عورت نے مُدّت تک اپنا مکان بیچنے سے انکار کیا اُس کے مکان کے باغ میں ایک کھجور کا بہت ہی خوبصورت درخت تھا جسے یہ بڑھیا بہت عزیز رکھتی تھی، آخر کار جب وہ مکان بیچنے پر راضی ہوئی تو یہ شرط کی کہ ایک مکان جس کے باغ میں ایسا ہی خوبصورت کھجور کا درخت ہو اُس کو علاوہ قیمتِ مکان کے دیا جائے، ایسا مکان ملنا مشکل تھا، لیکن جب منصور کو معلوم ہوا کہ عورت کیا مانگ رہی ہے، تو انھوں نے عُمال سے کہا "جو کچھ وہ مانگتی ہے وہ پیدا ہونا چاہیئے، اس میں چاہے بیت المال خالی ہی کیوں نہ ہو جائے" غرض تلاش اور دِقت کے بعد ایک مکان اُس بڑھیا کی مرضی کے مطابق ملا اور بڑی بھاری قیمت دے کر اُسے خرید لیا گیا۔

اس قسم کی فیاضی کا پھل بہت جلد مِل گیا، بیت المال سے اِس طرح روپیہ بے دریغ صرف کرنے پر اعتراض ہو سکتا تھا، لیکن اِس سے کون انکار کر سکتا تھا کہ منصور اُس وقت بڑی فیاضی اور حوصلے سے لوگوں کے ساتھ سلوک کر رہا ہے، رعایا میں سے جو لوگ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے وہ کہتے تھے کہ مسجد کو بڑا کر کے بنانا واقعی بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔

جس وقت مسجد میں اضافہ شروع ہوا قرطبہ کے لوگوں نے ایک عجیب کیفیت دیکھی اور وہ یہ تھی کہ عیسائی قیدی جن کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں مسجد کیلئے زمین ہموار کر رہے ہیں، مورخ لکھتا ہے کہ "اسلام کا ستارہ پہلے کبھی اس تیزی سے نہ چمکا تھا، اور کفار کی تذلیل کبھی اس درجہ نہ ہوئی تھی"، مگر جہاں یہ کیفیت نظر آرہی تھی وہاں دیکھنے والے یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حاجب المنصور، سلطنت بنی امیہ کے سفید و سیاہ کا مالک، سب سے بڑا شجاع اور بہادر، کبھی کدال، اور کبھی بیلچہ، کبھی آری اور کبھی بسولا ایک معمولی مزدور اور بڑھئی کی طرح ہاتھ میں لئے تعمیر کے کام میں مصروف ہے، اور یہ سب کچھ خدائے وحدہ لاشریک کی عظمت اور بزرگی کے لئے وہ کر رہا ہے یہ کیفیت دیکھ کر عیسائیوں کی تذلیل پر اعتراض کرنیوالوں کی زبان بند ہو جاتی تھی (۵۰۵)

جس وقت مسجد میں اضافہ و تعمیر کا کام جاری تھا لیون کی عیسائی ریاست سے لڑائی چھڑ گئی، اس ریاست میں جو اسلامی فوجیں مامور تھیں وہ اسے اپنا مفتوحہ ملک سمجھ کر وہاں کے لوگوں سے برتاؤ کرتی تھیں، والی ریاست برمند ثانی نے ان فوجوں کی شکایت منصور سے کی، منصور نے سختی سے جواب دیا، برمند کو صبر نہ رہا، اور اس نے ہمت کر کے مسلمان فوجوں کو اپنی ریاست سے نکال دیا۔

منصور کو اب یہ ضرورت پیش آئی کہ برمند کی پھر گوشمالی کرے، لیون سے لڑائی پھر شروع ہو جانے سے منصور کو کچھ افسوس نہ ہوا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لڑائی اور فتح کی خبریں رعایا کے لئے اس قدر دلچسپ مضمون ہو جائیں گی کہ ایسے معاملات کی طرف سے جن سے رعایا کو بحث نہ رکھنی چاہیئے ان کا خیال بٹ جائے گا حسب توقع لڑائیوں اور ان کے انجام کی طرف لوگ متوجہ ہو گئے، جون ۹۸۶ء ماہ صفر ۳۷۶ھ میں منصور نے شہر قلمریہ پر قبضہ کیا، اور اسے ایسا برباد کیا کہ سات برس تک یہ شہر بالکل ویران پڑا رہا۔

اس مہم کے دوسرے برس دریائے دویرہ کو عبور کر کے اسلامی فوجیں تمام علاقہ لیون پر سیلاب کی طرح پھیل کر ہلاکت اور تباہی اپنے ساتھ لائیں، شہر، قلعے، خانقاہیں، گرجا اور گاؤں کسی کو سلامت نہ چھوڑا، برمند دارالحکومت لیون سے

نکل کر سموره میں چلا آیا تھا، اُسے یقین تھا کہ منصور پہلے سموره پر حملہ کرے گا، لیکن منصور سموره کو رستے میں چھوڑتے ہوئے سیدھے شہر لیون پر جا دھمکے، اس سے پہلے بھی ایک موقع پر منصور نے لیون کے شہر پر تقریباً قبضہ کر لیا تھا، لیکن اُس کا مضبوط قلعہ، مستحکم بُرج اور مورچے سنگِ مرمر کے دروازے، رومانی شہر پناہ جس کا آثار ۲۰ فیٹ سے بھی زیادہ کا تھا، اِن سب چیزوں نے ایک عرصہ تک شہر کو دشمن کے حملوں سے بچائے رکھا، آخر کار مغربی دروازے کے قریب شہر پناہ میں ایک جگہ نقب لگائی گئی، جس وقت یہ نقب لگائی گئی تو لیون کی فوجوں کا سپہ سالار گون سالود گون زالیز[1] جو جلیقیہ کا ایک نامی رئیس تھا، سخت بیمار ہو گیا تھا، لیکن شہر کے لئے یہ ایسے خطرہ کا وقت تھا کہ بیماری کی حالت میں بھی بہادر گون سالود مسلح ہو کر پالکی میں سوار ہوا، اور مسلمانوں کو نقب کی راہ سے شہر میں داخل ہونے سے روکا، اپنی فوج کو للکار کر اُس کی ہمت بڑھائی، سپہ سالار کی موجودگی نے سپاہیوں کے دِل گرما دیئے، اور اُنھوں نے مسلمانوں کو نقب کے راستے شہر میں داخل نہ ہونے دیا لیکن چوتھے دن جنوبی دروازے سے مسلمان شہر میں گھس پڑے، اور اب انہوں نے قتلِ عام شروع کیا، سپہ سالار گون سالود کو باوجودیکہ وہ بیمار تھا زندہ نہ چھوڑا، شہر لیون کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، دروازوں کی سنگین عمارتیں، بُرج، مورچے، شہر پناہ، قلعہ، سکونت کے مکانات بالکل مسمار کر دیئے، شمالی دروازہ کے قریب صرف ایک بُرج کو منصور کے حکم سے سلامت رہنے دیا دیا گیا، تاکہ جس شہر کو مسمار کیا ہے اُس کی مضبوطی کا حال آیندہ نسلوں کو معلوم ہوتا رہے۔

لیون کو تباہ کر کے اسلامی فوجیں سموره کی طرف بڑھیں، راستے میں شنت بطرہ اسلونسا اور سا ہون کی مسیحی خانقاہوں کو جلا کر خاک کر دیا، سموره پہنچ کر شہر کا محاصرہ کیا، یہاں بر مِسند بادشاہِ لیون موجود تھا، اس موقع پر اُس نے اتنی بھی جرأت نہ دکھائی جو لیون

---

[1] یہ بیان صرف لوکس باشندہ توئی کا ہے، اُس نے نام گورمی گون ثالیز لکھا ہے مگر یہ نام ممکن نہیں، دیکھو ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) جلد اص ۱۸۱ - ۱۸۲)

میں اُس کے سپہ سالار گون سالو د سے ظاہر ہوئی تھی، برمند خفیہ طور پر شہر سے بھاگ گیا، اہلِ شہر نے مجبور ہو کر شہر منصور کے حوالے کر دیا، منصور نے شہر کو لوٹنے کا حکم جاری کیا، اور اب ریاست لیون کے تمام عیسائی رؤساء نے مسلمانوں کی اطاعت قبول کی، اور سلطنت لیون کا صرف وہ قلیل حصّہ جو بحرِ بسکے سے ملحق تھا برمند کے قبضے میں رہ گیا۔

جب اس شاندار فتح کے بعد منصور مدینۃ الزاہرہ کو واپس آیا تو چند نہایت اہم معاملات کی طرف اُسے فوراً متوجہ ہونا پڑا، واپس آنے پر معلوم ہوا کہ بہت سے عمائدِ شہر نے منصور کے خلاف سازش کی ہے اور انہی اہلِ سازش میں منصور کا بیٹا عبداللہ بھی جس کی عمر اس وقت ۲۲ برس کی تھی شریک ہے۔

عبداللہ بڑا بہادر اور شہسوار تھا، لیکن باپ کو اِس بیٹے سے محبت نہ تھی، وجہ یہ تھی کہ اُس کے صحیح النسب ہونے میں منصور کو شبہ تھا، یہ حال عبداللہ کو معلوم نہ تھا مگر وہ یہ دیکھ کر دل میں جلتا تھا کہ اُس کے بھائی عبدالملک کو جو چھ برس چھوٹا اور عقل و ذہانت اور دلیری میں بھی اُس سے کم ہے، باپ ہر بات میں عبداللہ پر ترجیح دیتا ہے، اس وجہ سے عبداللہ منصور کی طرف سے غصّہ میں رہتا تھا، اِسی حالت میں عبداللہ سرقسطہ آیا، سرقسطہ اس وقت سرحد شمال مشرق کے حاکم عبدالرحمٰن بن مطرف تجیبی کا مستقرِ حکومت تھا، اِس حاکم کے دربار کا رنگ عبداللہ کے حق میں زہر ہو گیا، اُس کا میزبان یعنی عبدالرحمٰن بن مطرف ایک بڑے شریف عربی خاندان کا رئیس اعظم تھا، سو برس سے اُس کے خاندان میں سرقسطہ کی صوبہ داری چلی آتی تھی، چونکہ منصور سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں کو ایک ایک کر کے گرفتار کر چکے تھے اِس لیے عبدالرحمٰن ہر وقت اس خوف میں رہتا تھا کہ اب مجھ پر بھی ہاتھ صاف ہونے والا ہے، اور یہ خوف مقتضائے فطرت تھا، مگر عبدالرحمٰن نے یہ قصد کیا کہ منصور کی طرف سے کوئی بات ہونے سے پہلے ہی وہ بغاوت کر دے، عبداللہ کے سرقسطہ پہنچتے ہی عبدالرحمٰن نے خیال کیا کہ اب اپنے قصد کو پورا کرنے کا موقع اچھا ہے، بغاوت کرنے کے لئے عبداللہ ایک اچھا حیلہ بن سکتا ہے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن نے عبداللہ کے دل میں جو دشمنی باپ کی طرف سے

تھی اُسے اُکسانا اور بھڑکانا شروع کیا اور بغاوت کا خیال اُس کے دل میں پیدا کیا،
آخر کار عبدالرحمٰن اور عبداللہ نے فیصلہ کر لیا کہ موقع پاتے ہی دونوں مِل کر منصور سے (۱۵۰۷ء)
بغاوت کریں گے، اگر فتح ہوئی تو اسپین کی حکومت کو آپس میں اس طرح تقسیم کر لیں گے
کہ جنوبی حصّہ عبداللہ کے پاس رہے گا اور شمالی حصّہ عبدالرحمٰن کے قبضے میں - دیوانی
اور فوج دونوں صیغوں کے اکثر معزز عہدہ دار اس سازش میں شریک ہو گئے،
منجملہ اُن کے مروانی شہزادہ عبداللہ بھی تھا - جو اُس وقت طلیطلہ کا حاکم تھا، "سنگدل"
کے لقب سے مشہور تھا -

منصور کے خلاف یہ سازش بہت سنگین تھی، مگر اُس کی شاخیں اِتنی دُور دُور
تک پھیل چکی تھیں کہ منصور کی تیز نظر سے وہ زیادہ دنوں تک چھپی نہ رہ سکتی تھی -

اب منصور کو طرح طرح کی خبریں پہنچنا شروع ہوئیں، منصور فوراً اِس سازش کو
توڑنے اور دشمنوں کو زک دینے کی تدبیر سوچنے لگے، اپنے فرزند عبداللہ کو سرقسطہ سے
واپس بُلا کر اُس سے بہت محبت اور لطف سے پیش آئے، یہاں تک کہ بیٹے کو
باپ پر بھروسہ ہو گیا، اُس کے بعد شہزادہِ عبداللہ اُموی ملقب بہ "سنگدل" حاکم طلیطلہ
کو طلیطلہ سے علیحدہ کیا، مگر ایسی معقول وجوہ کی بنیاد اور اس درجہ اخلاق کے ساتھ کہ
شہزادہ کو کسی بات کا بھی شبہ نہ گزرا، اس کے تھوڑے دن بعد عبداللہ اُموی کو منصور
نے وزارت سے برخاست کر کے حکم دیا کہ اپنے مکان سے باہر نہ نکلنے پائیں -

غرض اِس طرح سازش کے دو بڑے بانیوں کو بیکار کر کے حاجب المنصور نے
قشتالیہ سے جنگ کی تیاری کی، جملہ سرداران فوج کو حکم ہوا کہ اپنی اپنی فوجیں
لے کر سرحد پر حاضر ہوں، تمام سرداروں کی طرح عبدالرحمٰن بن مطرف تجیبی حاکم
سرقسطہ نے بھی اس حکم کی تعمیل کی، اب منصور نے خفیہ طور پر سرقسطہ کے اہل فوج کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے
حاکم عبدالرحمٰن کی شکایتیں منصور کے پاس پیش کریں، اہل فوج نے ایسا ہی کیا، جس
وقت عبدالرحمٰن پر اس بات کا الزام لگایا گیا کہ سپاہیوں کی تنخواہ کا ایک حصہ
عبدالرحمٰن نے خورد برد کر دیا ہے تو منصور نے اُسے سرقسطہ کی حکومت سے معزول کر دیا

۱۸ جون ۹۸۹ء مطابق ربیع الاوّل ۳۷۹ھ

منصور کو یہ پسند نہ ہوا کہ کل بنی ہاشم سے بگاڑ لے، اس لئے عبدالرحمٰن کو معزول کر کے
اُس کی جگہ اُس کے بڑے بیٹے یحییٰ تمیجہ کو سرقسطہ کا حاکم مقرر کیا، چند روز کی معزولی کے
بعد عبدالرحمٰن کو گرفتار کر لیا، مگر اُس کو یہ علم نہ ہونے دیا کہ سازش کا حال منصور پر کھل گیا
ہے۔ گرفتار کرنے کے وقت یہ بیان کیا گیا کہ عبدالرحمٰن کے سپرد جو رقمیں فوج کی تنخواہ
کی تھیں۔ اُن کے متعلق اس امر کی تحقیقات ضروری ہے کہ وہ رقمیں کس طور پر
صَرف میں لائی گئیں۔

اس کے تھوڑے دن بعد منصور نے اپنے فرزند عبداللہ کو فوج میں شریک ہونے
کا حکم دیا، عبداللہ حکم بجا لایا، منصور نے بہت کوشش کی کہ بیٹا کسی طرح اس سے
راضی ہو جائے، لیکن سب کوششیں بیکار گئیں۔ عبداللہ نے باپ سے قطعی علیحدگی اختیار
کرنے کا مصمم قصد کر لیا تھا، چنانچہ جس وقت اسلامی فوجیں قلعہ شنت اشتیبان غرماج
کا محاصرہ کئے ہوئے تھیں، عبداللہ چھ غلاموں کو ساتھ لے کر خفیہ طور سے قشتالیہ کے
عیسائی حاکم غرسیہ فرولنہ کے پاس چلا گیا، غرسیہ نے اُسے اپنی پناہ میں رکھنے کا
وعدہ کر لیا، منصور کو جس وقت معلوم ہوا تو اُس نے غرسیہ کو بہت دھمکیاں دیں، مگر (۵۹۱)
غرسیہ نے ایک سال تک اپنا عہد قائم رکھا، اس ایک سال میں غرسیہ کو بہت
سی شکستیں ہوئیں، صرف شکستیں ہی نہیں ہوئیں بلکہ اگست ۹۸۹ء (جمادی الاول ۳۷۹ھ)
میں قلعہ وبشمہ اس کے قبضے سے نکل گیا، منصور نے اس قلعے میں اسلامی فوج مقیم کر دی۔
اکتوبر ۹۸۹ء رجب ۳۷۶ھ میں منصور نے القبۃ کا شہر بھی چھین لیا، آخر کار غرسیہ
اس قدر مجبور اور پریشان ہوا کہ اُس نے منصور سے امان کی درخواست کی اور عبداللہ
کو منصور کے حوالے کر دیا۔

قشتالیہ کے سپاہی اس نوجوان باغی کو منصور کے لشکر کی طرف لے چلے، عبداللہ
ایک خچر پر سوار تھا، جس کا زین نہایت پُر تکلف تھا اور جسے بادشاہ قشتالیہ غرسیہ
نے تحفہ میں دیا تھا، عبداللہ کو پورا یقین تھا کہ منصور اُس کا قصور معاف کر دیں گے

اِس لئے اُسے اطمینان تھا، راستہ میں سواروں کا ایک رسالہ جس کا افسر سعد تھا اُسے مِلا، سعد نے عبداللہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اُسے یقین دلایا کہ ہرگز کسی بات کا خوف نہ کریں، کیونکہ جو کچھ اُن سے ہوا ہے، منصور اس کو ایک نوجوان آدمی کی اُن غلطیوں میں تصوّر کرتے ہیں جو قابلِ معافی ہوتی ہیں، جس وقت تک بادشاہِ قشتالیہ کے سپاہی ساتھ رہے، سعد اِسی قسم کی دل جوئی کرتا رہا، لیکن جب یہ سپاہی رخصت ہوئے اور سعد کا رسالہ مع عبداللہ کے دریائے دویرہ کو عبور کر چکا تو سعد عبداللہ کا ساتھ چھوڑ کر فوج کے عقب میں چلا گیا، اس کے جاتے ہی چند سپاہی عبداللہ کے قریب آئے اور اُس سے کہا کہ گھوڑے سے اُتر کر موت کی تیاری کریں۔ یہ جملہ سن کر اس بہادر عامری کو مطلق ہراس نہ ہوا، بے تکلف خچر سے نیچے اُتر پڑا اور نہایت اطمینان سے جلّاد کے سامنے گردن رکھ دی جلّاد نے سر تن سے جُدا کر دیا۔ (۹ ستمبر ۹۹۰ء مطابق ۱۵ جمادی الآخر ۳۸۰ھ) عبداللہ بن منصور کا ساتھی عبدالرحمن بن مطرف التجیبی پہلے ہی اپنے کئے کو پہنچ چکا تھا، سرکاری روپے میں تصرّف بے جا کا جرم ثابت ہونے پر مدینۃ الزاہرہ میں قتل کر دیا گیا تھا، اموی شہزادہ عبداللہ کسی طرح بھاگ کر برمند بادشاہِ لیون کے پاس پناہ گزیں ہوا۔

المنصور اپنے خلاف اِس سازش کو مٹا کر بھی چین سے نہ بیٹھے، غرسیہ بادشاہِ قشتالیہ کا یہ قصور کہ اُس نے عبداللہ بن منصور کو جس حالت میں کہ وہ باپ سے باغی ہو گیا تھا پناہ دی، منصور نے کبھی معاف نہ کیا اور اِس قصور کی سزا میں غرسیہ کے بیٹے شانجہ کو باپ سے باغی ہونے کی تحریک کی۔

منصور اپنی اِس کوشش میں کامیاب ہوئے اور شانجہ اس کے لئے تیار ہو گیا کہ اپنے باپ سے باغی ہو جائے، قشتالیہ کے عیسائی سرداروں نے جو بڑے صاحبِ اقتدار تھے شانجہ کا ساتھ دیا اور ۹۹۴ء (۳۸۴ھ) میں شانجہ نے اپنے باپ غرسیہ سے بغاوت کر دی، منصور نے شانجہ کو قشتالیہ کا بادشاہ تسلیم کر کے شنت اشتیبان غرملج اور قلنّہ پر قبضہ کر لیا۔

منصور نے اس لڑائی کو زیادہ طول نہ دینا چاہا، منصور کے درباریوں نے جو آقا کی

ہر بات سے خواہ گوارا ہو یا ناگوار، اتفاق ظاہر کیا کرتے تھے، لڑائی بند کرنے کے لئے بے صبری ظاہر کی، اسی دوران میں شاعر صاعد ایک بزِ کوہی کی گردن میں رسی ڈالے منصور کے سامنے حاضر ہوا اور اس جانور کو تحفے میں پیش کر کے ایک نظم پڑھی جو کچھ بہت اچھی نہ تھی، اس نظم کے تین شعر یہ تھے۔

مَوْلَایَ مُؤْنِسَ غُرْبَتِی مُتَحَفِّظِی — اے میرے آقا! میری غربت کے مونس! مجھ کو زمانہ کی دست بُرد سے بچانے والے!

مِنْ ظَفْرِ اَیَّامِیْ مُمْنِعْ مَعْقِلِی — مجھ کو محفوظ رکھنے والے اور سرپرست

عَبْدٌ نَشَلْتَ بِضَبْعِہٖ دغرسیۃ — ایک غلام تیرے پاس ایک بزِ کوہی لایا ہے

فی نعمۃٍ اھدی الیک بایدی — تُو نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی مدد کی اور اپنے نعمت و احسان میں اسے جگہ دی۔

سَمَّیْتُہٗ غرسیۃً دبعثتہٗ — میں نے اس کا نام غرسیہ رکھا اور اسے رسی سمیت تیرے

فی حبلۃٍ لیتاح فیہ تفاؤلی — پاس بھیجا ہے تاکہ میرا تفاؤل اس سے معلوم کیا جا سکے[1]۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ شاعر کی پیشین گوئی پوری اتری، غرسیہ اسی دن یعنی مئی کی ۱،۵۰۵
۲۵ تاریخ ۹۹۵ء (۲۱ ربیع الآخر ۳۸۵ھ) کو دوشنبہ کے دن دریائے دویرہ کے کنارے القفصر اور لنجہ کے درمیان گرفتار ہو گیا اور گرفتاری کے پانچ دن بعد زخموں کے اثر سے مر گیا، اس کے مرنے کے بعد شانجہ کی حکومت میں اب کوئی مزاحم نہیں رہا اور وہ مسلمانوں کو سالانہ خراج ادا کرنے لگا۔

اسی سال موسم خریف میں منصور نے بادشاہ لیون، برمند سے جنگ کی، برمند نے اموی شہزادہ عبداللہ کو جو دوسرا بڑا باغی تھا اپنے ہاں پناہ دی تھی، برمند کی حالت

---

[1] انگریزی ترجمہ میں ان اشعار کا خلاصہ اس طرح ہے "میں تیرا غلام جسے مفلسی سے آزاد کر کے تُو نے نعمتوں سے مالا مال کیا تھا یہ ہرن پیش کرتا ہوں، اس کا نام میں نے غرسیہ رکھا ہے اور اس کی گردن میں رسی ڈال کر تیرے پاس اس غرض سے لایا ہوں کہ میری پیشین گوئی پوری ہو" مترجم

اِس وقت بہت خراب تھی، اختیاراتِ شاہی اب نام کو نہ رکھتا تھا ملک کے رئیسوں نے اُس کی تمام زمینوں، غلاموں اور گلّوں پر قبضہ کر کے اُن چیزوں کو باہم تقسیم کر لیا تھا اور جب برمند نے اعتراض کیا تو یہ رئیس ہنس کر چپ ہو گئے، بعض زمیندار بھی جن کو برمند نے بعض قلعے اِس غرض سے دیئے تھے کہ مسلمانوں سے اُن کی حفاظت کرتے رہیں برمند سے بغاوت کر بیٹھے، اُس کے مرنے کی خبر بار بار مشہور کر دیتے تھے اور اِتنا بھی تحقیق نہ کرتے تھے کہ واقعہ سچ ہے یا جھوٹ۔

اِس زبون حالت میں برمند کا منصور سے مقابلہ کرنا ایک سخت نادانی کا فعل تھا اور نہ منصور جیسے جنگ آور سے جو ہر معرکے میں فتحیاب ہوتا تھا لڑائی میں دُور رہنے کی کوئی اُمید ہو سکتی تھی، لیکن برمند سے بہت جلد یہ حماقت ظہور میں آئی اور اُس نے منصور کے حملے کا جواب کرنا چاہا، نتیجہ یہ ہوا کہ شہر اشتورقہ برمند کے قبضے سے نکل گیا، بالآخر مجبور ہو کر وہ منصور سے امان کا خواستگار ہوا، منصور نے اس شرط سے امان دی عبداللہ اموی کو حوالے کر کے سالانہ خراج ادا کیا کرے

علاقہ کاریون[1] کے مسیحی قومسوں نے منصور کے حکم سے سرتابی کی تھی، اُس کی سزا میں منصور نے اُن کے دارالریاست یعنی شہر کاریون کو فتح کر لیا، اس فتح کے بعد منصور قرطبہ واپس آئے، عبداللہ اموی جو ماہِ نومبر ۹۹۵ئہ (شوال ۳۸۵ھ) میں منصور کے حوالے ہو چکا تھا ساتھ تھا، اِس مروانی شہزادے کو منصور نے سخت سزا دی، بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ڈال کر اونٹ پر سوار کرایا اور اِس صورت سے قرطبہ کے بازاروں میں اُس کی تشہیر کی گئی، آگے آگے ایک منادی تھا جو کہتا جاتا تھا "دیکھو عبداللہ ابنِ عبدالعزیز کو جو دشمنانِ اسلام سے مل کر تارکِ اسلام ہوا تھا" جب عبداللہ نے یہ الفاظ سُنے تو منادی سے کہا "تو جھوٹا ہے، یہ کیوں نہیں کہتا کہ اُس آدمی کو دیکھو جسے خوف نے بھگا دیا تھا، اُس کو دعوائے خلافت ضرور تھا، مگر وہ مشرک تھا نہ مرتد"

[1] لیون سے جنوب مشرق میں تھوڑے فاصلے سے یہ ایک عیسائی ریاست تھی۔ مترجم

ز۵۱۰ بہرکیف عبداللہ اموی مضبوط دل کا آدمی نہ تھا، اُس کو معلوم نہ تھا کہ ایک باغی میں سب سے زیادہ ضروری چیز ہمت اور حوصلہ ہوتا ہے، وہ جس زمانہ میں مجلس میں پڑا روز موت کا منتظر تھا، تو اپنے خاندان کی ہمت و مردانگی کے خلاف اُس سے بزدلی ظاہر ہوئی، اُس کے ساتھی عبداللہ بن منصور عامری نے جس پامردی اور استقلال سے جان دی تھی وہ بات اس عبداللہ میں مطلق نہ تھی۔ وہ منصور کی خدمت میں قصیدے لکھ کر بھیجتا تھا اور اُن میں لکھتا تھا کہ دُوسروں کے بہکانے سے وہ فرار ہو گیا تھا، وہ خوشامد کر کے منصور کو خوش کرنا چاہتا تھا، ایک دفعہ منصور کو اشرف بنی لنوع انسان کہہ کر لکھا کہ "کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ کسی بدنصیب نے آپ سے رحم کی درخواست کی ہو اور وہ منظور نہ ہوئی ہو۔ آپ کی فیاضی اور رحمدلی آسمان سے بارانِ رحمت کی طرح برستی ہے"۔

باوجود اس خوشامد کے منصور کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا عبداللہ اموی کو قید خانے میں ڈال دیا، جان اُس کی اس لئے سلامت رکھی کہ منصور اُسے ایک حقیر اور ذلیل آدمی سمجھتے تھے۔

عبداللہ قید خانے میں مدت تک رہا اور جب تک حاجب المنصور کا انتقال نہ ہو گیا قید سے رہائی نہ ہوئی۔

اسناد

ابن خلدون — (نصرانی ملوک الاندلس کے حالات) ترجمہ مندرجہ ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" (۱۸۸۱ء) جلد ا ص ۸۹ تا ۱۱۶

(تاریخ بربر جلد ۳ ص ۲۱۹، ۲۲۷

ساپیرہ ۷ - ۲۹

کرونیکون ایرنسی ۷ - ۱۲

ابن الابار ص ۱۱۳ تا ۱۱۹، ۱۵۴، ۲۵۱ تا ۲۵۳

ابن الخطیب (قلمی نسخہ ہے) ص ۱۸۰ تا ۱۸۱

ابنِ عذاری - ج ۱ ص ۲۴۸ ج ۲ ص ۳۰۱

قرطاس ص ۵۸ تا ۵۹

مقری ج ۱ ص ۳۵۹ تا ۳۶۰ ، ۳۰۹

ج ۲ ص ۵۷

عبدالواحد ص ۲۴ تا ۲۵

ابو الفدا جلد ۲ ص ۵۳۴

کرونیکون برگنسی ص ۳۰۹

انالیس کمومپلوٹن سیس - اسپیناسگرادا - ص ۲۱۳ - ایضاً ص ۳۲۰

انالیس تولیڈومینس - جلد ا ص ۳۸۴

اسپیناسگرادا - جلد ۱۹ ص ۳۸۲

جلد ۳۶ ص ۴

کتابِ ثالث

خلافت

گیارھویں فصل

شنت یاقب (دی کومپوسٹیلا)

حاجب المنصور کو اسپین پر عملاً فرمانروائی کرتے ہوئے اب بیس برس گذر لیئے تھے، گو بادشاہی کرنے کا حق اُنھیں حاصل نہ تھا، مگر شروع ہی سے اِس کو حاصل کرکے واقعی بادشاہ بن کر حکومت کرنا اُن کا مقصودِ اصلی تھا، وہ لوگ حقیقت میں بے بصیرت تھے جو یہ نہ دیکھ سکتے تھے کہ کس طرح آہستہ آہستہ نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ایک ایک قدم جماتے ہوئے ایسے تثبت و اصرار کے ساتھ جس کے سمجھنے میں غلطی کا احتمال نہ تھا وہ اِس راہ میں آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ (۵۱۱)

سنہ ۹۹۱ء / ۳۸۱ھ میں حاجب کا لقب خود ترک کرکے اپنے بیٹے عبد الملک کو عطا کیا جس کی عمر اُس وقت پورے اٹھارہ برس کی بھی نہ تھی اور اپنی نسبت اعلان کیا، کہ اُن کو صرف المنصور کے لقب سے یاد کیا جائے۔

سنہ ۹۹۲ء / ۳۸۲ھ میں حکم دیا کہ دفترِ وزارت سے جس قدر کاغذات اجرا ہوں، اُن پر خلیفہ ہشام المویدکی مہر ثبت ہونے کی جگہ ان کی مہر لگائی جائے اور خود بھی المویدکا لقب جو دراصل خلیفہ ہشام کا لقب تھا اختیار کر لیا۔

سنہ ۹۹۶ء / ۳۸۶ھ میں فرمان جاری کیا کہ "سَیِّدْ" کا لفظ صرف اُنہی کے لیے استعمال کیا جائے، اس کے ساتھ "مَلِکِ کَرِیْم" کا لقب بھی خود اختیار کیا

پس دراصل المنصور ملک کے بادشاہ ہو گئے، گو خلیفہ ابھی تک نہ ہو سکے تھے، خلیفہ بننے میں اگر کوئی امر مانع تھا تو وہ خلیفہ ہشام کے باعث نہ تھا، ہشام ایسی چیز نہ رہے تھے جس سے خوف کیا جاتا، اگرچہ ہشام پورے جوان ہو گئے تھے مگر اُن کی جانب سے کسی قسم کی جنبش یا کوشش اِس بات کی متعلق ظہور میں نہ آئی تھی کہ وہ منصور کے اختیارات کا بارِ گراں اپنی گردن سے دُور کرنا چاہتے ہیں، ہشام سے قطع نظر کر کے مروانی شہزادوں میں بھی کوئی اتنا نہ تھا کہ دم مار سکتا، ان میں جو لوگ زبردست اور صاحبِ اقتدار تھے، اُن کو منصور پہلے ہی قتل یا جلا وطن کر چکے تھے۔ جو باقی تھے اُن کو مفلس اور تنگ دست کر دیا تھا، فوج کی طرف سے بھی المنصور کو اندیشہ نہ تھا کہ حصولِ مقصد میں وہ کوئی شوشہ اُٹھائے گی، کیونکہ فوج میں زیادہ تر بربر یا شمالی اسپین کے عیسائی تھے، یا صقالبہ اور ایسے عیسائی تھے جو بچپن میں لڑائیوں میں قید ہو کر آئے تھے اور جوان ہونے پر فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے، غرض فوجوں میں ہر قسم کے لوگ تھے اور کل فوجیں درحقیقت المنصور کی ساختہ پرداختہ اور آنکھیں بند کر کے اُن کے حکم پر چلنے والی تھیں۔ پھر وہ کون تھا جس سے المنصور ڈرتے؟

منصور جس چیز سے ڈرتے تھے وہ قوم تھی، ہشام المویدا اپنی ہی قوم میں اجنبی ہو گئے تھے، خاص دار الخلافہ قرطبہ میں بھی کم لوگ ایسے تھے جنھوں نے کبھی اُن کی صورت دیکھی ہو، اگر کبھی اتفاق سے اپنے سونے چاندی کے قید خانے سے نکل کر (۵۱۲)
مضافاتِ شہر کے کسی قصر میں وارد ہوئے تو حرم سرا کی عورتوں کا ایک غول اُن کے ساتھ ہوتا تھا انہی خواصوں کی طرح وہ بھی نیچا سا لباس پہنے ہوتے تھے اور اس کا تمیز کرنا مشکل

تھا کہ عورتوں میں ایک مرد بھی موجود ہے، قصرِ زہراء سے برآمد ہو کر جن بازاروں میں سے سواری گذرتی تھی وہاں منصور کے خاص حکم سے دو طرفہ فوج کھڑی کر دی جاتی تھی۔

مگر باوجود اس کم آمیزی اور تنہائی کے ہشام کی رعایا اُن سے محبت کرتی تھی، کیا وہ عادل و نیک بخت خلیفہ الحکم کے فرزند اور مشہورِ آفاق النّاصر کے پوتے نہ تھے؟ کیا وہ صحیح النسب داورِ حق دار اپنی سلطنت کے نہ تھے؟

شرافتِ نسب ایسی عزت تھی جس کی قدر ہر کہ دمہ کے دل میں بیٹھی ہوئی تھی، اُمراء سے لے کر عوام تک کو اُس کا پاس و لحاظ تھا، امراء میں زیادہ تر لوگ عربی النسل تھے، اُن کے خیال میں بادشاہی کا ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہونا کبھی مفید بلکہ ضروری بھی ہو سکتا تھا، لیکن عوام میں جو اسپینی نسل کے تھے ایسا کوئی خیال نہ تھا، مذہبی خیالات اور خاندانِ خلافت کے ساتھ موانست اُن کے دلوں میں نقش تھی، منصور نے سلطنت کو وہ شان و عظمت بخشی تھی جو پہلے کبھی خواب و خیال میں بھی نہ آسکتی تھی، مگر اس پر بھی رعایا منصور کے اِس قصور کو معاف نہ کر سکی کہ اُنھوں نے خلیفہ ہشام کو ہر اعتبار سے ایک قیدی بنا رکھا ہے۔ پس رعایا آمادہ تھی کہ اگر منصور نے تختِ خلافت حاصل کرنے کی ذرا بھی کوشش کی تو وہ فوراً بغاوت کر دے گی

المنصور اِن باتوں کو خوب سمجھے ہوئے تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ بادشاہ بننے میں تامل کرتے تھے، لیکن اُن کو امید تھی کہ رائے عامہ میں رفتہ رفتہ ایک انقلاب پیدا ہو جائے گا اور وہ توقع رکھتے تھے کہ آخر کار ہشام المویدؔ کو سب لوگ بھول جائیں گے، پھر رعایا کے خیالات سوائے اُن کے دوسری طرف مرکوز نہ ہوں گے اور اس صورت میں بادشاہی دوسرے کی طرف منتقل ہو جانے سے کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوگا۔

پس منصورِ اعظم کے لئے یہی بہتر تھا کہ اپنے سر پر تاجِ خلافت رکھنے کو وہ معرضِ التوا میں رکھتے، وہ اس بات کو بہت جلد سمجھ گئے کہ جس قدر قوت اور وزن اُن کو حاصل ہے وہ ایک کچے دھاگے میں بندھا ہوا معلق ہے، باوجود فتوحات کی شان و شہرت اور اپنی ناموری کے بالکل قریب تھا کہ ایک کمزور عورت اُن کے تنزل کا باعث ہو جاتی

وہ خاتون کون تھی؟ وہ سلطانہ صبح تھیں، ایک زمانہ تھا کہ وہ منصور سے بہت محبت رکھتی تھیں، لیکن اب پُرانی موانست کے خیالات دونوں کے دلوں سے محو ہو چکے تھے باہم کشیدگی تھی اور جیسا قاعدہ ہے دِلوں میں فرق آنے پر بے تعلقی ہی نہیں بلکہ دشمنی پیدا ہو گئی تھی، سیّدہ صبح ایسی عورت نہ تھیں کہ جو کام شروع کرتیں اُسے ادھورا چھوڑ دیتیں جب محبت تھی تو پوری محبت تھی، جب غصہ آیا تو اب وہ کم ہونا نہ جانتا تھا، غرض وہ منصور کی تباہی کے درپے ہو گئیں اور اِسی غرض سے اُنہوں نے حرم سرائے خلافت میں جہاں ہر طرح کا امن و امان رہتا تھا ایک ہیجان پیدا کر دیا، اپنے فرزند کو نصیحت کی اور سمجھایا کہ "غیرت کا تقاضا یہی ہے کہ مرد بن کر کوشش کرو اور ایک ظالم وزیر نے جو قیدیں تم پر لگائی ہیں اُن کو دُور کرو۔"

ملکۂ صبح کا یہ کرشمہ سمجھنا چاہیئے کہ انہوں نے کمزور سے کمزور انسان میں بھی ارادے (۵۱۳)
کی قوت پیدا کر دی، گو کیسی ہی خفیف سہی، ہشام نے اب منصور سے سرد مہری کا برتاؤ شروع کیا، پھر زیادہ جرأت کر کے ایک آدھ مرتبہ حاجب کو کسی بات پر ملامت بھی کی، اس اُٹھتے طوفان کو روکنے کے لئے منصور نے بعض لوگوں کو جو خطرناک معلوم ہوئے شاہی حرم سرا سے علیحدہ کر دیا، لیکن سیّدہ سلطانہ سے کیونکر نجات ملتی جو اس سازش کی اصل بانی تھیں،

اِس حرکت پر کہ حرم سرا سے کچھ لوگ علیحدہ کر دیے گئے دشمن کا غصہ اور تیز ہوا۔ سلطانہ صبح بھی نبرہ کی رہنے والی قوم بشکنس کی عورت تھی، جس کام میں ہاتھ ڈالا، پھر اُس سے مُنہ پھیرنا نہ جانا، ارادے میں سختی فولاد کی مثل تھی، منصور جیسے سخت تھے ویسا ہی سخت دشمن اُن کو ملا۔

ملکۂ صبح کے آوردوں نے ہر جگہ مشہور کرنا شروع کیا کہ خلیفہ ہشام نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب وہ سلطنت کا کل کاروبار اپنے ہاتھ میں رکھیں گے اور بغیر کسی وزیر کے عمل دخل کے خود حکومت کریں گے اور اُن کو اپنی رعایا پر پورا بھروسا ہے کہ وہ اُن کو اس حاجب سے جو حاجب کیا بلکہ اُن کا قید کرنے والا ہو گیا ہے جلد نجات دلوائے گی۔

سلطانہ صبح کے ایلچی آبنائے جبل طارق اُتر کر مغرب اقصیٰ میں پہنچے، قرطبہ میں ہنگامے شروع ہونے کے ساتھ ساتھ مغرب اقصیٰ میں وہاں کے حاکم زیری بن عطیہ نے اس امر کا اعلان کر کے کہ حاجب منصور نے بہ اختیارِ خود خلیفہ ہشام کو جو بادشاہ جائز ہیں قید کر رکھا ہے عَلَمِ بغاوت بلند کر دیا۔

زیری بن عطیہ ہی ایک ایسا شخص اس وقت زندہ بچا تھا جس سے منصور ڈرتے تھے، گو اب وہ دشمنوں کو ایسا حقیر اور ذلیل سمجھنے لگے تھے کہ اُن کا خوف اُن کو مطلق نہ رہا تھا، لیکن زیری بن عطیہ ایسا شخص تھا جس سے وہ ہمیشہ خائف چلے آئے تھے، اِس نیم وحشی بربر سردار نے افریقہ کے صحرا نشینوں میں وہ زور اور نسل کا غرور پیدا کر رکھا تھا جو زیادہ تر زمانۂ ماضی کے شایانِ حال ہو سکتا تھا، منصور کو یہ بات ناگوار تھی، مگر زیری کی عقل و ذہانت کے قائل ہو چکے تھے چند سال قبل زیری قرطبہ میں آیا تھا، اُس موقع پر منصور نے اُس کی بہت عزت کی تھی، وزیر کا خطاب اُسے دیا تھا، اور تمام مراتب و اکرام جو منصبِ وزارت سے متعلق تھے اُسے عطا کئے تھے جس قدر لوگ اُس کے ساتھ آئے تھے، اُن کے نام لشکر کے تنخواہ داروں کی فہرستوں میں درج کر دیے، چلتے وقت سفر خرچ اور جس قدر تحائف زیری لایا تھا اُن کی قیمت کے برابر روپیہ اُسے دیا لیکن زیری پر اِن عطایا کا کچھ اثر نہ ہوا، جس وقت قرطبہ سے رخصت ہو کر افریقہ پہنچا تو سر پہ ہاتھ رکھ کر افریقہ کی زمین سے کہا "فی الحال تو میں ہی تیرا مالک ہوں" پھر جب اُس کے ایک ملازم نے اُسے وزیر کہہ کر خطاب کیا تو بولا "وزیر، وزیر، کیا بکتا ہے، وزیر کیا چیز ہے میں امیر ابنِ امیر ہوں، اِس ابنِ ابی عامر خسیس نے بجائے درہم و دینار دینے کے خالی خولی ایک ذلیل سا خطاب دے دیا ہے، قسم ہے خدا کی، اگر اُندلس میں احمقوں اور کم ہمتوں کے سوا کوئی دوسرا بھی بستا ہے تو جو منصور آج ہے وہ کل نہ رہے گا، ر۵۱۴ خدا کا شکر ہے کہ میں پھر اپنی سرزمین پہ آگیا، اور اب وہ مثل صادق آتی ہے کہ شیطان کا حال کسی کی زبان سے سُننا اُس کی صورت دیکھنے سے بہتر ہوتا ہے۔"

یہ جملے اگر کسی اور کے منہ سے نکلے ہوتے تو فوراً سر قلم کر دیا جاتا، منصور کے گوش گذار

کئے گئے مگر انہوں نے کچھ خیال نہ کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد زیری کو مغربِ اقصٰی کا حاکم مقرر کر دیا،

منصور اگرچہ زیری سے ڈرتے اور نفرت کرتے تھے مگر اُس کو سچا آدمی اور سلطنت کا خیر خواہ بھی سمجھتے تھے، لیکن واقعات نے اُن کا یہ خیال غلط ثابت کر دیا، زیری بظاہر صاف اور سیدھا آدمی تھا مگر در پردہ چالاک اور طامع تھا، سلطانہ صبح نے جب رشوت کا لالچ دے کر جو کام اُس سے لینا تھا اُس کا ذکر کیا تو بہت آسانی سے آمادہ ہو گیا اور خلیفہ ہشام کی گردن سے منصور کا جوا اُٹھا کر اپنا جوا رکھنے کو تیار معلوم ہوا -

سلطانہ صبح جانتی تھیں کہ جس رشوت کے دینے کا وعدہ کیا ہے اُس کا ایک حصّہ پیشگی ادا کرنا ہوگا، عورت کی تیز سمجھ نے ایک ترکیب ایسی نکالی کہ رشوت کے لئے روپیہ بہم بھی ہو جائے اور افریقیہ میں زیری کے پاس پہنچ بھی جائے، خزانے کی عمارت قصرِ خلافت کے احاطہ کے اندر تھی، اس وقت خزانے میں ساٹھ لاکھ اشرفیاں موجود تھیں، اُن میں سے اسّی ہزار اشرفیاں نکال کر سّو مٹکوں میں بھریں، پھر ان مٹکوں میں سے کسی میں شہد، کسی میں مفرح عرقیات، کسی میں مسالے وغیرہ بھر دیے اور مٹکوں پہ اُن چیزوں کے ناموں کے پرچے بھی لگا دیے، پھر چند صقلبی غلاموں کو بلا کر مٹکے اُن کے حوالے کئے کہ نہر کے باہر جو جگہ ملکہ نے بتائی ہے وہاں اُن کو رکھ دیں، یہ ترکیب پوری چل گئی، عامل شہر کو مطلق شبہ نہ گزرا، اور غلاموں کو مع اُن کے بوجھ کے باہر جانے کی اجازت مل گئی اشرفیاں جس وقت مغربِ اقصٰی روانہ ہو لیں تو منصور کو کسی طرح خبر ہو گئی، منصور سخت متردد ہوئے، اگر اُن کو یہی معلوم ہوتا کہ سلطانہ صبح خلیفہ کے ذخائر پر بے پوچھے گچھے ہاتھ صاف کر رہی ہیں تو اُن کو زیادہ پریشانی نہ ہوتی، مگر قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے خلیفہ کے ایما اور اجازت سے ہوا ہے، اگر یہ خیال صحیح تھا تو حقیقت میں منصور کے لئے یہ نہایت نازک معاملہ تھا، چنانچہ انہوں نے اس کا تدارک فوراً سوچا اور ایک مجلس وزراء اور عمال اور فقہاء کی منعقد کی، اُس میں دیگر عمائد بھی جن کا تعلق عدالت یا شہر سے تھا شریک کئے گئے -

سب مجلس جمع ہو گئی تو بیان کیا کہ "حرم سرا کی عورتیں خزانہ کا روپیہ صرفہ کرتی رہتی ہیں خلافت پناہی ہر وقت عبادت الٰہی میں مصروف رہتے ہیں، اُن کو اتنی مہلت نہیں کہ لوگوں کو ایسی حرکتوں سے روکیں، اِس لئے اجازت ملنی چاہیئے کہ خزانہ کسی دوسری جگہ جو محفوظ مقام ہو منتقل کر دیا جائے" مجلس نے اجازت دے دی مگر اس اجازت کا کچھ نتیجہ نہ نکلا، جس وقت منصور کے بھیجے ہوئے آدمی خزانہ لینے کے لئے قصر کے دروازے پر آئے تو سلطانہ صبح نے اُن کو اندر آنے کی اجازت نہ دی اور زبانی کہلا بھیجا، کہ خلافت پناہی نے حکم دے دیا ہے کہ خزانے کے صندوقوں کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ (۵۱۵)

اب منصور عجب مشکل میں مبتلا ہوئے، زور یا زبردستی سے کام لینا گویا خلیفہ سے لڑنا ہوتا اور اگر ایسا کیا بھی تو فوراً بغاوت ہو جانے کا خطرہ ہے شہر کے لوگ پہلے ہی فساد پر آمادہ بیٹھے تھے، اب ذرا سا اشارہ انہیں کافی ہو جائے گا، سوچنے لگے کہ موقع نہایت نازک اور اندیشے کا پیدا ہو گیا ہے مگر جب تک زیری بن عطیہ لشکر لے کر اسپین میں آئے اور خلیفہ ہشام بھی اپنے ارادے میں مستقل رہیں تو اس سے پہلے ہی اِس معاملہ کو درستی پر لانے سے کیوں ناامید ہوا جائے، زیری ابھی تک افریقہ میں تھا، اور خلیفہ ہشام حالت تذبذب میں تھے، اِس لئے منصور کو ناامید ہونے کی ضرورت نہ تھی، ہمت کر کے سلطانہ صبح کی لاعلمی میں خلیفہ ہشام سے ملاقات کی، ہشام کا دل کمزور ادھر منصور کے ارادے میں قوت، چند منٹ کی گفتگو کا نتیجہ یہ ہوا کہ منصور کو پھر بادشاہی مل گئی، ہشام نے صاف صاف کہا کہ "بذاتِ خود میں حکومت کرنے سے قاصر ہوں اور خزانہ کہیں اور لے جانے کی تمہیں اجازت دیتا ہوں" مگر منصور نے اِس زبانی گفتگو کو کافی نہ سمجھا، بلکہ اپنے مخالفوں کو بے دست و پا کرنے کے لئے ایک تحریر بھی اِسی مضمون کی ہشام سے فوراً حاصل کرنی چاہی ہشام نے اُن سے وعدہ کر لیا کہ جو کچھ تحریر وہ اُن کے پاس بھیجیں گے اُس پر دستخط کر دیے جائیں گے، منصور نے ایک تحریر اِس مضمون کی خلیفہ کی خدمت میں دستخط کے لئے بھیجی کہ خلافت مآب نے سلطنت کا کل انتظام منصور کے سپرد کر دیا ہے، جیسا کہ اب تک طریقہ رہا ہے۔

اس تحریر پر دربار کے بہت سے امراء کے مواجہ میں ہشام نے اپنے دستخط کر دیے امرائ نے بھی اس وثیقے پر اپنی مہریں کر دیں (فروری یا مارچ ۹۹۷ء مطابق ماہ صفر ۳۸۷ھ) اس کے بعد منصور نے جہاں تک ممکن ہوا اس فرمانِ خلافت کا اعلان کیا۔

اب قرطبہ میں کسی ہنگامے کا خوف بالکل نہ رہا، سچ ہے اُس قیدی کو کون آزاد کرے جو آزاد ہونے سے ڈرتا ہو۔

منصور نے اب رعایا کا دل رکھنا چاہا، مُدّت سے شہر کے لوگ غل مچا رہے تھے کہ خلیفہ کا دیدار عرصۂ دراز سے نصیب نہیں ہوا، منصور نے خلیفہ کی سواری شہر میں نکالنے کا بندوبست کیا، چنانچہ ایک روز ہشام المؤید ہاتھ میں عصائے سلطنت، سر پر ایک اُونچی کلاہ جو صرف خلفاء پہن سکتے تھے، گھوڑے پر سوار، بڑے جلوس کے ساتھ شہر میں نکلے، منصور اور تمام اہلِ دربار ہمرکاب تھے، جہاں جہاں سے سواری نکلی ہزارہا مخلوق خلیفہ کی صورت دیکھنے کے لئے کھڑی تھی، کسی قسم کی بدنظمی کسی طرف سے پیدا نہ ہوئی اور نہ بغاوت کی آواز کہیں سے سُنائی دی۔

سلطانہ صبح نے قسمت پر صبر کیا، خستہ و دل شکستہ دنیا سے مایوس ہو کر عبادت الٰہی میں مصروف ہوئیں[1]۔ اور گزشتہ کو فراموش کر کے نا اُمیدیوں کی تلافی کی منصور (۵۱۶)
کا مزاحم سوائے زیری بن عطیہ کے اور کوئی نہ رہا، مگر وہ بھی زیادہ خطرناک نہ رہا تھا، کیونکہ ہشام کی طرف سے ہمت افزائی اور سلطانہ صبح سے روپیہ ملنے کی اب کوئی توقع اُسے نہ رہی تھی۔ منصور نے یہ خیال کر کے کہ اب زیری سے نامہ و پیام کی ضرورت نہیں رہی ہے فوراً زیری کے باغی ہونے کا اعلان کر دیا اور اپنے مولیٰ واضح کو حکم دیا کہ فوج لے کر زیری کے مقابلے کے لئے مغرب اقصیٰ روانہ ہو جائے۔

یہ خیال گذر سکتا تھا کہ مغربِ اقصیٰ میں لڑائی ختم ہونے سے پہلے منصور کہیں اور جنگ کا قصد نہ کریں گے، مگر منصور لڑائی سے کب رُکتے تھے، عیسائی ریاست لیون

---

[1] دیکھو آخری اشعار ابنِ دراج قسطلی کے مرثیہ کے جو اس شاعر نے ملکہ صبح کی موت پر لکھا۔ ثعلبی "یتیمہ" (قلمی نسخہ بوڈلین)

کے والیانِ اضلاع کو شریک کر کے برمند کے مقابلہ میں ایک مہم کی تیاریاں پہلے ہی سے شروع کردی تھیں، برمند نے یہ سمجھ کر کہ زیری سے جنگ ہو گئی ہے منصور کو اب میری طرف متوجہ ہونے کی مہلت نہ ہوگی سالانہ خراج بھیجنے سے انکار کر دیا، گو حالات بہت کچھ بدل چکے تھے، لیکن منصورِ اعظم اپنے ارادہ میں ثابت قدم رہے تاکہ زیری اور برمند اور اُن کے اور مخالفوں پر جو اس وقت دشمن تھے یا آئندہ دشمن ہونے والے تھے واضح ہو جائے کہ منصور ایک ہی وقت میں دو لڑائیاں اچھی طرح لڑ سکتے ہیں، بہرکیف منصور نے اپنی قوت کا اندازہ غلط نہیں کیا تھا، کیونکہ عیسائیوں سے جو لڑائی اب وہ لڑنے والے تھے اُسے منصوری فتوحات میں سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی، یہ لڑائی تاریخ میں حرب شنت یاقب کے نام سے مشہور ہے۔

شنت یاقب حواری کا مزار صوبہ جلیقیہ میں کمپوستیلا کے شہر میں تھا، رومۃ الکبریٰ سے قطع نظر کر کے یورپ میں کوئی شہر کمپوستیلا کے برابر عیسائیوں میں مقدس نہ مانا جاتا تھا، لیکن اُس کی شہرت بہت قدیم نہ تھی، قصہ یوں مشہور تھا کہ بادشاہِ فرانس قرلہ شارلیمن کے زمانہ میں جلیقیہ کے شہر ایرا کے اُسقف سے جس کا نام تھیودومیر تھا لوگوں نے کہا کہ ہم نے رات کے وقت ایک جھاڑی سے عجیب و غریب روشنی پیدا ہوتے دیکھی ہے، اور وہاں سے گانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں، یہ خیال کر کے کہ عنقریب کوئی معجزہ ہونے والا ہے پادری نے اُس کے ظہور کے لئے تین دن اور تین راتیں روزے رکھ کر خدا کی جناب میں دعا کی، اس کے بعد وہ اُس جھاڑی میں گیا تو وہاں سنگِ مرمر کی ایک قبر دیکھی، پادری نے فوراً الہام کے ذریعہ سے مطلع ہو کر اعلان کیا کہ یہ قبر یعقوب ابن زبدی حواری مسیح علیہ السلام کی ہے جس کی نسبت مدت سے روایت چلی آتی ہے کہ اسپین میں انجیل کی تعلیم سب سے پہلے انہی بزرگ نے دی تھی۔ پادری نے از روئے الہام یہ بھی بیان کیا کہ جب ہیرودوس کے حکم سے یروشلم میں یعقوب قتل کیا گیا تو اُس کے تلامذہ اُس کی لاش کو جلیقیہ میں اُٹھا لائے اور یہیں اُسے دفن کر دیا۔

اگر کوئی اور زمانہ ہوتا تو اِن باتوں پر طرح طرح کی نکتہ چینیاں ہوتیں، لیکن وُہ زمانہ اعتقاد بلا دلیل کا تھا، کسی کی مجال نہ تھی کہ کلیسہ کا کوئی بزرگ جب کوئی خبر دے تو اُس میں شک اور شبہ کر سکے، اور اگر اس قصے میں کسی کو شبہ گذرا بھی تو وہ پاپائے رومہ لیوسوم کے اِس مقدس فرمان سے رفع ہو گیا کہ قبر جو جھاڑی سے برآمد ہوئی ہے فی الواقع یعقوب شہید کی ہے۔

غرض اُسقف تھیودومیر نے جو خبر دی تھی وہ الہام سمجھی گئی اور جلیقیہ کے لوگوں کو اِس بات پر فخر ہوا کہ ایک حواری مسیحؑ کی ہڈیاں اُن کی زمین میں دفن ہیں، بادشاہ لیون اذفونش نے ایریا کے اُسقف کو حکم دیا کہ جہاں قبر دریافت ہوئی ہے وہیں سکونت اختیار کرے، چنانچہ اُسقف وہیں آباد ہو گیا، اور قبر پر اُس نے ایک گرجا تعمیر کرایا، اُس کے بعد اذفونش نے اسی قبر پر ایک وسیع اور عالیشان بہت خوبصورت عمارت تیار کرائی، چونکہ اس عمارت کے اندر عجیب و غریب کرشمے اور کرامات ظاہر ہوتے رہتے تھے، اِس وجہ سے اِس مقام کو بڑی شہرت ہو گئی، اور دسویں صدی عیسوی (چوتھی صدی ہجری) کے اخیر میں "کمپوستیلا دائے یعقوب شہید" کا مزار فرانس، اٹلی اور جرمنی کے لوگوں کی زیارت گاہ بن گیا، بلکہ مشرق کے ملکوں سے بھی دُور دُور کے زائر یہاں آنے لگے۔ (۵۱ء

اسپینِ اسلامیہ میں مسلمانوں نے شہر کمپوستیلا اور اُس کے بڑے گرجا کا حال سُنا تھا، اور بقول ایک عرب مورخ کے یہ مقام عیسائیوں کی نظر میں وہی رتبہ رکھتا تھا جیسے مسلمانوں کی نظر میں مکہ معظمہ، لیکن مسلمانوں کو اِس مقام کے تقدس کا حال دوسروں ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا، اُسے جا کر کسی نے نہ دیکھا تھا، کیونکہ مسلمانوں کو وہاں جانے میں یہ خدشہ تھا کہ کہیں عیسائی اُنہیں قید نہ کر لیں، کسی عرب سپہ سالار کو بھی فوج لے کر ایسے دشوار گذار اور دور مقام کو فتح کرنے کا خیال نہ آیا تھا

لیکن جس چیز کا کسی نے قصد تک نہ کیا تھا منصور نے اُسے کر دکھایا، منصور کو یہ بتانا منظور تھا کہ جو کام دوسروں کے لئے ناممکن ہے وہ اُس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں، چنانچہ اب یہ ارادہ کیا کہ دشمنانِ اسلام کے ایسے مقام کو منہدم کرنا چاہیئے

جسے وہ سب سے زیادہ مقدس خیال کرتے ہیں، یعنی اُس حواریِ مسیح علیہ السلام کی یادگار کو مٹانا چاہئے جو عیسائیوں کے عقیدے میں غائبانہ طور پر اُن کا ساتھ دے کر لڑائیوں میں لڑا کرتا ہے۔

۳ر جولائی ۹۹۷ء (۲۳ر جمادی الآخر ۳۸۷ھ) ہفتے کے روز منصور سواروں کی ایک فوج لے کر قرطبہ سے روانہ ہوئے، قوریہ کے راستے سے بازو کے شہر میں (جو پرتگال میں ہے) پہنچے، یہاں بہت سے قومس (عیسائی رئیس) جنہوں نے منصور کی اطاعت قبول کر رکھی تھی ساتھ ہو لئے، بازو سے منصور کی فوجِ سوارہ شہر برتقال کے سامنے آئی، شہر برتقال دریائے دویرہ کے دوسری طرف واقع تھا، دریا کے کنارے ایک بیڑا جہازوں کا تیار ملا، یہ بیڑہ پیدل فوج اور سامانِ رسد لئے ہوئے قصر ابی دانس (واقع پرتگال) سے جو ساحل پر واقع تھا، دریائے دویرہ میں داخل ہونے کے لئے پہلے سے روانہ کر دیا گیا تھا، تاکہ خشکی میں پیدل فوج کو زیادہ مسافت طے نہ کرنی پڑے،

سمندر طے کرنے کے بعد یہ بیڑہ دریائے دویرہ کے طول میں اس طرح داخل ہوا کہ ایک جہاز کے پیچھے دوسرا جہاز تھا، شہر برتقال کے سامنے پہنچ کر جہازوں کو دریا کے عرض میں اس طرح لنگر انداز کیا کہ جہازوں سے دریا پر ایک پل بندھ گیا، اور اس جہازوں کے پل سے سواروں کے رسالے جو منصور کے ساتھ تھے شہر برتقال کی جانب اُتر گئے، اب دریائے دویرہ اور دریائے مینہ کے بیچ میں ایک وسیع زمین پڑتی تھی اُس زمین پر عیسائی سردار حکومت کرتے تھے، یہ سب سردار مسلمانوں کے دوست اور مطیع تھے، اس قطعۂ زمین کو طے کرنے میں سوائے چند مقامات کے جو دشوار گذار تھے اور کہیں اسلامی لشکر کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی، دشوار مقامات سے گذرنے میں سب سے زیادہ مشکل ایک بلند پہاڑی سلسلے کے حائل ہو جانے سے ہوئی، لیکن منصور کی سفر مینا پلٹن نے ایک سڑک اس پہاڑی سلسلے میں سے گذرنے کے لئے بہت جلد تیار کر دی۔

دریائے مینہ کو عبور کر کے سوار اور پیدل فوجیں دشمن کے ملک میں پہنچ گئیں، یہاں منصور کو بے انتہا احتیاط اور نگرانی کی ضرورت ہوئی، کیونکہ لیون کی عیسائی

فوج جو اِس مہم میں مسلمانوں کے ساتھ تھی اُس کے تیور بدلے ہوئے نظر آتے تھے، اِن عیسائیوں کو پہلے تو کچھ خیال نہ آیا تھا، لیکن بعد کو مسلمانوں کا ساتھ دے کر عیسائیوں سے لڑنا اُن کو اپنے مذہب کی سخت توہین معلوم ہوئی۔

غرض اِن فوجی عیسائیوں نے دشمن سے جو اُن کا ہم مذہب تھا سازش کرنی چاہی اور سازش بھی ایسی کہ اگر اُس کا پتہ نہ چل جاتا تو یہ اسلامی مہم قطعی غارت ہو جاتی۔ منصور نے عین وقت پر عیسائیوں کے منصوبوں کو معلوم کر کے اُن کی سازش کو بے اثر کر دیا۔

مورخوں نے یہ قصہ جس طرح لکھا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے:۔

"ایک رات بہت سردی تھی، بارش ہو رہی تھی کہ منصور نے اپنے ایک معتبر سوار کو طلب کر کے حکم دیا کہ جلد درۂ طلیارش[۱] کو چلا جائے اور اُس درے پر پہرا دے اور جو پہلا آدمی درے میں سے گذرے اُسے ہمارے سامنے حاضر کرے، سوار فوراً روانہ ہوا اور درۂ طلیارش پر پہنچ کر پہرا دینے لگا، تمام رات برف اور مینہ میں کھڑے گذر گئی مگر کوئی راہ گیر اُدھر سے نہ گذرا، جب صبح ہونے کو ہوئی تو دیکھا کہ لشکر گاہ کی طرف سے ایک بڈھا آدمی گدھے پر سوار درے کی سمت آ رہا ہے، صورت سے لکڑ ہارا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ لکڑیاں کاٹنے کا اوزار اُس کے پاس ہے، سوار نے اُسے ٹوکا اور پوچھا کہ "کہاں جاتے ہو؟" بڈھے نے جواب دیا "جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتا ہوں"۔ اب یہ سوار دل میں کہنے لگا کہ "اس بڈھے کو منصور نے کیا طلب کیا ہوگا، ایسے ضعیف اور محتاج سے اُسے کیا کام ہو سکتا ہے؟" پس سوار نے اُس بڈھے لکڑ ہارے کو درے سے گذرنے دیا، لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ منصور کا حکم بالکل صاف تھا، اگر نافرمانی کی تو سزا کا خوف ہے، فوراً گھوڑا دوڑا کر لکڑ ہارے کو جا لیا، اور کہا کہ "تم کو اپنے مالک منصور کے پاس لے چلوں گا"۔ بڈھے نے کہا "مجھ غریب سے منصور کو کیا کام ہو سکتا ہے؟

---

[۱] یہ دریائے مینہ کے قریب تھا۔ عیسائی بادشاہ برمودو ثانی کے ایک فرمان میں یہ نام اور اُس کا موقع بیان ہوا ہے (اسپینا سگرادا۔ جلد ۱۹ ص ۳۸۱)

مہربانی کرو، مجھے اپنے رستے جانے دو، ورنہ میری روزی میں خلل پڑے گا۔" سوار نے کہا "نہیں تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا" بڈھا مجبوراً ساتھ ہولیا، اور دونوں لشکرگاہ میں آئے۔

منصور رات بھر نہ سوئے تھے، بڈھے لکڑہارے کو دیکھ کر اُنہیں کچھ تعجب نہ ہوا اور اُنہوں نے فوراً صقلبی غلاموں کو حکم دیا کہ اس بڈھے کی تلاشی لیں، حکم کی تعمیل ہوئی مگر تلاشی میں کچھ برآمد نہ ہوا، منصور نے اشارہ کیا کہ گدھے کی پالان کو دیکھا جائے، اب جو دیکھا تو منصور کا شبہ واقعی درست نِکلا، پالان میں سے ایک خط نکلا جو لیون کے (۵۱۹)
چند عیسائیوں نے جو اسلامی لشکر کے ساتھ تھے دشمن کو جو اُن کے ہم مذہب تھے اس مضمون کا لکھا تھا کہ اسلامی لشکرگاہ کا ایک رُخ ایسا ہے جس کی پوری حفاظت نہیں کی گئی ہے، اس پر دشمن کامیابی کے ساتھ حملہ کرسکتا ہے۔" اِس خط سے منصور کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کِس کِس نے یہ سازش کی تھی، چنانچہ باغی عیسائیوں کو مع اُس بڈھے کے جو لکڑہارے کے بھیس میں قاصد بنا تھا معاً قتل کروادیا۔"

منصور کی یہ تدبیر بہت مؤثر ثابت ہوئی، اور پھر کسی عیسائی کو جرأت نہ ہوئی کہ اس مہم کے دوران میں دشمن سے جاملتا۔

اب مسلمانوں کا لشکر آگے بڑھا، اور بہت جلد وسیع اور ہموار میدانوں میں (جن میں سے ایک کا نام بلنبو لکھا ہے) سیلاب کی مثل پھیل گیا، موجودہ شہر بیونہ اور توئی کے درمیان دیرِ قشطان یا قشتمان اور دیرِ دامیان[1] کو لوٹ لیا، اور قلعہ شنت بلابیہ کا محاصرہ کرکے اُسے فتح کرلیا، قریب ہی خلیج ویگو میں دو چھوٹے چھوٹے جزیرے تھے، اُن میں جو جزیرہ بڑا تھا اُس میں نواحِ شنت بلابیہ کے رہنے والے جان بچانے کیلئے بھاگ آئے تھے، اِس جزیرے میں پہنچنے کے لئے ساحل پر ایک جگہ السی مل گئی جہاں

---

[1] دیرِ دامیان کا موقع اُن پہاڑوں میں تھا جو بیونہ اور توئی کے درمیان واقع تھے، دیرِ دامیان کو بعد میں دیرِ سان کلماد و کہنے لگے۔ دیکھو "توئی کے قدیم آثار" مصنفہ سندووال۔ ص ۱۲۰

سے سمندر پایاب تھا، یہاں سے مسلمان اس جزیرے میں پہنچ گئے، اور جو لوگ وہاں بھاگ کر آئے تھے اُن کا مال و اسباب لُوٹ لیا، اس کے بعد لشکر نے دریائے ایلہ یا ایلہ کو عبور کیا، اور آگے بڑھ کر ایریا کے شہر کو (جس کا نام آج کل الپدرون ہے) مسمار کر دیا، یہ مقام بھی عیسائیوں کی پُرانی زیارت گاہ تھا، اور اسی شہر کے اسقف تھیودومیر نے یعقوب ابنِ زبدی کی قبر دریافت کی تھی۔

غرض ۱۱ راگست ۹۹۷ء (چہار شنبہ ۲ رشعبان ۳۸۷ھ) کو اسلامی فوجیں کمپوستیلا (شنت یاقب) میں پہنچ گئیں، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی خبر سنتے ہی شہر والے گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں، صرف ایک راہب یعقوب حواری کے مزار پر مراقبے میں بیٹھا ہے، منصور نے راہب سے پوچھا کہ "تم یہاں کیا کرتے ہو؟" راہب نے جواب دیا کہ "اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں" منصور نے کہا "اچھا عبادت کئے جاؤ" اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس راہب کو کوئی نہ ستائے۔

منصور نے یعقوب حواری کے مزار کی حفاظت کے لئے، اور اس خیال سے کہ کوئی اُس کی بے ادبی نہ کرے فوج مقرر کر دی، لیکن باقی شہر کو منہدم کرنے کا حکم صادر کیا، چنانچہ شہر پناہ، بڑا گرجا، اور مکانات گرا دیئے گئے، ابن حیان نے لکھا ہے کہ شہر کی عمارتیں بہت مضبوط تھیں، لیکن وہ اس طرح مسمار کی گئیں کہ کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ یہاں کچھ پہلے کوئی شہر تھا، اس کے بعد سواروں کے دستوں نے قرب و جوار کی زمینوں کو لُوٹا، اور آگے بڑھ کر شنت مانکش تک پہنچ گئے، جو شہر کرونہ کے قریب ایک مقام تھا۔

کمپوستیلا میں ایک ہفتہ قیام کے بعد منصور نے لشکر کو لمیقیہ[1] کے شہر کی طرف واپسی کا حکم دیا، لمیقیہ پہنچ کر عیسائی فوجوں کے سرداروں کو جو اس مہم میں شریک ہوئے تھے 52.
بہت سا انعام دیا، جن میں بہت سے قیمتی کپڑے بھی تھے، پھر اُن کو رخصت کیا، اور لمیقیہ ہی سے اس مہم کی پوری کیفیت لکھ کر دربارِ قرطبہ کو روانہ کی، عرب مؤرخوں نے

---

[1] ابنِ عذاری نے یہ نام ملیقو لکھا ہے (کتابت کی غلطی سے م، ل سے پہلے آ گیا ہے)

اس تحریر کا مطلب ہی نہیں بلکہ اُس کے الفاظ تک اپنی تصانیف میں محفوظ رکھے ہیں۔

آخر کار منصور بہت سے عیسائی قیدی ساتھ لئے قرطبہ میں داخل ہوئے ان قیدیوں کو شننت یاقب والے گرجا کے کواڑ اور گھنٹے اپنے کندھوں پر لانے پڑے، گرجا کے کواڑ تو مسجد کے بالاخانے پر جس کی تعمیر ابھی تک ناتمام تھی لگائے گئے[۱] اور گھنٹے اسی مسجد میں اس طرح آویزاں کئے گئے کہ اُن سے گھنٹوں کی بجائے چراغوں کا کام لیا جائے اُس وقت کس کو خبر تھی کہ آئندہ زمانہ میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ یہی چیزیں مسلمان قیدیوں کے سروں پر رکھ کر قرطبہ سے شننت یاقب پہنچائیں جائیں گی۔

مغرب اقصٰی میں منصور کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، اس میں شبہ نہیں کہ شروع میں چند فتوحات واضح کو حاصل ہوئیں، ارزیلہ اور نکور پر اُس نے قبضہ کیا، زیری بن عطیہ کو بہت نقصان پہنچایا، لیکن اس کے بعد قسمت نے زیادہ ساتھ نہ دیا، اور واضح کو ایک موقع پر شکست کھانی پڑی، مجبور ہو کر طنجہ میں پناہ لی، طنجہ سے واضح نے ایک مراسلہ منصور کی خدمت میں اس غرض سے روانہ کیا کہ فوج کمک فوراً روانہ کی جائے، فوج کے آنے میں دیر نہ لگی، واضح کا خط پہنچتے ہی منصور نے ایک فوج قرطبہ سے جزیرۃ الخضراء کو روانہ کر دی، اور اس خیال سے کہ جزیرۃ الخضراء سے مغرب اقصٰی کی روانگی میں فوجوں کو جہازوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچنے میں دیر نہ ہو، منصور خود جزیرۃ الخضراء تک فوج کے ساتھ آئے۔

اس فوج نے جو منصور کے فرزند عبدالملک المظفر کی سرکردگی میں تھی آبنائے جبل طارق کو عبور کیا اور سبتہ میں جا اتری، اس خبر نے کہ اسپین سے فوج آ رہی ہے مغرب اقصٰی میں

---

[۱] دیکھو کتاب "تحقیقات" (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) جلد ۱ ص ۱۰۱ اسپین کی تاریخ میں ان دروازوں کا قصہ بھی ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان کی تاریخ میں سومناتھ کے مندر کے کواڑوں کا تھا کہ محمود غزنوی اُنہیں اکھیڑ کر غزنی لے گیا، اور وہاں سے لارنس صدیوں کے بعد اُسے پھر ہندوستان لایا ایک قصہ تو جھوٹا ثابت ہو چکا ہے، یہ دوسرا بھی جھوٹا ثابت ہو جائے گا (مترجم)

اچھا اثر پیدا کیا، بہت سے بربر سردار جو اب تک زیری کا ساتھ دے رہے تھے اُس سے علیحدہ ہو کر عبدالملک المظفر کے عَلَم کے نیچے آ گئے، عبدالملک مع فوجِ کمک کے واضح کے لشکر سے آملا، زیری کی فوجیں مقابلہ کے لئے آگے بڑھ رہی تھیں، عبدالملک جلد اُن سے لڑنے کے لئے میدان میں اُتر آیا، اور اکتوبر ۹۹۸ء (شوال ۳۸۸ھ) کو ایک مقام پر فریقین میں جم کر سخت لڑائی ہوئی، اور صبح سے شام تک جاری رہی، قریب تھا کہ عبدالملک کی سپاہ شکست کھا جائے، لیکن ایک اُسودِی نے جس کے بھائی کو زیری نے قتل کرا دیا تھا زیری کو زخمی کیا، تین گہرے زخم پہنچا کر یہ اُسودِی گھوڑا دوڑاتا ہوا عبدالملک کے پاس اِس واقعے کی خبر سُنانے آیا، عبدالملک نے پہلے تو اُس کی بات کا یقین نہ کیا کیونکہ زیری کا عَلَم ابھی تک بلند تھا، لیکن جب زیری کے زخمی ہونے کا یقین ہو گیا تو عبدالملک نے دشمن پر یلغار کر کے اُسے قطعی شکست دے دی۔

۱۷ اِس جنگ نے زیری بن عطیہ کی قوّت کا خاتمہ کر دیا، جن علاقوں پر وہ مُسلّط ہو گیا تھا وہ پھر خلافتِ قرطبہ کے عمل میں آ گئے، اور اس واقعہ کے تین برس بعد یعنی ۱۰۰۱ء (۳۹۲ھ) میں زیری بن عطیہ پُرانے زخموں کے پھوٹ جانے سے فوت ہو گیا۔

اسناد:-

ابنِ عذاری۔	جلد ۱ ص ۲۶۲
	جلد ۲ ص ۳۱۵ تا ۳۱۸
قرطاس	ص ۶۵ تا ۶۷، ۷۳
مقری	جلد ۱ ص ۳۸۹، ۳۹۲
	جلد ۲ ص ۶۴، ۱۴۶، ۳۱۸ تا ۳۱۹
نویری	ص ۱۷۴
ابنِ خلدون	(تاریخ بربر) جلد ۲ ص ۱۴
	جلد ۳ ص ۲۴۳، ۲۴۸

کتابِ ثالث

خلافت

بارھویں فصل

المنصور کی وفات

منصور کی زندگی اب خاتمے کے قریب آن لگی ہے، ۱۰۰۲ء (۳۹۲ھ) کی ربیع میں منصور شمال کے عیسائیوں سے لڑنے کے لئے روانہ ہوئے، وہ ہمیشہ دعا مانگا کرتے تھے کہ میدانِ جنگ میں میرا دم نکلے، اور انہیں اس دعا کے قبول ہونے کا اس قدر یقین تھا کہ جب کبھی لڑائی پر جاتے تو سامان میں کفن بھی ضرور رکھ لیتے، یہ کفن ان کی بیٹیوں نے سیا تھا، اور کفن کا کپڑا باپ دادا کی جاگیر طرّش کی آمدنی سے خریدا گیا تھا کسی اور آمدنی کو وہ اتنا پاک نہ سمجھتے تھے کہ اس سے ایسی چیز خریدی جائے، عمر جوں جوں بڑھتی گئی عبادت میں زیادہ مصروف رہنے لگے، چونکہ خدا کا حکم تھا کہ جس کے پاؤں پر راہِ خدا کی گرد ہوگی اس پر آتشِ دوزخ حرام ہو جائے گی، اس لئے جہاد میں جب کبھی لڑنے کے بعد کہیں قیام کرتے تو اپنے کپڑوں کی گرد احتیاط سے جھاڑ کر ایک

ہتھیلی میں جمع کرتے جاتے تھے، اور یہ کہہ رکھا تھا کہ دفن کرنے سے پہلے یہ خاک میرے جسم پر چھڑک دینا، اُن کو یقین تھا کہ جہاد میں جو محنتِ شاقہ اُنہوں نے اٹھائی ہے وہ قیامت میں اُن کی نجات کا باعث ہوگی۔

منصور کی آخری جنگ قشتالیہ کی عیسائی ریاست کے مقابلہ میں ہوئی، جس طرح اور لڑائیاں جیتتے تھے، اس لڑائی میں بھی فتح پائی، اور قشتالیہ کے علاقے میں بڑھتے بڑھتے شہر قنالیس[1] تک پہنچے، یہاں سنت الیمیان کے مزار کی عمارت جو ملک قشتالیہ کے نگہبان ولی سمجھے جاتے تھے، اس طرح منہدم کرادی جس طرح پانچ برس پہلے سنت یاقب کا گرجا مسمار کرادیا تھا۔

منصور جب اس لڑائی کے بعد قرطبہ کو واپس آنے لگے تو بیمار پڑ گئے، اور ایک مرض جس کی شکایت پہلے سے تھی عود کر آیا، اطبا تشخیصِ مرض اور علاج سے ناچار تھے، اس لئے دوا نہ پیتے تھے، اور اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ اب نہ بچوں گا۔ چونکہ گھوڑے پر سوار نہ ہو سکتے تھے اس لئے تختِ رواں پر سوار کئے گئے، تکلیف سخت تھی، ایک مرتبہ کہنے لگے کہ "اس وقت ۲۰ ہزار آدمی میرے لشکر میں ہیں مگر ایک کو بھی (۵
وہ تکلیف نہیں جو مجھے ہے"

پندرہ دن تک تختِ رواں پر سوار رہ کر منصور آخر کار مدینہ سالم میں پہنچے، صرف ایک خیال اُس وقت اُن کے ذہن میں تھا، اُن کی حکومت کبھی ایسی نہ رہی تھی کہ اُس پر معترض نہ پیدا ہوئے ہوں، اور بعض نازک وقت ایسے بھی آئے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ باوجود شہرت اور ناموری کے جو فتوحات سے حاصل ہوئی تھی وہ معرض زوال میں آنے کو ہیں، اب یہ خیال اُن کے دل میں رہنے لگا کہ مرنے کے بعد تمام اختیارات اُن کی اولاد کے قبضے سے نکل جائیں گے، اس خیال سے اُن کو ہر وقت تکلیف رہنے لگی اور زندگی کا آخری زمانہ تلخ گذرا، ایک روز اپنے سب سے بڑے فرزند عبدالملک

۱؎ یہ شہر موجودہ صوبہ ریوجہ میں شہر ناجرہ سے ۲۰ میل جنوب میں واقع ہے۔

کو قریب بُلایا، اور بہت سی نصیحتیں کر کے حکم دیا کہ سپہ سالاری کا کام اپنے بھائی عبدالرحمٰن کو سپرد کر کے قرطبہ چلے جاؤ، اور وہاں پہنچتے ہی کُل اختیارات اپنے قبضے میں کر لو، اگر بغاوت کی علامتیں دیکھو تو اُس کو فرو کرنے کے لئے تیار رہو،

عبدالملک نے اپنے باپ کا حُکم بجا لانے کا وعدہ کیا، لیکن منصور کچھ ایسے مضطرب تھے کہ جب کبھی عبدالملک یہ سمجھ کر کہ گفتگو ختم ہو گئی ہے اُٹھ کر چلنے کو ہوتے تو اُن کو پھر واپس بُلاتے، کمزوری کی حالت میں بار بار خیال کرتے کہ کوئی بات کہنے سے رہ گئی ہے بیٹے کو پھر کچھ نصیحت و ہدایت کر کے بیٹھنے کو کہتے، عبدالملک جب رونے لگے تو اُن کو منع کیا اور کہا "دیکھو یہ رونا کمزوری اور عجز کی پہلی نشانی ہے" عبدالملک کو جب رخصت ہونے کی اجازت دی تو اُس کے بعد مرض میں افاقہ ہوا، اور دوسروں کو جو لشکر میں تھے سامنے طلب کیا، یہ لوگ حاضر ہوئے، منصور اس قدر ناتوان اور لاغر ہو گئے تھے کہ صورت بھی مشکل سے پہچانی جاتی تھی، بات بھی اب منہ سے کم نکلتی تھی کچھ اشاروں سے کچھ لبوں کی جنبش سے اُن سرداروں سے آخری رخصت چاہی، اور اُس کے چند روز کے بعد ۱۱ اگست سنہ ۱۰۰۲ء (۲۸ رمضان سنہ ۳۹۲ھ) دوشنبہ کے روز اس جہاں سے رحلت کی، مدینہ سالم ہی میں دفن کئے گئے، اور قبر پر یہ اشعار کندہ ہوئے ؎

آثارہٗ تُنبئکَ عن اَخبارہٖ	حتّٰی کانّکَ بالعیانِ تَراہُ
تاللہِ لا یاتی الزمان بمثلہٖ	اَبداً ولا یحمی الثغورَ سواہُ

ترجمہ - خود اُس کے آثار و نشانات اُس کی تاریخ سے تجھے آگاہ کریں گے اور اس طرح آگاہ کریں گے کہ گویا تو اُن کو بچشم خود دیکھ رہا ہے، خدا کی قسم! زمانہ اب اُس کی مثل پیدا نہ کرے گا، اور نہ اب اُس کے سوا کوئی دوسرا اس ملک کی سرحدوں کا حامی اور محافظ پیدا ہوگا۔

یہ کتبہ تو مسلمانوں نے منصور کی قبر پر لکھا، لیکن ایک (دشمن اسلام) عیسائی راہب نے اپنی تاریخ میں منصور کی موت کا ذکر ان الفاظ میں کیا[1] "المنصور سنہ ۱۰۰۲ء میں

---

[1] کرنیکون برگنسی صفحہ ۳۰۹

مرگیا اور جہنم میں دفن ہوا" یہ سادے اور مختصر الفاظ ایک پاُفتادہ اور درماندہ دشمن نے نفرت اور عداوت کے جوش میں لکھے ہیں، لیکن اِن میں جو فصاحت ہے وہ بڑھیا سے بڑھیا قصیدے کی تعریف میں بھی نظر نہیں آسکتی دگالیاں تعریف سے ہمیشہ زیادہ فصیح ہوتی ہیں۔ مترجم)

حقیقت یہ ہے کہ شمالی اسپین کے عیسائیوں کو منصور جیسے دشمنِ صعب سے کبھی پہلے مقابلہ کرنا نہیں پڑا تھا، منصور پچاس لڑائیوں سے زیادہ اِن عیسائیوں سے لڑے، عام طریقہ یہ تھا کہ دو لڑائیاں ہر سال لڑتے تھے، ایک ربیع میں اور دوسری خریف میں۔ اِن پچاس سے زائد لڑائیوں میں ایک لڑائی بھی ایسی نہ تھی جس میں منصور ہارے ہوں، اِس ہمیشہ کی فتح نے اُن کو بے حد نامور کر دیا، ماسوا عیسائیوں کے متعدد شہروں کے جن میں اُن کے تین دارالحکومت یعنی لیون، پنپلونہ اور برشلونہ بھی شامل تھے منصور نے جلیقبہ اور قشتالیہ کے محافظ اور نگراں اولیائے مسیحی کے مزاروں اور گرجاؤں کو بھی مسمار کر دیا تھا، ایک عیسائی مؤرخ[۲] لکھتا ہے کہ "اس زمانہ مسیح کی عبادت عیسائیوں سے مفقود ہو گئی، خادمانِ مسیح کی شان و عظمت مٹ گئی، کلیسہ کے خزانے جن میں صدیوں کی دولت جمع تھی لُٹ گئے۔"

غرض منصور کے نام سے عیسائیوں کا دم فنا ہوتا تھا، یہ خوف اس قدر تھا کہ بعض موقعوں پر منصور خطروں میں گھر جانے کے بعد بھی صحیح سلامت نکل آئے، اور اگر کبھی عیسائیوں کے قابو میں بھی آ گئے تو بھی اُن کا ڈر اس قدر تھا کہ عیسائی اُن کا کچھ نہ کر سکتے، مثلاً ایک مرتبہ عیسائیوں کے ملک میں ایک تنگ پہاڑی درے میں سے گذرتے ہوئے جس کے دونوں جانب اُونچے اُونچے پہاڑ تھے دُور نکل گئے، مسلمانو

ے۱ دیکھو ۱۰۲۷ء کالوربنتی دالا فرمان، میرزد ۱۸۰۶ء ج ۲ ص ۳۵۵

ے۲ موناکی سی لین سیس گرد نیکون (اسپینا سگراوا، ج ۱۷، ص ۲۔

نے جو ساتھ تھے گرد و نواح کے علاقوں کو خوب تباہ و غارت کیا، عیسائی اُن کو مطلق نہ روک سکے، لیکن جب منصور واپسی میں اُسی پہاڑی درّے کے قریب آئے جس سے گذر کر آگے بڑھے تھے تو دیکھا کہ عیسائیوں نے درّے پر قبضہ کر رکھا ہے۔

عیسائیوں کو اب اس درّے سے ہٹانا اور درّے میں سے گذرنا مسلمانوں کو بہت خطرناک معلوم ہوا، وہ اسی فکر میں تھے کہ منصور نے ایک تدبیر کی، یعنی ایک اچھی سی جگہ دیکھ کر کچھ شامیانے نصب کرائے اور چند جھونپڑیاں ڈلوا دیں، عیسائی قیدی جو ساتھ تھے اُن سب کو وہاں قتل کیا، اور اُن کی لاشوں کو اوپر نیچے چُن کر ایک دیوار سی بنائی۔ سوار گھوڑوں کے لئے چارہ تلاش کرنے لگے، جب چارہ نہ ملا تو منصور کے حکم سے آلاتِ کشاورزی نکالے گئے اور سپاہیوں کو حکم ہوا کہ زمین جوتیں اور بوئیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر عیسائی بہت گھبرائے اور سمجھے کہ اب تو یہ مسلمان ملک سے ٹلتے نظر نہیں آتے، اس کا ڈر ایسا بیٹھا کہ انہوں نے منصور سے امان چاہی، مگر شرط یہ کی کہ مسلمانوں نے جو مالِ غنیمت عیسائیوں سے حاصل کیا ہے وہ واپس کر دیا جائے، منصور نے اس شرط کو منظور کرنے سے قطعی انکار کر دیا، اور جواب دیا کہ "ہمارے سپاہی جہاں ہیں وہیں آباد ہونا اپنے حق میں بہتر سمجھتے ہیں، وطن واپس جانے کی اب اُن کو ضرورت نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ اس سال میں ابھی پہلی لڑائی ختم ہوئی ہے اور دوسری کا وقت قریب آگیا ہے" تھوڑی سی اور گفتگو کے بعد عیسائی اس بات پر راضی ہو گئے کہ منصور مالِ غنیمت اپنے ہی پاس رکھیں، اور اُن کے ملک سے کسی طرح واپس چلے جائیں۔

عیسائیوں کو منصور کا اس قدر خوف تھا کہ اُنہوں نے مسلمانوں کو باربرداری کے ز۲۵ص
جانور دینا، اور اُن کا سامانِ رسد خود اسلامی سرحد تک پہنچانا، اور راستے کو جس میں لاشیں لشکر[1] کے گذرنے میں حائل تھیں خود ہی صاف کرنا قبول کر لیا۔

ایک مرتبہ عیسائیوں کے ایک شہر کے سامنے ایک بلند پہاڑی پر مسلمانوں

---

[1] مقابلہ کرو روڈریگو دی ٹولیڈو کی "ہسٹری ایرابم" ص ۳۱۔

نے اپنی فوج اُتاری، علَم بردار نے پہاڑی کے سب سے اونچے مقام پر اسلامی جھنڈا نصب کیا، جب مسلمانوں کی فوج وہاں سے کوچ کرگئی تو علَم بردار جھنڈا اکھاڑنا بھول گیا، بہت دن تک پہاڑی پر یہ جھنڈا لہراتا رہا لیکن کسی عیسائی کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ پہاڑی پر جاکر اتنا تو دیکھ لیتا کہ مسلمان وہاں موجود ہیں یا چلے گئے۔

بیان ہوا ہے کہ منصور کا ایک سفیر نبرہ کے عیسائی بادشاہ غرسیہ کے پاس گیا، غرسیہ نے اُسے بہت انعام واکرام دیا، یہ سفیر نبرہ کے سارے علاقے میں دورہ کرتا پھرا، اتفاق سے اُسے ایک گرجا میں ایک مسلمان بڑھیا ملی، اُس نے بیان کیا کہ وہ بچپن سے عیسائیوں کی قید میں ہے اور ایک لونڈی کی حیثیت سے گرجا میں رہتی ہے، سفیر سے اُس نے کہا کہ میرے حال سے منصور کو آگاہ کردینا، سفیر نے بڑھیا سے وعدہ کیا، اور تھوڑے دن کے بعد قرطبہ واپس آکر سفارت کے کل حالات منصور کی خدمت میں عرض کئے، جب کل حالات سُنا چکا تو منصور نے خود ہی پوچھا کہ نبرہ میں تم نے کوئی بات ایسی تو نہیں دیکھی جو ناگوار ہوئی ہو؟ اتنا سُنتے ہی سفیر کو وہ بڑھیا یاد آئی، اور اُس نے منصور سے اُس کا کل حال کہا، منصور بولا "واللہ! سفارت کے حالات سے پہلے تمہیں اِس واقعہ کا ذکر کرنا چاہیئے تھا" اتنا کہہ کر جنگ کی تیاری کی اور نبرہ کی سرحد پر لڑنے روانہ ہوگئے۔

غرسیہ بادشاہِ نبرہ نے سُنا کہ منصور لڑنے آئے ہیں تو سخت پریشان ہوا، اور ایک خط اُن کی خدمت میں بھیجا اور اُس میں لکھا کہ "مجھ سے کیا خطا ہوئی ہے جو یہ نوبت آئی، اپنی دانست میں تو مجھ سے کوئی قصور نہیں ہوا" قاصدوں سے جو غرسیہ کا خط لائے تھے منصور نے کہا "کیا غرسیہ نے مجھ سے اس بات کی قسم نہیں کھائی تھی کہ کوئی مسلمان عورت یا مرد اُس کے ملک میں قید نہیں رہے گا، اُس نے جھوٹی قسم کھائی، کیونکہ مجھے خبر لگی ہے کہ تمہارے گرجا میں ایک مسلمان عورت قید ہے میں نبرہ کی زمین سے اُس وقت تک نہ ٹلوں گا جب تک وہ عورت مجھے نہ ملے گی" غرسیہ کے پاس جس وقت یہ جواب پہنچا تو اُس نے اُس مسلمان بڑھیا کو اور دو

اور عورتوں کو جو تلاش کرنے پر اُس کے علاقے میں ملیں فوراً منصور کے پاس بھیج دیا اور بقسم عرض کیا کہ اِن عورتوں کو نہ کبھی اُس نے دیکھا تھا، اور نہ اُس کو اس کا علم تھا کہ وہ نبرہ میں موجود ہیں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ "جس گرجا کا ذکر آپ نے کیا ہے اُس کے مسمار کیے جانے کا حکم میں نے خود دے دیا ہے"

دشمنوں کا تو یہ حال تھا کہ منصور کے ڈر سے اُن کی جان نکلتی تھی، اور فوجوں کی یہ کیفیت تھی کہ منصور پر اپنی جان فدا کرتی تھیں، اور اُس کو اپنے باپ کے برابر سمجھتی تھیں منصور کو اہلِ فوج کی تمام ضرورتوں کا بے حد خیال رہتا تھا لیکن فوجی قواعد کی ۵۲۶)
پابندی میں نہایت سخت گیر تھا، ایک دن فوج کا معائنہ کرتا تھا کہ کسی سپاہی کی تلوار جو اُس وقت نیام میں ہونی چاہیئے تھی نیام سے باہر چمکتی نظر آئی، فوراً حکم دیا کہ یہ سپاہی سامنے حاضر کیا جائے، جب سپاہی سامنے آیا تو اُس سے پوچھا کہ تم نے بغیر حکم کے تلوار کیوں برہنہ کی؟ سپاہی نے کہا کہ تلوار میں اپنے ایک ساتھی کو دکھانی چاہتا تھا، میں نے خود اسے نیام سے نہیں نکالا تھا بلکہ وہ خود پھسل کر باہر نکل آئی، منصور نے کہا تمہارا عذر نامعقول ہے" پھر فوراً افسرانِ فوج کی طرف دیکھ کر کہا کہ "اسی تلوار سے اس کی گردن اڑا دی جائے اور اُس کی لاش تمام فوج کے سامنے سے نکالی جائے تاکہ سب لوگوں کو تنبیہ ہو جائے کہ فوجی قواعد وضوابط کی پابندی کیسی لازمی چیز ہے"

اس مثال نے فوج کے لوگوں پر بے حد اچھا اثر کیا، بیان ہوا ہے کہ جس وقت فوجیں منصور کے سامنے سے گذرتی تھیں تو بالکل خاموش ہوتی تھیں، ایک عرب مصنف لکھتا ہے کہ "آدمی تو آدمی گھوڑے تک اپنا کام سمجھتے تھے، اور اُن کے ہنہنانے کی آواز شاذ و نادر ہی سنائی دیتی تھی"

یہ المنصور ہی کی تربیت دی ہوئی قواعد داں فوج تھی جس نے اسپین کو سطوت و اقبال میں اُس بلندی پر پہنچایا جو کبھی پہلے اُس کو نصیب نہ ہوئی تھی، یہاں تک کہ یہ عروج اُس کو خلیفہ عبد الرحمٰن الناصر کے زمانہ میں بھی نہیں ہوا تھا، لیکن منصور کا صرف یہی ایک کارنامہ نہ تھا، یہ وہ شخص تھا جس نے نہ صرف ملک کو بلکہ تہذیب اور

تمدن کو بھی اپنا ممنونِ احسان کیا تھا، اہلِ ملک کی علمی و ذہنی قابلیتوں کی قدر کر کے ہمیشہ اُن کی عزت افزائی کی، یہ سچ ہے کہ سیاسی مشکلات کی وجہ سے اُنھوں نے فلسفہ کی تعلیم کو ترقی نہیں دی، لیکن جب کبھی ممکن ہوا فلسفیوں کو پناہ دی، اور یہ بھی اس طرح کہ فقیہوں کو ناگوار نہ گذرے، مثلاً ایک موقع ایسا آیا کہ قاسم ابن محمد سنبوسی[1] کو کافر ہونے کے اشتباہ میں گرفتار کر کے قید خانے بھیج دیا گیا، سب لوگوں نے ابن السنبوسی کے خلاف شہادت دی، اور فقہا نے اُس کے خلاف سزائے موت تجویز کر دی، ابن السنبوسی قریب تھا کہ قتل کر دیئے جائیں، لیکن ایک بڑے فقیہہ ابن المقوا، جنھوں نے اِن مقدمے میں قاضی بن کر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا مجلسِ عدالت میں آئے اور ابن السنبوسی کی صفائی میں ایک ایسی تقریر کی جو اگرچہ منطقی اعتبار سے ناقص تھی مگر ابن المقوا کی شرافت اور نیک دلی پر گواہ تھی، صدرِ مجلس قاضی ابن السسری دورانِ تقریر میں ابن المقوا کی برابر مخالفت کرتے رہے مگر ابن المقوا نے آخر کار قتل کا حکم مجلس سے مسترد کرا ہی دیا، منصور قاضی ابن السسری کی اس سختی پر اُن سے ناراض ہو گئے، اور اس فکر میں ہوئے کہ قضا کی سخت گیری کا کوئی انتظام کریں، چنانچہ ایک موقع آیا اور منصور نے کہا "تائیدِ دین ہمارا فرض ہے اور مومنین ہماری پناہ کے مستحق ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ قاضی ابن (۵۲۷ السسری صدرِ مجلس نے ابن السنبوسی کو مجرم ثابت کرنے میں بے مثل کوشش کی، لیکن مجلس کو آخر الامر یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ سچے مسلمان ہیں، پس اس سے ثابت ہوا کہ قاضی ابن السسری ایک ظالم شخص ہیں اور اس قابل نہیں کہ آیندہ زندہ رہنے دیئے جائیں"۔

یہ تقریر صرف ہدایت اور تنبیہ کے طور پر تھی، قاضی صاحب کچھ عرصہ کے بعد قید خانے بھیج دیئے گئے، اور یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ جب وہ قید سے رہا ہو کر اپنی جگہ پر بحال ہوئے

---

[1] بعض اور عالم بھی ان کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے، ہر جمعہ کو مسجد کے دروازے پر یوگ بٹھا دیئے جاتے تھے اور ایک آدمی پکار پکار کر کہتا تھا "جس کسی کو ان لوگوں کے خلاف کچھ کہنا ہو وہ کہے"۔ کتاب "تحقیقات" مولفہ ڈوزی (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) ج ۲ ص ۲۳۷

ہوں گے تو انہوں نے ایسے لوگوں پر جو عام اور مسلّم دینی عقائد سے تجاوز کر کے فلسفیانہ خیالات میں مصروف ہوتے تھے سختی کم کر دی ہوگی ۔

دربارِ منصور میں علماء کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا تھا ، درباریوں میں بہت سے شاعر بھی تھے جن کو معقول تنخواہیں ملتی تھیں اور یہ شاعر بعض وقت لڑائیوں میں منصور کے ہمراہ جایا کرتے تھے ، انہی شعراء میں ابو العلاء صاعد بن الحسن ربعی بغدادی تھے ، یہ علم و فضل میں سب سے زیادہ تھے مگر بڑے پُر لطف اور زندہ دل شخص تھے ، اندلس خاص کے علماء ہمیشہ غیر ملک کے باکمال لوگوں کو رشک کی نظر سے دیکھا کرتے تھے ، لیکن ابو العلاء صاعد کو بہر کیف وہ بھی مانتے تھے ، لغت ، ادب اور تاریخ کے وہ بڑے عالم تھے اور حاضر جوابی میں جواب نہ رکھتے تھے ، لیکن سچ بولنے سے بے پروا اور بات گھڑ لینے میں استاد تھے ، جب کچھ کہنا شروع کرتے تو اُن کو کوئی روک نہ سکتا تھا ، باتیں بھی جتنی سناتے تھے وہ عجیب و غریب ہوا کرتی تھیں ، اگر کسی ایسے لفظ کے معنی جس کا کہیں وجود نہ ہوتا ، اُن سے پوچھے جاتے تھے تو بلا تکلف فوراً ایک معنی بیان کر کے سند میں کسی پرانے شاعر کا کلام اُسی وقت پیش کر دیتے تھے ، اگر اُن کا بیان تسلیم و یقین کیا جاتا تو دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جسے اُنھوں نے پڑھا نہ ہو ، ایک روز منصور کی موجودگی میں چند عالموں نے اُن کی قلعی کھولنے کے لئے اُن کے سامنے ایک ایسی کتاب پیش کی جس میں از اوّل تا آخر سادے ورق تھے ، صرف سرورق پر کتاب کا نام اور اُس کے مصنّف کا نام ابو الغوث صنعانی تحریر تھا ، کتاب اور مصنّف دونوں فرضی چیزیں تھیں ، لیکن صاعد سرورق پڑھتے ہی فرمانے لگے " اچھا - یہ کتاب تو میری پڑھی ہوئی ہے " اور اتنا کہہ کر کتاب کو چوما ، اور پھر اُس شہر کا نام بتایا جہاں اُنھوں نے یہ کتاب پڑھی تھی اور اُس عالم کا نام بھی بتایا جو اُس کا درس دیا کرتا تھا ، یہ سب باتیں سُن کر منصور بولے تو پھر آپ کو کتاب کا مضمون بھی خوب معلوم ہوگا ، صاعد نے کہا " اس میں کیا شک ہے مگر اس کو پڑھے ہوئے اتنی مدت ہو گئی ہے کہ اب اُس کا مضمون ازبر نہیں ہے ، مگر اتنا خوب یاد ہے کہ اس میں صرف نحو کے مباحث ہیں ، تاریخ اور شاعری سے اُس سے

کوئی تعلق نہیں ہے۔" حاضرین صاعد کی یہ گفتگو سُن کر بے اختیار ہنس پڑے۔

ایک اور موقع پر منصور کے پاس اسپین کے ایک صوبہ دار مبرمان بن یزید[1] کا ایک خط آیا جس میں "قلب" اور "تنزیل" (یعنی کاشتکاری اور کھاد) کا بیان تھا منصور نے صاعد سے پوچھا کہ تم نے مبرمان بن یزید کی کتاب "الفوالب والزوالب" بھی دیکھی ہے؟" صاعد بولے "واللہ! یہ کتاب میں نے دیکھی ہے، ابن درید (۵
نے اس کتاب کی ایک نقل تیار کی تھی اور یہ نقل بغداد میں میں نے مطالعہ کی تھی حاشیہ پر ایسے نشان تھے جیسے چیونٹیاں چلی ہوں" منصور نے کہا "صاعد تم بڑے دروغ گو ہو، نام جو میں نے تمہارے سامنے بیان کیا تھا وہ کسی مصنف کا نہ تھا بلکہ ہمارے ایک صوبہ دار کا نام ہے، اُس نے مجھے ایک خط زراعت اور قلبہ رانی کے متعلق لکھا ہے۔" صاعد بولے "یہ سب درست ہے لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں نے کوئی غلط بات آپ سے کہی ہے، میں کبھی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ جس کتاب اور مصنف کا نام آپ نے لیا ہے وہ واقعہ ہے اور اگر آپ کے صوبہ دار کا وہی نام ہے جو مصنف کا ہے تو پھر یہ محض ایک توارد ہے۔"

ایک اور موقع پر منصور نے اُن کو ابو علی قالی کی کتاب[2] الامالی دکھائی، صاعد کتاب دیکھ کر کہنے لگے "اگر آپ فرمائیں تو اس سے بہتر کتاب آپ کے کاتبوں کو زبانی لکھوا دوں اور اس میں وہ باتیں بھی بیان ہوں جو ابو علی قالی سے چھوٹ گئی ہیں۔" منصور نے جواب دیا "بہت مناسب ہے" منصور واقعی چاہتے تھے کہ کتاب الامالی جسے اُس کے مصنف نے المستنصر باللہ کی خدمت میں لکھ کر پیش کیا تھا اُس سے بڑھ کر کوئی تصنیف اس کے سامنے پیش ہو، بلکہ واقعہ یہ تھا کہ منصور نے صاعد کو بغداد سے

---

[1] کتاب المعجب میں علامہ عبدالواحد المراکشی نے یہ نام مبدمان لکھا ہے، مگر پروفیسر ڈوزی نے اسے مبرمان لکھا ہے۔ مترجم

[2] اس کتاب میں عربی ادبیات کے عمدہ نمونے اور زباندانی سے متعلق لطائف درج ہیں۔ دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۸۵۵

اِسی اُمید میں بلایا تھا کہ ابوعلی قالی کی شہرت کو جس نے ناصر اور مستنصر کے دربار کو رونق بخشی تھی صاعد مٹا دیں گے ،

صاعد منصور کی فرمائش سنتے ہی تصنیف میں مصروف ہوئے اور مدینۃ الزاہرہ کی جامع مسجد میں بیٹھ کر منصور کے کاتبوں کو کتاب لکھوانے لگے ، جب کتاب ختم ہوئی تو بڑے بڑے علمائے معاصر نے نہایت ذوق و شوق سے اُسے پڑھا ، لیکن پڑھنے کے بعد بظاہر اُن کو حیرت اور درپردہ خوشی ہوئی کہ کل کتاب از اوّل تا آخر صاعد کی من گھڑت ہے ، چنانچہ یہی رائے علمائے اس کتاب کی نسبت قائم کی اور منصور نے بھی اس رائے کو تسلیم کیا ۔

اس موقع پر منصور صاعد سے واقعی ناخوش ہو گئے اور حکم دیا کہ صاعد کی لکھی ہوئی کتاب دریا میں پھینک دی جائے ، لیکن باوجود اس کے مصنف کے حق میں اپنی مہربانیاں کم نہیں کیں ، جس دن سے صاعد نے غرسیہ والی فشتالبہ کی گرفتاری کی پیشین گوئی کی تھی اور وہ سچی نکلی تھی اُس دن سے منصور اُن کی عزت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی کرامات کے بھی قائل ہو گئے تھے ۔

صاعد اپنی شکر گزاری کا ہزارہا طریقوں سے ثبوت دیتے تھے اور منصور بھی اس بات کو خوب سمجھتے تھے ، ایک مرتبہ صاعد نے بہت سی تھیلیاں جن میں اُن کو وقتاً فوقتاً انعام میں روپیہ ملا تھا ، جمع کیں اور اُن کو جوڑ جوڑ کر ایک لمبی سی قبا بنائی اور یہ قبا اپنے ایک حبشی غلام کو جس کا نام کافور تھا پہنا کر قصرِ منصور میں حاضر ہوئے (۵۲۹)
دو چار باتوں کے بعد جب دیکھا کہ منصور خوش ہیں تو کہنے لگے "میں حضور سے ایک مہربانی چاہتا ہوں" منصور نے پوچھا "وہ کیا ؟" صاعد کہنے لگے کہ "صرف اتنی درخواست ہے کہ میرے حبشی غلام کافور کو حضور کے سامنے حاضر ہونے کی اجازت مل جائے" منصور نے کہا "یہ عجیب درخواست ہے ، اچھا بلاؤ" ۔ اتنا حکم ہوتے ہی حبشی غلام کافور جو لمبے قد کا آدمی تھا ، چھوٹے چھوٹے رنگ برنگ پارچوں کی ایک لمبی سی قبا پہنے جیسے کسی درویش کی گدڑی ہو کمرے میں داخل ہوا ، منصور نے

دیکھتے ہی کہا "اِس غریب کو یہ قبا کس نے پہنائی ہے، کیسا نا معقول لباس ہے، ایسے کپڑے کیوں پہنائے ہیں؟" صاعد بولے "یہ تو آپ پر بخوبی روشن ہے کہ مجھے بہت بہت سا روپیہ اکثر تھیلیوں میں بھر کر آپ عنایت فرماتے رہے ہیں، انعام مجھے اتنی بار ملا کہ تھیلیاں میرے پاس بکثرت جمع ہو گئیں اور اتنی جمع ہو گئیں کہ اِس حبشی غلام کافور جیسے دراز قد آدمی کے لئے پنچی قبا تیار ہو گئی"۔ منصور یہ سن کر ہنس پڑے اور کہنے لگے "صاعد! واقعی خوبصورتی سے کسی کا شکریہ ادا کرنا تم کو خوب آتا ہے، میں تمہاری اِس حرکت سے بہت خوش ہوا"۔ اِس کے بعد منصور نے اور بہت سے تحائف صاعد کو بھیجے، اُن میں ایک لباس کافور کے لئے بھی تھا۔

یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ دربارِ منصور میں صاعد جیسے شاعر اور عالم کا موردِ عنایات ہونا ایک خاص وجہ سے تھا اور وہ وجہ یہ تھی کہ سلاطینِ مروانیہ کی طرح منصور امورِ علمیہ میں اعلیٰ درجہ کا مذاق نہ رکھتے تھے، شاعروں کو وابستۂ دولت رکھنا ایک ضروری فرض اور اپنے درجے کے شایاں اور دربار کا زیور سمجھتے تھے، لیکن اتنا وقت نہ تھا کہ سچے اور جھوٹے موتیوں میں تمیز کر لیتے۔

بہر کیف علم اُن کی طبیعت کا خاص جوہر نہ تھا لیکن عمل میں کمال اُن پر ختم ہو گیا تھا۔ ملک کے حق میں تمام مادی فوائد کے وہ ایک روشن ضمیر حامی اور سرپرست تھے۔ ذرائع رسل و رسائل میں ترقی کا خیال اُن کو ہمیشہ رہا، متعدد سڑکیں اور شاہراہیں تیار کرائیں۔ شہر استجہ میں دریائے شنیل پر ایک پُل اور قرطبہ میں وادی الکبیر پر پرانے پُل کے علاوہ ایک نیا پُل تیار کرایا۔

اُن کے تمام کاموں میں چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے ان کی لیاقت اور ذہانت صاف نظر آتی تھی، جب کبھی کوئی بڑا عزم کرتے یا کسی بڑی مہم پر جاتے تو اکابرِ سلطنت سے مشورہ کرتے، لیکن کبھی اس مشورے کو مانتے نہ تھے، مشیرانِ دولت جو قاعدے بندھے ہوئے تھے انہیں کے مطابق رائے دیتے تھے، ہر کے سب تقلید پرست تھے صرف اتنا یاد رکھنا کافی سمجھتے تھے کہ ایسی حالت میں منصور نے یہ کیا تھا اور مستنصر نے یہ

کہا تھا، اس کے علاوہ کوئی بات اُن کے ذہن میں نہ آتی تھی، جب دیکھتے کہ منصور اپنی بات پر اصرار کئے جاتے ہیں تو سمجھتے کہ اس خودرائی سے منصور ضرور نقصان اٹھائیں گے اور نوبت ہلاکت تک پہنچے گی، لیکن انجام میں مشیروں کا خیال غلط اور نتیجہ منصور کے حق میں اچھا نکلتا تھا۔

ابنِ ابی عامر المنصور کی طبیعت اور اوصاف کا اندازہ کرنے میں ہم اس بات کو نہیں ۵۳۰ ر
بھول سکتے کہ قوت اور اختیارات کو حاصل کرنے کے بعد اُن کو برقرار رکھنے میں اخلاقی قواعد سے وہ بالکل ہٹ جاتے تھے اور نہ صرف یہ بلکہ اُن سے واقعی جرائم بھی سرزد ہوئے، جن کو ہم نے ہمیشہ بے کم و کاست لکھا ہے، اُن کی تاویل میں کوشش نہیں کی، لیکن انصاف ہم کو اس امر کے ظاہر کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ جہاں کہیں ان کے حبِ جاہ و منزلت میں کوئی امر مخل و مزاحم نہ ہوتا تھا وہاں ابنِ ابی عامر المنصور صادق العمل فیاض اور عادل ثابت ہوتے تھے، حصولِ مقصد میں شدید اصرار جس کی مثالیں ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اُن کی طبیعت کا سب سے بڑا خاصہ تھا، جب کسی بات کا ارادہ کر لیتے تو پھر اُس سے نہ ٹلتے، ہمت اور ارادے کی قوت اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ جسمانی اور دماغی دونوں قسم کی اذیتیں بے تکلف برداشت کر لیتے تھے، ایک روز مجلسِ شوریٰ میں بیٹھے تھے، پاؤں میں کوئی مرض تھا، جراح نے گوشت جلانا شروع کیا، منصور بدستور جس مسئلہ پر بحث کر رہے تھے بحث کرتے رہے۔ جب گوشت جلنے کی بو پھیلی، تو ارباب مجلس پر حال کھلا، اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اُن لوگوں کو معلوم بھی نہ ہوتا کہ ممبرِ مجلس کے پاؤں پر عملِ جراحی ہو رہا ہے۔

منصور کے ہر فعل سے حزم و استقلال ظاہر ہوتا تھا، دوستی کے بھی ایسے ہی پکے تھے جیسے دشمنی کے، اگر کسی نے اُن کی خدمت کی تھی تو اُسے کبھی نہ بھولے، اسی طرح اگر کسی نے نقصان پہنچایا تو وہ کبھی دل سے نہ مٹتا۔

منصور کے اِن اوصاف کا ثبوت اُن طالب علموں کو خوب ملا جن سے شروع زمانہ میں کہا تھا کہ "جو عہدہ مانگنا ہے اب مانگ لو، جب میں وزیر ہو جاؤں گا تو وہی عہدہ

دوں گا۔" ان طلبا میں سے تین نے منصور کی بات کو سچ سمجھ کر جو منصب چاہے تھے منصور نے وزیر ہو کر وہی اُن کو دیئے[۱] ۔ لیکن چوتھے طالب علم کو جس نے منصور کی بات لغو خیال کی تھی اور بہت جل کر جواب دیا تھا اپنی گستاخی کی پوری سزا بھگتنی پڑی ۔ منصور نے کسی قصور میں اس کی جائداد ضبط کر لی ۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی تھی کہ جب منصور کو علم ہو جاتا تھا کہ حافظی انہوں نے کسی کے ساتھ بے انصافی کی ہے تو وہ اپنی خود رائی اور اصرار کو ترک بھی کر دیتے تھے، ایک دن کا ذکر ہے کہ خاص خاص قیدیوں کی رہائی کے لئے اُن کے ناموں کی ایک فہرست منصور کے حضور میں پیش ہوئی، اس فہرست میں منصور کی نظر اپنے ایک نوکر کے نام پر پڑی جس سے وہ سخت ناراض تھے اور وہ مدت سے بے قصور قید خانے میں پڑا تھا، منصور نے اس کا نام دیکھتے ہی فہرست کے حاشیہ پر لکھا " یہ آدمی جب تک جہنم واصل نہ ہو جائے اس کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ۔" اتنا لکھنے کے بعد منصور کو رات بھر نیند نہ آئی ، دل بار بار پکڑا جاتا تھا اور سوتے جاگتے یہ معلوم ہونے لگا کہ کوئی بڑی مہیب صورت انسان سے زیادہ طاقت رکھنے والی سامنے موجود ہے اور کہتی ہے کہ " اس آدمی کو قید سے رہا کر دو ، ورنہ اپنی بے انصافی کی سزا برداشت کرو ۔" منصور نے بہت کوشش کی کہ یہ مہیب صورت سامنے نہ آئے مگر وہ صورت کسی طرح سامنے سے نہ ٹلتی تھی، آخر کار خوابگاہ ہی میں پڑے پڑے قلمدان منگوایا اور قیدی کی رہائی کا حکم ان الفاظ میں لکھا کہ
۵۳ یہ شخص ابن ابی عامر کی مرضی کے خلاف خدا کا رہا کردہ ہے ۔"

ایک اور موقع پر مدینۃ الزاہرہ کے ایک پرفضا باغ میں بیٹھے وزیر ابو مغیرہ ابن حزم کے ساتھ مے نوشی میں مصروف تھے ، باوجود پابندِ مذہب ہونے کے شراب پینے کی عادت رکھتے تھے ، مرنے سے صرف دو برس پہلے تائب ہو گئے تھے ، شام کا وقت بڑی بہار کا تھا ، ایک خوبصورت کنیز سامنے بیٹھی گا رہی تھی ، اس حسین گانے والی کو منصور بہت چاہتے تھے مگر وہ ابو مغیرہ پر فدا تھی ، چنانچہ اُس نے چند اشعار اس مضمون کے گائے :

---

[۱] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۸۵۷

"دن رخصت ہونے کو ہے، ماہتاب کا نصف دائرہ آسمان پر ظاہر ہو چکا ہے، غروب ہوتا ہوا آفتاب معشوق کے عارضِ گلگوں کی طرح روشن ہے، ساغر کا شیشہ برف کی مثل شفاف ہے اور اس میں شرابِ آتشیں رنگین معلوم ہوتی ہے، میری آنکھیں ایسے ایسے گناہ کر چکی ہیں جو معاف ہونے کے قابل نہیں، لوگو! افسوس، میں ایک ایسے نوجوان سے محبت رکھتی ہوں جو مجھے اپنے عشق سے دُور رکھنا چاہتا ہے، گو میرے قریب ہے، اے کاش! میں اس سے وصل ہو جاتی اور وہ مجھے اپنے سینے سے لگا لیتا۔"

ابو مغیرہ ان الفاظ کا مطلب خوب سمجھ رہا تھا، اب خود اُس نے اُن کا جواب ان اشعار میں گانا شروع کیا:۔

"میں اُس حسین صورت تک کیونکر پہنچ سکتا ہوں جس کے گرد تلواریں اور برچھیاں تنی ہیں، افسوس! اگر میرے دل کو یہ یقین ہوتا کہ تیری محبت میرے ساتھ سچی ہے۔ تو تیرے لئے جان کھو دیتا، جو شریف دل اپنی منزلِ مقصود کو پہنچنا چاہتا ہے اُسے کوئی خطرہ نہیں روک سکتا۔"

منصور کو اب تاب نہ رہی، غصے سے للکارا، نیام سے تلوار نکالی اور بڑی مہیب آواز میں گانے والی سے پوچھا "سچ بتا، اشعار جو تو نے گائے ہیں کیا اُن میں تیری مراد مغیرہ سے تھی؟" اُس نوجوان گانے والی نے کہا "شاید جھوٹ بولنے سے میری جان بچ جائے، لیکن میں جھوٹ نہ بولوں گی، بیشک اُس کی نظر میرے کلیجے کے پار ہو چکی ہے عشق ایسی بات کو برملا کہلوا رہا ہے جسے میں کبھی زبان پر نہ لاتی، میں حضور کے قبضے میں ہوں، لیکن حضور دریا دل ہیں اور قصور کے اقرار پر قصور معاف کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ عورت رونے لگی، منصور نے عورت کا قصور قریب قریب معاف کر دیا، لیکن ابو مغیرہ کی طرف دیکھ کر اُسے نہایت سخت و سست کہا، ابو مغیرہ بالکل خاموش سب باتیں سُنتا رہا۔
جب منصور چپ ہوئے تو ابو مغیرہ نے کہا "آقا! میں اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے بہت بڑی خطا ہوئی ہے، لیکن میں کیا کر سکتا ہوں، تقدیر سے انسان لاچار ہے، کوئی شخص

اپنی نقدیر خود نہیں مقرر کرتا، میری قسمت میں یہی تھا کہ مجھے اس سے عشق ہو جس سے عشق نہ ہونا چاہیئے تھا۔" منصور یہ سُن کر کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے "اچھا میں تم دونوں کا قصور معاف کرتا ہوں، ابو مغیرہ! جس سے تم کو عشق ہے وہ آج سے تمہاری ہے میں اُسے تمہیں دیتا ہوں۔"

منصور کا انصاف ضرب المثل ہو گیا تھا، اُن کا حکم تھا کہ انصاف بغیر رعایت کے اور بغیر اس امتیاز کے کہ فریقین کس درجے کے آدمی ہیں، کیا جائے۔ جن لوگوں پر وہ مہربان ہوتے وہ بھی قانون کی گرفت سے باہر نہ تھے، ایک مرتبہ عوام الناس میں سے ایک شخص نے اُن کے سامنے آ کر غل مچانا شروع کیا کہ "اے مظلوموں کے دادرس! اس آدمی نے جو حضور کے پیچھے کھڑا ہے مجھ پر ظلم کیا ہے۔" اتنا کہہ کر اُس نے ایک صقلبی کی طرف اشارہ کیا جو منصور کا سپر بردار تھا اور آقا اُس کو بہت مہربانی کی نظر سے دیکھتا تھا، پھر اسی فریادی نے کہا "میں نے اس کو عدالت میں طلب کرایا تھا مگر اس نے حاضر ہونے سے انکار کر دیا۔" منصور نے تیز آواز سے پوچھا "کیا عدالت میں حاضر ہونے سے انکار کیا اور قاضی نے اسے مجبور نہیں کیا؟ قاضی عبد الرحمٰن ابن فوطس سے مجھے بہتر توقع تھی، لیکن یہ تو بتاؤ کہ وجہ شکایت کیا تھی؟" اس پر فریادی بولا کہ "اس صقلبی نے مجھ سے ایک عہد کر کے اُسے توڑا ہے۔" پورا قصہ سُن کر منصور نے کہا "ان خدمت گاروں نے میرا نفس تنگ کر دیا ہے۔" صقلبی خوف سے کانپنے لگا اور منصور نے غصہ سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا "تیرے پاس جو آدمی کھڑا ہے اُس کو ہماری سپر دے دے اور تو خود عدالت میں عاجزی کے ساتھ حاضر ہو، اور جو الزام تجھ پر ہے اس کا جواب دے تاکہ انصاف ہو سکے۔" اس کے بعد افسر پولیس سے کہا کہ "ان دونوں آدمیوں کو صاحب المظالم (مجسٹریٹ) کے پاس لے جاؤ اور کہو کہ اگر اس صقلبی پر جرم ثابت ہو تو میں چاہتا ہوں کہ اُس کو قید یا کسی اور طرح کی سخت سزا دی جائے۔" قاضی نے مدعی کے حق میں مقدمہ فیصل کیا، مدعی منصور کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا، منصور نے کہا "شکریہ کی ضرورت نہیں، تمہارا انصاف ہو گیا اور تم کو اطمینان ہو گیا مگر مجھے ابھی اطمینان نہیں ہوا

کیونکہ مجھے اُس نالائق صقلبی کو سزا دینی ہے جس نے باوجود اس کے کہ میرا ملازم تھا ایک ذلیل کام کرنے میں شرم نہ کی۔" یہ کہہ کر فریادی کو رخصت کیا۔

اسی طرح ایک مرتبہ منصور کے ایک خدمت گار کا جو داروغہ تھا ایک افریقی سوداگر سے جھگڑا ہو گیا، نوبت عدالت تک پہنچی، قاضی نے سوداگر سے کہا کہ "حلف لے کر شہادت دو۔" لیکن جب داروغہ سے بھی حلف کے لئے کہا گیا، تو اُس نے یہ سمجھ کر کہ منصور کے مزاج میں اُسے بہت دخل ہے عدالت اُس کا کیا کر سکتی ہے، حلف لینے سے انکار کیا، ایک دن منصور جامع مسجد جا رہے تھے داروغہ ساتھ تھا، سوداگر راستے میں ملا اور اُس نے دہائی دے کر جو واقعہ گذرا تھا بیان کیا، منصور نے اسی وقت داروغہ کو گرفتار کرا دیا اور حکم دیا کہ اس کو قاضی کے پاس لے جائیں، پھر یہ سُن کر کہ قاضی نے داروغہ کے خلاف فیصلہ کیا ہے داروغہ کو اپنی خدمت سے برطرف کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ جہاں ایسے وسائل و ذرائع کو جن سے منصور نے اختیارات شاہی
(۵۳۲) حاصل کئے، ہم بُرا کہنے پر مجبور ہوتے ہیں، وہاں اس بات کا اقرار کرنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جب سطوت سلطانی حاصل کر لی تو پھر نہایت شریفانہ طریقہ پر اُس سے کام لیا، اگر تقدیر اُن کو ایک شاہی گھرانے میں پیدا کر کے تخت سلطنت پر بٹھاتی تو دنیا کو بہت کم موقع اُنہیں بدنام کرنے کا ملتا اور اس صورت میں اُن کا شمار اُن سلاطین عظام میں ہوتا جن کے کارنامے تاریخ نے محفوظ کر رکھے ہیں، لیکن وہ ایک جاگیر دار کے گھر پیدا ہوئے اس لئے مجبور تھے کہ اپنا مقصود دلی حاصل کرنے میں ہزارہا موانع کو جو سنگ راہ ہوں ہٹاتے ہوئے اپنا رستہ نکالیں اور ہم اس کا افسوس نہیں کر سکتے کہ ان موانع کو دور کرنے میں جو طریقے اُنھوں نے اختیار کئے وہ جائز نہ تھے، اکثر وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے شخص تھے، لیکن اگر اخلاق کے مضبوط قوانین کو پیش نظر رکھ کر اُن کی نسبت کوئی فیصلہ نہ بھی کیا جائے تو بھی وہ ایسے شخص تھے جن سے محبت کرنی ناممکن اور جن کی تعریف کرنی مشکل تھی۔

○

اسناد :-

ابنِ عذاری جلد۲ ص ۳۰۹ تا ۳۱۱، ۳۲۰ تا ۳۲۱

مقری جلد ۱ ص ۲۵۹، ۲۷۳ تا ۲۷۴، ۳۸۷، ۳۹۲

۴۰۶ تا ۴۰۷

جلد۲ ص ۵۲، ۶۵

ابن الابار ص ۱۵۰

ابن الخطیب (قلمی نسخہ G) ص ۱۱۸، ۱۸۱

حمیدی ص ۱۰۰ تا ۱۰۳

عبدالواحد ص ۱۹ تا ۲۵

ابنِ خلکان (سلین) جلد ۱ ص ۳۲۲

کتابِ ثالث

خلافت

تیرھویں فصل

سنجول

منصور کے فرزند عبدالملک جن کا لقب مظفر تھا، باپ کے مرنے پر جس وقت (۵۳۴)
قرطبہ پہنچے تو ایک ہنگامہ دیکھا، تمام رعایا نے غل مچا دیا کہ اب بادشاہ جائز و حقدار کو زمامِ سلطنت خود سنبھال کر حکومت کرنی چاہیئے۔ ہشام المؤید نے بہت کہا کہ وہ سلطنت کی فکروں سے آزاد رہ کر زندہ رہنا چاہتے ہیں، مگر کسی نے نہ مانا، رعایا نے ایک بلوے کی شکل اختیار کر کے اپنی مراد کو پہنچنا چاہا، مظفر نے اس بلوے کو بزورِ شمشیر فرو کیا اور کچھ دنوں کو امن ہو گیا۔ یہ واقعہ بھی سچ ہے کہ خلیفہ ناصر کے ایک پوتے نے جس کا نام بھی ہشام تھا عبدالملک مظفر کو جان سے مارنے کی سازش کی تھی، مگر مظفر کو وقت پر اطلاع ہو گئی۔ اور اس نے اس سازش کو درہم برہم کر کے خلیفہ ناصر کے اِس پوتے ہشام کو قتل کرا دیا۔ (دسمبر ۱۰۰۶ء مطابق ربیع الاول ۳۹۶ھ)

حکومت اور انتظام کے اعتبار سے مظفر اپنے باپ کے قدم بقدم چلے علیسائیوں پر بہت سی فتوحات حاصل کیں، جب تک برسرِ حکومت رہے ملک ترقی پر رہا، لیکن بعد کے

لوگوں نے اُن کے زمانہ کو دَورِ زرّیں کہا[1] - مگر باوجود ترقی کے ملک میں رفتہ رفتہ ایک انقلاب پیدا ہو چکا تھا، پُرانے شرفاء عرب اب باقی نہ رہے تھے، عبدالرحمٰن الناصر اور منصور دونوں نے بھی کوشش کی تھی کہ اسپین کی مختلف قومیں شیر و شکر ہو کر ایک قوم ہو جائیں، اِس میں آخر کار اُن کو کامیابی بھی ہوئی تھی، عربی خاندانوں نے بنی امیہ سے خلافت چھین کر خود مسلط ہونے کے لئے ہمیشہ نزاع برپا رکھا تھا، ان خاندانوں کو نہ صرف مغلوب کیا گیا بلکہ اُن کا زور توڑنے کے لئے اُن کو مفلس اور تنگدست بنا دیا، ہر روز سُننے میں آتا تھا کہ آج کوئی پرانا نام جس کی لوگ عزت کیا کرتے تھے دنیا سے مِٹ گیا، اُمرائے دربار جن کا بڑا تعلق یہ تھا کہ بنی امیہ کے موالی تھے اچھی حالت میں تھے، ابوعبدہ، شہید، جہوراور فطیس کے خاندان والے اب بھی مناصب جلیلہ پر ممتاز تھے، لیکن اس زمانہ میں سب سے زیادہ با اختیار اور صاحب قوت بربر کے فوجی افسر اور صقالبہ تھے جن میں شمالی اسپین کے ایسے عیسائی بھی شامل تھے جو اسلامی فوجوں میں ملازم تھے، مگر ان لوگوں کے پردیسی اور نو دولت ہونے کی وجہ سے ملک والے اُن کی عزت کم کرتے تھے اُن کو وحشی سمجھتے تھے، اور اُن کی زیادتیوں اور ظلموں کی شکایت سب کی زبان پر رہا کرتی تھی متوسط الحال جماعتیں صنعت اور تجارت کی وجہ سے بہت مالدار ہو گئی تھیں، امیر عبداللہ بن محمد کے زمانہ میں جب کہ ہر طرف بدنظمی اور بدعملی تھی اِن متوسط درجہ کی جماعتوں نے بہت دولت جمع کر لی تھی، اہلِ تجارت و صنعت کا سرمایہ وہی روپیہ ہوتا تھا جو اُن کے دولتمند اُنہیں قرض دیتے تھے، چونکہ زمانہ امن و امان کا تھا - اس لئے ان سرمایوں میں اکثر آسانی سے اضافہ ہو جاتا کوئی تعجب کی بات نہ تھی، باوجودیکہ ظاہر میں سلطنت بہت سرسبز اور خوش حال تھی مگر خرابی کے جراثیم اُس میں مضمر تھے، قبیلوں کے نزاعات جو پہلے ہوا کرتے تھے اب بند ہو گئے تھے، مگر صرف اس وجہ سے بند ہو گئے تھے کہ نئی شکل میں نمودار ہوں، یہ نئی شکل اُنہوں نے مختلف جماعتوں کے باہمی نزاع کی صورت میں پیدا کی۔

[1] اِس زمانہ کے حالات بہت کم دستیاب ہوتے ہیں۔

کام کرنے والے کام لینے والوں کے دشمن تھے، متوسط درجے والے امیروں سے جلتے تھے، اور سب لوگ فوجی سرداروں کے اور ان میں خاص کر بربر کے فوجی افسروں کے دشمن ہو گئے تھے، عام ناتجربہ کاری نے لوگوں میں ایسی چیزیں حاصل کرنے کا شوق پیدا کر دیا تھا جن میں نہ کبھی پہلے ہاتھ ڈالا تھا اور نہ جن کے متعلق پہلے کسی قسم کا علم تھا، مذہب پر سخت حملے ہونے لگے، فلسفیوں کے خلاف جو طریقے منصور نے اختیار کیے تھے اُن کے نتائج فقہا کے حسبِ مراد پیدا نہ ہوئے، آزاد خیال لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی، مذہبی شکوک نے جن کی طرف عرب ہمیشہ سے رجحان رکھتے تھے زیادہ تر علمی شکل اختیار کی، میاسرہ یعنی ابن میسرہ کے پیرو بہت بڑھ گئے، اہلِ بدعت نے بہت سے طریقے ایسے وضع کیے جو مخربِ دین تھے، خود علمائے دین میں ایک فرقہ ایسا پیدا ہوا کہ گو علمِ حدیث اُسے حاصل تھا مگر اُس کے عقائد سچے مسلمانوں کی نظر میں سطحی اور اکثر ایسے دہریوں کی مشکوک و مشبوہ تصانیف پر مبنی تھے جو اسلام کو بیخ و بنیاد سے اکھیڑنا چاہتی تھیں، اس عالمِ موجودات کی نسبت اُن کا عجیب خیال تھا، کہتے تھے کہ یہ دنیا ایک مچھلی پر مچھلی بیل کے سینگ پر قائم ہے، اور بیل ایک چٹان پر کھڑا ہے، اور یہ چٹان ایک فرشتے کے کندھے پر رکھی ہے، اور اس فرشتے سے نیچے تاریکی ہے جس میں ایک بحرِ ناپیدا کنارہ موجیں مار رہا ہے[۱]۔ علمائے دین سمجھتے تھے کہ ان مبہم اور عجیب عقائد میں جو زیادہ تر اشارے اور رموز تھے کفر چھپا ہوا ہے۔

اس فرقہ نے کائنات کو لاحد و لاتناہی مان لیا، اور اس بات کی تعلیم دی کہ مذاہب جبر اور دھوکے سے شائع ہو سکتے ہیں، اور دلائل سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا کہ انسان کی عقل ان مذاہب میں سے کس کو سچ اور کس کو جھوٹ ماننے پر مجبور ہے۔

باوجود اس آزادی کے یہ لوگ حکمائے یونان کی تعلیم کو دشمنی کی نظر سے دیکھتے تھے مگر ایک دوسرا فرقہ ایسا تھا جس نے اپنے عقائد کی بنیاد فلاسفۂ یونان کی تعلیم پر رکھی تھی۔ (۵۳۶

---

[۱] دیکھو ابن خلدون "مقدمہ" (سلین کا ترجمہ) جلد اص ۲—۳ تعلیقہ ۲

اِس اخیر فرقے کے اُصول فطرت کے مطابق تھے، ریاضی کی تحصیل نے اُن کو علمِ ہیئت کی طرف متوجہ کیا، اور پھر اُنہوں نے یہ بحث چھیڑ دی کہ مذہبی عقائد اپنی تصدیق کے لیے ثبوتِ ریاضیہ کے محتاج ہیں، اور چونکہ کوئی ایسا ثبوت ملتا نہیں اس لیے مذہب ایک لغو چیز ہے، تمام احکام شریعت ہیچ، اور نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، انہیں ایک غلطی معلوم ہونے لگے، فقہاء ان لوگوں کی نسبت ملامت کے ایسے الفاظ استعمال کرنے سے باز نہ رہے جو دنیا میں بالعموم ہر مذہب کے عالم ایسے لوگوں کی نسبت استعمال کرتے ہیں جو تسلیم شدہ مذہب کے عقائد کے خلاف اپنی رائے ظاہر کیا کرتے ہیں، ان لوگوں پر فقیہوں نے یہ الزام لگایا کہ وہ بخیس دولت کمانے میں اپنی تمام عمر اس لیے گنواتے ہیں، کہ اخلاقی قواعد سے آزاد ہو کر ہوا و ہوس میں بے روک ٹوک زندگی بسر کریں۔

بہرکیف جو فرقے اسلام پر علانیہ معترض ہوتے تھے وہ اِس قدر خوف کی چیز نہ تھے جیسے کہ ایک دوسرا فرقہ تھا، اِس فرقے میں مسلمان، عیسائی، یہودی تینوں مذہبوں کے لوگ شامل ہوئے، انہوں نے ایک نیا مذہب "اَلْمِلَّتُ الْکُلِّیَہ" کے نام سے ایجاد کیا، اس مذہب کے پردے میں وہ دین سے بے پروائی کرنی سکھاتے تھے، فقہائے اسلام اِس بات سے خوب واقف تھے کہ جب کوئی مذہب غارت ہونے کو ہوتا ہے تو اندرونی اختلافات یہ غارت گری پیدا کرتے ہیں نہ کہ بیرونی حملے۔ مگر مِلَّتُ الکُلِّیَہ" کے ماننے والوں میں بھی جن کے عقائد اس قدر نرم تھے کہ جدھر چاہو موڑ لو بعض باتوں میں باہمی اختلاف تھا۔ کوئی کسی درجہ پر تھا کوئی کسی درجہ پر، مگر منطقی مباحث سے سب بیزار تھے، اُن کا قول تھا کہ "دنیا ادیان اور ادیان کی بدعتوں اور مذاہب فلسفہ سے بھری پڑی ہے، عیسائیوں کی مثال لیجیے، ملوکی عیسائی[1] نسطوری عیسائی[2] کا روادار نہیں، نسطوری کو یعقوبی عیسائی[3]

---

[1] مشرقی عیسائی

[2] یہ مسیح کی ایک ذات میں دو اقنوموں کا مجتمع ہونا نہیں مانتے تھے۔

[3] یہ شام کے رہنے والے ایسے عیسائی تھے جو ذاتِ مسیح میں دو اقنوموں کا جمع ہونا تسلیم نہ کرتے تھے، یہ یعقوب بارادیوس کے نام پر یعقوبی کہلائے گئے، ایسے عیسائی اب تک کم تعداد میں موجود ہیں۔

سے نفرت ہے اور پھر یہ سب ایک دوسرے پر لعن کرتے ہیں، مسلمانوں میں معتزلہ[1] اُن
لوگوں کو جو اُن سے متفق الکلام نہیں بُرا کہتے ہیں، خارجی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ دوسرے
فرقوں کا کام ہی تمام کردیں، سُنّی کوئی بات خارجیوں اور معتزلہ کی نہیں رکھتے، یہودیوں میں
بھی اختلافات کا یہی حال ہے، فلسفی گو لڑتے کم ہیں مگر اُن میں بھی اختلافات کی کثرت ہے،
اگر ہم تحقیق کریں کہ اِن بے شمار طریقوں اور مذہبوں میں کون سا حق پر ہے تو کسی میں کوئی
بات ایسی نہ پائیں گے کہ دوسرے پر ترجیح دے کر اُسے قبول کرلیں، اِن میں ہر مذہب
کا ماننے والا اپنے مذہب کی سچائی ثابت کرنے کے لیے جو دلائل پیش کرتا ہے وہ ایسے
ہی درست یا غلط معلوم ہوتے ہیں جیسے کہ دوسرے کے دلائل و براہین۔ فرق اگر کچھ نظر ۵۲۷
آتا ہے تو اس میں نظر آتا ہے کہ منطقی مہارت کس میں بڑھی ہوئی ہے، اگر اِن باتوں کی
تصدیق کرنی ہو تو مختلف مذاہب کے لوگوں کی بحثوں کو جاکر سنیئے، پھر معلوم ہوگا کہ آج
جس کو فتح ہوگئی تھی کل وہ شکست کھا گیا، علماء کی مجلسوں میں جو ہتھیار کام میں لائے
جاتے وہ بھی لڑائی کے ہتھیاروں کی طرح پورے بھروسے کے نہیں ہوتے، واقعہ یہ ہے
کہ ہر بحث کرنے والا جن باتوں پر بحث کرتا ہے اُن کا صحیح علم نہ کبھی پہلے اُس کو تھا اور
نہ کبھی آئندہ ہوگا۔

بہرکیف بعض اہلِ شک ایسے تھے جو خاص خاص نتائج کو تسلیم کرتے تھے، بعض لوگ
ایسے بھی تھے جو خدائے واحد خالق کون و مکاں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کے
قائل تھے۔ یہ لوگ دوسرے مذہبوں کی نسبت کہتے تھے کہ "ممکن ہے وہ سچ ہوں ممکن ہے
وہ باطل ہوں، ہم کو اُن کا اقرار ہے نہ انکار، ہم اُن کی نسبت کچھ نہیں بتا سکتے، اور ہمارا
ایمان ایسے اصول کو تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا جن کی سچائی پر ہم کو ہدایت نہ کی گئی ہو"
یہ فریقِ معتدل کے لوگ تھے، بعض لوگ صرف ایک خالق کا وجود مانتے تھے اور

---

[1] معتزلہ کے حالات کے لیے دیکھو نکلسن کی "عربوں کی ادبی تاریخ" (مطبوعہ سنہ ۱۹۰۷ء)
صفحہ ۲۲۲ اور اس کے بعد۔

جو لوگ زیادہ ترقی یافتہ تھے اُن میں کوئی مذہب جس میں پورا یقین رکھتے ہوں موجود نہ تھا، اُن کا قول یہ تھا کہ نہ خدا کا وجود ثابت ہو سکا ہے، اور نہ اِس عالَم کا مخلوق ہونا، لیکن اِس کے ساتھ ہی کوئی ثبوت اِس بات کا بھی نہیں ہے کہ خدا نہیں ہے، اور یہ کہ اس عالَم کی ابتدا نہیں ہوئی۔

بعض کہتے تھے کہ کم از کم ظاہر داری کی بنا پر اِس بات کی ضرورت ہے کہ جس مذہب میں پیدا ہوئے ہیں اُسے مانا جائے، بعض ایک ایسے جامع مذہب کی ضرورت سمجھتے تھے جس میں تمام اخلاقی اصول جن کو عقل نے اور تمام مذہبوں نے مانا ہو شامل ہوں۔

مذہبی معاملات میں جو لوگ نئے نئے شگوفے کھلاتے تھے وہ اُن لوگوں سے بہتر تھے جو نظمِ سلطنت میں نئے طریقے ایجاد کرنے چاہتے تھے، ان کو اتنا تو معلوم تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، اِس کے برعکس سیاسی دنیا میں کسی کے خیالات بھی واضح اور صاف نہ تھے، موجودہ سیاسی حالت سے سب ناخوش تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حالاتِ حاضرہ نے سوسائٹی پر ایسا زور ڈالا ہے کہ وہ ایک سیاسی انقلاب پیدا کرنے پر مجبور ہو گئی ہے، اِس قسم کے انقلاب کو منصور کی نظرِ دُوربین نے پہلے ہی سے دیکھ رکھا تھا، ایک دن وہ مدینۃ الزہراء کے ایک پُر فضا باغ میں کھڑے قصر کی عالیشان عمارت کو دیکھ رہے تھے کہ دفعتاً آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگے "زاہرہ! تجھ پر سخت افسوس ہے۔ کاش! مجھے وہ آدمی معلوم ہو جاتا جس کے ہاتھوں تو بہت جلد خراب ہونے والا ہے"۔ مصاحبوں میں سے ایک نے جو قریب تھا متعجب ہو کر اُن کے اِس خیال کی وجہ پوچھی، منصور بولے "واللہ جو میں کہہ رہا ہوں وہ تم خود جلد دیکھ لوگے، میں دیکھ رہا ہوں کہ زاہرہ کا نام مٹ رہا ہے، اُس کی بنیادیں اُکھاڑ کر پھینکی جا رہی ہیں، اُس کے خزانے لُوٹے جا رہے ہیں اور آتشِ فتنہ سب کو جلائے ڈالتی ہے"۔

سوال یہ تھا کہ اگر یہ سیاسی انقلاب پیدا ہوا تو اُس کی غرض اور اُس کا طریقہ کیا ہوگا مگر کوئی شخص اِس سوال کا ٹھیک جواب نہ دے سکتا تھا، لیکن اِس پر سب متفق الرائے (۵۱
تھے کہ خاندانِ منصور کو جو اختیارات حاصل ہو گئے ہیں اُن کو سلب کر لینا چاہئیے، اِس

رائے پر تعجب کی ضرورت نہیں، جو قومیں کسی مطلق العنان حکومت کی مطیع ہوتی ہیں وہ سوائے بادشاہ کے اور کسی کے اختیارات کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتیں، ایسے وزرا جن کو بادشاہوں کے سے اختیارات حاصل ہوئے، گو وہ کیسے ہی لائق ثابت ہوئے ہوں ہمیشہ رعایا کی عداوت اور نفرت کا نشانہ بنے رہے۔ اور یہی چیز عامریوں سے عداوت رکھنے کی کافی وجہ ہوگئی، لیکن اس کے ساتھ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ جو لوگ خلیفۂ وقت ہشام المؤید کے خیرخواہ تھے ان کے دلوں کو عامریوں نے طرح طرح سے زخمی کیا تھا، اب تک بنی عامر محض خلیفہ کے نام سے حکومت کرنے پر قانع معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی اصلی نیت یہی تھی کہ تاج و تخت کے بالکل مالک ہو جائیں، ان کی یہ حرص ایسی تھی جس نے نہ صرف خاندانِ امیہ کے شہزادوں کو جو بکثرت تھے ناراض کر دیا بلکہ فقہا بھی بہت ناخوش ہوگئے، کیونکہ فرمانروا خاندان میں سے خلیفہ مقرر ہونے کا جو طریقہ چلا آتا تھا اسے وہ دل سے پسند کرتے تھے، اور یہی حال عام رعایا کا تھا جو شاہی خاندان بنی امیہ کی دل سے شیدا تھی، اس کے علاوہ اہلِ دربار بھی عامریوں کا زوال چاہتے تھے، کیونکہ عامریوں کے تنزل سے اپنے اختیارات بڑھنے کی امید زیادہ ہوتی جاتی تھی، عام رعایا بھی سیاسی انقلاب کی آرزو رکھتی تھی۔ اس خیال سے کہ دولتمندوں سے بدلہ بھی نکال لیں گے اور ان کی دولت بھی ہاتھ آئے گی، یہ خیال ایسا تھا جس نے دولتمندوں کو پہلے ہی سے ہوشیار کر دیا ہوگا، صنعت و حرفت کے اعتبار سے قرطبہ بہت بڑا شہر تھا، مختلف صنعتوں کے ہزارہا کام کرنے والے اس میں آباد تھے، اور تھوڑا سا فساد بھی اتنی ترقی پکڑ سکتا تھا کہ دولتمندوں اور مفلسوں میں ایک فتنۂ عظیم کی شکل اختیار کرے۔ لیکن ناتجربہ کاری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اس خطرے کی طرف کسی کا خیال تک نہ گیا، دولتمندوں نے اہلِ حرفہ کو اپنا دوست سمجھا، اور سب اس خیال میں رہے کہ عامریوں کو نکالتے ہی کل باتیں ٹھیک ہو جائیں گی۔

بنی عامر کے زوال کے سب خواہشمند تھے کہ اسی حالت میں عبد الملک المظفر کا انتقال ہوگیا (۱۰۰۸ء ۳۹۹ھ) مظفر کے انتقال پر اُن کے بھائی عبد الرحمٰن حاجب مقرر ہوئے

یہ نوجوان تھے اور فقیہوں کو اُن سے سخت نفرت تھی، اولاً تو وہ انہیں نسب کا اچھا نہ سمجھتے تھے، کیونکہ عبدالرحمٰن کی ماں شانجہ کی بیٹی تھیں، یہ شانجہ یا توقشتالیہ کا عیسائی رئیس یا نبرہ کا عیسائی بادشاہ تھا، اسی وجہ سے نانا کے نام پر عبدالرحمٰن کا نام شنجول یا سنخول[1] یعنی چھوٹا شانجہ ہو گیا تھا، اور تاریخ میں اسی نام سے وہ پکارا گیا ہے، عبدالرحمٰن کے کام بھی ایسے نہ تھے جو خرابی نسب کی تلافی کر دیتے، آزاد منش اور بے پروا سا (٥٣٩)
آدمی تھا، سب کے سامنے شراب پینے میں مطلق باک نہ تھا، اکثر لوگ نہایت افسوس اور غصے سے اس بات کا ذکر کیا کرتے تھے کہ ایک موقع پر جب موذن نے حَیَّ عَلَی الصَّلوٰۃِ "(آؤ نماز کے لیے) کہا تو عبدالرحمٰن بولا کہ "اس کی جگہ حَیَّ عَلَی الْخَمْرِ (آؤ شراب کے لیے) کیوں نہ کہا جائے؟ یہ کہنا شاید بہتر ہوگا" اس کے علاوہ اس پر یہ الزام بھی لگایا جاتا تھا کہ اُس نے اپنے بھائی مظفر کو زہر دے کر مارا ہے، مشہور یہ ہوا کہ عبدالرحمٰن نے ایک چھری سے جس کے ایک رُخ زہر لگا ہوا تھا ایک سیب کاٹا، اور سیب کا وہ ٹکڑا جس میں زہر لگ گیا تھا اپنے بھائی مظفر کو دیا[2]، اس قسم کے الزام کم و بیش لوگوں کی گھڑنت تھے، لیکن یہ امر یقینی تھا کہ سنخول میں منصور یا مظفر کی سی لیاقت اور ہوشیاری نہ تھی، باوجود اس کے اُس نے ایک ایسے کوچے میں قدم رکھنا چاہا جہاں اُس کے باپ اور بھائی کی ہمت بھی قاصر رہی تھی۔

حکومت فی الحقیقت بنی عامر کر رہے تھے، ہشام المؤید برائے نام خلیفہ تھے، بنی عامر ابھی تک خلیفہ نہ ہوئے تھے گو دل سے چاہتے تھے کہ خلیفہ ہو جائیں۔ اب عبدالرحمٰن سنخول کو یہ حماقت سوجھی کہ وہ کسی طرح ہشام المؤید کا ولی عہد مقرر کر دیا جائے،

---

[1] اسپینی زبان میں اب بجائے سنخول کے سنخیلو ہو گیا ہے، سانکو رئیس قشتالیہ کے حالات کے لیے دیکھو ڈوزی کی کتاب "تحقیقات" (١٨٨١ء) جلد ١ صفحات ٢٠٣ تا ٢١٠

[2] مقابلہ کرو اسپینا سگرادا، ج ٢٢ ص ٢٠٣، اس طریقہ سے زہر دینے کی دوسری مثال البکری نے بیان کی ہے (صفحہ ١٢١ مطبوعہ سلین)

بعض ذی وقعت لوگوں سے جن میں قاضی ابوذکوان اور ابن برد کاتب الانشا خاص طور پر شریک ہوئے، اس معاملہ میں گفتگو ہوئی، سنخول کو جس وقت ان لوگوں کی طرف سے تائید ہونے کا یقین ہوگیا تو اُس نے خلیفہ ہشام سے اپنے ولی عہد مقرر کیے جانے کی درخواست کی، ہشام اگرچہ نام کے خلیفہ تھے مگر ایسا عجیب کام کرنے میں اُن کو بھی تذبذب ہوا، اور یہ کام اس وجہ سے اور بھی خطرناک معلوم ہوا کہ کسی موقع پر پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا کہ "حکومت بنی معد سے دوسری طرف کبھی نہ جانی چاہیئے"، ہشام المؤید نے بعض علماء سے اس امر پر استصواب کیا، لیکن یہ سب علماء قاضی ابن ذکوان کے سکھائے پڑھائے ہوئے تھے، انہوں نے ہشام کو یہی مشورہ دیا کہ سنخول کی درخواست قبول فرمانی چاہیئے، اور زیادہ شبہات رفع کرنے کے لیے ایک حدیث اس مضمون کی بیان کی کہ "جب تک حکومت بنی قحطان کے ایک آدمی کے ہاتھ میں نہ جائے گی قیامت کا دن نہ آئے گا" ہشام المؤید نے عبدالرحمٰن سنخول کی درخواست منظور کر لی، اور عبدالرحمٰن اپنے بھائی مظفر کی وفات کے ایک مہینے بعد ایک وثیقہ کے ذریعہ خلیفہ ہشام المؤید کے ولی عہد مقرر کر دیئے گئے، یہ وثیقہ ابن برد نے لکھا تھا۔

اس تقرر نے اہلِ قرطبہ کے جوش و خروش کو درجۂ انتہا پر پہنچا دیا، بعض اشعار جو اس واقعہ کی مذمت میں کہے گئے وہ سب کی زبان پر تھے۔ مثلاً

"ابنِ ذکوان اور ابنِ برد جنھوں نے مذہب کا یہ نیا طریقہ نکالا ہے، یہ خدا اور حق کے دشمن ہیں، کیونکہ انہوں نے شانجہ کے نواسے کو وارثِ خلافت بنایا ہے"

اس کے علاوہ لوگوں نے بہت خوش ہو کر یہ قصہ بیان کرنا شروع کیا کہ مدینۃ الزاہرہ میں ایک ولی اللہ کا گذر ہوا، شہر کی عماراتِ عالیہ اور رونقِ فائقہ کو دیکھ کر وہ کہنے لگے "اے مکان تُو بہت سے مکانوں کی لُوٹ سے مالا مال ہے، خدا ایسا کرے کہ تیری لُوٹ سے ہر مکان مالا مال ہو"

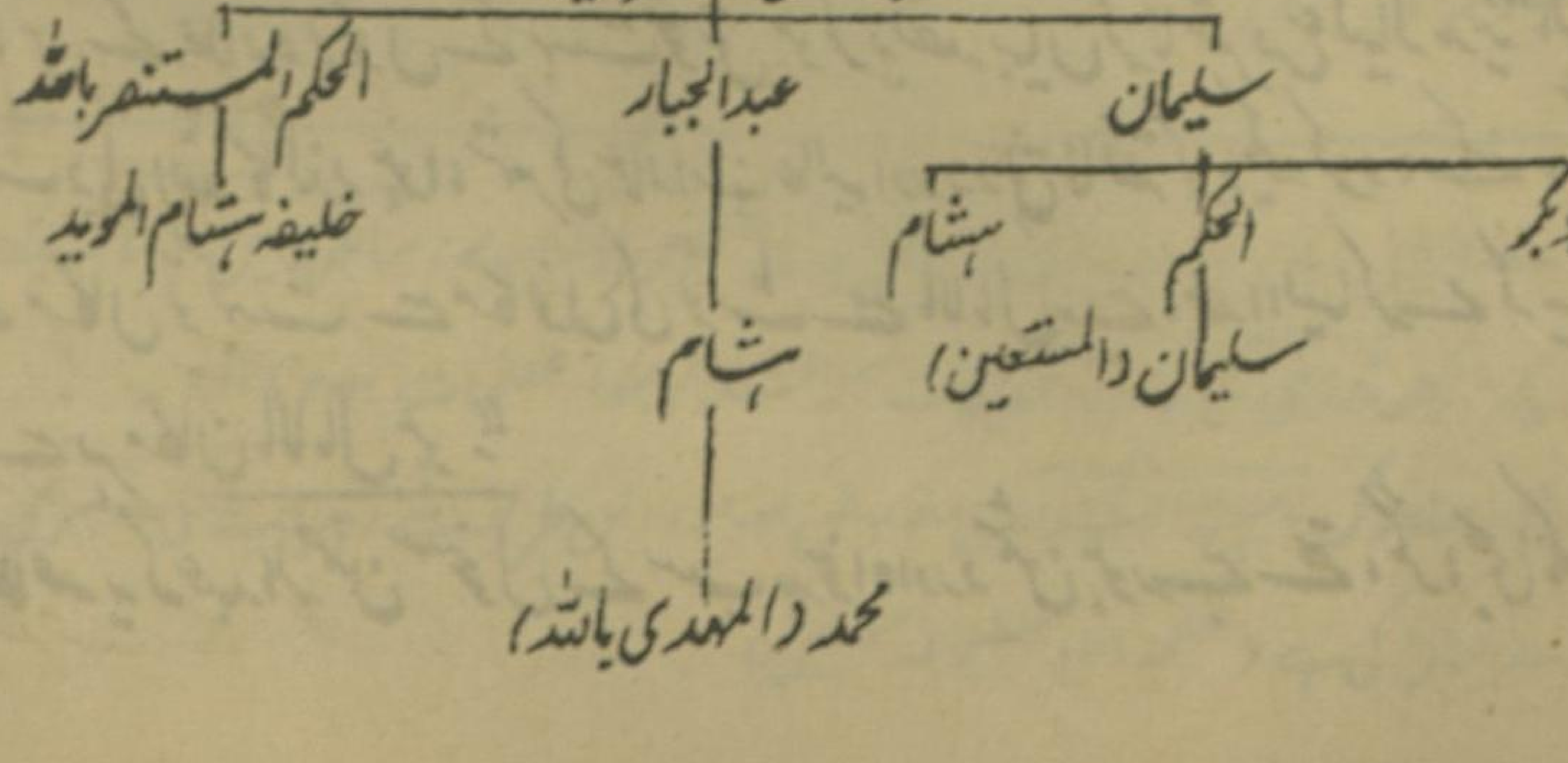
خلاصہ یہ کہ عبدالرحمٰن سنخول کے سب بدخواہ اور دشمن ہو رہے تھے، مگر ابھی تک

کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تھا، شہر میں چونکہ فوج موجود تھی اس لیے سب ڈرے اور سہمے ہوئے تھے، لیکن فتنہ برپا ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی، اس دھوکے میں آ کر کہ قرطبہ میں امن ہے عبدالرحمٰن سنخول نے لیون پر حملہ کرنے کا قصد کیا، اور ۱۴ جنوری ۱۰۰۹ء (۱۴ جمادی الاول ۳۹۹ھ) کو جمعہ کے دن قرطبہ سے فوجیں لیے ہوئے لیون روانہ ہو گیا ایک حماقت یہ کی کہ سر پر عمامہ رکھا، اور فوج والوں کو بھی یہی حکم دیا، حالانکہ قرطبہ میں سر کا یہ لباس علماء و فقہا کے ساتھ مخصوص ہو چکا تھا، قرطبہ کے لوگوں نے اس حرکت کو بھی مذہب اور مذہب کے عالموں کی توہین سمجھا۔

سرحد شمال سے گذرنے کے بعد عبدالرحمٰن سنخول نے ادفونش پنجم کو اس کے پہاڑی قلعوں سے باہر نکالنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی[۱]، برف و باراں کی شدت نے راستوں کو ناقابلِ گذر کر دیا تھا، سنخول نے مجبور ہو کر واپسی کا قصد کیا، جس وقت طلیطلہ میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ قرطبہ میں بغاوت ہو گئی ہے۔

ایک اموی شہزادہ جس کا نام محمد[۲] (بن ہشام بن عبدالجبار بن عبدالرحمٰن الناصر) تھا، اس بغاوت کا سرگروہ تھا، یہ محمد اسی ہشام کا فرزند تھا جسے عبدالملک المظفر ابن منصور نے قتل کرا دیا تھا (دیکھو صفحہ حاشیہ ۸۵۴) رشتے کے لحاظ سے یہ محمد بن ہشام خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ کا پر پوتا تھا، اس کا باپ ہشام بن عبدالجبار

[۱] اس مہم کا نام اسپینی زبان میں "کیچڑ والی لڑائی" تھا۔

[۲]


جب قتل ہوا تو اس خوف سے کہ باپ کی طرح وہ بھی نہ مارا جائے محمد بن ہشام قرطبہ میں کہیں روپوش ہو گیا۔ قرطبہ کے لوگ اس اموی شہزادے کے نام سے خوب واقف ہو گئے تھے، دولت اس شہزادے کے پاس بہت تھی اور بخیل نہ تھا۔ ایک بڑے فقیہہ حسن بن یحییٰ نے اس کی مدد کی، غرض ان وجوہ سے اور بہت سے امویوں کے سہارے سے محمد بن ہشام نے ایک بڑا گروہ بہادر اور دلیر لوگوں کا جمع کر لیا، عبدالرحمٰن سنخول روانگی کے وقت قرطبہ کا انتظام ابن عسقلیجہ عامری کے سپرد کر گیا تھا، ابن عسقلیجہ کے کانوں تک کچھ اڑتی سی خبر پہنچی تھی کہ عبدالرحمٰن سنخول کے خلاف کوئی سازش ہونے والی ہے، لیکن یہ خبر کچھ ایسی مبہم تھی کہ گو بعض لوگوں کی خانہ تلاشی کی گئی مگر کوئی سامان ایسا برآمد نہ ہوا جس سے سازش کا گمان پختہ ہو جاتا۔

محمد بن ہشام بن عبدالجبار بن ناصر نے ۲۵ر فروری ۱۰۰۹ئہ یعنی ۱۸ر جمادی الآخرہ ۳۹۹ھ جمعہ کا دن بغاوت کے لیے مقرر کیا، اور جن لوگوں کو جمع کیا ان میں سے تیس بڑے جانبازوں کو منتخب کر کے حکم دیا کہ قصر خلافت سے متصل جو اونچا چبوترہ ہے وہاں شام کو جمع ہو جائیں، ہتھیار اپنی قباؤں میں چھپائے رکھیں، پھر ان سے کہا کہ "میں غروبِ آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا، مگر اتنی احتیاط کرنا کہ جب تک میں اشارہ نہ کروں بالکل خاموش کھڑے رہنا"

۱۳۰ء تیسوں جوان مقرر جگہ پر پہنچ گئے، کسی کو ان پر کوئی شبہ نہ گذرا، کیونکہ قصر کے اس چبوترے پر جہاں سے بڑی سڑک اور دریا نظر آتا تھا، سیر تماشا دیکھنے کو اکثر لوگ جمع رہا کرتے تھے، اس اثنا میں محمد بن ہشام نے جو گروہ تیار کیا تھا اس کے لوگوں کو ہتھیار دے کر بالکل تیار رہنے کا حکم دیا۔

اب محمد بن ہشام اس گروہ کو ساتھ لیے خود خچر پر سوار اس بلند چبوترے پر آیا جہاں اس کے تیس جوان پہلے سے موجود تھے اور آتے ہی انہیں اشارہ کیا، تیسوں جوانوں نے ایک دم قصر کے دروازے پر جو سپاہی پہرا دے رہے تھے ان پر حملہ کیا۔ سپاہی بالکل بے خبر کھڑے تھے، حملہ آوروں نے ان کے ہتھیار چھین لیے، محمد بن ہشام فوراً

قصر میں داخل ہوا، اور وہاں پہنچا جہاں ابن عسقیلیجہ عامری اپنی حرم سرا میں بیٹھا دو کنیزوں کے ساتھ شراب پی رہا تھا، ابنِ عسقیلیجہ سنبھلنے بھی نہ پایا کہ قتل کر دیا گیا۔

محمد بن ہشام کے باقی گروہ والوں کو جس وقت معلوم ہوا کہ ابنِ عسقیلیجہ مارا گیا تو وہ فوراً قرطبہ کے بازاروں اور کوچوں میں یہ پکارتے ہوئے دوڑے کہ "لوگو ہتھیار اُٹھالو، محمد بن ہشام کے فریق کو اُمید سے زیادہ کامیابی ہوئی ہے۔" شہر کے لوگ جو بغاوت کرنے کے لیے فقط اشارے کے منتظر تھے خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے اس گروہ کے ساتھ ہو لیے، اب یہ لوگ خلیفہ ہشام المؤید کے محل کے سامنے آئے اور محل کی فصیل کو دو جگہ سے توڑ دیا۔ خلیفہ ہشام ابھی تک اس خیال میں تھے کہ شاہی فوج آ کر ان بلوائیوں سے بچا دے گی، سلطنت کے بڑے بڑے عہدہ دار اس وقت منصور کے تعمیر کردہ قصر الزاہرہ میں تھے، یہاں کچھ پیدل فوجیں صقالبہ کی اور چند رسالے سواروں کے موجود تھے جن کو یہ عہدہ دار حکم دے سکتے تھے، مگر جب اس ہنگامے کی خبر اُن کو پہنچی تو وہ سمجھے کہ ابنِ عسقیلیجہ تو قصرِ خلافت میں موجود ہی ہے وہ اس شورش کو جلد فرو کر دے گا، لیکن جب بعد میں معلوم ہوا کہ ہنگامہ پوری بغاوت ہے تو یہ عہدیدار خوف سے نیم جان ہو گئے، سب کے حواس باختہ ہوئے اور کسی نے خلیفہ ہشام کو اس خطرے سے نکالنے کی کوشش نہیں کی، خلیفہ ہشام نے جب دیکھا کہ اب کوئی دم میں لوگ اُن کے محل پر حملہ کر دیں گے تو انہوں نے ایک قاصد محمد بن ہشام کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ "اگر تم میری جان سلامت چھوڑ دو گے تو میں تمہارے حق میں تخت سے دست بردار ہو جاؤں گا۔" محمد بن ہشام نے قاصد سے کہا "کیا خلافت پناہی یہ سمجھتے ہیں کہ میں نے اُن کے قتل کے لیے یہ بغاوت کی ہے، نہیں ہرگز ایسا نہیں ہے۔ میری بغاوت کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس وقت میں نے دیکھا کہ آپ نے ہمارے خاندان سے سلطنت کو نکلتے ہوئے دیکھنا گوارا کر لیا تو مجھے سخت صدمہ ہوا، آپ کی جو خوشی اور مرضی ہو وہ کریں، لیکن اگر تختِ خلافت آپ مجھے خوشی سے دینا چاہتے

ہیں تو میں شکریہ کے ساتھ اُسے قبول کرتا ہوں اور اس صورت میں جو کچھ آپ چاہتے ہیں وہ مجھے سب منظور ہے۔"

اس کے بعد محمد بن ہشام نے علماء اور بعض مؤقر روساء کو طلب کیا اور اُن سے کہا کہ ایک عہد نامہ خلیفہ ہشام المؤید کے سلطنت سے سُبکدوش ہونے کا تیار کریں، چنانچہ عہد نامہ تیار ہوا، خلیفہ ہشام المؤید نے اُس پر اپنے دستخط کر دیئے، اور محمد بن ہشام رات بھر ہشام المؤید کے قصر میں رہا، دوسرے دن اُس نے اپنے ایک عزیز اُموی کو اپنا حاجب مقرر کیا، اور ایک دوسرے اُموی کے سپرد شہر کا انتظام کیا، اور اُن کو حکم دیا کہ جس قدر لوگ فوج میں بھرتی ہونا چاہیں اُنہیں بھرتی کیا جائے۔ شہر کے لوگوں میں اس قدر جوش و خروش تھا کہ ہر قسم کے لوگوں نے فوج میں کثرت سے بھرتی ہونا شروع کر دیا، معمولی لوگوں کے علاوہ مالدار تاجر، اضلاع کے زمیندار اور کاشتکار، مسجدوں کے امام، فقراء اور گوشہ نشین مشائخ بھی فوج میں بھرتی ہونے لگے اُمویوں کی طرف داری میں جو سلطنت کے اصلی حقدار تھے اور سنخول کو نکالنے میں جس نے تختِ خلافت غصب کیا تھا اور جو بے دین تھا ہر شخص اپنا خون بہانے کو تیار تھا۔

محمد بن ہشام نے اپنے حاجب کو حکم دیا کہ مدینۃ الزاہرہ کو جائے، حاجب جب وہاں پہنچا تو سرکاری عہدہ داروں کو جو وہاں حاضر تھے مقابلہ کرنے کا خیال تک پیدا نہ ہوا بلکہ بہت جلد سب کے سب نئے خلیفہ کی بیعت کرنے اور اُس سے عفوِ تقصیر چاہنے کے لیے قصرِ خلافت میں حاضر ہو گئے، محمد بن ہشام نے اُن کا قصور معاف کیا۔ لیکن پہلے اُن لوگوں کو سخت ملامت کی جنہوں نے عبد الرحمٰن سنخول کو ولی عہد بنانے میں مدد کی تھی۔

اس طرح چوبیس[۲۴] گھنٹے سے کم میں بنی عامر کی حکومت خاک میں مل گئی، مخالفوں میں کسی کو توقع نہ تھی کہ کامیابی اس قدر جلد ہو جائے گی، قرطبہ میں ہر جگہ شادیانے بجنے لگے ادنیٰ درجے کے لوگ بالخصوص بہت خوش تھے، یہ ادنیٰ طبقے کے آدمی جن کی خوشی اور ناراضی ہمیشہ انتہا درجے کی ہوا کرتی ہے خیال کرنے لگے کہ اب اُن کے لیے تموّل

اور خوشحالی کا زمانہ آگیا، لیکن اگر متوسط درجے کی جماعتوں کو اس کا کچھ بھی خیال پہلے سے گذرا ہوتا کہ اس ملکی انقلاب سے کیسے کیسے بُرے اور دُور تک اثر کرنے والے نتائج پیدا ہوں گے تو اُن کا فرض تھا کہ بغاوت میں شرکت سے پہلے ایک بار نہیں بلکہ بار بار غور کر لیتے، اور اس بات کو بھی سمجھ لیتے کہ عامریوں کی حکومت گو شخصی اور مطلق العنان سہی مگر وہ ایک شائستہ اور مہذب حکومت تھی، جس نے ملک کو اقبال مندی اور حربی طاقت میں اوجِ کمال کو پہنچا دیا تھا، اور اُس کی قدر و قیمت اُس بدنظمی و نوج تسلط سے جواب اُن پر ہونے والا تھا کہیں زیادہ تھی۔

اس موقع پر بھی ظلم و زیادتی جو عامۃ الناس کے ہنگاموں میں ظاہر ہوا کرتی ہے پیش آئی، محمد بن ہشام گو قتل و غارت کا حکم دے سکتا تھا، لیکن اِن چیزوں کو جب وہ شروع ہو جائیں روکنے کی قوت ابھی تک اُس میں نہ تھی، چنانچہ اُس نے بڑی دُور اندیشی سے جس کی قدر کرنی چاہیئے، یہ حکم دیا کہ قصر الزاہرہ میں جو خزانہ اور بیش بہا ذخائر و مصنوعات موجود ہیں اُن کو حفاظت سے نکال کر قرطبہ پہنچا دیا جائے، لیکن لُوٹنے والوں نے اس سے پہلے ہی اپنا کام شروع کر دیا تھا، اِن لوگوں نے عامریوں کے قصر کو اتنا لُوٹا کہ اُس کے کواڑ اور جالیاں تک اُتار لیں، المنصور اور اُن کے خاندان کے ملازموں کے جس قدر مکانات تھے اُن میں اکثر کا یہی درجہ کیا، چار دن تک محمد بن ہشام کی یہ مجال نہ تھی کہ لُوٹنے والوں کو لُوٹ سے روک سکتا، لیکن اس کے بعد اُس نے لوگوں کو غارت گری سے روکا اور لُوٹ بند کرائی، مگر قصر الزاہرہ کی دولت ایسی فراواں تھی کہ اس لُوٹ پر بھی پندرہ ۱۵ لاکھ سکۂ طلائی اور اکیس ۲۱ لاکھ سکۂ نقرئی خزانے میں محفوظ رہا، اس کے کچھ عرصہ بعد بعض پوشیدہ مقامات میں دفینے تلاش کیے گئے، اور اِن (۵م۱
سے بھی بیس ۲۰ لاکھ اشرفیاں دستیاب ہوئیں، جس وقت قصر سے یہ کُل خزانہ نکال لیا گیا تو قصر میں آگ لگا دی، اور قصر الزاہرہ کی عالیشان عمارت جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئی۔

اس کے بعد ۱۸ فروری ۱۰۰۹ء (۱۹ جمادی الآخر ۳۹۹ھ) کو جامع قرطبہ میں نماز کے بعد دو فرمان سُنائے گئے، ایک میں عبدالرحمٰن سنخول کی بُری حرکتیں بیان تھیں

اور حکم تھا کہ نماز کے بعد اُس کے حق میں ہمیشہ بد دعا کی جایا کرے، دوسرے فرمان میں بعض محصول جو حال میں جاری ہوئے تھے معاف کیے گئے، اِس کے ایک ہفتے کے بعد محمد بن ہشام نے المہدی باللہ کا لقب اختیار کیا، اور اِس خلیفہ کو آیندہ ہم اسی لقب سے یاد کریں گے۔

محمد بن ہشام جس وقت یہ لقب اختیار کر کے تخت سے نیچے اُترا تو اعلانِ عام کیا کہ عبدالرحمٰن سنخول سے لڑنے کے لیے ہتھیار اٹھائے جائیں، اس حکم کا بہت بڑا اثر ہوا، قرطبہ سے ے گرد و دور دور شہروں کے لوگ سنخول سے لڑنے کو جمع ہو گئے، اور چند روز کے اندر خلیفہ المہدی باللہ کے تحت میں ایک لشکرِ جرار نظر آنے لگا، لیکن اِس سیاسی انقلاب کا عمل میں آنا دراصل عوام الناس کا کام تھا، اور عوام الناس سپاہی بننے کے بعد ایسے افسروں کی ماتحتی میں لڑنا قبول نہ کر سکتے تھے جو المہدی باللہ سے پہلے دربارِ خلافت میں رسوخ رکھتے تھے، اِس لیے جو فوج اس وقت مرتب ہوئی تھی اُس کے سپہ سالار اور افسر ادنیٰ اور متوسط طبقے کے لوگوں میں سے منتخب کیے گئے تھے، یعنی پنساری، جلاہے، قصائی اور زین ساز وغیرہ فوج کے افسر مقرر ہوئے، یہ پہلا موقع تھا کہ اسپینِ اسلامیہ میں جمہوریت کی شان پیدا کی گئی اور اختیارات صرف بنی عامر ہی کے ساتھ سے نہیں بلکہ امرا و سلطنت کے ہاتھ سے بھی نکل گئے۔

سنخول کو قرطبہ کی بغاوت کا حال طلیطلہ میں معلوم ہوا، سنتے ہی قلعہ رباح کی طرف کوچ کیا، مصمم ارادہ کیا تھا کہ بغاوت کو بزورِ شمشیر فرو کرے گا، مگر راستہ ہی سے اُس کی فوج کے لوگ علیحدہ ہونے شروع ہو گئے، جو لوگ ساتھ رہے جب اُن سے کہا کہ خیر خواہ رہنے پر حلف اٹھائیں تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کیا کہ "ہم تو پہلے آپ کی اطاعت کی قسم کھا چکے ہیں، دوبارہ قسم کھانے کی کیا ضرورت ہے؟" یہ جواب بربر نے دیا تھا، اور یہ بربر وہ تھے جن کو بنی عامر نے دولت دے دے کر مالا مال کر دیا تھا، اور عبدالرحمٰن سنخول سمجھتا تھا کہ وہ اِن پر بھروسہ کر سکتا ہے، مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ احسان مندی اور خیر خواہی بربر کی نیکیوں میں شامل نہیں تھیں۔ بربر نے اِس خیال

سے کہ اُن کے سابقہ سرپرستوں کا عروج ختم ہوا، اپنی دولت بچانے کے لیے بہت جلد خلیفہ المہدی باللہ کی اطاعت قبول کرنے کا ارادہ کر لیا، اور اس ارادہ کو پوشیدہ رکھنے کی بھی ضرورت نہ سمجھی، چنانچہ جس وقت عبدالرحمٰن سنخول نے اپنے ایک فوجی افسر محمد بن یعلیٰ سے پوچھا کہ "اہلِ فوج کا میری نسبت کیا خیال ہے؟" تو ابن یعلیٰ نے کہا "میں اپنے اور دیگر اہلِ فوج کے خیالات اس بارے میں آپ سے مخفی رکھنے نہیں چاہتا، میں صاف صاف عرض کیے دیتا ہوں کہ ایک متنفس بھی آپ کا طرفدار ہو (۵۴۳۱)
کر لڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔"

سنخول فوج کے ایک حصہ کی خیر خواہی سے تو پہلے ہی مایوس ہو چکا تھا، مگر اُس کو ہرگز توقع نہ تھی کہ وہ محمد بن یعلیٰ کے منہ سے بھی ایسی بات سُنے گا، حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا "کیا ایک متنفس بھی میری طرف سے نہ لڑے گا؟ مجھے کیونکر یقین آئے کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ سچ ہے؟" ابنِ یعلیٰ نے کہا "اپنے حرم کے ملازموں کو طلیطلہ جانے کا حکم دیجیے اور یہ بھی ارادہ ظاہر کیجیے کہ آپ اُن کے ساتھ ہوں گے، پھر دیکھیے کہ ایک سپاہی بھی آپ کے ساتھ چلنے پر تیار نہ ہو گا۔"

سنخول نے افسوس کر کے کہا "ابنِ یعلیٰ! شاید تم سچ کہتے ہو" لیکن ابنِ یعلیٰ نے سنخول سے جو کچھ کہا تھا سنخول نے اُسے آزمایا نہیں، فوج نے خود ہی اُس کا ساتھ چھوڑ دیا، صرف ایک شخص ایسا باقی رہا جو عبدالرحمٰن کا سچا دوست اور خیر خواہ تھا، یہ ریاست کاریون کا عیسائی رئیس اور عبدالرحمٰن کے لیونی اتحادیوں میں یہی خاندان گومیز کی یادگار تھا، اس شریف عیسائی نے سنخول سے کہا "آپ میرے ساتھ چلیے میرے قصر میں پناہ لیجیے، اگر کوئی خطرہ پیش آیا جب تک ایک قطرہ بھی خون کا میرے جسم میں رہے گا آپ کی جان بچانے کو تیار ہوں گا۔" سنخول نے کہا "میرے معزز دوست! میں آپ کا بیحد شکر گذار ہوا، لیکن میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا، مجھے قرطبہ جانا لازمی ہے، جہاں میرے دوست میرے منتظر ہوں گے اور جس وقت میرے آنے کی خبر سُنیں گے تو سب تن واحد بن کر میری مدد پر آمادہ ہو جائیں گے،

اس کے علاوہ مجھے توقع ہے کہ جس وقت میں شہر میں قدم رکھوں گا تو جو لوگ اس وقت محمد بن ہشام کے طرفدار ہیں اُس کا ساتھ چھوڑ کر میرے پاس چلے آئیں گے۔"

رئیسِ کاریون نے کہا "ان غلط اُمیدوں کو چھوڑیئے، میری بات کا یقین کیجئے اب آپ سب کچھ کھو چکے ہیں جس طرح فوج نے آپ سے کنارہ کیا ہے اسی طرح قرطبہ میں ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو آپ کی مدد کرے۔" عبدالرحمٰن سنغول نے جواب دیا "اس کا ثبوت ملنا باقی ہے، بہرکیف میں نے ارادہ کر لیا ہے اور میں قرطبہ ضرور جاؤں گا۔" رئیسِ کاریون نے کہا "میں آپ کے اس ارادے کو پسند نہیں کر سکتا، اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس وقت دھوکے میں ہیں، خیر جو کچھ بھی آپ کی مرضی ہو میں آپ کا ساتھ کسی حال میں نہ چھوڑوں گا"

فوج کے جس قدر لوگ باقی رہ گئے تھے اُنہیں ساتھ لیے ہوئے عبدالرحمٰن نے اپنا سفر جاری رکھا، رئیسِ کاریون ساتھ رہا، جب ایک مقام پر جس کا نام منزل ہانی تھا یہ لوگ پہنچے تو شب کو وہاں قیام کیا، یہاں جس قدر بربر عبدالرحمٰن کے ساتھ تھے وہ رات کے اندھیرے میں سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، صبح اٹھ کر عبدالرحمٰن کو معلوم ہوا کہ سوائے گھر کے نوکروں اور رئیسِ کاریون کے اور کوئی ساتھ نہیں ہے۔ عیسائی دوست نے پھر ایک بار اصرار کیا کہ اُس کے ساتھ کاریون چل کر پناہ لیں، لیکن عبدالرحمٰن پر اس کہنے کا کچھ اثر نہ ہوا، معلوم ہوتا تھا کہ تقدیر سنغول کو موت کی طرف ہانک رہی تھی، سنغول رئیسِ کاریون سے کہنے لگا کہ "میں نے قاضی کو قرطبہ بھیجا ہے وہ میرے لیے خلیفہ سے امان مانگ لے گا۔"

جمعرات کے دن ۴ر مارچ ۱۰۰۹ء (۲۶ رجمادی الآخر ۳۹۹ھ) کو سنغول اور (۳۴۵
رئیسِ کاریون مسیحی خانقاہ شاش میں اُترے، دوسرے دن خلیفہ مہدی باللہ کے جو سوار روانہ کیے تھے وہ بھی شاش میں وارد ہوئے، سنغول نے اُن سے پوچھا "آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟ میری جان سلامت رہنے دیجئے کیونکہ میں نے خلیفہ مہدی کی اطاعت قبول کر لی ہے"، سواروں کے افسر نے کہا "اگر یہ بات ہے تو

آپ میرے ہمراہ قرطبہ چلیں"۔

عبدالرحمن سنخول کو اب کوئی چارہ سوائے اس حکم کے ماننے کے نہ رہا، کچھ قیام کے بعد وہ مہدی کے سواروں کے ساتھ قرطبہ چلا؛ اُسی دن تیسرے پہر خلیفہ مہدی باللہ کا حاجب بہت سی فوج لیے ہوئے آیا، یہ دیکھ کر عبدالرحمن نے قیام کیا، ستر مستورات کو جو عبدالرحمن کے ہمراہ تھیں قرطبہ روانہ کرنے کے بعد عبدالرحمن کو حاجب کے سامنے حاضر کیا گیا، حاجب بنی اُمیّہ میں سے تھا، عبدالرحمن بار بار اُس کے سامنے زمین بوس ہوا، لوگوں نے غل مچا کر کہا کہ حاجب کے گھوڑے کے سُم کو بوسہ دے، سنخول نے یہی کیا، رئیس کاریون خاموش کھڑا اس حالت کو دیکھ رہا تھا کہ کس طرح وہ شخص ذلیل وخوار ہو رہا ہے جس کے سامنے تھوڑے دن ہوئے ایک عظیم الشان سلطنت لرزہ براندام رہتی تھی، عبدالرحمن اب ایک گھوڑے پر سوار کیا گیا جو اُس کا نہ تھا، اُس کا عمامہ سر سے اتار لیا گیا، اور اس شکل سے یہ قافلہ روانہ ہوا

شام ہوتے جب ایک منزل پر پہنچے تو سواروں کو حکم ہوا کہ عبدالرحمن کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے جائیں، سواروں نے ایسی سختی سے ہاتھ پاؤں باندھے کہ عبدالرحمن نے کہا "مجھے ایذا نہ پہنچاؤ، تھوڑی دیر کو بند ڈھیلے کر دو، اور میرے ہاتھ کھول دو"۔ جونہی اُس کی یہ درخواست منظور کی گئی عبدالرحمن نے اپنے موزے سے خنجر نکال کر خودکشی کرنی چاہی، لیکن اس کی نوبت نہ آئی، سواروں نے خنجر اُس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

حاجب نے کہا "خودکشی کی تکلیف میں آپ کو نہ اٹھانے دوں گا" اتنا کہتے ہی عبدالرحمن سنخول کو زمین پر گرا کر حاجب نے قتل کر دیا، اور حکم دیا کہ لاش سے سر کاٹ لیا جائے، اس کے بعد رئیس کاریون بھی قتل کر دیا گیا۔

دوسرے دن سوار قرطبہ پہنچے، سنخول کا سر اور اُس کی لاش خلیفہ مہدی کے سامنے پیش ہوئی، مہدی نے لاش کو گھوڑوں کے سُموں سے کچلوایا، پھر لاش کو ایک شلوار اور نیچی قبا پہنا کر قصر کے دروازے کے قریب صلیب پر لٹکوا دیا، اور اس کے قریب ہی ایک نیزے پر سنخول کا سر نصب کیا، اس لاش اور سر کے قریب ایک شخص کھڑا پکارتا

تھا " دیکھو سنخول کو، خدا کی لعنت ہو اُس پر اور مجھ پر " یہ شخص سنخول کی فوجِ محافظ کا افسرِ اعلیٰ تھا، اس کا قصور اس شرط سے معاف کیا گیا تھا کہ وہ اپنے آقا کے ساتھ خیر خواہی کی شہرت اِس طرح حاصل کرے ۔ (۵۴۶)

اسناد

نویری	ص ۴۷۴ تا ۴۷۹
ابن الآبار	ص ۱۴۹ تا ۱۵۰ ، ۱۵۹
ابنِ حیّان	(ابنِ بسّام ۔ ج ۱ ص ۳۰ تا ۳۱)
ابنِ عذاری	ج ۲ ص ۲۹۰
خوشانی	ص ۳۲۸
ابنِ حزم	(ادیان) ج ۱ ص ۱۲۷ تا ۱۲۸ ، ۲۲۸ تا ۲۳۰
	ج ۲ ص ۸۰ ، ۱۴۶
مقرّی	ج ۱ ص ۲۷۷ تا ۲۷۸ ، ۳۷۹ ، ۳۸۷ تا ۳۸۸
ابن الاثیر	(سنہ ۳۶۶ھ)
ابن بسّام	ج ۱ ص ۲۴

کتابِ ثالث

خلافت

چودھویں فصل

محمد بن ہشام بن عبد الجبار المہدی باللہ

شروع میں المہدی باللہ نے آسانی سے حکومت کی، اہلِ قرطبہ نے انہیں مسندِ خلافت (۵۴۷) پہ بٹھایا تھا، بربر نے اُن کی خلافت تسلیم کی تھی اور عبد الرحمٰن شنجول کے قتل کے پانچ دن بعد ایک خط واضح عامری کا جو صقالبہ میں سب سے ممتاز شخص اور شمالی سرحدوں کا حاکم تھا خلیفہ مہدی کی بیعت قبول کرنے اور اُن کے خلیفہ ہونے پر اظہارِ مسرت کا آچکا تھا، چونکہ واضح کو ابنِ ابی عامر المنصور کی وجہ سے عروج ہوا تھا اس لئے مہدی کو یہ توقع نہ تھی کہ واضح اس قدر جلد اُن کا مطیع ہو جائے گا۔ واضح کے خط کے جواب میں خلیفہ مہدی نے اُس کو بہت سا روپیہ مع ایک خلعتِ فاخرہ اور ایک گھوڑے کے جو پُر تکلف ساز و سامان سے آراستہ تھا بطور انعام بھیجا اور اس کے علاوہ تمام سرحدوں کا اُسے حاکم اور منتظم مقرر کر دیا۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا تھا کہ تمام فریق مہدی باللہ کی خلافت پر متفق اور رضامند ہو گئے ہیں، لیکن یہ اتفاق صرف ظاہری طور پر مکمل نظر آتا تھا، فی الواقع ایسا نہ تھا، سلطنت میں جو سخت انقلاب عمل میں آیا تھا وہ غصے اور طیش کی حالت میں آیا تھا، فہم و فراست کو اس میں دخل نہ تھا، لیکن جب طبیعتیں ٹھنڈی ہوئیں اور اس ملکی انقلاب پر غور کیا گیا تو یقین ہو گیا کہ بنی عامر کے زوال سے نہ تو ہر ایک پچھلی شکایت رفع ہوئی ہے اور نہ ہر نقصان کی تلافی اور نہ ہر تکلیف کا علاج ہوا ہے بلکہ بہت سی شکایتیں اور بے اطمینانی کے اسباب جو پہلے تھے وہی اب تک موجود ہیں، مہدی باللہ نہ لیاقت رکھتے تھے نہ نیکی۔ فسق و فجور میں مبتلا اور ظلم کے خوگر تھے، عقل و تدبیر سے ایسے عاری تھے کہ تمام فریقوں کو جو اُن کے طرفدار ہوئے تھے رفتہ رفتہ اپنا مخالف بنا لیا، سب سے پہلے یہ حرکت کی کہ سات ہزار اہلِ حرفہ جو فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ انہیں یکلخت برخاست کر دیا، اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام اچھا تھا، کیونکہ اہلِ حرفہ ادنیٰ طبقہ کے لوگ تھے اور ظلم و زیادتی اُن کی عادت میں شامل تھی، قرطبہ کو ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑے رکھنا درست نہ تھا، لیکن اُن کی برطرفی سے عوام ناخوش ہوئے عوام کو اس بات پر فخر و ناز تھا کہ وہی اس انقلابِ سلطنت کے بانی ہیں، مگر یہ فخر و ناز اُن کو اس بات سے باز نہ رکھ سکا کہ بغیر کسی کام اور خدمت کے مفت کی تنخواہیں سلطنت سے وصول کرتے رہیں۔

مہدی باللہ نے دوسری حرکت یہ کی کہ بہت سے عامری صقالبہ کو جو قرطبہ میں رہتے تھے شہر بدر کر دیا اور جو صقالبہ قصر میں ملازم تھے اُن کی موقوفی کا حکم جاری کیا اور اس طرح گویا اِن سب لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ دشمنوں سے جا ملیں، حالانکہ اگر ذرا بھی خوش تدبیری سے کام لیتے تو اِن سب کو اپنا بنائے رکھتے، اس ساتھ علمائے وقت کو بھی ناراض کر دیا، عادت یہ اختیار کی کہ کبھی قصر سے قدم باہر نہ نکالتے وہیں (۵۴۸
عیاشی و اوباشی میں زندگی بسر کرتے، نیک بخت مسلمان حیرت سے ذکر کرتے کہ خلیفہ کی ایک ایک ضیافت میں سو سو بانسریاں اور نفیریاں بجتی ہیں، اب انہی لوگوں نے

کہنا شروع کیا کہ "یہ مہدی بھی عبدالرحمٰن سنخول کی طرح برا اور بد آدمی ہے"۔ مہدی کا نام انہوں نے 'شر الجزر' رکھ دیا اور بہت سے گھروں کی عزت و آبرو اور امن و سلامتی میں خلل ڈالنے کا الزام اس پر عائد کیا، اب رعایا کی زبان پر خلیفہ کی مذمت میں اشعار رہنے لگے۔

غرض مہدی باللہ نے چند بیہودہ حرکتوں سے اپنے مقبول عام رہنے کی خوبی کو غارت کر دیا، واضح عامری نے جب چند آدمیوں کے سر کاٹ کر جنہوں نے مہدی کی بیعت سے انکار کیا تھا، خلیفہ کے پاس بھیجے تو حکم ہوا کہ "ان سروں کی کھوپڑیوں کو گلدانوں کی جگہ برتا جائے اور قصر کے سامنے دریا کے کنارے انہیں آراستہ کیا جائے"۔

مہدی باللہ اس ڈراؤنے پھولوں کے باغ کو اپنے قصر سے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور شاعروں سے کہتے تھے کہ اس مضمون پر بھی طبع آزمائی کریں، شاعروں میں ابو العلا صاعد بھی تھے جو پہلے عامریوں کی قصیدہ خوانی میں سرگرم رہتے تھے اور اب انہوں نے عامریوں کی مخالفت میں ان کے دشمنوں کی مدح سرائی اپنا شیوہ کر لیا تھا۔

خلیفہ مہدی باللہ نے قرطبہ کے ادنیٰ طبقوں اور شہر کے متقی اور شریف لوگوں اور صقالبہ کو تو بالعموم اپنا مخالف کر ہی لیا تھا، مگر بربر کا دل رکھنے کی بھی انہوں نے کوئی تدبیر نہ کی، بربر قدرتی طور پر مہدی باللہ کا ساتھ دینے کو تیار تھے، یہ سچ ہے کہ قرطبہ میں یہ لوگ جو بالکل اجڈ سپاہی یا سوار تھے بری نظر سے دیکھے جاتے تھے، لوگوں کے دل اب تک ان سے ملے جلے ہوئے تھے، کیونکہ بنی عامر کی خود مختاری کے زمانے میں ان کے دست و بازو بھی بربر تھے اور اگر مہدی علانیہ بربر پر لطف و کرم ظاہر کرتے تو جو کچھ تھوڑی بہت عزت لوگوں میں ان کی تھی وہ بھی نہ رہتی، یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ بربر اسپین سے افریقہ واپس کر دیے جاتے، ان تمام صورتوں میں مہدی باللہ کا فرض تھا کہ کسی طرح بربر کی تسلی و تشفی کرتے رہتے، لیکن انہوں نے ایسا نہ کیا، بلکہ کوئی بات ایسی نہ چھوڑی جس میں بربر کی تحقیر و تذلیل نہ ہوتی، چنانچہ حکم دیا کہ بربر گھوڑے پر

سوار نہ ہوں، ہتھیار نہ لگائیں اور قصرِ خلافت میں حاضر نہ ہوا کریں۔

مہدی باللہ کی یہ شورِ تدبیر حیرت انگیز تھی۔ بربر یہ دیکھ چکے تھے کہ پہلے لوگ اُن کی عزّت کیا کرتے تھے، دربارِ خلافت میں اُن کی قدر افزائی ہوا کرتی تھی، اس لئے اب اُن کو اپنی عزت و آبرو اور قوت و اختیارات کا بہت زیادہ خیال رہنے لگا، بربر کو گوارا نہ تھا کہ سب کی نظر میں وہ حقیر ہو جائیں یہاں تک کہ کچھ بھی نہ سمجھے جائیں، اس حالت پر صبر سے بیٹھنا اُن کے لئے ناممکن تھا چنانچہ جب شہر والوں نے ہنگامہ کرکے اُن کے گھروں کو لوٹنا شروع کیا، اور پولیس نے اُس کا کچھ انسداد نہ کیا تو زاوی بن مناد اور دو اور بربر سردار قصرِ خلافت میں حاضر ہوئے، اور بہت دلیری سے خلیفہ سے کہنے لگے کہ مجرموں کو سزا دی جائے، یہ دیکھ کر کہ اِس وقت سردار بہت غصّے کی حالت میں ہیں، مہدی باللہ نے بلوائیوں کے سرغنوں کو قتل کروا دیا، اس کے بعد سب بربر کا خوف مہدی باللہ کے دل سے جاتا رہا تو پھر انہوں نے بربر کو ستانا شروع کیا۔

باوجود اِن باتوں کے مہدی باللہ اپنی نازک حالت سے بے خبر نہ تھے، اُن کو سب سے زیادہ خوف اس بات کا رہتا تھا کہ کہیں اُن کے دشمن اور مخالف ہشام المؤید کے گرد جو تخت سے دست بردار ہو چکے تھے جمع نہ ہو جائیں۔ اس لئے ہشام المؤید کو بغیر جان سے مارے مشہور کرا دیا کہ وہ مر چکے ہیں (۱۱ اپریل ۱۰۰۹ء) شعبان ۳۹۹ھ میں اتفاق سے ایک عیسائی جس کی شکل ہشام المؤید سے بہت ملتی تھی مر گیا، مہدی نے اِس عیسائی کی لاش خفیہ طور پر قصر میں منگوائی، یہاں یہ لاش اُن لوگوں کو دکھائی گئی ۷۹
جو ہشام کو پہچانتے تھے۔ یا تو عیسائی کی صورت واقعی ہشام المؤید سے ملتی جلتی تھی یا جن لوگوں کو مُردہ دکھا کر اُن کا بیان لیا گیا اُن کو پہلے سے روپیہ پہنچا دیا گیا تھا۔ بہر کیف سب نے یہی شہادت کردی کہ یہ مُردہ ہشام المؤید خلیفۂ سابق کا ہے، اس کے بعد مہدی نے ہر مذہب کے عالموں اور شہر کے خاص و عام لوگوں کو طلب کیا، جنازہ اُٹھایا گیا، اور نماز پڑھانے کے بعد یہ عجیب واقعہ دیکھنے میں آیا کہ ایک عیسائی کا

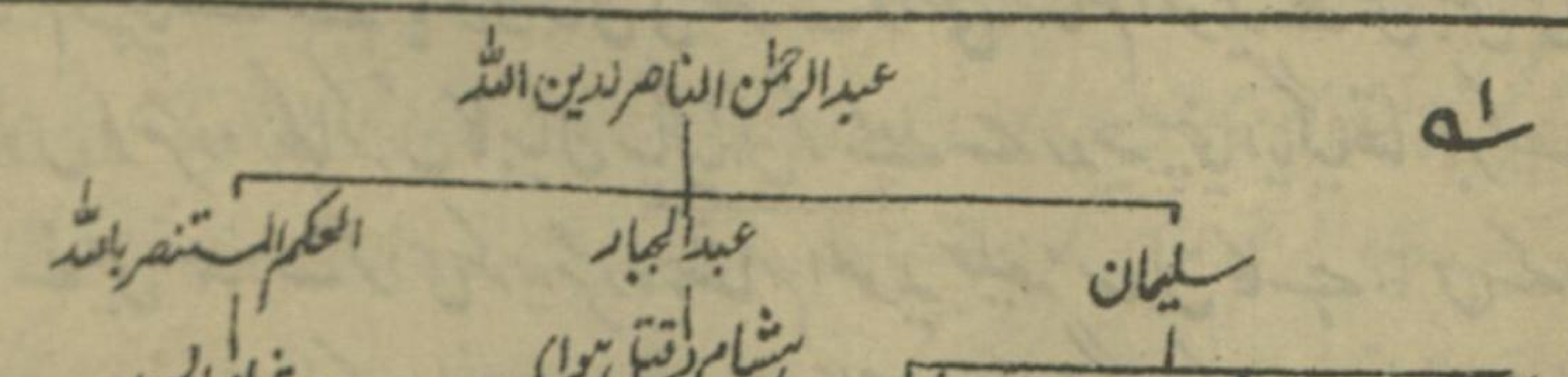
مُردہ مسلمانوں کے قبرستان میں شاہانہ تزک و احتشام سے دفن کیا جاتا ہے، ہشام المؤید بڑی احتیاط کے ساتھ نہایت پوشیدہ طور پر ایک وزیر کے گھر میں قید تھے۔

جب مہدی باللہ کو ہشام المؤید کی طرف سے اطمینان ہوگیا تو پھر بے احتیاطیاں شروع کیں، ماہ مئی ۱۰۰۹ء (رمضان ۳۹۹ھ) میں سلیمان ابن عبدالرحمٰن الناصر کو جو کچھ دن پہلے تخت کے وارث قرار دیئے گئے تھے قید خانے بھیج دیا، اس کے بعد یہ مشہور کردیا کہ بربر کے دس بڑے بڑے سرداروں کو قتل کرنے کا ارادہ ہے، یہ خبر اس قسم کی تھی کہ تمام افریقی بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گئے، سلیمان کے بیٹے ہشام نے بربر کو اور بھی بغاوت پر اشتعال دلایا، اور بغاوت کا سامان کرنے میں کچھ زیادہ مشکل پیش نہ آئی۔ اہلِ حرفہ کی سات ہزار فوج جسے مہدی باللہ برطرف کرچکے تھے فوراً دستیاب ہوگئی۔ اور ۲ جون ۱۰۰۹ء (۵ شوال ۳۹۹ھ) کو یہ فوج ہشام بن سلیمان (بن عبدالرحمٰن الناصر) کے مکان کے سامنے جمع ہوئی اور اس ہشام کے خلیفہ ہونے کا اُس نے اعلان کیا، ہشام بن سلیمان اپنے مکان سے نکلا، اور اس کُل فوج کو شہر سے باہر ایک میدان میں لے آیا، یہاں بربر بھی اُس سے آن ملے، اور اب یہ سب مل کر مہدی باللہ کے قصر کی طرف چلے۔

مہدی عیش و نشاط میں مصروف تھے، قصر کے باہر شور سُنا تو لوگوں سے پُوچھا کہ کیوں یہ شور مچایا جاتا ہے، ہشام بن سلیمان نے کہا کہ "آپ نے میرے باپ سلیمان کو قید کردیا ہے، ہمیں نہیں معلوم کہ اب وہ کس حال میں ہیں؟"

مہدی باللہ نے اتنا سنتے ہی سلیمان کو قید سے رہا کر دیا، لیکن اگر مہدی نے

سلہ



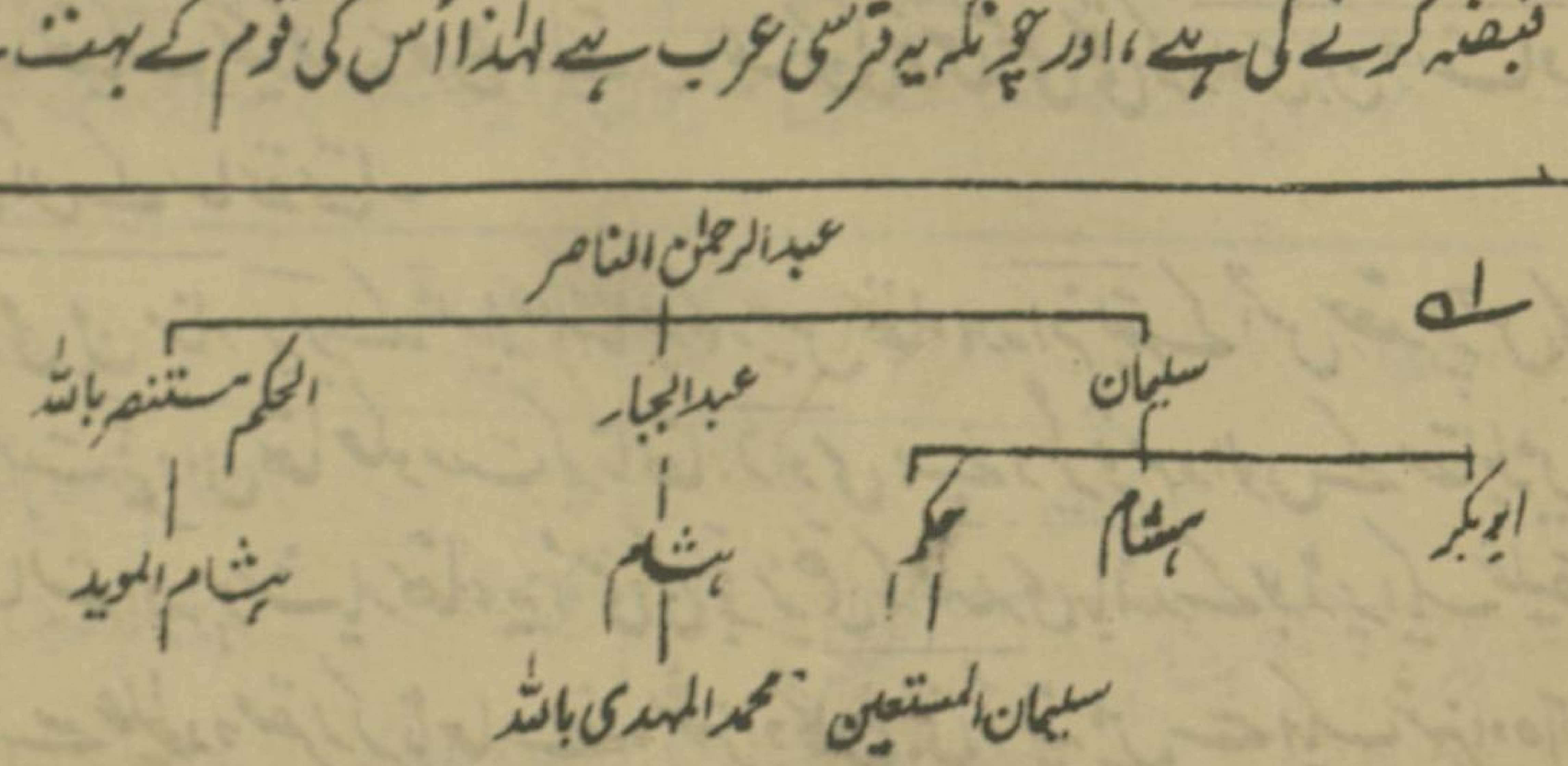
یہ سمجھ کر سلیمان کو قید سے رہا کیا تھا کہ خلقت کے اس ہجوم سے نجات ملے گی تو یہ غلطی تھی کیونکہ باپ کی رہائی کے بعد ہشام نے تخت کا دعویٰ پیش کیا، مہدی نے ہشام سے اس معاملہ میں گفتگو شروع کی، مطلب یہ تھا کہ کچھ وقت مل جائے، ایک مدت تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ اہلِ حرفہ جو ہشام بن سلیمان کی فوج میں تھے اور بربر، یہ دونوں گروہ اس تعویق سے پریشان ہوئے، اور انہوں نے ظروف سازوں کے بازار میں جو دوکانیں تھیں انہیں لوٹنا اور جلانا شروع کیا، قرطبہ کے رہنے والوں نے بھی ہتھیار سنبھالے، مہدی باللہ کی مدد کے لئے نہیں بلکہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لئے، مہدی باللہ نے اس دوران میں جو فوج طلب کی تھی وہ شہر والوں کی کمک پر پہنچ گئی ایک دن اور ایک رات سخت ہنگامہ رہا، لیکن ۳ رجون ۱۰۰۹ء (۵ رشوال ۳۹۹ھ) کو جمعہ کے دن بربر کو شکست ہوگئی، اور وہ نہایت بے ترتیب حالت میں پسپا ہوئے قرطبہ کے کچھ لوگوں نے ان کا پیچھا کر کے وادی ملاتو تک انہیں ہٹا دیا۔ کچھ لوگوں نے بربر کے گھروں کو لوٹا اور ان کی بیویوں کو اٹھا کر لے گئے، اور اشتہار جاری ہوا کہ جو شخص کسی بربر کا سر کاٹ لائے گا اس کو اتنا اتنا انعام دیا جائے گا۔

ہشام بن سلیمان جس نے مہدی باللہ کے سامنے سلطنت کا دعویٰ کیا تھا گرفتار کیا گیا، اور وہ اور اس کا باپ سلیمان دونوں قتل کر دیئے گئے

بربر شکست کے بعد جب پھر جمع ہوئے تو انہوں نے قسم کھائی کہ دشمنوں سے بدترین قسم کا انتقام لیں گے، لیکن ان میں اتنی لیاقت نہ تھی کہ حملہ کرنے کی کوئی تدبیر پہلے سے ٹھیک ٹھیک سوچ لیتے، یہ البتہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ زاوی بن مناد ۵۹
صنہاجی ان کے ساتھ تھا۔

زاوی بن مناد بربر کے قبیلہ صنہاجہ کا رئیس تھا، اور افریقہ کے اس حصہ پر جس کا دارالحکومت قیروان تھا حکومت کرتا تھا، زاوی اپنے دیگر قوم والوں کے مقابلہ میں زیادہ شائستہ اور ہوشیار تھا، یہ اسی کی تجویز تھی کہ مہدی باللہ کے جوڑ پر ایک خلیفہ اپنی طرف سے علیحدہ مقرر کرنا چاہیئے، شہزادگانِ بنی امیہ میں سے ایک شہزادہ اس

کام کے لئے موجود تھا، یہ ہشام (بن سلیمان بن عبدالرحمٰن الناصر)[1] کے بھائی حکم کا بیٹا سلیمان تھا، جس وقت سلیمان کے چچا ہشام نے مہدی سے بغاوت کی تھی تو سلیمان بربر کے ساتھ بھاگ گیا تھا، غرض زاوی بن مناد نے اس سلیمان کو خلیفہ بنانے کی تحریک اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کی، بربر میں سے بعض لوگوں نے اعتراض کیا، اور کہا کہ گو اور لحاظ سے سلیمان اچھا ہو، لیکن سرگروہ بننے کی قابلیت یا لڑائی کا تجربہ بالکل نہیں رکھتا، بعض بربر ایسے تھے جن کو گوارا نہ ہوا کہ ایک عرب اُن کا سرگروہ مقرر کیا جائے، اس موقع پر بربر کو سمجھانے کے زاوی نے ایک پُرانی مثال اگرچہ بربر کے لئے وہ ایک نئی مثال تھی پیش کی، اُس نے پانچ نیزوں کو اکٹھا کر کے باندھا اور ایک آدمی سے کہا کہ ان کو توڑے، آدمی نے بہت زور لگایا مگر وہ کب ٹوٹنے والے تھے زاوی نے کہا "اچھا، ان کا بندھن کھول دو، اور ایک ایک کر کے انہیں توڑ دو"، یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی اور وہ فوراً توڑ دیئے گئے، زاوی نے کہا "بس اسی مثال سے نصیحت پکڑو، اگر متفق اور متحد رہے تو پھر کوئی ہمیں مغلوب نہ کر سکے گا، اور اگر متفرق ہو گئے تو ہم برباد ہو جائیں گے، اپنے خطرے کا خیال رکھو اور جو کچھ ارادہ کرو وہ مجھ پر فوراً ظاہر کر دو"، تمام حاضرین نے یک زبان ہو کر جواب دیا کہ "آپ جو صلاح دیں گے وہی ہم کریں گے، لیکن اگر اُس پر ہم کامیاب نہ ہوئے تو پھر ہمارا قصور کچھ نہ ہو گا"، اتنا سُن کر زاوی نے سلیمان کو آگے بڑھا کر کہا "اچھا، اب اس قریشی کے ہاتھ پر بیعت کرو پھر بربر کو کوئی یہ الزام نہ دے سکے گا کہ اُن کی نیت اس ملک پر قبضہ کرنے کی ہے، اور چونکہ یہ قریشی عرب ہے لہٰذا اُس کی قوم کے بہت سے لوگ

[1]


اُس کے اندر ہمارے طرفدار ہو جائیں گے۔"

جس وقت بربر نے سلیمان کے ہاتھ پر بیعت کرلی، اور سلیمان نے المستعین باللہ کا لقب اختیار کرلیا تو زاوی نے پھر بربر سے اِن الفاظ میں خطاب کیا "ہماری حالت اس وقت خطرناک ہے، بس اِس کا خیال رہے کہ ہم میں سے کوئی شخص حصولِ قوّت کے شوق میں ناجائز اختیارات حاصل نہ کرے، ہم میں سے ہر قبیلے کو اپنا ایک سردار منتخب کرلینا چاہیئے، اور یہ سردار ذمہ دار ہوگا کہ جو قبیلہ اُس کے ماتحت ہے وُہ خلیفہ کا خیر خواہ رہے۔" اِس تقریر کے ختم ہونے پر بربر صنہاجہ نے زاوی کو اپنے قبیلے کا سردار مقرر کیا۔

اس انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلیمان المستعین کو براہِ راست بربر پر کوئی قابو اور اختیار نہ رہا، کیونکہ بربر کے ہر قبیلے نے اپنا سردار علیحدہ مقرر کرلیا تھا، المستعین صرف نام کو اُن کا سردار تھا، اور آخیر تک اُس کی یہی کیفیت رہی۔

اب بربر کی فوجوں نے جمع ہو کر شہر وادی الحجارہ کی طرف کوچ کیا، اور اِس شہر پر قبضہ کرکے واضح الدامری حاکمِ سرحد سے درخواست کی کہ اُن کا ساتھ دے، اور اپنے مستقرِ حکومت یعنی مدینہ سالم میں انہیں داخل ہونے کی اجازت دے، لیکن واضح
نے اُن کی یہ درخواست نامنظور کی، اتنے میں مہدی باللہ کے پاس سے واضح کو کمک (۵۵۱
پہنچ گئی اور اُس نے بربر کی فوجوں پر حملہ کردیا، لیکن شکست کھائی، بربر کو واضح کی اس شکست سے نفع نہ پہنچا، کیونکہ واضح نے بربر کی فوجوں میں سامانِ رسد کا پہنچنا بند کر دیا تھا، پندرہ دن تک بربر کی فوجوں کو کھانے پینے کی سخت تکلیف رہی، ساگ پات پر گذر ہونے لگا جب حالت اِس درجہ زبوں ہوئی تو انہوں نے شانجہ عیسائی بادشاہِ قشتالیہ کے پاس اپنے ایلچی اِس پیغام کے ساتھ بھیجے کہ اگر مہدی اور واضح نے ہم سے صلح نہ کی تو پھر شانجہ ہمارا ساتھ دے۔

جس وقت بربر کے ایلچی شانجہ کے پہنچے تو دیکھا کہ مہدی باللہ کے پاس سے بھی چند سفیر اُس کے دربار میں آئے ہوئے ہیں، اور ان سفیروں نے شانجہ کو گھوڑے اور

خچر، روپے اور خلعت قیمتی جواہرات اور طرح طرح کے دیگر تحائف پیش کئے ہیں، اور اقرار کیا ہے کہ اگر خلیفہ مہدی کی اُس نے مدد کی تو بہت سے شہر اور قلعے اُسے انعام میں دیئے جائیں گے۔

یہ عبرت کا مقام ہے کہ چند ماہ میں مسلمانوں کی حالت کیا سے کیا ہو گئی، اب مسلمان وہ نہ رہے کہ عیسائی والیانِ ملک سے جس طور پر چاہیں عہد نامے لکھوالیں، اب نوبت یہ پہنچی کہ قشتالیہ کا ایک عیسائی بادشاہ اسپین کی قسمت کا فیصلہ کرے۔

شانجہ بادشاہِ قشتالیہ اسلامی سلطنت کی موجودہ حالت سے پُورے طور پر واقف تھا، اُسے علم تھا کہ مہدی کی حکومت معرضِ خطر میں ہے، اس حالت پر نظر کر کے اُس نے بربر کو مدد پہنچانے کا وعدہ اس شرط سے کیا کہ جو شہر اور قلعے مہدی باللہ کے سفیر اس وقت دینے کا وعدہ کر رہے ہیں وہی شہر اور قلعے تم بھی دینے منظور کرو۔

بربر کے ایلچیوں نے اس شرط کو مان لیا، شانجہ نے مہدی کے سفیروں کو رخصت کیا اور بربر کے لشکرگاہ میں ایک ہزار بیل، پانچ ہزار بھیڑیں، اور ایک ہزار گاڑیاں کھانے پینے کے سامان سے بھر کر بھیجیں، فوج بھی مدد کے لئے روانہ کی، اب بربر مع شانجہ اور اُس کی فوج کے جنگ کے لئے تیار ہو گئے، اور مدینہ سالم کی طرف جو واضح عامری کا مستقرِ حکومت تھا بڑھے۔

مدینہ سالم میں پہنچ کر بربر نے واضح کو اپنا طرفدار بنانے کی پھر کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی، اور یہ دیکھ کر کہ وقت ضائع ہو رہا ہے بربر مدینہ سالم سے قرطبہ کی طرف روانہ ہو گئے (جولائی ۱۰۰۹ء مطابق ذیقعدہ ۳۹۹ھ)

بربر کے ہٹتے ہی واضح عامری سواروں کے رسالے ساتھ لے کر اُن کے تعاقب میں چلا، لیکن بربر نے مقابلہ کر کے واضح کو بہت نقصان کے ساتھ پسپا کیا، بہرکیف واضح کسی طرح قرطبہ پہنچ گیا، مگر اُس وقت اُس کے پاس صرف چار سَو سوار رہ گئے تھے، اُس کے چند فوجی افسر جو جان بچانے کے لئے راستہ ہی میں سے علیحدہ ہو گئے تھے پھر آن ملے، اور ان افسروں کے ساتھ صرف دو سَو سوار تھے۔

مہدی باللہ کو جس وقت معلوم ہوا کہ بربر قرطبہ پر حملہ کرنے والے ہیں تو وہ جس قدر
فوج فراہم کر سکا اُسے ساتھ لے کر قرطبہ سے مشرق میں ایک میدان میں آیا، اور یہاں
حصار باندھ کر لڑائی کے لئے تیار ہوگیا، مگر غلطی یہ کی کہ دشمن کے حملے کا انتظار نہ کیا، خود
ہی حصار سے باہر آکر دشمن پر حملہ کر دیا، مہدی اور بربر کی فوجوں کا مقابلہ ۵ رنومبر ۱۰۰۹ء
(۲۴ر ربیع الاول ۴۰۰ھ) کو ایک مقام پر ہوا جس کا نام قنتش تھا، فوج بربر کے صرف
تیس آدمیوں نے مہدی کے پورے لشکر کو جس میں بالکل ناتجربہ کار لوگ بھرے ہوئے
تھے پراگندہ کر دیا، شہر کے باشندے، اہل حرفہ اور فقہا جو مہدی کی فوج میں شریک تھے ۲۱
اس طرح بھاگے کہ بہت سے آپس ہی میں کچل کر مر گئے، بربر اور قشتالیہ کی فوجوں نے
مہدی کے صدہا آدمیوں کو تہ تیغ کر دیا، اور بہت سے لوگ وادی الکبیر میں ڈوب کر مر گئے،
اندازہ کیا گیا تھا کہ تقریباً دس ہزار آدمی اس لڑائی میں کام آئے۔ [1]

واضح کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ دشمن کو ضرور فتح ہو جائے گی، اس لئے وہ اپنے
چھ سو سواروں کو لئے ہوئے سرحد شمال کی طرف روانہ ہوگیا، مہدی نے بھاگ کر اپنے
قصر میں پناہ لی، بربر نے قصر کا جلد محاصرہ کر لیا، مہدی باللہ نے کہلا بھیجا کہ اگر ہشام المؤید
کو پھر تخت نشین کر دیا جائے تو وہ خلافت سے دست بردار ہونے کو تیار ہیں، چنانچہ
ہشام المؤید کو قید سے نکال کر ایسی جگہ بٹھایا جہاں سے وہ سب لوگوں کو اچھی طرح
نظر آئیں، اور قاضی ابن ذکوان کی معرفت بربر کو پیغام بھیجا کہ "ہشام المؤید اب تک زندہ
ہیں اور مہدی، ہشام المؤید کے محض حاجب ہیں، خلیفہ نہیں ہیں" بربر یہ پیغام سُن
کر ہنسے اور قاضی ابن ذکوان سے کہنے لگے "کل تو ہشام المؤید کا انتقال ہوگیا تھا،
تم نے اور تمہارے امیر نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھی تھی، جب وہ کل مر چکے تھے تو
آج کیسے زندہ ہو گئے؟ خیر، اگر تم سچے ہو تو خدا کا شکر ہے کہ ہشام زندہ ہیں، مگر اب

---

[1] یہ بیان ابن حیان کا ہے جو قدیم تر اور سب سے زیادہ معتبر مورخ ہے، اور مورخوں نے یہ تعداد تیس ۳۰ ہزار بلکہ چھتیس ۳۶ ہزار تک لکھی ہے۔

ہم کو اُن کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہم نے سلیمان کو خلیفہ تسلیم کر لیا ہے۔"

قاضی ابنِ ذکوان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اپنے آقا مہدی کی صفائی کریں ابھی گفتگو جاری تھی کہ سلیمان کی فوجوں سے مرعوب ہو کر اہلِ قرطبہ سلیمان کے سامنے مبارک باد دینے حاضر ہو گئے اور سب نے اُن کا خلیفہ ہونا تسلیم کر لیا۔

جس وقت سلیمان المستعین قرطبہ میں داخل ہوئے، اور بربر اور قشتالیہ کی فوجوں نے شہر والوں پر ظلم شروع کئے تو مہدی ایک شخص محمد نامی کے گھر میں روپوش ہو گئے جو طلیطلہ کا رہنے والا تھا، اسی شخص نے بندوبست کیا کہ مہدی قرطبہ سے طلیطلہ پہنچ جائیں، کیونکہ طلیطلہ میں بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ مشرق میں طرطوشہ سے لے کر مغرب میں اشبونہ تک سرحد کے تمام علاقے ابھی تک مہدی کا حکم مانتے تھے، چنانچہ جب شانجہ نے سلیمان مستعین سے ایفائے وعدہ کا تقاضہ کیا تو سلیمان کو یہی جواب دیتے بن پڑا کہ سردست وعدہ ایفا نہیں ہو سکتا، کیونکہ جن شہروں اور قلعوں کے دینے کا اقرار تھا اُن پر اپنا قبضہ ابھی تک نہیں ہوا ہے بہرکیف سلیمان نے شانجہ سے اپنے وعدہ کی تجدید کی اور کہا کہ جس وقت اِن شہروں اور قلعوں پر قبضہ ہو جائے گا وہ شانجہ کے حوالے کر دیئے جائیں گے، یہ عہد لے کر شانجہ قرطبہ سے مع اپنی فوج کے اپنے علاقے کو چلا گیا، شانجہ کی فوج والوں نے قرطبہ کے لوگوں کا مال لوٹ کر اپنی جیبیں بھرنے سے پرہیز نہیں کیا (۲ نومبر ۱۰۰۹ء مطابق ۲۳ ربیع الآخر ۴۰۰ھ)

ہشام المؤید جیسے تھے پھر ویسے ہی ہو گئے، سلیمان المستعین نے اُنہیں مجبور کیا کہ خلافت سے علیحدہ ہو کر سلطنت مستعین کے نام کر دیں۔ اس طرح ہشام المؤید پھر معزول ہو کر قید خانے پہنچ گئے، سلیمان المستعین نے عبدالرحمٰن شنجول ابنِ منصور کی لاش کو جو صلیب پر ایک مدت سے لٹک رہی تھی اُتروا کر معمولی رسوم کے ساتھ دفن کروا دیا۔

اس عرصے میں مہدی طلیطلہ پہنچ گئے تھے یہاں لوگوں نے اُن کا خیر مقدم کیا، اب سلیمان المستعین مہدی پر حملہ کرنے نکلے، علماء کو پہلے سے روانہ کیا تاکہ طلیطلہ (۵۵

کے لوگوں کو سمجھائیں کہ اگر سلیمان مستعین کی اطاعت قبول نہ کی تو سلیمان سخت ناراض ہو جائیں گے، لیکن اس تہدید کا اثر اہل طلیطلہ پر کچھ نہ ہوا۔ طلیطلہ جیسے مضبوط اور مستحکم شہر کا محاصرہ کرنے کا قصد نہ تھا اس لئے سلیمان مستعین بغیر لڑے مدینہ سالم روانہ ہوئے، اس عرصہ میں واضح عامری مدینہ سالم کو خالی کرکے طرطوشہ پہنچ گیا تھا طرطوشہ سے اُس نے سلیمان کو اس مضمون کا خط بھیجا کہ اگر آپ مجھے وہیں رہنے دیں جہاں میں پہلے تھا تو آپ کی اطاعت قبول کرتا ہوں، اس خط وکتابت کی غرض یہ تھی کہ واضح کو سنبھلنے کے لئے وقت مل جائے، چنانچہ یہ تدبیر چل گئی، سلیمان دھوکے میں آگئے اور واضح کو سرحد کی حکومت پر بدستور چھوڑ کر قرطبہ کی طرف واپس چلے گئے۔

اب واضح آزاد تھا، بہت جلد قیطلونیہ کے عیسائی رئیسوں سے اتحاد قائم کیا، ان میں سے ایک رئیس حاکم برشلونہ تھا اور دوسرا ارمنی جلد حاکم ارجل تھا، ان عیسائی رئیسوں نے امداد کے معاوضہ میں جو کچھ طلب کیا واضح نے سب منظور کرلیا، اور اب واضح اپنی اور ان عیسائی رئیسوں کی فوج کمک کو ساتھ لئے مہدی کی فوج سے طلیطلہ میں جا ملا۔ سلیمان مستعین نے یہ خبر سن کر قرطبہ کے لوگوں سے مسلح ہونے کو کہا، مگر قرطبہ کے لوگ یہ نہ چاہتے تھے کہ بربر افسروں کے ماتحت ہو کر لڑائی کے لئے اٹھیں، اس لئے انہوں نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ جنگ وجدل کی لیاقت اُن میں نہیں ہے، یہ بات انہوں نے کچھ غلط بھی نہیں کہی تھی، کیونکہ جنگ قنتش میں اُن کی ناتجربہ کاری ظاہر ہو چکی تھی۔

بربر نے ایسے کمزور لوگوں کی فوج تیار کرنے سے اختلاف ظاہر کرکے سلیمان سے کہا کہ صرف بربر ہی کو فتح حاصل کرنے کا موقع دیا جائے۔ سلیمان مستعین نے بربر کی درخواست منظور کی۔

جس وقت بربر قرطبہ سے چار فرسخ ایک مقام پر جس کا نام عقبۃ البقر[1] تھا پہنچے تو

---

[1] شریف ادریسی نے یہ نام "دار البقر" لکھا ہے۔ ج ۲ ص ۶۴ تا ۶۵ آج کل اس کو کاسٹیلو دل بکر کہتے ہیں۔

واضح عامری کے لشکر سے جس میں برشلونہ اور ارجل کی عیسائی فوجیں موجود تھیں مقابلہ ہوا۔ اس لشکر میں بیس ہزار مسلمان اور نو ہزار عیسائی لڑنے والے تھے۔ بربر کے افسران فوج نے سلیمان مستعین سے کہا کہ فوج کے عقب میں ایک محفوظ جگہ وہ اپنا قیام رکھیں اور کسی حال میں وہاں سے نہ ہٹیں، خواہ دشمن وہاں آ کر اُن کو پامال ہی کیوں نہ کر ڈالے۔ اس کے بعد بربر نے مہدی کے اُس حصۂ فوج پر جس میں قیطلونیہ کے عیسائی تھے اور اپنے طریقے کے مطابق حملہ کرتے ہی پیچھے کو بھاگے، تاکہ پلٹ کر دشمن پر زور کا دھاوا کریں۔

سلیمان نے بربر کے مقدمۃ الجیش کو اس طرح بھاگتے دیکھا تو خیال کیا کہ واقعی انہیں شکست ہو گئی اور اب کچھ باقی نہیں رہا۔ بربر کے افسران فوج نے جو تاکید سلیمان مستعین کو کی تھی کہ اپنی جگہ سے ہرگز نہ ہلیں اس کا انہوں نے کچھ خیال نہ کیا گھوڑے پر سوار ہو میدان سے سرپٹ بھاگے۔ جو سوار اُن کے قریب تھے وہ بھی میدان سے ہٹ گئے، بربر کچھ دور بھاگ کر پلٹے اور دشمن پر اس زور کا یلغار کیا کہ قیطلونیہ کی فوج کے ساٹھ افسروں کو قتل کر ڈالا، مقتولین میں ارجل کا رئیس ارمنی جلد بھی تھا۔ لیکن جب بربر نے دیکھا کہ سلیمان مستعین اپنی جگہ پر نہیں ہیں تو وہ مدینۃ الزاہرہ کی ۵۵۴ء
کی طرف چلے گئے اور میدان قیطلونیہ کی فوجوں کے ہاتھ رہا۔

غرض اس طرح سلیمان مستعین نے اپنی ناتجربہ کاری اور بزدلی سے عقبۃ البقر کی لڑائی بربر کو ہروا دی، سلیمان مستعین اگر فوجی افسروں کی ہدایت پر چلتے اور جو حیلۂ جنگ انہوں نے لڑائی شروع کرتے ہی کیا تھا اُس کو سمجھے ہوئے ہوتے تو عقبۃ البقر میں غالباً انہی کی فتح ہوئی ہوتی، رہی مہدی کی فتح، وہ جیسی کچھ بھی ہوئی زیادہ تر قیطلونیہ کی فوجوں کی وجہ سے ہوئی، کیونکہ یہی فوجیں تھیں جو واقعی لڑی تھیں، مہدی اور واضح کی فوجوں نے معلوم ہوتا ہے کہ اس معرکہ میں کوئی حصّہ نہیں لیا۔

مہدی قرطبہ واپس آئے، اور یہ بدنصیب شہر جسے چھ مہینے پہلے قشتالیہ کے عیسائی سپاہی اور بربر لوٹ چکے تھے، اب قیطلونی سپاہیوں کی لوٹ اور غارتگری کا

نشانہ بنا، مہدی نے اب بربر کا تعاقب کیا جو جزیرۃ الخضراء کی طرف جا رہے تھے اور راستے میں جو ملتا تھا اُسے قتل کر دیتے تھے، گاؤں اور قصبوں کو لوٹتے چلے جاتے تھے جب معلوم ہوا کہ مہدی تعاقب میں ہے تو بربر نے قیام کیا اور جدھر سے آئے تھے اُدھر ہی پلٹ پڑے۔

۲۱ جون ۱۰۱۰ء (۶ ذیقعدہ ۴۰۰ھ) کو ایک مقام پر جہاں وادی آرہ کا اتصال[1] وادی الکبیر سے ہوتا ہے۔ مہدی اور بربر کی فوجوں کا مقابلہ ہو گیا، یہاں عقبۃ البقر کی شکست کا بدلہ بربر نے مہدی کی فوجوں سے خوب لیا، آخر کار مہدی کی فوجوں کو شکست ہو گئی بہت سے صقالبی افسر مارے گئے اور تین ہزار قیطلونی عیسائی کھیت رہے، وادی الکبیر[1] نے پھر ایک مرتبہ صدہا آدمی بھینٹ لئے۔

دو دن کے بعد مہدی کی شکست خوردہ فوج قرطبہ میں داخل ہوئی اور اب قیطلونی سپاہیوں نے جو لڑائی میں مرنے سے بچے تھے، نہایت قابل نفرت ظلم و ستم کے ساتھ اپنی شکست کا غصہ اس طرح اُتارا کہ جو شخص شہر میں بربر کی صورت اور وضع کا ملا وہ اُن کا شکار ہو گیا۔ لیکن جب مہدی نے قیطلونیوں اور اپنی اور فوجوں سے پھر دشمن کا مقابلہ کرنے کو کہا تو انہوں نے یہ جواب دے کر کہ ہمارا سخت نقصان ہو چکا ہے انکار کر دیا، مہدی کی قیطلونی اور دیگر فوجوں نے ۸ جولائی ۱۰۱۰ء (۲۳ ذیقعدہ ۴۰۰ھ) کو قرطبہ سے کوچ کیا، شہر کے لوگوں نے گو ان فوجوں کے ہاتھ سے بہت ظلم اٹھائے تھے مگر اُن کے جانے پر افسوس کیا، کیونکہ شہر والوں کے دل میں بربر کا خوف جس سے یہ قیطلونی فوجیں انہیں بچاتی تھیں اب اور بھی زیادہ ہو گیا تھا، ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ "جب قیطلونی فوجیں چلی گئیں تو قرطبہ کے لوگ جب گلی کوچوں میں ملتے تھے تو اس طرح افسوس ظاہر کرتے تھے جیسے اُن کا کوئی عزیز مر گیا ہو، یا کوئی بڑا

[1] نویری نے دریا کا نام نہیں لیا، سمندر کی موجیں لکھا ہے، مگر واضح رہے کہ جہاں قتل ہوا تھا۔ وہ مقام دریا سے قریب تھا اور دریا میں بہاں جوار بھاٹا آتا تھا۔

مالی نقصان ہوگیا ہو۔"

مہدی نے سپاہ کو روپیہ دینے کے لئے شہر پر ایک نیا محصول لگایا اور اب ایک مرتبہ پھر مہدی بربر سے لڑنے میدان میں اُترے، لیکن جس دن سے قیطلونی فوجیں قرطبہ سے چلی گئی تھیں تو باقی فوجوں کی ہمت ٹوٹ گئی تھی، لڑائی کے لئے سات فرسخ بھی کوچ نہ کیا تھا کہ یہ خیال آتے ہی کہ بربر سے پھر مقابلہ ہے دل پر ایک خوف طاری ہوا، اور بجائے آگے بڑھنے کے قرطبہ واپس چلے آئے۔

مہدی باللہ کو اب سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ قرطبہ میں بیٹھ کر دشمن کے حملے (۵۵۵)
کا انتظار کریں، حفاظت کے خیال سے اُنہوں نے اس موقع پر قرطبہ کے گرد ایک نئی فصیل اور خندق تیار کرا دی تھی، لیکن تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا وہ یہ تھا کہ بربر نہیں بلکہ صقالبہ، مہدی کے زوال کا باعث ہوں۔

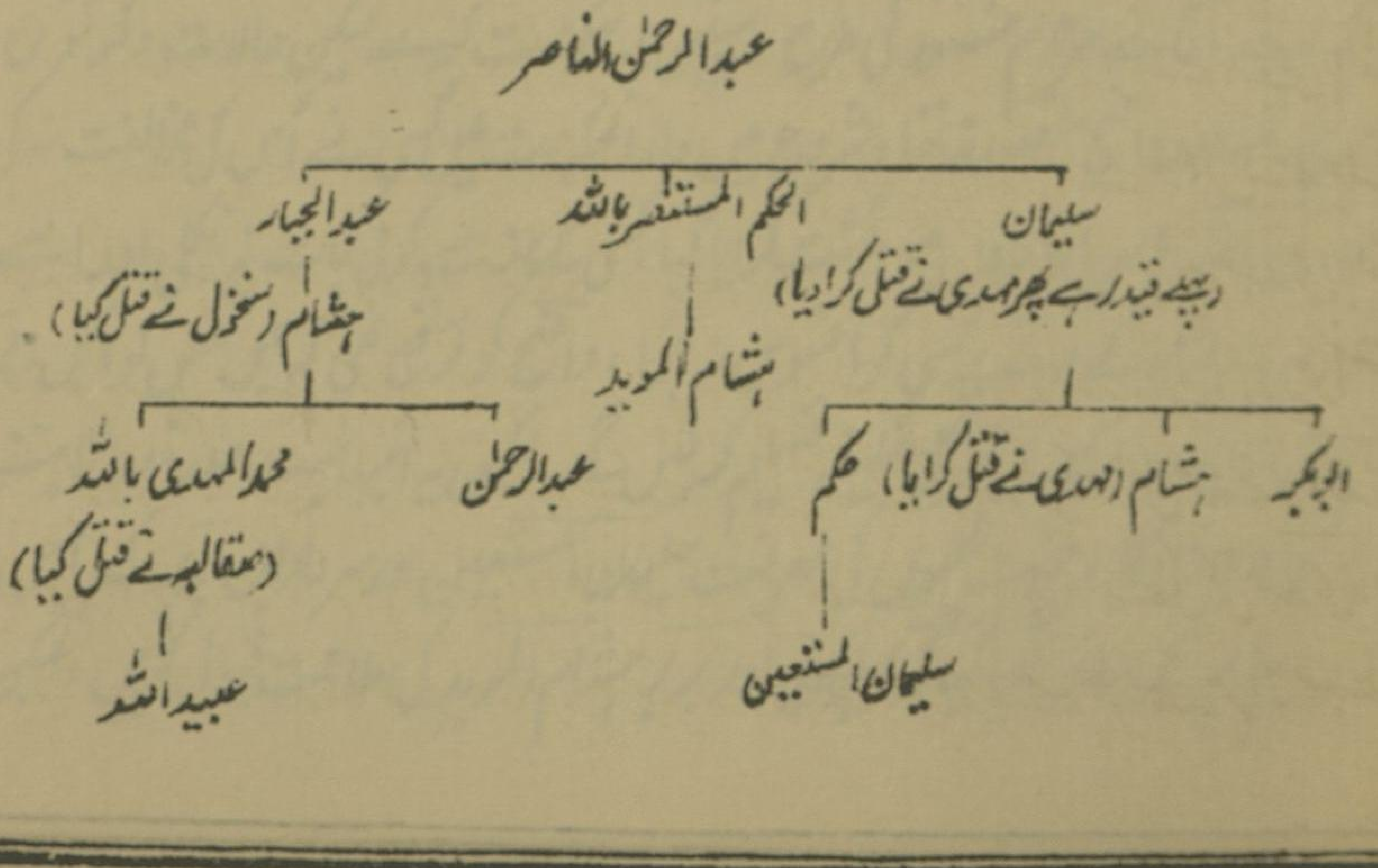
صقالبہ میں سے کچھ لوگ جن کا سردار واضح عامری تھا مہدی کی فوج میں شامل ہو کر دشمن سے لڑے تھے، لیکن ان کے سوا صقالبہ کے بڑے سردار خیران اور عنبر مہدی باللہ کے دشمنوں میں شمار کئے جاتے تھے، غرض صقالبہ نے سوچا کہ اپنے مقاصد کے لئے باہمی اتفاق لازمی ہے، اسی سلسلہ میں ارادہ کر لیا کہ ہشام المؤید کو خلیفہ بنانا چاہیئے، اس نیت سے واضح نے شہر والوں میں مہدی کے خلاف اشتعال پیدا کرنا شروع کیا اور مہدی کو شراب خور کہہ کر اُن کی بُرائیاں مشہور کیں، فوج کی بداعمالی پر علانیہ افسوس ظاہر کر کے خود بددلی پیدا کرنی چاہی، جب اس طرح کی باتوں سے مہدی باللہ کی نسبت جو کچھ تھوڑے بہت اچھے خیالات تھے وہ بھی لوگوں کے دلوں سے جاتے رہے تو خیران اور عنبر اور سلیمان المستعین کے دیگر صقلبی افسروں نے مہدی باللہ سے درخواست کی کہ اُن کو اپنی فوج میں داخل کر لیں، مہدی نے اُن کی درخواست منظور کی، مگر جس وقت یہ صقلبی اپنے ساتھیوں کو لئے قرطبہ میں داخل ہوئے تو مہدی باللہ کو معلوم ہوگیا کہ ان لوگوں کی نیت شروع ہی سے اُن کو تباہ کرنے کی تھی مہدی باللہ میں اب اتنا زور نہ تھا کہ ان صقالبہ کا مقابلہ کر سکتے، اس وجہ سے پھر قصد ہوا کہ طلیطلہ

میں جاکر پناہ لیں، لیکن صقالبہ نے انہیں طلیطلہ نہ جانے دیا، ۲۳ جولائی ۱۰۱۰ء (مطابق ۷ ذی الحجہ ۴۰۰ھ) کو ہفتے کے دن صقالبہ گھوڑوں پر سوار ہشام المؤید کی سلامتیٔ جان کے نعرے لگاتے ہوئے شہر کے بازاروں میں نکلے، اس کے بعد قیدخانے سے ہشام المؤید کو نکالا اور شاہانہ لباس پہنا کر مسندِ خلافت پر لا بٹھایا۔

مہدی باللہ اس وقت حمام میں تھے، لیکن جس وقت معلوم ہوا کہ قصر کے دیوانِ عام میں کیا گزر رہا ہے تو فوراً وہاں گئے، چاہتے تھے کہ ہشام المؤید کے پہلو میں بیٹھ جائیں، لیکن عنبر نے ان کا بازو سختی سے پکڑ کر ان کو مسند سے گھسیٹ لیا، اور ہشام المؤید کے سامنے بٹھا دیا، ہشام المؤید نے جو جو تکلیفیں اٹھائی تھیں ان کو بیان کر کے مہدی کو بہت سخت و سست الفاظ کہے، عنبر نے پھر مہدی کا بازو پکڑا اور مسند کے قریب لا کر تلوار نکالی تاکہ ان کا سر قلم کر دے، مہدی نے عنبر کی کمر پکڑ لی، اتنا دیکھتے ہی اور صقالبی جو قریب کھڑے تھے تلواریں لے کر مہدی پر جھک پڑے، مہدی باللہ صقالبہ کے ہاتھ سے قتل ہو گئے اور آج ان کی لاش اسی جگہ پڑی تھی، جہاں سترہ مہینے پہلے ابنِ عسقلیجہ کا مردہ پڑا تھا، ایک سازش نے تختِ خلافت دلوایا تھا، دوسری سازش نے تخت بھی لیا اور جان بھی۔[1]

---

[1] خلاصہ اس شجرہ سے ظاہر ہوگا۔



اسناد :-

نویری	ص ۴۷۹ تا ۴۸۴
ابنِ خلدون	ص ۹
ابنِ حیّان	(ابنِ بسّام) جلد ۱ ص ۷ تا ۸
عبدالواحد	ص ۲۸ تا ۳۰
ابن الآبار	ص ۱۵۹ تا ۱۶۰
ابن الاثیر	(سنہ ۳۶۶ھ)
مقرّی	ج ۱ ص ۲۷۸
روڈریگیو دی ٹولیڈو	ہسپٹ : اسالم - ۷ - ص ۳۲ تا ۳۵
عبار	ج ۱ ص ۴۴۲
ابن الخطیب	رزاوی پر مضمون - قلمی نسخہ ۷) ص ۱۳۳

کتابِ ثالث

خلافت

پندرھویں فصل

قرطبہ کا لوٹا جانا

ہشام المؤید جیسے کمزور بادشاہ کے زمانہ میں صقالبہ ملک کے سیاہ اور سپید (۵۵۶)
کے مالک ہوگئے ، واضح جسے اب تک حاجب کا درجہ حاصل تھا ، یہ نیت رکھتا تھا کہ اپنے آقائے مرحوم منصور کی طرح اسپین پر حکومت کرے لیکن حالات دگرگوں ہو چکے تھے اور واضح منصور نہ تھا ، شروع میں دار الحکومت میں کسی نے اُس کی مخالفت نہ کی ، مہدی باللہ کا سر بازاروں میں گشت کرایا گیا ، کسی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی اور ایسے خود سر بادشاہ کے مرنے پر کسی کو افسوس نہ ہُوا ، واضح کو توقع تھی کہ جس شخص کو اُس نے خلیفہ بنایا ہے اُسے بربر بھی خلیفہ تسلیم کرلیں گے ۔ لیکن یہ امید بہت جلد غلط ثابت ہوگئی ، مہدی کا سر چند ایلچیوں کی معرفت سلیمان المستعین اور سرداران بربر کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ سلیمان اور بربر ہشام المؤید کی اطاعت قبول کریں ، لیکن

بربر اس درجے برہم تھے کہ واضح کے ایلچیوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہوگئے سلیمان المستعین نے بمشکل ان کی جان بچائی۔ مہدی باللہ کا سر دیکھ کر جو چچا کے بیٹے بھائی ہوتے تھے سلیمان کی آنکھوں میں آنسو جاری ہوگئے، سر کو تحنیط کر کے مہدی کے لڑکے کے پاس بھیج دیا۔ عبید اللہ اس وقت طلیطلہ میں مقیم تھے۔

بربر کی طرف سے تو واضح کو ناامیدی ہو ہی چکی تھی، اب معلوم ہوا کہ قرطبہ میں بھی اُس کے دشمن موجود ہیں، بنی امیہ میں بعض لوگ ایسے تھے جو صقالبہ کی حکومت کو گوارا نہ کر سکتے تھے، ان لوگوں نے سوچا کہ اپنے فوائد کو مدِ نظر رکھنے کے لئے سلیمان المستعین کو ترقی دینے کی فکر ضروری ہے، چنانچہ انہوں نے سلیمان کو خفیہ طور پر کہلا بھیجا کہ اگر ۱۲؍اگست ۱۰۱۰ء (۲۸؍ذی الحجہ ۴۰۰ھ) کو سلیمان قرطبہ کے دروازے کے سامنے آجائیں تو انہیں شہر میں داخل کر لیا جائے گا۔ سلیمان اس پر رضامند ہو گئے، لیکن خیران اور عنبر نے بنی امیہ کی اس سازش کا حال واضح پر ظاہر کر دیا، سازش کرنے والے گرفتار ہو گئے اور سلیمان المستعین جب یوم مقررہ پر قرطبہ کی فصیلوں کے نیچے آئے تو ان پر سخت حملہ کیا گیا، مگر وہ فوراً پیچھے ہٹ گئے۔

اب واضح نے یہ سمجھ کر کہ سلیمان پر اس وقت جو حملہ ہوا ہے اُس سے بربر کا مزاج کسی قدر درست ہو گیا ہو گا۔ پھر بربر سے گفتگو شروع کی، لیکن واضح کی یہ کوشش بیکار گئی۔

اسی زمانہ میں سلیمان المستعین نے اپنے سابقہ معاون شانجہ بادشاہ قشتالیہ سے مدد چاہی اور اس کے معاوضہ میں وہ قلعے دینے چاہے جو قشتالیہ کے علاقے میں منصور نے فتح کئے تھے، یہ تحقیق نہیں کہ یہ وہی قلعے تھے جو پہلے دیئے گئے تھے یا دوسرے تھے۔

بہرکیف شانجہ کو خوب موقع ملا کہ بغیر فوج کشی کے اپنی عملداری کی حدود اس (۵۵۷) طریقے سے بڑھاتا رہے، چونکہ یہ قلعے ابھی تک سلیمان المستعین کے قبضے میں نہ تھے بلکہ واضح کے قبضے میں تھے اس لئے شانجہ نے واضح کو کہلا بھیجا کہ اگر قلعے اس کے حوالے نہ کئے گئے تو

وہ قشتالیہ کی فوجوں کو اپنے ساتھ لے کر بربر کو کمک پہنچائے گا، فیصلہ جو کچھ کرنا ہے جلد کیا جائے۔

واضح نے شہر کے عمائد کو جمع کر کے شانجہ کا معاملہ پیش کیا اور اُن کی رائے دریافت کی، اہلِ مشورت نے اس خوف سے کہ کہیں بربر کو قشتالیہ کی فوجوں سے مدد نہ مل جائے فیصلہ کیا کہ شانجہ جو کچھ طلب کرتا ہے وہ اُس کو دے دیا جائے، چنانچہ اگست یا ستمبر ۱۰۱۰ء (ماہ محرم ۴۰۱ھ) میں واضح نے شانجہ بادشاہِ قشتالیہ سے ایک عہدنامہ کیا، عربی مورخ لکھتے ہیں کہ اس عہدنامہ کے مطابق شانجہ کو دو سو قلعے تفویض کر دیئے گئے، عیسائی مورخوں نے اِن قلعوں میں شنت اشتیبان، کرونہ دل کوندے، غرماج اور وشمہ کے قلعوں کو شمار کیا ہے،

اس مثال سے اور عیسائی ریاستوں کو بھی جرأت ہوئی اور یہ سمجھ کر کہ مضبوط سے مضبوط قلعے بھی محض دھمکیوں سے مل جاتے ہیں اِن عیسائی ریاستوں نے بھی مسلمانوں سے قلعے مانگنے شروع کئے، اور کہا کہ اگر قلعے نہ دیئے گئے تو وہ سلیمان کو مدد پہنچائیں گے اِن عیسائی ریاستوں کی درخواستوں کو بھی مسلمان نامنظور نہ کر سکے، غرض سلطنتِ اسلامیہ جو خانہ جنگیوں کا شکار ہو رہی تھی اب پارہ پارہ ہو کر برباد اور تباہ ہونے لگی، اِس حالت میں یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اہلِ قرطبہ آج بھی بنی عامر کی تباہی پر ایسے ہی خوش تھے جیسے کہ محمد بن ہشام (مہدی باللہ) کو خلیفہ بنانے اور منصور کے فرزند عبدالرحمٰن سنخول کو معزول و قتل کرنے کے دن کوتاہ اندیشی نے اُنہیں خوش کیا تھا۔

بہرکیف قرطبہ والوں کے خیالات جو کچھ ہوں مگر جو کچھ ہو چکا تھا اب وہ اَن ہُوا نہ ہو سکتا تھا، اور مسلمانوں کی حالت ایسی مجبوری کی ہو گئی تھی کہ اپنے دین کے دشمنوں یا جس کسی کو صقالبہ یا بربر اُن پر حکمران بنا دیں اُن کے سامنے سر جھکا دیں، اور اُن کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنے رہیں، خلاصہ یہ کہ باشندگانِ قرطبہ کی حالت اِس وقت وہی تھی جو دُنیا میں ہر ایسی قوم کی ہوتی ہے جس کے پیشِ نظر صاف اور واضح مقاصد اور جس کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے مذہبی یا سیاسی اصول نہیں رہتے اور وہ

غلطیوں میں مبتلا ہو کر انقلاب کے ورطۂ ہلاکت میں آجاتی ہے۔

اس زمانۂ خاص میں بربر کی وحشیانہ حرکتوں سے قرطبہ کے رہنے والوں کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا جس قدر کہ قرطبہ کی اور چیزوں کو تباہی کا سامنا ہوا، بربر نے اِدھر تو چھ ہفتے تک قرطبہ کا محاصرہ جاری رکھا اور اُدھر مدینۃ الزہراء پر حملہ کر دیا، مدینۃ الزاہراء کا دو دن محاصرہ کئے رہے، تیسرے دن ایک نمک حرام افسر نے شہر کا دروازہ اندر سے کھول دیا، بربر نے مدینۃ الزہراء پر قبضہ کر لیا، یہ واقعہ ۴ نومبر ۱۰۱۰ء (۲۳ ربیع الاول ۴۰۱ھ) کا ہے، بربر نے اس بادشاہی شہر میں داخل ہوتے ہی شہر کے لوگوں کا قتلِ عام شروع کیا۔

(۵۵) آدمیوں کے اس قتلِ عام اور مدینۃ الزہراء کی بربادی کو دیکھ کر قرطبہ کے لوگوں کو جو اپنے شہر میں محصور تھے مطلق شبہ نہ رہا کہ جس وقت بربر اُن کے شہر میں داخل ہوں گے تو اُن کا بھی یہی درجہ کریں گے، مدینۃ الزہراء میں جس قدر فوج موجود تھی بربر نے اُس کا ایک متنفس بھی زندہ نہ چھوڑا، خلقت نے جامع زہراء میں پناہ لی، مگر ان افریقیوں سے لوگوں کو وہاں بھی پناہ نہ ملی، مرد، عورتیں اور بچے سب ہی قتل کر دیئے گئے، مدینۃ الزہراء کو لوٹنے کے بعد بربر نے اُس میں آگ لگا دی، اور عالیشان اور خوبصورت بادشاہوں کے رہنے کا شہر جو تمام یورپ میں عدیم المثال تھا ایسا ہی تودۂ خاک ہو گیا جیسے کہ اُس کا خوشنما حریف مدینۃ الزہراء منصور کا تعمیر کردہ شہر کچھ دن پہلے راکھ کا ڈھیر ہو چکا تھا۔

لشکرِ بربر کے ایک حصہ نے قرطبہ کے مضافات کو جاڑے بھر لوٹا اور غارت کیا، شہر میں ہر قسم کی رسد بند کر دی، جب دیہات کے لوگ لٹ چکے تو جان بچانے کے لیے وہ شہر کے اندر آنے شروع ہوئے، اب قرطبہ میں اُن کی اتنی کثرت ہوئی کہ شہر والوں سے بھی تعداد میں بڑھ گئے، کھانے پینے کی چیزیں اس قدر گراں ہو گئیں کہ بہت لوگ فاقوں سے مرنے لگے، سرکاری خزانے میں روپیہ نہ رہا، واضح حاجب ہشام المؤید نے روپیہ فراہم کرنے کے لئے خلیفہ مستنصر باللہ کے کتب خانے کی زیادہ تر کتابیں

فروخت کر ڈالیں، بربر کی فوجوں کے علاوہ افریقہ کے اور گروہوں نے اسپین کے صوبوں میں لوٹ مار شروع کی، بڑے بڑے شہر اُن کے قبضے میں آگئے، اور اکثر صورتوں میں اِن شہروں کے باشندوں پر بھی وہی گذری جو مدینۃ الزہراء کے لوگوں پر گذری تھی، اسپین میں ہر مقام ایک قابلِ رحم منظر پیش کرتا تھا، دیہات آدمیوں سے خالی ہو گئے، اور جن سڑکوں پر چند روز پہلے بکثرت مسافر چلا کرتے تھے وہاں کئی کئی دن کے سفر میں ایک آدمی تک نظر نہ آتا تھا۔

۱۰۱۱ء (۴۰۲ھ) کے موسمِ گرما میں اسپین میں بالعموم اور قرطبہ میں بالخصوص آفات و مصائب کی زیادتی رہی، معلوم ہوتا تھا کہ اِس بدنصیب شہر کو جہاں اب وبائی امراض کی بھی شدت ہو گئی تھی ایک دردناک مسرت اپنے مصائب کو خانہ جنگی سے بڑھانے میں حاصل ہوتی تھی، فوج کے لوگ اِن آفات کا باعث واضح حاجب کو قرار دیتے تھے، صقلبی سپہ سالار ابنِ ابی وداعہ نے جو واضح سے جانی دشمنی رکھتا تھا، واضح کے خلاف لوگوں کو اور بھی اشتعال دلانا شروع کیا، جب واضح کی توہین علی الاعلان ہونے لگی تو اُسے خیال ہوا کہ اب اِس حالت میں اپنا سلامت رہنا مشکل ہے، اِس لئے ایک شخص کو جس کا نام اُبوبکر تھا اُس نے مصالحت کے پیغام کے ساتھ سلیمان المستعین کے پاس بھیجا، سلیمان اِس وقت بربر کے ساتھ قرطبہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، واضح کی اِس حرکت سے قرطبہ کے لوگوں میں اور بھی غصہ بڑھا چنانچہ ابوبکر جس وقت سلیمان المستعین کا جواب لے کر مجلسِ وزراء میں آیا تو سپاہیوں نے اُس پر حملہ کیا، اور وہ سلیمان المستعین کا جواب ابھی سُنانے بھی نہ پایا تھا کہ خلیفہ ہشام المؤید اور واضح کی آنکھوں کے سامنے اُسے قتل کر ڈالا، حاجب واضح نے جب یہ حال دیکھا تو بربر کے پاس جا کر پناہ لینے کا قصد کر لیا، لیکن ابنِ ابی وداعہ کو واضح کا یہ ارادہ معلوم ہو گیا اور اُس نے واضح کو قرطبہ سے باہر نکلنے نہ دیا، بلکہ صقالبہ کو ساتھ لئے واضح کے محل میں داخل ہوا، اور اُسے تلوار مار کر کہنے لگا "بدبخت تُو نے اُس روپیہ کو برباد کیا ہے جس کی ہمیں سخت ضرورت تھی اور اب ہم کو بربر کے قبضے میں دینا چاہتا ہے۔" ابنِ ابی وداعہ سپہ سالار صقالبہ کے ۵۹۶

ساتھ جو سپاہی تھے اُنھوں نے حاجب واضح کا بہت جلد کام تمام کر دیا، اور تھوڑی دیر کے بعد واضح کا سر قرطبہ کے بازاروں میں گشت کرایا جانے لگا جو لوگ واضح کے طرفدار تھے اُن کا گھر بار لُٹنا شروع ہوا اور آخر کار واضح کی لاش وہیں پھینک دی گئی۔ جہاں محمد بن ہشام المہدی باللہ اور ابن عسقیلیجہ کی لاشیں پھینکی گئی تھیں یہ واقعات ۱۶؍اکتوبر سنہ ۱۰۱۱ء یعنی ۱۵؍ربیع الثانی سنہ ۴۰۲ھ کے ہیں۔

ابھی بربر اور سلیمان المستعین جو قرطبہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھے، شہر میں داخل ہوا اور قرطبہ کے لوگوں کو اُن کے باہمی نزاعات سے سبکدوش کرنے میں ڈیڑھ برس اور باقی ہے اسی زمانہ ایک مسلسل شورش کا ہے، اس ڈیڑھ برس میں ابن ابی وداعہ نے نہایت ظلم اور سختی سے قرطبہ پر حکومت کی، فقہا نے اُس کی مدد کی اور فتوی دیا کہ بربر سے لڑنا جہاد ہے، محصورین قرطبہ کو کئی بار لڑائیوں میں کامیابی ہوئی تھی سنہ ۱۰۱۲ء (شوال سنہ ۴۰۳ھ) میں بربر کا ایک بڑا سردار اُن کے ہاتھ پڑ گیا، یہ زاوی بن منّاد کا بھتیجا حباسہ تھا، حباسہ قرطبہ کے محصوروں سے لڑتا ہوا دشمن کے منجھ میں پہنچا ہی تھا کہ اُس کے گھوڑے کا زیر بند ٹوٹ گیا، جب وہ اُسے درست کرنے جھکا تو ایک علیبائی صقلبی نے برچھی مار کر اُسے گھوڑے سے گرا دیا، اُس کے گرتے ہی اور صقالبہ نے حباسہ کو فوراً قتل کر دیا۔ حباسہ کے بھائی حبوس نے بہت کوشش کی کہ صقالبہ سے اپنے بھائی کی لاش چھین لے، لیکن لڑائی سخت ہوئی اور حبوس کو پیچھے ہٹنا پڑا، صقالبہ حباسہ کا سر بڑی خوشیاں مناتے ہوئے قصر خلافت میں لائے اور حباسہ کی لاش کو قرطبہ کے لوگوں میں چھوڑ دیا تاکہ وہ اس کی بے عزتی کریں، قرطبہ کے لوگوں نے لاش کو گھسیٹا ہاتھ پاؤں کاٹے اور آخر کار اُسے جلا ڈالا، اس پر بربر کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی یہ چیخ چیخ کر کہتے تھے کہ ہم اپنے سردار حباسہ کے خون کا بدلہ ایسا لیں گے کہ وہ قرطبہ کے تمام آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد بھی کم نہ ہوگا۔

اب بربر نے محاصرہ میں سختی دو چند کر دی، لیکن جب زندگی سے ناامیدی ہوئی تو قرطبہ والوں کی ہمت میں انسان کی ہمت سے بڑھ کر طاقت پیدا ہو گئی۔

اور ابن ابی وداعہ کی سرکردگی میں شہر پناہ سے باہر نکل کر بربر پر اس زور کا حملہ کیا کہ
بربر نے مجبور ہو کر محاصرہ اُٹھا لیا۔ اہل قرطبہ نے اشبیلیہ سے بھی بربر کو خارج کیا۔
لیکن جب بربر نے قلعہ رباح پر قبضہ کیا تو اُن کو روک نہ سکے اس کے تھوڑے دن
بعد بربر پھر قرطبہ کی شہر پناہ کے سامنے نمودار ہوئے، باوجود قرطبہ والوں کی کوشش کے
بربر نے قرطبہ کے گرد جو خندق تھی اُسے پاٹ دیا۔ اور قرطبہ کے مشرقی حصے کے وہ مالک
ہو گئے ایک مرتبہ پھر تقدیر نے کچھ دیر کے لئے قرطبہ والوں کا ساتھ دیا اور انہوں نے بربر کو
اُس مقام سے جہاں وہ جم گئے تھے ہٹا دیا، لیکن اہل قرطبہ کی یہ اخیر کامیابی تھی۔ اتوار
کے دن ۱۹ اپریل ۱۰۱۳ء یعنی ۵ شوال ۴۰۳ھ کو بربر باب شقندہ سے شہر میں داخل
ہو گئے، شہر کا دروازہ ایک افسر نے جسے بربر نے رشوت پہنچا دی تھی کھول دیا تھا۔
تین برس تک دشمن کا مقابلہ کرتے رہنے کی سزا یہ ملی کہ قرطبہ میں خون کی ندیاں بہہ
گئیں، صقالبہ جان سے مایوس ہو کر چھپنے کی جگہ ڈھونڈنے لگے، بربر نے قرطبہ کے ہر ۵۴۰؍
گلی کوچے کو وحشیانہ شور مچا کر لوٹا، کہیں لوٹا، کہیں بے عزت کیا، کہیں جان سے مارا،
اسی طرح سارے شہر پر قبضہ کر لیا، ایسے بے گناہ بھی جن کو فتنہ و فساد سے کچھ سروکار
نہ تھا بربر کے قہر و غضب کا نشانہ بن گئے، کہیں صاحب التعظیم سعید ابن منذر جو
مستنصر باللہ کے وقت سے جامع قرطبہ میں امامت کرتے آئے تھے اور نہایت
نیک نفس اور باخدا شخص تھے مرے پڑے تھے، کہیں مروان کی لاش پڑی تھی جو بنی حدیر
کے نہایت شریف خاندان کی یادگار تھے اور کسی کے عشق میں مجنون رہا کرتے تھے،
فاضل اجل ابن الفرضی[1] جنہوں نے ایک بڑی اعلیٰ تصنیف فن رجال پر لکھی تھی، اور
قاضی ملقبیہ جو خلیفہ مہدی باللہ کے زمانہ میں قاضی مقرر ہوئے تھے اسی ہنگامے میں
مارے گئے ان اخیر بزرگ نے کبھی دعا مانگی تھی کہ شہید ہو کر مروں، یہ دعا اُن کی قبول ہوئی

---

[1] ابو الولید عبداللہ ابن الفرضی ۳۵۱ھ ۹۶۲ء میں قرطبہ میں پیدا ہوئے، دیکھو ہوارٹ کی تصنیف "عربی ادبیات"
(مطبوعہ ۱۹۰۳ء) صفحہ ۳۰۳ تا ۳۰۴

مقتولوں کی تعداد اتنی تھی کہ اُن کا شمار ممکن نہ تھا، اِس قتلِ عام کے منظر کو آگ کے شعلوں نے اور بھی ہیبت ناک کر دیا، خوبصورت سے خوبصورت قصر آگ کی نذر ہو گئے، ابنِ حزم نے ایک جگہ لکھا ہے "آخر کار مجھے اپنے محل کا حال معلوم ہوا جو بلاطِ مغیث میں تھا، قرطبہ سے ایک شخص بھاگ کر آیا، اُس نے بیان کیا کہ وہ محل اب اینٹوں کا ایک ڈھیر ہے، اپنی بیویوں کا حال بھی معلوم ہوا، بعض گوشۂ قبر میں پہنچ چکی ہیں اور بعض دور دراز ملکوں میں آوارہ گرد ہیں۔"

شہر پر جس دن بربر کا قبضہ ہوا اُس کے دوسرے دن سلیمان المستعین قصرِ خلافت میں گئے، قرطبہ کے لوگ جو بربر کی تلوار سے بچ گئے تھے سب المستعین کے سلام کے لئے گھروں سے نکلے، گو قتل و غارت کے ہولناک واقعات کے بعد اُن کے دِل زخمی ہو رہے تھے مگر پھر بھی سلیمان المستعین کے حق میں دُعا کرنے لگے، سلیمان اُن کے تصنع کو سمجھ گئے اور کسی شاعر کا ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ "اُن کی زبان سے میرے حق میں درازیٔ عمر کی دعا نکل رہی ہے، لیکن اُن کے ہاتھ سے میری موت بہت جلد آسکتی ہے۔"

قصر میں آکر سلیمان نے ہشام المؤید کو بلایا اور اُن سے کہا "کیا تم نے میرے لئے تختِ خلافت نہیں چھوڑا تھا؟ کیا تم نے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ تخت کا دعویٰ پھر نہ کروں گا؟ یہ عہد شکنی تم نے کیوں کی؟" ہشام المؤید نے کہا "افسوس، تم کو معلوم ہے کہ میں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں، وہ جو کچھ کہتے ہیں مجھے کرنا پڑتا ہے، میری جان لینے سے باز آؤ، میں پھر تمہارے حق میں خلافت سے دست کش ہوتا ہوں، اور تم کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔"

بربر پہلے ربضِ شقندہ میں آباد ہوئے، لیکن تین مہینے کے بعد قرطبہ کے تمام لوگوں
کو سوائے اُن کے جو شہر کے مشرقی حصّے میں یا اُس حصّے میں رہتے تھے جسے پرانا شہر (۵۶۱)
کہتے تھے شہر بدر ہونے کا حکم دیا گیا، اُن کی جائیدادیں ضبط کر کے فاتحوں میں تقسیم کر دی گئیں اور اب بھی فاتح اُن مکانوں میں جو منہدم ہونے سے بچ گئے تھے رہنے لگے۔

اسناد:۔

نویری	ص ۴۸۴ تا ۴۸۶
ابن الاثیر	سنہ ۴۰۰ھ)
ابنِ حیّان	(ابن بسّام ج ۱ ص ۸)
روڈرگیودی ٹولیڈو	ص ۳۷ تا ۳۹
مقرّی	ج ۱ ص ۲۵۰، ۵۴۶
ابنِ حزم (عشق)	ص ۳۸، ۸۷ تا ۸۸، ۹۶، ۱۰۲، ۱۰۶
ابن الخطیب	(حباسہ پر مضمون۔ قلمی نسخہ ۹) ص ۱۲۴
ابنِ بسّام	ج ۱ ص ۱۶۱
	ج ۳ ص ۱
ابن الابار	ص ۱۹۴
عبدالواحد	ص ۲۸

کتابِ ثالث

خلافت

سولھویں فصل

بنی حمود

(٥ جس وقت سے خانہ جنگی شروع ہوئی تھی، اسپین کے بہت سے صوبوں کے حاکموں نے خود مختاری شروع کر دی تھی، جب بربر نے قرطبہ پر جو دار الخلافت تھا قبضہ کر لیا تو سلطنت کی احدیت شکست ہو گئی، شیرازہ حکومت بکھر گیا، صقلبی سپہ سالاروں نے مشرقی اسپین کے بڑے شہروں پر تصرف کر لیا، بربر کے سردار بھی جنہیں بنی عامر نے بڑی بڑی جاگیریں اور صوبے حکومت کرنے کے لئے دے رکھے تھے مطلق العنان ہو گئے، چند عربی خاندان جو اب تک صاحب قوت تھے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکتے تھے، اُنھوں نے سلیمان المستعین کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا، سلیمان المستعین کی حکومت اس وقت صرف پانچ بڑے شہروں پر یعنی قرطبہ، اشبیلیہ، لبلہ، اکشنوبہ اور باجہ پر محدود تھی۔

اب کسی سیاسی تبدیلی کا احتمال نہ تھا، بربر اُس دولت کے صرف کرنے میں مصروف ہوئے جو قرطبہ اور شہروں کو لوٹ کر حاصل کی تھی، سلیمان بھی جو چار برس تک مجبور ہو کر لڑائیوں میں مصروف رہے تھے اب جنگ کی طرف متوجہ نہ تھے، یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ سلیمان المستعین جن کو بربر کی اُن وحشی قوموں کی سرداری نصیب ہوئی تھی، جنھوں نے سلطنتِ اسلامیہ کو غارت و تباہ کیا تھا اپنی ذات سے انصاف پسند، نرم دل اور فیاض تھے۔ ادبیات کے شیدا اور اچھے شاعر تھے، عورتوں کا بہت لحاظ کرتے تھے، عاشق مزاج تھے، جہاں تک امکان میں تھا اُن کی کوشش یہی تھی کہ اس طوفانِ عظیم کے بعد جو سکون پیدا ہوا ہے اُسے ہمیشہ برقرار رکھا جائے بدقسمتی سے فوجِ بربر کے ظلموں سے جن کو وہ دیکھتے تھے مگر روک نہ سکتے تھے وہ سخت بدنام ہو چکے تھے، بربر اُن کے اِس شرط پر مطیع ہوئے تھے کہ اُن کی آزادی میں کوئی مخل نہ ہو، اندلسیوں کی نظر میں المستعین ظالم اور کافر تھے، غاصبِ تاج و تخت تھے، بربر اور شمال کے عیسائیوں نے جن میں دونوں قابلِ نفرت تھے، انہیں خلیفہ بنایا تھا، جس وقت سلیمان نے بعض شہروں کے باشندوں کو دھمکی دی کہ اگر وہ اطاعت قبول نہ کریں گے تو قرطبہ کی مثل اُن کے شہروں کو بھی غارت کر دیا جائے گا، تو تمام رعایا اُن کے حق میں بددُعا کرنے لگی، کسی شاعر نے کہا:-

> اللہ تمہارے سلیمان پر رحم نہ کرے، کیونکہ وہ سلیمان (علیہ السلام) کی ضد ہے، سلیمان (علیہ السلام) نے تمام شیاطین کو قید کر دیا تھا، اور اِس سلیمان (المستعین) نے تمام شیطانوں کو آزاد کر دیا، اور اسی کا نام ہے کہ یہ شیاطین تمام ملکوں میں قتل و غارت کرتے پھرتے ہیں، میں نے قسم کھائی ہے کہ ظالموں کے سینے میں اپنی تلوار اُتار دوں گا، اور مذہب کی جو شان جاتی رہی ہے پھر اُسے قائم کروں گا، عجیب بات ہے کہ عبد شمس کی اولاد میں سے ایک شخص بربر ہو جائے، اور شرفائے عرب کے ہوتے ہوئے تاج اُس کے سر پر رکھا جائے میں کبھی ایسے شیطانوں کا مطیع نہ ہوں گا، تلوار اِس بات کا فیصلہ کرنے کی

اگر وہ مغلوب ہوئے تو پھر زندگی میں میرے لئے راحت ہے اور اگر میں مارا گیا تو

کم سے کم ظلموں کے دیکھنے سے بچ جاؤں گا"۔

اہل اندلس اور نیز صقالبہ کے خیالات سلیمان المستعین کی طرف سے اسی قسم کے تھے جو ان اشعار میں بیان ہوئے ہیں، خطبے میں وہ اب تک ہشام المؤید کے حق میں دعا کرتے تھے، حالانکہ سلیمان ان سے درخواست کر چکے تھے کہ ہیں اور کسی قسم کی تم سے امداد نہیں چاہتا، لیکن خطبے میں ہشام المؤید کی جگہ میرا نام پڑھا جائے، یہ بات ابھی تک یقینی طور پر معلوم نہ تھی کہ ہشام المؤید زندہ ہیں، عجیب و غریب متضاد خبریں ان کی نسبت مشہور تھیں، کوئی کہتا تھا کہ سلیمان نے ان کو مروا ڈالا ہے، کوئی کہتا تھا کہ قید کر رکھا ہے زیادہ تر خیال یہ کہ وہ قید خانے میں ہیں مارے نہیں گئے، کیونکہ قاعدہ یہ تھا کہ معزول بادشاہ کا جانشین معزول بادشاہ کی لاش رعایا کو دکھا دیا کرتا تھا، اگر ہشام المؤید مارے گئے ہوتے تو اس قاعدے کے مطابق ان کی لاش رعایا کو دکھا دی گئی ہوتی، لیکن ابھی تک کسی نے ان کی لاش دیکھی نہ تھی۔ صقالبہ ابھی تک ہشام المؤید کے نام سے لڑائیاں لڑتے تھے، خیران صقالبہ کا سب سے بڑا سردار تھا، یہ محمد ابن ابی عامر المنصور کا مولیٰ تھا اور منصور ہی نے اپنے زمانہ میں اس کو المریہ کا حاکم مقرر کیا تھا، جس وقت بربر قرطبہ میں داخل ہوئے تو خیران قرطبہ ہی میں تھا، لیکن قرطبہ میں بربر کے داخل ہوتے ہی وہ وہاں سے بھاگا، جب دشمن نے پیچھا کیا تو بھاگنے سے رک گیا، ساتھیوں نے ساتھ چھوڑ دیا، دشمن سے معرکہ ہوا، خیران زخموں سے چور ہو کر زمین پر گرا، دشمن یہ سمجھ کر کہ ٹھنڈا ہو چکا ہے چھوڑ کر چل دیئے، مگر خیران زندہ رہا اور پھر قرطبہ میں چلا آیا، یہاں اس کے ایک دوست نے جو فلاح فرلق سے تھا اُسے اپنے گھر مہمان کیا، جب زخم اچھے ہو گئے تو دوست نے اُسے کچھ روپیہ دیا، خیران میں اب اتنی جان آ گئی تھی کہ المریہ کا رستہ لے، چنانچہ بہت سے صقالبی اور اندلسی خیران کے علم کے نیچے جمع ہو گئے، المریہ پہنچ کر خیران نے شہر کا محاصرہ کیا اور بیس[۲۰] دن کے محاصرے کے بعد المریہ پر قبضہ کر لیا سلیمان المستعین کے سپہ سالاروں میں سے ایک شخص البیلہ نکلا جو خیران کا بڑا

سچا اور یکّا دوست ثابت ہوا، اس سپہ سالار کا نام علی بن حمود تھا، علی بن حمود حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی اولاد میں سے تھے، لیکن چونکہ اُن کا خاندان دو سو برس سے افریقہ میں آباد ہوگیا تھا اس لئے خاندان کے لوگ تقریباً بربر ہوگئے تھے، علی بن حمود صحیح عربی نہ بول سکتے تھے، افریقہ میں سبتہ اور طنجہ کے حاکم تھے، اُن کے بڑے بھائی قاسم بن حمود جزیرۃ الخضراء کے والی تھے، علی اپنی جگہ تقریباً خود مختار تھے، مگر یہ خود مختاری اُن کے لئے کافی نہ تھی، اسپین پر حکومت کرنے کا شوق پیدا ہوا، اسی طمع میں قصد کیا کہ صقالبہ سے سازش کرنی چاہیئے، چنانچہ خیران سے اُنہوں نے ملاقات کی، اور حصول مقصد کے لئے ایک عجیب قصّہ گھڑا، وہ یہ کہ ہشام المؤید نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ اندلس میں بنی اُمیّہ
(۵۶۴) کے زوال پر ایک علوی جس کا نام "ع" سے شروع ہوگا حکومت کرے گا، اور یہ بھی بیان کیا کہ قرطبہ کے محاصرہ کے زمانہ میں ہشام المؤید نے اُن کے پاس ایک تحریر اس مضمون کی بھیجی تھی کہ "میرا قیاس ہے کہ سلیمان المستعین مجھے قتل کر دے گا، اس لئے میں تم کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں، میرے خون کا بدلہ لینا تمہارا فرض ہوگا۔" خیران نے جب دیکھا کہ علی بن حمود جیسا معاون و مددگار ہاتھ آتا ہے اور ہشام المؤید ابھی جیتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا، اور علی بن حمود نے جو قصّہ بیان کیا تھا اُسے بلا تامل یقین کر لیا علی بن حمود نے خیران سے اس بات کا وعدہ لیا کہ اگر ہشام المؤید زندہ نہ ہوئے تو علی بن حمود کو وہ خلیفہ تسلیم کرے گا۔

جب یہ ابتدائی امور طے ہوگئے تو علی بن حمود بحر زقاق عبور کر کے اسپین میں آئے عامر ابن فتوح فائقی اُس وقت مالقہ کا حاکم تھا، علی نے عامر سے مالقہ کی حکومت مانگی، عامر جو ایک شخص فائق کا مولیٰ تھا، اور فائق خود خلیفہ مستنصر کا مولیٰ رہا تھا، پہلے ہی سے صقالبہ سے میل ملاپ رکھنے پر آمادہ تھا، کیونکہ بربر سے اُسے یہ شکایت چلی آتی تھی کہ بربر کے سرداروں نے رندہ کی حکومت سے اُسے معزول کر دیا تھا، غرض عامر بن فتوح نے مالقہ کی حکومت بھی علی بن حمود کے سپرد کر دی، اب علی نے شہر المنکب میں خیران والی المریہ سے ملاقات کی اور یہ دونوں مل کر قرطبہ پر حملہ کرنے کے لئے چلے۔

علی بن حمود نے صرف صقالبہ کی مدد پر بھروسہ نہ کیا بلکہ بربر کی بھی ایک بڑی جماعت سے ساز باز کر لیا، بربر بالعموم سلیمان المستعین کو کچھ نہ سمجھتے تھے، سلیمان کو خلیفہ انہوں نے اس لئے بنایا تھا کہ اس وقت کسی نہ کسی کو خلیفہ بنانے کی ضرورت تھی اور سوائے سلیمان کے دوسرا کوئی دستیاب نہ ہوتا تھا، بربر کی طبیعت وحشی اور جنگ جو تھی، سلیمان نرم دل کے تھے، اس لئے بربر ان کو اور بھی ناپسند کرتے تھے، علی بن حمود بہادر اور شجاع تھے، یہ چیزیں بربر کے دل میں ان کی عزت پیدا کرتی تھیں اس کے علاوہ علی بن حمود کو بربر اپنا ہم وطن بھی سمجھتے تھے، بربر کا سب سے بڑا سردار جو اس وقت غرناطہ کا حاکم تھا زادی بن زیری تھا، اسی نے سلیمان کو خلیفہ بنایا تھا مگر بنی امیہ سے بالعموم اسے سخت عداوت تھی، کیونکہ اس کا باپ زیری افریقہ میں بنی امیہ کے دوستوں کے مقابلہ میں لڑا تھا، جب لڑائی میں مارا گیا تھا تو اس کا سر کاٹ کر قرطبہ میں قصر خلافت کی دیوار پر نصب کیا گیا تھا، یہ سر اس وقت تک دیوار پر نصب تھا جب کہ زادی اپنی فوج کو لئے ہوئے قرطبہ کو لوٹنے کے لئے شہر میں داخل ہوا تھا، زادی کے لئے باپ کے مردے کی توہین ایسی تھی جسے وہ کبھی معاف نہ کر سکتا تھا، پس جس وقت علی بن حمود نے سلیمان المستعین کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو زادی، علی کے ساتھ ہو گیا، زادی کی مثال نے اور بربر بھی اڑ گیا، چنانچہ سلیمان المستعین نے جس بربر فوج کو علی بن حمود کے مقابلہ میں بھیجا تھا اس نے قصداً علی بن حمود سے شکست کھائی، اور اس بربر فوج کے سپہ سالار نے سلیمان المستعین سے کہا کہ اگر آپ فتح چاہتے ہیں تو خود فوج کے سپہ سالار بن کر لڑائی پر چلئے، سلیمان مستعد ہو گئے، لیکن جب وہ لڑائی کے میدان کے قریب پہنچے تو انہیں ایک خچر پر سوار کرا کے علی بن حمود کے حوالے کر دیا گیا،

یکم جولائی سنہ ۱۰۱۶ء (۲۲ محرم سنہ ۴۰۷ھ) کو اتوار کے دن علی بن حمود اور ان کے ہمراہی قرطبہ میں داخل ہوئے، حیران اور دیگر صقالبہ کا پہلا کام یہ تھا کہ ہشام المویدہ کو تلاش کریں جب یہ تلاش بے سود ہوئی تو علی بن حمود دل میں خوش ہوئے، اب انہوں نے وزیروں

اور فقیہوں کے سواجہ میں سلیمان المستعین سے پوچھا کہ ہشام الموید کہاں ہیں؟ سلیمان نے (۵۶۵)
فوراً جواب دیا کہ اُن کا انتقال ہو گیا، علی بولے، اگر ایسا ہوا ہے تو اُن کی قبر بتاؤ کہاں ہے
سلیمان نے ایک قبر بھی بتادی، قبر کھولی گئی، علی بن حمود نے ہشام کے ایک ملازم کو
بلایا اور لاش دکھا کر پوچھا کہ "کیا یہ تمہارے آقا کی لاش ہے؟" اس ملازم کی نسبت
ہمیں یقین ہے کہ اُسے ہشام الموید کے زندہ ہونے کا علم تھا، لیکن علی بن حمود نے
اسے پہلے سے سکھا پڑھا دیا تھا، غرض ملازم نے بے تکلف جواب دیا کہ لاش بیشک
اُس کے آقا کی ہے۔ اور شناخت کے لئے منہ میں ایک سیاہ دانت کی طرف اشارہ بھی کیا،
اس نوکر کی شہادت کی تائید اور لوگوں نے بھی کی، یہ لوگ وہ تھے جو علی بن حمود کو ناخوش
کرنے سے ڈرتے تھے، یا اُسے اپنے اُوپر مہربان بنانا چاہتے تھے۔

غرض صقالبہ کو تسلیم کرنا پڑا کہ اُن کا خلیفہ اور آقا ہشام الموید اب زندہ نہیں ہے
اس لئے اُس کی جگہ اب علی بن حمود کو بادشاہ ماننا چاہیئے، علی بن حمود نے اب سلیمان
المستعین، اور اس کے باپ حکم، اور باپ کے بھائی ابوبکر کو قتل کرنے کا حکم سنایا،
جس وقت سلیمان کا باپ حکم مقتل میں پہنچا تو علی بن حمود نے اُس سے کہا کہ "تم نے
ہشام کو قتل کیا ہے"۔ حکم، جن کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی عبادت و ریاضت
میں مصروف رہتے تھے، اور سیاسی معاملات سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے، کہنے
لگے، "نہیں، خدا میرا گواہ ہے کہ ہم نے ہشام کو ہلاک نہیں کیا، وہ اب تک زندہ ہیں...."
یہ الفاظ اُن کی زبان سے ابھی پورے نکلے بھی نہ تھے کہ علی بن حمود ڈرے کہ خدا جانے
آگے اور کیا کیا باتیں کھلیں، فوراً جلاد کی طرف اشارہ کیا، بڈھے حکم قتل کردیئے گئے
جو لاش قبر سے نکالی گئی تھی اور اُسے ہشام الموید کی لاش بتایا گیا تھا، اُسے پھر اُسی
قبر میں شاہانہ عزت و عظمت کے ساتھ دفن کردیا گیا۔

سوال یہ ہے کہ آیا ہشام الموید واقعی مر چکے تھے؟ اس مسئلہ پر ضریحی اختلافات
نے ایسا پردہ ڈال رکھا ہے جسے اُٹھانا تقریباً ناممکن ہے: یہ امر یقینی ہے کہ سلیمان
المستعین کے قرطبہ میں داخلہ کے بعد ہشام الموید کسی کو نظر نہ آئے، اور جو شخص بعد کو ہشام الموید

کہلایا گیا وہ ایک فرضی شخص تھا، لیکن برخلاف اس کے یہ امر کبھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا کہ سلیمان المستعین نے ہشام المؤید کو قتل کرا دیا تھا، یا وہ سلیمان کے زمانہ حکومت میں اپنی موت سے مرے تھے، اور نہ موالی بنی اُمیّہ کا بیان پایہ ثبوت کو پہنچ سکا کہ علی بن حمود نے جو لاش قبر کھلوا کر نکلوائی تھی وہ ہشام المؤید کی نہ تھی، یہ سچ ہے کہ عمائد سلطنت کے سامنے سلیمان المستعین کہہ چکے تھے کہ ہشام المؤید اب زندہ نہیں ہیں، لیکن سلیمان المستعین کی شہادت اس امر میں قابل اعتبار نہیں معلوم ہوتی، یہ بھی ناممکن ہے کہ علی بن حمود نے سلیمان المستعین سے کہا ہو کہ جان کی سلامتی چاہتے ہو تو یہی کہو کہ ہشام المؤید اب زندہ نہیں ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سلیمان المستعین ظالم آدمی نہ تھے، اور یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ سلیمان المستعین ایک ایسا جرم کرتے جو مہدی جیسے غضب ناک آدمی سے بھی بن نہ پڑا تھا، یہ امر بھی غور کے قابل ہے کہ اگر سلیمان المستعین کے زمانہ حکومت میں ہشام کا انتقال ہوا ہوتا تو لازمی تھا کہ سلیمان اُن کی لاش حسب دستور اور اپنے فائدے کے لئے اہل قرطبہ کو دکھا دیتے، موالی بنی اُمیّہ کا بیان ہے کہ سلیمان المستعین اہل قرطبہ سے اس قدر بیزار تھے کہ وہ کبھی اُن کی لاش نہ دکھاتے، اس بیان میں یہ موالی اس بات کو بھول گئے تھے کہ سلیمان المستعین کو اہل قرطبہ سے بیزاری ہو، لیکن صقالبہ سے تو یہ بیزار نہ ہو سکتے تھے، کیونکہ بہت کوشش کے بعد صقالبہ کو خوش کر کے
(۵۶۶ سلیمان نے اپنی بیعت اُن سے حاصل کی تھی، اور کوئی طریقہ اس سے بہتر نہ تھا کہ اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے صقالبہ کو ہشام المؤید کی موت کا یقین دلا دیتے، سب سے اخیر میں سلیمان المستعین کے بڈھے باپ حَکَم کی شہادت تھی جس نے باوجود اپنے فرزند کے بیان کے خدا کو گواہ کر کے کہا کہ ہشام المؤید اب تک زندہ ہیں۔ کیا یہ ممکن تھا کہ ایک زاہد و عابد بڈھا آدمی جو خدا کے حضور میں حاضر ہونے کو تھا مرتے وقت ایسا جھوٹ بولتا، اس بات کو قیاس ہرگز گوارا نہیں کرتا۔

اِن کُل امور پر غور کرنے کے بعد یقین ہوتا ہے کہ عورتوں اور حریم خلافت کے خواجہ سراؤں میں جو روایت مشہور تھی وہی کسی قدر سچ تھی، اور وہ یہ تھی کہ سلیمان المستعین

کے زمانۂ حکومت میں ہشام المؤید کسی ترکیب سے قصر سے نکل کر شہر میں جا چھپے، اور یہاں کچھ دن تک چوری چھپے مزدوری کر کے اپنا گذر کرتے رہے، اس کے بعد وہ ایشیا چلے گئے، یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا ایشیا کی طرف اُن کی فراری سلیمان المستعین کے اشارے سے عمل میں آئی تھی؟ کیا ہشام المؤید نے قسم کھائی تھی کہ وہ مستعین کی راہ میں اب کسی طور پر مزاحم نہ ہوں گے؟ کیا ہشام اور مستعین میں خط و کتابت رہتی تھی؟ یہ کل سوالات سلیمان المستعین کے بڈھے باپ حَکَم کے بیان سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اِن سوالوں کا کوئی ٹھیک جواب نہیں دیا جا سکتا، یہ امر خلاف قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ ہشام المؤید اُن لوگوں سے تنگ آ گئے ہوں جنہوں نے ہر قسم کے اختیارات سے اُنہیں محروم کر دیا تھا، لیکن لڑائیوں میں ہمیشہ اُنہی کا نام لے کر لڑتے تھے، اور اِس حالت میں اُنہوں نے ایشیا کے کسی گوشے میں اپنی ستائی ہوئی کمزور جان کو جس پر مصیبتوں کا ہجوم تھا آرام دینا چاہا ہو۔

بہرکیف یہ جو کچھ بھی ہو علی بن حمود اب حکمران ہو گئے اور معلوم ہونے لگا کہ امن و امان کا زمانہ پھر عود کرنے کو ہے، علی جو حکمراں خاندان بنی حمود کے بانی ہوئے اگرچہ تقریباً بربر تھے مگر اہلِ اندلس پر اُنہوں نے مہربانی اور شفقت ظاہر کی، اندلسی شعراء کا کلام خوش ہو کر سنتے تھے گو عربی زبان مشکل سے سمجھتے تھے، اندلس کا کوئی آدمی جب اُن سے ملنا چاہتا مِل سکتا تھا، بربر کے دستِ تعدی کو نہایت سختی سے روکتے تھے، ایک روز کا واقعہ ہے کہ ایک بربر گھوڑے پر سوار اپنی کاٹھی کے سامنے ایک ٹوکرا انگوروں سے بھرا ہوا لئے جا رہا تھا، علی بن حمود نے اِس سوار کو روکا، اور پوچھا کہ یہ انگور کہاں سے لئے؟ سوار اِس سوال پر کسی قدر حیران ہوا مگر بہت پروائی سے بولا "انگور ہمیں پسند آئے اس لئے اُٹھا لئے"۔ اِس چوری کی سزا میں بربر کو اپنی جان دینی پڑی۔

علی بن حمود نے ایک تدبیر ایسی سوچی تھی کہ اُن کی طبیعت کی فیاضی کا ثبوت سب کو مِل جائے، اور وہ یہ تھی کہ خانہ جنگی کے زمانہ میں قرطبہ کے لوگوں کا جس قدر نقصان ہوا ہو، وہ کسی طرح بھر دیا جائے، لیکن شہر والوں کی بدقسمتی تھی کہ خیران کی طامع طبیعت نے

علی بن حمود کو ایک دوسرا ہی طریقہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

شروع میں خیران، علی بن حمود کا خیر خواہ رہا اور اپنے علاقہ میں ایسے لوگوں کو سزائیں دیتا رہا جو سازشیں کر کے بنی اُمیّہ میں سے کسی کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے، اگر خیران اسی طرح علی بن حمود کی خدمت کرتا رہتا تو ملک بھر میں پھر امن و سلامتی کا دور دورہ ہو جاتا، لیکن اُس نے علی بن حمود کے حق میں منصور بننا چاہا، مگر یہ دیکھ کر کہ علی بن حمود ا ہشام (۵۶۷)
المؤید بننا نہیں چاہتے خیران نے بنی اُمیّہ میں سے کسی ایسے شخص کو خلیفہ بنانا چاہا جو اُس کے شاہانہ اختیارات میں کمی پیدا نہ کرے، چنانچہ اب اُسے ایک مدعیٔ سلطنت کی تلاش ہوئی۔ ۱۰۱۷ء (۴۰۸ھ) کے قریب اُس کو ایک ایسے شخص مل گئے، یہ خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے پڑپوتے تھے۔ پورا نام عبدالرحمٰن بن ہشام بن عبدالجبار بن عبدالرحمٰن الناصر تھا، یہ بلنسیہ میں سکونت رکھتے تھے۔

بہت سے اندلسیوں نے خیران کو مدد دینے کا وعدہ کیا، ان میں منذر حاکم سرقسطہ خاندانِ بنی ہاشم کی یادگار بھی تھا، منذر عیسائی حاکم برشلونہ ریمند کی فوج کو ساتھ لے کر سرقسطہ سے جنوب کی طرف بڑھا تاکہ عبدالرحمٰن بن ہشام کو خلیفہ بنانے میں امداد کرے، علی بن حمود نے جب دیکھا کہ جن لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا وہی اب بدسلوکی پر آمادہ ہیں، اور قرطبہ کے لوگ بنی اُمیّہ میں سے پھر کسی کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں، تو جن لوگوں کو اپنی پناہ میں لیا تھا اُن پر سختی شروع کر دی، اور بربر کی طرفداری ظاہر کی جن پر اب تک سختی کرتے رہے تھے، بربر کو حکم دیا کہ قرطبہ کے لوگوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں جیسے کسی مفتوحہ شہر کے باشندوں کے ساتھ کیا جاتا ہے، چنانچہ اُس کی مثال خود ہی پیش بھی کی، روپیہ فراہم کرنے کے لئے نئے نئے محصول جاری کئے، شہر کے بہت سے رئیسوں کو قید کر دیا، ان میں مجلس مشورت کا معزز رکن ابن جہور بھی تھا، علی بن حمود نے ان رئیسوں سے جب تک بیش قرار رقمیں وصول نہ کر لیں انہیں قید سے رہا نہ کیا، بے انصافیوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی توہین بھی کی، وہ اس طرح کہ جب یہ رئیس رہا ہو کر قید خانہ سے نکلنے کو تھے تو اُن کے نوکر سواری کے خچر لئے باہر

حاضر تھے، علی بن حمود نے حکم بھیجا کہ "قیدی جو رہا ہوئے ہیں اپنے گھروں کو پیدل جائیں اور خچر ہمارے اصطبل میں داخل کیے جائیں"۔ مساجد کے اوقاف بھی اُن کے ہاتھوں محفوظ نہ رہے، ابن جبّار ایک فقیہہ کی مدد سے اوقاف کے متولیوں کو مجبور کیا گیا کہ وقف کا کُل مال علی بن حمود کے حوالے کریں، اب شہر پر ایک خوف طاری ہوا، قرطبہ پولیس کے لوگوں، جاسوسوں اور مخبروں سے بھر گیا، عدل و انصاف رخصت ہُوا، جس زمانہ میں علی بن حمود اہلِ قرطبہ کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے تھے اُن کے ساتھ عدالتوں میں بھی رعایت کی جاتی تھی، اب قاضیوں کا یہ حال ہوا کہ اپنی جگہ سلامت رکھنے کے لئے جب کوئی قرطبی کسی بربر کے خلاف استغاثہ دائر کرتا تو خواہ شکایت کیسی ہی بجا ہوتی وہ اُس کی طرف مطلق توجہ نہ کرتے۔

بہت لوگ جاہ و منزلت کے لالچ میں ہمہ تن علی بن حمود کے جاں نثار و خیر طلب بن گئے، ایک عہد نویس مورخ لکھتا ہے کہ "شہر کے نصف باشندے باقی نصف باشندوں کی جاسوسی پر مقرر ہیں"۔ شہر کے بازار اور کوچے خالی نظر آنے لگے، جہاں کسی پر شبہ ہوا فوراً اُسے گرفتار کر کے قید خانے بھیج دیا گیا، گرفتاری سے جو لوگ بچنا چاہتے تھے وہ تمام دن گھروں میں چھپے بیٹھے رہتے تھے، رات کو ضروری خرید و فروخت کے لئے نکلتے تھے۔

اندلسیوں پر علی بن حمود کو اس قدر غصّہ تھا کہ اُس نے قرطبہ کے لوگوں کو ہلاک اور جلاوطن کرنے کے بعد شہر کو قطعی منہدم کرنے کی قسم کھائی تھی، لیکن موت نے یہ قسم پوری نہ ہونے دی، نومبر ۱۰۱۷ء (جمادی الآخر ۴۰۸ھ) میں علی بن حمود باغیوں کے مقابلے کو نکلے، لیکن جب وادی آش تک پہنچے تو بارش کثرت سے ہونے لگی، اس لئے قرطبہ واپس چلے آئے، اپریل ۱۰۱۸ء (ذیقعدہ ۴۰۸ھ) میں یہ سُن کر کہ معاون فوجیں جیان میں آگئی ہیں حکم دیا کہ ۱۷ اپریل ۱۰۱۸ء (۲۸ ذیقعدہ ۴۰۸ھ) کو اُن کا معائنہ کیا جائے گا، یومِ مقررہ کو فوجیں علی بن حمود کے انتظار میں آراستہ کھڑی رہیں، جب وقت زیادہ گذرا اور علی بن حمود معائنہ کے لئے نہ آئے تو افسرانِ فوج

سبب دریافت کرنے کے لئے قصر کی طرف چلے، وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ علی بن حمود کو حمام میں کسی نے قتل کر دیا ہے۔

یہ خون قصر میں تین صقالبیوں نے کیا تھا جو کسی زمانہ میں بنی اُمیّہ کی ملازمت میں رہے تھے، اُن کو علی بن حمود سے کوئی ذاتی عداوت نہ تھی، بلکہ علی اُن کا اعتبار کرتے تھے اور اُن پر مہربان رہتے تھے، یہ بھی دریافت نہیں ہوتا کہ خیران یا اہل قرطبہ کے ایما سے یہ قتل ہوا، مجرم گرفتار ہوئے اور قتل کا حکم سُنا کر اُن سے پوچھا گیا کہ کس کے کہنے سے تم نے یہ قتل کیا؟ اُنہوں نے جواب دیا کہ "کسی کے کہنے سے نہیں"، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے آقا کا خون صرف اس خیال سے کیا تھا کہ ایک ظالم
لقب اختیار کیا
سے اور نا اہل حاکم سے ملک کو نجات مل جائے۔

علی بن حمود کی موت سے قرطبہ کے لوگ بے حد خوش ہوئے، لیکن اس موت سے بنی حمود کی حکومت کو زوال نہیں ہوا، علی بن حمود نے دو بیٹے یحییٰ اور ادریس، اور ایک بھائی قاسم بن حمود پیچھے چھوڑا، یحییٰ سبتہ کا اور قاسم اشبیلیہ کا حاکم تھا، بربریں سے بعض لوگوں نے یحییٰ بن علی کو خلیفہ بنانا چاہا، لیکن باقی لوگوں نے قاسم بن حمود کو زیادہ مستحق سمجھا، کیونکہ اشبیلیہ جہاں کا وہ حاکم تھا بہ نسبت سبتہ کے قرطبہ سے نزدیک تھا، یہی فریق کامیاب ہوا، اور علی بن حمود کی موت کے چھ دن بعد قاسم بن حمود دارالخلافہ میں داخل ہوئے اور لوگوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔

خیران اور منذر نے ۳۰ اپریل ۱۰۱۸ء (۱۱ ذی الحجہ ۴۰۸ھ) کو ایک مجلس عام ایسے سرداروں کی جن پر بھروسا تھا اپنی طرف سے منعقد کی، اس مجلس میں لوگ بکثرت شریک ہوئے، علماء و فقہاء بھی موجود تھے، فیصلہ یہ ہوا کہ خلیفہ ہمیشہ بذریعہ انتخاب مقرر ہوا کرے، چنانچہ عبد الرحمٰن[1] بن محمد بن عبد الملک بن عبد الرحمٰن الناصر خلیفہ منتخب کئے گئے، اور اس انتخاب کو مجلس نے منظور کر لیا۔ عبد الرحمٰن نے خلیفہ ہو کر المرتضیٰ کا

---

[1] عبد الرحمٰن کا شجرۂ نسب صفحہ آئندہ پر ملاحظہ فرمائیں۔

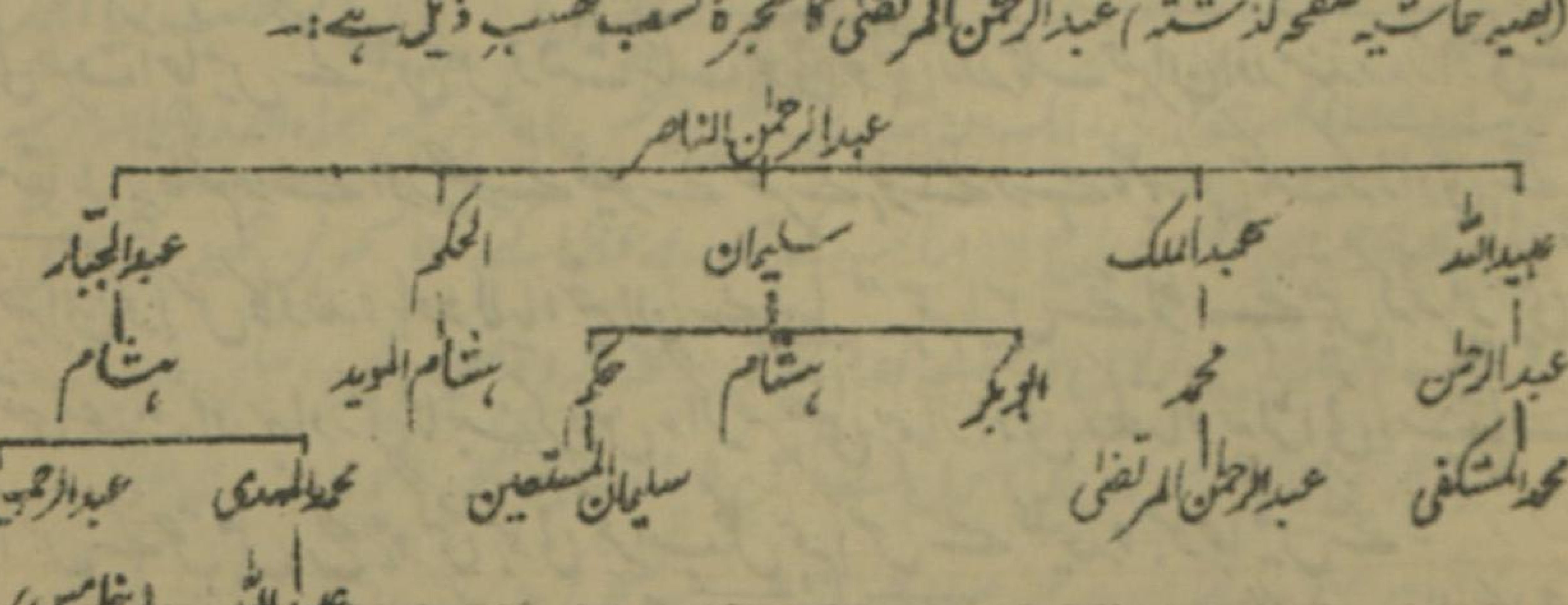
اب خیران اور منذر مع عبد الرحمن المرتضیٰ کے غرناطہ کی طرف روانہ ہوئے، جب غرناطہ پہنچے تو عبد الرحمن المرتضیٰ نے زاوی کو بہت ہی شائستہ الفاظ میں خط لکھا کہ زاوی اُن کو خلیفہ تسلیم کریں۔ زاوی نے خط پڑھوا کر سُنا، اور کاتب کو حکم دیا کہ جواب میں قرآن شریف کی یہ سورۃ لکھ دو قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ج وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ لا وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ط لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ع (ترجمہ۔ کہہ دو کہ اے کافرو! میں عبادت نہیں کرتا اُس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور تم عبادت نہیں کرتے اُس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں، میں کبھی عبادت نہ کروں گا اُس کی جس کی تم عبادت کرتے ہو، اور نہ تم عبادت کرو گے اُس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں، تم کو تمہارا دین سہے اور مجھ کو میرا دین)

جب زاوی کا یہ جواب آیا تو عبد الرحمن المرتضیٰ نے ایک دوسرا خط زاوی کو بھیجا، اس خط میں دھمکی دی اور یہ الفاظ لکھے کہ "میں عیسائیوں کی ایک فوج اور اہل اندلس کے بڑے بڑے شجاعوں کو ساتھ لے کر تمہارے مقابلے پہ آرہا ہوں، تم کیا کر سکو گے؟" خط کے اخیر میں ایک شعر تھا جس کا مضمون تھا:۔

"اُن کی قسمت اچھی ہو گی جو ہماری طرف ہوں گے، اور مصیبت آئے گی ہمارے دشمنوں پر"

زاوی نے جواب میں قرآن شریف کی یہ دوسری سورۃ لکھوا کر بھیجی اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ط کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ لا ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ط

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عبد الرحمن المرتضیٰ کا شجرۂ نسب حسب ذیل ہے:۔



كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ط لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ۝ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (ترجمہ۔ کثرت اور بہتات نے تمہیں غافل کردیا، یہاں تک کہ جب قبر میں پہنچے تو آنکھیں کھلیں، سُن رکھو کہ عنقریب اِس غفلت کا انجام معلوم ہو جائے گا، اچھی طرح سُن رکھو کہ آگے چل کر اِس کا انجام ضرور معلوم ہونا ہے، بات یہ ہے کہ اگر انجام کو تم یقینی طور پر جانتے ہوتے تو اپنی آنکھوں سے دوزخ کو دیکھ لیتے، (مگر) ایک دن تم ضرور دوزخ کو دیکھو گے، پھر اُس دن تم سے اُن نعمتوں کے باب میں بازپرس ہوگی)

اِس جواب کو سُن کر خلیفہ مرتضیٰ اِس قدر برہم ہوئے کہ اُنہوں نے جنگ کا مصمم قصد کرلیا۔

خیران اور منذر کو بہرکیف جلد معلوم ہو گیا کہ مرتضیٰ اِس قسم کے فرمانروا نہیں ہیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے، اِن سرداروں کو بنی اُمیّہ کے حقوق سے تو کوئی واسطہ نہ تھا، اگر اُن میں سے کسی کے لئے وہ ہتھیار اُٹھاتے تھے تو گویا اِس شرط سے ایسا کرتے تھے کہ سلطنت کی باگیں اپنے ہی ہاتھوں میں رہیں گی، مگر مرتضیٰ کی غیرت اِس قسم کی ماتحتی کو قبول نہ کر سکتی تھی، برائے نام شاہی اختیارات رکھنے انہیں گوارا نہ ہو سکتے تھے، اور بجائے اِس کے کہ وہ اپنے سپہ سالاروں کا حکم مانتے وہ انہیں محکوم بنا کر رکھنا چاہتے تھے، اب خیران اور منذر نے بے وفائی پر کمر باندھی، اور زاوی سے درپردہ عہد کر لیا کہ جب اُس کی لڑائی خلیفہ سے ہوگی تو وہ خلیفہ کا ساتھ چھوڑ کر زاوی کی طرف آجائیں گے لیکن جس وقت جنگ ہوئی تو کئی روز تک خیران اور منذر، زاوی کے مقابلہ پر قائم رہے اور چھوٹے چھوٹے معرکے ہوتے رہے، یہاں تک کہ زاوی نے خیران کو اُس کا وعدہ یاد دلایا، خیران نے کہا "ہم اِس لئے لڑ رہے ہیں کہ تم پر اپنی شجاعت اور بہادری ثابت کر دیں، اگر مرتضیٰ ہمارا دل رکھتا تو یہ لڑائی اب تک اُس کے حق میں فتح ہو گئی ہوتی مگر اب کل ہم اُس سے علیحدہ ہو جائیں گے"۔

دوسرے دن صبح کو فی الواقع خیران اور منذر نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھائی

جس قدر افسرانِ فوج مرتضیٰ کی طرف سے لڑ رہے تھے، خیران اور منذر کی یہ حرکت دیکھ کر بے حد خشمناک ہوئے، انہی میں سلیمان ابن ہود بھی تھا جو منذر کی عیسائی فوج کی اِس وقت سپہ سالاری کر رہا تھا، منذر جس وقت سلیمان بن ہود کے پاس سے نِکلا، تو کہنے لگا "اے بدبخت! جان بچانی ہے تو بچا، یہ نہ سمجھ کہ تیرے لئے میں یہاں کوئی دم ٹھہروں گا" سلیمان بن ہود نے جواب دیا "افسوس! تمہاری وجہ سے آج ہم برباد اور بے عزت ہوتے ہیں"، بہرکیف یہ دیکھ کر کہ اب مقابلہ کرنا ممکن نہیں سلیمان بن ہود بھی اپنے آقا کے ساتھ میدان سے ہٹ گیا۔

مرتضیٰ یہ دیکھ کر کہ فوج کے اکثر حصوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہے بے جگری ہو کر لڑے، (۵۷۰
اور دشمن کے منہ سے اپنے تئیں باہر نکال لائے، میدان سے نکل کر وہ وادیٔ آش کی طرف چلے، جو اُس زمانہ میں غرناطہ کی سرحد سے باہر سمجھا جاتا تھا، لیکن خیران نے اُن کی تاک میں چند آدمی بھیج رکھے تھے، اُن آدمیوں نے عبدالرحمٰن المرتضیٰ کو قتل کر دیا۔

خیران کو اِس دغا اور بزدلی کا یہ پھل ملا کہ اُس کا فریق ٹوٹ کر پراگندہ ہو گیا، اب صقالبہ اِس قابل نہ رہے کہ ایک لشکر جمع کر سکیں، اس لئے اُن کے مخالفین یعنی بربر اندلس کے مالک ہو گئے، مگر اِس زمانہ میں قرطبہ نسبتہً اچھی حالت میں رہا، اور جس حد تک حکومتِ غیر میں ایک شہر آسودہ رہ سکتا تھا وہ حالت اُس کی رہی، حکومت بزورِ شمشیر کا اب تقریباً سدِ باب ہو چکا تھا، اور زیادہ امن و سلامتی کا زمانہ آگیا تھا، قاسم بن حمود امن و امان بہت پسند کرتے تھے، ملک پر زیادہ محصول لگا کر رعایا کو نہیں ستایا، گذشتہ نزاعات کو فراموش کرنے کے لئے خیران کو اُنہوں نے طلب کیا، اور اُس سے مصالحت کر لی، ایک دوسرے صقلبی کو جس کا نام زہیر تھا، اور وہ علاقہ مرسیہ کا حاکم تھا، جیان، قلعہ رباح اور بیاسہ کے صوبے عطا کئے، قاسم بن حمود کے سُنی المذہب ہونے میں لوگوں کو شبہ تھا، خیال یہ تھا کہ وہ شیعہ ہیں، لیکن مذہب اُن کا جو کچھ بھی تھا دوسروں کو اُنہوں نے اُس کا پابند کرنا کبھی نہ چاہا، اپنے عقائد کسی پر ظاہر نہیں کئے اور مذہبی معاملات میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی، اُن

کی ہر بات میں اعتدال کا وصف ایسا تھا کہ بنی حمود کی حکومت کو اسپین میں استقلال ہوتا نظر آتا تھا، یہ سچ ہے کہ قرطبہ کے لوگ ابن حمود کی حکومت سے کوئی دلی تعلق نہ رکھتے تھے، لیکن اگر حالات جن پر اہلِ قرطبہ قدرت نہ رکھتے تھے ایسی صورت اختیار کرتے کہ اُن کی گذشتہ اُمیدیں پھر زندہ ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد پرانے خلفاء کو بھول کر وہ موجودہ حالت سے مطمئن ہو جاتے۔

قاسم بن حمود کو بربر کا اعتبار نہ رہا تھا، اب اُنھوں نے اپنے استحکام کے لئے دوسری صورت پیدا کی، بربر کے پاس اُسودی غلام بکثرت تھے، ان غلاموں کو قاسم بن حمود نے خرید لیا، افریقہ سے اور بہت سے غلام دستیاب کئے اور ان سب سے ایک فوج مرتب کی، اور اس فوج کے افسروں کو بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز کیا، اس کارروائی نے بربر میں غصہ پیدا کیا، اور بربر کی اس حالت سے یحیٰی بن علی بن حمود یعنی قاسم کے بھتیجے نے فائدہ اٹھایا، ایک خط بربر کو بھیجا، اور اُس میں جہاں اور باتیں لکھیں یہ بھی لکھا کہ "میرے چچا قاسم بن حمود نے مجھے عاق کر دیا ہے، اور تمہارے ساتھ بھی بدسلوکی کی ہے کہ تمہارے غلاموں کو وہ اعلیٰ مراتب عطا کئے ہیں جن کے مستحق دراصل تم تھے، اگر تم مجھ کو میرے باپ کا تخت دلوا دو گے تو تمہارے سابقہ مراتب پھر تم کو مل جائیں گے اور اُسودی برطرف کر دیئے جائیں گے۔"

بربر نے یحیٰی بن علی بن حمود کی یہ درخواست جیسی کہ توقع کی جاتی تھی منظور کر لی، اور یحیٰی کو مدد دینے کا وعدہ کر لیا، اب یحیٰی اپنی فوجیں ساتھ لئے زقاق عبور کر کے مالقہ میں جا اُترا، یہاں اُس کا بھائی ادریس حاکم تھا، ادریس نے بھائی کا ساتھ دیا، یحیٰی مالقہ ہی میں مقیم تھا کہ خیران کا خط اُس کے پاس آیا، خیران کی حالت یہ تھی کہ ہر مدعی سلطنت کی مدد کو تیار ہو جاتا، اور جب اس مدعی کو کامیابی ہو جاتی تو پھر اُس کی تباہی کے لئے سازشیں کرتا۔ خیران نے اپنے خط میں یحیٰی کو یاد دلایا کہ اُس کے باپ علی بن حمود کی اُس نے بڑی بڑی خدمتیں ادا کی تھیں، مگر ادریس نے اپنے بھائی یحیٰی سے کہا کہ "خیران (۵۷
کی مدد لینے سے انکار کر دینا چاہیئے، کیونکہ خیران بڑا عہد شکن ہے، اور ایک

دن ضرور دھوکا دے گا" یحییٰ نے یہ سُن کر بھائی سے کہا "مجھے بھی اِس بات کا بالکل یقین ہے، لیکن ہم ایسی احتیاط رکھیں گے کہ وہ کوئی نقصان نہ پہنچانے پائے گا" پس یحییٰ نے صاحب المریہ خیران کو لکھا کہ ہم آپ کی خدمات قبول کرتے ہیں، اور یہ لکھ کر یحییٰ قرطبہ کی طرف بڑھا۔

یحییٰ کے چچا قاسم بن حمود پر جب یہ حال کُھلا تو انھوں نے قرطبہ میں رہنا مناسب نہ سمجھا، اور ۱۱/۱۲ اگست ۱۰۲۱ء (۲۸/۲۹ ربیع الآخر ۴۱۲ھ) کو قرطبہ سے اشبیلیہ روانہ ہو گئے، صرف پانچ سوار اُن کے ساتھ تھے۔ اِس تاریخ سے ایک ماہ کے بعد یحییٰ بن علی قرطبہ میں داخل ہوئے، مگر اُن کی حکومت چند روزہ ہوئی، اسودی غلام بہت جلد قاسم سے اشبیلیہ میں جا ملے، اندلسی فوجوں کے بہت سے افسر بھی قاسم کے پاس چلے گئے، یحییٰ کے غرور سے یہ افسر ایسے بیزار ہوئے کہ بہت جلد اُن سے علیحدہ ہو گئے، یحییٰ بن علی کی حالت اب ایسی نازک ہوئی کہ اپنے ہی محل میں ہر وقت گرفتار ہو جانے کا خوف رہنے لگا، اب اُن کو پناہ کی تلاش ہوئی، اور رات کے وقت قرطبہ سے مالقہ کو بھاگ گئے، یہ سُن کر قاسم بن حمود پھر قرطبہ چلے آئے، اور ۱۲ فروری ۱۰۲۳ء (۱۸ ذیقعد ۴۱۳ھ) کو پھر اُن کی خلافت کا اعلان ہوا، لیکن قاسم بن حمود کی حکومت بھی مستحکم بنیاد پر نہ تھی، اُن کی قوت میں جلد انحطاط پیدا ہوا، یحییٰ کے بھائی ادریس نے جو اِس وقت سبتہ کا حاکم تھا طنجہ پر قبضہ کر لیا، قاسم بن حمود نے طنجہ کو بہت مستحکم کر دیا تھا، تاکہ اگر اسپین میں کوئی مشکل پیش آئے تو زقاق عبور کر کے طنجہ میں پناہ لیں، اسپین میں یحییٰ بن علی نے (قرطبہ سے واپسی پر) جزیرۃ الخضرا پر قبضہ کیا، یہاں قاسم بن حمود کے اہل و عیال اور ذخائر تھے، قرطبہ میں اُن کا معاون سوائے اسودیوں کے اور کوئی نہ تھا

اِن حالات نے اہل قرطبہ کی ہمت بڑھائی، چچا بھتیجے کی باہمی منازعت میں اُن کو زیادہ دلچسپی نہ تھی، بہر کیف باشندگانِ قرطبہ میں ایک قسم کی بے چینی پھر پیدا ہوئی بربر کی حکومت سے گلو خلاصی کی کوشش اُن کی سب سے بڑی آرزو تھی جو کسی

وقت دل سے نہ نکلتی تھی، اب ایک خبر مشہور ہوئی کہ خاندانِ بنی اُمیّہ میں سے ایک شخص جلد ظاہر ہوکر تخت کا دعویٰ کرنے والا ہے، قاسم بن حمود اس خبر سے ڈر گیا، چونکہ اس شخص کا نام نہیں بتایا گیا تھا اس لئے اُس نے حکم دیا کہ بنی اُمیّہ میں سے جو کوئی ملے اُسے گرفتار کر کے قید کردیا جائے، اب بنی اُمیّہ کا یہ حال ہوا کہ کوئی شہر میں اور کوئی شہر سے باہر کسی گاؤں میں جا چھپا، مگر قاسم کی یہ پیش بندیاں بغاوت کو نہ روک سکیں، بربر کی زیادتیوں سے طیش میں آکر قرطبہ کے لوگوں نے ۱۳؍جولائی ۱۰۲۳ء (مطابق ۱۰؍جمادی الاول ۴۱۴ھ) کو غدر کردیا، لڑائی سخت ہوئی، مگر اس کے بعد فریقین میں صلح ہوگئی، یا یہ سمجھئے کہ لڑائی کچھ مدت کے لئے بند ہوگئی، یہ مدت بہت کم ثابت ہوئی، گو قاسم بن حمود نے اہلِ قرطبہ پر لطف وکرم کرکے اس مدت کو بڑھانا چاہا، بہر کیف ۶؍ستمبر ۱۰۲۳ء (۷؍جمادی الآخر ۴۱۴ھ) کو جمعہ کی نماز کے بعد شہر میں چاروں طرف سے ہتھیار اُٹھانے کے لئے نعرے بلند ہونے لگے، اور قرطبیوں نے قاسم بن حمود اور بربر کو شہر سے نکال باہر کیا، مگر بیرونِ شہر یہ سب لوگ جمع ہوگئے، قاسم بن حمود نے قرطبہ سے مشرق کی سمت میں اپنا خیمہ نصب کیا، اور شہر کا محاصرہ کرلیا جو پچاس دن ۱۵۰
سے کچھ زیادہ تک قائم رہا، شہر کے اندر سے باغی شہر کو دشمن سے بچاتے رہے، لیکن جب شہر والوں کے پاس کھانے پینے کا سامان کم رہ گیا تو محاصرہ کرنے والوں سے انہوں نے درخواست کی کہ ہم کو مع اہل وعیال کے شہر سے صحیح سلامت نکل جانے دو، قاسم بن حمود نے یہ درخواست منظور نہیں کی، اور اب قرطبہ والوں نے جان پر کھیل کر ایک کام کیا، شہر کا ایک دروازہ توڑ ۳۱؍اکتوبر ۱۰۲۳ء (۳؍شعبان ۴۱۴ھ) کو سب کے سب شہر سے باہر نکلے اور محاصرین پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ بالکل بے ترتیب ہوکر بھاگے قاسم بن حمود کے افسران فوج اپنی اپنی جاگیروں کو چلے گئے، اور قاسم بن حمود اشبیلیہ چلے گئے، لیکن اشبیلیہ والوں نے بھی اہلِ قرطبہ کی مثال کا تتبع کرکے اپنے شہر کے دروازے بند کرلئے اور قاسم کو اندر نہیں آنے دیا اور اشبیلیہ میں جمہوری حکومت قائم کرلی (یعنی چند سربرآوردہ رئیسوں کے مشورے سے حکومت ہونے لگی۔) قاسم بن حمود

اشبیلیہ سے سرلیش پہنچے اور شہر میں داخل ہوئے۔ یحییٰ بن علی نے سرلیش کا محاصرہ کر لیا اور قاسم کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ قاسم بن حمود کے کارنامے اب خاتمہ کو پہنچتے ہیں۔ یحییٰ بن علی قاسم بن حمود کو مالقہ لے گئے اور وہاں اُنہیں قید کر دیا، اور اس بات کی قسم کھائی کہ چچا کو زندہ نہ چھوڑیں گے، لیکن حالت تذبذب کی رہی اور یہ قسم مدت تک پوری نہ ہو سکی، خواب میں اپنے باپ علی بن حمود کو یہ کہتے سُنا "تمہیں قسم دلاتا ہوں کہ قاسم کو جان سے نہ مارنا، جب میں بچہ تھا تو اُنہوں نے مجھ پر مہربانیاں کی تھیں اور گو وہ مجھ سے عمر میں بڑے تھے مگر میرے مقابلہ میں کبھی تخت کے مدعی نہ ہوئے" باوجود اس کے یحییٰ بن علی نے اکثر شراب کے نشے میں چچا کو قتل کر دینے کا ارادہ کیا، لیکن دوستوں نے اس قصد سے منع کیا اور کہا "قاسم قید خانے میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتے" یحییٰ نے دوستوں کے اس کہنے کو مان لیا اور قاسم بن حمود علاقہ مالقہ کے ایک قلعے میں تیرہ برس تک قید رہے، لیکن سنہ ۱۰۳۶ء (سنہ ۴۲۸ھ) میں یحییٰ بن علی کو معلوم ہوا کہ قلعہ میں جو فوج رہتی ہے اُس کو قاسم بغاوت پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں، اس پر یحییٰ آگ ہو کر بولے "کیا یہ بڈھا اب بھی تخت کی آرزو رکھتا ہے، یہی قصور اس کا کافی ہے"۔ اتنا کہہ کر حکم دیا کہ قاسم کا گلا گھونٹ دیا جائے۔

اہل قرطبہ نے خود مختار ہونے کے بعد پھر یہ خواہش کی کہ بنی امیہ میں سے کسی کو خلیفہ بنایا جائے اور یہ کام زور اور زبردستی سے نہیں بلکہ باقاعدہ طور پر عمل میں آئے۔ چنانچہ نومبر سنہ ۱۰۲۳ء (شعبان یا رمضان سنہ ۴۱۴ھ) میں انہوں نے ایک مجلس منعقد کی، اور وزیروں نے ان تین آدمیوں کے نام خلافت کے لئے پیش کئے۔

(۱) سلیمان ابن عبدالرحمٰن المرتضیٰ (۲) عبدالرحمٰن برادر مہدی باللہ (۳) محمد ابن عراقی
فہرست امیدواراں میں سلیمان کا نام سب سے پہلے لکھا گیا، وزیروں کو سلیمان ابن

عبدالرحمٰن المرتضیٰ کے منتخب ہو جانے کا اس قدر یقین تھا کہ کاتب احمد ابن برد نے جو عہدنامہ اس موقع کے لئے تیار کیا تھا اُس میں سلیمان کا نام تک درج کر دیا تھا۔

لیکن اِن وزیروں نے اپنے اثر و اقتدار کا اندازہ زیادہ کر لیا تھا اور جو لوگ مہدی باللہ کے بھائی عبدالرحمٰن کے مددگار تھے اُن کی قوت کو پورے طور پر نہ سمجھا تھا عبدالرحمٰن کی عمر اس وقت بائیس برس کی تھی، بنی حمود نے اُن کو کچھ زمانے سے شہر بدر کر رکھا تھا، لیکن انتخاب سے کچھ پہلے وہ پوشیدہ طور پر شہر میں چلے آئے تھے، چنانچہ جس وقت اہلِ قرطبہ نے بربر کے خلاف غدر کیا تھا تو عبدالرحمٰن اُس وقت قرطبہ ہی (۵۷۳
میں موجود تھے اور اس غدر کو دیکھ چکے تھے، اُس زمانہ میں اُنہوں نے ایک فریق ایسا تیار کرنا چاہا تھا جو اُن کو خلیفہ مقرر کر دے، مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی تھی، وزراء جنھوں نے بغاوت برپا کی تھی عبدالرحمٰن برادر مہدی کے حقوق کو اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے اور عبدالرحمٰن نے جن لوگوں کو اپنے انتخاب کی تائید میں بھیجا تھا اُن کو ان وزیروں نے قید کر دیا تھا، بلکہ خود عبدالرحمٰن کو بھی گرفتار کرنا چاہا تھا، البتہ جس وقت عہدنامہ لکھا جانے لگا تو اس خیال سے کہ شہر کے بعض بڑے لوگ بُرا نہ مان جائیں عبدالرحمٰن کا نام فہرست میں لکھ دیا تھا، مگر اُن کو اس کا گمان تک نہ تھا کہ انتخاب عبدالرحمٰن کا ہو جائے گا، جہاں محمد بن العراقی کا نام جو رعایا میں ہر دلعزیز نہ تھے درج کیا تھا، وہاں عبدالرحمٰن کا نام بھی تحریر کر دیا تھا۔

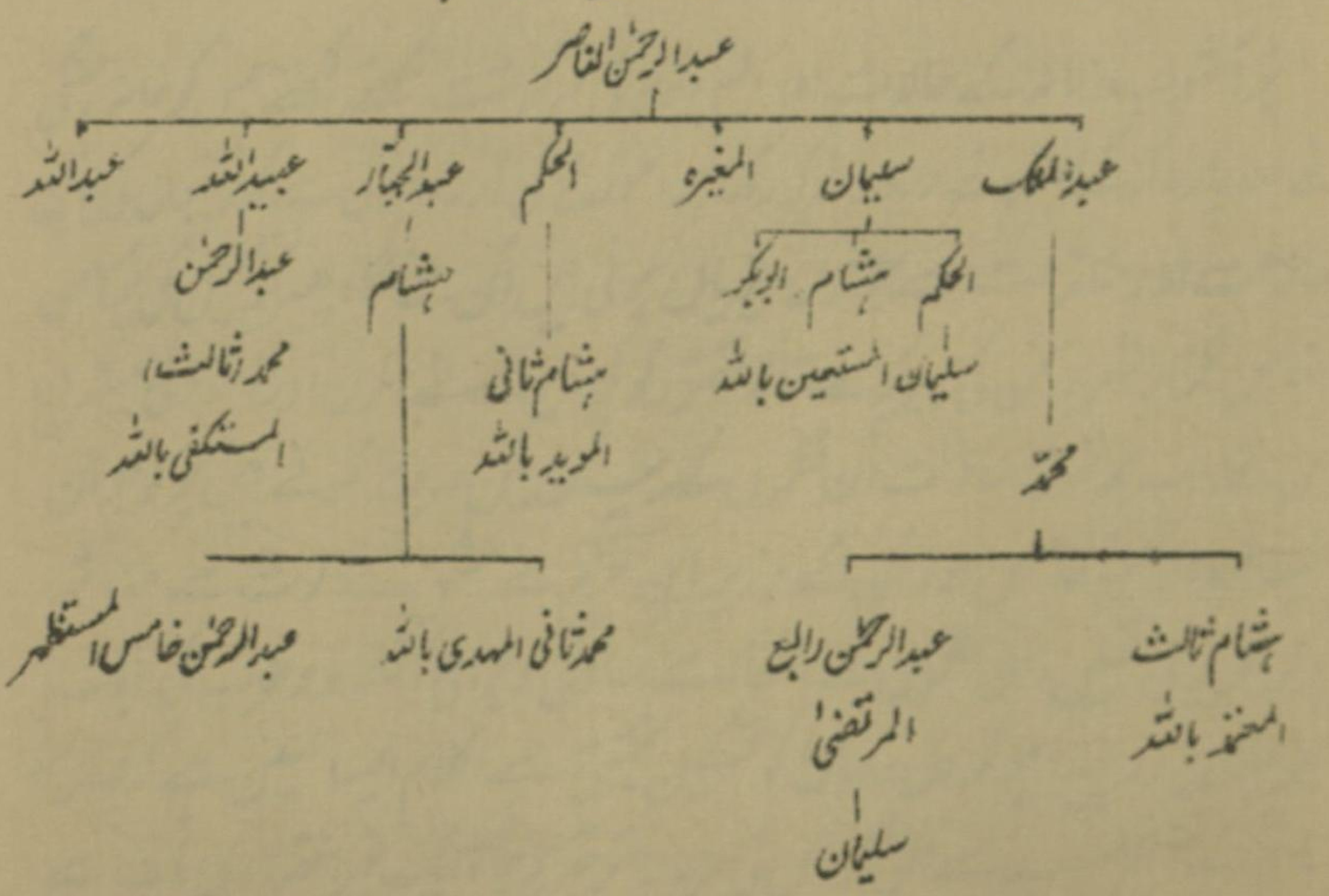
وزیروں نے اپنے معاملے کو خوب مضبوط سمجھ کر شرفاء قوم اور افسران فوج اور عوام الناس کا ایک جلسہ جامع مسجد میں منعقد کر کے انتخاب خلیفہ کا مقدمہ پیش کیا، یہ واقعہ یکم دسمبر ۱۰۲۳ء (۱۲ رمضان ۴۱۴ھ) کا ہے، یوم مقررہ پر عبداللہ ابنِ مخامس وزیر کے ساتھ سلیمان سب سے پہلے اس جلسے میں آئے، یہ نہایت پُرتکلف لباس پہنے ہوئے تھے اور بہت خوش اور بشاش معلوم ہوتے تھے اور دل سے یقین کرتے تھے کہ انتخاب انہی کا ہوگا، اُن کے ہوا خواہ انہیں دیکھتے ہی استقبال کے لئے آگے بڑھے اور ایک شہ نشین میں جو اُن کے لئے مخصوص کیا گیا تھا لا کر بٹھایا، اس کے تھوڑی

دیر بعد عبدالرحمٰن ایک دُوسرے دروازے سے مسجد میں آئے، اُن کے ساتھ ایک انبوہ اہلِ فوج اور اہلِ حرفہ کا تھا، عبدالرحمٰن نے جونہی دہلیز پر قدم رکھا لوگوں نے متفق الکلام ہو کر بڑے جوش وخروش کے ساتھ عبدالرحمٰن برادر مہدی باللہ کو خلیفہ منتخب کر لیا، وزیروں کی زبان حیرت سے بند ہو گئی، اور اگر انہوں نے کچھ کہنا بھی چاہا تو غل میں کسی نے کچھ نہ سُنا، آخر کار مجبور ہو کر وزراء نے عبدالرحمٰن کو خلیفہ تسلیم کر لیا اور سلیمان نے بھی یہ دیکھ کر کہ عبدالرحمٰن کو سب نے خلیفہ مان لیا ہے خود بھی اُن کو خلیفہ تسلیم کیا اور اب لوگوں نے سلیمان کو خلیفہ عبدالرحمٰن کے سامنے پیش کیا۔ سلیمان نے عبدالرحمٰن کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور عبدالرحمٰن نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب مسند پر بٹھا لیا،

تیسرے امیدوارِ خلافت یعنی محمد ابن العراقی نے بھی عبدالرحمٰن کی بیعت کی اور کاتب ابنِ بُرد نے عہدنامے میں سے سلیمان کا نام چھیل کر وہاں عبدالرحمٰن کا نام لکھ دیا۔
عبدالرحمٰن نے خلیفہ ہوتے ہی المستظہر کا لقب اختیار کیا[1]

---

[1] مختلف ناموں کو آسانی سے سمجھنے کے لئے یہاں شجرہ لکھا جاتا ہے:-



اسناد:-

ابنِ حیان	ص ۱۲۸ ز ابنِ بسّام ج ۱ ص ۶ تا ۱۰، ۹۰، ۲۲ تا ۲۴
	۱۲۰ تا ۱۲۲، ۱۲۸ تا ۱۲۹ - ج ۳ ص ۵، ۱۴۱
مقرّی	ج ۱ ص ۱۰۲، ۲۸۰، ۳۱۵ تا ۳۱۹
عبدالواحد	ص ۳۵ تا ۳۸، ۵۴
ابن الاثیر	(سنہ ھجری کے واقعات،
نویری	ص ۴۸۶ تا ۴۹۰
ابن الخطیب	(علی ابنِ حمود پہ مضمون، قلمی نسخہ E)
ابن الابار	ص ۲۴۰ تا ۲۴۱
عباد	ج ۱ ص ۲۲۲
	ج ۲ ص ۲۱۴
ابنِ حزم	(فہرست مرتبہ ڈوزی، ج ۱ ص ۲۲۵)

کتاب ثالث

خلافت

سترھویں فصل

خلیفہ عبدالرحمٰن خامس ملقب بہ المستظہر اور ابنِ حزم

پُر آشوب زمانہ کے حالات اور ایسی قوم کی سرگزشت لکھتے لکھتے جس کو خانہ جنگی ۵۷ء
نے صدپارہ کرکے مبتلائے درد والم کر رکھا ہو، مورخ کی آرزو ہوتی ہے کہ فریقوں کی باہمی منازعت اور منازعت سے جو خونریزیاں ہوتی ہیں اُن سے نگاہ پھیر کر تخیل کی پُرامن فضا میں گلزارِ شعر و سخن کی سیر کرے، تاکہ تصوّر کو کچھ دیر کے لئے سکون اور آسودگی میسّر ہو، اس لئے اب ہم تھوڑا سا وقت اُن نظموں کے بیان میں صرف کرتے ہیں جو نوجوان خلیفہ عبدالرحمٰن خامس اور اُن کے وزیر ابنِ حزم نے عشقِ بے لوث سے متاثر ہو کر تحریر کی تھیں، ان نظموں کے اشعار سے سادگی و جوانی، نشاط و طرب کی ایک نسیم جاں پرور پیدا ہو کر دل و دماغ کو تسکین بخشتی ہے، کلام ایسا حسین ہے کہ جہاں سوز تباہی کے منظرِ مہیب سے نکل کر اُس کی طرف متوجہ ہو جانا ایک غیر اختیاری بات ہے

یہ نظمیں گویا عنادل کے نغمے ہیں جو طوفانِ بلاخیز کے شور میں بھی صاف صاف سُنائی دیتے ہیں۔

عبدالرحمٰن خامس ابھی لڑکے ہی تھے کہ اُن کو اپنی خواہرِ عمزاد حبیبہ سے جو خلیفہ سلیمان المستعین کی بیٹی تھیں عشق ہو جاتا ہے، لیکن یہ عشق ناکام رہتا ہے، خلیفہ سلیمان المستعین کی بیوہ ملکہ عبدالرحمٰن سے حبیبہ کی شادی کرنی نامنظور کرتی ہیں اور نوجوان عاشق صبر کر لیتا ہے کہ زندگی جس طرح بسر ہوتی ہے بسر کرے، ملکہ کی نامنظوری سے عبدالرحمٰن کی تمکنتِ خاطر کو صدمہ پہنچتا ہے اور اسی رنج و ملال میں شعر کہہ کر طبیعت کو بہلاتا ہے، چنانچہ کہتا ہے

اِنکار کے بہانے بے شمار ہیں، اُن کو سُن کر دل کو صدمہ ہوتا ہے، ہمنا عدان والے چشمِ بصیرت کو اندھا کر کے انھیں مجبور کرتے ہیں کہ مجھ سے انکار کر دیں، لیکن سورج سے چاند کو کون رد کرا سکتا ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حبیبہ کی ماں جو میرے رُتبے اور منزلت سے واقف ہیں مجھے اپنا داماد بنانے سے ناخوش ہوں۔

مجھے حبیبہ سے عشق ہے، حبیبہ خاندانِ عبدِ شمس کی خوبصورت اور معصوم بیٹی ہے اور اپنے ماں باپ کے محل میں تنہا رہتی ہے، میں نے تا زیست اُس کی غلامی کی قسم کھائی ہے، میرا دل اُس کا جہیز ہے۔

جس طرح عقاب اُڑتا ہوا قمری پر گرتا ہے اور قمری اپنے کانپتے ہوئے پر پھیلا دیتی ہے۔ اِسی طرح عبدِ شمس کی اس قمری کو دیکھ کر میں بھی جو عبدِ شمس کے گھرانے کا ہوں اُس کی طرف مائل ہوتا ہوں۔

میری حبیبہ کیسی حسین ہے اُس کے ہاتھ ایسے گورے ہیں کہ بنات النعش کا نور بھی اُن کے آگے ماند ہو جاتا ہے

اے پیاری حبیبہ! تیرے عشق کا روزہ بہت ہی سخت ہے، کب تو اُس کے افطار کی اجازت دے گی؟

اے پیاری حبیبہ! تیری ہی چھت کے نیچے میں اپنے مدد کی دعا

تلاش کرتا ہوں ، اور اللہ اس چھت پر اپنی برکتیں نازل رکھے، تیرا ہی گھر ہے جہاں میرا آفت رسیدہ دِل تسکین پا سکتا ہے اور اسی گھر میں وہ آگ بجھ سکتی ہے جو مجھے جلائے ڈالتی ہے ۔

(۵۱،۵) اے بنتِ عم ! اگر تو نے مجھ سے انکار کیا ، تو یہ انکار اُس شخص سے ہوگا جو (قسیبہ کہتا ہوں کہ) شرافت میں تیرے برابر ہے اور جس کی آنکھیں اُس جوش کی وجہ سے جو تُو دِل میں پیدا کرتی ہے دُھندلا دکھنے لگی ہیں ۔

لیکن میں ناامید نہیں ہوں ، ایک دن وہ مجھے نصیب ہوگی ، پھر میں اپنی شان و عظمت کی پوری بلندی پر پہنچ جاؤں گا ، کیونکہ میں اُس وقت برچھا چلا سکتا ہوں جب کہ سیاہ گھوڑے خون سے سرخ ہوتے ہیں ؛ جو اجنبی میرے دروازے پر آتا ہے میں اُس کی عزّت کرتا ہوں ، جو محتاج مجھ سے سوال کرتا ہے میں اُسے نعمتیں دیتا ہوں ، اُس کا کون سا عزیز ہے جو خوبیوں میں مجھ سے زیادہ ہے ؟ مجھ میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو اُس کے خوش کرنے کے لیے کسی میں ہونی چاہئیں ، جوان ہوں ، صاحبِ تمیز ہوں ، نرم مزاج ہوں اور بلیغ ہوں ۔"

نہیں معلوم کہ حبیبہ کے خیالات اپنے عاشق کی نسبت کیا تھے ، عرب مؤرخوں نے اِس حسین و معصوم صورت کی ایک اُڑتی سی جھلک دکھائی ہے اور تصوّر کو موقع دیا ہے کہ اپنی قوّت سے تصویر کو واضح اور مکمل کر لے ، بہرکیف یہ نہ تھا کہ عبدالرحمٰن کی اِس محبّت کا اثر حبیبہ کے دل پر نہ ہوتا ، ایک دِن ملاقات ہوئی ، عبدالرحمٰن نے اُس کی صورت اس قدر اشتیاق کے ساتھ دیکھنی شروع کی کہ حبیبہ نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں اور کچھ ایسی سراسیمہ ہوئی کہ عبدالرحمٰن کے سوال کا جواب بھی نہ دے سکی ، عبدالرحمٰن نے اس بات کو سرد مہری پر محمول کیا اور یہ اشعار کہے :-

سلام ہو اُس پر جو مجھ سے بات کرنی گوارا نہیں کرتی

سلام ہو اُس غزالِ رعنا پر جس کی نگاہ کے تیر میرے کلیجے کے پار ہوئے جاتے ہیں ۔

افسوس وہ کبھی مجھے اپنی تصویر تک نہیں بھیجتی، تاکہ اس پریشاں خیالی میں کچھ تو دل کو تسکین ہو۔
تیرا نام لینے میں شیرینی کی سی لذت ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا عشق تیرے ساتھ ایسا ہے جسے بیان کرنا گویائی کی قوت سے باہر ہے، حبیبہ! میں تیرا ایسا سچا عاشق ہوں کہ دُوسرا ہو نہیں سکتا۔"

بہر کیف عبدالرحمٰن کی شادی حبیبہ سے نہ ہو سکی، حقیقت یہ ہے کہ عبدالرحمٰن عشق میں ہمیشہ ہی نامراد رہا، گو یہ واقعہ ہے کہ ایک دوسری عورت نے اُس کے عشق کو مہربانی کی نظر سے دیکھا، لیکن کچھ دن کے بعد بے وفائی کی اور اس بے وفائی پر عبدالرحمٰن نے اس مضمون کے اشعار کہے:

"رقیب کو تو نے مجھ پر ترجیح دی اور اب میرا وقت مصیبت سے کٹتا ہے، تُو بے وفا ہے، عہد شکن ہے، کیا وہ راتیں بھول گئیں کہ ہم دونوں گلاب کے تختے پر پڑے رہتے تھے، صرف ایک ہی چادر ہم دونوں کو ڈھکے ہوتی تھی، جیسے ہار میں موتی پاس پاس ہوں اسی طرح ہم بھی پاس پاس ہوتے تھے، ہم دو تھے پر وصل میں ایک ہو جاتے تھے اور نیلگوں آسماں پر سونے کے ستارے چمکا کرتے تھے۔"

نوجوان عبدالرحمٰن کا ایک دوست تھا جو طبیعت اور مزاج میں بالکل اس کا مشابہ تھا، اس دوست کا نام علی ابن حزم تھا، یہ عبدالرحمٰن کا وزیر بھی تھا، علی کے آباؤ اجداد لبلہ کے رہنے والے تھے اور کسی زمانہ میں عیسائی تھے، علی کے دادا احزم نے اسلام قبول کیا تھا، مسلمان ہو کر اُس کو اپنی سابقہ نسل و نصرانیت پر ایسی شرم آئی کہ اپنا نسب بدل دیا، اور اُمَوی خلیفہ اوّل یعنی امیر معاویہؓ کے بھائی کے ایک ایرانی آزاد کردہ غلام سے اپنا نسب (۵۸۶
قائم کیا اور اپنے بزرگوں کے مذہب سے سخت نفرت کی۔

اپنی تصنیف الملل والنحل میں ابن حزم لکھتے ہیں کہ "انسان کی واہمہ پرستی پر کبھی تعجب نہ کرنا چاہیے، ایسی قومیں بھی جن میں آدمیوں کی کثرت ہے اور وہ متمدن اور مہذب بھی ہیں بہر کیف واہمہ کی غلام ہیں، عیسائیوں کی مثال لیجیے، وہ اِتنے کثیر ہیں کہ خدا ہی کو اُن کا شمار معلوم ہے، اُن میں بڑے بڑے فلسفی اور دانش مند بادشاہ گذرے ہیں باوجود اس کے وہ یقین کرتے ہیں کہ ایک تین ہیں اور تین ایک ہے، تینوں میں سے ایک باپ ہے، دوسرا بیٹا ہے اور تیسری ایک رُوح ہے، وہ کہتے ہیں کہ باپ بیٹا ہے،

اور باپ بیٹا نہیں ہے، اور یہ کہ ایک آدمی خدا ہے اور خدا نہیں ہے، مسیح ہر اعتبار سے خدا ہے، اور اُس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ مسیح بالکل ویسا نہیں ہے جیسا کہ خدا ہے مسیح ازل سے موجود ہے، باوجود اس کے وہ مخلوق ہے، عیسائیوں کا ایک فرقہ جسے یعقوبی کہتے ہیں تعداد میں لاکھوں کا ہے، اِس فرقہ کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا کو تازیانے لگائے گئے تھے، اُس کو مارا تھا اور مصلوب کر کے اُس کی جان لی تھی، اور یہ کہ تین دن تک تمام عالم کا کوئی حکمراں نہ تھا۔"

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ طنزیہ کلام کسی مشکک کا نہیں ہے بلکہ ایک "پکّے" مسلمان کا ہے، ابنِ حزم فرقہ ظاہریہ سے تعلق رکھتے تھے جو قرآن کے الفاظ کا شدت سے پابند ہے، ابنِ حزم تشبیہ پر کسی امر کے فیصلہ کرنے کو بُرا سمجھتے تھے، یعنی قرآن کے معنی میں اگر انسانی عقل کو دخل دیا جاتا تھا تو اُس کو شیطانی فعل سمجھتے تھے، سیاسیات میں ابن حزم صحیح النسب خاندانِ شاہی یعنی بنی اُمیّہ کے ہمدرد اور معاون تھے، انہی بنی اُمیّہ کے موالی میں اپنے نسب کو غلط قرار دے کر وہ شریک ہوئے تھے، بنی اُمیّہ کو ابن حزم جیسا جاں نثار اور خیر خواہ ملنا ممکن نہ تھا، اور بنی اُمیّہ کی دوستی میں ایسے ثابت قدم تھے کہ جس وقت اسپین سے اِس خاندان کا چراغ گُل ہونے لگا اور علی بن حمود خلیفہ ہو گئے اور خیران نے بھی علی بن حمود کی اطاعت قبول کر لی تو اُس وقت بھی ابن حزم کی ہمت میں فرق نہ آیا، اگرچہ چاروں طرف دشمن اور جاسوس لگے ہوئے تھے مگر وہ بنی اُمیّہ کی ترقی کے لیے سلسلہ جنبانی اور طرح طرح کی تدبیریں ہمیشہ کرتے رہے۔

ابنِ حزم بڑی پُرجوش طبیعت رکھتے تھے، اور پُرجوش طبیعتیں احتیاط کرنے کو بُزدلی سمجھا کرتی ہیں، خیران کو ابنِ حزم کی کارروائیاں معلوم ہو گئیں، اُس نے ابنِ حزم کو کئی مہینے تک قید رکھا، تاکہ اُن کی سازشیں کسی طرح بند ہوں، اور قید کے بعد اُن کو شہر بدر کر دیا، ابن حزم حصن القصر کے حاکم کے پاس چلے گئے اور اُس کے ہاں مہمان رہے حصن القصر اشبیلیہ سے زیادہ دُور نہ تھا، وہ حصن القصر ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ بنی اُمیّہ میں سے عبد الرحمٰن (رابع) کی نسبت سُنا کر بلنسیہ میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کی گئی

ہے، اس خبر کو سُنتے ہی ابنِ حزم ساحل پر آئے اور جہاز پر سوار ہو کر بلنسیہ پہنچے تاکہ عبدالرحمٰن (رابع) المرتضیٰ کو اپنی خدمات پیش کریں، اور اب عبدالرحمٰن المرتضیٰ جو لڑائی اپنے دشمنوں سے لڑے اور جس میں اپنے ہی دوستوں کی دغابازی سے مارے گئے، اُس میں ابنِ حزم بھی اپنے آقا کی طرف سے لڑے، اس لڑائی میں ابنِ حزم فتح یاب بربر کے ہاتھ پڑگئے، بربر نے اُن کو فوراً گرفتار کر لیا، اور ایک مدّت تک بربر کی قید سے وہ رہا نہ ہو سکے۔

اخیر میں وہ ایک بڑے جیّد عالم مشہور ہو گئے اور اسپین کے بہترین مصنفوں میں اُن کا شمار ہونے لگا، شروع زمانہ میں زیادہ تر شاعری میں اُنہوں نے نام پیدا کیا، اور اسپینی مسلمان شاعروں میں اُن کا پایہ سب سے بلند ہو گیا، اُس وقت اُن کی عمر ایسی تھی جس میں شاعرانہ خیالات کا ہجوم ہوتا ہے، یہ اپنے نوجوان آقا عبدالرحمٰن خامس (المستظہر) سے صرف آٹھ برس عمر میں بڑے تھے۔

عشق کی ایک داستان ابنِ حزم کی بھی تھی، مگر بہت سیدھی سادی جسے اُنہوں نے اِس قدر سادگی مگر خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ ہم اُس کا اعادہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ (گو بعض بلیغ استعارات اور زبان کے تکلفات ہم چھوڑتے گئے ہیں، عربی شعراء کے نزدیک وہ حُسنِ کلام کے لئے ضروری ہیں، مگر مغربی مذاق اُن کو گوارا نہیں کرتا) وہ قصّہ یہ ہے:۔

"میرے باپ کے قصر میں ایک لڑکی رہتی تھی جس نے ہمارے ہی گھر میں پرورش پائی تھی، جب وہ لڑکی سولہ برس کی ہوئی تو حسن و جمال، لیاقت و ذہانت، شرم و حیا میں کسی عورت کو اُس سے نسبت نہ تھی، خوشامد اور تمسخر سے جلد ناراض ہو جاتی تھی، اُس کا حُسن اگرچہ ہر دل کو مغلوب کئے ہوئے تھا، مگر کسی کی اتنی مجال نہ تھی کہ اپنا عشق اُس پر ظاہر کر سکتا، وہ مغرور تھی اور کسی پر مہربانی ظاہر کرنے میں بھی بے حد احتیاط کرتی تھی، پھر بھی خوش گفتار اور ملتفت عورتوں سے کہیں زیادہ اُس کی طرف دِل کھنچے جاتے تھے، وہ چلتی پھرتی بھی کم تھی، اور کھیل کود کی طرف متوجہ نہ تھی، لیکن چنگ بجانے میں کمال رکھتی تھی۔

میرا شباب تھا اور میں ہمہ تن اُسی کا ہو رہا، اُسے باتیں کرتا ہوا سُنتا تھا، مگر اُسی وقت جب کہ اور لوگ بھی اُس کے نزدیک ہوتے تھے، میں دو برس تک اسی دُھن میں رہا کہ کہیں تنہائی میں اُس سے بات کرنے کا موقع ملے، ایک دن کوئی تقریب تھی، جیسے کہ وزیروں کے گھروں میں اکثر ہوا کرتی ہیں، اور ہمارے خاندان کی تمام مستورات، ہمارے موالی، اور ملازمین سب اس تقریب میں مدعو تھے، دن کا کچھ حصّہ قصر میں صرف کرکے تمام مستورات ایک ایسے مقام پر جاکر بیٹھیں جہاں سے قرطبہ کا شہر اور اُس کے مضافات خوب نظر آتے تھے اور درخت بالکل حائل نہ تھے، میں بھی وہاں گیا، اور اُس محراب کے قریب پہنچا جہاں یہ حسینہ کھڑی تھی، لیکن جب اُس نے مجھے قریب کھڑے دیکھا تو جلدی سے دوسری محراب میں جا کھڑی ہوئی، میں بھی پیچھے چلا، مگر وہ بچتی رہی، میری محبت کا حال اُس کے دل کو معلوم ہو گیا تھا، کیونکہ عورتیں مردوں کا عشق معلوم کرنے میں ایسا ہی ملکہ رکھتی ہیں جیسے ایک بدّو رات کے وقت ریگستان میں منزل کی لیکھ معلوم (۵۷۸)
کرنے میں مشاق ہوتا ہے، یہ خوش قسمتی تھی کہ عورتیں جو اُس وقت اُس کے ساتھ تھیں، اُن پر میرا حال کچھ نہ کھُلا، کیونکہ وُہ پر فضا اور خوشنما موقعوں کی تلاش میں ایسی سرگرم تھیں کہ میری طرف اُن کا خیال نہ گیا، پھر وہ سب کی سب باغ میں چلی گئیں، اور بعض بڑی بوڑھیوں نے اُس سے، جو سب کے دِل کو عزیز تھی کہا کہ "کچھ گاؤ"۔ اُس نے چنگ اُٹھا کر اُس کے پردوں کو اپنی نازک انگلیوں سے درست کیا، اِس کیفیت سے اُس کا حُسن میری نظروں میں دوبالا ہو گیا، پھر چنگ پر عباس ابنِ احنف کے یہ اشعار اُس نے گائے :-

"مجھے سوائے اپنے ماہِ تاباں کے دوسرے کا خیال نہیں، وہ نازک اندام جو محل کی سیاہ دیواروں کے پیچھے غائب ہوتی نظر آئی ہے، انسان ہے یا جن ہے، عورت سے وہ بڑھ کر ہے۔ حُسن و خوبی اُس میں از سر تا پا موجود ہے، لیکن جنّات کی خباثت اُس میں نہیں ہے، اُس کا چہرہ گوہرِ آبدار ہے اور اُس کا جسم نرگس ہے، اُس کا نفس خوشبو ہے، اور نُور کا وہ ایک چشمہ ہے، شربتی رنگ کا جوڑا گلے میں ہے،

اور سُبک رفتاری کا یہ عالم ہے کہ نازک سے نازک چیز بھی پاؤں کے نیچے دب کر نہیں ٹوٹ سکتی ۔"

یہ اشعار وہ چنگ کے پردوں پر گیا گاتی تھی میرے دل کی رگوں کو مضراب سے چھیڑتی تھی، اُس دن کو آج تک میں نہیں بھولا اور مرتے دم تک نہ بھولوں گا، لیکن اُس دن کے بعد پھر وہ شیریں آواز سُننی نصیب نہیں ہوئی ، میں نے اپنے اشعار میں کہا ہے :۔

"اگر وہ مجھ سے گریز کرتی ہے تو اس میں اُس کا قصور نہیں ، تیری ملامت کی وہ مستحق نہیں ہے ، وہ ایک غزالِ یا چمکتے چاند کی مانند حسین وجمیل ہے ، لیکن غزالہ بزدل ہوتا ہے اور چاند تک کسی کی رسائی نہیں .... تو نے مجھے اپنی شیریں آواز سُننے سے محروم کر دیا ، اور اب تو میری آنکھوں کو بھی اجازت نہ دے گی کہ وہ تیرا حُسن دیکھیں ، عبادت میں محو تیرے خیالات خدا کی طرف ہیں انسان کا کوئی خیال تجھے نہیں ہے ، کتنا خوش نصیب ہے عباس ، جس کے اشعار تو گاتی ہے ، لیکن اگر یہ شاعر تیرا گانا سُنتا تو دل گیر ہو جاتا اور تجھ پر رشک کرتا اور تو نے اُسے ہرا دیا ، کیونکہ تیرے لبوں نے اُس کے اشعار میں وہ درد پیدا کیا ہے جو اُس کی شاعری میں نہیں ہے ۔"

خلیفہ مہدی باللہ کی خلافت کے اعلان کو تین دن گذرے تھے کہ ہم نئے محل سے جو مدینۃ الزاہرہ کے مضافات میں قرطبہ سے مشرق کی جانب تھا، اُٹھ کر اپنے قصر میں چلے آئے جو قرطبہ کے مغربی مضافات میں بلاطِ مغیث کے نام سے مشہور تھا، لیکن اب اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ، کیونکہ اس زمانہ میں وہ عورت ہمارے ساتھ نہ تھی ، جس وقت ہشام المؤید دوبارہ خلیفہ ہوئے تو جو لوگ اُس وقت سر برآوردہ تھے وہ ہم سے ناراض ہو گئے ، اُنہوں نے بڑی بڑی رقمیں روپیہ کی ہم سے وصول کیں اور ہمیں قید کر دیا ، جب قید سے چھوٹے تو روپوش ہونا پڑا ، اب خانہ جنگی شروع ہوئی ، کوئی متنفس ایسا نہ تھا جس کو ان آپس کی لڑائیوں سے نقصان نہ پہنچا ہو ، خاص کر ہمارا خاندان تو بالکل ہی تباہ ہو گیا ، میرے والد کا انتقال ۲۱ ر جون ۱۰۱۲ء (۲۸ ر ذیقعدہ ۴۰۲ھ) کو ہو گیا ، اور اب ہم پر مصیبتوں کا

مینہ برس پڑا۔

اِسی زمانہ میں ایک دن مَیں ایک عزیز کے جنازے کے ساتھ جا رہا تھا کہ ماتم کرنے والیوں میں مَیں نے اُس عورت کو دیکھا، میرا حال اُس دن نہایت افسوس ناک تھا، مصیبتوں نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا تھا، پھر بھی جب میری نظر اُس پر پڑی تو زمانۂ حال مع اپنے درد و الم کے اِس طرح غائب ہو گیا جیسے کسی نے جادو سے اُڑا دیا ہو اُس کی صورت دیکھتے ہی مجھے اپنا پچھلا زمانہ اور عشق و محبت کی ابتدا یاد آگئی، اور تھوڑی دیر کو یہ معلوم ہونے لگا کہ عہدِ جوانی و انبساط پھر آگیا، لیکن افسوس یہ کیفیت بہت تھوڑی دیر رہی، فوراً موجودہ مصائب کا خیال پھر عود کر آیا، اور میرا درد و الم عشقِ ناکام کو یاد کر کے اور بھی زیادہ ہو گیا، اِس حالِ زار میں مَیں نے یہ اشعار کہے:۔

”یہ ایک مُردے کا ماتم کر رہی ہے جس کی لوگ بہت عزت کرتے تھے لیکن
جو شخص اب تک زندہ ہے اُس سے کہیں زیادہ ضرورت اُس کے آنسوؤں کی ہے،
یہ ایسے انسان کو رو رہی ہے جو قدرتی موت مرا ہے، لیکن مجھ بدنصیب کے لئے اُس
کے دل میں رحم نہیں ہے، جسے حالتِ نا اُمیدی کی تکلیفیں اُس نے ہمیشہ پہنچائی
ہیں“

اِس واقعہ کے کچھ مدت بعد جب بربر کا قبضہ دار الخلافت پر ہو گیا تو ہماری نسبت شہر بدر کئے جانے کا حکم ہوا، اور ہم جولائی ۱۰۱۳ء (محرم ۴۰۴ھ) میں قرطبہ سے نکل گئے، اِس کے بعد پانچ برس تک مجھے اُس عورت کی صورت نظر نہ آئی، آخر کار جب فروری ۱۰۱۸ء (رمضان ۴۰۸ھ) میں مَیں قرطبہ واپس آیا تو وہاں ایک عزیز کے گھر میں رہنا ہوا، اِس گھر میں مَیں نے اُسے پھر دیکھا، لیکن وہ اِس قدر بدل گئی تھی کہ مَیں مشکل سے اُس کی صورت پہچان سکا، بلکہ جب اَوروں نے یقین دلایا کہ یہ وہی ہے تو مَیں نے اُسے پہچانا، وہ پھول جسے مَیں حیرت سے دیکھا کرتا تھا، اور اگر پاسِ ادب نہ ہوتا تو ہر شخص اِس پھول کو توڑنے کے لئے تیار ہو جاتا اب کملا چکا تھا، ہمارے گھر میں وہ ناز و نعمت میں پلی تھی لیکن جب اُس گھر سے نکلنا پڑا تو روزی کمانے کے لئے اُسے محنت و مشقت کرنی پڑی، عورتیں

نازک پھول ہوتی ہیں، جہاں اُن پھولوں سے غفلت کی اور وہ مُرجھا گئے، اُن کا حسن مرد کے حُسن کی مانند دیرپا نہیں ہوتا، جلتی دُھوپ، گرم ہوا، موسم کی سختی یا بے توجہی اُنہیں تباہ کردیتی ہے، لیکن اب بھی جیسی کچھ وہ تھی، اگر ایک لفظ بھی محبت کا مجھ سے کہتی تو میں دُنیا میں اپنے تئیں سب سے زیادہ خوش نصیب سمجھنے لگتا، لیکن میری طرف سے وہ اسی طرح بے پروا اور سرد مہر رہی جیسے کہ ہمیشہ سے تھی، رفتہ رفتہ اُس کی اِس بے توجہی نے میرے دِل کو اُس سے جُدا کرنا شروع کردیا، میں نے کبھی اُسے بُرا نہیں کہا، اور اب بھی میں اُسے بُرا نہیں کہتا، مجھے اِس بات کا کوئی حق حاصل نہ تھا، میں کِس بات کی شکایت کرسکتا تھا، اگر کبھی وہ مجھ سے ہنسی بولی ہوتی تو اب گِلہ شکوہ بھی کرسکتا، لیکن اُس نے نہ کبھی کسی قسم کی کوئی اُمید پیدا ہونے دی، اور نہ کسی بات کا وعدہ کیا۔"

(۵) اِس قصہ میں ایسی نازک خیالیاں ہیں جو عربوں میں غیر معمولی تصوّر کی جاسکتی ہیں، عرب اُس حُسن کو ترجیح دیتے تھے جو دلفریب ہو، معشوق کی نگاہیں ایسی برق وش ہوں جو آگے کی راہ بتاتی ہوں، آہوں میں وہ اثر ہو جن سے آیندہ کی اُمید بندھے، ابنِ حزم کے عشق کا یہ قصہ اِس میں شک نہیں ایسا ہے جس میں ہوا و ہوس کا عنصر موجود ہے، کیونکہ جب معشوقہ کی صورت اچھی نہیں رہی تو عاشق کے غمِ فرقت میں کمی ہوگئی، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مصنف جس کی تحریر اخلاقی پاکیزگی میں سب سے بڑھ کر تھی، جو مسلمان شاعروں میں سب سے زیادہ شان ایک عیسائی شاعر کی رکھتا تھا خالص عربی النسل کا آدمی نہ تھا، ایک اسپینی عیسائی کا پڑپوتا تھا، گو طبیعت اور طرزِ خیال جو اُس کے بزرگوں کا تھا وہ اُس میں باقی نہ رہا تھا، پھر بھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسپینی عیسائیوں کا مسلمان ہو کر اپنے نسب کو بدلنا اور اپنے سابقہ ہم مذہبوں پر طعن و تشنیع کرنا کیسی فضول اور نازیبا حرکت تھی، [۱] کیونکہ بہرکیف اُن کی طبیعت میں ایک ایسا نازک اور روحانی عنصر موجود رہا جو عربی نہ تھا۔

[۱] مصنف کا مطلب یہ ہے کہ ابنِ حزم کی یہ نازک خیالیاں اس وجہ سے تھیں کہ کسی (باقی برصفحہ آیندہ)

اسناد :-

ابن الابار ص ۱۶۵ تا ۱۶۶

ابن بسام ج ۱ ص ۱۱ تا ۱۲

مقری ج ۱ ص ۲۸۴

ڈوزی "فہرست" ج ۱ ص ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۳۰

ابن حزم طوق الحمام ص ۹۹ تا ۱۰۲ (کتاب ادیان) ج ۲ ص ۲۷۰

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) زمانہ میں اُس کے بزرگ عیسائی تھے، گویا سابقہ نصرانیت کا اثر باقی تھا جو ایسی اچھی طبیعت پائی تھی، لیکن ابن حزم نے عیسائی مذہب کے بیان کرنے میں طعن و تشنیع سے کام لیا پس اُس کی یہ حرکت ایک قسم کی نا احسان مندی تھی۔ مترجم

کتابِ ثالث

خلافت

اٹھارھویں فصل

خلافتِ اندلس کا زوال

(۵۸ عبدالرحمٰن المستظہر کو مسندِ خلافت پر بیٹھے اور ابنِ حزم کو حاجب ہوئے سات ہفتے بھی پورے نہ گذرے تھے کہ عبدالرحمٰن قتل کر دیئے گئے، اور ابن حزم دُنیا اور دُنیا کی اُمیدوں سے ہاتھ کھینچ کر گوشہ نشینی، عبادتِ الٰہی، اور مطالعہ میں زندگی بسر کرنے لگے تاکہ واقعاتِ گذشتہ دل سے محو ہو جائیں، اِن دونوں شخصوں پر اس قسم کا کوئی الزام عائد نہیں ہو سکتا کہ اُنھوں نے امورِ سلطنت میں تلوّن مزاجی یا غفلت جو شاعروں کا اکثر شیوہ سمجھی جاتی ہے ظاہر کی ہو، واقعہ یہ ہے کہ انتظامِ سلطنت میں دونوں قابل تھے، اور جلاوطنی اور مصائب کے مکتب میں پہلے اتنے سبق پڑھ چکے تھے کہ اب انسانی فطرت کا عِلم اور سیاست میں ہوش مندی اُن کو جلد حاصل ہو گئی، لیکن اپنے زمانۂ حکومت میں وہ متعدد اور قسم قسم کے خطروں میں مبتلا رہے۔

عبدالرحمٰن المستظہر جس وقت خلیفہ ہوئے تھے تو صرف نوجوان شرفاء قوم کو اپنا مشیر بنا سکے تھے، علی ابن حزم کے علاوہ جن لوگوں سے وہ بالعموم مشورہ لیتے تھے وہ عبدالوہاب ابنِ حزم (علی ابن حزم کے چچازاد بھائی) اور ابوعامر ابنِ شہید تھے، یہ بڑے ذہین اور قابل لوگ تھے، مگر اُن کے مذہبی خیالات میں کچھ ایسی آزادی تھی کہ وہ مسلمان جو راسخ الایمان تھے اُن سے ناراض ہو گئے، اُمراء دولت میں جو لوگ زیادہ عمر والے تھے اُنھوں نے سلیمان برادر مہدی باللہ کو خلیفہ بنانا چاہا تھا، لیکن جب کثرتِ رائے نے سلیمان کو خلیفہ نہ ہونے دیا تو ان لوگوں نے سلیمان کی خلافت کے لئے علانیہ سازشیں شروع کیں، یہ سازشیں اتنی بڑھیں کہ عبدالرحمٰن المستظہر نے مجبور ہو کر اُن بڈھے امیروں کو قید کر دیا۔

دُور اندیش لوگوں نے عبدالرحمٰن المستظہر کی اس کارروائی کو ضروری سمجھا، لیکن اراکین سلطنت اس بات پر بگڑ اُٹھے، عبدالرحمٰن پر اعتراض ہونے لگے کہ اُنھوں نے جن لوگوں کو قید کیا ہے اُن میں دو شخص ایسے بھی ہیں جو مدعیٔ خلافت ہیں، گو ان قیدیوں کے ساتھ برتاؤ اچھا کیا جاتا تھا مگر قصر سے باہر نکلنے کا انھیں حکم نہ تھا، دوسری مشکل یہ پیدا ہوئی کہ اکثر پیشہ وروں کے کاموں کا مندا ہو گیا، اور اہلِ حرفہ کثرت سے بے روزگار ہو کر آمادہ ہوئے کہ معاشرت کے قصر کو جس حال میں بھی ہو برباد کر دیں، بدقسمتی سے اس گروہِ مفسد کا ایک سردار اور مددگار بھی پیدا ہو گیا، یہ شخص بنی اُمیّہ میں سے تھا، اس کا نام محمد بن عبدالرحمٰن بن عبیداللہ بن عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ تھا، جس زمانہ میں خلیفہ کا انتخاب ہو رہا تھا تو محمد بن عبدالرحمٰن کو بھی اپنے خلیفہ ہونے کی اُمید تھی گو اُس کا نام اُمیدوارانِ خلافت کی فہرست میں نہ تھا، محمد بن عبدالرحمٰن فی الواقع خلافت کے لائق بھی نہ تھا، کیونکہ جاہل تھا اور پیدائشی قابلیتیں بھی بہت کم رکھتا تھا، سوائے بسیار خوری اور مے نوشی کے دوسرا شغل نہ تھا، طبیعت میں غرور بہت تھا، جس وقت معلوم ہوا کہ انتخاب کے وقت کسی نے بھی اُس کی طرف توجہ نہیں کی اور خلافت ایسے شخص ۲۱
کو مل گئی جو نوعمر ہے تو اُسے بے انتہا غصہ آیا، اہلِ حرفہ میں جو کچھ رسائی اُس نے پہلے

سے پیدا کر رکھی تھی، اب اُس سے کام نکالنا شروع کیا، پیشہ وروں اور عامیوں سے اُس کے تعلقات ایسے گہرے تھے کہ ایک شخص احمد بن خالد جو جولاہے کا پیشہ کرتا تھا اُس کا بڑا عزیز دوست تھا، اِس احمد بن خالد کی سرگرم تائید سے محمد بن عبدالرحمٰن نے شہر کے پیشہ وروں کو حکومت اور لوٹ کا لالچ دے کر ایک سخت بغاوت کی داغ بیل ڈال دی۔

ابتدا میں کوئی وجہ خوف کی اِس بارے میں نہ تھی کہ عوام اور اُمرائے قرطبہ جن کو عبدالرحمٰن المستظہر نے قید کر رکھا تھا امرِ خلافت میں متفق الرائے ہو جائیں گے، کیونکہ ان میں کوئی کسی کو خلیفہ بنانا چاہتا تھا کوئی کسی کو، لیکن جب سلیمان (برادر مہدی باللہ) کا انتقال ہو گیا، تو عوام اور اُمرائے قرطبہ نے ایک شخص پر اتفاق کر لیا، اِنہی اُمراء میں ایک شخص ابنِ عمران تھا، اُس نے عبدالرحمٰن المستظہر اور اہلِ شہر میں درمیانی بننا چاہا، عبدالرحمٰن المستظہر سیدھی طبیعت کے آدمی تھے، لوگوں نے ابنِ عمران کی طرف سے ہوشیار بھی کرنا چاہا مگر عبدالرحمٰن المستظہر نے اُسے قید سے رہا کر دیا، عبدالرحمٰن المستظہر سے اُن کے ایک دوست نے کہا تھا کہ اگر ابنِ عمران قید خانے سے نکلا تو قید خانے سے باہر اُس کا ایک ایک قدم خلیفہ کی عمر کے ایک ایک سال کم ہونے کے برابر ہو گا،

ابنِ عمران حقیقت میں بڑا خطرناک آدمی تھا، قید سے آزاد ہوتے ہی اُس نے خلیفہ مستظہر کے خلاف کام شروع کر دیا، افسرانِ فوج جو اُس زمانہ میں خلیفہ سے ناراض ہو گئے تھے اُن کو اپنی طرف ملا لیا۔

اِس واقعہ سے دو دن پہلے بربر کے بہت سے لوگ فوج میں بھرتی ہونے کے لئے خلیفہ مستظہر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، خلیفہ نے یہ دیکھ کر کہ حالت خطرناک ہو رہی ہے فوج میں سواروں کے رسالے بڑھانے مفید ہوں گے بربر کو بھرتی کر لیا، فوج جو قصرِ خلافت میں موجود تھی اِس بات پر بگڑ گئی، اور ابنِ عمران کی پشت گرمی سے اِس فوج نے علانیہ شکایتیں کرنی شروع کیں، یہ فوجی کہنے لگے کہ "ہم نے بربر کو شکست دے کر یہاں سے نکالا تھا، اور اب اُن کو وہی شخص جسے ہم نے مسندِ خلافت پر بٹھایا

شہر میں واپس بُلا رہا ہے، اور ہم کو پھر ہمارے دشمنوں کے پنجے میں گرفتار کرانا چاہتا ہے۔"

شہر کے لوگ اشارہ پانے کے تو منتظر ہی تھے اب نہایت خوشی سے بغاوت پر رضامند ہو گئے، اور یہ بات ایسے وقت پیش آئی کہ خلیفہ مستظہر کو کسی کی طرف سے بھی بدگمانی نہ تھی، باغیوں کا ایک گروہ قصرِ خلافت میں گھس پڑا، اور وہاں پہنچ کر شہر کے جو اُمراء قید کر دیئے گئے تھے اُن کو رہا کیا، عبدالرحمٰن المستظہر نے جب دیکھا کہ جان کو خطرہ ہے تو وزیروں کو طلب کر کے اُن کی رائے پوچھی، وزیروں کو خود اپنی جان کا اندیشہ تھا، جان بچانے کی تدبیریں بڑے غور سے سوچ رہے تھے کہ قصر کے اہلِ فوج نے اِن وزیروں سے کہا کہ "اگر عبدالرحمٰن المستظہر کو اپنے حال پر چھوڑ دو گے تو پھر تمہاری جان کو کوئی خطرہ نہ رہے گا۔" بہت سے وزیروں نے اِس اُصول کی پابندی میں کہ اپنی جان بچانی ضروری ہے خلیفہ عبدالرحمٰن المستظہر سے علیٰحدگی اختیار کی، لیکن جلد معلوم ہوگیا کہ فوج والے قول کے کیسے جھوٹے تھے، وزیروں میں سے بہت سے لوگ جس وقت بابِ الحمہ سے نکل کر شہر کے باہر آئے تو سب کے سب قتل کر دیئے گئے۔

عبدالرحمٰن المستظہر نے گھوڑے پر سوار ہو کر اسی دروازۂ شہر سے باہر نکلنا چاہا، مگر فوج والوں نے راستہ روک لیا، برچھیاں تول کر عبدالرحمٰن کے گرد حلقہ باندھ لیا، اور نہایت سخت الفاظ کہے، عبدالرحمٰن قصر کو واپس چلے آئے، اور گھوڑے سے اُتر کر حمّام میں گئے، اور قبا اُتار کر ایک دودکش ہی میں گھس گئے۔ (۸۱۳ھ

اِسی اثناء میں شہر کے لوگ اور قصر کے اہلِ فوج بڑی بے رحمی سے بربر کا تعاقب کر رہے تھے، جہاں جو بربر ملتا تھا، خواہ کسی کے قصر میں ملے، خواہ مسجد یا حمام میں، فوراً قتل کر دیتے تھے، عبدالرحمٰن المستظہر کے اہلِ حرم کو اُمرائے شہر نے گرفتار کر کے باہم تقسیم کر لیا، اور انہیں اپنے گھر لے گئے۔

خلاصہ یہ کہ محمد اُموی (بن عبدالرحمٰن بن عبیداللہ بن عبدالرحمٰن الناصر) کو کامیابی ہوگئی، اور اُسی قصر میں جہاں معزول عبدالرحمٰن المستظہر چھپے ہوئے تھے محمد کی خلافت

کا اعلان کیا گیا، محمد اب قصر کے بڑے کمرے میں آئے اور تخت پر ہو بیٹھے، اُن کے گرد فوج کے لوگوں اور شہر کے عامیوں کا مجمع تھا، مگر جب تک عبد الرحمٰن المستظہر زندہ تھے محمد اُموی کی بادشاہی کو استقلال نہ ہو سکتا تھا، اِس اندیشہ کو رفع کرنے کے لئے محمد اُموی نے عبد الرحمٰن المستظہر کی تلاش کا حکم دیا، عبد الرحمٰن گرفتار ہو گئے، اور ۱۸ جنوری ۱۰۲۴ء (۴ ذیقعدہ ۴۱۴ھ) کو قتل کر دیئے گئے۔

محمد اُموی نے المستکفی کا لقب اختیار کیا، دولت اور مناصب تقسیم کر کے نامودری حاصل کرنی چاہی، لیکن جب اُنھوں نے اپنے ایک جولاہے دوست کو وزیرِ اعظم مقرر کیا، تو سب لوگ کیا عوام اور کیا خواص، اُن سے سخت ناراض ہو گئے، المستکفی کا دورِ حکومت بہت قلیل رہا، پہلے ہی سے خیال تھا کہ وہ ایک بُرے فرمانروا ثابت ہوں گے اور ہوا بھی یہی، جب سُنا کہ لوگ اُن کی جان کے درپے ہوئے ہیں تو اپنے ہی خاندان کے بہت سے لوگوں کو قید کر دیا، ان میں سے ایک آدمی اُن کے حکم سے گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا، اس خونِ ناحق سے اہلِ قرطبہ میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اُٹھی، مستکفی نے عبد الرحمٰن المستظہر کے خاص خاص مشیروں کو بھی قید خانے بھجوا دیا، اِن میں علی ابنِ حزم اور عبد الوہاب ابنِ حزم بھی تھے، ابو عامر شہید اور بہت سے اُمرا گرفتاری کے خوف سے قرطبہ سے نکل گئے، اور مالقہ میں یحییٰ بن حمود سے جا ملے، اور انہیں سمجھایا کہ قرطبہ میں سخت بد نظمی ہے، بہتر ہے کہ آپ اِسے دُور کرنے کا قصد کریں۔

اُمرائے قرطبہ کی یہ صلاح بیکار ثابت نہ ہوئی، اور اب قرطبہ میں خبر گرم ہوئی کہ یحییٰ بن حمود شہر پر حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں، مئی ۱۰۲۵ء (ربیع الاول ۴۱۶ھ) میں ایک بلوہ شہر میں ہوا، بلوائیوں نے مستکفی کے حاجب کو جو کسی زمانہ میں جولاہے کا پیشہ کرتا تھا پکڑ کر اتنی چھُریاں ماریں کہ وہ مر گیا، اور اُس کی لاش کو جب تک وہ ٹھنڈی نہ ہو گئی پاؤں سے کچلتے رہے، مستکفی کے قصر کا محاصرہ کر لیا، سپاہی جو قصر کی حفاظت کر رہے تھے مستکفی کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ "ہمارا خدا علیم ہے کہ جہاں تک ہماری قدرت اور امکان میں تھا ہم نے آپ کو تخت پر سلامت رکھنے کی کوشش

کی، لیکن اب اس حالت کو قائم رکھنا غیر ممکن ہے، یحیٰی بن حمود حملہ کرنے والے ہیں اور ہمیں اُن کے مقابلے کے لئے جانا ہے، اور خوف یہ ہے کہ جب ہم چلے جائیں گے تو آپ کی حالت بہت نازک ہو جائے گی، ہماری رائے میں اگر آپ خفیہ طور پر شہر سے نکل جائیں تو بہتر ہو۔"

مستکفی نے یہ دیکھ کر کہ اب کچھ باقی نہیں رہا ہے، ان سپاہیوں کی صلاح پر عمل کرنا چاہا، اور ایک گانے والی کا سا لباس پہن کر منہ پر نقاب ڈال، دو عورتوں کو ساتھ لئے قصر سے نکلے اور پھر شہر سے باہر آگئے، یہاں سے بھاگ کر سرحد کے ایک (۵۸۴
گاؤں میں جا کر قیام کیا، یہاں ایک شخص نے جو اُن کے ساتھ تھا انہیں زہر دے کر مار ڈالا، اس شخص میں اور مستکفی میں ایک ایسا قول و اقرار ہو گیا تھا کہ وہ مستکفی کا ساتھ نہ چھوڑ سکتا تھا، لیکن اب ایسے آدمی کے ساتھ رہنا جس کے سر سے قانون نے اپنا سایہ اُٹھا لیا ہو اس شخص کو ناگوار تھا، اُس نے مستکفی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔

چھ مہینے تک قرطبہ میں کوئی بادشاہ نہ تھا، شہر کا انتظام ایک مجلس اپنے طرز پر کرتی تھی، لیکن یہ طرزِ حکومت کسی طرح بھی مستقل طور پر جاری نہ رہ سکتا تھا، دوسرے اس طرزِ سلطنت کا زمانہ مساعد نہ تھا، پُرانے طریقے مٹ رہے تھے، نئے طریقے نے ابھی تک عالمِ خیال سے باہر قدم نہ نکالا تھا، رائے عامہ میں مطلق العنان بادشاہی ایسا طرزِ حکومت تھا جس سے ملک میں انتظام قائم رہ سکتا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ مطلق العنان بادشاہ کیونکر دستیاب ہو؟ کیا اُس کا جواب یہ تھا کہ بنی اُمیہ میں سے ایسا بادشاہ مل سکتا ہے، مگر اس کا تجربہ ہو چکا تھا، عبدالرحمٰن المستظہر بنی اُمیہ ہی میں سے خلیفہ مقرر ہو چکے تھے، اور اس خاندان میں یہ بہترین شخص تھے، لیکن نتیجہ ناکامی ہوا، ملک میں امن قائم رکھنے، اور عوام کو جو ہمیشہ فتنہ و فساد پر آمادہ اور قتل و غارت پر مستعد رہتے تھے روکنے کے لئے ایک ایسے حکمران کی ضرورت تھی جس کے پاس ایسی فوجیں ہوں جن میں غیر ملک کے لوگ ہوں، بنی اُمیہ میں سے کسی کے پاس ایسی

فوجیں نہ تھیں، اس لئے رائے یہ قرار پائی کہ یحییٰ بن حمود کو سلطنت سپرد کردی جائے۔ اس لئے کہ اس وقت یحییٰ بن حمود ہی ایسے شخص تھے جن سے کسی کو کوئی شکایت نہ تھی، ایک عرب مصنف[1] کا بیان ہے کہ یہ تحریک ایسے لوگوں کی نہیں معلوم ہوتی تھی جو سلطنت سے ناراض ہو کر باغی ہو گئے تھے بلکہ ان لوگوں کی تھی جو امن و امان قائم کرنا چاہتے تھے، اور اس صورت کے سوا دوسری کوئی تدبیر ان کو نظر نہ آتی تھی، اب یحییٰ بن حمود سے جو مالقہ میں تھے خط و کتابت شروع ہوئی، قرطبہ والوں کی درخواست اُنہوں نے منظور کی، مگر بہت بے توجہی اور سرد مہری سے، جو لوگ اُن کو سلطنت سپرد کرنی چاہتے تھے اُن کی تلوّن مزاجی کا حال یحییٰ کو معلوم تھا، اور وہ یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ مرض کا محض آخری علاج سمجھ کر اہلِ قرطبہ نے یہ درخواست کی ہے، یحییٰ ابن حمود نے اس وقت یہی کافی سمجھا کہ ایک بربر سپہ سالار کی سرکردگی میں کچھ فوج قرطبہ روانہ کردیں (نومبر ۱۰۲۵ء = رمضان ۴۱۶ھ)

یحییٰ بن حمود کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو کسی نے بہت اچھی صلاح دی تھی، کیونکہ بربر سپہ سالار کے آنے پر اہلِ قرطبہ نے اُس کی حکومت سے جلد اپنی گلو خلاصی کرنی چاہی، اور مشرقی اندلس کے صقلبی اُمرا یعنی خیران صاحب المریہ، اور مجاہد صاحبِ دانیہ کے جو ایلچی قرطبہ میں وارد تھے اُن کی طرف ملتفت ہو گئے، اِن ایلچیوں نے قرطبہ کے لوگوں سے کہا کہ اگر وہ حقیقت میں آزادی چاہتے ہیں تو صقالبہ اُن کی مدد کے لئے فوراً یہاں آسکتے ہیں۔

ایلچیوں کا یہ قول غلط نہ تھا، مئی ۱۰۲۶ء (ربیع الاول ۴۱۷ھ) میں خیران اور مجاہد لڑائی کی تیاریاں کر کے ایک زبردست فوج کو لئے ہوئے قرطبہ کی طرف روانہ ہو گئے، اہلِ قرطبہ نے شہر میں ہنگامہ کر کے اُن کی مدد کی، اور یحییٰ بن حمود کے بربر سپہ سالار کو شہر سے نکال دیا، اور اُس کے بہت سے آدمیوں کو بھی قتل کر دیا، قرطبہ کے لوگوں نے اب خیران اور مجاہد کے لئے شہر کے دروازے کھول دیئے، لیکن جب حکومت

---

[1] حمیدی۔ جسے اور عرب مورخوں نے بھی نقل کیا ہے۔

کا سوال پیدا ہوا کہ کون بادشاہ بنے تو خیران اور مجاہد آپس میں لڑ پڑے، خیران اِس خوف سے کہ مجاہد کا فریق اُس کو دغا نہ دے فوراً المریہ واپس چلا آیا (۱۲ ارجون ۱۰۲۶ء ۲۲ ربیع الآخر ۴۱۷ھ)

خیران کے چلے جانے کے بعد مجاہد کچھ دنوں اور قرطبہ میں ٹھہرا رہا، لیکن آخر کار بغیر وہاں کا بادشاہ بنے دانیہ واپس چلا آیا، اِس کے چلے جانے پر قرطبہ کی مجلسِ انتظامی نے وہی طرزِ حکومت اختیار کرنا چاہا جو تجربہ سے ناممکن ثابت ہو چکا تھا، بنی اُمیہ میں سے کسی ایسے شخص کا خلیفہ ہونا جس کی مدد پر غیر ملک کی تنخواہ دار سپاہ نہ ہو، اور اِس کے ساتھ رعایا کا دو ایسے فریقوں میں منقسم ہونا جن میں مصالحت خارج از امکان ہو، یہ دونوں صورتیں ایسی تھیں کہ عوام الناس کی عادت اور اُمرا کی سازش سے خلیفہ کا جلد خاتمہ ہو جانا لازمی تھا، مستقل حکومت کو پھر سرسبز کرنے کے لئے بنی اُمیہ میں سے کسی کو تخت نشین کرنا ایک خطرناک بات تھی، لیکن اِس کے سوا کوئی دوسری صورت ایسی نہ تھی جو تجویز کی جا سکتی، مجلسِ انتظامی کا سب سے معزز رکن ابو الحزم ابنِ جَہور تھا بنی اُمیہ سے کسی کو بادشاہ بنانے کی تجویز اُس نے بہت پسند کی، چنانچہ سرحدی اُمراء سے اِس بارے میں مشورہ بھی کیا، اِن سرحدی اُمرا میں سے کوئی بنی اُمیہ سے اور کوئی صقالبہ میں سے کسی شخص کو بادشاہ بنانا پسند کرتا تھا، لیکن بربر سے نفرت اور عداوت رکھنے میں سب ایک تھے، بہت کچھ خط و کتابت کے بعد سرحدی اُمرا میں سے بعض نے بنی اُمیہ میں سے ایک شخص کو بادشاہ بنانا منظور کر لیا غالباً اِس وجہ سے کہ آخر میں اِس تجویز کے ناکام رہنے کا اُن کو پورا یقین تھا۔ (۵۸۵

غرض یہ قرار پایا کہ عبد الرحمٰن رابع (المرتضٰی) کے بھائی ہشام کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے، ہشام، البنت میں سکونت رکھتے تھے، جہاں وہ اپنے بھائی عبد الرحمٰن رابع کے قتل ہونے کے بعد چلے آئے تھے، اپریل ۱۰۲۷ء میں ماہ ربیع الاوّل ۴۱۸ھ میں قرطبہ کے لوگوں نے اُن سے بیعت کر لی، اِن مشکلات کے طے کرنے میں تین برس صرف ہوئے تھے، اِس زمانہ میں ہشام ثالث جنھوں نے خلیفہ ہو کر المعتد (یا المعتمد) کا لقب

اختیار کیا، شہر شہر پھرتے رہے، اکثر والیانِ علاقہ جات بیچ میں اُن کا راستہ روکتے تھے، آخر کار قرطبہ کے لوگوں نے ایک دن سُنا کہ ہشام شہر میں داخل ہونے والے ہیں، قرطبہ کی مجلسِ انتظامی نے شاہانہ طریقے پر اُن کے استقبال کا اہتمام کیا، ۱۸ر دسمبر ۱۰۲۹ء یعنی ۸ر ذی الحجہ ۴۲۰ھ کو خبر آئی کہ آج قرطبہ کے باہر سواری آن پہنچی ہے، فوجیں شہر سے باہر استقبال کو نکلیں اور سارا شہر خوشی کے نعروں سے گونجنے لگا، بازاروں میں ہزارہا آدمی ہشام کے دیکھنے کو جمع ہو گئے، سب منتظر تھے کہ خلیفہ کا جلوس بڑی شان کا ہوگا، لیکن جب ہشام کو دیکھا تو لوگ مایوس ہو گئے، ہشام ایک بہت ہی دُبلے، سوکھے، اور خستہ حال گھوڑے پر سوار تھے، اور کپڑے ایسے معمولی قسم کے پہنے ہوئے تھے جو خلیفہ کی شان اور رُتبہ کو نہیں پہنچتے تھے، اِن باتوں نے لوگوں پر اچھا نقش پیدا نہ کیا، پھر بھی اُن لوگوں نے جو سمجھتے تھے کہ بد عملی کا زمانہ اب دُور ہو جائے گا اور ایک مستقل اچھی حکومت قائم ہو جائے گی، ہشام کا خیر مقدم بہت خوش ہو کر کیا۔

ہشام ثالث المعتد اِس لائق نہ تھے کہ اُن کی ذات سے یہ اُمید کہ بد عملی دور ہو جائے گی پُوری ہو جاتی، دِل کے اچھے تھے، مگر مذبذب، کاہل، اور آرام طلب تھے، جس روز شہر میں قدم رکھا، مجلسِ قرطبہ کے ارکان سمجھ گئے کہ انتخاب میں غلطی ہوئی، تخت والے (۵۸۰ کمرے میں ایک بڑا دربار ہوا، عہدہ دارانِ اعلیٰ کو خلیفہ کے حضور میں پیش کیا گیا، ہشام دربار کی رسوم اور تقریروں سے واقف نہ تھے، بوڑھے آدمی تھے، تقریر کے جواب میں دو چار لفظ وہ بھی اٹک اٹک کر کہے، اور پھر خاموش ہو گئے، ایک وزیر نے اُن کی طرف سے جوابی تقریر پُوری کی، جس وقت شعراء نے اِس موقع کی یادگار میں قصیدے پڑھے تو ہشام نے ایک لفظ بھی تعریف کا نہ کہا، بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شاعروں کا کلام سمجھتے ہی نہیں۔

بہرکیف ہشام کا یہ آغاز دیکھ کر اچھی اُمیدیں منقطع ہو گئیں، اور حالت اُس وقت اور بھی بدتر ہوئی جب کہ ہشام نے حکم بن سعید کو اپنا حاجب مقرر کیا، حکم موالی بنی عامر سے تھا، اور قرطبہ میں جولاہے کا پیشہ کیا کرتا تھا، قرطبہ میں اُس سے اور ہشام سے دوستی

پیدا ہوئی تھی، اُموی شہزادے اکثر مصلحت سمجھ کر ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے موانست پیدا کر لیتے تھے، خانہ جنگی کے زمانہ میں حکم بن سعید نے سپاہی کا پیشہ اختیار کیا تھا، اِس وجہ سے دلیر اور فوجی کاموں میں ہوشیار تھا، فوج میں آکر جلد ترقی کی، سرحدی سرداروں کی ماتحتی میں ایسے کام کئے تھے کہ یہ لوگ اُس کی عزت کرنے لگے تھے، ہشام جب خلیفہ ہوئے تو حکم بن سعید اُن کے پاس حاضر ہوا، اور پُرانی دوستی یاد دلائی، رفتہ رفتہ خلیفہ کے دِل میں ایسی رسائی پیدا کی کہ وزیر ہو گیا۔

حکم بن سعید نے وزیر ہو کر پہلا انتظام یہ کیا کہ شاہی دسترخوان پر لذیذ سے لذیذ کھانے اور عمدہ شرابیں چُنی جایا کریں، گانے ناچنے والیاں برابر حاضر رہیں سب سے زیادہ تن دہی اِس میں دکھائی کہ خلیفہ کے لئے سامانِ عیش و نشاط میں کسی طرح کی کمی نہ ہونے پائے۔ ہشام المعتد طبیعت کے کمزور تھے، اختیاراتِ شاہی کی مطلق پروانہ کرتے تھے، سلطنت کا کام کرنے سے اُکتاتے تھے اور چاہتے تھے کہ اِس قسم کی ذمہ داری جس قدر جلد سر سے ٹل سکے ٹل جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے بہت خوشی سے سلطنت کا کاروبار حکم بن سعید کے سپرد کر دیا۔

حاجب حکمؔ بن سعید کو معلوم ہوا کہ خزانہ خالی ہے، محاصل ملکی جو قانوناً وصول ہوتے تھے وہ مصارف کے لئے کافی نہ تھے، زیادہ روپے کی ضرورت تھی، ملک کی آمدنی میں اضافہ ہوتا تو کیونکر ہوتا، یہ معلوم ہی تھا کہ اگر نئے محصول جاری کئے گئے تو رعایا اس سے ناراض ہو جائے گی، اِس لئے زر کشی کی صورتیں دوسری پیدا کیں، مگر وہ ایسی نہ تھیں جنھیں قطعی طور پر جائز کہا جاتا، لیکن ضرورتوں نے انہیں اختیار کرنے پر مجبور کیا، مظفر عامری کے لڑکوں نے کچھ ذخائر اپنے دوستوں کے پاس بطور امانت کے رکھ دیئے تھے، حاجب حکمؔ کو خبر لگی تو اُس نے وہ ذخیرے ضبط کر لئے، اور قرطبہ کے چند بڑے تاجروں کو بلا کر مجبور کیا کہ وہ اِن ذخیروں کو بہت گراں قیمت ادا کر کے خرید لیں، خانہ جنگی کے زمانہ میں جو بڑے بڑے محل اور قصور ڈھائے گئے تھے اُن کے ملبے میں سے لوہے اور سیسے کا جس قدر سامان نِکلا تھا وہ بھی اِن تاجروں کے ہاتھ جبراً

فروخت کیا گیا، لیکن جو روپیہ اس طرح وصول ہوا وہ بھی مصارف کے لئے کافی نہ ہوا، اور اب حاجب حکمؔ ابنِ جیّار کی طرف متوجہ ہوا، ابن جیار اگرچہ فقیہہ تھے مگر لوگ اُن سے خوش نہ تھے، ایک موقع پر اُنہوں نے خلیفہ علی بن حمود کو ایک تدبیر ایسی بتائی تھی جس سے خزانہ میں روپیہ تو خوب پہنچ گیا تھا لیکن وہ تدبیر فی نفسہ نہایت فضیحت کے قابل تھی۔ اب حاجب کی ضرورتوں پر نظر کر کے ابنِ جیّار نے مساجد کے سرمایہ کو نقصان پہنچا کر ایک بہت بڑی رقم ملک کے مالیہ میں اضافہ کر دی، مگر بھید کھل گیا، اور قرطبہ کے لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، خاص کر فقیہوں کو سخت شکایت پیدا ہوئی، مگر باوجود اس کے کچھ دنوں بعد اُنہی فقیہوں نے جن کو شکایت پیدا ہوئی تھی، اپنی تنخواہوں میں اضافہ منظور کر لیا، درحالیکہ جانتے تھے کہ یہ اضافہ خلاف قانون محصولوں کے روپیہ سے ادا کیا جائے گا۔

حاجب حکمؔ کو فقہا پر بہت غصّہ آیا، اور اُس نے ایک محضر نہایت سخت الفاظ میں اُن کی نسبت شائع کیا، یہ محضر ابو عامر ابنِ شہید نے لکھا تھا، جون ۱۰۳۰ء (جمادی الآخر ۴۲۱ھ) میں وہ قصرِ خلافت اور جامع مسجد میں پڑھا گیا، فقیہوں کو اعتراضوں پر بہت ملال ہوا، اور اب انہوں نے عوام میں ایک ہیجان پیدا کر کے حاجب حکمؔ کے خلاف سازش کرنی چاہی، لیکن عوام کو اُس وقت کوئی خاص شکایت نہ تھی، اس لئے فقیہوں کو کچھ کامیابی نہ ہوئی، حکومت نے سختی سے کام لیا، اور وزیروں میں سے ایک وزیر کو جو حاجب کے خلاف سازش میں شریک ہوا تھا قتل کرا دیا، ابو عامر ابنِ شہید نے فقیہوں پر تشدد شروع کیا اور کہا کہ "اِن لوگوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے، میں اپنے نیش زبان سے اُن کی حقیقت کھولتا رہوں گا۔"

اگر حاجب حکمؔ کو صرف فقیہوں سے مقابلہ کرنا ہوتا تو اُس پر کوئی غالب نہ آسکتا کیونکہ فقیہوں میں اب اتنی جان نہ تھی کہ حکمؔ کو نقصان پہنچا سکتے، لیکن حکمؔ کے دشمن اور لوگ بھی تھے جو بہت خطرناک تھے، اُمرائے دربار اُس سے دشمنی رکھتے تھے، حکمؔ کا ایک ادنیٰ اپیشہ ور قوم سے ہونا ایسا داغ تھا جو اُمرا کی نظر سے کبھی دُور نہ ہو سکتا

تھا، وہ معتمد کے پاس حاجب حکم کو ایک نو دولت سپاہی نہیں بلکہ حقیقت میں نِرا جولاہا ہی جانتے تھے، اور رُتبے میں اُس کو محمد (ثانی) المستکفی کے وزیر کے برابر سمجھتے تھے،[1] مگر مستکفی اور معتمد کے وزیروں میں بڑا فرق تھا، مستکفی کا وزیر بالکل ہی جولاہا تھا، اور معتمد کے وزیر نے اپنی زندگی کا بہترین حصّہ لشکر گاہوں اور سرحدی والیانِ ملک کے درباروں میں گذارا تھا، اُمرائے سلطنت کو اس کی پروا نہ تھی کہ خزانہ روپیہ سے کس طرح پُر کیا گیا ہے، اگر انہی میں سے کوئی روپیہ فراہم کرنے کے وہ ذریعے اختیار کرتا جو حاجب حکم نے مجبور ہو کر کئے تھے تو اُسے معاف کر دیتے، لیکن چونکہ حکم ایک ادنیٰ طبقہ کا آدمی تھا، اس لئے جب اِن اُمراء کو اصلی حالات معلوم ہوئے کہ خزانہ میں روپیہ کیونکر فراہم کیا گیا ہے، تو اُنہوں نے حکم پر سخت اعتراض کر کے اپنا دِل ٹھنڈا کیا، لیکن اُمرا نے جو طریقہ مخالفت کا اختیار کیا وہ خود اُن کے لئے مُضر تھا، شروع میں حکم نے اُن کی جانب کسی طرح کی دشمنی ظاہر نہ کی، اور اُس نے دیدہ دانستہ اپنے تعلقات اُن سے منقطع نہ کئے، ابنِ شہید کو جو ارکانِ سلطنت میں سے تھا حاجب حکم نے اپنا دوست اور معتمد علیہ بنایا، لیکن جب اُسے معلوم ہُوا کہ اُمراء اور اراکین اُس کی مہربانیوں کا بدلہ صرف نفرت اور عداوت سے کرتے ہیں تو اُس کو بُرا معلوم ہوا، چنانچہ طبقۂ عوام سے انتخاب کر کے اپنے لئے ملازمین مقرر کرنے لگا، جن لوگوں کو نوکر رکھتا تھا وہ پہلے ہی سمجھ لیتے تھے کہ اُمرائے سلطنت اُن سے دشمنی کریں گے۔ ۵۸۸ء

ان امیروں کا قول تھا کہ "حاجب حکم ایسے لوگوں کو نوکر رکھتا ہے جو نوجوان بے سروسامان جولاہے یا بے دین بدمعاش ہوں، جنہیں سوائے شراب، اور چھوٹوں اور بہت نعولا کے دوسری چیز سے مطلب نہ ہو، قابل اور لائق لوگوں کا مضحکہ اُڑائیں، اور جو بد نصیب اُن سے انصاف کا خواستگار ہو اُس کو ستائیں" حاجب حکم کی نسبت کہتے تھے کہ "وہ بیوقوف، مکّار، اور بزدل ہے، گھوڑے کی سواری اُسے البتہ اچھی آتی ہے، اس کے

---

[1] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۵۸۳

سوا بالکل کورا ہے"۔ جو لوگ ایسا کہتے تھے غالباً دشمنی نے انہیں اندھا کر دیا تھا، بہرکیف عمائدِ سلطنت نے حاجب حَکَم کو اُس کے مرتبہ سے گرانے میں جو طریقہ اختیار کیا وہ بُری قسم کا تھا۔

پہلے اُمراءِ دولت نے لوگوں کو اس بنا پر فساد اُٹھانے کی ترغیب دی کہ تجارت میں جو کمی واقع ہوئی ہے وہ نئے محصولوں کے جاری ہونے سے پیش آئی ہے، اور یہ نئے محصول حاجب حَکَم کے جاری کئے ہوئے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ تجارت کی کمی کا باعث دُوسرے ہی مصائب تھے۔

غرض اس مسئلہ پر بحثیں ہونے لگیں، اور نتیجہ ان بحثوں کا اُمراء کے حق میں مفید پیدا ہوا، اور ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا جنہوں نے اُمراء سے وعدہ کر لیا کہ وہ حاجب حَکَم کے مکان پر حملہ کریں گے، حاجب حَکَم کو اس کی خبر لگ گئی اور وہ اپنا مکان چھوڑ کر خلیفہ کے قصر میں جا رہا۔

اب حَکَم نے جو محصول اضافہ کئے تھے اور اُن پر اعتراض کیا جاتا تھا موقوف کر دیئے اور ایک بڑے محضر کے ذریعے رعایا کو مطلع کیا کہ خزانے کی ضروریات پر نظر کر کے یہ زائد محصول جاری گئے تھے، آئندہ یہ محصول بند کر دینے کی کوشش کی جائے گی۔

رعایا یہ محضر دیکھ کر مطمئن ہو گئی، اب اُمراء نے دوسرا طریقہ اختیار کیا، حاجب حَکَم کو اندلسی نوجوں پر بھروسا نہ تھا، کیونکہ یہ فوجیں اُمراء کی طرف دار تھیں، اس وجہ سے اُس نے بربر کی فوجیں مرتب کرنی چاہیں۔ اس پر اندلسیوں کو شکایت پیدا ہوئی، اُمراء نے اُن کو اور بھڑکایا، حاجب حَکَم کو معلوم ہو گیا، اُس نے فوج والوں پر قواعد کی پابندی میں سختی کی، اور جو اُن میں سرغنے تھے اُن کی تنخواہیں بند کر دیں۔

جب اُمراء کی یہ تدبیر بھی نہ چلی تو انہوں نے ہشام المعتد کو حاجب کی طرف سے بدگمان کرنا چاہا، اس میں بھی وہ کامیاب نہ ہوئے، کیونکہ حاجب کو ہشام کی طبیعت پر جو قابو حاصل تھا وہ ان امیروں کو نہ تھا، چنانچہ ہشام کی طرف سے ان اُمراء کو حکم ہوا کہ قصرِ خلافت میں قدم نہ رکھیں، البتہ ابن جہور جو مجلسِ سیاسی کا صدر تھا کسی قدر

ہشام کی طبیعت میں دخل رکھتا تھا، کیونکہ حقیقت میں ابنِ جہور کی بدولت ہشام المعتد کو تخت یا یہ کہئے کہ عیش وآرام کی زندگی نصیب ہوئی تھی، ہشام اسی وجہ سے ابنِ جہور کی بہت عزت کرتے تھے، اور اُس کا احسان مانتے تھے۔ حاجب حَکَم نے کوشش کی کہ ابنِ جہور کو معزول کرادے، لیکن اس کی کوشش بیکار ثابت ہوئی، گر حَکَم نے ہمت نہ ہاری، اور ہشام سے ہمیشہ یہی عرض کرتا رہا کہ ابنِ جہور کو معزول کر دیا جائے، حاجب حَکَم کو اُمید تھی کہ ہشام کو ابنِ جہور کے برطرف کرنے میں جو کچھ تذبذب اِس وقت ہے وہ ایک نہ ایک دن دُور ہو جائے گا۔

ابنِ جہور بھی اِن حالات کو خوب سمجھ رہا تھا، اور جانتا تھا کہ اُس کے اقتدار میں اب زوال آچلا ہے، پس اُس نے ارادہ کر لیا کہ نہ صرف حاجب حَکَم سے پیچھا چھڑا یا جائے بلکہ خلافت کا بھی کام تمام کر کے مجلسِ سیاسی کو کُل سفید وسیاہ کا مالک بنا دیا جائے، ابنِ جہور کے دوستوں نے بھی اِس رائے سے اتفاق کیا، لیکن سوال یہ تھا کہ اِس کام میں حصّہ لینے والے کیونکر پیدا کئے جائیں؟ سب میں بڑی مشکل اِس ارادہ کو عمل میں لانے کی یہی تھی۔ ۵۸۹ھ

بہت لوگ ایسے تھے جو ہشام المعتد کو تخت سے اُتارنے کے لئے کسی بات سے دریغ نہ کرتے، لیکن مجلس سے باہر کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کے خواب وخیال میں بھی یہ گذرتا ہو کہ بادشاہی کو ترک کر کے اُس کی جگہ اُمرائی حکومت قائم کی جائے، کیونکہ بادشاہی طرزِ حکومت کا سب کے دلوں پر ایسا نقش تھا کہ وہ کسی طرح نہ ہٹ سکتا تھا، اراکینِ مجلس نے ضروری سمجھا کہ اپنے ارادے کو مخفی رکھیں، اب اُنہوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ ہشام المعتد کی جگہ کسی دوسرے شخص کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں، اور اِس غرض سے ہشام کے ایک رشتہ دار سے جس کا نام اُمیہ تھا گفتگو شروع کی، یہ اُمیہ ایک کم عقل، جاہ پسند اور ناعاقبت اندیش سا آدمی تھا، ارکانِ مجلس سیاسی نے اُس کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ اگر وہ سرگروہ بن کر بغاوت کرادے گا تو تخت کا مالک ہو جائے گا، اُمیہ اِس بات کو بالکل نہیں پہنچا کہ مجلسِ سیاسی کے لوگ محض

اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے اُسے ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں، اور جس وقت اپنا مطلب نکل جائے گا تو پھر اُس کی بات تک نہ پوچھیں گے۔

غرض اُمیہ نے ارکانِ مجلس کی رائے کو بہت خوش ہو کر سنا، چونکہ ہاتھ کا سخی تھا، فوج والوں کو جن کی تنخواہیں بند تھیں اپنی طرف کر لیا، دسمبر ۱۰۳۱ء (ذی الحجہ ۴۲۲ھ) میں فوج کے چند سپاہی کمین گاہ میں بیٹھ گئے، اور جس وقت حاجب حَکَم قصر سے نکلا، تو اس قدر جلد اُسے قتل کر دیا کہ وہ اپنی تلوار تک نیام سے باہر نہ کھینچ سکا، ان سپاہیوں نے حَکَم کا سر اُس کی لاش سے کاٹ لیا، یہ سر خاک و خون میں اس قدر آلودہ تھا کہ صورت پہچاننی مشکل تھی، ایک ماہی گیر کے لگن میں اُسے دھویا اور پھر نیزہ کی انی پر لگا کر اُسے اونچا کیا۔

اُمیّہ کے ساتھ فوج کے لوگوں اور شہر والوں کا ایک بڑا انبوہ تھا، اُمیّہ نے اب اس گروہ کی نقل و حرکت کو اپنے اختیار میں کر لیا، ہشام المعتد نے جب قصر میں سپاہیوں کا شور سنا تو وہ گھبرا کر مع مستورات اور چار صقلبی ملازموں کے ایک اونچے برج پر چڑھ گئے اور اوپر ہی سے باغیوں سے جو اب قصر کے اندر داخل ہو گئے تھے کہا کہ

"تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی، اگر تمہیں کوئی شکایت ہے تو ہمارے وزیر سے کہو وہ تمہارے ساتھ انصاف کرے گا"۔

بلوائیوں نے نیچے سے شور مچا کر کہا "اپنے وزیر کا حال دیکھنا ہو تو دیکھ لو"۔

ہشام نے نیزے کے پھل پر ایک کٹا ہوا سر دیکھا، بلوائی پکار پکار کر کہتے تھے "اُس خبیث وزیر کا کٹا ہوا سر دیکھ لو جس کے ہاتھ میں تم نے رعایا کو دے رکھا تھا"۔

ہشام المعتد نے وحشی بلوائیوں کے غصہ کو فرو کرنا چاہا، مگر انہوں نے ہر بات کا جواب دشنام اور توہین سے کیا، بلوائیوں کا ایک گروہ حرام سرا میں داخل ہو گیا اور جو کچھ بھی وہاں اُٹھائے جانے کے قابل تھا یہ بلوائی اُسے اُٹھا لے گئے، یہاں ان کو چند زنجیریں ایسی ملیں جو سرکش اور متمرد امراء کو باندھنے کے لئے حَکَم نے بنوا رکھی تھیں، اُمیّہ نے بلوائیوں کی ہمت اور بڑھائی اور اُن سے کہا "دوستو! یہاں جو کچھ (۵۹۰)

ہے سب تمہارا ہے، خوب جی کھول کر دولت لوٹو، اور پھر اِس اُوپر والے بُرج میں جا کر میری خاطر سے اِس بدبخت ہشام کو قتل کر ڈالو۔"

بلوائیوں نے بُرج پر چڑھنا چاہا، مگر وہ بہت اُونچا تھا، ہشام المعتد نے ایسے لوگوں سے مدد مانگی جو لوٹنے میں شریک نہ تھے، لیکن اِن لوگوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اُمیہ اِس یقین کے ساتھ کہ وزراء اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے قصر کے بڑے کمرے میں آیا، ہشام کی مسند پر بیٹھا، بلوائیوں کے سردار اُس کے گرد موجود تھے، اُمیہ نے اِن سرداروں کو ابھی سے بڑے بڑے عہدے دیئے اور احکام اِس طرح جاری کرنے شروع کئے کہ گویا اب وہ خلیفہ ہے، ایک شخص نے جو اُس کے قریب کھڑا تھا کہا کہ "ہم کو تمہاری جان کا خوف ہے، کیونکہ خوش نصیبی تمہارے خاندان سے رُخصت ہو چکی ہے۔" اُمیہ نے جواب دیا "کچھ پروا نہیں، آج مجھے تخت پر بیٹھ لینے دو، کل جان سے مار ڈالنا۔" لیکن اِس نوجوان اُمیہ کو معلوم نہ تھا کہ ابنِ جہور کے مکان پر اِس وقت کیا واقعات پیش آ رہے تھے؟

جس وقت بلوہ شروع ہوا تو مجلسِ سیاسی کے صدر ابنِ جہور نے ارکانِ مجلس کو اِس امر میں مشورہ کے لئے طلب کیا کہ اب وہ کیا تدبیریں ہیں جنہیں اختیار کرنا مناسب ہوگا حاضرین نے فوراً فیصلہ سُنایا، اور قصرِ خلافت کی طرف مع فوج اور اپنے موالی و ملازمین کے روانہ ہو گئے، قصر پر پہنچتے ہی حکم دیا کہ "لوٹ فوراً بند کی جائے، ہم ذمہ لیتے ہیں کہ ہشام المعتد خلع خلافت کریں گے۔"

اتنا سُن کر بلوائیوں نے یا تو وزیروں کے چلے آنے سے خائف ہو کر، یا فوج جو ساتھ تھی اُس کے حملے کے ڈر سے، یا محض اِس وجہ سے کہ لوٹنے کو اب کچھ باقی نہ رہا تھا لوٹ بند کر دی، اور تھوڑی دیر میں امن ہو گیا۔

اب وزیروں نے ہشام المعتد سے چلا کر کہا کہ "وہ نیچے اُتر آیئے اور خلع خلافت کیجئے، جان آپ کی سلامت رکھی جائے گی۔" ہشام بہت کچھ تذبذب کے بعد مجبور ہوئے کہ اپنے آپ کو وزراء کے حوالے کر دیں، بُرج میں رہنا ممکن نہ تھا، کیونکہ وہاں

کھانے پینے کا کوئی سامان نہ تھا، ہشام المعتد بُرج سے نیچے اُترے، وزراء نے اُن کو اور اُن کی مستورات کو جامع مسجد قرطبہ کے ایک دالان میں نظربند کر دیا۔

ہشام المعتد جس وقت راستہ میں تھے تو کہنے لگے کہ "ان آفات میں مبتلا ہونے سے تو میں سمندر میں غرق ہو جانا بہتر سمجھتا ہوں، جو کچھ تم لوگوں کو میرے حق میں کرنا ہے وہ کرو لیکن میری جان بچا دو"۔

جب رات ہوئی تو وزیروں نے قرطبہ کے عمائد کو جامع مسجد میں طلب کیا، تاکہ ہشام المعتد کے بارے میں کوئی امر طے کریں، سب لوگ آئے اور یہ فیصلہ کیا کہ ہشام کو ایک قلعہ میں قید کر دیا جائے۔

اس فیصلے پر عمل کرنے کے لئے جس وقت جامع مسجد کے رواق میں جہاں ہشام نظربند کئے گئے تھے لوگ داخل ہوئے تو ایک عجیب دردناک حالت نظر آئی، دیکھا کہ ہشام پتھر کے فرش پر بیٹھے ہیں، گرد بیویاں بیٹھی رو رہی ہیں، کپڑے تن پر کافی نہیں ہیں اور بال پریشان ہیں، ہشام کی نظر سے ناامیدی ظاہر ہے، اور اپنی اکلوتی بیٹی کو جسے وہ بے حد چاہتے تھے، گرم رکھنے کے لئے اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، ۱۵
یہ لڑکی اس قدر کم سن تھی کہ باپ کی مصیبتوں کو سمجھ نہ سکتی تھی، تاریک مکان کی رطوبت اور سرد ہوا سے معصوم بچی کانپ رہی تھی، کیونکہ رات سرد تھی، اس کے علاوہ بھوک سے جان آدھی ہو گئی تھی۔

معلوم نہیں محض غفلت سے یا ظلم اور ایذا رسانی کے قصد سے اِن مصیبت زدہ قیدیوں کو کھانے پینے کی کوئی چیز اب تک نہیں پہنچائی گئی تھی، جو شیوخ رواق میں آئے تھے اُن میں سے ایک شیخ نے معزول خلیفہ سے کہا کہ "جامع مسجد میں وزراء اور اُمراء جمع ہوئے تھے، اُنہوں نے جو کچھ حکم آپ کے بارے میں دیا ہے وہ ہم آپ کو سُنانے آئے ہیں"۔ ہشام نے قطع کلام کر کے کہا "یہ سب درست ہے، جو کچھ اُن کا حکم ہے وہ میں بجا لانے کو تیار ہوں، لیکن اس سے پہلے برائے خدا ایک ٹکڑا روٹی کا لا دو کہ اس بچی کو کھلا دوں جو بھوک سے مری جاتی ہے"۔ شیوخ یہ سُن کر

بسجد متاثر ہوئے اُن کی آنکھوں میں آنسو ٹپکنے لگے - فوراً کھانا حاضر کیا گیا، اور جس شیخ نے گفتگو کی تھی اُس نے کہا "حضور کے حق میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ آج صبح ہوتے ہی ایک قلعے میں پہنچا دیے جائیں اور وہیں آپ حراست میں رہیں"

ہشام نے صبر و شکر کے ساتھ نہایت افسردہ ہو کر کہا "اچھا یہی سہی، مگر میرے حال پر اتنی مہربانی اور کرو کہ ایک چراغ لا دو، کیونکہ اس کمرے کا اندھیرا مجھے بہت تکلیف دے رہا ہے"

دوسرے دن جب ہشام المعتد قرطبہ سے روانہ کر دیے گئے تو وزراء نے ایک اشتہار اہلِ شہر کے نام اِس مضمون کا جاری کیا کہ "خلافت برخاست کی گئی - اور عنانِ حکومت آئندہ مجلسِ سیاسی کے سپرد رہے گی۔

اِس اشتہار کے جاری کرنے کے بعد وزراء قصرِ خلافت میں گئے، اُمیّہ ابھی تک وہیں تھا - وزراء نے جو وعدے خفیہ طور پر اُس سے کئے تھے اُن پر ابھی تک اُسے بھروسا تھا، اِسی بنا پر شہر کے عہدہ داروں کو اپنی بیعت کے لئے وہاں جمع کر رکھا تھا - لیکن اب اُمیّہ پر وزیروں کا دھوکا کھُل گیا، اِن وزیروں نے اہلِ فوج اور شہر کے لوگوں کو اس بات پر سخت و سست کہا کہ اُمرائے دولت کا فیصلہ سُننے سے پہلے ایک آوارہ گرد کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں کیوں اُنہوں نے ایسی عجلت ظاہر کی؟ اس کے بعد وزیروں نے کہا کہ "اُمراء نے رعایا کی رضامندی سے بادشاہی طرزِ حکومت کو منسوخ کر دیا ہے، سپاہیو! احتیاط کرو، خانہ جنگی نہ ہونے دو، اُن احسانوں کو یاد کرو جو تمہارے ساتھ کئے گئے ہیں اور اب پہلے سے بھی زیادہ اختیارات کے متوقع ہو جاؤ، بشرطیکہ سلامت روی اور عافیت پسندی پر تمہارا عمل رہے" پھر افسروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "اُمیّہ کو گرفتار کر کے قصر سے باہر کر دو، اور پھر ہماری سلطنت کی حدود سے وہ خارج کیا جائے"

یہ حکم فوراً بجا لایا گیا، اُمیّہ وزیروں کا حکم سُن کر غصہ سے بیتاب ہو گیا اُس نے قسم کھائی کہ اِن عہد شکن لوگوں سے ایک دِن بدلہ ضرور لوں گا، اُنہوں نے

پہلے قلعدار ہیں پیدا کرائیں اور پھر ایک مجرم کی طرح اُسے ملک سے نکال دیا بعض عہدہ داروں کو اُس نے اپنا ہمدرد بنانا چاہا، مگر یہ لوگ مجلس سیاسی کے احکام کی تعمیل کرتے آئے تھے، اُمیّہ کے دعووں یا لعنت و ملامت نے اُن پر کچھ اثر نہ کیا۔

اُمیّہ کا حال ٹھیک طور پر دریافت نہیں ہوتا کہ آخر کار اُس کا کیا درجہ ہوا؟ کچھ دنوں تک اُس کی نسبت کوئی خبر سُننے میں نہیں آئی، مگر پھر کچھ زمانے کے بعد اُس نے قرطبہ واپس آنے کی کوشش کی، بعض مؤرخ لکھتے ہیں کہ اِسی وجہ سے وزیروں نے (۹۲۱) خفیہ طور پر اُسے قتل کرادیا۔

ہشام المعتد جس قلعے میں قید تھے وہاں سے نکل کر شمالی اسپین کے شہر لاردہ میں چلے گئے۔ لاردہ میں اس وقت سلیمان بن ہود حکومت کرتا تھا، ایک عہد نویس مؤرخ نے لکھا ہے کہ مجلس سیاسی نے یا تو بھول یا بے پروائی سے خلع خلافت کے وثیقہ پر ہشام المعتد کے دستخط نہیں کرائے تھے اور نہ مجلس نے گواہوں کی موجودگی میں ہشام سے اس بات کا کوئی اقرار لیا تھا کہ سلطنت کرنے کے قابل اب وہ نہیں رہے اور رعایا اُن کی اطاعت سے بری ہے۔

یہ دونوں باتیں کسی بادشاہ کو تخت سے اُتارتے وقت عمل میں آیا کرتی تھیں مگر ہشام المعتد کے ساتھ ایک بات بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

بہرکیف کسی نے ہشام کی پروا نہیں کی، سب اُنہیں بھول گئے اور جب پانچ برس کے بعد دسمبر ۱۰۳۶ء (صفر ۴۲۸ھ) میں اُن کا انتقال ہوگیا تو قرطبہ میں کسی نے اُن کا ذکر تک نہیں کیا، قرطبہ کے علاوہ باقی اسپین کو اُن کے ساتھ اور بھی کم دل چسپی تھی۔

○

اسناد:-

ابنِ بسّام جلد ۱ ص ۸۲

ابنِ حیّان (ابنِ بسّام جلد ۱ ص ۹ تا ۱۱، ۱۱۴ تا ۱۱۵، ۱۵۷

جلد ۴ ۱۳۹ تا ۱۴۳)

ابن الاثیر

مقرّی جلد ۱ ص ۳۱۹ تا ۳۲۰

عبدالواحد ص ۳۸ تا ۴۱

روڈ ریگو دی ٹولیڈو - ۴۴۷

کتاب رابع

ملوکُ الطوائف

کتابِ رابع

مُلوکُ الطّوائِف

پہلی فصل

ابوالقاسم محمدؐ قاضی اشبیلیہ

اسلامی اسپین کے صوبوں میں سیاسی آزادی جو زبردستی اپنے بندھ گئی تھی کئی برس تک قائم رہی، ہر جگہ لوگ پریشان خاطر رہتے تھے، آئندہ کا تصور خوف و ہراس کے ساتھ کرتے اور گزشتہ واقعات کو افسوس کی نظر سے دیکھتے، صرف غیر ملکوں کے رہنے والے فوجی افسر شیرازۂ خلافت بکھرنے پر نفع میں رہے، بربر سپہ سالاروں نے اسپین کے جنوبی حصوں پر قبضہ کیا۔ صقالبہ مشرقی حصے کے مالک بن بیٹھے، باقی ملک یا تو دولت امرا کے حصے میں آیا، یا چند شریف خاندانوں میں تقسیم ہو گیا، جو خلیفہ ناصر یا حاجب منصور کے حملوں سے اتفاقیہ سلامت رہ گئے تھے، ملک کے دو بڑے نامی شہروں یعنی قرطبہ اور اشبیلیہ میں جمہوری طرز کی حکومت ہو گئی۔

بنی حمود برائے نام فریقِ بربر کے سردار مانے جاتے تھے، تمام عربی اسپین پر اُن کو حکومت کا دعویٰ تھا، لیکن واقعی اُن کے تصرّف میں صرف مالقہ کا شہر اور اُس کا علاقہ تھا۔ بنی حمود کے ماتحت سب سے زیادہ قوی غرناطہ کے حکمراں تھے یعنی زادی بن زیری بن مناد جس نے غرناطہ کو دار الحکومت بنا لیا تھا اور زادی کا بھتیجا حبوس جو زاوی کا کا جانشین ہوا، قرمونہ، مورور اور رُندہ میں بھی بربر حکومت کرتے تھے، بنی افطس جو بطلیوس میں حکمراں تھے نسلِ بربر سے تھے مگر وہ عرب بن گئے تھے اور اپنی حیثیت کسی قدر سب سے علیحدہ رکھتے تھے۔

صقالبہ میں خیران صاحب المریہ اور زہیر جو ۱۰۲۸ء (۴۱۹ھ) میں خیران کا جانشین ہوا اور مجاہد بن یوسف بن علی عامری صاحبِ دانیہ و جزائر شرقی الاندلس سب میں ممتاز تھے، مجاہد عامری نے جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا بحری سپہ سالار تھا جس طرح جزائر سردانیہ اور ساحلِ اٹلی پر حملے کرنے میں شہرت پیدا کی تھی اُسی طرح اہلِ علم و فضل کی سرپرستی میں بھی نامور ہوا تھا، خیران، زہیر اور مجاہد کے علاوہ جو صقالبہ تھے، وہ کچھ زمانہ کے لئے بلنسیہ میں حکمران رہے تھے، لیکن ۱۰۲۱ء (۴۱۲ھ) میں عبدالعزیز جو ابن ابی عامر منصور کا پوتا اور عبدالرحمٰن سنخول کا بیٹا تھا، بلنسیہ کا بادشاہ ہو گیا تھا، سرقسطہ میں بنی ہود کا شریف عربی خاندان منذر بن یحییٰ تجیبی کے انتقال پر ۱۰۳۹ء میں صاحبِ حکومت ہو گیا۔

ان کے علاوہ اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی تھیں جن سے ہم قطع نظر کرتے ہیں، انہی میں طلیطلہ کی ریاست اب تک برقرار تھی، ایک شخص یعیش نے یہاں ۱۰۳۶ء (۴۲۸ھ) تک حکومت کی تھی، یعیش کے بعد بنی ذوالنون جو ایک پرانا بربری خاندان تھا او (۵۹۲)

ل پہلا دار الحکومت مدینۃ البیرہ تھا، جب آپس کی لڑائیوں میں یہ شہر ویران ہو گیا تو اس کے بسنے والے ۱۰۱۰ء (۴۰۱ھ) میں غرناطہ جا کر آباد ہو گئے اور غرناطہ دار الحکومت ہو گیا، مدینۃ البیرہ اور غرناطہ پاس پاس واقع تھے

جس نے آٹھویں صدی عیسوی (پہلی صدی ہجری) میں فتح اسپین کے موقع پر عربوں کی مدد کی تھی ریاست طلیطلہ کا مالک ہوگیا۔

قرطبہ سے جب خلافت منقرض ہوگئی تو وہاں کے سربرآوردہ لوگوں نے ابن جہور[1] کی طرف امورِ سلطنت منتقل کرنے کا ارادہ کیا، ابنِ جہور نے پہلے تو اِس کام سے انکار کیا، مگر مجلسِ مشورت کی ضروریات کا خیال کرکے اِس شرط سے اُسے منظور کیا کہ اُن کے دو رشتہ دار محمد ابنِ عباس اور عبدالعزیز بن حسن اُن کے مشیر اور انتظامِ سلطنت میں شریک رہیں، مجلس نے ابنِ جہور کی یہ درخواست اِس شرط سے منظور کی کہ ابنِ عباس اور عبدالعزیز کو صرف مشورہ دینے کی اجازت ہوگی۔

پہلی مجلس نے قرطبہ کی جمہوری ریاست پر انصاف اور دانائی سے حکومت کی۔ قرطبہ کے لوگوں کو اب بربر کے ظلم و ستم کی شکایت نہ رہی، کیونکہ ابنِ جہور نے صدرِ مجلس ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ بربر کی فوجوں کو برطرف کر دیا، صرف بنی افرین کی فوجوں کو جو بھروسے کی تھیں قائم رکھا، بربری فوجوں کی جگہ جنہیں برطرف کیا تھا ایک نئی فوج مرتب کی، ابنِ جہور نے بظاہر جمہوری حکومت کے طریقے جاری رکھے، یعنی جب کوئی رعایت چاہتا تو جواب ملتا۔ "میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے، اِس معاملہ کا تعلق مجلس سے ہے، میں تو مجلس کا محض ایک کارگذار ہوں۔" اگر کوئی مراسلہ خاص ابنِ جہور کے نام آتا تو اُس پر کوئی کارروائی نہ کی جاتی، صرف اتنی ہدایت کر دی جاتی کہ "یہ تحریر وزراء کے نام ہونی چاہیئے۔" ہر امر کے فیصلے میں پہلے مجلس کی رائے ہمیشہ لی جاتی، ابن جہور نے کبھی بادشاہوں کے سے طور طریقے اختیار نہیں کئے، سرکاری کام کبھی قصرِ خلافت میں بیٹھ کر نہیں کیا، اپنے ہی مکان پر سب کام انجام دیتے رہے، لیکن پھر بھی اُن کے اختیارات کی انتہا نہ تھی، کیونکہ مجلس اُن کی رائے سے کبھی اختلاف نہ کرتی تھی، نہایت درجہ ایماندار شخص تھے، انہوں نے اموالِ سلطنت کبھی اپنے گھر میں نہ رکھے بلکہ اُن کو نہایت دیانت دار لوگوں کی حفاظت میں رکھا، اگرچہ کفایت شعار تھے مگر بخل کے

---

[1] ابوالحزم جہور بن محمد بن جہور بن عبداللہ بن محمد بن معمر بن یحییٰ بن ابی مغافر بن ابی عبیدہ کلبی

درجے تک نہیں، اس وجہ سے اُن کی دولت بڑھی اور شہر میں وہ سب سے زیادہ مالدار ہو گئے لیکن روپیہ کی محبت کبھی اتنی غالب نہ آئی کہ کسی امانت میں خیانت کرتے، رعایا کی فلاح و بہبود کی کوششوں میں کبھی تھک کر نہ بیٹھے۔ قریب و جوار کی ریاستوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کئے اور اس میں اس قدر کامیاب ہوئے کہ تجارت و حرفت کو جن حفاظتوں کی سخت ضرورت تھی وہ میسّر ہو گئیں، ہر چیز میں ارزانی ہوئی، باہر کے لوگ شہر میں آ کر آباد ہونے لگے اور یہاں کے بعض محلّوں کو جنھیں بربر نے شہر فتح کرنے کے بعد مسمار کر دیا تھا یا جلا دیا تھا، ان نو آباد لوگوں نے اُن کو از سرِ نو تعمیر کیا، لیکن دار الخلافت قرطبہ کو جو عظمت اور بزرگی پہلے حاصل ہوئی تھی وہ دوبارہ حاصل نہ ہو سکی، اب بجائے قرطبہ کے اشبیلیہ سب سے ممتاز شہر ہو گیا اور اب ہم جو حالات لکھیں گے، ۵۹
زیادہ تر اسی شہر کے تعلق سے لکھیں گے۔

برسوں تک اشبیلیہ کی قسمت قرطبہ سے وابستہ رہ چکی تھی، قرطبہ ہی کی مثل اس میں بھی پہلے بنو امیّہ اور پھر بنو حمود نے حکومت کی تھی، سنہ ۱۰۲۸ء/۴۱۹ھ میں جو فتنہ قرطبہ میں برپا ہوا اُس کا جواب اشبیلیہ میں بھی ہوا، قرطبہ کے لوگوں نے قاسم بن حمود ملقب بہ مامون کو اپنے صوبے سے نکال دیا، قاسم نے مجبور ہو کر اشبیلیہ میں پناہ لینی چاہی، جہاں اُس کے دو بیٹے سکونت رکھتے تھے، یہاں شہر کی حفاظت کے لئے محمد بن زیری کی ماتحتی میں جو بربر کے قبیلہ افرین سے تھا۔ بربر کی فوجیں مقیم تھیں، قاسم بن حمود نے اپنے سپاہیوں کے رہنے کے لئے اشبیلیہ کے لوگوں کو ایک ہزار مکانات خالی کرنے کا حکم دیا، اس حکم سے لوگوں میں بہت بے اطمینانی پھیلی، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ قاسم بن حمود کے سپاہی بڑے چور مشہور تھے، قرطبہ پہلے ہی بنی حمود کی اطاعت سے منحرف ہونے کی مثال پیش کر چکا تھا، اب اشبیلیہ نے بھی یہی کرنا چاہا، لیکن بربر کی فوجیں شہر میں موجود تھیں، اُن کے خوف سے شہر والوں کو کسی بات کی ہمت نہ ہوئی، لیکن قاضی شہر ابو القاسم محمد نے جو بنی عباد کے خاندان سے تھے۔ فوجِ بربر کے سالار محمد ابن زیری کو ملا لیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر اس موقع پر مدد کی تو وہ خود بہت آسانی سے اشبیلیہ کا مالک ہو جائے گا۔ ابن زیری

حکومت کے لالچ میں آ کر قاضی القاسم محمدؒ کی مدد پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے بعد قاضی ابوالقاسم محمدؒ نے قرمونہ کے بربر سپہ سالار محمد بن عبداللہ برزالی سے میل ملاپ پیدا کیا اور اب اشبیلیہ کے لوگوں نے بربر فوجوں کی مدد سے قاسم بن حمود کے دو بیٹوں کے خلاف جو شہر میں رہتے تھے ایک ہنگامہ برپا کیا اور اُن کے قصر کو جا کر گھیر لیا۔ قاسم بن حمود جس وقت اشبیلیہ پہنچے تو شہر کے دروازے بند پائے، اُنھوں نے شہر کے لوگوں سے اچھے اچھے وعدے کر کے اُن کو قابو میں لانا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ قاسم بن حمود کے دونوں بیٹے اس وقت بہت خطرے کی حالت میں تھے، آخر کار قاسم بن حمود اس شرط سے اشبیلیہ کے علاقہ کو چھوڑنے پر رضامند ہوئے کہ اُن کا کل مال و متاع اور دونوں بیٹے اُن کے سپرد کر دیئے جائیں، اہلِ اشبیلیہ یہ شرط منظور کر لی اور جب قاسم چلے گئے تو موقع پاتے ہی اُنھوں نے بربر کی فوجوں کو بھی جو شہر میں قیام کئے ہوئے تھیں شہر سے نکال باہر کیا۔

غرض اشبیلیہ نے اس طرح پھر آزادی حاصل کر لی اور اب عمائدِ شہر اس امر میں مصروف ہوئے کہ انتظام سلطنت کے لئے کوئی طرزِ حکومت قرار دیں ہنگامہ کر کے بنی حمود کو اس وقت اشبیلیہ سے نکال تو دیا تھا لیکن یہ خدشہ کہ دیکھیئے اس حرکت کا انجام کیا ہوتا ہے کسی کے دل سے دور نہ ہوا تھا، اُن کو خوف تھا کہ بنی حمود پھر اشبیلیہ کا قصد کریں گے، اور گذشتہ ہنگامے میں جو لوگ بہت سرگرم رہے تھے اُن کو سخت سزائیں دیں گے اس وجہ سے جو کچھ گذر چکا تھا اُس کی جواب دہی شہر کے بڑے لوگوں میں سے کوئی اپنے ذمّہ نہ لینی چاہتا تھا، آخر کار بہ اتفاقِ رائے ان لوگوں نے سب باتوں کا ذمہ دار قاضی ابوالقاسم محمدؒ کو قرار دیا، ابوالقاسم بہت مالدار تھے، اُن کی دولت پر شہر والوں کو رشک تھا اور جب خیال کرتے تھے کہ بنی حمود آ کر اُن کی دولت لوٹ لیں گے تو دل میں خوش ہوتے تھے۔ (٥٩٨)

غرض شہر کی حکومت اب سب لوگوں نے قاضی ابوالقاسم محمدؒ کے سپرد کرنی چاہی، قاضی ابوالقاسم حکومت کی آرزو دل میں چاہے کیسی ہی رکھتے ہوں لیکن اس موقع پر حکومت قبول کرنا مصلحت نہ سمجھتے تھے، قاضی صاحب بڑے عالی خاندان نہ تھے مالدار البتہ بہت تھے، اشبیلیہ کے علاقہ کی ایک تہائی زمین کے مالک تھے، سب لوگ اُن کی عقل و ذہانت کی

وجہ سے اُن کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن اُن کا خاندان (بنی عباد) ایسا نہ تھا جس کا شمار پُرانے وقتوں سے اعلیٰ خاندانوں میں چلا آتا ہو، یہ وہ جانتے ہی تھے کہ کوئی فوج اپنے پاس نہیں ہے، اور فوج نہ رکھنے کی صورت میں شہر کے پُرانے خاندانی اُمرا اُن کو ایک نیا اُبھرا ہُوا آدمی سمجھ کر جلد اُن کی خرابی کے درپے ہو جائیں گے، اور واقعی ہوتا بھی یہی، کیونکہ وہ عالی نسب نہ تھے، گو یہ سچ ہے کہ جب بنی عباد اپنے ہی مقاصد کے لیے پھر خلافت قائم کرنے پر کمر بستہ ہوئے تو اُنھوں نے اپنی اصل اُن لخمی بادشاہوں سے بتائی جنھوں نے کسی زمانے میں حیرہ میں حکومت کی تھی، دربار کے بھوکے شاعروں نے اس نسب کی تصدیق میں کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا، لیکن بنی عباد کے اس دعوے کا ثبوت کہ وہ ملوکِ حیرہ کی اولاد سے تھے، نہ خود اُن کے پاس اور نہ اُن کے ہوا خواہوں کے پاس موجود تھا، ملوکِ حیرہ اور بنی عباد میں جو چیز مشترک تھی وہ صرف یہ تھی کہ دونوں یمن کے قبیلہ لخم سے تھے، لیکن لخم کی جس شاخ سے بنو عباد تھے اُن کی سکونت کبھی حیرہ میں نہ رہی تھی، اُس کا وطن عرلیش تھا جو مصر اور شام کی سرحد پر صوبہ حمص کا ایک شہر تھا،[1] ملوکِ حیرہ سے اپنا نسب ملاتا تو بہت دور تھا بنی عباد اپنے شجرۂ نسب کو نعیم لخمی سے جو عطاف کا باپ تھا آگے نہ بڑھا سکے، یہ عطاف اسپین میں بلج بن بشر کے ساتھ آئے تھے جو لشکرِ حمص کا سردار تھا، عطاف کے ساتھیوں کو اشبیلیہ کے قریب رہنے کے لئے زمینیں مل گئی تھیں، خود عطاف طشانہ کے علاقہ میں ایک موضع میں جس کا نام یا مین تھا آباد ہو گئے تھے، یہ موضع وادی الکبیر کے کنارے واقع تھا،

سات پُشتوں کی کفایت شعاری اور محنت سے یہ خاندان رفتہ رفتہ گمنامی کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آیا، اور قاضی ابو القاسم محمد کے باپ اسماعیل پہلے شخص تھے جنھوں نے اس خاندان کو نامور کیا اور اُمرائے اشبیلیہ کی فہرست میں بنو عباد[2] کا نام آبِ زر سے لکھوا دیا،

---

[1] مقابلہ کرو کاسس کی کتاب جلد ۳ ص ۲۱۲، ۲۲۴

[2] عباد قاضی اسماعیل کے دادا کے دادا تھے۔

اسمٰعیل فقہ کے عالم تھے اور اُس کے ساتھ پورے سپاہی بھی تھے، خلیفہ ہشام المویدکے زمانہ میں وہ ایک فوج کے افسر اعلیٰ مقرر ہوئے تھے، اور جامع قرطبہ میں صاحب الصلوٰۃ، اور اُس کے بعد اشبیلیہ میں قاضی بھی رہ چکے تھے، علم وفضل، استواری عقل، علوہمتی، اور حُسنِ تدبیر میں مشہور ہونے کے علاوہ نہایت دیانتدار تھے، رشوت کا بازار ہر طرف گرم تھا، مگر اُنہوں نے کبھی کسی سے کوئی نذر یا انعام قبول نہیں کیا، بے انتہا فیاض تھے، اور قرطبہ سے جو لوگ خارج البلد ہوکر اشبیلیہ میں آتے تھے وہ اُن کی مہمان نوازی کے احسان مند ہوتے تھے، اِن تمام خوبیوں نے اُن کو مغربی اسپین کے سب سے بڑے شریف وکریم کے لقب سے مشہور کردیا تھا، ۱۰۱۹ء (سنہ ۴۱۰ھ) میں قاضی اسمٰعیل کا انتقال ہوگیا، اور یہ واقعہ اُس زمانہ سے کچھ زیادہ سابق کا نہیں ہے جس کے حالات ہم اب تحریر کرتے ہیں۔

قاضی اسمٰعیل کے فرزند ابوالقاسم محمد عقل ودانائی میں باپ کے برابر تھے، لیکن اخلاق (۵۹۹) اُن کی مثل نہ رکھتے تھے، خود مطلب اور جاہ طلب تھے، سب سے پہلا کام جو اُنہوں نے کیا وہ نا احسان مندی پر دلالت کرتا ہے، اُن کو اُمید تھی کہ باپ کے انتقال کے بعد باپ کی جگہ قاضی اشبیلیہ مقرر ہوجائیں گے، لیکن یہ جگہ دوسرے شخص کو مل گئی، انہوں نے قاسم بن حمود کی خدمت میں اس جگہ کے لئے عرضی پیش کی، قاسم بن حمود نے اُن کے لئے کوشش کی اور ابوالقاسم محمد اشبیلیہ کے قاضی مقرر ہوگئے، اس احسان کا بدلہ ابوالقاسم محمد نے جو کچھ کیا وہ ہم آگے پڑھیں گے۔

بہرکیف عمائدِ شہر نے اشبیلیہ کی حکومت قاضی ابوالقاسم محمد کے سپرد کرنی چاہی، مگر وہ اِن لوگوں کا مطلب سمجھ گئے اور جواب دیا کہ "یہ معزز عہدہ اُن کی عزت افزائی کا موجب ہوسکتا ہے لیکن تاوقتیکہ کچھ اور لوگ بھی حکومت میں اُن کے شریک نہ بنائے جائیں، وہ اس منصبِ عالی کو قبول نہیں کرسکتے" اُنہوں نے یہ بھی لکھا کہ "یہ شرکا، اُن کے وزیر اور مددگار ہوں گے، اور بغیر اُن کے مشورے کے وہ کوئی فیصلہ نہ کریں گے" اس جواب پر اُمرائے شہر نے کسی قدر پس وپیش کے بعد مجبور ہوکر اُن کی شرط قبول کی، کیونکہ تنہا حکومت کرنے سے قاضی صاحب کو قطعی انکار تھا، اس کے بعد اُمرا نے اُن

لوگوں کے نام دریافت کئے جن کو قاضی صاحب اپنا شریک بنانا چاہتے تھے، قاضی ابوالقاسم محمد نے چند عالی نسب لوگوں مثلاً ہوزنی اور ابنِ حجاج کے نام بتائے جو اپنے اپنے خاندان کے سردار تھے، اور ان کے ساتھ چند اور لوگوں کے نام بھی لئے مثلاً محمد ابنِ بریم الہانی، اور مشہور عالم ابوبکر زبیدی جو خلیفہ ہشام المؤید کے اُستاد رہ چکے تھے، اِن لوگوں کو قاضی صاحب نے اس لئے شریک کرنا چاہا کہ وہ اُنہی کے ساختہ پرداختہ ہوکر ہمیشہ ہم فریق رہیں گے غرض حکومت ملنے کے بعد پہلی فکر اس بات کی ہوئی کہ کسی طرح فوج مہیّا ہونی چاہیئے، بڑی بڑی تنخواہوں کے وعدوں پر عرب، بربر اور آدر قوموں کے لوگوں نے اُن کی فوجی خدمت قبول کرلی، اِن کے علاوہ بہت سے غلام خرید کر اُن کو فوجی قواعد سکھائے گئے

اسی زمانے میں قاضی ابوالقاسم محمد نے دیگر ملوک الطوائف کے ساتھ اسپین کے شمالی حصے پر فوج کشی کی، اس موقع پر قاضی صاحب کو اپنی فوج میں اضافہ کرنے کا موقع ملا، شمال مغربی اسپین کے شہر بازو سے شمال میں دو قلعوں کا محاصرہ کیا گیا، یہ قلعے دو[2] پہاڑیوں پر واقع تھے اور بیچ میں ایک خشک گہرا نالہ حائل تھا، ان قلعوں کا نام عربوں میں الاخوین (دو بھائی) تھا، جو اب بگڑ کر اسپینی زبان میں الافوئین ہوگیا ہے، یہ قلعے اسپینی عیسائیوں کے تھے جن کے بزرگوں نے ایک صلح نامہ موسیٰ ابن نصیر سے اُس زمانہ میں کیا تھا جب کہ موسیٰ نے بازو کا شہر فتح کیا تھا، لیکن یہ اسپینی عیسائی جس زمانہ کا ہم ذکر کررہے ہیں نہ تو عیسائی ریاست لیون کے ماتحت تھے اور نہ کسی مسلمان بادشاہ[5] کے، قاضی ابوالقاسم محمد نے اِن دونوں قلعوں پر قبضہ کرلیا، اور وہاں کے تین[3] سو عیسائیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا،[1] اب ابوالقاسم محمد کے پاس پانچ[5] سو سواروں کا ایک رسالہ ہوگیا۔ بہرکیف اُن کے پاس اب اتنی فوج فراہم ہوگئی کہ وہ قرب وجوار کے علاقوں پر حملہ کرسکیں (۷۰۰)

---

[1] سیلوس کے مورخ راہب نے ایک شخص سیسی نند کا ذکر کیا ہے جس نے معتضد کی ملازمت ترک کرکے فردلند اول کی نوکری کرلی تھی، اور فردلند نے اُس کو قلمریہ کا حاکم مقرر کردیا تھا، یہ سیسی نند شہر الاخوین کا عیسائی تھا۔

لیکن فوج کی تعداد ابھی ایسی نہ تھی کہ اشبیلیہ پر اگر کوئی سخت حملہ کرے تو اُس کا جواب دیا جا سکے، چنانچہ ۱۰۲۷ء (۴۱۸ھ) میں اِس کا ثبوت بھی مل گیا، حمودی خلیفہ یحییٰ بن علی اور قرمونہ کے بربر حاکم محمد بن عبداللہ برزالی نے اشبیلیہ کا محاصرہ کیا، اشبیلیہ کے لوگوں میں اتنا دَم نہ تھا کہ اِس حملے کی زیادہ مدت تک تاب لا سکتے، چنانچہ یحییٰ بن علی حمودی سے اُنھوں نے صلح کی گفتگو شروع کی، اور یحییٰ بن علی کی خلافت تسلیم کرنے پر آمادگی اِس شرط سے ظاہر کی کہ بربر اشبیلیہ میں داخل نہ ہوں، یحییٰ بن علی نے یہ شرط قبول کی، لیکن اشبیلیہ کے چند عالی خاندان نوجوان ضمانت میں طلب کئے، تاکہ اگر اشبیلیہ والے عہد شکنی کریں تو اِن نوجوانوں کو قتل کر دیا جائے۔ اِس طلبی پر سارا شہر لرز گیا، کوئی شریف گوارا نہ کر سکتا تھا کہ اپنے بیٹے کو بربر کے حوالے کر دے، اور بربر ذرا سے شبہ پر اُسے قتل کر دیں لیکن قاضی ابوالقاسم محمد کو اِس میں مطلق تذبذب نہ ہوا، اُنھوں نے اپنے فرزند عباد کو یحییٰ بن علی حمودی کے حوالے کر دیا، یحییٰ بن علی نے یہ خیال کر کے کہ ابوالقاسم محمد اشبیلیہ میں سب سے زیادہ معزز شخص ہیں، صرف اُن کے لڑکے کو ضمانت میں لینا کافی سمجھا۔

ابوالقاسم محمد کے اِس ایثار پر نظر کر کے شہر کے لوگ اور بھی اُن کی عزت اور تعظیم کرنے لگے۔ اب ابوالقاسم محمد کو نہ تو شہر کے رؤسا اور اُمرا کا کوئی خوف رہا، اور نہ یحییٰ بن علی کا جن کی خلافت کو وہ پہلے ہی تسلیم کر چکے تھے، اِس لئے خیال ہوا کہ اب تنہا حکومت کرنے کا وقت آ گیا ہے، جن مشیروں کو اُنھوں نے حکومت میں شریک کیا تھا اُن میں سے ہوزنی اور ابن حجاج کو تو مجلس سے پہلے ہی برطرف کر دیا تھا، دو مشیر جو باقی رہ گئے تھے یعنی زبیدی اور ابن بریم اُن کو اب علیحدہ کر دیا، زبیدی کو ملک بدر[۱] کیا، اور اپنا وزیر حبیب نامی ایک شخص کو جو مضافاتِ اشبیلیہ کا رہنے والا ایک معمولی خاندان کا آدمی تھا مقرر کیا، حبیب بے اصول سا آدمی تھا، لیکن جفاکش اور ذہین ہونے کے ساتھ اپنے آقا کے فائدے کا دل سے خیال رکھنے والا شخص تھا۔

اب ابوالقاسم محمد نے باجہ کے علاقے کو شامل کر کے اشبیلیہ کی ریاست کو وسعت

---

[۱] زبیدی پہلے قیروان گئے، قیروان سے المریہ گئے، اور یہاں قاضی مقرر کر دیئے گئے۔

دینی چاہی، نویں صدی عیسوی (تیسری صدی ہجری) میں شہر باجہ کو عربوں اور اسپینی مسلمانوں کے ہاتھوں بہت نقصان پہنچ چکا تھا، حال میں بربر نے محاصرہ کرکے اُس کے ایک حصے کو مسمار کر دیا تھا، اور سارے ضلع کو خوب لوٹا، جلایا، اور برباد کیا تھا، ابوالقاسم محمد نے چاہا کہ باجہ کو دوبارہ تعمیر کرے، لیکن ابومحمد عبداللہ بن مسلمہ معروف بہ ابن افطس صاحب بطلیوس مزاحم ہوا، ابن افطس نے اپنے بیٹے محمد کو جو باپ کے بعد المظفر کے لقب سے حکمراں ہوا، فوج دے کر باجہ روانہ کیا، محمد افطسی نے باجہ پہنچتے ہی اُس پر قبضہ کیا، جس وقت ابوالقاسم محمد کا فرزند اسمٰعیل اشبیلیہ کی فوج اور صاحب قرمونہ سے کمک لے کر باجہ پہنچا ہے تو محمد افطسی باجہ پر قبضہ کر چکا تھا، قرمونہ کی فوج اسماعیل کے ساتھ اس وجہ سے ہو لی تھی کہ صاحب قرمونہ اسماعیل کے باپ ابوالقاسم محمد کا دوست تھا۔

اب اسماعیل نے شہر کا محاصرہ شروع کیا، اور اپنے رسالوں کو بورہ اور ساحل بحر کے درمیان جو گاؤں اور قصبات پڑتے تھے اُن کے لوٹنے کے لئے روانہ کیا، صاحب مرتلہ ۱۰۶۰ء
ابن طیفور نے محمد افطسی کو کمک بھیجی، لیکن محمد افطسی شکست کھا گیا، اور جب اُس کی فوج کا بہترین حصہ کام آگیا تو دشمن نے اُسے گرفتار کرکے قرمونہ روانہ کر دیا

ان کامیابیوں سے ایسا دل بڑھا کہ قاضی ابوالقاسم محمد اور اُن کے دوست صاحب قرمونہ نے مل کر نہ صرف بطلیوس کے بلکہ قرطبہ کے علاقے میں بھی لوٹ مار شروع کر دی، اور قرطبہ کی گورنمنٹ مجبور ہوئی کہ مدینہ شذونہ کے بربر کو اپنی فوجوں میں بھرتی کرے، کچھ دنوں بعد لڑائی بند کرنے کا عہد و پیمان ہوا، اور صاحب قرمونہ نے قاضی ابوالقاسم محمد کی رضامندی سے محمد افطسی کو رہا کر دیا (مارچ ۱۰۳۰ء مطابق ربیع الاول ۴۲۱ھ)۔

صاحب قرمونہ نے محمد افطسی کو جس وقت قید سے رہا کیا تو اُسے ہدایت کی کہ وہ اشبیلیہ جا کر ابوالقاسم محمد کا شکریہ ادا کرے، لیکن محمد افطسی کو ابوالقاسم محمد سے حد درجہ نفرت تھی، اس لئے اُس نے جواب دیا کہ "میں آپ کی قید کو اس قاضی کے احسان سے بہتر جانتا ہوں، اگر قید سے رہائی میں آپ کے علاوہ ابوالقاسم محمد کا بھی احسان مند ہونا ضروری ہے تو جس قید میں اس وقت ہوں اُسی میں رہنا پسند کرتا ہوں"، یہ جواب سن کر صاحب قرمونہ کو محمد افطسی کا

پاسِ خاطر ہوا اور جس اعزاز کا وہ مستحق تھا اُس کے ساتھ مع محافظوں کے اُس کو بطلیوس پہنچوا دیا۔

اِس واقعہ کے چار برس بعد یعنی ۱۰۳۴ء (۴۲۶ھ) میں ابو محمد عبد اللہ معروف بہ ابنِ افطس نے جو شکستیں کھائی اُن کا بدلہ ایسے طریقہ سے لیا جس سے اُس کی طبیعت کی کوئی خوبی ظاہر نہیں ہوئی، پہلے تو ابنِ افطس نے ابوالقاسم محمد کو جب وہ علیسائی حکومت لیون کی سرحد پر فوج کشی کو اُٹھے، اپنے علاقہ میں سے فوجیں لے جانے کی اجازت دے دی، لیکن جب ابوالقاسم محمد کا فرزند اسماعیل فوجیں لئے ہوئے ایک پہاڑی درّے میں داخل ہوا جو لیون کی سرحد سے دُور نہ تھا تو ابن افطس کے سواروں نے اسماعیل پر دفعتہً حملہ کیا اشبیلیہ کی بہت سی فوج یا تو وہیں قتل ہوگئی، یا بھاگتے میں لیون کے سواروں نے انہیں تہ تیغ کر دیا، خود اسماعیل چند ہمراہیوں کے ساتھ اس تہلکہ سے جان بچا کر بھاگا، لیکن جس وقت یہ لوگ شہر لشبونہ کا رُخ کئے جاتے تھے تو اُنہیں بھوک اور پیاس کی سخت تکلیفیں پہنچیں، لشبونہ قاضی ابوالقاسم محمد کی قلمرو کی شمالی سرحد کا مشہور شہر تھا۔

غرض جس دن سے اسماعیل پر یہ آفتیں نازل ہوئیں قاضی ابوالقاسم محمد صاحب بطلیوس کے جانی دشمن بن گئے، اِن دونوں میں جو لڑائیاں ہوئیں اُن کے مفصّل حالات تو دریافت نہیں ہو سکے، لیکن یہ لڑائیاں بہرکیف اسپین کے حق میں اتنی نتیجہ خیز نہ تھیں جس قدر کہ ایک اور واقعہ تھا جس کا حال اب پیش کیا جاتا ہے۔

یہ اُوپر آچکا ہے کہ قاضی ابوالقاسم محمد نے یحییٰ بن علی حمودی کی خلافت تسلیم کر لی تھی لیکن ابوالقاسم پر ایک مدت تک اِس کا کچھ اثر نہ تھا، وہ اشبیلیہ میں بغیر کسی کی ماتحتی کے حکومت کرتے تھے، کیونکہ یحییٰ بن علی میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ اپنے حقوقِ خلافت کا کسی سے مطالبہ کر سکتے، مگر رفتہ رفتہ یہ حالت بدلی، یحییٰ بن علی نے بربر کے تمام سرداروں کو اپنا کر لیا، اور اِس طریقہ سے یحییٰ بن علی برائے نام نہیں بلکہ فی الحقیقت افریقی فریق کے قائد اور سردار ہو گئے اور قرمونہ سے وہاں کے حکمراں محمد بن عبد اللہ برزالی کو نکال کر اِس شہر کو اپنا مستقر قرار دیا، اور قرطبہ اور اشبیلیہ پر ایک ساتھ حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ ز۲۰۲

قاضی ابوالقاسم محمد کے لئے یہ خطرے کا وقت تھا، مگر اِس حالت میں اُنہوں نے ایک ایسی تدبیر سوچ کر نکالی کہ اگر ذاتی اغراض کے لئے وہ نہ سوچی گئی ہوتی تو حقیقت میں بڑی شریفانہ اور قوم کے حق میں مفید تدبیر ہوتی، سرداران بربر کو اِس بات سے روکنے کے خیال سے کہ جو اتحاد اُن میں اِس وقت پیدا ہوا ہے اُس کے بل پر کہیں وہ اُن علاقوں کو جن سے ہٹا دیئے گئے تھے پھر فتح نہ کرلیں، ضرورت تھی کہ عرب اور صقالبہ کسی ایک سردار کی ماتحتی میں متحد و متفق ہو جائیں، تاکہ ملک کو ایسی آفات سے بچائے رکھیں جیسی کہ سابق میں بربر نے برپا کی تھیں۔

قاضی ابوالقاسم محمد نے ایک بڑا گروہ قائم کرنے کی تدبیر کی جس میں افریقیوں کے تمام دشمنوں کو شامل کرکے خود اِس گروہ کا سردار بننا چاہا، اِس کام میں جو جوڑ کاڈیں تھیں اُن سے ابوالقاسم لاعلم نہ تھے، خوب جانتے تھے کہ صقالبہ کے سرداروں اور عربی شرفاء اور ارکانِ مجلسِ قرطبہ کو اُن کی طرف سے شبہ گذرے گا، اور وہ اِس کام سے اختلاف کریں گے اور اُن کے سردار ہونے کو اپنی ذلت کا باعث سمجھیں گے، لیکن قاضی ابوالقاسم اپنی مراد کو کسی قدر پہنچ گئے۔

یہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ سلیمان المستعین کے دورِ حکومت میں ہشام المؤید قصرِ خلافت سے نکل کر اندلس سے ایشیا چلے گئے تھے، اور غالباً وہیں حالتِ گمنامی اور کس مپرسی میں اُن کا انتقال ہو گیا، لیکن عامۃ الناس جن کے دل خاندانِ بنی اُمیہ سے بے حد وابستہ تھے، اور جو سمجھتے تھے کہ جس قدر شان و شوکت اور ترقی و اقبال مندی حاصل ہوئی ہے وہ اِسی خاندان کی بدولت ہوئی ہے، وہ کسی طرح اِس بات کا یقین نہ کرتے تھے کہ ہشام المؤید اب زندہ نہیں ہیں، اِس لئے جو خبر خلیفہ ہشام کی نسبت مشہور ہوتی تھی، خواہ وہ کیسی ہی لغو اور بے معنی ہو فوراً باور کرلی جاتی تھی، ایشیاء میں جس طرح ہشام المؤید اپنی زندگی بسر کرتے تھے اُس کے حالات اکثر زبان زدِ خلائق ہوتے رہتے تھے، ایک قصہ یہ مشہور تھا کہ اسپین سے نکل کر وہ مکہ معظمہ چلے گئے تھے، ایک کیسہ زر و جواہر سے بھرا ہوا اُن کے پاس تھا، امیرِ مکہ کے

حبشی غلاموں نے اُن کا مال لُوٹ لیا، اور اب یہ نوبت ہوئی کہ دو دن کے فاقے سے وہ مکہ میں
پڑے پھرتے تھے کہ ایک کوزہ گر کو اُن پر رحم آیا اور اُس نے اِن سے پوچھا کہ تمہیں مٹی گوندھنی
آتی ہے، ہشام المؤید نے حالتِ پریشانی میں کہہ دیا کہ "ہاں آتی ہے۔" اس پر کوزہ گر نے
کہا کہ "اگر تمہیں میرے ہاں مزدوری کرنی منظور ہو تو یومیہ ایک درہم اور ایک روٹی دیا
کروں گا۔" ہشام نے کہا "اچھا، مگر پہلے ایک روٹی دے دو، کیونکہ دو دن کے فاقے
سے ہوں۔" کچھ دنوں تک ہشام اِس کوزہ گر کے ہاں مٹی گوندھ کر روزی پیدا کرتے رہے
لیکن پھر اِس کام سے گھبرائے اور ایک قافلے کے ساتھ فلسطین چلے گئے، جس وقت یروشلم
میں پہنچے تو پاس کچھ نہ تھا، پریشان حال بازاروں میں پھرتے پھرتے ایک بوریئے والے کی
دوکان کے سامنے کھڑے ہو گئے، بوریہ باف اپنے کام میں مصروف تھا، جب دوکان کے
سامنے ایک آدمی کو کھڑے دیکھا تو کہنے لگا "تم کیوں اِس طرح غور سے دیکھ رہے ہو؟
کیا تمہیں بوریہ بُننا آتا ہے؟" ہشام بولے "بوریہ بُننا تو نہیں جانتا لیکن بھوکا ہوں۔"
اِتنا کہہ آگے بڑھنے کو ہوئے مگر بوریئے والے نے کہا "اچھا، بوریہ بُننے کے لئے گھاس
اور نرسل تو لا سکتے ہو؟ میں تمہیں اِس کی مزدوری دوں گا۔" ہشام نے شکریئے کے
۱۰۲۳ء) ساتھ یہ خدمت منظور کر لی، اور کچھ دنوں بعد بوریہ بُننے میں مشتاق ہو گئے، اس واقعہ کے
کئی سال بعد یعنی ۱۰۳۳ء (۴۲۵ھ) میں وہ فلسطین سے اندلس چلے آئے، پہلے وہ مالقہ
میں ٹھہرے، پھر ۱۰۳۵ء (۴۲۷ھ) میں المریہ پہنچے، یہاں اِس زمانہ میں زہیر حکومت کرتا تھا،
اُس نے ہشام کو اپنے صوبہ سے نِکلوا دیا، ہشام المریہ سے روانہ ہو کر قلعہ رباح میں جا بسے
اِس قصّہ کو سہل الاعتقاد لوگوں نے بہت شوق سے سُنا اور فوراً باور کر لیا، مگر قصّہ
فی نفسہٖ ہرگز یقین کرنے کے لائق نہ تھا، واقعہ یہ تھا کہ جس وقت یحییٰ بن علی حمودی نے اشبیلیہ
اور قرطبہ پر حملے کا قصد کیا تو قلعہ رباح میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام خلف تھا، خلف
کی صورت شکل ہشام المؤید سے بہت مشابہ تھی، لیکن اِس کی شہادت کہیں موجود نہیں
کہ خلف حقیقت میں خلیفۂ معزول ہشام المؤید تھا، ابنِ حیان اور ابنِ حزم اگرچہ بنی اُمیہ کے
موالی تھے، اور ہشامِ مصنوعی کو ہشامِ اصلی تسلیم کر لینے میں اُن کا نفع متصوّر ہو سکتا تھا

لیکن اِن دونوں مورخوں نے خلف کے ہشام ہونے کو ایک بالکل جھوٹا قصہ بنایا ہے، بہرحال خلف کو حکومت کی طمع تھی، اکثر کہا کرتا تھا کہ "میری شکل ہشام المؤید سے ملتی ہے"، یہ کہتے کہتے اب اُس نے یہ مشہور کیا کہ درحقیقت وہ ہشام المؤید ہے، چونکہ خلف قلعہ رباح کا اصلی باشندہ نہ تھا جو ہمیشہ وہاں رہا ہو، اس لئے شہر کے لوگوں نے جو کچھ وہ کہتا تھا اُس کا یقین کر لیا، اور صرف یقین ہی نہیں کیا بلکہ اُس کو اپنا بادشاہ مان لیا، اور اپنے حاکم اسماعیل ابن ذی النون صاحب طلیطلہ کے خلاف عَلَم بغاوت بلند کر دیا، اسماعیل بن ذی النون نے یہ کیفیت دیکھ کر قلعہ رباح کا محاصرہ کر لیا، محصوروں نے جلدی ہتھیار ڈال دیئے، اور خلف کہ جو ہشام المؤید بنا تھا قلعہ رباح سے نکال کر پھر اسماعیل بن ذی النون کی اطاعت قبول کر لی۔

بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ خلف کو جو کچھ کرنا تھا اب وہ ختم ہو گیا تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اُسے جو کچھ کرنا تھا اب وہ شروع ہوتا ہے، قاضی ابوالقاسم محمد صاحب اشبیلیہ نے سوچا کہ ہشام المؤید کے دوبارہ اندلس میں وارد ہونے سے اپنا کوئی نفع نکالنا چاہیئے، اس بات سے کہ خلف واقعی ہشام المؤید ہے یا نہیں اُنہیں کچھ بحث نہ تھی، جب تک خلف کی مشابہت ہشام المؤید سے اس درجہ ہے کہ بوجوہ غالب اُسے ہشام المؤید باور کیا جا سکتا ہے اُس وقت تک ہشام المؤید کی طرف سے ایک گروہ بربر کے خلاف قائم کرنا ممکن تھا، اور اس گروہ کے خاص محرک خود ابوالقاسم محمد خلیفہ ہشام کے حاجب ہونے کی حیثیت سے بن سکتے تھے، پس قاضی ابوالقاسم محمد نے خلف کو اشبیلیہ بلایا، اور اُس سے وعدہ کیا کہ اگر وہ ہشام المؤید ثابت ہو سکا تو اُس کی مدد کی جائے گی، خلف لوریہ باف سے اس امر میں اصرار کرنے کی ضرورت نہ تھی طلب ہوتے ہی فوراً اشبیلیہ چلا آیا، اب ابوالقاسم محمد نے خلیفہ ہشام المؤید کی مستورات کے سامنے اُسے پیش کیا، یہ عورتیں اس بات کو تو جانتی ہی تھیں کہ ہم سے کس بیان کی توقع کی جاتی ہے، پس سب نے مل کر خلف کی نسبت کہہ دیا کہ یہی خلیفہ معزول ہشام المؤید ہیں، ابوالقاسم محمد نے اس شہادت کو قابل تسلیم قرار دے کر مجلس قرطبہ، اور سرداران صقالبہ، اور شرفائے عرب کو اطلاع دی کہ ہشام المؤید اس وقت اشبیلیہ میں اُس کے پاس تشریف رکھتے ہیں، اور سب سے اصرار کیا کہ ہشام المؤید کو پھر خلیفہ قرار دینے کے لئے مسلح ہو جائیں،

یہ ترکیب چل گئی، محمد ابن عبد اللہ برزالی صاحب قرمونہ نے جو اس وقت اشبیلیہ میں وارد تھا، (۱۰۴۰ء
ہشام المؤید کو خلیفہ مان لیا، اسی طرح عبد العزیز صاحب بلنسیہ، مجاہد صاحب دانیہ و جزائر
شرق الاندلس اور صاحب طرطوشہ نے ہشام المؤید کی خلافت کو دوبارہ تسلیم کیا، قرطبہ
کے عوام ہشام کے دوبارہ نمودار ہونے پر بے حد خوش ہوئے، لیکن مجلس سیاسی کے صدر
یعنی ابو الحزم ابن جہور جنہیں کسی بات کا جلد یقین نہ آتا تھا، اور اس کے علاوہ اپنے اختیارات
میں کمی بھی نہیں چاہتے تھے اِس دھوکے میں نہ آئے، لیکن اتنا وہ جانتے تھے کہ عوام کی
مرضی اور رائے کے خلاف چلنا اُن کی قدرت سے خارج ہے، نیز عربوں اور صقالبہ کو ایک
ہی شخص کے تحت میں کرنے کی ضرورت ہے، اور قرطبہ پر بربر کے حملے کا اندیشہ بھی موجود ہے
غرض ابو الحزم نے قرطبہ کے لوگوں کو ہشام المؤید کی بیعت کرنے سے روکا نہیں، یہ بیعت
نومبر ۱۰۳۵ء (محرم ۴۲۷ھ) کا واقعہ ہے۔

ادھر عرب اور صقالبہ حمودی خلیفہ یحییٰ بن علی کے مقابلے کی تیاری کرتے تھے، اُدھر یحییٰ
بن علی نے اشبیلیہ کا محاصرہ کر کے اُس کے علاقے کو تباہ کرنا شروع کر دیا، یحییٰ بن علی نے
مصمم قصد کر لیا تھا کہ ابو القاسم محمد سے اچھی طرح انتقام لے گا، لیکن یحییٰ کے گرد و پیش بہت
سے لوگ ایسے موجود تھے جو یحییٰ کے دشمن اور بد خواہ تھے، قرمونہ کے بربر جو یحییٰ کے عَلَم کے
نیچے بہ جبر لائے گئے تھے اب تک سچے دل سے اپنے آقا محمد ابن عبد اللہ برزالی کے خیر خواہ
تھے اور اُس سے خفیہ طور پر تعلقات بھی رکھتے تھے اور اُن میں سے کچھ لوگ اکتوبر ۱۰۳۵ء
ذی الحجہ ۴۲۶ھ میں چھپ کر اشبیلیہ بھی آئے تھے اور یہاں قاضی ابو القاسم محمد اور محمد
ابن عبد اللہ برزالی سے کہا تھا کہ یحییٰ بن علی حمودی بہت آسانی سے گرفتار کئے جا سکتے ہیں
کیونکہ وہ اپنے ہوش و حواس میں کم رہتے ہیں، اس اشارے سے ابو القاسم اور ابن عبد اللہ
برزالی نے نفع حاصل کیا، اسماعیل جو قاضی ابو القاسم کے فرزند تھے محمد بن عبد اللہ برزالی کے
ہمراہ ایک لشکر لے کر چل پڑے، جب رات ہوئی تو بہت سے سواروں کو کمین گاہ میں بٹھا
دیا اور چند رسالے قرمونہ کی طرف اِس امید میں روانہ کئے کہ یحییٰ بن علی حمودی اُن کو
دیکھتے ہی شہر کے باہر مقابلے کے لئے نکل آئیں گے۔

یحییٰ اس وقت شغلِ شراب میں تھے، لشکر کی خبر سنتے ہی یہ کہتے ہوئے کرسی سے اُٹھے "واہ کیا اچھی قسمت ہے، ابنِ عباد مجھ سے ملنے کو آیا ہے، لوگو! فوراً مسلح ہو کر گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ"۔

اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور یحییٰ بہت جلد تین سَو سواروں کی جمعیت لئے ہوئے شہر سے باہر نکل آئے، شراب دماغ کو چڑھی ہوئی تھی، سواروں کی صفوں کو بغیر درست کئے رات کے اندھیرے میں جب کہ کسی کو کچھ سُوجھتا نہ تھا دشمن پر یک لخت دھاوا کر دیا، اشبیلیہ کی فوج پہلے تو اس شدید ایلغار سے گھبرائی، لیکن پھر سنبھل کر اُسے روکنا چاہا، مگر جب یہ نہ ہو سکا اور پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوئی تو اُس طرف بھاگی جدھر کمین گاہ میں اسمٰعیل نے سواروں کو بٹھا رکھا تھا، یحییٰ کو اس کی خبر نہ تھی، تعاقب کرتے چلے گئے، اسمٰعیل نے الاخوین کے قلعوں سے جو عیسائی سوار بھرتی کئے تھے اُن کو لے کر یحییٰ پر سخت حملہ کر دیا، یحییٰ کی فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے خود یحییٰ بن علی حمودی بھی اس لڑائی میں کام آئے، اُن کی فوج کا بھی یہی درجہ ہوتا جو اُن کا ہوا، لیکن ابنِ عبد اللہ برزالی نے اسماعیل سے یہ کہہ کر اس فوج کی جان بچا لی کہ اس میں سب لوگ قرمونہ کے بربر ہیں جن کو یحییٰ بن علی نے مجبور کر کے ہمارے خلاف اس لڑائی میں لڑوایا تھا، اسماعیل نے ابنِ عبد اللہ برزالی کی بات مان لی، اور مرحوم یحییٰ کی بھاگتی ہوئی فوج کا تعاقب بند کیا۔

ابنِ عبد اللہ برزالی فوراً قرمونہ پہنچا، تاکہ اپنے علاقے پر پھر قبضہ کرے، یحییٰ بن علی کے اسودی سپاہیوں نے دروازۂ شہر پر ابنِ عبد اللہ برزالی کو روکنا چاہا، مگر شہر والوں کی مدد سے برزالی ایک ایسے مقام سے جہاں فصیل ٹوٹی ہوئی تھی قرمونہ میں داخل ہو گیا، اور یحییٰ کے قصر میں پہنچ کر جس قدر عورتیں وہاں تھیں اُن کو اپنے بیٹوں میں تقسیم کر دیا، اور یحییٰ کے تمام خزانوں اور ذخیروں پر قبضہ کر لیا (نومبر ۱۰۳۵ء مطابق محرم ۴۲۷ھ)[1]

---

[1] بعض مورخوں نے بجائے ۴۲۷ھ کے ۴۲۹ھ لکھا ہے، لیکن ابنِ حیان نے ۴۲۷ھ صحیح تاریخ ثابت کی ہے، اور قرمونہ کے ایک بربر سپاہی کا قصہ نقل کیا ہے، جو بذاتِ خود اس معرکہ میں موجود تھا جس میں یحییٰ مارے گئے تھے۔

یحییٰ بن علی حمودی کی موت سے اشبیلیہ اور قرمونہ میں لوگ بہت خوش ہوئے، الوالقاسم محمد نے جب سُنا تو سجدۂ شکر بجا لائے، اب بنی حمود کا خوف لوگوں کے دلوں سے کچھ دنوں کو دُور ہو گیا،

یحییٰ بن علی کی موت پر اُن کے بھائی ادریس بن علی حمودی کی خلافت کا اعلان مالقہ میں کیا گیا، ادریس کو ایک زمانہ درکار تھا کہ سرداران بربر کے ساتھ رعایتوں کا وعدہ کر کے اُن کو اپنی طرف بلائے، اس وقت ادریس میں اتنی قوت بھی نہ تھی کہ وہ جزیرۃ الخضراء کو فتح کر سکتے، جہاں اُن کے چچا کے بیٹے محمد بن قاسم بن علی بن حمود کو حبشی غلاموں نے خلیفہ بنا رکھا تھا، قاضی الوالقاسم نے یہ دیکھ کر کہ موقع اچھا ہے، چاہا کہ فرضی ہشام کو ساتھ لے کر قرطبہ کے قصرِ خلافت میں جا بیٹھیں، لیکن الوالحزم ابن جہور مجلسِ سیاسی کی صدر نشینی چھوڑنے کا ارادہ نہ رکھتے تھے، اُنہوں نے شہر کے لوگوں کو یقین دلایا کہ جس شخص کو خلیفہ بنایا جاتا ہے وہ ہشام المؤید نہیں ہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے، لوگوں نے الوالحزم کا یقین کیا، اور اُس دن سے خطبوں میں خلیفہ ہشام کے لئے جو دعا کی جاتی تھی وہ بند کی گئی، قاضی الوالقاسم محمد جب قرطبہ پہنچے تو شہر کے دروازے بند پائے، فوج اتنی ساتھ نہ تھی کہ قرطبہ جیسے مستحکم شہر پر حملہ کر کے قبضہ کر لیتے، اس لئے واپس ہوئے، اس کے بعد اُنہوں نے زہیر صاحب المریہ پر حملہ کرنے کا قصد کیا، کیونکہ صقالبہ میں صرف یہی ایک امیر تھا جس نے ہشام المؤید کی اطاعت قبول نہیں کی تھی، زہیر بنی حمود کا ہوا خواہ اُس وقت سے چلا آتا تھا جب سے حمودی خلیفہ قاسم بن علی نے عامریوں کے خوش کرنے کے لئے زہیر کو بہت سی جاگیریں دی تھیں، چنانچہ جس وقت ادریس بن علی حمودی کو مالقہ میں خلیفہ بنایا گیا تو زہیر نے ادریس کی خلافت تسلیم کر لی۔

جب زہیر کو اس حملہ کا ارادہ معلوم ہوا تو اُس نے حبوس صاحبِ غرناطہ سے اتحاد کر لیا اور جب اشبیلیہ کی فوجیں اُس پر حملہ کرنے آئیں تو زہیر نے المریہ اور غرناطہ کی متحدہ فوجوں سے انہیں شکست دے دی۔

قاضی الوالقاسم محمد نے اپنی قوت کا اندازہ کرنے میں زیادتی کی تھی، اس شکست کے

بعد اُنہیں خوف ہوا کہ کہیں المریہ اور غرناطہ کی فوجیں مل کر اشبیلیہ کے علاقے پر حملہ نہ کر دیں لیکن بجتِ بیدار نے حسبِ معمول قاضی ابو القاسم کی مدد کی، اور اتفاق ایسا ہوا کہ اُن کے دو دشمنوں یعنی زہیر اور حبوس میں سے ایک نے دُوسرے کا کام تمام کر دیا۔

اسناد

ابنِ بسام ج ۱ ص ۸۱ تا ۸۲، ۱۲۹، ۱۵۷

عبد الواحد ص ۳۷ تا ۳۸، ۴۲ تا ۴۳، ۴۵، ۶۵

عبّاد (ڈوزی) ج ۱ ص ۲۲۰ تا ۲۲۵، ۲۴۷، ۲۳۱، ۳۸۱

ج ۲ ص ۷، ۳۲ تا ۳۴، ۷۲، ۱۲۸ تا ۱۳۱، ۱۷۳، ۲۰۸، ۲۱۶، ۲۱۷

ابنِ خلدون ص ۲۲، ۲۵

کتاب رابع

مُلوک الطّوائِف

دوسری فصل

سموایل ہالیوی (اسمعیل ابن نغدالہ) اور ابن عباس

اِس زمانہ میں دو نامورشخص جن میں باہم جانی عداوت تھی، المریہ اور غرناطہ پر حکومت کرتے تھے، اِن میں سے ایک عرب تھا جس کا نام ابنِ عباس تھا، اور دوسرا یہودی جس کا نام سموایل تھا۔

ربّی سموایل ہالیوی[1] (عربی نام اسمٰعیل ابنِ نغدالہ) قرطبہ کا رہنے والا تھا، یہودیوں کے مشہور عالم ربّی حنوخ سے اُس نے تالمود کو پڑھا تھا، اور عربی ادبیات اور دیگر علوم میں

---

[1] یہ یہودی دینس میں ۴۲۰ھ ۱۰۲۸ء میں پیدا ہوا، اور ۴۳۶ھ ۱۰۴۷ء میں مرگیا، دیکھو ڈوزی کا دیباچہ ابنِ عذاری کی کتاب پر ص ۸۰ تعلیقہ

جو اُس وقت مروج تھے بڑی دست گاہ پیدا کی تھی، مدت تک پہلے قرطبہ میں اور پھر مالقہ
میں پنساری کی دوکان کرتا رہا، جس زمانہ میں سلیمان المستعین کی بربر فوج نے قرطبہ پر قبضہ
کیا تھا تو سموایل قرطبہ چھوڑ کر مالقہ میں آن بسا تھا، یہ شخص محض حُسنِ اتفاق سے ایک
نہایت ادنیٰ حالت سے بہت بڑے درجے پر پہنچ گیا۔

یہودی سموایل کی دوکان مالقہ میں ایک قصر کے قریب تھی جو ابوالقاسم ابن عریف
کا تھا ابنِ عریف اس زمانہ میں حبوس صاحب غرناطہ کا وزیر تھا، قصر کی عورتیں جو لکھنا پڑھنا
نہ جانتی تھیں، اکثر اس یہودی سے خط لکھوا کر ابن عریف کو غرناطہ بھیجا کرتی تھیں، وزیر ابنِ
عریف اِن خطوں کو پڑھ کر اُن کی عبارت کی تعریف کیا کرتا تھا، کیونکہ طرزِ بیان نہایت
نفیس ہوتا تھا، اور عربی بلاغت کے بہترین نمونوں سے عبارت مزّین ہوتی تھی ابن عریف
کو غرناطہ سے مالقہ آنے کا اتفاق ہوا تو شوق ہوا کہ اُن خطوط کے لکھنے والے کو دیکھنا چاہیئے،
چنانچہ اُس نے یہودی کو بُلا بھیجا، جب ملاقات ہوئی تو ابنِ عریف نے کہا "دوکان تمہارے
لیے موزوں نہیں ہے، تم تو اس قابل ہو کہ شاہی دربار کی رونق ہو، بہت اچھا ہو کہ تم
میرے ہاں کاتب کی خدمت قبول کرو" خلاصہ یہ کہ سموایل، ابنِ عریف کے ساتھ غرناطہ چلا
گیا، یہاں جب ملکی معاملات کے متعلق یہودی کی گفتگو سُنی تو ابنِ عریف کو اور بھی تعجب
ہوا، اور خیال کرنے لگا کہ سموایل کو واقعی دُنیا اور دنیا کے معاملات میں ایسی نظر غائر حاصل
ہے کہ اور لوگوں میں اُس کا پتہ بھی نہیں ہے، ایک یہودی مورخ لکھتا ہے کہ جب سموایل
کسی بات میں مشورہ دیتا تھا تو اُس کی تقریر میں خدا کی آواز سنائی دیتی تھی" وزیر ابنِ عریف
کے حق میں اچھا تھا کہ وہ ہمیشہ سموایل کے مشورے پر چلتا تھا، ابنِ عریف جب مرنے کو ہوا تو حبوس
بادشاہِ غرناطہ اُس کی عیادت کو آیا اور مریض کے قریب کھڑے ہو کر سوچنے لگا کہ اب اِس جیسا (۶۰۸)
نمک حرام وزیر کہاں نصیب ہوگا۔ ابنِ عریف نے بادشاہ کو دیکھ کر عرض کیا کہ "حال میں جس
قدر صلاح و مشورے حضور کو میں نے دیئے تھے، وہ سب اپنے کاتب سموایل کی رائے
اور ہدایت کے مطابق دیئے تھے، حضور اس کاتب کا خیال رکھیں، اور خدا کرے کہ آپ
کے حق میں وہ مثل باپ کے ثابت ہو، اور آپ کی وزارت کی خدمت بہ حُسنِ عمل انجام دے

اس کی رائے اور رہابت پر حضور چلیں اور خدا آپ کا ہمیشہ ناصر و مددگار رہے گا۔" اس کے بعد حبوس نے سموایل کو قصر میں بلایا، اور اُسے اپنا کاتب اور مشیر مقرر کیا۔[1]

ایک اسلامی ریاست میں کسی یہودی کو غالباً یہ بات کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی کہ بادشاہِ وقت کا وزیر اور مشیر بن کر براہِ راست سب پر حکومت کرے، یہ درست ہے کہ مسلمان بادشاہوں کے تحت میں اکثر یہودی مناصبِ جلیلہ پر ممتاز رہے، اور مالی انتظاماتِ سلطنت بالخصوص اُن کے سپرد رہے، لیکن مسلمانوں کی مذہبی رواداری کبھی اس حد کو نہ پہنچی تھی کہ ایک یہودی سے حاجب اور وزیر اعظم کا کام لیا جائے، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بات کچھ غرناطہ ہی میں ممکن بھی تھی، کیونکہ یہاں بنی اسرائیل اس کثرت سے آباد تھے کہ غرناطہ کو بعض اوقات مدینۃ الیہود کہا جاتا تھا، چونکہ وہ بہت مالدار اور بارسوخ ہوتے تھے اس لئے ملکی معاملات میں بھی عملی طور پر اُن کو شریک کیا جاتا تھا، غرض غرناطہ میں بنی اسرائیل کو ارضِ موعود جا ہے نہ ملی ہو مگر جریب کی پہاڑی اور صحرا کا امن ضرور دستیاب ہو گیا تھا، سموایل کی ترقی کی ایک وجہ اور بھی تھی، بادشاہِ غرناطہ کے لئے کسی شخص کو حاجب کے عہدے کے لئے منتخب کرنا آسان بات نہ تھی، کیونکہ یہ ایسی ذمہ داری کا منصب تھا جس پر نہ کسی عرب کا اعتماد ہو سکتا تھا نہ کسی بربر کا، اُس زمانہ میں حاجب کا عالم و ادیب ہونا ضروریات سے تھا تاکہ اعلیٰ درجے کی انشاپردازی کے ساتھ مقفیٰ مسجع عبارت میں غیر ممالک کے بادشاہوں کو ایسے خطوط لکھ سکے جو بادشاہوں کی توجہ کے قابل ہوں، اس قسم کی قابلیتوں کی قدر حبوس صاحبِ غرناطہ خاص طور پر کرتا تھا، اور جس طرح کوئی شخص پرانے امیروں کی نقل اُتار کر اپنے نو دولت ہونے کا عیب مٹاتا ہے اسی طرح حبوس اپنے ایک نیم وحشی قوم سے ہونے کا عیب بہت سی باتوں سے دُور کرنا چاہتا تھا، اُس کو اپنے علم و فضل پر ناز تھا، اور اپنی قوم صنہاجہ کی نسبت دعویٰ تھا کہ وہ بربر نہیں بلکہ عربی النسل ہے، پس ضروری تھا کہ وہ ایک ایسا حاجب مقرر کرے جو قرب و جوار کی ریاستوں کے حاجبوں سے کسی بات میں کم نہ ہو، لیکن ایسا

---

[1] جرنل ایشیاٹک ـ سلسلہ ۴، حصہ ۱۶، صفحہ ۲۰۳ تا ۲۰۴

آدمی ملتا تو کہاں ملتا؟ بربر کا یہ حال تھا کہ لڑنا مرنا، شہروں کو لُوٹنا اور جلانا خوب جانتے تھے،
لیکن عربی کا ایک فقرہ بھی صحیح لکھنا کسی کو نہ آتا تھا، رہے عرب، تو اُن کی کیفیت یہ تھی کہ وہ کسی
بادشاہ کی حکومت کا جوا اپنی گردن پر رکھنے میں غصّے اور شرم سے لرز اُٹھتے تھے، اُن میں ایک
آدمی بھی بھروسے کا نہ تھا، اپنے آقا کو دھوکا دینا اور وقت پر اُس سے بے وفائی کرنا اُن کے
نزدیک ہرگز کوئی بُرا کام نہ تھا، ایسی صورت میں ایک یہودی کا مل جانا، اور وہ بھی سموایل جیسی
لیاقت کے یہودی کا ملنا ایک بڑی نعمت معلوم ہُوا، یہ ایسا یہودی تھا جو علمائے عرب کے
نزدیک بھی عربی زبان کے تمام محاسن کو سمجھنے اور ادا کرنے پر قدرت رکھتا تھا، اپنے مذہب (۶۰۹)
کا پابند تھا، لیکن جب مسلمانوں سے خط وکتابت کرتا تھا تو اُن کے بزرگانِ دین کا ادب ملحوظ
رکھ کر تعظیمی الفاظ اور جملے قاعدے کے بموجب اُن کے ناموں کے ساتھ لکھتا تھا[1]۔

بادشاہِ غرناطہ نے جب سموایل کو وزارت کے لئے منتخب کیا تو اِس انتخاب کو غرناطہ کے عربوں نے بھی پسند کیا، باوجودیکہ عرب یہودیوں سے اختلاف رکھتے تھے مگر سموایل کی لیاقت کے وہ بھی قائل تھے۔ اُس کا علم وفضل بہت بڑھا ہوا تھا، بڑا ریاضی داں اور منطق کا عالم تھا، علمِ ہیئت خوب جانتا تھا[2]، اس کے علاوہ سات زبانوں پر قادر تھا[3]، شاعروں، اور عالموں کے حق میں بڑا فیاض تھا، اُن کو بہت انعام واکرام دیا کرتا تھا، اور وہ بھی اُس کی تعریف میں کوتاہی نہ کرتے تھے، شاعر منفتیل نے ذیل کے اشعار اُس کی نسبت لکھے تھے، اِن اشعار کو جن کا مطلب یہاں درج کیا جاتا ہے مسلمان مصنفوں نے بھی اپنی تصانیف میں نقل کیا ہے:۔

"تُو اپنی ذات میں وہ صفات کُلّی طور پر رکھتا ہے جو دوسروں میں جزوی طور پر نظر آتی ہیں، تو نے سخاوت کو جو پابہ زنجیر تھی آزاد کر دیا، تجھے مغرب اور مشرق کے اہل

---

[1] دیکھو ڈوزی کا دیباچہ ابنِ عذاری کی کتاب پر ص ۹۷
[2] جرنل ایشیاٹک، سلسلہ ۴، حصہ ۱۶، ص ۲۰۹ تعلیقہ
[3] جرنل ایشیاٹک " ص ۹۶ تا ۹۷

جود و سخا پر وہی فضیلت حاصل ہے جو سونے کو تانبے پر ہے، جو لوگ حق اور باطل میں تمیز کر سکتے ہیں وہ تیرے ہاتھوں کو بوسہ دیں گے، خدا کو خوش کرنے کے لئے حجرِ اسود کو بوسہ دینے کی بجائے اب وہ تیرے ہاتھ چومیں گے، یہ ہاتھ وہ ہیں جو دُنیا میں عیش و مسرت کے بخشنے والے ہیں، تیرے ہی طفیل سے اِس دُنیا میں میرے دِل کے ارمان نکلے ہیں، اور تیرے ہی طفیل سے اُمید رکھتا ہوں کہ عاقبت میں میری بھلائی ہوگی، تیرے سامنے میں علی الاعلان اپنے مذہب پر جس میں سَبت کا حکم ہے عمل رکھتا ہوں، لیکن جب میں اپنے لوگوں میں آتا ہوں تو خفیہ طور پر اس کا پابند ہوتا ہوں"

سموایل نے عبرانی ادب کی جو جو خدمتیں کی جنہیں عرب اُن کی قدر نہ کر سکتے تھے، یہ خدمتیں بہت تھیں، اُس نے تالمود کی شرح عبرانی زبان میں لکھی، اور عربی نحو پر بائیس جلدیں تصنیف کیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب الثروت تھی، جس کی نسبت ایک مشہور یہودی نحوی نے لکھا ہے کہ "نحو میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ہے"

سموایل شاعر بھی تھا، اور عہد نامہ عہدِ عتیق سے زبور، امثال، اور کتاب الواعظ کی منظوم شرح لکھی، اس شرح میں تلمیحات، عربی ضرب الامثال، حکماء کے اقوال، اور مذہبی شاعروں کی تصانیف سے مشکل فقرے اور جملے اِس کثرت سے منقول تھے کہ شرح کی عبارت نہایت ادق ہوگئی تھی، بڑے بڑے یہودی عالم بھی اس شرح کے معنی بغیر شرح کی شرح پڑھے مشکل سے سمجھ سکتے تھے[1]، چونکہ عبرانی زبان میں عربی زبان کی طرح جس پر عبرانی ادب کو ڈھالا گیا ہے باریکیاں اور دِقّت طلب الفاظ کی بھرمار اُس زمانہ میں عام تھی، اس لئے عبارت کو مشکل و مبہم کر دینا بجائے عیب کے صواب سمجھا جاتا تھا۔

(۶۱۰) سموایل یہودی کو طلبہ سے بہت محبت تھی، اور وہ اُن پر اُن کے والدین کی مثل نظرِ شفقت رکھتا تھا، طلبہ میں جو مفلس ہوتے تھے اُن کا کفیل ہو جاتا تھا، کاتب مقرر کر رکھے تھے

---

[1] جرنل ایشیاٹک ص ۲۲۲ تا ۲۲۴

جو مشنا اور تالمود کی نقلیں تیار کرتے تھے، یہ نقلیں ایسے تنگدست طلبہ کو جو کتاب خریدنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے مفت دی جاتی تھیں۔

سموایل کی سخاوت صرف اپنے اندلس بھائیوں ہی تک محدود نہ تھی، افریقہ، صقلیہ، یروشلم، بغداد، بلکہ تقریباً ہر جگہ کے یہودیوں کو اُس کی فیاضی اور سخاوت کا بڑا اسہارا تھا،[1] ریاست غرناطہ کے یہودیوں نے ۱۰۲۷ء (۴۱۸ھ) میں سموایل کو اُس کی عنایات کے شکریہ میں "نغید"[2] یعنی "بنی اسرائیل میں شہزادے" کا لقب دیا تھا، تدبیر مملکت میں سموایل اپنی دانائی اور فہم رسائی مدد سے نہایت احتیاط اور مضبوطی سے کام کرتا تھا، بات کم کرتا اور سوچتا زیادہ تھا، یہ دونوں باتیں ایک مدبر ریاست کی خوبیوں میں شمار ہوتی ہیں، واقعات جیسے کچھ بھی پیش آئیں سموائل ہمیشہ دانائی اور فراست کو کام میں لاکر اُن سے اپنا فائدہ نکالتا تھا، انسان کی خصلتوں اور جذبات پر ہمیشہ غور کرتا تھا، اور یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کو برائیوں سے کیونکر پاک کیا جاسکتا ہے،

سموایل علاوہ ان خوبیوں کے ایک نہایت مہذب اور شائستہ دنیادار بھی تھا، قصر حمرہ کے عالیشان کمروں میں وہ اس بے تکلفی کی شان سے نقل و حرکت کیا کرتا تھا کہ گویا ہمیشہ سے دولت و ثروت میں پرورش پائی ہے، گفتگو میں شائستگی و مدارات، خوشامد میں عمدہ اسلوب، دوسروں کے قلب کو مسخر و مسرور کر دینے کی لیاقت، فصیح و بلیغ الفاظ میں پختہ دلائل پیش کرکے فریقِ مخالف کو اپنی طرف کھینچ لینے کی قابلیت سموایل میں ایسی تھی کہ کسی اور میں نظر نہ آتی تھی۔

باوجود ان سب اوصاف کے سموایل کی طبیعت میں اُس غرور اور تکبر کا پتہ بھی نہ تھا جو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ درجہ پر پہنچنے میں اکثر لوگوں میں پیدا ہو جاتا ہے، اُس کی ہر ادا سے مہربانی اور مروت ظاہر تھی، اور معلوم ہوتا تھا کہ طبیعت ہی ایسی لے کر پیدا ہوا ہے جس میں غرور

---

[1] جرنل ایشیاٹک ص ۲۰۹

[2] اسی خطاب کی وجہ سے عربی میں سموایل کا نام ابن نغدالہ ہوا تھا۔

نام کو نہیں، سموایل اپنی پہلی ادنیٰ حالت پر شرمندہ ہونے کی بجائے اُس پر فخر کرتا تھا، اور کچھ ایسا اثر رکھتا تھا کہ دشمنوں کی زبان اُس کے سامنے بند رہتی تھی۔[لہ]

زہیر صاحب المریہ کا وزیر ابن عباس بھی سموایل سے کچھ کم نہ تھا، بیان ہوا ہے کہ چار باتوں میں یعنی زورِ تحریر، دولت، طمع اور غرور میں اُس کا کوئی نظیر نہ تھا۔ اُس کی دولت ایک قصہ معلوم ہوتی تھی، پانچ لاکھ سکۂ زر (جس کی قیمت آج کل کے حساب سے تقریباً دو کروڑ روپیہ ہوتی ہے) اُس کے خزانے میں تھے، اُس کا قصر شاہانہ تکلفات سے آراستہ تھا، نوکر چاکر بکثرت تھے، پانچ سو گانے والیاں نہایت حسین وجمیل ملازم تھیں، اور سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ ایک بہت بڑا کتب خانہ رکھتا تھا، جس میں بے شمار رسائل کے علاوہ چار لاکھ کتابیں تھیں، کسی چیز کی جو انسان کی مسرت کا موجب ہو اُس کے لئے کمی نہ تھی، خوبصورت تھا اور ابھی جوان تھا، کیونکہ عمر ابھی تیس برس سے متجاوز نہیں ہوئی تھی، عالی نسب تھا، پرانے اور شریف خاندان الضار کی یادگار تھا، دولت کی انتہا نہ تھی، (۶۱۱)
چونکہ تعلیم وتربیت یافتہ، حاضر جواب، اور تحریر وتقریر پر بے حد قادر تھا، اس لئے علمی شہرت بھی اُسے حاصل تھی، لیکن بدقسمتی سے ایک عیب اُس میں حد سے گذرا ہوا تھا، اور وہ یہ کہ غرور ونخوت اور کبر وپندار کی انتہا نہ رہی تھی، اور اُس کی وجہ سے بکثرت دشمن پیدا کر لئے تھے، قرطبہ کے لوگوں کو بالخصوص اُس سے عداوت تھی، کیونکہ ایک مرتبہ جب زہیر کے ساتھ اُسے قرطبہ جانے کا اتفاق ہوا تو قرطبہ کے ایسے لوگوں کے ساتھ بھی وہ غرور سے پیش آیا جو قابلیت اور عالی نسبی میں بہت ممتاز تھے، اور چلتے وقت اُن سے کہہ دیا کہ قرطبہ میں سوائے سائلوں اور جاہلوں کے کوئی اور نظر نہ آیا۔ غرور اور تکبر اس میں جنون کی حد کو پہنچا ہوا تھا، ایک جگہ اپنے اشعار میں لکھ گیا کہ "اگر تمام بنی نوعِ انسان میرے غلام ہوتے تو بھی میرے دل کو تسکین نہ ہوتی، میں خوش ہو کر آسمان کے ستاروں تک پہنچتا اور وہاں سے بھی اور بلندی پر جانے کی جستجو کرتا۔" ابن عباس شطرنج کھیلتے وقت کسی

لہ دیکھو ڈوزی کا دیباچہ ابنِ عذاری کی کتاب پر۔ ص ۹۶ تا ۹۷

شاعر کے دو مصرعے پڑھا کرتا تھا جن کا مضمون تھا کہ "جب میں قریب سے گذرتا ہوں تو طالعِ بد سویا کرتا ہے، چونکہ اُسے میری طرف دیکھنے کا حکم نہیں، اس لئے وہ بیدار نہیں ہوتا۔"

قسمت کو اس طرح ہیچ سمجھنے پر المریہ کے لوگوں کو ابنِ عباس پر غصّہ آیا، اور ایک شاعر نے عوام کے خیالات کا آئینہ بن کر دوسرے مصرع کا مضمون اس طرح تبدیل کیا کہ ابنِ عباس کے حق میں آگے چل کر وہ بالکل صحیح ثابت ہوگیا، بدلے ہوئے مصرع کا مضمون یہ تھا "لیکن مشیت جو کبھی فنا نہیں ہوتی ایک دن نمودار ہوگی اور طالعِ بد کو بیدار کردے گی۔"

چونکہ ابنِ عباس خالص نسلِ عرب سے تھا، اس لئے بربر اور یہودیوں دونوں سے نفرت کرتا تھا، غالباً وہ اس بات کو بھی ناپسند کرتا تھا کہ اُس کا آقا زہیر عربوں اور صقالبہ کے اتحاد میں شرکت کرے، کیونکہ اس صورت میں زہیر کا مرتبہ اتحاد کے سرگروہ قاضی ابوالقاسم محمد کے مرتبہ سے کم ہو جائے گا

ایک دوسرا سبب اس اتحاد کو ناپسند کرنے کا یہ تھا کہ اپنے آقا زہیر کو ایک بربر (حبوس صاحب غرناطہ) سے اتفاق کرتے ہوئے دیکھنا، جس کا وزیر ایک خبیث یہودی ہو، ابنِ عباس کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔

بنی حمودِ مالقہ کے وزیر ابن بقنہ سے مل کر ابنِ عباس نے سمواِیل کو گرانے کی کوشش کی، اور اس کوشش میں سمواِیل کی بے حد مذمت شروع کی، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا، اس کے بعد ابنِ عباس اس کے درپے ہوا کہ اپنے آقا زہیر صاحب المریہ اور حبوس صاحب غرناطہ میں ناچاقی پیدا کرادے، اور پھر والی قرمونہ ابنِ عبداللہ برزالی کو جو حبوس بادشاہ غرناطہ کا دشمن تھا زہیر کی طرف سے کمک پہنچوا دے، اس کوشش میں ابنِ عباس کامیاب ہوگیا۔

جون ۱۰۳۸ء (رمضان ۴۲۹ھ) میں حبوس صاحب غرناطہ کا انتقال ہوگیا۔ اس نے دو بیٹے
۶۱۱ چھوڑے، بڑے کا نام بادیس اور چھوٹے کا بلکین تھا، بربر اور بعض یہودیوں نے
چاہا کہ بلکین کو باپ کا جانشین کیا جائے، لیکن باقی یہودی جن میں سمواِیل بھی تھا، بادیس

کے طرفدار ہوگئے، عربوں نے بھی بادلیس ہی کو بادشاہ بنانا پسند کیا،

اِس نزاع پر ضرور خانہ جنگی ہو جاتی، مگر بلکین نے تخت کے دعوے سے دست بردار ہوکر اپنے بھائی بادلیس کی بیعت کرلی، پھر اُس کے کل فریق نے بھی بادلیس کی اطاعت قبول کرلی[1]۔

بادلیس نے غرناطہ کا بادشاہ ہوکر زہیر صاحب المریہ سے از سرِ نو اتحاد قائم کرنا چاہا، زہیر نے بادلیس کو لکھا کہ ملاقات کے وقت سب باتیں طے ہو جائیں گی، اور اب زہیر اپنے حشم و خدم کے ساتھ المریہ سے نکل کر اچانک غرناطہ پہنچ گیا، یہاں نہ کسی کو اُس کے آنے کا خیال تھا، اور نہ اُس نے سرحد کو عبور کرنے کے لئے بادلیس سے اجازت لی تھی، بادلیس زہیر کی اِس حرکت سے بہت پریشان ہوا، تاہم اُس نے بہت عزت سے زہیر کا استقبال کیا، اور اُس کی خاطر و مدارت میں مصروف ہوا، اُس کے ہمراہیوں کی بڑے اہتمام سے مہمانداری کی اور اُن کو انعام و تحائف دیئے۔

مگر بادلیس اور زہیر کی اس ملاقات کا کچھ نتیجہ نہ ہوا، یہ دونوں بادشاہ کسی بات پر متفق ہوئے اور نہ اُن کے دونوں وزیر، بلکہ زہیر نے اپنے وزیر ابن عباس کے اشارے سے بادلیس بادشاہِ غرناطہ کے ساتھ مغرورانہ برتاؤ کیا، بادلیس اِس فکر میں ہوا کہ زہیر کی اِس گستاخی کا بدلہ کیونکر نکالے، لیکن بادلیس کے ایک ملازم نے جس کا نام بھی بلکین تھا، دونوں بادشاہوں میں مصالحت کی کوشش کی، بلکین رات کے وقت زہیر کے وزیر ابن عباس کے پاس گیا، اور اُس سے کہا کہ "خدا کے غضب سے ڈرو، تم مصالحت نہیں ہونے دیتے اور اپنے آقا زہیر کو تم نے اپنے قابو میں کر رکھا ہے، تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم تم مل کر کام کرتے تھے تو ہر بات میں کامیاب رہتے تھے اور سب لوگ ہم پر رشک کرتے تھے، پس اُسی پُرانی دوستی اور اتحاد کو پھر قائم کردو، جو بات اِس اتحاد میں مخل ہے وہ صرف یہ ہے کہ تم محمد ابنِ عبداللہ برزالی صاحبِ قرمونہ کی مدد کرتے ہو، اس والیِ قرمونہ کو اب اُس کے

---

[1] جرنل ایشیاٹک، سلسلہ ۴، حصہ ۱۶، ص ۲۰۶ تا ۲۰۸

حال پر چھوڑ دو، اور اس سے کچھ واسطہ نہ رکھو، جیسے امیر بادیس کی خواہش ہے پھر سب باتیں درست ہو جائیں گی۔"

ابن عباس نے بلکین کی اس تقریر کا جواب بُری طرح دیا، اور بلکین نے جب ابن عباس کو گلے لگا کر اور رو رو کر اپنا ہم خیال بنانا چاہا تو ابن عباس نے کہا "نہ تمہارے الفاظ سے اور نہ تمہاری اس گریہ وزاری سے میرے دل پر کوئی اثر ہو سکتا ہے، میں نے تم سے کل جو کچھ کہا تھا آج بھی وہی کہتا ہوں کہ اگر تم اور تمہارے آقا ہماری بات نہ مانیں گے تو پھر دکھا دوں گا کہ اخیر میں تم کو کیسی پشیمانی اٹھانی پڑتی ہے۔" بلکین یہ گفتگو سن کر طیش میں آگیا، اور کہنے لگا "کیا تمہارا یہی جواب ہے جو میں مجلس کے سامنے کہوں؟"

ابن عباس نے کہا "ہاں یقینی میرا یہی جواب ہے، اور جن الفاظ میں میں نے تم سے گفتگو کی ہے، اگر اُن سے بھی بدتر الفاظ میں میرا جواب مجلس کو سنانا چاہو تو میں بے تکلف تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔"

بلکین غصہ سے آنکھوں میں آنسو بھرے بادیس اور مجلس کے سامنے آیا، اور ابن عباس (۶
کی گفتگو نقل کر کے کہا "صنہاجیو! اس ابن عباس کا غرور ناقابل برداشت ہے، اٹھو، اور اُسے خاک کا پیوند بنا دو، ورنہ تمہارے گھر تمہارے گھر نہ رہیں گے۔" غرناطہ کی مجلس سیاسی کے ارکان کو بھی ابن عباس پر غصہ آیا، لیکن بلکین برادر بادیس تو غصہ سے بالکل ہی بیتاب ہو گیا، اور اُس نے اپنے بھائی بادیس سے کہا کہ ان المریہ والوں کو فوراً سزا ملنی چاہیئے، بادیس نے وعدہ کر لیا کہ ضرور سزا دی جائے گی۔

زہیر کو غرناطہ سے المریہ واپس آنے میں بہت سے پہاڑی دروں اور ایک پل سے گذرنا پڑتا تھا، اس پل کے قریب ایک گاؤں تھا جو اسی پل کی رعایت سے البونت کہلاتا تھا (پوانتی لاطینی زبان میں پل کو کہتے ہیں) بادیس نے حکم دیا کہ اس پل کو کاٹ دیا جائے اور پہاڑی دروں میں فوج بٹھا دی جائے،

بادیس نے یہ حکم تو دیا، لیکن اس کو اپنے بھائی بلکین کی طرح زہیر پر غصہ نہ تھا، اور اُس کو اب تک اپنے باپ کے دوست سے قطعی نا امیدی نہ تھی، بادیس کا خیال تھا کہ

شاید زہیر اب بھی مصالحت کرے، چنانچہ بادلیس نے ارادہ کیا کہ زہیر کو راستے کے خطروں سے پورے طور پر آگاہ کر دے، اس غرض سے اُس نے ایک بربر کو جو المریہ کی فوج میں افسر تھا درمیانی بنایا، اس بربر نے رات کے وقت زہیر سے مل کر کہا "اے امیر! میری بات کا یقین کیجیے، جس راستہ سے آپ المریہ کو واپس جا سکتے ہیں، اُس میں کئی چند مشکلات پیدا کی جائیں گی، پیشتر اس سے کہ یہ مشکلات پیدا کی جائیں، بہتر یہ ہے کہ آپ آج اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جائیں، اس صورت میں غرناطہ کی فوج پہاڑی دروں تک پہنچنے نہیں پائے گی کہ آپ وہاں سے نکل جائیں گے، اور اگر اس فوج نے آپ کا تعاقب بھی کیا تو آپ کھلے میدانوں میں اُس کا مقابلہ کر سکیں گے، یا اپنے کسی قلعے میں پناہ لے سکیں گے۔"

زہیر کو یہ صلاح مناسب معلوم ہوئی، لیکن ابن عباس جو اس تقریر کے وقت موجود تھا کہنے لگا کہ "خوف اس بربر کے منہ سے یہ باتیں کہلوا رہا ہے۔" بربر افسر نے جواب دیا "کیا میری نسبت آپ کو خوف کا گمان ہے؟ حالانکہ میں بیسیوں لڑائیوں میں لڑ چکا ہوں، آپ نے تو آج تک لڑائی کی شکل بھی نہ دیکھی ہوگی، اب آپ خود ہی دیکھ لیں گے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح نکلتا ہے یا غلط۔" اتنا کہہ کر بربر افسر زہیر سے رخصت ہوا،

ابن عباس کے دشمنوں نے جو بکثرت تھے بیان کیا ہے کہ بربر افسر کی صلاح اس لئے ابن عباس نے نہیں مانی تھی کہ در اصل وہ اپنے آقا زہیر کی موت چاہتا تھا، ان دشمنوں کا بیان ہے کہ ابن عباس فی الواقع المریہ کا بادشاہ بننا چاہتا تھا، وہ سمجھ گیا تھا کہ غرناطہ کے لوگ زہیر کو ضرور قتل کر دیں گے، اور خود یہ سوچ لیا تھا کہ اُس کے قتل ہوتے ہی بھاگ کر المریہ پہنچوں گا اور وہاں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دوں گا،

دشمنوں کے اس بیان میں کسی قدر سچ ضرور تھا، کیونکہ آگے چل کر ہم پڑھیں گے کہ ابن عباس نے صاحب غرناطہ بادلیس کے سامنے فخریہ کہا تھا کہ "میں نے زہیر کو دیدہ دانستہ جال میں پھنسایا تھا" غرض یہ جو کچھ بھی ہو زہیر جب غرناطہ سے المریہ کو روانہ ہوا تو

روانگی کے دوسرے دن راستے میں دیکھا کہ غرناطہ کی فوجوں نے اُسے چاروں طرف سے
گھیر لیا ہے۔ (۳۰ر اگست ۱۰۳۸ء مطابق ۲۸ر شوال ۴۲۹ھ بروز پنجشنبہ)
زہیر کے سپاہی ڈرے، لیکن خود زہیر نہیں گھبرایا، فوراً حبشی و اندلسی فوج کے
پانچ سو جوانوں کو لڑائی کے لئے صف لبستہ کیا، اور اپنے سپہ سالار ہذیل کو حکم دیا کہ صقالبہ (۶۱۴)
کے سواروں کو لے کر دشمن پر دھاوا کرے، ہذیل نے حکم کی تعمیل کی، لڑائی ابھی پوری
شروع بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہذیل یا تو برچھی کھاکر، یا گھوڑے کے ٹھوکر کھانے سے زمین پر
گرا، اُس کے گرتے ہی سوار میدان سے بھاگے، زہیر کے حبشی سپاہیوں نے جن پر زہیر
بے حد بھروسہ کرتا تھا عین وقت پر اپنے آقا کو دغا دی، اِن حبشیوں نے ہتھیاروں پر قبضہ
کر لیا اور پھر دشمن سے جا ملے، اب زہیر کے ساتھ صرف اندلسی سپاہی رہ گئے، جن میں
سپاہیانہ قابلیت ہمیشہ سے کم تھی، اُن کو سوائے میدان چھوڑنے کے دوسرا خیال
نہ تھا، زہیر نے سمجھ لیا تھا کہ شکست یقینی ہے، اِس لئے جب یہ اندلسی بھاگے تو وہ
بھی اُن کے ساتھ ہو گیا، چونکہ موضع البوت والاُیل توڑ دیا گیا تھا اِس لئے بھاگنے والوں
کو پہاڑوں میں اندر جاکر پناہ لینی پڑی، اِن میں سے بہت لوگوں کو غرناطہ کے فوجیوں نے
قتل کر دیا، انہی میں زہیر صاحب المریہ بھی تھا۔
عہدہ دارانِ دیوانی جو زہیر کے ہمراہ تھے گرفتار کر لئے گئے، بادیس نے حکم دیا کہ اُن
میں کسی کو جان سے نہ مارا جائے، ابنِ عباس بھی انہی گرفتار شدہ لوگوں میں تھا، اُسے
اپنی جان کا خوف مطلق نہ تھا، جو کچھ خوف تھا وہ اپنی کتابوں کا تھا، بار بار یہی زبان پر
تھا "واللہ، معلوم نہیں میرے سامان کا کیا درجہ ہوگا؟" غرناطہ کے سپاہی جب اُسے
پکڑ کر بادیس کے سامنے لے جانے لگے تو راستے میں سپاہیوں سے کہا "دیکھو! اپنے
آقا سے کہہ دینا کہ وہ میرے سامان کی بہت احتیاط کرے، کیونکہ اس میں ایسی کتابیں ہیں
جن کا مول نہیں ہے۔" جس وقت بادیس کے سامنے آیا تو ہنس کر کہنے لگا "اقرار کرو
کہ میں نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے۔" اس کے بعد المریہ کے عہدہ دار جو گرفتار

تھے اُن کی طرف اشارہ کر کے کہا "کیونکہ اِن کتّوں کو میں نے تمہارے حوالے کر دیا ہے پس اب اس احسان کا بدلہ کرو اور حکم دو کہ میری کتابوں کی احتیاط کی جائے، اس لئے کہ وہ مجھ کو دل سے عزیز ہیں"۔

جس وقت ابنِ عباس یہ گفتگو کر رہا تھا تو المریہ کے قیدی اُس کو غضب کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، اِن قیدیوں میں سے ایک فوجی افسر نے جس کا نام ابن شبیب تھا، بادیس سے کہا "یا امیر! میں آپ کو اُس ذاتِ پاک کی قسم دلا کر جس نے آپ کو فتح مند کیا ہے کہتا ہوں کہ اس بدبخت کو جس نے اپنے آقا اور مالک کے ساتھ دغا کی ہے ہرگز رہا نہ کیجئے گا، یہ جو کچھ ہو رہا ہے سب اسی کی حرکتوں کا نتیجہ ہے، اے کاش! میں اس کو سزا پاتے دیکھ لوں، اس کے بعد چاہے میرا سر ہی کیوں نہ اُتار لیا جائے"۔

یہ گفتگو سُن کر بادیس ہنسا، اور ابنِ شبیب کو اُس نے فوراً رہا کر دیا، مگر کسی اور سپاہی کو زندہ نہ چھوڑا، اور سپاہیوں کے علاوہ جو لوگ گرفتار ہوئے تھے وہ بھی قتل کر دیئے گئے، دیوانی کے عہدہ داروں میں صرف ابنِ عباس ایسا تھا جسے رہا نہیں کیا گیا۔ (٦١٥)

اِس وقت یہ مغرور اور سرکش وزیر اُس طالع بد کے سامنے کھڑا تھا جسے مجنونانہ غرور میں اُس نے کوئی چیز نہ سمجھا تھا، اور المریہ کے شاعر کی یہ پیشین گوئی کہ "مشیت نمودار ہو کر بدبختی کو بیدار کر دے گی" پوری ہو گئی، الحمرہ کے ایک تاریک حجرہ میں ابنِ عباس قید کر دیا گیا، بیس سیر وزن کی زنجیریں اُس کے پاؤں میں ڈال دی گئیں، وہ خوب جانتا تھا کہ بادیس کو اُس پر غصہ ہے، اور بادیس کا وزیر سموائل اُسے جان سے مارنے کی فکر میں ہے، لیکن اُمید کی ایک رمق اب تک دِل میں باقی تھی، رہائی کے لئے تیس ہزار سکۂ زر بادیس کو نذر دینے کے لئے کہا، بادیس نے سوچ سمجھ کر جواب دینے کو کہا، تقریباً دو مہینے اسی میں گذر گئے، اور بادیس نے کچھ فیصلہ نہیں کیا، دربارِ غرناطہ پر مختلف لوگوں نے مختلف طور پر زور ڈالا، ایک طرف قرطبہ کا سفیر تھا، جو مُصر تھا کہ ابنِ عباس کو فوراً رہا کر دیا جائے، دوسری طرف صاحب بلنسیہ عبد العزیز عامری کا سفیر اور بہنوئی ابو الاحواز معن ابن صمادح چاہتا تھا کہ تمام قیدی بلا استثناء قتل کر دیئے جائیں، اور جو شخص سب سے پہلے قتل

کیا جائے وہ ابنِ عباس ہو، عبدالعزیز المریہ کی ریاست پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ اپنے کو اس کا مستحق اس بنا پر سمجھتا تھا کہ زہیر اُس کے خاندان کا مولی تھا، مگر اُسے خوف تھا کہ اگر ابنِ عباس زندہ رہا، اور دوسرے قیدی رہا کر دیئے گئے تو یہ سب المریہ پر عبدالعزیز کا قبضہ نہ ہونے دیں گے، بادلیس بھی شش و پنج میں تھا، ایک طرف روپیہ کا لالچ تھا، دوسری طرف انتقام کی خواہش تھی، اسی تردد میں تھا کہ ایک دن گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا، اُس کا بھائی بلکین ہمرکاب تھا، بادلیس نے بلکین سے ابنِ عباس کا ذکر کیا اور کہا کہ "وہ تیس ہزار اشرفیاں بطور زرِ فدیہ دینے کو کہتا ہے تمہاری کیا رائے ہے؟" بلکین نے کہا "اگر آپ نے ابنِ عباس کو روپیہ لے کر چھوڑ دیا، تو پھر وہ ایک ایسی جنگ چھیڑ دے گا جس کے مصارف اس زرِ فدیہ سے دو چند ثابت ہوں گے۔ میری رائے میں تو اس کا فوراً قتل کر دینا بہتر ہوگا۔"

بادلیس جب واپس آیا تو ابنِ عباس کو طلب کیا، جب وہ حاضر ہوا تو جس قدر بے انصافیاں اُس نے کی تھیں اُن پر بادلیس نے اُسے سخت و سست کہا، ابنِ عباس بالکل خاموش نہایت صبر کے ساتھ بادلیس کی لعنت ملامت سنتا رہا، جب بادلیس خاموش ہوا تو ابنِ عباس نے کہا "مجھ پر رحم کرو، مصیبتوں سے مجھے آزاد کرو"، بادلیس نے کہا، "مصیبتوں سے تو ابھی رہائی مل جاتی ہے، لیکن جہاں تمہیں جانا ہے وہاں کی مصیبتیں بہت سخت ہوں گی"۔ اس پر ابنِ عباس کچھ نہ بولا، بادلیس نے اپنے بھائی بلکین سے کچھ باتیں بربری زبان میں کیں، جن کو ابنِ عباس مطلق نہ سمجھا، لیکن بادلیس کے آخری جملے اور خونی انداز سے سمجھ گیا کہ بس اب وقت آ گیا، ابنِ عباس نے کہا "بادلیس! میرے خون سے پرہیز کر، میرے اہل و عیال پر رحم کر، تیس ہزار اشرفیاں نہیں مجھے اپنی (۱۰۴۶)
جان کے بدلے ساٹھ ہزار اشرفیاں دینی منظور ہیں"۔

بادلیس نے یہ باتیں سن کر منہ سے کچھ نہ کہا اور ایک نیزہ اٹھا کر ابنِ عباس کے سینے پر مارا، بادلیس کے بھائی بلکین و وزیر علی ابن کردی نے بھی نیزے مارے، اور ابنِ عباس سترہ زخم کھا کے ختم ہو گیا (۴ ستمبر ۱۰۳۸ء مطابق یکم ذی الحجہ ۴۲۹ھ بروز دوشنبہ)

تھوڑے ہی دن میں اہلِ غرناطہ کو معلوم ہوا کہ دولت مند اور مغرور ابنِ عباس مارا گیا، ہر بر دِل میں بہت خوش ہوئے، لیکن جس قدر خوشی اس خبر سے سموایل کو ہوئی اُور کسی کو نہ ہوئی۔ اب اس یہودی کا صرف ایک دشمن اور باقی رہ گیا تھا اور وہ ابنِ لقنّہ تھا. سموایل کو ایک فال سے معلوم ہو گیا تھا کہ ابنِ لقنّہ بھی جلد مارا جائے گا، یہودی اور عرب سب کو یقین تھا کہ رات کے وقت جب پہرا بدلا جاتا ہے تو غیب سے آوازیں سنائی دیتی ہیں، ایک رات سموایل کو سوتے سوتے عبرانی زبان میں تین مصرعے سنائی دیئے جنکا مضمون یہ تھا۔

"ابنِ عباس اور اُس کے بڑے دوست مر چکے ہیں، خدا کی تعریف ہو، اُس کے نام کو بندگی ہو، دوسرا وزیر جو ابنِ عباس کا شریک تھا وہ بھی گرے گا، اور مارا جائے گا، وہ اُن کی دھمکیاں اور عداوتیں اور زور کیا ہوئے؟ آخر کار وہ کچھ نہ کر سکے، خدا کا نام بڑا ہے۔[1]"

ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا کہ سموایل نے خواب میں جو کچھ سُنا تھا وہ سچ نکلا، حقیقت یہ ہے کہ عداوت ہو یا محبت، آئندہ کا حال معلوم کرنے کے لئے انسان کے دماغ میں ایک عجیب قوت پیدا کر دیتی ہے۔

اسناد

ابی بسام	ج ۱ - ص ۱۲۲، ۱۷۱ تا ۱۷۵، ۲۰۱
رازی	ص - ۳۷
عباد (ڈوزی)	ج ۲ - ص - ۳۴
المقری	ج ۲ ص ۳۵۹، ۳۶۰
ابن الخطیب (قلمی نسخہ ۱۷)	ص ۵۱ تا ۵۲، ۱۳۴ تا ۱۳۵

---

[1] جرنل ایشیاٹک، سلسلہ ۴، حصّہ ۱۶، ص ۲۱۲

کتاب رابع

ملوک الطوائف

تیسری فصل

ابو الفتوح

بادیس نے ابنِ عباس کو قتل کر کے نادانستہ اس فریق کو قوت دے دی جو ہشام ۶۱۷
المؤید کو اب تک خلیفہ تسلیم کر رہا تھا، عبدالعزیز صاحبِ بلنسیہ نے زہیر کی موت کے بعد ریاستِ المریہ پر قبضہ کر لیا، مگر عبدالعزیز کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اپنے دوست قاضی ابوالقاسم محمد والیٔ اشبیلیہ کی مدد کر سکتا، کیونکہ عبدالعزیز کو بہت مجاہد صاحبِ دانیہ مجاہد کے حملوں سے اپنی ریاست کو بچانا پڑا، مجاہد یہ نہ دیکھ سکتا تھا کہ اُس کی ریاست سے متصل عبدالعزیز کی ریاستِ بلنسیہ کو وسعت حاصل ہوتی چلی جائے[1] بہر کیف قاضی

---

[1] عبدالعزیز سنہ ۴۳۳ھ (سنہ ۱۰۴۱ء) میں المریہ سے چلا گیا تھا، اور حکومت اپنے ایک عزیز ابوالاحوص معن کے سپرد کر گیا تھا، دیکھو ڈوزی کی کتاب تحقیقات۔ ج ۱ ص ۲۴۱

ابوالقاسم محمد کو المریہ کی طرف سے اب جنگ کا کوئی اندیشہ نہ رہا، اور اس لیے بربر سے لڑنے کے لیے پوری توجہ کرنے کا موقع مل گیا، سب سے پہلے محمد بن عبداللہ برزالی صاحبِ قرمونہ سے لڑنے کی ٹھیرائی، کیونکہ قاضی ابوالقاسم اور ابن عبداللہ برزالی میں مخالفت مدت سے چلی آتی تھی، اسی زمانہ میں قاضی ابوالقاسم محمد نے غرناطہ میں ایک فریق سے خط وکتابت شروع کی اور وہاں بغاوت پھیلانی چاہی، غرناطہ میں اب بہت لوگ بادیس سے ناراض رہنے لگے تھے، شروع زمانۂ حکومت میں بادیس سے رعایا کو اچھی امیدیں تھیں، لیکن رفتہ رفتہ وہ ظالم، حیلہ ساز، دشمنوں کے خون کا پیاسا، اور قابلِ شرم طریقہ پر مے خوار ثابت ہوا، غرض رعایا کی شکایتیں اور ناراضی بغاوت کا دیباچہ ہوگئیں اس بغاوت کا سرغنہ باہر کا ایک شخص ابوالفتوح نامی تھا، اسپین اس کا وطن نہ تھا، ایشیا میں جرجان کے ملک میں جس کا قدیم نام ہرکانیہ تھا پیدا ہوا تھا، بغداد میں مشہور اساتذہ سے ادب وحکمت وہیئت کی تعلیم حاصل کی تھی، صرف عالم ہی نہ تھا بلکہ شہسوار بھی تھا، شریر گھوڑوں کو رام کرنے، تیر اندازی اور تلوار چلانے میں بھی ویسی ہی مہارت تھی جیسے ایک نفیس نظم یا فلسفہ کے کسی دقیق مسئلہ پر ایک کتاب لکھنے میں کمال حاصل تھا، اسپین میں ابوالفتوح ۴۰۶ھ ۱۰۱۵ء میں تبلاشِ روزگار آیا تھا، کچھ زمانے تک مجاہد صاحبِ دانیہ کے دربار میں حاضر رہا، مجاہد صاحب دانیہ بھی بڑا زبردست عالم تھا، ابوالفتوح کبھی اس عالمِ بادشاہ سے علمی مباحث میں اور کبھی اپنی کتاب جمل کے لکھنے میں مصروف رہا، یہ مشہور کتاب اُس نے نحو پر لکھی تھی، ایک موقع پر مجاہد کے ساتھ ہو کر جزیرہ سردانیہ پر حملہ کرنے میں شریک ہوا، اکثر فلسفہ کے غوامض حل کرنے، یا علمِ نجوم سے آئندہ کی خبریں نکالنے میں اپنا وقت صرف کرتا۔

دانیہ سے ابوالفتوح سرقسطہ چلا گیا، جہاں منذر ابن یحیی التجیبی حکومت کرتا تھا، یہاں منذر ۱۸
نے شروع میں اس کی بہت خاطر ومدارات کی، اور اپنے فرزند کا اُسے اتالیق مقرر کیا، مگر بقول ایک عربی مؤرخ کے جس نے بہت صحیح کہا ہے کہ زمانہ بدلتا ہے، اور زمانے کے ساتھ آدمی بھی بدل جاتے ہیں۔" ایک دن منذر نے ابوالفتوح سے کہا کہ

"اب مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہے اور بہتر ہے کہ آپ سرقسطہ چلے جائیں"۔

ابو الفتوح، سرقسطہ سے نکل کر غرناطہ میں آباد ہو گیا، اور یہاں عربوں کی قدیم شاعری پر، بالخصوص اُس مجموعہ نظم پر جس کا نام حماسہ[1] ہے درس دینے لگا، لیکن افسوس ہے کہ اِس درس و تدریس کے علاوہ اُس کو اور کاموں کے لیے بھی وقت مل گیا، یہ معلوم کر کے کہ غرناطہ میں بادیس کے خلاف بہت لوگ ہیں، اس نے بادیس کے عزاد یعذیر کو حکومت کی طمع دلائی، اور اُسے باور کرایا کہ بادیس کا عنقریب تخت سے اتارا جانا اوضاع کواکب سے ثابت ہوتا ہے اور یہ کہ یعذیر بیس برس تک صاحب تاج و تخت رہے گا، اس طریقہ سے ابو الفتوح نے بادیس بادشاہِ غرناطہ کے خلاف ایک سازش کی بنا ڈال دی لیکن سازش ابھی پختہ نہ ہونے پائی تھی کہ بادیس کو خبر ہو گئی، یعذیر اور اس کے ہوا خواہوں کو جو سازش میں شریک تھے، مشکل سے اتنا وقت ملا کہ جان بچا کر بھاگ سکیں، غرض بمشکل یہ سب غرناطہ سے بھاگ کر اشبیلیہ میں قاضی ابو القاسم محمدؔ کے پاس پہنچے، قاضی ابو القاسم بھی غالباً اس سازش میں معاون تھے، گو یہ نہیں دریافت ہو سکا کہ وہ کس حد تک اس میں شریک تھے۔

اسی اثنا میں قاضی ابو القاسم محمد نے ابن عبد اللہ برزالی صاحب قرمونہ کے علاقہ پر فوج کشی کا حکم دیا، قاضی ابو القاسم محمدؔ کے فرزند اسماعیل کی سرکردگی میں اشبیلیہ کی فوجوں نے بہت سی فتوحات حاصل کیں، اشونہ اور استجہ کے شہروں کو مجبور کیا کہ وہ اطاعت قبول کریں، قرمونہ کا محاصرہ کر لیا، جب قرمونہ میں ابن عبد اللہ برزالی کی حالت نازک ہو ئی تو اس نے ادریس صاحب مالقہ اور بادیس بادشاہِ غرناطہ سے مدد طلب کی، ان دونوں نے برزالی کی درخواست منظور کی، ادریس اُس زمانہ میں بیمار تھے، انہوں نے اپنے وزیر ابن بقنہ کی سرکردگی میں فوج کمک روانہ کی، بادیس خود فوج لے کر چلا، جب غرناطہ اور مالقہ کی فوجیں ایک جگہ ہو گئیں تو اسماعیل نے ان سے لڑنا چاہا، لیکن

---

[1] ابو تمام کی کتاب حماسہ کے حالات کے لیے دیکھو آر۔ اے نکلسن کی کتاب عربوں کی ادبی تاریخ مطبوعہ ۱۹۰۷ء ص ۱۲۹ تا ۱۳۰، حماسہ کا ترجمہ جرمن زبان میں ایف۔ روکرٹ نے کیا ہے۔

بادیس اور ابنِ بقنہ نے یہ دیکھ کر یا حسن فرض کرکے کہ اسماعیل کی فوج تعداد میں زیادہ ہے لڑنا پسند نہیں کیا، اور ابنِ عبداللہ برزالی صاحب قرمونہ کو اس کی قسمت پر چھوڑ ابن بقنہ مالقہ کو اور بادیس غرناطہ کو واپس چلے آئے۔ اسماعیل نے غرناطہ کی فوج کا تعاقب کیا، خوش قسمتی سے ابن بقنہ کو بادیس سے علیحدہ ہوئے صرف ایک ہی گھنٹہ ہوا تھا، بادیس نے مدد کے لیے ابن بقنہ سے پلٹنے کو کہا، ابن بقنہ فوراً واپس آیا۔ اب مالقہ اور غرناطہ کے لشکر استجہ کے قریب یکجا ہو کر بہت ترتیب کے ساتھ اسماعیل کے حملے کے منتظر ہو گئے۔

اشبیلیہ کی فوجیں اس خیال میں تھیں کہ فقط بھاگتے دشمن کا پیچھا کرنا ہے، لیکن جب (۶۱۹)
انہوں نے دیکھا کہ دشمن کے دونوں لشکر (یعنی غرناطہ اور مالقہ کے لشکر) لڑائی کے لیے صف بستہ ہیں تو انہیں تعجب ہوا، اس تعجب و حیرت کی حالت میں پہلے ہی حملے پر اشبیلیہ والوں کی صفوں میں ابتری پڑ گئی، اسماعیل نے بہت کوشش کی کہ اپنی فوج کو پراگندہ نہ ہونے دے، مگر وہ خود ہی اپنی ہمت و مردانگی کا شکار ہو گیا اور پہلا شخص جو اس لڑائی میں مارا گیا، وہ خود اسماعیل تھا، اسماعیل کے کام آتے ہی اشبیلیہ کی فوج نے میدان سے بھاگنے ہی میں اپنی جان کی سلامتی دیکھی۔

بادیس نے یہ لڑائی آسانی سے سر کر کے استجہ کے دروازے کے سامنے اپنا خیمہ نصب کیا ہی تھا کہ یکایک ابو الفتوح آیا اور بادیس کے قدموں میں گر پڑا، بیوی بچوں کی محبت نے اس کو اس حرکت پر مجبور کیا، غرناطہ سے ایسی جلدی میں بھاگا تھا کہ اہل و عیال کو وہیں چھوڑنا پڑا تھا، اس کا علم ہو چکا تھا کہ بادیس کے حبشی داروغہ قدام نے جو بڑا ظالم تھا بادیس کے حکم سے اُس کے بیوی بچوں کو المنکب میں قید کر رکھا ہے، ابو الفتوح کو اپنی بیوی سے جو ایک بہت ہی خوشرو و نوجوان اندلسی عورت تھی بہت محبت تھی، دو بچے بھی تھے، ایک بیٹا تھا ایک بیٹی، اِن بچوں پر بھی وہ جان دیتا تھا، بغیر بیوی بچوں کے اُس کی زندگی دوبھر ہو گئی تھی، اس کا خوف بھی تھا کہ کہیں اس کے قصور کا بدلہ ان بیگناہوں سے نہ لیا جائے، غرض انہی وجوہ سے اس وقت وہ بادیس کے سامنے اپنے قصور کی معافی

چاہنے کے لیے حاضر ہوا تھا، وہ اگرچہ بادیس کے غیظ وغضب سے بخوبی واقف تھا، لیکن خیال تھا کہ اہل سازش میں سے ایک شخص ابن ریش کا قصور بادیس معاف کر چکا ہے، اس لئے خود بھی جرأت ہوئی کہ عذر تقصیر پیش کر کے کسی طرح اپنے بیوی بچوں سے ملے، الوالفتوح نے بادیس کے قدموں میں گر کر کہا "یا امیر! میرے حال پر رحم فرمایئے، میں بقسم کہتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں"۔ بادیس نے غصہ سے آنکھیں سرخ کر کے کہا "کیا تیری موت قریب ہے جو تو میرے پاس آیا ہے؟ تو تو وہ ہے جس نے میرے خاندان کے لوگوں میں فساد ڈلوا دیا ہے، اور اب کہتا ہے کہ میں بے قصور ہوں کیا تو سمجھتا ہے کہ میں اس طرح آسانی سے تیرے دھوکے میں آجاؤں گا"۔

الوالفتوح نے بادیس سے کہا "خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھ پر رحم کیجئے، یاد کیجئے کہ کس طرح آپ نے اپنے سایۂ عاطفت میں مجھے پناہ دی تھی، اور اس وقت میں کس طرح اپنے وطن سے بے وطن ہو کر مصیبت میں مبتلا ہوں، اپنے کسی عزیز کے جرم کو مجھ سے منسوب نہ کیجئے، میں اس جرم میں نہ کبھی شریک ہوا تھا اور نہ مجھے اس سے کچھ سروکار تھا، یہ سچ ہے کہ میں غرناطہ سے فرار ہوا، مگر اس کی وجہ محض یہ تھی کہ آپ جانتے تھے کہ آپ کا عزیز میرا دوست ہے، میں ڈرا کہ اس دوستی کی وجہ سے مجھے بھی آپ سازش میں شریک سمجھ کر کہیں سزا نہ دیں، میں اس وقت آپ سے عاجزی کرتا ہوں اگر آپ کی یہی خوشی ہے کہ ایک جرم جو میں نے نہیں کیا ہے اُس کا اقبال کر لوں، تو آپ سے معافی حاصل کرنے کے لیے مجھے یہ بھی گوارا ہے، میرے ساتھ ایسا سلوک کیجئے جو ایک بادشاہ کے شایانِ شان ہے، بادشاہ کا رتبہ بڑا ہوتا ہے کہ وہ ایک غریب و عاجز انسان سے عداوت نہیں کرتا، مجھے میرے بیوی بچے دلوا دیجیے"۔

بادیس نے جواب دیا کہ "اگر خدا کی مرضی ہے تو میں تیرے ساتھ وہی سلوک کرونگا جس کا تو مستحق ہے، غرناطہ کو واپس جا، تیرے بیوی بچے تجھ سے وہیں ملیں گے، جس وقت میں وہاں پہنچوں گا تو تیرے معاملہ کا فیصلہ کروں گا"۔ (۶۲۰)

یہ جملے مبہم سے تھے، مگر الوالفتوح ان کو سچ سمجھ کر دو سواروں کے ساتھ غرناطہ کی

طرف روانہ ہوا، بادیس نے اپنے حبشی داروغہ قدام کو پہلے ہی سے حکم بھیج دیا تھا جب ابوالفتوح شہر غرناطہ کے قریب پہنچا تو قدام کے آدمیوں نے اُس کو گرفتار کر لیا اور اس کا سر منڈوا کر اُسے اُونٹ پر سوار کیا، اور اس شکل سے شہر کے گلی کوچوں میں اُس کی تشہیر کی، اس کے بعد ابوالفتوح اور اس کے ایک ساتھی کو جو بربر تھا اور استجہ میں گرفتار ہوا تھا قید خانے بھیج دیا۔

ابوالفتوح کو قید خانے میں بہت دن گذر گئے، بادیس غرناطہ واپس بھی چلا آیا، مگر ابوالفتوح کے مقدمہ کا کوئی فیصلہ نہ کیا، اس تاخیر کا باعث بادیس کا بھائی بلکین تھا، جس کے اشارے سے ابن عباس قتل کیا گیا تھا، کوئی وجہ ایسی تھی کہ بلکین کو اِس عالم کے ساتھ دلچسپی تھی اور وہ اُسے بے قصور جانتا تھا اور بادیس سے ابوالفتوح کی سفارش اس طرح کرتا تھا کہ بادیس ابوالفتوح کے قتل کا ارادہ کر سکتا تھا لیکن ایک دن بلکین دوستوں میں بیٹھا شراب پی رہا تھا کہ بادیس نے ابوالفتوح اور اس بربر کو جو ابوالفتوح کے ساتھ قید تھا سامنے بلوایا، بادیس نے ابوالفتوح کو بہت سخت الفاظ کہنے کے بعد کہا جھوٹے، تیری نجوم دانی سے تجھے کیا نفع پہنچا؟ کیا تو نے اپنے امیر لیعذیر کو یہ خبر نہیں دی تھی کہ وہ میرے تخت کا مالک ہو کر تیس برس حکومت کرے گا، تو نے اُس بیوقوف کو تو دھوکے اور فریب میں رکھا، مگر اپنا زائچہ نہ دیکھا کہ خود مصیبت سے اپنے تئیں بچائے رکھتا، بدبخت! اب میری مٹھی میں تیری جان ہے۔"

ابوالفتوح نے بادیس کی اس گفتگو کا کچھ جواب نہ دیا، جس وقت تک بیوی بچوں کو دیکھنے کی قدرے قلیل اُمید تھی اُس وقت تک ابوالفتوح آہ وزاری اور غلط بیانی سب کچھ گوارا کر سکتا تھا، لیکن جب یقین ہو گیا کہ اس ظالم اور مکار بادشاہ کے دل کو کوئی چیز نرم نہیں کر سکتی تو پھر اس میں وہی پہلی سی خود داری پیدا ہو گئی، نظریں نیچی تھیں چہرے پر نفرت آمیز تبسم اور لبوں پر مہر تھی، اس کیفیت نے بادیس کو غصہ سے اور بھی مجنون کر دیا، منہ سے کف جاری ہو گئے، اور تلوار اٹھا کر ابوالفتوح کے سینے میں بھونک دی ابوالفتوح نے بغیر کسی قسم کی حرکت یا منہ سے آہ نکالے تلوار کی اس ضرب کو اس طرح

برداشت کیا کہ بادیس کے منہ سے بھی تعریف نکلی، بادیس نے پھر اپنے غلام بربر ان سے کہا کہ سر کاٹ کر ایک اونچی لکڑی پر نصب کر دے اور باقی لاش کو ابن عباس کے قریب دفن کر دے، تاکہ میرے یہ دونوں دشمن قیامت تک پاس پاس سوتے رہیں، اس کے (۱۲۱) بعد بادیس اُس بربر سے مخاطب ہوا جو ابوالفتوح کے ساتھ قید تھا، اور کہنے لگا "اے بدبخت! اب تیری باری ہے، قریب آ"

بربر جس سے یہ الفاظ کہے گئے تھے عجیب حالتِ اضطراب میں تھا، سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا، اسی حالت میں بادیس کے قدموں پر کر منتیں کرنے لگا کہ میری جان چھوڑ دی جائے، بادیس نے کہا "کم بخت، تجھ میں ذرا غیرت نہیں، اس بڑے عالم و فاضل کو جس کی لاش سامنے پڑی ہے اگر خوف ہوتا تو بجا تھا، مگر تو نے دیکھا کہ اس نے کیسی جوانمردی سے جان دی ہے، لب تک نہ ہلا، مگر تو پرانا سپاہی ہو کر اور اپنے کو بڑا بہادر سمجھ کر اس طرح کی بزدلی ظاہر کرتا ہے، خدا تجھ پر رحم کرے" یہ کہہ کر تلوار کا ایک ہاتھ مارا اور بربر کا سر کٹ کر زمین پر گر پڑا (۲۰ اکتوبر ۱۰۳۹ء شنبہ ۲۸ محرم ۴۳۱ھ)

ابوالفتوح کا جنازہ ابن عباس کے قریب دفن کیا گیا، اور جو اہل علم تھے ان کا رنج و ملال بھی اس میت کو قبر میں رکھوانے ساتھ ساتھ گیا، عرب جو خاموشی اور صبر کے ساتھ غیر ملک کے اس وحشی بربر بادیس کی حکومت برداشت کر رہے تھے جب ابوالفتوح کی قبر کے پاس سے گذرتے تھے "تو اکثر کہتے تھے آہ! یہ دونوں جن کی مٹی یہاں دبی ہے کیسے بے مثل عالم تھے، ثبات صرف خدا کی ذات کو ہے، بزرگی ہو اُس کے نام کو"

اسناد

عباد (ڈوزی) ج ۱ ص ۵۱

ج ۲ ص ۳۳ تا ۳۴، ۲۰۷، ۲۱۷

ابن الخطیب (قلمی نسخہ ۞) ص ۱۱۴ تا ۱۱۵

عبدالواحد ص ۴۴، ۶۵

کتاب رابع

ملوک الطوائف

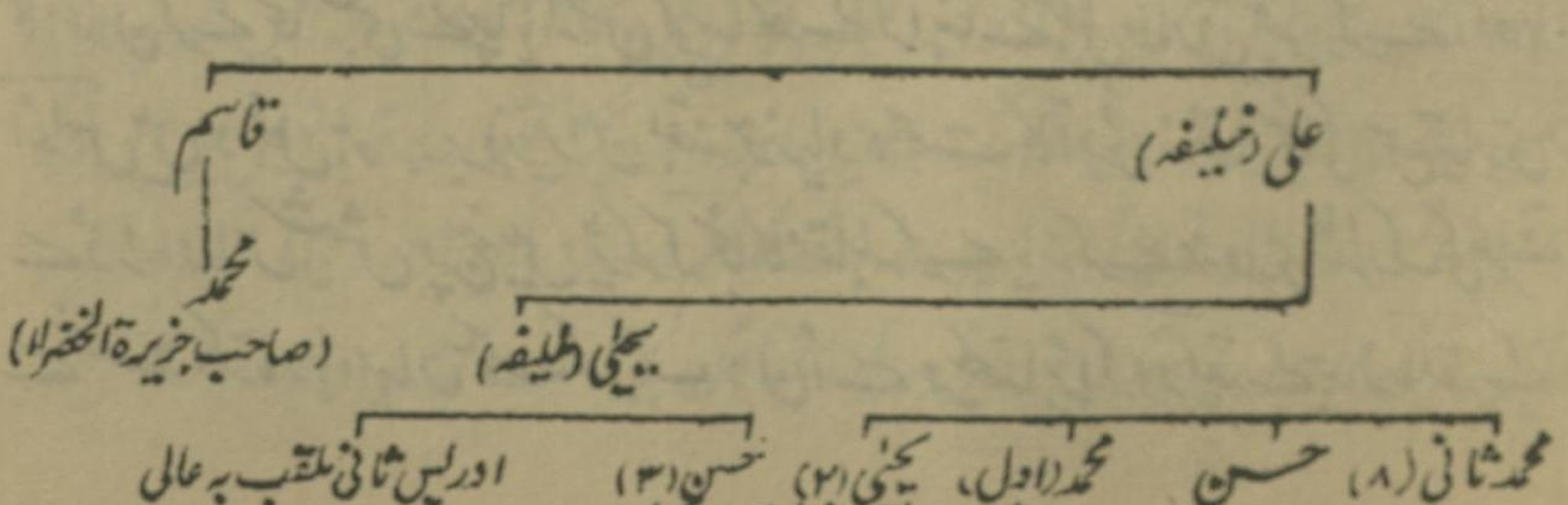
چوتھی فصل

مالقہ

۲۲۱ بادیس امیر غرناطہ (جسے عربی مؤرخ صاحب صنہاجہ بھی لکھتے ہیں) اپنے فریق میں زیادہ نمایاں ہوتا گیا، گو مالقہ کے بنی حمود[1] کی سیادت و خلافت کو محض ایک ضابطہ کی بات سمجھ کر ابھی تک وہ تسلیم کر رہا تھا، مالقہ کے بنی حمود کمزور ہو کر اب اپنے وزیروں کے ہاتھ میں تھے، لیکن باوجود اس کمزوری کے بنی حمود اپنے حریفان مقابل کو زیر اور

---

[1] بنی حمود کا شجرۂ نسب :-



خنجر سے مارنے پر اب بھی تیار تھے، بڑے والیانِ ریاست جو اُن کی خلافت کو تسلیم کر کے گویا اُن کے ماتحت تھے، اُن پر قابو یافتہ رہنے کا بنی حمود کو کچھ خیال نہ تھا، وہ صرف اسی میں خوش تھے کہ مالقہ، طنجہ اور سبتہ پر ایک ظاہری امن و امان کے ساتھ حکومت کرتے رہیں۔

اِس کے علاوہ غرناطہ اور مالقہ کے شاہی درباروں میں بھی بڑا فرق تھا، غرناطہ کے دربار میں بربریا ایسے لوگوں کے سوا جیسا کہ وزیر سموایل تھا، جو ہر وقت بربر کی بھلائی کی فکر میں رہتا تھا کوئی دوسرا نہ تھا، اس وجہ سے دربارِ غرناطہ کو ایک قسم کا استحکام حاصل تھا برعکس اِس کے مالقہ کے دربار میں صقالبہ کا قدم بھی موجود تھا اور اُن کی وجہ سے بہت جلد وہی رشک و حسد، عداوتیں اور رقابتیں پیدا ہونی شروع ہو گئیں جنھوں نے دولتِ بنی امیہ کو غارت کیا تھا۔

حمودی خلیفہ ادریس اول نے جس وقت ابن عبداللہ صاحبِ قرمونہ کی مدد پر فوج بھیجی تھی تو ادریس اُس وقت بہت بیمار تھے، قاضی ابوالقاسم محمد صاحب اشبیلیہ کے فرزند اسماعیل جو استجہ پر مارے گئے تھے، جب اُن کا سر خلیفہ ادریس کے سامنے پیش ہوا، تو اس کے دو دن بعد خلیفہ ادریس بھی مر گئے، اُن کے انتقال پر مالقہ کے بربر وزیر ابن بقنہ اور صقلبی وزیر نجا میں نزاع شروع ہوا، ابن بقنہ چاہتا تھا کہ مالقہ کا تختِ حکومت ادریس کے بڑے فرزند یحییٰ کو ملے، اور غرض اس میں یہ تھی کہ اگر یحییٰ خلیفہ ہو گئے تو حکومت کے جملہ اختیارات ابنِ بقنہ کو حاصل ہو جائیں گے، نجا صقلبی نے اس کی مخالفت کی، نجا اس وقت افریقہ میں بنی حمود کی ریاستوں کا وزیرِ اعظم تھا، اس نے افریقہ میں یحییٰ بن علی بن حمود کے فرزند حسن کی خلافت کا اعلان کیا، یہ حسن ابن بقنہ والے یحییٰ کے عمزاد تھے، حسن کی خلافت کا اعلان کر کے نجا صقلبی نے چاہا کہ حسن کو ساتھ لے کر آبنائے جبل طارق عبور کرے، اور اندلس میں داخل ہو، بربر وزیر ابن بقنہ جو زیادہ ہمت کا آدمی نہ تھا، نجا کی اس تیاری سے ڈرا، اور اس شش و پنج میں پڑ کر کہ نجا کا مقابلہ کرے یا نہ کرے ضروری تدارک کی طرف سے غفلت کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن اُسے دیکھنا پڑا کہ افریقہ کے جہاز مالقہ کے

سامنے لنگرانداز ہوئے ہیں جہازوں کا بیڑا دیکھ کر ابن بقنہ ایسا گھبرایا کہ یحییٰ بن ادریس کو ساتھ لیے کمارش چلا گیا، اب حسن مالقہ کے مالک ہو گئے۔ ابن بقنہ جو کمارش میں تھا اُسے یقین دلایا گیا کہ اگر وہ مالقہ واپس آجائے گا تو اُس کا قصور معاف کر دیا جائیگا، ابن بقنہ (۶۲۳) نے حسن کے وعدہ کا اعتبار کیا اور مالقہ چلا آیا، مگر مالقہ پہنچتے ہی ابن بقنہ قتل کرا دیا گیا، اور سموایل یہودی کی پیشگوئی پوری ہوئی، کچھ دنوں بعد حسن کے رقیب یعنی یحییٰ بن ادریس جنہیں ابن بقنہ خلیفہ بنانا چاہتا تھا مارے گئے۔ بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ اس قتل کا خاص محرک نجا صقلبی تھا، بہرکیف حسن کو اس جرم کی سزا اٹھانی پڑی اور وہ اس طرح کہ حسن کی بیوی نے جو یحییٰ بن ادریس کی بہن تھیں، بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لیے شوہر کو زہر دے دیا۔

اب نجا صقلبی کو یہ خیال گذرا کہ وزارت تو بہت دن کر لی، اب بالکل مختار بن کر تخت حاصل کرنا چاہیے، اسی خیال سے اُس نے حسن کے فرزند کو جو ابھی ایک نو عمر لڑکا تھا ایک چال سے مار کر اور حسن کے بھائی ادریس کو قید کر کے بربر سے کہا کہ مجھے خلیفہ مانو میں تم سے حسنِ سلوک کا وعدہ کرتا ہوں۔"

بربر کو نجا کی اس غائبانہ حرکت پر کہ بنی حمود کی حکومت کو جو آلِ حسن علیہ السلام کی حکومت تھی مٹا کر خود خلیفہ بننا چاہتا ہے بہت غصہ آیا، لیکن سوائے اس کے کہ نجا کے اس قصد میں مساعدت کرتے اور کوئی چارہ نہ دیکھا، انہوں نے بظاہر نجا سے موافقت کا اظہار کیا، مگر دل میں سوچ لیا کہ موقع مناسب پر نجا کو اس حرکت کی سخت سزا دی جائے گی مختصر یہ کہ اس وقت نجا سے انہوں نے بیعت کر لی۔

اب نجا نے محمد بن قاسم بن حمود کا جو جزیرہ الخضراء میں حکومت کرتا تھا استیصال چاہا اور اس سے لڑائی شروع کر دی، لیکن لڑائی میں نجا کو معلوم ہوا کہ اُس کے بربر سپاہی دشمن سے لڑنے میں بے دلی ظاہر کر رہے ہیں اور وہ ہرگز اعتبار کے قابل نہیں ہیں پس بہ نظر احتیاط اُس نے اپنی فوج کو میدان سے ہٹنے کا حکم دے دیا، اور ارادہ کیا کہ مالقہ واپس ہو کر جن بربر سرداروں کی نیت میں فرق دیکھا تھا اُن کو برطرف کرے اور جہاں تک ممکن ہو

متقالبہ کو بلا کر ان کی مدد سے غیروں کے مقابلہ کے لیے قوت حاصل کرے، لیکن نجا کے دشمنوں کو اس کا یہ ارادہ یا تو خود قیاس دوڑانے سے یا کسی کے اطلاع کرنے سے دریافت ہوگیا، اور جس وقت لشکر، مالقہ کو جاتے ہوئے ایک تنگ پہاڑی درے میں سے گذرنے لگا تو انہوں نے نجا پر حملہ کر کے اُسے قتل کر دیا (۵ فروری ۱۰۴۳ء، شنبہ، ۲۱ جمادی الآخر ۴۳۴ھ)

اب لشکر میں ابتری پڑی، بر برخوشی کے نعرے لگانے لگے، صقالبہ اس خوف سے کہ کہیں وہ بھی نجا صقلبی کی طرح قتل نہ کر دیے جائیں، لشکر چھوڑ کر بھاگ گئے، نجا کے قاتلوں میں سے دو سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے مالقہ میں آئے، شہر میں داخل ہوتے ہی دونوں نے مبارکباد، مبارکباد کا شور مچایا، اور جب نجا کے نائب سطیفی کے پاس پہنچے تو اُسے بھی قتل کر دیا، اور اب سب نے مل کر حسن کے بھائی ادریس بن یحییٰ (ابن علی بن حمود) کو قید خانے سے نکال کر اپنا سردار بنایا، اور ان سے بیعتِ خلافت کر کے انہیں عالی کے لقب سے ملقب کیا۔

مالقہ میں صقلبی خدام کو جو کچھ کرنا تھا وہ خاتمے کو پہنچا، امن اگرچہ ہوگیا مگر زیادہ دن نہ رہا، ادریس ثانی جو اس وقت عالی کے لقب سے خلیفہ ہوئے تھے کچھ قابل آدمی نہ تھے، رحم دل اور فیاض ضرور تھے، روپیہ خیرات کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتے تھے، اور اگر تمام امور میں رعایا کا دارومدار انہی کی ذات پر ہوتا تو سب خوش و خرم رہتے،
۴۲۴ جو لوگ شہر سے نکل گئے تھے عالی نے انہیں پھر بلایا اور ان کی جائیدادیں اُن کو واپس دے دیں، کسی جاسوس کی بات کا وہ کبھی یقین نہ کرتے تھے، ہر روز پانچ سو درہم غریبوں اور مفلسوں میں تقسیم کرتے تھے، ادنیٰ طبقے کے لوگوں کے بڑے دردمند تھے اور اُن سے باتیں کرنے کا بہت شوق رکھتے تھے، ادھر تو دولت مند لوگوں اور شاہانہ جاہ و حشم اور درباری آداب و قواعد سے واسطہ تھا، اُدھر عوام اور رذیل سے صحبت تھی، غرض دونوں چیزوں کا مقابلہ حیرت انگیز تھا۔

بنی حمود چونکہ آلِ حضرت علی کرم اللہ وجہ سے تھے، اس لیے رعایا کے دل میں اُن کا بڑا ادب تھا اور بنی حمود رعایا میں اپنی نسبت اس تعظیم کے خیال کو قائم رکھنے کی غرض

سے جو اُن کے حق میں مفید تھا، عوام کے سامنے ظاہر بھی نہ ہوتے تھے، اور اُن کے گرد و پیش جو چیزیں ہوتی تھیں وہ عوام کی نظر میں ایک رازِ سربستہ رہتی تھیں۔

ادریس عالی اگرچہ بہت سیدھی سادی طبیعت رکھتے تھے، لیکن جو طور اور طریقے اُن کے بزرگ قائم کر گئے تھے اُن کے ہر طرح پابند تھے، قاعدہ یہ تھا کہ خلیفہ جہاں بیٹھتے تھے وہاں پردہ پڑا رہتا تھا، حاضرین کو خلیفہ نظر نہ آتے تھے، جس کسی کو کوئی بات کرنی ہوتی تھی وہ اسی پردے کے پاس کھڑے ہو کر بات کرتا تھا، لیکن ادریس ایسی نیک طبیعت کے آدمی تھے کہ وہ کبھی کبھی اس قاعدے کو توڑ دیتے تھے، ایک روز کا ذکر ہے کہ بشتونہ سے ایک شاعر نے حاضر ہو کر اُن کی سخاوت اور عالی نفسی پر ایک قصیدہ پڑھا جس کا مضمون تھا "اور لوگ پانی اور مٹی سے بنے ہیں، مگر اولاد پیغمبر صرف پانی سے بنی ہے، اور وہ پانی عدل و پرہیز گاری کا ہے، وحی اُن کے مورث پر اُتری ہے اور جبرئیل جو ہم کو نظر نہیں آتے اب بھی اُن کے سروں پر سایہ کیے ہوئے ہیں، امیر المومنین ادریس کا چہرہ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب کی مثل ہے، جو اپنی شعاعوں سے دیکھنے والوں کی نظر کو خیرہ کر دیتا ہے، اے امیر! کاش ہم آپ کو دیکھ سکتے، اور آپ کے نور سے جو ضیا رب العلمین کا پرتو ہے، مستفیض ہوتے"۔

یہ اشعار سنتے ہی خلیفہ ادریس نے جو کبھی کسی کی درخواست نامنظور نہیں کیا کرتے تھے حاجب کو حکم دیا کہ بیچ کا پردہ اُٹھا دیا جائے، بشتونہ کا یہ شاعر یونانیوں کے خدائے جوپیٹر کی محبوبہ سے جو معاشق کو دیکھتے ہی جل کر مر گئی تھی زیادہ خوش قسمت نکلا، اس نے اپنے ممدوح کی صورت دیکھی، مگر اس میں وہ نور نہ تھا جو اُسے جلا دیتا، بلکہ اس نور سے مہربانی اور محبت کے آثار ہویدا تھے، غالباً یہ نظارہ شاعر کو اُن شعاعوں سے بہتر معلوم ہوا ہو گا جن کی نسبت اُس نے کہا تھا کہ وہ انسان کی نظر کو خیرہ کیے دیتی ہیں، بہرکیف یہ یقینی ہے کہ شاعر کو بہت سا انعام ملا اور وہ خوش ہو کر دربار سے رخصت ہوا۔

سلطنت کی شان اور استحکام کے حق میں یہ بدقسمتی تھی کہ ادریس میں نیک نفسی کے ساتھ غائت درجہ کی کمزوری بھی تھی، کسی سوال کو ٹالنا نہ جانتے تھے، بادیس بادشاہ غرناطہ

اور وہ سرداروں کو جو کچھ وہ مانگتے تھے ہمیشہ مل جاتا تھا، چاہے اس میں قلعہ ہو یا کوئی اور چیز، بہر کیف اُن کا سوال ہمیشہ پورا کیا جاتا تھا، ایک مرتبہ بادلیس نے اُن کو لکھا کہ وہ اپنے مدبر امر وزیر اور اپنے باپ دادا کے ہم نشین موسیٰ بن عفان سبتی کو اُس کے حوالے کریں، جب خلیفہ ادریس نے وزیر موصوف سے کہا کہ "بادلیس نے خط لکھا کر تم کو طلب کیا ہے، مجھ کو اس کا افسوس ہے، لیکن میں بادلیس کے سوال کا جواب انکار نہیں کر سکتا" موسیٰ بن عفان سبتی نے جو قوم منہاجہ کے پرانے رفیق تھے، کہا "جو کچھ آپ سے درخواست کی گئی ہے وہی کیجیے، انشاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں پائیں گے۔" موسیٰ بن عفان جب غرناطہ پہنچے تو بادلیس نے انہیں قتل کرا دیا۔ ۶۲

اِس قسم کی کمزوریوں سے بربر کو بڑی وحشت ہوتی تھی، ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے خلیفہ ادریس کو جو ہمدردی تھی اُس کی شکایت بربر کو پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی، بالخصوص اسودیوں (حبشیوں) کو اس بات سے سخت پریشانی تھی، یہ لوگ ہمیشہ اس بات کے خوگر تھے کہ تازیانے، تلوار اور سولی سے ان پر حکومت کی جائے، وہ ایسے بادشاہ کو کیا سمجھتے جو کبھی کسی کے قتل تک کا حکم نہ دیتا ہو، غرض جس وقت قلعہ ایرش کے حاکم نے عَلمِ بغاوت بلند کیا تو خلیفہ ادریس عالی سے بہت کچھ ناراضی پیدا ہو چکی تھی۔

خلیفہ ادریس عالی نے اپنے چچیرے بھائیوں محمد اور ادریس کو جو ادریس بن علی بن حمود کے بیٹے تھے قلعہ ایرش میں قید کر رکھا تھا، حاکم ایرش نے خلیفہ ادریس سے باغی ہو کر ان دونوں شہزادوں کو آزاد کر دیا اور ان میں بڑے شہزادے یعنی محمد بن ادریس بن علی کو خلیفہ بنا دیا، مالقہ میں اسودیوں کی فوج شہر کی حفاظت کے لیے رہتی تھی جب اس نے بغاوت کی خبر سنی تو خود بھی غدر کر دیا اور محمد بن ادریس بن علی کو مالقہ میں بلا لیا، لیکن مالقہ کے لوگوں نے اپنے ہمدرد اور رحمدل خلیفہ کا خطرے کی حالت میں ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا، نہایت مردانگی سے وہ خلیفہ کے پاس جمع ہو گئے اور ان سے ہتھیار مانگے اور یقین دلایا کہ اگر ہتھیار اُن کو مل گئے تو ممکن نہیں کہ اسودی ایک ساعت کے لیے بھی مالقہ پر قبضہ رکھ سکیں، خلیفہ ادریس عالی نے اُن کی خیر خواہی کا شکریہ ادا کیا، لیکن اُن کی درخواست

منظور نہ کی، اور شہر کے لوگوں سے کہا کہ تم سب اپنے اپنے گھر چلے جاؤ میں اپنی ذات کے واسطے ایک جان بھی ضائع کرنی نہیں چاہتا، غرض اِدھر محمد بن ادریس بن علی مالقہ میں داخل ہوئے اُدھر خلیفہ ادریس عالی ایرش کے قلعے میں بند ہو جانے کے لیے چلے گئے، گویا دونوں نے صرف جگہ بدل لی (سنہ ۱۰۴۶-۱۰۴۷ء مطابق سنہ ۴۳۸ھ)

نئے خلیفہ محمد بن ادریس بن علی، خلیفہ ادریس عالی کی مثل نہ تھے، محمد بن ادریس اپنی ماں کی سی طبیعت رکھتے تھے، جو ایک بڑی بہادر خاتون میدان جنگ کی شیدائی تھیں جنگ کی تیاریاں اور محاصروں کی کیفیت دیکھنے میں انہیں لطف حاصل ہوتا تھا اور خود لڑائی میں جاکر اپنی تقریر سے لڑنے والوں کا دل بڑھایا کرتی تھیں، محمد بن ادریس نہایت بہادر اور شدید العزم تھے، قواعد اور ضوابط کے بہت پابند تھے، ادریس عالی میں جس قدر قوت کی کمی تھی اتنی قوت کی زیادتی اِن نئے خلیفہ میں تھی، بغاوت کے محرکوں کو بہت جلد یہ بات معلوم ہو گئی اور اب وہی پرانا قصہ[1] مینڈکوں کا پیش آیا جنھوں نے جوپیٹر دیوتا سے ایک بادشاہ مانگا تھا، بربر اور اسودی دونوں لکڑی کے بیجان کندے کو حسرت سے یاد کرکے حاجی لق لق کے حق میں بددعائیں کرنے لگے۔ اب ایک سازش ہوئی اور اہل سازش نے قلعہ ایرش کے حاکم سے خط و کتابت شروع کی اور اس حاکم کو آسانی سے آمادہ کر لیا کہ وہ ادریس بن یحییٰ عالی کو پھر خلیفہ تسلیم
(۶۲۶) کرکے انہیں قید سے آزاد کر دے، اس مرتبہ ادریس بن یحییٰ عالی خانہ جنگی کے خیال سے نہیں گھبرائے، قید خانے میں رہتے رہتے خیالات بدل گئے تھے، لیکن محمد بن ادریس

---

[1] حکایاتِ لقمان کا مشہور قصہ ہے کہ ایک تالاب میں مینڈک رہا کرتے تھے، انھوں نے جوپیٹر سے دعا مانگی کہ ہم میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں اس لیے ایک بادشاہ ہمارے پاس بھیج، جوپیٹر نے لکڑی کا ایک کندہ تالاب میں ڈال دیا اور کہا کہ یہ تمہارا بادشاہ ہے، کچھ دنوں تک تو مینڈک اس کندے سے ڈرتے رہے لیکن جب دیکھا کہ اُس کو جنبش ہی نہیں تو دل میں ناخوش ہوئے اور جوپیٹر سے پھر دعا مانگی کہ کوئی اور بادشاہ بھیج، جوپیٹر نے ناراض ہو کر ایک لق لق کو بھیج دیا، اس لق لق نے مینڈکوں کو چن چن کر کھانا شروع کیا۔ مترجم

بن علی نے اپنی ماں کے سمجھانے سے مخالفین کا مقابلہ ایسا شدید کیا کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اطاعت قبول کرنے سے پہلے ہی انھوں نے ادریس بن یحییٰ عالی کو حفاظت کے خیال سے قلعہ ایرش سے افریقہ بھیج دیا تھا، افریقہ میں اس وقت دو بربر آزاد شدہ غلاموں کی حکومت تھی، اُن میں ایک کا نام سکوت تھا، یہ سبتہ کا حاکم تھا، اور دوسرا رزق اللہ تھا جو طنجہ پر حکومت کرتا تھا۔ افریقہ میں ادریس عالی کی بہت تعظیم و تکریم کی گئی، خطبہ ان کے نام کا پڑھا گیا، لیکن سکوت اور رزق اللہ نے ان کو اختیارات کسی قسم کے نہیں دیے، ان حاکموں کو اپنے اختیارات کا اس قدر خیال تھا کہ انھوں نے ادریس عالی کی بیحد حفاظت کی اور اُن کو عوام کے سامنے ظاہر نہ ہونے دیا اور حکم دے دیا کہ کوئی شخص ان کے پاس حاضر نہ ہو، مگر بربر کے چند اکابر نے اُن سے ملاقات کی اور کہا کہ اِن دونوں غلاموں (یعنی سکوت اور رزق اللہ) نے آپ کو قید کر رکھا ہے، بادشاہی نہیں کرنے دیتے، اگر آپ ہمیں اختیارات دیں تو ہم آپ کو اِن غلاموں سے نجات دلوا سکتے ہیں"۔ مگر ادریس عالی نے جو دل کے نیک تھے اِن لوگوں کی درخواست منظور نہیں کی، اور اس کا تذکرہ بھی سکوت اور رزق اللہ سے کر دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں حاکموں نے بربر کے دونوں سرداروں کو جو ادریس عالی سے گفتگو کرتے آئے تھے، جلا وطن کر دیا اور اس خوف سے کہ پھر کوئی شکایت کرنے نہ آئے انھوں نے ادریس عالی کو اسپین پہنچا دیا، مگر اُن کو خلیفہ بدستور تسلیم کرتے رہے۔ ادریس عالی نے اسپین پہنچ کر رندہ (تاکرُنا) کے بربر سردار کے پاس پناہ لی۔

اِسی زمانہ میں مالقہ کے باغیوں نے بادیس بادشاہِ غرناطہ سے مدد حاصل کی، بادیس نے محمد بن ادریس بن علی سے اعلانِ جنگ کر دیا، لیکن پھر دونوں میں جلد مصالحت ہو گئی۔ جزیرۃ الخضراء کے بادشاہ کو جس کا نام بھی محمد تھا (یعنی محمد بن قاسم بن حمود) خلیفہ بنایا گیا اب گویا اسپین میں چار خلیفہ ہو گئے۔

(۱) فرضی ہشام المؤید اشبیلیہ میں

(۲) محمد بن ادریس بن علی مالقہ میں

(۳) محمد بن قاسم بن حمود جزیرۃ الخضراء میں

(۴) ادریس عالی

باقی دو معمولی درجے کے والیانِ ریاست تھے، خلیفہ کا لقب اُن کے لیے اس وجہ سے بھی مضحکہ خیز تھا کہ خلیفہ سے مراد کل مسلمانوں کا بادشاہ ہوتا تھا نہ کہ ایک چھوٹی سی ریاست کا حاکم۔

محمد بن قاسم بن حمود، جزیرۃ الخضراء کے بادشاہ کو اپنی کوششوں میں کامیابی نہیں ہوئی، جب انہوں نے دیکھا کہ جن لوگوں نے انہیں مسندِ خلافت پر بٹھایا تھا، وہی ساتھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں، تو وہ اپنے وطن افریقہ کو چلے گئے اور وہیں حالت رنج و غم میں مر گئے (۱۰۴۸-۱۰۴۹ء مطابق سنہ ۴۴۰ھ)

چار برس کے بعد محمد بن ادریس بن علی، مالقہ کے خلیفہ کا بھی انتقال ہو گیا، اب ان کے بھتیجے نے تخت حاصل کر کے ادریس ثالث کے نام سے حکومت کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ اس زمانے میں ادریس عالی یعنی ادریس ثانی کو پھر خلیفہ بنایا گیا اس مرتبہ قسمت یاور تھی ادریس عالی یعنی ادریس ثانی نے ۱۰۵۵ء (۴۴۷ھ) تک امن و سلامتی کے ساتھ حکومت کر کے سفرِ آخرت اختیار کیا۔

بنی حمود سے اب ایک اور شخص نے ادریس عالی یعنی ادریس ثانی کی جگہ خلیفہ ہونا چاہا، لیکن بادیس نے اس کی امیدوں پر خاک ڈال دی۔

بادشاہِ غرناطہ بادیس اب تمام بربر کا واقعی سردار ہو گیا تھا، اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب کسی کو خلیفہ بنانے کی ضرورت نہیں ہے، بنی حمود کا خاتمہ کر کے مالقہ کو اپنی حکومت غرناطہ میں شامل کر لینا چاہیے۔ اس کام کو انجام دینا اُس کے لیے کچھ مشکل نہیں ہوا، یہ سچ ہے کہ مالقہ کے عربوں نے اُس کی اطاعت آسانی سے قبول نہیں کی، لیکن عربوں کے بعض بڑے لوگ مثلاً ابو عبداللہ جذامی جو وزیر بھی تھے اور قاضی بھی، بادیس کے طرفدار ہو گئے۔ اس وجہ سے بادیس نے باقی عربوں کی کچھ پروا نہ کی رہے مالقہ کے بربر، تو اُن کو اپنے سرداروں کی کمزوری اور اس ضرورت کا اندازہ کافی طور پر ہو گیا تھا کہ اگر

عربوں کے مقابلہ میں وہ گھٹنا چاہتے ہیں تو غرناطہ کے بربر سے اتحاد و رکھنا ضروری ہے، عرب اس زمانہ میں اسپین کے جنوب مغربی علاقوں میں زور پکڑتے جاتے تھے۔

غرض مالقہ کے بربر نے بادیس کی مخالفت نہ کی، بلکہ اُس کی رائے اور تدبیر کو مناسب سمجھا، اس طرح بادیس بادشاہِ غرناطہ مالقہ کی ریاست کا بھی مالک ہوگیا، اور بنی حمود جس قدر وہاں تھے وہ ملک سے خارج کیے گئے۔

بنی حمود کو افریقہ میں ابھی بہت کچھ کرنا تھا، لیکن اسپین سے وہ ہمیشہ کو رخصت ہوئے۔

اسناد:

ابن بسّام	ج ا ص ۴۲۴
ابن الخطیب	(قلمی نسخہ ۵) ص ۱۰۷
عبدالواحد	ص ۴۵ تا ۴۹
ابن خلدون	ص ۲۲ تا ۲۳
مقرّی	ج ا ص ۱۳۲، ۲۸۲ تا ۲۸۴
حمیدی	بیوگرافیکل ڈکشنری

کتاب رابع

ملوک الطوائف

پانچویں فصل

المعتضد

اس خیال سے کہ تاریخِ مالقہ کا جو مختصر خاکہ یہاں کھینچا ہے اس کا سلسلہ شکست نہ ہو ہم آگے کے واقعات بھی یہیں لکھ گئے ہیں، لیکن اب ایک نظر اس ترقی پر ڈالنی ہے جو اسی دوران میں عرب کے فریق نے کی تھی، اس لیے یہاں پچھلے زمانہ کے کچھ حالات لکھنے ضروری ہیں۔

قاضی ابو القاسم محمد صاحب اشبیلیہ کی وفات پر جو جنوری ۱۰۴۲ء (جمادی الاول ۴۳۳ھ) میں پیش آئی۔ اُن کا لڑکا عباد جس کی عمر اس وقت ۲۶ برس کی تھی، فرضی خلیفہ ہشام المؤید کا حاجب مقرر ہوا، عباد کا نام تاریخوں میں شروع ہی سے معتضد لکھ دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لقب عباد نے حاجب ہونے کے بعد اختیار کیا تھا، ہم بھی آسانی کے لیے اس کا نام ہمیشہ معتضد ہی لکھیں گے۔

جنوب مغربی اسپین کے عربوں کا یہ سردار (معتضد) اُن لوگوں میں سے تھا جن کے

حالات و خصائل پڑھ کر انسان کو حیرت ہوتی ہے، اور جنھیں ایک قوم کے تمدن نے اپنی پیرانہ سالی (بلکہ پیری و صد عیب)، کے زمانہ میں پیدا کیا تھا، ہر لحاظ سے عربوں کا یہ سردار بادیس بادشاہِ غرناطہ کا حریفِ مقابل تھا، بادیس عربوں کے فریق مخالف یعنی بربر کا سردار تھا۔

بادیس کی طرح معتضد بھی بدظن و منتقم اور غدار و خود سر تھا، شراب سے وہ بھی بادیس کی طرح بدمست رہتا تھا، بلکہ فسق و فجور میں بادیس سے بڑھا ہوا تھا، فطرۃً عیش پسند تھا، حیوانی خواہشیں کبھی سیر ہونا نہ جانتی تھیں، کسی والئ ملک کی حرم سرا میں عورتیں اس کثرت سے نہ تھیں، کہا جاتا تھا کہ آٹھ سو باکرہ اس کے حرم میں تھیں مگر باوجود اس مشابہت کے بادیس اور معتضد کی خصلتیں ایک سی نہ تھیں، بادیس قریباً وحشی انسان تھا، ادب و تہذیب اور علمی حسن و لطافت سے اسے نفرت تھی قصر الحمرا کے عالیشان ایوان میں شاعروں کا گذر نہ تھا، کیونکہ صاحب الحمرا عادتاً بربر زبان بولتا تھا، شعراء کے قصائد جو عربی میں ہوتے تھے مشکل سے سمجھ سکتا تھا، برعکس اس کے معتضد کی تعلیم و تربیت بہت غور اور احتیاط سے ہوئی تھی، یہ درست ہے کہ وہ عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا، اور اس نے زیادہ پڑھا بھی نہ تھا، لیکن ذہن اور حافظہ بہت اچھا پایا تھا، اور ایک اوسط درجے کے لائق اور قابل آدمی سے وہ بہت بڑھا ہوا تھا، معتضد کی لکھی ہوئی نظمیں حُسنِ کلام کے علاوہ اس وجہ سے بھی دلچسپ ہیں کہ ان کو پڑھ کر شاعر کی طبیعت و فطرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، شعراء ہمعصر میں وہ ایک لائق ناظم سمجھا گیا ہے، علم دوست اور ہنر پرور تھا، شاعروں کو اچھے کلام پر بہت انعام دیتا تھا، عالیشان محل اور عمارات بنانے کا بیحد شائق تھا، جو کچھ تھوڑا بہت علم و فضل رکھتا تھا اس سے بھی شانِ حکومت بڑھانے میں کام لیا، اور جس خلیفۂ بغداد یعنی معتضد عباسی کا لقب اختیار کیا تھا اس کو اپنی زندگی کا ایک نمونہ قرار دیا، حالانکہ (۶۲۹)

لہ زمانۂ حکومت ۲۷۹ھ / ۸۹۲ء سے ۲۹۰ھ / ۹۰۲ء تک

بادلیس، بادشاہ غرناطہ کو اتنا بھی علم نہ تھا کہ پہلا عباسی معتضد کب گذرا تھا، شراب خوار دونوں تھے، مگر بادیس ایک بدتہذیب فوجی سوار کی طرح پی کر بدمست ہو جاتا تھا، لیکن معتضد جو کبھی شائستگی اور تہذیب کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا، شراب کی مستی میں بھی کوئی بات ایسی نہ کرتا تھا جس سے بدتمیزی ظاہر ہو، بادہ نوشی کے جلسوں میں بھی ایک حُسن پیدا کرتا، شراب خوب پیتا، مگر شراب پر جو نظمیں وہ خود یا ایسے جلسوں کے انیس لکھتے تھے اُن میں نفاست اور نازک خیالی موجود ہوتی، قوائے جسمانی ایسے مضبوط تھے کہ کثرتِ عیاشی اور محنتِ شاقہ، دونوں کی برداشت بخوبی کر لیتا، عیش پرستی میں بے روک ٹوک، شدت سے محنتی و جفاکش، لذائذ نفس کو سیر کر کے امورِ سلطنت میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا، منصبِ شاہی کی خدمات ادا کرنے میں جان تک کھپا دینے کا شوق تھا، اور جو وقت لہو و لعب میں ضائع کرتا، اس کی تلافی میں ایسی کوشش کرتا جو انسان کی قوت سے بالاتر معلوم ہوتی، مگر اس تلافی کے بعد پھر شراب پینے کی ضرورت ہوتی تاکہ کام کی قوت پیدا ہو، اور یہ عجیب بات تھی کہ جس ظالم کی غضب آلود نگاہوں سے حسینانِ حرم لرز جاتی تھیں، وہی ظالم اُنہی حسینوں میں سے بعض کے عشق میں نہایت شیریں، نازک اور پاکیزہ اشعار کہتا تھا۔

غرض بادیس اور معتضد میں وہی فرق تھا جو ایک وحشی ظالم اور ایک مہذب ظالم میں ہو سکتا ہے اور سب باتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں ظالموں میں وحشی ظالم بادیس کم درجے کا ظالم تھا، بادیس کے قتل و غارت میں ایک قسم کی صفائی قلب ظاہر ہوتی، معتضد کی نیت اور طبیعت کا پتہ اس کے دلی دوستوں کو بھی نہ چلتا، معتضد کی نگاہیں دوسروں کے دل میں گھس کر اندر کی بات لے آتیں، لیکن اپنے دل کا حال مجال نہ تھی کہ چہرے کی شکن یا آواز کی لغزش سے دوسرے پر کھل جائے، بادیس بادشاہ غرناطہ نے اکثر لڑائی کے میدانوں میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی، لیکن صاحب اشبیلیہ معتضد اگرچہ ہمیشہ لڑائیوں میں مصروف رہے اور ہمت و مردانگی میں بھی کسی طرح کم نہ تھے، مگر سوائے ایک یا دو لڑائیوں کے کبھی خود فوج لے کر میدان میں نہیں اُترے

بقول ایک عرب مورخ کے معتضد اپنے حجرے میں بیٹھے امراء لشکر کے لیے لڑائیوں کے نقشے تیار کیا کرتے تھے، لڑائیوں میں بادلیس کی ترکیبیں اور حیلے ایسے بھدّے ہوتے تھے کہ دشمن انھیں جلد بیکار ثابت کر دیتا تھا، لیکن معتضد کے حربی حیلے اس خوبی اور احتیاط سے سوچے جاتے تھے کہ بہت کم اپنے مقصد میں ناکام رہتے تھے، اس قسم کے معاملات میں معتضد بے حد احتیاط سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ ایک قصہ اسی ذیل میں یہاں بیان کرنے کے قابل ہے۔

جس زمانہ میں قرمونہ سے جنگ چھڑی ہوئی تھی، تو معتضد نے قرمونہ میں ایک عرب کو خفیہ طریقے سے اس کام پر مقرر کر رکھا تھا کہ بربر کی نقل و حرکت اور ان کی چالوں سے برابر اطلاع دیتا رہے، اس خوف سے کہ اس عرب اور معتضد میں جو خطوط آتے جاتے رہتے ہیں، وہ کسی دوسرے کے ہاتھ نہ پڑ جائیں اور کسی کو یہ شبہ نہ گذرے کہ شہر میں جاسوس لگے ہوئے ہیں، ان خطوط کے بارے میں نہایت درجہ احتیاط کی ضرورت تھی ایک موقع پر اس عرب جاسوس کو معتضد نے پہلے سے کہلا بھجوایا کہ "ایک خط اس قسم کی ترکیب سے تمہارے پاس بھیجا جاوے گا، اس کا خیال رہے"۔ اس کے بعد معتضد نے ایک دن اپنے قصر میں ایک کسان کو بلوایا، جو بادیۂ اشبیلیہ کا رہنے والا تھا، یہ نہایت سیدھا سادا بیوقوف سا آدمی تھا، جب وہ کسان حاضر ہوا تو معتضد نے اس سے کہا کہ "اپنی یہ بدنما قبا اتار دو، اور یہ جبّہ پہن لو، یہ جبّہ بہت اچھے کپڑے کا ہے اور اگر تم اسے پہن لوگے، اور میرا کہنا کروگے تو یہ جبہ تمہیں انعام میں دیدیا جائے گا"۔ کسان یہ سنکر بہت خوش ہوا، اور فوراً اپنی قبا اتار کر جبّہ پہن لیا، اس کو اس کا شبہ بھی نہ گذرا کہ جبّے کے استر میں ایک جگہ ایک خط سیا ہوا ہے جو معتضد نے عرب جاسوس کے نام لکھا ہے، کسان نے وعدہ کیا کہ حضور جو کچھ حکم دیں گے اسے بجالاؤں گا معتضد نے کہا "ہاں یہ درست ہے، تم کو صرف یہ کرنا ہے کہ یہاں سے قرمونہ چلے جاؤ جب شہر کے قریب پہنچو تو کہیں سے لکڑیاں کاٹ کر ان کا ایک گٹھا باندھ لینا اس کے بعد شہر کے دروازے میں داخل ہو کر جہاں لکڑہارے لکڑیاں بیچنے جمع ہوتے ہیں، وہیں

تم بھی جاکر کھڑے ہو جانا، لیکن جب تک کوئی پانچ درم تمہارے گٹھے کی قیمت نہ دے، تم اُسے ہرگز مت بیچنا۔"

غریب کسان مطلق نہ سمجھا کہ یہ عجیب ہدایت کس غرض سے کی گئی ہے، وہ فوراً حکم بجا لانے کو تیار ہو کر مورنہ روانہ ہو گیا، شہر کے قریب پہنچکر لکڑیوں کا ایک گٹھا تیار کیا، لیکن یہ کام کبھی کیا نہ تھا، درختوں کی شاخیں اور ٹہنیاں اناپ شناپ توڑ، ایک گٹھا باندھ، لکڑہاروں والے بازار میں جا کھڑا ہوا، ایک خریدار اُدھر سے گذرا، اُس نے گٹھے کے دام پوچھے کسان نے کہا "پانچ درم ہوں گے، چاہے لو، چاہے نہ لو" خریدار نے دام سنتے ہی ہنسکر کہا "شاید لکڑیاں آبنوس کی ہیں" ایک دوسرے آدمی نے جو پاس کھڑا تھا، کہا "آبنوس نہیں عود ہندی ہے۔" غرض اس اناڑی لکڑہارے کی لوگ ہنسی اُڑاتے رہے، جب شام ہوئی تو معتضد کا جاسوس اودھر سے گذرا، اُس نے بھی گٹھے کے دام پوچھے، اور پانچ درم سنتے ہی فوراً گٹھا خرید لیا، اور کسان سے کہا کہ "اچھا لکڑیاں اپنے کندھے پر رکھ کر میرے گھر پہنچا دو، میں تمہارے ساتھ ہوں"۔ جب کسان جاسوس کے گھر پہنچا، تو گٹھا کندھے سے اتار کر نیچے رکھا، جاسوس نے پانچ درم اس کے حوالے کیے، کسان درم لے، گھر سے نکلنے کو ہوا تو جاسوس بولا، "کہاں جاتے ہو؟ کسان نے کہا "شہر سے باہر جاتا ہوں کیونکہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں" جاسوس نے کہا "ایسا خیال بھی نہ کرنا، تمہیں معلوم نہیں کہ یہاں رستہ میں ڈاکو بستے ہیں، آج یہیں ٹھیر جاؤ، کھانا کھا کر سو رہو، کل صبح ہوتے ہی اپنے گھر چلے جانا۔

کسان نے شکریہ کیساتھ اس مہمان نوازی کو قبول کیا، اور جب اچھے اچھے کھانوں کی شکل دیکھی تو دن بھر لوگوں نے جو ہنسی اڑائی تھی، اس کا رنج و ملال دل سے دور ہو گیا جب کھانے سے فارغ ہوا تو جاسوس نے اُس سے پوچھا کہ "تم کہاں کے رہنے والے ہو؟" کسان نے کہا "بادیہ اشبیلیہ کا رہنے والا ہوں" جاسوس نے کہا "تم بڑے دل گردے کے آدمی ہو کہ اتنی دور سے یہاں تک چلے آئے، یہ تو تم نے بھی سنا ہوگا کہ بربر آجکل کیسا ظلم ڈھا رہے ہیں؟ رستے میں جو مسافر ملتا ہے اُسے ختم کر دیتے ہیں، معلوم

ہوتا ہے کہ کوئی بڑا ہی ضروری کام تھا جو تم یہاں آئے"؟ کسان نے کہا روزی تو بہر صورت پیدا کرنی ہی پڑتی ہے، مجھ غریب کسان کو مارنے سے کسی کو کیا مل جائیگا یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ کسان کو نیند آنے لگی، جاسوس نے اُسے سونے کی جگہ بتائی کسان بغیر کپڑے اتارے سونے کے لیے لیٹ گیا، جاسوس نے کہا "رات گرم ہے اپنا جُبّہ اتار دو، تاکہ آرام سے سوؤ" کسان نے جُبہ اتار دیا اور فوراً غافل سو گیا۔

کسان کے سوتے ہی جاسوس نے جُبّہ اٹھا کر اُس کا استر پھاڑا، اور خط جہاں سیا ہوا تھا اُسے نکال کر پڑھا اور فوراً اُس کا جواب لکھ کر جہاں سے استر پھاڑا تھا وہیں رکھکر پھر اسے سی دیا، اور جُبّہ وہیں ڈال دیا جہاں اُسے کسان پھینک کر سو گیا تھا، کسان صبح اُٹھا، جُبّہ پہنا، اور اپنے میزبان کا شکریہ ادا کرکے اشبیلیہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

اشبیلیہ پہنچتے ہی کسان معتضد کے سامنے حاضر ہوا، اور جو کچھ گذرا تھا وہ عرض کیا معتضد نے کہا کہ " ہم تم سے بہت خوش ہوئے اور تم انعام کے مستحق ہو، یہ جُبہ جو تم پہنے ہو ہمیں واپس دیدو، اور اس کی بجائے یہ اچھے اچھے کپڑے جو تمہیں انعام میں دیے جاتے ہیں، پہن لو" کسان اتنا سنتے ہی خوشی کے مارے آپے میں نہ سمایا اور نئے کپڑے پہن اپنے دوستوں اور پڑوسیوں سے کہنے لگا کہ بادشاہ نے مجھے خلعت دیا ہے، غرض ایسی باتیں کرنے لگا کہ گویا وہ بہت بڑا منصب دار ہے۔

اس غریب کسان کو معلوم ہوتا تو کجا، شبہ بھی نہ گذرا کہ وہ ایک ایسے خط کا غیر معمولی نامہ بر بنایا گیا تھا، کہ اگر بربر کو ذرا بھی خبر ہو جاتی، اور وہ خط کسان کے پاس سے نکل آتا تو پھر اس غریب کی جان جانی یقینی تھی

معتضد صاحب اشبیلیہ ضرورت کے وقت طرح طرح کی چالیں پیدا کرنے میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا، ترکیبوں اور حیلوں کا ایک لازوال خزانہ اُس کے قبضے میں تھا، جو شخص اس کے قہر و غضب کا نشانہ بنتا مصیبتیں اُس پر ٹوٹ پڑتی تھیں، ایسا آدمی اگر ملک بھی چھوڑ دے تو بھی اُسے پناہ نہ ملتی تھی، معتضد کا انتقام ایسا تھا کہ دنیا کے دوسرے سرے تک پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔

بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ معتضد نے اشبیلیہ میں ایک نابینا کی بہت سی جائداد اپنے قبضے میں کرلی، باقی جو کچھ بچا، وہ اس نابینا نے خود ضائع کردیا، غرض بالکل مفلس و غریب ہوکر فقیر ہوگیا، اور اسی حالت میں مکہ شریف چلا گیا، یہاں آکر رات دن اُس شخص کے حق میں بد دُعا شروع کی جس نے اُسے مفلس اور محتاج کردیا تھا، معتضد کو یہ حال معلوم ۶۳۶
ہوا تو ایک آدمی کو جو حج کرنے جارہا تھا، بُلوایا، اور اُس کو ایک صندوقچہ دیا، جس میں دینار بھرے ہوئے تھے، لیکن ان دیناروں پر کوئی نہایت تیز زہر مل دیا گیا تھا، معتضد نے اس آدمی سے کہا کہ "جب مکہ پہنچو تو یہ صندوقچہ شہر کے فلاں نابینا کو دے دینا، اور اُس سے میرا اسلام کہہ کر کہنا کہ یہ سوغات معتضد نے تمہیں بھیجی ہے، لیکن تم خود اس صندوقچہ کو نہ کھولنا" چنانچہ جب یہ آدمی مکہ میں پہنچا تو معتضد کی سوغات لیکر اُس نابینا کے پاس گیا، اور وہ صندوقچہ اُسے دیدیا، غریب اندھے نے صندوقچہ لے کر کہا "واللہ! اس کے ہلانے سے تو اشرفیوں کی آواز آتی ہے اس میں تو دینار بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ کیا بات ہے کہ اشبیلیہ میں تو معتضد مجھ پر ظلم کرے اور حجاز میں مجھے دینار بھیجے" جو آدمی صندوقچہ لایا تھا اُس نے کہا "بادشاہوں کے مزاج میں تلون ہوتا ہے، یا ممکن ہے کہ معتضد نے تمہارے ساتھ جو ناانصافی کی تھی، اب اُس پر دل میلا ہوگیا ہو اور اُس نے تمہارے نقصان کی تلافی کرنی چاہی ہو، بہرکیف مجھے اُس سے بحث نہیں، مجھے معتضد نے جس کام کو کہا تھا وہ میں نے کردیا، اب تم یہ صندوقچہ لو، یہ تمہارے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔

نابینا نے جواب دیا "نعمت ہونے میں کیا کلام ہے، میں آپ کی اس تکلیف کا بہت ممنون ہوں، جب آپ اشبیلیہ واپس جائیں تو معتضد کی خدمت میں میرا شکریہ عرض کردیجئے گا۔"

اندھا صندوقچہ بغل میں دبائے جس قدر ایک اندھے سے جلد چلنا ممکن تھا اپنے غریب گھر کی طرف چلا، اور وہاں پہنچکر دروازہ احتیاط سے بند کرکے صندوقچہ جلدی سے کھولا، کہا جاتا ہے کہ جب انسان مفلس ہوتا ہے اور اتفاق سے اُسے دولت مل جاتی ہے

تو وہ اشرفیاں دیکھ کر بے انتہا خوش ہوتا ہے، اور ان کی چمکتی ہوئی صورت پر اس کی نظر لوٹنے لگتی ہے، اشبیلیہ کا یہ اندھا آنکھوں میں نور نہ رکھتا تھا کہ اس قسم کی لذت اٹھاتا، جو کام کبھی بصارت دیا کرتی تھی، اب اس کی جگہ لامسہ اور سامعہ مدد دیتے تھے، غرض اس خوشی کے عالم میں وہ اندھا کبھی اشرفیوں کو مٹھی میں اٹھاتا، کبھی انگلیوں سے انھیں الٹ پلٹ کرتا کبھی انھیں جھنکاتا، اور کبھی گنتا، یہاں تک کہ منہ سے انھیں چومنے لگا، منہ کو اشرفیوں کا چھونا تھا کہ زہر نے فوراً اثر کیا اور رات نہ ہونے پائی تھی کہ یہ غریب اندھا دنیا سے چل بسا

بادیس اور معتضد کہنے کو تو دونوں ظالم تھے، لیکن ان دونوں کے ظلم میں بھی ایک امتیاز قائم ہو سکتا ہے، بادیس حالتِ غیظ و غضب میں دشمن کو اکثر اپنے ہاتھ سے قتل کرتا تھا مگر معتضد سرکاری جلاد کی خدمت خود ادا کرنی کبھی پسند نہ کرتا تھا، خون میں اپنے ہاتھ رنگنے معتضد کو گوارا نہ تھے، لیکن اس کی عداوت میں جو سختی اور دیرپائی تھی وہ بادیس کی عداوت میں نہ تھی، بادیس کا دشمن جب قتل ہو جاتا تھا تو بادیس کے دل کو تسکین ہو کر اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا تھا، اور مقتول دشمن کا سر کاٹ کر حسبِ دستور ایک لکڑی کے سرے پر نصب کر دیا جاتا تھا۔

لیکن اس کے برعکس صاحب اشبیلیہ کی دشمنی ایک ایسی اشتہا تھی جو کبھی سیر ہونا جانتی (۳۱)
نہ تھی، اس کی عداوت دشمن کے قتل ہونے کے بعد بھی دشمن کا پیچھا نہ چھوڑتی تھی، اس کی خونی اشتہا ایسی تھی کہ دشمن کے کٹے ہوئے سر اور کٹے ہوئے ہاتھ پاؤں دیکھنے میں اسے ایک خاص لذت محسوس ہوتی تھی، خلیفہ مہدی باللہ کی طرح دشمنوں کی کھوپریوں میں پھولوں کے درخت لگواتا تھا، اور اپنے قصر کے صحن کو ان گلدانوں اور گلدستوں سے آراستہ کرتا تھا ہر کھوپری پر ایک پرچہ لگا ہوتا تھا جس پر اس کے مالک سابق کا نام درج ہوتا تھا، قصر کے جس صحن میں یہ آرائش منعقد ہوتی تھی معتضد اسے "باغ" کہا کرتا تھا، اور اس باغ کی سیر کا اسے بہت شوق رہتا تھا، ایسے بادشاہوں کے سر جن کو فتح کیا تھا، وہ بصارت کے سب سے زیادہ محظوظ کرنے والے تھے، ایسی کھوپریوں کو قصر کے تہ خانے میں ایک صندوق میں مقفل رکھا جاتا تھا۔

لیکن یہ ظالم والیٔ ملک اپنی نظروں میں بہترین بادشاہ تھا؛ گویا رومیوں کا بادشاہ ٹائٹس تھا، جو ایک خاص غرض سے بنی نوعِ انسان کے فائدے کے لیے دنیا میں پیدا ہوا تھا۔

معتضد شاعرانہ جوش میں اپنی ایک نظم میں کہتا ہے:۔

"خدایا اگر تجھے منظور ہے کہ سعادت اور مسرت تیری مخلوق کو نصیب ہو تو مجھے عرب اور غیر عرب سب پر یکساں حکومت کرنے کی قوت بخش، کیونکہ میں کبھی راہِ راست سے نہیں پھرا ہوں۔ کبھی میں نے اپنی رعایا کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا ہے جو ایک فیاض اور دریادل بادشاہ کی شان کے خلاف ہو۔ میں نے ہمیشہ ظالم اور زبردست سے انھیں پناہ میں رکھا ہے، اور جن مصائب نے انھیں گھیر لیا تھا انھیں دفع کیا ہے۔"

اسناد

عباد (ڈوزی)	جلد ا ص ۲۴۳ تا ۲۴۵	
	جلد ۲ ص ۴۸، ۵۲	
عبدالواحد	ص ۶۷ تا ۷۰	
ابن بسام	جلد ا ص ۱۰۱	

کتاب رابع

ملوک الطوائف

چھٹی فصل

المعتضد (بسلسلہ سابق)

معتضد کا پہلا کام یہ تھا کہ اپنے باپ کے وزیر اور معتمد حبیب کو قتل کر کے اس سے اپنا پیچھا چھڑائے، اس کے بعد بربر سے لڑائی شروع کی خاص کر قرمونہ کی بربر ریاست سے جو اشبیلیہ کے علاقے سے متصل تھی، افریقیوں سے نفرت وعداوت رکھنے کی وجوہ ذاتی تھیں، معتضد سمجھتے تھے کہ اگر بربر کا زور نہ توڑا تو بربر اُن کو یا اُن کے بعد اُن کی اولاد کو حکومت سے محروم کردیں گے، نجومیوں نے بھی خبر دی تھی کہ اُن کے خاندان کو ایک ایسی قوم غارت کرے گی جو اسپین کی رہنے والی نہ ہوگی، بربر سے جو لڑائی شروع ہوئی وہ طویل المدت ثابت ہوئی، ۴۳۴ھ مطابق ۱۰۴۲-۴۳ء میں محمد بن عبداللہ برزالی صاحب (۱۰۴۳ء)

قرمونہ ایک کمین گاہ میں دشمن کے ہاتھ سے مارا گیا، مگر اس کے مارے جانے پر لڑائی ختم نہیں ہوئی، برزالی کے فرزند اور جانشین اسحاق نے جنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔

اسی زمانہ میں معتضد اپنی سلطنت کی حدود کو مغرب کی سمت میں بڑھاتے رہے، ۴۳۶ھ/۱۰۴۴ء میں ابن طیفور نے مرتلہ کی ریاست چھین لی، پھر ابن یحییٰ صاحب لبلہ پر حملہ کیا ابن یحییٰ بربر نہ تھا بلکہ عرب تھا، لیکن جب سلطنت کو وسعت دینے کا خیال پیدا ہوتا تھا تو معتضد بربر اور عرب میں کوئی خصوصیت نہ سمجھتے تھے، ابن یحییٰ صاحب لبلہ کو جب معتضد کی فوجوں نے بہت دبایا تو وہ بربر سے جا ملا چنانچہ مظفر صاحب بطلیوس اس کی مدد کو آیا اور معتضد کو پیچھے ہٹا دیا، اور بادیس صاحب غرناطہ، اور محمد المہدی، صاحب مالقہ، اور محمد بن قاسم بن حمود صاحب جزیرۃ الخضراء کو ملا کر ایک اتحاد معتضد کے خلاف قائم کیا، ابوالولید ابن جہور نے جو ۴۳۵ھ/۱۰۴۳ء میں اپنے باپ کی موت پر جمہوری ریاست قرطبہ کا صدر مجلس ہوا تھا بہت چاہا کہ مخالفین میں مصالحت ہو جائے مگر کامیابی نہ ہوئی اور اس کی سفارتوں کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوا۔

جب ان اتحادی ریاستوں کے لشکر یکجا ہو گئے تو بربر نے بڑھ کر اشبیلیہ پر حملہ کرنے کی تدبیر کی مگر معتضد نے دشمنوں کی ایک نہ چلنے دی، مظفر صاحب بطلیوس اس وقت اپنے دارالحکومت بطلیوس میں نہ تھا، اپنی ریاست کی سرحدوں کی پوری حفاظت بھی اس نے نہ کی تھی، معتضد نے یہ حال دیکھ کر بطلیوس کے قرب وجوار کو لوٹنا اور غارت کرنا شروع کیا، اور پھر خلاف عادت ایک لشکر کو اپنی سرکردگی میں لے لبلہ پر حملہ کرنے بڑھا، شہر لبلہ کے دروازے کے قریب ایک درے میں دشمن پر حملہ کیا اور بہت سے لوگوں کو وادی لبلہ (دریائے ٹنٹو) میں جس پر شہر واقع تھا، غرق کر دیا مظفر کو خبر ہوئی تو اس نے اپنے سواروں کو جمع کر کے معتضد پر حملہ کیا، معتضد کو پیچھے ہٹنا پڑا،

اب مظفر نے اپنا لشکر اتحادیوں کے لشکر سے جا ملایا، لیکن جس وقت یہ اتحادی (۶۳۵)
اشبیلیہ کے نواح کو لوٹنے لگے تو ابن یحییٰ صاحب لبلہ اتحادیوں کو چھوڑ کر معتضد سے

جا ملا، مظفر نے ابن یحییٰ کو اس عہد شکنی کی یہ سزا دی کہ جو روپیہ اس نے مظفر کے پاس امانت رکھا تھا اُسے ضبط کر لیا، اور لبلہ کے علاقے کو جی کھول کر لوٹا، ابن یحییٰ نے معتضد سے فریاد کی، معتضد نے بطلیوس کی فوج پر حملہ کر دیا اور اس فوج کو حیلے سے ایک کمین گاہ تک لا کر وہاں اُسے شکست دے دی، مگر معتضد اس فتح کو کافی نہ سمجھا، اور اپنے فرزند اسماعیل کو یابرہ (یا یبورہ) کے علاقے میں بھیجا تاکہ اس علاقہ کو تباہ اور غارت کرے۔

مظفر بادشاہ بطلیوس نے دشمن کے روکنے کے لیے جس قدر آدمی ایسے ملے جو ہتھیار لگا سکیں جمع کیے، اور اسحاق صاحب قرمونہ سے کمک لے کر دشمن پر حملہ کرنے بڑھا، قرمونہ کے بربر نے مظفر کو بہت سمجھایا کہ حملہ کرنے نہ جایئے اور یہ بھی کہا کہ "آپ کو معلوم نہیں کہ اشبیلیہ کا لشکر کس قدر زیادہ ہے، ہم کو اس لشکر کے کثیر ہونے کی خبر اشبیلیہ سے پہنچی ہے، اور معتضد کے اس لشکر کو ہم نے دیکھا بھی ہے" مگر مظفر پر ان لوگوں کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا، لڑا، اور لڑنے کی سزا یہ ملی کہ شکستِ فاش کھائی جس میں اُس کے تین ہزار آدمی مارے گئے، مقتولوں میں اسحاق والیٔ قرمونہ بھی تھا، جو اپنے باپ کے لشکر کو لے کر اس لڑائی میں آیا تھا، اسحاق کا سر کاٹ کر معتضد کے سامنے پیش کیا گیا، معتضد نے اس سر کو اُسی صندق میں رکھا جس میں بادشاہوں کے کٹے ہوئے سر مقفل رہتے تھے، اسی صندوق میں اسحاق کے دادا عبداللہ برزالی کا سر بھی تھا۔

ایک مدت تک بطلیوس کی حالت تباہ رہی، دوکانیں بند اور بازار سونے ہوگئے شہر کے بڑے لوگ شکست والے دن سب کے سب قتل ہو چکے تھے، بڑی مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اشبیلیہ والوں نے کھیتیاں کھلیان سب غارت کر دیے اس کی وجہ سے کل علاقے میں قحط پڑ گیا، مظفر بالکل بے یار و مددگار رہ گیا، اتحادیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اب وہ اپنے دارالحکومت میں سخت غم اور غصہ کی حالت میں بیکار بیٹھا رہتا تھا، مگر اس حالت میں بھی اُس نے اپنی خودداری میں فرق نہ آنے دیا،

جب مصالحت کر لینے کا مشورہ دیا گیا تو بالکل نہ سنا، حالانکہ جس وقت ابن جہور نے مصالحت کی تحریک کی تھی تو معتضد نے اس سے انکار نہ کیا تھا، مظفر نے ایسا ظاہر کیا کہ جو کچھ اس کو نقصان پہنچا ہے، وہ گویا کچھ بھی نہ تھا، چنانچہ ایک آدمی قرطبہ روانہ کیا کہ کچھ لونڈیاں، اچھی گانے والی خرید کر لائے، اس قسم کا مال اس زمانہ میں ذرا مشکل سے ملتا تھا، صرف دو لونڈیاں وہ بھی معمولی گانے والی دستیاب ہوئیں، بادشاہ بطلیوس کی اس حرکت پر سب کو تعجب تھا کیونکہ مظفر بہت محتاط شخص تھا، اور گانے والیوں کا اسے کبھی شوق بھی نہ رہا تھا، سب کو حیرت تھی کہ جب ملک کو اس قدر تباہی کا سامنا ہوا اس وقت ارباب نشاط کے خریدنے کا کیا موقع تھا؟ لیکن جب اصل وجہ معلوم ہوئی تو سب کا تعجب دور ہو گیا، مظفر کو خبر لگی تھی (۶۳۶) کہ اسی زمانہ میں قرطبہ میں ایک وزیر کا مال فروخت ہوا تھا، اور اس مال میں سے معتضد نے ایک مشہور گانے والی کنیز خریدی تھی، پس یہ ظاہر کرنے کو کہ جیسا اطمینانِ خاطر معتضد کو حاصل ہے وہی مظفر کو بھی ہے، مظفر نے کنیزیں خریدنے کے لیے ایک آدمی قرطبہ روانہ کیا تھا

بہرکیف ابن جہور نے مصالحت کی کوشش میں کمی نہ کی، جولائی ۱۰۵۱ء ربیع الاول ۴۴۳ھ میں وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا، یعنی اسی زمانہ میں مظفر اور معتضد میں ایک طول طویل گفتگو کے بعد صلح ہو گئی۔

اب معتضد، بادشاہ لبلہ ابن یحییٰ سے جنگ کرنے کی طرف متوجہ ہوئے ابن یحییٰ کے پاس مقابلہ کرنے کو سوائے اپنی فوج کے اور کچھ نہ تھا، لبلہ پر معتضد کی لشکر کشی فوج کی نقل و حرکت کے سوا اور کچھ ثابت نہ ہوئی، لڑائی نہیں ہوئی، ابن یحییٰ اپنی کمزور حالت سے واقف تھا اس لیے لبلہ کو بچانے کی کوشش نہیں کی، اور شہر چھوڑ کر قرطبہ جانے کا قصد کیا، تاکہ زندگی کے باقی دن وہیں گذارے، معتضد نے ابن یحییٰ سے بہت اخلاق کا برتاؤ کیا، اور فوج کا ایک دستہ ابن یحییٰ کے پاس اس غرض سے بھیجدیا کہ وہ ان کو عزت کے ساتھ قرطبہ تک پہنچا دے۔

عبدالعزیز بکری جو اس وقت ریاست ولبہ اور اس کے قریب ایک چھوٹے سے جزیرے پر جس کا نام سلطیش تھا، حکومت کر رہا تھا، سمجھا کہ اب میری باری آنے والی ہے اس خیال سے کہ ریاست کے جانے میں تو کوئی شک ہے نہیں، جو کچھ بچ سکے اسی کو بچالے

عبدالعزیز نے معتضد کو ایک خط لکھا، حال میں جو فتوحات معتضد کو حاصل ہوئی تھیں، اُن پر مبارکباد دی، اور اُن دوستانہ مراسم کو یاد دلایا جو عبدالعزیز اور معتضد کے خاندان میں قدیم زمانہ سے چلے آتے تھے، خود بھی اظہارِ اطاعت کیا، اور دلبہ کی ریاست اس شرط سے نذر میں دینی چاہی کہ سلطیش کا جزیرہ اُسی کے قبضے میں رہے۔

معتضد نے عبدالعزیز کی درخواست منظور کی، اور یہ ظاہر کرکے کہ عبدالعزیز سے ملاقات کرنی منظور ہے، معتضد دلبہ کی طرف روانہ ہوئے عبدالعزیز نے اپنی خیر اسی میں سمجھی کہ مہمان کے آنے کا انتظار نہ کرے، چنانچہ جس قدر خزانہ دلبہ میں رکھتا تھا اُسے جزیرہ شلطیش میں منتقل کردیا، معتضد دلبہ آئے، شہر پر قبضہ کیا، اور ایک فوجی افسر کو اپنا نائب مقرر کرکے اشبیلیہ واپس چلے آئے، مگر نائب کو یہ حکم دیتے گئے کہ عبدالعزیز جزیرہ شلطیش سے باہر نہ جانے پائے، اور شلطیش میں کوئی باہر کا آدمی بھی اُس کے پاس نہ آئے۔

جب عبدالعزیز کو یہ بات معلوم ہوئی تو اُس نے بڑی دانشمندی سے معتضد کے نائب سے جو دلبہ میں مقرر ہوا تھا، خط و کتابت کی، اور آخر کار اپنا کل سامانِ جبر اور جہاز معتضد کے ہاتھ چھ ہزار دینار میں فروخت کرنے اور قرطبہ چلے جانے کی اجازت حاصل کرنی چاہی معتضد نے اجازت دیدی، لیکن عبدالعزیز جب قرطبہ جانے لگا تو راستے میں اس کا مال ضبط کرنے کی تدبیر کی، عبدالعزیز کو اس کا پتہ چل گیا، صاحب قرمونہ نے فوج کا ایک دستہ سفر میں ساتھ رہنے کے لیے اُس کے پاس بھیجدیا تھا، اس دستۂ فوج کی حفاظت میں عبدالعزیز صحیح سلامت قرطبہ پہنچ گیا۔

دلبہ اور شلطیش پر قبضہ کرنے کے بعد معتضد نے شلب کی چھوٹی سی ریاست کو تاکا اس ریاست کا والی عربی خاندان بنی مزینہ کا ایک شخص تھا، جس کے بزرگ اسپین کے اس حصے میں مدت سے بڑے بڑے علاقوں کے مالک ہوتے چلے آئے تھے اور خلفائے بنی امیہ کے عہد میں بڑے بڑے منصبوں پر ممتاز ہوتے رہے تھے۔ ۶۱۰۴۸

صاحب شلب نے اطاعت قبول کرنے کی جگہ مرنے کو بہتر سمجھا، اور معتضد کا مقابلہ ایسی ہمت اور دلیری سے کیا جو انسان میں جان سے مایوس ہونے کے وقت پیدا ہو جاتی ہے

لیکن اشبیلیہ کی فوج نے جو محمد بن معتضد کی سرکردگی میں برائے نام تھی، کیونکہ ابن معتضد کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس کی تھی، آخر کار شلب کو فتح کر لیا (یہ واقعہ ٤٤٤ھ/١٠٥٢ء یا ٤٤٣ھ/١٠٥١ء کا ہے، کیونکہ شلب کی فتح لبلہ اور ولبہ کی فتح کے بعد مگر شنت ماریہ کی فتح سے قبل عمل میں آئی تھی) لڑائی جہاں بہت سخت ہوئی تھی وہاں ابن مزینہ نے چاہا کہ لڑتے لڑتے مرجائے، لیکن معتضد نے اُسے مرنے نہ دیا، اور زندہ گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا اس کے بعد ابن مزینہ کے بیٹے محمد کو شلب کی حکومت دے کر معتضد ریاست شنت ماریۃ الغرب کی طرف متوجہ ہوا شنت ماریہ کا شہر سمندر کے کنارے ایک راس پر ہے جسے اب تک سینٹ ماریہ کہتے ہیں، خلیفہ سلیمان المستعین نے اپنے زمانۂ حکومت میں شنت ماریہ کا شہر ماردہ کے ایک شخص سعید بن ہارون کو بطور جاگیر عطا کیا تھا، سعید بن ہارون کا نسب کہیں بیان نہیں ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ عرب تھا نہ بربر، عربی مؤرخ جن لوگوں کے نسب سے لاعلمی ظاہر کرتے تھے وہ اکثر اسپینی ہوا کرتے تھے، اس لیے ممکن ہے کہ سعید بن ہارون اسپینی مسلمان ہو جب سلیمان المستعین کا انتقال ہو گیا تو سعید بن ہارون شنت ماریہ کا خود مختار حاکم بن گیا، اور جب سعید کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا محمد بن سعید ریاست کا مالک ہوا، جب اشبیلیہ والوں نے اس پر حملہ کیا تو اس نے خفیف سا مقابلہ کیا۔

معتضد نے شنت ماریہ کی ریاست اور شلب کی ریاست ایک کر کے اپنے لڑکے کو اُس کی حکومت تفویض کی (یہ واقعہ ٤٤٤ھ/١٠٥٢ء کا ہے)

ان جلد اور پے در پے فتوحات سے اشبیلیہ کی سلطنت کو مغرب کی سمت میں بہت وسعت حاصل ہو گئی، لیکن اسپین کی جنوبی سمت میں جہاں روسا بربر حکومت کرتے تھے اشبیلیہ کی ترقی میں مزاحمت ہوتی رہی، ان بربر رئیسوں میں اکثر رئیس معتضد سے صلح و آشتی رکھتے تھے، بلکہ معتضد کی سیادت بایں سمجھے کہ فرضی ہشام المؤید کی خلافت کو تسلیم کرتے تھے، مگر معتضد اس برائے نام سیادت کو کافی نہ سمجھتے تھے، قصد یہ تھا کہ ان بربر رئیسوں کا قلع قمع کر کے اُن کی ریاستوں کو اپنے قبضے میں لائیں، لیکن اُنھوں نے اس کام میں

احتیاط کی، کیونکہ وہ کسی مشکل کام میں اس وقت تک ہاتھ نہ ڈالتے تھے جب تک گہری سازشیں کر کے اپنے حق میں کامیابی کا پورا اطمینان نہ کر لیتے تھے۔

تلسب پر قبضہ کرنے کے بعد صرف دو ملازموں کو ساتھ لے کر معتضد بغیر اطلاع کیے ابن نوح صاحب مورور، اور ابن ابی قرہ یفرنی صاحب رندہ سے ملاقات کرنے ان کے شہروں میں گیے، بربر کو معتضد سے سخت عداوت تھی اور معتضد بھی اس بات کو خوب جانتے تھے، پھر تعجب ہوتا ہے کہ کیوں انھوں نے دیدہ و دانستہ ان بربر یمیسوں کے پاس جا کر اپنی جان کو خطرہ میں ڈالنا پسند کیا، وجہ یہ تھی کہ معتضد جرأت اور ہمت میں کچھ کم نہ تھے اور گو خود بہت ایماندار نہ تھے، لیکن دوسروں کی ایمانداری پر بھروسہ کرتے تھے مورور میں ابن نوح نے ان کی بہت خاطر مدارات کی اور بغیر اطلاع ملاقات پر بیحد مسرت ظاہر کی، بڑے اہتمام سے ان کی مہمانداری میں مصروف ہوا، اور اپنی دوستی کا انھیں یقین دلایا، لیکن معتضد میٹھی میٹھی باتیں سننے اور پر تکلف دعوتیں اڑانے کے لیے نہیں آئے تھے، ان کا مقصد کچھ اور ہی تھا، وہ اس لیے آئے تھے کہ حالات کا بچشم خود مطالعہ کریں اور اگر ممکن ہو تو بڑے بڑے آدمیوں کو اپنی طرف ملا لیں، چنانچہ مورور پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں کے عرب بربر کی حکومت سے آزاد ہونے کے بہت آرزومند ہیں، اور جب کوئی موقع آئے گا تو معتضد کا ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں گے۔

معتضد کے حکم سے اس کے دونوں ملازم اشرفیاں اور جواہرات اپنے ساتھ لائے تھے معتضد نے بربر کے بعض فوجی افسروں کو زر و جواہر دے کر اپنی طرف ملا لیا، ابن نوح کو معتضد کی طرف سے کچھ بدگمانی نہ ہوئی اور اس کو ان سازشوں کا مطلق علم نہ ہوا۔

مورور میں سب باتوں کی طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد معتضد رندہ پہنچے، یہاں بھی ان کی بہت خاطر و تواضع ہوئی اور جو تدبیریں سوچ کر آئے تھے ان پر عمل کرنے میں بھی وہ کامیاب رہے، بلکہ یہاں مورور سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی، رندہ کے عرب مورور کے عربوں سے بھی زیادہ بربر سے گلو خلاصی کے خواہشمند تھے، اور یہاں بنی ابی قرہ حکومت کرنے میں بنی نوح سے بھی زیادہ سخت تھے، لہذا معتضد کو موقع ملا کہ یہاں بھی بغاوت کی

ایک ایسی سرنگ تیار کردیں جو ایک اشارے کے ساتھ سب کا دھواں اُڑا دے۔

مگر اِس بے احتیاطی سے کہ معتضد زندہ ہیں تنہا چلے آئے، ایک موقع ایسا آیا کہ بال بال جان بچ گئی، ایک دن ایک ضیافت میں کھانا کھانے کے بعد جس میں شراب پینے میں بھی کچھ کمی نہیں کی تھی، کسی قدر دورانِ سر معلوم ہوا، معتضد نے اپنے میزبان سے کہا کہ "کچھ کسل معلوم ہوتا ہے، اِس لیے تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں، لیکن اس صحبت کو برہم کرنا نہیں چاہتا، تھوڑی دیر سونے سے طبیعت درست ہو جائے گی، اِس کے بعد پھر شریک ہوں گا" ابنِ ابی قرہ نے کہا "جیسا ارشاد ہو" اور یہ کہہ کر معتضد کو قریب کے ایک کمرے میں لے گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب ایسا معلوم ہوا کہ معتضد بے خبر سو گئے ہیں تو ایک بربر افسر نے مجمع کو یہ کہہ کر اپنی طرف متوجہ کیا کہ اُسے ایک ضروری بات کہنی ہے، سب لوگ یہ سنتے ہی خاموش ہو گئے، اور اب اس بربر نے کہا:۔

"اِس وقت ایک بڑا موٹا بینڈھا ہمارے پاس ایسا موجود ہے جو اپنی گردن ہماری چھری کی نذر کرنی چاہتا ہے، یہ موقع ایسی خوش نصیبی کا ہے جو ہمارے خواب و خیال میں بھی نہ آسکتا تھا، اگر اِس شخص کو پانے کیلئے اندلس کی تمام دولت بھی صرف کر دیتے تو وہ ہاتھ نہ آتا، یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ اِس وقت وہ ہمارے قبضے میں ہے، اس بات کو سب جانتے ہیں کہ یہ شیطان مجسم ہے، اگر اسے غارت کر دیا تو اس ملک پر قبضہ کرنے میں ہمارا کوئی مزاحم نہیں ہو سکے گا"۔

جلسے میں جس قدر لوگ تھے، بربر کی اِس تقریر کو سُن کر دنگ رہ گئے، منہ سے کسی نے کچھ نہ کہا مگر نگاہیں زبان کا کام کرنے لگیں، چونکہ ایسے شخص کو قتل کرنا جو موجبِ خوف ہو اور جس کے مکر و فریب سے ہر شخص واقف ہو، ایسے لوگوں کے لیے ایک دلکش مضمون تھا جن کو قتل و غارت کے ارتکاب نے پہلے ہی سے سنگ دِل کر دیا تھا، اس لیے اُن کے چہروں سے بربر کی تقریر کے بعد نہ حیرت کے آثار ظاہر ہوئے اور نہ نفرت کے، صرف ایک شخص جو اوروں سے زیادہ منصف مزاج تھا، اِس مجمع میں ایسا نکلا جس کا خون اِس

بکرو دغا کی تحریک پر جوش کھانے لگا، یہ معاذ ابن ابی قرہ صاحب رندہ کا ایک رشتہ دار تھا، غصے سے اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں، کھڑے ہو کر آہستہ آہستہ آواز سے مگر نہایت متاثر ہو کر کہنے لگا:۔

"میں آپ لوگوں کو خدا کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ ہم کو ہرگز اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیئے، یہ شخص ہماری خیر خواہی پر بھروسہ کر کے یہاں آیا ہے، اُس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری طرف سے کسی قسم کے دھوکے یا دغا کا اُسے وہم و گمان بھی نہیں ہے پس ہماری غیرت کا یہی مقتضا ہے کہ جو بھروسہ اُس کو ہم پر ہے اُسے صحیح ثابت کر دیں، بربر کے اور قبیلوں میں جب ہمارے بھائی بند سنیں گے کہ ہم نے حقوق مہمان داری کو کس طرح پامال کیا ہے، اور اپنے مہمان کو مار ڈالا ہے تو وہ ہمیں کیا کہیں گے؟ لعنت ہو خدا کی اُس پر جو ایسا کام کرے۔"

معاذ کے اس کریمانہ اور غیرت دلانے والی تقریر نے بربر میں ایک جوش پیدا کر دیا میزبانی اور مہمان نوازی کے واجبات یاد دلانے سے سب کے دلوں پر وہ اثر پیدا ہوا جس کا پیدا نہ ہونا مشرقی قوموں میں شاذ ہوتا ہے۔

اُس وقت جب کہ یہ گفتگو ہو رہی تھی معتضد بظاہر سو رہے تھے مگر حقیقت میں بیدار تھے، اور نہایت خوفزدہ ہو کر بربر کی ایک ایک بات کو غور سے سُن رہے تھے معاذ کی تقریر سُن کر جب ذرا دل کو تسکین ہوئی تو اُٹھے اور فوراً جلسے میں آن بیٹھے سب لوگ اُن کے آتے ہی تعظیم کو کھڑے ہوئے، اور بہت ادب سے اُن کی پیشانی کو بوسہ دیا، اِس اظہارِ تعظیم میں مبالغہ اِس وجہ سے تھا کہ مہمان کو اِس دنیا سے دوسرے عالم میں پہنچانے کا جو خیال اِس وقت پیدا ہوا تھا، اب اُس پر سب نادم تھے۔

معتضد نے کہا "دوستو! میں اب اشبیلیہ واپس جانے کا قصد رکھتا ہوں، میں بیان نہیں کر سکتا کہ آپ کی مہمان نوازی نے مجھے کس درجہ مرہونِ منت کیا ہے میں اپنی شکر گذاری کا بدل چند ناچیز تحائف سے کرنا چاہتا ہوں، گو مجھے افسوس ہے کہ تحائف جو میرے ملازم ساتھ لے کر چلے تھے، اب تقریباً ختم ہو چکے ہیں، کچھ کاغذ اور

قلم دوات مجھے دیجئے اور ہر شخص اپنا نام اور جو چیز اُسے پسند ہو مثلاً خلعت، روپیہ گھوڑے، خوبصورت کنیزیں، غلام وغیرہ وغیرہ وہ مجھے لکھوا دے، اور جب میں اشبیلیہ پہنچ جاؤں تو اپنا نوکر میرے پاس بھیج دے، تاکہ میں سب کی فرمائشیں نوکروں کی معرفت روانہ کر دوں۔"

(۶۴۰) سب لوگ معتضد کی اس بات کو سُن کر بہت خوش ہوئے اور اُن سے اتفاق کر لیا، جب معتضد، اشبیلیہ پہنچے تو بربر کے بھیجے ہوئے آدمی بکثرت اُن کے پاس حاضر ہوئے، اور بیش بہا تحائف اپنے آقاؤں کے لیے پا کر واپس گئے۔

معتضد اور بربر میں بظاہر اب بہت اچھے تعلقات قائم ہو گئے، معلوم ہوتا تھا کہ پُرانی عداوتیں اب دلوں سے فراموش ہو گئی ہیں، اور عداوت کی جگہ اب دوستی اور رفاقت پیدا ہو گئی ہے۔

اس واقعہ کے چھ ماہ بعد معتضد نے رندہ اور مورور کے رئیسوں کو ایک ضیافت میں مدعو کیا، یہ ضیافت اُس خاطر و مدارات کا بدل تھا جو حال میں ان مقامات کے رؤسا نے معتضد کی کی تھی، ابن خزرون صاحب ارکش اور شریش بھی اس ضیافت میں بُلائے گئے، چنانچہ یوم مقررہ پر یہ تینوں یعنی رندہ، مورور، ارکش و شریش کے رئیس اشبیلیہ میں وارد ہوئے (سنہ ۴۴۵ھ ۱۰۵۳ء)

معتضد نے بڑے اہتمام سے اُن کا استقبال کیا، اور حسب دستور ان رئیسوں اور ان کے درباریوں کو حمام کرنے بھیجا، مگر کسی ترکیب سے معاذ کو حمام نہ جانے دیا۔

تقریباً ساٹھ بربر اُس حمام پر جسے معتضد نے بنایا تھا، پہنچے، باہر کے کمرے میں کپڑے اُتار کر اندر کے درجے میں غسل کے لیے داخل ہوئے، اسلامی ملکوں میں حمام میں غسل کا کمرہ، اور اُس کی دیواریں، اور فرش سب سنگ مرمر کا ہوتا ہے، اور چھت کی جگہ ایک قبہ ہوتا ہے جس میں کھڑکیاں اور کھڑکیوں میں شیشے لگے ہوتے ہیں، غسل کے لیے حوض بھی سنگ مرمر کے ہوتے ہیں، اور دیواروں کے اندر نل نیچے کے آتش دان

سے گرم ہوا کھینچ کر تمام کمرے کو بہت گرم رکھتے ہیں۔

بربر غسل کی راحتوں سے لُطف اُٹھا رہے تھے کہ کسی کسی نے کچھ ایسی آواز سُنی، جیسے کہیں دور معمار کام کرتے ہوں، مگر کسی نے اس کا کچھ خیال نہ کیا، تھوڑی دیر میں حمام اتنا گرم ہو گیا کہ برداشت کے قابل نہ رہا، لوگوں نے چاہا کہ کواڑ کھول کر باہر نکلیں، کواڑ کھولے تو دیکھتے کیا ہیں کہ دروازے میں تیغا لگا ہوا ہے، اور تمام روزن جہاں سے ہوا آ سکتی تھی، بند کر دیئے گئے ہیں، غرض ان میں سے ایک شخص بھی باہر نہ نکل سکا، اور سب اسی حال میں دم گھُٹ کر مر گئے۔

معاذ دیر تک اپنے ساتھیوں کا انتظار کرتا رہا، جب وقت زیادہ گذر لیا، اور کوئی نہ آیا تو اُس نے معتضد سے اس دیر کی وجہ دریافت کی، معتضد نے صاف صاف کُل واقعہ بیان کر دیا، معاذ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، معتضد نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا "تم بالکل نہ ڈرو، تمہارے یہ دوست اور عزیز اسی لائق تھے کہ وہ ہلاک کیے جاتے، کیونکہ اُنہوں نے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا، میں اُس وقت جاگ رہا تھا اور سب باتیں سنتا تھا۔ جو شریفانہ تقریر تم نے اُس موقعہ پر کی تھی، میں اُسے کبھی نہیں بھولوں گا، یہ تمہارا ہی طفیل ہے کہ آج میں زندہ ہوں، اب تم چاہے اشبیلیہ میں رہو اور جو کچھ مال و دولت اور آرام و راحت مجھے نصیب ہے اُس میں شریک ہو، اور اگر رندہ جانا چاہتے ہو تو نہایت قیمتی تحائف اور ایک فوج جلو میں لے کر رندہ چلے جاؤ"

(۱۴۴) معاذ نے بہت افسردہ آواز میں کہا "افسوس ہے، میں رندہ میں کیسے واپس جا سکتا ہوں، جہاں ہر چیز مجھے اپنا نقصان یاد دلائے گی"

معتضد بولا "اچھا تو پھر اشبیلیہ میں رہو، یہاں تم کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو گی" اس کے بعد معتضد نے ایک نوکر کو اشارہ کیا اور کہا "دیکھو! فوراً ایک محل معاذ کے رہنے کے لیے درست اور آراستہ کیا جائے، ایک ہزار اشرفیاں، دس گھوڑے، تیس کنیزیں، اور دس غلام اس محل میں فوراً پہنچا دیئے جائیں"

اتنا کہہ کر معتضد معاذ سے مخاطب ہو کر بولا "اِن چیزوں کے علاوہ میں نہیں

بارہ ہزار دینار سُرخ انعام کے طور پر سالانہ دیا کروں گا۔"

اب معاذ نے اشبیلیہ میں سکونت اختیار کر لی، اور یہاں وہ بادشاہوں کی طرح رہنے لگا، معتضد روزانہ اُس کو کوئی نہ کوئی قیمتی اور حسین تحفہ بھیج دیا کرتا تھا، اشبیلیہ کی فوج میں معاذ کو افسری کی عزت بخشی، اور جس وقت معاملاتِ سلطنت میں وزراء سے مشورہ کرنا ہوتا تو معاذ کو بھی شریک کرتا، اور اُس شخص کو جس نے اُس کی جان بچائی تھی سب سے زیادہ عزت کی جگہ بٹھاتا۔

بربر سرداروں کے سر اُتروا کر اُسی صندوق میں رکھوائے جسے دیکھ کر خوش ہوا کرتا تھا، اِس کے بعد مورور، ارکش، شریش، رندہ اور دیگر بلاد پر قبضہ کرنے کے لیے فوجیں روانہ کیں، ہر جگہ عرب باشندوں اور ایسے لوگوں کی مدد سے جن کو معتضد روپیہ دے چکا تھا، اِن فوجوں کو شہروں پر قبضہ کرنے میں سہولت ہوئی، رندہ پر قبضہ ہونے میں، جہاں اب ابونصر اپنے باپ کی جگہ حکومت کرتا تھا، کسی قدر مشکل پیش آئی، کیونکہ یہ شہر ایک اُونچے پہاڑ پر واقع تھا، اور اُس کی چاروں سمتیں اِس قدر سیدھی اُٹھی ہوئی چٹانوں کی تھیں کہ اُن پر چڑھ کر اوپر پہنچنا ناممکن معلوم ہوتا تھا، لیکن شہر کے عرب مل کر ایک دم بربر کے مقابلہ پر اُٹھ کھڑے ہوئے، اور بربر کو نہایت وحشیانہ طریقے سے قتل کرنا شروع کیا، ابونصر نے بھاگ کر جان بچانی چاہی، لیکن اِسی کوشش میں مر گیا، ایک دیوار پر چڑھنا چاہا، مگر پاؤں پھسل گیا، اور نیچے ایک گہرے غار میں گر کر ختم ہو گیا۔[1]

رندہ کے فتح ہو جانے سے معتضد بہت خوش ہوا، اور فوراً شہر کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیے اُس کی تعمیر شروع کی، جب نئی دیواریں اور مورچے دمدمے وغیرہ تیار ہو گئے تو اُن

---

[1] اِس واقعہ کے بڑے اجزاء ابنِ بسام نے بیان کیے ہیں، لیکن دو تین غلطیاں بھی کی ہیں، نویری نے مقام بجائے رندہ کے قرمونہ بیان کیا ہے (مقابلہ کرو عباد مولفہ ڈوزی سے جلد ا ص ۲۵۰ تا ۲۵۱ جلد ۲ ص ۱۲۹ تا ۱۳۰- ۲۱۰-۲۱۴ تا ۲۱۵ نیز دیکھو ڈوزی کا دیباچہ ابن عذاری کی تاریخ پر ص ۸۶ ۔

کے معائنے کے لیے آیا، اور سب چیزوں کو دیکھ کر جوشِ مسرّت میں اِس قسم کے اشعار کہے:۔

"اے زنادہ! میری سلطنت کے سب سے حسین جوہر، کبھی تجھ کو ایسے استحکام پر پہلے ناز نہ ہوا ہوگا، بہادر لڑنے والوں کی تلواروں اور برچھوں نے میرے لیے تجھے فتح کیا ہے، اور تیرے باشندے مجھ کو اپنا محافظ اور بادشاہ مانتے ہیں۔ آہ! اگر میری زندگی رہی تو میرے دشمنوں کی زندگی کم ہو جائے گی، اپنی جان سلامت رکھنے کے لیے میں کبھی اُن سے لڑنا بند نہ کروں گا، اُن کے دستے کے دستے میں نے قتل کیے ہیں میرے دشمنوں (۶۴ کے سر موتیوں کی طرح لڑیوں میں پروئے ہوئے میرے محل کے دروازہ پر گلے کے ہار کی طرح لٹکے ہیں۔"

اسناد:۔

عباد	جلد۱ ص ۲۴۲، ۲۴۷ تا ۲۴۹، ۲۵۱ تا ۲۵۳
	جلد۲ ص ۱۴، ۶۰، ۱۲۳، ۲۰۹ تا ۲۱۱، ۲۱۶
ابنِ بسّام	جلد۱ ص ۹۹، ۱۰۸ تا ۱۰۹
	جلد۲ ابنِ عمار پر مضمون
ابن الابار	ص ۵۰ تا ۵۱

کتاب رابع

ملوک الطوائف

ساتویں فصل

المعتضد (بسلسلۂ سابق)

معتضد تو کامیابیوں سے سُرخرو نہایت خوش و خرم زندگی بسر کر رہا تھا، مگر بادلیس ۳۱
بادشاہِ غرناطہ کی پریشانیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں، یہ سُن کر کہ بربر کے اِتنے رئیس
نہایت اذیت سے ہلاک کر دیئے گئے، بادلیس نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور رنج و
غصے سے چیخنے لگا، پھر جب سُنا کہ رندہ کے عرب باشندے قومی جوش میں تنِ واحد
ہو کر بربر کے مقابلے میں اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو بڑے مایوسانہ خیالات نے بادلیس
کے دل کو مضطرب کرنا شروع کیا، سوچتا تھا کہ اس حالت میں کیونکر یقین کر لے کہ غرناطہ
کی عرب رعایا اُس کی حکومت اور جان لینے کے لیے بنو عبادِ اشبیلیہ سے سازش
نہیں رکھتی؟ رات دن اسی کا خوف رہنے لگا، فکر اور غصّہ سے حالت مجنونانہ ہو گئی،

کبھی طیش میں آکر تمام دنیا کو تودۂ ملامت بناتا، کبھی طرح طرح کے خطروں کے خیال سے چپ لگ جاتی، غرض انہی فکروں نے اُس کو ایسا خمیدہ اور پا افتادہ کر دیا جیسے کسی درخت پر بجلی گری ہو، اِن سب باتوں پر ایک عجیب بات جس سے آئندہ کے لیے اور بھی خوف پیدا ہوا، یہ ہوئی کہ بادلیس نے شراب پینی چھوڑ دی۔

بادلیس دل ہی دل میں ایک نہایت خوفناک تدبیر سوچنے لگا، وُہ خوب جانتا تھا کہ جب تک عرب اُس کی سلطنت میں موجود ہیں، جان کو سلامتی نصیب رہنی ممکن نہیں پس اپنی خیر اسی میں ہے کہ ان سب عربوں کو نیست و نابود کر دیا جائے، جمعہ کا دن قریب ہے، مسجد میں سب لوگ جمع ہوں گے، بس اُسی دن عربوں کا کام تمام کر دیا جائے، لیکن یہودی وزیر سموائل سے بغیر مشورہ کیے بادلیس کوئی کام نہ کرتا تھا، چنانچہ اِس وزیر سے اپنا خیال ظاہر کیا، اور یہ بھی کہا کہ وزیر چاہے اُس کے خیال کو پسند کرے، یا نہ کرے، مگر ہوگا وہی جو اُس نے سوچا ہے، یہودی وزیر نے بادلیس کی تدبیر کو اچھا نہ سمجھا، اور چاہا کہ بادشاہ کو اس سے باز رکھے، نہایت ادب سے عرض کرنے لگا کہ ابھی توقف فرمایا جائے، اور اُن نتائج پر بھی غور کر لیا جائے جو ایسے کام سے پیدا ہونے والے ہیں، پھر عرض کیا کہ "فرض کیجئے کہ کام اُسی طرح انجام پایا جیسا کہ آپ چاہتے ہیں اور تمام خطروں کو بغیر سوچے آپ نے عربوں کو ہلاک بھی کر دیا تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اسپین کے باقی شہروں کے عرب اِس حادثۂ عظیم کی طرف سے جو اُن کے ہم قوم لوگوں پر وارد ہوگا غافل ہو جائیں گے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اِس صورت میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں گے؟ نہیں ہرگز نہیں، میری آنکھوں میں تو ابھی سے یہ تصور پھرنے لگی ہے کہ عرب قہر و غضب میں بھرے ہوئے شمشیر بکف آپ کی طرف بڑھے چلے آتے ہیں، مجھے تو ابھی سے نظر آرہا ہے کہ بے شمار دشمن سمندر کی موجوں کی طرح آپ پر اُمنڈ آئے ہیں، اور اُن کی تلواریں آپ کے سر پر چمک رہی تھی"

باوجود اس تقریر کے بادلیس پر کچھ اثر نہ ہوا، اور وہ اپنے ارادہ پر بدستور پختہ رہا اُس نے سموائل سے کہہ دیا کہ یہ بات کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔

غرض بادیس نے ضروری تیاریاں کر کے اس مضمون کے احکام جاری کئے کہ جمعہ کو تمام فوجیں پورے ہتھیار لگا کر میدان میں حاضر ہوں، اُن کا معائنہ کیا جائے گا۔

سموائیل اس اثنا میں بیکار نہ بیٹھا، چند عورتوں کے ذریعہ سے جو عربی رئیسوں کے ہاں آتی جاتی تھیں، اطلاع کرا دی کہ آئندہ جمعہ کو وہ مسجد میں نہ آئیں، بلکہ کہیں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ عرب اس طرح ہوشیار ہو گئے، اور جمعہ کو صرف چند معمولی آدمی مسجد میں آئے جب بادیس کا یہ منصوبہ نہ چلا تو اُس نے بہت غصہ کی حالت میں سموائیل کو طلب کیا اور افشائے راز کرنے پر اُس کو نہایت سخت و سُست کہا، وزیر نے عرض کیا کہ "میں نے راز کی کوئی بات کسی پر ظاہر نہیں کی، رہا عربوں کا مسجد میں نہ آنا، تو اس کی وجہ ظاہر ہے چونکہ آپ نے حالتِ امن میں تمام فوج کو مسلح کر کے بلا کسی سبب کے حاضر کرایا تھا، اس لئے قدرتی طور پر لوگوں کو خطرے کا اندیشہ گذرا، بجائے غصہ کرنے کے حضور کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے، عربوں کو آپ کا ارادہ معلوم ہو گیا تھا، ممکن تھا وہ آپ کے مقابلے کو اُٹھ کھڑے ہوتے، مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا، غصہ دُور کر کے اس معاملہ پر غور فرمایئے اور وہ وقت آنے والا ہے کہ میں نے جو رائے دی تھی اُس سے آپ اتفاق کرنے لگیں گے۔"

شاید بادیس اس سمجھانے پر بھی اپنی تدبیر کو عمل میں لانے پر اصرار کرتا، لیکن ایک بربر شیخ اس گفتگو کے وقت موجود تھا، اُس نے بھی سموائیل کے دلائل کو مضبوط سمجھ کر تسلیم کیا، غرض بادیس کو سوائے اس کے کچھ کہتے نہ بن پڑا کہ "میں اپنی غلطی کو تسلیم کرتا ہوں۔" اور اب اُس نے اپنی عربی رعایا کو قطعاً نیست و نابود کرنے کے خیال سے در گذر کی، لیکن جب موردر، ارکش، شریش اور رندہ کے بربر نے جو غرناطہ میں پناہ گزیں ہوئے تھے، فریاد و زاری کی تو بادیس نے اپنی نسل کے اس دشمن صعب یعنی معتضد کو سزا دینے کا مستقل ارادہ کر لیا، اور موردر، ارکش اور رندہ کے بربر کو جنھوں نے غرناطہ میں پناہ لی تھی، اپنی فوجوں کے ہمراہ لے کر اشبیلیہ کے علاقہ پر حملہ کر دیا اس لڑائی کے مفصل حالات ہم تک نہیں پہنچے، لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کشت و خون بہت ہوا، کیونکہ ادھر تو اسودیوں میں اپنے سرداروں کی ہلاکت پر جوشِ

انتقام بھرا ہوا تھا، اُدھر عربوں کو غرناطہ کے بربر سے بہ نسبت اور جگہ کے بربر کے کہیں
زیادہ خصومت تھی، اور عرب اُن کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، غرناطہ کے بربر کو وہ
کافر اور دشمنِ دین سمجھتے تھے، کیونکہ اُن کا وزیر ایک یہودی تھا، چنانچہ جب اشبیلیہ
کے شاعروں نے معتضد کو اُس کی فتوحات پر مبارکباد دی ہے تو اُس میں یہ بھی کہا
کہ "تو نے اپنی تلوار سے اُس قوم کو سزا دی ہے جو یہودیوں کے برابر ہے، گو وہ اپنے
کو بربر کہتی ہے" اہلِ اشبیلیہ کے نزدیک غرناطہ کے لوگوں سے لڑنا جہاد تھا، اور
اسی خیال نے اُن میں اتنی قوت پیدا کر دی کہ بادیس کی فوجوں کو انہوں نے پسپا کر
(۶۴۵) دیا، وہ لوگ جو مورور، ارکش، شریش اور رندہ سے بھاگ کر بے خانماں ہوئے
تھے اُن کی حالت رحم کے قابل تھی، معتضد نے اُن کو اُن کے گھروں کو واپس نہ
جانے دیا، اور بادیس نے غرناطہ میں اُن کے رہنے کی ممانعت کر دی، مجبور ہو کر
یہ لوگ آبنائے جبلِ طارق عبور کر کے روزی کی فکر میں افریقہ میں سبتہ کے ساحل پر
اُترے لیکن سبتہ میں سکوت نے جو وہاں کا حاکم تھا انہیں ٹکنے نہ دیا، غرض ایسے
زمانہ میں جب کہ افریقہ میں قحط پڑ رہا تھا، یہ لوگ ہر در سے ناکام پھر کر تقریباً سب کے
سب فاقہ کشی سے ہلاک ہو گئے۔

اب معتضد نے قاسم حمودی (قاسم بن محمد بن قاسم بن حمود) صاحب جزیرۃ الخضراء
پر حملہ کیا، بربر کے رئیسوں میں یہ سب سے کمزور رئیس تھا، مصالحت کرنے پر بہت
جلد مجبور ہو گیا، معتضد نے اس کو قرطبہ میں رہنے کی اجازت دے دی (۴۴۸ھ ۱۰۸۵ء)

اس اخیر فتح یعنی جزیرۃ الخضراء پر قبضہ کرنے کے بعد معتضد نے سوچا کہ والدِ مرحوم
(قاضی ابو القاسم محمد) کے وقت میں ہشام المؤید کا جو تماشا کھڑا کیا گیا تھا، اور جسے اپنے
وقت میں بھی جاری رکھنا پڑا ہے، اب اُسے بند کر دینا چاہیئے، اور یہ بات تسلیم کر لینی
چاہیئے کہ ہشام المؤید زندہ نہیں ہیں، جن اسباب کی بنا پر قاضی ابو القاسم محمد کو ضرورت
پیش آئی تھی کہ اس خلیفہ کو زندہ ظاہر کر کے اُس کی پناہ میں رہیں، اب وہ اسباب
باقی نہ تھے، اس زمانہ میں عام طور پر تسلیم کر لیا جاتا تھا کہ قدیم طرزِ سلطنت کو پھر زندہ

کرنا ممکن نہیں، خلافت جو مٹ چکی ہے، اب دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی، خلافت کو دوبارہ قائم کرنے کے متعلق جو خواب وخیال لوگوں کے دلوں میں کچھ باقی بھی تھے وہ تجربہ سے بیکار اور عبث ثابت ہو چکے تھے، اس لئے قلعہ رباح کا بوریہ باف خلف جسے ہشام المؤید بنا رکھا تھا، اب ایک بیکار چیز تھا، ممکن ہے کہ یہ شخص جو نہ کبھی رعایا کے سامنے ظاہر ہوا تھا، اور نہ کبھی دربار میں بیٹھا تھا اس وقت زندہ نہ ہو، اور کبھی کا اپنی موت مر چکا ہو، یا معتضد نے اُس کا کام تمام کرادیا ہو، جیسا کہ بعض مورخوں نے لکھا ہے، بہرکیف اس بارے میں صرف قیاس سے کام لیا جا سکتا ہے کیونکہ معتضد جس بات کو چھپانا چاہتے تھے، اُس پر ایسا پردہ ڈالے رکھتے تھے کہ کوئی اُس پردہ کو اُٹھا نہ سکتا تھا، صرف اتنی بات یقینی ہے کہ ۴۵۱ھ ۱۰۵۹ء میں معتضد نے دار الحکومت اشبیلیہ کے عمائد واکابر کو طلب کیا، اور جب وہ حاضر ہوئے تو اُن کو اطلاع دی کہ "تھوڑے دن ہوئے خلیفہ ہشام المؤید کا مرض فالج سے انتقال ہوگیا ہے، چونکہ اُس وقت لڑائی ہو رہی تھی اس لئے اس خبر کو عام نہیں کیا گیا، اب امن ہوگیا ہے اس لئے اس واقعہ کے ظاہر کرنے میں کوئی اندیشہ نہیں ہے" اس کے بعد معتضد کے حکم سے خلف بوریہ باف کا جنازہ شاہانہ شان وشوکت سے اٹھایا گیا، اور معتضد بہ حیثیتِ حاجب پیادہ پا بغیر طیلسان سر پر ڈالے جنازے کے ساتھ چلے اسپین کی مشرقی ریاستوں کو بھی جن سے اتحاد تھا خلیفہ ہشام المؤید کی موت کی اطلاع دی گئی، اور اس امر کا اعلان کیا گیا کہ خلیفہ مرحوم نے اپنے وصیت نامہ میں معتضد کو امیرِ اسپین مقرر کیا ہے۔

اب معتضد کے تمام کام اس غرض ونیت سے ہوتے تھے کہ وہ تمام اسپین کے (۶۴۶)
امیر اور بادشاہ ہو جائیں، اور اسی غرض سے اُنہوں نے مصمم قصد کر لیا کہ سلطنتِ اسپین کے سابقہ دار الحکومت یعنی قرطبہ پر قبضہ کریں، لیکن قسمت میں یہ لکھا تھا کہ اس معاملہ میں اُنہیں سخت ناکامی ہو۔

معتضد کی فوجیں قرطبہ کے علاقے پر کئی بار حملہ کر چکی تھیں، لیکن ۴۵۵ھ ۱۰۶۳ء میں

معتضد نے اپنے فرزندِ کلاں اسماعیل کو جو امیرِ لشکر تھا، حکم دیا کہ مدینۃ الزاہراء پر جو نصف کے قریب کھنڈر ہو چکا تھا، قبضہ کیا جائے، اسماعیل نے اس حکم کو بجالانے میں کسی قدر پس وپیش ظاہر کیا، کچھ عرصہ سے اسماعیل باپ سے رنجیدہ خاطر رہنے لگا تھا باپ کی سخت مزاجی اور ظلم کی شکایت تھی، اور کہا کرتا تھا کہ "جب بھی مجھے کوئی لڑائی لڑنی یا کوئی قلعہ فتح کرنا پڑا، تو ہمیشہ مجھے تھوڑی سی فوج دی گئی، جس کی وجہ سے اکثر جان کا خطرہ رہا"۔

اسماعیل کی ان شکایتوں کو باہر کے ایک آدمی نے اور بھی دل میں بٹھا دیا، اس شخص کا نام ابو عبداللہ بزلیانی تھا، جس زمانہ میں بادیس بادشاہِ غرناطہ نے مالقہ پر قبضہ کیا تھا تو ابو عبداللہ بھاگ کر اشبیلیہ چلا آیا تھا، اُس کی بڑی تمنا یہ تھی کہ کہیں حاجب کا عہدہ مل جائے، اس سے بحث نہ تھی کہ کس بادشاہ کا حاجب مقرر ہو۔

غرض اس عبداللہ بزلیانی نے اسماعیل کو اس بات کا اشتعال دلایا کہ باپ سے باغی ہو کر کسی مقام پر مثلاً جزیرۃ الخضراء میں اپنی حکومت جدا قائم کرے، مگر بزلیانی کو اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔

مدینۃ الزاہراء پر قبضہ کرنے کا حکم جس وقت اسماعیل کو ملا تو باپ سے کشیدہ خاطر تو پہلے ہی سے تھا، اب بالکل بے قابو ہو جانے کے لئے ایک اشارہ کافی ہو گیا، زیادہ فوج دینے سے معتضد نے انکار کر دیا، اسماعیل نے بہت کہا کہ "تھوڑی فوج سے قرطبہ جیسی ریاست پر کامیابی کے ساتھ حملہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے، اور اگر بادیس بادشاہِ غرناطہ قرطبہ والوں کی کمک پر آگیا، اور یقیناً وہ ایسا ہی کرے گا تو پھر اشبیلیہ کی فوجیں دو طرف سے گھر جائیں گی"۔ مگر معتضد نے ایک عذر بھی نہ سنا، اور غصہ میں آکر اسماعیل کو نامرد اور بزدل کہا، اور یہ بھی کہا کہ "اگر تو نے جانے میں دیر کی تو تیرا سر قلم کرا دوں گا"۔ قریب تھا کہ ان الفاظ پر عمل ہو جائے۔

اسماعیل اس ذلت پر پیچ وتاب کھاتا غصہ کی حالت میں مدینۃ الزاہراء کی طرف چلا، بزلیانی سے مشورہ کیا، اُس نے اسماعیل کو آسانی سے یقین دلا دیا کہ جس بات پر

وہ مدت سے باہم مشورہ کیا کرتے تھے اُس کے حاصل کرنے کا اب موقع آگیا ہے، اشبیلیہ سے دو دن کا سفر طے کرنے کے بعد اسماعیل نے فوج کے افسروں سے کہا کہ کسی اور کام کے لئے جو قرطلبیکی مہم سے بھی زیادہ ضروری ہے اُس کے والد معتضد کا حکم آیا ہے کہ فوراً اشبیلیہ واپس
(۶۴۷) آئے، یہ کہہ کر اسماعیل، ابزلیانی کو ہمراہ لئے تیس سواروں کے ساتھ گھوڑا دوڑاتا ہوا اشبیلیہ آیا، معتضد اُس وقت شہر میں نہ تھے، بلکہ دریا پار اپنے ایک قصر میں جس کا نام قصرِ زاہد تھا، ٹھہرے ہوئے تھے، اسماعیل نے دیکھا کہ قلعہ اشبیلیہ کے دروازوں پر پہرا معمولی ہے، چنانچہ رات کے وقت قلعہ پر اسماعیل نے قبضہ کر لیا اور باپ کے خزانے سے روپیہ نکال کر خچروں پر رکھا، اور اس خیال سے کہ دریا اُتر کر قصرِ زاہد تک کوئی خبر نہ پہنچا دے، قلعہ کے نیچے جس قدر کشتیاں دریا میں تھیں اُن کو ڈبوا دیا، پھر اپنی ماں اور حرام سرا کی دیگر مستورات کو ہمراہ لئے جزیرۃ الخضرا کی طرف چلا۔

اسماعیل نے بہت احتیاط کی تھی کہ باپ کے کانوں تک اس واقعہ کی خبر نہ پہنچے، مگر اسمٰعیل کے ایک سوار نے اس حرکت کو ناپسند کر کے جس طرح گھوڑے پر بیٹھا تھا، گھوڑا دریا میں ڈال دیا، اور دریا پار کر کے معتضد کو کل حالات سے آگاہ کر دیا،

معتضد نے یہ سنتے ہی سواروں کا ایک دستہ اسماعیل کے تعاقب میں روانہ کیا، اور تمام قلعہ داروں کے پاس قاصد دوڑا دیے، سب قلعوں میں خبر وقت پر پہنچ گئی، چنانچہ اسمٰعیل جس قلعہ پر پہنچا اُس کا دروازہ بند پایا، اس پر اُس نے اس خوف سے کہ کہیں قلعہ داروں کی فوج اُس پر حملہ نہ کر دے، ایک قلعہ کے حاکم سے جس کا نام حسادی تھا پناہ کی درخواست کی، یہ قلعہ مدینہ شذونہ کے علاقے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا، حسادی نے اس شرط سے پناہ دینے کا وعدہ کیا کہ اسمٰعیل پہاڑ کے نیچے ہی قیام رکھے، اس کے بعد حسادی فوج ساتھ لئے قلعہ سے نیچے آیا، اور اسمٰعیل کو سمجھایا کہ باپ سے مصالحت کر لے، اسمٰعیل نے یہ دیکھ کر کہ بات بگڑ چکی ہے حسادی کا کہنا مان لیا۔

اس کے بعد اسمٰعیل کو حسادی قلعہ میں لے آیا، اور اُس کی شان کے مطابق اُس کی خاطر و مدارات میں مصروف ہوا، مگر ساتھ ہی معتضد کو کُل واقعہ لکھ بھیجا، اور آخر میں یہ لکھ دیا کہ "اسمٰعیل کو اپنی غلطی پر سخت ندامت ہے، اور وہ آپ سے عفوِ تقصیر کا خواستگار ہے"۔

معتضد کے پاس سے حسادی کے اس خط کا ایسا جواب آیا جس سے سب کو اطمینان ہو گیا کیونکہ اس خط میں بیٹے کی خطا معاف کر دینے کا وعدہ تھا۔ چنانچہ اس جواب سے مطمئن ہو کر اسمٰعیل فوراً اشبیلیہ چلا آیا۔

معتضد نے بیٹے کو اُس مال سے جو اس نے نکالا تھا، متمتع ہونے میں کسی طرح کی دست اندازی نہ کی، لیکن پہرے بٹھا دیئے کہ شہزادے کی نقل و حرکت پر ہر وقت نظر رکھیں، البرطیانی اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا گیا،

اسمٰعیل اپنے باپ کی چالوں سے خوب واقف تھا، اور سمجھ گیا تھا کہ جو معافی اسے دی گئی ہے وہ محض ایک فریب ہے، چنانچہ اس نے پہرے والوں اور چند غلاموں کو روپیہ دے کر رات کے وقت ایک جگہ جمع کیا، اور ہمت بڑھانے کے لئے انہیں خوب شراب پلائی، پھر ان کی مدد سے قصر کی دیوار پر چڑھا جہاں سے باپ پر اچانک حملہ کرنا ممکن تھا، سمجھا یہ تھا کہ باپ قصر میں سوتے ہوں گے، اور میں ان کو اسی حالت میں ہلاک کر دوں گا، مگر معتضد بالکل خلافِ توقع دفعتاً ایک دستہ فوج لئے ہوئے سامنے نظر آئے، جنہیں دیکھتے ہی اسمٰعیل کے ساتھ والے بھاگ گئے، اسمٰعیل نے بھی چاہا کہ شہر کی فصیل پر چڑھ کر نکل بھاگے، مگر سپاہیوں نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا، معتضد غصہ سے بیتاب تھا، بیٹے کو گھسیٹتا ہوا قصر میں لے گیا، اور (۴۴۷) تمام ملازموں کو علیحدہ ہو جانے کا حکم دے کر اسمٰعیل کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

بیٹے کے قتل کے بعد معتضد نے اسماعیل کے ساتھیوں، نوکروں، اور اس کے حرم کی عورتوں سے بدلہ نکالا، ان کے ہاتھ پاؤں اور ناکیں کاٹی گئیں، اور اہلِ سازش کو علانیہ اور پوشیدہ دونوں طریقوں سے قتل کرا دیا۔

جب غصہ اُتر گیا تو معتضد اس ظلم و سفاکی پر رنج و افسوس کا شکار ہو گئے، جس فرزند نے باپ سے بغاوت کی ہو، جس نے باپ کو قتل کرنا چاہا ہو، جس نے باپ کا خزانہ لوٹا ہو، اور باپ کی حرموں کو بھی گرفتار کر لیا ہو، اس میں شبہ نہیں کہ ایسا بیٹا نہایت سنگین جرموں کا مرتکب ہوا تھا، ان خیالات سے معتضد اپنے دل کو تسلی دینی چاہتے تھے مگر تسکین نہ ہوتی تھی، ہر وقت یہی یاد آتا تھا کہ اسمٰعیل سے انہیں کیسی محبت تھی، معتضد باوجود ظالم ہونے کے اپنے

بچوں سے بہت محبت رکھتے تھے، یہ بیٹا وہ تھا جس کے مزاج میں احتیاط تھی، جو مشورہ دینے میں بڑا صائب الرائے تھا، اور میدانِ کارزار میں بڑا بہادر اور شجاع تھا، بڑھاپے کا عصا، باپ کے کاموں کو آگے بڑھانے والا، اگر کوئی نظر آتا تھا تو یہی ایک فرزند تھا مگر اب اپنے ہی ہاتھ سے اُسے قتل کر کے اپنی تمام اُمیدوں پر خاک ڈال دی۔

اشبیلیہ کا ایک وزیر لکھتا ہے کہ "اِس قتل کے تین دن بعد میں دیگر وزیروں کے ساتھ معتضد کی خدمت میں حاضر ہُوا، اُس وقت اُس کا چہرہ ایسا ہیبت ناک ہو رہا تھا کہ اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا، ہم سب مارے خوف کے لرزنے لگے، سلام کرنے کے بعد مشکل سے ہمارے منہ سے کوئی لفظ نکلا، زبان میں لکنت پیدا ہوگئی، بادشاہ نے نہایت غضب آلود نگاہ سے ہمیں اوپر سے نیچے تک دیکھا، پھر شیر کی مانند گرج کر کہا "بدبختو! تم کیوں چُپ کھڑے ہو؟ میری مصیبت پر دل میں خوش ہوتے ہوگے، دُور ہو میرے سامنے سے"

شاید یہ پہلا ہی موقع تھا کہ اِس مغلوب الغضب، فولاد سے زیادہ سخت ارادے اور حوصلے کے انسان نے اپنے دل کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے دیکھا، وہ دل جو کسی سے مغلوب ہونا نہ جانتا تھا اِس وقت ایسا مجروح تھا جس کے زخموں کا مندمل ہونا ایک مدت گذرنے کے بعد شاید ممکن بھی ہوتا، مگر زخموں کے داغ کبھی مٹنے والے نہ تھے۔

غرض معتضد نے قرطبہ کی جمہوری ریاست کو مطیع کرنے کا خیال اِس وقت چھوڑ دیا، اور یہ ریاست اِس تعجب ہیں کہ کیونکر سلامت رہ گئی، کچھ دنوں اور باقی رہی، مگر جو عظیم الشان منصوبے معتضد نے سوچ رکھے تھے، وہ کچھ دنوں ملتوی رہ کر رفتہ رفتہ پھر دل میں اُبھرنے لگے اور مالقہ پر حکومت کرنے کی طمع نے اُنہیں بالکل ہی سرسبز کر دیا۔

مالقہ کی عرب رعایا برسوں سے بادیس بادشاہِ غرناطہ کے ظلم سہتے سہتے اِس ظالم کو رات دن کوسا کرتی تھی، اور معتضد بادشاہِ اشبیلیہ کی طرف نگاہیں لگائے بیٹھی رہتی کہ وہی کسی دن اُن کو اِس مصیبت سے نجات دے گا، یہ وہ جانتے تھے کہ معتضد بھی ظالم ہے مگر یہ لوگ دو ظالم و مطلق العنان بادشاہوں میں سے اُس ظالم کو ترجیح دیتے تھے جو اپنی نسل اور قوم کا ہو۔

غرض مالقہ کے عربوں اور معتضد سے درپردہ گفتگو ہونے کے بعد عربوں نے بغاوت کا سامان کیا، بادلیس کی غفلت اور بے پروائی نے اس سازش کو اور ترقی دی، بادلیس اب اکثر مخمور رہتا تھا، سلطنت کے کاروبار کی طرف صرف کبھی کبھی متوجہ ہوتا تھا، بغاوت کا جو دن عربوں نے مقرر کیا تھا، اُسی دن مالقہ اور اُس کے علاقہ کے ۲۵ قلعوں میں غدر پڑ گیا، (۴۴۹)
معتضد کی فوجیں بھی معتمد کی سرکردگی میں جو معتضد کا دوسرا فرزند تھا، اُسی روز مالقہ کی سرحد میں باغیوں کی مدد کو داخل ہو گئیں، بربر اس ناگہانی آفت سے بالکل بے خبر تھے، چنانچہ اس غدر میں بہت سے قتل ہو گئے، اور جو باقی رہے وہ بھاگ کر بمشکل اپنی جان بچا سکے۔

ایک ہفتہ کے اندر مالقہ کی پوری ریاست معتمد کے قبضہ میں آگئی، صرف مالقہ کا قلعہ جس میں اسودیوں کی فوج تھی، ایسا مقام تھا جو فتح نہ ہو سکا، یہ قلعہ بہت مضبوط تھا، اور پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا، اور ایسا مقام تھا جو مدت تک دشمن کا مقابلہ کر سکتا تھا، معتمد نے اگرچہ قلعے کا محاصرہ کر رکھا تھا، مگر اُسے یہ خوف تھا کہ اگر اس کے فتح ہونے میں دیر ہوئی تو بادلیس اس تاخیر سے نفع اُٹھا کر محصورین کی مدد کو آن پہنچے گا۔

یہ رائے کم سے کم اُن لوگوں کی تھی جو اس بغاوت کے سرغنے تھے، اس لئے اُنھوں نے معتمد سے بہ اصرار کہا کہ قلعہ کے محاصرے میں زیادہ سختی اختیار کی جائے، اور بربر جو معتمد کی فوج میں تھے، اعتبار نہ کیا جائے۔ یہ نصیحت بہت اچھی تھی، مگر معتمد نے پروا نہ کی۔

معتمد کے مزاج میں سُستی تھی، ہر شخص کا اعتبار جلد کر لیتا تھا، مالقہ کے لوگوں نے جو اُس کے حُسنِ اخلاق کے گرویدہ ہو گئے تھے، ضیافتوں کا سلسلہ شروع کر دیا، معتمد دعوتوں میں مصروف ہوئے، فوج کے بربر افسروں نے جو کچھ مشورہ دیا اُسے مانتے رہے، حالانکہ یہ بربر بادلیس سے درپردہ سازش اور معتمد سے دشمنی رکھتے تھے، اِن لوگوں نے یقین دلایا کہ قلعہ جلد فتح ہو جائے گا باقی سپاہ اِس خیال میں کہ اب کوئی خطرہ نہیں ہے، دشمن سے بے پروا ہو کر رنگ رلیوں میں مصروف ہو گئی۔

یہ غفلت مہلک ثابت ہوئی، قلعہ مالقہ کے اسودیوں کو ایسے وسائل مل گئے کہ بادلیس کو اس حال کی خبر کر دیں کہ اس وقت اشبیلیہ کی فوج پر اچانک حملہ کرنا آسان ہے،

بادیس کو اس خبر کا پہنچنا تھا کہ غرناطہ کی فوجیں مالقہ کی طرف چل پڑیں، اور پہاڑوں میں سے نزدیک کا راستہ نکال کر مالقہ میں ایسی چپ چاپ پہنچ گئیں کہ معتمد کو اُن کا آنا مطلق معلوم نہ ہوا، اب اشبیلیہ والوں کی حالت یہ تھی کہ غرناطہ کی فوج کو اُن سے لڑنے کی بھی ضرورت نہ ہوئی، اتنی زحمت البتہ گوارا کرنی پڑی کہ نہتّے اور نشے میں چُور اشبیلی سپاہیوں کے گلے کاٹ ڈالیں، معتمد بھاگ کر رندہ چلے آئے، اور مالقہ کا کل علاقہ پھر بادیس کے قبضہ میں چلا گیا۔

معتضد نے جب اس شکست کا حال سُنا تو اپنے فرزند کی اس مجرمانہ غفلت پر آگ بگولہ ہو گیا، یہ غفلت ایسی تھی کہ اس سے ایک اچھا لشکر غارت ہو گیا، اور ایک پورا علاقہ ہاتھ سے نکل گیا، چنانچہ اُس نے حکم دیا کہ معتمد کو رندہ میں تیار رکھا جائے، اور اب بڑے بیٹے اسماعیل کے قتل پر جو رنج و الم تھا، اُسے بھول کر اُس کے بھائی کی فکر میں ہوا کہ اُس پر بھی سزائے قتل کا حکم نافذ کرے۔

معتمد اس کا اندازہ نہ کر سکا کہ باپ کو اُس پر کس قدر غصہ ہے؟ باپ کو خوش کرنے کے لئے معتمد نے اشعار لکھ لکھ کر بھیجنے شروع کئے، جن میں اُس کی سخاوت اور رحم دلی کی تعریف کر کے کوشش کی کہ گذشتہ فتوحات کو یاد دلا کر باپ کے دِل کو تسکین دے، چنانچہ لکھا کہ "کیسی کیسی شاندار فتوحات آپ حاصل کر چکے ہیں، یہ وہ فتوحات ہیں جو زمانہ آئندہ (۶۵۰)
میں یاد کی جائیں گی، سیاحوں نے اُن کی شہرت دُور دراز ملکوں میں پھیلا دی ہے، اور جب لوگ چاندنی رات میں مشاہیر کے کارنامے سُنانے بیٹھتے ہیں، تو وہ صرف آپ کی شجاعت اور مردانگی کے کام بیان کرتے ہیں۔"

معتمد نے سارا قصور اپنے سر سے ٹال کر دغا باز بربروں کے سر تھوپا، اور اس ناکامی پر جو کچھ رنج و افسوس اُسے ہوا تھا، اُس کو بڑی آب و تاب سے بیان کیا، لکھا کہ "میرا دل لرز رہا ہے، میری آواز اور نظر اب کام نہیں دیتی، میرے چہرے کا رنگ اُڑ گیا ہے، مگر میں بیمار نہیں ہوں، میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں، گو میں ابھی جوان ہوں، کوئی چیز اب مجھے خوش نہیں کرتی، جام شراب اور عود اب میرے لئے دلکش چیزیں نہیں رہیں، حسینوں کی ادائیں، خواہ کیسی ہی دلآویز ہوں، مگر اب اُن کا تسلط میرے

دل سے اُٹھ گیا، میں زاہد خشک نہیں ہوں، اللہ تاریک الدنیا بھی نہیں ہوں، جوانی کا خون اب بھی میری رگوں میں دوڑ رہا ہے، مگر اب جو خیال دل کو خوش کرسکتا ہے وہ یہی ہے کہ حضور میرا قصور معاف فرمادیں، اور میں اپنی برچھیاں آپ کے دشمنوں کے سینے سے پار اُتاروں"۔

معتضد کا دل رفتہ رفتہ نرم ہوا، کسی قدر معتمد کے اشعار سے، کیونکہ اچھا شعر معتضد کے دل پر اثر کرتا تھا، اور کسی قدر ایک نیک نفس درویش کی سفارش اور التجاؤں سے۔ غرض معتمد کو اشبیلیہ آنے کی اجازت مل گئی، اور اب باپ، بیٹے سے خوش رہنے لگا، لیکن مالقہ ہمیشہ کے لئے ہاتھ سے نکل گیا۔ کیونکہ بادلیس بادشاہِ غرناطہ اب اس قدر ہوشیار ہو گیا تھا کہ معتضد کو حالتِ بے خبری میں اُس پر حملہ کرنے کا موقع ملنا ممکن نہ رہا۔

یہاں ہم یہ بھی فرض کرسکتے ہیں کہ بادلیس جو سفر میں قبیلوں کے سرداروں کو ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا، وہ اُن بدنصیبوں کو جنہوں نے اُس سے بغاوت کی تھی، قتل و قید کی سزائیں دیتا رہا ہوگا، اور جو لوگ اُس سے منحرف رہتے تھے اس طریقے سے اُن کا جوش و خروش بھی سب مٹ گیا ہوگا۔

یہودی وزیر سموائل کے مرنے پر اس کا لڑکا یوسف اُس کی جگہ وزیر مقرر ہوا، یہ بھی بہت لائق اور قابل شخص تھا، مگر باپ کے سے اوصاف نہ رکھتا تھا کہ منصبِ وزارت کا کفارہ اخلاق اور مروت سے ادا کرتا رہے۔

یوسف شاہانہ تکلفات پسند کرتا تھا، اور جب اپنے بادشاہ کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہوکر نکلتا تھا، تو بادشاہ اور وزیر دونوں کا لباس خوبی اور قیمت میں ایک سا ہوتا تھا، بلکہ یوسف کے ٹھاٹھ بادلیس سے بھی زیادہ شاہانہ ہوتے تھے۔

یوسف، بادلیس کی طبیعت پر بالکل قابو پائے ہوئے تھا، جو اب اپنے ہوش و حواس میں کسی وقت بھی نہ رہتا تھا، یوسف اس خیال سے کہ کہیں اُس کے اختیارات سلب نہ کرلئے جائیں، بادشاہ کے گرد و پیش بہت سے جاسوس لگائے رکھتا تھا جن کے ذریعے سے بادشاہ کی ذرا ذرا سی بات اُس تک پہنچتی رہتی تھی۔ (۷۵۱)

مذہب کے اعتبار سے یوسف صرف برائے نام یہودی تھا، مشہور یہ تھا کہ اُس

کا مذہب، نہ اپنے بزرگوں کا سا ہے، اور نہ کسی کا سا، تمام مذاہب سے اُسے نفرت تھی، بہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اُس نے دینِ موسوی کی کبھی علانیہ مخالفت کی ہو، لیکن اسلام کی نسبت اُس نے علی الاعلان گستاخیاں کی تھیں۔

اپنے نخوت و غرور، اور پھر اس پر لامذہبی اور عدل و انصاف کے خلاف روش رکھنے سے یوسف نے عرب، بربر، اور یہودیوں کو ناراض کر رکھا تھا، متعدد جرائم تھے جو لوگ اُس سے منسوب کرتے تھے، اُس کے بکثرت دشمنوں میں ایک عرب فقیہہ ابو اسحاق[1] نامی البیرہ کا رہنے والا اُس کا سب سے زیادہ شدید مخالف تھا، طرح طرح کی ترکیبوں سے اس فقیہہ نے بادیس کے دربار میں اپنے حسب نسب کے شایاں درجہ حاصل کیا تھا، لیکن یوسف نے اُسے بہت ستایا، اور آخر کار اُسے جلا وطن کرا دیا، ابو اسحاق اب ایک فقیہہ کے رنگ میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ ظاہر ہوئے، یوسف سے دشمنی تو پہلے ہی سے تھی، اب اور بھی زیادہ دشمن ہو گئے، اور ایک نظم یہودیوں کی مخالفت میں لکھی، جس کا مضمون یہ تھا:۔

اے قاصد جا اور بنی صنہاجہ سے جو ہمارے وقت کے بدر و اسد ہیں، یہ الفاظ کہہ دے، یہ الفاظ اُس شخص کی زبان سے نکلے ہیں جو صنہاجہ سے اُلفت رکھتا ہے، جسے اُن پر رحم آتا ہے، اور جو سمجھتا ہے کہ اگر اُس نے صنہاجہ کو سچی ہدایت نہ کی تو وہ اپنی دینی خدمت میں قاصر اور ناکام رہے گا۔

تمہارے آقا نے وہ کام کیا ہے جس پر تمام بدخواہ خوش ہیں، گو وہ اپنا وزیر مومنین کی جماعت میں سے منتخب کر سکتا تھا، لیکن اُس نے ایک کافر کو پسند کیا، اس وزیر کی وجہ سے قابلِ نفرت یہودی ہمارے آقا اور حاکم بن گئے ہیں، اور اُن کے غرور اور تکبر کی کوئی حد نہیں رہی، جن چیزوں کی وہ توقع تک نہ کر سکتے تھے، وہ اُنہوں نے دل بھر کر حاصل کیں، اُنہوں نے اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب، اور بڑے بڑے اعزاز پائے، یہاں تک کہ اِن بے دینوں کا ذلیل بندر بھی ایسا

---

[1] یہ ابو اسحاق تجیبی تھے ۴۵۹ھ ۱۰۶۶ء میں انتقال ہوا، مقابلہ کرو کتاب تحقیقات "ڈوزی" جلد اص ۲۸۲-۲۹۴

ہوگیا جس کے خادموں میں بہت سے سچے اور نیک مسلمان شمار کئے جاسکتے ہیں، یہ باتیں خود ان کافروں کے ارادے اور کوشش سے پیدا نہیں ہوئی ہیں بلکہ جس شخص نے اُنہیں اِس اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے، وہ ہمارے ہی مذہب کا آدمی ہے، افسوس! کیوں اُس نے پُرانے صاحبِ ایمان بادشاہوں کی مثال کا اتباع نہیں کیا؟ کیوں اُس نے یہودیوں کو ذلیل اور بدترین مخلوق سمجھ کر اُن کے ساتھ برتاؤ نہیں کیا؟ پھر وہ کثرت سے آوارہ گرد ہوکر ہم لوگوں میں نہ پھرتے، اور ہمیشہ ہماری نفرت اور بیزاری کا نشانہ نہ بنے رہتے، پھر یہ یہودی ہمارے شریفوں کے ساتھ غرور کا برتاؤ، اور ہمارے بزرگانِ دین کے ساتھ گستاخیاں نہ کرتے، کیا پھر اِن بدترین خلائق کو اتنی جرأت نہ ہوتی کہ ہمارے پہلو میں بیٹھتے اور ہمارے شریفوں کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہوکر نکلتے؟

اے بادلیس! تو عاقل و فرزانہ ہے، تیرے قیاسات صحیح ہوتے ہیں، کیوں ایسی بُرائی کو تُو نے نہ دیکھ لیا، جو اُن شیاطین کا شیوہ ہے جنہوں نے تیری حکومت میں اپنے سینگھ اونچے کئے ہیں؟ تُو اِن بدنسل لوگوں کے ساتھ کیونکر مہربانی کرسکتا ہے جنہوں نے تیرے نام کو ہر شخص کی نظر میں قابلِ نفرت بنا دیا ہے، کیونکر تجھے اپنی قوت کو برقرار رکھنے کی اُمید ایسی حالت میں پیدا ہوسکتی ہے، جب کہ یہ بدبخت اِن چیزوں کو ڈھاتے اور گراتے رہتے ہیں جنہیں تُو نے بنایا ہے؟ تو ایک شریر آدمی کو کیونکر اپنا معتمد اور بے تکلف دوست بنا سکتا ہے؟ کیا تو بھول گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اِن بے دینوں سے ملنے کی ممانعت کی ہے! ایسے آدمیوں کو اپنا وزیر نہ بنا، بلکہ اُن کو لعنت و ملامت کے حوالے کردے کیونکہ (67
کُل رُوئے زمین بلیشبہ اِس سے کہ متزلزل ہوکر فنا ہوجائے، اُن کی شکایتوں میں مصروف ہے، ذرا دوسرے ملکوں کو دیکھ! کہ وہاں یہودی کتوں کی طرح سمجھے جاتے ہیں، اور لوگ اُن کو اپنے سے دُور رکھتے ہیں، پھر تو کیوں دوسری روش اختیار کرتا ہے؟ اے بادشاہ! تیری رعایا تجھ سے محبت رکھتی ہے، تو بادشاہوں

کی نسل سے ہے، تو اپنے ہم عصر بادشاہوں سے ایسی ہی فضیلت رکھتا ہے جیسے تیرے بزرگ اپنے زمانہ کے بادشاہوں سے رکھتے تھے۔

میں غرناطہ میں آیا، اور دیکھا کہ وہاں یہودی حکومت کرتے ہیں، انھوں نے غرناطہ کے شہر اور علاقے کو آپس میں تقسیم کرلیا ہے، ہر جگہ انہی ملعونوں میں سے کوئی ملعون حکومت کرتا ہے، محصول بھی یہی جمع کرتے ہیں، اور بہت خوش حال ہیں پرتکلف لباس پہنتے ہیں، لیکن مسلمانوں کے لباس پرانے اور پھٹے ہوئے ہیں، ریاست کے تمام رازوں سے یہودی واقف ہیں، لیکن کیا یہ دانائی اور دانشمندی ہے کہ دشمنوں پر اعتماد کیا جائے؟ مومن تو تنگدستی کا ٹکڑا کھاتے ہیں، اور یہ بے دین محلوں میں بیٹھ کر لذیذ کھانے اڑاتے ہیں، مسلمانو! بادشاہ کے دل میں جہاں تمہاری جگہ تھی، تمہیں نکال کر وہاں یہ بے دین سما گئے ہیں، مسلمانو! کیا تم ان کا مقابلہ نہ کروگے! کیا ان کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہوگے؟ یہ ہمارے بازاروں میں بیل اور بھیڑیں ذبح کرتے ہیں، اور تم بلا تکلف ان ذبیحوں کا گوشت کھاتے ہو جو ان یہودیوں کی نظر میں نجس ہے[1]، ان بندروں میں جو سب کا سردار ہے، اس نے اپنے محل کو سنگِ مرمر کے در و دیوار سے آراستہ کیا ہے، اور فوارے تیار کرائے ہیں جن میں صاف اور شفاف پانی اڑتا ہے، ہم اس کے دروازے پر اس کے انتظار میں کھڑے رہتے ہیں، اور وہ ہم پر اور ہمارے مذہب پر ہنستا ہے، اللہ اکبر! یہ کیسی ذلیل حالت ہے، اے بادشاہ اگر میں یہ کہوں کہ یہ وزیر بھی اتنا ہی دولتمند ہے جتنا کہ تو ہے، تو اس میں کچھ جھوٹ نہ ہوگا، اے بادشاہ! جلد اسے ہلاک کرکے سوختہ قربانی بنادے، اسے ذبح کر ڈال کیونکہ وہ بڑا موٹا مینڈھا ہے، اس کے عزیزوں اور دوستوں کو بھی زندہ نہ چھوڑ کیونکہ انہوں نے بہت دولت جمع کرلی ہے، ان سے ان کی دولت چھین لے

---

[1] دیکھو ڈوزی کی کتاب تحقیقات ج ۱ (مطبوعہ ۱۸۸۱ء) ص ۲۸۸، ۸۱

کیونکہ دولت چھیننے کا حق تجھ کو بہ نسبت اُن کے زیادہ حاصل ہے، یہ نہ سمجھ کر اُن کو قتل کرنے میں تجھ پر کسی قسم کی دغا اور فریب کا الزام عائد ہوگا، نہیں، دغا اور فریب تو یہ ہے کہ اُن کو بڑے بڑے منصوبوں پر قائم رکھا جائے، یہ وہ ہیں، جنھوں نے ہم سے عہد شکنی کی ہے، پھر کون ایسا ہے کہ ان عہد شکنوں کو سزا دینے پر تجھے الزام دے گا؟ ہم سایہ میں رہ کر کیونکر سرسبز ہو سکتے ہیں، یہودی اپنے غرور کی چمکتی ہوئی شعاعوں سے ہماری آنکھیں اندھی کئے دیتے ہیں، جب ہم اپنا اُن سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہم ذلیل و خوار نظر آتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ ہم بُرے ہیں اور وہ اچھے ہیں، اُن کو ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرنے دے، کیونکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں اُس کا جواب وہ تو ہمارے سامنے ہے، یاد رکھ کہ ایک دن خدا کے سامنے تجھے اس برتاوے کا جواب دینا ہوگا جو دنیا میں تو نے ہمارے ساتھ برتا ہے، ہم خدا کے پسندیدہ ہیں، اور ہمارے لئے عاقبت میں ہمیشہ کی راحت اُتری ہے"

اس نظم نے بادیس پر کچھ اثر نہ کیا، اور وہ برابر اپنے یہودی وزیر یوسف پر پورا بھروسا اور اعتماد کرتا رہا، لیکن بربر پر اس نظم کا بیحد اثر ہوا، اور انھوں نے قسم کھائی کہ اب اس یہودی کو بغیر تباہ کئے نہ چھوڑیں گے، چنانچہ ایک سازش اس کے خلاف کی گئی، اور اس سازش کے سرگروہ نے یہ خبر مشہور کی کہ معتصم بادشاہ المریہ سے، جس سے اس زمانہ میں لڑائی ہو رہی تھی، روپیہ کھا کر یہ وزیر اُس سے مل گیا ہے، لیکن اور لوگ جو ایسی باتوں کا جلد یقین نہ کرتے تھے، اور جن کی نظر غصہ کی وجہ سے خیرہ نہ ہوئی تھی، پوچھتے تھے کہ یوسف کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ ایک ایسے بادشاہ سے دغا کرے جو بالکل اُس کے بس میں ہو، اس کا جواب یہ دیا جاتا تھا کہ جب یہ یہودی بادیس کو مار کر معتصم کو غرناطہ کی سلطنت حوالے کرے گا، تو پھر معتصم کو مار کر خود غرناطہ کے تختِ حکومت پر بیٹھ جائے گا۔

اس بات کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ یوسف پر یہ سب بہتان بندیاں تھیں، واقعہ یہ تھا کہ بربر کوئی حیلہ ڈھونڈتے تھے کہ یوسف کو تباہ کریں، اور یہودیوں کو خوب لوٹیں،

جن کی دولت اُنہوں نے مدت سے تاک رکھی تھی، اور اب یہ سمجھ کر کہ ایک حیلہ آخر کار ہاتھ (۵۶۴۳
آگیا ہے، اُنہوں نے ایک ہنگامہ برپا کیا، اور بادشاہی قصر پر جہاں یوسف نے پناہ لی تھی حملہ کر دیا۔

بلوائیوں کے اس غول سے جان بچانے کے لئے یوسف قصر کی ایک کوٹھڑی میں جہاں کوئلے بھرے ہوئے تھے، چھپ گیا، اور صورت بدلنے کے لئے منہ کو سیاہ کر لیا، لیکن لوگوں نے اُسے پہچان لیا، فوراً گرفتار کر کے قتل کر ڈالا، اور لاش صلیب پر چڑھا دی۔

غرناطہ کے لوگ یوسف کے قتل کے بعد یہودیوں کے گھر لوٹنے، اور انہیں قتل کرنے میں مصروف ہوئے، چنانچہ چار ہزار یہودی اس تعصب کی نذر ہو گئے۔

اسناد :-

عباد (ڈوزی) ج ۱ ص ۱۵ تا ۵۴، ۴۹ تا ۲۵۰، ۲۵۳ تا ۲۵۹،
۳۰۱ تا ۳۰۲
ج ۲ ص ۶، ۶۰، ۶۳ تا ۶۵، ۲۰۷، ۲۱۰

عبدالواحد ص ۶۶، ۸۰

ابن خلکان (کلائیڈ) ج ۱ ص ۱۷۷

ابن خلدون ص ۲۳

ابن بسام ج ۱ ص ۲۰۰ تا ۲۰۱

ڈوزی۔ ابن عذاری کی کتاب پر دیباچہ ص ۸۰ تا ۱۰۲

کتاب رابع

ملوک الطوائف

آٹھویں فصل

معتضد کی وفات

اسلامی اسپین کے جنوبی حصوں میں جو ابتری تھی، وہی باقی حصوں میں پیدا ہو گئی، قلمرو خلافت کے ٹکڑے ہو گئے تھے، اور ان ٹکڑوں پر آپس میں سخت لڑائیاں ہو رہی تھیں کہ سمتِ شمال سے عیسائیوں کا ایک سیلاب آیا، جس سے اندیشہ ہوا کہ کل اسلامی ریاستوں پر پانی پھرنے والا ہے۔

پچاس برس تک شمالی اسپین کے عیسائی بادشاہوں کو آپس کے مناقشوں سے اتنی مہلت نہ ملی کہ مسلمانوں پر حملہ کرتے، لیکن ۴۴۷ھ ۱۰۵۵ء میں حالت بدلی، فردلند اول، بادشاہِ قشتالیہ ولیون آخر کار اس قابل ہو گیا کہ فوجیں جمع کر کے مسلمانوں کے مقابلے پر لائے، یہ ظاہر تھا کہ مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ عیسائیوں کا جواب کر سکیں، تقدیر نے اب عیسائیوں کا ساتھ دیا اور ان میں وہ چیزیں موجود ہو گئیں جو مسلمانوں میں ختم ہو چکی تھیں، یعنی لڑنے کا شوق اور مذہبی جوش، یہی چیزیں تھیں جن کے باعث فردلند بادشاہ قشتالیہ ولیون کو بڑی بڑی فتوحات جلد جلد ہونے لگیں، مظفر صاحبِ بطلیوس سے فردلند نے یازدہ اور لمیقیہ کے شہر چھین لئے (۴۴۹ھ م ۱۰۵۷ء)

بادشاہ سرقسطہ سے دریائے دویرہ کے جنوب میں جس قدر قلعے تھے سب لے لیے، ابوالحسن یحییٰ المامون ذی النونی صاحب طلیطلہ کے علاقے پر چھاپہ مارا، اور قلعۃ النہر تک فتح کرتا ہوا چلا گیا، قلعۃ النہر کے باشندوں نے المامون صاحب طلیطلہ کو لکھا کہ اگر مدد جلد نہ بھیجی تو وہ مجبور ہو کر فردلند کی اطاعت قبول کرلیں گے، مامون میں اتنا دم نہ تھا کہ دشمن کا مقابلہ کرتا، اس لیے اُس نے احتیاط اور مصلحت سے کام لیا، فردلند سے ملاقات کی، اور اس کو زروجواہر دے کر سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ اسی طرح بطلیوس اور سرقسطہ کے بادشاہوں نے بھی فردلند کا باجگذار ہونا قبول کیا۔

اب معتضد کی باری آئی ۴۵۵ھ [۱۰۶۳ء] میں فردلند نے اشبیلیہ کے علاقے کے کچھ گاؤں جلا دیئے اسلامی ریاستوں کی کمزوری کا اب یہ حال تھا کہ معتضد نے بھی جو جنوبی اسپین میں سب سے زبردست بادشاہ گنا جاتا تھا، اسی حال میں اپنی خیر سمجھی کہ مامون صاحب طلیطلہ کی طرح فردلند سے صلح کرے، چنانچہ معتضد عیسائیوں کے لشکر میں آئے، اور فردلند کو بہت سے تحائف دے کر درخواست کی کہ اپنی ریاست کو واپس چلا جائے، فردلند کو غالباً معلوم نہ تھا کہ جس شخص سے اس وقت واسطہ پڑا ہے، وہ کیسی ہوشیار طبیعت اور غضب کی ترکیبوں کا آدمی ہے سفید بال اور پیشانی کی شکنوں سے معتضد کی شکل بہت واجب التعظیم معلوم ہوتی تھی، گو عمر ابھی سینتالیس [۴۷] سال سے متجاوز نہ تھی، لیکن سلطنت کے افکار اور حکومت کی طمع میں محنت شاقہ اُٹھاتے اٹھاتے، جس کے ساتھ تعجب نہیں اولاد کا غم بھی شامل ہو، قبل ازوقت بوڑھے معلوم ہونے لگے تھے، پس کچھ تعجب نہیں کہ عیسائی بادشاہِ قشتالیہ دلیون پر ان کی درخواست کا اثر ہوا ہو، لیکن فردلند نے بہتر سمجھا کہ پہلے اپنے امراء اور اساقفہ سے اس امر میں مشورہ کرلے، چنانچہ اُس نے ایک مجلس منعقد کی، تاکہ وہ اس امر کا تصفیہ کرے کہ معتضد سے کن شرائط پر صلح کرنی مناسب ہوگی؟

طول طویل مباحثوں کے بعد بالآخر اس مجلس نے یہ فیصلہ کیا کہ "اشبیلیہ کا بادشاہ سالانہ خراج ادا کرنا منظور کرے، اور بادشاہِ قشتالیہ جو سفیر اُس کے دربار میں بھیجے، اُن کی معرفت مسیحی شہیدہ یُستہ کی لاش، جو معتضد بادشاہِ اشبیلیہ کی قلمرو میں کہیں دفن ہے

اُن کے حوالے کی جائے۔" شہیدہ لُبِینہ ایک کنواری نصرانیہ تھی، جو کبھی اگلے وقتوں میں رُومانی بُت پرستوں کے ہاتھوں قتل ہو کر شہید مانی گئی تھی[1]۔

معتضد نے یہ شرطیں منظور کر لیں اور فردلند اپنا لشکر واپس لے گیا، جس وقت اپنے پایۂ تخت لیون میں آیا تو لیون کے اُسقف الوتیوس[2] اور اشتورقہ کے اُسقف اردونو کو اپنے سفیروں کے طور پر اشبیلیہ روانہ کیا۔

اِن اُسقفوں کے ذمے دو کام تھے، ایک[1] یہ کہ شہیدہ لُبینہ کی لاش جہاں کہیں دفن ہو، اُس کو نکال کر لیون لے آئیں، دوسرا[2] کام یہ تھا کہ خراج جو معتضد نے دینا منظور کیا تھا اُس کے متعلق تفصیلی امور طے کریں۔

شہیدہ لُبینہ کی لاش تلاش کرنے میں بدقسمتی سے اِن اُسقفوں کو کامیابی نہ ہوئی، اِس حالتِ ناکامی میں اسقف الوتیوس نے اپنے ہمراہیوں سے کہا "میرے بھائیو! ظاہر ہے کہ جب تک خدا کی رحمت شامل حال نہ ہوگی، ہم اِس سخت و دشوار سفر کی زحمتیں اٹھانے کے بعد نا اُمید ہو کر اپنے گھروں کو واپس جائیں گے، پس ہمیں خدا سے التجائیں کرنی اور تین دن تک روزے اور نماز میں مصروف رہ کر دعا مانگنی چاہیئے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے اُس پوشیدہ خزانہ کو ہم پر ظاہر فرما دے، جس کی تلاش کو ہم نکلے ہیں۔"

---

[1] اشبیلیہ کے پُرانے اولیا میں دو عورتیں لُبینہ اور رفینہ تھیں، جو قتل ہونے پر شہید اور اشبیلیہ کی محافظ اور نگران تصور کی جاتی تھیں، یہ عورتیں جس زمانے میں زندہ تھیں تو اُنہوں نے بُت پرستوں کے ہاتھ مٹی کے برتن بُتوں پر چڑھانے کے لیے بیچنے سے انکار کر دیا تھا، اور بُت پرستوں کی دیبی وینس کا بُت بھی توڑ ڈالا تھا، اِس جرم میں وہ دونوں قتل کی گئی تھیں، قتل ہونے کے بعد اُن کو کلیسہ میں شہادت کا مرتبہ دیا گیا تھا، ایک روایت ہے کہ جیرالدہ کا مینار جس وقت زلزلے کے صدمہ سے ایک طرف کو جھک گیا تھا، تو انہی ولی عورتوں کی کرامات سے وہ سیدھا ہو گیا۔

[2] ابنِ خلدون نے الوتیوس کو بادشاہِ قشتالیہ لکھ دیا ہے، دیکھو کتاب "تحقیقات" (۱۸۸۱ء) ج ۱ ص ۱۰۷، تعلیقہ

غرض ان پادریوں نے روزے رکھ کر تین شبانہ روز خدا سے دعا مانگنے میں صرف کیے، جس کی وجہ سے اسقف الوتیوس کی صحت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو گئی، اشبیلیہ میں وارد ہونے کے وقت بھی اسقف الوتیوس علیل تھے،

تین دن دعائیں مانگنے کے بعد چوتھے دن صبح کے وقت الوتیوس نے اپنے ساتھیوں کو طلب کر کے اُن سے کہا "پیارے بھائیو! آؤ، ہم جان و دل سے خدا کے منت گذار ہوں جس نے اپنی رحمت سے یہ خبر دی ہے کہ ہمارا یہ سفر رائیگاں نہ جائے گا، یہ سچ ہے کہ رضا الٰہی نہیں ہے کہ ہم مبارک شہیدہ یُستہ کی ہڈیاں یہاں سے لے جائیں، لیکن مشیت میں اُترا ہے کہ تم ایک ایسا تحفہ یہاں سے اپنے ملک کو لے جاؤ جو مرتبے اور فضیلت میں شہیدہ یُستہ کی ہڈیوں سے کم نہیں ہے، پیارے بھائیو! وہ تحفہ کیا ہے؟ وہ مبارک علیسیدور کا جسد ہے، وہ علیسیدور جس کے سر پر کسی زمانہ میں اسی اشبیلیہ کے شہر میں اُسقف کا تاج رکھا گیا تھا، اور جس نے اپنے کلام اور اپنے اعمال سے تمام اسپین کو بزرگی بخشی تھی میرے بھائیو! میں نے چاہا تھا کہ کل تمام شب بیدار رہ کر خدا سے دعا مانگتا رہوں، لیکن چونکہ
(۵۶ تھکا ہوا تھا، نیند کا غلبہ ہوا اور سو گیا، اس حالتِ خواب میں ایک نورانی صورت اُسقف کا لباس پہنے میرے سامنے آئی، اور کہنے لگی "مجھے معلوم ہے کہ تو اور تیرے ساتھی کس غرض سے یہاں آئے ہیں؟ لیکن چونکہ خُدا کی مرضی نہیں ہے کہ یہ شہر شہیدہ یُستہ کی ہڈیوں سے محروم ہو کر محزون ہو، اور چونکہ خداوند اپنی رحمتِ بے پایاں سے گوارا نہیں فرماتا کہ تو اور تیرے ساتھی یہاں سے خالی ہاتھ جائیں، اس لیے اُس نے میرا جسد تجھے عنایت فرمایا ہے"
جب اس مقدس و متبرک صورت نے یہ بات کہی تو میں نے پوچھا کہ "تم کون ہو جو یہ باتیں کرتے ہو؟" تب اُس نے جواب دیا کہ "میں اسپین کا ڈاکٹر ہوں[1]، اور پہلے جس زمانہ میں

[1] یہ شخص ۶۳۶ء میں فوت ہوا تھا، اس کا نام کلیسہ کے نوشتوں میں اُن بزرگ پادریوں میں بیان ہوا ہے جو کسی عابد اور زاہد مسیحی کے مرنے پر اس بات کا فیصلہ کرتے تھے کہ اس کا نام فہرست اولیاء مسیحی میں درج کیا جائے یا نہیں؟ یہ اختیارات صرف پاپائے رومہ کو حاصل ہیں، لاطینی میں علیسیدور کا نام اس طرح لکھا ہے "بیاتی سیموس ڈاکٹر ہسپانیارم" مرنے پر یہ بزرگ اشبیلیہ کے بڑے گرجا میں دفن کیا گیا تھا۔

زندہ تھا تو اس شہر کے قسیسوں کا سردار تھا، میں علیسیدور ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ صورت غائب ہوگئی، میں فوراً بیدار ہوا، اور بیدار ہوتے ہی دعا کی کہ اگر یہ خواب خدا کی طرف سے دکھایا گیا ہے تو وہ اپنے کرم سے تین بار پھر وہی خواب مجھے دکھائے گا، چنانچہ دو مرتبہ وہی خواب نظر آیا، اور دونوں مرتبہ پھر اُسی نورانی صورت نے وہی الفاظ جو پہلے کہے تھے کہے، تیسری مرتبہ کے خواب میں اُس نے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں اُس کا جسدِ خاکی دفن تھا، تین مرتبہ اُس نے اپنا عصا زمین پر مارا اور کہا "یہاں! یہاں! یہاں تجھے میرا جسد ملے گا، اور مجھے یہ بات بتانے کے لیے کہ یہ کوئی غلط اور وہمی صورت نہیں ہے، جو تجھ سے اس وقت باتیں کر رہی ہے، تجھ پر ایک نشانی ظاہر کی جائے گی، جس وقت میری ہڈیاں زمین سے نکالی جائیں گی تو تو ایک مرضِ لاعلاج میں مبتلا ہوگا، حتیٰ کہ تو اپنے جسمِ فانی کو چھوڑ دے گا اور ہمارے پاس آجائے گا، اور پھر تیرے سر پر تاج رکھا جائے گا، اور وہ تاج عادلوں کا ہوگا" اتنی تقریر کرکے وہ صورت پھر غائب ہوگئی۔"

اب الوتیوس اور اُس کے ہمراہی قصرِ معتضد میں آئے، اور وہاں اُسقف الوتیوس نے معتضد کے سامنے اپنا خواب بیان کیا، اور بجائے شہیدہ جُستہ کی لاش کے شہید علیسیدور کا جسد اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت چاہی،

اُسقف کے خواب نے معتضد کے دل پر جو کچھ نقش پیدا کیا ہوگا وہ عجیب ہوگا، متشکک اور تمام ادیان کو یکساں طریقہ پر بیزاری سے دیکھنے والا معتضد صرف دو چیزوں کا قائل تھا ایک نجوم، اور دوسرے شراب[1]، باوجود اس کے معتضد نے نہایت متانت سے اُسقف کا بیان سنا، اور جب اُس کا بیان ختم ہوا تو بہت رنج و ملال کے لہجے میں کہا کہ "اگر شہید علیسیدور کی ہڈیاں آپ کی نذر ہوگئیں تو پھر میرے لیے یہاں کیا رہ جائے گا؟ مگر نہیں خدا کا حکم بجالانا ضروری ہے، کونسی چیز ہو سکتی ہے جسے آپ جیسا محترم اور پاکیزہ نفس

---

[1] پروفیسر ڈوزی لکھتا ہے کہ معتضد نے صبح کی نماز کے وقت پڑھنے کے لیے ایک نظم لکھی تھی، جس میں یک شعر اس مضمون کا تھا کہ "شراب علی الصباح پیو، یہ اصل دین ہے، جو نہ مانے وہ کافر ہے۔"

بزرگ طلب کرے اور پیش نہ کروں، بسم اللہ کیجیے، اور شہید علیسیدور کا جسدِ مقدس جہاں کہیں ہو تلاش کر کے اپنے ساتھ لے جائیے، میرے رنج و الم کا خیال نہ کیجیے۔[1]

معتضد بڑا عاقل و ہوشیار عرب تھا، علیسائیوں کی خوش اعتقادی پر دل ہی دل میں ہنستا رہا، اور یہ بھی سمجھ گیا کہ اُن کی اس کمزوری سے خود کیونکر نفع اُٹھا سکتا ہے، چونکہ اس وقت خراج ادا کرنے کا مسئلہ درپیش تھا، اس لیے خیال ہوا کہ ان علیسائیوں کے تبرکات کی بھاری قیمت بتانی ممکن ہے، اگر علیسائیوں نے اپنے تبرکات زبردستی لینے چاہے تو بہرصورت اپنی حفاظت کے خیال سے اُن کے تبرکات اُن کے حوالے کرنے پڑیں گے، لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو وہ بہت بکارآمد ثابت ہوں گے، اب معتضد کا حال اُس قرضدار کا سا ہوا جو قرضدار ادا کرتے وقت روپیہ کے ساتھ کوئی پرانی نادر شے بھی پیش کر کے قرض خواہ سے کہتا ہے کہ اسے بھی قرضہ میں محسوب کیجیے، کیونکہ یہ بڑی عجیب و غریب اور بے بہا چیز ہے، غرض اب یہی انداز اختیار کیا گیا۔

اُسقف الوتیوس بیمار تو تھا ہی، اشبیلیہ ہی میں ختم ہو گیا، اور جب اُس کا ساتھی اشتورقہ کا اُسقف شہید علیسیدور کی ہڈیاں تابوت میں رکھی ہوئی اشبیلیہ سے جانے لگا، تو معتضد اُس کے جلوس میں شریک ہوئے، اور تابوت پر ایک بہت قیمتی چادر جس پر زری کا نہایت خوبصورت کام تھا، ڈال کر بہت حزن سے کہا "اے بزرگ علیسیدور اکیا اب آپ ہم سے جدا ہوتے ہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ وہ کیسی محبت تھی، جس نے ہم کو اب تک آپ سے ملائے رکھا تھا؟"

فردلند کی یورش کے ایک سال بعد یعنی ۴۵۶ھ / ۱۰۶۴ء میں مسلمانوں پر ایک اور آفت ٹوٹی، قلمریہ کے شہر والوں نے چھ مہینے کے محاصرہ کے بعد فردلند کی اطاعت قبول کر لی، شرائطِ صلح کے بموجب اہلِ شہر میں سے پانچ ہزار سے زیادہ آدمی فردلند کے حوالے کیے گئے، باقی لوگ اپنے گھروں سے نکال باہر کیے گئے، ان لوگوں کے پاس مشکل سے اتنا روپیہ تھا کہ کسی طرف سفر اختیار کر سکیں۔

---

[1] اس سفارت کے حالات مسیحی راہب سیلوس نے اُسقف الوتیوس کے ہمراہیوں کی زبان سے سُن کر لکھے ہیں۔

صرف یہی نہیں ہوا، بلکہ جو مسلمان دریائے دویرہ اور دریائے مندلیق کے درمیانی قطعات میں آباد تھے وہ بھی ملک سے خارج کیے گئے۔

مغربی اسپین میں یہ تہلکہ ڈال کر اب فردلند نے مشرقی اسپین میں بلنسیہ کے علاقہ پر یورش کی، بلنسیہ میں اس وقت عبدالملک المظفر حکومت کرتا تھا، یہ اپنے باپ عبدالعزیز المنصور کے بعد ۴۵۲ھ (۱۰۶۱ء) میں بلنسیہ کا بادشاہ ہوا تھا، کمزور اور آرام طلب تھا، فردلند نے بلنسیہ کے شہر کا محاصرہ کر لیا، لیکن قشتالیہ کے عیسائیوں نے یہ دیکھ کر کہ بلنسیہ کا شہر محاصرین سے فتح نہ ہو سکے گا، ایک چال اس نیت سے چلی کہ شہر کے لوگ بکثرت قتل ہو جائیں، فردلند کی یہ قشتالی فوج محاصرہ اُٹھا کر ایک طرف کو بھاگی، بلنسیہ والے یہ دیکھ کر ایسے خوش ہوئے کہ عید کا دن تھا، وہ اس خیال سے بھاگتوں کو خوب قتل کریں گے عید کے کپڑے پہنے ہوئے قشتالیوں کے پیچھے دوڑ پڑے، لیکن بطرنہ کے مقام پر جو بلنسیہ سے مرسیہ کی سڑک پر بائیں ہاتھ کو تھا، قشتالی بھاگتے بھاگتے دفعتاً بلنسیہ والوں پر پلٹ پڑے، نتیجہ یہ ہوا کہ بلنسیہ کے لوگوں کو اپنی اس حماقت سے سخت نقصان پہنچا، صاحب بلنسیہ نے اس تہلکہ سے بھاگ کر اپنی جان بچائی، مگر یہ سب کچھ ہونے پر بھی بلنسیہ پر عبدالملک کی حکومت بدستور قائم رہی۔

دوسری مصیبت مسلمانوں پر یہ آئی کہ شمال مشرقی اسپین کا ایک بڑا مضبوط مقام بربشتر[۵۱] نامی نارمن لوگوں کے قبضہ میں چلا گیا،[۵۲] نارمن قوم نے جس کے ظلم و ستم مشہور تھے، بربشتر کے رہنے والوں پر ظلموں کی انتہا کر دی، قلعہ بربشتر میں جو فوج مقیم تھی، اس نے اس شرط پر اطاعت قبول کی کہ اس کی جان سلامت رکھی جائے، لیکن جب یہ فوج قلعے سے

---

۵۱ یہ شہر لاردہ اور سرقسطہ کے درمیان واقع تھا۔

۵۲ نارمن فوجوں کا سردار اس وقت ایک عیسائی گیلامی مونت ریل کا رہنے والا تھا، یہ پاپائے رومہ الکساندر ثانی (۱۰۶۱ء تا ۱۰۷۳ء) کا ملازم تھا، ابن حیان نے اسے صرف "قائد خیل رومیہ" لکھا ہے، اس بحث کو پڑھنے کے لیے دیکھو کتاب تحقیقات (۱۸۸۱ء) ج ۲ ص ۳۵۰ تا ۳۵۳۔

باہر نکلی تو نارمن لوگوں نے اُس کے تقریباً کُل آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔

شہر کے ساتھ بھی یہی سفاکی کی گئی، اہلِ شہر کو پہلے امان دے دی، لیکن جب وہ شہر چھوڑنے کی تیاری کرنے لگے تو نارمن فوجوں کے عیسائی سپہ سالار نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ "شہر سے جو لوگ نکل رہے ہیں اُن کو مار کر اُن کی تعداد کم کر دی جائے"۔ اب ان مظلوم شہر والوں کا قتلِ عام اس حد کو پہنچا کہ عیسائیوں نے چھ ہزار مسلمانوں کو تہِ تیغ کر دیا، اس کے بعد عیسائی سپہ سالار نے اہلِ بربشتر کو حکم دیا کہ "وہ اپنے بیوی بچوں سمیت اپنے اپنے گھروں میں چلے آئیں"۔ ان مظلوموں نے یہی کیا، مگر نارمن عیسائیوں نے ان لوگوں کو بطورِ مالِ غنیمت آپس میں تقسیم کر لیا، ایک عرب عہد نویس مورخ لکھتا ہے "ہر ایک عیسائی سوار، جس کو ایک گھر حصے میں ملا تھا، اُسے گھر کے علاوہ جو کچھ اُس گھر میں تھا وہ بھی دے دیا گیا، یعنی اُس گھر کی عورتیں، بچے، مال و اسباب، اور روپیہ وغیرہ سب اُس کا ہو گیا اور گھر کا مالک اُس کا غلام بنا یا گیا، اس غریب کو طرح طرح کی جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں تاکہ مال اگر کہیں دبا ہو تو بتائے، بعض وقت ان نارمن عیسائیوں کی ایذا رسانی سے مر جاتے تھے، اور مرنا فی الواقع اُن کے حق میں بہتر ہوتا تھا، کیونکہ یہ کافر زانی تھے، اور مسلمان بیویوں اور بیٹیوں کو اُن کے شوہروں اور والدین کے سامنے بے آبرو کرتے تھے، یہ حرکتیں وہ علی الاعلان کرتے تھے، اور مسلمان قیدی کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنے ایسے باحیا نہ موقعوں پر حاضر رہیں"۔

یہ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ یہ وحشی خونخوار زانی نارمن اسپین سے جلد اپنے ملک کو چلے گئے، تاکہ جو دولت اسپین میں انھوں نے کثرت سے لوٹی تھی، اُسے اپنے وطن میں بیٹھ کر خرچ کریں۔

چلتے وقت یہ نارمن اپنے دو ہزار پیدل اور ڈیڑھ ہزار سوار قلعہ میں چھوڑ گئے، مگر قلعہ کی حفاظت کے لیے سپاہ کی یہ تعداد کافی نہ تھی، بنی ہود سے احمد مقتدر صاحب سرقسطہ نے اس حالت میں معتضد سے پانچ سو سواروں کی کمک پاکر بربشتر کے شہر پر ۴۵۷ھ/۱۰۶۵ء کی ربیع میں پھر قبضہ حاصل کر لیا۔

فردلند نے بلنسیہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں کمی نہ کی، دوبارہ فوج کشی کی، عبدالملک بادشاہ بلنسیہ کو اپنے خسر ابوالحسن یحیٰی مامون ذوالنونی صاحب طلیطلہ سے کمک پہنچ گئی تھی، مگر عبدالملک کی حالت بہتر نہ ہوئی، فردلند اسی زمانہ میں بیمار پڑ گیا، اور اُس کو اپنے دارالحکومت لیون کو واپس جانا پڑا، فردلند کے چلے جانے سے بھی عبدالملک کو کوئی نفع نہ پہنچا، کیونکہ نومبر ۱۰۶۵ء (ذی الحجہ ۴۵۷ھ) میں اُس کے خسر ابوالحسن یحیٰی ذوالنونی صاحب طلیطلہ نے عبدالملک کو حکومت بلنسیہ سے بے دخل کر کے ایک قلعہ میں قید کر دیا، اور بلنسیہ کے تمام علاقے کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔

اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد موت نے مسلمانوں کو اُن کے ایک سخت دشمن سے نجات دے دی، یعنی موت کے فرشتے نے اپنا تاج نیک بخت، بہادر، اور پارسا فردلند کے شریف سر پر رکھ دیا، جو (عیسائیوں میں) بادشاہوں کا بہترین نمونہ تھا، جس وقت بیمار ہو کر بلنسیہ سے لیون میں آیا (شنبہ ۲۴ دسمبر ۱۰۶۵ء م ۲۲ محرم ۴۵۸ھ) تو فوراً گرجا (۴۵۹
گیا، جو اُس نے شہید عیسیدور کی یادگار میں اسی شہید کے نام سے تعمیر کرایا تھا، فردلند کو اب اپنی موت کے قریب ہونے کا یقین ہو گیا تھا، اور سمجھتا تھا کہ اُس کا جنازہ اسی گرجا میں رکھا ہو گا، وہ گرجا میں دعا مانگنے کے بعد اپنے محل کو چلا گیا، تاکہ کچھ دیر وہاں آرام کرے، جب رات ہوئی تو پھر گرجا میں چلا آیا، یہاں اس وقت تمام قسیس ولادت مسیحؑ کی یاد میں مصروف نماز تھے، جس وقت انھوں نے اُس طریقۂ عبادت کے مطابق جو طلیطلہ میں مروّج تھا، نصف شب کو ولادت مسیحؑ کی خوشی میں دُعا کے لیے اپنی آوازیں بلند کیں، تو فردلند نے بھی گو وہ بہت نحیف اور کمزور تھا، اپنی آواز اُن کی آوازوں میں ملائی، اور صبح ہوتے ہی پادریوں سے درخواست کی کہ نماز قدّاس[1] پڑھی جائے، جس وقت یہ نماز ختم ہوئی تو فردلند کو نوکروں نے سہارا دے کر بمشکل اُس کے محل تک پہنچایا۔

جب دن اچھی طرح نکل آیا تو فردلند کو بادشاہی لباس پہنا کر پھر گرجا میں لائے، اور اب

---

[1] یہ نماز آدھی رات کو شروع ہوا کرتی تھی۔

وہ قربان گاہ کے سامنے گھٹنے زمین پر ٹیک کر کھڑا ہوا، کندھے سے ردائے شاہی اور سر سے تاجِ سلطنت اُتار کر قربانگاہ پر رکھا اور نہایت صاف آواز میں کہا "تیری ہی بادشاہی ہے اور تیری ہی سب قدرت ہے، اے خداوند! تو سب بادشاہوں کا بادشاہ ہے، آسمان اور زمین پر تیری ہی حکومت ہے، جو کچھ تو نے دیا تھا اور اُس پر تیرے ہی حکم اور رضا سے میں نے حکومت کی تھی، اب وہ سب تیرے حوالے کرتا ہوں، اے خداوند! اس ظلمت کدہ دنیا سے آزاد ہوتے ہی میری روح کو اپنے جوارِ رحمت میں لے لے"۔

یہ دعا مانگ کر فرولند سنگین فرش پر دراز ہو گیا، گناہوں کی معافی چاہی اور ایک اُسقف نے اُس کے جسم پر تیل ملا، پھر وہ ٹاٹ کا کرتہ پہن، سر پر خاک ڈال، موت کا منتظر ہو گیا، چہرے پر ایمان کا نور اور خدا کی مرضی پر صبر و شکر کرنے کی علامتیں تھیں، دوسرے دن سہ شنبہ کو صبح کی چھ ساعتیں گذری تھیں کہ فرولند بادشاہِ قشتالیہ اور لیون نے اپنی روح خدا کو سونپ دی، مرنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت اطمینان کے ساتھ ہنستی ہوئی صورت سے سو رہا ہے۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد ایک اور موت وقوع میں آئی، مگر یہ موت کسی مسیحی ولی یا شہید کی نہ تھی[1] جس کے بیان میں انجیل کے موتی پرونے کی ضرورت ہو۔ مترجم اردو) ۲۸ فروری ۱۰۶۹ء ام شنبہ ۲ جمادی الاول ۴۶۱ھ کو ہفتے کے دن معتضد بادشاہِ اشبیلیہ نے وفات پائی اس نے مرنے سے دو سال پہلے قرمونہ کی ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا، اور ایک دوسرا قتل اپنے ہاتھ سے اور بھی کیا تھا، یعنی ابو حفص ہوزنی کو جو اشبیلیہ کا ایک رئیس تھا،

---

[1] اس موت کے حال میں سوائے اس کے کہ اُسے بری طرح بیان کیا جائے، کسی اور اہتمام کی ضرورت مصنف کو نہ تھی، فرولند مسیحی ولی اور شہید نے بھی ہزاروں کو قتل کیا ہوگا، مگر اُس کی موت کے حالات میں بے گناہوں کا قتل یاد دلانا ضروری نہ تھا، البتہ معتضد کی موت کے بیان میں ایک خونِ ناحق کا ذکر، جو معتضد کی موت سے کئی برس پہلے کا واقعہ تھا اس موقعہ کے لئے لگا رکھا تا تا کہ ایک مسلمان کی موت کے وقت اُس کا ذکر کر کے اپنے مسیحی ناظرین کو محظوظ کیا جائے یہ ہیں صورت فریب انشا پردازی کے کمالات! (مترجم اردو)

مار کر ہلاک کر دیا۔

آخیر زمانہ میں معتضد کو سلطنت کے متعلق بُرے بُرے شگون نظر آنے لگے تھے، اُسے اس کا خوف نہ تھا کہ جو سلطنت اپنی ذہانت اور ترکیبوں سے قائم کی ہے اُسے قشتالیہ کے عیسائی تباہ کر دیں گے۔ قشتالیہ کی طرف سے اُسے کوئی فکر یا اندیشہ نہ تھا، کیونکہ نجومیوں نے اُسے یہ خبر دی تھی کہ آپ کی سلطنت کو وہ لوگ تباہ کریں گے جو اسپین میں پیدا نہیں ہوئے، چنانچہ معتضد کو مدت سے یہ خیال بندھ گیا تھا، کہ یہ اسپین سے باہر پیدا ہونے والے سوائے بربر کے اور لوگ نہیں ہیں اور بربر کو غارت کرنے کے بعد معتضد دل میں خوش تھے، کہ جو کچھ نجومیوں نے خبر دی تھی، اُس کا تدارک کر دیا، پھر یہ خیال ہوا کہ نہیں یہ خیال درست
(۶۶۰) نہیں ہے۔ بحرِ زقاق کی دوسری جانب صحرائیوں کا ایک انبوہِ کثیر جسے ایک شخص نے ریگستانوں سے بُلا کر جمع کیا تھا، افریقہ کی فتح کے لئے چل پڑا ہے، اور اس میں وہی جوش اور ہمت موجود ہے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں تھی، مذہب کے ان متوالوں میں جن کا نام اسپین کے لوگوں نے المرابطین رکھا تھا، معتضد نے دیکھ لیا کہ آئندہ زمانہ میں اسپین کے فتح کرنے والے یہی لوگ ہوں گے اور اب مرابطین کی طرف سے دل میں ایسا اندیشہ بیٹھا کہ کسی طرح دُور نہ ہوا۔

ایک روز معتضد دربار میں بیٹھے ہوئے سکوت حاکم سبتہ کا خط بار بار پڑھتے تھے سکوت نے اطلاع دی تھی کہ "مرابطین کا مقدمۃ الجیش مراکش میں آکر اُترا ہے"۔ اُس وقت ایک وزیر قریب حاضر تھا، اس نے عرض کیا کہ "اس خبر سے حضور کیوں پریشان ہوتے ہیں؟ ان وحشیوں کی سکونت کے لئے مراکش کا میدان بمقابلہ ہمارے شاداب اشبیلیہ کے بہت بہتر مقام ہے، اگر ان صحرائیوں نے وہاں اپنے خیمے لگائے ہیں تو ہمیں کیا اندیشہ ہے اُن میں اور ہم میں بڑے بڑے صحرا اور لشکر اور سمندر کی موجیں حائل ہیں"۔ معتضد نے جواب دیا مجھے پورا یقین ہے کہ ایک دن یہ لوگ آئیں گے، اور ممکن ہے کہ اُس دن کے دیکھنے کے لئے تم زندہ رہو، جزیرۃ الخضراء کے حاکم کو فوراً لکھو کہ جبلِ طارق کے قلعہ کو خوب مستحکم کر لے اور بہت ہوشیار رہے اور دیکھتا رہے کہ سمندر پار

کیا حالات پیش آ رہے ہیں"۔ پھر معتضد اپنے فرزندوں کی طرف دیکھ کر بولے "معلوم نہیں وہ روزِ بد دیکھنا کس کی تقدیر میں لکھا ہے؟ تمہاری تقدیر میں یا میری تقدیر میں" باپ کے منہ سے یہ سُن کر معتمد کہنے لگے "خدا مجھ کو آپ پر فدا کرے، اور جو مصیبتیں خواہ وہ کیسی ہی ہوں جو آپ کی تقدیر میں اُتری ہیں، وہ میرے سر پر آجائیں"۔

معتضد کو موت سے پانچ دن پہلے طبیعت بہت گری گری معلوم ہوئی۔ اُس نے ایک مشہور مغنیہ کو جو صقلیہ کی رہنے والی تھی، طلب کر کے حکم دیا کہ کچھ گا نا سنائے اس سے بحث نہیں کہ وہ کیا ہو؟ خیال یہ کیا تھا کہ وہ جو کچھ گائے گی، اُسی سے تقدیر کا حال معلوم کروں گا، گانے والی نے اتفاق سے ایسے شعر گائے جن میں اگرچہ حلاوت تھی مگر شدت سے دل کی افسردگی اُن سے ظاہر ہوتی تھی۔ اشعار کا مضمون یہ تھا:۔

"جہاں تک ہو سکے زندگی خوش گذار دے۔ کیونکہ جلد اُسے ختم ہونا ہے۔ اے میری محبوبہ! شراب میں سادہ اور شفاف پانی ملا کر میرے پاس لے آ"۔

اس غزل کے پانچ شعر اُس نے گائے اور یہ عجیب واقعہ ہے جس کے مستند ہونے میں شبہ نہیں کہ یہ پانچ کا عدد معتضد کی باقی زندگی کے دن تعبیر کرتا تھا۔ ۹۱/

گانا سُننے کے دوسرے دن ۲۶ فروری ۱۰۶۹ء مطابق یکم جمادی الاول سنہ ۴۶۱ھ جمعرات کے دن معتضد کی ایک بیٹی کا انتقال ہو گیا، اس لڑکی سے باپ کو بہت محبت تھی۔ معتضد کی نسبت بیان ہوا ہے کہ باوجود ظالم ہونے کے اُن کو اپنے بچوں سے بہت اُلفت تھی۔ غرض اس بیٹی کی موت نے اور بھی درگور کر دیا۔ جمعہ کی شام کو سخت رنج و غم کی حالت میں بیٹی کے جنازے کے ساتھ گئے۔

میت دفن ہونے کے بعد معتضد شدید دردِ سر کی شکایت کرنے لگے ناک اور منہ سے خون جاری ہو گیا۔ جس سے دم گھٹنے لگا، طبیب نے چاہا کہ فصد لی جائے لیکن مزاج میں ضد تھی، کہا "آج نہیں کل"۔ اس تاخیر نے موت کو اور بھی جلد بُلا لیا۔

دوسرے دن ہفتے کو منہ اور ناک سے پھر خون جاری ہوا، اور اب اُس کی زیادتی کی انتہا نہ رہی، زبان بند ہو گئی اور اسی حالت میں انتقال کیا۔

معتضد کا جانشین اُس کا بیٹا معتمد ہوا، جس کے عجیب و غریب حالات لکھنے باقی ہیں۔

اسناد :-

مونا کی سی لین سیس - مندرجہ اسپانا ساگراد - جلد ۱۷ ص ۲۷۰ تا ۳۳۰

کرونیکون کومپلوٹنسی ص ۳۲۷

کرونیکون کومپوسٹیلانم ص ۳۱۷ تا ۳۱۸

عباد جلد ۱ ص ۲۴۶، ۲۵۱ تا ۲۵۲

جلد ۲ ص ۶۱ تا ۶۲، ۲۱۶، ۲۱۹ تا ۲۲۰

ابن بسّام (قلمی نسخہ گوتھا) اخیر ورق

مقری جلد ۱ ص ۱۱۱

جلد ۲ ص ۷۴۸ تا ۷۴۹

عبدالواحد ص ۷۰

کتاب رابع

ملوک الطوائف

نویں فصل

معتمد اور ابنِ عمّار

۶۲۱ معتمد ۴۳۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، گیارہ برس کی عمر تھی کہ باپ نے انہیں صوبہ ولبہ کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس کے بعد تھوڑا زمانہ گذرا تھا کہ محاصرۂ شلب میں لشکرِ اشبیلیہ کی سپہ سالاری سپرد ہوئی، اسی زمانہ میں معتمد کی ملاقات ایک شخص سے ہوئی جو ان سے عمر میں نو برس بڑا تھا اور جس کی قسمت میں تھا کہ آئندہ معتمد پر اپنی طبیعت کا بہت بڑا اثر پہنچائے۔

اس شخص کا نام محمد بن عمار اور کنیت ابوبکر تھی، شہر شلب کے اعمال سے شنتبوس نامی ایک قریہ میں مفلس اور گمنام ماں باپ کے گھر پیدا ہوا تھا، جو عرب تھے، علم و ادب پہلے شلب میں اور پھر قرطبہ میں حاصل کیا، اس کے بعد پریشاں گردی میں عمر گذرنے لگی، اس کی وجہ معاش یہ تھی کہ جس کسی سے کچھ وصول ہونے کی توقع ہوتی، اس کا قصیدہ لکھتا، اگرچہ نامور شعراء سوائے وزیروں اور بادشاہوں کے کسی کا قصیدہ لکھنا اپنی شان کے خلاف

سمجھتے تھے، لیکن نوجوان ابنِ عمار، جس کے ذلیل کپڑوں اور سر پر جھکی ہوئی ٹوپی اور پرانی قبا پر کوئی ہنستا اور کوئی رحم کھاتا تھا، اسی کو غنیمت سمجھتا تھا کہ کوئی تو دولت اس کا قصیدہ سن کر کچھ سلوک کر دے، ایک دن بہت ہی زدہ حال شلب میں آیا، تنگ دستی کی یہ حالت تھی کہ جس جانور پر سوار تھا اس کے لئے دانہ خریدنے کو بھی دام پاس نہ تھے، اتفاق سے اُسے شلب کے ایک شخص کا خیال آیا کہ شاید وہ اس وقت کچھ مدد کرے، یہ ایک دولتمند تاجر تھا، اگرچہ جاہلِ محض تھا مگر اپنی تعریف میں شعر سُننے کا ہمیشہ مشتاق رہتا تھا، ابنِ عمار نے فوراً ایک قصیدہ لکھا اور اپنی مصیبت کی ایک داستان لکھ کر مع قصیدہ کے تاجر کے پاس بھیجی، تاجر قصیدہ سُن کر بہت خوش ہوا اور ایک توڑے میں جو بھر کر مفلس شاعر کے پاس بھیجے، جب یہ کم قیمت انعام پہنچا تو شاعر کو خیال آیا کہ افسوس تاجر سے اتنا بھی نہ ہوا کہ توبڑہ میں جو کی جگہ گیہوں بھر کر بھیجتا، پھر بھی یہ جو غنیمت ہوئے، ہم آگے پڑھیں گے کہ ابنِ عمار نے اپنے اس محسن کا شکریہ کس طرح ادا کیا۔

شاعری میں ابنِ عمار کو جلد شہرت حاصل ہوئی اور اسی شہرت کے باعث معتمد کی خدمت میں پہنچنے کی اُسے عزت نصیب ہوئی، معتمد، ابنِ عمار کو دیکھتے ہی اُس پر مہربان ہو گئے چونکہ دونوں عیش پسند، ہمت و جرأت کے کاموں میں شوق سے شریک ہونے والے اور شاعری کے خصوصیت سے جوہر شناس تھے، اس لئے اُن میں بہت جلد دوستی پیدا ہو گئی۔ غرض جب شلب دشمن سے فتح کر لیا گیا اور معتمد وہاں کے حاکم مقرر ہوئے تو اُنھوں نے اپنے دوست ابنِ عمار کو قلمدان وزارت عطا فرمایا اور صوبہ شلب کا کل انتظام اُس کے سپرد کر دیا۔

شلب جیسے پُر فضا اور دلفریب مقام میں جہاں کا ایک معمولی کسان بھی شعر کہہ سکتا تھا، معتمد اور ابنِ عمار کا جو زمانہ خوشی اور خرمی میں گذرا وہ معتمد کے دل سے کبھی نہ بھولا، شہزادہ کے دل میں عشق نے ابھی تک راہ نہ پائی تھی، دل میں حسین سے حسین خیالات پیدا ہوتے اور مِٹ جاتے، کوئی مستقل نقش پیچھے نہ چھوڑتے، یہ سن البتہ تھا جس میں سچی اور پکی دوستیاں پیدا کرنے کا ایک ولولہ اُٹھتا رہتا ہے، غرض اسی دُھن میں

جوانی و شباب کا پورا زور معصومانہ طریقہ پر صرف ہونے لگا۔

ابن عمار دولت کی چھاؤں اور عیش و آرام کے سایہ میں نہ پلا تھا، ابتدائے عمر سے اُسے افلاس و تنگ دستی اور مشکلوں اور مایوسیوں کا تجربہ ہوتا رہا تھا، ابن عمار کے خیال اور تصور میں معتمد کی سی تازگی نہ تھی، نہ معتمد کی طرح وہ خوش رہتا تھا، اور نہ شہزادہ کی سی جوانی اور جوانی کا جوش اُس میں موجود تھا، کلام میں ایک دبا ہوا شکوہ اور رُکی ہوئی فریاد تھی، جو بغیر زبان سے نکلے نہ رہتی تھی، عقائد میں کسی قدر شکی تھا، ایک دن جمعہ کی نماز کیلئے یہ دونوں دوست مسجد کو جاتے تھے کہ راستہ میں مؤذن کی اذان سنی، معتمد نے اذان سنتے ہی اس مضمون کا مصرع کہا "سنو! مؤذن پکارتا ہے کہ نماز کا وقت آگیا" پھر ابن عمار سے کہا کہ اس پر مصرع لگاؤ، ابنِ عمار نے اس مضمون کا مصرع لگایا "اور یقین کرتا ہے کہ اس میں خدا اُس کے بہت سے گناہ معاف کردے گا" معتمد نے تیسرا مصرع کہا "اور خدا اُسے خوش رکھے کہ حق پر گواہی دیتا ہے۔ ابنِ عمار نے ہنس کر چوتھا مصرع کہا "بشرطیکہ دل میں بھی وہی ہو جو زبان پر ہے"

ابن عمار بہت کم سنی سے دوسروں کی طبیعت کو پہچاننا اور اُن کا اعتبار نہ کرنا سیکھ گیا تھا، اس لئے زیادہ تعجب کا مقام نہیں کہ معتمد کی دوستی اور محبت کو بھی جس کی کوئی انتہا نہ تھی، بعض وقت وہ شبہ کی نظر سے دیکھا کرتا تھا، مے نوشی کے جلسوں میں بالخصوص اُس کی طبیعت افسردہ ہوجاتی تھی اور جو بُرے خیالات اس وقت دل میں آتے تھے وہ پھر ذہن سے نہ نکلتے تھے چنانچہ اس بارے میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جو اگرچہ عجیب ہے۔ مگر اس کی صحت میں کلام نہیں، کیونکہ اس پر گواہی دینے والے خود ۶۶۴/
ابنِ عمار اور معتمد ہیں [1]

قصہ یہ ہوا کہ ایک دن معتمد نے ابنِ عمار کو شام کے وقت ایک ضیافت میں مدعو

---

[1] عبد الواحد المراکشی نے اس قصہ کو ابنِ عمار کے الفاظ میں بیان کیا ہے اور ابنِ بسام نے اشبیلیہ کے اکثر وزراء سے سن کر، جنھوں نے معتمد سے سنا تھا، یہ قصہ لکھا ہے۔

گیا، ضیافت ہوئی اور اُس میں شراب نوشی معمول سے زیادہ ہوئی، جب اور مہمان رخصت ہو گئے تو معتمد نے ابن عمار سے کہا کہ "تم نہ جاؤ" ابنِ عمار نے اس ارشاد کی تعمیل کی اور دونوں باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

ابن عمار تھوڑی دیر سوئے تھے کہ اُن کے کان میں آواز آئی "اے نامراد! ایک دن یہی تجھ کو مار ڈالے گا" ابنِ عمار ڈر کر جاگ اُٹھے، مگر یہ سمجھ کر کہ خمار میں برے خیالات آ رہے ہیں، بہت کوشش سے اس آواز کا خیال دُور کر کے پھر سو گئے، مگر ذرا سی دیر سوئے تھے کہ پھر وہی منحوس آواز سنی، پھر سوئے اور پھر وہی آواز آئی اس تیسری بار اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ آواز محض واہمہ نہیں بلکہ ندائے غیب ہے، اب سوائے اس کے دُوسری کوئی بات قیاس کرنے کی ہمت نہ ہوئی، چپکے سے اُٹھے، محل کی ڈیوڑھی میں آئے اور یہاں ایک کونے میں بوریے میں لپٹ کر اس ارادہ سے کھڑے ہو گئے کہ دروازہ کھلتے ہی محل سے باہر نکل جائیں گے اور پھر ساحل کا رستہ لے وہاں کسی بندرگاہ سے جہاز پر سوار ہو افریقہ چلتے ہوں گے۔

معتمد کی آنکھ کھلی تو دوست کو نہ پایا، اس پر انھوں نے اس زور سے آواز لگائی کہ نوکر جاگ اٹھے، معتمد نے نوکروں کو تلاش کا حکم دیا، خادموں نے سارا قصر چھان مارا، مگر ابنِ عمار کا کہیں پتہ نہ چلا، معتمد خود تلاش میں شریک ہوئے اور یہ دیکھنے کو کہ قصر کا دروازہ کھلا ہے یا بند، ڈیوڑھی کی طرف گئے، یہاں ابن عمار چھپے کھڑے ہی تھے، بے اختیار کچھ ایسی جنبش کی کہ بوریا جس میں لپٹے کھڑے تھے ہلا، معتمد کی نظر اُدھر گئی، پوچھا کہ اس بوریے میں کیا ہے؟" نوکر فوراً دوڑ کر بوریے کے پاس پہنچے تو ابنِ عمار بوریے میں سے نکلے، حالت رحم کے قابل تھی، ننگے گلے، صرف پاجامہ پہنے ہوئے تھے، سر سے پاؤں تک تھر تھر کانپتے تھے اور شرم و ندامت سے آنکھیں نیچی کئے ہوئے تھے۔

معتمد دوست کی یہ حالت دیکھ کر رو دیے اور کہنے لگے "ابوبکر! یہ کیا حالت ہے" مگر پھر یہ دیکھ کر کہ ابنِ عمار کانپ رہے ہیں، انہیں اپنے کمرے میں لے آئے، اور اب معلوم کرنا چاہا کہ آخر یہ ماجرا کیا تھا؟ مگر ابنِ عمار بہت دیر تک کچھ جواب نہ دے سکے

کچھ تو خوف سے اور کچھ اپنی شرمناک حالت سے ہوش و حواس معطل سے ہو گئے تھے کبھی ہنستے تھے کبھی روتے تھے، آخر جب کچھ تسکین ہوئی تو کل واقعہ بیان کیا، جسے سُن کر معتمد ہنس پڑے اور بڑی محبت اور درد مندی سے کہنے لگے کہ شراب کے بخارات نے دماغ پر اثر کر کے یہ فضول خیال تمہارے دماغ میں پیدا کیا تھا، اس کے سوا اور کچھ نہ تھا، بھلا تم سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے مار ڈالنے کا خیال میرے دل میں کیونکر آسکتا ہے؟ تم میری جان اور زندگی ہو، تم کو قتل کرنا خود اپنے آپ کو قتل کرنا ہے، بس اب اس خیال کو دُور کر دو، اور اس کا پھر کبھی ذکر بھی نہ کرنا۔

(۳۶۵) اس موقع پر عربی مؤرخ لکھتا ہے کہ "ابنِ عمار اس واقعہ کو بھول گئے، لیکن جب بہت لیل و نہار گذر لئے، تو وہ واقعہ پیش آیا جس کی طرف عنقریب اشارہ کیا جائے گا۔"

جب یہ دونوں دوست شلب میں نہ ہوتے تو اپنا وقت اشبیلیہ میں گذارتے، اشبیلیہ دارالسلطنت تھا، ہر قسم کا سامانِ عیش وہاں میسّر تھا، یہاں آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے، اکثر بھیس بدل کر مَرجُ الفضّہ (چاندی والے چوک) میں جاتے، جہاں عورتیں اور مرد تفریح کے لئے جمع ہوا کرتے تھے، یہی مقام تھا جہاں معتمد اُس حسین صورت سے پہلی بار ملے، جس کے نصیب میں معتمد کا عمر بھر ساتھ دینا لکھا تھا، ابنِ عمار کے ساتھ ایک دن اسی نزہت گاہ میں سیر کرتے تھے کہ ہوا کے چلنے سے دریا کی سطح پر ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوئیں، معتمد نے فوراً اس مضمون کا مصرع موزوں کیا۔

نسیم کے جھونکوں سے پانی کی موجیں زرہ بن گئی ہیں

ابنِ عمار دوسرا مصرع سوچتے ہی رہے کہ اتنے میں ایک نوجوان حسین عورت نے جو قریب کھڑی تھی بے تکلف دُوسرا مصرع کہا:۔

لڑنے والے کے لئے کیا خوب زرہ ہوتی اگر پانی کی موجیں برف ہوتیں۔

معتمد کو حیرت ہوئی کہ کس بلا کی تیز عورت ہے جس نے مصرع لگانے میں ابنِ عمار کی تقدیم کی اور ابنِ عمار بھی وہ جس کی شاعری کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی ہے، اس حیرت کے عالم میں معتمد اس عورت کو غور سے دیکھنے لگے، اس کی اچھی صورت کا دل پر اثر ہوا

ایک خواجہ سرا سے جو کچھ فاصلے سے پیچھے آرہا تھا، کہا کہ "اس شاعرہ کو قصر میں لے جاکر بٹھاؤ" اتنا کہہ کر خود بھی قصر میں آئے، جس وقت وہ حسین عورت سامنے آئی، تو معتمد نے اس کا حسب نسب دریافت کیا، عورت نے جواب دیا کہ میرا نام اعتماد ہے، لیکن بالعموم رُمیکیہ کے نام سے مشہور ہوں، کیونکہ میں رُمیاک کی لونڈی ہوں، اور خچر ہانکنا میرا کام ہے" اتنا سُن کر شہزادے نے پوچھا "کیا تمہاری شادی ہو چکی ہے" رمیکیہ نے جواب دیا "نہیں" معتمد نے کہا "یہ خوب ہوا، میں تمہیں تمہارے آقا سے خرید کر تم سے شادی کروں گا[1]"

معتمد جب تک زندہ رہے رُمیکیہ کے ساتھ اُن کے عشق میں کبھی کمی نہیں ہوئی، کوئی دل لبھانے والی چیز معتمد کی نظر میں ایسی نہ تھی جو رُمیکیہ میں موجود نہ ہو، بعض اوقات رمیکیہ کو شہزادی ولادہ سے جو اموی خلیفہ المستکفی باللہ کی بیٹی تھیں، اکثر نسبت دی گئی ہے، لیکن تمام باتوں میں یہ نسبت پوری نہیں اُترتی، رُمیکیہ علم و فضل میں شہزادی ولادہ سے کوئی نسبت نہ رکھتی تھی، لیکن شیریں کلامی اور بذلہ سنجی میں شہزادی ولادہ سے ہرگز کم نہ تھی اور معصوم بچوں کی سی خوش ادائی، کھیل کود اور شرارت میں ولادہ سے بڑھی ہوئی تھی۔ ۱۰۶۶/

رمیکیہ کو جو نیا شوق اُچھلتا وہ شوہر کے لئے مسرت اور مایوسی دونوں کا باعث ہوتا تھا کوئی فرمائش ایسی نہ تھی جو پوری نہ کی جاتی ہو، چاہے اس میں کتنی ہی دولت و زحمت صرف ہو، رُمیکیہ جس بات کا ارادہ کر لیتی پھر دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جاتی مگر اپنی بات سے نہ ٹلتی ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فروری کا مہینہ تھا، قصر قرطبہ کی ایک کھڑکی سے رمیکیہ باہر کی سیر دیکھ رہی تھی، یکایک برف روئی کے گالوں کی شکل میں گرنی شروع ہوئی، جس ملک میں جاڑا شدت کا نہ ہوتا ہو، وہاں کبھی اتفاق سے برف کا گرنا ایک عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے، برف کے سفید سفید گالے دیکھ کر رُمیکیہ رونے لگی معتمد نے پوچھا

[1] معتمد نے اپنا لقب "معتمد" رکھا، جس کا مادہ وہی ہے جو اعتماد کا ہے۔

"کیوں! کیوں! روتی کیوں ہو؟" رُمیکیہ نے سسکیاں لے لے کر جواب دیا "تمہارے برابر کوئی بُرا اور ظالم نہ ہوگا، ذرا دیکھو! یہ برف گرتی ہوئی کیسی بھلی معلوم ہوتی ہے؟ کس طرح اس کے گالے درختوں کی شاخوں کو لپیٹ گئے ہیں، لیکن تم بڑے نااحسانمند ہو، تمہیں اتنا بھی خیال نہ آیا کہ ہر جاڑے مجھے یہی بہار دکھا دیا کرتے، اگر یہاں ممکن نہ تھا تو پھر ایسے ملک ہی کی بسر کرادی ہوتی جہاں برف ہمیشہ گرا کرتی ہے"۔ یہ کہتے کہتے رُمیکیہ کے آنسو رخساروں پر بہنے لگے معتمد نے آنسو پونچھ کر کہا "پیاری دلبر! کیوں پریشان ہوتی ہو؟ لو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب سے ہر جاڑے برف گرنے کی بہار دیکھ لیا کروگی۔

معتمد نے فوراً حکم دیا کہ جبل قرطبہ پر بادام کے درخت لگائے جائیں تاکہ جاڑے میں کُہر گرنے کے بعد جب مطلع صاف ہو تو اُن درختوں کے خوبصورت سفید پھول ہوا سے جھوم جھوم کر برف گرنے کا لطف پیدا کر دیں جس کی رُمیکیہ اس قدر مشتاق ہے"۔

ایک اور موقعہ پر رُمیکیہ نے دیکھا کہ کچھ غریب عورتیں اینٹیں بنانے کے لئے پاؤں سے مٹی گوندھ رہی ہیں، رمیکیہ یہ دیکھ کر پھر رو کر شوہر سے کہنے لگی "ہائے! جس دن سے ایک غریب گھر سے نکال کر جہاں میں خوش اور آزاد رہتی تھی، تم نے آدابِ شاہی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے اس تاریک محل میں بند کیا ہے، وہ دن اور آج کا دن جیسے آرام کہتے ہیں وہ مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا، ذرا دریا کے کنارے ان غریب عورتوں کو دیکھو! کیا اچھا ہوتا کہ میں بھی انہی کی طرح پاؤں سے مٹی گوندھتی ہوتی، مگر افسوس تم نے ملکہ بنا کر مجھے قید میں ڈال دیا، ان غریب عورتوں کی طرح مٹی گوندھنے کا لطف مجھے کب نصیب ہو سکتا ہے؟" معتمد نے مسکرا کر کہا "کیوں! نصیب کیوں نہیں ہو سکتا"۔

اس کے بعد معتمد محل کے صحن میں آئے اور خدام شاہی کو حکم ہوا کہ کافور و شکر اور مشک و عنبر کے ڈھیر صحن میں لگائے جائیں۔ جب یہ چیزیں حاضر کر دی گئیں تو دوسرا حکم یہ ہوا کہ ان سب اشیاء کو آمیختہ کر کے عرقِ گلاب سے نرم کیا جائے، یہاں تک (۱۰۶۷)

کہ وہ نرم گیلی مٹی کی طرح ہو جائیں۔

جب یہ سب کچھ ہو لیا تو معتمد نے رُمیکیہ کو آواز دی "اب ذرا یہاں قدم رنجہ فرمایئے خواصیں اور سہیلیاں بھی ساتھ ہوں، پائے نازک سے پامال کرنے کے لئے مٹی تیار ہے۔" اتنا سنتے ہی سلطانہ رُمیکیہ مع خواصوں کے بالاخانہ سے نیچے اُتریں اور ننگے پاؤں ہو کر اُس مشک و عنبر کی کیچڑ کو خوب خوش ہو ہو کر رُوندنا شروع کیا۔

اس کھیل میں بڑی دولت صرف ہوئی تھی، چنانچہ معتمد نے ایک موقع پر اپنی نازک مزاج سلطانہ کو یہ شغل یاد بھی دلایا، وہ موقع یہ تھا کہ ایک دن پھر رُمیکیہ نے اسی قسم کی دولت ضائع کرنے والی فرمائش معتمد سے کی اور کہا "کیوں! مجھے تم سے شکایت کیوں نہ ہو؟ میرے برابر مصیبت زدہ کون عورت ہوگی؟ خدا جانتا ہے کہ ایک بات بھی تو میرے خوش کرنے کو کبھی تم نے نہ کی۔" اتنا سن کر معتمد نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا "کیا جس دن پاؤں سے مٹی گوندھ رہی تھیں اُس دن بھی جی خوش نہیں ہوا تھا؟" رُمیکیہ یہ فقرہ سن کر شرمندہ ہو گئی اور پھر کبھی کوئی فرمائش کی۔

یہ بات غور کے قابل ہے کہ فقہا اور علماء نے اس خفیف الحرکات سلطانہ کا نام بھلائی کے ساتھ نہیں لیا: یہ لوگ سمجھتے تھے کہ اس ملکہ نے معتمد کو عیش و نشاط اور لہو لعب میں مبتلا کر رکھا ہے، اور جب یہ بزرگ معتمد کی اصلاح میں کوشش کرتے ہیں تو یہی ملکہ مزاحم ہوتی ہے۔ جمعہ کو مسجد میں اگر نمازی کم آتے تو یہ کمی بھی رُمیکیہ ہی کا قصور سمجھی جاتی۔ رُمیکیہ ان بزرگوں کی شکایتوں پر ہنستی تھی، مگر کچھ خبر نہ تھی کہ یہی بزرگ ایک دن اُس کی جان کے دشمن بن جائیں گے۔

معتمد ملکہ کے عشق میں ڈوبے رہتے تھے، مگر باوجود اس کے ابن عمار سے جو محبت تھی وہ بدستور قائم رہی۔ ایک مرتبہ رمیکیہ سے جُدا ہو کر ابنِ عمار کے ہاں مہمان تھے تو ملکہ کو یہ اشعار لکھ کر بھیجے:-

"آنکھوں سے اوجھل ہو مگر دل میں بسی ہو، تمہیں نعمتیں اور لذتیں ایسی ہی کثرت سے نصیب ہوں جس کثرت سے آہیں۔ اور آنسو اور راتوں کی نیندیں اُچاٹ ہوئی

مجھے نصیب ہو رہی ہیں۔

جب دوسری عورتیں لگام چڑھا کر مجھے ہانکنا چاہتی ہیں تو تاب نہیں رہتی اُن کے قابو سے باہر ہو جاتا ہوں، لیکن تمہاری خاطر ذرا ذراسی بات میں بھی جان اور دل سے ہر وقت منظور ہے ہر وقت یہ تمنّا ہے کہ تمہارے پہلو میں ہوں، خدا کرے یہ تمنّا جلد پوری ہو۔ اے میرے دل کی پیاری! مجھے یاد کرتی رہو بھولو نہیں، خواہ میں کتنے ہی دن تم سے دُور رہوں۔

واہ ناموں میں کیسا پیارا نام نکلا ہے "اعتماد" میں نے اُسے لکھ لیا ہے اور اس کا مادہ بھی تلاش کر لیا ہے"

اس خط کو معتمد نے اِس جملہ پر ختم کیا:۔

"میں تم سے عنقریب ملوں گا، بشرطیکہ اللہ اور ابنِ عمار نے اجازت دی"۔

(۶۶۸) جس وقت ابنِ عمار کو اِس آخری فقرے کی اطلاع ملی تو اُس نے چند اشعار صنعتِ توشیح میں لکھ کر معتمد کی خدمت میں بھیجے، جن کا مضمون یہ تھا۔

"اے میرے بادشاہ! میں تیری رضا کے سوا اور کوئی آرزو نہیں رکھتا، تو میری رہنمائی اس طرح کرتا ہے جیسے اندھیری رات میں بجلی کوندکر مسافر کو راہ بتاتی ہے اپنی محبوبہ کے پاس واپس جانے کا قصد فرمایئے، ایک تیز رفتار کشتی پر سوار ہو جیے میں بھی آپ کے متعاقب حاضر ہوتا ہوں، یا گھوڑے پر سوار ہو جایئے، اور میں پیچھے پیچھے چلوں اور جس وقت خدا کے فضل سے آپ صحنِ قصر میں داخل ہوں تو مجھے اپنے گھر واپس جانے کی اجازت دی جائے اور پھر تلوار کمر سے نہ کھلنے پائے کہ اُس حسینہ کے قدموں پر سر رکھ دیجئے جس کا نشان کمر زریں ہے، پھر جتنے دن مفارقت میں گذرے ہیں اُن کا حساب کر کے اُتنی ہی بار اس محبوبہ سے بغل گیر ہو جیے اور اپنے سینہ سے اُسے لگایئے اور پھر آپ کے اور اُس کے لبوں سے شیریں الفاظ اِس طرح نکلیں جیسے طیورِ خوش الحان کی منقار سے صبح کی آمد میں نغمے نِکلتے ہیں"

رُمیکیہ کے عشق اور ابنِ عمار کی دوستی میں معتمد کے دن نہایت عیش سے گذر رہے

تھے، لیکن اس عیش کو خاک میں ملانے والا دن بھی آیا، معتمد کے والد معتضد نے ابن عمار کو جلاوطن کردیا، یہ واقعہ دونوں دوستوں کے حق میں ایسے صدمہ کا تھا جیسا سروں پر بجلی کا گرنا، لیکن کیا کر سکتے تھے، معتضد نے جب کسی بات کا قصد کرلیا ہو، تو پھر اُس کو جنبش نہ تھی۔ غرض ابن عمار نے اسپین کے شمال میں بالخصوص سرقسطہ میں حالتِ جلاوطنی میں بہت دن کاٹے حتیٰ کہ معتمد اپنی عمر کے انتیسویں سال میں اپنے والد معتضد کی وفات پر تخت نشین ہوئے[1]

بادشاہ ہوتے ہی معتمد نے اپنی جوانی کے دوست ابن عمار کو واپس بلالیا اور اُن سے کہا کہ جو منصب پسند ہو وہ اختیار کرو، ابن عمار نے صوبہ شلب کی حکومت پسند کی، جہاں وہ پیدا ہوئے تھے، معتمد کو افسوس ہوا کہ اس خدمت پر جانے سے اُن کا دوست اُن سے بہت دُور ہو جائے گا۔ بہر کیف معتمد نے ابن عمار کی درخواست منظور کی، لیکن جب ابن عمار رخصت ہونے لگے تو معتمد کو اپنا اور ابن عمار کا کبھی شلب میں ساتھ رہنا یاد آگیا، اور محبت کے جذباتِ شیریں پھر عود کر آئے، جنھوں نے ان دونوں دوستوں میں کبھی کوئی ملال پیدا نہ ہونے دیا تھا، چنانچہ اسی کیفیت میں معتمد نے ایک نظم لکھی، جس کا مضمون یہ تھا۔

"اے ابوبکر! جب تم شلب پہنچو تو اُن محبوب مقامات سے جن سے تم واقف ہو میرا سلام کہنا، اور اُن سے یہ پوچھنا کہ میں بھی انہیں کبھی یاد آتا ہوں کہ یا نہیں؟ سب سے پہلے شراجیب سے سلام کہنا، یہ وہی محل ہے جس کے عالیشان کمروں میں شیروں اور حسین عورتوں کے مجسّمے نصب ہیں، یہاں تک کہ وہ قصر کبھی شیروں کا جنگل اور کبھی حسینوں کا گھر معلوم ہوتا ہے اور اُس سے یہ کہنا کہ ایک نوجوان تجھے پھر دیکھنے کی آرزو میں سوختہ دل ہو کر جی رہا ہے، ہائے! کیسی کیسی راتیں جوان، خوش اندام نازک کمر حسینوں کے پہلو میں گذاری تھیں، مہ وشانِ سیاہ چشم کی وہ میٹھی میٹھی

[1] یہ روایت کہ معتضد کی زندگی میں ابن عمار واپس چلے آئے تھے زیادہ قرینِ قیاس نہیں ہے

نگاہیں کس طرح میرے دل کے پار ہوتی تھیں، معلوم ہوتا تھا کہ نگاہیں نہیں ہیں تلواریں اور برچھیاں ہیں اور ہائے وہ راتیں بھی کس لطف سے کٹی تھیں جب کہ دریا کے قریب ایک سبزہ زار کے بیچوں بیچ کھلی ہوئی جگہ میں وہ پری جمال مطربہ پہلو میں ہوتی تھی جس کے گلے کا ہار ہلالِ عید معلوم ہوتا تھا۔ طرح طرح سے یہ گانے والی دل میں آگ روشن کرتی تھی، کبھی پیاری و شرمیلی نگاہوں سے، کبھی بادۂ ناب سے اور کبھی شیریں بوسوں سے وہ تواضع کرتی تھی، پھر جب کبھی عود اُٹھا کر میدانِ کارزار کا کوئی راگ چھیڑ دیتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ تلواروں کی جھنکار سن رہا ہوں اور لڑنے مرنے کا اک جوش دل میں پیدا ہو رہا ہے اور سب سے غضب کا وقت وہ ہوتا تھا جب کہ لباس پھینک کر وہ بیدِ مجنون کی ایک نازک اور نرم شاخ کی طرح سامنے آتی تھی اور میں کہتا تھا کہ واہ وا، کلی کھِل کر پھول ہوگئی۔" (۶۶۹)

ابنِ عمار ایسے حشم و حشم کے ساتھ شلب میں داخل ہوئے کہ معتمد بھی جس زمانہ میں شلب کے حاکم مقرر ہو کر بھیجے گئے تھے اس کرّ و فر کے ساتھ شہر میں داخل نہ ہوئے تھے لیکن اس غرور اور نمود کا کفارہ شکر گذاری کے ایک شریفانہ کام سے کیا، آتے ہی دریافت کیا کہ وہ تاجر زندہ ہے یا نہیں جس نے انہیں مفلسی اور آوارگردی کے زمانہ میں ایک توبڑا جو کا بھر کر بھیجا تھا، وہ توبڑا ابنِ عمار نے اب تک اپنے پاس رکھا تھا، جب معلوم ہوا کہ وہ تاجر زندہ ہے تو اُسی توبڑہ میں ابن عمار نے درہم (چاندی کے سکّے) بھر کر اُس کے پاس بھیجے، مگر اُس پرانے محسن سے یہ بات بھی پوشیدہ نہ رکھی کہ جس وقت اُس کا تحفہ پہنچا تھا تو خیال آیا تھا کہ محسن نے احسان کرنے میں خسّت کی ہے، اگر وہی توبڑا گیہوں سے بھر کر بھیجتا تو میں آج اُسے دینار (سونے کے سکوں) سے بھروا کر واپس کرتا۔ ل

ابنِ عمار زیادہ دن تک شلب میں نہیں رہے، معتمد کو بغیر ان کے چین نہ تھا، اس وجہ سے انہیں وزیر کر کے اپنے پاس بُلا لیا+

اسناد :-

عبدالواحد ص ۷۷، ۷۹ تا ۸۳

عبّاد (ڈوزی) ج ۱ ص ۳۹، ۸۴، ۳۸۴

ج ۲ ص ۶۸ تا ۶۹، ۸۸، ۱۲۰، ۱۵۱ تا ۱۵۳

۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۴

ابنِ لبّام ج ۲ ص ۹۸، ۱۱۳

کتاب رابع

ملوک الطوائف

دسویں فصل

معتمد

معتمد اور ابنِ عمار دونوں کو شاعری کے برابر کسی چیز سے عشق نہ تھا، اس وجہ سے اشبیلیہ کا دربار نامی شعراء کا ملجاو ماویٰ بن گیا، معمولی درجے کے شاعر یہاں عزت حاصل نہ کر سکتے تھے، کیونکہ معتمد بڑے سخن سنج اور زبردست ناقد تھے، جو نظم پیش ہوتی تھی اس کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک مصرعے کو نہایت غور سے جانچتے تھے، جو شعراء واقعی صاحبِ کمال ہوتے اُن کے ساتھ معتمد کی داد و دہش کی انتہا نہ رہتی، ایک دن حاضرین میں سے کسی نے اس مضمون کے دو شعر معتمد کے سامنے پڑھے:۔

"وعدوں کی وفا ایک شاذ و نادر نیکی ہو گی۔

ایسی مخلوق کہاں جسے اپنے وعدوں کو پورا کرنے کا خیال ہو یا اپنے قول کا پاس و لحاظ ہو۔

وعدہ وفا کرنا یا تو کہانیوں والی عنقا ہے یا

ایک حکایت ہے جس میں بیان کیا جائے کہ فلاں کو ایک ہزار مثقال انعام میں ملے تھے۔"

معتمد نے پوچھا کہ "یہ شعر کس کے ہیں؟" حاضرین نے عرض کیا کہ "عبدالجلیل ابن وہبون کے ہیں"۔ معتمد نے یہ سن کر حیرت سے کہا "وائے قسمت! ایک شخص ہمارے خدام سے ہو اور شاعر بھی اچھا ہو، اور پھر وہ ایک ہزار مثقال کے انعام کو عنقا سمجھے"۔ غرض زیادہ زمانہ نہ گذرنے پایا کہ ابن وہبون کا یہ فرضی قصہ معتبر تاریخ بن گیا۔

ایک اور موقع پر جب کہ نارمنڈی کے بادشاہ روجر[1] نے صقلیہ کا جزیرہ مسلمانوں سے لے لیا تھا تو اسی جزیرہ کا ایک مسلمان شاعر اشبیلیہ میں وارد ہوا، ایک دن معتمد اس شاعر سے باتیں کر رہا تھا کہ دارالضرب سے کچھ نئی اشرفیاں تیار ہو کر آئیں اور وہ تھیلیوں میں بند بادشاہ کے سامنے رکھی گئیں بادشاہ نے ان میں سے دو تھیلیاں شاعر کو مرحمت فرمائیں، یہ انعام کچھ کم نہ تھا مگر شاعر کی تسلی نہ ہوئی اور بہت ہی حسرت سے وہ ایک نادر صنعت کی طرف دیکھنے لگا، یہ عنبر کا ایک کھلونا اونٹ کی صورت کا تھا اور اس پر موتی جڑے ہوئے تھے، اس نادر شے کو دیکھ کر شاعر نے کہا "حضور نے جو انعام عطا فرمایا ہے وہ بہت ہے لیکن اس میں وزن اتنا ہے کہ گھر تک لے جانے کے لئے ایک اونٹ درکار ہے"۔ معتمد نے ہنس کر جواب دیا "اونٹ تمہارا ہے"۔

معتمد کا حال یہ تھا کہ کمال کی قدر کرتا تھا، چاہے وہ پیشۂ قزاقی ہی میں کیوں نہ دکھایا گیا ہو، چنانچہ ایک قزاق کا قصہ لکھا ہے جس کا نام صقرِ اشہب دھورے رنگ کا باز) مشہور ہو گیا تھا، اس کے سوا دوسرا نام نہ رکھتا تھا، یہ اپنے زمانے کا بڑا مشہور رہزن اور لٹیرا تھا اور تمام ملک میں قہر و عذاب کا ایک نمونہ بنا پھرتا تھا، آخر کار گرفتار ہوا، معتمد نے حکم دیا کہ شاہراہ کے کنارے صلیب پر لٹکا دیا جائے۔ تاکہ دیہات کے رہنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ انصاف کیا گیا ہے، جس دن اس قزاق کو صلیب کی سزا دی گئی تو گرمی بہت تھی، سڑک پر راہگیر کوئی نہ تھا، قزاق کے بیوی بچے صلیب (۱۷۱)

[1] روجر اوّل (روجر گس کارڈ) اور اس کے بھائی رابرٹ گس کارڈ نے صقلیہ کا جزیرہ مسلمانوں کے قبضہ سے نکال لیا (۱۰۶۰ء تا ۱۰۹۰ء، ۴۵۲ھ تا ۴۸۴ھ) نومبر ۱۰۶۷ء میں راجر گس کارڈ نے اپنا لقب قومس صقلیہ رکھا۔

کی لکڑی سے لگے نیچے بیٹھے رو رہے تھے، اوپر قزاق لٹکا ہوا تھا، بیوی اور بچے یہ کہہ کر رونے لگتے کہ "ہائے تمہارے مرتے ہی ہم بھی بھوکے مرجائیں گے۔" مگر واقعہ یہ ہے کہ صفرا شہب دل کا نرم تھا، اس خیال سے کہ اہل دعیال کو اب بہت تکلیف رہا کرے گی، وہ بہت فکرمند ہوا، اسی فکر میں تھا کہ ایک پھیری والا جو گاؤں گاؤں سوداگری کا مال بیچا کرتا تھا خچر پر سوار جس پر کپڑوں کے تھان اور بکری کا اور سامان لدا ہوا تھا اُدھر سے گزرا، یہ دیکھتے ہی قزاق نے صلیب پہ لٹکے ہی لٹکے تاجر سے کہا "حضرت! میں جس حال زار میں ہوں وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں، اگر آپ چاہیں تو اس وقت میری مدد کر سکتے ہیں اور اُس میں آپ کا بھی فائدہ ہو جائے گا۔" سوداگر نے کہا "جس طرح کہو حاضر ہوں" قزاق بولا "یہ سامنے والا کنواں آپ دیکھتے ہیں؟" سوداگر نے کہا "ہاں دیکھتا ہوں"۔ قزاق بولا "تو حضرت بات یہ ہے کہ جس وقت ان موذی سرہنگوں نے مجھے گرفتار کیا ہے تو اُس سے ذرا ہی پہلے میں نے اِس کنوئیں میں جو اندر سے خشک ہے، ستّو اشرفیاں ڈال دی تھیں، اگر آپ میرے حال پر رحم کر کے وہ اشرفیاں اس کنوئیں میں سے نکال دیں تو اُن میں سے آدھی آپ لے لیجئے گا، میرے بیوی بچے آپ کا خچر پکڑے کھڑے رہیں گے۔"

سوداگر کو اشرفیوں کا لالچ ہوا، فوراً اُس نے ایک رسی نکالی، اور اس کا ایک سرا کنوئیں کی مینڈھ میں باندھ کنوئیں کے اندر اُتر گیا۔

اتنا دیکھتے ہی قزاق نے اپنی بیوی سے کہا "اری جلدی کر، رسی کاٹ دے اور خچر کو لے کر بچوں سمیت جس قدر جلد ممکن ہو یہاں سے بھاگ جا۔" بیوی نے میاں کے کہنے پر عمل کیا، اب سوداگر نے کنوئیں میں چیخنا اور غل مچانا شروع کیا، لیکن آس پاس کوئی آدمی نہ تھا، کچھ دیر کے بعد ایک مسافر ادھر سے گذرا، مگر یہ اکیلا آدمی تھا اور آدمیوں کے آنے کا انتظار کرنے لگا، غرض جب آدمی آئے اور انھوں نے سوداگر کو کنوئیں سے نکالا تو کنوئیں میں جانے کا کل قصّہ سوداگر نے سب کو

سنایا، اور ہزاروں گالیاں اُس قزاق کو دینی شروع کیں جس نے اس کے ساتھ یہ فریب کیا تھا۔
یہ کل قصّہ شہر میں فوراً مشہور ہوگیا، یہاں تک کہ معتمد کے کانوں تک بھی پہنچا، معتمد نے سنتے ہی حکم دیا کہ صقرا شہب کو صلیب سے اُتار کر اسی وقت ہمارے سامنے حاضر کیا جائے چنانچہ جب قزاق قصر میں حاضر ہوا تو معتمد نے کہا "بدبخت! میرے برابر بھی کوئی سنگدل اور بدمعاش دنیا میں نہ ہوگا، کہ موت سامنے کھڑی تھی مگر تو اُس وقت بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور دھوکا اور فریب دینا اُس وقت بھی نہ بھولا" صقرا شہب نے جواب دیا "غلام کیا عرض کرے، اگر حضور کو معلوم ہوتا کہ قزاقی میں کیسے کیسے لطف ہیں تو (۶۷۲)
جہاں پناہ بھی یہ لباس شاہی اُتار کر پھینک دیتے اور کسی شاہراہ پر رہزنی کرنے تشریف لے جاتے"
معتمد نے یہ سُن کر قہقہہ لگایا اور کہا "خبیث! کیا بکتا ہے؟" اتنا فرما کر قزاق سے کہا کہ "اب معقول باتیں کرنی چاہئیں، اگر میں تیری جان بخش دوں، اور آزاد کر کے تجھے اس قابل کردوں کہ ایمانداری سے اتنی روزی پیدا کرنے لگے کہ تیری ضروریات کو کافی ہو تو اس صورت میں اس قابلِ نفریں پیشے کو ترک کر کے تو اپنی اصلاح کر سکے گا یا نہیں؟ اس کا جواب دے۔"

قزاق نے عرض کیا "جہاں پناہ! جان بڑی چیز ہے، حضور تو اصلاح کرنے کو فرماتے ہیں، میں تو جان کی خاطر اس سے بھی بدتر کام کرنے کو حاضر ہوں، جہاں پناہ اب مجھ سے کبھی قصور نہ ہوگا۔"

معتمد نے اُسے پولیس کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا، صقرا شہب اپنے قول کا پابند رہا، اور اب اُس نے اپنے پُرانے رہزن دوستوں میں وہی کھلبلی ڈال دی جو پہلے یہی دوست دیہات کے لوگوں میں ڈالا کرتے تھے۔

معتمد رنگ رلیوں میں زندگی بسر کیا کرتے تھے، اُمورِ سلطنت کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی، چنانچہ ایک نظم میں لکھتے ہیں کہ "بغیر شراب کے زندگی زندگی نہیں" اُن کا زیادہ وقت جلسوں اور ضیافتوں میں صرف ہوتا تھا، باقی وقت حرم کی حسین عورتوں کی صحبت میں گذرتا تھا، تاکہ اُن کے ساتھ لطف و محبت میں نام پیدا کریں، یہ نہ تھا کہ

رمیکیہ سے اُن کا عشق کم ہو گیا ہو، یہ عشق اُسی زور پر رہا جس زور سے شروع ہوا تھا لیکن مسلمانوں کے ملکوں میں عشق کے قواعد و قوانین کچھ عجیب ہیں، ان قوانین کی رو سے غیر عورتوں کی طرف تھوڑے دل کو توجہ ہو جانے سے بیوی کے حق میں کسی قسم کی بیوفائی نہیں ہوسکتی، گو معتمد کی طبیعت گاہے گاہے دوسری طرف مائل ہو جاتی تھی، لیکن اقلیمِ دل کی اصلی مالکہ رمیکیہ ہی تھیں، اور ایسی حرکتوں پر وہ شوہر کو خطاوار نہ سمجھتی تھیں۔

معتمد کو جن حسین عورتوں سے صحبت رہتی تھی، اُن میں امندہ نے غضب کی دلفریب صورت پائی تھی، جب کبھی معتمد اُس کا جامِ صحت پیتے تو اپنے ساغر میں دو چار پھول امندہ کے ہاتھ کے پڑے ہوئے ضرور نظر آتے، معتمد جس وقت پرانے شعراء کا کلام مطالعہ کرتے یا خود شعر کہنے بیٹھتے تو قمر ضرور پہلو میں ہوتی، اور اگر کمرے میں شعاعِ آفتاب گستاخیاں کرتی آتی تو قمر ہی بادشاہ پر سے دھوپ روکنے کھڑی ہوتی اور بادشاہ کہتا "سچ ہے چاند ہی سورج کو گہنا سکتا ہے۔"

کبھی کبھی شرمیلی، شوخ اور ہیٹلی مرغ ریطہ، جس کا پیار کا نام لوُلوُ تھا، ضدیں کرنے لگتی، اور جب کبھی اُسے زہر چڑھتا تو معتمد بڑی بڑی منتیں کر کے اُس کا غصہ دور کرتے ایک مرتبہ معتوب ہوئے تو عفوِ تقصیر کے لئے معروضہ بھیجا، مرغ ریطہ نے جواب تو دیا،

۱؎ مسلمانوں پر ڈوزی کا یہ طعن عجیب مضحکہ خیز ہے، ایسے آدمیوں کو چھوڑ کر جن کی ظاہری محبّت محض بوالہوسی اور عیاشی کیلئے ہوتی ہے۔ کوئی بھی شخص جو اپنی بیوی سے حقیقی محبّت کرنے والا اور اُس کا عاشق صادق ہو، وہ غیر عورتوں کی طرف تھوڑے نوں کے لئے متوجہ ہونا تو الگ رہا۔ کبھی انکی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کا روادار نہ ہوگا، یہی عشق کا قانون ہے اور یہی مسلمانوں کے ملکوں میں رائج ہے۔ نہ کہ وہ قانونِ عشق جو ڈوزی نے بیان کیا ہے۔ لیکن قانونِ عشق کی اس بحث کو الگ رکھتے ہوئے ہمارا خیال ہے کہ غالباً یہاں ڈوزی کو لونڈیوں کے تعلق کے متعلق دھوکہ لگا ہے، جو ایک شخص اسلامی قانون کے بموجب علی الاعلان بیوی کے علاوہ متعدد رکھ سکتا ہے، اور چونکہ مرد ایسی عورتوں کو بالعموم قیمتاً خریدتا ہے، لہٰذا وہ اُن سے عیش و آرام حاصل کرنے کا جائز حقدار بھی ہوتا ہے۔ آگے چلکر اس ضمن میں معتمد

(باقی بر صفحہ آئندہ)

لیکن نامے کی پیشانی پر اپنا نام نہ لکھا جیسا کہ دستور تھا، معتمد نے خط پڑھ کر کہا ہائے ابھی تک معافی نصیب نہیں ہوئی، دیکھو اپنا نام نہیں لکھا، جانتی ہے کہ اس نام پر جان دیتا ہوں، مگر غصّہ کو کیا کرے، سب کچھ لکھا مگر نام نہ لکھا، اُسے تو شکایت یہ رہتی ہے کہ جہاں میرا نام دیکھتے ہیں اُسے پیار کر لیتے ہیں، واللہ! میں اب نام ہی نہ لکھوں گی جو دیکھیں اور پیار کریں"۔

پھر تیمارداری میں جنیہؓ کو کمال حاصل تھا، معتمد دعائیں مانگا کرتے تھے کہ عمر بھر بیمار پڑا رہوں، تاکہ بالیں سے اس غزال کو دیکھا کروں جس کے لب یاقوت کے ہیں۔ ۶۷

لیکن ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ معتمد کے باپ معتضد اور دادا ابوالقاسم محمدؒ نے جو کام شروع کیا تھا، اس کے جاری رکھنے میں معتمد نے کسی طرح کی غفلت یا کوتاہی کی، گو ان دونوں بزرگوں کی طرح معتمد حکومت کی طمع نہ رکھتے تھے، مگر باوجود اس کے انھوں نے وہ کامیابی حاصل کی جو اُن کے دادا اور باپ کوشش بلیغ کے بعد بھی حاصل نہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کی بعض لونڈیوں کا ذکر بھی آتا ہے جس سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔

انفرادی اور ذاتی طور پر کسی شخص کے افعال سے اُسکی کل قوم یا مذہب کو قابلِ الزام ٹھہرانا یورپین مؤرخین کی مخصوص عادت ہے، مگر یہ مورخین دوسروں پر طعن و تشنیع کے تیر پھینکنے سے قبل اپنی آنکھ کا شہتیر بالکل نہیں دیکھتے، اب اسی "قانونِ عشق" کو لے لیجیے، ڈوزی کے اپنے وطن یورپ میں یہ کتنا عجیب ہے، یعنی گرجا میں تو بیوی اور خاوند ایک دوسرے سے پیمانِ الفت محکم باندھتے اور شوق کے ساتھ حلیفِ محبت اٹھاتے ہیں. مگر گرجا سے باہر نکلکر ایسے ایسے ناکردنی کام کرتے ہیں کہ عزت و عصمت بلکہ شرم کے اپنا منہ چھپا لیتی ہے اور دوسرے تیسرے ہی مہینے طلاق تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ حالانکہ وہ شادی مدتوں کی خاموش راہ و رسم اور طویل معاشقہ کے بعد عمل میں آئی تھی، اسی "قانونِ عشق" کا نتیجہ ہے کہ پچھلے دنوں شائع ہوا تھا کہ امریکہ میں ایک سال کے اندر ۹ لاکھ طلاقیں دی گئیں، پھر "قانونِ عشق" کتنا عجیب ہے کہ ناچ گھر میں اپنے تمام حیا سوز مناظر و حرکات کے ساتھ ایک دوسرے کے عین سامنے بیوی غیر مرد کیساتھ ناچ رہی ہے اور مرد عورت کے ہمراہ مشغول تفریح ہے، دراصل دونوں کی حالت پر اکبر کا یہ شعر پورے طور پر صادق آتا ہے

؎ خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں حجاب اس کو نہیں آتا، انھیں غصّہ نہیں آتا

(اسماعیل)

کو سکے تھے، خلاصہ یہ کہ جلوس کے دوسرے سال معتمد نے قرطبہ کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا یہ سچ ہے کہ قرطبہ پر قبضہ کرنے کی تدبیر معتمد کے باپ معتضد نے اپنے ہی زمانہ میں شروع کر دی تھی، حالات بھی بہت موافق پیدا ہوتے رہے، وہ یہ کہ اس زمانہ سے چھ سال پیشتر یعنی ۴۵۷ھ ۱۰۶۴ء میں قرطبہ کی جمہوری ریاست کے صدر ابوالولید بن جمہور نے مستعفی ہوکر اپنی جگہ پر اپنے دو بیٹوں یعنی عبدالرحمن اور عبدالملک کو سلطنت کے انتظام پر مقرر کرادیا تھا بڑے بیٹے عبدالرحمن کو خزانہ اور عام انتظام سپرد کیا گیا تھا، اور چھوٹے بیٹے عبدالملک کو فوج کی سپہ سالاری ملی تھی، عبدالملک جلد اپنے بھائی سے بڑھ گیا، مگر کچھ زمانہ تک وزیر ابن سقا کی وجہ سے خیریت رہی، یہ وہ صاحب تدبیر تھا جس سے قرطبہ کے چھپے اور ظاہر دونوں طرح کے دشمن بہت ڈرتے تھے، چنانچہ معتضد نے یہ سوچ رکھا تھا کہ اگر اپنا مقصد حاصل کرنا ہے تو پہلے اس وزیر کو اس کی جگہ سے ہٹانا چاہیئے۔ معتمد نے ابنِ سقا کی طرف سے عبدالملک کو بدگمان کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیابی ہوئی۔ ابنِ سقا قتل کر دیا گیا جس کا نتیجہ ریاست کے حق میں بہت مضر ہوا، اس قتل پر سلطنت کے بہت سے عہدہ داروں اور فوجی افسروں نے جو ابنِ سقا سے تعلق اور انس رکھتے تھے استعفے دیدیے، اور اب عبدالملک کی سختی اور بے پروائی نے قرطبہ کے لوگوں کو اس سے سخت متنفر کر دیا، اور جمہوری ریاست کی جو تھوڑی بہت خصوصیتیں جو اب تک چلی آتی تھیں وہ بھی مرٹ گئیں۔ جس وقت ۴۶۳ھ ۱۰۷۰ء میں ابوالحسن یحییٰ المامون ذوالنونی صاحب طلیطلہ نے قرطبہ کا محاصرہ کیا تو عبدالملک کی قوت زائل ہوچکی تھی، لشکر میں سواروں کے رسالے برائے نام رہ گئے تھے، اور جو تھے وہ بھی بھروسے کے نہ تھے۔ پس عبدالملک نے مجبور ہو کر معتمد سے مدد چاہی، معتمد نے کمک روانہ کی، اور یہ کمک ایسی زبردست تھی کہ المامون ذوالنونی کی فوجیں محاصرہ اٹھا کر واپس چلی گئیں۔ لیکن اس سے عبدالملک کو کوئی نفع نہ ہوا، کیونکہ اشبیلیہ سے جو کمک آئی تھی اسکے افسروں نے معتمد کی ہدایت کے مطابق اہل قرطبہ سے اس امر میں اتفاق کرلیا کہ عبدالملک کے ہاتھ سے کل اختیارات نکال کر قرطبہ کو سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر دیا جائے، یہ سازش ایسے خفیہ طریقہ کی گئی تھی کہ عبدالملک کو کچھ خبر نہ ہوئی اور اس کو اپنی نسبت کوئی اندیشہ یا خوف پیدا نہ ہوا، جب المامون ذوالنونی

صاحب طلیطلہ قرطبہ کا محاصرہ اٹھا کر چلا گیا تو اس کے ساتویں دن عبد الملک اپنے قصر سے نکل کر اشبیلیہ کی فوجوں کو رخصت کرنے جانے لگا۔ جنھوں نے اُسی روز اشبیلیہ کو واپسی کا قصد کیا تھا، باہر نکلنے کو تھا کہ باغیوں کی آوازیں کان میں آئیں اور دیکھا کہ قرطبہ کے باشندوں اور اشبیلیہ کی سپاہ نے جو دوست بن کر کمک پر آئی تھی، قصر کو گھیر لیا ہے، اب عبد الملک اور عبد الملک کے باپ ابو الولید ابن جہور مع اہل وعیال کے سب گرفتار کر لئے گئے۔

قرطبہ میں اب معتمد کی بادشاہی کا اعلان ہوا، اور تمام بنی جہور جزیرہ شلطیش میں قید کر دیے گئے، بڈھے ابو الولید ابن جہور نے اس واقعہ کے چالیس روز بعد انتقال کیا۔

دربار معتمد کے شاعر نے اس فتح کا حال اس طرح نظم کیا ہے کہ گویا پرانے عاشق کو اپنی حسین معشوقہ پر فتح نصیب ہوئی ہے۔

"میں نے پہلے ہی حملے میں خوبصورت قرطبہ کو حاصل کر لیا، قرطبہ وہ بہادر
عورت تھی جو ہمیشہ تلوار اور برچھی سے اُن لوگوں کو جو اُس سے شادی کرنی
چاہتے تھے دور رکھا کرتی تھی، اور اب میں اس کے قصر میں شادی رچاتا ہوں
دوسرے بادشاہ میرے نامراد رقیب روتے اور خوف سے کانپتے ہیں۔
اے نفرت کے قابل دشمنوں! تمہارا خوف سے لرزنا درست ہے،
کیونکہ کوئی دم میں شیر تم پر جست کرنے والا ہے۔"

مامون ذوالنونی صاحب طلیطلہ گو قرطبہ سے محاصرہ اٹھا کر چلا گیا تھا، مگر وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کو ناکامی ہوئی ہے، وہ ایک نہ ایک دن قرطبہ پر قبضہ کرنے کا مصمم ارادہ رکھتا تھا، چنانچہ اُس نے عیسائی بادشاہ اور فونش ششم کو ساتھ لے کر مضافات قرطبہ پر یورش کی، لیکن حاکم قرطبہ عباد نے جو معتمد اور رُمیکیہ کا فرزند تھا، مامون اور ادفونش کی فوجوں کو پسپا کر دیا۔ مامون ذوالنونی کے بعد ابن عکاشہ کو قرطبہ پر قبضہ کرنے کی ہوس دامنگیر ہوئی ابن عکاشہ بڑا ظالم اور خونخوار آدمی تھا، کسی زمانہ میں پہاڑوں پر رہ کر قزاقی کا پیشہ کر چکا تھا، لیکن بہت ہوشیار اور عقلمند انسان بھی تھا اور قرطبہ کے حالات سے بخوبی واقف

تھا، وہاں کے امورِ ملکی میں دخل رکھ چکا تھا، قرطبہ کے عمال سے، جب ایک قلعہ کا حاکم مقرر ہوا تو قرطبہ میں بغاوت پھیلانی چاہی، یہ کام کچھ مشکل بھی نہ معلوم ہوا، کیونکہ قرطبہ کے لوگوں میں حکومت کے خلاف ناراضی پہلے ہی سے ترقی پر تھی، اہلِ قرطبہ کو عباد ابن معتمد سے بہت کچھ اچھی امیدیں تھیں، لیکن عباد کی عمر ابھی اتنی نہ تھی کہ اپنی ذات سے حکومت کرتا، تمام اختیارات فوج مقیم کے افسر محمد بن مرتن کے سپرد کر رکھے تھے، ابن مرتن کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بزرگ کبھی عیسائی رہے ہوں گے، ابن مرتن گو سپاہی اچھا تھا مگر ظالم اور مفسد تھا، قرطبہ کے لوگوں کو اس سے نفرت تھی، قرطبہ میں بہت سے لوگ ایسے بھی موجود تھے جو ابن عکاشہ سے علانیہ تعلقات قائم کرنے میں مطلق تذبذب نہ رکھتے تھے، ابن عکاشہ بھی اپنی تمام تدبیروں کو پورے طور پر پوشیدہ نہ رکھ سکا، ایک افسر کو معلوم ہو گیا کہ یہ پرانا قزاق اکثر رات کے وقت قرطبہ کے دروازے پر آیا کرتا ہے، اور وہاں جو فوج مقیم ہے اس کے سپاہیوں سے ایسی باتیں کرتا ہے جن کی نسبت بہت کچھ شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

اس واقعہ کی خبر عباد حاکمِ قرطبہ کو پہنچائی گئی، عباد نے خود کچھ خیال نہ کیا، اور افسرِ فوج کو جو خبر لایا تھا محمد بن مرتن کے پاس جانے کا حکم دیا، ابن مرتن سے جب یہ واقعہ کہا گیا تو اس نے کہا کہ ہمارے ماتحت افسروں کو اطلاع دی جائے، غرض ایک نے دوسرے پر ذمہ داری ڈالنی چاہی۔ اور یہ معاملہ یونہیں رہا۔

ابن عکاشہ بہرحال ہوشیار تھا، جنوری ۱۰۷۵ء (جمادی الاول ۴۶۷ھ) میں ایک رات جبکہ اندھیرا بہت تھا، اور طوفان آیا ہوا تھا، ابن عکاشہ کو موقع مل گیا، اور اپنے لوگوں کو ساتھ لیے شہر میں اس طرح داخل ہوا کہ کسی کو خبر تک نہ ہوئی، ابن عکاشہ اور (٦٧٥)
اس کے آدمی عباد کے قصر تک آئے، اور یہ دیکھ کر کہ پہرا کچھ نہیں ہے، دروازہ توڑنے کو ہوئے، اتنے میں اندر کے دربان کو معلوم ہو گیا، اور اس نے دوڑ کر عباد کو اطلاع کی، عباد چند غلاموں اور سپاہیوں کو لے کر نکلے، اور ابن عکاشہ کا راستہ روکا، اور باوجود نوعمر ہونے کے شیر کی طرح لڑ کر اپنے کو دشمن سے بچاتے رہے، یہ امر یقینی ہے کہ انہوں نے ابن عکاشہ کے آدمیوں کو قصر کے سامنے سے ہٹا دیا، لیکن لڑنے میں پاؤں پھسلا، زمین پر

گر رے، اور گرتے ہی ایک دشمن نے کام تمام کر دیا، مقابلہ کے لیے جس وقت نکلے تھے تو نیند سے دفعتاً بیدار ہو کر نکلے تھے، کپڑے کم پہنے ہوئے تھے، لاش اسی حالت میں نیم برہنہ راستہ میں پڑی رہی۔

ابنِ عکاشہ اب اپنے ہمراہیوں کو فوجِ مقیم کے افسرِ اعلیٰ کے مکان کی طرف لے گیا، اس افسر کو خیال تک نہ تھا کہ اس وقت کوئی حملہ ہونے والا ہے، بیٹھا ناچ دیکھ رہا تھا، یہ افسر عباد کی طرح جوانمرد نہ تھا، مکان کے صحن میں تلواروں کی آواز سن کر فوراً چھپ گیا لیکن جہاں چھپا تھا، وہ مقام دشمن نے معلوم کر کے اس کو بھی قتل کر دیا۔

صبح ہوتے ہی ابنِ عکاشہ اپنے بلوائیوں کو ساتھ لیے شرفائے قرطبہ کے گھروں کا گشت لگا رہا تھا کہ اُن کو اس ہنگامہ میں اپنا شریک بنائے کہ ایک امام صاحب نے جو مسجد کو جا رہے تھے راستہ میں ایک نیم برہنہ لاش پڑی دیکھی، لاش گو خاک اور خون میں بہت آلودہ تھی، مگر انہوں نے پہچان لیا کہ عباد قتل ہوئے پڑے ہیں، امام صاحب نے اس شہزادے کی آخری خدمت یہ کی کہ جو قبا خود پہنے ہوئے تھے، اُسے اُتار کر لاش پر ڈال دیا، وہ ہٹے ہی تھے کہ ابنِ عکاشہ ایک انبوہِ کثیر کے ساتھ وہاں پہنچا اس انبوہ میں وہ لوگ بھی تھے، جو ہر ہنگامہ میں مجنونانہ طریقے سے شریک ہو جاتے ہیں، ابن عکاشہ کے حکم سے لاش سے سر کاٹ لیا گیا، اور اُسے ایک نیزے کے پھل پر لگا کر قرطبہ کے گلی کوچوں میں گشت کرانا شروع کیا، عباد کی فوج جو قرطبہ میں مقیم تھی، یہ کیفیت دیکھتے ہی ہتھیار پھینک کر بھاگی، ابنِ عکاشہ نے اب اہلِ شہر کو جامع مسجد میں جمع کیا، اور اُن سے کہا کہ مامون صاحبِ طلیطلہ کی بیعت قبول کر لیں، گو حاضرین میں بہت لوگ ایسے تھے جو معتمد بادشاہِ اشبیلیہ کے دل سے ہوا خواہ تھے، لیکن سب پر خوف ایسا طاری تھا کہ ابنِ عکاشہ کا حکم مان لیا۔

چند روز کے بعد المامون ذوالنونی صاحبِ طلیطلہ خود قرطبہ میں آیا، اور ابن عکاشہ کی بجد شکر گذاری ظاہر کی، اور کثیر انعام اور خلعتِ فاخرہ دے کر ظاہر کیا کہ ابنِ عکاشہ پر اُس کو پورا بھروسہ اور اعتماد ہے، لیکن المامون دل میں اس پر لئے رہزن سے ڈرتا تھا

جو جرائم کرتے کرتے بالکل سنگدل ہوگیا تھا، ماموں سمجھتا تھا کہ اگر ضرورت ہوئی تو ابنِ عکاشہ اُس کو بھی عباد کی طرح پیوندِ خاک بنا دیگا۔

غرض ماموں اس فکر میں ہوا کہ کسی حیلے سے اپنی حکومت کو اس خطرناک آدمی سے محفوظ رکھے، ماموں نے اپنے اس خیال کو درباریوں سے پوشیدہ نہ رکھا، چنانچہ ایک دن ابنِ عکاشہ، ماموں کے دربار سے جانے لگا تو ماموں نے ایک آہِ سرد بھر کر، اور غصہ سے منہ لال کرکے بے اختیار ایسے الفاظ منہ سے نکالے جن سے بُرا شگون نکلتا تھا، اِس کے کچھ
۶۷۶ر دنوں بعد ابنِ عکاشہ کے ایک دوست نے ابن عکاشہ کی نسبت ماموں کے سامنے کچھ اچھے الفاظ کہے تو ماموں نے کہا "بس خاموش رہو، جس شخص کو بادشاہوں کی جان لینے میں دریغ نہ ہو، وہ بادشاہوں کی خدمت میں رہنے کے قابل نہیں سمجھا جا سکتا"

قرطبہ میں ابوالحسن یحییٰ المامون ذوالنونی والی طلیطلہ کو آئے ہوئے چھٹا مہینہ تھا (جون ۱۰۷۵ء مطابق شوال ۴۶۷ھ) کہ اس کا انتقال ہوگیا، درباریوں میں سے ایک شخص کی نسبت شبہ ہوا کہ ماموں کو اس نے ہلاک کیا ہے، اگر ماموں فی الواقع ہلاک کیا گیا تھا تو اس بات کا باور کرنا مشکل نہ ہوگا کہ ابن عکاشہ بھی اِس جرم میں شریک تھا۔

اشبیلیہ میں جب اِس دوگونہ مصیبت کی خبر پہنچی کہ قرطبہ بھی ہاتھ سے گیا اور شہزادہ عباد بھی مارا گیا، تو معتمد کے رنج والم کی انتہا نہ رہی، عباد، معتمد کا سب سے پہلا بچہ تھا اور اس کو وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا، لیکن معتمد کی شرافت دیکھیئے کہ اُس کو تو نہ بیٹے کے مرنے کا اتنا رنج تھا، اور نہ دشمن کے انتقام لینے کا اتنا خیال تھا، جس قدر کہ اُس شخص کے احسان کا دل پر اثر تھا جس نے اُس کے لختِ جگر کی برہنہ لاش پر اپنے گلے سے قبا اُتار کر ڈال دی تھی، معتمد کو اس کا سخت صدمہ تھا کہ اس محسن کا احسان نہیں اتار سکتا، تھا کیونکہ اُس کے نام تک کا علم نہ تھا، معتمد بار بار ایک قدیم شاعر کا شعر جو ایسے ہی ایک موقع پر لکھا گیا تھا پڑھتا تھا:-

"افسوس! جس شخص نے اپنی قبا سے میرے فرزند کی لاش کو ڈھکا تھا گو میں
اُسے نہیں جانتا، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ ایک شریف اور فیاض انسان تھا"

تین برس تک معتمد کی کوششیں کہ قرطبہ پر پھر قبضہ حاصل ہو، اور وہ بیٹے کے قتل کا انتقام لے ناکام ثابت ہوتی رہیں، لیکن آخر کار ۱۰۷۰ء عیسوی کے ماہ ستمبر کی چوتھی تاریخ سہ شنبہ کو (۲۳ ماہ صفر ۴۶۲ھ) معتمد کی فوج نے قرطبہ کو حملہ کر کے دشمن سے چھین لیا، معتمد شہر کے ایک دروازے سے داخل ہوئے اور ابن عکاشہ دوسرے دروازے سے بھاگا، معتمد کے سواروں نے اس کا تعاقب کیا اور آخر کار اُسے گھیر لیا، ابن عکاشہ نے یہ سمجھ کر کہ جس کے بیٹے کو قتل کیا ہو، اُس سے رحم کی امید فضول ہوگی، بہت لوگوں کی جان لے کر اپنی جان دینے کا ارادہ کر لیا، اور دشمن میں ایک جنگلی بجار کی طرح گھس پڑا، لیکن معتمد کے آدمیوں کی تعداد زیادہ تھی، اُنہوں نے ابن عکاشہ کو قتل کر دیا، معتمد کے حکم سے اُس کی لاش صلیب پر ایک کُتے کی لاش کے ساتھ لٹکائی گئی، اور قرطبہ کی فتح کے بعد ریاست طلیطلہ کا وہ کل علاقہ جو وادی الکبیر اور وادی آنہ کے درمیان پڑتا تھا معتمد کی قلمرو میں شامل کر لیا گیا۔

معتمد کو اگرچہ شاندار فتوحات حاصل ہوئیں، لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا اندلس کے ملوک الطوائف میں معتمد ایک زبردست بادشاہ تھا، لیکن انہی ملوک الطوائف کی طرح وہ بھی ایک عیسائی ریاست کا باجگذار ہو گیا تھا، پہلے بادشاہِ جلیقیہ غرسیہ کو جو فرڈلنڈ کا تیسرا بیٹا تھا خراج ادا کیا لیا، اور پھر ادفونش ششم کو جس وقت وہ اپنے دو بھائیوں شانجہ اور غرسیہ کی ریاستوں کا مالک ہو کر بادشاہ ہوا، خراج دیا گیا، خراج کے معاملہ میں ادفونش بڑا ہی زشت خو، اور بدمزاج بادشاہ تھا، ملوک الطوائف سے سالانہ خراج لینے کو کافی نہ سمجھا، بار بار عربی ریاستوں پر قبضہ کرنے کی دھمکی دیتا رہا۔ ایک مرتبہ اُس نے ریاست اشبیلیہ کے علاقے پر بہت بڑا لشکر لے کر حملہ کیا، مسلمان ڈرے لیکن ان میں اتنی قوت نہ رہی تھی کہ دشمن کا مقابلہ کر سکتے، مگر وزیر اعظم ابن عمار مطلق نہ ۶۷۷ گھبرایا، اشبیلیہ کی فوج پر اُسے بالکل بھروسہ نہ تھا، اور اس فوج کو عیسائیوں کے مقابلہ پر لانا مفت میں جان گنوانا سمجھتا تھا، ادفونش سے وہ خوب واقف تھا، کئی بار اُس کے دربار میں حاضر ہو چکا تھا، اور جانتا تھا کہ یہ عیسائی بادشاہ گو بڑا لالچی ہے، لیکن اگر کوئی

شخص اُس کے مذاق اور مزاج سے واقف ہو جائے تو پھر ایک عرب بادشاہ کی طرح اس عیسائی فرمانروا پر قابو پا جانا بالکل آسان ہے

غرض اَدفونش کی اس کمزوری سے ابن عمار نے نفع حاصل کرنا چاہا، لڑ کر مقابلہ کرنے کی جگہ اس وزیر نے حکم دیا کہ فلاں شطرنج نکلوائی جائے، یہ شطرنج صنعت میں ایسی عجیب و غریب تھی کہ اُس کی مثل کسی اور بادشاہ کے ہاں نہ تھی، اُس کے مہرے آبنوس اور صندل کے تھے. جن پر سونے کا کام ہو رہا تھا، جب یہ شطرنج نکالی گئی تو ابنِ عمار کسی بہانے سے اَدفونش کے لشکر میں پہنچا، بادشاہ نے اُس کی خاطر و مدارات کی، کیونکہ ابنِ عمار اُن مسلمانوں میں سے تھا جن کی اَدفونش بہت قدر کرتا تھا، ایک دن ابنِ عمار نے قشتالیہ کے ایک رئیس کو جو اَدفونش کے مقربوں میں تھا وہ شطرنج دکھائی، اُس رئیس نے اَدفونش سے اس کا ذکر کیا، اَدفونش نے ابنِ عمار سے پُوچھا کہ "کیا تمہیں شطرنج کھیلنے کا شوق ہے"؟ ابن عمار بولے "میرے بعض احباب کا خیال ہے کہ میں شطرنج اچھی کھیلتا ہوں" پھر بادشاہ نے کہا "سُنتا ہوں کہ تمہارے پاس ایک بہت ہی خوبصورت شطرنج ہے"

ابن عمار۔ یہ درست ہے۔

بادشاہ۔ کیا تم اُسے دکھا سکتے ہو؟

ابنِ عمار۔ یقیناً۔ مگر ایک شرط کے ساتھ، وہ یہ کہ میں اور آپ ایک بازی کھیلیں اگر آپ جیت جائیں تو شطرنج آپ کی، اور اگر میں جیتوں تو جو مانگوں سو ملے۔

اَدفونش۔ اچھا منظور۔

اِس کہنے پر شطرنج منگوائی گئی، بادشاہ اُس کی خوبصورتی اور عمدہ صنعت کو دیکھ کر اس قدر متحیر ہوا کہ فوراً نشانِ صلیب اپنے سینے پر بنایا اور کہا "واہ کیا کمال کیا ہے، کبھی وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ شطرنج ایسی خوبصورت بن سکتی ہے" کچھ دیر تک اُسے دیکھنے کے بعد کہنے لگا "ابنِ عمار! تم نے کیا شرط کی تھی؟" ابنِ عمار نے پھر شرط بیان کی اس پر اَدفونش نے کہا "میں شرط میں کوئی بات ایسی قبول نہ کروں گا جس کا علم مجھے پہلے سے نہ ہو جائے، ممکن ہے جیتنے کے بعد تم کوئی درخواست ایسی کرو جسے میں منظور نہ کر سکوں"

ابنِ عمار نے جواب دیا "پھر جیسی حضور کی مرضی ہو"

یہ کہہ کر نوکروں کو حکم دیا کہ "شطرنج یہاں سے لائی گئی ہے، وہیں پہنچادی جائے"

ملاقات ختم ہوئی، مگر ابنِ عمار ہمت ہارنے والا آدمی نہ تھا۔ اُس نے چند قشتالی رئیسوں کو جو ادفونش کے ساتھ تھے، بہت خفیہ طور پر بتا دیا کہ بازی جیتنے پر وہ بادشاہ سے کیا چیز طلب کرے گا۔ اُس نے ان رئیسوں سے یہ بھی کہا کہ اگر اس کام میں اُنہوں نے مدد کی تو بہت روپیہ دیا جائے گا، عیسائی رئیسوں کو روپے کی طمع تو تھی ہی، جب اُن کو یقین ہو گیا کہ ابن عمار کیا چیز مانگنے والا ہے، تو اُنہوں نے مدد کرنے کا وعدہ کر لیا،

ادفونش پہلے ہی شطرنج دیکھ کر اُس پر ایسا فریفتہ ہوا تھا کہ کسی نہ کسی طرح اُسے حاصل کرنا چاہتا تھا، مگر اپنے درباریوں سے اس بارے میں مشورہ کرنا بھی ضروری سمجھا، اُن کو ابن عمار نے پہلے ہی درست کر رکھا تھا، چنانچہ ادفونش نے جب اُن سے مشورہ کیا تو اُنہوں نے عرض کیا کہ "اگر حضور جیت گئے تو ایک ایسی نایاب چیز ہاتھ لگتی ہے جسے دیکھ کر کون سا بادشاہ ہے جو رشک نہ کرے گا، اور اگر ہار گئے، تو یہ عرب آخر کار کچھ مانگے گا بھی تو کیا مانگے گا۔ اگر اُس نے کوئی درخواست حد سے متجاوز کی تو پھر ہم اُس کو اور ہر طرح پر سمجھانے کو تیار ہیں۔"

ادفونش نے اپنے مشیروں کی بات مان لی، اور ابن عمار کو مع شطرنج طلب کر کے کہا "مجھے شرط قبول ہے، آؤ ایک بازی ابھی کھیلیں" ابن عمار نے کہا "بہت مناسب لیکن حضور شرط کا خیال رکھیں، اور چند گواہ بھی حاضر رہیں تو اچھا ہو" ادفونش نے یہ بات بھی منظور کر لی، اور جب قشتالیہ کے وہی رئیس جن سے پہلے ابن عمار کی گفتگو ہو چکی تھی بطور گواہ حاضر ہو گئے تو بازی شروع ہوئی، ادفونش ہار گیا۔

ابن عمار نے بادشاہ سے عرض کیا "اب مجھے حق حاصل ہو گیا ہے کہ جو چاہوں سو مانگوں" ادفونش نے کہا "مانگو، کیا مانگتے ہو؟" ابن عمار نے فوراً کہا "میں جو کچھ مانگتا ہوں، وہ صرف یہ ہے کہ آپ اپنا لشکر یہاں سے اُٹھا کر اپنے ملک کو واپس چلے جائیں"

اتنا سنتے ہی ادفونش کا رنگ فق ہو گیا، کبھی اُٹھ کر کمرے میں ٹہلتا، کبھی بیٹھ جاتا اور پھر کرسی سے اُچھل کر کھڑا ہو جاتا، اور ٹہلتا، تھوڑی دیر کے بعد دربار کے رئیسوں سے

مخاطب ہوا اور کہنے لگا "تم نے دیکھا کہ مجھے کس طرح دھوکا دیا ہے اور تم سب اس دھوکے کا باعث ہوئے ہو، میں خوب سمجھتا تھا کہ ایسی ہی کوئی درخواست یہ عرب کرے گا، مگر تم لوگوں نے اطمینان دلایا اور میں شرط قبول کرنے پر راضی ہو گیا اور اب تمہارے مشورہ کا کڑوا پھل مجھے چکھنا پڑا۔" پھر کچھ دیر چپ رہ کر بادشاہ نے کہا "مگر میں شرط پوری ہی کیوں کروں؟ کوئی میرا کیا کر سکتا ہے؟ بس سن لو، ہم فوج کشی جاری رکھیں گے۔" قشتالی رئیسوں نے کہا "حضور یہ عہد شکنی ہو گی، آپ مسیحی بادشاہوں میں سب سے زبردست بادشاہ ہیں، حضور اپنے قول سے پھرنا کیوں کر گوارا فرما سکتے ہیں؟"

اوفونش خاموش ہو کر پھر غور کرنے لگا اور آخر کار بولا "اچھا میں اپنے قول کا پابند ہوں، لیکن اس ہارنے کے بدلے ہم اس سال کا خراج دوچند وصول کریں گے۔"

ابن عمار نے کہا "خراج دوچند آپ کو ملے گا۔"

یہ کہہ کر ابن عمار سے جس قدر روپیہ اوفونش نے طلب کیا، اس کے ادا کئے جانے کا بندوبست کر دیا اور اس طرح اشبیلیہ اس دانشمند وزیر کی ہوشیاری اور تدبیر سے ایک زبردست غنیم کے خطروں سے محفوظ ہو گیا۔[1]

---

[1] سنہ ۱۴۶۶ء (۸۷۱ھ) میں ابو عبداللہ الزغل نے بھی عیسائی حاکم لورقہ پیڈرو فیجاردو سے شطرنج پر بازی لگائی تھی، بازی میں المریہ اور لورقہ کے علاقے لگائے گئے تھے، ابو عبداللہ بازی جیت گیا۔ مگر پیڈرو فیجاردو نے بے ایمانی سے کام لے کر ان متذکرۂ بالا علاقوں پر ابو عبداللہ الزغل کا قبضہ نہ ہونے دیا۔

اسناد:-

عباد (ڈوزی) جلد ۱ ص ۴۶ تا ۴۸، ۳۲۲ تا ۳۲۴، ۳۸۸، ۳۹۱ تا ۳۹۲

جلد ۲ ص ۱۶، ۳۰، ۳۵، ۸۹، ۱۴۶، ۱۴۸، ۲۲۲، ۲۲۴ تا ۲۲۵

عبدالواحد ص ۷۲ تا ۷۳، ۸۳ تا ۸۵، ۹۰

ابنِ خلدون ص ۲۵

ابنِ بسّام جلد ۱ ص ۱۵۸ تا ۱۶۰ (ابنِ حیان کی عبارت نقل ہے)

ابن القصیرہ (ابن الخطیب، قلمی نسخہ ۲ ص ۵۱)

لوکاس دی توی ص ۱۰۰

کردنیکون کمپلوٹنسی ص ۳۲۷

کتاب رابع

ملوک الطوائف

گیارھویں فصل

ابنِ عمّار کی تباہی

ابنِ عمّار نے اشبیلیہ کی سلطنت کو مضبوط و مستحکم کرنا ہی کافی نہ سمجھا، بلکہ اس کی حدُود کو وسعت دینے کی بھی فکر کی اور مُرسیہ کی ریاست پر خاص طور سے دانت جمانا چاہا، کسی زمانہ میں یہ ریاست عمید الدولہ ابوالقاسم زہیر العامری کی قلمرو میں شامل تھی، اس کے بعد وہ سلطنتِ بلنسیہ میں شامل کرلی گئی تھی، لیکن جس زمانہ کا ہم ذکر کرتے ہیں اس وقت وہ ایک خود مختار حکومت تھی اور وہاں کا فرمانروا عرب کے قبیلۂ قیس کا ایک شخص ابوعبدالرحمٰن ابنِ طاہر تھا، یہ بڑا دولت مند تھا، مرسیہ کا تقریباً آدھا علاقہ اُس کی ذاتی جائداد تھا، بڑا عاقل اور روشن ضمیر تھا، لیکن فوج کم رکھنے کی وجہ سے ہر دشمن کا آسانی سے نشانہ بن سکتا تھا، ابن عمار پر یہ حال کھل گیا تھا اور اب کسی وجہ سے جس کا کسی کو پتہ نہ تھا، ابنِ عمّار کو والیٔ برشلونہ ریمنڈ برنگر کے دربار میں جانے کی ضرورت ہوئی، اور ۴۷۱ھ ۱۰۷۸ء میں برشلونہ جاتے ہوئے مُرسیہ

سے گذرنا پڑا، مرسیہ پہنچ کر ابنِ عمار نے اُن رئیسوں سے تعلقات پیدا کئے، جو ابنِ طاہر سے ناراض تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ کوئی روپیہ دے تو اس کی تباہی میں کوشش کریں۔

غرض مرسیہ میں قیام کے بعد جب وزیر ابنِ عمار رفسلونہ پہنچا تو رمنید کو دس ہزار اشرفیاں دینے کا اس شرط سے وعدہ کیا کہ وہ مرسیہ کو فتح کرنے میں مدد دے، رمنید نے مدد دینی منظور کی اور اس کے متعلق باہمی عہد و پیمان بھی ہوگیا، رمنید نے ایفائے عہد کی ضمانت میں اپنی طرف سے اپنے بھتیجے کو ابنِ عمار کے حوالے کر دیا اور ابنِ عمار نے رمنید سے یہ شرط کرلی کہ اگر دس ہزار اشرفیاں تاریخ معینہ پر نہ پہنچیں تو رمنید معتمد کے بیٹے رشید کو اپنی حراست میں بطور یرغمال کے لے سکتا ہے۔

ابنِ عمار نے معتمد کو اس کل معاملہ کی اطلاع کی، لیکن اس آخری شرط کی خبر نہ دی کہ اشرفیاں وقت پر نہ پہنچنے کی صورت میں رشید حراست میں لے لیا جائے گا، وجہ یہ تھی کہ ابنِ عمار کو پورا یقین تھا کہ اشرفیاں وقت پر مل جائیں گی اور رشید ابنِ معتمد کو حراست میں جانے کی نوبت نہ آئے گی۔

اب اشبیلیہ کی فوجوں نے رمنید کی فوجوں کے ساتھ مل کر مرسیہ کے علاقے پر چڑھائی کی، معتمد کے مزاج میں کاہلی تھی، رمنید کو دس ہزار اشرفیاں ملنے کی تاریخ ٹل گئی۔ رمنید کو شبہ ہوا کہ ابنِ عمار نے دھوکا دیا۔ اس پر اُس نے فوراً ابنِ عمار اور رشید کو گرفتار کر لیا، اشبیلیہ کی فوج والوں نے چاہا کہ اپنے وزیر اور شہزادے کو چھڑالیں، لیکن کچھ نہ کرسکے اور خود پیچھے ہٹنا پڑا۔

معتمد اس وقت اشبیلیہ سے اُٹھ کر مرسیہ آرہا تھا، اور رمنید کا بھتیجا اُس کے ساتھ تھا، منزلیں آہستہ طے کر رہا تھا، جب وادیانہ صغیر کے کنارے پہنچا تو دریا طغیانی پر تھا اُسے عبور نہ کرسکا، دریا کے کنارے ٹھیرا ہوا تھا کہ ایک روز فوجِ اشبیلیہ کے چند سپاہی جو ابنِ عمار کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، دریا کے دوسرے کنارے پر نظر آئے، ان میں دو سوار وہ تھے، جن کو ابنِ عمار نے معتمد کو حالات سے مطلع کرنے بھیجا تھا، ان

سواروں نے معتمد کو دیکھ کر اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیے اور جب اس پار آئے تو معتمد سے جس قدر افسوس ناک واقعات پیش آئے تھے، بیان کیے اور یہ بھی کہا کہ ابنِ عمار قید سے جلد آزاد ہو جائے گا۔ انہوں نے معتمد سے التجا کی کہ "حضور جہاں مقیم ہیں وہیں رہیں"۔ معتمد نے اُن کی یہ بات نہ مانی، آگے تو بڑھا، لیکن مشرق میں جیان کی طرف ہٹ آیا، بیٹے کے قید ہو جانے کی خبر نے پریشان کر دیا، ریمند کا بھتیجا جو ریمند نے ابنِ عمار کو بطورِ یرغمال کے سپرد کیا تھا، اس وقت معتمد کے ساتھ تھا، معتمد نے یہ سُن کر کہ اپنا فرزند قید ہو گیا ہے۔ ریمند کے بھتیجے کو بھی قید کر دیا۔

اِس واقعہ کے دس روز بعد ابنِ عمار جنہیں ریمند نے قید سے آزاد کر دیا تھا، جیان کے قریب پہنچے، لیکن معتمد سے ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ سامنے حاضر نہ ہوئے، اور یہ اشعار بادشاہ کی خدمت میں لکھ کر بھیجے:۔

میں اپنے دل کا کہا مانوں یا ساتھ والوں کی بات کا، جو تدبیر خود سوچی ہے اُس پر چلوں، یا جہاں اس وقت ہوں، مع اپنے ہمراہیوں کے وہیں ٹھیرا رہوں، دل کا کہنا مانتا ہوں تو آگے بڑھتا ہوں اور اُمید ہوتی ہے کہ میرا حبیب کیسے ہاتھ پھیلا کر ملے گا، لیکن عقل جو کچھ بتاتی ہے، اُس سے میرے قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں محبت کہتی ہے "آگے چل"، اپنی غلطیاں کہتی ہیں "پیچھے ہٹ" قسمت کی باتیں بھی عجیب ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ آپ کی دوری مجھے خوش رکھے گی، مجھے اب آپ سے خوف معلوم ہوتا ہے، کیونکہ آپ میری جان لے سکتے ہیں، مجھے آپ پر اعتبار ہے کیونکہ آپ سے دلی محبت رکھتا ہوں، اُس پر رحم کیجیے جس کی محبت کو آپ جانتے ہیں کہ کبھی نہ بدلے گی اور جس کا سب سے بڑا حق آپ پر یہ ہے کہ آپ سے محبت رکھتا ہے میں نے کوئی بات ایسی نہیں کی ہے کہ حاسد میری گرفت کر سکیں، میری طرف سے نہ غفلت ہوئی ہے اور نہ بے احتیاطی، لیکن آپ نے مجھے سخت مصیبت میں گرفتار کر دیا ہے، میری تلوار آپ نے کند کر دی ہے بلکہ اُسے توڑ ڈالا ہے، سچ

یہ ہے کہ اگر میں آپ کی بے شمار مہربانیوں کو جو مجھ پر ہمیشہ اس طرح رہی ہیں۔ جیسے درختوں پر بارانِ رحمت برستا ہے، یاد نہ کرتا ہوتا، تو کبھی تکلیف اور مصیبت کے خیالات مجھے نہ ستاتے اور میں یہ نہ کہتا کہ قصور میرا ہے، اب میں آپ کے قدموں پر سر رکھ کر رحم کا خواستگار اور عفوِ تقصیر کا امیدوار ہوں لیکن اگر آپ کے قہر و عتاب کی بادِ شمال بھی میرے غارت کرنے کو اُٹھے گی تو بھی کہوں گا کہ نسیمِ رُوح پرور کے جھونکے دل کو راحت دے رہے ہیں"۔

معتمد، جسے اتنا خیال ضرور ہوگا کہ دراصل غلطی اپنی تھی، ابنِ عمار کی اس التجا اور درخواست کو نامنظور نہ کر سکا، اور جواب لکھا:۔

"آؤ! ایک مرتبہ پھر میرے قریب بیٹھو، آؤ! ڈرو نہیں، کیونکہ زجر و توبیخ نہیں بلکہ قدر و منزلت تمہاری منتظر ہے، سمجھ لو کہ مجھے تم سے اتنی محبت ہے کہ تمہاری کسی تکلیف کو نہیں دیکھ سکتا، تمہیں خوش دیکھوں، اس سے زیادہ میری کوئی خوشی نہیں، جب تم آؤ گے تو دیکھو گے کہ میں بدستور خطا واروں کو معاف اور دوستوں کے ساتھ سلوک اور مہربانی کرنے والا آدمی ہوں، میں تمہارے ساتھ اُسی لطف و کرم سے پیش آؤں گا جیسا کہ ہمیشہ پیش آتا تھا، میں تمہارا قصور معاف کر دوں گا، بشرطیکہ کوئی قصور نکلا، کیونکہ خدا نے مجھے دل سخت نہیں دیا ہے اور سچی اور پرانی دوستی کو بھول جانا میری عادت میں شامل نہیں ہے"۔

معتمد کے ان الفاظ سے ابنِ عمار کو تسکین ہوئی اور وہ بہت جلد آقا کی قدم بوسی ۶۸
کو حاضر ہوا، اور اب دونوں دوستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ریمنڈ والیِ برشلونہ کو دس ہزار اشرفیاں دے دی جائیں اور اُس کے بھتیجے کو آزاد کرنے کا وعدہ کیا جائے تاکہ ریمنڈ، رشید کو قید سے آزاد کر دے، لیکن ریمنڈ اب بجائے دس ہزار کی رقم قرار داد کے تیس ہزار اشرفیاں مانگنے لگا، معتمد کے پاس اس وقت روپیہ زیادہ نہ تھا، اس لئے کھوٹ ملوا کر ٹکسال سے اشرفیاں تیار کر دیں، رشید کو آزاد کرنے سے پہلے ریمنڈ کو یہ قصہ معلوم نہ ہوا۔

باوجودیکہ مرسیہ پر پہلی بار قطعی ناکامی ہوئی تھی، مگر مرسیہ کو فتح کرنے کا خیال ابنِ عمار کے دل سے نہ نکلا، معتمد اشبیلیہ میں تھا کہ ابنِ عمار نے اُس سے عرض کیا کہ "مرسیہ کے بعض اُمراء کے بہت امید افزا خطوط اُس کے پاس آئے ہیں، مرسیہ کا قصد پھر کیا جائے۔"
غرض ابنِ عمار نے معتمد کو اس بات پر راضی کر لیا کہ صرف اشبیلیہ کی فوجوں سے شہر مرسیہ کا محاصرہ کر لیا جائے۔

مرسیہ کے قصد سے اشبیلیہ سے روانہ ہو کر وہ جب قرطبہ میں آیا تو ۲۴ گھنٹے وہاں قیام کیا، غرض یہ تھی کہ قرطبہ میں سواروں کے رسالے جس قدر دستیاب ہو سکیں انہیں اپنے لشکر کے ساتھ کر لے، اُس وقت قرطبہ کا حاکم معتمد کا فرزند فتح تھا، شب کو ابنِ عمار نے فتح کے پاس قیام کیا، فتح کی ظرافت اور شیریں کلامی پر ابنِ عمار ایسا فریفتہ ہوا کہ جب ایک خواجہ سرا نے آکر اطلاع کی کہ صبح ہوگئی ہے تو ابنِ عمار نے یہ شعر پڑھا۔

"دُور ہو احمق! میرے لئے تو یہ تمام رات صبح تھی، جب فتح میرے ساتھ ہو، تو اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔"

قرطبہ سے نکل کر ابنِ عمار ایک قلعے کے قریب پہنچا، جس کا نام بلج بن بشر کے نام پر اب تک قلعہ بلج[1] مشہور تھا، بلج بن بشر دُوسری صدی ہجری میں شامی عربوں کا جو افریقہ میں بربر سے ہزیمت اُٹھا کر اندلس میں وارد ہوئے تھے، سردار تھا، اس زمانہ میں بھی بلج ہی کے قبیلہ قشیر کا ایک شخص اِس قلعہ کا حاکم تھا، اس کا نام ابنِ رشیق تھا ابنِ رشیق نے جب سُنا کہ وزیر ابنِ عمار آرہا ہے، تو قلعہ سے اُس کی ملاقات کو نکلا اور درخواست کی کہ شب کو قلعہ میں آرام فرمائیں، ابنِ عمار نے ابنِ رشیق کی درخواست منظور کی، ابنِ رشیق نے اس معزز مہمان کی خاطر و مدارات میں کوئی بات ایسی فروگذاشت نہ کی کہ ابنِ عمار کے دل میں ابنِ رشیق کی عزت و وقعت کا پایہ بلند نہ ہوتا، اس مہمانداری میں قلعہ بلج کے حاکم کو ضرورت سے زیادہ کامیابی ہوئی، یعنی ابنِ عمار نے اُسے اپنا رازدار

---

[1] یہ غالباً وہی مقام ہے جسے آج کل ویلیئر ردیو کہتے ہیں۔ (مترجم اردو)

بنا لیا، لیکن ابنِ رشیق کو رازدار بنانا آگے چل کر ایک سخت غلطی ثابت ہوا۔

اب ابنِ عمار ابنِ رشیق کو ساتھ لئے ہوئے شہر مرسیہ کے محاصرے کو چلا، راستہ میں حصن مولہ کے لوگوں نے اطاعت قبول کی، شہر مولہ کے مفتوح و مطیع ہو جانے سے مرسیہ کے لوگوں کو سخت نقصان پہنچا، کیونکہ مرسیہ میں رسد کا سامان اسی شہر سے پہنچا کرتا تھا۔

اب مرسیہ کا محاصرہ شروع کیا گیا، ابنِ عمار کو یقین ہو گیا کہ شہر والے جلد اطاعت قبول کر لیں گے، چنانچہ محاصرہ پر ابنِ رشیق کو چھوڑ کر اور کچھ فوج سوارہ متعین کر کے ابنِ عمار باقی فوج لے کر اشبیلیہ واپس چلا آیا۔

اشبیلیہ پہنچ کر ابنِ رشیق کے پاس سے اس مضمون کے خطوط آئے کہ "مرسیہ قحط سے (۶۸۲
تباہ ہو رہا ہے اور عمائدِ شہر نے بڑی بڑی تنخواہوں کے وعدے پر ہماری مدد کرنی منظور کر لی ہے"۔

ان خطوط کو پڑھ کر ابنِ عمار نے کہا "شاید کل یا پرسوں تک سننے میں آئے کہ مرسیہ نے ہماری اطاعت قبول کر لی ہے"۔

ابنِ عمار کا خیال درست نکلا، محاصرے کی حالت میں کسی نمک حرام نے مرسیہ کے دروازے اندر سے کھول دیئے، ابنِ رشیق شہر میں داخل ہوا اور ابنِ طاہر رئیسِ شہر کو قید کر کے اہلِ شہر سے معتمد کی بیعت لی۔

ابنِ عمار نے جب یہ مژدہ سنا کہ مرسیہ فتح ہو گیا، تو معتمد سے اجازت مانگی کہ اس جدید مفتوح شہر کا جا کر معائنہ کرے، معتمد نے بلا تامل اجازت دے دی، اب ابنِ عمار نے اس خیال سے کہ اہلِ مرسیہ میں خوب داد و دہش کروں گا، شاہی اصطبل سے بہت سے گھوڑے اور خچر اور دوستوں سے سواری کے جانور جو تعداد میں تقریباً دو سو تھے اپنے ساتھ لئے اور ان سب پر نہایت قیمتی پارچہ جات کی گٹھریاں رکھیں اور اپنا پرچم اڑاتا ہوا طبل و دہل کے ساتھ مرسیہ روانہ ہوا جس شہر سے گذرا وہاں کے خزانے میں روپیہ خوب بھر دیا، مرسیہ میں پورے جلوس کے ساتھ بڑی شان سے داخل ہوا، دوسرے دن دربار کیا اور اس میں شاہانہ انداز اختیار کئے اور اسی قسم کی اونچی ٹوپی پہنتی، جو

معتمد دربار کے موقعوں پر پہنا کرتا تھا، عرضیاں جس قدر پیش ہوئیں اُن پر حکم لکھا "ایسا ہونا چاہیئے، انشاء اللہ" لیکن معتمد کا نام نہ لکھا۔

اس قسم کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ ابنِ عمار اپنے آقا سے منحرف ہے، کم سے کم معتمد کو تو یہی خیال پیدا ہوا، لیکن معتمد کو ان حرکتوں پر غصّہ نہ آیا، بلکہ افسوس اور مایوسی ہوئی، ابنِ عمار کی دوستی کا نقش جو ۲۵ برس سے نظر کے سامنے تھا یک لخت محو ہوگیا، معتمد سمجھا کہ دل کی صداؤں نے اب تک دھوکے میں رکھا، وزیر ابنِ عمار کے دعوے دوستی اور جاں نثاری کے سب جھوٹے اور باطل تھے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وزیر کا اِتنا قصور نہ تھا، جتنا کہ معتمد نے سمجھ لیا تھا، یہ سچ ہے کہ ابنِ عمار کی نمود و نخوت تمسخر کی حد تک پہنچ گئی تھی، لیکن یہ امر یقینی نہ تھا کہ وہ اپنے آقا اور محسن سے باغی یا اُس کا دشمن اور بدخواہ ہوگیا ہے، ابنِ عمار میں حدّتِ نفس اور کسی نقش سے جلد تر متاثر ہو جانے کا مادہ معتمد سے بہت کم تھا، اس وجہ سے وہ معتمد کی دوستی اور خلوص کا پورا بدل نہ کر سکا، مگر پھر بھی اُس کو اپنے آقا سے واقعی محبّت تھی جس کا ثبوت اُس کے اشعار سے ملتا ہے، معتمد نے جب اُس کی ان حرکتوں کو ناپسند کرکے اُس کو بہت بُرا بھلا لکھا تو ابنِ عمار نے جواب میں یہ اشعار لکھے:-

"آپ فرماتے ہیں کہ حوادثِ تقدیر نے مجھے بدل دیا، نہیں جب آپ یہ فرماتے ہیں تو خود ایک دھوکے میں پڑ جاتے ہیں، مجھ کو اپنی بڑھیا ماں سے جو محبت ہے، وہ اُس محبت سے کم ہے جو آپ کے ساتھ ہے، میرے محبِ معظّم یہ کیا معاملہ ہے کہ آپ کی محبّت آمیز عنایات میرے بختِ سیاہ کو اب اس طرح روشن نہیں کرتیں، جس طرح بجلیاں کوندکر شبِ تاریک کو روشن کیا کرتی ہیں؟ کیا سبب ہے کہ اب ایک لفظ بھی آپ کی زبان سے نسیمِ جاں بخش کی طرح میرے دل کو تازگی نہیں بخشتا؟ مجھے شبہ ہوتا ہے کہ بدخواہوں نے جنہیں میں خوب جانتا ہوں، سازش کر کے ہمارے جامِ الفت میں یہ زہر ملایا ہے کیا ۲۵ برس کی دوستی کے بعد آپ اس طرح قطع تعلق فرما سکتے ہیں؟ یہ وہ

۹۳۱

زمانہ تھا جس میں سوائے خوشی اور انبساط کے کوئی چیز بے لطف کرنے والی نہ تھی۔ اس کندن میں کھوٹ نام کو نہ تھا، یہ زمانہ اس طرح گذرا تھا کہ کوئی وجہ شکایت کی نہ مجھے پیدا ہوئی تھی نہ آپ کو اور جس میں نہ کوئی قصور مجھ سے سرزد ہوا تھا، کیا اب آپ اپنا ہاتھ کھینچ کر مجھے پنجۂ تقدیر میں چھوڑنا چاہتے ہیں؟ میں کیا ہوں؟ بجز اس کے کوئی ہستی نہیں رکھتا کہ آپ کا ایک مطیع اور فرمانبردار غلام ہوں، کچھ دیر غور فرمایئے جلدی نہ کیجئے، جو تیز چلتا ہے ٹھوکر کھاتا ہے جو احتیاط سے چلتا ہے وہ منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے، جس وقت وہ تعلقات جو مجھے اور آپ کو وابستہ کئے ہوئے ہیں ٹوٹ جائیں گے، اُس وقت میں آپ کو یاد آؤں گا، پھر سوائے جھوٹے اور خود غرض دوستوں کے اور کوئی آپ کے پاس نہ ہوگا، اُس وقت آپ مجھے ڈھونڈیں گے۔ جب کوئی نیک صلاح دینے والا آپ کے نزدیک نہ ہوگا، اور میں بھی آپ کے پاس نہ ہوں گا کہ اُن کی عقلوں کی کسوٹی بنوں"۔

اگر معتمد تخلیے میں ایک گھنٹہ بھی ابنِ عمّار سے گفتگو کر لیتے تو سب بدگمانیاں اُن کے دل سے دُور ہو جاتیں اور دونوں دوستوں میں جن کا باہمی تعلق فطرت کا پیدا کیا ہوا تھا۔ مصالحت ہو جاتی، لیکن افسوس معتمد اور اُس کے وزیر ابنِ عمّار میں ایک فاصلہ دراز حائل تھا، اشبیلیہ میں ابنِ عمّار کے دشمنوں کا ایک پورا غول موجود تھا، جو ہر وقت اُسے بُرا کہنے اور بادشاہ کی نظر میں ذلیل کرنے اور اس کی ہر بات اور کام کے اُلٹے معنی بیان کرنے میں مصروف رہتا تھا، "بدخواہوں" میں جن کی طرف ابنِ عمّار نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا تھا سب سے بڑھ کر ابوبکر ابنِ زیدون تھا، اُسے معتمد کے دربار میں اس وقت بہت رسوخ حاصل تھا، اُس نے پہلے ہی سے معتمد کے کان اس طرح بھرے تھے کہ ابنِ عمّار جس وقت اشبیلیہ سے مرسیہ روانہ ہوا تھا، تو جب ہی سے بادشاہ کو اُس کی وفاداری میں کچھ شبہ پیدا ہو چلا تھا۔

ان دشمنوں کے علاوہ ابنِ عبدالعزیز والیٔ بلنسیہ، جو ابنِ طاہر بادشاہِ مرسیہ کا بڑا

دوست تھا، ابنِ عمار کا کچھ کم خطرناک دشمن نہ تھا۔

مرسیہ پہنچنے پر ابنِ عمار نے ابنِ طاہر سے نہایت اخلاق سے پیش آنے کا ارادہ کیا، ایک نہایت پُر تکلف خلعت ابنِ طاہر کے خوش کرنے کو اُس کے پاس بھیجا، لیکن ابنِ طاہر ریاست سے بے دخل ہو جانے پر ہر وقت بارمزاج رہتا تھا، ابنِ عمار کے قاصد اور خلعت کو، جو یہ قاصد اپنے ساتھ لایا تھا، دیکھ کر قاصد سے کہنے لگا کہ اپنے آقا سے کہہ دینا "میں تو صرف ایک جُبّے اور سر کی چپکواں ٹوپی کا آپ سے خواستگار ہوں" قاصد یہ جواب سُن کر ابنِ عمار کے پاس آیا، ابنِ عمار کے پاس اُس وقت بہت سے درباری حاضر تھے، قاصد نے ابنِ طاہر کا جواب سُنایا، ابنِ عمار جواب سُن کر دانتوں سے ہونٹ چبانے لگا، اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا کہ "ابنِ طاہر کے اِن الفاظ کا مطلب میں خوب سمجھتا ہوں، جُبّہ اور چپکواں ٹوپی میں اُس وقت پہنا کرتا تھا، جب مفلس اور تنگدست تھا اور اسی حالت میں ابنِ طاہر کے سامنے حاضر ہو کر اُس کی تعریف میں شعر پڑھتے تھے"۔

ابنِ عمار نے ابنِ طاہر کے اِن الفاظ کو جنھوں نے واقعی اُس کے دل کو مجروح کیا تھا کبھی معاف نہ کیا، فوراً اپنا ارادہ بدل کر ابنِ طاہر کو مرسیہ کے قریب ایک قلعہ میں، جس کا نام منت اقود تھا قید کر دیا، ابنِ عبد العزیز والیٔ بلنسیہ نے ابنِ طاہر کی سفارش میں معتمد کو خط لکھا، معتمد نے ابنِ عمار کو فرمان بھیجا کہ ابنِ طاہر کو رہا کر دیا جائے، ابنِ عمار نے معتمد کے اس حکم کی پروا نہیں کی، لیکن ابنِ عبد العزیز کی مدد سے ابنِ طاہر کسی طرح (۴۸۴ھ)
قید سے نکل بھاگا، اور بلنسیہ میں سکونت اختیار کر لی، ابنِ عمار کو اس پر بیحد غصہ آیا، اور ایک نظم لکھی جس میں اہلِ بلنسیہ میں اس بات کا جوش پیدا کرانا چاہا کہ وہ اپنے بادشاہ ابنِ عبد العزیز سے بغاوت کریں، اس نظم کا ایک حصہ یہ تھا:-

بلنسیہ کے رہنے والو! متحد ہو کر ابنِ عبد العزیز کے خلاف کھڑے ہو جاؤ

اپنی شکایتیں بیان کر کے کسی اور کو اپنا بادشاہ منتخب کرو، اور وہ بادشاہ الیسا ہو

لہ یہ قلعہ مرسیہ کے شہر سے ایک فرسخ تھا، پُرانے قلعے کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔

جو تم کو دشمنوں سے محفوظ رکھ سکے، چاہے وہ محمد ہو یا احمد ہو، جو کچھ بھی وہ ہو، ہر حال میں ابنِ عبدالعزیز سے بہتر ہونا چاہیئے، جس نے تمہارے شہر سے ایسی بے اعتنائی کی ہے، جیسے کوئی بے غیرت شوہر اپنی بیوی کو خود بیسوا بنائے اُس نے اپنے پاس ایک ایسے شخص کو چھپایا ہے جس کو خود اُس کی رعایا نے اپنے ہاں سے نکال دیا تھا، یہ ابنِ عبدالعزیز ایک منحوس پرند تمہارے درمیان لے آیا ہے، اُس نے تمہارا ساتھی اور ہم وطن ایسے شخص کو بنایا ہے جو بدبھی ہے اور بدنام بھی، ہاں میرا فرض تھا کہ میں ایک ایسے شخص سے شہر (مرسیہ) کو پاک کردوں جس کے سر پر ایک ذلیل لونڈی نے جس کے گلے میں ہار تک نہ تھا تمانچے مارے تھے، گیا وہ سمجھتا ہے کہ اُس شخص کے انتقام سے بچ جائے گا، جو دشمن کے تعاقب سے ایسی راتوں میں بھی باز نہیں آیا، جن میں تارے اپنا منہ تک نہیں دکھاتے، وہ کون سا مکر وحیلہ ہے جس سے تو بنی عمار کے ایک بہادر لڑنے والے سے، اور اُس کے انتقام کش ہاتھوں سے جس کے ساتھ برچھیوں کا ایک جنگل حرکت میں ہے، بچ کر نکل جائے گا، بہت جلد تو دیکھ لے گا کہ بنی عمار کا ایک بہادر بے شمار لشکر کے ساتھ تیرے سر پر ہوگا، اہلِ بلنسیہ! میں تمہیں نیک صلاح دے رہا ہوں، اُٹھو، اور اُس قصر پر حملہ کرو جو اپنی عمارت میں ایسی ایسی خبیث چیزیں چھپائے ہوئے ہے، اُس کے خزانے لُوٹ لو، اور اُسے گرا کر زمین کے برابر کردو، اور صرف اُس کے کھنڈروں کو اس بات کا گواہ بنادو کہ ہاں کبھی وہ یہاں تھا۔

معتمد کو جب ابنِ عمار کی حرکتوں کی خبر لگی، اور اس نظم کا حال معلوم ہوا، تو اُسے بہت غصہ آیا، اور ابنِ عمار کی نظم کی اس طرح خاک اڑائی:۔

حقیقت میں وہ کون سا مکروحیلہ ہے جس سے تو بنی عباد کے ایک انتقام کش لڑنے والے کے ہاتھ سے بچ سکتا ہے؟ بنی عمار وہ ہیں جو کل کی بات ہے کہ ذلت و خواری کے ساتھ ہر بادشاہ، امیر، اور صاحب زر کے قدموں میں گرگر

لجاجت کرتے تھے، ذلیل ترین نوکروں سے دو گُنے بھی زیادہ اگر بنی عمار کو اُن کے آقا دے دیتے تھے تو بنی عمار کی عید ہو جاتی تھی، نحس و ناپاک جلادوں کی طرح مجرموں کو قتل کرنا اُن کی خاص خدمت تھی، اور وہ شدت سے نکبت اور ذلت کی حالت سے اُٹھا کر بڑے بڑے منصوبوں پر ممتاز کئے گئے تھے "

معتمد کے اِن اشعار نے ابنِ عبد العزیز بادشاہ بلنسیہ کو بیحد محظوظ و مسرور کیا، ابنِ عمار نے معتمد کے اشعار پڑھے، بہت چاہا کہ اپنے غصے کو روکے، مگر بن نہ پڑا، دم گھٹنے لگا، اور بالکل بے آپے ہو کر معتمد، رُمیکیہ، اور بنی عباد کی ہجو اُن الفاظ سے بھی زیادہ دِل جلے الفاظ میں جو اہلِ بلنسیہ سے خطاب کئے تھے، لکھی، یعنی اب یہ نوبت آئی کہ وہ مفلس و تنگدست اور آوارہ گرد، جو ایک تاریک جھونپڑی میں پیدا ہوا تھا، اور جسے معتمد کی فیاضی نے حالتِ گمنامی سے اعلیٰ ترین رتبے پر پہنچایا تھا، اتنی جرأت کرے کہ بنی عباد کو قریہ یامین کا گمنام کسان اور کاشتکار بتائے، اور قریہ یامین کو جو ایک گاؤں تھا، طنزاً لکھے کہ وہ دنیا کا دار الحکومت تھا، ہجو کے اشعار میں سے بعض کا مفہوم یہ تھا:-

"قوم کی بیٹیوں میں سے تُو نے اُسے پسند کیا جو رُمیکیہ کی لونڈی تھی، لونڈی بھی ایسی ذلیل جسے اُس کا مالک یک سالہ بچۂ شتر کے عوض فروخت کر ڈالتا، تین بدکار (۴۸۵ھ)
بیٹیاں اور دو بد قوارہ و پستہ قد بیٹے تجھے شرم دلانے کے لئے اُس کے بطن سے پیدا ہوئے، معتمد! میں تیری بے عزتی کو تمام عالم میں مشعل کی طرح روشن کر دوں گا میں وہ پردہ اُٹھا دوں گا جو تیرے گناہوں کو ڈھکے ہوئے ہے، گھر سے باہر پُرانے شہسواروں کی مثل بخریہ اپنے قریوں اور شہروں کی حفاظت کرتا ہے، اور گھر کے اندر اپنی بیویوں کے ساتھ جو آوارہ ہیں، خلیق بنتا ہے"

ابنِ عمار میں اتنی غیرت باقی تھی کہ اِس ہجو کو جو حالتِ طیش میں لکھی تھی، سوائے اپنے گہرے دوستوں کے اور کسی کو نہ دکھایا، لیکن اِن دوستوں میں بدقسمتی سے مشرق کا ایک یہودی بھی تھا، جس پر ابنِ عمار کو کامل اعتماد تھا، اِس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ درا صل یہ ابنِ عبد العزیز کا جاسوس ہے، اِس یہودی نے بہت آسانی سے اِس ہجو کی ایک

نقل خود ابنِ عمار کے ہاتھ لکھی ہوئی، حاصل کر کے ابنِ عبدالعزیز صاحبِ بلنسیہ کے پاس روانہ کر دی، ابنِ عبدالعزیز نے فوراً معتمد کو ایک خط لکھا، اور اس خط میں ہجو کی نقل بھی رکھ دی، یہ خط ایک کبوتر کے گلے میں باندھ کر بھیجا گیا۔

اب ابنِ عمار اور معتمد میں مصالحت بالکل ناممکن تھی، یہ بیہودہ اور نامعقول ہجو ایسی تھی کہ نہ معتمد، نہ رمیکیہ اور نہ معتمد کے بیٹے اُسے معاف کر سکتے تھے، لیکن بادشاہِ اشبیلیہ کو اس کی ضرورت نہ ہوئی کہ وہ وزیر ابنِ عمار کو اِس گستاخی کی سزا دیتا، سزا دینا دوسروں نے اپنے ذمہ لے لیا۔

ابنِ عمار پر حکومت کا غرور ایسا چھایا کہ اُس کو اتنی بھی خبر نہ ہوئی کہ ابنِ عبدالعزیز والئی بلنسیہ کی پشت گرمی سے ابنِ رشیق فی الحقیقت اُس کا دشمن اور بدخواہ ہو گیا ہے۔ لیکن جب ابنِ عمار یہ معلوم ہوا تو وقت نکل چکا تھا۔

ابنِ رشیق کے اغواء سے ابنِ عمار کے سپاہیوں نے تنخواہ کے بقایا کے لئے ایک شور برپا کیا، ابنِ عمار جب تنخواہوں کی ادائیگی کا بندوبست نہ کر سکا، تو سپاہیوں نے دھمکی دی کہ ہم اُسے معتمد کے حوالے کر دیں گے، اِس دھمکی سے ابنِ عمار پر ایسا خوف طاری ہوا کہ وہ مرسیہ چھوڑ کر کہیں اور پناہ لینے چلا گیا۔

لیون اور قشتالیہ کے بادشاہ اذفونش کے دربار میں ابنِ عمار نے اِس امید میں پناہ لی کہ یہ عیسائی بادشاہ مرسیہ کو دوبارہ فتح کرنے میں اُس کی مدد کرے گا، لیکن ابنِ عمار کا یہ خیال غلط نکلا، ابنِ رشیق اذفونش کو پہلے ہی بڑے بڑے قیمتی تحائف پہنچا چکا تھا ابنِ عمار نے جب اذفونش سے مدد کے لئے کہا، تو اُس نے جواب دیا کہ "تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ ایک لوٹ کا قصّہ ہے، یعنی ایک قزاق کو دوسرے قزاق نے لوٹا، اور جب اِس دوسرے کی باری آئی، تو ایک تیسرے قزاق نے اُسے لوٹ لیا"۔

(تین قزاقوں سے مراد معتمد، ابنِ عمار، اور ابنِ رشیق ہیں، مگر اذفونش بھی کچھ کم قزاق نہ تھا، اور ان سب قزاقوں کے ساتھ قزاقی کا سہرا اُن نیک نہاد عیسائی قزاقوں کے سر بندھا، جن میں ایک اذفونش بھی تھا۔ مترجم اُردو)

ابنِ عمار کو جب معلوم ہو گیا کہ لیون میں کام نہ چلے گا، تو وہ سرقسطہ چلا گیا، یہاں احمد مقتدر کی جو بنی ہود سے تھا، اور سرقسطہ میں حکومت کرتا تھا، ملازمت اختیار کی، لیکن مقتدر کے دربار میں وہ شان کہاں تھی جو معتمد کے دربار میں تھی، ابنِ عمار کا یہاں جی نہ لگا، مجبور ہو کر لاردہ چلا گیا، جہاں مقتدر کا بھائی مظفر حکومت کرتا تھا، مظفر نے ابنِ عمار کی بہت خاطر و مدارت کی، لیکن لاردہ ابنِ عمار کو سرقسطہ سے بھی زیادہ بے لطف معلوم ہوا، اس لئے لاردہ چھوڑ کر پھر سرقسطہ چلا آیا، اب جو آیا تو مقتدر کا انتقال ہو چکا تھا، اور اُس کی جگہ اکتوبر ۱۰۸۱ء (جمادی الاول ۴۷۴ھ) میں اُس کا بیٹا موتمن سرقسطہ کا بادشاہ ہوا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ابنِ عمار کی بیکاری و سستی، اور ہر چیز سے دل کا اُچاٹ رہنا، جو اُس کے حال و استقبال پر ابرِ سیاہ کی طرح چھا گیا تھا، آخر کار اُسے تباہ کر دے گا، اس بیکاری و کاہلی کو دُور کرنے کی ایک تدبیر اُس نے بہت خوش ہو کر سوچی، سرقسطہ کی ریاست (۶۸۶) میں ایک قلعہ دار جو ابنِ عمار کا شناسا تھا، بادشاہِ سرقسطہ سے اس زمانہ میں باغی ہو گیا تھا، ابنِ عمار نے موتمن سے کہا کہ وہ اس باغی قلعہ دار کو موتمن کا مطیع کر دے گا، چنانچہ تھوڑی سی فوج لے کر وہ اُس باغی کے قلعے کی طرف گیا، قلعہ پہاڑ کی چوٹی پر تھا، جب ابنِ عمار پہاڑ کے نیچے پہنچا، تو قلعہ دار سے کہلا بھیجا کہ صرف دو ملازموں کی ہمراہی میں وہ ملاقات کرنی چاہتا ہے قلعہ دار کو شبہ کرنے کا کوئی موقع نہ تھا، اُس نے اجازت دے دی، ابنِ عمار نے اپنے دو ملازموں جابر اور ہادی کو یہ ہدایت کی کہ "جس وقت دیکھو کہ میں قلعہ دار سے مصافحہ کرتا ہوں، تو تم فوراً اُس کے سینے میں تلوار اُتار دینا" غرض ملاقات ہوئی اور قلعہ دار قتل ہو گیا، قلعہ کے سپاہیوں کو امان دی گئی، موتمن بادشاہِ سرقسطہ ابنِ عمار کی اس عمدہ خدمت سے بہت خوش ہوا۔

اب ابنِ عمار کو اپنی بے چین اور بے قرار طبیعت کی تسکین کے لئے ایک دوسرا موقع ہاتھ آیا تدبیر یہ سوچی کہ شقورہ کا قلعہ موتمن کے لئے فتح کر لیا جائے، یہ قلعہ ایک ایسے اونچے پہاڑ کی چوٹی پر تھا جس کے اوپر پہنچنا سخت دشوار تھا، یہ قلعہ علی اقبال الدولہ صاحبِ دانیہ کے مقبوضات سے تھا، مقتدر صاحبِ سرقسطہ نے جب علی اقبال الدولہ کے علاقوں کو

فتح کیا تھا، تو یہ قلعہ بدستور خود مختار اور غیر مفتوح رہا تھا، ادر علی کا ایک فرزند سراج الدولہ کچھ عرصہ سے وہاں حکومت کرتا تھا، مگر حال ہی میں اُس کا انتقال ہوگیا تھا، اور بنی سہل نے جو سراج الدولہ کے بچوں کے ولی تھے، یہ چاہا کہ قلعہ شقورہ کو قریب کے ایک رئیس کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں۔

ابنِ عمار نے موتمن سے کہا کہ جیسے پہلے ایک قلعہ آپ کے لئے فتح کیا ہے، یہ دوسرا بھی فتح کرلیا جائے گا، چنانچہ اسی قصد سے ابنِ عمار کچھ سوار لے کر شقورہ کی طرف بڑھا، شقورہ پہنچ کر بنی سہل سے ملاقات کی درخواست کی، بنی سہل نے درخواست منظور کی لیکن بنی سہل ابنِ عمار کی طرف سے ہوشیار تھے، وجہ یہ تھی کہ جب ابنِ عمار مرسیہ میں حکومت کرتا تھا تو بنی سہل اُس سے کسی بات پر ناراض ہوگئے تھے، اب بجائے اِس کے کہ بنی سہل ابنِ عمار سے دھوکا کھاتے، بنی سہل نے ابنِ عمار کو دھوکا دیا۔

قلعہ شقورہ تک پہنچنے کا راستہ ایسی سیدھی اور اونچی چٹانوں پر تھا کہ کہیں کہیں ہاتھوں کے سہارے سے اوپر چڑھنا ہوتا تھا، جب ایسے ہی ایک مقام پر ابنِ عمار مع اپنے ملازموں جابر اور ہادی کے جو ہر معرکے میں اُس کے ساتھ رہتے تھے، پہنچا، تو ابنِ عمار نے سب سے پہلے اوپر چڑھنا شروع کیا، لیکن جونہی اوپر پہنچ کر ہموار زمین پر قدم رکھا، قلعے کے سپاہیوں نے اُسے گرفتار کرلیا، اور دونوں ملازموں سے جو نیچے تھے، کہا کہ "جان کی خیر چاہتے ہو، تو بھاگو، ورنہ ہم ابھی تیروں سے تمہارا کام تمام کئے دیتے ہیں"

اِس بات کے دوبارہ کہنے کی ضرورت نہ تھی، جابر اور ہادی پہاڑ سے بالکل نیچے اُتر گئے، اور سرقسطہ کے سوار جو ساتھ آئے تھے، اُن کو اطلاع دی کہ بنی سہل نے ابنِ عمار کو گرفتار کرلیا ہے، سواروں نے دیکھا کہ ابنِ عمار کو چھڑانا کسی طرح ممکن نہیں، اِس لئے وہ سرقسطہ واپس چلے گئے۔

بنی سہل نے ابنِ عمار کو قید خانے میں ڈال دیا، اور نیّت یہ کی کہ جو سب سے زیادہ قیمت دے گا، اُسی کے ہاتھ یہ مال بیچا جائے گا،

سب سے بڑا خریدار معتمد ثابت ہوا، جس نے قلعہ شقورہ کے ساتھ ابنِ عمار کو بھی

خرید لیا، اور اپنے بیٹے راضی کو حکم دیا کہ ابنِ عمار قیدی کو قرطبہ میں حفاظت کے ساتھ حاضر کرے۔

اب وزیر ابنِ عمار اس صورت سے قرطبہ میں داخل ہوا کہ پاؤں میں بیڑیاں تھیں، اور ایک خچر پر، جس کے دونوں طرف بھوسے کے بورے لدے ہوئے تھے بوروں کے بیچ میں بیٹھا ہوا تھا۔ جس وقت معتمد کے سامنے پیش ہوا، تو معتمد نے سخت لعنت و ملامت کی، اور جو ہجو ابنِ عمار نے لکھی تھی، اُس کی نقل دکھا کر کہا کہ "اپنا خط پہچانتے ہو؟" ابنِ عمار بیڑوں کے بوجھ سے سیدھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا، اسی حال میں نظریں نیچی کئے کھڑا رہا، لیکن جب معتمد بُرا بھلا کہہ چکے تو ابنِ عمار نے کہا "میرے آقا! جو کچھ آپ نے فرمایا، اُس کا کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے آپ کے کسی لفظ کی تردید سے مجھے کیا حاصل ہو سکتا ہے؟ جب کہ ہر ایک بے جان چیز بھی گواہی دینے کو موجود ہے کہ جو کچھ حضور نے کہا، وہ سب سچ کہا، مجھ سے خطا ہوئی، میں نے آپ کی بے ادبی کی، لیکن اب معاف کر دیجئے۔" معتمد نے جواب دیا کہ "جو کچھ تم نے کیا، وہ معافی کے قابل نہیں۔"

معتمد کی ملکہ اور بیٹیوں نے بھی، جن کی نسبت ہجو میں ابنِ عمار نے بہت بُری باتیں لکھی تھیں، اِس ہجو گو کو بہت سخت دُشنست کہہ کر اپنے دل کا بخار نکالا۔

قرطبہ سے ابنِ عمار اشبیلیہ بھیج دیا گیا، وہاں شہر کے لوگوں نے اُس کی اور بھی بے عزتی کی، بہرکیف اُس کی قید کا زمانہ بڑھتا رہا، اِس سے کچھ توقع ہوتی تھی کہ شاید رہا کر دیا جائے۔

اِس کے علاوہ چند مقتدر اور ممتاز لوگوں نے جن میں شہزادہ رشید بھی شامل تھا زبانی یا تحریر کے ذریعے ابنِ عمار کی سفارش کی تھی۔

اِن مربیوں کی تعریف میں ابنِ عمار اشعار لکھ لکھ کر اُن کو آمادہ کرتا تھا کہ اُس کے مقدمے میں کوشش کرتے رہیں، معتمد کو بھی بے شمار درخواستیں اور عرضیاں لکھتا رہتا تھا یہاں تک کہ معتمد تنگ آ گئے، اور اُنھوں نے حکم دیا کہ لکھنے کی کوئی چیز قیدی کو نہ دی

جائے لیکن ابنِ عمار نے بہت ہی منت ولجاجت سے کہا کہ "ایک بار اور کاغذ، قلم، اور دوات ملنے کا حکم دیا جائے"۔ جب یہ درخواست منظور ہوئی تو ابنِ عمار نے ایک نظم لکھی، اور قید خانہ کے محافظ سے کہا کہ "رات کو جب بادشاہ سلامت ضیافت میں تشریف رکھتے ہوں تو یہ نظم اُس وقت پیش کردی جائے"۔ جب سب مہمان رخصت ہو لئے تو معتمد نے وہ نظم پڑھی، دل پر اثر ہوا، اور ابنِ عمار کو سامنے آنے کا حکم دیا، ابنِ عمار جب حاضر ہوا، تو معتمد نے پھر اُس کی نا احسان مندی پر اُسے فضیحت کی، ابنِ عمار نے اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی، منہ سے کوئی جواب نہ نکلتا تھا، جب ذرا دم ٹھہرا تو اس قدر پُر درد اور فصیح تقریر میں وہ زمانہ بیان کیا، جس میں دونوں ساتھ خوش وخرم رہا کرتے تھے، کہ معتمد بے حد متاثر ہوئے، معلوم ہوتا تھا کہ دل کچھ نرم ہوا ہے، بلکہ آدھا رام ہو گیا ہے، چند باتیں ابنِ عمار کی تسکین کی کیں، لیکن باضابطہ معافی نہ دی، بدقسمتی یہ ہوئی، اور بدقسمتیوں میں سب سے بڑی بدقسمتی وہ ہے جو اُمید کی سحر ہوتے ہی مطلع روشن کو پھر سیاہ کردے کہ ابنِ عمار نے معتمد کے خیالات کا اندازہ غلط کیا تھا، غصے اور رحم کی جو کیفیتیں یکے بعد دیگرے دیکھی تھیں اُن کو غلط معنی پہنا دیئے۔

اس میں شک نہیں کہ معتمد کو اپنے وزیر سے کسی قدر پہلی سی محبت محسوس ہوتی تھی لیکن کسی خطاکار کے حال پر افسوس کرنے، اور اس کی خطا کو معاف کرنے میں بڑا فرق ہوتا
ہے، اس نکتے تک ابن عمار نہ پہنچ سکا۔ وہ معتمد سے رخصت ہو کر جب واپس قید (۶۸۸
خانے میں آیا تو وزارت پر پھر بحالی کا تصور بندھا، اور اس تصور میں ایسا خوش ہوا کہ شہزادہ رشید کو خط لکھ مارا، اور اُس میں بادشاہ سے جو گفتگو ہوئی تھی اس سے اپنے حق میں اچھا نتیجہ نکالا۔

جب یہ خط رشید کے پاس پہنچا تو وہ تنہا نہ تھے، خط پڑھنے لگے تو اُن کے وزیر علیسے نے ایک اُچٹتی سی نظر خط پر ڈالی، اور اتنا سمجھ میں آگیا کہ خط کا مضمون کیا ہے، وزیر علیسے نے یا تو اس وجہ سے کہ ابن عمار کو وہ اچھا نہ جانتا تھا، یا اس سبب سے کہ زیادہ باتیں کرنے کی عادت تھی، خط کا مضمون طشت از بام کر دیا، یہاں تک کہ اُس

کی خبر ابوبکر ابنِ زیدون تک پہنچی، اور خبر بھی بہت کچھ مبالغے اور رنگ آمیزیوں کے ساتھ پہنچی جن کی تفصیل کا علم ہمیں نہیں ہو سکا، لیکن اس میں شبہ نہ کرنا چاہیئے کہ اس خبر میں بہت سی نامعقول اور بیہودہ باتیں اضافہ کر دی گئی تھیں، کیونکہ ایک عربی مورخ لکھتا ہے کہ "اس میں ایسی قبیح باتیں بڑھا دیں کہ اُن کی نقل سے میں اپنی کتاب کو محفوظ و پاک رکھنا چاہتا ہوں"۔

ابنِ زیدون نے رات پریشانی میں گذاری، کیونکہ ابنِ عمار کی بحالی سے اندیشہ تھا کہ خود تباہ ہو جائے گا، اور ممکن ہے کہ جان سے بھی مارا جائے، دوسرے دن بھی اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے، بہر کیف وہ دار الامارت میں حاضر ہونے کی بجائے اپنے گھر میں بیٹھا رہا جب وہ آیا تو معتمد نے اُس سے غیر حاضری کا سبب دریافت کیا، اُس نے عرض کیا "غیر حاضری کی وجہ یہ ہوئی کہ اب حضور کی نظرِ مہر مجھ پر نہیں رہی" اس کے بعد بیان کیا کہ بادشاہ نے جو کچھ گفتگو ابنِ عمار سے کی تھی، وہ تمام اہلِ دربار کو معلوم ہو گئی ہے، اور وزارت پر ابنِ عمار کی واپسی بالکل عنقریب سمجھی جارہی ہے، چنانچہ ابنِ عمار کے دوست ابنِ سلیم حاکم شہر نے اپنے مکان میں چند کمرے بڑی شان سے آراستہ کئے ہیں، تاکہ جب تک ابنِ عمار کے مکانات واگذاشت ہوں، وہ ابنِ سلیم کے پاس قیام کرے۔

اِن باتوں کے ساتھ ابنِ زیدون نے ایک بیہودہ بات بھی جو مشہور ہو گئی تھی بیان کر دینے سے پرہیز نہ کیا۔

اِس وقت معتمد کا مارے غصّے کے بُرا حال ہوا، معتمد اور ابنِ عمار میں جو باتیں ہوئی تھیں، اگر دشمن اُن میں شگوفہ کاری نہ بھی کرتے، تب بھی معتمد کو اِس بات پر غصّہ آتا کہ مہربانی کے چند الفاظ کو ابنِ عمار نے رہائی اور بحالی کا وعدہ کس طرح سمجھ لیا، غرض فوراً ایک خواجہ سرا سے کہا "جاؤ، ابنِ عمار سے دریافت کرو کہ کل شام کو مجھ میں اور اُس میں جو باتیں ہوئی تھیں وہ دوسروں پر کیوں ظاہر کی گئیں"۔ خواجہ سرا جلد جواب لایا اور کہا کہ "ابنِ عمار انکار کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ میں نے کسی سے اُن باتوں کا ذکر نہیں کیا"۔ معتمد نے کہا کہ "ممکن ہے زبان سے نہ کہا ہو، بلکہ لکھ کر بھیجا ہو، میں نے اُس کو

کاغذ کے دو ورق دیئے تھے، ایک پر اُس نے نظم لکھی جو مجھے بھیجی، دوسرا ورق اُس نے کیا کیا؟ جاؤ اُس سے دریافت کرو۔"

خواجہ سرا جواب سے کر پھر حاضر ہوا اور عرض کیا کہ "ابنِ عمار کا بیان ہے کہ دوسرے ورق پر اُس نے نظم کا مسودہ کیا تھا۔" معتمد نے کہا "اگر یہی بات ہے تو وہ مسودہ اُس سے مانگ لاؤ۔" (۶)

اب ابنِ عمار میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ سچ بات بتانے سے انکار کرتا، لہٰذا صاف کہہ دیا کہ "اُس ورق پر شہزادہ رشید کو خط لکھا تھا" اور نہایت ندامت کے ساتھ یہ بھی کہا کہ "بادشاہ کے وعدے سے شہزادے کو میں نے اطلاع دی تھی۔"

اقبالِ جرم پر معتمد کا خون جوش کھا گیا، باپ کی بے درد طبیعت جو درندے کی طرح اپنے شکار کو پھاڑ کھاتی تھی، معاً بیٹے میں حلول کر آئی، ایک تبر قریب رکھا تھا، جو بادشاہِ لیون ادفونش نے اُسے تحفہ میں دیا تھا، وہ تبر اُٹھا کر ابنِ عمار جہاں قید تھا وہاں دوڑا ہوا گیا۔

ابنِ عمار معتمد کی سُرخ آنکھیں دیکھتے ہی لرزنے لگا، اور سمجھ گیا کہ موت کا وقت قریب ہے، بیڑیوں کو گھسیٹتے ہوئے بڑھا، اور قدموں میں گر کر پاؤں چومنے لگا، لیکن معتمد کے دل میں اب رحم نہ تھا، تبر مارنے شروع کئے، یہاں تک کہ ابنِ عمار کا خاتمہ ہوگیا۔

ابنِ عمار کا خاتمہ نہایت غمناک صورت میں پیش آیا، تمام اسپین عربیہ میں اُس کا بیحد اثر ہوا، لیکن اثر زیادہ دن نہ رہا کیونکہ طلیطلہ میں عجیب واقعات پیش آرہے تھے، اور قشتالیہ کے عیسائی لشکر نے مسلمانوں کے مقبوضات پر یورشیں کر کے لوگوں کے خیالات دوسری طرف متوجہ کر دیئے تھے۔

اسناد :-

ابن الابار ص ۱۸۶ تا ۱۸۹

عباد ج ۲ ص ۳۶، ۸۶ تا ۸۷، ۹۱ تا ۹۴، ۱۰۳ تا ۱۱۹

ابن بسام ج ۲ (ابنِ عمار پر مضمون)

عبدالواحد ص ۸۵ تا ۹۰

کتاب رابع

ملوک الطوائف

بارھویں فصل

ادفونش ششم

جنگِ زلاقہ

ادفونش ششم نے جو صوبجات لیون، قشتالیہ، جلیقیہ، اور نبرہ کا بادشاہ ہوگیا تھا، (۶۹۰)
مصمم قصد کرلیا کہ تمام جزیرہ نمائے اسپین کو مسلمانوں سے فتح کرے گا، یہ بھی نہ تھا کہ اِس قصد کو عمل میں لانے کی قوت نہ رکھتا ہو، مگر اس کام میں عجلت کرنی اُسے منظور نہ تھی سمجھے بیٹھا تھا کہ جب چاہے گا مسلمانوں سے ملک خالی کرالے گا، وہ اِس زمانہ میں سامانِ حرب بڑی مستعدی سے فراہم کرتا رہا، اور فی الواقع یہی سامان اُس کو اپنی مراد تک پہنچا سکتا تھا، اُموی سلطنتِ اسلامیہ کی بربادی پر جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں مسلمانوں نے قائم کی تھیں، ادفونش اُن پر سخت دباؤ ڈالتا تھا، اور اُن کی دولت اتنی نچوڑتا تھا کہ اُن کے خزانے خالی ہوئے چلے جاتے تھے۔

مسلمانوں کی ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں، جو ادفونش کو خراج دینے لگی تھیں

غالباً سب سے کمزور ریاست بادشاہِ طلیطلہ یحییٰ القادر ذوالنونی کی تھی، یحییٰ القادر ناز و نعمت کے پلے ہوئے، خواجہ سراؤں کے ساتھ کی کٹھ پتلی بنے ہوئے تھے، قرب و جوار کے والیانِ ریاست اُن کا مذاق اُڑانے کے علاوہ دولت بھی اُن سے چھینا کرتے تھے، اور ظاہر ایسا ہوتا تھا کہ صرف ادفونش ہی اُن کا محافظ و مددگار ہے۔

غرض جب رعایا قابو سے باہر ہوئی، جو حکومت سے بیزار تھی تو یحییٰ القادر کو ادفونش سے مدد مانگنی پڑی، ادفونش نے فوج دینے کا اس شرط سے وعدہ کیا کہ بہت بڑی رقم روپیہ کی اس خدمت کے معاوضہ میں ادا کی جائے۔

یحییٰ القادر نے رؤسائے شہر کو بلایا، اور اُن سے رقم طلب کی، رئیسوں نے روپیہ دینے سے انکار کیا، یحییٰ القادر نے کہا کہ "اگر تم نے یہ روپیہ فوراً فراہم نہ کیا، تو میں تمہاری اولاد کو ادفونش کے حوالے کردوں گا" رئیسوں نے جواب دیا "جب تک تو ہم تم کو یہاں سے نکال باہر کریں گے"۔

چنانچہ اہلِ طلیطلہ نے یحییٰ القادر کی اطاعت چھوڑ کر بطلیوس کے بادشاہ عمر المتوکل کی اطاعت قبول کرلی، یحییٰ القادر رات کے وقت طلیطلہ سے فرار ہوئے، اور اب انہوں نے ادفونش سے امداد کی درخواست کی۔

ادفونش کو اُس کی عیسائی رعایا اب بادشاہ نہیں بلکہ شہنشاہ کہنے لگی تھی، غرض شہنشاہ ادفونش نے یحییٰ القادر کو جواب دیا کہ "میں طلیطلہ کا محاصرہ کردوں گا، اور اُس پر قبضہ کرکے پھر تمہیں تخت پر بٹھادوں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ جس قدر زر و جواہر اپنے ساتھ لے گئے ہو وہ مجھے دے دو، اور روپیہ کی اور رقمیں آئندہ ادا کرنے کی ضمانت میں چند قلعے بھی ہمیں تفویض کردو"۔

یحییٰ القادر نے یہ سب شرطیں قبول کرلیں، اور ۴۷۳ھ میں طلیطلہ سے لڑائی کا سلسلہ چھڑ گیا۔

اس لڑائی کو جاری ہوئے دو برس ہوئے تھے کہ ادفونش نے سالانہ خراج وصول کرنے کے لئے ایک سفارت حسبِ معمول معتمد بادشاہِ اشبیلیہ کے پاس بھیجی، اس

سفارت کے ساتھ کچھ سوار بھی تھے، اور ایک یہودی تھا، جس کا نام ابنِ شالیب تھا،
اُسے خراج وصول کرنے کا اختیار دیا گیا تھا، اس زمانہ میں اسلامی اور عیسائیوں ریاستوں (۶۹۱)
میں گفتگو اکثر یہودیوں کے ذریعے سے ہوا کرتی تھی۔

ادفونش کے سفیروں نے اشبیلیہ کے باہر جب اپنے خیمے نصب کئے تو معتمد کے چند معزز لوگ بماتحتی وزیر ابوبکر بن زیدون خراج کا روپیہ لئے ہوئے سفیروں کے پاس گئے، روپے جو ساتھ لائے تھے، اُن میں کچھ ایسے تھے جو کھرے نہ تھے، وجہ اُس کی یہ تھی کہ رعایا پر اس خراج کے لئے زیادہ محصول لگانے پر بھی خراج کی رقم پوری نہ ہو سکی تھی، یہودی نے کھوٹے سکے دیکھ کر کہا "میں ایسا بیوقوف نہیں ہوں کہ جعلی سکے قبول کر لوں اس سال تو خاص سونا لیا جائے گا، اور دوسرے سال تمہارے شہروں پر قبضہ کیا جائے گا"

جب یہودی کی اس گفتگو کی اطلاع معتمد کو کی گئی، تو وہ غصے سے لال ہو گئے، اور فرمایا کہ "اس یہودی اور اس کے ساتھ والوں کو میرے پاس پکڑ لاؤ" اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی۔

جس وقت ادفونش کے سفیر معتمد کے سامنے حاضر کئے گئے، تو اُن میں جو عیسائی تھے اُن کو تو قید خانے بھیجنے کا حکم ہوا، اور یہودی کی نسبت یہ حکم ہوا کہ "اس کو فوراً صلیب پر چڑھا دیا جائے"

یہودی جو پہلے بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کرتا تھا، اب سر سے پاؤں تک کانپنے لگا اور رو رو کر کہنے لگا کہ "امیر مجھ پر رحم کر، میں اپنے وزن کے برابر تجھے سونا دوں گا" معتمد نے جواب دیا "خدا کی قسم، اگر تو مجھے تمام ملک اسپین اور ملکِ مغرب کو بھی فدیے میں دے تو قبول نہ کروں" غرض یہودی صلیب پر چڑھا دیا گیا۔[۱]

جب ادفونش کو معلوم ہوا کہ اُس کے سفیروں کی کیا گت بنی، تو اُس نے ثالوثِ مقدس

---

[۱] دربارِ معتمد کے مشہور شاعر ابن اللبانہ نے قصہ اسی طرح بیان کیا ہے۔ علامہ مقری نے روضۃ المطار سے اس قصہ کو دوسری طرح بیان کیا ہے، روضۃ المطار الیشیائی روایات کا مجموعہ بہت بعد کے زمانہ کا معلوم ہوتا ہے۔

ادراد لیائے مسیحی کی قسم کھائی کہ "معتمد سے اس کا بدلہ ایسا لوں گا جیسے بدلہ کہتے ہیں، میں اُس بے دین کی ریاست کو ایسے لڑنے والوں کے ذریعہ سے غارت اور تباہ کردوں گا جن کی تعداد میرے سر کے بالوں کے برابر ہو گی، اور اُس وقت تک دم نہ لوں گا، جب تک آبنائے جبلِ طارق تک نہ پہنچ جاؤں گا۔"

لیکن ادفونش اپنی سفارت کے اُن معزز لوگوں کو جو اس وقت اشبیلیہ کے محبس میں زندگی کے دن کاٹ رہے تھے، اس حالتِ زار میں کیسے چھوڑ دیتا، لاچار معتمد کے پاس درخواست بھیجی، اور دریافت کیا کہ کن شرائط پر آپ ان عیسائیوں کو قید سے رہا کرسکتے ہیں معتمد نے جواب دیا کہ "المدور لہ کا شہر جس پر تم نے قبضہ کر رکھا ہے واپس کردو۔"

ادفونش نے المدور پر سے اپنا قبضہ اُٹھا کر شہر معتمد کو واپس کردیا معتمد نے عیسائی قیدیوں کو رہا کردیا کردیا۔

یہ عیسائی، لیون پہنچے ہی تھے کہ ادفونش نے معتمد کی سلطنت کو غارت کرنے کی جو قسم کھائی تھی، اُس پر عمل درآمد شروع کردیا، شرف اشبیلیہ کے گاؤں اور قصبات کو جلانے اور غارت کرنے لگا، اور مسلمانوں کو جو وہاں سے نکل کر کسی قلعے میں نہ چھپ سکے تھے، یا تو قتل کردیا، یا قید کر کے غلام بنایا، شہر اشبیلیہ کا تین دن تک محاصرہ جاری رکھا، مدینہ شذونہ کے علاقے کو خوب لوٹا، جس وقت بڑھتے بڑھتے طریف کے مقام پر پہنچا، تو اپنا گھوڑا سمندر میں ڈال دیا، اور کہا "دیکھو میں اسپین کی انتہا تک پہنچ گیا۔"

ادفونش نے اس طرح اپنی قسم پوری کر کے اپنے مغرور دل کو تسکین دی، اور اب (۶۹۲
لشکر کو پلٹا کر طلیطلہ کے علاقے میں یحییٰ القادر کی طرف سے لڑنے کے لئے پہنچا۔

یہاں بھی اُسے فتح ہوئی، عمر المتوکل بطلیوس کا بادشاہ جس کی اطاعت طلیطلہ کے لوگوں نے قبول کر لی تھی طلیطلہ کے علاقے کو چھوڑ کر چلا گیا، اور شہر کے باشندوں نے

لہ ادیدو کے پیلا گیوس دسی اا نے المدور کو اُن شہروں میں شمار کیا ہے، جن پر ادفونش نے قبضہ کر لیا تھا۔

بہ اکراہ شہر کے دروازے یحییٰ القادر کے لئے کھول دیئے (۴۷۸ھ)

یحییٰ نے آتے ہی اہلِ طلیطلہ پر ایک بڑا بھاری محصول لگایا، اور جو رقم وصول ہوئی وہ ادفونش کی نذر کردی، ادفونش نے کہا کہ رقم کافی نہیں ہے، القادر نے مہلت چاہی، ادفونش نے مہلت اس شرط سے منظور کی کہ اُن قلعوں کے علاوہ جو یحییٰ پہلے تفویض کر چکا تھا، چند اور قلعے اس رقم کی ضمانت میں اُس کے حوالے کئے جائیں، القادر کو سوائے منظور کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

یحییٰ القادر نے جو ریاست بزرگوں سے پائی تھی، اب وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر ہاتھ سے نکل رہی تھی، دولت ختم ہوچکی تھی، اور یہ علم بھی تھا کہ ادفونش کی تلوار سر پر چمک رہی ہے، اگر ذرا بھی کسی بات سے انکار کیا، تو سر پر آنے میں دیر نہ ہوگی۔

غرض القادر مجبور و معذور ادفونش کو بار بار روپیہ اور قلعوں پر قلعے نذر کرتا رہا، ادفونش کا پیٹ بھرنے کے لئے اُسے اپنی رعایا پر ظلم کرنے پڑے، یہاں تک کہ رہنے والوں سے ریاست خالی ہوگئی، کیونکہ جب طلیطلہ کے لوگوں نے دیکھا کہ حالت انتہا درجہ خراب ہوگئی ہے، تو وہ طلیطلہ کے علاقے کو چھوڑ کر سر قسطہ کے علاقے میں جا کر آباد ہوگئے،

القادر کی تمام کوششیں بیکار تھیں، وہ جس قدر روپیہ رعایا سے وصول کر کے ادفونش کو دیتا تھا، اُتنی ہی ادفونش کی بھوک اور بڑھتی گئی، جب القادر نے قسمیں کھا کر کہا کہ "اب میرے پاس ایک حبہ بھی دینے کو نہیں ہے" تو ادفونش نے مضافاتِ طلیطلہ کو لوٹنا شروع کیا۔[1]

کچھ دنوں تک اور یحییٰ القادر گرتے ہوئے تختِ حکومت کو اس طرح لپٹے رہے جیسے ڈوبتا ہوا آدمی ٹوٹی ہوئی ناؤ کے تختے کو لپٹا رہتا ہے، لیکن آخر کار اتنی گرفت بھی ہاتھ سے چھوٹ گئی، ادفونش پہلے ہی تاک لگائے بیٹھا تھا، یحییٰ القادر نے مجبور ہوکر

---

[1] یہ وہی ادفونش ہے، جس نے معتمد، ابن رشیق اور ابنِ عمار کو قزاق کہا تھا، ملاحظہ ہو حاشیہ کا صفحہ ۴۸۵ (مترجم اردو)

طلیطلہ کا علاقہ ادفونش کے سپرد کرنا چاہا، مگر چند شرطوں کے ساتھ، اور وہ شرطیں یہ تھیں کہ

۱- ادفونش اہل طلیطلہ کی جان اور مال کو محفوظ رکھے۔

۲- اگر طلیطلہ کے لوگ علاقہ چھوڑنا چاہیں تو انہیں منع نہ کیا جائے۔

۳- باشندگانِ شہر پر محصول صرف ایک لگایا جائے۔

۴- جامع مسجد پر مسلمانوں کا قبضہ رہے۔

۵- یحییٰ القادر کو بلنسیہ کی حکومت دی جائے

ادفونش نے یہ شرطیں منظور کرلیں، اور ۲۵ مئی ۱۰۸۵ء (۲۷ محرم ۴۷۸ھ) کو یہ عیسائی بادشاہ طلیطلہ کے شہر میں جو قوم قسیقوط کا قدیم دار السلطنت تھا بطور بادشاہ اور فرمانروا کے داخل ہوا۔

اب ایک طرف تو ادفونش کے غرور اور تکبر کی انتہا نہ تھی، اور دوسری طرف ذلت و غلامی، اور خوشامد حد سے گذری ہوئی تھی، چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے مسلمان رئیسوں نے ادفونش کے پاس اپنے ایلچی مبارکباد کہنے بھیجے، بڑی بڑی نذریں گذرانیں اور معروضے ارسال کئے کہ ہم آپ کے محصول جمع کرنے والے ہیں۔

ادفونش نے "حامی دین مسیح و اسلام" کا لقب اختیار کیا، لیکن مسلمانوں کو ذلیل اور حقیر سمجھنے میں کوتاہی نہ کی، قصہ مشہور ہے کہ حسام الدولہ والی شنتمریہ بنو رزین جب ادفونش کے دربار میں ایک بھاری نذر پیش کرنے خود آیا تو ادفونش اُس وقت ایک بندر سے کھیل رہا تھا، حسام الدولہ نے جب نذر پیش کی تو ادفونش بہت ہی نفرت و حقارت سے کہنے لگا کہ "اپنی نذر کے بدلہ میں میری طرف سے یہ بندر لے جاؤ" حسام الدولہ نے بجائے غصہ ظاہر کرنے کے اُس بندر کو ادفونش سے دوستی قائم رکھنے کا ایک ذریعہ سمجھا، اور خیال کیا کہ اب اُس کی ریاست کو دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں رہا[1]۔

---

[1] غالباً یہ قصہ پادری مورخوں کے قلم کا ہے، لیکن کچھ عجب نہیں کہ ایسا ہوا ہو، ملاحظہ کیجئے مسلمانوں کی خاطر و مدارات، جو ادفونش کے بزرگوں کے ساتھ ناصر و مستنصر نے کی تھی، جن کی امداد (باقی بر صفحہ آئندہ)

اذفونش کی حکومت میں طلیطلہ کے الحاق کے بعد اب بلنسیہ کے شامل ہونے کی نوبت آئی۔ بلنسیہ میں ابن عبد العزیز کے دو بیٹوں میں حکومت پر نزاع برپا تھا، ہر ایک کا ایک ایک فریق تھا۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا فریق ایسا تھا جو بلنسیہ کی حکومت کو مسلمان بادشاہ سرقسطہ کے سپرد کرنا چاہتا تھا، ایک چوتھا فریق بھی تھا، اس کی خواہش یہ تھی کہ یحییٰ القادر ذوالنونی، جس نے طلیطلہ کو اذفونش کے حوالے کیا ہے بلنسیہ کا بادشاہ بنے یہ چوتھا فریق جو یحییٰ القادر کا طرفدار تھا، کامیاب ہو گیا۔

القادر کے بادشاہ ہونے پر کون معترض ہو سکتا تھا، کیونکہ اذفونش کا لشکر ایک مشہور عیسائی سپہ سالار البرفانیز کی سرکردگی میں یحییٰ القادر کی مدد کے لیے موقع پر موجود تھا، اہل بلنسیہ کو جو اب القادر کی رعیت ہو گئے تھے، اس لشکر کے مصارف کے لیے چھ ہزار اشرفیاں روانہ کرنی پڑتی تھیں، یحییٰ القادر نے بہت کہا کہ "عیسائی لشکر کی اب ضرورت نہیں ہے، ہم سب آپ کی خیر خواہ رعایا ہیں" مگر اذفونش نے ایک نہ سنی، وہ ایسا بیوقوف نہ تھا کہ یحییٰ القادر کی بات کا یقین کر لیتا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ رعایا فی الحقیقت اس سے سخت نفرت کرتی ہے اور بلنسیہ کی حکومت کے جو لوگ مدعی ہیں، وہ ابھی تک امید رکھتے ہیں کہ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے، غرض اذفونش نے اپنی قشتالی فوج کو بلنسیہ ہی میں متعین رکھا۔

یحییٰ القادر نے اس لشکر کے مصارف ادا کرنے کے لیے ایک خاص محصول شہر اور تمام علاقہ بلنسیہ پر لگا دیا، اور بلنسیہ کے رئیسوں[1] سے بڑی بڑی رقمیں جبراً وصول کیں باوجود اس زور و زبردستی کے لشکر کے اخراجات کے لیے بقایا رقم القادر کے ذمے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حاصل کرنے کے لیے عیسائی بادشاہ دربار خلافت میں حاضر ہوتے تھے، اب یہ حالت ہے کہ ایک بندر نذر کے عوض میں لے کر ایک مسلمان سمجھتا ہے کہ عیسائی سے دوستی پکی ہو گئی ہے، جیسے بندر کی دوستی کا اعتبار نہیں، اسی طرح نذر کے معاوضہ میں بندر کا ملنا دوستی کی ضمانت نہ ہو سکا، جیسا کہ آگے ثابت ہوا۔ (مترجم اردو)

۱؎ ان میں ابن عبد العزیز کے بیٹے بھی تھے۔ کتاب تحقیقات (۱۸۸۱ء) جلد ۲ ص ۱۲۱

برابر لگتی رہی، سپہ سالار الورِ فانیز نے تقاضے شروع کیے، اور یحییٰ القادر کی حالت ایسی زبوں ہوئی کہ اُس کے پاس ایک حبہ نہ رہا، اُس نے مجبور ہو کر قشتالیہ کے لشکر والوں سے کہا کہ "بلنسیہ کے علاقے میں جاگیریں بانٹ لو، اور یہیں آباد ہو جاؤ، جاگیریں دینے کو میں تیار ہوں۔"

لشکریوں نے یہ بات منظور کر لی، لیکن جاگیریں لے کر انہوں نے زمین کی کاشت تو غلاموں کے سپرد کی، اور خود قرب و جوار کے ملک کو لوٹنے میں مصروف ہو گئے۔

اِن لشکر والوں کی تعداد ایسے لوگوں کے شامل ہونے سے، جو عربوں میں بدترین طبقے کے لوگ تھے، زیادہ ہوتی گئی۔

عیسائیوں اور عربوں کے علاوہ ایک بڑا گروہ غلاموں، مجرموں، اور بدمعاشوں کا بھی ساتھ ہو گیا، ان میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے اسلام ترک کر کے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا، اور اب وہ راس مسیحی قشتالی لشکر کے علم کے سائے میں آکر (لشکر والوں کی طرح) ظلم و جفاکاری میں شہرہ آفاق ہو گئے، مردوں کو قتل اور عورتوں کو بے عزت کرتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ اُن کا سلوک یہ تھا کہ شراب کے ایک مٹکے، یا ایک روٹی، یا آدھ سیر گوشت کے عوض میں ایک گرفتار شدہ مسلمان کو فروخت کر دیتے تھے، اگر کوئی مسلمان اُن کی قید میں آکر فدیہ ادا نہیں کرنا چاہتا تھا، یا ادا نہ کر سکتا تھا، تو اُس کی زبان کاٹ ڈالتے تھے، آنکھیں نکال لیتے تھے، یا کتوں سے اُنہیں پھڑوا ڈالتے تھے۔

اب بلنسیہ فی الواقع ادفونش کے قبضے میں تھا، یحییٰ القادر برائے نام صاحبِ بلنسیہ کہلاتا تھا، ریاست کا بہت سا حصہ قشتالی عیسائیوں کی دست برد میں تھا، بلنسیہ کو اپنی قلمرو میں شامل کرنے کے لیے ادفونش کی زبان کی ایک جنبش کافی تھی، سرقسطہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلتا معلوم ہوتا تھا، ادفونش نے اُس کا محاصرہ کر رکھا تھا اور قسم کھائی تھی کہ سرقسطہ کو فتح کر کے چھوڑے گا۔

سرقسطہ سے دور اسپین کے جنوب مشرقی حصے میں ادفونش کا ایک نائب غرسیہ زمی نیز نامی سواروں کی ایک فوج لے کر حصن اللبیط پر متصرف ہو گیا تھا، یہ قلعہ شہر لورقہ (۶۹۴)

سے دُور نہ تھا، غرسیبہ زمی نیز کا نائب اس قلعہ سے المریہ کے علاقہ پر لوٹنے کی غرض سے اکثر دھاوے کیا کرتا تھا۔

غرناطہ بھی ادفونش کے حملوں سے نہ بچ سکا، کیونکہ ۴۷۸ھ کی ربیع میں قشتالیہ کی فوج نے قریہ نبار تک جو غرناطہ سے مشرق میں ایک فرسخ کے فاصلہ پر تھا، حملے کیے تھے اور خاص نبار میں مسلمانوں سے معرکہ کیا تھا، مسلمانوں کی اب یہ حالت تھی کہ اگر خود پانچ ہوتے تھے اور قشتالی عیسائی اکیلا ہوتا تھا تو بھی لڑنے کی ہمت نہ رکھتے تھے، قشتالیہ کے اسّی عیسائیوں نے المریہ کے چار سو لڑنے والے مسلمانوں کو شکست دے دی۔

غرض یہ حالات صاف ظاہر کر رہے تھے کہ اسپین کے عرب اگر اپنے ہی بھروسے پر رہے، تو دو باتوں میں سے ایک بات ہونی ضروری ہے۔ یا تو مسلمان عیسائی بادشاہ ادفونش ششم کی رعیت بن کر رہیں، اور یا ملک سے نکل جائیں۔

چنانچہ بہت سے مسلمان ملک چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے، ایک شاعر نے اسی زمانہ میں کہا تھا "اندلس کے مسلمانو! رحلت اختیار کرو، اب یہاں رہنا جنون ہے۔"

باوجود اس کے مسلمانوں کا ملک سے قطعی نکل جانا نہایت مشکل کام تھا، عربوں کو بالعموم یہ قصد پسند نہ آیا، وہ سوچتے تھے کہ ابھی تک کچھ نہیں گیا ہے، افریقہ سے مدد ملنی ممکن ہے، اور اب افریقہ ہی وہ ملک تھا جس کی طرف لوگ امید کی نظروں سے دیکھنے لگے، اور سمجھنے لگے کہ اگر پناہ ملے گی تو اسی کے ہاتھوں ملے گی، ایک تحریک یہ ہوئی کہ افریقیہ کے بدوؤں سے مدد مانگنی چاہیئے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوا کہ افریقیہ کے بدوی جس قدر لڑائی میں بہادر مشہور ہیں اسی قدر وحشی اور ظالم بھی ہیں، اور اگر وہ اسپین میں بلائے گئے تو عیسائیوں سے لڑنے کی بجائے وہ مسلمانوں کو لوٹنے لگیں گے، اس کے بعد المرابطین کا خیال آیا کہ ان سے مدد لی جائے، یہ افریقہ کے صحرائے اعظم کے رہنے والے بربر تھے اور شہرت کے میدان میں پہلی ہی بار انہوں نے قدم رکھا تھا، شہر سجلماسہ کے ایک واعظ نے حال میں انہیں مسلمان کیا تھا، مسلمان ہو کر ملک گیری میں انہوں نے بہت جلد ترقی کی، جس زمانہ تک ہم اس تاریخ میں پہنچے ہیں، اُس وقت تک مرابطین

کی سلطنت مغرب میں دریائے سنیگال سے شروع ہوکر مشرق میں الجزائر تک پہنچ چکی تھی۔
مرالطبین کو اندلس میں بلا کر مدد لینے کا خیال خصوصیت کے ساتھ علمائے دین کو پیدا
ہوا، ملوک الطوائف یعنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے بادشاہوں کو اس میں مدت تک
پس و پیش رہا، معتمد بادشاہِ اشبیلیہ، اور متوکل بادشاہ بطلیوس، بادشاہِ مرالطبین
یوسف بن تاشفین سے خط و کتابت رکھتے تھے، اور انہوں نے کئی بار اس حد تک
ارادہ کیا تھا کہ عیسائیوں سے لڑنے کے لیے یوسف بن تاشفین سے مدد لینے کی درخواست
کریں، لیکن اندلس کی اور ریاستوں کے مسلمان فرمانروا بالعموم صحرائے افریقہ کی ایک
وحشی اور متعصب قوم کے بادشاہ کے ساتھ کچھ ہمدردی نہ رکھتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ
بجائے دوست و رفیق رہنے کے وہ ایک خطرناک دشمن اور حریف ہو جائے گا۔ لیکن
عیسائیوں کی طرف سے اندیشہ اس قدر بڑھتا گیا کہ حفاظت کی صورت صرف یوسف بن
تاشفین سے رجوع کرنے میں نظر آئی، کم از کم معتمد بادشاہِ اشبیلیہ کی تو یہی رائے ہوئی
اور جب اُس کے بیٹے رشید نے وہ خطرے بتائے جو مرالطبین کو اندلس میں مدعو کرنے سے
ہو سکتے تھے تو معتمد نے جواب دیا "لیکن میں اپنے اخلاف سے یہ ملامت سُننی نہیں
چاہتا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے اندلس کو چھوڑ کر اُسے کفار کا شکار بنایا، مجھے گوارا
نہیں ہوگا کہ ہر مسجد کے منبر سے مجھ پر لعنت کی آواز بلند ہو، رہا اپنا ذاتی خیال، تو وہ یہ ہے (۶۹۵
کہ افریقہ میں اونٹ چرانے کی خدمت کو اس سے بہتر سمجھوں گا کہ قشتالیہ میں سُور چراؤں"۔
معتمد نے اب مصمم قصد کر کے قریب کے ملوک الطوائف میں سے عمر متوکل بادشاہِ
بطلیوس، اور بادلیس کے پوتے عبداللہ بادشاہِ غرناطہ کو لکھا کہ اب متحد و متفق ہو کر کام
کرنے کا وقت آگیا ہے، اور اُن کا فرض ہے کہ اپنے اپنے دارالحکومت کے قاضیوں کو
سفارت کے لیے نامزد کریں۔

۱ ۴۶۶ھ/۱۰۷۳ء میں بادلیس بادشاہِ غرناطہ کا جب انتقال ہوگیا، تو اس کی ریاست دو پوتوں میں اس طرح
تقسیم ہوئی کہ غرناطہ عبداللہ کو، اور مالقہ تمیم کو دیا گیا۔

اس درخواست کے مطابق بطلیوس کے قاضی ابو اسحاق ابن مکانا، اور غرناطہ کے قاضی ابو جعفر قلیعی نامزد ہو کر اشبیلیہ آئے، معتمد نے ابن ادہم قاضی قرطبہ، اور اشبیلیہ کے وزیر ابوبکر ابن زیدون کو سفارت میں اور اضافہ کیا، اور یہ سب لوگ جزیرۃ الخضراء پہنچ کر وہاں سے جہاز پر سوار ہو، یوسف بن تاشفین کے پاس افریقہ پہنچے۔

ان سفیروں کو اپنے اپنے بادشاہ کی طرف سے اجازت تھی کہ یوسف کو مع اُس کے لشکر کے اندلس میں آنے کی دعوت دیں، لیکن اس کے ساتھ یہ ہدایت بھی تھی کہ چند شرطیں بھی یوسف بن تاشفین سے کرالی جائیں، ان شرائط کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچی، صرف اتنا دریافت ہوتا ہے کہ یوسف نے قسم کھائی کہ وہ اندلس کے کسی مسلمان بادشاہ کی ریاست پر قبضہ نہ کریں گے۔

اس شرط کے بعد یہ ضروری ہوا کہ کوئی خاص مقام اسپین کے ساحل پر مقرر کیا جائے جہاں یوسف بن تاشفین جہاز سے اُتریں، ابن زیدون نے جبلِ طارق کی بندرگاہ تجویز کی، لیکن یوسف نے جزیرۃ الخضراء کو ترجیح دی، اور کہا کہ یہ شہر اُن کے حوالے کر دیا جائے ابن زیدون نے کہا کہ "اس کا مجھے اختیار نہیں دیا گیا"۔

اتنا سُن کر یوسف نے سفیروں سے سرد مہری کا برتاؤ کیا، اور اُن کے سوالوں کا جواب مبہم طور پر دینے لگا۔ غرض جس وقت اہلِ سفارت یوسف سے رخصت ہوئے تو کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ "یوسف کیا ارادہ رکھتے ہیں؟ اور کیا کریں گے؟ اسپین آنے کا انہوں نے نہ اقرار کیا ہے نہ انکار۔"

اسپین کے ملوک الطوائف اسی پریشانی میں تھے کہ ایک واقعہ نے اس پریشانی کو رفع کر دیا، مگر وہ واقعہ فی نفسہٖ ایسا تھا جو ناگوار گذرا، اور یوسف کی طرف سے جو اندیشہ ملوک الطوائف کو پہلے سے تھا، وہ اور بھی پختہ ہو گیا۔

یوسف بن تاشفین کوئی کام بغیر فقہاء کے مشورے کے نہ کرتے تھے، چنانچہ اندلس جانے کے بارے میں بھی ان لوگوں سے استصواب کیا، فقیہوں نے کہا کہ قشتالیہ کے عیسائیوں سے جنگ کرنی یوسف کا فرض ہے، اور اس کے لیے اگر جزیرۃ الخضراء تفویض نہیں کیا جاتا تو

خود اُس پر قبضہ کر لیا جائے۔

فقیہوں کے اِس فتوے پر یوسف اندلس جانے پر آمادہ ہو گئے اور حکم دیا کہ ایک بڑا لشکر بندرگاہ سبتہ سے سنو جہازوں کے بیڑے میں سوار ہو کر جزیرۃ الخضراء روانہ ہو جائے۔

چنانچہ اِس حکم کے بعد بہت جلد جزیرۃ الخضراء کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک بڑے لشکر نے اُن کے شہر کو گھیر لیا ہے، اور لشکر والوں نے رسد حاصل کرنے، اور شہر پر قابض ہونے کے لیے ایک حشر برپا کر رکھا ہے۔

معتمد کا فرزند راضی جو اِس وقت جزیرۃ الخضراء کا حاکم تھا سخت پریشان ہوا کہ اس مشکل کو کیونکر حل کرے؟ مرابطین کے لشکر کو سامانِ رسد تو پہنچاتا رہا، لیکن جب انھوں نے لڑنا چاہا تو راضی بھی کلہ بکلہ جواب دینے کو مستعد ہو گیا، مگر فوراً ہی کبوتروں کی ڈاک سے ایک خط اپنے والد معتمد کو اِس مضمون کا بھیجا کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ معتمد نے یوسف بن تاشفین کی اِس حرکت کو کہ بغیر اجازت یا اطلاع کے اسپین کے ساحل پر چلے آئے، سخت اعتراض کے قابل بات سمجھا۔

بہرکیف اب معاملہ کی صورت ایسی ہو گئی تھی کہ معتمد نے بات بڑھانی نہیں چاہی اور (۶۹۶
جہاں تک امکان میں تھا، بطریقِ احسن اُسے طے کرنے کی کوشش کی، چنانچہ فوراً راضی کو لکھا کہ "جزیرۃ الخضراء خالی کر کے رندہ چلا جائے"۔

اس اثنا میں یوسف کی مزید فوجیں سبتہ سے جہاز لے کر جزیرۃ الخضراء آئیں، اور آخر میں یوسف بن تاشفین بھی آ موجود ہوئے، آتے ہی جزیرۃ الخضراء کی فصیلوں اور برجوں کو مستحکم کیا، لڑائی کا سامان، اور کھانے پینے کی چیزیں بکثرت شہر میں جمع کر کے ایک زبردست فوج وہاں مقیم کر دی، اور لشکر کے بڑے حصے کو ساتھ لے، یوسف اشبیلیہ روانہ ہو گئے، معتمد گھوڑے پر سوار ہو، ارکینِ دولت کو ہمراہ لیے شہر کے باہر استقبال کے لیے نکلے، جس وقت دونوں قریب آئے تو معتمد نے یوسف کے ہاتھ کو بوسہ دینا چاہا، مگر یوسف نے بہت محبت اور اخلاق سے انہیں بغل گیر کیا، تحفے تحائف بھی جو ایسے موقعوں پر پیش ہوا کرتے ہیں پیش ہوئے، معتمد نے جو تحائف و ذخائر نذر میں پیش کیے تھے، وہ اتنے تھے کہ

یوسف بن تاشفین اپنے لشکر کے ہر سپاہی کو اُس میں سے کچھ تقسیم کر سکے، اور اسپین کی دولت کا اندازہ اُنہوں نے ایک بڑے پیمانہ پر کیا۔

لشکر نے شہرِ اشبیلیہ کے قریب قیام کیا، بادلیس کے دو پوتے، عبداللہ صاحب غرناطہ اور تمیم صاحب مالقہ یہاں آکر مرابطین کے ساتھ ہو گئے۔ عبداللہ کے ساتھ تین سَو اور تمیم کے ساتھ دو سَو سوار تھے، معتصم صاحب المریہ نے سواروں کا ایک رسالہ اپنے لڑکے کی سرکردگی میں اِس معذرت کے ساتھ بھیجا کہ "حصن اللبیط کے عیسائیوں نے اُسے ایسا منتشر کر رکھا ہے کہ خود حاضر نہیں ہو سکتا"۔

آٹھ دن کے بعد امیر مرابطین یوسف کا لشکر اشبیلیہ سے اُٹھ کر بطلیوس کی طرف چلا، اب متوکل صاحب بطلیوس، اور اُس کی فوج یوسف کے لشکر سے آملی، اور اِس طرح فوجیں مجتمع ہو کر طلیطلہ کے قصد سے آگے بڑھیں، مگر زیادہ دُور نہ گئی تھیں کہ دشمن سامنے آگیا۔

اسپین میں مرابطین کے داخلے کی خبر اذفونش نے اُس وقت سُنی جب کہ وہ سرقسطہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا، یہ سمجھ کر کہ بادشاہ سرقسطہ احمد المستعین کو مرابطین کے اندلس میں وارد ہونے کی اطلاع ابھی نہیں پہنچی ہو گی، کہلا بھجوایا کہ اگر مستعین ایک رقم کثیر ادا کرے تو محاصرہ اٹھا لیا جائے گا، مگر مستعین کو پہلے ہی خبر لگ چکی تھی، اُس نے فوراً جواب دیا کہ "میں ایک درہم بھی نہ دُوں گا"، اب اذفونش مجبور ہوا، اور سرقسطہ کا محاصرہ اُٹھا طلیطلہ کا رُخ کیا، اور اپنے سپہ سالار البرفانیز، اور دیگر افسرانِ فوج کو حکم بھیجا کہ اپنی اپنی فوجیں لے کر طلیطلہ پر ملیں۔

جس وقت اذفونش کی فوجیں یکجا ہو گئیں، جن میں بہت سے فرانس کے معزز شہسوار بھی آکر مل گئے تھے، تو اذفونش نے مسلمانوں کے مقابلہ میں خود ہی تقدیم کی، مرابطین، اور مرابطین کے اتحادیوں سے ایک مقام پر جو بطلیوس سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا، اور جس کا نام مسلمان مورخوں نے زلاقہ، اور عیسائیوں نے ساکری لیاس لکھا ہے، اُس کا مقابلہ ہو گیا اذفونش کا لشکرگاہ ابھی پورا درست نہ ہوا تھا کہ یوسف بن تاشفین کا خط اِس مضمون کا اُس کے نام آیا کہ "یا تو اسلام قبول کرو، یا جزیہ دو، اور اگر اِن دونوں باتوں سے اِنکار

ہے تو ہم تم سے لڑیں گے۔"

ادفونش اِس خط کو پڑھ کر بہت برہم ہوا، اور عرب کاتب جو لشکر میں حاضر تھے اُن سے جواب لکھوایا "چونکہ اسپین کے مسلمان بادشاہ کئی سال سے میرے باجگذار ہیں، اِس لیے میں تمہاری اس گستاخانہ تحریر کی کچھ پروا نہیں کرتا۔" اِس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ "میرے پاس ایسا زبردست لشکر موجود ہے جو دشمنوں کے غرور کو ڈھا دے گا۔" (۶۹۰

جس وقت ادفونش کا یہ خط دارالانشاء میں پہنچا تو ایک اندلسی کاتب نے فوراً اس کا جواب لکھا، مگر اِس جواب کی عبارت یوسف کو بہت پُر تکلف معلوم ہوئی، اور اُسی خط پر اپنے قلم سے یہ سادے الفاظ لکھ دیئے "جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ تم خود ہی دیکھ لو گے۔" یہ خط جواب میں ادفونش کے پاس بھیج دیا گیا۔

اُس زمانہ کا دستور تھا کہ فریقین لڑائی سے پہلے باہمی تصفیہ سے ایک دن لڑائی کا مقرر کر لیا کرتے تھے، چنانچہ جمعرات کے دن ۲۲ر اکتوبر ۱۰۸۶ء د ۱۲ر رمضان ۴۸۰ھ کو ادفونش نے مسلمانوں کو یہ پیغام بھیجا کہ "جمعہ تمہارا مبارک دن ہے، اور اتوار ہمارا، اِس لیے مناسب ہوگا کہ اتوار کے دوسرے دن لڑائی شروع کی جائے۔"

امیر یوسف نے اِس تجویز سے اتفاق کر لیا، لیکن معتمد کو شبہ ہوا کہ ادفونش نے اس میں کوئی فریب سوچا ہے، اِس خیال سے کہ اسلامی لشکر میں اندلسیوں کی فوج سب سے آگے، اور مرابطین کی فوجیں پہاڑوں کی آڑ میں پیچھے ہیں، دشمن کے یکایک حملے کا پورا زور اندلسی فوج کو برداشت کرنا ہوگا، ایسے اچانک حملے سے بچنے کے لیے معتمد نے بہت ہی احتیاط سے کام لیا، دشمن کی نقل و حرکت سے خبردار رہنے کے لیے کچھ سواروں کو آگے روانہ کر دیا، معتمد اِس وقت بہت گھبرا رہے تھے، نجومیوں سے بار بار سوال کرتے تھے، وقت بہت نازک آگیا تھا، اِسی ایک لڑائی پر کل اسپین کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، قشتالی فوجیں مسلمانوں سے تعداد میں کہیں زیادہ تھیں، مسلمانوں کے اندازے سے عیسائی لڑنے والوں کی تعداد پچاس اور ساٹھ ہزار کے درمیان تھی، اور اِن کے مقابلے میں مسلمان بیس ہزار سے زائد نہ تھے۔

جمعہ کے دن (۱۳ا رمضان ۴۷۹ھ) علی الصباح معتمد کو معلوم ہوگیا کہ اوفونش کی طرف سے فریب و دغا کا جو اندیشہ تھا، وہ غلط نہ تھا۔ سواروں نے آکر خبر دی کہ عیسائیوں کی فوجیں مقابلے کے لئے آرہی ہیں، معتمد کی حالت اس وقت نازک تھی، اندیشہ یہ تھا کہ مرابطین کے آنے تک کہیں اپنی فوج بالکل غارت نہ ہوجائے، اُس نے یوسف کو کہلا بھیجا کہ "اپنی کل فوج لے کر مدد کو آئیں یا کم از کم ایک زبردست کمک روانہ کریں۔"

امیر یوسف کو جلدی کی کوئی وجہ نہ تھی، لڑائی کا جو نقشہ اُنہوں نے سوچا تھا اُس پر قائم تھے، اندلسی فوجوں کی اُنہیں پروانہ تھی، بلکہ اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ "اگر یہ سب کے سب مارے جائیں تو ہمیں پروا نہیں، کیونکہ یہ ہمارے دشمن ہیں۔"

یہ حالت دیکھ کر کہ کوئی مددگار نہیں ہے بہت سے اندلسی میدان سے ہٹ گئے صرف اشبیلیہ کی فوجیں معتمد کی ہمت بڑھانے سے میدان میں جم کر لڑتی رہیں، لڑائی میں اگرچہ معتمد کے چہرے اور ہاتھ پر زخم آئے۔ مگر وہ نہایت دلیری اور ہمت سے لڑتے رہے، یہاں تک کہ امیر یوسف کے پاس سے کمک آگئی۔

اب لڑائی تعداد کے لحاظ سے اتنی بے جوڑ نہ رہی جتنی پہلے تھی، مگر اشبیلیہ کی فوجیں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ اوفونش کی فوجیں میدان چھوڑ کر یک لخت بھاگ رہی ہیں۔ حالانکہ امیر یوسف نے جو کمک معتمد کو بھیجی تھی وہ ایسی نہ تھی کہ مسلمانوں کو فتح کی امید ہوجاتی واقعات جو پیش آئے وہ یہ تھے کہ امیر یوسف نے یہ دیکھ کر کہ اوفونش کی فوجیں مسلمانوں سے لڑنے میں مصروف ہیں۔ عیسائیوں کے عقب سے اُن پر حملہ کرنا چاہا معتمد کے پاس صرف اتنی کمک بھیج کر کہ عیسائی معتمد کی فوجوں کو نیست و نابود نہ کردیں خود چکر کاٹ کر اپنی پوری قوت سے اوفونش کے لشکر گاہ پر حملہ آور ہوا، عیسائی سواروں کے رسالے جو لشکر گاہ کی حفاظت پر مقرر تھے، اُن میں امیر یوسف نے قتل و غارت کا بازار گرم کردیا اور لشکر گاہ میں آگ لگا کر عقب والی عیسائی فوجوں پر ایسا زبردست بلغار کیا کہ وہ تاب نہ لاسکیں، آگے عیسائی بھاگ رہے تھے اور پیچھے امیر یوسف کے رسالے تھے، اب اوفونش نے دیکھا کہ دشمن نے ہر طرف سے اُسے گھیر لیا ہے اور چونکہ اسلامی

فوجیں جو عیسائیوں کے عقب پر حملہ کر رہی تھیں، تعداد میں اُن فوجوں سے زیادہ تھیں جو سامنے سے حملہ کرتی تھیں، اس لئے اوفونش مجبور ہوا کہ اپنے قلب کی فوجوں کو عقب کی فوجیں بچانے کے لئے کام میں لائے۔

اب بہت زور کی لڑائی ہوئی اور اوفونش کے لشکرگاہ پر امیر یوسف نے بار بار قبضہ کیا اور اپنی فوجوں میں للکارتے رہے "مسلمانو! ہمت سے کام لو، تمہارے سامنے خدا کے دشمن ہیں اور جو مسلمان اس لڑائی میں شہید ہوں گے۔ جنت اُن کی منتظر ہے"

اندلسی، جو شروع میں میدان سے ہٹ گئے تھے، اب پھر یکجا ہو کر معتمد کی مدد کو آئے، اِدھر تو یہ ہوا، اُدھر امیر یوسف نے اپنے اسودی سواروں کو جن سے اب تک کچھ کام نہیں لیا تھا عیسائی فوجوں پر دھر لیکایا اور اب اِن سیاہ فام افریقیوں نے عیسائیوں میں ایک تہلکۂ عظیم برپا کر دیا، ایک اسودی راستہ کاٹتا ہوا اوفونش تک پہنچ گیا، اور اپنے خنجر سے اس کی ران میں زخم پہنچایا۔

جب رات ہوئی تو اس لڑائی میں جو نہایت سخت تھی، فتح کا سہرا مسلمانوں کے سر بندھا، اوفونش کی فوجوں کے زیادہ تر لوگ میدانِ کارزار میں زخمی یا مردہ پڑے تھے، باقی سب میدان چھوڑ کر بھاگ گئے اور اوفونش بادشاہِ قشتالیہ، لیون و جلیقیہ پانچ سواروں کے ساتھ بمشکل تمام میدان سے بھاگ سکا ۲۳ اکتوبر ۱۰۸۶ء مطابق ۱۲ رمضان ۴۸۰ہجری)

مسلمانوں کو اس جنگ میں اگرچہ شاندار فتح حاصل ہوئی، مگر اس سے اُن کے حق میں وہ تمام فوائد پیدا نہیں ہوئے جن کی توقع تھی، امیر یوسف کا ارادہ تھا کہ عیسائیوں کے ملک میں دُور تک پہنچے، لیکن یہ قصد اس وجہ سے ترک کرنا پڑا کہ اُن کے بڑے لڑکے کے مرنے کی خبر آئی جسے سبتہ میں بیمار چھوڑ آئے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے یہی کافی سمجھا کہ تین ہزار سپاہ معتمد کے پاس چھوڑ کر باقی فوجوں کو لئے ہوئے افریقیہ واپس چلے جائیں۔[۱]

۱؎: جنگِ زلاقہ کے حالات پادری مورخوں نے جن کی تصنیفات لاطینی زبان میں ہیں، بہت ربانی پر (صفحہ آئندہ)

اسناد :-

عباد	ج ۱ ص ۱۶۹ ، ۱۷۵	
	ج ۲ ص ۸ ، ۱۷ تا ۲۳ ، ۲۷ ، ۳۷ تا ۳۸	
	۱۷۴ تا ۱۷۵ ، ۱۸۷ تا ۱۸۹ ، ۱۹۱ ، ۱۹۳ ،	
	۲۳۱ ، ۲۳۸ تا ۲۳۹	
قرطاس	ص ۹۲ ، ۱۰۹	
روڈریگو طلیطلی	ج ۶ ص ۲۳	
ابنِ خلکان	ج ۱۲ ص ۱۶	
ابنِ خلدون (تاریخ بربر)	ج ۲ ص ۷۷ (ترجمہ)	
ابن الخطیب (قلمی نسخہ E) مقابل پر مضمون		
مقری	ج ۲ ص ۶۷۲	
عبدالواحد	ص ۹۱ ، ۹۳	

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کم لکھے ہیں ، عرب مورخوں نے اس لڑائی کے بیان میں نہایت تفصیل سے کام لیا ہے ، مگر بعض غلطیاں بھی کی ہیں (یہاں ڈوزی نے مسلمان مورخوں کی غلطیاں نہیں بتائیں، غالباً وہ "غلطیں" اسی وجہ سے غلطیاں سمجھی گئی ہوں گی کہ پادری مورخوں کے بیانات کے خلاف پڑتی ہوں گی ، مگر یہ پادری مورخ ایسے تھے جن کی نسبت خود حال کے ایک عیسائی مورخ کا قول ہے کہ "جہاں کسی دوسرے مذہب یا قوم کا ذکر آئے وہاں ان پادریوں کے بیان کو یقین کرنے میں جلدی نہ کی جائے" مترجم اردو)

کتاب رابع

ملوک الطوائف

تیرھویں فصل

یوسف بن تاشفین

اسپین میں مرابطین کے وارد ہوتے ہی اوفونش کی قشتالی فوجیں اِدھر تو بلنسیہ سے نکل گئیں اور اُدھر سرقسطہ کا محاصرہ اُنہیں مجبوراً اُٹھا لینا پڑا اور زلاقہ کی شکستِ فاش نے اوفونش کو اُس کی بہترین سپاہ سے محروم کر دیا، اس لڑائی میں بعض مسلمان مورخوں نے دس ہزار اور بعض نے چوبیس ہزار قشتالی عیسائیوں کا قتل ہونا بیان کیا ہے۔

اِس جنگِ عظیم سے علاوہ اِس نتیجہ کے ملوک الطوائف کو اس شرمناک مجبوری سے کہ وہ اوفونش کو سالانہ خراج ادا کریں، نجات ملی، یہ بھی فائدہ ہوا کہ اسپین کے مغربی اضلاع میں جہاں قلعوں کی حفاظت اب امیر یوسف کی پسماندہ فوجوں کے سپرد تھی، اوفونش کے حملوں کا مطلق خوف نہ رہا۔

غرض جنگ زلاقہ میں فتح پانے سے یہی فوائد تھے جو مسلمانوں کو فوراً حاصل ہوئے۔

اور مسلمانانِ اسپین کے خوش ہونے کے لئے کافی اسباب پیدا ہو گئے، سارا ملک خوشی کے نعروں سے گونج اُٹھا، امیر یوسف کا نام ہر شخص کی زبان پر تھا، ہر جگہ اُن کے زہد و اتقاء جوانمردی و شجاعت اور حربی کمالات کی تعریفیں ہونے لگیں، امیر یوسف عیسائیوں کے جور و ظلم سے پناہ دینے والے اور اندلس اور اسلام دونوں کے محافظ سمجھے گئے، فقہا اور علمائے دین ان کی مدح و ثنا میں سب سے زیادہ سرگرم ہوئے، اُن کی نظروں میں امیر یوسف صرف فاتح ہی نہ تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر کوئی ہستی تھے جسے خدا نے اپنے بندوں کی حفاظت کے لئے دنیا میں پیدا کیا تھا۔

اگرچہ فتح زلاقہ نہایت عظیم الشان فتح تھی، مگر ایسی نہ تھی جس سے مسلمانوں اور عیسائیوں کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہو گیا ہو، کم سے کم قشتالیہ کے عیسائیوں نے تو اُسے اسی نظر سے دیکھا۔

باوجودیکہ عیسائیوں نے پے در پے شکستیں کھائیں، مگر جو کچھ ہاتھ سے گیا، اُسے پھر حاصل کرنے کی امید منقطع نہ ہونے دی، اسپین کے مغربی علاقوں میں بطلیوس اور اشبیلیہ کی سلطنتوں پر حملہ کرنے کو عیسائی اپنے حق میں خطرناک سمجھتے تھے، لیکن اسپین کے مشرقی حصے کو فتح کرنا، یا فتح نہ ہو سکے تو اُسے غارت اور تباہ کرنا ممکن سمجھتے تھے۔ مشرقی اسپین کی چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں مثلاً بلنسیہ، مرسیہ، لورقہ اور المریہ سب کمزور ریاستیں تھیں اور ان سب کے وسط میں ایک مقام پر قشتالیہ کے عیسائیوں نے ایسے قدم جمائے تھے کہ فی الواقع ان اسلامی ریاستوں پر وہ بالکل حاوی ہو گئے تھے، اس مقام کا نام حصن الیبط تھا، جس کے کھنڈر مرسیہ اور لورقہ کے درمیان اب تک نظر آتے ہیں۔

حصن الیبط کا قلعہ ایک اونچے پہاڑ پر تھا اور اتنا وسیع تھا کہ اُس میں بارہ تیرہ ہزار فوج سکونت رکھ سکتی تھی اور یہ قلعہ اس درجہ محفوظ و مستحکم سمجھا جاتا تھا کہ اُس کا فتح ہونا لوگ غیر ممکن خیال کرتے تھے۔

اس قلعہ پر قشتالیوں کا قبضہ تھا اور یہ لوگ یہاں سے نکل کر قرب و جوار کے تمام

علاقوں میں رہزنی اور لوٹ مار کیا کرتے تھے اور یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ قشتالی المریہ لورقہ اور مرسیہ کے شہروں کا محاصرہ کر چکے تھے اور بہ ظاہر ہوتا تھا کہ اگر ان شہروں کو محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ کی تو یقیناً ایک دن عیسائیوں کا ان پر قبضہ ہو جائے گا۔

معتمد سمجھ گئے تھے کہ اسپین کے مشرقی علاقوں کو کیسا خطرۂ عظیم درپیش ہے اور خطرہ نہ صرف ان علاقوں کو ہے، بلکہ خود معتمد کا نفع یا نقصان اس میں شامل ہے، کیونکہ مرسیہ اور لورقہ کے علاقے جن کو عیسائیوں کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا، دراصل معتمد کی ملکیت تھے، ایک از روئے استحقاق اور دوسرا از روئے واقعہ اس لئے کہ لورقہ کے بادشاہ ابن الیسع نے جب دیکھا تھا کہ حصن اللبیط کے عیسائیوں سے مقابلہ کی طاقت اُس میں نہیں ہے، تو معتمد کو اُس نے اپنا بادشاہ اس غرض سے تسلیم کر لیا کہ معتمد اس کو عیسائیوں سے محفوظ رکھیں گے۔ مرسیہ پر ابن رشیق نے قبضہ کر رکھا تھا۔ حالانکہ وہ معتمد کا تھا۔ معتمد اس باغی ابن رشیق کو سخت سزا دینی چاہتے تھے۔

غرض معتمد نے اسپین کے مشرقی حصے پر فوج کشی کا مصمم قصد کر لیا، اس عزم کے دو بڑے مقصد تھے، ایک یہ کہ عیسائیوں کی لوٹ مار سے علاقوں کو محفوظ کرے، دوسرے ابن رشیق باغی کو مطیع کرے، اور انہیں دونوں مقاصد کے پیش نظر معتمد کچھ اپنی فوجیں اور کچھ امیر یوسف کے رسالے لے کر لورقہ کے قصد سے چل پڑے۔

معتمد جب لورقہ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ نزدیک ہی تین سو قشتالی سواروں کا رسالہ پڑا ہوا ہے۔ معتمد نے اپنے فرزند راضی کو حکم دیا کہ تین ہزار اشبیلی سواروں سے قشتالیوں پر حملہ کرے، راضی نے جسے لڑائی سے زیادہ شوق کتابیں پڑھنے کا تھا، بیماری کا عذر کر کے اس معرکہ پر جانے سے انکار کیا۔ معتمد کو اس بات پر بہت غصہ آیا اور انہوں نے اپنے دوسرے فرزند کو جس کا نام معتد تھا، تین ہزار سواروں کا افسر کر کے قشتالیوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔ لیکن اب پھر اندلسی مسلمانوں کے مقابلہ میں قشتالی عیسائیوں کا بہتر سپاہی ہونا ثابت ہو گیا، اشبیلیہ کے تین ہزار سواروں کو تین سو قشتالی سواروں نے شکست دے دی۔

مرسیہ کو مغلوب کرنے کی کوشش میں بھی معتمد کو کچھ کامیابی نہیں ہوئی، معتمد کے اشبیلی لشکر میں مرابطیوں کے رسالے بھی تھے ان مرابطیوں سے ابن رشیق نے دوستی کر کے انھیں اپنا ہمدرد بنا لیا تھا، نتیجہ اس فوج کشی کا یہ ہوا کہ معتمد کا ایک کام بھی نہ نکلا، نہ لورقہ پر قبضہ ہوا نہ مرسیہ پر اور معتمد اشبیلیہ واپس چلے آئے۔

یہ بات ثابت ہو گئی کہ فتح زلاقہ کے بعد بھی اندلس کے مسلمان، دشمن سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے میں ایسے ہی لاچار اور بے بس ہیں جیسے کہ اس فتح سے پہلے تھے، سب لوگ اس خیال پر متفق تھے کہ اگر امیر یوسف ایک بار پھر اُن کی مدد کو اسپین نہ آئے تو سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ چنانچہ اندلس کے فقیہوں اور بلنسیہ، مرسیہ، لورقہ اور بیاسہ کے رئیسوں نے افریقہ پہنچ کر امیر یوسف کے قصر پر ہجوم کیا اور اپنا اپنا حال اُن سے عرض کیا، بلنسیہ والوں کو رزریق قنبیطور سے شکایت تھی، یہ عیسائی سردار (البورفا نیز سپہ سالار اوفونش کی طرح) یحییٰ القادر ذوالنونی سے اس بات کو ظاہر کر کے کہ وہ اس کا محافظ ہے چھ ہزار اشرفیاں ماہوار جبراً وصول کیا کرتا تھا اور باغیوں کو مطیع کرنے کے حیلے ۷۰۱
سے تمام ملک کو لوٹنے اور غارت کرنے میں مصروف رہتا تھا، بلنسیہ کے علاوہ منفصل علاقوں میں مسلمانوں کو حصن الیبط کے قشتالیوں سے سخت شکایت تھی کہ انھوں نے بڑے ظلم ڈھا رکھے ہیں یہاں کے لوگ بھی اس امر میں متفق الرائے تھے کہ اگر امیر المسلمین یوسف بن تاشفین مسلمانوں کی مدد کو دوبارہ نہ آئے تو مسلمان عیسائیوں کا لقمہ ہو جائیں گے۔

لیکن امیر المسلمین پر مسلمانانِ اندلس کی اس منت و نزاری کا زیادہ اثر نہ ہوا، یہ سچ ہے کہ انھوں نے ان لوگوں سے وعدہ کیا کہ جب موسم مناسب ہو گا تو وہ سمندر عبور کر کے اندلس میں پھر وارد ہوں گے، لیکن اس روانگی کے لئے انھوں نے کسی قسم کی تیاری کا حکم نہیں دیا اور سب لوگوں کے سامنے نہ کہا، مگر کنایۃً ظاہر کیا کہ اس قسم کی درخواست شاہانِ اندلس کی طرف سے ہونی چاہیئے تھے۔

لے مقابلہ کرو ڈوزی کی کتاب تحقیقات (۱۸۸۱ء) جلد ۲ ص ۱۲۸

اتنی خبر سن کر معتمد نے اس قسم کی درخواست بھیجنے کا قصد کر لیا، امیر یوسف کی اصلی نیت کی طرف سے معتمد کو جو کچھ بدگمانی پہلے تھی وہ رفتہ رفتہ جاتی رہی تھی ایا یہ کہیے کہ اب اُس بدگمانی کا زور گھٹ گیا تھا، کیونکہ سوائے جزیرۃ الخضراء پر قبضہ کر لینے کے امیر یوسف نے کوئی بات ایسی نہ کی تھی جو ملوک الطوائف کی شکایت یا خوف کا موجب ہوتی، بلکہ امیر یوسف نے اکثر موقعوں پر کہا تھا کہ "اندلس آنے سے پہلے انہوں نے اس ملک کی خوبیوں اور دولت کا بڑا اندازہ کیا تھا، لیکن جب اُسے دیکھا تو کچھ نہ نکلا۔" غرض معتمد کو امیر یوسف کی طرف سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا تھا اور چونکہ اِس وقت ملک بلاشبہ بہت خطرے کی حالت میں تھا، اس لیئے اُنہوں نے بذاتِ خود امیر یوسف سے ملاقات کرنے کا قصد کیا۔

امیر یوسف نے معتمد کو نہایت تواضع و اخلاق کے ساتھ اپنے پاس ٹھہرایا اور اُن کے حالات دریافت کیئے اور یہ بھی کہا "آپ نے خود کیوں تکلیف کی، صرف ایک خط بھیج دینا کافی تھا" معتمد نے کہا "میں آپ کے پاس اِس لیئے حاضر ہوا ہوں کہ ہماری حالت بہت خطرناک ہو رہی ہے۔ حصن اللبیط ہماری عملداری کے وسط میں ہے، عیسائیوں نے اُس پر قبضہ کر رکھا ہے اور ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ اُن کو اس قلعہ سے بے دخل کر سکیں، اگر آپ عیسائیوں کو اس قلعے سے نکال دیں، تو یہ دین کی بڑی خدمت ہو گی، ایک مرتبہ آپ دشمن سے ہماری گلو خلاصی کرا چکے ہیں ایک مرتبہ اور تکلیف فرمایئے" امیر یوسف نے کہا "میں ضرور کوشش کروں گا۔"

غرض جب معتمد واپس اشبیلیہ آئے تو امیر یوسف نے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں جب کل سامان فراہم ہو گیا تو فوجوں کے ساتھ بحرِ زقاق عبور کر کے ۴۸۳ھ/۱۰۹۰ء کی ربیع میں جزیرۃ الخضراء کے ساحل پر جہازوں سے اُترے اور معتمد سے ملاقات کر کے اندلس کے ملوک الطوائف کو دعوت دی کہ اُن کے ساتھ ہو کر حصن اللبیط کا محاصرہ کریں۔

تمیم صاحبِ مالقہ، عبداللہ صاحبِ غرناطہ، معتصم صاحب المریہ اور چند اور کم درجہ کی ریاستوں کے فرمانرواؤں نے امیر یوسف کی دعوت قبول کی اور حصن اللبیط کا محاصرہ

شروع کر دیا گیا، مرسیہ کے نجاروں اور معماروں نے آلاتِ حرب تیار کئے، اور یہ طے
پایا کہ ایک ایک والیٔ ریاست ایک ایک دن قلعے پر حملہ کرے، لیکن محاصرہ میں ترقی کی
رفتار سست رہی، حصن الملیط میں اس وقت عیسائیوں کی فوج تیرہ ہزار تھی، ان (۷۰۲
میں ایک ہزار سوار تھے، مسلمانوں کے حملوں کا عیسائی جواب دیتے رہے، لیکن قلعہ
اس قدر مضبوط تھا کہ باوجود مسلمانوں کی کوشش کے، ہلّہ کر کے فتح نہ ہو سکا، آخر کار محاصرہ
کرنے والوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ قلعہ کے اندر جو لوگ ہیں، اُن کی رسد قطعی بند کر دی جائے
تاکہ وہ فاقوں کی تکلیف سے مجبور ہو کر آخر کار قلعہ مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

لیکن حالت واقعی یہ تھی کہ مسلمانوں کو محاصرہ کا اتنا خیال نہ تھا جتنا خیال اپنے
ذاتی فوائد اور اغراض کا تھا، اسلامی لشکر سازشوں کا گھر بنا ہوا تھا۔

اب امیر یوسف کی نیت کچھ اور ہو گئی، اُن کا شروع میں یہ کہنا کہ اسپین کا ملک
اُن کی توقع کے مطابق نہ نکلا، سچے دل سے نہ تھا، واقعہ یہ تھا کہ وہ اسپین کو سب ملکوں
سے زیادہ پسند کرتے تھے، اور اُس پر قبضہ جمانا چاہتے تھے، یہ قصد یا تو ملک گیری
کے شوق نے پیدا کیا تھا۔ یا اُس میں زیادہ تر شریفانہ نیت مخفی تھی، کیونکہ دین کے فوائد
کا خیال نہایت خلوص کے ساتھ اُن کے دل میں موجود تھا، اور یہ خیال ایسا نہ تھا جس
کا پورا ہونا دشوار ہوتا، کیونکہ بہت سے اندلسی دل سے یقین کرتے تھے کہ ملک کو
عیسائیوں کی دست برد سے بچانے کی صورت اگر کوئی ہو سکتی ہے تو یہی ہے کہ اس
ملک کا الحاق سلطنتِ مرابطین سے کر دیا جائے۔ (۷۰۳

لیکن یہ خیال اندلس کے طبقۂ اعلیٰ کے مسلمانوں کا نہ تھا، کیونکہ شائستہ اور تعلیم یافتہ
لوگوں کی نظر میں امیر یوسف، جو عربی زبان سے بہت کم واقف تھے، اور ایک جاہل اور
وحشی آدمی تھے۔

امیر یوسف اپنی تعلیم و تربیت کی کمی کا اکثر موقعوں پر ثبوت دے چکے تھے، چنانچہ
جب اشبیلیہ کے شاعروں نے اُن کی شان میں اُن کے سامنے قصیدے پڑھنے شروع
کئے تو معتمد نے امیر سے پوچھا کہ "آپ اِن قصیدوں کے معنی سمجھتے ہیں یا نہیں؟" امیر یوسف

نے جواب دیا کہ "صرف اتنے معنی سمجھتا ہوں کہ ان کے لکھنے والے روٹیوں کے محتاج ہیں"

ایک اور موقع ایسا آیا کہ جب امیر یوسف افریقہ واپس چلے گئے، تو معتمد نے اندلس کے مشہور شاعر ابوالولید[1] بن زیدون کے کچھ اشعار جو شاعر نے اپنی سرپرست ومربیہ ولادہ[2] بنت خلیفہ المستکفی کی تعریف میں کہے تھے، امیر یوسف کی خدمت میں بھیجے، مضمون ان کا یہ تھا "جب آپ مجھ سے دور ہوتے ہیں، تو آپ کے دیدار کا شوق مجھے جلائے ڈالتا ہے، اور ایک سیلِ اشک میری آنکھوں سے جاری ہو جاتا ہے، آج کل میرے دن سیاہ ہیں، لیکن زیادہ دن نہیں گذرے کہ میری راتوں کو آپ نے سپید کیا تھا" یہ اشعار سن کر امیر یوسف بولے "کیا معتمد یہ چاہتے ہیں کہ میں سیاہ اور سپید دونوں رنگ کی لونڈیاں ان کو بھیجوں" یہ معنی سن کر حاضرین نے عرض کیا کہ شاعری کی اصطلاح میں سیاہ کے معنی اندوہ گیں اور سپید کے معنی پاکیزہ اور نشاط انگیز کے ہیں" یہ مطلب سن کر امیر یوسف نے کہا "بہت خوب! میری طرف سے بھی بادشاہ سے کہہ دینا کہ جب وہ نظر سے دور ہوتے ہیں تو میرے سر میں درد رہنے لگتا ہے"

اندلس جیسے ملک میں جو فی الواقع شاعروں، عالموں، اور ادیبوں کا خطہ تھا، کسی بادشاہ میں اس قسم کی خامیاں قابل معافی نہ تھیں، اصحاب علم جس قدر تھے وہ اپنی حالت سے خوش تھے، ان کی خواہش نہ تھی کہ اندلس سلطنت مرابطین کے تحت میں آجائے، جن ملوک الطوائف کی ریاستوں میں یہ ارباب علم رہتے تھے، ان کے دربار دربار نہ تھے بلکہ دار العلوم تھے، اور وہاں کے عالم اور ادیب بادشاہوں کی ناز پروردہ اولاد ہوتے تھے، (۷۰۳)
جن پہ بادشاہ بڑی بڑی دولتیں صرف کرتے رہتے تھے، عالموں کی تو یہ کیفیت تھی مگر جو لوگ آزاد خیال تھے وہ بھی ملوک الطوائف سے کوئی وجہ شکایت کی نہ رکھتے تھے، اور یہی زمانہ پہلی مرتبہ ایسا آیا تھا کہ بغیر اس خوف کے کہ ان کو سنگسار یا نذرِ آتش ہونا پڑے گا۔

---

[1] ابوالولید، معتمد کے وزیر کے باپ تھے (ولادت ۳۹۴ھ ۱۰۰۳ء وفات ۴۶۳ھ ۱۰۷۱ء)

[2] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۶۶۵

جو کچھ وہ لکھنا چاہتے تھے، آزادی سے لکھ سکتے تھے، مرابطین کی حکومت کی خواہش جس قدر کمرِان لوگوں کو تھی، اتنی کسی دوسرے کو نہ تھی، کیونکہ مرابطین کی حکومت کے معنی مذہبی حکومت کے تھے۔

بہرکیف اگر طبقۂ اعلیٰ اور تعلیم یافتہ گروہ میں اِس بات کے حامی کم تھے کہ اندلس کی ریاستوں کا الحاق مرابطین کی سلطنت سے ہو جائے، تو عامۃ الناس میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو اِس خیال کا حامی نہ ہو، عام لوگ اِن چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے ناراض اور ناخوش تھے، اور اُس کی وجہ کافی تھی، ہر ایک بڑا شہر ایک ریاست تھا، اُس کا دربار، اُس کا خدم وحشم علیحدہ تھا، جس کے قائم رکھنے میں مصارفِ کثیر عائد ہوتے تھے کیونکہ ہر ریاست کا امیر انتہا سے زیادہ مسرف تھا۔

اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ رعایا بھاری قیمت دے کر حفاظت اور امن مول لیتی تھی، نہیں، حالت اِس کے برعکس تھی، یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور اُن کے مالک اکثر اِس قدر کمزور ہوتے تھے کہ عیسائی تو چیزِ دیگر تھے، قرب وجوار کے مسلمانوں سے بھی وہ اپنی رعایا کو محفوظ نہ رکھ سکتے تھے، رعایا کی جان ومال کو نہ دشمن سے پناہ نصیب تھی، اور نہ ریاستوں میں امن تھا۔

یہ حالت اِتنی بڑھی کہ قابلِ برداشت نہ رہی، اور اِس حال سے نجات پانے کی آرزو اہلِ حرفہ کے لئے ایک قدرتی امر تھا، لیکن اب تک کوئی موقع ایسا نہ آیا تھا کہ اِس خراب حالت کو بدلنے کا خیال پیدا ہوتا، سرکشی اور بغاوت کی خواہش دلوں میں موجود تھی مگر اُس کی کوئی واضح صورت قائم نہ ہوتی تھی، چنانچہ غرناطہ کے شاعر سُمیسر کے یہ اشعار بہت سے لوگ سُنا کرتے تھے:۔

"بادشاہو! آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ اسلام کو تم نے دشمنوں کے حوالے کر دیا اور اُس کے بچانے کو ہاتھ نہیں بڑھاتے، تم سے بغاوت کرنی ہر شخص کا فرض ہے کیونکہ تم عیسائیوں سے مِل گئے ہو، تمہاری حکومت سے اپنی گلو خلاصی چاہنی ہرگز گناہ نہیں ہے، کیونکہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے حاکموں سے تم نے گردن پھیر لی ہے"

چونکہ بغاوت سے معاملات کی صورت اور بھی خراب ہو جاتی، اس لئے سردست سوائے صبر کے کوئی چارہ نہ تھا، چنانچہ یہی شاعر سُمیسر[1] کہتا ہے :-

بادشاہو! ہم نے تم پر بھروسا کیا، مگر تم نے ہماری توقعات کو حرفِ غلط کر دیا مصیبتوں سے نجات پانے کے لئے ہم نے تمہاری طرف دیکھا، مگر ہمارا دیکھنا بے کار تھا۔ صبر، صبر، زمانہ بڑے بڑے انقلاب پیدا کرے گا، عاقلوں کے لئے ایک لفظ کافی ہوتا ہے "

لیکن اب صبر کی ضرورت نہ تھی، ملوک الطوائف سے بغاوت کرنی ممکن تھی، کیونکہ ایک عادل، زبردست، اور نیک نام بادشاہ اسپین میں وارد تھا، عیسائیوں کے مقابلے میں عظیم الشان فتوحات حاصل کر چکا تھا، اور آئندہ ایسی ہی فتوحات حاصل کرنے کی اُس سے توقع تھی، لوگ سمجھتے تھے کہ خدا نے اپنی رحمت سے ایک ایسے شخص کو بھیج دیا ہے جو اندلس کو پھر اُسی عظمت و اقبال پر پہنچا دے گا جو اُسے پہلے حاصل تھا، ایسے بادشاہ کی اطاعت اختیار کرنی بہترین تدبیر ہوگی جو بے شمار پریشان کُن محصولوں سے رعایا کو نجات دے، ایسا بادشاہ امیر یوسف تھا، کیونکہ اُس نے اپنی قلمرو میں ایسے کُل محصولوں کو جن کا قرآن میں حکم نہ تھا بند کر دیا تھا، عام خیال تھا کہ اندلس میں بادشاہ ہو کر یہاں بھی وہ ایسے محصول بند کر دے گا۔ (۱۰۸۷ء)

عامۂ خلائق کے ذہن میں یہی دلائل تھے، اور بعض وجوہ سے وہ بالکل معقول تھے، لیکن اُن کے ساتھ چند امور ایسے بھی تھے جن کا لحاظ انہوں نے نہیں کیا تھا، مثلاً اس پر غور نہیں کیا تھا کہ جن محصولوں کو وہ بند کرانا چاہتے ہیں، اگر وہ بند کر دیئے گئے تو انتظامِ سلطنت کے مصارف ادا کرنے کی کیا سبیل ہوگی؟ یا اگر اندلس کا الحاق مراکش سے ہو گیا، اور مراکش میں سیاسی انقلاب، اور ایسے انقلابوں کے ساتھ جو مصائب ہوتے ہیں وہ پیش آئے، تو اُن کے بُرے اثر سے اندلس کیونکر محفوظ رہ سکے گا؟ نیز یہ کہ اندلس میں مرابطین کی

---

[1] سمیسر شاعر کے حالات کے لئے دیکھو ڈوزی کی کتاب تحقیقات (۱۸۸۱ء) ج ۱ ص ۲۵۹ تا ۲۶۱

حکومت بہر حال غیر ملک والوں کی حکومت ہوگی، علاوہ اس کے امیر یوسف کی فوج حوالے ایسی قوم کے لوگ ہوں گے جن کو اہل اسپین ہمیشہ سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے آئے ہیں، یہ لوگ کسی قاعدے اور قانون کا پابند ہو کر رہنا کم جانتے تھے، ممکن تھا کہ اندلس میں اُن کا قیام ایک آزاد مہمان کی سی حیثیت اختیار کرے۔

پھر الحاق کی ضرورت کو اندلس کی بعض ریاستیں زیادہ، اور بعض ریاستیں کم محسوس کرتی تھیں، مثلاً غرناطہ میں تمام رعایا، کیا عرب اور کیا اندلسی جنہوں نے بربر کی حکومت کو اس کے ظلموں کی وجہ سے بُرا کہنا اب تک بند نہیں کیا تھا، بہت خواہش مند تھی کہ اندلس میں مرابطین کی حکومت ہو جائے، لیکن معتمد کی قلمرو میں حکومت سے ناراض لوگ بہت کم تھے، المریہ میں اپنے بادشاہ سے کوئی بھی ناراض نہ تھا، کیونکہ معتصم جو وہاں حکومت کرتا تھا، رعایا میں بہت ہردلعزیز تھا، یہ ایک نیک بخت، عادل اور رحمدل بادشاہ تھا، رعایا کے ساتھ ایسی ہی محبت رکھتا تھا جیسی باپ اپنے بچوں کے ساتھ رکھتا ہے، اس فرمانروا میں نہایت دلکش نیکیاں موجود تھیں۔

فقہاء اور علمائے دین ہر جگہ امیر یوسف کے بڑے معاون و مددگار تھے، اُن کو یہ ڈر تھا کہ اگر عیسائی ملک پر مسلط ہو گئے تو اُن سے زیادہ کوئی نقصان میں نہیں رہے گا۔ ملوک الطوائف سے بھی اُنہیں کوئی خاص اُنس نہ تھا، کیونکہ یہ بادشاہ ناپاک اور خبیث علوم سیکھتے تھے، ہمیشہ عیش و نشاط اور لہو و لعب میں منہمک رہ کر علماء کو کم عقل سمجھتے تھے، اور کبھی اُن کی پند و نصیحت پر نہ چلتے تھے، بلکہ فلسفیوں کے بلا تکلف سرپرست اور مربی بن جاتے تھے، لیکن امیر یوسف ان بادشاہوں کے برعکس زہد و ورع کا کامل نمونہ تھے، کبھی ایسا نہ ہوتا تھا کہ وہ معاملات سلطنت میں علماء سے مشورہ نہ لیتے ہوں، اور ان کی ہدایتوں پر عمل نہ کرتے ہوں، اس لئے امیر یوسف سے ان علماء کو بہت ہی خلوص اور ہمدردی کا تعلق تھا۔

ان عالموں اور فقیہوں کو یا تو واقعی کسی ذریعہ سے علم ہو گیا تھا، یا اُنہوں نے محض قیاس کر لیا تھا کہ امیر یوسف ملوک الطوائف کو تخت سے اُتار کر خود اندلس کی

حکومت اپنے قبضے میں لانی چاہتے ہیں۔

باوجود اس علم اور قیاس کے ان علماء و فقہاء کو اس کے سوا کسی بات کا خیال نہ تھا کہ امیر یوسف کے ارادے کو تقویت بخشیں، اور اُن کو باور کرا دیں کہ اُن کا ارادہ بالکل دین کے مطابق ہے۔

اس تحریک میں کہ امیر یوسف اندلس کے بادشاہ ہو جائیں، سب سے بڑے کارکن قاضی غرناطہ ابو جعفر قلیعی تھے، چونکہ وہ عرب تھے اس لئے بربر سے جو اُن کے ملک پر ظلم کیا کرتے تھے، سخت عداوت رکھتے تھے، اور بربر سے اپنی دشمنی کو مخفی رکھنے میں بھی کامیاب نہ ہوئے تھے، بادلیس جس وقت غرناطہ میں بادشاہ تھا، تو اُس کا دل بار بار یہی کہا کرتا تھا کہ اُس کے خاندان کے زوال کا باعث اگر کوئی ہونے والا ہے تو وہ یہی قاضی ابو جعفر ہوں گے (۷۰۵)

بادلیس، قاضی صاحب کو ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا بھی کرتا تھا، کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ ان کو قتل کرا دے، لیکن بقول ایک عرب کے "خدا ظالم کے ہاتھ باندھ دیتا ہے تاکہ مشیت کا فرمان پورا ہو" وہ قاضی صاحب کے قتل پر قادر نہ ہو سکا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ قاضی ابو جعفر اس وقت اُس لشکر کے ساتھ تھے جو حصن الیط کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، امیر یوسف سے کئی بار تخلیہ میں ملاقات بھی کر چکے تھے، امیر یوسف ان سے خوب واقف تھے، کیونکہ چار برس پہلے اہلِ اندلس کے لئے مدد مانگنے کو وہ امیر یوسف کے دربار میں حاضر ہو چکے تھے، تخلیے میں دونوں کی جو کچھ باتیں ہوئی ہوں گی، اُن کا مقصود معلوم کرنا چنداں دشوار نہیں، امیر یوسف اس بات کی قسم کھا چکے تھے کہ اندلس میں کسی مسلمان بادشاہ کی ریاست پر قبضہ نہ کریں گے، اب اندلس کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے کا خیال اُن کا ایمان کیونکر گوارا کر سکتا تھا۔

قاضی صاحب نے امیر کے دل سے یہ تردد رفع کر دیا، اور عرض کیا کہ "اندلس کے فقہاء حضور کو اس قسم سے بالکل بری کر دیں گے، اور ملوک الطوائف کے خلاف فقہاء سے ایک الیبا فتویٰ بہ آسانی حاصل کیا جا سکتا ہے، جس میں ان بادشاہوں کے عیب اور اُن کی

قبیح حرکات ایک ایک کرکے گنوادی جائیں گی، اور یہ امر ثابت کر دیا جائے گا کہ جن ریاستوں پر وہ حکومت کرتے ہیں، اُن پر حکومت کرنے کا حق اُن کا قطعی سلب ہوچکا ہے۔"

غرض اِدھر تو قاضی ابو جعفر جو بڑے دانش مند اور صاحب تقویٰ مشہور تھے، اُن کے دلائل نے امیر یوسف کے دل پر اثر کیا، اُدھر معتصم صاحب المریہ کی گفتگو نے ملوک الطوائف میں سب سے بڑے بادشاہ معتمد کی طرف سے امیر یوسف کو برانگیختہ کر دیا۔

معتصم، جیسا کہ بیان ہوچکا ہے، بڑی خوبیوں کا بادشاہ تھا، سب سے خلوص اور محبت رکھتا تھا، لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جس سے اُس کو جانی دشمنی تھی، اور یہ معتمد تھے، یہ دشمنی رشک و حسد کی خفیف خفیف باتوں سے پیدا ہوتی تھی، کوئی واقعی وجہ شکایت ایک سے دوسرے کو نہ تھی، باوجود اس کے دشمنی سخت تھی، اور گو دونوں میں بظاہر مصالحت ہوگئی تھی، لیکن معتصم نے جن نازیبا طریقوں سے امیر یوسف کو اپنے اُوپر مہربان بنایا تھا، ویسے ہی نازیبا طریقوں سے معتمد کی طرف سے امیر یوسف کے دل میں زہر بھر دیا، اور معتمد کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی کہ معتصم نے درپردہ اُن کے خلاف کیا کارروائی کی ہے۔

جب کبھی معتصم سے ملاقات ہوئی تھی تو معتمد بے تکلفی سے باتیں کیا کرتے تھے، ایک دن معتصم اندلس میں امیر یوسف کے زیادہ قیام پر اپنی پریشانی ظاہر کرنے لگا تو معتمد کسی قدر غرور میں آکر بولے "اس میں شک نہیں کہ یہ شخص اندلس میں مدت سے ٹھہرا ہوا ہے، لیکن جس دن میرا دل اس سے بیزار ہوا، فقط ایک انگلی اُٹھانے کے دیر ہوگی کہ دوسرے ہی دن وہ اور اُس کی فوجیں یہاں سے چلتی نظر آئیں گی، معلوم ہوتا ہے تم ڈرتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ کوئی بُرائی کرے گا، مگر یہ اور اس کی سپاہ ہے کیا چیز؟ یہ سب اپنے ملک میں کنگلے اور فقیر تھے، اُن کی بھلائی کے خیال سے ہم نے اُنہیں یہاں بُلا لیا تھا، تاکہ پیٹ بھر کر اُنہیں روٹی مل جائے، اور جب سیر ہو جائیں تو اپنے ملک کو واپس کر دیئے جائیں۔" ۲۰۶۱

معتمد کے یہ الفاظ معتصم کے ہاتھوں میں خنجر بن گئے، اُس نے امیر یوسف سے معتمد

کی کل تقریر جا لکھی، جسے سنتے ہی امیر یوسف آگ بگولہ ہو گئے، اور اندلس پر حکومت کرنے کا خیال جو اب تک ضعیف تھا، بالکل پختہ ہو گیا۔

معتصم کی دشمنی چل گئی، لیکن افسوس! اُس نے اس دشمنی کا انجام کچھ نہ سوچا تھا، ایک عرب مورخ لکھتا ہے کہ "معتصم نے یہ دیکھا کہ جو کنواں اُس نے معتمد کے لئے کھودا ہے اُس میں ایک دن خود بھی ڈوبنا ہو گا، اور جس تلوار کو اُس نے اپنے نزدیک ایک موذی درندے کے قتل کے لئے برہنہ کرایا ہے وہ ایک روز خود اُس کا گلا کاٹ ڈالے گی"۔

اس قسم کی ناعاقبت اندیشی ملوک الطوائف میں عام تھی، امیر یوسف کے سامنے وہ ایک دوسرے کی بُرائیاں کیا کرتے تھے، اور آپس کے جھگڑوں میں وہ امیر یوسف کو حَکَم مقرر کرتے تھے، ادھر صاحب المریہ معتصم نے امیر اشبیلیہ معتمد کے غارت کرنے کا سامان کیا اُدھر امیر اشبیلیہ نے صاحب مرسیہ ابن رشیق کی تباہی میں کوشش کی۔

معتمد نے امیر یوسف کو بار بار یہ بات جتائی کہ ابن رشیق، اذفونش کا دوست رہ چکا ہے، اور اُس نے حصن اللیط کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف بڑی مدد پہنچائی ہے، اور اب تک مدد پہنچا رہا ہے، اس کے بعد مرسیہ کے متعلق اپنے حقوق بیان کر کے امیر یوسف سے کہا کہ "اس باغی ابن رشیق کو جس نے میرے شہر پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، گرفتار کر کے میرے حوالے کر دیا جائے"۔

یوسف نے فقہا سے کہا کہ اس مقدمہ کے حالات تحقیق کریں، فقہا نے فیصلہ معتمد کے حق میں کیا، امیر یوسف نے ابن رشیق کو گرفتار کرا کے معتمد کے حوالے کر دیا، لیکن یہ کہہ دیا کہ "ابن رشیق کو جان سے نہ مارا جائے"۔

ابن رشیق کی گرفتاری نے بُرے نتیجے پیدا کئے، مرسیہ کے لوگ لشکر سے چلے گئے اور فوج کو سامانِ رسد پہنچانے اور مزدور دینے سے قطعی انکار کر دیا، حالانکہ فوج کو ان چیزوں کی بے حد ضرورت تھی۔

غرض جو لشکر اس وقت حصن اللیط کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، وہ سخت مشکلات میں مبتلا ہو گیا، چونکہ جاڑے کی آمد تھی اس لئے خیال ہوا کہ آئندہ اور بھی حالت خراب ہو جائے

اسی زمانہ میں خبر آئی کہ ادفونش اٹھارہ ہزار فوج لے کر حصن اللیط کے عیسائیوں کو مدد دینے آرہا ہے، امیر یوسف نے پہلے تو یہ ارادہ کیا کہ طوطانہ سے مغرب میں جبلِ تریزہ میں ادفونش سے جنگ کرے، لیکن اس کے بعد امیر یوسف نے لڑائی کا نقشہ بدل دیا اور وہ بجائے طوطانہ کے طوطانہ ہی کی سمت میں آگے لورقہ کی طرف اپنی فوجیں لے گئے۔

امیر یوسف نے لوگوں پر یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ خاص اندلسی فوجیں جو اُس کے لشکر میں اس وقت شامل ہیں، وہی ہیں جو جنگِ زلاقہ میں میدان سے ہٹ گئی تھیں، اور اب پھر وہ یہی کرتی نظر آتی ہیں، امیر نے یہ بھی کہا کہ اب حصن اللیط کے آثار میں اتنا دم نہیں ہے کہ قشتالی عیسائی جو اُس میں محصور ہیں، اُس کی حفاظت کر سکیں، ضرور ہے کہ محصورین قلعہ چھوڑ کر باہر نکل جائیں گے۔

امیر یوسف کی یہ رائے بالکل درست تھی، ادفونش جس وقت حصن اللیط پر پہنچا ہے تو قلعہ کے بُرج اور اُس کی دیواریں کھنڈر نظر آئیں، اور عیسائیوں کی جو فوج اُس میں مقیم تھی اُس میں صرف سنّو آدمی باقی تھے، ادفونش نے یہ حالت دیکھ کر قلعہ میں آگ لگا دی، اور جو لوگ قلعہ میں باقی رہے اُن کو اپنے ساتھ قشتالیہ لے آیا۔

حصن اللیط کے محاصرہ کا جو مقصد مسلمانوں نے سوچا تھا وہ حاصل ہو گیا، یعنی عیسائیوں کو وہاں سے نکلنا پڑا، مسلمانوں کو کامیابی ضرور ہوئی مگر بُری طرح، چار مہینے تک محاصرہ جاری رکھا گیا مگر قلعہ فتح نہ ہوا[1] (۰۷

ادفونش کے آنے کی خبر سُن کر امیر یوسف کا لڑنے کے قصد سے آگے بڑھنا، اور قلعہ سے لشکر کو ہٹا لینا، یہ دونوں باتیں ایسی تھیں، جن سے لوگوں کو خیال ہوا کہ یہ نقلی در حرکت بھاگنے کے برابر تھی، لیکن فقیہوں نے ایسا اہتمام کیا کہ امیر یوسف کی شہرت کو کوئی

---

[1] جب قلعہ کی دیواریں اور بُرج بے کار کر دیئے، اور محصورین وہاں رہ نہ سکے، اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے، جو بچے وہ گرفتار ہوئے، پھر قلعہ میں آگ لگا دی گئی، ان سب کے بعد یہ کہنا کہ "قلعہ فتح نہ ہو سکا" بے کار سا معلوم ہوتا ہے (مترجم اُردو)

نقصان نہ پہنچے، اُنہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ چار برس پہلے امیر المسلمین کو عیسائیوں پر جو فتح ہوئی تھی، ویسی ہی فتح کا اس موقع پر حاصل نہ ہونا دراصل ملوک الطوائف کا قصور ہے، اِن بادشاہوں نے آپس کی سازشوں، اور باہمی رشک وحسد، اور مناقشوں کے باعث امیر یوسف کو ایسی عظیم الشان فتوحات سے باز رکھا، جو تنہا لڑنے کی صورت میں وہ ضرور حاصل کر لیتے۔

اب فقہاء خفیہ کارروائیوں میں اور بھی سرگرم ہوئے، اور اُس کی وجہ بھی معقول تھی اُمراء اندلس کو اِن فقیہوں کے منصوبے معلوم ہو گئے تھے، اِس لئے فقیہوں کو اپنی طرف سے طرح طرح کے اندیشے پیدا ہوئے، قاضیٔ غرناطہ ابوجعفر قلیعی کو اِس کا پتہ چل گیا کہ اُن کی کارروائیاں ظاہر ہو چکی ہیں، اِس افشائے راز سے قاضی صاحب کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا، جس وقت حصن البیط کے سامنے امیر یوسف کا لشکر پڑا ہوا تھا، تو عبداللہ امیر غرناطہ اور امیر یوسف کے خیمے پاس پاس تھے، یہاں عبداللہ کو معلوم ہوا کہ قاضی ابوجعفر پوشیدہ طور سے امیر یوسف سے ملاقات کیا کرتے ہیں، امیر عبداللہ اِن ملاقاتوں کا مطلب سمجھ گیا، لیکن چونکہ امیر یوسف خود لشکر میں موجود تھے، اِس لئے ہمّت نہ ہوئی کہ قاضی صاحب، اور اُن کے فریق کے خلاف کوئی سخت کارروائی کرتا، مگر جب غرناطہ کو واپسی ہوئی، تو صاحبِ غرناطہ عبداللہ نے قاضی ابوجعفر کو بغاوت کا الزام دے کر بہت سخت وسُست کہا، اور سپاہیوں کو حکم دیا کہ اُن کو قتل کر دیں، لیکن عبداللہ کی ماں نے بیٹے کے قدموں پر سر رکھ دیا، اور کہا کہ ایسے بزرگ کا خون کرنے سے باز رہے، عبداللہ ماں کا بہت مطیع تھا، قاضی ابوجعفر قتل نہیں کئے گئے، بلکہ قصر کے ایک کمرے میں قید کر دیئے گئے

قاضی صاحب کو معلوم تھا کہ جس قدر لوگ قصر میں رہتے ہیں، وہ بہت خوش اعتقاد اِنسان ہیں، اکثر نماز میں مصروف رہتے، اور قرآن اِس قدر بلند آواز سے پڑھتے کہ تمام قصر گونجتا رہتا، ہر شخص اُن کا پڑھنا نہایت ادب سے سُنتا، کسی کے منہ سے آواز تک نہ نکلتی کہ قاضی صاحب کو تکلیف ہوگی، رفتہ رفتہ اہلِ قصر نے امیر عبداللہ کے کان تک یہ بات پہنچا دی کہ اگر قاضی صاحب کو فوراً رہا نہ کیا گیا، تو عنقریب خدا کا کوئی غضب ٹوٹنے والا ہے۔

عبداللہ کی والدہ سب سے بڑی سفارشی قاضی صاحب کی تھیں، کبھی ڈرا کر، کبھی دھمکا کر، کبھی عاجزی سے بیٹے کو سمجھایا کرتیں، آخرکار عبداللہ نے قاضی ابوجعفر کو رہا کر دیا، قاضی صاحب رہا ہوئے، مگر ایسا سبق ملا کہ انہوں نے غرناطہ کا رہنا ہی چھوڑ دیا، ایک رات تاریکی میں القلعیہ کے شہر کو چلے گئے، اور ایک خط امیر المسلمین یوسف بن تاشفین کو لکھا، اُس میں تمام ذلتیں اور خواریاں جو اٹھانی پڑی تھیں لکھیں، اور بہ اصرار عرض کیا کہ "جس امر میں باہمی گفتگو بار بار ہو چکی ہے، اب اُس کو معرض التوا میں زیادہ نہ رکھا جائے"۔

اُس کے ساتھ ہی قاضی ابوجعفر نے اندلس کے اور قاضیوں اور فقیہوں کو خطوط لکھے اور اُن سے ایک ایسا فتویٰ طلب کیا جس میں ملوک الطوائف کی نالائقیاں بالخصوص بادیس کے دونوں پوتوں کی بُری حرکتیں درج کی جائیں۔

قضاۃ و فقہاء کو اس امر میں مطلق تامل نہ ہوا کہ وہ عبداللہ صاحب غرناطہ اور تمیم صاحب مالقہ کی نسبت لکھ دیں کہ ان بادشاہوں کے مظالم نے اُن کو مستحق حکومت نہیں رکھا، بالخصوص بادیس کے بڑے پوتے عبداللہ کو، جس نے اپنے قاضی کے ساتھ نہایت بُرا سلوک کیا ہے، باقی شاہان اندلس کی نسبت سختی سے کوئی رائے نہیں لکھی، اور صرف اس کو کافی سمجھا کہ ایک دوسرا فتویٰ امیر یوسف کے پاس اس مضمون کا بھیج دیں کہ یہ امیر یوسف کا فرض ہے کہ شرع شریف کی پابندی کا حکم تمام شاہانِ اندلس پر جاری کریں، اور اُن کو ہدایت کریں کہ قرآنِ پاک میں جن محصولوں کا حکم نہیں ہے وہ رعایا پر نہ لگائے جائیں۔

اِن دو فتووں کی بنا پر امیر یوسف نے ملوک الطوائف کو لکھا کہ "بیگار، اور ایسے محصول جن کے وصول کرنے سے رعایا پر سختی ہوتی ہے یک لخت موقوف کیے جائیں"۔

اِس کے بعد ہی امیر یوسف اپنی فوجوں کے چار حصے کر کے ایک حصّے کو ساتھ لے غرناطہ کی طرف بڑھے، باقی کے تین حصوں کو حکم دیا کہ بعد میں غرناطہ چلے آئیں، امیر یوسف نے عبداللہ والیٔ غرناطہ سے واقعی کوئی جنگ نہیں کی، لیکن عبداللہ امیر کا مطلب سمجھ کر

بے حد خوف زدہ ہو گیا، یہ عبداللہ اپنے دادا بادلیس سے کسی بات میں بھی نہ ملتا تھا، بادلیس ایک جاہل مگر نہایت مضبوط دل و دماغ کا آدمی تھا، عبداللہ کسی قدر لکھا پڑھا تھا، عربی خاصی بول لیتا تھا، بلکہ عربی میں شعر بھی کہتا تھا، خوش نویس اعلیٰ درجہ کا تھا، اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن مجید عرصہ تک غرناطہ میں محفوظ رہا، لیکن حوصلے کا ضعیف آرام طلب اور کاہل وجود تھا، مرد ایسا تھا جو عورت کے لیے مطلق دلکش نہ ہو، تلوار دیکھ کر ڈر جاتا تھا، اور تذبذب ہر بات میں اس درجہ تھا کہ جو پاس آتا تھا اُسی سے صلاح و مشورہ کرنے لگتا تھا۔

عبداللہ نے اس نازک موقع پر مجلس سیاسی کے ارکان کو جمع کیا، اور سب سے پہلے پیرانہ سال معمل سے جس نے عبداللہ کے دادا بادیس کی کوئی بڑی خدمت انجام دی تھی صلاح پوچھی، معمل نے عبداللہ کو سمجھایا کہ امیر یوسف کوئی قصد اُس کے خلاف ایسا نہیں رکھتے جس سے دشمنی ثابت ہوتی ہو، عبداللہ کو چاہیئے کہ امیر المسلمین کے استقبال کو جائے تاکہ اُنہیں معلوم ہو جائے کہ عبداللہ اُن پہ اعتماد رکھتا ہے۔

جب معمل کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کی صلاح عبداللہ کو ناگوار گذری ہے، اور عبداللہ حملے کی صورت میں امیر یوسف سے لڑنے کو تیار ہے، تو عبداللہ کو سمجھایا کہ دیکھو مرابطین کا اب مقابلہ کرنا بالکل غیر ممکن ہے۔

معمل کی یہ نصیحت بالکل درست تھی، کیونکہ عبداللہ کے پاس فوج کم تھی، اور اپنے فوجی افسروں میں جو شخص سب سے بہتر تھا، یعنی بربر مقاتل، اُسے وہ جلاوطن کر چکا تھا، مجلس کے پرانے تجربہ کار اراکین نے معمل کی صلاح سے اتفاق کیا، لیکن عبداللہ کو بڈھے معمل کی خیر خواہی میں شبہ تھا، اور خیال تھا کہ قاضی ابوجعفر سے جن کو عبداللہ بے ایمان سمجھتا تھا وہ ملا ہوا ہے، قاضی ابوجعفر جس وقت غرناطہ سے فرار ہوئے تھے، تو یہ سمجھ کر کہ (۷۰۹ معمل کے اشارے سے ایسا ہوا ہے، عبداللہ اس بڈھے نمک خوار کو بہت بُرا بھلا کہہ چکا تھا عبداللہ کا یہ شبہ بالکل غلط بھی نہ تھا،

یہ یقینی طور پر دریافت نہیں ہوا کہ معمل واقعی امیر یوسف کے فائدے کی بات کہتے

تھے، لیکن اِس میں شک نہیں کہ امیر یوسف جو معمل کی عقل و دانائی کی قدر کرتے تھے، اِس بات کے متوقع تھے کہ معمل اُن کی مدد کرے گا۔

غرض عبداللہ صاحبِ غرناطہ نے اِس بڈھے ناصح کی نصیحت کو ایک دھوکا خیال کیا، اور چونکہ نوجوان صلاح کاروں اور مشیروں نے سمجھا دیا تھا کہ امیر یوسف غرناطہ کی طرف بُری نیّت سے آ رہا ہے، اِس لئے عبداللہ نے یہ ارادہ ظاہر کر دیا کہ تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا۔

معمل اور اُس کے دوستوں کی عبداللہ نے بہت بُری طرح فضیحت کی، لیکن اُس کے برابر کوئی ناعاقبت اندیشی نہ تھی، عبداللہ کی اِس حرکت سے مجبور ہو کر یہ لوگ یوسف کی پناہ میں چلے گئے۔

معمل اور اُس کے ہم خیال رات کے وقت غرناطہ سے نکل کر لوشہ میں آ گئے، اور اِس شہر پر قبضہ کر کے امیر المرابطین کی حکومت کا اعلان کر دیا، عبداللہ نے اِن لوگوں کے مقابلے کے لئے فوج بھیجی، اِس فوج نے اِن لوگوں کو گرفتار کیا، اور لوشہ سے وہ سب غرناطہ لائے گئے، یہاں بازاروں میں اُن کی تشہیر اِس طرح کی گئی کہ گویا وہ بہت ہی بُری قسم کے مجرم ہیں، مگر امیر یوسف کی مداخلت سے اِن لوگوں کی جان بچ گئی، امیر یوسف نے صاحبِ غرناطہ کو حکم بھیجا کہ اِن لوگوں کو فوراً رہا کر دو، عبداللہ کو ابھی تک امیر یوسف کی بُری یا بھلی نیت کا حال یقین کے ساتھ معلوم نہ تھا، اِس لئے اُس نے اِن قیدیوں کو رہا کر دینا مناسب سمجھا۔

عبداللہ گو دل سے یہی چاہتا تھا کہ امیر مرابطین سے لڑائی نہ ہو، لیکن درپردہ جنگ کی تیاری بھی کرتا رہا، بادشاہِ لیون ادفونش کے پاس قاصد بہ قاصد طلبِ امداد کی درخواست کے ساتھ بھیجنے شروع کئے، اور بہت روپیہ صرف کر کے مختلف قسم کے اہلِ حرفہ کو جن میں سوداگر، جولاہے، اور دوسرے لوگ شامل تھے، فوج میں بھرتی کیا،

لیکن عبداللہ کی یہ سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، ادفونش بادشاہِ لیون و قشتالیہ نے اُس کی درخواست منظور نہ کی۔

خود غرناطہ کی رعایا عبداللہ سے دل میں ناراض تھی، اور بہت شوق سے مرابطین کے آنے کی منتظر تھی، غرناطہ کے بہت لوگ روز شہر سے نکل کر امیر یوسف کے پاس جانے لگے عبداللہ کو یہ حال معلوم ہو گیا، ۱۰ نومبر ۱۰۹۰ء (۱۴ رمضان ۴۸۳ھ) کو اتوار کے دن جب کہ امیر یوسف کو غرناطہ پہنچنے میں صرف ۸ میل کی مسافت طے کرنی باقی رہ گئی تھی، عبداللہ نے اراکینِ مجلسِ سیاسی کا پھر ایک جلسہ منعقد کیا، مجلس نے رائے دی کہ امیر یوسف کا مقابلہ کر کے شہر کو بچانا بے سود ہو گا، اس کا خیال تک دل میں نہ لانا چاہیئے، عبداللہ کی ماں جو اس وقت مجلس میں موجود تھی، اور جس کی نسبت مورخ یقین دلاتے ہیں کہ اُس نے امیر یوسف سے نکاح کرنے کی خواہش کی تھی، اپنے فرزند سے کہنے لگی کہ "بیٹا! تیرے لئے سلامتی کی بس یہی صورت ہے کہ امیر یوسف کے استقبال کو جا، وہ تیرا عمزاد ہے (یعنی تو بھی بربر ہے اور وہ بھی) وہ تجھ سے اچھی طرح ملے گا، اور تیری بہت عزت کرے گا"

عبداللہ، ماں کو ساتھ لئے ہوئے ایک بڑے جلوس کے ساتھ امیر یوسف کے استقبال کو نکلا، صقالبہ کا رسالہ آگے آگے تھا، اور عیسائی سوار عبداللہ کے چاروں طرف حاضر تھے، سب کے سروں پر سفید عمامے تھے، اور نہایت عمدہ گھوڑوں پر، جن پر زری کا سامان تھا، سوار تھے، امیر یوسف کے سامنے آتے ہی عبداللہ گھوڑے سے اُترا، اور عرض کیا کہ اگر کسی وجہ سے اُس نے امیر المسلمین کو ناخوش کیا ہے تو اُسے معافی دی جائے، امیر یوسف نے کہا کہ اگر کوئی شکایت تھی بھی، تو اب وہ رفع ہو گئی، امیر یوسف نے عبداللہ کو ایک خیمہ بتایا کہ اُس میں قیام کرے اور اُس کی عزت اُس کی شایانِ شان کی جائے گی، لیکن عبداللہ نے جونہی خیمہ کے اندر قدم رکھا، پاؤں میں بیڑیاں پڑ گئیں۔

اس کے بعد ہی شہر کے رئیس اور امیر، یوسف کے لشکر میں حاضر ہوئے، یوسف ان سب سے بہت اخلاق سے ملے، اور اُن کو یقین دلایا کہ ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، مسلط خاندانِ شاہی کی تبدیلی سے، جو عنقریب پیش آنے والی ہے، وہ فائدے میں رہیں گے۔

جس وقت ان لوگوں نے بادشاہ مرابطین یوسف بن تاشفین کے ہاتھ پر بیعت کرلی تو امیر موصوف نے ایسے محصولوں کے بند کرنے کا حکم دیا، جن کا ذکر قرآن میں نہ تھا،

اب امیر یوسف شہر غرناطہ میں داخل ہوئے، رعایا بڑے جوش وخروش سے مبارکباد کے نعرے لگاتی تھی، امیر قصر میں آکر اُترے، تاکہ جو خزانے اور ذخائر بادلیس نے یہاں جمع کئے تھے اُن کو ملاحظہ فرمائیں، یہ خزانے اور ذخیرے بے شمار اور حیرت انگیز تھے، قصر کے کمروں میں دیوار پوش نہایت قیمتی لگے ہوئے تھے، اور نہایت بیش بہا قالینوں کا فرش تھا، ہر جگہ زمرد وفیروزے، لعل ویاقوت، ہیرے اور موتی، بلور کے ظروف اور سونے چاندی کے قیمتی سامان کی چمک سے نظر خیرہ ہوئی جاتی تھی، صرف ایک ہار میں چار سو موتی ایسے تھے جن میں ہر موتی کی قیمت سو اشرفیاں تھی۔

یوسف اِن ذخیروں کو دیکھ کر حیران رہ گئے، غرناطہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس تمام دولت کے مالک اب وہ خود ہیں، لیکن شوقِ ناموری طمع پر غالب آیا، اور فیاضی سے کام لے کر ان تمام خزانوں کو اپنی سپاہ میں تقسیم کردیا، اور اپنے لئے کچھ نہ رکھا۔ لیکن یہ سب جانتے تھے کہ قصرِ غرناطہ میں جس قدر دولت یوسف کی نظر سے گذری ہے، اُس سے کہیں زیادہ وہاں موجود ہے، اور عبداللہ کی ماں نے بہت سی نادر اور قیمتی اشیاء زمین میں دفن کر رکھی ہیں، اب اُس پر جبر کرکے تمام دفینے معلوم کئے گئے، لیکن پھر بھی شبہ رہا کہ اُس نے تمام دفینے نہیں بتائے۔ امیر یوسف نے معمّل کو، جو اُس کے حکم سے اب قصر اور تمام املاک شاہی کا منتظم مقرر کیا گیا تھا، حکم دیا کہ قصر کی بنیادوں اور عمارتوں کی موریوں کو کھود کر خزانے معلوم کئے جائیں۔

یہ واقعات ایسے تھے جنہیں دیکھ کر اندلس کے ملوک الطوائف امیر یوسف سے قطعاً بگڑ جاتے، لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس معتمد بادشاہ اشبیلیہ اور متوکل بادشاہ بطلیوس، امیر یوسف کو مبارکباد دینے غرناطہ میں آئے، اور معتصم صاحب (۷۱۱) المریہ نے اپنے فرزند عبیداللہ کو اپنی جگہ مبارکباد دینے روانہ کیا،

معتمد کی یہ بڑی نادانی تھی جو اُس کی عقل سے بعید بھی معلوم ہوتی تھی کہ اس حالت میں وہ ایک عجیب امید دل میں قائم کر کے خوش ہونے لگا، وہ اُمید یہ تھی کہ امیر یوسف غرناطہ کی ریاست معتمد کے فرزند راضی کو جزیرۃ الخضراء کے عوض میں دے دیں گے، جس شخص نے امیر یوسف سے یہ امید رکھی ہو کہ وہ ملک کا کوئی حصہ کسی کو دے دیں گے، اُسے یوسف کی طبیعت اور مزاج سے قطعی ناواقفیت تھی، امیر یوسف نے معتمد کی غلطی بہت جلد معتمد پر ثابت کر دی، ملوک الطوائف جو مبارکباد دینے حاضر ہوئے تھے، اُن سے بہت بے رُخی اور سرد مہری کا برتاؤ کیا، اور جس وقت معتمد نے غرناطہ کی نسبت اشارتاً کچھ کہا تو اُس کے جواب میں یہ عجیب بات دیکھنی پڑی کہ امیر نے معتصم صاحب المریہ کے بیٹے کو جو مبارکباد دینے آیا تھا قید کر دیا۔

اب ملوک الطوائف کی آنکھیں کھلیں، معتمد سخت پریشان ہوا اور کہنے لگا "اس شخص کو اپنے ملک میں بلانے میں ہم نے سخت غلطی کی، اب ہم کو بھی اُسی پیالے سے پینا پڑے گا جو عبداللہ کو بھی وہ زبردستی پلا چکا ہے"۔

اس کے بعد معتمد اور متوکل نے اس بہانے سے کہ قشتالیہ کے عیسائیوں نے اُن کی سرحدوں پر حملہ کرنے کی دھمکی دی ہے، واپسی کی اجازت چاہی، امیر نے اجازت دی، اور یہ دونوں اپنی اپنی ریاست کو واپس چلے گئے۔

اب معتمد اور متوکل نے دوسرے ملوک الطوائف سے کہا کہ "یوسف کی نیت اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ اپنی ریاستوں کو اُس کے حملوں سے بچانے کے لئے کوئی تدبیر کریں"۔

اس تحریک میں انہیں کامیابی ہوئی، ملوک الطوائف نے باہم اتفاق کر لیا کہ مرابطین کو آئندہ فوجیں اور سامانِ رسد مطلق نہ دیا جائے گا، اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ اندلس کی تمام اسلامی ریاستیں اذفونش عیسائی بادشاہِ لیون سے اتحاد پیدا کریں۔

یوسف بن تاشفین، غرناطہ سے جزیرۃ الخضراء واپس آئے، تاکہ جہاز پر سوار ہو کر افریقہ جائیں، اور اپنے سپہ سالاروں کو اسپین میں اس کام کے لئے چھوڑ گئے کہ وہ اندلس کے

ملوک الطوائف کو حکومت سے معزول کریں۔

غرناطہ سے جزیرۃ الخضراء کی راہ طے کرنے میں امیر یوسف نے عبداللہ معزول صاحب غرناطہ کے بھائی تمیم سے مالقہ کی ریاست چھین لی، مالقہ کی ریاست اور مالقہ کا رئیس ملوک الطوائف میں سب سے کم حیثیت رکھتا تھا۔

امیر یوسف نے اندلس کے فقیہوں کو بھی تاکید کر دی کہ اب قطعی فتویٰ لکھنے اور جاری کرنے کا وقت آ گیا ہے، فقہا کو اتنا اشارہ پانے پر فتویٰ تیار کرنے میں کیا دیر لگنی تھی، چنانچہ فتویٰ فوراً تیار ہو گیا، جس میں بیان کیا گیا کہ "ملوک الطوائف بڑے بے دین اور فاسق و فاجر ہیں، انہوں نے اپنی بُری مثال سے رعایا کو خراب اور دین سے اُسے بدراہ کر رکھا ہے۔ دیکھو! یہ بادشاہ نماز کی طرف سے کیسے غافل ہیں اور باوجود امیر المسلمین کی ممانعت کے اُنہوں نے خلافِ شرع محصول اب تک جاری کر رکھے ہیں۔ اُن کی نازیبا حرکتوں میں بدترین کرتوت یہ ہے کہ قشتالیہ کے عیسائی بادشاہ سے جا ملے ہیں اور یہ کافر بادشاہ وہ ہے جو دینِ حق کا جانی دشمن ہے، پس یہ ملوک الطوائف اب ہرگز مستحق نہیں رہے کہ وہ مسلمانوں پر حکومت کریں، امیر المسلمین یوسف نے جس قدر عہد و پیمان اُن سے کئے تھے اب اُن کے ایفاء پر امیر موصوف مطلق مجبور نہیں رہے، اور یہ اُن کا حق ہی نہیں بلکہ فرضِ عین ہے کہ وہ ملوک الطوائف کو بلا تامل اُن کی حکومتوں سے معزول کریں۔"

فقہاء نے فتوے کے اخیر میں لکھا کہ "ہم اپنے اس فیصلے کی نسبت خدا کے سامنے
(۱۳ے) جواب دینے کے ذمہ دار ہیں، اگر ہم خطا پر ہیں تو عاقبت میں اس کی پاداش بھگتیں گے اور ہم کہے دیتے ہیں کہ امیر المسلمین! اب آپ اس امر میں ہر سابقہ عہد و پیمان سے آزاد ہیں اور ہم دل سے یقین رکھتے ہیں کہ اگر آپ نے اندلس کے ان بادشاہوں کو سلامت چھوڑ دیا، تو وہ اس ملک کو کفار کے حوالے کر دیں گے اور اس صورت میں آپ کو خدا کے سامنے اس غفلت کا جواب دینا ہو گا۔"

یہی اندازِ بیان اس قابلِ یادگار فتویٰ کا تھا، اس میں اندلس کے خاص خاص بادشاہوں

پر الزام بھی لگائے گئے تھے۔ رُمیکیہ ملکۂ معتمد کا بھی اس میں ذکر تھا، اُس پر یہ الزام تھا کہ اُس نے اپنے شوہر کو دیدہ و دانستہ عیش و عشرت اور شراب خوری میں مبتلا کیا، اور پابندیٔ دین کے زوال و انحطاط کا خاص باعث یہی عورت ہے۔

یہ فتویٰ یوسف کے لئے بڑی ہی قابل قدر چیز تھا اور اس کو زیادہ استحکام بخشنے کے لئے افریقیہ کے فقیہوں سے بھی اس کی منظوری حاصل کی گئی، اس کے بعد یہ فتوے مصر اور ایشیا کے مشہور علماء کی خدمت میں اس غرض سے بھیجا گیا کہ فقہائے مغرب کی رائے کو وہ بھی مستند قرار دیں۔

مشرق کے علماء ممکن تھا کہ ایسے معاملات میں دخل دینے سے پرہیز کرتے، جن کا انہیں کسی قسم کا علم نہ تھا، مگر ایسا نہ ہوا، وہ اس خیال سے خوش ہوئے کہ دنیا میں ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں علمائے دین کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس کو چاہیں بادشاہ بنائیں اور جسے چاہیں بادشاہی سے خارج کر دیں۔

اس وقت علمائے مشرق میں سب سے زیادہ مشہور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ تھے، اُن کو بھی اندلس کے فقہا کے فیصلے سے اتفاق کرنے میں مطلق تامل نہ ہوا۔

لیکن ان بزرگوں نے یوسف بن تاشفین کو اس بات کی ضرور ہدایت کی کہ وہ حکومت انصاف سے کرے اور راہِ راست سے نہ ہٹے، یا دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ سمجھیے کہ علمائے دین کی ہدایتوں پر ہمیشہ چلے۔

اسناد :-

عباد (ڈوزی) ج ۱ ص ۱۷۲ تا ۱۷۵

ج ۲ ص ۹، ۲۳ تا ۲۷، ۳۹، ۱۲۰ تا ۱۲۱

۱۳۱ تا ۱۳۲، ۱۵۱، ۱۷۹ تا ۱۸۰

۱۹۹ تا ۲۰۴، ۲۱۱، ۲۲۱

عبدالواحد ص ۹۲، ۹۴ تا ۹۷

ابنِ بسّام ج ۱ ص ۲۳۰

ابن الخطیب (قلمی نسخہ گوتھا) ص ۱۴ تا ۱۷

(قلمی نسخہ E) مضامین متعلق الوجعفر قلیعی، مقاتل،

ابنِ بلوگین اور مُعتَل

ابنِ خلکان ج ۱۲ ص ۲۷ تا ۳۶

ابنِ خلدون (تاریخِ بربر) ج ۲ ص ۷۹ تا ۸۲ (ترجمہ)

قرطاس ص ۹۹

کتاب رابع

ملوک الطوائف

چودھویں فصل

مرابطین کی حکومت

جنگ و منازعت کی شکل جیسا کہ قیاس چاہتا تھا اب دوسری ہوگئی، لڑائیاں (۷۱۳)
کھلے میدانوں کی نہ رہیں بلکہ صرف محاصرے رہ گئے، فریقینِ مقابل کا یہ کام تھا کہ ایک فریق دوسرے فریق کے قلعوں کا محاصرہ کرے اور دوسرا فریق اپنے قلعوں کو دشمن سے بچائے مرابطین کا لشکر، جس کا سردار امیر یوسف کا بھتیجا سیر ابنِ ابو بکر تھا، کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا، ایک حصہ المریہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اور باقی حصے معتمد کے قلعوں پر حملہ کرتے تھے، اِن قلعوں میں سے جزیرہ طریف کا قلعہ دسمبر ۱۰۹۰ء (شوال ۴۸۳ھ) میں مرابطین نے فتح کر لیا۔

مرابطین کو فتوحات اِس قدر جلد حاصل ہو رہی تھیں کہ جزیرہ طریف کی فتح کے بعد ہی امیر یوسف کے لشکر نے قرطبہ کا محاصرہ شروع کر دیا، قرطبہ کی فوجوں کا سپہ سالار فتح ابنِ معتمد

تھا، اس کا لقب المامون تھا، بنی امیہ اندلس کا پرانا دار الخلافہ قرطبہ اب اس قابل نہ تھا کہ دشمن کے حملوں کو زیادہ مدت تک روک سکتا، خود اسی کے باشندوں نے شہر مرابطین کے حوالے کر دیا۔ فتح نے چاہا کہ دشمنوں اور باغیوں میں سے رستہ نکالتا ہوا باہر آئے مگر دشمن زیادہ تھے، قتل ہو گیا، مرابطین نے اس کا سر کاٹ کر نیزے پر لگایا اور فتح کی خوشی میں اُسے گشت کرایا (۲۶ مارچ ۱۰۹۱ء - ۲ صفر ۴۸۴ھ) ڈیڑھ مہینے کے بعد ۱۰ مئی ۱۰۹۱ء (۱۸ ربیع الاول ۴۸۴ھ) کو قرمونہ بھی مرابطین کے قبضہ میں آگیا، اس کے بعد اشبیلیہ کا محاصرہ شروع ہوا، مرابطین کے دو لشکر اس شہر پر حملہ کرنے کو بڑھے تھے ایک نے شہر کی مشرقی سمت میں اور دوسرے نے مغربی سمت میں اپنے خیمے نصب کر دیے۔ مغربی سمت والے لشکر اور شہر کے درمیان دریائے وادی الکبیر حائل تھا اور شہر والے کنارے کی طرف شہر کی حفاظت کیلئے دریا میں ایک جنگی بیڑا جہازوں اور کشتیوں کا موجود تھا، معتمد کی حالت اس وقت نازک تھی، صرف ایک شخص سے کچھ امید باقی تھی اور یہ لیون کا عیسائی بادشاہ اوفونش تھا، معتمد نے اس سے مدد چاہی اور مدد کے معاوضہ میں بڑے بڑے انعاموں کا وعدہ کیا، اوفونش نے مدد دینے کا اقرار کیا اور وعدہ ایفا بھی کیا، یعنی اپنے سپہ سالار البور فانیز کو بہت سی فوج دے کر روانہ کیا، لیکن حصن المدور کے قریب سیر ابن ابوبکر کی بھیجی ہوئی ایک فوج سے البور فانیز کا مقابلہ ہوا اور اس معرکہ میں البور فانیز شکست کھا گیا۔

اس شکست کی خبر معتمد کے لئے ایک صدمۂ عظیم ثابت ہوئی، لیکن پھر بھی ہمت کو ہاتھ سے نہ دیا، دربار کے نجومی بھی اچھی خبریں اور اچھے خواب سنا کر ہمت بڑھاتے رہے، جب تک نیک فالیں نکلتی رہیں معتمد کو امید رہی کہ پردۂ غیب سے کوئی نہ کوئی صورت ایسی پیدا ہو جائے گی کہ اس کی سلطنت قائم رہے گی، لیکن جب نجومیوں نے بُری فالیں اور خاتمہ کے قریب آنے کی خبریں سنائیں، جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ "ایک شیر اپنے شکار پر جست لگانے کو ہے"۔ تو معتمد کے دل پر غم کی گھٹا چھا گئی اور شہر کو دشمن سے بچانے کا جس قدر کام تھا وہ اپنے فرزند رشید کے سپرد کر دیا۔

(۷۱۴) اسی اثنا میں بدخواہوں نے جو شہر کو دشمن کے حوالے کرنا چاہتے تھے، شہر کے لوگوں میں بغاوت پھیلانے کی کوششیں شروع کیں، معتمد کو ان لوگوں کا حال معلوم تھا اگر چاہتا تو ان کو

قتل کر دیتا، لیکن اُسے یہ گوارا نہ ہوا کہ اپنے دورِ حکومت کو ایسے تشدد پر ختم کرے۔ پس اُس نے صرف اس بات کو کافی سمجھا کہ ان غداروں کو نظر میں رکھا جائے، مگر ان کی نگرانی بیکار رہی، ان دشمنوں کو ایسے ذرائع میسر ہو گئے تھے کہ شہر کی خبریں مرابطین کو باہر پہنچاتے رہیں۔ مرابطین نے فصیل میں نقب لگائی، دشمنوں نے مرابطین کی مدد کی اور اسی نقب سے ۲؍ستمبر ۱۰۹۱ء (۱۵؍رجب ۴۸۴ھ) کو سہ شنبہ کے دن مرابطین میں سے کچھ لوگ شہر میں داخل ہو گئے۔ معتمد نے جب سنا تو تلوار ہاتھ میں لیے بغیر زرہ پہنے یا سپر لگائے گھوڑے پر سوار ہوا اور کچھ سواروں کو ساتھ لے کر دشمن پر دھاوا کر دیا، ایک مرابطی نے اپنا نیزہ معتمد کی جانب چلایا، نیزہ معتمد کی بغل کے پاس سے قبا کو چھوتا ہوا نکل گیا، اس پر معتمد نے تلوار دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس زور سے لگائی کہ مرابطی کے دو ٹکڑے ہو گئے، اس مرابطی کا حشر دیکھ کر باقی جس قدر دشمن نقب کے رستے شہر میں داخل ہوئے تھے سب بھاگ گئے، نقب جلد بند کر دی گئی، لیکن خطرہ جس کا سدِ باب کچھ دیر کے لیے ہو گیا تھا، پھر جلد پیدا ہو گیا، اسی دن تیسرے پہر مرابطین نے دریا میں جو بیڑا پڑا ہوا تھا اس میں آگ لگا دی۔

اس واقعہ نے محصورین کے ہوش پراگندہ کر دیے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جہازوں کے تباہ ہو جانے کے بعد شہر کو دشمن سے محفوظ رکھنا کسی طرح ممکن نہ تھا، دشمن نے آخری حملہ اپنے سپہ سالار سیر ابن ابوبکر کے آنے تک ملتوی رکھا تھا۔ شہر والوں کو اب اپنی جان کی پڑی، کسی نے دریا تیر کر بھاگنے کی کوشش کی، کوئی فصیل پر چڑھ کر نیچے کود ا، بعض نہ خانوں اور موریوں میں چھپ گئے۔ اسی زمانہ میں سیر بن ابوبکر اشبیلیہ پہنچ گیا اور ۸؍ستمبر ۱۰۹۱ء (۲۱؍رجب ۴۸۴ھ) کو اتوار کے دن اشبیلیہ پر آخری حملہ کیا گیا، معتمد کے سپاہی جو فصیلوں پر تھے، بڑی جوانمردی سے دشمن کے حملے روکتے رہے، لیکن دشمنوں کی تعداد نے آخرکار اُن کو مغلوب کر دیا اور مرابطین شہر میں داخل ہو گئے اور شہر بہت جلد ہر قسم کی زیادتیوں اور خوں ریزیوں کا مرکز بن گیا۔ فاتحین نے لالچ میں آ کر شہریوں کے کپڑے تک اُتروا لیے۔

معتمد اپنے قصر میں تھے، اُن کی بیگمات رو رہی تھیں، اُن کے دوست اور ہوا خواہ انہیں سمجھانے لگے کہ اطاعت قبول کر لیجیے، مگر معتمد انکار کرتے رہے، کیونکہ وہ ڈرتے تھے،

موت سے نہیں، اُس سے تو اکثر دوچار ہو چکے تھے، ڈرتے تھے بے عزتی سے۔ چنانچہ اس مضمون کے چند اشعار بھی اُنہوں نے کہے تھے:۔

"جب میرے آنسو بہنے بند ہوئے اور دُکھتے ہوئے دل کو سکون ہوا، تو لوگوں نے کہا رضا، قضا مقتضائے سیاست ہے۔ لہٰذا تیری جانب سے مرابطین کے لئے اطاعت ظاہر ہونی چاہیئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اِس جامِ ذلت سے زہرِ ہلاہل میرے لئے شیریں ہے، اگر دشمن نے میری قلمرو مجھ سے چھین لی ہے اور سپاہیوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو کیا ہوا، میرا دل تو ہنوز پہلو میں ہے پسلیاں نے ابھی دل کو تو نہیں چھوڑا، فطری شرافت تو مجھ سے چھینی نہیں گئی، کیا شرافت جو اعلیٰ درجہ کی چیز ہے چھینی جا سکتی ہے؟ جس روز میں نے دشمن پر حملہ کیا تو میں نے زرہ نہیں پہنی تھی، میں اس شان سے مقابلہ میں آیا کہ بجز کُرتے کے اور کوئی چیز جسم کو ڈھانکنے والی نہ تھی، میں اپنی جان پر کھیل گیا تاکہ جسم سے خون نکلنے کے بعد جان بھی نکل جائے، میری موت میں تاخیر ہو گئی مگر میری خواہش کبھی نہ تھی کہ ذلت و اطاعت قبول کروں۔" (۷۱۵)

ایک مرتبہ پھر معتمد نے موت کو جو اُن سے بچنا چاہتی تھی، تلاش کیا، اُنہوں نے اپنے سپاہیوں کو جمع کیا اور مرابطین کے اُس دستہ فوج پر جو قصر میں داخل ہو گیا تھا حملہ کیا اور اُسے قصر سے باہر نکال دیا، جو لوگ فصیل پر چڑھ آئے تھے اُنہیں دریا میں دھکا دے دیا گیا۔

اس ہنگامہ میں معتمد کے ایک فرزند جن کا نام مالک تھا کام آئے، لیکن معتمد کو کوئی ضرر نہ پہنچا، معتمد جب قصر میں واپس آئے تو خودکشی کا ارادہ کیا، لیکن خدا کی نظر میں ایسے کام کو بُرا سمجھ کر اُس کا خیال دِل سے نکال ڈالا اور آخرِ کار مرابطین کی اطاعت اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔

جب رات ہوئی تو معتمد نے اپنے فرزند رشید کو سیر ابنِ ابوبکر کے پاس اِس اُمید سے بھیجا کہ شاید صلح کی کچھ شرطیں منظور کی جائیں، لیکن یہ اُمید بے کار ثابت ہوئی۔ رشید نے بہت چاہا کہ سیر ابنِ ابوبکر سے بالمواجہ گفتگو ہو، مگر کامیابی نہ ہوئی اور ابنِ ابوبکر نے

رشید کو کہلا بھیجا کہ اپنے باپ سے کہہ دو کہ وہ بلا کسی شرط کے اطاعت قبول کرے۔

معتمد نے اب مشیت کے سامنے سر جھکا دیا، اپنے اہل و عیال اور روتے ہوئے افسرانِ فوج کو الوداع کہا اور خود اور اپنے فرزند کو مرابطین کے حوالے کر دیا۔

معتمد جب قصر سے چلے گئے تو قصر لوٹا گیا اور معتمد کو اطلاع دی گئی کہ اُن کو اور اُن کے فرزند کی جان کو صرف اس شرط پر سلامتی دی جا سکتی ہے کہ معتمد اپنے دو بیٹوں راضی اور معتد کو حکم دیں کہ وہ اپنے اپنے قلعے مرابطین کے سپرد کر دیں، جن کا مرابطین اس وقت محاصرہ کیئے ہوئے تھے۔

راضی اُس وقت رندہ کے اور معتد مرتلہ کے حاکم تھے۔ معتمد اس بات پر رضامند ہو گئے مگر وہ جانتے تھے کہ دونوں فرزند بھی اُنہی کی طرح دل کے مضبوط ہیں۔

معتمد نے نہایت محبت اور شفقت کے الفاظ میں والدین پر مہربانی اور رحم کی درخواست کے ساتھ راضی اور معتد کو لکھا کہ "میرے کہنے سے اپنے اپنے قلعے چھوڑ کر علیحدہ ہو جاؤ۔ کیوں کہ یہی ایک صورت ہے جس سے تمہارے ماں باپ اور بھائی بہنوں کی جان سلامت رہ سکتی ہے۔"

سیدہ اعتماد (رمیکیہ) نے بھی دونوں فرزندوں کو وہی باتیں لکھیں، جو باپ نے لکھی تھیں، کیونکہ اُنہیں بہت خوف تھا کہ کہیں راضی اور معتد اپنے اپنے قلعوں کو چھوڑنے سے انکار نہ کر دیں، یہ خوف بہت حد تک ٹھیک تھا۔

راضی گو جانتا تھا کہ ماں باپ اور بھائی بہنوں کی اس صورت میں جان نہ بچے گی، مگر اُسے اصرار ہوا کہ وہ مقابلہ جاری رکھ کر رندہ کو مرابطین کے قبضے میں نہ جانے دے، کیونکہ وہ خوب واقف تھا کہ رندہ کا قلعہ دشمن سے مدت تک فتح نہ ہو سکے گا۔ غیرور مرابطین کا سپہ سالار جو رندہ کی فتح کے لئے مقرر کیا گیا تھا، قلعہ سے کچھ دُور رہتا تھا، اُس کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس آشیانۂ عقاب کے قریب جائے جو بلند اور سیدھے پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔ غیرور اُس کی فتح کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا۔

راضی پر آخر کار والدین کی محبت غالب آئی اور اُس نے دشمن سے مصالحت کی

گفتگو کرنی چاہی، شرائط صلح اچھی طے پائیں، اس کے بعد راضی نے مرابطین کے لیے قلعہ کا دروازہ کھول دیا، لیکن مرابطین کے سپہ سالار نے نقض عہد کیا اور اس قصور پر کہ قلعہ میں رہ کر اتنی مدت تک کیوں مقابلہ کیا، راضی کو قتل کرا دیا۔

معتمد نے قلعہ مرتلہ کو حوالے کرنے میں زیادہ دیر نہ کی، اس لیے اُس کا حال راضی سے بہتر رہا، مرابطین نے شروع میں معتمد سے وعدہ کیا کہ اُس کا مال و متاع سب اُس کے قبضے میں رہے گا۔ مگر اخیر میں یہ مال ضبط کر لیا۔

اشبیلیہ کے فتح ہو جانے سے مرابطین کے لیے المریہ کی فتح آسان ہو گئی، معتصم صاحب المریہ کا جب انتقال ہونے لگا تو اس نے اپنے بڑے فرزند عزالدولہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر مرابطین اشبیلیہ فتح کر لیں تو تم افریقہ میں بجایہ کے بادشاہ کے پاس چلے جانا، عزالدولہ نے باپ کا کہنا کیا اور المریہ چھوڑ کر بجایہ چلا گیا، مرابطین ذی قعدہ ۴۸۴ھ (آخر ۱۰۹۱ء) میں المریہ میں بحیثیت فاتح داخل ہوئے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد مرسیہ، دانیہ، اور شاطبہ پر مرابطین کا تصرف ہو گیا، اور اب وہ بطلیوس کی طرف متوجہ ہوئے۔

متوکل صاحب بطلیوس نے محاصرۂ اشبیلیہ کے زمانہ میں چاہا تھا کہ مرابطین سے مل کر اپنی ریاست بچالے، بیان ہوا ہے کہ اُس نے مرابطین کو خوش کرنے کے لیے معتمد کے دارالحکومت کو فتح کرنے میں ان کی مدد کی، لیکن جب مرابطین نے جو برائے نام متوکل کے دوست بنے ہوئے تھے اس کی ریاست کی حدوں پر غارتگری شروع کی تو متوکل نے اوفونش سے مدد مانگی اور اس مدد کے عوض میں اشبونہ، شنترہ اور شنترین کے شہر اوفونش کے حوالے کر دیے۔

ان شہروں کی حکومت عیسائیوں کے حوالے کر دینے سے مسلمان رعایا متوکل سے بگڑ بیٹھی اور ان میں سے بعض نے مرابطین سے بات چیت شروع کر دی، سیر ابن ابوبکر نے جو اس زمانہ میں اشبیلیہ کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا فوراً ۴۸۷ھ (۱۰۹۴ء) میں ایک لشکر متوکل سے جنگ کرنے کے لیے روانہ کیا اور علاقہ بطلیوس پر مع شہر بطلیوس کے اس سرعت اور تیزی سے قبضہ کیا کہ اوفونش کو متوکل کو مدد دینے کا وقت تک نہ مل سکا، متوکل اس وقت بطلیوس کے شہر میں اُسے محفوظ مقام سمجھ کر مع اہل و عیال کے چلا آیا تھا جب شہر پر مرابطین

کا قبضہ ہوا تو متوکل گرفتار ہو گیا، سیر ابن ابوبکر نے متوکل کو جسمانی ایذائیں پہنچا کر پوشیدہ خزانوں کا پتہ چلایا اور پھر حکم دیا کہ متوکل اور اُس کے دونوں بیٹوں طفیل اور عباس کو اشبیلیہ لے جائیں، لیکن سیر ابن ابوبکر کا ارادہ دراصل اُن کو اشبیلیہ بھیجنے کا نہ تھا، بلکہ اصل مقصود اُن کو ہلاک کر دینے کا تھا، لیکن اس خیال سے کہ اگر بطلیوس میں اُن کو قتل کیا تو اس کا اثر اچھا نہ ہوگا، اُس نے افسر فوج کو جو متوکل اور ان شہزادوں کو حراست میں لیے ہوئے تھا، ہدایت کر دی کہ جس وقت شہر سے باہر کچھ دور پہنچو تو اُن کو قتل کر دینا شہر سے نکل کر کچھ دور جانے کے بعد افسر فوج نے متوکل اور اس کے دونوں فرزندوں سے کہا کہ موت کے لیے تیار ہو جائیں، متوکل نے اِن قاتلوں سے رحم کی درخواست نہ کی، کیونکہ وہ اس کو ایک فعل عبث سمجھتا تھا، صرف اتنا کہا کہ بیٹوں کو پہلے قتل کیا جائے، یہ اس خیال سے کہا کہ باپ کو بیٹوں کی موت دیکھنے میں سخت تکلیف اور اذیت ہو گی اور مسلمان کو جس قدر اذیتیں اور تکلیفیں اس دنیا میں زیادہ پہنچتی ہیں، اُتنے ہی اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

متوکل کی یہ درخواست منظور ہوئی، اور جب اُس نے اپنے دونوں بیٹوں کے کٹے ہوئے سر دیکھ لیے تو نماز پڑھی، سجدہ ہی میں تھا کہ سپاہیوں نے برچھیاں بھونک کر متوکل کو ہلاک کر دیا۔

سنہ ۴۹۶ھ / ۱۱۰۲ء میں مرابطین نے بلنسیہ پر قبضہ کر لیا، آٹھ برس پہلے اس شہر پر قنبیتور ۲۷
مستولی ہو گیا تھا جب تک وہ زندہ رہا، مرابطین، بلنسیہ پر قبضہ نہ کر سکے قنبیتور کے مرنے پر (سنہ ۴۹۳ھ / ۱۰۹۹ء) اُس کی بیوی زمینہ دو برس اور قابض رہی، اذفونش بادشاہ لیون سے اُس نے مدد کی درخواست کی، لیکن اذفونش نے یہ سمجھ کر مدد نہ دی کہ بلنسیہ اُس کے دار الحکومت سے بہت دور ہے، اس لیے ہمیشہ اُس کی حفاظت کرنی ممکن نہ ہو گی بدیں وجہ اُس نے بلنسیہ سے بے تعلق رہنا مناسب سمجھا، قشتالی عیسائیوں کو جب مرابطین کے خوف سے بلنسیہ خالی کرنا پڑا، تو وہ جاتے ہوئے شہر میں آگ لگاتے گئے جس سے سارا شہر جل کر خاک ہو گیا۔

اسپین اسلامیہ میں اب صرف دو ریاستیں ایسی رہ گئی تھیں جنہیں مغلوب کرنا ابھی مرابطین کے لیے باقی تھا، ایک تو سرقسطہ کی ریاست جس میں احمد المستعین حکومت کرتے تھے جو بنی ہود میں سے تھے اور دوسری ریاست سہلہ کی تھی، جس کے مالک بنی رزین تھے، بنی رزین امیر یوسف بن تاشفین کو اپنا بادشاہ مانتے تھے مگر باوجود اس کے وہ سہلہ کی ریاست سے معزول کیے گئے، احمد مستعین جنہوں نے قیمتی تحائف دے کر مرابطین کو خوش کر رکھا تھا، بنی رزین سے اچھے رہے یعنی مستعین کی زندگی تک سرقسطہ کی ریاست بحال خود قائم رہی، لیکن جب ۲۴ جنوری ۱۱۱۰ء ذیقعد رجب ۵۰۳ھ کو المستعین کا انتقال ہو گیا، تو ریاست میں انقلاب پیدا ہوا، سرقسطہ کے باشندوں نے مستعین کے فرزند اور جانشین عماد الدولہ کی اطاعت اس شرط سے کرنے کا وعدہ کیا کہ جس قدر عیسائی عماد الدولہ کی فوجوں میں ملازم ہیں وہ برطرف کر دیے جائیں۔

اس شرط کی پابندی مشکل تھی، کیونکہ سرقسطہ کی بہترین فوجیں وہی تھیں جن کے سپاہی عیسائی تھے، اور یہ عیسائی فوجیں کچھ آج سے نہیں بلکہ سو برس پہلے سے ریاست میں چلی آرہی تھیں، عماد الدولہ کو ان فوجوں کے موقوف کر دینے کے بعد اپنی معزولی بھی صاف نظر آرہی تھی، کیونکہ رعایا کی بڑی خوشی یہی تھی کہ مرابطین کی اطاعت قبول کر لی جائے لیکن آخر کار عماد الدولہ مجبور ہوا اور اس نے رعایا سے عیسائی فوجوں کے برخاست کر دینے کا وعدہ کر لیا جس وقت یہ عیسائی فوجیں برطرف ہوئیں تو رعایا نے یوسف بن تاشفین کا تو اب انتقال ہو چکا تھا، ان کے بیٹے علی سے جو باپ کے جانشین ہوئے تھے، خط و کتابت شروع کر دی اور امیر علی بن یوسف کو لکھا کہ عیسائیوں کی فوجیں برخاست کر دی گئیں ہیں اب ریاست آپ کے لیے حاضر ہے۔"

رعایا کی طرف سے جب یہ سازش دیکھی تو عماد الدولہ نے عیسائیوں کو پھر فوج میں بھرتی کر لیا، اس پر رعایا کے غصے کی انتہا نہ رہی، فوراً امیر علی بن یوسف کو اس واقعہ کی اطلاع دی اور ان سے مدد چاہی، امیر علی بن یوسف نے علمائے مراکش سے اس امر میں استفسار کیا کہ ایسی حالت میں سرقسطہ کے معاملات میں دست اندازی

کرنی چاہیے یا نہیں؟ علماء نے دست اندازی کی اجازت دی، اجازت ملتے ہی علی بن یوسف نے حاکم بلنسیہ کو لکھا کہ سرقسطہ پر قبضہ کرے، اس حکم کی تعمیل بغیر دشواری کے ہوئی کیونکہ عماد الدولہ[۱] یہ سمجھ کر کہ سرقسطہ اب اُس کے لیے محفوظ مقام نہیں ہے، شہر چھوڑ کر قلعہ روطہ میں جارہا تھا، سرقسطہ سے روانہ ہونے سے پہلے اُس نے ایک بہت پُر درد خط علی بن یوسف کو اس مضمون کا لکھا کہ جو دوستی اور محبت میرے اور آپ کے والد میں تھی اُس کا لحاظ کرتے ہوئے امید ہے کہ آپ میری ریاست پر قبضہ نہ کریں گے، کیونکہ مجھ سے کوئی بات ایسی نہیں ہوئی جس پر آپ ناراض ہوں"

علی بن یوسف پر اس خط کا بڑا اثر پڑا، کیونکہ اُن کے والد امیر یوسف نے مرتے وقت بیٹے کو وصیت کی تھی کہ بنی ہود سے صلح رکھنا، چنانچہ خط پڑھتے ہی علی نے فوراً اپنا حکم جو حاکم بلنسیہ کو دیا تھا مسترد کیا، لیکن اب اس کا وقت نہ رہا تھا۔ مرابطین سرقسطہ پر قابض ہو چکے تھے۔

اس طرح امیر مرابطین یعنی بادشاہ مراکش میں تمام اسلامی سپین کی حکومت مجتمع ہو گئی، عالموں اور فقیہوں کے دلوں کو تسکین ہوئی، اس انقلاب سلطنت پر انہیں افسوس کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، مرابطین کی سلطنت میں علمائے دین کو جو زور اور قدرت حاصل تھی، اس کی مثال اگر عیسوی حکومت میں تلاش کرنی ہو تو قوم فسیقوط کے عہد کو یاد کیا جائے، جس میں پادری تمام سلطنت کے سیاہ و سپید کے مالک ہو رہے تھے خاندان مرابطین کے تین بادشاہ جنہوں نے یکے بعد دیگرے اندلس پر حکومت کی، یعنی یوسف بن تاشفین، علی بن یوسف (۵۰۰ھ/۱۱۰۶ء تا ۵۳۸ھ/۱۱۴۳ء) اور تاشفین بن علی بن یوسف (۵۳۸ھ/۱۱۴۳ء تا ۵۴۰ھ/۱۱۴۵ء) یہ سب بڑے متقی اور پرہیزگار انسان تھے، فقیہوں کی بے حد عزت کرتے تھے اور کوئی کام تاوقتیکہ وہ منظور نہ کریں نہیں کرتے تھے، لیکن زہد اور

[۱] عماد الدولہ اس قلعہ پر اپنی وفات (۵۲۵ھ/۱۱۳۰ء) تک قابض رہے، اس کے دس برس بعد عماد الدولہ کے بیٹے اور جانشین سیف الدولہ نے یہ قلعہ الفونش ہفتم کو تفویض کر دیا

انتقام علی بن یوسف پر ختم ہو گیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ علی تختِ حکومت کے لیے نہیں پیدا کیے گئے تھے، بلکہ کسی خانقاہ یا صحرا کے کسی رباط میں عبادت و ریاضت میں زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا کیے گئے تھے، فقہاء ایسے بادشاہ سے بے انتہا خوش تھے، جس طرح چاہتے تھے اُسے چلاتے تھے، فقہاء سلطنت کا کل انتظام اپنے ہی قبضے میں لے آئے تھے، ملازمینِ سلطنت کا عزل و نصب، اُن کی قدر افزائی یا خواری انہی کے اختیار میں تھی، دولت ان لوگوں نے خوب جمع کر لی تھی، خلاصہ یہ کہ حکومتِ مرابطین سے جو جو پھل انہوں نے چکھنے چاہے تھے وہ چن لیے اور پھلوں کی فصل بھی اُن کے اندازہ سے بہتر اٹھی لیکن یہاں فقہا کی عمدہ توقعات پوری ہوتی تھیں، وہاں ایسے لوگوں کا خوف بھی اس بھی صحیح نکلا جو نہ مراکش کے فقیہوں کا اور نہ صحرا کے وحشیوں کا محکوم ہونا پسند کرتے تھے، شعراء و فلاسفہ اور دیگر اہلِ علم کو مرابطین سے سخت شکایتیں پیدا ہوئیں، یہ درست ہے کہ بہت سے اہلِ علم اور لکھے پڑھے لوگ جو پہلے اندلسی بادشاہوں کے محکموں اور دفتروں میں ملازم تھے، اب مرابطین کی ملازمت میں تھے، لیکن وہ متعصب فقیہوں اور وحشی فوجیوں کے ہجوم میں خوشی سے زندگی بسر نہ کر سکتے تھے، جن شاہی درباروں کی خدمت کے وہ پہلے سے خوگر ہو چکے تھے وہ کچھ اور ہی طرز اور قماش کے تھے پیٹ کے لیے ٹکڑا پیدا کرنے کی غرض سے جو شاعر رؤسائے مرابطین کی شان میں قصیدے کہتے تھے یا مصنفین اپنی کتابیں اُن کے نام معنون کرتے تھے، ان سب کے کلام میں ایک افسردگی پائی جاتی تھی، اور یہ لوگ اپنے اشعار اور تصانیف میں شاہانِ اندلس کو جو دنیا سے چل بسے تھے، بڑی حسرت سے یاد کرتے تھے، ان شعراء اور مصنفین میں بعض بگڑے دل ایسے بھی تھے، جو بے اختیار ہو کر مرابطین پر اپنا غضب ظاہر کرنے لگتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر امیر المسلمین نے اپنے کاتب ابو مردان کو حکم دیا کہ بلنسیہ کے لشکر کو اس حرکت پر کہ عیسائی بادشاہ ارغون سے اُس نے شکست کھائی، فضیحت کی جائے، ابو مردان نے مرابطین کی طرف سے جو بخار اس کے دل میں بھرا ہوا تھا وہ خط میں اس طرح کے جملے لکھ کر نکالا بزدلو! نامردو! جو ایک سوار کو دیکھتے ہی

ڈر کر بھاگنے کو ہوتے ہو، تم کو سواری کے لیے گھوڑے نہیں بلکہ دودھ دُہنے کے لیے بھیڑ بکریاں ملنی چاہیے تھیں، اب وقت آگیا ہے کہ تم کو سخت سزا دی جائے اور اسپین کو خس و خاشاک سے پاک کرنے کے لیے تمہیں پھر صحرا میں واپس آنے کا حکم دیا جائے۔"

اس قسم کی عبارت امیر مرابطین کو اپنی فوج کی نسبت لکھنی کیونکر گوارا ہوسکتی تھی؟ چنانچہ ابو مروان کاتب برطرف کر دیا گیا۔

اس زمانہ میں شاعروں کے لیے سر پرستوں اور مربیوں کا کال پڑ گیا، ہر وقت کفِ افسوس ملتے تھے کہ ہائے لوگوں کا مذاق کیسا بگڑ گیا ہے، صحرا کے وحشی فاتحوں پر لعنت و ملامت کی بوچھاڑ رکھتے تھے، کچھ شاعر ایسے بھی تھے جو فقیہوں کی مدح سرائی کرکے قوتِ لایموت پیدا کر لیتے تھے، کیونکہ فقہاء بھی باوجود زہد و اتقا کے خود پسندی کے عیب سے پاک نہ تھے۔ احمد ابن حمدین قاضی قرطبہ فقہا میں سب سے سر برآوردہ تھے اور خود بینی بھی اُن میں سب سے زیادہ تھی، چونکہ شرفائے عرب سے ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے اور شاہانہ کر و فر سے رہتے تھے، اس لیے اس قسم کے اشعار سننے پسند کرتے تھے "مت ذکر کرو بغداد کی شان اور چین و ایران کے حسن کا، دنیا کے شہروں میں کسی شہر کو قرطبہ کے اور دنیا کے لوگوں میں کسی انسان کو احمد بن حمدین کے مقابلہ میں نہیں پیش کیا جا سکتا" لیکن فقہاء شدت سے بخیل ہوتے تھے، یہاں تک کہ احمد بن حمدین بھی جو سب سے زیادہ دولت رکھتے تھے، اس عیب سے مستثنیٰ نہ تھے، اسی لیے جن شاعروں کو اپنے فن یا اپنی عزت کا ذرا بھی پاس تھا، وہ فقیہوں کی شان میں قصیدے لکھنے سے پرہیز کرتے تھے۔

قصہ مختصر یہ کہ مفلسی و تنگدستی شاعروں کا حصہ بن چکی تھی، شاعر خوش بیان ابن البقی اندلس کے بہترین شعراء میں سے تھا، مگر حالت یہ تھی کہ شہر شہر دریوزہ گری کرتا پھرتا تھا۔ ایک موقع پر بہت ہی رنج و ملال کے ساتھ کہتا ہے "اے ہموطنو! میں تم میں رہ کر مفلسی اور تکلیف میں گذر کر رہا ہوں۔ اگر مجھے اپنی عزت کا خیال ہوتا، تو کبھی کا یہاں سے چلا گیا ہوتا، تمہارے باغ اب پھل پیدا نہیں کرتے، تمہارا آسمان اب بارانِ رحمت

نہیں برساتا، کمال مجھے حاصل ہے، اگر اندلس اپنی زمین سے مجھے نکالتا ہے، تو عراق مجھے قبول کریگا، شاعری کر کے اس ملک میں زندہ رہنا دیوانگی ہے، کیونکہ اس سرزمین میں اب سوائے نالائق اور تو دولت جاہلوں کے کوئی آباد نہیں۔[۱]"

اب شاعروں کے لیے صرف ایک چیز تسکین دینے والی رہ گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس وقت ملک میں جو لوگ صاحب اقتدار تھے، اُن کی مذمت یا فقیہوں پر ہجو کے تیر برسایا کریں، کبھی اُن کو "اہلِ ریا" اور کبھی ایسا بھیڑیا بتائیں جو اندھیرے میں گشت لگاتا ہوا مذہب کے حیلے سے سب کا مال ہڑپ کر جاتا ہے۔[۲]"

لیکن اس قسم کی بد کلامی شعراء کے حق میں خطرناک تھی، کیونکہ ایسے دریدہ دہن اور بدزبان لوگوں کو سزا دینی فقہاء کے اختیار میں تھی۔

فلسفہ کی نسبت اس زمانہ میں یہ کہنا کہ وہ ایک ممنوع علم تھا، بیکار اعادہ ہوگا۔ مالک ابنِ وہیب اشبیلی سے جوانی میں یہ غلطی ہوئی تھی کہ وہ فلسفہ کی تحصیل میں مصروف ہوئے تھے، لیکن جب دیکھا کہ اس میں جان کا خطرہ ہے تو اُسے چھوڑ کر فقہ پڑھنے لگے، اس بات پر افسوس کرنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ فقہ دانی کی بدولت وہ امیر المسلمین کے مقرب و معتمد ہو گئے۔ لیکن جوانی میں جو خطا ہوئی تھی، وہ معاف نہ ہوئی، ایک دشمن نے لکھ مارا کہ تاشفین کے پوتے علی کا دربار بالکل پاک رہتا، اگر شیطان مالک ابنِ وہیب کو اس میں جگہ نہ ملتی۔

اس زمانہ میں فقہاء کا تعصب حد سے گذر چکا تھا اور جس قدر تعصب تھا اسی قدر خیالات میں تنگی و پستی موجود تھی، یہ فقہاء حدیث نبوی پر بہت کم غور و خوض کرتے تھے سارا دار و مدار مالکی مذہب کی تصانیف پر تھا، یہی کتابیں پڑھی جاتی تھیں اور انہی کے

---

[۱] دیکھو اردو ترجمہ کتاب المعجب صفحہ ۱۶۸، عربی اشعار کا یہ خلاصہ ہے (مترجم)

[۲] شاعر ابن القبی نے کہا، "دنیا کا خاتمہ قریب ہے، آج ابنِ حمدین نے روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہے لیکن آسمان کے ستارے بھی اتنی ہی دور ہیں جتنا کہ اس کا روپیہ ہماری گرفت سے دور ہے۔"

مقتضا پر عمل تھا، غلطیوں سے اپنے آپ کو پاک سمجھتے تھے، اُن کی کل دینیات یہی تھی کہ امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) کے فروع مذہب کو بہت غور سے حاصل کیا جائے جو علمائے دین زیادہ روشن ضمیر تھے وہ اعتراض کرتے تھے کہ محض کتب مالکی یا مذہب کی ادنیٰ فروع پر تمام عقائد کو مبنی کرنا درست نہیں ہے۔ مگر ایسے اعتراضوں کے جواب میں معترضوں کو صرف سزا دی جاتی تھی اور وہ بے دین اور بدعتی ٹھیرائے جاتے تھے۔ امام غزالی (علیہ الرحمۃ) کی مشہور و معروف تصنیف احیاء العلوم جس وقت مشرق میں شائع ہوئی تو اندلس میں ایک شور برپا ہو گیا، گو یہ تصنیف ایسی نہ تھی جسے بدعت فی الدین کہا جاتا، امام غزالی تمام مذاہب حکمت و فلسفہ سے بیزار ہو کر پہلے متشکک و منکر ہو گئے۔ لیکن محض انکار سے اُن کے دل کو تسکین نہیں ہوئی، اس لیے تصوف اور علمِ باطن کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوئے اور اس وقت سے حکمت و فلسفہ کے سخت دشمن ہو گئے احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ فلسفہ کا استعمال اگر ہو سکتا ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ الہامی مذہب میں اگر کوئی شخص جدت یا بدعت پیدا کرنی چاہے تو فلسفہ سے اس کا جواب دیا جا سکے، لیکن جب دین اپنی صحیح شکل میں مروج ہو تو پھر فلسفہ ایک بیکار شے ہے، علوم طبیعات سے اگر ایمان میں اختلال پیدا ہوتا ہو تو اُن سے بھی پرہیز کرنا چاہئیے" غرض امام صاحب جس دین کی تعلیم دیتے تھے اُس کا تعلق انسان کی ذات اور اُس کے جذبات سے تھا، یعنی اُس دین کا تعلق دل سے تھا، انہوں نے اس امر میں پوری قوت سے فقہاء پر اعتراض کیا کہ وہ خارج کی چیزوں سے مطمئن ہو کر صرف شرع کے مسائل پر غور کرتے ہیں جن سے ادنیٰ درجے کے خفیف مقدمات طے ہوا کرتے ہیں۔

اس اعتراض نے اندلس کے فقہاء پر وہی کام کیا جو نمک زخم پر کرتا ہے اور وہ سب چلا اُٹھے، چنانچہ قاضی قرطبہ ابن حمدین نے حکم دیا کہ جو شخص غزالی کی کتاب پڑھے گا وہ کافر ہو کر مبتلائے عذاب رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک فتوے سے احیاء العلوم کے تمام نسخوں کو جلا دینے کا حکم صادر کیا۔

اس فتوے کو جس پر تمام فقہائے اندلس کے دستخط تھے امیر المسلمین علی بن یوسف

نے بھی پسند کیا، اس فتوے کی تعمیل میں احیاء العلوم کے نسخے قرطبہ اور سلطنت مرابطین کے ہر شہر میں نذر آتش کر دیے گئے، اور عام اعلان ہو گیا کہ جس شخص کے پاس یہ کتاب نکلے گی، اس کی جائداد ضبط کر لی جائے گی اور خود اُسے موت کی سزا دی جائے گی۔ ۷۲۱)

ایسی حکومت میں ظاہر ہے کہ جو لوگ مسلمان نہ تھے اُن کے ساتھ اور بھی ناروا داری کا برتاؤ کیا جاتا ہوگا، مثلاً قرطبہ کے ایک فقیہہ نے یہودیوں کو مسلمان کرنے کی اپنی دانست میں ایک بہت ہی عمدہ تدبیر نکالی، انہوں نے کہنا شروع کیا کہ ابن مَسَرّہ کے کاغذات میں ایک روایت پڑھنے میں آئی ہے جس میں یہودیوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کیا تھا کہ ہجرت کے بعد پانچویں صدی کے خاتمے تک اگر مسیح موعود ظاہر نہ ہوئے تو وہ سب اسلام قبول کر لیں گے"۔

اس عجیب وغریب روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ ادبیات میں ان فقہاء کو زیادہ دستگاہ نہ تھی، ورنہ ابن مَسَرّہ کے کاغذات میں تلاش کرنے کی بجائے (جو بڑا متقی مسلمان نہ تھا) اس روایت کو وہ کہیں اور بھی مطالعہ کر سکتے تھے، لیکن اس فقیہہ کے ہم عصر نقاد نہ تھے۔

امیر یوسف جو اس وقت اسپین میں تھے، یہ روایت سن کر خود الیسانہ[1] کے شہر میں گئے، یہ شہر بالکل یہودیوں کا تھا، چنانچہ اُسے الیسانۃ الیہود کہا کرتے تھے، امیر یوسف نے شہر میں آتے ہی یہودیوں کو طلب کیا، اور اُن سے کہا کہ تمہارے بزرگوں نے جو وعدہ کیا تھا، اب اُس کا ایفا ہونا چاہیے" یہ سن کر الیسانہ کے یہودیوں کے اوسان خطا ہوئے، لیکن اِس مشکل سے نکلنے کے لیے انہیں جلد ایک تدبیر سوجھ گئی۔ فاتحوں نے اس موقع پر دراصل جس چیز کو تاکا تھا، وہ یہودیوں کا مذہب نہ تھا بلکہ وہ

---

[1] حصن بلائی سے الیسانہ جنوب مغرب میں ۱۵ میل کے فاصلہ پر تھا، شہر کے باہر کی آبادی کل مسلمانوں کی تھی، لیکن شہر کے اندر جس کے گرد فصیل اور خندق تھی یہودی آباد تھے۔ یہ مسلمانوں کو بعض اوقات شہر کے اندر نہ آنے دیتے تھے، دیکھو ادریسی جلد ۲ ص ۵۹

ان کی دولت تھی، یہودی اسپین میں سب سے زیادہ دولت مند مانے جاتے تھے اور حکومت متوقع تھی کہ محصولوں کی معافی سے ملک کی واصلات میں جو کمی ہوتی ہے اُسے یہ یہودی بھرتے رہیں گے۔

یہودی بھی اس بات کو جانتے تھے، پس انھوں نے تدبیر یہ کی کہ قاضی قرطبہ سے امیرالمسلمین کی خدمت میں اپنی سفارش چاہی، احمد بن حمدین نے اُن سے بے توجہی نہیں کی، بلکہ امیر یوسف کے سامنے اُن کے معاملے میں وکالت کی، یہ امر کہ بغیر حق المحنت وصول کیے قاضی صاحب نے اس مقدمے میں وکالت کی، کسی قدر مشتبہ ہے بہرکیف قاضی صاحب کو یہودیوں کے مرافع میں کامیابی ہوئی، امیر یوسف نے جو رقم ان یہودیوں سے طلب کی اس میں شک نہیں کہ وہ بہت زیادہ تھی، مگر یہودیوں نے شکر کیا ہوگا کہ تھوڑا سا مالی نقصان اُٹھا کہ مذہب تو بچ گیا۔

عیسائیوں کا حال یہودیوں سے بھی بدتر ہُوا، عیسائیوں کو اندلس میں مستعربین کہا جاتا تھا، فقہا اور عام مسلمانوں کو عیسائیوں سے بہ نسبت یہودیوں کے زیادہ دشمنی تھی۔[ل] اکثر شہروں میں عیسائیوں کی تعداد قلیل تھی، لیکن غرناطہ کے علاقے میں وہ کثرت سے آباد تھے اور شہر غرناطہ کے قریب ان کا ایک خوبصورت گرجا بھی تھا، جسے ایک قرطی رئیس گدیلا نامی نے ۳۰۶ھ میں تعمیر کرایا تھا، یہ گرجا فقیہوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا، چنانچہ ان فقہاء نے خلیفہ ثانی (حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی مثال کی پیروی کرکے جنھوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں عیسائیوں کی کسی مذہبی عمارت کو خواہ

ل شاید اسی دشمنی کا بدلہ اب یورپ کی عیسائی سلطنتیں دیگر تمام اقوام سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرکے نکال رہی ہیں اور کبھی کسی موقع پر کوئی دقیقہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا باقی نہیں چھوڑتیں؛ انہدام گرجا کے اس قصہ کو (جو آگے بیان ہوا ہے) اگر سچ بھی سمجھ لیا جائے تب بھی ڈوزی کا یہ گلہ کچھ فضول سا ہے، کیونکہ بقول مولانا حالی ؎

کرتے آئے ہیں سب اپنی باری میں یہی　　اور یہی جاری رہے گا دوز تا روز شمار

(اسماعیل)

قدیم ہو یا جدید، سلامت نہ رکھنا چاہا تھا۔[۱] (دیکھیے جرنل ایشیاٹک سلسلہ ۴ جلد ۱۸ ص ۱۳ و ۱۳۹ ایک فقرہ)

[۱] حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ ڈوزی کا صریح اتہام اور بہتان ہے، جس کی کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں، واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کی کسی مذہبی عمارت کو گرانا اور منہدم کرنا تو بڑی بات ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو انہیں خفیف سا نقصان پہنچانے کا بھی کبھی خیال نہیں کیا، بلکہ برخلاف اس کے آپ نے ہمیشہ ان کی حفاظت اور حمایت کی ہے، چنانچہ جب ۱۶ھ / ۶۳۷ء میں بیت المقدس فتح ہوا تو جو امان نامہ عیسائی اہالیان شہر کو حضرت عمرؓ نے لکھ کر دیا، اس کے الفاظ یہ تھے:۔

هذا ما اعطى عبد الله عمر امير المومنين اهل ايليا من الامان اعطاهم امانًا لانفسهم واموالهم ولكنائسهم وصلبانهم وسقيمها وبريئها وسائر ملتها انه لا يسكن كنائسهم ولا تهدم ولا ينتقص منها ولا من خيرها ولا من صلبهم ولا من شئ من اموالهم ولا يكرهون على دينهم ولا يضار احد منهم" یعنی یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام اور مسلمانوں کے سردار عمر نے ایلیا، (بیت المقدس) کے لوگوں کو دی، یہ امان اُن کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار، اور اُن کے تمام فرقوں کے لیے ہے نہ اُن کے گرجا مسلمان سکونت کے لیے استعمال کر سکیں گے، نہ وہ ڈھائے جائیں گے، نہ اُن کو یا ان کے احاطے کو کوئی نقصان پہنچایا جائے گا، نہ عیسائیوں کی صلیبوں اور اُن کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، نہ مذہب کے متعلق اُن پر کوئی جبر کیا جائے گا، اور نہ اُن میں سے کسی شخص کو محض مذہب کے اختلاف کی وجہ سے کوئی تکلیف دی جائے گی" (تاریخ طبری۔ ذکر فتح بیت المقدس)، سمجھ میں نہیں آتا کہ آزادیٔ مذہب کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کونسی ملیگی؟ اور اس بالکل صاف اور غیر مبہم امان نامہ کے بعد یہ کہنا کہ عمر نے گرجوں کو سلامت نہ رکھنا چاہا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ اس ضمن میں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ یہ امان نامہ فوری، وقتی اور نمائشی نہ تھا، بلکہ اس قسم کے تمام وعدوں اور معاہدوں پر اس سختی سے عمل ہوتا تھا کہ جب حضرت عمرؓ کا انتقال ہونے لگا تو آپ نے آئندہ ہونے والے خلیفہ کے لیے وصیت فرمائی کہ ذمیوں (غیر مسلموں) سے جو عہد ہو چکا ہے اُس کی پابندی کی جائے اور اگر کوئی دشمن انہیں ستائے تو اُن کی حمایت میں اُس سے جنگ کی جائے، آپکے اصل الفاظ یہ تھے:

"...يوفى لهم بعهدهم وان يقاتل من ورائهم" (صحیح بخاری مطبوعہ میرٹھ ص ۱۸۷) محمد اسماعیل

اس گرجا کے منہدم کیے جانے کا جاری کیا۔ امیر یوسف بن تاشفین نے بھی اس فتوے پر عمل کرنے کی منظوری دیدی۔ اور ۴۹۲ھ / ۱۰۹۹ء میں یہ گرجا ڈھادیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اور گرجاؤں کا بھی یہی انجام ہؤا۔

عیسائیوں پر فقیہوں نے ایسا تشدد کیا کہ انہوں نے اوفونش بادشاہِ ارغون سے التجا کی کہ ہمیں تکلیفوں سے نجات دینے کی کوئی صورت پیدا کرے۔ اوفونش نے ان کی درخواست منظور کی اور ستمبر ۱۱۲۵ء (شعبان ۵۱۹ھ) میں چار ہزار مسیحی شہ سواروں کو ساتھ لے، جن سب نے انجیل پر قسمیں کھائی تھیں کہ کبھی آپس کا ساتھ نہ چھوڑیں گے، اپنے دارالحکومت سے روانہ ہو گیا۔ لیکن جس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے یہ کل اہتمام کیا تھا وہ حاصل نہ ہؤا۔ یہ درست ہے کہ اسلامی اسپین میں وہ ایک سال تک لوٹ مار کرتا پھرا اور ایک بار تو قرطبہ کے دروازہ تک پہنچ گیا اور ارنیسول کے مقام پر اسے مسلمانوں کے مقابلہ میں ایک فتح بھی نصیب ہوئی۔ لیکن اصلی غرض اس فوج کشی کی غرناطہ پر قبضہ کرنے کی تھی اور وہی پوری نہ ہوئی۔

جس وقت اوفونش کا یہ ارغونی لشکر واپس چلا گیا تو مسلمانوں نے عیسائیوں سے خوب بدلہ نکالا۔ دس ہزار عیسائی تو مسلمانوں کی دسترس سے باہر ہو گئے تھے، کیونکہ انہوں نے اوفونش کی اجازت حاصل کرکے اُس کی عملداری میں سکونت اختیار کر لی تھی، لیکن جو باقی بچے تھے اُن میں اکثر کی جائداد منبط کر لی گئی اور طرح طرح سے انہیں تکلیفیں پہنچائی گئیں، کسی کو قید کیا، کسی کو قتل اور ان میں سے زیادہ تر کو افریقہ روانہ کر دیا۔ افریقہ میں ان لوگوں کی حالت عرصہ تک عذاب کی رہی، آخرکار وہ صالح اور مکناسہ کے شہروں کے قریب آباد ہو گئے (۵۲۰ھ / ۱۱۲۶ء)

عیسائیوں کی یہ جلا وطنی ایک فرمان کے ذریعہ سے عمل میں آئی تھی جو قاضی ابن رشد

لہ ان میں گیسٹن علاقہ بی ارن کا نائب رئیس - پیڈرو - اسقفِ سرقسطہ اور اسٹیفن اسقف وشقہ شامل تھے، دیکھو کتاب تحقیقات (۱۸۸۱ء) ج ا ص ۳۵۰ -

(علامہ ابن رشد کے دادا) نے امیر المسلمین علی بن یوسف سے حاصل کیا تھا۔
اس واقعہ کے گیارہ برس بعد مستعربین کو پھر جلاوطن کیا گیا، اور اب وہ ملک میں بہت کم رہ گئے[1]۔

پس رعایا میں بہت سی جماعتیں ایسی تھیں جن کو مرابطین کی حکومت سخت اور ظالمانہ معلوم ہوئی، عیسائی اور یہودی، یا ایسے مسلمان جو مذہبی رواداری کو جائز رکھتے تھے۔ قوم کا ایک قلیل حصہ تھے، اگرچہ یہ قلیل تعداد بہت با اثر تھی اور حکومت ان کی طرف سے بے پروا نہ رہ سکتی تھی کیونکہ قوم میں جس قدر لائق اور قابل لوگ تھے وہ انہی میں سے تھے لیکن قوم کی مجموعی تعداد کو وہ تعبیر نہ کرتے تھے۔

عامۃ الناس جن کی تعداد کے مقابلہ میں یہ جماعتیں نہایت قلیل تھیں نظم حکومت سے جن باتوں کی توقع رکھتے تھے وہ یہ تھیں:۔ اندرونِ ملک امن و سلامتی، باہر کے دشمنوں سے حفاظت، محصولوں کی کمی اور اقبال و دولت کی ترقی۔

اس بات کو یقیناً تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ کل باتیں یوسف بن تاشفین کے دورِ حکومت میں اور اُن کے بعد اُن کے جانشین علی بن یوسف کے دورِ سلطنت میں رعایا کو حاصل رہیں ملک میں انتظام قائم رہا، تجارت کے راستے محفوظ رہے اور قشتالیہ کے عیسائی جن کو اسلامی علاقوں میں ڈاکے ڈالنے اور لوٹ مار کرنے کا مزا پڑ گیا تھا، ایسے خوف زدہ رہے کہ یہ حرکتیں انہیں ترک کرنی پڑیں۔

ابتداءً میں حکومت نے ملک میں خلاف شرع محصول جاری نہیں کیے، کیونکہ یہودی واصلات کی کمی پوری کر دیا کرتے تھے۔ ایک مسلمان مورخ نے لکھا ہے کہ "کوئی غیر معمولی محصول جاری نہیں کیا گیا۔" مگر یہ قول تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ امیر یوسف بن تاشفین

[1] عیسائی مسلمانوں کی رعایا ہو کر شمال کے عیسائی بادشاہوں سے جو اسلامی ریاستوں کے دشمن تھے، سازشیں کیا کرتے تھے اور اس طرح حکومت سے باغی ہونے کی وجہ سے سزائیں اٹھاتے تھے مصنف اس بات کو صاف نہیں کہتا، بلکہ عیسائیوں کی ہمدردی میں خفا ہو کر منہ آیا ہے۔
(مترجم اردو)

نے جنگ کا ایک محصول جسے "معونہ" یعنی اعانت کا محصول کہتے تھے، کم سے کم ایک بار جاری کرنے کی کوشش کی، المریہ کے لوگوں نے جو کبھی مرابطین کے طرفدار نہ رہے تھے، اس محصول کے ادا[1] کرنے سے انکار کیا، اور جب امیر یوسف نے تقاضا کیا تو قاضی المریہ ابو عبداللہ ابن فرا نے امیر یوسف کو جواب دیا۔ "آپ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں اپنے شہر کے لوگوں کو معونہ ادا نہیں کرنے دیتا اور فرماتے ہیں کہ اس محصول کا جائز ہونا مراکش اور اندلس کے قاضیوں اور فقیہوں کے نزدیک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مثال کا اتباع ہے، یہ صحابی وہ تھے جو حضرت رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قریب دفن کیے گئے تھے اور جن کے عدل وانصاف پر کوئی شخص حرف گیری نہ کر سکا تھا، اے امیر المسلمین! میں اس کا یہ جواب دیتا ہوں کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی نہیں ہیں اور نہ اُن کے قریب آپ دفن کیے جائیں گے اور یہ بھی نہیں ہے کہ آپ کے عدل وانصاف پر کبھی حرف گیری نہ کی گئی ہو، پس اگر قاضی اور فقیہ آپ کا درجہ حضرت عمر فاروقؓ کے برابر بتاتے ہیں تو ان کو اس جسارت کا جواب خدا کے سامنے دینا ہوگا، حضرت عمرؓ نے معونہ اُس وقت تک جاری نہیں فرمایا تھا جب تک مسجد میں جا کر اس بات کی قسم نہ کھالی کہ بیت المال میں اس وقت ایک درہم بھی باقی نہیں ہے اگر آپ بھی ایسی قسم کھا سکتے ہیں تو معونہ وصول کرنے کا حق رکھتے ہیں، ورنہ آپ کو کوئی حق اُس کے وصول کرنے کا نہیں ہے، والسلام"۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس سخت اور صاف اعتراض کا امیر یوسف پر کچھ اثر ہوا یا نہیں مگر یہ بات بالکل پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ امیر یوسف بن تاشفین کے فرزند امیر علی بن یوسف کے زمانۂ حکومت میں شرع کے خلاف محصول ایک حد تک دوبارہ لگائے گئے۔

ہمارے اس قول کی تصدیق ایک مشہور مورخ کے قول سے ہوتی ہے، جس نے

---

[1] ابو عبداللہ ۵۱۴ھ/۱۱۲۰ء میں دروقہ کے قریب قتندہ کی لڑائی میں مارے گئے۔

لکھا ہے کہ امیر علی بن یوسف نے چند عیسائیوں کو مغرم جمع کرنے کے لیے مقرر کیا:
مغرم سے مراد وہی محصول ہوتے تھے جن کا کتاب اللہ میں ذکر نہیں ہے۔

بہرکیف یہ ثابت ہے کہ مرابطین کے زمانہ میں محصول اتنے نہ تھے جتنے کہ شاہان اندلس کے زمانہ میں رعایا کو ادا کرنے پڑتے تھے، اس کے علاوہ سلطنت میں انتظام اور امن ایسا تھا جو رعایا کی بھلائی اور فلاح کا باعث ہوا، امن و سلامتی میں ملک کو اعلیٰ درجہ حاصل ہوا، روٹی ارزاں رہی اور ترکاری برائے نام قیمت پر فروخت ہوتی تھی۔

مرابطین کی حکومت سے جن فوائد کی توقع تھی اُن میں مایوسی نہیں ہوئی، البتہ اگر رعایا اس بات کی متوقع تھی کہ مرابطین کو عیسائیوں پر ایسی فتوحات حاصل ہوں گی جن کا نتیجہ ہمیشہ قائم رہے گا اور اسلامی اسپین پھر وہی شان و شوکت اور عروج حاصل کرے گا جو الناصر یا المستنصر یا منصور کے زمانہ میں رکھتا تھا، تو بیشک یہ امید پوری نہ ہوئی فتوحات کے لیے حالاتِ وقت مرابطین کے حق میں مفید تھے، او فونش ششم اجس نے جنگِ زلاقہ میں شکست کھائی تھی) جب ۵۰۳ھ ۱۱۰۹ء میں مرا تو عیسوی اسپین پھر خانہ جنگیوں کا شکار ہوگیا۔ لیکن مرابطین نے عیسائیوں کے اس ضعف اور ابتری کے زمانہ سے کوئی نفع نہ اُٹھایا، طلیطلہ کو عیسائیوں کے قبضے سے نکالنے میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی البتہ بعض شہروں پر جنہیں درجۂ دوم کا شہر کہنا چاہیے مرابطین کا قبضہ ہوگیا، مگر جہاں ایک طرف یہ کامیاں تھیں وہاں دوسری طرف یہ نقصان بھی دیکھنا پڑا کہ سرقسطہ قبضے سے نکل گیا (۵۱۲ھ ۱۱۱۸ء)

بہرکیف اس انقلابِ سلطنت کے مفید نتائج چند روزہ ثابت ہوئے، کیونکہ سلطنت کے منتظم اور کارکن، فوجوں کے سردار اور سپاہی غیر معمولی عجلت سے تنزل کے راستے پر

ے معتبر جغرافیہ نویس شریف ادریسی نے لکھا ہے کہ مرابطین نے بہرکیف دارالحکومت میں تقریباً تمام اشیاء پر محصول لگایا (نزہتہ المشتاق، جس کا صحیح اڈیشن پروفیسر دوزی اور ڈی گوج نے ۱۸۶۶ء میں شائع کیا۔ متن کا صفحہ ۷۰)

ہو لیے، امیر یوسف بن تاشفین کے امرائے لشکر جس وقت اسپین میں وارد ہوئے تھے تو اگرچہ وہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن نہایت متقی، پرہیزگار، بہادر اور دیانتدار تھے، اور صحرا کی سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کی عادت رکھتے تھے، لیکن جب امیر یوسف نے دولت دے کر اُن کو تونگر کر دیا تو بہت جلد اُن کے اچھے اوصاف اُن سے رخصت ہونے لگے اور اب سوائے دولت کے مزے لوٹنے کے اُن کو دوسرا کام نہ رہا، اندلسی معاشرت اُن کے لیے ایک عجیب دلکش چیز تھی، اب اُن کو اپنی صحرائی زندگی پر شرم آنے لگی اور انھوں نے اندلس کے اُن بادشاہوں کی نقالی شروع کر دی جنھیں تخت اور حکومت سے معزول کیا تھا۔

اندلس میں رہ کر یہ اُمرا علم ادب کے حامی اور سرپرست بنے، شاعروں کی زبان سے اپنی تعریف اور مصنفوں کی طرف سے اپنے نام اُن کی تصانیف کے عنوان میں پڑھنے سے خوش ہو لے لگے، لیکن تمدن اور علم کے متعلق اُن کی کوششیں بھدی اور بے لطف تھیں بہرصورت وہ نیم وحشی ہی رہے اور اندلسی تہذیب و تمدن میں جو چیزیں بدترین تھیں ان کی نقل اتارنے میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے۔

ابوبکر بن ابراہیم یعنی امیر علی بن یوسف کے بہنوئی جو پہلے غرناطہ میں اور پھر سرقسطہ میں بہت کامیابی کے ساتھ حاکم رہے تھے، اس قسم کے امرا لشکر میں سے تھے جو اپنے تئیں اندلسی ثابت کرنے میں بیحد ساعی رہے تھے، ابوبکر صحرا میں پیدا ہوئے تھے اور انکی تعلیم و تربیت اپنی قوم کے تخت قواعد کے مطابق ہوئی تھی، لیکن جب سرقسطہ میں حاکم ہوئے تو وہ شروع زمانہ کی تربیت سب ذہن سے محو ہو گئی اور شاہانِ بنی ہود کے سے طریقے عیش پرستی کے اختیار کر لیے، جب دوستوں میں شراب پینے بیٹھتے تو سر پر تاج اور لباس بادشاہوں کا سا ہوتا۔

بنی ہود علم کے بڑے مربی اور سرپرست رہ چکے تھے، ان میں مقتدر اور موتمن نے فنِ ریاضی میں بڑی بڑی کتابیں لکھی تھیں، ابوبکر بن ابراہیم کو بھی اُن کی نقل اتارنی ضروری تھی، چنانچہ اس شوق میں انھوں نے اس امر کا بالکل خیال نہ کیا کہ امیر علی بن یوسف اور اس زمانہ کے فقہا کیا کہیں گے؟ اس غرض کو حاصل کرنے کے لیے انھوں نے اپنا مشیر اور

دوست ایک ایسے شخص کو بنایا جس کے نام سے مسلمانوں کو سخت نفرت تھی، یہ شخص کتاب اللہ اور وحی تک کو نہ مانتا تھا۔ یہ اندلس کا مشہور و معروف فلسفی ابوبکر بن الصائغ ابن باجہ تھا[1] (۴۲۵ ۱
ابوبکر بن ابراہیم کی سپاہ اس حرکت پر ایسی ناراض ہوئی کہ اُس نے ابنِ ابراہیم کا ساتھ چھوڑ دیا۔

امرائے لشکر کے علاوہ عام سپاہیوں کا بھی یہ حال ہوا کہ باوجود سچے اور پکے مسلمان ہونے کے وہ بھی اپنے افسروں کی مانند بگڑ چلے۔ اندلسیوں کی تحقیر و تذلیل اور میدانِ جنگ میں دوں ہمتی اب اُن کی خصلت میں داخل ہو گئی، بزدلی اس حد کو پہنچی کہ علی بن یوسف نے مجبور ہو کر عیسائیوں سے اپنی نفرت کم کی اور اُن کا امیر البحر ابنِ میمون جو انسان کے حق میں درندے سے کم نہ تھا، جن عیسائیوں کو جلیقیہ، قیطلونیہ، اطالیہ اور قلمرو بیزنطیہ سے اپنے ساتھ لایا[2]، اُن کو امیر نے اپنی فوج میں بھرتی کر لیا۔

باوجود اس کیفیت کے مرابطین، اندلس کو اپنا مقبوضہ و مملوکہ ملک سمجھتے تھے اور اندلسیوں سے جو چیز چاہتے تھے چھین لیتے تھے، چاہے اس میں اُن کا مال ہو یا اُن کی بیوی یا، حکومت مجبور و معذور تھی، اُس کی کمزوری قابلِ رحم ہوتی جاتی تھی، فقہا نے اپنے اختیارات عورتوں کی طرف منتقل کر دیے، یا اپنے اختیارات میں اُن کو حصہ دار بنایا۔ علی بن یوسف پر اُن کی بیوی قمر حکومت کرتی تھیں، دربار کے بڑے لوگوں پر بھی عورتیں ہی قابو یافتہ تھیں جنہوں نے اُن کی طمع پوری کی، اُسی کو ہر قسم کی آزادی دلوا دیتی تھیں، قزاقوں اور رہزنوں کی بھی یہی حالت تھی، اگر وہ ان عورتوں کی پناہ میں آ گئے تو اپنا پیشہ بے تکلف جاری رکھتے تھے، سرکاری عہدوں کا ملنا بھی عورتوں کے اختیار میں تھا اور اُن عہدوں پر اکثر نالائق لوگ مقرر کیے جاتے تھے، تمام نظامِ سلطنت فی الواقع نفرت اور ہنسی کے قابل ہو گیا تھا، کیا اہلِ لشکر اور کیا عوام اس حکومت پر افسوس کرتے تھے، آج جو حکم دیا جاتا کل وہ مسترد ہو جاتا، رؤسائے ملک کو تخت حاصل کرنے کی جرأت ہوتی رہتی تھی، کیونکہ

---

[1] سنہ وفات ۱۱۳۸ء (۵۲۳ھ)

[2] ان ملکوں کے عیسائیوں کو اندلس میں زمانۂ سابق کے صقالبہ کی مانند سمجھنا چاہیئے۔

اُن کو دعویٰ تھا کہ وہ علی بن یوسف سے بہتر حکومت کر سکتے ہیں اور علی بن یوسف تھے کہ اُن کو نماز روزے کے سوا کچھ آتا ہی نہ تھا

ان تمام آفات پر ایک آفت یہ اور نازل ہوئی کہ افریقیہ میں ایک سخت بغاوت شروع ہوگئی (۵۱۵ھ ۱۱۲۱ء) کوہستانِ اطلس کے وحشی گروہوں نے ابنِ تومرت نامی مصلح قوم کی ہدایت سے جو مہدیٔ آخرالزمان ہونے کا بھی دعویٰ رکھتے تھے، تعصب کا سبق پڑھا، اور موحدین کا لقب اختیار کرکے مرابطین کے مقابلہ میں ہتھیار سنبھال لیئے، مرابطین کا قصرِ حکومت خود ہی گرنے کو ہو رہا تھا، اب اس صدمہ نے اُسے بالکل ہی زمین دوش کر دیا، سوائے ایسی فوجوں کے جن کے سپاہی عیسائی تھے، باقی فوجوں میں مرابطین کا یہ حال تھا کہ دشمن کو دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے۔

حکومت نے اندلس میں جب اپنی یہ زبوں حالت دیکھی تو فوج اور لڑائی کا کل سامان اندلس سے اٹھا کر افریقیہ روانہ کر دیا، ادھر اندلس مرابطین سے خالی ہوا، اُدھر شمال کے عیسائیوں کو شکار ہاتھ آیا اور ملک پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔

۵۱۹ھ ۱۱۲۵ء میں اوفونش بادشاہِ ارغون نے اسلامی اسپین میں قتل و غارت کا بازار ایک سال تک گرم رکھا۔ ۵۲۸ھ ۱۱۳۳ء میں اوفونش ہفتم بادشاہِ قشتالیہ نے جو اپنے دادا (۷۲۶)
اوفونش ششم کی طرح اپنے آپ کو شہنشاہ کہتا تھا قرطبہ، اشبیلیہ اور قرمونہ کے علاقوں کو تباہ کیا، شریش کا شہر جلا دیا اور اپنے دادا کی طرح لوٹتا مارتا صنم قادس[1] تک پہنچا۔ اس واقعے کے پانچ برس بعد اس نے شہر جیان، بیاسہ، ابدہ اور اندوشر کے مضافات کو خوب لوٹا، ۵۳۸ھ ۱۱۴۳ء میں قرطبہ، اشبیلیہ اور قرمونہ کی پھر باری آئی کہ عیسائی ان شہروں کو تاخت و تاراج کریں۔ اس کے ایک سال بعد ۵۳۹ھ ۱۱۴۴ء میں تمام اسلامی اسپین قلعہ رباح سے المریہ تک عیسائیوں کے ظلم و ستم کی جولانگاہ بن گیا۔

پس سمجھنا چاہیئے کہ باشندگانِ اسپین کو چند سال کی خوش حالی اور اقبال مندی کے

---

[1] اسے برج قادس یا برج ہرقل بھی کہتے تھے، دیکھو ڈوزی کی کتاب تحقیقات (۱۸۸۱ء) ج ۲ ص ۳۱۲

بعد اس سیاسی انقلاب کے نتائج سے آگاہی ہو گئی جسے بڑے جوش و خروش سے انہوں نے اپنے حق میں مبارک سمجھا تھا، وہ نتائج کیا تھے؟ ایک ناکارہ اور رشوت خوار حکومت، ایک بزدل نا تربیت یافتہ اور ظالم لشکر، منتظمانِ سلطنت نالائق اور قابلِ نفرین، شہروں میں چور اور اُٹھائی گیرے بھرے ہوئے، دیہات اور قصبات میں رہزنوں کی کثرت، تجارت اور حرفت کا بازار قطعی بند، کھانے کی چیزیں گراں اور کمیاب اور سب سے بدتر یہ کہ ملک پر غنیموں کی وہ زیادتی جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

اندلس کے لوگوں کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں، اب وہ مرابطین کو کوستے تھے اور یہ وہی مرابطین تھے جن کے آنے کو شروع میں ملک کے لئے نجات کا موجب سمجھا گیا تھا۔

۵۱۵ھ / ۱۱۲۱ء میں قرطبہ کے لوگ اس فوج کے مقابلہ میں اٹھ کھڑے ہوئے جو مرابطین نے اس شہر میں بٹھا رکھی تھی، اس فوج نے اہلِ قرطبہ پر طرح طرح کے جور و ظلم کیے تھے، اور کسی نے اُن کو نہ روکا تھا، قرطبہ کے لوگوں نے ان وحشی فوجیوں کو اپنے شہر سے نکال دیا اور اُن کے گھروں کو لوٹ لیا۔

علی بن یوسف کو جب قرطبہ کے اس واقعہ کا حال معلوم ہوا تو افریقیوں کی دَل بادل فوجیں لے کر اندلس پر چڑھائی کی، اندلس کے ساحل پر کبھی اتنا لشکر نہ اُترا تھا۔

اب قرطبہ کے لوگوں نے اس ہمت اور دلیری کے ساتھ جو جان سے مایوس ہونے کے وقت ہوا کرتی ہے، اپنے شہر کے دروازے بند کر لئے اور گلیوں اور سڑکوں پر دشمن کو روکنے کے لئے جگہ جگہ مورچے قائم کر دیے، لیکن بایں ہمہ اہلِ قرطبہ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ علی بن یوسف کا مقابلہ کر سکتے۔ خیریت یہ ہوئی کہ فقہا نے درمیان میں آ کر کشت و خون نہ ہونے دیا۔

اس موقع پر فقیہوں نے ہر بات میں بادشاہ کی غلامی سے پرہیز کیا اور حکومت کے مقابلے میں رعیت کے طرفدار بن گئے اور فوراً ایک فتویٰ اس مضمون کا صادر کر دیا کہ اہلِ قرطبہ کی بغاوت حق بجانب ہے، کیونکہ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے ہتھیار اُٹھائے تھے، علی بن یوسف نے حسبِ عادت فقہا کے فیصلے کو تسلیم کیا، اور بہت مختصر

گفتگو کے بعد قرطبہ کے لوگوں نے وعدہ کر لیا کہ مرابطین کی فوج والوں کا جس قدر نقصان ہوا ہے اُس کا معاوضہ ادا کر دیں گے۔

موجودہ واقعات کو دیکھتے ہوئے قرطبہ کے علاوہ اور شہروں میں بھی بے اطمینانی بڑھتی گئی اور کیفیت یہ ہوئی کہ سابقہ حالات جو خود اچھے نہ تھے، موجودہ خراب اور ناقابل برداشت حالت کے مقابلہ میں بہتر معلوم ہونے لگے۔

اس قسم کے خیالات ایک خط سے ظاہر ہوتے ہیں جو ۵۲۸ھ / ۱۱۳۴ء میں اشبیلیہ کے لوگوں نے بادشاہِ سرقسطہ کے فرزند سیف الدولہ کو لکھا تھا، سیف الدولہ اِس وقت اوفونش ہفتم بادشاہِ لیون کی فوج میں سرداری کی خدمت پر تھے اور یہ فوج اس وقت اشبیلیہ کے دروازے پر حملہ کرنے کو تیار کھڑی تھی اس خط میں سیف الدولہ کو اہلِ اشبیلیہ نے یہ جملے لکھے تھے "عیسائیوں کے بادشاہ کو ہماری فریاد سناؤ، اور اس کی مدد حاصل ۱۷۱
کر کے مرابطین کا جُوا ہمارے کندھوں سے اُتروا دو، جس وقت ہم مرابطین کی اطاعت سے آزاد ہو جائیں گے، تو عیسائی بادشاہ کو اپنے سابقین سے زیادہ خراج ادا کیا کریں گے، اور پھر تم اور تمہارے اخلاف ہم پر حکومت کریں گے"۔

اس واقعہ کے گیارہ برس بعد جب کہ مرابطین کی سلطنت اپنے تمام اقطاع میں زوال پذیر ہو رہی تھی تو بازاروں اور مسجدوں میں یہ صدائیں سنائی دیتی تھیں "ان مرابطین نے ہماری ہڈیوں کا گودا تک چوس لیا ہے، کہاں ہے ہمارا مال؟ کہاں ہیں ہماری بیویاں؟ اور کہاں ہیں ہمارے بچے؟ بس اُٹھو اور ان ظالموں کو قتل کر دو" کچھ لوگ ایسے تھے جو کہتے پھرتے تھے "بادشاہِ لیون سے مل جاؤ اور حسبِ دستورِ سابق اس کو خراج دو، اِن مرابطین سے گلوخلاصی کی تو جو تدبیر ہوگی وہ اچھی ہوگی"۔ اس تدبیر کی کامیابی کے لئے خدا سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔

غرض اب اندلس کے لوگ سب ایک ہو کر مرابطین کو غارت کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے رہنما قاضی اور فقیہ تھے، مذہب کوئی بھی ہو، حامیانِ مذہب کی نیکیوں میں شکرگزاری کم شامل ہوا کرتی ہے۔

اسلامی اسپین کے اس سیاسی انقلاب کی تاریخ لکھنا ہم نے اپنے ذمّہ نہیں لیا تھا اور نہ ہمارے ذمّہ یہ کام ہے کہ موحدین (جنھوں نے مرابطین کی سلطنت کو مراکش میں غارت کر دیا تھا) اسپین میں کس طرح فتح یاب ہوئے؟ ہم نے جو کام اس کتاب میں اپنے ذمّہ رکھا تھا۔ وہ صرف اِتنا تھا کہ بنی اُمیہ کی خلافت سے آزاد ہو کر اندلس میں جو خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں، اُن کی ابتدا، اور پھر اُن کی ترقّی اور آخر میں اُن کا انجام کیا ہُوا؟

اگر ان حالات کا مختصر خاکہ کھینچنے میں جب کہ اندلس سلطنتِ غیر یعنی مرابطین کا ایک صوبہ بن گیا تھا، ہم اپنے موضوع کی حدُود سے باہر ہو گئے ہیں تو اس کی ضرورت ایک خاص وجہ سے پیدا ہوئی اور وہ ضرورت اس امر کا واضح کرنا تھا کہ اندلس اپنے آپ کو مرابطین کے حوالے کر کے خوشی حاصل نہ کر سکا اور اُس کے لئے ایک دن اس بات پر افسوس کرنے کا آ گیا کہ کیوں اُس نے ایسے بادشاہوں کو جو اسپین میں پیدا ہوئے تھے، بُرا کہہ کر اور عین خطرے کی حالت میں اُن کا ساتھ چھوڑ کر اُن سے بے وفائی کی؟ ۔

اب ہمیں صرف معتمد علی اللہ کے حالات زمانۂ اسیری کے لکھنے باقی رہے ہیں۔

اسناد :-

عبدالواحد ص ۹۸ تا ۱۰۱، ۱۱۴، ۱۲۲ تا ۱۲۴، ۱۲۷ تا ۱۲۸
۱۳۲ تا ۱۳۳، ۱۴۸ -

عباد :- ج ۱ ص ۵۲ تا ۵۹، ۳۰۲ تا ۳۰۴، ۳۵۶
ج ۲ ص ۴۲، ۴۴، ۶۸، ۱۲۸، ۲۰۴ تا ۲۰۵، ۲۲۷ تا ۲۲۸

قرطاس ص ۱۰۰ تا ۱۰۱، ۱۰۴، ۱۰۸

انالیس ٹولیڈانوس (تاریخ طلیطلہ) ج ۲ ص ۴۰۴

کرونیکون لوسی ٹانم - ص ۳۲۶، ۴۱۹

انالیس کمپوسٹیلانی ص ۳۱۷

ابن الابار ص ۱۸۲، ۲۲۵

ہلال (تاریخ مراکش) ص ۳۰ تا ۳۱، ۳۳ تا ۳۶، ۳۹، ۴۱، ۵۲،
۵۸ تا ۵۹، ۶۲

مقری ج ۱ ص ۲۲۹

ج ۲ ص ۲۶۲ تا ۲۶۳، ۳۰۳ تا ۳۰۴، ۳۲۲ تا ۳۲۳
۳۶۰ تا ۳۶۱، ۴۷۲، ۵۹۰، ۴۲۹

کرونیکون دی الفونسو ہفتم (مندرجہ اسپانا ساگرادا) ص ۱۳ تا ۱۶
۴۵ تا ۴۶، ۶۰، ۶۴، ۸۲، ۸۸ تا ۸۹، ۹۱، ۹۴

ابن ابی اصیبعہ (ابن باجہ پر مضمون)

ابن خلکان ص ۱۷ تا ۱۸

ابن الخطیب (قلمی نسخہ گوتھا) ص ۹۸ تا ۱۰۰

ابن خاقان - کلائیڈ (ابن باجہ پر مضمون)

کتاب رابع

ملوک الطوائف

پندرھویں فصل

زمانۂ اسیری و جلاوطنی میں معتمد علی اللہ کے حالات

امیر یوسف بن تاشفین کے اوصافِ حمیدہ جو کچھ بھی ہوں اور فقہا کی نظر میں یہ بکثرت ۲۸۱
تھے، مگر اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مغلوبوں اور زیر دستوں کے ساتھ علو حوصلگی اُن کے اوصاف میں نہ تھی، اندلس کے ملوک الطوائف کے ساتھ جن کو انہوں نے قید کیا، اُن کا برتاؤ ظلم و دنایت کا تھا، یہ درست ہے کہ بادلیس کے دونوں پوتوں کو جو امیر یوسف کی قید میں تھے، شکایت کا کوئی موقع نہ ملا، اُن کو اِس شرط پر قید سے جلد رہا کر دیا گیا کہ مراکش سے باہر قدم نہ نکالیں، وظائف بھی جو اُن کے مقرر ہوئے ایسے معتدبہ تھے کہ عبداللہ اپنے بچوں کے لئے بڑی دولت چھوڑ مرا، امیر یوسف فی الواقع ان دونوں شہزادوں کے بڑے طرفدار تھے، اولاً تو یہ اُسی قوم کے لوگ تھے جس قوم کے امیر یوسف تھے، دوسرے یہ کہ کچھ قابلیت بھی نہ رکھتے تھے اور جو لوگ نا قابلیت کے ساتھ خوشامدی بھی

ہوں، اُن سے خوف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی، لیکن ان کے سوا جو ملوک الطوائف امیر کی قید میں تھے، اُن کی حالت ایسی اچھی نہ تھی، راضی، متوکل اور اُس کے دو فرزند فضل اور عباس کا حال ہم پڑھ ہی چکے ہیں کہ وہ سب قتل کر دیے گئے تھے، اب معتمد پر امیر یوسف کے ہاتھوں جو کچھ گذرا، وہ بھی کم قابلِ افسوس نہ تھا۔

اشبیلیہ پر جب مرابطین کا قبضہ ہو گیا، تو معتمد کی نسبت حکم ہوا کہ طنجہ روانہ کیے جائیں معتمد جس وقت مع اہل و عیال کے جہاز پر سوار ہو کر طنجہ جانے لگے تو وادی الکبیر کے کنارے ہزار ہا لوگ اُن کو رخصت کرنے کے لئے جمع ہوئے، شاعر ابن اللبّانہ نے اس واقعہ کو اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کیا ہے:-

"نہایت شجاعت سے مقابلہ کرنے کے بعد شہزادے مغلوب ہوئے، پھر اُن کو جہاز تک لائے، دریا کے کناروں پر خلقت کا ہجوم تھا، عورتیں بے نقاب تھیں اور اُن کے چہروں سے رنج و الم ٹپک رہا تھا، جس وقت جہاز چلا، اور مفارقت ہوئی تو وہ کون سی پُر درد آہیں تھیں جو زبان سے نہ نکلی ہوں، اور کون سے آنسو تھے جو آنکھوں سے جاری نہ ہوئے ہوں، افسوس! ہمارے لئے یہاں کیا رہ گیا ہے؟ اے اجنبی! اب یہاں سے تو بھی چلا جا۔ اپنا سامان سمیٹ، جُود و سخا کا مسکن اُجڑ گیا، اے لوگو! جو کبھی شوق سے یہاں آنا چاہو گے، معلوم رکھو کہ جس خاندان کو تم تلاش کرو گے وہ پہلے ہی یہاں سے چلا گیا، افسوس! کششِ باراں نے ہماری کھیتیاں جلا دیں اور اے شہسوار! جس کے جلو میں زرق برق سپاہی ہیں اپنے ہتھیار رکھ دے، اب وہ ہتھیار بے کار ہیں۔ کیونکہ تجھے نگلنے کے لئے شیر نے اپنے جبڑے کھول دیئے ہیں۔"

جب معتمد طنجہ پہنچے، جہاں وہ کئی دن مقیم رہے تو شاعر حصری نے جو اُس وقت طنجہ میں تھا اور اس سے پہلے دربارِ اشبیلیہ میں حاضر رہا کرتا تھا، چند نظمیں جو کسی زمانہ میں معتمد
۷۹|| کی تعریف میں لکھی تھیں، معتمد کو بھیجیں، ان میں ایک قصیدہ بھی تھا جو معتمد کے طنجہ پہنچنے پر لکھا
تھا، اس قصیدہ میں حصری نے روپیہ کا سوال کیا تھا، گو حصری کو یہ معلوم کر لینا چاہیئے

تھا کہ اب اُس کے ممدوح کے پاس دینے کو کچھ نہیں ہے۔ اِس وقت معتمد کے پاس اپنی کُل دولت میں سے صرف چھتیس ۳۶ سکّے چاندی کے رہ گئے تھے، جو اُنھوں نے اپنے موزوں میں رکھ لیے تھے، اور چلنے میں اُن کے پاؤں سے جو خون نکلا تھا، اُس کے داغ اِن سکّوں پر تھے، لیکن معتمد ایسے سخی تھے کہ اُنھیں اپنے اِس آخری سرمائے کو بھی دے ڈالنے میں مطلق تامل نہ ہوا، ایک کاغذ میں روپے لپیٹ کر، اور چند اشعار اِس قلیل رقم کی معذرت میں لکھ کر روپے اور اشعار حصری کے پاس بھیج دیئے، لیکن یہ شاعر ایسا بے غیرت نکلا کہ اُس نے خط کا جواب اور روپیہ کا شکریہ تک نہ لکھا۔

جب طنجہ کے اور شاعروں نے سُنا کہ مصری کو روپیہ ملا ہے تو وہ بھی قصیدے لکھ لکھ کر کثرت سے معتمد کے پاس آنے لگے، لیکن افسوس ہے کہ اُن کو خالی ہاتھ واپس جانا پڑا، اسی موقع پر معتمد نے یہ اشعار کہے تھے:۔

"طنجہ اور مغرب کے شعراء عربوں سے بھی بڑھ کر شعر کہنے پر پِل پڑے ہیں اور ایک قیدی سے خیرات مانگتے ہیں، حالانکہ یہ قیدی اگر اُن سے خیرات مانگے تو بجا ہے، تعجب ہے، اگر حیا اور غیرت کا پاس نہ ہوتا تو آج کو وہ شخص بھی جو پہلے اپنی دولت فراخ دستی سے لٹایا کرتا تھا، سوال کرنے میں انہی شاعروں کے برابر ہوتا۔"

اب معتمد طنجہ سے مکناسہ پہنچا دیئے گئے، راستے میں اُنھیں ایک انبوہ آدمیوں کا ملا، جو مینہ کے لیے دعائیں مانگنے مسجد کی طرف جا رہا تھا، معتمد نے اِن لوگوں کو دیکھ کر فی البدیہہ یہ اشعار کہے:۔

"جب لوگ جو مینہ کی دعا مانگنے والے تھے، مجھے ملے، تو میں نے کہا کہ میرے آنسو مینہ کی جھڑی کا کام دے سکتے ہیں، ان لوگوں نے جواب دیا کہ یہ تو درست ہے کہ آپ کے آنسو ضرور کافی ہوں گے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اُن میں خون ملا ہوا ہے۔"

معتمد مکناسہ میں کئی مہینے رہے، اس کے بعد امیر یوسف کے حکم سے وہ اغمات پہنچا دیئے گئے، جو ملکِ مراکش کا ایک شہر ہے، معتمد جس وقت اغمات کو جاتے تھے تو

اُن کے بیٹے رشید نے، جن سے معلوم نہیں معتمد کیوں ناراض ہو گئے تھے، باپ کو رضا مند کرنے کے لیے ذیل کے اشعار لکھ کر بھیجے :۔

"بارانِ رحمت کے ہمسر! سخاوت کے سردار! انسان کو پناہ دینے والے! بڑی سے بڑی نعمت جو آپ مجھے بخش سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اپنے نورانی چہرے کو دیکھنے کی اجازت دیجئے، جو رات کے لیے مشعل اور دن کے لیے آفتاب ہے"!

معتمد نے جواب دیا :۔

"بارانِ رحمت کا ہمسر، سخاوت کا سردار، اور انسان کا پناہ دینے والا میں اُس وقت تھا جب کہ میرا داہنا ہاتھ خیرات کے دن سونا بکھیرتا تھا، اور لڑائی کے دن دشمن کو قتل کرتا تھا، اور جس وقت لڑائی کا گھوڑا برچھیوں کی آواز سُن کر ڈرتا تھا تو میرا بایاں ہاتھ اُس کی راسیں سنبھال لیتا تھا، مگر اب میری حالت غلامی اور ذلّت کی ہے، میری مثال اب اُس زیارت گاہ کی مانند ہے جس کی حُرمت اُٹھ چکی ہو، یا میں اب اُس پرند کی طرح ہوں جس کے بازو ٹوٹ گئے ہوں، اور اب میں مفلسوں اور مظلوموں کا سوال پورا نہیں کر سکتا، میرے چہرے کا نُور اب غموں سے غبار آلودہ ہے، اور میرے فکروں نے خوشی کے خیالات دل سے نکال دیئے ہیں، کل جو لوگ میرے سامنے حاضر ہونے کی تمنّا کرتے تھے، آج وہ اپنا منہ میری طرف سے پھیر لیتے ہیں"

(۷۳۰ اغمات میں معتمد اپنی زندگی کے دن اِس طرح کاٹ رہے تھے کہ اُن کو دیکھنے سے رحم آتا تھا، امیر یوسف کا کبھی حکم آتا تھا کہ بیڑیاں کاٹ دی جائیں، اور کبھی حکم آتا تھا کہ پھر پہنا دی جائیں، علاوہ اِس طرح تکلیف دینے کے اُن کی ضروریات کی طرف سے بھی غفلت کی جاتی تھی، وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ نہایت مفلسی اور تنگ دستی کی حالت میں رہتے تھے، اُن کی بیوی اور بیٹیاں سُوت کات کر مشکل سے اپنا گذر کرتی تھیں، صرف شعر ایسی چیز تھا جس سے وہ اپنا دل بہلا لیا کرتے تھے، ایک روز قید خانے کی کھڑکی سے پرندوں کا ایک جھنڈ اڑتے دیکھا، جنہیں عرب قطا کہتے ہیں، اور جسے ایک قسم کا تیتر سمجھنا چاہیئے تو اُنھوں نے اپنے خیالات اِن بیتوں میں ظاہر کیے :۔

"جب میں نے قطا کا ایک جھنڈ آسمان پر اُڑتے دیکھا تو میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، وہ آزاد تھے، قید خانے اور بیڑیوں سے واقف نہ تھے، میرے آنسوؤں کا باعث رشک نہ تھا، بلکہ اس بات کی خواہش تھی کہ میں بھی انہی کی طرح آزاد ہوتا، اگر مجھے اتنی آزادی مل جائے کہ جہاں چاہوں جاؤں، تو پھر میرے دل پر غموں کا بوجھ نہ رہے، میں اپنے بچّوں کی موت پر بھی رونا چھوڑ دوں - اے پرندو! تم کیسے خوش ہو؟ تم اپنوں سے جُدا نہیں ہو، اہل و عیال سے مفارقت کا غم تم نہیں جانتے، اور نہ تم اُن راتوں کی تکلیف سے واقف ہو، جو قید خانے میں دروازے بند ہونے کی آواز سننے کے بعد کاٹی جاتی ہیں، ان پرندوں کے بچوں کا خدا روزی رساں ہے، لیکن میرے بچے پیاس سے اور سائے کے بغیر مرے جاتے ہیں"

معتمد نے اپنے اشعار میں اپنی گذشتہ شان و شوکت، اور اپنے آراستہ و پُرتکلف محلوں کو بھی یاد کیا ہے جو اُن کی ناز و نعم کی زندگی کے شاہد رہ چکے تھے، اور اپنے فرزندوں کو بھی یاد کیا ہے جو قتل کیے گئے تھے۔

عید الفطر کے روز اُنھوں نے اس مضمون کے اشعار لکھے:-

"گذشتہ ایام میں عیدیں تجھے خوش کرتی تھیں، لیکن غم کے دن سے بدتر وہ عید ہے جو اغمات میں تجھے ایک اسیر کی شکل میں دیکھ رہی ہے، تو اپنی بیٹیوں کو بدن پر چیتھڑے لگے اور فاقوں سے مرتے دیکھ رہا ہے، وہ مفلس اور محتاج ہو کر بہت قلیل روزی کے لیے سُوت کات کر زندگی بسر کر رہی ہیں، محنت و مشقت سے تھکی ہوئی نظریں نیچے کیے مجھ سے عید ملنے آئی ہیں، جو مشک اور کافور کو پاؤں میں روندتی چلتی تھیں[1]، آج گلیوں کی کیچڑ میں ننگے پاؤں پھرتی ہیں، اُن کے خشک رخسار جن پر آنسوؤں کے نشان جھلک رہے ہیں اُن کی مفلسی کے گواہ ہیں . . . . . .
غموں کی اس عید کو (اللہ خدا نہ کرے کہ تجھے دوسری عید دیکھنی پڑے) جس طرح تو نے روزہ افطار کیا ہے، اسی طرح اُس نے بھی جو تیرا دل ہے روزہ کھولا ہے، تیرا

[1] دیکھو حاشیہ کا صفحہ ۶۶۶

غم جو مدت سے چھپا ہوا تھا، آج تجھ پر پھٹ پڑا ہے۔ کل تیری زبان سے جو حکم نکلتا تھا اُسے سب سے بجا لاتے تھے، اور آج تو سب کے حکموں کو بجا لانے والا ہے بادشاہ جو اپنی شان و عظمت پر غرور کرتے ہیں، وہ ایک رویائے باطل سے دھوکا کھاتے ہیں۔"

سیدہ کبریٰ اُرُمیکیہ کے لیے یہ سخت زندگی قابل برداشت نہ تھی، وہ بہت بیمار ہو گئیں، معتمد کی تکلیف اس وجہ سے اور زیادہ ہو گئی کہ اغمات میں کوئی ایسا نہ تھا جو بیوی کا علاج کرتا، اتفاق سے مشہور طبیب ابوالعلاء ابن زہر اس وقت مراکش میں تھے یہ معتمد کی حکومت کے آخری زمانہ میں اشبیلیہ میں درباری طبیب رہ چکے تھے، معتمد نے ایک زمانہ میں ابوالعلاء کے دادا کی جائداد ضبط کر لی تھی، جسے امیر یوسف نے واگذاشت کر دیا تھا، معتمد کی غیرت اور حمیت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ ایسے شخص سے کوئی درخواست کریں، مگر مجبوری سب کچھ کراتی ہے، بہت پس و پیش کے بعد آخر کار معتمد نے بہت مجبوری کے ساتھ ابوالعلاء کو لکھا کہ وہ بیوی کو آکر دیکھیں، ابوالعلاء نے (۷۴۳) آنے کا وعدہ کیا، چونکہ معتمد کو انہوں نے طولِ بقا کی دُعا دی تھی، لہٰذا اُس کے شکریہ میں معتمد نے یہ اشعار لکھ کر بھیجے:۔

"آپ نے میری بقائے عمر کی دعا کی ہے، لیکن ایک قیدی طول عمر کی کیونکر خواہش کر سکتا ہے؟ کیا اُس کے حق میں موت ایسی زندگی سے بہتر نہیں جس میں روز تکلیفیں بڑھتی رہیں، زیادہ عمر کی خواہش تو وہ لوگ کریں جو راحت و آرام کی اُمید رکھتے ہوں، مجھے تو اب صرف موت سے ملنے کی تمنا ہے، کیا میری خواہش یہ ہو سکتی ہے کہ اپنی بیٹیوں کو ننگے پاؤں اور بدن پر پھٹے کپڑے پہنے دیکھوں، اب وہ اُس شخص کی ماماگیری کرتی ہیں جس کا کام یہ تھا کہ جب میری سواری نکلے تو لوگوں کی اطلاع کے لیے آواز لگائے[1]، اور جو لوگ میرے راستے میں آئیں، اُنہیں ہٹا دے، اللہ جب

---

[1] معتمد کی بیٹیوں کے سلے جو عورتیں کاتنے کے لیے سوت لایا کرتی تھیں اُن میں معتمد کے ایک عریف (دربان) کی بیٹی بھی تھی۔

لوگ میرے قصر کے صحن میں جمع ہوں تو اُن کو بدتمیزی سے روکے، اور جس وقت میں لشکر کا معائنہ کروں، تو میرے چپ و راست اپنا گھوڑا دوڑاتا پھرے، اور یہ دیکھتا رہے کہ کوئی سپاہی اپنی صف سے باہر تو نہیں ہوا، مگر بہر حال تمہارے دل سے نکلی ہوئی دعا نے میرے دل کو تقویت بخشی، اے ابوالعلاء! خدا تم کو اس کا نیک اجر دے، مجھے نہیں معلوم کہ کب میری تمنا پوری ہو گی؟ مگر جب خیال کرتا ہوں کہ آخرالامر سب کو فنا ہے تو نفس کو کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔"

معتمد کو گاہے گاہے خطوط اور شاعروں کی ملاقات سے جنہیں کبھی بہت کچھ مال و دولت دے چکے تھے، کچھ تسکین ہو جاتی تھی، بہت لوگ معتمد سے ملنے کے لیے اغمات کا سفر اختیار کرتے تھے، انہی میں ایک شخص ابومحمد حجازی بھی تھے، ان کو معتمد نے صرف ایک نظم پر اتنا روپیہ دیا تھا کہ وہ اُس کی مدد سے ایک بڑے تاجر ہو گئے تھے، اور جب تک زندہ رہے خوشحال رہے، ان سے ایک دن باتوں باتوں میں معتمد نے اس خیال کو تسلیم کیا کہ یوسف کو اندلس بلانا اُن کی سخت غلطی تھی، اور یہ وہ کام تھا جس سے انہوں نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھود لی، جب ابومحمد معتمد سے رخصت ہو کر المریہ واپس آئے جہاں انہوں نے سکونت اختیار کر لی تھی، تو معتمد نے باوجود محتاج و مفلس ہونے کے ابومحمد کو تحفہ کے طور پر کچھ دینا چاہا، مگر ابومحمد نے نہایت ادب و انکسار سے تحفہ لینے سے انکار کیا، اور دو شعر فی البدیہہ کہے:۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ایسے شخص سے کوئی چیز نہیں لے سکتا جس کو تقدیر نے سخت بیجا تکلیفوں میں مبتلا کر رکھا ہے، آپ کے گذشتہ زمانہ کے انعام میرے لیے کافی ہیں، گو آپ کو اب وہ یاد بھی نہیں ہیں۔"

معتمد کے سب سے گہرے اور وفادار دوست ابن اللبانہ تھے، یہ شاعر جب ایک مرتبہ اغمات میں آئے تو معتمد کو ایک اچھی خبر سنائی، اور وہ یہ تھی کہ اندلس میں جو لوگ صاحب امر ہوئے ہیں وہ حالتِ خوش و خرد میں ہیں، اور وہاں کے عمائد اور اکابر جو کبھی امیر یوسف کی حکومت سے خوش نہ تھے، آپس میں اس بات پر گفتگو کرتے ہیں کہ آپ کو دوبارہ

تخت پر بٹھائیں۔

ابن اللبانہ نے یہ خبر درست سُنائی تھی، اندلس کے طبقۂ اعلیٰ کے لوگوں میں بے حد ناراضی پھیلی ہوئی تھی، حاکموں کو اس کی خبر بھی ہو گئی تھی، اور انہوں نے بہت ہوشیاری اور آہستگی سے ایسے لوگوں کو جن پر شبہ گذرا تھا، گرفتار بھی کر لیا تھا، مالقہ میں یہ حالات خاص کر پیش آئے تھے، اس شہر کے اہلِ سازش جو قید ہو گئے تھے (اور جن کا سردار ایک بڑا نامور شریف ابن خلف نامی تھا) رات کے وقت قید خانے سے نکل بھاگے، اور قلعہ منت میور[۱] پر اُنہوں نے قبضہ کر لیا، اس کے تھوڑا عرصہ بعد معتمد کا ایک فرزند عبدالجبار جو اندلس میں رہ گیا تھا، اور جسے لوگوں نے راضی ابن معتمد سمجھ رکھا تھا، اہلِ سازش سے جا ملا، جنہوں نے اُسے اپنا سردار بنا لیا۔ (۷۳۲

ان باغیوں کا کام خوب درستی سے چل رہا تھا، مراکش کا ایک جہاز بھٹک کر قصر مالقہ کے قریب ساحل پر آ گیا تھا، اُس میں سے رسد اور لڑائی کا سامان اُنہیں آسانی سے ملتا رہتا تھا، جزیرۃ الخضرا اور ارکش کے لوگوں نے ان باغیوں کی اطاعت قبول کر لی، اور ۴۹۳ھ ۱۰۹۹ء میں اُنہوں نے ارکش کو دشمن پر حملہ کرنے کے لیے اپنا صدر مقام بنا لیا، عبدالجبار کے حملے اشبیلیہ کے دروازوں تک ہونے لگے۔

پہلے تو عبدالجبار کی بغاوت کی خبر سُن کر معتمد بہت پریشان ہوئے، اور ڈرے کہ یہ بغاوت بغیر سوچے سمجھے کی گئی ہے اور اس لیے عبدالجبار کا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو اُس کے اور بھائیوں کا ہوا، لیکن یہ خوف جلد جاتا رہا، اور بجائے خوف کے اچھی اُمید بندھنے لگی، اور جو تخت ہاتھ سے جا چکا تھا، اُس کا پھر حاصل ہونا ممکن نظر آنے لگا۔

اس قسم کی دل خوش کن اُمید کو معتمد نے اپنے دوستوں سے چھپایا بھی نہیں، چنانچہ جس وقت ابن حمدیس شاعر اُن سے ملاقات کر کے مہدیہ کو واپس ہوا، تو ایک نظم اُسے لکھ کر بھیجی جس کی ابتدا یوں تھی:-

---

[۱] یہ قلعہ مربلہ کے قریب ہے اور ایک غیر آباد مقام ہے۔

مسجد میں منبر اور قصر میں تختِ شاہی اُس اسیر پر روتے ہیں جسے تقدیر نے افریقہ کے ساحل پر پھینک رکھا ہے۔"

اسی نظم میں یہ اشعار بھی تھے:۔

"اے کاش! مجھے کوئی یقین دلا دیتا کہ میں اپنے باغ اور بحیرے کو پھر دیکھوں گا جو اُس ملک میں ہیں جہاں زیتون کا درخت اُگتا ہے، جہاں قُمریوں کی کوکو، اور طیورِ خوش لحن کے نغمے سُنے جاتے ہیں۔"

ابن اللبانہ نے اس قسم کی امیدیں پیدا کرائی تھیں، جس وقت وہ اندلس واپس آنے لگا تو معتمد نے اُسے بیس مثقال چاندی اور دو پارچے دیے۔ ابن اللبانہ نے یہ چیزیں واپس کر دیں، اور اس موقع پر یہ اشعار کہے:۔

"کچھ دن اور صبر کیجیے، بہت جلد آپ میری خوشی کا باعث ہوں گے، کیونکہ آپ کو پھر اپنا تخت مل جائے گا، جس دن آپ قصر میں داخل ہوں گے تو مجھے اعلیٰ ترین مرتبہ پر پہنچا دیں گے، پھر آپ سخاوت میں بنی مروان سے بھی سبقت لے جائیں گے، اور میں فضل و کمال میں جریر[۱] سے بھی بڑھ جاؤں گا۔"

غرض معتمد اب اس امید میں رہنے لگے کہ پھر صاحبِ حکومت ہو جائیں گے، باوجودیکہ امیر یوسف کے حکم سے بھاری بھاری بیڑیاں بار بار اُن کے پاؤں میں ڈالی جاتی تھیں، کیونکہ امیر یوسف کو اسی زمانے کے کسی شخص کا قول یاد تھا کہ "جب شیر کا بچہ غراتا ہے تو شیر جست لگانے کو ہو جاتا ہے۔" معتمد کی اُمید بالکل ہی غلط بنیاد پر قائم ہوئی تھی عبدالجبار کے فریق میں لوگوں کی تعداد بہت تھی، اور مرابطین کی حکومت بہت ہی اندیشہ کے ساتھ ان حالات کو دیکھ رہی تھی، دو برس تک اس بغاوت نے حکومت پر ایک خوف طاری رکھا، اور جب تک معتمد کی موت کا وقت نہ آگیا، یہ بغاوت فرو نہ ہو سکی[۲] (۴۸۹ھ / ۱۰۵۹ء)

(۳۴۳

[۱] یہ شخص حجاج بن یوسف حاکم عراق کے شاعر تھا، ہجو کہنے میں مشہور تھا۔ سالِ وفات ۱۱۰ھ/۷۲۸ء۔

[۲] یہ بغاوت ۴۸۴ھ/۱۰۹۲ء میں شروع ہوئی تھی، دو برس کے بعد عبدالجبار ارکش میں داخل ہوا، سیر حاکم اشبیلیہ نے عبدالجبار کا ارکش میں محاصرہ کر لیا، عبدالجبار ایک تیر سے زخمی ہو کر ہلاک ہوا، لیکن جس فریق کا وہ سردار تھا اُس نے کچھ مدت بعد تک ہتھیار نہ ڈالے۔

معتمد عرصہ تک بیمار رہ کر ۴۸۹ھ ۱۰۹۵ء میں بعمر پچپن ۵۵ سال قضا کر گئے، اور اغمات کے قبرستان میں دفن ہوئے، کچھ مدت کے بعد عید الفطر کے روز اندلس کا شاعر ابن عبد الصمد اُن کے مزار پر آیا، اور سات مرتبہ قبر کے گرد اس طرح پھرا جیسے کوئی کعبہ کا طواف کرتا ہو پھر جھکا اور اُس خاک کو بوسہ دیا جس کے نیچے اُس کا محسن و مربی آسودہ تھا، اور اُٹھ کر ایک مرثیہ پڑھا، اس شاعر کی مثال کا حاضرین پر ایسا اثر ہوا کہ سب نے قبر کا طواف کیا، اور زار و قطار روتے رہے۔

تیرھویں صدی عیسوی (نویں صدی ہجری) کا ایک مؤرخ لکھتا ہے "سب لوگ معتمد سے محبت رکھتے ہیں، سب اُس کے حال پر ترس کھاتے ہیں، اور اب تک اُسے روتے ہیں" شاہانِ اندلس میں وہ سب سے زیادہ ہر دلعزیز بادشاہ تھے، اُن کی سخاوت اُن کی شجاعت، اور اُن کی مروت نے آیندہ نسلوں میں شریف اور شائستہ طبیعتوں کو اُن کا گرویدہ کر دیا، جو رحم دل تھے اُن پر معتمد کے مصائب نے، جن کی مثال ملنی مشکل تھی بعید اثر کیا، اور عوام الناس کو اُن کی زندگی کے عجیب اور دلچسپ سوانح نے متاثر رکھا، شاعری میں اُن کے کلام کی تعریف بدوی بھی کرتے تھے، جو شعر کی زبان پرکھنے میں حضری (شہر کے رہنے والے) سخن فہموں سے زیادہ مستند خیال کیے جاتے تھے۔

بارھویں صدی عیسوی (آٹھویں صدی ہجری) میں ایک شخص اشبیلیہ کا رہنے والا صحرائے افریقہ میں سفر کرتا ہوا بنی لخم کے ایک خیمہ گاہ میں پہنچا، ایک خیمے کے قریب آ کر اُس کے مالک سے مہمان نوازی کا خواستگار ہوا، مالک مسافر کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کہ آج ایک مہمان کی خاطر و مدارات کرنے کا موقع نصیب ہوا، جس میں اس کی شہرت رکھتی تھی، پس اُس نے نہایت خوش ہو کر مہمان کا خیر مقدم کیا، مسافر دو تین دن تک اِن مہربان میزبانوں کے پاس رہا، ایک رات نیند نہ آئی تو ہوا کھانے کے لیے خیمے سے باہر نکلا، رات نہایت خوشگوار تھی، فیروزی رنگ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے، اتنے میں چاند نے اُفق سے آہستہ آہستہ بلند ہو کر صحرائے خوابیدہ و خاموش کو اپنے نور سے منور کر دیا، اور تمام ریگزار آئینہ بن گیا، یہ منظر دیکھ کر اس اشبیلی کو اپنے سابق بادشاہ کی ایک نظم یاد آ گئی،

اور اسے زور زور سے پڑھنا شروع کیا

"جب رات نے اپنا سایہ زمین پر ایک عظیم الشان نقاب کی طرح ڈال دیا، تو میں مشعلوں کی روشنی میں جو میرے ساغر میں جھلکتی تھی۔ شراب پینے لگا، آسمان پر جوزا بلند ہو چکا تھا کہ اتنے میں قمر نے اپنا رُخِ روشن دکھایا، معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کی ملکۂ حسنِ فطرت کے معائنے کو اُٹھی ہے اور جوزا اس پر چتر کئے ہوئے ہے، ستارے تاباں و درخشاں ایک ایک کر کے حاضر ہوئے اور نور بڑھتا رہا اور اس جشن کواکب میں پروین کا جھمکا اس طرح آسمان میں معلق ہوتا ہے گویا کہ ملکۂ قمر اپنا پرچم اڑا رہی ہے۔

جس طرح یہ ملکہ آسمان پر ہے، میں زمین پر ہوں، جوانانِ تہمتن اور مہوشانِ حرم میرے گرد جمع ہیں۔ جن کی سیاہ زلفیں ظلمتِ شب کو مات کرتی ہیں، دوستو! آؤ شراب پئیں، انگور کا عرق نوش کریں۔ جب کہ یہ خوبصورت گانے والیاں اپنا گانا سناتی ہوں"

اس کے بعد اشبیلی نے ایک نظم سنائی جو معتمد نے اپنے والد کا عتاب دور کرنے کی غرض سے لکھی تھی، اس عتاب کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ معتمد اپنی غفلت سے مالقہ کی لڑائی ہار گئے تھے، اشبیلی نے یہ نظم ابھی پڑھنی ختم نہیں کی تھی کہ قریب ترخیمے کا پردہ کسی نے ہٹایا اور ایک شخص نظر آیا جس کی واجب التعظیم صورت ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شیخ قبیلہ ہے۔ شیخ اس اشبیلی کے قریب آیا اور نہایت صاف اور پاکیزہ عربی محاورے میں جس کے لئے بدوی ہمیشہ سے مشہور رہے آتے ہیں اور جس پر انہیں فخر و ناز ہے، کہنے لگا:۔

"اے حضری! شہر کے رہنے والے، تجھ پر خدا کی برکتیں نازل ہوں، یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ کس کے اشعار پڑھے ہیں، جس کی زبان آبِ رواں کی مانند مصفا ہے اور جس کے الفاظ میں ایسے سبزے کی سی تازگی ہے جس پر ابھی مینہ کا چھینٹا پڑا ہو، کبھی وہ نازک و شیریں اشعار اس حسینہ کی نوائے خوش معلوم ہوتے ہیں، جس کے گلے میں سونے کا ہار پڑا ہو، اور کبھی وہ ایسے تیز اور پُر آواز ہیں جیسے بچۂ شتر کی بانگ"

مسافر نے جواب دیا۔ "یہ ایک بادشاہ کے کہے ہوئے اشعار ہیں جو اندلس میں حکومت

کرتا تھا، اس کا نام ابنِ عبّاد تھا۔

شیخ نے کہا "درست ہے، یہ بادشاہ کسی بہت ہی چھوٹے مُلک پر حکمراں ہوگا اور اس وجہ سے اپنا تمام وقت شعر کہنے میں صرف کر سکتا ہوگا، کیونکہ جس شخص کو بہت سے کام کرنے ہوں، وہ ایسے اچھے اشعار کہنے کی مہلت نہیں پا سکتا۔

مسافر:۔ یا شیخ! معاف فرمائیے گا، یہ بادشاہ ایک بڑی قوم کا بادشاہ تھا۔

شیخ:۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کس قبیلے سے تھا؟

مسافر:۔ یقیناً، وہ بنی لخم میں سے تھا۔

شیخ یہ سُن کر کہ آج اپنے قبیلے کی شہرت کے لئے ایک بات اور حاصل ہوئی، بے انتہا خوش ہُوا اور اسی خوشی میں گرجتی ہوئی آواز سے پکارا "قبیلے والو! اٹھو، اٹھو اور جلد اُٹھو"۔

اِس آواز کے بلند ہوتے ہی ایک آنِ واحد میں تمام خیمہ گاہ میں ہل چل پڑ گئی، اور اہلِ قبیلہ جوق در جوق اپنے شیخ کے گرد جمع ہونے لگے جب وہ سب جمع ہو گئے تو شیخ نے ان سے کہا "تم سب بھی اُس چیز کو سُنو، جو میں نے ابھی سنی ہے اور اپنے حافظہ میں وہ کلام محفوظ کر لو جو ابھی میرے دل میں نقش ہوا ہے، کیونکہ یہ وہ کلام ہے جو تمہارے لئے تمغۂ فخر ہے اور ایسا سرمایۂ عزت ہے جس پر تم کو ناز ہو سکتا ہے، اے حضری! مہربانی کرو اور ایک بار پھر ہمارے بنی عم کے اشعار سُنا دو"۔

اشبیلی نے جب وہ اشعار پھر پڑھے اور اہلِ بادیہ نے اپنے شیخ کی طرح نہایت جوش و خروش سے شاعر کے کلام کی داد دے لی، تو اشبیلی نے کچھ حالات جو وہ شیخ کو سنانے والا تھا، ان بدوؤں کے سامنے بھی بیان کئے، یہ حالات بنی عبّاد اور ان کے اقارب و متعلقین کی اصل کے متعلق تھے کہ کس طرح ان میں بھی قبیلۂ لخم کا خون موجود تھا۔ اور وہ بھی کسی زمانہ میں اونٹ لئے صحرا میں گشت لگایا کرتے تھے اور اپنے خیمے وہاں نصب کرتے تھے جہاں ایک ریگستان ملکِ مصر کو شام کے ملک سے جدا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس نے معتمد کا ذکر شروع کیا جس کے کلام میں نزاکت و لطافت اور علو و جلالت پیدا تھی۔ (۸۳۷

وہ ایک بہادر مبارز اور اشبیلیہ کا جلیل القدر بادشاہ تھا۔

جب اشبیلی نے اپنی تقریر ختم کر لی، تو سب بدوی قومی تفاخر کے جوش میں مست ہو گئے اور فوراً گھوڑوں پر سوار ہو کر رقص و سرود[1] شروع کیا اور اسی میں صبح کر دی۔

صبح ہوتے ہی شیخ قبیلہ نے اپنے اونٹوں میں سے بیس اونٹ جو بہترین تھے نکال کر اشبیلی کی نذر کئے، قبیلے میں سے اور لوگوں نے بھی حسبِ حیثیت اس مہمان کو اونٹ دیئے یہاں تک کہ سورج پورا نکلا بھی نہ تھا کہ اشبیلی کے پاس تیس اونٹ جمع ہو گئے پھر ان فیاض اور مہمان نواز فرزندانِ صحرا نے اشبیلی کے ہاتھ کے بوسے دے کر اسے اچھے اچھے کھانے کھلائے اور اس کی بہت عزت کی اور جب اس کے رخصت ہونے کا وقت آیا تو بہت مشکل سے اسے جانے کی اجازت دی، کیونکہ ایسے مسافر سے جو ان کے ہم قوم لخمی بادشاہ اور شاعر کا کلام اس خوبی سے پڑھ سکے، ان کو بہت محبت ہو گئی تھی۔

ان واقعات سے ڈھائی سو برس بعد جب کہ اسلامی اسپین سابق کی طرح آزاد نہ تھا بلکہ سخت پابندِ مذہب ہو گیا تھا، ایک زائر ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لئے ملکِ مراکش میں سفر کر رہا تھا، غرض اس سفر کی یہ تھی کہ بڑے بڑے درویشوں سے ملاقات اور مقدس مقامات کی زیارت کرے، یہ زائر بادشاہ غرناطہ کا وزیر لسان الدین ابن الخطیب تھا، دورانِ سیاحت میں جس وقت اغمات کے چھوٹے سے قصبے میں آیا تو اس قبرستان کی تلاش ہوئی جہاں ابھی تک معتمد علی اللہ اور اس کی ملکہ سیدہ رمیکیہ کی قبریں موجود تھیں، یہ قبریں ایک پہاڑی کے قریب تھیں اور اس پہاڑی پر نیلوفر کے درختوں میں پھول کثرت سے کھل رہے تھے۔

ان قبروں کو دیکھ کر جو زمانے کے ہاتھوں کہنہ و شکستہ ہو رہی تھیں وزیر ابن الخطیب

[1] اس رقص کا نام پروفیسر ڈوزی نے فانتازیہ لکھا ہے اور مترجم انگریزی نے اس پر یہ تعلیق لکھی ہے کہ "اس رقص کی کیفیت کے لئے دیکھو سی، آر کونڈر کی کتاب "فلسطین میں خیمے" (مطبوعہ عنہ ۱۸۰۸ء) صفحہ ۳۴۶" (مترجم اردو)

کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور انہوں نے فی البدیہہ یہ اشعار کہے:۔

"اس متبرک فریضہ کو ادا کرنے کے لئے کہ تیری قبر کی زیارت کروں، میں اس وقت اغمات میں ہوں، اے صاحبِ قبر! افسوس، کیوں میرے نصیب میں نہ ہوا کہ آپ کی زندگی میں آپ سے واقف ہوتا اور نہ آپ کی مدح میں زبان کھولنے کی عزت حاصل کرتا، آپ وہ ہیں جو سخاوت میں سب بادشاہوں سے بالاتر ہیں اور اس طرح روشن ہیں جس طرح مشعل شبِ تاریک میں روشن ہوتی ہے، اب کم ازکم اجازت دیجئے کہ آپ کی قبر کو سلام کروں، زمین کی بلندی آپ کے مدفن کو ممتاز کرتی ہے، آپ جب زندہ تھے تو لوگوں میں ممتاز تھے اور مرنے کے بعد بھی آپ اُن لوگوں سے برتر ہیں جو موت کے خوابِ گراں میں آپ کے قدموں کے پاس آسودہ ہیں، زندوں میں آپ بادشاہ تھے اور اب مُردوں میں بھی بادشاہ ہیں، آپ کے بعد زمانہ بہت گذر گیا ہے مگر اب تک اُسے آپ جیسا تاجدار دیکھنا نصیب نہیں ہوا، اور میں سمجھتا ہوں کہ جو زمانہ آئندہ گذرنے والا ہے، وہ بھی آپ جیسا بادشاہ نہ دیکھے گا۔"

مگر معتمد کو ہم دنیا کے بڑے بادشاہوں میں شمار نہیں کر سکتے، چونکہ وہ ایک ایسی قوم پر حکومت کرتے تھے جو محض حصولِ نشاط کے لئے زندہ تھی اور جسے عیش وعشرت نے بالکل کمزور کر دیا تھا، اس لئے وہ بڑے رُتبے کے بادشاہ نہ ہو سکتے تھے، اگر اُن کی فطری آرام طلبی اور ہر حسین چیز سے عشق، جو حسن پرستوں کی لذت اور تباہی دونوں کا باعث ہوا کرتا ہے، انہیں اس مرتبے کی اجازت بھی دیتا تو بھی وہ اُسے حاصل نہ کر سکتے، لیکن اس میں ہرگز کلام نہیں کہ کوئی اور بادشاہ اُن کی مانند نازک خیال جس میں شاعری کی روح حلول کر چکی ہو، نظر نہیں آتا، اُن کے لئے زندگی کا کوئی خفیف سے خفیف اور گریز پا سے (۱۲۳۹ء)
گریز پا واقعہ ایسا نہ تھا جو شاعری کے حسین لباس میں سامنے نہ آجاتا ہو، اُن کی سیرت یا بہر صورت اُن کی علمی زندگی کے حالات اُن کی نظموں سے اخذ کر کے لکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نظمیں اُن کے دِل کے سچے انکشافات ہیں جن میں ہر روز کی دھوپ اور چھاؤں جو جو

راحتیں اور کلفتیں اپنے ساتھ لائی تھی، اُن کے صحیح مرقعے نظر آجاتے ہیں اس کے علاوہ اُن کی بڑی خوش نصیبی یہ تھی کہ وہ اُن اسلامی بادشاہوں میں سے تھے جو اسپین میں پیدا ہوئے تھے اور اُنہی پر ایسے بادشاہوں کے سلسلہ کا خاتمہ ہوا معتمد اس قوم اور قومی شائستگی اور تمدن کے تعبیر کرنے والے تھے جو افریقہ کے وحشی فوج کشوں کے دورِ حکومت میں اسپین سے فنا ہو گیا، یا اگر زندہ رہا تو بہت کمزور اور نحیف حالت میں رہا۔ معتمد اس وجہ سے بھی عزیز ہیں کہ اندلس کے متحدہ شاعر بادشاہوں میں وہ سب سے آخر میں پیدا ہوئے تھے۔ کسی اور بادشاہ کو قوم اِتنا نہیں روئی جتنا معتمد علی اللہ کو روئی۔ اور اتنا روئی کہ دو سروں پر گمنامی کا اندھیرا چھا دیا اور اس رونے میں حزن وملال تھا جو پھول کو آخری بار کھلتے دیکھنے یا موسم خزاں کے آخری ساکت وخاموش دنوں کو یا غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی اخیر کرنوں کو دیکھ کر ہوتا ہے ✦

اسناد

ابن الخطیب (قلمی نسخہ ع)، ابن بلوکین پر مضمون

عبادہ (ڈوزی) ج ۱ ص ۴۰، ۵۹ تا ۶۸، ۱۱ تا ۳۰۶، ۳۱۰ تا

۳۱۴، ۳۱۹ تا ۳۲۰، ۳۶۶، ۳۸۳

ج ۲ ص ۶۳ - ۶۶ تا ۶۷، ۱۱ تا ۱۴۸، ۱۴۷ تا

۱۴۹، ۱۷۵، ۲۲۲ تا ۲۲۳ - ۲۲۸ تا ۲۲۹، ۲۳۲

عبدالواحد ص ۱۰۱ تا ۱۰۲، ۱۰۹

مقری ج ۲ ص ۲۹۳

گیارہویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) کے ملوک الطوائف

اشبیلیہ - بنی عباد

ابوالقاسم محمد (اول)، ابنِ اسماعیل (قاضی)،	۱۰۲۳ء تا ۱۰۴۲ء مطابق ۴۱۴ھ تا ۴۳۴ھ
ابوعامر عباد ابنِ محمد - المعتضد	۱۰۴۲ء تا ۱۰۶۹ء ، ۴۳۴ھ تا ۴۶۲ھ
ابوالقاسم محمد (ثانی) بن عباد - المعتمد	۱۰۶۹ء تا ۱۰۹۱ء ، ۴۶۲ھ تا ۴۸۴ھ

قرطبہ - بنی جہور

ابوالحزم جہور ابن محمد ابن جہور	۱۰۳۱ء تا ۱۰۴۳ء مطابق ۴۲۳ھ تا ۴۳۵ھ
ابوالولید محمد ابنِ جہور	۱۰۴۳ء تا ۱۰۶۴ء مطابق ۴۳۵ھ تا ۴۵۶ھ
عبدالملک ابنِ محمد	۱۰۶۴ء تا ۱۰۷۰ء ، ۴۵۷ھ تا ۴۶۳ھ

(قرطبہ سلطنتِ اشبیلیہ بنو عباد میں شامل کر لیا گیا)

مالقہ - بنی حمود

حمود

علی (خلیفہ) — (۱) ادریس اوّل، حسن (۵)، محمد اوّل (۲) یحییٰ — (۶) ادریس ثالث

یحییٰ — (۳) حسن — یحییٰ؛ (۴ - ۷) ادریس ثانی

۱ - ادریس اوّل	۱۰۳۵ء تا ۱۰۳۹ء مطابق ۴۲۷ھ تا ۴۳۱ھ
۲ - یحییٰ	۱۰۳۹ء ، ۴۳۱ھ
۳ - حسن	۱۰۳۹ء تا ۱۰۴۱ء ، ۴۳۱ھ تا ۴۳۳ھ
نجاء	۱۰۴۱ء تا ۱۰۴۳ء ، ۴۳۳ھ تا ۴۳۵ھ
۴ - ادریس	۱۰۴۳ء تا ۱۰۴۶ء ، ۴۳۵ھ تا ۴۳۹ھ
۵ - محمد اول	۱۰۴۷ء تا ۱۰۳۵ء ، ۴۳۹ھ تا ۴۴۵ھ
۶ - ادریس ثانی	۱۰۳۵ء ، ۴۲۶ھ

۷- ادریس ثانی (بارِ دیگر) سنہ ۱۰۳۵ء تا سنہ ۱۰۵۵ء مطابق سنہ ۴۲۵ھ تا سنہ ۴۴۷ھ

۸- محمد ثانی سنہ ۱۰۵۵ء تا سنہ ۱۰۵۷ء ، سنہ ۴۴۷ھ تا سنہ ۴۴۹ھ

(مالقہ کا الحاق سلطنتِ غرناطہ سے ہوگیا)

جزیرۃ الخضراء - بنی حمود

محمد ابن قاسم ابنِ محمد سنہ ۱۰۵۳ء تا سنہ ۱۰۴۸ء(۱۹) مطابق سنہ ۴۲۷ھ تا سنہ ۴۴۰ھ

قاسم بن محمد سنہ ۱۰۴۸ء(۱۹) تا سنہ ۱۰۵۷ء ، سنہ ۴۴۰ھ تا سنہ ۴۵۰ھ

(جزیرۃ الخضراء سلطنت اشبیلیہ بنو عباد میں شامل کرلیا گیا)

غرناطہ - بنی زیری

زاوی ابن زیری سنہ ۱۰۱۹ء مطابق سنہ ۴۱۰ھ (۷

حبوس سنہ ۱۰۱۹ء تا سنہ ۱۰۳۸ء ، سنہ ۴۱۰ھ تا سنہ ۴۳۰ھ

بادیس سنہ ۱۰۳۸ء تا سنہ ۱۰۷۳ء ، سنہ ۴۳۰ھ تا سنہ ۴۶۶ھ

عبداللہ سنہ ۱۰۷۳ء تا سنہ ۱۰۹۰ء ، سنہ ۴۶۶ھ تا سنہ ۴۸۳ھ

قرمونہ - بنی رزال

اسحاق

عبداللہ ابن اسحاق سنہ ۱۰۴۲ء(۳) مطابق سنہ ۴۳۴ھ

محمد بن عبداللہ سنہ ۱۰۴۲ء(۳) تا سنہ ۱۰۶۷ء ، سنہ ۴۳۴ھ تا سنہ ۴۶۰ھ

(مطابق تحریر ابنِ حیان - دیکھو ابنِ لبسام ۱-۸۷)

ابن عبداللہ (یعنی عبداللہ ابنِ محمد) نے قرمونہ
میں اس وقت حکومت کی جب کہ ہشام ثالث
قرطبہ میں فرمانروا تھے - سنہ ۱۰۲۶ء تا سنہ ۱۰۳۱ء مطابق سنہ ۴۲۰ھ تا سنہ ۴۲۳ھ

(اور ابنِ حیان ہی کے بیان کے مطابق
جو ابنِ خلدون کے بیان سے زیادہ قابلِ
اعتبار ہے، ابنِ عبداللہ کا جانشین

اسحاق بن عبداللہ ہوا جس نے حکومت کی از سنہ ۱۰۵۰ء مطابق سنہ ۴۴۲ھ

(ابن الابار نے معلوم ہوتا ہے اس بیان میں غلطی کی ہے کہ ابنِ عبداللہ سنہ ۴۴۳ھ ۱۰۵۱ء میں میں زندہ تھا)

رندہ

ابونور ابنِ ابی قرہ (۱) سنہ ۱۰۱۴ء تا سنہ ۱۰۵۳ء مطابق سنہ ۴۰۵ھ تا سنہ ۴۴۵ھ

ابونصر ابنِ ابونور سنہ ۱۰۵۳ء " سنہ ۴۴۵ھ

(رندہ کا الحاق سلطنتِ اشبیلیہ سے ہو گیا)

مورور

نوح (۵) سنہ ۱۰۱۳ء تا (۳) سنہ ۱۰۴۱ء مطابق سنہ ۴۰۴ھ تا سنہ ۴۳۳ھ

ابو مناد (۲) سنہ ۱۰۴۱ء تا سنہ ۱۰۵۳ء " سنہ ۴۳۳ھ تا سنہ ۴۴۵ھ

(مورور سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا)

ارکش

ابن فرزون سنہ ۱۰۵۳ء مطابق سنہ ۴۴۵ھ

(ارکش سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا)

ولبہ بنی بکریہ

ابو زید محمد ایوب (۳) سنہ ۱۰۱۱ء سے ابتدا ہوئی مطابق سنہ ۴۰۲ھ سے ابتدا ہوئی

ابو المصعب عبدالعزیز تا سنہ ۱۰۵۱ء تا سنہ ۴۴۳ھ

(ولبہ کا الحاق سلطنتِ اشبیلیہ سے ہو گیا)

لبلہ - بنی یحییٰ

ابو العباس احمد ابن یحییٰ یحصبی سنہ ۱۰۲۳ء تا (۳) سنہ ۱۰۴۱ء مطابق سنہ ۴۱۴ھ تا سنہ ۴۳۳ھ

محمد ابن یحییٰ یحصبی (یعنی ابو العباس احمد کا بھائی)

فتح ابن خالد ابن یحییٰ (یعنی محمد بن یحییٰ کا بھتیجا) تا سنہ ۱۰۵۱ء تا سنہ ۴۴۳ھ

(لبلہ ریاست اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا)

(ابن الابار (دیکھیہ ڈوزی) کی کتاب رسرچیز ۱ - ۲۸۷) نے ریاست لبلہ کے اخیر بادشاہ کا نام یحییٰ ابن احمد بن یحییٰ لکھا ہے - لیکن یہاں ابنِ خلدون کی عبارت کی پابندی کی گئی ہے (عباد - ۲ - ۲۱۱) ابن حیان (دیکھو ابنِ بسام ۱ - ۱۰۸) نے یہ نام فتح بن یحییٰ لکھا ہے)

شلب - بنی مزین

ابوبکر محمد ابن سعید ابن مزین — ۱۰۲۸ء تا ۱۰۵۰ء مطابق ۴۱۹ھ تا ۴۴۲ھ

ابوالاصبغ عیسیٰ — تا ۱۰۵۱ء(۲) مطابق تا ۴۴۳ھ

(شلب کی ریاست اشبیلیہ کی سلطنت میں شامل کر لی گئی)

شنت ماریۃ الغرب

ابوعثمان ابن ہارون — ۱۰۱۶ء تا ۱۰۴۳ء مطابق ۴۰۷ھ تا ۴۳۵ھ

محمد ابن ابوعثمان سعید ابن ہارون — ۱۰۴۳ء تا ۱۰۵۲ء " ۴۳۵ھ تا ۴۴۴ھ

(شنت ماریۃ الغرب) شبیلیہ کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا)

مرتلہ

ابنِ طیفور — تا ۱۰۳۶ء مطابق ۴۲۸ھ

(مرتلہ سلطنتِ اشبیلیہ میں شامل کر لیا گیا)

بطلیوس

سابور

بنی الافطس

ابومحمد عبداللہ ابن محمد ابن مسلمہ (المنصور اول)

ابوبکر محمد (المظفر) — تا ۱۰۶۸ء مطابق تا ۴۶۱ھ

یحییٰ المنصور ثانی
عمر المتوکل — تا ۱۰۹۴ء مطابق تا ۴۸۷ھ

طلیطلہ

یعیش — تا ۱۰۳۶ء مطابق تا ۴۲۸ھ

بنی ذی النون

اسماعیل الظافر — ۱۰۳۶ء تا ۱۰۴۳ء مطابق ۴۲۸ھ تا ۴۳۵ھ
(دیکھو مصنف کی کتاب، رسرچیز (۱۸۸۱) - ۱ - ۲۳۸ - حاشیہ)
ابو الحسن یحییٰ بن المامون — ۱۰۴۳ء تا ۱۰۷۵ء مطابق ۴۳۵ھ تا ۴۶۸ھ
یحییٰ بن اسماعیل ابن یحییٰ القادر — ۱۰۷۵ء تا ۱۰۸۵ء ، ۴۶۸ھ تا ۴۷۸ھ

سرقسطہ - بنی تجیب

منذر بن یحییٰ تجیبی — تا ۱۰۳۹ء مطابق تا ۴۳۱ھ

بنی ہود

ابو ایوب سلیمان ابن محمد المستعین — ۱۰۳۹ء تا ۱۰۴۶ء مطابق ۴۳۱ھ تا ۴۳۸ھ
احمد المقتدر — ۱۰۴۶ء تا ۱۰۸۱ء ،، ۴۳۸ھ تا ۴۷۴ھ
یوسف موتمن — ۱۰۸۱ء تا ۱۰۸۵ء ، ۴۷۴ھ تا ۴۷۸ھ
احمد المستعین ثانی — ۱۰۸۵ء تا ۱۱۱۰ء ،، ۴۷۸ھ تا ۵۰۴ھ
عبد الملک عماد الدولہ — تا ۱۱۱۰ء ،، تا ۵۰۴ھ

السہلہ (دار الحکومت شنت ماریہ بنو رزین)

بنی رزین

ابو محمد ہذیل اول ابن خلف ابن لب ابن رزین — ۱۰۱۱ء سے مطابق ۴۰۲ھ سے
ابو مروان عبد الملک اول ابن خلف
ابو محمد ہذیل ثانی عز الدولہ پسر ابو مروان عبد الملک اول
ابو مروان عبد الملک ثانی حسام الدولہ — تا ۱۱۰۳ء مطابق تا ۴۹۷ھ

یحییٰ

البونت ۔ بنی قاسم

عبداللہ (اول) ابن قاسم الفہری نظام الدولہ تا ۱۰۳۰ء مطابق تا ۴۲۱ھ

محمد یمین الدولہ

احمد عضد الدولہ تا ۱۰۴۸ء[۹۱] " تا ۴۴۰ھ

عبداللہ ثانی جناح الدولہ برادر احمد عضد الدولہ ۱۰۴۸ء[۹۱] تا ۱۰۹۸ء " ۴۴۰ھ تا ۴۹۲ھ

بلنسیہ

مبارک اور مظفر صقالبہ

لبیب صقلبی صاحب طرطوشہ

عبدالعزیز المنصور ۱۰۲۱ء تا ۱۰۶۱ء مطابق ۴۲۱ھ تا ۴۵۳ھ

عبدالملک المظفر ۱۰۶۱ء تا ۱۰۶۵ء " ۴۵۳ھ تا ۴۵۸ھ

(ریاست بلنسیہ کا الحاق ریاست طلیطلہ سے ہوگیا)

مامون (صاحب طلیطلہ) ۱۰۶۵ء تا ۱۰۷۵ء مطابق ۴۵۸ھ تا ۴۶۸ھ

(بلنسیہ کا تعلق ریاست طلیطلہ سے قطع ہوگیا)

ابوبکر ابن عبدالعزیز ۱۰۷۵ء تا ۱۰۸۵ء مطابق ۴۶۸ھ تا ۴۷۸ھ

قاضی عثمان بن ابی بکر تا ۱۰۸۵ء " تا ۴۷۸ھ

قادر (سابق بادشاہ طلیطلہ) ۱۰۸۵ء تا ۱۰۹۲ء " ۴۷۸ھ تا ۴۸۵ھ

(ریاست بلنسیہ جمہوری حکومت ہوجاتی ہے)

ابن جحاف ۔ صدر مجلس

دانیہ

ابوالجیش مجاہد الموفق تا ۱۰۴۴ء[۱۵] مطابق تا ۴۳۶ھ

علی اقبال الدولہ ۱۰۴۴ء[۱۵] تا ۱۰۷۶ء " ۴۳۶ھ تا ۴۶۹ھ

(مقتدر صاحب سرقسطہ نے علی اقبال الدولہ کو تخت سے اتار دیا اور ریاست دانیہ کو سرقسطہ میں شامل کر لیا)

مقتدر (صاحب سرقسطہ) ۱۰۷۶ء تا ۱۰۸۱ء مطابق ۴۶۹ھ تا ۴۷۴ھ

(مقتدر نے اپنی ریاست اپنے دو بیٹوں میں تقسیم کردی ان دونوں میں سے ایک کا نام حاجب منذر مشہور تھا۔ اس کے حصے میں لاردہ، طرطوشہ اور دانیہ کے علاقے آئے)

پسر مقتدر بولایت بنی بہتر

مرسیہ

خیران (صاحب المریہ) ۱۰۱۶ء تا ۱۰۲۸ء مطابق ۴۰۷ھ تا ۴۱۹ھ

زہیر (صاحب المریہ) ۱۰۲۸ء تا ۱۰۳۸ء 〃 ۴۱۹ھ تا ۴۳۰ھ

عبدالعزیز المنصور (صاحب بلنسیہ) ۱۰۳۸ء تا ۱۰۶۱ء 〃 ۴۳۰ھ تا ۴۵۳ھ

عبدالملک المظفر (صاحب بلنسیہ) ۱۰۶۱ء تا ۱۰۶۵ء 〃 ۴۳۵ھ تا ۴۵۸ھ

(اوپر کے آخری تین بادشاہوں کے زمانے میں ابوبکر احمد بن طاہر مرسیہ کے حاکم رہے)

ان کا انتقال ہوا۔ ۱۰۶۳ء مطابق ۴۵۶ھ

ان کے بعد ان کا فرزند ابو عبدالرحمٰن محمد ث جانشین ہوا ۱۰۶۳ء تا ۱۰۷۸ء مطابق ۴۵۶ھ تا ۴۷۱ھ

معتمد۔ بادشاہ اشبیلیہ۔

ابن عمار

ابن رشیق تا ۱۰۹۰ء مطابق تا ۴۸۳ھ

المریہ

خیران تا ۱۰۲۸ء مطابق تا ۴۱۹ھ

زہیر ۱۰۲۸ء تا ۱۰۳۸ء مطابق ۴۱۹ھ تا ۴۳۰ھ

عبدالعزیز المنصور (صاحب بلنسیہ) ۱۰۳۸ء تا ۱۰۴۱ء 〃 ۴۳۰ھ تا ۴۳۳ھ

بنی صمادح

ابوالاحوص معن ۱۰۴۱ء تا ۱۰۵۱ء مطابق ۴۳۳ھ تا ۴۴۳ھ

محمد معتصم ۱۰۵۱ء تا ۱۰۹۱ء 〃 ۴۴۳ھ تا ۴۸۴ھ

عزالدولہ تا ۱۰۹۱ء 〃 تا ۴۸۴ھ

اسناد

ذیل کی فہرست میں ان کتابوں اور مصنفوں کے نام ہیں جن سے مصنف کتاب نے مضامین اخذ کئے ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کا سنہ طباعت ہر کتاب کے آگے لکھ دیا گیا ہے۔ قلمی نسخوں کا "کیٹیلوگ نمبر" جو کتب خانوں میں درج ہے ہر نسخے کے نام کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ خطوط وحدانی میں جو عبارت ہے وہ مترجم انگریزی نے اپنی طرف سے اضافہ کی ہے +

(۱) عباد۔ عرب مصنفوں کے لکھے ہوئے حالات بنی عباد۔ مرتبہ پروفیسر ڈوزی لیدن ۱۸۴۶ء (یہ مجموعہ تین جلدوں میں ختم ہو کے ۱۸۶۳ء میں چھاپا گیا)

(۲) عبد الواحد المراکشی۔ کی کتاب المعجب (خلافت موحدین)... مطبوعہ ڈوزی لیدن ۱۸۴۷ء۔ (اس کا ترجمہ ای فاگنان نے کیا ہے، جو بمقام الجیریز ۱۸۹۳ء میں طبع ہوا۔)

(۳) ابو المحاسن۔ ابو المحاسن ابن تغری بردی ...... مرتبہ ٹی۔ جی۔ جے، جوین بال اور بی۔ ایف۔ مانفییس۔ لیدن ۱۸۵۲ء۔ ۱۸۶۱ء (النجوم الزاہرہ زمانہ حکومت عرب میں مصر کی تاریخ۔ عربی کا ترجمہ فرنسیسی میں سی۔ اے۔ ای۔ باربیر ڈی مینارد نے ۱۸۸۹ء میں کیا)

(۴) اغانی۔ مطبوعہ جے۔ جی۔ ایل۔ کوسی گارٹن۔ گریفسوالڈ ۱۸۴۰ء (کتاب الاغانی مؤلفہ ابو الفرج الاصفہانی۔ مطبوعہ بولاق ۱۸۶۸ء بیس جلدوں میں ہے اور ایک جلد ضمیمہ کی علاوہ ہے۔ آر۔ ای برونو نے بمقام لیدن ۱۸۸۸ء میں طبع کی۔

(۵) اخبار مجموعہ۔ پیرس کا قلمی نسخہ۔ قدیم نسخے۔ نمبر ۷۰۶ (یہ عربی کتاب مع اسپینی ترجمے کے جو ای۔ ایل۔ باقتندہ القنطرہ نے کیا تھا ۱۸۶۷ء میں طبع ہوئی۔ نیز دیکھو ڈوزی کی "کتاب تحقیقات" (۱۸۸۱) جلد ۱۔ ص ۴۰ اور ڈوزی کا دیباچہ جو ابن عذاری کی تاریخ پر لکھا گیا۔ ص ۱۰ تا ۲)

(۶) احمد ابن ابی یعقوب - کتاب البلدان - قلمی نسخہ - مملوکہ ایم مجلنسک باشندہ سنیٹ پیٹرز برگ (نیز کتاب البلدان مصنفہ احمد ابن ابی یعقوب معروف بہ الیعقوبی مطبوعہ اے - ڈبلیو - تھومس جونس بال - لیدن ۱۸۶۱ء)

(۷) الوارد - پادری یولوجیس کے سوانح - مندرجہ اسپاناساگرادا، جلد ۱۰ ص ۴۲۹ تا ۴۷۱ - خطوط مندرجہ اسپاناساگرادا - جلد ۱۱ ص ۱۸۱ تا ۲۱۸ - اندی کولوس لومی نوسو مندرجہ اسپاناساگرادا - جلد ۱۱ ص - ۱۱ - ص ۲۱۹ - ۲۷۵)

(۸) انالیس کومپلوٹین سس - مندرجہ اسپاناساگرادا جلد ۲۳ - ص ۳۱۰ - ۳۱۴

(۹) انالیس کومپوئی ٹسلانی - مندرجہ اسپاناساگرادا جلد ۲۳ ص ۵۸ تا ۲۶۲

(۱۰) انالیس ٹولیڈانوسس - مندرجہ اسپاناساگرادا - جلد ۲۳ - ص ۵۸ تا ۳۶۲ -

(۱۱) عریب ابن سعد القرطبی - تاریخ افریقیۃ واندلس - موسومہ البیان المغرب، مصنفہ ابن عذاری ..... اور چند اجزا تاریخ عریب ابن سعد القرطبی کے، جن کو ڈوزی نے طبع کیا لیدن ۱۸۴۸ء، ۱۸۵۱ء -

(۱۲) بلاذری - احمد ابن یحییٰ البلاذری

(۱۳) البصری - فتوح الشام، یعنی ملک شام میں اسلامی فتوحات کے حالات - مؤلفہ .... محمد بن عبد اللہ الازدی البصری .... مرتبہ ایشائن - ڈبلیو - ابن لیس کلکتہ ۱۸۵۴ء (ببلیوتھیکا انڈیکا - جلد ۱۶)

(۱۴) برگانزا - فراسسکو دی برگانزا - قدیمیات اسپین مطبوعہ مجریط ۱۷۱۹ء تا ۱۷۲۱ء -

(۱۵) فہرست .... مرتبہ ڈوزی - لیدن ۱۸۵۱ء

(۱۶) کاسن - اے - پی کاسن دی پرسیوال - جواب مضمون بر تاریخ، از ابتدائے اسلام - پیرس ۱۸۴۷ء، ۱۸۴۸ء

(۱۷) کرونیکا دی الفونسو - ہفتم (تاریخ بادشاہ الفونسو) مندرجہ اسپاناساگرادا -

جلد ۲۱ - ص ۳۰۷ - ۴۰۹

(۱۸) کرونیکون - البیلڈینسی - مندرجہ اسپانا ساگرادا - جلد ۱۳ - ص ۴۱۷ تا ۴۶۴

(۱۹) کرونیکون برگنسی - مندرجہ اسپانا ساگرادا - جلد ۲۳ - ص ۳۰۷ تا ۳۱۰

(۲۰) کرونیکون دی سارڈبنا - مندرجہ اسپانا ساگرادا جلد ۲۳ ص ۳۰۷ تا ۳۸۰

(۲۱) کرونیکون کومپلوٹین سی - مندرجہ اسپانا ساگرادا جلد ۲۳ ص ۳۱۵ تا ۳۱۷

(۲۲) کرونیکون کومپلوسٹی لانم - مندرجہ اسپانا ساگرادا جلد ۲۳

(۲۳) کرونیکون کونم بری سنیسی - مندرجہ اسپانا ساگرادا جلد ۲۳ ص ۳۲۹ تا ۳۵۵

(۲۴) کرونیکون اری ایبنسی - مندرجہ اسپانا ساگرادا جلد ۲۰ ص ۵۹۸ تا ۶۰۸

(۲۵) کرونیکون لوسی تانم - مندرجہ اسپانا ساگرادا - جلد ۱۴ - ص ۴۰۲ تا ۴۱۹

(۲۶) اسپانا ساگرادا - یعنی اسپین کی تاریخ و جغرافیہ کا جام جہاں نما - طبع دوم مجریط ۱۷۵۴ء تا ۱۸۵۰ء (۱۸۷۹ء) مطبوعہ ایچ فلوریز و دیگر اشخاص

(۲۷) لیولوجیوس - یولوجیوس کی تصنیفات جس قدر کہ شوٹس کی کتاب ہسپانیا الیسٹراٹی میں نقل ہوئی ہیں - جلد ۴ - (یہی تصنیفات مِین کی کتاب کی جلد ۱۱۵ - ۱۱۶ میں بیان ہوئی ہیں)

(۲۸) الفاکہی - ابو عبداللہ الفاکہی "تاریخ مکہ" - لیدن کا قلمی نسخہ نمبر ۴۶۳ دیکھیو کیٹیلوگ - ۲ - ص ۱۷۰

(۲۹) حماسہ :- مرتبہ ابوتمام حبیب ابن اوس - مطبوعہ فریٹاگ بون ۱۸۲۸ء - ۱۸۵۱ء مشہور مجموعۂ اشعار -

(۳۰) حماسہ البحتری - لیدن کا قلمی نسخہ (صرف ایک ہی ہے)

(۳۱) ہسٹوریا کمپو سٹیلانا - مندرجہ اسپانا ساگرادا جلد ۲۰

(۳۲) ہلال - (تاریخ مراکش) قلمی نسخہ لیدن کا نمبر ۲۴ مقابلہ کرو - عباد جلد - ۲ - ص ۱۸۲ - اور بعد کے صفحات نیز مقابلہ کرو کیٹیلوگ جلد ۲ - ص ۱۸۵

(۳۳) حمیدی - (مشاہیر کے تذکرے) آکسفورڈ کا قلمی نسخہ - ہنٹ - ص ۴۶۴

(۳۴) ابن ابی اصیبعہ: ۱۔ اطبار کے سوانح) پیرس کے قلمی نسخہ (نمبر ۶۷۳) کے حصۂ متعلق کی نقل معہ اُن اختلافات کے جو آکسفورڈ کے قلمی نسخے سے مقابلہ کرنے سے معلوم ہوئے ۲ ہنٹ ۱۷۱۔ اور پوکاک ۳۵۶ (یہ کتاب یعنی "عیون الانباء" مقام کونگز برگ میں اے ملز نے ۱۸۸۴ء میں طبع کی تھی)

(۳۵) ابنِ عذاری ۔ دیکھو عریب

(۳۶) ابن الابار ۔ جہاں تک ڈوزی کی تصنیف "تبصرات بر تصانیف عرب" میں ابن الابار کی تصنیفات کا ذکر آیا ہے جسے دیکھنا چاہیئے (حلۃ السیرۃ" مصنفہ ابو محمد عبد اللہ ابن الابار)

(۳۷) ابن الاثیر ۔ پیرس کا قلمی نسخہ جو بالم "ٹورن برگ" کے مملوکہ قلمی نسخے کی نقل ہے (کتاب الکامل فی التاریخ مصنفہ ابوالحسن علی عزالدین ابن الاثیر مطبوعہ ٹورن برگ ۱۸۵۱ء تا ۱۸۷۶ء

(۳۸) ابن الخطیب (الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ اور اس کی تلخیص مرکز الاحاطہ، باد باء غرناطہ) ۱۔ برلن کا قلمی نسخہ ۲۔ کتب خانہ اسکوریال کا قلمی نسخہ ۳۔ موسیو دی کیانگوس کا مملوکہ قلمی نسخہ ۴۔ پیرس کا قلمی نسخہ ۔ دیکھو عباد (ڈوزی) جلد ۲۔ ص ۱۴۹ تا ۱۷۲ اور کتاب تحقیقات (دوسری طباعت) جلد ۱۔ ص ۲۹۲ تا ۲۹۴ ۔

(۳۹) ابن القوطیہ ۔ پیرس کا قلمی نسخہ نمبر ۷۰۶ (ڈوزی کا دیباچہ ابن عذاری کی تاریخ پر ص ۲۸ تا ۳۰) (تاریخ اندلس یعنی ۲۸۰ھ مطابق ۸۹۳ء تک اسپین میں عربوں کی تاریخ)

(۴۰) ابن بدرون ۔ ابن عبدون کے قصیدے پر تاریخی شرح ابن بدرون کے قلم سے مطبوعہ آرڈوزی لیدن ۱۸۴۶ء (ابن عبدون کے قصیدے کا مضمون زوال حکومت بنی افطس ہے)

(۴۱) ابن بسام ۔ ذخیرہ ۔ پہلی جلد ۔ قلمی نسخہ ۔ مملوکہ ایم جولز مول ۔ دوسری جلد قلمی نسخہ آکسفورڈ کا (نمبر ۷۴۹، کیٹلوگ I. Ri) تیسری جلد ۔ قلمی نسخہ گوتھا کا (نمبر ۲۶۶) جسے جمع کر کے مقابلہ کیا گیا ۔ موسیو دی کیانگوس کے قلمی نسخے سے ایسے مقامات کے متعلق جہاں ابن بسام نے ابن حیان کی عبارتیں نقل کی ہیں ۔ دیکھو عباد (ڈوزی) جلد ۱ ص ۱۸۹ اور بعد کے صفحات ۔ نیز دیکھو جرنل ایشیاٹک ۱۸۶۱ء ۔

(۴۲) ابن بطوطہ ۔ سفر نامہ ابن بطوطہ ..... سی ۔ دی فریمری اور بی ۔ آر ۔ سانگوئی نیٹی

پیرس ۱۸۵۳ء وغیرہ وغیرہ۔

(۴۳) ابنِ حبیب ۔ دیکھو تاریخ۔

(۴۴) ابنِ حیان ۔ قلمی نسخہ آکسفورڈ کا ۔ قلمی نسخہ بوڈلین کا ۔ ۵۰۹ نکول کی فہرست نمبر ۱۳۷) نیز دیکھو ابنِ بسام (ابومروان ابن حیان کی عظیم الشان تاریخ تقریباً کل معدوم ہے)

(۴۵) ابنِ حزم ۔ (رسالہ مذاہب پر) لیدن کا قلمی نسخہ نمبر ۴۸۰ (رسالہ عشق پر) لیدن کا قلمی نسخہ نمبر ۹۲۷ (ابومحمد علی ابن حزم ۔ ان میں ایک کتاب "کتاب الملل والنحل" (تاریخ مذاہب وفرق) ہے اور دوسری "طوق الحمامہ" (مجموعہ اشعار عشقیہ) ہے۔

(۴۶) ابنِ خاقان ۔ مطمح الانفس لندن اور سنیٹ پیٹرزبرگ کے قلمی نسخے ۔ قلائد العقیان و محاسن الاعیان ۔ لیدن کے قلمی نسخے (نمبر ۳۰۶ اور ۳۵ (یہ اخیر کتاب یعنی "خالص سونے کنٹھیاں اور بڑے لوگوں کی خوبیاں" اس کا ترجمہ ۔ ای بورگید نے کیا ہے)۔

(۴۷) ابنِ خلدون ۔ مقدمہ تاریخ ۔ مطبوعہ ای کواتری میری ۔ مقدمہ "کتب عربی کتب خانہ سرکاری کے تعلیقات اور اقتباسات" کے ساتھ طبع ہوا ہے ۔ (جلد سولھویں ، سترھویں اور اٹھارہویں (تاریخ بنی امیہ مشرقی) لیدن کا قلمی نسخہ جلد نمبر ۲ ۔ نمبر ۱۳۵۰ ۔ (تاریخ اسپین) پیرس کا قلمی نسخہ (نمبر ۲۴۴۷ تا ۴۴۷ ، ضمیمہ ۷۴۴ اور لیدن کا قلمی نسخہ (۴ نمبر ۱۳۵۰) (تاریخ بربر) مطبوعہ و مترجمہ میک گواکن دی سیلن ۔ (پورا نام ۔ ابوزید عبدالرحمن ابن خلدون ۔ ولادت $\frac{۷۳۲ھ}{۱۳۳۲ء}$ وفات $\frac{۸۰۹ھ}{۱۴۰۶ء}$)۔

(۴۸) ابنِ قتیبہ ۔ مطبوعہ ۔ وسٹن فلڈ ۔ مقام گوٹن گن ۱۸۵۰ء۔

(۴۹) ایداتی ایپسکوپی کرونیکون ۔ مندرجہ اسپانا گرادا ۔ جلد ۸ ۔ ص ۲۸۲ تا ۳۲۵ و (مقابلہ کرو ، کتاب تحقیقات (۱۸۸۱) جلد ۱ ۔ ص ۲ ۔ اور بعد کے صفحات)۔

(۵۰) ادریسی ۔ جغرافیہ ادریسی ۔ مطبوعہ پی ۔ اے ۔ جابرٹ ۔ پیرس ۱۸۳۶ء تا ۱۸۴۰ء نزہتہ المشتاق مصنفہ ابوعبداللہ الادریسی ۔ ولادت $\frac{۴۹۳ھ}{۱۰۹۹ء}$ وفات $\frac{۵۴۹ھ}{۱۱۵۴}$۔

(۵۱) علیسیدور ۔ علیسیدوری پاکن سیس ایپس کوپی کرونیکون مطبوعہ اسپانا ساگرادا جلد ۸ ص ۲۸۲ تا ۳۲۵ (مقابلہ کرو کتاب تحقیقات جلد ۱ ص ۲ ۔ اور بعد کے صفحات)

(۵۲) اصطخری ۔ ابو اسحاق الفریسی ۔ اصطخر میں پیدا ہوئے
(۵۳) قرطاس ۔ بادشاہ مغرب ابو الحسن علی بن عبداللہ ابن ابی زرع ۔ مطبوعہ ٹورن برگ اپسالا ۱۸۴۶ء
(۵۴) قزوینی ۔ آثار البلاد ۔ مؤلفہ زکریا ابن محمد القزوینی ۔ مطبوعہ ۔ الیف وسٹن فلڈ گوٹنگن ۱۸۴۸ء، ۱۸۴۹ء
(۵۵) خوشانی (تاریخ قضاۃ قرطبہ) آکسفورڈ کا قلمی نسخہ ذکرل کی فہرست میں نمبر ۱۲۷)
(۵۶) لورنتی
(۵۷) لوکاس ۔ (الوئی کا اسقف) جلد ۴ ۔
(۵۸) مقری ۔ منتخبات از تاریخ و ادبیات اعراب اندلس ۔ مطبوعہ آر ڈوزی ۔ جی ڈگٹ ۔ ایل ۔ کریل ۔ ڈبلیو ۔ رائٹ ۔ لیدن ۱۸۵۵ء ۔ ۱۸۶۱ء (یہ انتخابات احمد بن محمد التلمسانی المقری کی تاریخ اسپین اسلامیہ کی تمہید کے طور پر اصل کتاب کے ساتھ شامل کئے گئے ہیں (۱۵۹۰ ۔ ۱۶۳۲) اصل کتاب کے اور حصوں کو نئی ترتیب دے کر پاسکل دی گیاگوس نے انگریزی میں ترجمہ کر کے ان کا نام اسپین کے اسلامی شاہی خاندانوں کی تاریخ رکھا ہے ۔ لندن ۱۸۴۰ء ۔ ۱۸۴۳ء ۔
(۵۹) مسعودی ۔ مروج الذہب (سونے کے مرغزار) لیدن کے قلمی نسخے ۔ نمبر ۱۲۷ و نمبر ۵۳۷ ۔ (یہ علی ابن حسین کی بڑی تاریخ کی جو اب ناپید ہے ۔ تلخیص ہے ۔ مروج الذہب کا ترجمہ اے ۔ اسپرنگر نے (مشرقی تراجم کے سرمایہ سے انجام دیکر) ۱۸۴۱ء میں طبع کرایا تھا ۔
(۶۰) میا ۔ میا کا قلمی نسخہ مندرجہ "تاریخی یادداشتیں" جلد ۴
(۶۱) مبرد ۔ کامل ۔ لیدن کا قلمی نسخہ نمبر ۵۸۷ ۔ دیکھو "فہرست" جلد ۱ صفحات ۲۰۴ و ۲۰۵ (محمد ابن یزید الازدی المبرد)
(۶۲) نووی ۔ مشہور لوگوں کے سوانح ... مؤلفہ ابو ذکریا یحییٰ النووی ... جے ۔ الیف ۔ وسٹن فلڈ نے طبع کیا ۔ گوٹنگن ۱۸۴۲ء ۔ ۱۸۴۵ء (تہذیب الاسماء ۔ اس

میں اعلام کی صحت کی گئی ہے)

(۶۳) تعلیقات۔ عربی قلمی نسخوں پر۔ مؤلفہ ڈوزی مطبوعہ لیدن ۱۸۴۷ء۔ ۱۸۵۱ء

(۶۴) نویری (تاریخ اسپین احوالہ۔ لیدن کے نسخے نمبر ۲۔ ۲ کا دیا گیا ہے بیگن پیرس کے قلمی نسخے سے جو بہتر ہے مقابلہ کر کے اختلاف کا لحاظ کر لیا گیا ہے۔

(۶۵) پالی ڈاپاکونی ایمپری ٹین سس دی ویٹا۔ پی پی۔ ایمپری ٹیو سیوم۔ مندرجہ اسپانا ساگرادا۔ جلد ۱۴۔ ص ۴۵۹ تا ۴۷۵۔

(۶۶) پلاگیوس۔ باشندہ آوَیدو۔ اسپانا ساگرادا میں۔ جلد ۱۴

(۶۷) ریحانہ۔ ریحانۃ الباب۔ لیدن کا قلمی نسخہ نمبر ۴۱۵۔ دیکھئے کیٹے لوگ (فہرست) جلد ا ص ۲۶۸۔ ۲۶۹۔

(۶۸) رازی۔ مسلمانوں کی تاریخ۔ مندرجہ کاغذات اقدمیہ تاریخ۔ جلد ۸۔ دیکھو ڈوزی کا دیباچہ تاریخ ابن عذاری پر صفحہ ۲۴ و ۲۵ (جس کی بنیاد احمد ابن محمد الرازی قرطبی کی تصنیف پر رکھی گئی ہے)۔

(۶۹) کتاب تحقیقات۔ عہد وسطی کی تاریخ وادبیات کے متعلق تحقیقات مؤلفہ آر ڈوزی۔ تیسری طباعت۔ لیدن ۱۸۸۱ء

(۷۰) روڈریگو طلیطلی۔ اسپین کی بازیابی"......

(۷۱) سعید طلیطلی۔ طبقات الامم سے اقتباس۔ لیدن کا قلمی نسخہ نمبر ۱۵۹

(۷۲) سمہودی۔ پیرس کا قلمی نسخہ نمبر ۷۵۳ (نورالدین السمہودی کی "تاریخ مدینہ" کا خلاصہ وستن فلڈ نے کیا تھا۔ بمقام گوٹنگن ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا۔

(۷۳) سامپیرو۔ تاریخ۔ مندرجہ اسپانا ساگرادا۔ جلد ۱۴ ص ۴۱۹۔ ۴۵۷

(۷۴) سامسن سیلوئیس اباتس کوردوبیونسس اپولوجی ٹی کس۔ مندرجہ اسپانا ساگرادا۔ جلد ۱۱۔ ص ۳۲۵۔ ۵۱۶

(۷۵) سباستین۔ سباستین کی تاریخ۔ مندرجہ اسپانا ساگرادا۔ جلد ۱۳۔ ص ۳۲۵۔ ۵۱۶

(۷۶) شہرستانی۔ کتاب الملل والنحل۔ مذہبی اور فلسفی فرقے۔ مصنفہ الشہرستانی

مطبوعہ ڈبلیو۔ کیورٹن۔ لندن ۱۸۴۲ء-۱۸۴۶ء (ابوالفتح الشہرستانی۔ ابوالفتح
شہرستانی کی کتاب کا نام بھی وہی تھا جو ابنِ حزم کی تصنیف کا تھا۔ دیکھو ابن حزم)

(۷۷) سوٹا۔ فرانسسکو دی سوٹا۔ عروقہ چاٹ ۔ اسقوراس اور کانتابریا کی تاریخ۔ مطبوعہ
مجریط ۱۶۸۱ء۔

(۷۸) سیوطی۔ تاریخ الخلفاء۔ خلفاء کی تاریخ۔ مؤلفہ ابوالفتح عبدالرحمٰن جلال الدین بن
ابی بکر السیوطی۔ مطبوعہ ڈبلیو۔ این۔ لیس۔ اور مولوی عبدالحق کلکتہ۔ ۱۸۵۶ء۔
(اس کا ترجمہ انگریزی میں میجر ایچ۔ ایس۔ جیرٹ نے کیا تھا۔ (۱۸۸۱ء) جو ببلیو
تھیکا انڈیکا کی جلد ۸۳ میں درج ہے۔

(۷۹) طبری۔ تاریخ۔ مؤلفہ محمد بن جریر الطبری۔ دی گوئی اور اور لوگوں نے اس کتاب
کو طبع کیا۔ لیدن ۱۸۷۹ء۔ ۱۸۹۸ء۔

(۸۰) تاریخ ابنِ حبیب۔ قلمی نسخہ آکسفورڈ کا نکول کی فہرست، نمبر ۱۲۸) دیکھو کتاب
تحقیقات۔

(۸۱) وتیا بیالی ورجی نس ادر گنٹیا۔ مندرجہ اسپاناساگرادا، جلد ۱۰ ص ۴۷۵۔

(۸۲) سوانح جرمانس گورزیشس۔ مندرجہ۔ پرٹز مونومنٹا جرمانیکا۔ جلد چوتھی۔

اشاریہ

ہدایت اس اشاریہ میں جن صفحات کا حوالہ ہے وہ کتاب کے حاشیہ کے صفحات ہیں پیشانی کے نہیں، کتاب میں حاشیہ کا صفحہ دیکھنے سے لفظ ملیگا

ا

پ

(خ)

ز

س

ص

ظ

ع

ن

ی

عظیم اور معیاری کتابیں

تاریخ وسوانح

علامہ ابن ہشام

سیرۃ ابن ہشام ۱۵/-

سید علی بلگرامی

تمدن عرب ۲۰/-

تمدن ہند قسم اول ۲۷/۵۰

تمدن ہند قسم دوم ۱۲/۵۰

مولوی عنایت اللہ

عبرت نامہ اندلس ۳۰/

عمر ابو النصر

سید العرب ۳/-

علی اور عائشہ ۳/-

آل محمد کربلا میں ۳/-

تاریخ خوارج ۵/-

رئیس احمد جعفری

خلیفہ ہارون رشید اور اسکا عہد ۶/-

قائد اعظم اور انکا عہد ۱۲/۵۰

خون کی ہولی ۴/-

آزادی ہند ۱۰/-

اسلامیات

مولانا ابو الکلام آزاد

عزیمت و دعوت ۳/۵۰

نگارشات آزاد ۴/۵۰

تنقید

پروفیسر سجاد حارث

غزالی شاعر اور اسکا فن ۴/-

نظم

عبد الحمید عدم

رنگ و آہنگ ۳/-

سائنس

سید علی ناصر زیدی

سائنس کے نئے افق ۵/-

سائنسدان کیسے بنتے ہیں ۳/۵۰

محمد سعید

جوہر کے کرشمے ۴/-

آسمان کی سیر ۲/۵۰

طائر اور طیارے ۲/۵۰

حکیم حبیب اشعر

جڑی بوٹیوں سے علاج ۲/۵۰

پروفیسر حمید عسکری

کیمیا کے رومان ۵/-

تاریخی ناول

محمد سعید

بحری عقاب ۶/۵۰

القاہرہ ۱۰/-

اطلس ۴/۵۰

الموت ۸/۵۰

ہمایوں ۸/-

رئیس احمد جعفری

یورش ۸/۵۰

تغلق ۸/-

رشید احمد میرٹھی

صبح اندلس ۶/-

قرطبہ ۸/۵۰

ناول

رئیس احمد جعفری

آنچ ۶/-

نائلی ۹/-

محبت کا انتقام ۴/۵۰

نفرت ۸/۵۰

قمر نقوی

راحلہ ۴/-

ندیمہ ۴/۵۰

راوی کے کنارے ۴/۵۰

مسافر ۵/۵۰

اور گھنٹی بجتی رہی ۵/۵۰

اے حمید

خوشبو کا خواب ۴/-

بادبان کھول دو ۵/-

محمد سعید

شہزادی ۶/۵۰

ایم اسلم

صیاد ۳/-

سید نذیر احمد

جنتی مالا ۵/۵۰

انیسلا ۵/۵۰

مقبول اکیڈمی ۱۸۲ شاہ عالم گیٹ لاہور